الحمد للہ القدیر کہ تفسیر بنظیر

مسمّٰی باسم تاریخی

# اشرف التفاسیر

۱۳۶۳ھ

ملقب بہ

# تفسیر نعیمی



مصنّفہ

مولانا الحاج المفتی احمد یار خاں صاحب بدایونی مدظلہ العالی المدرس مدرسہ انجمن خدام الصوفیہ گجرات

حسب فرمائش

حضرت والا مرتبت ناصر شریعت ناشر طریقت واقف رموز حقیقت و معرفت مولینا الحاج الحافظ

پیر سید ولایت شاہ صاحب مدفیوضہ

باہتمام خادم العلماء ابو الفقراء المنشی الحاج احمد دین عفی عنہ سکریٹری

انجمن خدام الصوفیہ گجرات پنجاب

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد (دکن)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حمد ہے اس اللہ جل شانہ کو جس نے حضرت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیدا فرمایا۔ درود ہو اُن حضرت محمد رسول اللہ علیہ السلام پر جنہوں نے اللہ کو ظاہر فرمایا۔ حمد ہے اُس اللہ تعالیٰ کو جس نے ہمیں انسان کیا۔ درود ہو اُس مصطفےٰ علیہ السلام پر جنہوں نے ہمیں مسلمان کیا۔ حمد ہے اُس رب کریم کو جس نے ہمیں بولنا سکھایا۔ درود ہو اُس نبی رؤف ورحیم پر جس نے ہمیں کلمہ پڑھایا حمد ہے اُس رب بے نیاز کو جس نے ہمیں ایمان دیا۔ درود ہو اُس صاحب تخت وتاج پر جس نے ہمیں قرآن دیا۔ حمد ہے اُس مالک یوم الدین پر جس نے زمین پر انسان بکھیرے۔ درود ہو اُس شاہ عرش نشین پر جس نے یہ بکھرے ہوئے جمع فرمائے۔ حمد ہے اُس رب کو جس نے رنگ برنگا انسان بنایا۔ درود ہو اُس نبی علیہ السلام پر جس نے ان کو اک رنگ بنایا ؎

صبغۃ اللہ ہست رنگِ خمِ او ہستہا یک رنگ گردد اندر او

حمد ہے اُس رب کو جس نے ہمیں عقل وہوش دیا درود ہو اُس نبی پر جس نے جام عرفاں سے متوالا ومدہوش کیا۔ حمد ہے اُس ربّ کو جسنے آسمان نبوت پر مختلف تارے کھلائے۔ درود ہو اُس آفتاب رسالت پر جس نے اپنے دامن نور میں سارے تارے چھپائے۔ حمد ہے۔ اُس جبار وقہار کو جس نے جہنم بھڑکایا۔ درود ہو اُس شفیع روز شمار پر جس نے اس بھڑکتے کو بجھایا حمد ہے اُس ستار وغفار پر جس نے دار الخلد بنایا درود ہو اُس مدنی سرکار پر جس نے اُسے بسایا حمد ہے اُس خالق کو جس سے سب کی ابتدا ہوئی ہے۔ درود ہو اُس خاتم پر جس پر سب کی انتہا ہے۔ درود ہو اُس نبی پر جس نے فرمایا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ حمد ہو اُس اللہ کو جس نے فرمایا مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ وبارک وسلم

امّا بعد جاننا چاہیے کہ نظر انسانی آفتاب آسمانی کے مقابل خیرہ۔ شبنم شمسی نور سے کافور اور کمزور روئی روشن آگ سے فیض لینے سے معذور غرضکہ ہر ادنیٰ اعلیٰ کے مقابل محض مجبور یہ تو مخلوق کا آپس میں معاملہ ہے۔ ذات خالق تو کہیں اعلیٰ وبالا ہے کس آنکھ میں طاقت ہے۔ کہ اُس کی تجلی جھیل سکے کس گوش ہوش میں قوت ہے۔ کہ اُس کے مخاطبہ کی تاب لاسکے کس مخلوق میں قدرت ہے۔ کہ اس کے مقابل ٹھیر سکے۔ یہ ظلمت وہ نور وہ قادر یہ مجبور۔ وہ قاہر یہ مقہور۔ ان مجبوریوں میں مخلوق کا خالق سے تعلق کیونکر قائم ہوتا۔ اور افاضہ واستفاضہ کی کیا صورت ہوتی مخلوق کی یہ بے بسی کسی ایسے برزخ کبریٰ کی تلاش میں تھی جو رب وربوب عابد ومعبود خالق ومخلوق میں فیض دینے اور لینے کا سلسلہ قائم کرے۔ خلقت کی کمزور نگاہ کسی ایسے گہرے رنگ والے شیشے کی جستجو میں تھی جو نور لم یزل کی جلالی شعاعوں کو شان جمالی میں اس تک پہنچادے۔ خلقت کی ہستی کسی ایسے مضبوط واسطے کی جویاں تھی۔ جو اس کمزور وادنیٰ کی اس قوی واعلیٰ تک رسائی کرادے۔ دایرۂ کائینات کسی ایسے مرکز کا متلاشی تھا جسکی طرف سب کا رجوع ہو۔ اس مجبوری ومعذوری پر رب قدیر نے رحم فرمایا۔ کہ مخلوق کو خالق سے ملانے گرتوں کو اٹھانے۔ بگڑوں کو بنانے کے لئے اس ذات کو پیدا فرمایا۔ جو ہستی کا پہلا نقش دفتر مخلوقات کا حرف اولین۔ گلزار خلائق کا نفیس پھول۔ آسمان وجود کا نیّر اعظم ہے۔ جسے جہان والے تو مکی مدنی کہتے ہیں۔ اور جناں والے سرو چمنی۔ بلبل انہیں گل کہے۔ قمری سرو جانفزا بتائے۔ عرش والے انہیں احمد مجتبےٰ کہتے ہیں۔ اور فرش والے محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ الی یوم الجزاء ؎

ادھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل خواص اس برزخ کبریٰ میں تھا حرف مشدد کا

ان کی ذات حبل اللہ المتین ہے۔ اور واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً حکم رب العالمین۔ ان کا نام پاک ہی ان کے کام کا پتہ دیتا ہے کہ "اللہ" بولنے سے دونوں لب جدا ہوجاتے ہیں۔ اور لفظ "محمد" کہتے ہی مل جاتے ہیں۔ کہ وہ نیچوں کو اعلیٰ سے ملانے ہی تو آئے ہیں۔ ان ہی کا نام

حرزِ جانِ طفلاں تیغِ جواناں اور عصائے پیرِ ناتواں ہے۔ پھر وہ خالی نہ آئے اک نسخہ کیمیا ساتھ لائے جس کا نام ہے قرآن کریم ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

سُبحان اللہ! نسخہ کیا ہے۔ کیمیا ہے۔ بیماروں کی شفا۔ تندرستوں کا ذریعہ بقا۔ گمراہوں کا راہنما۔ مسجدوں میں اس کی تلاوت ہے۔ میدانوں میں اس سے جہاد۔ عدالتوں میں اس سے فیصلے۔ بیماروں کے گلوں میں تعویذ بن کر پڑے۔ جان کنی میں مشکل حل کرے۔ بعد موت قبر اور حشر میں کام آئے۔ غرضکہ انسان کی دینی اور دنیوی زندگیوں کا دستور العمل ہے۔ ہر مسلمان کے دل میں جذبہ ہے۔ کہ اسے سمجھے۔ ہر مومن کے قلب میں تڑپ ہے۔ کہ اُس فرمان تک اس کی رسائی ہو علماء تو محنت کر کے اس کے مضامین تک پہنچتے ہیں۔ مگر عوام چاہتے ہیں۔ کہ اس کے مضامین ہماری زبان میں ہم تک پہنچیں۔ اس لئے تقریباً ہر زبان میں اس کی بے شمار تفسیریں لکھی گئیں۔ زبان اُردو بھی کسی سے پیچھے نہ رہی مگر اہل ہند نے مسلمانوں کے اس جذبے سے غلط فائدہ اٹھایا۔ کہ اپنے خیالات فاسدہ کو تفسیری رنگ میں ظاہر کیا۔ مرزائی نبوّت مرزا کا مقصد لے کر مفسّر بنے۔ چکڑالوی اپنے مذہب نامہذب کی اشاعت تفسیر کی آڑ میں کرنے لگے۔ نیچریوں نے ولائیتی عینک سے قرآن پاک کو دیکھا دیوبندیوں اور وہابیوں نے شیطانی دل و دماغ سے اسے سمجھا۔ کہ خود قرآن کریم سے صاحب قرآن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی توہین نکالنے لگے۔ شیطانی توحید کو ایمانی توحید بنا کر خلق کے سامنے پیش کرنے لگے۔ آجکل ہر بدمذہب نے ترجمہ قرآن کو اپنے لئے آڑ بنایا ہے۔ جگہ جگہ مسجدوں میں قرآنی ترجمے کے درس کے بہانے مسلمانوں کو بہکایا جا رہا ہے۔ جاہل سے جاہل اُردو خواں جسے استنجا کرنے کی تمیز نہیں مفسّر بنا ہوا ہے۔ اس لئے عرصے سے میرا ارادہ تھا۔ کہ کوئی ایسی تفسیر لکھوں جو کہ عربی معتمد تفاسیر کا خلاصہ ہو۔ اور جس میں موجودہ فرقوں کے نئے نئے اعتراضات کے جوابات دیئے جائیں۔ کیونکہ اُردو تفاسیر عام طور سے بدمذہبوں کی ہیں۔ لیکن بہت وجوہ سے اس کا موقعہ نہ ملتا تھا۔ کہ رب تعالیٰ نے مجھے شہر گجرات علاقہ پنجاب میں بھیجا۔ یہاں مجھے روزانہ تفسیر قرآن سنانے کی خدمت میسّر ہوئی۔ اُس وقت یہ خیال بھی نہ تھا۔ کہ یہ تفسیر کبھی کتابی شکل میں چھپے گی۔ ہوا یہ کہ بعض احباب نے روزانہ کی تقریریں لکھنا شروع کر دیں۔ جب چند پارے ختم ہوئے تو عام مسلمانوں کا خیال ہوا۔ کہ اس کو چھپوا دیا جاوے۔ یہ تو ممکن نہ تھا۔ کہ وہ ہی تقاریر بجنسہٖ چھپائی جاتیں بلکہ اُن پر نظر ثانی کر کے انہیں زوائد و مکررات سے خالی کرنا نئے فوائد بڑھانا ضروری تھے کیونکہ تقریر و تحریر میں فرق ہوتا ہے۔ ادھر میں نے حسب ذیل کتب لکھیں۔

"جاءالحق"، "شان حبیب الرحمٰن"، "سلطنتِ مصطفےٰ"، "صلی اللہ علیہ وسلم"، "اسلامی زندگی"، "دیوان سالک" وغیرہ امید سے زیادہ ان کی مقبولیّت نے اور بھی میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ لہٰذا اس طرف توجہ کی توجہ تو کر دی مگر اتنے بڑے کام کی ہمّت نہ پڑتی تھی۔ بھلا کہاں مجھ جیسا بے ہنر انسان اور کہاں تفسیر قرآن لیکن درحقیقت نہ تو وہ کتابیں میری قوت سے لکھّی گئیں۔ اور نہ یہ کام میری طاقت سے ہوگا۔ بلکہ رب تعالیٰ اور اُس کے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام جس سے چاہیں اپنا کام لے لیں حق تعالیٰ کے بھروسہ پر یہ کام شروع کر دیا۔ رب تعالیٰ میری زبان و قلم و کلام کو غلطی سے بچائے حق باتیں ظاہر فرمائے اور بخیر و خوبی اس کام کو انجام پر پہونچائے اور اسے قبول فرماوے اور مجھ فقیر بے نوا کے لئے صدقۂ جاریہ اور توشۂ آخرت بنائے نیز اس انجمن خدّام الصوفیہ گجرات کو دائم قائم رکھے اور جن جن حضرات نے اس میں درمے قدمے سخنے قلمے کوشش کی انہیں جزاء خیر دے۔

# خصوصیات

اس تفسیر میں حسب ذیل خصوصتیں ہیں (۱) یہ تفسیر تفسیر روح البیان۔ تفسیر کبیر تفسیر عزیزی تفسیر مدارک۔ تفسیر محی الدین ابن عربی۔ وغیرہ کا گویا خلاصہ ہے۔ (۲) اُردو تفاسیر میں سب سے بہتر تفسیر خزائن عرفان مصنفہ حضرت مرشدی استاذی صدر الافاضل مولٰینا

الحاج سیّد محمد نعیم الدین صاحب قبلہ مراد آبادی دام ظلہم ہے۔ اس کو مشعل راہ بنایا گیا۔ گویا یہ تفسیر اُس کی تفصیل ہے (۳) اردو ترجموں میں نہایت اعلیٰ اور بہتر اعلیحضرت قدس سرہٗ کا ترجمہ کنز الایمان ہے۔ اوسی پر یہ تفسیر کی گئی (۴) ہر آیت کا پہلی آیت سے نہایت عمدہ تعلق اور ربط بیان کیا گیا (۵) آیات کا شان نزول نہایت وضاحت سے بتایا گیا۔ اور اگر شان نزول چند مروی ہیں۔ تو اُن کی مطابقت کی گئی (۶) ہر آیت کی اوّلاً تفسیر پھر خلاصہ تفسیر اور پھر تفسیر صوفیانہ دلکش اور ایمان افروز طریقہ سے کی گئی۔ (۷) ہر آیت کے ساتھ علمی فوائد اور فقہی مسائل بیان کئے گئے۔ (۸) تقریباً ہر آیت کے ماتحت آریہ عیسائی وغیرہ دیگر ادیان اور دیو بندی قادیانی نیچری چکڑالوی وغیرہم کے اعتراضات معہ جوابات بیان کئے گئے ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب کے جوابات بھی دیئے گئے۔ لیکن یہ کتاب مجھے کچھ بعد میں ملی۔ اس لئے اس کی باقاعدہ تردید کچھ دُور جاکر شروع ہوئی اس تفسیر کے مطالعہ کے وقت قرآن پاک سامنے رکھا جائے اور جس آیت کی تفسیر دیکھنا ہو اُس پر نظر رہے تو انشاء اللہ بہت لُطف آئے گا۔ (۹) بہت کوشش کی گئی ہے۔ کہ زبان آسان ہو۔ اور مشکل مسائل بھی آسانی سے سمجھا دیئے جائیں۔ مگر پھر بھی بعض مسائل علمی ہیں۔ جیسے مسئلہ امکان کذب یا امکان نظیر یا مسئلہ عصمت انبیاء یا حضور علیہ السلام کے والدین کے ایمان کی بحث یا آیات و احادیث کی مطابقت اگر ان میں سے کوئی بات سمجھ میں نہ آئے۔ تو چند بار مطالعہ کریں۔ یا کسی سُنّی عالم سے حل کرلیں (۱۰) تفسیر کی تعریف اور تفسیر و تاویل و تحریف کا فرق اور مولوی اور صوفی کی تعریفیں اور اُن میں عمدہ فرق اور ان دونوں جماعتوں کی ضرورت پارہ اوّل کے اخیر میں بیان کی گئیں وہاں ملاحظہ فرمایئں۔ اور جو کوئی اس سے فائدہ اٹھائے وہ مجھ فقیر بے نوا کو دعا خیر سے یاد کرے۔ اس کا تاریخی نام "اشرف التفاسیر" المعروف "بتفسیر نعیمی" رکھتا ہوں حق تعالیٰ اسے قبول فرمائے۔ اور میرے لئے صدقہ جاریہ اور کفارہ سیّات بنائے

وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَنُوْرِ عَرْشِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ اَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

احمد یار خان نعیمی اشرفی اوجھانوی بدایونی

۸ ماہ فاخر ربیع الآخر سنہ ۱۳۶۳ھ ہجری روز ایمان افروز طغیان سوز دوشنبہ مبارکہ

# مُقَدِّمَہ

## اس میں چند فصلیں ہیں

**پہلی فصل لفظِ قرآن کے معنی اور اسکی وجہ تسمیہ**

لفظ قرآن یا تو قرءٌ سے بنا ہے یا قراءۃ سے یا قرنٌ سے (تفسیر کبیر پارہ ۲) قرءٌ کے معنے جمع ہونے کے ہیں۔ اب قرآن کو قرآن اس لئے کہتے ہیں۔ کہ یہ بھی سارے اولین و آخرین کے علموں کا مجموعہ ہے (تفسیر روح البیان پارہ ۲) دین دنیا کا کوئی ایسا علم نہیں جو قرآن میں نہ ہو۔ اسی لئے حق تعالےٰ نے خود فرمایا۔ کہ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ نیز یہ سورتوں اور آیتوں کا مجموعہ ہے نیز یہ تمام بکھروں کو جمع کرنیوالا ہے دیکھو ہندی۔ سندھی۔ عربی عجمی لوگ ان کے لباس طعام زبان۔ طریق زندگی سب الگ الگ۔ کوئی صورت نہ تھی۔ کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بکھرے ہوئے بندے جمع ہوتے۔ لیکن قرآن کریم نے ان سب کو جمع فرما دیا۔ اور ان کا نام رکھا مسلمان۔ خود فرمایا هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ جیسے کہ شہد مختلف باغوں کے رنگ برنگے پھولوں کا رس ہے۔ مگر اب ان سب رسوں کے مجموعہ کا نام شہد ہے۔ اسی طرح مسلمان مختلف ملکوں مختلف زبانوں کے لوگ ہیں۔ مگر اب ان کا نام ہے مسلمان۔ تو گویا یہ کتاب اللہ کے بندوں کو جمع فرمانے والی ہے۔ **اسی طرح** زندوں اور مردوں میں بظاہر کوئی علاقہ باقی نہ رہا تھا۔ لیکن اس قرآن عظیم نے ان کو بھی خوب جمع فرمایا۔ کہ مُردے مسلمان زندوں سے فیض لینے لگے۔ کہ اسی قرآن سے ان کو ایصال ثواب وغیرہ کیا جاتا ہے۔ اور زندے وفات شدہ لوگوں سے۔ کہ وہ حضرات اسی قرآن کی برکت سے ولی قطب۔ غوث بنے اور ان کا فیض بعد وفات جاری ہؤا۔ انشاء اللہ اس کی بحث وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں آئے گی۔

**اور اگر یہ قراءۃ سے بنا ہے۔** تو اس کے معنے ہیں پڑھی ہوئی چیز۔ تو اب اس کو قرآن اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اور انبیائے کرام کو کتابیں یا صحیفے حق تعالیٰ کی طرف سے لکھے ہوئے عطا فرمائے گئے۔ لیکن قرآن کریم پڑھا ہؤا اترا۔ اس طرح کہ حضرت جبریل امین حاضر ہوتے اور پڑھ کر سُنا جاتے۔ اور یقیناً پڑھا ہؤا نازل ہونا۔ لکھے ہوئے نازل ہونے سے افضل ہے جسکی بحث دوسری فصل میں آتی ہے نیز جس قدر قرآن کریم پڑھا گیا۔ اور پڑھا جاتا ہے۔ اس قدر کوئی دینی اور دُنیوی کتاب دُنیا میں نہ پڑھی گئی۔ کیونکہ جو کوئی آدمی کوئی کتاب بناتا ہے۔ وہ تھوڑے سے لوگوں کے پاس پہنچتی ہے۔ اور وہ بھی ایک آدھ دفعہ پڑھتے ہیں۔ اور پھر کچھ زمانہ بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پہلی آسمانی کتابیں بھی خاص خاص جماعتوں کے پاس آئیں اور کچھ دنوں رہ کر اولاً تو بگڑیں پھر ختم ہو گئیں جس کا ذکر تیسری فصل میں انشاء اللہ آئے گا۔ لیکن قرآن کریم کی وہ شان ہے۔ کہ سارے عالم کی طرف آیا۔ اور ساری خدائی میں پہنچا سب نے پڑھا۔ بار بار پڑھا اور دل نہ بھرا۔ اکیلے پڑھا جماعتوں کے ساتھ پڑھا۔ اگر کبھی تراویح کی جماعت یا شبینہ دیکھنے کا اتفاق ہؤا ہو۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ اس عظمت کے ساتھ کوئی کتاب پڑھی ہی نہیں گئی۔ پر **لطف** بات یہ ہے۔ کہ اس کو مسلمانوں نے بھی پڑھا۔ اور کفار نے بھی پڑھا۔ **لطیفہ** ایک بار رام چندر آریہ نے حضرت صدر الافاضل دام ظلہم سے عرض کیا۔ کہ مجھے قرآن کریم کے چودہ سیپارے حفظ یاد ہیں۔ بتایئے آپ کو میرا وید کتنا یاد ہے۔ حضرت موصوف نے فرمایا۔ یہ تو میرے قرآن کا کمال ہے۔ کہ دوست تو دوست دشمنوں کے سینے میں بھی پہنچ گیا۔ اور تیرے وید کی یہ کمزوری ہے۔ کہ دوستوں کے دل میں بھی گھر نہ کر سکا۔ اور بقول تمہارے دنیا میں وید کو آئے ہوئے کروڑوں برس ہو چکے۔ لیکن ہندوستان سے آگے نہ نکل سکا۔ مگر قرآن کریم چند صدیوں میں تمام عالم میں پہنچ گیا۔

اور اگر یہ قرنٌ سے بنا ہے۔ تو قرن کے معنے ہیں ملنے اور ساتھ رہنے کے۔ تو اس کو قرآن اس لئے کہتے ہیں۔ کہ حق اور ہدایت اس کے ساتھ ہے۔ نیز اس کی سورتیں اور آیتیں ہر ایک بعض بعض کے ساتھ ہیں۔ کوئی کسی کے مخالف نہیں نیز اس میں عقائد اور اعمال اور اعمال

میں اخلاق۔ سیاسیات۔ عبادات۔ معاملات تمام ایک ساتھ جمع ہیں نیز یہ مسلمان کے ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔ دل کے ساتھ۔ خیال کے ساتھ ظاہری اعضاء کے ساتھ اور باطنی عضوؤں کیساتھ۔ دل میں پہنچا۔ اس کو مسلمان بنایا۔ ہاتھ پاؤں ناک کان وغیرہ کو حرام کاموں سے روک کر حلال میں مشغول کر دیا۔ غرضکہ سر سے لے کر پاؤں تک کے ہر عضو پر اپنا رنگ جما دیا۔ پھر زندگی میں ہر حالت میں ساتھ رہا۔ بچپن میں ساتھ جوانی میں ساتھ بڑھاپے میں ساتھ پھر ہر جگہ ساتھ رہا۔ تخت پر ساتھ تختے پر ساتھ گھر میں ساتھ مسجد میں ساتھ جنگل میں ساتھ آبادی میں ساتھ جاگتے میں ساتھ سوتے میں ساتھ۔ مصیبت میں ساتھ۔ آرام میں ساتھ سفر میں ساتھ حضر میں ساتھ غرض کہ ہر حال میں ساتھ پھر مرتے وقت ساتھ۔ کہ پڑھتے اور سنتے ہوئے مرے قبر میں ساتھ۔ کہ بعض بعض صحابہ کرام کو ان کی وفات کے بعد قبر میں قرآن پاک پڑھتے ہوئے سنا گیا۔ اور حشر میں ساتھ۔ کہ گنہ گار کو خدا سے بخشوائے پلصراط پر نور بن کے مسلمان کے آگے آگے چلے۔ اور راستہ دکھائے۔ اور بتائے۔ اور جب مسلمان جنت میں پہنچیگا۔ تو فرمایا جائیگا۔ کہ پڑھتا جا اور پڑھتا جا۔ غرض کہ یہ مبارک چیز کبھی بھی ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اس کا دوسرا نام فرقان بھی ہے۔ یہ لفظ فرقؔ سے بنا ہے۔ اس کے معنے ہیں فرق کرنے والی چیز۔ قرآن کو فرقان اس لئے کہتے ہیں۔ کہ یہ حق و باطل جھوٹ اور سچ مومن اور کافر میں فرق فرمانے والا ہے۔ قرآن کریم کے کل ۳۲ نام ہیں جن کی تفصیل انشاء اللہ شروع سورۂ بقر ذٰلِكَ الْكِتٰبُ میں بیان کی جاویگی۔

## دوسری فصل نزول قرآن کریم میں

نزول کے معنے ہیں اوپر سے نیچے اُترنا۔ اور کلام میں اترنا اور نقل و حرکت نہیں ہو سکتی۔ لہذا اس کے اترنے اور نقل و حرکت کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو کسی چیز پہ لکھا جائے اور اس چیز کو منتقل کیا جائے۔ جیسے کہ ہم کوئی بات خط میں لکھ کر بھیجدیں۔ تو وہ بات بذریعہ اس کاغذ کے منتقل ہوئی۔ اس طرح پہلی کتابوں کا نزول ہوا تھا۔ یا کسی آدمی سے کوئی بات کہلا کے بھیج دی جائے۔ اس صورت میں حرکت کرنے والا وہ آدمی ہوگا۔ اور وہ کلام اس کے ذریعے سے حرکت کرے گا۔ اور یا بغیر کسی واسطے کے سننے والے سے گفتگو کر لی جائے۔ قرآن کریم کا نزول ان پچھلے دو طریقوں سے ہوا۔ یعنی جبریل امین آتے تھے اور آکر سناتے تھے۔ یہ نزول بذریعہ قاصد ہوا۔ اور قرآن کریم کی بعض آئتیں معراج میں بھی بغیر واسطہ جبریل عطا فرمائی گئیں۔ جیسا کہ مشکوٰۃ شریف باب المعراج میں ہے۔ کہ سورۂ بقر کی آخری آئتیں حضور علیہ السلام کو معراج شریف میں عطا فرمائی گئیں۔ لہذا قرآن پاک کا نزول دوسری آسمانی کتابوں کے نزول سے زیادہ شاندار ہے۔ کہ وہ لکھی ہوئی آئیں۔ یہ بولا ہوا۔ اور لکھنے اور بولنے میں بڑا فرق ہے۔ کہ بولنے کی صورت میں بولنے کے طریقے سے اتنے معنے بن جاتے ہیں کہ جو لکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ایک شخص نے ہم کو لکھ کر دیا۔ کہ "تم دہلی جاؤگے" ہم اس لکھی ہوئی عبارت سے ایک ہی مطلب حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر اسی جملے کو وہ بولے۔ تو پانچ چھ طریقے سے بول کر اس میں وہ پانچ چھ معنے پیدا کر سکتا ہے۔ ایسے لہجوں سے بول سکتا ہے۔ کہ جس سے سوال حکم تعجب تمسخر وغیرہ کے معنے پیدا ہو جائیں مجھ سے ایک شخص نے کہا تھا۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تاروں کے بارے میں فرمایا هٰذَا رَبِّیْ کہ یہ میرا رب ہے اور یہ شرک ہے۔ اور انبیاء کرام شرک سے معصوم ہوتے ہیں پھر آپ نے یہ کیوں فرمایا میں نے ان سے کہا۔ کہ ہم کو یہ جملہ لکھا ہوا ملا۔ اس لئے ہم ان کی مراد کے سمجھنے میں غلطی کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے۔ کہ انہوں نے اس کو اس طرح بولا ہو۔ کہ جس سے انکار یا سوال کے معنے پیدا ہو گئے ہوں۔ تو حقیقت میں یہ کلام ان چیزوں کی ربوبیت کے انکار کے لئے ہو۔ غرض کہ بولنے اور لکھنے میں بڑا فرق ہے (فائدہ) کوئی انسان قرآن کریم کو صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نہیں جان سکتا۔ اس کی چند وجہیں ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ ہم نے قرآن کریم جبریل امین کی زبان سے نہ سنا۔ تو ادا کرنے میں جو اسرار اور نکات حاصل ہوئے ہوں گے۔ ان تک ہمارا دماغ کیسے پہنچ سکتا ہے۔

## قرآن پاک کا نزول کتنے بار ہوا

قرآن کریم کا نزول چند طریقے سے اور چند بار ہوا ہے۔ اوّلاً تو لوح محفوظ سے پہلے آسمان کی طرف نزول ہوا کہ یکبارگی ماہ رمضان کی شب قدر میں ہوا۔ اس کے متعلق قرآن کریم فرماتا ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ

الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ اور اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ. پھر نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم پر تئیس (۲۳) سال کے عرصے میں تھوڑا تھوڑا بقدر ضرورت آتا رہا. اور احادیث سے ثابت ہے. کہ ماہ رمضان میں حضرت جبریل امین حضور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر سارا قرآن سنایا کرتے تھے. اور بعض بعض آئتیں دو دو بار بھی نازل ہوئی ہیں جیسے سورۂ فاتحہ وغیرہ خلاصہ یہ ہوا. کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کا نزول کئی طریقے سے ہوا لیکن احکام اس نزول سے جاری فرمائے جاتے تھے. جو بذریعہ جبریل علیہ السلام تھوڑا تھوڑا آتا تھا. ہماری اس تقریر سے ایک بڑا اعتراض بھی اٹھ گیا. وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم کے بارے میں کہیں نَزَّلْنَا فرمایا اور کہیں اَنْزَلْنَا اور نَزَّلْنَا کا معنے ہے آہستہ آہستہ ہم نے اُتارا اَنْزَلْنَا کا معنے ہے. یکبارگی اتار دیا. ان دونوں آیتوں کی مطابقت کس طرح کی جائے جواب معلوم ہو گیا. کہ چند بار نزول ہوا ہے. اور ان آیتوں نے الگ الگ نزولوں کو بیان فرمایا ہے.

## قرآن کا نزول حضور علیہ السلام پر کیوں ہوا

بندوں کے لئے ضروری ہے. کہ حق تعالیٰ کے احکام کو مانیں. لیکن یہ ماننا جب ہی ضروری ہو گا. جبکہ وہ احکام نبیؑ کی زبان پاک سے ادا ہوں حق تعالےٰ تو بلا واسطہ کسی غیر نبی سے کلام نہیں فرماتا. اگر حضرت جبریل علیہ السلام انسانی شکل میں آکر لوگوں کو احکام سنا جاتے. تو بھی ان پر عمل کرنا ضروری نہ ہوتا. اسی طرح کوئی غیر نبی خواب یا الہام یا غیبی آواز سے کسی حکم پر مطلع ہو جائے. تو اُس کا ماننا شرعاً لازم نہ ہو گا. مشکوٰۃ شریف کے شروع میں ہے کہ ایک بار حضرت جبریل علیہ السلام شکل انسانی میں سائل بن کر حضور پاک کی خدمت میں حاضر ہوئے. اور حضور علیہ السلام سے دریافت کیا ایمان کیا ہے. اسلام کیا ہے. احسان کیا ہے حضور علیہ السلام نے جواب دیئے. جب وہ دریافت کر کے چلے گئے. تو سرکار صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا. کہ یہ جبریل امین تھے. اور تم کو تمہاری دینی باتیں سکھانے آئے تھے. دیکھو اس موقعہ پر حضرت جبریل علیہ السلام نے خود ہی نہ کہہ دیا. کہ اے صاحبو! میں جبریل ہوں. اور تم کو فلاں فلاں بات کا حکم کرتا ہوں. کیونکہ وہ جانتے تھے. کہ میری اطاعت ان حضرات پر واجب نہ ہو گی. اسلئے حضور علیہ السلام کی زبان پاک سے وہ کلمات لوگوں کو سنوائے. اماموں کا قیاس بھی حق تعالےٰ کے فرمان یا حضور علیہ السلام کے ارشاد پر ہی مبنی ہوتا ہے. ہمارے اس کلام سے نتیجہ یہ نکلا کہ ع

اصل الاصول بندگی اس تاجور کی ہے

کہ نبی کی ہی اطاعت درحقیقت حق تعالیٰ کی اطاعت ہے. **فائدہ** پیغمبر کا خواب اور ان کا الہام وغیرہ بھی وحی کی طرح قابل اطاعت ہوتا ہے. حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا تھا. کہ اپنے فرزند کو ذبح کر دو. حالانکہ بے قصور آدمی کو قتل کرنا ظاہر شریعت کے خلاف تھا. لیکن آپ کے اس خواب نے اس حکم شرعی کو آپ کے حق میں منسوخ کر دیا. آج اگر کوئی مسلمان یہ خواب دیکھے تو وہ محض اپنے خواب پر ایسے کام کی جرأت نہیں کر سکتا. کیونکہ یہ خلاف شریعت ہے. **نکتہ**. یہ بھی یاد رہے. کہ حضرت جبریل علیہ السلام نہ تو نبی ہیں. اور نہ نبیوں کے اُستاد بلکہ رب تعالیٰ اور پیغمبروں کے درمیان پیغام پہنچانے والے اور قاصد ہیں. اور انبیاء کرام کے خادم. نبی حکومت الٰہیہ کے اختیارات والے حکام ہیں حضرت جبریل امین ایسے نہیں بلا تشبیہ یوں سمجھو کہ ایک ضلع کا افسر ہے. اور ایک محکمہ ڈاک کا قاصد بادشاہ کے یہاں سے احکام ڈاک کے ذریعے سے حاکم کے پاس آتے ہیں. تو ڈاک کا لانے والا حاکم نہیں. حاکم وہی ہے جس کے پاس یہ احکام آئے. اور جو ان پر رعایا سے عمل کرائیگا.

## قرآن اور حدیث کا فرق

قرآن و حدیث دونو ہی وحی الٰہی ہیں. دونو کی اطاعت ضروری ہے. فرق اتنا ہے. کہ قرآن کریم کی عبارت خدا کی طرف سے ہے. اور مضمون بھی گویا جس طرح حضرت جبریل امین نے آکر سنایا. اسی طرح بلا کسی فرق کے حضور علیہ السلام نے بیان فرما دیا. حدیث میں یہ ہے. کہ مضمون رب کی طرف سے ہوتا ہے. اور الفاظ حضور علیہ السلام کے اپنے ہوتے ہیں. اب اس مضمون کا رب کی طرف سے آنا یا بطور الہام ہوتا ہے. یا فرشتہ ہی عرض کرتا ہے. لیکن اس کی ادا حضور علیہ السلام کے اپنے الفاظ سے

ہوتی ہے۔ اسی لئے اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری۔ لیکن اس کی تلاوت نماز میں بجائے قرآن شریف کے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عمل مضمون پر ہوتا ہے۔ اور تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے قرآن پاک کے احکام حدیث سے منسوخ ہو سکتے ہیں۔ ہم اس کی پوری بحث انشاء اللہ تعالیٰ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِهَا میں کریں گے۔ دیکھو غیر اللہ کو سجدۂ تعظیمی کرنا قرآن شریف سے ثابت ہے۔ مگر حدیث نے اس کو منسوخ کیا وغیرہ وغیرہ اسی لئے قرآن پاک فرماتا ہے۔ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ یعنی ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مسلمانوں کو قرآن شریف اور حکمت سکھاتے ہیں۔ اگر حدیث شریف ماننے کی ضرورت نہ ہوتی۔ تو حکمت کا ذکر نہ فرمایا جاتا فقط کتاب کا ذکر ہی کافی تھا۔ حدیث ماننے کا یہ مطلب نہیں۔ کہ قرآن ناقص ہے۔ قرآن پاک بالکل مکمل کتاب ہے۔ لیکن اس مکمل میں سے مضامین حاصل کرنے کے لئے مکمل ہی انسان کی ضرورت تھی۔ اور وہ نبی ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ سمندر میں موتی ضرور ہیں۔ لیکن ان کے حاصل کرنے کے لئے کسی غواص (غوطہ خور) کی ضرورت ہے۔ اگر قرآن پاک سے مسائل ہر شخص نکال لیا کرتا۔ تو اس کے سکھانے کے لئے پیغمبر کیوں بھیجے جاتے۔ اس کی پوری بحث انشاء اللہ آئندہ ہوگی۔ اور جس طرح سے کہ قرآن شریف کے ہوتے ہوئے حدیث پاک کے ماننے کی ضرورت ہے۔ اور حدیث کے ماننے سے قرآن پاک کا ناقص ہونا لازم نہیں آتا۔ اسی طرح حدیث و قرآن کے ہوتے ہوئے ہم جیسوں کو فقہ کے ماننے کی بھی ضرورت ہے۔ اور فقہ ماننے سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ قرآن و حدیث ناقص ہوں۔ اسی لئے قرآن کریم نے عام حکم فرمایا۔ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ یعنی اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسول علیہ السلام کی اور اپنے میں سے امر والوں (علماء مجتہدین) کی۔

## تیسری فصل قرآن پاک کی ترتیب اور اس کا جمع ہونا

پہلے معلوم ہو چکا ہے۔ کہ قرآن پاک لوح محفوظ میں لکھا ہوا تھا۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ۔ پھر وہاں سے پہلے آسمان پر لایا گیا۔ پھر وہاں سے تئیس (۲۳) سال میں آہستہ آہستہ حضور علیہ السلام پر نازل ہوتا رہا۔ مگر یہ نازل ہونا اس لکھے ہوئے کی ترتیب کے موافق نہ تھا۔ کیونکہ یہ نزول بندوں کی ضرورت کے مطابق ہوتا تھا جس آیت کی ضرورت ہوئی وہی آگئی۔ مثلاً اگر اول ہی سے شراب کے حرام ہونے کی آیتیں اتر آتیں۔ تو یقیناً عرب کے نئے مسلمانوں کو دشواری واقع ہوتی۔ کیونکہ وہاں عام طور پر شراب پی جاتی تھی۔ اسی طرح سارے احکام کو سمجھ لو۔ لیکن چونکہ حضور علیہ السلام کی نگاہ پاک لوح محفوظ وغیرہ پر تھی۔ اس لئے آپ ہر آیت کے نزول کے وقت اس کو ترتیب سے جمع کرا دیتے تھے۔ اس طرح کہ جو حضرات کاتب وحی مقرر تھے۔ ان کو فرما دیتے تھے۔ کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد رکھو۔ اور یہ ترتیب لوح محفوظ کی ترتیب کے موافق تھی۔ اور طریقہ اس وقت یہ تھا۔ کہ حضرت زید ابن ثابت و دیگر بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اس خدمت کو انجام دینے کو مقرر تھے۔

جس وقت جو آیت آتی تھی حضور علیہ السلام کے حکم کے مطابق اونٹ کی ہڈیوں پر کھجور کے پٹھوں پر اور مختلف کاغذوں پر لکھ لیتے تھے۔ اور یہ چیزیں متفرق طور پر لوگوں کے پاس رہیں۔ لیکن ان حضرات کو زیادہ اعتماد حفظ پر تھا۔ یعنی عام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پورے قرآن کے حافظ تھے۔ جیسا کہ آج حافظ ہیں۔ بلکہ اس سے زیادہ تو یوں سمجھو۔ کہ قرآن پاک کی ترتیب خود حضور علیہ السلام نے دے دی تھی۔ لیکن ایک جگہ کتابی شکل میں جمع نہ فرمایا تھا۔ اس کی تین وجہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ چونکہ صدہا حافظ اس کو اسی ترتیب سے یاد کر چکے تھے۔ جو آج تک چلی آرہی ہے۔ اور نماز میں پڑھنا فرض تھا اور نماز کے علاوہ بھی صحابہ کرام برکت کے لئے اس کو اکثر اوقات پڑھتے ہی رہتے تھے۔ اس لئے اس کے ضائع ہونے کا کچھ اندیشہ نہ تھا۔ اور دوسرے یہ کہ جہاد اور دیگر ضروریات دینیہ کی وجہ سے اتنا موقعہ نہ مل سکا۔ کہ اس کو ایک جگہ جمع کیا جاتا۔ اور تیسرے یہ کہ جب تک کہ پورا قرآن پاک نہ آجاتا اس کو جمع کرنا غیر ممکن تھا کیونکہ ہر سورت کی کچھ آیات اتر چکی تھیں۔ کچھ اترنے والی ہوتی تھیں حضور کی وفات سے کچھ روز پہلے نزول قرآن کی تکمیل ہوئی۔ غرض کہ حضور پاک علیہ السلام کی زندگی پاک میں قرآن کریم

کتابی شکل میں ایک جگہ جمع نہ ہو سکا۔ البتہ مرتب ہو گیا۔ اللہ کی شان کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے زمانے میں یعنی حضور علیہ السلام کی وفات ہی کے سال **ملک یمامہ** کے جھوٹے مدعی نبوت مسیلمہ کذاب اور اُس کے ساتھیوں سے صحابہ کرام کو سخت جنگ کرنی پڑی۔ اور اس جنگ میں تقریباً سات سو حافظ قرآن بھی شہید ہو گئے۔ تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بارگاہ صدیقی میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا۔ کہ اگر اسی طرح حافظ اور قُرّاء شہید ہوتے رہے۔ تو بہت جلد قرآن پاک ضائع ہو جائیگا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع فرمایا جنہوں نے حضور علیہ السلام کے زمانہ پاک میں وحی لکھنے کی خدمت انجام دی تھی۔ اور اس کا مہتمم حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قرار دیا۔ کہ تم تمام جگہ سے قرآن پاک کی آیات جمع کر کے کتابی شکل میں تیار کرو۔ زید ابن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے تھے۔ آپ وہ کام کیوں کرتے ہیں۔ جو حضور علیہ السلام نے نہ کیا۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ کہ یہ کام اچھا ہے (**نوٹ**) اس سے بدعت حسنہ کا ثبوت ہوا۔ حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہائت محنت اور جانفشانی سے ان تمام آیتوں کو یکجا جمع کیا۔ جو کہ لوگوں کے سینوں اور کھجور کے پٹھوں اور ہڈیوں میں لکھی ہوئی تھیں۔ اور ترتیب وہی رہی جو حضور علیہ السلام نے فرمائی تھی۔ یہ قرآن کا نسخہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیات میں ان کے پاس رہا۔ پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس رہا۔ پھر ان کے بعد فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پاک بیوی حفصہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے پاس محفوظ رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے زمانے میں حذیفہ ابن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کہ ارمینیہ اور آذر بائیجان کے کفار سے جنگ فرما رہے تھے۔ وہاں کی مہم سے فارغ ہو کر حاضر بارگاہ ہوئے اور عرض کیا۔ کہ اے امیر المومنین لوگوں میں قرآن پاک کے متعلق اختلاف شروع ہو گئے ہیں۔ اگر یہ اختلاف بڑھتے رہے تو مسلمانوں کا حال یہود و نصاریٰ کی طرح ہو جائے گا۔ لہٰذا اس کا جلد کوئی انتظام کیجئے **وجہ اختلاف** یہ تھی۔ کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے نسخوں میں حضور علیہ السلام کے وہ الفاظ بھی لکھے تھے۔ جو آپ نے بطور تفسیر ارشاد فرمائے تھے۔ اور وہ حضرات اس کو قرآن کا ہی جزو سمجھ گئے تھے۔ حالانکہ وہ الفاظ قرآن نہ تھے جیسے کہ مصحف ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ نیز ایک نسخہ تمام ملک کے مسلمانوں کے لئے اب کافی نہ تھا۔ نیز حافظ صحابہ کرام کو جو لقمہ قرآن مجید میں لگتا تھا۔ اس کے نکالنے میں بہت دشواری ہوتی تھی۔ ان وجوہ کی بنا پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پھر زید ابن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم فرمایا۔ اور ان کی مدد کے لئے عبد اللہ ابن زبیر اور سعید ابن عاص اور عبد اللہ ابن حارث ابن ہشام کو مقرر فرمایا۔ ان حضرات نے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس سے پہلے جمع کئے ہوئے قرآن کو منگایا۔ اور پھر اس کا مقابلہ حفاظ کے حفظ قرآن سے نہائت تحقیق سے کر کے چھ یا سات نسخے نقل کئے۔ اور یہ نسخے عراق۔ شام اور مصر وغیرہ اسلامی ممالک میں بھیج دیئے۔ اور اصل نسخہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو واپس کر دیا۔ اور جن صحابہ کرام کے پاس تفسیر سے ملے ہوئے قرآن کے نسخے تھے وہ اس کو قرآن پاک ہی سمجھے بیٹھے تھے۔ ان کو منگوا کر جلوا دیا گیا۔ کیونکہ ان نسخوں کا باقی رہنا آئندہ بڑے فتنوں کا دروازہ کھول دیتا۔ کہ آئندہ لوگ اس کو قرآن پاک ہی سمجھنے لگتے۔ الحمد للہ کہ اب تک قرآن پاک اسی طرح بلا کم و کاست مسلمانوں میں چلا آرہا ہے۔ **ناظرین** ہماری اس تقریر سے سمجھ گئے ہوں گے۔ کہ قرآن پاک کی ترتیب نزول کے مطابق ہو سکتی ہی نہ تھی۔ کیونکہ موجودہ ترتیب لوح محفوظ کی ترتیب کے مطابق ہے۔ اور قرآن پاک کا نزول ضرورت کے مطابق ہوا۔ اور یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے۔ کہ قرآن پاک کو ترتیب دینے والے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لیکن اس کو کتابی شکل میں جمع فرمانے والے اولاً صدیق اکبر اور دوسرے عثمان غنی ہیں۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اس لئے آپ کا لقب ہے عثمان جامع قرآن **نکتہ** صلح حدیبیہ کے موقعہ پر جبکہ صحابہ کرام نے حضور علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کی جس بیعت کا نام **بیعت الرضوان** ہے۔ اس میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ موجود نہ تھے۔ کیونکہ ان کو حضور علیہ السلام کی طرف سے مکہ معظمہ بھیجا گیا تھا۔ تو حضور علیہ السلام نے اپنے بائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔ اور خود انکی طرف سے بیعت فرمائی ؏ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ

تو گویا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ہاتھ ہوا۔ اور حق تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ فرمایا۔ کہ فرمایا یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ تو گویا اس واسطے سے عثمان غنی کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہے۔ اور قرآن کریم اللہ کا کلام۔ تو یوں سمجھو کہ کلام اللہ کو یدُ اللہ نے جمع فرمایا۔ اس لئے عثمان غنی کو جمع قرآن کے لئے منتخب فرمایا گیا۔ **نوٹ ضروری** قرآن کریم کی تقسیم اس زمانہ پاک میں دو طریقے سے ہو چکی تھی۔ ایک سورتوں سے دوسری منزلوں سے۔ یعنی قرآن پاک کی سات منزلیں کی گئی تھیں۔ کہ تلاوت کرنے والا ایک منزل روزانہ کے حساب سے سات دن میں ختم کر سکے۔ ان منزلوں کو فمی بشوق میں جمع کیا گیا ہے۔ یعنی پہلی منزل سورۃ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے۔ دوسری سورۃ مائدہ سے تیسری سورۃ یونس سے چوتھی بنی اسرائیل سے پانچویں سورہ شعراء سے چھٹی سورہ والصّٰفّٰت سے اور ساتویں سورہ قٓ سے پھر اس کے بعد قرآن پاک کے تیس ۳۰ حصے برابر برابر کئے گئے جس کا نام رکھا گیا تیس سیپارے تاکہ تلاوت کرنے والا ایک سیپارہ روز کے حساب سے ایک مہینے میں قرآن پاک ختم کر سکے پھر قرآن پاک میں زبر زیر نہ ہونے کی وجہ سے اس کے تلاوت کرنے میں سخت دشواری محسوس ہوتی تھی کیونکہ غیر عربی لوگ تو پڑھ سکتے ہی نہ تھے۔ اور عربی حضرات بھی بعض بعض موقعوں پر دشواری محسوس کرتے تھے لہٰذا اس میں زبر زیر لگائے گئے۔ اور **نون قطنی** وغیرہ ظاہر کئے گئے۔ مشہور یہ ہے۔ کہ یہ کام حجّاج ابن یوسف نے کیا۔ اسی حجّاج ابن یوسف نے سورتوں کے نام قرآن میں لکھے۔ اس سے پہلے یہ نام قرآن میں لکھے نہ گئے تھے (تفسیر خزائن العرفان) پھر اس میں رکوع بنائے گئے یعنی حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ رمضان شریف کی تراویح کی نماز میں جس قدر قرآن پاک پڑھ کر رکوع فرماتے تھے۔ اتنے حصے کو رکوع قرار دیا گیا۔ اسی لئے اس کے نشان کے لئے قرآن مجید کے حاشیئے پر ع لگا دیتے ہیں بعض تو کہتے ہیں۔ کہ یہ عمرو کے نام کا عین ہے بعض کہتے ہیں۔ کہ عثمان کے نام کا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ رکوع کا عین ہے۔ تو حقیقت میں یہ تمام کام تلاوت کرنے والے کی آسانی کئے گئے **لطیفہ** اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تراویح بیس رکعت ہونی چاہیئے۔ نہ کہ آٹھ اس لئے کہ حضرت عثمان غنی روزانہ بیس رکعت تراویح پڑھتے تھے۔ اور ہر رکعت میں قرآن پاک ایک رکوع پڑھتے۔ اور ستائیسویں رمضان مبارک کو ختم قرآن فرماتے تھے۔ اس حساب سے کل پانسو چالیس ۵۴۰ رکوع بنتے ہیں۔ اور کل رکوع قرآن پاک پانسو چھپن ۵۵۶ ہیں چونکہ بعض سورتیں بہت چھوٹی ہیں۔ اسلئے بعض رکعتوں میں دو سورتیں پڑھ لی جاتی ہیں۔ اگر تراویح آٹھ رکعت ہوتیں جیسے وہابی کہتے ہیں تو قرآن پاک کے رکوع کل دوسو سولہ ۲۱۶ ہونے چاہیئے تھے۔ اس کی زیادہ تحقیق کیلئے ہماری کتاب **لمعات المصابیح علی الرکعات التراویح** دیکھو۔ سورتوں کی ترتیب کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ ان کو بھی آیتوں کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی ترتیب دیا تھا۔ اور بعض فرماتے ہیں۔ کہ نہیں۔ بلکہ صحابہ کرام کی اجتہاد سے یہ ترتیب ہوئی۔ لیکن تفسیر عزیزی نے یہ فیصلہ فرمایا ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی سورتوں کی ترتیب اشارۃً خود فرما دی تھی جیسے کہ سات طویل سورتیں اور حٰمٓ والی اور مفصل کی سورتیں کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازوں یا اپنے وظیفوں میں ترتیب وار پڑھ کر بتا دیا تھا اور بعض سورتوں کی ترتیب حضور علیہ السلام کے بعد صحابہ کرام کے اجتہاد سے مضامین کی مناسبت سے واقع ہوئی۔ جیسے کہ کسی بڑے شاعر کے کلام کو ہم ترتیب دیں۔ تو اُس کو ردیف کے حرفوں کے مطابق سے اس طرح ترتیب دیتے ہیں۔ کہ بڑی بڑی غزلیں اور قصیدے پہلے اور مثنوی اُس کے بعد اور قطعے اور رباعیاں اُس کے بعد تو ترتیب میں کلام کی موزونیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے نہ یہ کہ اُس نے یہ کلام کب کہا۔ اسی لئے مدنی بڑی بڑی سورتیں قرآن پاک میں اوّل ہیں۔ اور مکی سورتیں بعد ہیں۔

## چوتھی فصل قرآن پاک کی حفاظت

قرآن پاک سے پہلی کتابیں مثلاً توریت۔ انجیل و زبور وغیرہ ایک خاص وقت تک کے لئے اور خاص خاص قوموں کے لئے دنیا میں بھیجی گئی تھیں۔ اس لئے حق تعالیٰ نے ان کی حفاظت کا ذمہ خود نہ لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان پیغمبران عظام کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد وہ کتابیں بھی قریب قریب ختم ہو گئیں لیکن یہ قرآن کریم سارے جہان کے لئے آیا اور ہمیشہ کے لئے آیا۔ اس لئے رب تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ہم ہی نے یہ ذکر (قرآن) اُتارا ہے۔ اور ہم اس کے محافظ ہیں۔ اور سبحان اللہ! ایسی اسکی حفاظت ہوئی۔ کہ کوئی شخص اس میں زیر اور زبر کا فرق نہ کر سکا۔ اس حفاظت کا ذریعہ یہ ہوا۔ کہ قرآن کریم فقط کاغذ پر ہی نہ رہا۔ بلکہ مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ کیا گیا۔ صحابہ کرام رضہ کے زمانے کی حالت تو ہم سُنی سنائی بیان کر سکتے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں تو مشاہدہ ہو رہا ہے۔ کہ اگر کسی چھوٹے سے گاؤں کے اندر بھی کسی مجمع کے سامنے کوئی تلاوت کرنے والا ایک زبر زیر تک کی غلطی کر دے۔ تو ہر چہار طرف سے آوازیں آتی ہیں۔ کہ آپ نے غلط پڑھا۔ اس طرح پڑھو۔ اور ہر زمانے میں ہر جگہ ایک دو نہیں۔ بلکہ صدہا حافظ پیدا ہوتے رہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ جب بچہ سکول میں قدم رکھتا ہے۔ تو چونکہ ابھی اس میں کتاب سنبھالنے کی لیاقت نہیں ہوتی۔ لہٰذا اُس کے استاد چھوٹے چھوٹے قاعدے اور کتابیں اس کو خرید کر دیتے ہیں۔ وہ بچہ کتابیں پڑھتا بھی جاتا ہے۔ اور ضائع بھی کرتا جاتا ہے۔ جب کسی قدر ہوش سنبھالتا ہے۔ تو اب کتابیں پھاڑتا تو نہیں۔ لیکن ان پر لکھ لکھ کر ان کو خراب کرتا رہتا ہے۔ پھر جب خوب سمجھ دار ہو جاتا ہے۔ اور کتاب کی قدر و قیمت پہچانتا ہے۔ تو اب کتاب کو جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا ہے۔ اسی طرح دنیا سب سے پہلے خدائی کتابوں اور صحیفوں کو سنبھال نہ سکی۔ اور ان کو برباد کر ڈالا۔ پھر توریت و انجیل وغیرہ کو بالکل تو نہ مٹایا۔ مگر اپنی طرف سے بہت کچھ اس میں خلط ملط کر دیا۔ دنیا کے آخیر دور میں قرآن کریم تشریف لایا۔ اور قدرت نے اس کو سمجھانے کا طریقہ سکھایا۔ توریت و انجیل کسی زمانے میں بگڑی بگڑائی پائی جاتی ہوں گی۔ لیکن اب تو صفحۂ ہستی سے قریباً بالکل ناپید ہو گئیں۔ یہ جو پیسے پیسے کی یوحنا اور متی رسول کی انجیلیں فروخت ہو رہی ہیں۔ یہ وہ انجیل نہیں۔ جو آسمان سے آئی تھی۔ بلکہ اس کے ترجمے ہوں گے۔ کیونکہ وہ زبان عبرانی میں تھیں اور یہ ترجمے مختلف زبانوں میں ہیں۔ جب وہ اصل کتاب ہمارے سامنے ہے ہی نہیں تو ہم کیسے معلوم کریں۔ کہ یہ ترجمے اس کے صحیح ہیں۔ یا غلط بخلاف قرآن کریم کے۔ کہ وہی قرآن اسی زبان میں بعینہٖ موجود ہے۔ جو صاحب قرآن علیہ السلام پر اترا تھا۔ وہ کتابیں تو کیا باقی رہتیں۔ زبان عبرانی جس میں وہ کتابیں آئی تھیں وہ ہی دنیا سے غائب ہو گئی۔ بلکہ مصر اور شام وغیرہ ممالک جہاں عبرانی زبان بولی جاتی تھی۔ وہاں عربی زبان نے اپنا سکہ جما لیا۔ اور اس قرآن پاک کی بدولت ہر ملک میں عربی زبان کا دور دورہ ہو گیا۔ چنانچہ الحمدللہ ہندوستان میں بھی لاکھوں کی تعداد میں عربی دان موجود ہیں لیکن عبرانی جاننے والا ایک بھی نہیں ہے حتیٰ کہ مشن سکولوں میں عربی زبان تو پڑھائی جاتی ہے۔ مگر افسوس کہ عبرانی اور سریانی زبانیں وہاں بھی غائب ہیں۔ یہ سب قرآن پاک اور صاحب لولاک کی برکت ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ حیرت یہ ہے۔ کہ قرآن پاک کے الفاظ محفوظ اسکے پڑھنے کے طریقے یعنی قرأت (تجوید) محفوظ۔ کہ س ص ف ط ک ق د ذ ز ض ظ مدّ شدّ وغیرہ کس طرح ادا کئے جائیں۔ طریقہ تحریر بھی محفوظ ہے یعنی جس طرح کہ صاحب قرآن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے تحریر منقول ہے۔ اس کے خلاف قرآن پاک نہیں لکھ سکتے۔ بِسْمِ اللّٰهِ کا سین لمبا اور میم گول لکھا جاتا ہے۔ ممکن نہیں کہ کسی قرآن پاک میں یہ سین چھوٹا کر کے لکھا جائے۔ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ لکھنے میں اَلْاِسْمُ آتا ہے۔ مگر پڑھنے میں لِاسْمُ آتا ہے۔ علماء فرماتے ہیں۔ کہ قرآن پاک کو عربی خط میں لکھا جائے۔ اُردو خط یا نستعلیق میں نہ لکھا جائے۔ بعض بعض کلمات نحوی قاعدے کے خلاف معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن وہ پڑھے ویسے ہی جاتے ہیں۔ جیسے کہ ثابت ہو چکے۔ مثلاً عَلَيْهُ اللّٰهَ۔ وَمَا اَنْسَانِيْهُ۔ لَنَسْفَعًا وغیرہ ان چیزوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کہ سبحان اللہ! قرآن پاک ایسا محفوظ ہے۔ کہ اس کے صفات تک محفوظ اگر کوئی مُنصف ان باتوں کو بنظر انصاف دیکھے تو قرآن پاک کے قبول کرنے میں تامل نہ کرے۔ ان خوبیوں کو دیکھ کر بعض پادریوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اوّلاً تو اس کوشش میں رہے۔ کہ انجیل شریف کو محفوظ کتاب ثابت کریں۔ مگر نہ کر سکے۔ بلکہ بہت سے محققین عیسائیوں نے مان لیا۔ کہ انجیل شریف میں لفظی اور معنوی بے شمار تحریفیں ہوئیں۔ اور مان لیا۔ کہ انجیل کی بہت سی آئتیں اور بہت سے باب الحاقی ہیں۔ دیکھو مسٹر ہارن اور ہنری اور اسکاٹ صاحب کی تفاسیر اور دیکھو مباحثہ دینی مطبوعہ اکبرآباد مصنفہ پادری فنڈر وغیرہ بعض عیسائی پادریوں نے یہ کوشش کی۔ کہ قرآن پاک کو محرّف ثابت کریں۔ چنانچہ عبدالمسیح اور ماسٹر رام چندر اور پادری عمادالدین نے اس بارے میں رسالے لکھ ڈالے۔ یہ لوگ جس قدر اعتراض کر سکتے

ہیں. ہم ان کو علیحدہ علیحدہ سوال جواب کی شکل میں بیان کرتے ہیں. تاکہ مسلمان ان سے واقف ہوں. (۱) **سوال** حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے جب قرآن کا نسخہ تیار کیا. تو پچھلے نسخوں کو جلوا دیا جس سے معلوم ہوتا ہے. کہ یہ قرآن وہ نہیں ہے. جو آسمان سے آیا تھا. بلکہ وہ جلایا جا چکا ــــ **جواب** اس کا جواب دوسری فصل میں نہایت تفصیل سے گزر چکا. کہ ان نسخوں کا جلوانا اختلاف کو مٹانے کیلئے تھا. کیونکہ ان میں قرآن اور تفسیری عبارات مخلوط تھیں. آیات کو لے لیا گیا. اگر وہ نسخے باقی رہتے. تو آئندہ بڑا اختلاف پیدا ہو جاتا. اس تفصیل کو پڑھنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے. کہ اعتراض محض لغو ہے اور دھوکہ دینے کے لئے ہے. (۲) **سوال** تفسیر اتقان بخاری شریف جلد دوم باب جمع قرآن میں ہے. کہ حضرت زید ابن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں. کہ میں نے لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ والی آیت تمام جگہ تلاش کی. مگر کہیں نہ ملی. بجز ابوخزیمہ انصاری کے. کہ ان کے پاس یہ لکھی ہوئی موجود تھی. اس سے معلوم ہوتا ہے. کہ اور آیتیں بھی اس طرح گم ہو گئی ہوں گی. نیز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے. کہ ایک آیت لکھی ہوئی ہمارے پاس تھی. جسے بکری کھا گئی جس سے معلوم ہوتا ہے. اور آیات بھی اسی طرح برباد ہو گئی ہوں گی **جواب** اگر ایسی ایسی دو چار سو روایتیں بھی جمع کر لی جائیں. اور وہ روایتیں قابل قبول بھی ہوں. اور کوئی بکری پورا قرآن بھی کھا گئی ہو. تب بھی اصل قرآن کا ایک نقطہ بھی ضائع نہیں ہو سکتا. یہ تو جب ہوتا. جب قرآن پاک کا دارو مدار تورات وانجیل کی طرح فقط دو چار نسخوں پر ہوتا. یہ تو مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ تھا. کاغذ کو بکری اور گائے بھینس کھا سکتی ہیں. حافظ کے سینے کو تو قبر کی مٹی بھی نہیں کھاتی. اسے کون کھائے گا. جناب وہ تو صحابہ کرام کا زمانہ تھا. اگر آج بھی دنیا سے قرآن پاک کے سارے نسخے ناپید کر دیئے جائیں. تو ہندوستان کے کسی معمولی گاؤں کا ایک چھوٹا حافظ بچہ بھی قرآن پاک بعینہٖ لکھوا سکتا ہے. (۳) **سوال** مسلمان خود مانتے ہیں کہ قرآن پاک کی بہت سی آیتیں منسوخ ہیں. کہ سورہ یٰسین سورہ بقر کے برابر تھی. لیکن نسخ وغیرہ ہو کر کٹ کٹا کے اتنی باقی رہی معلوم ہؤا. کہ یہ قرآن بعینہٖ وہ نہیں ہے. کہ جو آسمان سے آیا تھا. بلکہ اس میں بہت سی تبدیلی ہو چکی ہے. **جواب** تحریف کی معنے یہ ہیں. کہ کتاب والے کی غیر موجودگی میں اسکی بغیر مرضی اس کتاب میں کچھ کمی زیادتی کر دی جائے. لیکن اگر صاحب کتاب ہی اپنی مرضی سے اپنی کتاب میں کچھ کمی بیشی کرے. تو اس کو کوئی بیوقوف بھی تحریف نہ کہے گا. ایک طبیب نسخہ لکھتا ہے. بیمار اس میں اپنی طرف سے دوائیں گھٹا بڑھا لیتا ہے. تو وہ مریض یقیناً مجرم ہے لیکن اگر طبیب ہی مریض کی حالت میں تبدیلی کی بنا پر اپنے نسخے میں کچھ تبدیلی کرتا ہے تو یہ طبیب کی قابلیت اور نسخے کے مکمل ہونے کی دلیل ہے. نہ کہ نسخے کی تحریف یہی قرآن پاک میں ہؤا. کہ بعض سورتوں میں حالات کے موافق خود قرآن بھیجنے والے خدا تعالیٰ کی طرف سے ہی احکام بدلے گئے. نسخ کی پوری تحقیق ہم انشاء اللہ تعالیٰ اس آیت کے ماتحت لکھیں گے. کہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ انتظار کریں (۴) **سوال** مسلمانوں کی بعض جماعتیں (جیسے کہ شیعہ) کہتی ہیں. کہ قرآن میں سے دس پارے کم کر دیئے گئے. اور اس قرآن میں سورہ حسنین سورہ علی اور سورہ فاطمہ بھی تھیں. پتہ نہیں لگتا وہ کہاں گئیں. پھر آپ لوگ کس منہ سے کہتے ہیں. کہ قرآن پاک محفوظ ہے. **جواب** کسی بیوقوف شیعہ نے یہ گپ ہانکی ہو گی. محققین شیعہ تو بڑے شدومد کے ساتھ اس سے اپنی برأت ثابت کرتے ہیں. مثلاً ملا صادق شرح کلینی میں محمد ابن حسن عاملی شیخ صدوق ابوجعفر محمد ابن علی بابویہ وغیرہ. اور کیوں نہ ثابت کریں. اس لئے کہ اس عقیدے سے تو اہل بیت عظام کے اسلام کی ہی خیر نہ رہی گی. کیونکہ پھر سوال یہ پیدا ہو گا. کہ اہل بیت اطہار رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے اس محرف قرآن کو اپنی نمازوں میں کیوں پڑھا. اور اس سے احکام کیوں جاری فرمائے. اور قرآن پاک کو تحریف ہوتا ہؤا دیکھ کر خاموشی کیوں اختیار کی. کیوں نہ سر بکف ہو کر میدان میں نکلے. اور قرآن پاک کی حفاظت فرمائی. اگر وہ اس کام کو کرتے. تو تمام مسلمان ان کی امداد کرتے. اگر نہ بھی کرتے تو خدا تو امداد کرتا. اگر خدا بھی امداد نہ کرتا اور جان جاتی تو شہید ہوتے جب مسئلہ خلافت کے لئے امیر معاویہ اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جنگ ہو سکتی تھی. تو مسئلہ حفاظت قرآن کے لئے خلفائے ثلاثہ سے بھی جنگ ہو سکتی تھی. رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین. اور اگر کچھ بھی نہ ہوا تھا. تو حضرت علی مرتضےٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کا زمانہ خلافت سب سے بعد تھا۔ اسی زمانہ میں خلفائے ثلاثہ پردہ فرما چکے تھے کسی کا خوف نہ تھا۔ تب اصلاح فرمانی ضروری تھی۔ شہید کربلا سید الشہداء امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو یزید کی بیعت کے مقابلے میں اپنی جان دے سکتے تھے۔ وہی شہباز اسلام پروانہ شمع رسالت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس مسئلہ حفاظت قرآن پر بھی اپنی جان قربان کر سکتے تھے۔ ان تمام حضرات کا بلا اعتراض قرآن پاک کو قبول فرمالینا۔ اس کی صحت کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔ کونسا ایسا بے وقوف شیعہ ہوگا۔ جو کہ اپنے آئمہ دین پر اس قدر اعتراض گوارا کر کے قرآن پاک کی تحریف کا قائل ہوگا۔ اس کی زیادہ تحقیق منظور ہو تو **تفسیر فتح المنان** کا مطالعہ کریں **باقی** اور واہیات اعتراضات جو کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایاك نعبد وایاك نستعین پر یا قرآن پاک میں انبیاء کرام کے قصوں کے بار بار آنے پر۔ چونکہ ان کا تعلق حفاظت قرآن سے نہیں۔ اس لئے ہم ان کو یہاں بیان نہیں کرتے۔ بلکہ اس آیت کے ماتحت بیان کریں گے۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا الخ ناظرین اس کا انتظار کریں۔ **تتمہ بحث** قرآن پاک کا طریقہ تحریر بھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے منقول ہے چنانچہ خرپوتی شریف شرح قصیدہ بردہ میں کتب معتبرہ سے نقل کیا۔ کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو کاتب وحی تھے قلم کا ہاتھ میں لینا دوات کا موقعہ پر رکھنا ب کو سیدھا کرنا سین کو متفرق کر کے لکھنا م کو ٹیڑھا نہ کرنا وغیرہ سکھاتے تھے۔ اس لئے قرآن پاک کی تحریر اور اس کی تلاوت ہر ایک میں سنت کا اتباع لازم ہے۔

## پانچویں فصل قرآن پاک کے فضائل و فوائد

انسان میں کیا طاقت ہے۔ جو رب کے کلام کے فضائل اور اس کے فوائد کو پورے طور پر بیان کر سکے۔ مسلمانوں کی واقفیت کیلئے چند باتیں اس کے فضائل کے متعلق اور چند فائدے بیان کئے جاتے ہیں۔ کلام کی عظمت کلام کرنے والے کی عظمت سے ہوتی ہے۔ ایک بات فقیر بے نوا کے منہ سے نکلتی ہے۔ اس کی طرف کوئی دھیان بھی نہیں دیتا۔ اور ایک بات کسی بادشاہ یا حکیم کے منہ سے نکلتی ہے۔ تو اس کو دنیا میں شائع کیا جاتا ہے۔ اخباروں اور رسالوں میں اس کی اشاعت ہوتی ہے۔ غرض یہ ہے۔ کہ کلام کی عظمت کا پتہ کلام والے کی عظمت سے لگتا ہے۔ اسی قاعدے کی بنا پر اندازہ لگالو۔ کہ قرآن پاک ایسا معظم کلام ہے۔ کہ اس کی مثل کسی کا کلام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ خالق کا کلام ہے مثل مشہور ہے۔ کہ كَلَامُ الْمُلُوْكِ مُلُوْكُ الْكَلَامِ یعنی بادشاہ کا کلام کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے۔ اس کلام ربانی میں سارے علوم اور ساری حکمتیں موجود ہیں جس میں سے ہر شخص اپنی لیاقت کے موافق حاصل کرتا ہے۔ اس کا پتہ اس سے لگتا ہے۔ کہ تفسیریں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس مفسر میں جیسی قابلیت ہے۔ اسی قسم کے وہ بیش بہا موتی اس قرآن سے نکالتا ہے۔ منطقی مفسر کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن کریم میں از اول تا آخر منطق ہی منطق ہے۔ نحوی اور صرفی مفسر کی تفسیر سے پتہ چلتا ہے۔ کہ اس میں صرف و نحو ہی ہے فصیح و بلیغ مفسر کی تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ قرآن حکیم میں فصاحت و بلاغت کا دریا موجیں مار رہا ہے۔ صوفیا کرام کی تفسیروں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن عظیم میں علوم باطنی کے بیش قیمت موتی بھرے ہوئے ہیں۔ اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ قرآن میں سب کچھ ہے۔ لیکن جیسا اس کا استاد ویسی اس کی تحصیل۔ پھر جہاں تک سمجھنے والے کی سمجھ کی پہنچ وہاں تک اس کی تحقیق۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک جہاز سواریوں سے بھرا ہوا سمندر کے سفر سے آکر کنارے لگا۔ اس جہاز میں کپتان سے لیکر مسافروں تک ہر قسم کے لوگوں نے سفر کیا۔ لیکن اگر کسی مسافر سے سمندر کے کچھ حالات دریافت کئے جائیں۔ تو وہ کچھ نہ بتا سکے گا۔ کیونکہ اس کی نظر فقط پانی کی ظاہری سطح پر تھی اور اگر خلاصی سے کچھ تحقیق کی جائے وہ وہاں کے حالات کا کچھ پتہ دے گا۔ اور اگر کپتان سے معلومات حاصل کی جائیں۔ تو وہ اول سے آخر تک کے سمندر کے تقریباً سارے اندرونی حالات بیان کر سکے گا۔ کہ فلاں جگہ اس کی گہرائی اتنے میل تھی۔ اور فلاں مقام پر پانی میں اس قسم کا پہاڑ تھا۔ میں اپنے جہاز کو اس طرح سے بچا کے لایا وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح قرآن کریم ہم بھی پڑھتے ہیں اور امام اعظم ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ بھی پڑھتے تھے۔ اور صحابہ کرام بھی اسی قرآن کی تلاوت

فرماتے تھے۔ اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی اسی قرآن پاک کو پڑھا۔ کتاب تو ایک ہی ہے۔ لیکن پڑھنے والوں کے ذہن کی رسائی کی انتہائیں الگ الگ۔ ہماری نگاہ فقط ظاہری الفاظ تک ہی بمشکل پہنچتی ہے۔ یہ حضرات بقدر وسعت علمی اس کی تہ تک پہنچ کر مسائل اور فوائد کو نکال لیتے ہیں۔ بیہقی شریف میں ہے۔ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور علیہ السلام سے بارہ سال میں سورہ بقر پڑھی۔ اب بتاؤ۔ پڑھنے والے فاروق اعظم جیسے صاحب کمال۔ پڑھانے والے خود صاحب قرآن صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور بارہ سال کی مدت بتاؤ تو کہ آقا نے کیا کیا نہ دیا ہوگا۔ اور انکے نیاز مند خادم عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا کیا نہ لیا ہوگا۔ پھر ذرا اس پر بھی غور کرتے چلو۔ کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ اپنے محبوب علیہ السلام کو رحمٰن نے قرآن سکھایا ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام تو فقط پہنچانے والے ہیں۔ سوچو تو کہ سکھانے والا رحمٰن اور سیکھنے والا سید الانس والجان اور کیا سکھایا۔ قرآن۔ نہ معلوم رب نے کیا دیا۔ اور محبوب علیہ السلام نے کیا کیا لیا۔ اسی لئے تفسیر روح البیان شریف نے فرمایا۔ کہ ایک مرتبہ حضرت جبریل قرآن کی آیت الٓمّٓ لے کر آئے۔ عرض کیا۔ الف حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ "میں نے جان لیا"۔ عرض کیا لام فرمایا "یقین کر لیا میں نے"۔ عرض کیا میم تو فرمایا۔ "اس کا کرم ہے"۔ جبریل امین کہنے لگے۔ کہ حضور آپ نے کیا سمجھا اور کیا جانا میں تو کچھ بھی نہ سمجھا۔ فرمایا یہ میرے اور رب کے درمیان راز ہیں ؎

میان خالق و محبوب رمزے است  کراماً کاتبیں را ہم خبر نیست

ہمارے اس عرض کرنے کا مدعا یہ ہے۔ کہ کوئی بڑے سے بڑا عالم اور بڑے سے بڑا زبان دان قرآن پاک کے متعلق یہ خیال نہ کرے کہ میں نے اس کی حقیقت کو پا لیا۔ قرآن پاک ایک سمندر ناپید اکنار ہے۔ جتنا جس کا برتن اتنا وہاں سے وہ پانی لے سکتا ہے۔ لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میرے کوزے میں سارا سمندر آگیا۔ غرض کہ قرآن کریم حق تعالیٰ کی عظمت کا مظہر ہے جیسے اُس کی عظمت کی انتہا نہیں ویسے ہی اس کی عظمت بے انتہا ہے۔ شعر ؎ کلام اللہ بھی نام خدا کیا راحت جاں ہے  عصائے پیر ہے تیغ جواں ہے حرز طفلاں ہے

**فوائد۔** قرآن کریم کے فوائد کا احاطہ کسی کی زبان کسی کا قلم کسی کا دل و دماغ نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھو۔ کہ یہ عالم کی تمام روحانی جسمانی۔ ظاہری۔ باطنی۔ ضرورتوں کا پورا فرمانے والا ہے۔ اگر ہم حدیث و فقہ کی روشنی میں قرآن کریم کے صحیح معنے میں عامل بن جائیں۔ تو ہم کو کبھی بھی کسی قوم سے کسی حاجت میں کسی قسم کی امداد نہ لینی پڑے۔ ہم اس کے متعلق دو طرح گفتگو کرتے ہیں۔ ایک عقلی اور ایک نقلی۔ اگرچہ مسلمان کے لئے نقلی دلائل کے ہوتے ہوئے عقلی دلائل کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن زمانہ موجودہ میں نئی روشنی کے دلدادوں کا اعتماد اپنی لولی لنگڑی عقل پر زیادہ ہے یعنی گلاب کی خوشبو کے مقابلے میں گیندے کی بدبو سے زیادہ مانوس ہو چکے ہیں۔ اس لئے ہم اوّلاً ان کی تواضع کے لئے عقلی فوائد بیان کرتے ہیں۔

(۱) سخی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو فقیر کو بلا کر دیں دوسرے وہ جو فقیر کے گھر آکر دیں۔ کنواں بلا کر دیتا ہے۔ دریا آکر دیتا ہے۔ اور سمندر بادل بنا کر عالم پر پانی برسا دیتا ہے۔ کعبہ معظمہ بھی سخی اور قرآن کریم بھی مگر فرق یہ ہے۔ کہ کعبہ معظمہ کے پاس بھکاری جائیں اور جا کر فیض لے آئیں۔ قرآن کریم کی یہ شان ہے۔ کہ مشرق و مغرب میں گھر گھر پہنچا۔ اور اپنا فیض جا کر دیا۔ اور جو لوگ کہ بالکل اَن پڑھ تھے۔ ان کے لئے علما مثل بادل کے بنا کر اپنی رحمتوں کی بارش ان پر بھی برسا دی ؎

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی  ہری ہو گئی دم میں کھیتی خدا کی

(۲) **آفتاب** وہ نور ہے جو ایک وقت میں آدھی زمین کو چمکاتا ہے۔ اور پھر ظاہر کو چمکاتا ہے۔ اور اپنے سامنے والے کو چمکاتا ہے اور پھر بادل کی وجہ سے اس کی روشنی پھیکی پڑھ جاتی ہے کبھی اس کو گرہن بھی لگتا ہے۔ دن بھر میں تین پلٹے کھاتا ہے صبح اور شام کو ہلکا اور دوپہر کو تیز لیکن قرآن کریم آسمان ہدایت کا وہ چمکتا دمکتا سورج ہے جو بیک وقت سارے عالم کو چمکا رہا ہے۔ فقط ظاہر ہی کو نہیں بلکہ دل و دماغ کو بھی منور کر رہا ہے۔ نیز اس کی روشنی جیسے میدانوں پر پڑ رہی ہے۔ اسی طرح پہاڑوں میں غاروں میں اور تہ خانوں میں غرض کہ ہر جگہ پہنچ رہی ہے۔ نہ کبھی

اس کو گہن لگے۔ نہ کوئی بادل اس کی روشنی کو ڈھک سکے۔ اس کی شعاعیں بڑی تاریک گھٹاؤں کو بھی چیر کر اپنا کام کرتی ہیں۔ اسی لئے رب تعالیٰ نے قرآن پاک کے بارے میں فرمایا۔ وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا

(۳) آج ہم لوگوں نے اپنی بے علمی کی وجہ سے قرآن کریم کے فیوض و برکات کو محدود سمجھ رکھا ہے بعض لوگوں نے تو اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے۔ کہ قرآن کریم فقط اس لئے آیا ہے۔ کہ بیماری میں اسے پڑھ کے دم کر لو۔ اور گھر میں برکت کے واسطے رکھ لو جب کوئی مرنے لگے تو اس پر یٰسین پڑھ دو۔ اور بعد موت اس کو پڑھوا کر ایصال ثواب کروا دو۔ باقی رہا عمل اس کے لئے قرآن کی کوئی ضرورت نہیں اس کے لئے فقط انگریزوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں۔ چنانچہ بعض جگہ کے مسلمانوں نے اپنی خوشی سے اسلامی قوانین کے مقابلے میں ہندوؤں، یا عیسائیوں کے قانونوں کو اپنے پر لازم کر لیا۔ جیسے کہ پنجاب کے زمیندار یا کاٹھیاواڑ کے عام مسلمان کہ انہوں نے میراث سے اپنی لڑکیوں کو قانونی طور پر محروم کر دیا۔ اور اپنی صورت۔ سیرت۔ طریق زندگانی۔ لباس وغیرہ میں یکدم غیروں سے مل گئے اور بعض نے یہ کہنا شروع کیا۔ کہ قرآن فقط عمل کے لئے آیا ہے اس کی تلاوت کرنا۔ اس سے دم کرنا۔ تعویذ لکھنا۔ یا اس سے ایصال ثواب کرنا۔ اس کے نزول کی حکمت کے خلاف ہے قرآن عمل کے لئے اترا ہے۔ نہ کہ طبابت اور جھو منتر کے لئے وہ کہتے ہیں۔ قرآن پاک ایک نسخہ ہے۔ نسخے کے فقط پڑھتے رہنے سے شفا نہیں ملتی۔ بلکہ اس کو استعمال کرنا چاہیئے۔ یہ وہ خیال فاسد ہے۔ کہ جو پڑھے لکھوں کے دماغ میں بھی گھوم رہا ہے۔ مسٹر عنایت اللہ مشرقی اور ابو العلا مودودی اور عوام دیوبندی اسی چکر میں ہیں۔ مگر خیر سے عمل وہاں بھی غائب ہے۔ عمل کا فقط نام ہی نام ہے۔ یا اگر عمل ہے۔ تو ایسا اندھا جیسا کہ مشرقی نے اپنے خاکساروں سے کرا کر صدہا کو موت کے گھاٹ اتروا دیا۔ اور خود معافی مانگ کر خیریت سے گھر آ بیٹھے لیکن دوستو ان لوگوں میں افراط ہے۔ اور پہلے لوگوں میں تفریط تھی جس طرح سے کہ ہم اپنے مال اور بدن کے اعضا سے بہت سے کام لیتے ہیں۔ کہ آنکھ سے دیکھتے بھی ہیں، روتے بھی ہیں۔ اس میں سرمہ لگا کر زینت بھی حاصل کرتے ہیں۔ ہاتھ سے پکڑتے بھی ہیں، اور مار کو روکتے بھی ہیں۔ زبان سے کھاتے بھی ہیں۔ بولتے بھی ہیں۔ کھانے کی لذت اور اس کی سردی گرمی محسوس بھی کرتے ہیں۔ ایک ہی پھونک سے گرم چائے ٹھنڈی بھی کرتے ہیں۔ سردیوں میں انگلیاں بھی گرم کرتے ہیں۔ آگ جلاتے بھی ہیں اور چراغ بجھاتے بھی ہیں۔ اس طرح عبادات میں صدہا ایسی مصلحتیں ہیں۔ روزہ عبادت بھی ہے۔ قسم وغیرہ کا کفارہ بھی۔ جو غریب نکاح نہ کر سکے اس کے لئے شہوت توڑنے کا ذریعہ بھی۔ اسی طرح قرآن کریم صدہا دینی اور دنیوی فوائد لیکر اترا۔ نماز قرآن کے ذریعہ سے ادا ہو۔ کھانا وغیرہ قرآن پڑھ کر شروع کرو۔ شاہی قوانین قرآن سے حاصل کرو۔ بیمار پر قرآن پاک پڑھ کر دم کر دیا تعویذ لکھ کر گلے میں ڈالو۔ ثواب کے لئے اس کو پڑھو۔ عمل اس پر کرو۔ غرض کہ یہ قرآن بادشاہ کے لئے قانون۔ غازی کے لئے تلوار۔ بیمار کے لئے شفا۔ غریب کا سہارا۔ کمزور کا عصا۔ بچوں کا تعویذ۔ بے ایمان کے لئے ہدایت۔ قلب مردہ کی زندگی۔ قلب غافل کے لئے تنبیہ۔ گمراہوں کے لئے مشعل راہ زنگ آلودہ قلب کی صیقل ہے۔ اگر قرآن کریم صرف احکام کے لئے ہوتا۔ اور دیگر مقاصد اس سے حاصل نہ ہوتے۔ تو اس میں فقط احکام کی آیتیں ہوتیں۔ ذات و صفات کی آیتیں متشابہات۔ انبیائے کرام کے قصے آیات منسوختہ الاحکام ہرگز نہ ہونی چاہیئے تھیں۔ کیونکہ ان سے احکام حاصل نہیں کئے جاتے۔ اسی طرح سے اُن احکام کی آیتیں بھی نہ ہوتیں جن پر عمل ناممکن ہے جیسے کہ نبی کی آواز پر آواز بلند کرنے کی آیتیں یا بارگاہ نبوی میں دعوت کھانے کے آداب یا نبیوں کی بیبیوں سے حرمت نکاح کی آیتیں۔ اور نیز قرآن پاک یہ نہ فرماتا کہ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔ اسی طرح اگر قرآن کریم فقط برکت لینے اور دم درود کے لئے ہوتا۔ تو اس میں احکام کی آیتیں نہ ہونی چاہیئے تھیں۔ **نکتہ** یہ جو کہا گیا۔ کہ قرآن ایک نسخہ ہے اور نسخے کا پڑھنا مفید نہیں ہوتا۔ یہ مثال غلط ہے۔ بعض چیزوں کے نام میں اور پڑھنے میں تاثیر ہوتی ہے پردیسی آدمی کے پاس گھر سے خط آئے تو فقط پڑھ کر ہی اس کا دل خوش ہو جاتا ہے۔ بیماری ہلکی پڑ جاتی ہے۔ کسی شخص کو مصیبت کی خبر سناؤ۔ فقط سن کر دل کا حال بدل جاتا ہے کسی کو اُلّو گدھا کہہ دو تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ کسی کے سامنے کسی

کھٹی چیز کا نام لے دو. تو منہ میں پانی بھر آتا ہے. اگر روزے کی حالت میں کسی کا منہ خشک ہو جائے. تو اس کو دکھا کر لیموں کاٹو تو اس کی خشکی دور ہو جاتی ہے. بہر دوا پلائی ہی نہیں جاتی. بلکہ کبھی دکھائی سنائی اور سنگھائی بھی جاتی ہیں. تو جب مخلوق کے نامہ وپیام میں اور ناموں میں اتنا اثر ہے تو خالق کے کلام وپیغام میں کس قدر اثر ہونا چاہیئے. خود غور کر لو۔

اب ہم قرآن پاک کے وہ فوائد بیان کرتے ہیں. جو احادیث سے ثابت ہیں. (۱) حدیث شریف میں ہے کہ جس گھر میں روزانہ سورۂ بقر شریف پڑھی جائے. وہ گھر شیطان سے محفوظ رہتا ہے. (لہٰذا جنات کی بیماریوں سے بھی محفوظ رہے گا) (۲) قیامت کے دن سورۂ بقر اور سورۂ آل عمران ان لوگوں پر سایہ کریں گی اور ان کی شفاعت کریں گی جو دنیا میں قرآن پاک کی تلاوت کے عادی تھے (۳) جو شخص آیۃ الکرسی صبح وشام اور سوتے وقت پڑھ لیا کرے تو اس کا گھر انشاء اللہ آگ کے لگنے اور چوری ہونے سے محفوظ رہے گا. (۴) سورۂ اخلاص کا ثواب تہائی قرآن کے برابر ہے. (اسی لئے ختم و فاتحہ میں اس کو تین بار پڑھتے ہیں. (۵) حضور علیہ السلام فرماتے ہیں. کہ جو شخص قرآن پاک کا ایک حرف پڑھے. اس کو دس نیکیوں کے برابر نیکی ملتی ہے. خیال رہے. کہ الٓمٓ ایک حرف نہیں بلکہ الف. لام. میم تین حرف ہیں لہٰذا فقط اتنا پڑھنے سے تیس نیکیاں ملیں گی. (۶) جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل کرے. تو قیامت کے دن اس کے ماں باپ کو ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی چمک آفتاب سے کہیں بڑھ کر ہو گی (۷) قرآن پاک دیکھ کر پڑھنے میں دوہرا ثواب ملتا ہے. اور بغیر دیکھے پڑھنے میں ایک ثواب. لوٹ. چند چیزوں کا دیکھنا عبادت ہے. قرآن پاک. کعبہ معظمہ. ماں باپ کا چہرہ محبت سے اور عالم دین کی شکل دیکھنا عقیدت سے وغیرہ وغیرہ (۸) قرآن پاک کی تلاوت اور موت کی یاد دل کو اسی طرح صاف کر دیتی ہے. جیسے کہ زنگ آلودہ لوہے کو صیقل (۹) جو شخص کہ قرآن پاک کی تلاوت میں اتنا مشغول ہو کہ کوئی دعا نہ مانگ سکے. تو خداوند تعالیٰ اس کو مانگنے والوں سے زیادہ دیتا ہے. (۱۰) جو شخص ہر رات سورہ واقعہ پڑھا کرے. انشاء اللہ اسے کبھی فاقہ نہ ہو گا (۱۱) سورۂ الٓمٓ تنزیل کا پڑھنے والا جب قبر میں پہونچتا ہے. تو یہ سورت اس طرح اس کی شفاعت کرتی ہے. کہ اے اللہ اگر میں تیرا کلام ہوں. تو اس کو بخش دے. ورنہ تو مجھے اپنی کتاب سے نکال دے. اور میت کو اس طرح ڈھک لیتی ہے جیسے چڑیا اپنے پروں سے اپنے بچے کو. اور اسے عذاب قبر سے بچاتی ہے (۱۲) جو شخص کہ سورۂ یٰسین اوّل دن میں (دوپہر سے پہلے) پڑھنے کا عادی ہو. تو اس کی ساری حاجتیں پوری ہوتی ہیں (۱۳) سورۂ یٰسین شریف پڑھنے سے تمام گناہ معاف ہوتے ہیں. اور مشکلیں آسان ہوتی ہیں. لہٰذا اس کو بیماروں پر پڑھو (۱۴) سوتے وقت قُلْ یٰاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھنے والا انشاء اللہ تعالیٰ کفر سے محفوظ رہے گا. (یعنی اس کو خاتمہ بالخیر نصیب ہو گا.) (۱۵) سورۂ فلق اور سورۂ ناس پڑھنے سے آندھی اور اندھیری دُور ہوتی ہے. اور اس کا پابندی سے پڑھنے والا انشاء اللہ جادو سے محفوظ رہے گا (۱۶) سورہ فاتحہ ہر جسمانی اور روحانی بیماری کی دوا ہے. (ہر سورت کے فوائد ہم انشاء اللہ تعالیٰ اس سورت کے ساتھ بھی لکھیں گے. واضح رہے. کہ قرآن کے فائدے فقط پڑھنے والے پر ہی ختم نہیں ہو جاتے. بلکہ دوسروں تک بھی پہنچ جاتے ہیں. مثلاً جہاں تک اس کی آواز پہنچے وہاں تک ملائکہ رحمت کا اجتماع ہوتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے. کہ حضرت اسید ابن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک شب تلاوت قرآن کر رہے تھے. اور ان کے پاس ایک گھوڑا بندھا تھا. وہ اچانک اُچھلنے کودنے لگا. اوپر نگاہ اٹھا کے دیکھا. ایک سائبان سا تھا جس میں قندیلیں روشن تھیں. اس سے گھوڑا ڈر کر کودتا تھا. صبح کو آکر بارگاہ نبوت میں یہ واقعہ عرض کیا. ارشاد ہوا. کہ یہ رحمت کے ملائکہ تھے. جو تمہارا قرآن پاک سننے آئے تھے. اسی طرح جہاں تک اس کی آواز پہنچے وہاں تک کی ہر چیز درخت گھاس بیل بوٹے حتیٰ کہ در و دیوار اس کے ایمان کی قیامت میں انشاء اللہ تعالیٰ گواہی دیں گے. اسی طرح اگر تلاوت کرنے والا کچھ آیتیں پڑھ کر کسی بیمار پر دم کر دے. تو انشاء اللہ تعالیٰ صحت ہوگی. دیکھو اگر تم کسی باغ کے پاس سے گذرو. تو وہاں کے پھولوں کی مہک دور تک محسوس ہوتی ہے جس سے دماغ معطر اور دل خوش ہو جاتا ہے. آخر یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ

ہوا پھولوں سے لگ کر ہر چہار طرف پھیلتی ہے اس ہوا کی تاثیر یہ ہوتی ہے کہ گذرنے والوں کو خوش کر دیتی ہے۔ تو جس زبان سے قرآن پاک پڑھا جائے اس سے لگ کر جو پھونک نکلے وہ کیوں نہ دافع ہو۔ صحابہ کرام نے سانپ سے ہوؤں کا سورۂ فاتحہ دم کر کے علاج کیا ہے اسی طرح قرآن کریم کی آیتوں کو لکھ کر تعویذ کی شکل میں بیمار کے ساتھ رکھا جائے تو اسے شفا حاصل ہوتی ہے جس کی آنکھ دُکھتی ہو۔ اسکی آنکھ کے سامنے ایک سبز کپڑا باندھ دیتے ہیں اور اس سے اسکو شفا ہوتی ہے۔ آنکھ میں سرمہ لگانے سے نظر قایم رہتی ہے۔ جب یہ معمولی دوائیں کچھ دیر ہمارے ساتھ رہ کر اپنا اثر دکھا دیں۔ تو قرآن حکیم کی آئتیں اس سے کہیں زیادہ شفا بخش ثابت کیوں نہ ہونگی؟ صحابہ کرام نے قرآن شریف کی آیتوں سے بیماروں کا علاج کیا ہے جس تعویذ گنڈے اور دم سے حدیث پاک میں منع فرمایا گیا ہے۔ وہ زمانہ جاہلیت کے شرکیہ کلموں کے منتر تھے جن میں بتوں سے مدد مانگنے کے الفاظ تھے قرآن پاک کی آیتوں سے ان کو کیا نسبت؟ اسی طرح اگر قرآن پاک کی تلاوت کر کے کسی کو ثواب بخش دیا جائے۔ تو وہ ضرور اس کو پہنچے گا۔ اگر میں اپنا کمایا ہؤا روپیہ کسی کو دوں۔ تو دے سکتا ہوں۔ اسی طرح اپنے کمائے ہوئے ثواب کو دینے کا اختیار بھی رکھتا ہوں۔ ہاں فرق یہ ہے۔ کہ اگر مال چند اشخاص پر تقسیم کیا جائے۔ تو وہ بٹ کر تھوڑا تھوڑا ملے گا۔ اور دینے والے کے پاس نہ رہے گا۔ لیکن اگر ثواب صدہا آدمیوں کو بخش دیا جائے۔ تو سب کو پورا پورا ملے گا۔ اور بخشنے والے کو ان سب کے برابر۔ جیسے کہ کوئی عالم یا حافظ صدہا آدمیوں کو عالم یا حافظ بنا دے۔ تو وہ علم تقسیم ہو کر نہ ملے گا۔ بلکہ سب کو برابر ملے گا۔ اور پڑھانے والے کے علم میں اور ترقی ہوگی۔ ایصال ثواب کی پوری بحث اور اس کے متعلق تمام اعتراضات اور جوابات انشاء اللہ تعالیٰ ہم اس آیت کے ماتحت لکھیں گے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۔

## چھٹی فصل تلاوتِ قرآن کے آداب

بزرگانِ دین کی عادتیں تلاوت قرآن کریم کے متعلق جداگانہ تھیں۔ بعض حضرات تو ایک دن رات میں آٹھ ختم کر لیتے تھے۔ چار دن میں اور چار رات میں۔ بعض حضرات چار۔ بعض دو اور بعض ایک۔ اور بعض لوگ دو دن میں ایک ختم اور بعض تین دن میں۔ بعض پانچ دن میں۔ بعض سات دن میں۔ اور سات دن میں ختم کرنا۔ اکثر صحابہ کرام کا معمول تھا۔ ہمیں لوگوں کے حالات مختلف ہیں۔ بعض لوگ تو نہایت تیز پڑھنے کی صورت میں بھی حروف کو ان کے مخرجوں سے ادا کرنے اور صحیح پڑھنے پر قادر ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگ اگر تیز پڑھیں تو صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ لہذا تلاوت کرنیوالوں کو چاہیئے۔ کہ صحیح پڑھنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ ثواب صحیح پڑھنے میں ہے۔ نہ محض جلدی پڑھنے میں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس طرح تلاوت فرماتے تھے۔ کہ ایک ایک حرف صاف صاف معلوم ہوتا تھا۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ قرآن کریم جب دل میں اترتا ہے۔ تب اس میں جمتا ہے۔ اور نفع دیتا ہے۔ تلاوت کرنے والا جس اطمینان اور سکون کے ساتھ دنیا میں تلاوت کرتا تھا۔ اسی اطمینان کے ساتھ تلاوت کرتا ہؤا جنّت میں بڑھتا جائے گا۔ اور جہاں تک اس کی تلاوت ختم ہوگی۔ وہاں تک کا سب ملک اس کو دیا جائے گا۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے۔ کہ اگر عربی سمجھنے پر قدرت رکھتا ہو۔ تو اس کے معانی اور مضامین پر غور کرتا جائے۔ اور رحمت کی آیت آئے۔ تو خوش ہو اور خدا سے رحمت مانگ لے۔ اور جب عذاب کی آیت آئے تو ڈرے اور اس سے پناہ مانگے نیز کوشش کرے۔ کہ تلاوت کے وقت دل حاضر ہو۔ اور خشوع اور خضوع کے ساتھ پڑھے۔ یہاں تک کہ رقت آ جائے۔ اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں۔ اگرچہ بے وضو بھی قرآن پڑھنا جائز ہے۔ لیکن مستحب یہ ہے۔ کہ وضو کر کے تلاوت کرے کہ اسمیں زیادہ ثواب ہے۔ اور سنت یہ ہے کہ تلاوت پاک جگہ میں ہو مسجد میں ہو۔ تو اور زیادہ بہتر ہے۔ یہ بھی مستحب ہے۔ کہ قبلہ کی طرف منہ کر کے سر جھکا کر اطمینان سے پڑھے۔ اور اگر تلاوت کرتے وقت مسواک وغیرہ سے منہ کو خوب صاف کر لے۔ اور خوشبو بھی لگا لے تو بہت ہی اچھا ہے۔ کیونکہ جتنا ادب زیادہ اتنا ہی فیض زیادہ۔ تلاوت سے پہلے اَعُوْذُ بِاللهِ اور بِسْمِ اللهِ بھی پڑھے۔ اور تلاوت کی حالت میں کسی سے بلا ضرورت بات کرنا مکروہ ہے۔ سیدنا عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما تلاوت کے دوران میں کسی سے کلام نہ فرماتے تھے اور اگر کلام کرنا پڑ جائے۔ تو کلام کے

دوران میں قرآن شریف بند رکھے۔ اور پھر بسم اللہ پڑھ کر شروع کرے **مسئلہ** جنبی حیض و نفاس والی عورتیں اور شرابی جس کا منہ شراب سے ناپاک ہو۔ اور وہ شخص جس نے کوئی گندی اور ناپاک چیز کھائی ہو۔ ان سب کو تلاوت قرآن مجید جائز نہیں **مسئلہ** جنبی اور حیض و نفاس والی عورتوں کو قرآن پاک کا چھونا بھی جائز نہیں۔ اگر چھونا پڑ جائے۔ تو کسی علیحدہ کپڑے سے چھوئیں۔ یونہی بے وضو آدمی بھی بغیر کپڑے قرآن پاک کو نہ چھوئے۔ فرق یہ ہے۔ کہ بے وضو اپنے کرتے کے دامن سے بھی پکڑ سکتا ہے۔ اور وہ لوگ علیحدہ کپڑے سے پکڑیں۔

**ختم قرآن پاک** بہتر یہ ہے۔ کہ جس دن قرآن پاک ختم کرے۔ اس دن اپنے گھر والوں اور دوستوں کو جمع کرے۔ سیدنا حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ختم قرآن کے وقت اپنے اہل قرابت کو جمع فرماتے اور دعا کرتے تھے۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں۔ کہ اس وقت رحمت الٰہی نازل ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ اس وقت دعا قبول ہوتی ہے۔ بعض روایتوں میں ہے۔ کہ جو قرآن پاک پڑھ کر حق تعالیٰ کی حمد کرے اور درود پڑھے۔ اور اپنے گناہوں کی معافی چاہے تو رحمت الٰہی اس کو تلاش کرتی ہے۔ تلاوت کرنے والے کو چاہیئے۔ کہ قرآن پاک ختم کرتے ہی دوسری دفعہ اس کو شروع کر دے یعنی سورہ فاتحہ پڑھ کر سورہ بقر مفلحون تک پڑھ لے پھر دعا مانگے **مسئلہ** حافظ تراویح میں جب قرآن پاک پڑھے تو ایک بار کسی نہ کسی جگہ بسم اللہ شریف بلند آواز سے ضرور پڑھے۔ کیونکہ یہ بھی قرآن پاک کی آیت ہے۔ اور مستحب یہ ہے۔ کہ ہر نمازی نماز میں جب کوئی سورت شروع کرے۔ تو آہستہ سے بسم اللہ پڑھ لیا کرے۔ سوائے سورہ توبہ کے اسکی پوری بحث تفسیر خزائن العرفان کے مقدمے میں دیکھو۔ **تتمہ** قرآن پاک کا چھوٹی تقطیع پر یا تعویذی طرح چھاپنا مکروہ ہے۔ چاہیئے یہ کہ بڑی تقطیع پر چھاپا جائے۔ حروف خوب کھلے ہوئے ہوں۔ اور اس کے رکوع اور آیتوں اور منزلوں کو دیدہ زیب بنانا مستحب ہے۔ کیونکہ اس میں قرآن پاک کی عظمت کا اظہار ہے۔ قرآن پاک اتنی جلدی پڑھنا۔ کہ جس سے بجز تعلمون اور یعلمون کچھ سمجھ میں نہ آئے یعنی حروف کی ادائیگی پوری طرح نہ ہو سخت برا ہے۔ حافظوں کو اس کا بہت لحاظ چاہیئے **مسئلہ** جس جگہ سب لوگ اپنے کاروبار میں مشغول ہوں وہاں قرآن پاک بلند آواز سے پڑھنا منع ہے۔ یا تو تنہائی میں بلند آواز سے پڑھو۔ یا وہاں جہاں کم سے کم ایک آدمی سننے والا ہو۔ کیونکہ اس کا سننا فرض کفایہ ہے **مسئلہ** چند شخصوں کا بیک وقت بلند آواز سے تلاوت کرنا منع ہے۔ یا تو ایک پڑھے اور باقی سب سنیں۔ یا سب آہستہ پڑھیں۔ (تیجے اور ختم والوں کو اس کا خاص خیال چاہیئے) مکتبوں اور مدرسوں میں جو بچے مل کر پڑھتے ہیں۔ یہ مجبوری کی وجہ سے ہے **مسئلہ** قرآن پاک کو خلاف ترتیب الٹا پڑھنا منع ہے۔ ہاں اگر خارج نماز درمیان میں ٹھیرتا جائے جس سے الگ الگ قرائتیں معلوم ہوں۔ تو کوئی مضائقہ نہیں (شامی) اور ترتیب کے مطابق جگہ جگہ سے آیتوں کا پڑھنا جائز ہے جیسے کہ فاتحہ اور ختم کے وقت کیا جاتا ہے۔

## ساتویں فصل تفسیر کے معنے اور اس کی تحقیق

لفظ تفسیر فسر سے مشتق ہے جس کے معنے ہیں کھولنا۔ محاورے میں تفسیر یہ ہے۔ کہ کلام کرنے والے کا مقصد اس طرح بیان کرنا جس میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔ اور مفسرین کی اصطلاح میں تفسیر یہ ہے۔ کہ قرآن پاک کے وہ احوال بیان کرنا جس میں عقل کو دخل نہ ہو۔ بلکہ نقل کی ضرورت ہو جیسے آیات کا شان نزول یا ان کا ناسخ اور منسوخ ہونا وغیرہ تفسیر بالرائے حرام ہے کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہے۔ اور ٹھیک بھی کہہ جائے۔ جب بھی خطا کار ہے۔ تفسیر قرآن کے چند مرتبے ہیں۔ (۱) تفسیر قرآن بالقرآن یہ سب سے مقدم ہے (۲) تفسیر قرآن بالحدیث۔ کیونکہ حضور صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صاحب قرآن ہیں۔ ان کی تفسیر نہایت صحیح اور اعلیٰ (۳) قرآن کی تفسیر صحابہ کرام خصوصاً فقہائے صحابہ اور خلفائے راشدین کے اقوال سے (۴) تفسیر قرآن تابعین یا تبع تابعین کے قول سے اگر روایت سے ہے۔ تو معتبر۔ اس کی زائد تحقیق کے لئے ہماری کتاب "جاء الحق" یا کتاب "اعلائے کلمۃ اللہ" مصنفہ قطب الوقت حضرت شاہ قبلہ مہر علی شاہ صاحب کا مطالعہ کرو۔ لفظ تاویل اول سے مشتق ہے۔ اس کے معنے ہیں رجوع کرنا۔ اصطلاح میں تاویل یہ ہے کہ کسی کلام میں چند احتمال ہوں۔ ان میں سے کسی

احتمال کو قرینوں اور علمی دلائل سے ترجیح دینا۔ یا کلام میں علمی نکات وغیرہ بیان کرنا۔ اس کے لئے نقل کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ہر عالم اپنی قوت علمی سے قرآن پاک میں نکات وغیرہ نکال سکتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے۔ کہ خلاف شریعت ہرگز نہ ہو۔ اسی لئے مفسرین اپنی قوت علمی سے قرآن پاک میں بڑے بڑے نکات بیان فرماتے ہیں۔ اور ہر ایک کے متعلق نقل پیش نہیں فرماتے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے احیاء العلوم شریف باب ہشتم میں فرمایا۔ کہ قرآن پاک کے ایک ظاہری معنے ہیں۔ اور ایک باطنی۔ ظاہری معنے کی تحقیق علماء شریعت فرماتے ہیں۔ اور باطنی کی صوفیائے کرام۔ حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ اگر میں چاہوں تو سورہ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹ بھر دوں۔ مگر یہ باطنی تفسیر ظاہری معنے کے خلاف ہرگز نہ ہوگی۔ **تحریف** مشتق ہے حرف سے جس کے معنے ہیں علیحدگی یا کنارہ۔ اصطلاح میں تحریف یہ ہے۔ کہ کلام کا مطلب ایسا بیان کیا جائے۔ جو کلام کرنے والے کے مقصد کے خلاف ہو۔ مفسرین کی اصطلاح میں تحریف دو طرح کی ہے۔ **تحریف لفظی یا تحریف معنوی**۔ **تحریف لفظی** یہ ہے۔ کہ قرآن پاک کی عبارت کو دیدہ دانستہ بدل دیا جائے جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی اپنی کتابوں میں کیا۔ **تحریف معنوی** یہ ہے۔ کہ قرآن پاک کے ایسے معنے اور مطلب بیان کئے جائیں۔ جو کہ اجماع امت یا عقیدۂ اسلامیہ یا اجماع مفسرین یا تفسیر قرآن کے خلاف ہوں۔ اور وہ یہ کہے۔ کہ آیت کے وہ معنے نہیں۔ بلکہ یہ ہیں جو میں بیان کر رہا ہوں جیسا کہ اس زمانہ میں چکڑالوی۔ قادیانی اور دیوبندی وغیرہ کر رہے ہیں۔ دونوں قسم کی تحریفیں کفر ہیں **مفسر** وہ شخص ہو سکتا ہے (۱) جو کہ قرآن کے مقصد کو پہچان سکے۔ (۲) ناسخ اور منسوخ کی پوری خبر رکھتا ہو۔ (۳) آیات اور احادیث میں مطابقت کرنے پر قادر ہو یعنی جن آیتوں کا آپس میں مقابلہ معلوم ہوتا ہو۔ یا جو آیات کہ احادیث کے خلاف معلوم ہوتی ہوں۔ ان کی ایسی توجیہ کر سکے۔ کہ جس سے مخالفت اٹھ جائے (۴) آیتوں کے شان نزول سے باخبر ہو (۵) آیتوں کی توجیہ کر سکے یعنی جو قرآن پاک کی آیتیں عقل کی رو سے محال معلوم ہوتی ہوں ان کو حل کر سکے مثلاً قرآن پاک میں آتا ہے۔ کہ حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے لوگوں نے کہا یَاۤ اُخْتَ هٰرُوْنَ۔ حالانکہ ہارون علیہ السلام (موسےٰ علیہ السلام کے بھائی) اور حضرت مریم میں سینکڑوں برس کا فاصلہ ہے۔ تو پھر حضرت مریم ان کی بہن کیسے ہو سکتی ہیں اسی طرح قرآن کریم فرماتا ہے۔ کہ سکندر ذوالقرنین نے آفتاب کو کیچڑ میں ڈوبتا ہوا پایا۔ حالانکہ آفتاب ڈوبتے وقت زمین پر نہیں آتا۔ اور نہ کیچڑ اونچی ہو کر آفتاب تک پہنچتی ہے۔ ان جیسی آیات کی توجیہیں کر سکے۔ (۶) آیات میں محذوفات نکالنے پر قدرت رکھتا ہو۔ یعنی بعض جگہ آیات میں پوری کی پوری عبارتیں محذوف ہیں۔ ان کے بغیر نکالے ہوئے آیت کا ترجمہ درست نہیں ہوتا۔ (۷) عرب کے محاورے سے پورے طور پر واقف ہو قرآن پاک نے بہت جگہ وہاں کے خاص محاورے استعمال فرمائے ہیں۔ جیسے کہ تَبَّتْ یَدَاۤ اَبِیْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ یعنی ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں یا کہ فَمَا بَكَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ۔ کہ کفار کے مرنے پر آسمان اور زمین نہ روئے یا ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ یعنی کفار سے جہنم میں کہا جائے گا۔ تو یہ عذاب چکھ تو بڑا عزت اور کرم والا ہے۔ وغیرہ وغیرہ ان جیسی آیات کے مقصود کو پہچان سکے۔ اور معلوم کر سکے۔ کہ اس جگہ کس قسم کا محاورہ استعمال ہوا ہے۔ (۸) محکم اور متشابہ آیت کو پہچانتا ہو (۹) قرأتوں کے اختلاف سے واقف ہو (۱۰) مکی اور مدنی آیتوں کو جانتا ہو وغیرہ وغیرہ جب اتنی صفتیں موجود ہوں۔ تو تفسیر کرنے کی ہمت کرے اس کی زیادہ تحقیق مقصود ہو۔ تو دیکھو تفسیر فتح المنان کا مقدمہ۔ مگر افسوس ہے۔ کہ اس زمانہ پر فتن میں تفسیر قرآن کو جتنا آسان سمجھا گیا ہے۔ اتنا آسان اور کوئی کام نہیں سمجھا گیا حقتعالیٰ اس زمانہ کے فتنوں سے بچائے فقیر حقیر پر تقصیر احمد یار اپنے قصور علم کا اقرار کرتے ہوئے محض اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھروسے پر اس کام کو شروع کرتا ہے۔ اور اس دریاء ناپید اکنار میں غوطہ لگاتا ہے۔ اور بارگاہ الٰہی میں دعا کرتا ہے۔ کہ حق بات قلم سے نکلوائے اور اسے قبول فرما کر میرے لئے صدقہ جاریہ اور توشہ آخرت بنائے۔ اور جن حضرات نے کہ اس کام میں دامے درمے قدمے قلمے سخنے مدد کی انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ احمد یار خاں نعیمی اشرفی مدرس مدرسہ خدام الصوفیہ گجرات ۱۵ ربیع الآخر ۱۳۶۳ ہجری یوم دوشنبہ مبارکہ

# اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝

| پناہ پکڑتا ہوں | ساتھ اللہ کے | سے | شیطان | نکالا ہوا |
|---|---|---|---|---|
| میں نکالے ہوئے شیطان سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں | | | | |

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کے متعلق چند باتیں غور کے قابل ہیں (۱) تلاوت سے پیشتر اس کو کیوں پڑھتے ہیں (۲) اس کی تفسیر کیا ہے (۳) اس میں نکات کیا ہیں۔ (۴) اس کے فوائد کیا ہیں۔ (۵) اس کے متعلق مسائل کیا ہیں۔ (پہلی بحث۔ پڑھنے کی وجہ) رب تعالیٰ کا حکم ہے۔ فَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ جب تم قرآن پڑھنے لگو۔ تو نکالے ہوئے شیطان سے اللہ کی پناہ لو۔ معلوم ہوا۔ کہ قرآن پاک پڑھتے وقت اَعُوْذُ بِاللّٰہِ پڑھنا حکم الٰہی ہے۔ ۲۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ساری امت ہمیشہ اس پر عمل کرتی رہی معلوم ہوا۔ کہ یہ پڑھنا سنت ہے۔ ۳۔ نیز جس طرح کہ نماز سے پہلے وضو ضروری ہے۔ کیونکہ وہ جسمانی پلیدی کو دور کرتا اور انسان کو قابل نماز بناتا ہے۔ اسی طرح تلاوت سے پیشتر اعوذ پڑھنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ اندرونی پلیدی کو دور کرتا ہے۔ اور زبان کو قرآن پاک کی تلاوت کے قابل بناتا ہے ۴۔ نیز جو شخص بادشاہ کے دروازے پر حاضر ہو۔ وہ بغیر اجازت اندر نہیں جا سکتا۔ یونہی جو بارگاہ الٰہی میں حاضر ہو۔ وہ بغیر اَعُوْذُ پڑھے کچھ عرض نہ کرے۔ گویا اعوذ باللہ پڑھنا رب تعالیٰ سے تلاوت کی اجازت لینا ہے۔ ۵۔ نیز حاضری بارگاہ کے وقت درباری لباس جسم پر ہوتا ہے۔ یہ بارگاہ الٰہی میں حاضری کے وقت گویا قلب وزبان کا لباس ہے۔

## اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کی تفسیر

لفظ اَعُوْذُ عَوْذٌ سے مشتق ہے۔ اور عَوْذٌ کے دو معنے ہیں (۱) التجا کرنا۔ پناہ پکڑنا (۲) ملنا پہلے معنے کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ میں پناہ پکڑتا ہوں۔ اور التجا کرتا ہوں اللہ سے۔ اور دوسرے معنے کی بنا پر مطلب یہ ہوگا۔ کہ میں اپنے نفس کو اللہ (فضل الٰہی ورحمت الٰہی) کے ساتھ ملاتا ہوں۔ لفظ اَللّٰہ کی تفسیر انشاء اللہ بِسْمِ اللّٰہِ میں بیان کی جائے گی۔ لفظ شَیْطٰن میں دو قول ہیں (۱) بعض کہتے ہیں کہ یہ شطنٌ سے مشتق ہے اور (۲) بعض کے قول کی بنا پر شَیَطٌ سے شَطنٌ کے معنے ہیں۔ دور ہونا۔ اور چونکہ ابلیس بھی مقرب بارگاہ الٰہی ہو کر وہاں سے دور ہوا۔ اس لئے اس کو شیطان کہا جاتا ہے۔ اور شَیَطٌ کے معنے ہے ہلاک ہونا۔ یا باطل ہونا۔ اور چونکہ ابلیس بھی سرکشی کی وجہ سے ہلاک ہوا۔ اور اس کا سارا پچھلا کیا دھرا باطل ہو گیا اس لئے اس کو شیطان کہتے ہیں۔ لفظ رَجِیْم مرجوم کے معنے میں ہے۔ اور مرجوم رجم سے بنا ہے۔ اور رجم کے معنے نکالنے کے بھی ہیں۔ اور پھینک کر مارنے کے بھی۔ اور یہ لعنت (دور کرنا) کے معنے میں بھی آتا ہے۔ اگر پہلے معنے کئے جائیں۔ تو چونکہ شیطان پہلے ملائکہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اور وہاں سے اس کو نکالا گیا۔ اور فرمایا فَاخْرُجْ مِنْهَا اس لئے اسے رجیم کہا جاتا ہے۔ دوسرے معنے کی بنا پر یہ توجیہ ہو گی۔ کہ اب بھی جب کبھی یہ آسمان پر جانے کی کوشش کرتا ہے۔ تو اس کو شہاب (ٹوٹا ہوا تارہ) پھینک کر مارا جاتا ہے۔ لہذا یہ مرجوم ہوا۔ تیسرے معنے کی بنا پر توجیہ یہ ہو گی۔ کہ اس پر ہمیشہ حق تعالیٰ اور فرشتوں اور انسانوں کی طرف سے لعنت پڑتی ہی رہتی ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنَّ عَلَیْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ اور تجھ پر قیامت تک لعنت ہے۔ عالمانہ تفسیر اس کی یہ ہوگی۔ کہ دینی اور دینی آفتیں بے انتہا ہیں۔ اور ہماری طاقت اور قدرت ان کو دور نہیں کر سکتی۔ کیونکہ ہم کمزور ہیں۔ اور جب کمزور شخص کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائے۔ تو اس کو ضروری ہوتا ہے۔ کہ وہ کسی قوت والے کی پناہ لے اور اس کی امن میں آئے۔ اور جتنی بڑی آفت ہو۔ اتنی ہی بڑی قومی ذات کے ساتھ پناہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ معمولی دشمنوں کو دفع کرنے کے لئے تھانیدار یا پولیس کی پناہ کافی ہوتی ہے۔ اور بڑی مصیبت دفع کرنے کے لئے کپتان پولیس ڈپٹی کمشنر گورنر۔ وائسرائے۔ بلکہ بعض صورتوں میں بادشاہ کی پناہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ چونکہ شیطان نہایت

قوی دشمن ہے اور اس کے مکر و فریب غیر متناہی ہیں۔ اتنے بڑے دشمن اور اتنی مصیبتوں سے بچنے کے لئے اس ذات کی پناہ لینا ضروری ہے۔ جو قادر مطلق اور حیّ و قیّوم ہے۔ اسی لئے انسان سے کہلوایا گیا۔ کہ اے بندے یہ کہہ کر تو میری پناہ میں آ کہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○ پھر پُر لطف بات یہ ہے۔ کہ یہاں یہ نہ کہا گیا۔ کہ شیطان کے کس دھوکے سے پناہ مانگتا ہوں جس میں اشارہ اس جانب ہے۔ کہ اس کے سارے وسوسوں اور ساری خباثتوں سے پناہ مانگتا ہوں۔ تو گویا بُرے عقائد سے اللہ کی پناہ بُرے اعمال سے اللہ کی پناہ۔ اچھے کام سے باز رہنے سے اللہ کی پناہ اندرونی اور بیرونی روکاوٹوں سے اللہ کی پناہ غرض جو چیز اللہ سے روکے اسی سے اللہ کی پناہ۔ اس کی صوفیانہ تفسیر یہ ہوگی۔ کہ جو چیز بھی سرکش ہو۔ اور ہم کو ذکر الٰہی سے روکے وہ شیطان ہے خواہ وہ جن ہو یا انسان ہو۔ کوئی چوپایہ ہو یا موذی جانور ہو۔ خواہ ہمارا نفس ہو یا جسمانی اور نفسانی عوارض یا کوئی دنیوی کام اسی لئے قرآن کریم فرماتا ہے۔ شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ اور ایک جگہ فرماتا ہے مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں ایک خچر حاضر کیا گیا۔ جب آپ اس پر سوار ہوئے تو وہ اچھلنے کودنے لگا۔ اس کو بہت کچھ مارا مگر وہ اسیطرح اچھلتا کودتا رہا۔ حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس پر سے یہ کہہ کر اتر آئے۔ کہ یہ شیطان ہے مثنوی شریف میں ہے۔ کہ ؎

نفس ما ہم کمتر از فرعون نیست ایک او را عون ما را عون نیست

اس تقدیر پر الشَّیْطَان میں "الف لام" جنسی ہے۔ اور مقصود اس کا یہ ہے۔ کہ میں مطلقاً ہر شیطان کے ہر فریب سے اللہ کی پناہ لیتا ہوں۔ اس میں اشارہ اس جانب ہے۔ کہ ہم نہایت کمزور ہیں اور بڑے بڑے قوی دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ نفس، شہوت، غصہ، حرص، حسد، ہوس، طمع وغیرہ اندرونی دشمن ہیں۔ جو ہر وقت ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔ اور بُرے ساتھی، دنیوی ضروریات اور ہر عضو کی غلط خواہشیں مثلاً آنکھ سے حرام چیز دیکھنے کی خواہش۔ کان سے حرام چیز سننے کی خواہش ہاتھ سے حرام کام کرنے کی خواہش پیر سے حرام کی طرف جانے کی خواہش یہ تمام خارجی دشمن ہیں۔ تو ایک انسان ضعیف البنیان اور اس کے پیچھے اتنے خطرناک شیطان۔ اس اپنی بے بسی اور بے کسی کو دیکھ کر انسان عرض کرتا ہے۔ کہ اے اللہ تیری پناہ۔ کامل اعوذ یہ ہے۔ کہ بندہ عمل و قول دونوں سے ادا کرے۔ یعنی زبان سے اعوذ باللہ پڑھے اور عملی طور پر بُرے یاروں اور شیطانی کاموں سے بچے۔ جو شخص کہ زبان سے اعوذ باللہ پڑھا کرے۔ مگر بُرے آدمیوں اور بُرے کاموں سے نہ بچے۔ اُس کا اعوذ پڑھنا ناقص ہے۔ **نکتہ** کسی مصیبت میں (دینی یا دنیوی) نبی یا ولی یا مرشد یا دنیوی حاکم کی پناہ پکڑنا۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کے خلاف نہیں۔ کیونکہ انکی پناہ حقیقت میں رب کی ہی پناہ ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے۔ کہ ان کی بارگاہوں میں جانے والا رب سے پھر گیا۔ دیکھو رازق اور مددگار رب ہی ہے۔ لیکن پھر بھی رزق تلاش کرنے کے لئے مالداروں اور بادشاہوں کی نوکری کرتے ہیں۔ پھر وہاں سے روپیہ حاصل کر کے بہت سی دوکانوں پر جاتے ہیں کہیں سے خوراک کہیں سے پوشاک وغیرہ حاصل کرتے ہیں۔ تو اسکا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم نے خدا کو چھوڑ کر انکو رازق سمجھ لیا بلکہ خدا ہی کا رزق تلاش کرنے اسی کے حکم سے ان جگہوں پر جاتے ہیں یہ اسکے رزق کے دروازے ہیں اسیطرح شیطان سے بچنے کیلئے پیر کے پاس جانا۔ بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہونا نبی کے دامن میں چھپنا یہ سب اس اَعُوْذُ بِاللّٰہِ پر ہی عمل ہے۔ مثنوی شریف میں ہے۔ کہ ؎

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر ٭ ہست بس پُر آفت و خوف و خطر

**دوسری بات** یہ بھی ہے۔ کہ اللہ کی پناہ میں انسان جب آسکتا ہے جب کوئی اس پناہ میں لانے والا ہو۔ جج کی پناہ میں وہ شخص آئے گا جس کو وکیل یا مختار اس کی پناہ تک پہنچا دے۔ تو انبیاء کرام اور اولیاء عظام کے پاس آنا حقیقت میں اللہ کی پناہ میں آنے کا ذریعہ ہے انشاء اللہ تعالیٰ اس کی پوری بحث اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ اور جَاءُوْکَ کے تحت میں آئے گی (اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کے الفاظ) امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمتہ اللہ علیہما کے نزدیک اعوذ باللہ کے یہ الفاظ ہونے چاہئیں کہ۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○ کیونکہ قرآن پاک میں انہی الفاظ کے ساتھ حکم دیا گیا ہے۔ لیکن امام احمد رحمتہ اللہ علیہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ کہ اس طرح پڑھنا بہتر ہے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○ امام ثوری اور امام اوزاعی فرماتے ہیں۔ کہ اس طرح پڑھے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اور بعض روایتوں میں آتا ہے۔ کہ حضرت جبریل نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا آپ اس طرح پڑھیے اَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ لیکن حنفیوں کو چاہیئے کہ پہلی اعوذ پڑھا کریں۔

**اَعُوْذُ بِاللّٰهِ کے نکتے۔** اعوذ باللہ پڑھنے میں چند نکتے ہیں۔ **پہلا نکتہ** اعوذ باللہ پڑھنا گویا خلق سے خالق کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اور یہ تصوف کی پہلی سیڑھی ہے۔ **دوسرا نکتہ** اعوذ پڑھنے میں اپنی مجبوری اور بے بسی اور رب تعالیٰ کی قدرت کا اقرار ہے۔ اور یہ نفس کے پہچاننے کی پہلی منزل ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ **تیسرا نکتہ** شیطان انسان کا دشمن ہے۔ اور رب تعالیٰ انسان کا مولیٰ ہے۔ مولیٰ کے پاس حاضری دینے میں دشمن راستہ قطع کرتا ہے۔ تو انسان پکار کر عرض کرتا ہے۔ کہ اے مولیٰ تو ہی مجھے شیطان سے بچالے۔ اور اپنی بارگاہ میں حاضر فرمالے۔ اور انسان تصوف کی منزل جب ہی طے کر سکتا ہے۔ جب ادھر سے طلب ہو۔ **چوتھا نکتہ** قرآن کریم فرماتا ہے۔ کہ "قرآن کو نہ چھوئیں مگر پاک لوگ" تو قرآن پاک کی جلد کو پاک ہاتھ چھوئے اور قرآن پاک کی عبارت کو پاک زبان چھوئے اور قرآن پاک کے مضامین کو پاک دل چھوئے اور اعوذ زبان و دل کی طہارت ہے۔ شرک کرنے والا گویا قلبی جنبی ہے۔ اور گنہگار گویا قلبی بے وضو ہے۔ اور اَعُوْذُ آب رحمت کا دریا ہے۔ کوئی بھی اس میں آکر غوطہ لگائے پاک ہو جائے گا۔ **پانچواں نکتہ** مومن کا دل حق تعالیٰ کا تجلی گاہ ہے حق تعالیٰ کا باغ۔ اور اس کا تخت ہے جیسا حدیث قدسی میں آیا ہے۔ اور جنت ہمارا باغ ہے حق تعالیٰ نے جنت سے ہماری وجہ سے شیطان کو نکالا۔ اور فرمایا "اُخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا" لہٰذا ہم کو لازم ہے۔ کہ حق تعالیٰ کے باغ یعنی اپنے دل سے اس کے لئے شیطان کو نکالیں۔ کیونکہ میزبان کے لئے ضروری ہے۔ کہ مہمان کی خاطر گھر صاف کرے۔ مگر چونکہ ہم اس کے نکالنے پر مستقل قادر نہ تھے۔ تو اس میں اسی کی امداد لی اور پڑھا اَعُوْذُ بِاللّٰهِ **چھٹا نکتہ** رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ بارگاہ الٰہی میں پاک کلمے قبول ہوتے ہیں۔ قرآن پاک کی ساری عبارت فی نفسہ پاک ہے۔ لیکن اگر پڑھنے والا پاک نہ ہو۔ تو اس کی گندگی کی وجہ سے یہ پڑھنا بارگاہ الٰہی میں قبول نہ ہوگا۔ تو انسان اعوذ سے اپنے کو پاک کر کے اس تلاوت کو قابل قبول بناتا ہے۔ اگر زیادہ تفصیل دیکھنا ہو۔ تو "بستان التفاسیر" اور "تفسیر کبیر" اور "روح البیان" وغیرہ کا مطالعہ کرو۔

**(اَعُوْذُ بِاللّٰهِ کے فضائل و فوائد)**

**پہلی فضیلت** تقریباً تمام انبیاء اور اولیاء نے مختلف عبارتوں سے اَعُوْذُ باللہ پڑھی ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا۔ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْاَلَكَ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا سے ارشاد فرمایا مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اور اپنے بھائیوں سے فرمایا۔ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا الخ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ اور فرمایا اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ۔ حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی والدہ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا۔ اِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ اور حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت جبریل امین کو مرد کی شکل میں دیکھ کر فرمایا۔ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ الخ ہمارے حضور علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے بار بار اعوذ پڑھنے کا حکم دیا۔ کہیں فرمایا قُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ الخ اور کہیں فرمایا۔ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ کہیں فرمایا۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور کہیں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ وغیرہ وغیرہ۔ ان آیات سے معلوم ہوا۔ کہ انبیاء کرام نے ہر مصیبت کے موقعہ پر اعوذ باللہ پڑھی ہے۔ **"دوسری فضیلت"** احادیث شریفہ بھی اس بارے میں بہت وارد ہیں۔ چنانچہ ایک شخص پر غصہ بہت غالب تھا۔ اور منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اگر یہ شخص اَعُوْذُ باللہ پڑھ لے تو اس کی یہ حالت دور ہو جائے۔ معلوم ہوا۔ کہ اَعُوْذُ باللہ پڑھنے سے غصہ دور ہوتا ہے۔ جو ہزارہا گناہوں کی جڑ ہے۔ "بستان التفاسیر" میں ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ جو شخص روزانہ دس بار اَعُوْذُ باللہ پڑھ لیا کرے حق تعالیٰ اس پر ایک فرشتہ مقرر فرما دیتا ہے جو کہ اس کو شیطان سے بچاتا ہے۔ "تفسیر

روح البیان شریف نے اسی اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کی تفسیر میں فرمایا۔ کہ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ جو حضور قلب کے ساتھ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ پڑھے تو رب تعالیٰ اس کے اور شیطان کے درمیان تین سو پردے حائل کر دیتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اَعُوْذُ کو مختلف عبارتوں کے ساتھ بہت سے فائدوں کے لئے بہت دعاؤں میں وارد فرمایا ہے۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں اِسْتِعَاذَہ (اعوذ پڑھنا) کا ایک باب باندھا ہے۔ چنانچہ جو شخص صبح و شام یہ پڑھے "اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ" تو انشاء اللہ تعالیٰ زہریلی چیزوں سے محفوظ رہے گا۔ نیز نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم امام حسن اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے لئے یہ دعا پڑھتے تھے۔ "اُعِيْذُكُمَا بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ وَمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَّامَّةٍ" اور فرماتے تھے۔ کہ میرے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے فرزندوں اسمٰعیل و اسحاق علیہ السلام کو اس دعا سے تعویذ فرماتے تھے۔ (بستان التفاسیر) اس سے معلوم ہوا۔ کہ اگر بچوں کو اس دعا کا تعویذ پہنایا جائے۔ یا اس دعا سے دم کیا جائے۔ تو انشاء اللہ وہ بچے ہر بلا سے محفوظ رہیں گے۔ مشکوٰۃ شریف کے اسی باب میں ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ پڑھا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْهَمِّ وَالْحُزْنِ وَالْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَضَلَعِ الدَّيْنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ" اس کا پڑھنے والا انشاء اللہ دینوی رنج اور غم مجبوری اور بزدلی اور قرض اور دشمنوں کے غلبے سے محفوظ رہے گا۔ نیز حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ پڑھا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبَرَصِ وَالْجُذَامِ وَالْجُنُوْنِ وَمِنْ سَيِّئِ الْاَسْقَامِ" انشاء اللہ تعالیٰ اس کا پڑھنے والا جذام اور دیوانگی اور بُری بیماریوں سے محفوظ رہے گا۔ مشکوٰۃ شریف کے اسی باب میں ہے۔ کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ جو شخص سو کر اُٹھے تو یہ پڑھ لیا کرے۔ "اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ غَضَبِهٖ وَعِقَابِهٖ وَشَرِّ عِبَادِهٖ وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِيْنِ وَاَنْ يَّحْضُرُوْنِ" سیدنا عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنے سمجھ دار بچوں کو یہ دعا حفظ کرا دیتے تھے۔ اور نابالغ بچوں کے گلے میں اس کا تعویذ بنا کر ڈال دیتے تھے۔ تعویذ لکھنے اور گلے میں ڈالنے کا ثبوت ہوا۔ اس کی پابندی کرنے والا انشاء اللہ تعالیٰ جنات اور انسانوں کی شرارت اور رب تعالیٰ کے غضب سے محفوظ رہے گا۔ غرض کہ اَعُوْذُ بہت سی دعاؤں میں کام آتا ہے۔ اگر اس کی زیادہ تحقیق منظور ہو۔ تو مشکوٰۃ شریف کا باب الاستعاذہ مطالعہ کرو۔

**(اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کے متعلق فقہی مسائل)** تلاوت قرآن کرنے والے کے لئے تلاوت سے پہلے اَعوذ باللہ پڑھنا سنت ہے۔ اس طرح کہ اوّل اعوذ باللہ پڑھے پھر بسم اللہ۔ **مسئلہ** مقتدی اعوذ نہ پڑھے گا۔ کیونکہ وہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرے گا۔ **مسئلہ** اُستاد کو قرآن سنانے والے کیلئے اعوذ پڑھنا سنت نہیں کیونکہ وہ تلاوت نہیں کر رہا۔ بلکہ قرآن سیکھ رہا ہے۔ **مسئلہ** عید کی نماز میں امام پہلی تکبیر کے بعد فقط سُبحانَ پڑھے۔ اور چوتھی تکبیر کے بعد اعوذ باللہ پڑھ کر قرأت شروع کرے۔ کیونکہ یہی وقت قرأت کا ہے۔ **مسئلہ** بعض لوگوں کے نزدیک تلاوت کے وقت اعوذ باللہ پڑھنا واجب ہے۔ اور بعض کے نزدیک تلاوت کے بعد پڑھنا واجب ہے۔ وہ لوگ اس آیت کے ظاہری معنے پر عمل کرتے ہیں۔ "فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ" اور کہتے ہیں۔ کہ اس آیت میں قرآن پاک پڑھنے کے بعد اعوذ باللہ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور خدا کے حکم پر عمل کرنا واجب ہے۔ (تفسیر کبیر اَعوذ کی بحث) لیکن صحیح پہلی ہی بات ہے یعنی اعوذ پڑھنا قرآن پاک پڑھنے سے پہلے سنت ہے۔ جیسے قرآن پاک فرماتا ہے۔ کہ "اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ الخ" یعنی جب کھڑے ہو تم نماز کی طرف تو وضو کر لو۔ مطلب یہ نہیں کہ نماز پڑھ کر وضو کرو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس وقت نماز کا ارادہ کرو۔ اور وہی اس جگہ مُراد ہے۔ اسی طرح رب فرماتا ہے۔ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ دیکھو نکاح کرنے کا حکم قرآن پاک میں ہے لیکن بسا اوقات یہ نکاح سنت ہوتا ہے۔ **مسئلہ** بعض روایتوں میں آتا ہے۔ کہ پہلی وحی میں حضرت جبریل امین نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔ کہ آپ اس طرح فرمایئے۔ اَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اِقْرَاْ بِاسْمِ

رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝ اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اعوذ باللہ بھی قرآن پاک کی آیت ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ آیت نہیں بلکہ حضرت جبریل علیہ السلام نے برکت کے واسطے یہ پڑھائی۔ اور آیت قرآن اِقْرَاْ سے شروع ہوئی۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ

| بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ |
|---|
| ساتھ نام اللہ بہت مہربان رحمت والا |
| بہت مہربان رحمت والے اللہ کے نام سے شروع |

بِسْمِ اللّٰہِ کے متعلق چند باتیں عرض کرنی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا تعلق اعوذ باللہ سے کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں نکات کیا ہیں۔ تیسرے اس کے **فضائل و فوائد** کیا ہیں۔ چوتھے اس کے متعلق **فقہی مسائل** (۱) (**تعلق**) بسم اللہ کا اعوذ باللہ سے دو طرح تعلق ہے۔ ایک تو یہ کہ اعوذ باللہ میں ماسویٰ اللہ سے علیحدگی تھی۔ اور بسم اللہ میں اللہ کی طرف توجہ اور ماسویٰ اللہ سے علیحدگی توجہ الی اللہ پر مقدم ہے۔ اس لئے اعوذ باللہ بسم اللہ پر مقدم ہے۔ دوسرے اس طرح کہ اعوذ باللہ میں بُرے عقائد اور بُرے اعمال وغیرہ سے پرہیز ہے۔ اور بسم اللہ میں اچھے عقائد اور اچھے اعمال وغیرہ کو رب سے حاصل کرنا ہے۔ تو گویا وہ پرہیز تھا یہ علاج ہے۔ اور پرہیز علاج پر مقدم ہے۔ پہلے بیماری کو دفع کرو۔ پھر مقویات کا استعمال کرو۔ لہٰذا اعوذ پہلے پڑھو اور بسم اللہ بعد میں (۲) (**بسم اللہ کے نکات**) بسم اللہ میں دو قسم کے نکات ہیں۔ ایک تو خود بسم اللہ کے۔ کہ ہر کام کے شروع میں بسم اللہ کیوں پڑھی جاتی ہے۔ دوسرے بسم اللہ کے الفاظ میں یعنی ب۔ اسم۔ اللہ۔ الرحمٰن۔ الرحیم میں کیا نکات ہیں (**پہلا نکتہ**) کفار عرب اپنے ہر کام کو بتوں کے نام سے شروع کرتے تھے۔ چنانچہ کہا کرتے تھے۔ کہ بِاسْمِ اللَّاتِ وَالْعُزّٰى۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ موحد مسلمان اپنے ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرے۔ تاکہ کفار کی مخالفت ظاہر ہو۔ **فائدہ۔** اس سے معلوم ہوا۔ کہ مسلمان کا ہر عمل کفار کے مخالف چاہیئے۔ ان سے محبت اور مشابہت بہت بری چیز ہے۔ **دوسرا نکتہ** جس کام کی ابتداء اچھی ہو۔ اس کی انتہاء بھی اچھی ہوتی ہے۔ بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کے کان میں اذان کہی جاتی ہے۔ تاکہ اس کی ابتداء اللہ کے نام پر ہو۔ اور اس کی تمام زندگی بخیریت گزرے۔ دکاندار دکان کی پہلی بکری اُدھار سے نہیں کرتا۔ بلکہ نقد پیسے مانگتا ہے۔ تاکہ سارا دن تجارت کے لئے اچھا گزرے اسی طرح مسلمان کو ضروری ہے۔ کہ اپنے ہر کام کی ابتداء اللہ کے نام سے کرے۔ تاکہ بخیر و خوبی انجام کو پہونچے۔ **تیسرا نکتہ** سرکاری مال پر کوئی سرکاری علامت لگا دی جاتی ہے۔ تاکہ چور اس کو لیتے ہوئے خوف کرے۔ اور چرا نہ سکے۔ کیونکہ سرکاری مال کی چوری ایک قسم کی بغاوت ہے۔ اسی طرح مسلمان کو چاہیئے۔ کہ اپنے ہر کام کے اوّل بسم اللہ پڑھ دے۔ تاکہ یہ بسم اللہ رب العالمین کی نشانی بن جائے۔ اور شیطان چور اس میں اپنا دخل نہ دے سکے۔ اور حدیث پاک میں آتا بھی ہے۔ کہ جس کام کے اوّل میں بسم اللہ نہ پڑھی جائے۔ اس میں شیطان شریک ہو جاتا ہے۔ اور بسم اللہ کے پڑھ لینے سے وہ کام شیطان سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کی پوری بحث بسم اللہ کے فوائد میں آئے گی۔ **چوتھا نکتہ** آدمی جس کا ذکر زیادہ کرتا ہے۔ اس کو اسی کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ انسان بسم اللہ زیادہ پڑھے۔ تو انشاء اللہ دونوں جہان میں رحمت الٰہی اس کے ساتھ رہے گی۔ تفسیر کبیر شریف نے بسم اللہ کے ماتحت ایک روایت بیان فرمائی۔ کہ ایک مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنی انگوٹھی عطا فرمائی۔ اور فرمایا۔ کہ اس پر کسی نقاش سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لکھوا دو۔ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقاش کے پاس لے گئے۔ اور فرمایا۔ کہ اس پر لکھ دے۔ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ" نقاش نے یہی لکھ دیا۔ جب وہ انگوٹھی بارگاہ رسالت میں پیش ہوئی۔ تو اس پر لکھا تھا۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اَبُوْبَكْرٍ صِدِّيْقٌ ارشاد فرمایا۔ اے ابوبکر یہ زیادتی کیسی؟ عرض کیا۔ کہ یا رسول اللہ آپ کے نام کو تو میں نے بڑھایا تھا میں نے نہ چاہا۔ کہ رب کے اور آپ کے نام میں جدائی ہو

جائے (یعنی رب کا ذکر ہو اور آپ کا ذکر نہ ہو) لیکن اپنا نام میں نے نہیں بڑھایا. یہ عرض معروض ہو رہی تھی. کہ جبریل امین حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا. کہ یا رسول اللہ صدیق کا نام میں نے لکھا کیونکہ صدیق اس سے راضی نہ ہوئے. کہ آپ کا نام خدا کے نام سے علیحدہ ہو تو خدا تعالٰے اس سے راضی نہ ہؤا. کہ صدیق کا نام آپ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے علیحدہ ہو. خدائے پاک توفیق عطا فرمائے. کہ ہم اس کا ذکر اس کے حبیب علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ کیا کریں. **پانچواں نکتہ** دنیا کے سارے کام حقیقت میں انسان کے لئے زہر قاتل ہیں. کیونکہ یہ ربّ سے غافل کرنیوالے ہیں. اور اس کا تریاق رب کا نام ہے. تو جو انسان رب کے نام سے سارے کام شروع کرے گا. خدا چاہے. تو اس کا کوئی کام غفلت پیدا نہ کریگا. **چھٹا نکتہ** جب کوئی فقیر کسی امیر کے دروازے پر جاتا ہے. تو بھیک مانگنے کی غرض سے اس کی تعریف شروع کر دیتا ہے جس سے کہ امیر سمجھ جائے. کہ یہ بھکاری ہے. میری تعریفیں کر کر کے کچھ مجھ سے مانگنا چاہتا ہے. تو گویا فقیر کا یہ کہنا. کہ گھر والا بڑا سخی داتا ہے مطلب اس کا یہ ہوتا ہے. کہ کچھ دلوا دو. اسی طرح جب انسان کوئی کام شروع کرتا ہے. تو چاہتا ہے کہ ربّ تعالٰی سے اس میں مدد مانگے. اور اس کے پورا کرنے اور درست کرنے کی توفیق مانگے. تو صاف صاف تو نہیں کہتا. رب کی تعریفیں کرتا ہے. اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے. کہ میرے اس نام لینے کی لاج تیرے ہاتھ ہے. تو ہی اس بیڑے کو پار لگانے والا ہے. **فقیر حقیر** احمد یار اپنے رب قدیر کی بارگاہ میں اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ پیش کر کے عرض کرتا ہے. کہ اے مولا! کہاں مجھ جیسا ضعیف البنیان انسان اور کہاں تفسیر قرآن. تیرے ہی نام سے اور تیرے ہی بھروسے پر اس کام کو شروع کیا ہے. تو ہی اس کو درست فرمانے والا ہے اور بخیر وخوبی انجام کو پہنچانے والا ہے. **ساتواں نکتہ** انسان کو چاہیئے. کہ ہر وقت اپنی عاجزی اور کمزوری اور نیازمندی اور رب تعالٰی کی قدرت اور رحمت اور بے نیازی پر نگاہ رکھے. تاکہ بڑے سے بڑا کام کرنے کے بعد بھی اس کے دل میں یہ غرور نہ پیدا ہو. کہ میں نے اتنا بڑا کام کر لیا. بلکہ یہ خیال رہے. کہ جو کچھ کیا رب نے کیا. اس کا فضل تھا. کہ مجھ سے کرا لیا. اور یہ بات جب ہی حاصل ہو گی. جب کہ ہر وقت مولا کی طرف دھیان رہے. لہذا جبکہ ہر کام کے شروع ہی میں بسم اللہ پڑھ لے گا. تو انشاءاللہ کبھی اس میں "میں" نہ پیدا ہو گی. بلکہ "تو ہی تو" میں فنا ہے گا. **بسم اللہ کے حروف کے نکات** بسم اللہ کو ب سے شروع کیا گیا. اور اسم کے الف کو گرا دیا. حالانکہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں اگرچہ الف پڑھنے میں نہیں آتا. مگر لکھنے میں آتا ہے. اس کی کیا وجہ ہے؟ اس میں چند حکمتیں ہیں. **پہلی حکمت** انسان نے عالم ارواح میں پیدا ہو کر سب سے پہلے لفظ بلٰی بولا تھا. یعنی رب نے فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے عرض کیا بلٰی یعنی ہاں. تو سب سے پہلے انسان کے منہ سے ب نکلی. رب تعالٰی نے اپنے کلام کو ب سے شروع فرمایا. تاکہ قرآن پاک پڑھتے ہی وہ عہد و میثاق یاد آجائے **دوسری حکمت** خدا پاک کا نام بَرّ اور بارّ اور باری بھی ہے. اور یہ ب سے شروع ہوتے ہیں. تو گویا اس میں رب تعالٰی کے بہت سارے ناموں کی طرف اشارہ بھی ہو گیا **تیسری حکمت** نحوی قاعدے سے ب ملانے کے لئے آتی ہے. اور قرآن کی تلاوت کرنے والا بھی رب سے ملنا ہی چاہتا ہے. اور الف بے تعلقی چاہتا ہے. اس لئے وصل کی حالت میں گر جاتا ہے. تو یہ چونکہ ملنے کا وقت ہے اس لئے ب سے ابتداء کی جائے **چوتھی حکمت** ب میں انکسار ہے. اور الف میں بلندی ہے. لکھنے میں اور بولنے میں بھی لہذا بندے کے اظہار عاجزی کے لئے ب ہی مناسب ہے. **اِسْم** یہاں بسم اللہ کہا گیا باللہ نہ کہا گیا جس کے معنے یہ ہوتے. کہ اللہ کے نام سے شروع کر رہا ہے. کیونکہ ابھی بندے کی ابتدائی حالت ہے. اولاً نام تک تو پہنچ لے. بعد کو ذات تک پہنچے گا. دوسرا نکتہ یہ ہے. کہ اس میں اس جانب اشارہ ہے. کہ جس طرح اللہ کی ذات سے برکت اور مدد حاصل کی جاتی ہے. اسی طرح اللہ کے نام یعنی لفظ اللہ سے بھی برکت اور مدد حاصل کی جا سکتی ہے. حالانکہ لفظ اللہ رب نہیں یہ تو کچھ حروف کا مجموعہ ہے. جب الف و لام و الف اور ہ سے مدد اور برکت لینا جائز ہے تو اللہ کے پیاروں سے مدد لینا بھی بدرجہ اولٰی جائز ہے. کیونکہ وہ ان حرفوں سے تو کم نہیں **نکتہ** مجھ سے بعض بزرگوں

نے فرمایا کہ اسم اللہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا بھی نام پاک ہے۔ جیسے کہ ذکر اللہ بھی حضور علیہ السلام کا نام ہے۔ دیکھو دلائل الخیرات شریف اور حضور علیہ السلام کو اسم اللہ اس لئے کہتے ہیں کہ اسم وہ ہوتا ہے جو ذات کو بتائے اور ذات پر دلالت کرے۔ اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی اللہ کی ذات کو ظاہر کیا۔ رب تعالیٰ حضور علیہ السلام کا خالق ہے۔ اور حضور علیہ السلام اس کے مظہر اتم ؎

جب محمد ہوئے رسول اللہ تب کھلا لا الٰہ الا اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

نیز بقاعدہ نحوی اسم پر سارے فعل اعتماد کرتے ہیں۔ اور وہ کسی فعل پر اعتماد نہیں کرتا۔ دیکھو مارا کا اعتماد زید پر ہے۔ نہ کہ زید کا اعتماد مارا پر۔ یعنی زید ہو تو "مارا" پایا جائے۔ نہ یہ کہ مارا فعل ہو۔ تو زید پایا جائے۔ اسی طریقے سے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر سارے عالم کا اعتماد ہے۔ بلکہ اعتماد کو بھی آپ پر اعتماد ہے لیکن آپ کو بجز پروردگار کی ذات کے کسی پر اعتماد نہیں نیز بقاعدہ نحوی اسم فعل کا محتاج نہیں۔ بلکہ فعل اسم کا حاجتمند ہے۔ یعنی فعل بغیر اسم کے ملے ہوئے جملہ (پوری بات) نہیں بن سکتا۔ اور اسم بغیر فعل کے جملہ بن سکتا ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم عالم میں کسی کے حاجتمند نہیں۔ بلکہ سارا عالم ان کا محتاج ہے۔ کہ وہ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ بقاعدہ تصوف کہاں کا اسم اور کہاں کا فعل یہ سب اعتبارات ہیں۔ اصل حقیقت محمدیہ ہی ہے۔ یہ سب اس کے پرتو (سائے) ہیں۔ اعلیحضرت نے کیا خوب فرمایا ؎ وہی جلوہ شہر بہ شہر ہے وہی اصل عالم و دہر ہے ٭ وہی بحر ہے وہی لہر ہے وہی پاٹ ہے وہی دھار ہے

پانی ایک ہی ہے۔ مگر الگ الگ اعتبارات سے الگ الگ نام۔ کنارہ۔ دھار۔ پاٹ۔ موج۔ لہر۔ نالہ۔ دریا۔ سمندر۔ پھر فرماتے ہیں ؎ وہ نہ تھا تو باغ میں کچھ نہ تھا وہ نہ ہو تو باغ ہو سب فنا ٭ وہی جان ہے جان سے ہے بقا وہی بن ہے بن ہی سے بار ہے پھر فرماتے ہیں ؎ با ادب جھکا لو سر ولا کہ میں نام لوں گل و باغ کا! گل تر محمد مصطفےٰ چمن ان کا پاک دیار ہے

یہ بہت اچھی تاویل ہے۔ اور کسی قاعدہ شرعیہ کے خلاف نہیں۔ اب آگے جو الرحمٰن اور الرحیم آرہا ہے۔ وہ یا تو اللہ کی صفت ہو۔ یا لغوی معنے میں اسم اللہ کی۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی۔ اور حضور علیہ السلام کو رحیم تو قرآن نے فرمایا ہے۔ رہا لفظ رحمٰن اس کے متعلق گذارش یہ ہے۔ کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدارج میں فرمایا۔ کہ حضور تمام صفات الٰہیہ سے موصوف ہیں۔

نیز قرآن نے فرمایا وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ۝ اللہ۔ تفسیر کبیر کے شروع میں بسم اللہ کے ماتحت ہے۔ کہ حق تعالےٰ کے ایک ہزار (۱۰۰۰) ایک نام ہیں۔ جو کہ قرآن اور حدیث میں موجود ہیں۔ اور تفسیر روح البیان میں الرَّحِيۡمِ کے ماتحت میں ہے۔ کہ حق تعالیٰ کے تین ہزار نام ہیں جن میں سے ایک ہزار کو ملائکہ جانتے ہیں۔ اور ایک ہزار صرف انبیاء کرام اور باقی ایک ہزار میں سے تین سو نام توراۃ شریف میں اور تین سو انجیل میں اور تین سو زبور میں اور ننانوے (۹۹) نام قرآن کریم میں ہیں۔ اور ایک نام وہ ہے جس کو صرف حق تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ لیکن بسم اللہ میں جو حق تعالیٰ کے تین نام آئے ان تین میں ان تین ہزار کے معنے پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا جس نے ان تین ناموں سے حق تعالیٰ کو یاد کر لیا۔ گویا اس نے تمام ناموں سے اس کو یاد کیا۔ ان تمام ناموں میں لفظ اللہ حق تعالیٰ کا ذاتی نام ہے۔ اور باقی اسمائے صفاتیہ۔ ذاتی نام اسے کہتے ہیں۔ جو کہ صرف ذات کو بتائے۔ اور صفاتی نام وہ کہلاتے ہیں۔ جو کہ ذات کے ساتھ صفت کی طرف بھی اشارہ کریں جیسے ایک آدمی کا نام عبداللہ خان ہے لیکن وہ مولوی بھی ہے۔ اس واسطے اسے عالم کہتے ہیں۔ اور چونکہ قرآن پاک بھی اس نے حفظ کیا ہے۔ لہٰذا اسے حافظ بھی کہتے ہیں۔ قرأت بھی سیکھی اس واسطے اس کو قاری بھی کہتے ہیں۔ زمین کا مالک بھی ہے۔ لہٰذا اس کو زمیندار بھی کہتے ہیں تو عبداللہ تو اس کا ذاتی نام ہوا۔ کیونکہ اس نے فقط اس کی ذات کو بتایا علم اور قراءت اور حفظ وغیرہ کی طرف اشارہ نہ کیا۔ اور دوسرے نام اس کے صفاتی نام ہیں۔ اس طرح اللہ فقط اس کی ذات کو بتاتا ہے۔ باقی علیم۔ قدیر۔ رحمٰن اور رحیم وغیرہ اس کی صفات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اسم ذات کی پہچان چند ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ نام نام والے کے ساتھ خاص ہو۔ دوسرے کی اس میں شرکت نہ ہو۔ دیکھو جو بھی علم سیکھ لے اسے عالم اور جو بھی قرآن پاک حفظ

کرے اسے حافظ کہا جائیگا۔ لیکن اس علم اور حفظ کی وجہ سے کسی کو عبد اللہ خاں نہ کہا جائیگا۔ اسی لئے قرآن کریم میں حق تعالیٰ کے بعض صفاتی نام رؤف۔ رحیم وغیرہ غیر اللہ کے لئے بھی استعمال فرمائے گئے ہیں لیکن اللہ کسی کو نہ کہا گیا۔ **دوسرے** یہ کہ اسم ذات کبھی کسی اسم کی صفت بن کر نہیں آتا۔ بلکہ صفتوں کا موصوف بن کر آتا ہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ عبد اللہ خاں، عالم، فاضل، حاجی، قاری ہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ حاجی صاحب عبد اللہ خاں ہیں۔ اسی طرح قرآن پاک میں ہر جگہ لفظ اللہ موصوف بن کر تو آیا مگر کسی اسم کی صفت نہ بنا **تیسری** پہچان یہ ہے۔ کہ اسماء صفات میں زیادتی کمی کا احتمال ہوتا ہے مگر اسم ذات میں یہ احتمال نہیں۔ مثلاً یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ فلاں شخص فلانے سے زیادہ عالم ہے۔ اس سے زیادہ قاری اس سے زیادہ مالدار ہے۔ لیکن یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ اس سے زیادہ عبد اللہ ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ کے دوسرے بعض ناموں میں تفضیل وغیرہ کے صیغے بن سکتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ عالم بھی ہے۔ علّام بھی ہے اور علیم بھی ہے قادر قدیر بھی ہے۔ لیکن لفظ اللہ کی نہ تفضیل بنے نہ مبالغہ اور نہ صفت مشبہ وغیرہ اس فرق کا بہت خیال چاہیئے۔ اس میں **اختلاف** ہے۔ کہ اللہ کسی اور لفظ سے بنا ہے۔ یا نہیں (مشتق ہے یا جامد) **بعض** علماء کرام فرماتے ہیں۔ کہ یہ مشتق ہے۔ اور بعض کہتے ہیں۔ کہ جامد۔ مشتق کہنے والے فیصلہ یقینی نہ کر سکے۔ کہ کس لفظ سے مشتق ہے۔ بعض نے فرمایا۔ کہ اَلۡہٌ سے بنا ہے جس کے معنے ہیں سکون اور چین اور قرار چونکہ حق تعالیٰ کے ذکر سے سب کو چین اور قرار آتا ہے۔ اس لئے اس کا نام اللہ ہے۔ یا اس لئے کہ ہر ممکن چیز واجب پر ختم ہوتی۔ اور قرار پکڑتی ہے۔ تو تمام عالم کے متعلق سوال ہو سکتا ہے۔ کہ اس کو کس نے بنایا لیکن اللہ کے متعلق یہ سوال نہیں ہو سکتا۔ کہ یہ کس سے بنا ہے۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ لفظ وَلۡہٌ سے بنا ہے جس کے معنے ہیں حیرانی چونکہ تمام مخلوق اس کی ذات وصفات میں حیران ہے۔ محرومین تو جہالت کی تاریکیوں میں پھنسے ہیں۔ اور واصلین الی اللہ بجز تجلیات نورانی کچھ نہ پا سکے اور اس کی حقیقت کو نہ پہنچ سکے۔ جیسے کہ آفتاب ؎

حیرت اندر حیرت آمد حیرت اندر حیرت است  هست باحیرت سراپا کار در سرکار ما

**بعض** حضرات فرماتے ہیں۔ کہ یہ لَاہٌ سے مشتق ہے جس کے معنے ہیں بلندی۔ چونکہ حق تعالیٰ کی ذات تمام ممکنات سے بلند و بالا ہے اس لئے اس کو اللہ کہا جاتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ لفظ اللہ اس لَاۓ سے بنا ہے جس کے معنے حجاب کے ہیں (یعنی پردہ) چونکہ حق تعالیٰ کی ذات نظر، خیال، گمان، وہم، عقل سب سے وراء ہے۔ اس لئے اسے اللہ کہتے ہیں شیخ سعدی علیہ الرحمتہ نے فرمایا۔

اے برتر از قیاس و خیال و گمان و وہم  وز ہرچہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

لطف یہ ہے۔ کہ اللہ کی ذات زیادتی ظہور کی وجہ سے چھپ گئی۔ اور کمال نور کی وجہ سے نظر نہ آسکی ؎

بے حجابی یہ کہ ہر ذرّے میں جلوہ آشکار  اس پہ یہ گھونگھٹ کہ صورت آجتک نا دیدہ ہے

**بعض** فرماتے ہیں۔ کہ لفظ اللہ اس اَلۡہٌ سے بنا ہے جس کے معنے ہیں عاجزی و زاری کرنا۔ چونکہ تمام بندے اس کی بارگاہ میں عاجزی اور زاری کرتے ہیں۔ لہٰذا اسے اللہ کہتے ہیں۔ کبھی کبھی انسان اسباب پر نظر کر لیتا ہے لیکن پھر اس کی انتہا مسبّب اسباب پر ہی ہوتی ہے بعض لوگوں نے کہا ہے۔ کہ لفظ اللہ اس اَلۡہٌ سے بنا ہے جس کے معنے ہیں گھبرا کر آنا۔ چونکہ تمام مخلوق ہر مصیبت میں آخر کار رب کی طرف پناہ پکڑتی ہے اس لئے اس کا نام اللہ ہے۔ صاحب تفسیر کبیر نے اسی معنیٰ کے تحت فرمایا۔ کہ مقروض قرضخواہ کو دیکھ کر بھاگتا ہے۔ لیکن پروردگار ایسا کریم ہے۔ کہ اس کے مقروض بندے اسی کی بارگاہ کی طرف بھاگتے ہیں۔ بلکہ وہ خود بلا رہا ہے۔ فرماتا ہے۔ فَفِرُّوۡۤا اِلَی اللّٰہِ (بھاگ کر آؤ اللہ کی طرف) بادشاہ و مالدار فقراء سے اپنے دروازے بند کرتے ہیں۔ تاکہ فقیر ہمارے پاس نہ آئیں۔ لیکن رب تعالیٰ وہ غنی ہے۔ کہ جس کا دروازہ ہر وقت ہر ایک کیلئے کھلا ہے۔ اور تو بھگاتے ہیں مگر وہ اپنے دروازے کی طرف بلاتا ہے۔ فرماتا ہے۔ اُدۡعُوۡنِیۡۤ اَسۡتَجِبۡ لَکُمۡ (اے بندو مجھ سے مانگو میں تمہاری بات مانوں گا) **حکایت** دو بھائی تھے۔ ایک متقی پرہیزگار۔ دوسرا فاسق و بدکار جب فاسق مرنے لگا تو متقی بھائی نے کہا۔ کہ دیکھا

تجھے میں نے بہت سمجھایا. مگر تو اپنے فسق وفجور سے باز نہ آیا. اب بول تیرا کیا حال ہوگا؟ اس نے جواب دیا. کہ اگر قیامت کے روز میرا رب میرا فیصلہ میری ماں کے سپرد کر دے. تو بتاؤ کہ ماں مجھے کہاں بھیجے گی. دوزخ میں یا جنت میں. پرہیزگار بھائی نے کہا. کہ ماں تو واقعی جنت میں بھیجے گی. گنہ گار نے جواب دیا. کہ میرا رب میری ماں سے زیادہ مہربان ہے. یہ کہا اور اس کا انتقال ہوگیا. بڑے بھائی نے اس کو خواب میں نہایت خوشحال دیکھا مغفرت کی وجہ پوچھی. کہا. کہ میری اسی مرتے وقت کی بات نے میرے تمام گناہ بخشوادیئے ؎

ہم گنہ گاروں پہ تیری مہربانی چاہیئے سب گناہ دُھل جائیں گے رحمت کا پانی چاہیئے

اس وجہ سے اس کو اللہ کہتے ہیں. لیکن حق یہ ہے. کہ لفظ اللہ کسی لفظ سے مشتق نہیں. جیسے اس کی ذات کسی سے نہیں بنی. ایسے ہی اس کا نام کسی لفظ سے نہیں بنا. سبحان اللہ! جب اس کے نام میں اتنی حیرانی ہے. تو کون دعوٰے کر سکتا ہے. کہ میں نے رب کی حقیقت کو پالیا (**لفظ اللہ کی خصوصیات**) تفسیر کبیر شریف میں بسم اللہ کی تفسیر میں فرمایا. کہ لفظ اللہ میں چند خصوصتیں ہیں. **ایک** یہ کہ لفظ اللہ رب کی ذات پر دلالت کرنے میں حرفوں کا محتاج نہیں. الف کو گرادو تو لِلّٰہ رہتا ہے. وہ بھی ذات کو بتارہا ہے. حق تعالیٰ فرماتا ہے. وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. اگر اس کا پہلا لام بھی گرادو. تو لَهٗ کی شکل پر رہتا ہے. یہ بھی اسی ذات کو بتارہا ہے. فرماتا ہے. لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ. اگر دوسرا لام بھی گرادیں تو فقط ہٗ باقی رہتا ہے. وہ بھی ذات کو بتارہا ہے. لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ جس طرح سے کہ اس کا نام حروف کا محتاج نہیں. ایسے ہی اس کی ذات کسی کی محتاج نہیں. **دوسری خصوصیت** یہ ہے. کہ خدا کے دوسرے اسماء خاص خاص صفتوں پر دلالت کرتے ہیں. لیکن اللہ ساری صفتوں پر. جس نے اللہ کہہ کر پکار لیا. اس نے گویا ساری صفتوں سے پکارا. کیونکہ اللہ وہی ہے. جس میں ساری صفتیں موجود ہوں **تیسری خصوصیت** یہ ہے. کہ کلمہ طیبہ میں لفظ اللہ ہی داخل ہے جس کو پڑھ کر کافر مومن بنتا ہے. اگر کوئی لَآ اِلٰهَ اِلَّا الرَّحْمٰنُ کہہ لے. یا اس کے دیگر سارے اسموں سے کلمہ پڑھ لے مومن نہ ہوگا. مگر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتے ہی دولت ایمان سے مالامال ہوجاتا ہے. لفظ محمدؐ میں قریب قریب یہ ساری خصوصتیں موجود ہیں. اور اس میں بہت عجیب عجیب نکات ہیں. لیکن یہاں اس کے بیان کا موقعہ نہیں صرف ایک نکتہ عرض کرتا ہوں. لفظ "اللہ" بولو تو ہونٹ ملتے نہیں مگر لفظ محمدؐ کے بولتے ہی نیچے کا ہونٹ اوپر والے سے دو بار مل جاتا ہے معلوم ہوا. کہ ان کا نام نیچوں کو اوپر والے سے ملانے والا ہے. اور ان کی ذات مخلوق کو خالق سے ملانے والی ہے. تو ان کا نام ان کے کام کو بتارہا ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم. اس کی خصوصیات انشاء اللہ کسی اور جگہ بیان کی جائیں گی. اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لفظ رحمٰن اور رحیم رحم سے بنا ہے. اور رحم کے معنٰے ہیں. دل کا نرم ہونا. اور کسی پر مہربانی کرنا. عورت کی بچہ دانی کو اس لئے رِحم کہتے ہیں. کہ وہ اپنے پیٹ کے بچے پہ بہت مہربان ہوتی ہے. اور بچہ اس سے بہت اُنس رکھتا ہے. نیز جن لوگوں کا آپس میں رحمی رشتہ ہوتا ہے. وہ بھی ایک دوسرے پر مہربان ہوتے ہیں. بھائی. بھتیجے بھانجے یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتے ہیں. اسی لئے انہیں ذی رحم کہتے ہیں مگر حق تعالیٰ چونکہ دل وغیرہ سے پاک ہے. اس لئے یہاں اس کے یہ معنٰے ہوں گے. کہ فضل واحسان فرمانے والا. اب رحمٰن اور رحیم کے معنٰے میں چند طرح کا فرق ہے. **ایک** تو یہ کہ رحمٰن کے معنٰے سب پر عام رحم فرمانے والا اور رحیم کے معنٰے خاص خاص پر خاص رحم فرمانے والا. دیکھو ہوا. پانی. سورج کی روشنی وغیرہ بلا فرق سب کو عطا فرمائی. یہاں رحمانیت کی جلوہ گری ہے. لیکن حکومت، دولت، ولایت، نبوت یہ سب کو نہ دیئے. بلکہ خاص خاص کو دیئے. ان میں رحیم کے معنٰے کا ظہور ہے. **دوسرے** یہ کہ دنیا میں دوست اور دشمن مسلمان اور کافر سب کو اپنی رحمتوں سے نوازڈالا. یہاں صفت رحمان کا ظہور ہے. مگر آخرت میں خاص مسلمانوں پر رحم اور دشمنوں پر قہر ہوگا. تو وہاں صفت رحیم کا ظہور ہوگا. **تیسرے** اس طرح کہ بڑی بڑی نعمتیں سلطنت. حکومت. زمین. جنت اسی سے مانگی جاتی ہے. اور وہی دیتا ہے. اور چھوٹی چھوٹی نعمتیں بھی اس سے طلب کی جاتی ہیں حتیٰ کہ اگر کسی کے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے. تو وہ بارگاہ الٰہی میں عرض کرے. کہ خدایا میرا تسمہ ٹوٹ گیا ہے. تو عطا

فرما. تو بڑی نعمتوں کے لحاظ سے رحمٰن اور چھوٹی نعمتوں کے لحاظ سے رحیم اس میں اس طرف اشارہ ہے۔ کہ اگر بڑے بادشاہ سے چھوٹی چیز مانگی جائے۔ تو اس کو ناگوار ہوتی ہے۔ کہ اس میں میری توہین ہو گئی۔ اور اگر معمولی مالدار سے بڑی چیز مانگی جائے۔ تو وہ اس کے دینے سے عاجز ہوتا ہے۔ یہ رب تعالیٰ کی ہی شان ہے۔ جو چھوٹی بڑی ہر چیز عطا فرماتا ہے۔ اور کسی چیز کے مانگنے میں ناراض نہیں ہوتا **چوتھا فرق** یہ ہے۔ کہ حق تعالیٰ نے بعض نعمتیں بلا واسطہ اور بعض کسی واسطے سے عطا فرمائی ہیں۔ دیکھو ہم کو جان ملی بغیر ماں باپ کے وسیلے کے۔ مگر جسم اور جسم کی ضروریات ماں باپ اور دوسرے بندوں کے واسطے سے ملیں۔ اسی طرح پانی۔ ہوا۔ دھوپ اور چاندنی وغیرہ بغیر کسی واسطے کے عطا فرمائی گئیں۔ لیکن غذا اور دوا لباس وغیرہ بندوں کیواسطے سے عطا فرمایا۔ تو بلا واسطہ نعمتوں کے لحاظ سے اس کو رحمان اور بالواسطہ کے لحاظ سے رحیم کہا جاتا ہے۔ **پانچواں فرق** یہ ہے۔ کہ رب تعالیٰ نے بعض نعمتیں ہمیشہ کیلئے عطا فرما دیں۔ جیسے جان اور ایمان اور عبادت اور نیکیاں اور آخرت کی نعمتیں۔ اور بعض نعمتیں عارضی ہیں۔ جو چند روز کے لئے عطا فرمائی گئیں۔ بعد میں ہمارے پاس نہ رہیں گی۔ جیسے کہ دنیوی زندگی کی ضروریات وغیرہ۔ پہلی نعمتوں کے لحاظ سے اس کا نام رحمٰن اور دوسری نعمتوں کے لحاظ سے رحیم **نکتہ** حق تعالیٰ نے بسم اللہ میں اپنے اسم ذات کے ساتھ رحمت کی دو صفتوں کو بیان فرمایا۔ اس لئے کہ اللہ کے نام میں ہیبت تھی۔ اور رحمٰن اور رحیم میں رحمت۔ اللہ کا نام سن کر نیک بندوں کو بھی کچھ عرض معروض کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ لیکن رحمٰن اور رحیم سن کر ہر مجرم اور خطاکار کو بھی عرض کرنے کی ہمت پڑی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے۔ کہ اس کے جلال کے مقابلے میں کون دم مار سکتا ہے۔ اور ظہور جمال کے وقت ہر ایک ناز کر سکتا ہے۔ **تفسیر کبیر شریف** میں اس کے ماتحت ایک عجیب حکایت لکھی ہے۔ کہ ایک سائل ایک بہت بڑے مالدار کے عظیم الشان دروازے پر آیا۔ اور کچھ سوال کیا۔ مکان میں سے کوئی معمولی سی چیز آئی۔ فقیر نے لی اور چلا گیا۔ دوسرے دن ایک بہت مضبوط پھاوڑا لے کر آیا۔ اور دروازہ کھودنے لگا۔ مالک نے پوچھا یہ کیا کرتا ہے۔ فقیر نے کہا۔ کہ یا تو عطا کو دروازے کے لائق کر۔ یا دروازہ عطا کے لائق بنا۔ یعنی جب دروازہ اتنا بڑا بنایا ہے۔ تو ضروری ہے۔ کہ بڑے دروازے سے بڑی ہی بھیک ملا کرے۔ کیونکہ عطا دروازے اور نام کے لائق ہونی چاہیئے۔ ہم فقیر گنہ گار بندے بھی عرض کرتے ہیں۔ اے مولا ہم کو ہمارے لائق نہ دے۔ بلکہ اپنے جود و عطا کے لائق دے۔ بیشک ہم گنہ گار ہیں۔ لیکن تیری غفاری ہماری گنہ گاری سے بڑی ہے۔ ؎

گنہ رضا کا حساب کیا وہ اگرچہ لاکھوں سے ہیں سوا — مگر اے عفو تیرے عفو کا تو حساب ہے نہ شمار ہے

حق تعالیٰ کے نام توقیفی ہیں یعنی شریعت میں جو نام ہے۔ اوسی نام سے اُس کو یاد کیا جائے۔ اپنی طرف سے حق تعالیٰ کا نام تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا خدا کو رام یا پرمیشور وغیرہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ یہ نام شریعت سے ثابت نہیں۔ ہاں خدا کی صفتوں کو اپنی زبان سے جس طرح چاہیں بیان کریں۔ مثلاً اُس کو پروردگار یا خدا یا اللہ پاک کہیں یہ الفاظ رب کے نام نہیں۔ بلکہ اُس کی صفات کے ترجمے ہیں۔ لفظ خدا مالک کا ترجمہ ہے اور پروردگار رب کا وغیرہ

### بسم اللہ کے فضائل اور فوائد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے فوائد و فضائل بے شمار ہیں جن میں سے کچھ عرض کئے جاتے ہیں۔ **ایک** یہ کہ یہ قرآن پاک کی کنجی ہے۔ بلکہ ہر دنیوی اور دینی جائز کام کی بھی کنجی ہے۔ کہ جو کام اس کے بغیر کیا جائے ناقص رہتا ہے۔ **دوسرے** یہ کہ تفسیر روح البیان شریف نے بسم اللہ کے ماتحت ایک حدیث نقل فرمائی۔ کہ جب حضور علیہ السلام معراج میں تشریف لے گئے۔ اور جنتوں کی سیر فرمائی۔ تو وہاں چار نہریں ملاحظہ فرمائیں۔ ایک پانی کی دوسری دودھ کی تیسری شراب کی اور چوتھی شہد کی جبریل امین سے دریافت کیا۔ کہ یہ نہریں کہاں سے آرہی ہیں۔ حضرت جبریل امین نے عرض کیا۔ کہ مجھے اس کی خبر نہیں۔ دوسرے فرشتے نے آکر عرض کی۔ کہ ان چاروں کا چشمہ میں دکھاتا ہوں۔ ایک جگہ لے گیا۔ وہاں ایک درخت تھا جس کے نیچے ایک عمارت بنی ہوئی تھی۔ اور دروازے پر قفل پڑا تھا۔ اور اس کے نیچے سے یہ چاروں نہریں نکل رہی تھیں۔ ارشاد فرمایا دروازہ کھولو۔ عرض کیا اس کی چابی میرے پاس نہیں۔ بلکہ آپ کے

پاس ہے یعنی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بسم اللہ پڑھ کر قفل کو ہاتھ لگایا۔ دروازہ کھل گیا۔ اندر جا کر ملاحظہ فرمایا۔ کہ اس عمارت میں چار ستون ہیں۔ اور ہر ستون پر بسم اللہ لکھی ہے۔ اور بسم اللہ کے میم سے پانی جاری ہے۔ اللہ کی ہ سے دودھ جاری ہے۔ رحمٰن کی میم سے شراب اور رحیم کی میم سے شہد۔ اندر سے آواز آئی "اے میرے محبوب علیہ السلام آپ کی اُمت میں سے جو شخص بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ پڑھے۔ وہ ان چاروں کا مستحق ہوگا" **تیسرے** یہ کہ تفسیر کبیر شریف میں اسی بسم اللہ کی تفسیر میں لکھا ہے۔ کہ فرعون نے خدائی کے دعوٰی سے پیشتر ایک مکان بنایا تھا۔ اور اس کے بیرونی دروازے پر بسم اللہ لکھی تھی۔ جب دعوٰی خدائی کیا۔ اور موسٰی علیہ السلام نے اس کو تبلیغ اسلام کی۔ اور اس نے قبول نہ کی۔ تو موسٰی علیہ السلام نے اس کے حق میں بددُعا کی۔ وحی آئی "اے موسٰی (علیہ السلام) یہ ہے تو اس قابل کہ اس کو ہلاک کر دیا جائے۔ لیکن اس کے دروازے پر بسم اللہ لکھی ہے جس کی وجہ سے وہ عذاب سے بچا ہوا ہے" اسی وجہ سے فرعون پر گھر میں عذاب نہ آیا۔ بلکہ وہاں سے نکال کر دریا میں ڈبویا گیا۔ سبحان اللہ! جب ایک کافر کا گھر بسم اللہ کی وجہ سے عذاب سے بچ گیا۔ تو اگر کوئی مسلمان اس کو اپنے دل و زبان پر لکھ لے۔ تو کیوں نہ عذاب الٰہی سے محفوظ رہے **نتیجہ** عمارتوں کے دروازوں پر مردوں کی قبروں پر بلکہ کفن اور پیشانی میں اس لئے بسم اللہ لکھی جاتی ہے۔ کہ عذاب الٰہی سے محفوظ رہے۔ مگر خیال رہے کہ ان الفاظ کی بے ادبی نہ ہونے پائے۔

**تفسیر عزیزی** میں بسم اللہ کے فوائد میں لکھا ہے۔ کہ ایک ولی اللہ نے مرتے وقت وصیت کی تھی۔ کہ میرے کفن میں بسم اللہ لکھ کر رکھ دینا لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی۔ تو انہوں نے جواب دیا۔ کہ یہ قیامت کے دن میری دستاویز ہوگی جس کے ذریعہ سے میں رحمت الٰہی کی درخواست کروں گا **تفسیر کبیر** وغیرہ میں ہے۔ کہ بسم اللہ میں انیس[19] حروف ہیں۔ اور دوزخ پر عذاب کے فرشتے بھی انیس[19] ہیں پس امید ہے۔ کہ اس کے ایک ایک حرف کی برکت سے ایک ایک فرشتہ کا عذاب دُور ہو جائے۔ **دوسری خوبی** یہ بھی ہے۔ کہ دن رات میں چوبیس[24] گھنٹے ہیں جن میں سے پانچ گھنٹے پانچ نمازوں نے گھیر لئے اور انیس[19] گھنٹوں کیلئے بسم اللہ کے انیس[19] حرف عطا فرمائے گئے جو بسم اللہ کا ورد کرتا رہے۔ انشاء اللہ اس کا ہر گھنٹہ عبادت میں شمار ہوگا۔ اور ہر وقت کے گناہ معاف ہوں گے **بسم اللہ کے فائدے** بسم اللہ کے بے شمار فائدے ہیں جن میں سے ہم کچھ تھوڑے "تفسیر کبیر" اور "تفسیر عزیزی" وغیرہ سے نقل کرتے ہیں **پہلا** جو شخص اپنی بیوی کے پاس جاتے وقت بسم اللہ پڑھ لے تو اس میں شیطان شریک نہ ہوگا۔ اور اگر اس صحبت سے حمل قائم ہو جائے۔ تو اس حمل کا بچہ اپنی زندگی میں جس قدر سانس لے گا۔ اس قدر اس کے باپ کے نامۂ اعمال میں نیکیاں لکھی جائیں گی۔ جو شخص کسی جانور پر سوار ہوتے وقت "بسم اللہ" اور "الحمد للہ" پڑھ لے تو اس جانور کے ہر قدم پر اس سوار کے حق میں ایک نیکی لکھی جائے گی۔ جو شخص کشتی میں سوار ہوتے وقت "بسم اللہ" اور "الحمد للہ" پڑھ لے۔ جب تک وہ اس میں سوار رہے گا۔ اس کے واسطے نیکیاں لکھی جائیں گی جو بیمار "بسم اللہ" کہہ کر دوا پئے انشاء اللہ وہ دوا فائدہ دے گی۔ **حکایت** ایک بار حضرت موسٰی علیہ السلام کے پیٹ میں نہایت سخت درد ہوا حق تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا۔ ارشاد ہوا۔ کہ جنگل کی فلاں بوٹی کھاؤ۔ چنانچہ آپ نے وہ کھائی اور فوراً آرام ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد پھر وہی بیماری ہوئی۔ موسٰی علیہ السلام نے پھر وہی دوا استعمال کی۔ مگر درد میں زیادتی ہو گئی۔ جناب باری میں عرض کیا۔ کہ الٰہی یہ کیا بھید ہے۔ کہ دوا ایک مگر تاثیریں اس کی دو۔ کہ پہلی بار اس نے شفا دی۔ اور اس دفعہ بیماری بڑھائی۔ ارشاد الٰہی ہوا۔ کہ اے موسٰی اُس بار تم میری طرف سے بوٹی کے پاس گئے تھے۔ اور اس دفعہ اپنی طرف سے۔ اے موسٰی شفا تو میرے نام میں ہے۔ میرے نام کے بغیر دنیا کی ہر چیز زہر قاتل ہے۔ اور میرا نام اس کا تریاق ہے **حکایت** حضرت عیسٰی علیہ السلام ایک قبر پر گذرے۔ دیکھا۔ کہ اس میت کو سخت عذاب ہو رہا ہے۔ یہ دیکھ کر چند قدم آگے تشریف لے گئے۔ اور وہاں سے استنجا کر کے واپس ہوئے اب جو اس قبر پر گذرے تو ملاحظہ فرمایا کہ اس قبر میں نور ہی نور ہے۔ اور وہاں رحمت الٰہی کی بارش ہو رہی ہے۔ آپ بہت حیران ہوئے اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا۔ کہ مجھے اس کا بھید بتایا جائے۔ ارشاد ہوا۔ کہ روح اللہ یہ شخص سخت گنہ گار اور بدکار تھا۔ اس وجہ سے عذاب میں گرفتار تھا لیکن اس نے اپنی بیوی حاملہ چھوڑی تھی۔ اس کے لڑکا پیدا ہوا۔ اور آج اس کو مکتب میں بھیجا گیا۔ اُستاد نے اس کو بسم اللہ پڑھائی ہمیں حیا آئی کہ میں

زمین کے اندر اُس شخص کو عذاب دوں۔ کہ جس کا بچہ زمین پر میرا نام لے رہا ہے۔ اس سے معلوم ہُوا کہ بچوں کی نیکی سے ماں باپ کی نجات ہو جاتی ہے" تفسیر عزیزی" میں ہے۔ کہ جس شخص کو کوئی سخت مصیبت پیش آ جائے۔ تو وہ بسم اللہ بارہ ہزار دفعہ اس طرح پڑھے۔ کہ ایک ہزار بسم اللہ پڑھ کر دو رکعت نفل پڑھے۔ پھر ہر ہزار پر دو نفل پڑھتا جائے۔ اس کے بعد دُعا مانگے۔ انشاء اللہ اس کی دعا ضرور قبول ہوگی۔ جس شخص کو کوئی سخت مشکل درپیش ہو۔ تو وہ یہ عبارت ایک پرچہ میں لکھے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مِنَ الْعَبْدِ الذَّلِیْلِ اِلٰی رَبِّ الْجَلِیْلِ رَبِّ اِنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ پھر یہ پرچہ کسی بہتے ہوئے پانی میں ڈال دے اور ڈال کر یہ دعا پڑھے اَللّٰھُمَّ بِمُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ وَاَصْحٰبِہِ الْمُرْسَلِیْنَ اِقْضِ حَاجَتِیْ یَا اَکْرَمَ الْاَکْرَمِیْنَ۔ جو شخص پاخانہ میں جاتے وقت بسم اللہ پڑھ لے۔ تو انشاء اللہ جنّات اس کا ستر نہ دیکھ سکیں گے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی میں سوار ہوتے وقت پڑھا تھا۔ بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖھَا وَمُرْسٰھَا اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ اس کی وجہ سے ان کا بیڑا پار ہُوا۔ تو جو شخص کشتی میں سوار ہوتے وقت یہ دعا پڑھ لے۔ تو خدا چاہے وہ ڈوبنے سے بچے گا۔ جب آدھی بسم اللہ سے بیڑے پار لگتے ہیں۔ تو پوری بسم اللہ میں کیا کیا برکتیں ہوں گی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب بلقیس کو پہلا خط لکھا تو اس میں لکھا۔ کہ اِنَّہٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّہٗ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اس کی برکت سے بلقیس ان کے نکاح میں آئی۔ اور اس کا پورا ملک یمن حضرت سلیمان علیہ السلام کے قبضے میں آیا۔ **غور تو کرو۔** کہ سورۂ توبہ میں بسم اللہ نہیں لکھی گئی۔ اسی طرح ذبح کے وقت پوری بسم اللہ نہیں پڑھتے۔ بلکہ یوں کہتے ہیں۔ بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ اس میں کیا حکمت ہے۔ حکمت یہ ہے۔ کہ سورۂ توبہ میں اوّل سے آخر تک جہاد اور قتال کا ذکر ہے۔ اور یہ کافروں پر قہر ہے۔ اسی طرح ذبح میں جانور کی جان لی جاتی ہے۔ یہ بھی جبر و قہر کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت رحمت کا ذکر نہ کرو۔ **سبحان اللہ** تو جو شخص پوری بسم اللہ کا وِرد کرے تو انشاء اللہ خدا کے غضب سے محفوظ رہے گا۔

حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی شخص زہر لایا۔ اور کہا کہ اگر آپ اس زہر کو پی کر صحیح سلامت رہیں۔ تو ہم جان لیں کہ اسلام سچا ہے۔ آپ نے بسم اللہ پڑھ کر وہ زہر پی لیا۔ اور خدا کے فضل سے کچھ اثر نہ ہُوا۔ وہ شخص یہ دیکھ کر اسلام لے آیا۔ **بادشاہ روم ہرقل** نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں خط لکھا۔ کہ مجھے درد سر کی بہت شکایت ہے کچھ علاج کیجئے۔ آپ نے اس کے پاس ایک ٹوپی بھیج دی۔ جب بادشاہ وہ ٹوپی اوڑھتا تھا۔ درد جاتا رہتا تھا۔ اور جب اتار دیتا تھا۔ درد شروع ہو جاتا تھا۔ اس کو سخت تعجب ہُوا۔ اس نے ٹوپی کو کھلوایا دیکھا تو اس میں ایک پرچہ رکھا تھا جس میں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ لکھا تھا۔ **غرض یہ ہے۔** کہ بسم اللہ میں بے شمار فائدے ہیں۔

**اعتراض** بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو بسم اللہ ہزاروں بار پڑھتے ہیں۔ مگر کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے بسم اللہ پڑھ کر زہر پی لیا۔ لیکن اگر ہم بسم اللہ پڑھ کر کوئی بھاری غذا بھی کھا لیں تو بھی نقصان پہنچا دیتی ہے۔ **جواب** تمام دعائیں اور وظیفے مثل کارتوس کے ہیں۔ اور پڑھنے والے کی زبان بندوق۔ کارتوس یقیناً شیر کو مارتا ہے۔ مگر کب جبکہ اچھے رائفل سے استعمال کیا جائے۔ دعائیں تو وہی ہیں لیکن ہماری زبانیں صحابہ کرام کی سی نہیں۔ ہم اس زبان سے روزانہ جھوٹ غیبت وغیرہ بکتے رہتے ہیں۔ پھر وہ تاثیر کہاں سے آئے۔ اگر قرآن پاک کی تاثیر دیکھنی ہے۔ تو اچھی زبان پیدا کرو۔

## بسم اللہ کے مسائل

بسم اللہ قرآن پاک کی پوری آیت ہے۔ مگر کسی صورت کا جزو نہیں۔ بلکہ صورتوں میں فاصلہ کرنے کے لئے اتاری گئی ہے۔ اسی لئے نمازیں اس کو آہستہ ہی پڑھتے ہیں۔ ہاں جو حافظ تراویح میں پورا قرآن پاک ختم کرے۔ وہ ضرور کسی نہ کسی سورت کے ساتھ بسم اللہ زور سے پڑھے **مسئلہ** سوا سورۂ توبہ کے باقی ہر سورت بسم اللہ سے شروع کی جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص سورۂ توبہ سے ہی تلاوت شروع کرے۔ تو وہ تلاوت کیلئے بسم اللہ پڑھ لے **مسئلہ** ہر جائز کام بسم اللہ سے شروع کرنا مستحب ہے۔ ناجائز کام پر بسم اللہ پڑھنا منع ہے۔ اگر کوئی شخص بسم اللہ کہہ کے شراب پیئے۔ چوری کرے۔ غیبت کرے جھوٹ بولے تو کفر کا اندیشہ ہے۔ شامی میں ہے۔ کہ حقہ پیتے وقت

اور بدبودار چیزیں (جیسے پیاز۔ لہسن وغیرہ) کھاتے وقت بسم اللہ نہ پڑھنا بہتر ہے **مسئلہ** ننگے ہوکر۔ پاخانہ میں پہنچ کر بسم اللہ پڑھنا منع ہے **مسئلہ** نمازی نماز میں جب کوئی سورۃ شروع کرے۔ تو آہستہ بسم اللہ پڑھ لینا مستحب ہے۔ **مسئلہ** جو جائز کام بھی بغیر بسم اللہ کئے شروع کیا جائیگا۔ اس میں برکت نہ ہوگی **مسئلہ** جب مردہ کو قبر میں اتارا جائے۔ تو اتارنے والے یہ پڑھتے جائیں۔ بِسْمِ اللّٰہِ وَعَلٰی مِلَّتِ رَسُوْلِ اللّٰہِ **مسئلہ** جمعہ عیدین نکاح وعظ وغیرہ کا خطبہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ سے شروع کیا جائے یعنی بسم اللہ آہستہ پڑھی جائے۔ پھر جب قرآن پاک کی آیت آئے تب بلند آواز سے بسم اللہ پڑھی جائے **مسئلہ** جانور کو ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب ہے۔ کہ اگر جان بوجھ کر چھوڑ دیا تو جانور مُردار ہوگا۔ اور اگر بھولے سے چھوٹ گئی تو جانور حلال ہے **مسئلہ** اگر شکاری تیر یا بھالا وغیرہ دھاردار چیز سے شکار کرے اور یہ چیزیں پھینکتے وقت بسم اللہ پڑھ لے تو اگر جانور اسکے پہنچتے پہنچتے مر بھی گیا تب بھی حلال ہوگا۔ یونہی اگر پالتو جانور قبضے سے نکل گیا۔ مثلاً گائے کنوئیں میں گر گئی یا اونٹ بھاگ گیا۔ تو بسم اللہ کہہ کر تیر یا بھالا یا تلوار مار دی گئی تو جانور حلال ہے **مسئلہ** اگر شکار پر شکاری کتا چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھ لی جائے۔ اور کتے کی پکڑ سے جانور مر جائے تو وہ حلال ہے۔ شکار کے پورے مسائل انشاء اللہ شکار کی آیتوں کی تفسیر میں بیان کئے جائیں گے۔

## سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ وَّھِیَ سَبْعُ اٰیَاتٍ

سورۂ　فاتحہ　مکہ والی اور وہ　سات　آیتیں

سورۂ فاتحہ مکیہ ہے اور وہ سات آیتیں ہیں:-

سورۂ فاتحہ کے متعلق چند باتیں عرض کرنی ہیں۔ **ایک** یہ کہ اس کے نام کتنے ہیں۔ دوسرے یہ کہ شان نزول اس کا کیا ہے۔ **تیسرے** یہ کہ اس کے **فضائل** کیا کیا ہیں۔ **چوتھے** یہ کہ اس میں مسائل کیا کیا ہیں۔ **سورۂ فاتحہ کے نام** (اس کے کل بیس[20] نام ہیں۔ فاتحہ[1] فاتحۃ الکتاب[2]۔ ام القرآن[3]۔ سورۃ الکنز[4]۔ سورۃ کافیہ[5]۔ سورۂ وافیہ[6]۔ سورۂ شافیہ[7]۔ سورۂ شفا[8]۔ سبع مثانی[9]۔ سورۃ نور[10]۔ سورۂ رقیہ[11]۔ سورۃ الحمد[12]۔ سورۃ دعا[13]۔ سورۂ تعلیم المسئلہ[14]۔ سورۂ مناجات[15]۔ سورۂ تفویض[16]۔ سورۂ سوال[17]۔ سورۂ ام الکتاب[18]۔ سورۂ فاتحۃ القرآن[19]۔ سورۂ صلوٰۃ[20] اس سورۃ میں سات آیتیں ستائیس[27] کلمے اور ایک سو چالیس حرف ہیں۔ کوئی آیت ناسخ یا منسوخ نہیں۔ **اس سورۃ کی وجہ تسمیہ۔ (فاتحۃ الکتاب)** اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اس سورۃ سے قرآن پاک کو شروع کیا جاتا ہے۔ یعنی پہلے لکھی بھی جاتی ہے۔ اور پہلے پڑھائی بھی جاتی ہے۔ اور نماز میں بھی پہلے ہی پڑھی جاتی ہے۔ اور الحمد سے ہر کلام شروع کیا جاتا ہے۔ اور اس لئے کہ بعض روایات کی رو سے سب سے پہلے یہی اتری۔ **(سورۃ الحمد)** اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اس کے اول میں لفظ اَلْحَمْدُ آتا ہے۔ **(اُمّ القرآن)** اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اُم کے معنے ہیں۔ اصل کے اور یہ سورۃ سارے قرآن پاک کی اصل ہے۔ اس لئے کہ جس قدر مضامین سارے قرآن شریف میں تفصیل وار ہیں۔ وہ سب اجمالاً یہاں آگئے ہیں۔ اس کو قرآن پاک سے وہی نسبت ہے جو بیج کو درخت سے ہوتی ہے۔ کیونکہ بیج میں سارا درخت (یعنی پتے۔ شاخیں پھل پھول وغیرہ) ہوتا ہے۔ **(اُمّ الکتاب)** اس لئے کہتے ہیں۔ کہ ساری آسمانی کتابوں کے تقریباً سارے مضامین اس میں آگئے ہیں۔ کیونکہ عقائد اعمال وغیرہ سب اس میں موجود ہیں۔ نیز خدا کی ذات وصفات اس کی معبودیت اس کی بے نیازی بندے کی عبدیت۔ نیازمندی وغیرہ تمام اس میں موجود ہیں۔ **(سبع مثانی)** اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اس لفظ کے معنے ہیں۔ سات مکرر آیتیں چونکہ اس میں سات آیتیں ہیں اور دو بار یہ نازل ہوئی۔ اس لئے اس کا یہ نام ہوا۔ نیز نماز کی ہر رکعت میں اس سورۃ کی تکرار ہوتی ہے۔ نیز آدھی سورۃ میں رب کی حمد وثنا ہے۔ اور باقی آدھی میں بندے کی عرض ومعروض تو گویا آدھی خالق کے لئے ہے۔ اور آدھی مخلوق کے لئے لہذا اس کو سبع مثانی کہا جاتا ہے نیز اس طرح کی سورۃ کسی اور آسمانی کتاب میں نہ آئی۔ نیز سورہ فاتحہ کا ثواب قرآن کے ساتویں حصہ کے برابر ہے۔ لہذا جو شخص اسے سات بار پڑھ لے وہ پورے قرآن پاک پڑھنے کا ثواب پائے گا۔ نیز اس کی آیتیں بھی سات ہیں۔ اور دوزخ کے دروازے بھی سات۔ جو شخص کہ ان سات آیتوں کے پڑھنے کا پابند ہوگا۔ انشاء اللہ اس پر دوزخ کے سات دروازے بند ہوجائیں گے۔ حدیث شریف میں ہے

کہ ایک بار جبریل امین نے بارگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کیا۔ کہ میں آپ کی اُمت پر دوزخ کے عذاب کا خوف کرتا تھا جب سورۂ فاتحہ اتری تو مجھے اطمینان ہوگیا۔ کیونکہ یہ سات آتیں جہنم کے سات طبقوں کا قفل ہیں۔ (تفسیر کبیر) **سورۂ وافیہ**۔ وافیہ کے معنی پوری ہونے والی اس سورت میں یہ خصوصیت ہے۔ کہ یہ ہر رکعت میں پوری ہی پڑھی جاتی ہے۔ دوسری بڑی سورتیں اگر دو رکعت میں آدھی آدھی یا کم و بیش پڑھ دی جائیں تو جائز ہوتا ہے۔ **سورۂ کافیہ**۔ اس کو کافیہ اس لئے کہتے ہیں۔ کہ یہ دوسری سورتوں کے بدلہ میں کافی ہوتی ہے۔ لیکن اور کوئی سورۃ اس کا بدل نہیں ہوسکتی۔ **سورۂ شفا**:۔ اس لئے کہتے ہیں۔ کہ یہ زہر اور صدہا قسم کی بیماریوں کا علاج ہے۔ ایک صحابی نے دیکھا۔ کہ ایک آدمی مرگی کے دورہ میں گرفتار ہے۔ تو اس کے کان میں یہ سورۃ پڑھ دی۔ اور اس کو آرام ہوگیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ واقعہ عرض کیا گیا۔ تو فرمایا۔ کہ یہ سورت ہر بیماری کی دوا ہے **نیز** یہ سورت جسمانی اور روحانی تمام بیماریوں کا علاج ہے۔ انشاء اللہ اس کی تحقیق اس کے فائدوں میں کی جائے گی۔ **سورۂ صلوٰۃ** اس کو اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اس کا پڑھنا ہر نماز میں ضروری ہے **سورۂ سوال**۔ اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اس میں بندوں کو حق تعالیٰ سے دُعا مانگنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ کہ جب دعا کرنی ہو۔ تو پہلے خداوند تعالیٰ کی حمد کرے۔ اپنی محتاجی اور بندگی کا ذکر کرے۔ پھر اپنی حاجت عرض کرے۔ اور دنیوی حاجتوں کے مقابلے میں آخرت کی حاجتیں زیادہ مانگے **سورۂ شکر** اور **سورۂ دُعا** اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اس میں بندوں کو رب تعالیٰ کا شکر کرنے اور دعا مانگنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے وغیرہ وغیرہ

## شانِ نزول

اس کے نزول کے بارے میں تین قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مکہ مکرمہ میں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ بلکہ بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ سب سے پہلے سورۂ فاتحہ ہی نازل ہوئی۔ چنانچہ اس کا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور فرمایا۔ کہ جب میں تنہائی میں بیٹھتا ہوں۔ تو غیبی آواز سنتا ہوں۔ کہ کوئی کہتا ہے پڑھو۔ اسکی خبر ورقہ **ابن نوفل** کو دی گئی جو کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے رشتہ میں بھائی تھے۔
ورقہ نے عرض کیا کہ اب جب کبھی یہ آواز آئے تو آپ اطمینان سے سنتے رہیں۔ چنانچہ پھر یہ ہوا کہ حضرت جبریل حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا۔ کہ پڑھیئے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اس روایت سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے فاتحہ نازل ہوئی مگر دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے سورۂ اقرأ نازل ہوئی۔ **دوسرا قول** یہ ہے۔ کہ یہ سورت ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں اتری۔ لیکن اس پر اعتراض یہ ہے۔ کہ نماز مکہ مکرمہ میں شب معراج میں فرض ہو چکی تھی۔ اور نماز میں اس کا پڑھنا ضروری ہے۔ اگر یہ سورت مدنی ہو تو مسلمانوں نے اتنے روز تک نماز میں کیا پڑھا۔ **تیسرا قول** یہ ہے۔ کہ یہ سورت ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں اور ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں دوبارہ نازل ہوئی۔ اس لئے اس کو "سبع مثانی" کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ سات آیتیں ہیں اور دو دفعہ اتری ہیں۔ اور دوبارہ اتارنے میں حکمت یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کو اس کی شان کا پتہ لگ جائے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بھی معلوم ہو جائے۔ کیونکہ قرآن پاک کی آیتیں حقیقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ربانی تحفہ ہیں۔ **نوٹ**:۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک کا اترنا محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کیلئے نہیں تھا۔ بلکہ اس میں اور بھی حکمتیں ہیں **سورت آیت مکی مدنی**۔
**آیت** قرآن پاک کی اس عبارت کو کہتے ہیں جس میں بات پوری تو ہو جائے۔ مگر اس کا کوئی نام علیحدہ نہ رکھا گیا ہو جیسے ہم لوگ جملہ یا کلام بولتے ہیں اور اس کو آیت اس لئے کہتے ہیں۔ کہ آیت کے معنی ہیں نشانی اور قرآن پاک کا ہر جملہ قرآن پاک کی حقانیت لانے والے کی حقانیت اور بھیجنے والے کی حقانیت کی نشانی ہے سب سے چھوٹی آیت **مُدْهَآمَّتٰنِ** ہے۔ اور سب سے بڑی آیت سورہ **مداینہ** جو سورۂ بقر کے آخیر رکوع میں ہے **سورت** سُور سے بنا ہے۔ اس کے معنے ہوتے ہیں گھیرنے والی چیز اسی لئے شہر کے آس پاس کی دیوار (شہر پناہ) کو سُوْرُ الْبَلَدِ کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ شہر کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ قرآن پاک کی اصطلاح میں سورۃ قرآن پاک کی وہ عبارت کہلاتی ہے جس میں مضمون پورا ہو گیا ہو۔ اور اس کا کچھ نام بھی رکھ دیا گیا ہو۔ جیسے سورۂ **فلق** سورۂ **بقرہ** وغیرہ سورت اور آیت **دو قسم** کی ہیں مکی اور مدنی۔ مکی وہ ہیں۔ جو

ہجرت سے پہلے اتریں خواہ کہیں اتریں مدنی وہ ہیں جو ہجرت کے بعد اتریں خواہ کہیں اتری ہوں۔ لہذا ہجرت کے بعد جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ تشریف لائے۔ اور وہیں کوئی آیت آئی۔ تو اگرچہ وہ اتری ہے مکہ مکرمہ میں لیکن یہ مدنی کہلائے گی۔ کیونکہ ہجرت کے بعد آئی۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ مکی وہ جو مکہ مکرمہ میں اترے۔ اور مدنی وہ جو مدینہ پاک میں اترے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ اگر مکی مدنی کے یہ معنی ہوتے۔ تو بعض وہ آیتیں جو کہ طائف شریف وغیرہ میں اتریں۔ ان کا نام طائفی آیتیں ہونا چاہئے تھا۔ لہذا سورۂ فاتحہ مکی بھی ہے مدنی بھی۔ قرآن پاک میں سب سے چھوٹی سورت سورہ کوثر ہے۔ اور سب سے بڑی سورۂ بقر ہے۔ **سورتوں کے نام** قرآن پاک کی سورتوں کے نام اسکے بعض مضامین یا بعض مقاصد یا بعض الفاظ سے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً اس سورت کا نام الحمد بھی ہے۔ اس لئے کہ اس میں لفظ الحمد آگیا ہے۔ سورہ بقر کا نام سورۂ بقر ہے۔ اس لئے کہ اس میں کسی جگہ گائے کا ذکر آگیا ہے۔ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ کا نام سورۂ اخلاص ہے۔ اس لئے کہ اس کا مقصود ہے اپنے دین کو خالص اللہ کے لئے بنانا۔ سورت کے نام کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس میں اول سے آخر تک وہی مضمون ہو۔ سورہ بقر میں صدہا مضامین بیان ہوئے۔ مگر اس کا نام سورۂ بقر رکھا گیا۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ طبیب اپنی مرکب دواؤں کے نام مختلف حیثیت سے رکھتے ہیں۔ ایک دوا کا نام ہے "جوارش کمونی" یعنی زیرے کی جوارش تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس میں صرف زیرہ ہی ہے۔ دوائیں اور بھی ہیں۔ مگر ایک جز سے اس کا نام رکھ دیا گیا ہے۔ ایک دوا کا نام ہے "شربت شفا"، چونکہ اس سے شفا مقصود ہے۔ اسی لئے اس کا نام "شربت شفا" ہوا۔ بعض دواؤں کا نام ہے "تریاق نزلہ" اس کا مقصد یہ ہے۔ کہ یہ دوا نزلہ میں استعمال کی جائے۔ یہ بیماری کے نام سے دوا کا نام ہوا جس طرح کہ طبیب جسمانی اپنی دواؤں کے نام چند وجہوں سے رکھتے ہیں۔ ایسے ہی طبیب روحانی نے اپنے قرآن پاک کی سورتوں کے نام چند وجہوں سے رکھے یہ بات بہت خیال میں رہے۔ (**سورۂ فاتحہ کی آیتیں**) یہ سب مانتے ہیں۔ کہ سورۂ فاتحہ میں سات آیتیں ہیں۔ اس کا نام ہی "سبع مثانی" ہے۔ لیکن اس میں اختلاف ہے۔ کہ سات آیتیں کونسی ہیں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بِسْمِ اللّٰهِ پہلی آیت ہے۔ اور صِرَاطَ الَّذِيْنَ سے وَلَا الضَّآلِّيْنَ تک ایک آیت یعنی عَلَيْهِمْ پر وقف نہیں۔ بلکہ ان کے یہاں بسم اللہ ہر سورت کی پہلی آیت ہے۔ اسی لئے ان کے مذہب میں امام بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھتا ہے۔ اور حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بسم اللہ اس سورت کا جز نہیں پہلی آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ہے۔ اور عَلَيْهِمْ پر وقف ہے۔

## سورۂ فاتحہ کے فضائل اور فوائد

اس سورت کے فضائل بے شمار ہیں کچھ "تفسیر کبیر" وغیرہ سے نقل کئے جاتے ہیں "مسلم شریف" میں ہے۔ ایک مرتبہ ایک فرشتے نے آسمان سے نازل ہو کر بارگاہ نبوت میں عرض کی۔ کہ یا رسول اللہ مبارک ہو۔ آپ کو دو نور ایسے ملے۔ کہ جو کسی نبی کو نہ ملے۔ ایک سورہ فاتحہ اور دوسرا سورۂ بقر کی آخری آیتیں "ترمذی شریف" میں ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ فاتحہ کی مثل توریت و انجیل و زبور میں کوئی سورت نہ اتری "تفسیر کبیر" میں ہے۔ کہ رب تعالیٰ نے آسمان سے ایک سو چار کتابیں اور صحیفے اتارے۔ مگر سو کتابوں کے علوم چار میں رکھے یعنی توریت انجیل زبور و قرآن پھر ان چار کے علوم قرآن پاک میں رکھے پھر قرآن پاک کے علوم مفصل (سورہ حجرات سے والناس تک ہیں) رکھے گئے پھر مفصل کے علوم سورہ فاتحہ میں رکھے گئے۔ لہذا جس نے سورہ فاتحہ سیکھ لی۔ اس نے گویا ساری آسمانی کتابیں سیکھ لیں۔ اور جس نے سورۂ فاتحہ پڑھ لی اس نے تمام آسمانی کتابیں پڑھ لیں نیز یہ سورت بالکل رحمت کی سورت ہے۔ اس لئے اس میں ربّ تعالیٰ کے قہر اور جبر اور دوزخ عذاب وغیرہ کا ذکر نہیں۔ بلکہ اس میں وہ حرف بھی نہیں آئے جو جہنم وغیرہ کے اوّل میں آتے ہیں۔ چنانچہ اس سورت میں سات حرف نہیں ث۔ ج۔ خ۔ ز۔ ش۔ ظ۔ ف کیونکہ ث ثبور کا پہلا حرف ہے جس کے معنے ہیں ہلاکت جیم جہنم کا پہلا حرف ہے جس کے معنے ہیں دوزخ۔ خ خِزْیٌ کا پہلا حرف ہے جس کے معنی ہے رسوائی۔ ذ فیر اور زقوم کا پہلا حرف ہے ذفیر دوزخیوں کی آواز اور زقوم تھوہر (جہنمیوں کی غذا) ش شھیق کا پہلا حرف ہے جس کے معنی ہیں جہنمیوں کی آواز۔

ظ ظِل جو کہ قرآن پاک میں اس طرح مذکور ہے۔ ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ اور ظُلْمَۃٌ کا پہلا حرف ہے "تفسیر روح البیان" میں ہے کہ جس وقت یہ سورت اتری اس وقت حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے آئے تھے۔ **فوائد:۔** سورہ فاتحہ کے بے شمار فائدے ہیں جن میں سے چند بیان کئے جاتے ہیں۔ جو شخص سورہ فاتحہ سو بار پڑھ کر دعا مانگے حق تعالیٰ اس کی دعا قبول فرمائے گا۔ جو شخص مریض لا دوا ہو وہ چینی کے سفید برتن میں آب زمزم اور زعفران سے سورۂ فاتحہ لکھ کر دھو کر اکتالیس روز تک پیتا رہے۔ تو انشاء اللہ شفا ہو گی۔ اگر آب زمزم نہ ملے۔ تو عرق گلاب لے لے۔ اگر یہ بھی نہ میسر ہو تو کنویں کا پانی ہی کافی ہے۔ "تفسیر کبیر" میں ہے۔ کہ بعض گنہگار قوموں پر عذاب الٰہی آنے والا ہو گا مگر اُن میں سے کوئی بچہ مکتب میں جا کر فاتحہ پڑھے گا۔ اس کی برکت سے چالیس سال تک کے لئے عذاب دور ہو جائیگا جو شخص کسی دنیوی بلا میں پھنس گیا ہو۔ وہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی میم کو الحمد کے لام میں ملا کر پڑھا کرے۔ ان شاء اللہ اُس سے نجات ملے گی **بعض صوفیاء** کے یہاں یہ عمل ہوتا ہے۔ کہ اگر کسی شہر میں طاعون یا کوئی اور وبائی بیماری پھیلے۔ تو ایک تاشا یا نقارہ پر دائرہ کی شکل میں سورۂ جمعہ اور بعد میں سورۂ فاتحہ کو لکھتے ہیں۔ اور بیچ میں پندرہ کا نقش بناتے ہیں۔ پھر ایک دُنبے کے سامنے یہ تاشا بجاتے ہیں۔ اور تاشا بجاتے ہوئے اِس دُنبے کو گلی کوچے میں گشت کراتے ہیں۔ اس کے بعد اُس دُنبے کو کنارہ شہر پر ذبح کر کے اُس کا خون دفن کر دیتے ہیں۔ اور اس کا گوشت فقیروں پر خیرات کر دیتے ہیں۔ تو بفضلہ تعالیٰ اس وبا سے امن ملتی ہے **بعض** صحابہ کرام نے سانپ کاٹے ہوئے پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا اُسے آرام ہوا۔ غرضیکہ اس کی بے شمار فائدے ہیں۔

## سورۂ فاتحہ کے مسائل

**مسئلہ:۔** ہر نماز میں اس سورت کا پڑھنا واجب ہے۔ فرض نماز میں تو اوّل دو رکعتوں میں اور فرض کے علاوہ دیگر نمازوں میں ہر رکعت میں **مسئلہ۔** امام کے پیچھے مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنا سخت منع ہے۔ قرآن پاک فرماتا ہے کہ جب قرآن پاک پڑھا جائے تو تم خاموش رہو اور کان لگا کر سنو۔ لہٰذا جو شخص امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھتا ہے۔ وہ اس آیت کریمہ کے خلاف عمل کرتا ہے "مسلم شریف" میں ہے۔ کہ اِذَا قَرَاَ فَاَنْصِتُوْا جب امام قراءت قرآن کریم کرے تم خاموش رہو۔ دوسری حدیث شریف میں آتا ہے۔ قِرَاءَۃُ الْاِمَامِ لَہٗ قِرَاءَۃٌ امام کا قرآن پاک پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے۔ **نیز** تقریباً اسّی جلیل القدر صحابہ کرام سے منقول ہے۔ کہ وہ حضرات امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کو پڑھنے سے منع فرماتے تھے۔ اُن میں سے حضرت علی مرتضٰے اور عبداللہ ابن مسعود وغیرہم رضی اللہ عنہم اجمعین بھی ہیں۔ دیکھو "شامی" جلد اوّل باب القراءت اور اگر احادیث کی پوری تحقیق کرنی منظور ہو تو "طحاوی شریف" "صحیح البہاری شریف"، اور "مؤطا امام محمد" وغیرہم **نیز** اگر مقتدی پر سورہ فاتحہ پڑھنا ضروری ہوتی۔ تو جو شخص رکوع میں امام سے ملتا وہ رکعت نہ پاتا۔ کیونکہ اس کا فرض یعنی سورۂ فاتحہ پڑھنا رہ گیا۔ **نیز** بادشاہوں کی بارگاہ میں حاضر ہونے والے دربار کے آداب سب بجا لاتے ہیں اور سلام سب عرض کرتے ہیں۔ مگر کلام اُن سب کی طرف سے ایک ہی کرتا ہے۔ نماز میں بھی بارگاہ الٰہی میں حاضری ہے۔ لہٰذا نماز کے ارکان۔ رکوع۔ سجدہ۔ قیام وغیرہ سب ادا کریں کیونکہ یہ اس کے دربار کے آداب ہیں۔ اور التحیات وغیرہ سب پڑھیں۔ کیونکہ یہ اس دربار کا سلام وغیرہ ہیں۔ مگر قرآن پاک کی تلاوت فقط ایک امام ہی کرے۔ کیونکہ یہ عرض و معروض ہے۔ حدیث شریف میں جو ہے۔ کہ بغیر سورہ فاتحہ نماز نہیں ہوتی۔ یہ ہمارے خلاف نہیں کیونکہ جب امام نے سورۂ فاتحہ پڑھ لی۔ تو یہ نماز سورۂ فاتحہ سے خالی نہ رہی۔ **نیز** یہ حدیث تو فرماتی ہے۔ کہ سورۂ فاتحہ نماز میں ضرور پڑھی جائے۔ اور قرآن کریم فرماتا ہے۔ کہ جب قرآن پاک پڑھا جائے۔ تو تم سنو اور خاموش رہو۔ ان دونوں کو اس طرح جمع کر لو۔ کہ امام اور اکیلا نمازی سورۂ فاتحہ پڑھے۔ اور مقتدی خاموش رہے۔ قرآن پاک پر بھی عمل ہو گیا۔ اور حدیث شریف پر بھی **نیز** حدیث تو فرماتی ہے۔ کہ بغیر سورۂ فاتحہ نماز نہیں ہوتی۔ لیکن قرآن کریم فرماتا ہے۔ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ کہ جس قدر قرآن پاک میسر ہو۔ پڑھ لو۔ لہٰذا اس حدیث شریف اور قرآن پاک کو اس طرح جمع کیا جائے گا۔ کہ مطلقاً قرآن پڑھنا تو فرض اور سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب **نیز** ایک حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے۔ کہ نماز بغیر سورۂ فاتحہ اور دوسری سورت کے ملائے نہیں ہوتی حالانکہ

دوسری سورت کا ملانا کسی کے نزدیک بھی مقتدی پر ضروری نہیں۔ بلکہ مقتدی کے لئے منع ہے غرض کہ صحیح یہی ہے۔ کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ ہرگز نہ پڑھی جائے۔ مسئلہ نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ تلاوت کی نیت سے پڑھنا منع ہے۔ ہاں اگر دعا کی نیت سے پڑھے تو جائز ہے۔ اس کے باقی مسائل انشاء اللہ اپنے اپنے موقع پر آئیں گے۔

اِس آیت میں چار باتیں قابلِ غور ہیں (۱) قرآن کریم میں سب سے پہلے یہ آیت کیوں آئی (۲) اس کی عالمانہ اور صوفیانہ تفسیر کیا ہے (۳) اس سے مسلمانوں کو فائدے اور سبق کیا کیا حاصل ہوئے (۴) ان پر سوالات کیا ہیں اُن کے جوابات کیا (۱) چند وجہوں سے اس آیت کو سب سے پہلے رکھا گیا۔ ایک یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا ہوتے ہی چھینک آئی۔ آپ نے فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اسی لئے ہم کو بھی حکم ہے کہ چھینک کر یہ پڑھیں اور سُننے والا جواب دے یَرْحَمُکُمُ اللّٰہُ پھر چھینکنے والا جواب دے۔ یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ معلوم ہوا کہ یہ وہ پہلا کلمہ ہے جو حضرت انسان کے منہ سے نکلا۔ رب تعالیٰ نے اپنے کلام کو بھی اسی سے شروع فرمایا۔ **دوسرے** یہ کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ میں آٹھ حروف ہیں۔ اور جنّت کے دروازے بھی آٹھ ہیں۔ تو جو شخص صفائی قلب سے اسے پڑھے گا۔ وہ انشاء اللہ جنّت کے آٹھوں دروازوں کا مستحق ہوگا۔ اس میں اشارہ اس طرف ہے۔ کہ قرآن پاک شروع کرتے ہی پڑھنے والا جنت کا مستحق تو ہو چکا اب آگے جس قدر پڑھے گا۔ رب تعالیٰ کے فضل و کرم میں زیادتی ہی ہوگی **تیسرے** یہ کہ عبادت کی جان اللہ کی تعریف ہے اسی کو قرآن کریم نے پہلے بیان کیا **چوتھے** یہ کہ اس میں مسلمانوں کو سبق ہے کہ اپنا ہر کام خدا کی حمد سے شروع کیا کریں۔ کیونکہ رب کی کتاب بھی اسی سے شروع ہوئی ہے۔ **پانچویں**۔ یہ کہ جب کسی بادشاہ سے کچھ عرض کرنا ہوتا ہے۔ تو پہلے اس کی تعریف کی جاتی ہے۔ اسی طرح جب کسی کو خط لکھتے ہیں۔ تو اوّلاً اس کے القاب لکھتے ہیں بعد میں اپنا مطلب۔ چونکہ سورۂ فاتحہ میں بھی بندوں کو دعا سکھائی گئی۔ اس لئے اسے حمد سے شروع کیا گیا ہے۔ (تفسیر) اس کی عالمانہ تفسیر تو یہ ہے۔ کہ اس میں تین کلمے ہیں۔ الف۔ لام۔ حمد۔ لِلّٰہ ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ تحقیق کی جائے۔ **الف**۔ لام میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ استغراقی ہے۔ دوسرے یہ کہ عہدی ہے (تفسیر روح البیان) اگر استغراقی ہے تو معنے یہ ہوں گے۔ کہ ہر حمد ہر زمانے میں ہر حالت میں ہر حمد کرنے والے سے خاص ہے اللہ کے لئے حمد کا عام ہونا۔ الف۔ لام سے حاصل ہوا اور حمد کے عام ہونے سے حامد کا عموم حاصل ہو گیا۔ اور جملے اسمیئے سے ہمیشگی معلوم ہوئی۔ تو اب کلام کا مقصود یہ ہوا۔ کہ کوئی بھی تعریف کرے کبھی بھی کرے کسی حالت میں کرے سب تعریف اللہ ہی کی ہوئی۔ وہ اس طرح کہ اگر ربّ کی تعریف کرو۔ تو ظاہر ہے۔ کہ وہ تعریف بلا واسطہ ربّ کی تعریف ہے۔ اور اگر اس کی کسی مخلوق کی تعریف کرو۔ نبی، ولی، چاند، سورج، موتی وغیرہ جس کی بھی تعریف کی جائے۔ وہ بالواسطہ ربّ ہی کی تعریف ہے۔ کیونکہ چیز کی تعریف حقیقت میں بنانے والے کی تعریف ہوتی ہے۔ مکان کی تعریف حقیقت میں اس کاریگر کی تعریف ہے جس نے وہ مکان بنایا۔ خط کی تعریف حقیقت میں اس کے لکھنے والے کی تعریف ہے جس نے اسے لکھا۔ اسی طرح دنیا کی ہر چیز کی تعریف حقیقت میں اس کے بنانے والے کی ہے۔ اسی لئے حضور علیہ السلام کی نعت حقیقت میں رب کی حمد ہے۔ پھر زبان سے تعریف کرو۔ تو اللہ کی تعریف ہاتھ پیر سے اپنے عاجزی کا اظہار کرو۔ مثلاً نماز پڑھو۔ روزہ رکھو تو رب کی تعریف اس کی اطاعت میں مال خرچ کرو۔ مثلاً زکوٰۃ، صدقہ فطر، قربانی ادا کرو۔ تو یہ رب کی عملی تعریف ہے۔ خانہ کعبہ کا طواف حضور پاک کے روضۂ اطہر کی تعظیم قرآن پاک کی عظمت ماہ رمضان کا

ادب اور احترام۔ اولیاء اللہ کے تبرکات اور ان کی قبور کی تعظیم حقیقت میں رب کی عملی تعریف ہے۔ قرآن پاک فرماتا ہے۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ "جو شخص رب کی نشانیوں کی تعظیم کرے تو وہ دل متقی ہے"۔ حکومت کے دفتروں کچہریوں اور اس کے خدام کی عظمت درحقیقت حکومت کی عزت ہے۔ ان میں سے ایک کی بھی توہین حقیقت میں حکومت کی توہین اور اس سے بغاوت ہے۔ الف۔ لام استغراقی نے ان سب باتوں کو اپنے میں لے لیا۔ اسی طرح خدا کی نعمت ملنے پر اس کا شکر کرنا۔ اور تکالیف میں آنے پر صبر کرنا یہ بھی رب تعالیٰ کی تعریف ہے۔ بندے کو چاہیئے کہ ہر حال میں خدا کی حمد کرے۔ نعمت میں اس لئے حمد کرے کہ خدا کے فضل کا شکریہ ہے۔ اور تکلیف میں اس لئے حمد کرے۔ کہ جو تکلیف ہم پر آئی ہے۔ وہ کسی گناہ کی وجہ سے آئی۔ خدا کی حمد اس گناہ کا کفارہ بن جائے گی جب گناہ مٹ جائے گا تکلیف اپنے آپ جاتی رہے گی۔ یہ ہوئی ہر حالت کی حمد اسی طرح ہر نعمت کا شکریہ اور اس کی حمد علیحدہ علیحدہ ہے۔ تندرستی کی حمد یہ ہے کہ اس میں رب کی عبادت بیماروں کی تیمارداری اور بے دست و پا کی خدمت کرے بال کا شکر اور حمد یہ ہے کہ اس سے غریبوں کی امداد کرے۔ اسی طرح ہر عضو کی حمد اور شکر الگ الگ ہے۔ آنکھ کا شکر اور حمد یہ ہے۔ کہ کعبہ معظمہ کو۔ قرآن پاک کو علماء دین کے چہروں کو دیکھے۔ کان کی حمد اور شکر یہ ہے۔ کہ اس سے قرآن پاک کی تلاوت۔ نعت شریف علمی مضامین علماء دین کا وعظ سُنے۔ ہاتھ پاؤں کی حمد اور شکر یہ ہے۔ کہ ان سے مرضی الٰہی کے کام لے۔ فقط الف۔ لام نے ان سب باتوں کو گھیر لیا۔ انسان کی پیدائش سے پہلے نا معلوم کون کون سی چیزیں دنیا میں کب کب آباد تھیں اور اب بھی نا معلوم اس عالم میں کس قدر مخلوقات ہے۔ ان کو ان کا پیدا کرنے والا ہی جانتا ہے۔ اور ہر چیز خدا کی تعریف کرتی ہے۔ اور ہمیشہ سے کرتی رہی اور کرتی رہے گی۔ غرضکہ جب سے وقت بنا۔ اور جب تک وقت رہے گا۔ رب کی حمد ایک آن کیلئے بند نہ ہوگی۔ "وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ" ہر چیز رب کی حمد اور تعریف کرتی ہے۔ یہ ہوا۔ اس حمد کے زمانے کا عموم) ان سب کو جملے اسمیئے نے گھیر لیا۔ **دوسرا احتمال** یہ ہے۔ کہ الف۔ لام عہدی ہو۔ تب اس کے معنے یہ ہوں گے۔ کہ وہ خاص حمد اللہ کی ہے۔ یعنی رب تعالیٰ ہر حمد قبول نہیں فرماتا۔ بلکہ کوئی خاص حمد اس کے ہاں مقبول ہوتی ہے۔ اب وہ خاص حمد کونسی ہے۔ وہ وہ حمد ہے۔ جو اس کے محبوب صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے اپنے رب کی کی۔ یا ان کے بتانے سے کوئی اور کرے۔ اس لئے آپ کا اسم شریف ہے "احمد" یعنی رب کی بہت حمد کرنے والے۔ اور رب کا نام ہے "محمود" یعنی اپنے پیارے محبوب کا حمد کیا ہوا۔ حدیث شفاعت میں وارد ہے۔ کہ رب تعالیٰ قیامت کے دن ہم کو اپنی خاص حمدیں الہام فرمائے گا۔ ہم سجدے میں ان سے رب کی حمد کر کے اپنی اُمت کی شفاعت کریں گے اور حقیقت بھی یہ ہے۔ آج ہندو عیسائی سکھ آریے وغیرہ تمام کفار اپنے اپنے خیال میں خدا کی تعریف کرتے ہیں۔ مگر ان میں سے کسی کی حمد قبول نہیں حمد مسلمانوں ہی کی قبول ہے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ مسلمان محبوب علیہ السلام کی بتائی ہوئی حمد کرتے ہیں اور وہ لوگ ان سے علیحدہ ہو کر یا اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ حمد خدا کے ہاں مقبول ہے جو اس کے محبوب علیہ السلام کی نعت کے ساتھ ہو۔ جو حمد الٰہی نعت مصطفےٰ علیہ السلام سے خالی ہو مردود ہے شیطان کی ساری عبادتیں بیکار ہو گئیں۔ تمام کفار کی ساری حمدیں غیر مقبول کیوں؟ اس لئے کہ اس میں نعت کی چاشنی نہیں۔ اسی لئے کلمہ۔ نماز خطبہ اذان۔ غرض کہ مسلمانوں کی کوئی عبادت حضور علیہ السلام کی نعت سے خالی نہیں ؎

ذکر خدا جو ان سے جدا چاہو نجدیو ۔ واللہ ذکر حق نہیں کنجی سقر کی ہے

ذکر سب پھیکے جب تک نہ مذکور ہو ۔ نمکیں حسن والا ہمارا نبی (صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم)

حمد خدا روحانی غذا ہے۔ اور نعت مصطفےٰ علیہ السلام اس کا نمک ہے۔ بغیر نمک ساری غذا بیکار۔ بغیر نعت مصطفےٰ علیہ السلام ساری حمد برباد۔ پہلی صورت میں تو واقعی حمد کا ذکر تھا۔ یعنی واقعہ میں تمام حمدیں اللہ کی ہوتی ہیں۔ اور اس صورت میں حمد مقبول کا تذکرہ ہے۔ یعنی واقعہ میں تو سب حمدیں اللہ ہی کی ہیں۔ لیکن مقبول حمد وہی ہے۔ جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی ہو۔ **تیسرے** معنی اس کے یہ بھی ہو

سکتے ہیں. کہ وہ خاص حمد اللہ کی ہے یعنی ساری مخلوق میرے محبوب علیہ السلام کی حمد و ثنا کرے. مگر جیسی چاہیئے ویسی نہیں کر سکتی محبوب علیہ السلام کی کامل حمد وہی ہے. جو رب نے کی. اسی لئے رب کا نام ہے. حامدؔ اور حضور علیہ السلام کا نام ہے "محمدؐ" یعنی رب تعریف فرمانے والا کس کی؟ اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اور مُحَمَّدٌ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) تعریف کئے ہوئے کس کے؟ اپنے رب کے پہلی تمام توجیہوں کی بنا پر اس آیت میں اللہ محمودؔ ہے. اور ساری مخلوق یا نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس کے حامدؔ ہوئے. لیکن اس آخری توجیہ کی رو سے حضور علیہ السلام محمودؔ ہیں اور اللہ "حامدؔ". تو یہ آیت جس طرح حمد خدا ہے. اسی طرح نعت مصطفےٰ بھی ہے. صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حمد تین چیزوں میں فرق کرنا چاہیئے. حمد و مدح اور شکر حمد کے معنے ہیں کسی کی اختیاری خوبی بیان کرنا خواہ وہ کوئی نعمت دے یا نہ دے شکر کے معنے ہیں. کسی کی اختیاری خوبی ظاہر کرنا. اس لئے. کہ اس نے ہم کو کچھ دیا ہے. اور مدح کسی کی خوبی بیان کرنا خواہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری موتی کی صفائی کی تعریف کی جائے. تو یہ اس کی مدح ہے. اور جب کوئی ہم کو کچھ دے. اور ہم اس کی تعریف میں کہہ دیں. کہ آپ سخی ہیں. یا جھک کر اسے سلام کریں. تو یہ اس کا شکر ہے. اور ویسے ہی کسی کی تعریف کریں. کہ فلاں بڑا عالم ہے یہ اس کی حمد ہے. لیکن اس آیت میں لفظ حمد تینوں معنیٰ کو شامل ہے. اسی لئے آگے اللہ کا نام ذاتی اور اس کی کچھ صفتوں کا ذکر کیا گیا. لفظ اللہ نے حمد کے حقیقی معنے کو بیان کیا. اور الرَّحْمٰنِ اور الرَّحِيْمِ نے شکر کے معنے اور "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" نے مدح لِلّٰہ کے لام میں تین احتمال ہیں. یا خصوصیت کا لام ہو. یا استحقاق کا یا ملکیت کا. تو معنے اس آیت کے یہ ہونگے. کہ تمام حمدیں اللہ کے ساتھ خاص ہیں. یا اللہ ان کا مستحق ہے. یا وہ اللہ کی ملکیت ہیں. اب جو شخص بھی غیر اللہ کو اپنا معبود جان کے اس کی تعریف کرے. گویا خدا کی امانت میں خیانت کرتا ہے. کیونکہ حمد ملک تو ہے خدا کی اور اس نے صرف کی اور جگہ "تفسیر صوفیانہ" صوفیا کرام فرماتے ہیں. کہ حمد کے معنے ہیں محمود کے کمال کو ظاہر کرنا. اور جو شخص یا جو چیز اپنے میں جو بھی کمال رکھتی ہے. وہ حقیقت میں رب ہی کا کمال ہے. لہٰذا دنیا کی چیزوں کے کمال کا ظہور خدا کی حمد ہے. اس کا مطلب صاف یہ ہوا. کہ کوئی شخص زبان سے خدا کی حمد کرے یا نہ کرے. رب تعالیٰ کی حمد کرے یا بُت پرستی کرے. لیکن ہر حال میں اس کے رونگٹے رونگٹے سے حق تعالیٰ کی صفت کا ظہور ہو رہا ہے. اور یہ خدا کی حمد ہے. ایک بُت پرست بُت کو سجدہ کر رہا ہے. اپنی حماقت سے اپنی اختیاری تعریف کو غلط جگہ صرف کر رہا ہے لیکن اس کے جسم کی بناوٹ اور اس کے ہاتھ پاؤں کی طاقت اس کی قوت گویائی غرض کہ اس کا ہر عضو اور اُس کی ہر حرکت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ میرا خالق بے نیاز ہے. اور بزبان حال اس پر لعنت کرتی ہے. کہ اے اندھے تو کر کیا رہا ہے؟ غرض یہ کہ اس کی بُت پرستی کی حالت میں بھی اس کی غیر اختیاری حمد اللہ ہی کے لئے ہو رہی ہے ؎

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار　　　　ہر ورق دفترے ست معرفت کردگار

اگر یہ کمبخت خود اپنے کو پہچان لیتا. تو بُت پرستی کبھی نہ کرتا یہی معنے اس حدیث کے ہیں. کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ. **دوسری توجیہ** صوفیائے کرام فرماتے ہیں. کہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰهُ. صرف حق تعالیٰ ہی موجود ہے. دنیا کی باقی سب چیزیں اس کا سایہ اور اعتبار ہیں. اور سایے کی تعریف حقیقت میں سایے والے کی تعریف ہے. لہٰذا جس کی تعریف کرو رب ہی کی تعریف ہے. کیونکہ وہ اس کے وجود ہی کا ظل ہے. حقیقتِ محمدیہ اس کا اعتبار اوّل یا عکس اوّل. باقی سارا عالم. اس کے اعتبارات بلا تشبیہ یوں سمجھو. کہ دھوپ میں ایک آئینہ رکھا ہے جس میں آفتاب کا عکس آ رہا ہے. اس کے مقابلے میں کسی کوٹھڑی میں بہت سے رنگ برنگے آئینے رکھے ہیں اس آئینے کی وجہ سے ان تمام آئینوں میں آفتاب کے عکس پہنچ رہے ہیں. لیکن چونکہ ان کے رنگ الگ الگ ہیں. لہٰذا مختلف رنگ سورج کے عکس نظر آ رہے ہیں. دیکھو اصل تو وہ آفتاب ہے جو آسمان پر چمک رہا ہے. اس کا پہلا سایہ دھوپ والے آئینے میں ہے. اور اس کے دیئے ہوئے عکس کوٹھڑی کے سارے آئینوں میں ہیں. اب ان عکسوں میں سے جس کے حسن جمال اور نور کی تعریف کرو. وہ حقیقت میں آسمان والے

اصل سورج کی تعریف ہے۔ اسی طرح حقیقی نور حق تعالیٰ (اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) حقیقت محمدیہ پہلا آئینہ باقی سارا عالم وہ کوٹھڑی والے رنگ رنگ کے آئینے ہیں۔ اب اگر بیچ میں یہ دھوپ والا آئینہ نہ ہو۔ تو یہ کوٹھڑی کے آئینے سب بے نور رہ جائیں۔ اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ اَنَا نُوْرٌ مِّنْ نُّوْرِ اللّٰہِ وَکُلُّ الْخَلَائِقِ مِنْ نُّوْرِیْ " لہٰذا ثابت ہوا کہ ساری حمد اللہ کی ہے کیونکہ وہ خود ہی حامد خود ہی محمود اور خود ہی حمد ہے۔ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ ہماری اس تحریر سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عالم کے ذرے ذرے میں موجود ہونے کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس مسئلہ کو صوفیائے کرام مسئلہ وحدت الوجود کہتے ہیں حقیقت میں یہ مسئلہ کسی حال والے سے سمجھنا چاہئیے قال کا دائرہ بہت تنگ ہے۔

**مسائل فقہیہ** جمعہ کے خطبہ میں حمد پڑھنا واجب ہے۔ اور خطبۂ نکاح اور دعا اور ہر جائز کام کے اول اور آخر میں اور ہر کھانے پینے کے بعد حمد کرنا مستحب ہے چھینک آنے کے بعد حمد کرنا سنت مؤکدہ ہے۔ **اعتراض**۔ آریوں نے اس پر چند اعتراض کئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ کلام اللہ کا نہیں کسی بندے کا بنایا ہوا ہے۔ اگر خدا کا ہوتا۔ تو اس طرح ہوتا اَلْحَمْدُ لِیْ۔ دوسرے یہ کہ آگے آرہا ہے۔ ہم تجھی کو پوجتے ہیں۔ رب کس کو پوجتا ہے تیسرے یہ کہ خدا اپنی تعریف اپنے آپ کرے یہ غرور ہے۔ اور غرور کرنا اور شیخی مارنا بری بات ہے۔ **جواب** یہ کلام اللہ کا ہے۔ اور بندوں سے کہلوانے کے لئے اسی طرح بولا گیا ہے جیسے استاد۔ شاگرد کو سامنے بٹھا کر کتاب خود پڑھتا ہے تاکہ شاگرد بھی اسی طرح پڑھے۔ نیز کبھی حاکم دوسرے کی زبان میں بات کرتا ہے۔ ممبری کے فارم چھپوائے جاتے ہیں۔ اس کی عبارت اس طرح ہوتی ہے۔ کہ میں اقرار کرتا ہوں۔ کہ سارے قوانین کی پابندی کروں گا ہمیشہ اس کا خیر خواہ رہوں گا وغیرہ وغیرہ۔ دیکھو ان فارم کا مضمون بنانے والا کوئی اور ہے۔ لیکن چونکہ ممبروں سے یہ کہلوانا مقصود ہے۔ اس لئے اس کی زبان میں یہ الفاظ لکھے گئے۔ تو اس آیت کا مطلب یہ ہے۔ کہ اے بندو ہماری بارگاہ میں آکر اس طرح کہا کرو۔ رب تعالیٰ اگر اپنی ذات و صفات خود ہم سے بیان نہ فرماتا۔ تو ہمیں اس کا پتہ کیسے چلتا۔ یہ شیخی نہیں ہے۔ بلکہ بندوں کو اپنی پہچان کرانی ہے۔ ایک بادشاہ اپنی رعایا سے کہتا ہے۔ کہ مجھے تم پر فلاں فلاں اختیارات ہیں۔ اور میری یہ شان ہے۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے۔ کہ رعایا ان باتوں سے خبردار ہو کر اس کی اطاعت کرے۔ اسی طرح یہاں بھی ہے غرض کہ یہ اعتراض محض حماقت ہے۔ **دیوبندی اعتراض**۔ دیوبندی کہتے ہیں۔ کہ اسی آیت سے معلوم ہوا کہ ہر حال میں بندہ اللہ ہی کی حمد اور اُسی کا ذکر کرے۔ اٹھتے بیٹھتے یارسول اللہ اور یا غوث کہنا کسی اور کا نام جپنا شرک ہے۔ **جواب**۔ اللہ والوں کی تعریف اور ان کا ذکر حقیقت میں خدا ہی کی تعریف اور اس ہی کا ذکر ہے۔ بلکہ کامل حمد اللہ کی وہی ہے۔ جو اس کے خاص بندوں کے ذکر کے ساتھ ہو جیسا ہم اوپر بیان کر چکے۔ اگر اٹھتے بیٹھتے غیر خدا کی تعریف کرنا شرک ہے۔ تو تم بھی اٹھتے بیٹھتے اپنے مولویوں کی تعریف کرتے ہو تم مشرک ہوئے۔ کہ نہیں۔

## رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

| مالک یا پالنے والا | سارے | جہانوں |
|---|---|---|

جو مالک سارے جہان والوں کا۔

**تعلق**، اس کا تعلق حمد سے چند طرح ہے۔ **ایک** یہ کہ اُس میں سب بندوں کو رب کی حمد کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور اس میں اس کی وجہ بتائی گئی۔ یا یہ کہ دعوے تھا۔ کہ سب تعریفیں اللہ ہی کی ہیں اس میں اس کی دلیل بیان کی گئی یعنی ساری تعریفیں اللہ کے لئے ہیں کیونکہ وہ تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ اور جو جہانوں کو پالے وہ تعریف کا مستحق بھی ہے۔ **دوسرے** اس طرح کہ رب کی حمد کرنے والے چار قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو کہ محض رب کو راضی کرنے کے لئے اس کی حمد کریں۔ اور کوئی اپنا نفع ان کے مدنظر نہ ہو۔ جیسے حضرات

انبیاء کرام علیہ السلام اور خواص اولیاء اللہ۔ دوسرے وہ جو کہ اپنے پر اس کے بے شمار احسانات دیکھ کر اس کی حمد کریں، جیسے عام شکر گزار بندے۔ تیسرے وہ جو کہ آئندہ رحمت کی امید پر اس کی حمد کریں۔ جیسے عام گنہ گار امیدوار بندے۔ چوتھے وہ جو اس کی ہیبت اور جلالت سے ڈر کر اس کی حمد کریں۔ پہلے گروہ کیلئے فرمایا گیا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ دوسرے گروہ کے لئے فرمایا رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی چونکہ وہ تم کو برابر پال رہا ہے۔ روزی دے رہا ہے۔ اس کی حمد کرو تیسرے گروہ کے لئے فرمایا گیا اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ یعنی چونکہ وہ تم پر آئندہ بھی رحم فرمائے گا۔ لہٰذا تم اس کی حمد کرو چوتھے گروہ کے لئے فرمایا۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ۔ یعنی چونکہ وہ شہنشاہ ہے۔ ہر طرح تم پر قدرت رکھتا ہے۔ اس سے ڈرو۔ اور اس کی حمد کرو۔ غرض کہ چاروں جملوں میں نہایت اعلیٰ درجے کا تعلق ہے۔ اور ترتیب کیسی عمدہ ہے کہ حمد کرنے والوں کے مرتبوں کے مطابق ہے۔

**تفسیر** لفظ ربّ کے تین معنے ہیں۔ مالک۔ سردار۔ پالنے والا۔ اور تینوں معنے اس جگہ درست ہو سکتے ہیں۔ مالک تو اس لئے کہ سارے جہانوں کا مالک ہونا۔ ہمیشہ سے مالک ہونا۔ ہمیشہ تک مالک رہنا۔ ہر طرح مالک ہونا۔ حقیقی مالک ہونا۔ یہ خاص حق تعالےٰ ہی کی صفت ہے جس کسی کو اس نے ملکیّت عطا فرمائی وہ محدود ہے کسی خاص وقت سے ہے کسی خاص وقت تک کے لئے ہے۔ خاص حیثیت سے ہے۔ اور ربّ کی عطا سے ہے۔ آپ اپنے جانور کے مالک ہیں۔ لیکن اس کی ہر چیز کے مالک نہیں نہ ہمیشہ سے مالک تھے۔ اور نہ ہمیشہ مالک رہیں گے۔ اسی طرح اور چیزوں کو بھی قیاس کر لو۔ سردار کے معنے اس لئے درست ہیں۔ کہ سردار وہ جو بلند مرتبہ رکھے۔ اور بیشک حق تعالےٰ سب سے بلند مرتبے والا اور اعلیٰ ہے جس کسی کو عزت اور عظمت ملی۔ اسی کی عطا سے ملی۔ اسی لئے اس کا نام اعلیٰ عظیم اور اس کی صفت تعالےٰ ہے۔ تیسرے معنے ہیں پالنے والا۔ اس معنے میں نہایت ہی وسعت ہے۔ کس کو پالنے والا۔ کب سے پالنے والا۔ کب تک پالنے والا۔ اور کس طرح پالنے والا۔ کس کو پالنے والا۔ تو ربّ العالمین نے بمعلوم ہؤا۔ کہ سارے جہانوں کو پالنے والا۔ کب سے اور کب تک پالنے والا بھی اسی سے معلوم ہؤا۔ کہ جب سے عالم ہے۔ اور جب تک رہے گا۔ اس کی ربوبیت کی بارش ان پر ہوتی رہے گی۔ کس طرح پالنے والا۔ یہ بھی اسی سے معلوم ہوا۔ یعنی ہر طرح اور ہر نوعیت سے پالنے والا۔ اب اس کو یوں سمجھو۔ کہ دنیا کے ظاہری پالنے والوں کی تربیت اس وقت شروع ہوتی ہے جب کہ وہ چیز پہلے بن کر سامنے آجائے۔ اور بہت جلد ختم ہو جاتی ہے۔ اور خاص قسم کی تربیت ہوتی ہے۔ عام نہیں ہوتی۔ اور خاص خاص کی تربیت ہوتی ہے۔ ہر ایک کو کوئی نہیں پالتا۔ دیکھو دنیا میں سب سے بڑے پالنے والے ماں باپ مانے گئے ہیں جن کے متعلق ربّ قرآن پاک میں فرماتا ہے۔ کَمَا رَبَّیَانِیْ صَغِیْرًا ۔ دوسروں کی تربیت ان سے کہیں کم ہے۔ لیکن جب بچہ باپ کی پیٹھ میں ہو۔ اور ماں کے پیٹ میں آئے نطفہ بن کے رہے خون کا قطرہ بنے، گوشت کا لوتھڑا بنے، اس میں عضو وغیرہ بنیں۔ پھر اس میں روح پیدا ہو۔ ان تمام وقتوں میں ماں باپ کو اس کی پرورش سے کوئی تعلق نہیں۔ جب خیریت سے پیدا ہو گیا۔ تو ربّ ہی نے ماں کے سینے سے دودھ کی دو نہریں جاری فرمائیں۔ ماں نے صرف یہ کیا کہ ربّ کا دیا ہؤا دودھ اسی بچے کے منہ میں دے دیا۔ اسی دودھ کے پیٹ میں پہنچنے کے بعد ماں پھر بے تعلق ہو گئی۔ معدے میں پہنچ کر اس کا ہضم ہونا اور بچے کا پلنا بڑھنا اس میں ماں کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر دودھ کا بہانہ بھی دو سال تک رہا۔ بچہ بڑا ہؤا۔ ماں نے یہ بھی بند کر دیا۔ غرض کہ بچہ جس قدر بڑھتا گیا۔ ماں کی پرورش گھٹتی گئی۔ پھر ایک وقت وہ آیا۔ کہ بچہ جوان اور ماں باپ بوڑھے ہوئے۔ تو اب معاملہ الٹا ہو گیا۔ ماں خدمت کی محتاج اور بیٹا خدمت گار۔ اور اگر اسی درمیان میں بچہ مر گیا۔ تو پھر تو کسی طرح کا ظاہری تعلق رہا ہی نہیں۔ قربان اس ربّ العالمین کے کہ جو ہم کو باپ کی پیٹھ میں پالے۔ ماں کے پیٹ میں پالے۔ بچپن۔ جوانی۔ بڑھاپا۔ تندرستی۔ بیماری۔ جیتے مرے ہر حال میں پالے۔ اور سب کو پالے۔ پھر کسی سے اس کا معاوضہ طلب نہ کرے۔ اسی لئے وہی "ربّ العالمین" کہلانے کا مستحق ہے۔ پھر ہر طرح پالتا ہے۔ جسم کے ظاہری اعضاء کو اور طریقے سے پرورش فرماتا ہے۔ باطنی اعضاء کی پرورش کا اور طریقہ مقرر فرمایا۔ جان کو اور طریقے سے پالا۔ ایمان کو اور طرح سے پرورش فرمایا۔ پاک ہے وہ جس نے ہڈی (کان) سے سنایا۔ چربی (آنکھ) سے دکھایا اور گوشت (زبان) میں بولنے کی طاقت دی۔ پھر ان چیزوں

کو قسم قسم کے پھلوں اور دانوں سے پرورش فرمایا جس وقت جس طرح جس کو پرورش کی ضرورت تھی. اسی طرح اس کو پالا. **درختوں** میں چلنے پھرنے کی طاقت نہ تھی. تو ان کے لئے باغبان کو خدمت گار مقرر کیا جس نے ان کو وہیں کھاد پہنچایا. بادلوں کے بہشتیوں کو حکم دیا. کہ تم سمندر سے پانی لے کر ان کو پلا آؤ. غرض کہ ان کی ہر ضرورت وہیں کھڑے کھڑے پوری کی. **پرندوں** میں حرکت کی طاقت تھی لیکن روزی کمانے کی طاقت نہ تھی. ان کو حکم دیا. کہ تمہارے گھونسلوں میں تمہارا رزق نہ پہنچے گا. تم یہاں سے جاؤ کھیت میں کسان نے تمہارے لئے غلّہ تیار کر رکھا ہے. جاؤ اور چگ آؤ. وہ صبح کو بھوکے نکلے اور شام کو پیٹ بھر کر لوٹے. **حضرت انسان** کو حرکت کرنے کی بھی طاقت تھی. اور کمانے کی بھی. انہیں حکم دیا گیا. کہ تم کو درختوں اور جانوروں کی طرح بغیر کمائے روزی نہ ملے گی. وہ مجبور ہیں. اور تم مختار گھر سے نکلو بھی اور روزی کماؤ بھی. بیج تم ڈال آنا. باقی بارش دھوپ وغیرہ سے تمہاری امداد ہم کریں گے. حضرت انسان بھی جب تک بے دانت والے ناسمجھ بچے رہے تب تک ان کو بھی دودھ پلا کر بغیر محنت کرائے پالا. غرض کہ ہر طرح پالنے والا ہے. یہ اس کی لامتناہی تربیتوں کا ایک نمونہ ہے.

## خالق اور مخلوق کی پرورش میں فرق

اگرچہ بعض بندے بعض بندوں کو ظاہری طور پر کچھ وقت کے لئے کسی قدر پالتے ہیں. اس لئے ان کو مجازاً رب کہا جاتا ہے جس پر قرآن کریم شاہد ہے. لیکن پھر بھی خالق اور مخلوق کی تربیت میں بڑا فرق ہے. **پہلا فرق** یہ ہے. کہ بندہ کسی کو کسی غرض کے لئے پالتا ہے. خالق بغیر غرض. اگر ماں باپ بیٹے کو پالتے ہیں. تو اس لئے کہ وہ بڑھاپے میں کام آئے. مالدار غریبوں کو پالتے ہیں. تو یا تو اس لئے کہ ہمارا نام ہو یا اس لئے ہم کو آخرت میں ثواب ملے. بادشاہ اپنے نوکروں کو تنخواہ دیتے اور پالتے ہیں. اس لئے کہ وقت پر ہمارے کام آئیں غرض سب اپنی اپنی غرض لئے ہیں حق تعالےٰ ہی ہے. جو بغیر غرض کے پالے. **دوسرا فرق** بندہ کسی کو پالتا ہے. تو اس کے مال میں کمی ہوتی جاتی ہے. وہ ختم ہونے کے خوف سے بڑی احتیاط سے کام کرتا ہے. اگر آمدنی کم ہو جائے تو بہت سے نوکر نکال دیئے جاتے ہیں حق تعالیٰ کے خزانے میں کبھی کمی نہیں ہوئی. اس لئے اس کی تربیت سے کوئی نکالا نہیں جاتا. **تیسرا** یہ کہ سخی بندے جب کسی کو پالتے ہیں تو اس پر احسان جتاتے ہیں. اور بغیر مانگے دیتے نہیں. مگر حق تعالیٰ بغیر مانگے عطا فرماتا ہے. وہ تو ایسا کریم ہے کہ جب ہم ماں کے پیٹ میں تھے. ہم کو مانگنے کا شعور بھی نہ تھا. تب وہ دے رہا تھا. **چوتھا** یہ کہ بندہ سب کو نہیں پال سکتا. گھر بار والا آدمی صرف اپنے بچوں کو پالتا ہے. بڑا آدمی صرف نوکروں چاکروں کو پالتا ہے. لیکن ربّ سب کو پالتا ہے. **پانچواں فرق** یہ ہے. کہ اور سخی لوگ زیادہ مانگنے والوں اور بہت سے سوالات سے گھبرا جاتے ہیں. لیکن رب وہ کریم ہے. کہ اس کو بہت مانگنا پسند ہے. ہر گدا اس کے دروازے پر نئی ادا سے آتا ہے. اور نئے ناز دکھاتا ہے. مگر وہ سب کو اپنے فضل سے نوازتا ہے ؎

اے کہ با ہر دل ترا رازے دگر ہر گدا را بر درت نازے دگر

(**فائدہ**) عیسائی حق تعالیٰ کو اب (باپ) کہتے ہیں. اور ہم اس کو رب کہتے ہیں حقیقت یہ ہے. کہ خدا کو دنیا کا باپ کہنا. اس کی بہت بڑی توہین ہے. ہم بتاتے ہیں. کہ اب اور ربّ میں کیا اور کتنے فرق ہیں **پہلا فرق** یہ ہے. کہ باپ اپنے بچے کو پالنے میں اس کی ماں کا محتاج ہے. کہ اس کی امداد سے پالے. رب بندوں کو پالنے میں کسی کا محتاج نہیں ہے. **دوسرا فرق** یہ ہے. کہ باپ فقط جسم کو پالتا ہے. ربّ ہر چیز کو. اسی لئے باپ بیٹے کو ہوشیار ہونے کے بعد استاد اور پیر کے سپرد کرتا ہے. اور عرض کرتا ہے. کہ اتنا کام میں نے کر دیا. آگے اس کی اصلاح آپ کے ذمے ہے. **تیسرا فرق** باپ کا درجہ دینی استاد اور مرشد سے کم ہے. کیونکہ باپ نے ہم کو حیوان (جاندار جسم) بنایا. اور دینی اُستاد اور شیخ نے ہم کو ناطق یعنی سمجھ بوجھ والا بنایا. نیز باپ نے ہم کو اوپر (عالم ارواح) سے نیچے (عالم اجسام) میں اتارا. اور اُستاد اور شیخ نے پھر نیچے سے اوپر پہنچایا. اگر ان کا کرم نہ ہوتا. تو اسفل السافلین میں جاتے. نیز باپ نے فقط جسم بنایا جو کہ مٹنے والا ہے. مگر اُستاد اور شیخ نے ایمان دیا. جو باقی دولت ہے. اسی لئے اگرچہ مالی حقوق میں ماں باپ استاد سے بڑھ جائیں. لیکن اطاعت اور ادب میں استاد اور شیخ والد

سے بڑھ کر ہیں۔ لیکن رب کی بارگاہ میں یہ سوال ہی نہیں۔ کیونکہ وہاں تقسیم کار نہیں **چوتھا فرق** باپ اور بیٹے میں جنسیت اور نوعیت میں شرکت ہوتی ہے۔ یعنی بیٹا باپ کا ہم جنس ہوتا ہے۔ انسان کا بچہ انسان گھوڑے کا بچہ گھوڑا۔ گدھے کا بچہ گدھا۔ ہمارے پیٹ میں سے جو کیڑے خارج ہوتے ہیں۔ اسی طرح بالوں اور کپڑوں میں سے جوئیں وغیرہ نکلتی ہیں۔ وہ ہماری اولاد نہیں کیونکہ وہ ہماری ہم جنس نہیں لہٰذا جب مخلوق خالق کی ہم جنس نہیں۔ بلکہ کسی صفت میں شریک نہیں۔ تو اس رب کو باپ اور مخلوق کو اولاد کہنا حماقت ہی تو ہے۔ **پانچواں فرق** یہ کہ جس طرح بیٹا باپ کا محتاج ہے۔ ایسے ہی باپ اپنے باپ بننے میں بیٹے کا محتاج ہے۔ بیٹا ہو تو اُسے باپ کہا جائے۔ مگر رب تعالےٰ اپنی کسی صفت میں اپنی مخلوق کا محتاج نہیں۔

**ربوبیّت عامّہ اور خاصہ** حق تعالیٰ کی ربوبیت کا دو طرح ظہور ہو رہا ہے۔ اس کی بعض نعمتیں تو وہ ہیں جو سب کو بلا فرق مل رہی ہیں۔ جیسے دھوپ۔ ہوا۔ زمین۔ آسمان کا سایہ وغیرہ بعض نعمتیں وہ ہیں جو خاص خاص کو بہت فرقوں کے ساتھ عطا ہو رہی ہیں۔ جیسے رزق۔ مال۔ اولاد عزت حکومت آفتاب وغیرہ تو حق تعالےٰ کی ربوبیّت عامہ کے مظہر ہیں۔ اور مال وغیرہ اس کی ربوبیّت خاصہ کے۔ لیکن پھر بھی آفتاب وغیرہ کے عموم میں کچھ کمی ہے۔ کہ یہ چیزیں بیک وقت سب کو فیض نہیں پہنچاتی۔ فقط جسم کو فیض دیتی ہیں روح سے ان کو تعلق نہیں ہوتا حکمت الٰہی کا تقاضا تھا۔ کہ کوئی نعمت اس کی ایسی بھی ہو جو اس کی ہر طرح کی ربوبیّت کو پورے طور پر ظاہر کرے۔ ہر جگہ ہر وقت ہر چیز کو یکساں فیض عام بھی پہنچائے۔ اور خاص خاص کو خاص خاص فیض بھی اس نعمت الٰہیہ کا نام اور مظہر اتم کا اسم شریف ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ صلّی اللہ تعالیٰ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ یہی وہ نعمت عظمیٰ ہے جس کو رب تعالیٰ نے فرمایا۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔ ایک جگہ فرمایا۔ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا۔ جس قدر ربّ العالمین کی ربوبیّت میں وسعتیں ہیں۔ اسی قدر رحمت عالم کی رحمت میں گنجائشیں۔ بلکہ یوں کہو۔ کہ حق تعالیٰ کی ربوبیّت حضور علیہ السلام کی رحمت کے ذریعے سے سب کو پہنچتی ہے حضور علیہ السلام کی رحمت ایک تو عام ہے۔ کلمہ۔ کعبہ۔ قرآن۔ ایمان سب کو یکساں عطا فرمایا۔ لیکن ولایت۔ قطبیت۔ غوثیت اور شہادت وغیرہ خاص خاص نعمتیں ہیں جو حضور علیہ السلام کے دربار دُربار سے فرق کے ساتھ بٹتی ہیں۔ اَلْعٰلَمِیْنَ۔ عالمین جمع عالم کی ہے۔ عالم علم سے بنا ہے جس کے معنے ہیں نشان دنیا کو عالم اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اس کی ہر چیز اپنے خالق کی نشانی ہے۔ اللہ کے سوا کو عالم کہتے ہیں۔ تفسیر روح البیان شریف نے اس جگہ فرمایا۔ کہ اٹھارہ ہزار عالم ہیں۔ اور یہ دنیا یعنی زمین و آسمان وغیرہ جو ہم کو نظر آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ہے۔ "عالم ارواح" "عالم اجسام" "عالم امکان" پھر "عالم سفلی" "عالم علوی" "عالم ملکوت" "عالم ناسوت" "عالم جنات" "عالم انسان" "عالم ملائکہ" "عالم برزخ" وغیرہ وغیرہ یہ دُنیا تو ان عالموں میں سب سے چھوٹا عالم ہے۔ ایک جنت ہی اتنی بڑی ہے۔ کہ تمام زمین و آسمان اس میں رکھے جائیں۔ تو ایسے معلوم ہوں۔ جیسے میدان میں چند کوڑیاں۔ جہنم کی گہرائی کا یہ حال ہے۔ کہ اگر ایک پتھر اس کے کنارے سے پھینکا جائے۔ تو ستر سال میں اس کی تہ تک پہنچے۔ حالانکہ وہی پتھر اگر آسمان سے پھینکا جائے۔ تو بارہ گھنٹے سے پیشتر زمین پر آجائے گا۔ پھر یہ عالم جو نظر آرہا ہے۔ اس میں ہزاروں قسم کی وہ مخلوق ہے جس سے ہم ناواقف ہیں۔ تفسیر روح البیان شریف میں اسی جگہ ہے۔ کہ صرف انسانوں کی ایک سو پچیس ۱۲۵ قسمیں ہیں۔ بعض وہ بھی ہیں۔ کہ جن کے کان ہاتھی کے کان کی طرح ہیں۔ بعض وہ ہیں جن کے پاؤں میں چلنے کی طاقت نہیں۔ بعض وہ ہیں جن کی آنکھیں ان کے سینوں پر ہیں۔ بعض وہ ہیں۔ کہ جن کے سر کتّوں کے سے ہیں۔ فقیر نے بھی بعض مردم خور انسانوں کے فوٹو دیکھے ہیں۔ جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ جب ہم کو ان عالموں ہی کی خبر نہیں۔ تو اس کی ربوبیّت کو کما حقہٗ کیسے جان سکیں۔ (**آریوں کے اعتراضات**) اگر پروردگار واقعی عالمین (تمام جہانوں) کا پالنے والا ہے۔ تو مسلمانوں کے ہاتھ سے کفّار کو قتل کیوں کراتا ہے۔ رب کا کام ہے پالنا نہ کہ مارنا۔ (**جواب**) جو ناقص مخلوق اپنے وجود سے دوسری اعلیٰ مخلوق کی پرورش میں رکاوٹ پیدا کرے۔ اس کو علیحدہ کر دینا ہی پرورش ہے۔ کسان کے

کھیت میں فصل کے ساتھ کچھ خوبصورت نرم گھاس بھی اُگ آتی ہے۔ دیکھنے میں بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے مگر کسان جانتا ہے۔ کہ اس سے کھیت برباد ہو جائے گا۔ اِسے جڑ سے اُکھیڑ باہر پھینکتا ہے کیونکہ اس میں کھیت کی بھلائی ہے۔ اسی طرح کفار ربّ تعالیٰ کی زمین پر خوبصورت گھاس ہیں۔ کہ اگر زور پکڑ جائیں۔ تو خدا کے بندوں پر دنیا تنگ آجائے۔ ان کو نکلوا دینا ہی ضروری ہے۔ گویا یہ ربوبیّت کے لئے ایک آڑ ہیں جس کا ہٹانا ضروری ہے۔ **اعتراض نمبر ۲۔** رب کا کام پرورش کرنا۔ اور تکلیفوں سے بچانا ہے پھر وہ اپنے خاص بندوں پر تکلیفیں کیوں اتارتا ہے۔ بیماری غریبی وغیرہ **جواب۔** ربّ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں پر جو کوئی تکلیف بھیجتا ہے۔ اس میں ہزارہا حکمتیں ہوتی ہیں۔ کبھی یہ تکلیف اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے کبھی صبر کی وجہ سے اس کا درجہ بلند کرتی ہے۔

کبھی یہ بہت بڑی راحت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ مثلاً مال کی زکوٰۃ ظاہر میں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مال بلا وجہ خرچ کرتا ہے۔ لیکن اسکی برکت سے غریب پل جاتے ہیں۔ دینے والے کے مال میں برکت ہوتی ہے جیسے کہ پھلدار درخت کی شاخیں کاٹ دینے سے آئندہ اس میں زیادہ پھل پیدا ہوتا ہے۔ معمولی بیماریاں۔ بڑی بڑی بیماریوں سے بچالیتی ہیں۔ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے۔ کہ ایک چیز ہم کو شروع میں ناپسند ہوتی ہے مگر اُس کا انجام نہائت اچھا ہوتا ہے۔ باپ اپنے عزیز بیٹے پر علم و ہنر سیکھنے کی محنت ڈالتا ہے۔ بچہ مدرسے کی پابندیاں اُستاد کی سختیاں دیکھ کر گھبراجاتا ہے۔ مگر جب اس کا نتیجہ نکلتا ہے۔ تو سمجھتا ہے۔ کہ وہ سختیاں کڑوی دوا کی طرح فائدہ مند تھیں۔ **اعتراض نمبر ۳۔** اگر حق تعالیٰ "ربّ العلمین" ہے۔ تو بندوں کی ہر دعا قبول کیوں نہیں فرماتا۔ بہت دفعہ دعا کرتے کرتے تھک جاتے ہیں۔ لیکن دعا قبول نہیں ہوتی **جواب** بندہ اپنی ناسمجھی سے کبھی وہ دعائیں مانگ لیتا ہے۔ جو انجام کار اس کے لئے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ ربّ تعالیٰ چونکہ علیم و خبیر ہے۔ وہ اپنے عین فضل و کرم سے ان کو قبول نہیں فرماتا۔ اس کا قبول نہ فرمانا۔ اس کا کرم ہے۔ نہ کہ ظلم۔ ناسمجھ بچہ اپنے عقلمند باپ سے شہد مانگتا ہے۔ باپ جانتا ہے۔ کہ یہ شہد اس کو نقصان دے گا۔ بیوقوف بیمار حکیم سے خوشرنگ اور مزیدار دوائیں مانگتا ہے۔ لیکن وہ اس کو کڑوی دوائیں پلاتا ہے تو یہ اس باپ اور حکیم کا اس پر عین کرم ہے۔ **اعتراض نمبر ۴۔** رب کے معنے ہیں پالنے والا۔ جب حق تعالیٰ سب کا رب ہے۔ تو چاہیئے کہ سب کو پالا ہی کرے۔ کسی کو موت نہ دیا کرے۔ کیا ہلاک کرنا بھی ربوبیّت ہے؟ **جواب۔** جو لوگ موت سے گھبراتے ہیں۔ وہ موت کی حقیقت کو سمجھے نہیں۔ موت تو حبیب سے ملنے کا ایک پل ہے۔ اس موت کے ذریعے سے انسان دنیوی مصیبتوں سے چھوٹ جاتا ہے۔ اور اپنے کئے ہوئے نیک اعمال کی جزا پاتا ہے۔ حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ گویا زندگی ایک کھیتی ہے۔ اور موت اس کی کٹائی کھیت کا کاٹنا حقیقت میں کھیت کی پرورش کی تکمیل ہے۔ ایسے ہی انسان کی زندگی۔ اس کے کمائی کرنے کا وقت ہے۔ اور موت اس کا پھل پانے کا وقت ہے۔

**دیوبندی اعتراض۔** جب حق تعالےٰ "ربّ العالمین" ہے۔ تو چاہیئے۔ کہ ساری حاجتیں اسی سے مانگی جائیں۔ جو لوگ کہ خدا کو چھوڑ کر نبیوں، ولیوں، سے حاجتیں مانگتے ہیں۔ وہ خدا تعالےٰ کو ربّ العالمین، نہیں مانتے۔ **جواب۔** اللہ کے خاص بندوں سے کوئی چیز مانگنا حقیقت میں اسی سے مانگنا ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کے بندے اس کی صفت ربوبیّت کے مظہر ہیں۔ بے شک اللہ "ربّ العالمین"، رازق ہے۔ شافی الامراض ہے۔ لیکن اس نے ان تمام کاموں کے لئے دروازے مقرر کر دیئے ہیں۔ ان دروازوں پر جاکر مانگنا حقیقت میں رب ہی سے مانگنا ہے۔ شفا لینے حکیم کے ہاں جاتے ہیں۔ انصاف لینے حاکم کے ہاں پہنچتے ہیں۔ خدا کا رزق لینے مالداروں کا دروازہ تلاش کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ شیخ سعدی علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں ؎

رزق ہر چند بے گماں برسد — شرط عقل است جُستن از درہا

یوں سمجھو کہ پاور ہاؤس میں بجلی بنتی ہے۔ لیکن اس کی روشنی وہاں ملتی ہے۔ جہاں اس کے قمقمے لگے ہوں۔ تو جو شخص قمقموں سے

روشنی حاصل کرے۔ وہ پاور ہاؤس کا مخالف نہیں۔ اس کی بحث انشاءاللہ تعالےٰ آئندہ بھی کی جائے گی۔

## اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

| بخشنے والا | مہربان |
|---|---|
| بہت مہربان رحمت والا۔ | |

**تعلق**۔ اس کا تعلق رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے چند طریقے پر ہے۔ **ایک** یہ کہ اس جملے میں ارشاد تھا کہ وہ جہانوں کا پالنے والا ہے۔ احتمال تھا۔ شاید وہ اس پالنے پر مجبور ہو یعنی اس کو پالنا پڑتا ہو۔ جیسے کہ بادشاہ اپنے ملازمین کو پالتا ہے۔ مگر وہ اس پالنے میں مجبور ہے۔ کہ اگر نہ پالے تو اس کی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی۔ یا کوئی شخص اپنے گھر کے جانوروں وغیرہ کو مجبوراً پالتا ہے۔ کیونکہ جانتا ہے۔ کہ نہ پالوں گا۔ تو میرے کام بند ہو جائیں گے۔ تو اس جگہ فرمایا گیا۔ کہ وہ عالمین کو پالنے پر مجبور نہیں ہے محض رحمت سے پالتا ہے۔ **دوسرے** اس طرح کہ پالنا کبھی رحم کے ساتھ ہوتا ہے کبھی قہر کے ساتھ جیسے کہ جیل خانے میں قیدیوں کو بھی حکومت پالتی ہی ہے۔ کھانے پینے کو دیتی ہے۔ مگر قہر کے ساتھ پالتی ہے یہاں فرمایا۔ کہ پالتا تو ہے۔ مگر رحم کے ساتھ **تیسرے** اس طرح کہ حمد کا رحمت کے ساتھ خاص تعلق ہے جو خدا کی حمد کرتا ہے۔ رحمت ضرور پاتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا ہوتے ہی چھینک آئی۔ تو کہا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ فوراً ملائکہ کی طرف سے جواب ملا۔ یَرْحَمُكَ اللّٰهُ وہی سنت آج بھی جاری ہے۔ **تفسیر**۔ رحمٰن اور رحیم کی تفسیر اور ان کا فرق ہم بسم اللہ میں پورے طور پر بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اتنا اور بتائے دیتے ہیں۔ کہ "رحمٰن" کے معنے یہ بھی کئے گئے ہیں۔ کہ اس قسم کی رحمتیں فرمانے والا۔ جو بندوں سے حاصل نہ ہو سکیں۔ اور "رحیم" کے معنے یہ ہیں۔ کہ اس قسم کی رحمتیں فرمانے والا۔ کہ جس کی مثل کچھ نہ کچھ بندوں سے بھی حاصل ہو سکے۔ اسی طرح رحمٰن بلا واسطہ بندوں پر رحم فرمانے والا اور رحیم بندوں کے واسطے سے رحم فرمانے والا۔ مثال یوں سمجھو۔ کہ اکثر جاندار چیزیں اپنے ماں باپ کے ذریعے سے پرورش پاتی ہیں۔ لیکن کوّے کا بچہ جب انڈے سے نکلتا ہے۔ تو اس کی ماں اس سے بالکل بے تعلق ہو جاتی ہے۔ وہ گوشت کا لوتھڑا سا ہوتا ہے۔ اس کو کھانے کیلئے اس پر مچھر جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کو لقمہ بنا لیتا ہے اسی طرح اس کی پرورش ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے جسم پر پَر آجاتے ہیں تب ماں پالتی ہے (روح البیان وتفسیر کبیر) حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ ایک دن میں دریائے نیل کے کنارے جا رہا تھا میں نے دیکھا۔ کہ ایک بچھو بھاگا ہوا دریا کی طرف آرہا ہے۔ جب وہ دریا کے کنارے پہنچا فوراً ایک کچھوا کنارے آ لگا۔ وہ بچھو اس پر سوار ہوا۔ اور کچھوا اس کو لے کر دوسرے کنارے کی طرف چل دیا۔ مجھے شوق ہوا۔ کہ دیکھوں یہ بچھو کو کہاں لے جا رہا ہے میں کشتی میں بیٹھ اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ بچھو اس طرف پہنچ کر اترا اور دوڑتا ہوا آگے چل دیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا کچھ دور جا کر دیکھا۔ کہ ایک نوجوان شخص سو رہا ہے۔ اور اس کے قریب ایک زہریلا سانپ ہے۔ جو اس کو کاٹنا چاہتا ہے۔ اس بچھو نے سانپ پر حملہ کیا۔ اور سانپ نے بچھو پر یہ دونوں ایک دوسرے کے زہر سے مر گئے اور وہ جوان بچ گیا۔ ہم بھی دن میں ظاہر اپنی حفاظت خود کرتے ہیں۔ لیکن رات کو سونے کی حالت میں ہماری حفاظت خدا کے سوا کون کرتا ہے۔ بہت سی مصیبتیں وہ ہیں۔ کہ ہماری ظاہری کوشش سے دفع ہوتی ہیں۔ اور بہت سی وہ آفتیں ہیں جن سے ہم کو حق تعالیٰ ہی بچاتا ہے۔ وہ اس کی رحمانیت کا ظہور ہے۔ اور یہ اس کی رحیمی کی جلوہ گری۔ مشرکین کا عقیدہ تھا۔ کہ بڑی بڑی نعمتیں رب دیتا ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی نعمتیں بت۔ اس عقیدے کی بھی اس میں تردید ہوگئی۔ کہ وہ رحمٰن بھی ہے۔ رحیم بھی ہے۔ یعنی چھوٹی بڑی نعمتیں وہی عطا کرتا ہے۔ **آریوں کے اعتراض** (۱) جب بسم اللہ میں یہ دو لفظ آچکے تھے تو یہاں دوبارہ کیوں لائے گئے۔ **جواب** (۱) بسم اللہ میں حق تعالیٰ کی ذاتی رحمتوں کا ذکر تھا۔ اور یہاں صفاتی کا (۲) قرآن کریم جن چیزوں کا بار بار ذکر فرماتا ہے۔ اس سے مقصود کبھی یہ ہوتا ہے۔ کہ بندے سمجھ جائیں۔ کہ ان کو بار بار کہنا خدا کو پسند ہے۔ **اعتراض** (۲) خدا پاک رحمان اور رحیم ہے۔ تو

دوزخ اور موذی چیزوں کو کیوں پیدا فرمایا۔ اور شیطان کو کیوں بنایا **جواب**۔ اس کا جواب "رب العالمین" میں گزر چکا کہ بعض تکلیفیں رحمت کو ظاہر کرتی ہیں جو بلا کسی رحمت کا ذریعہ بن جائے۔ وہ حقیقت میں رحمت ہی ہے۔ اگر تکلیف دہ چیزیں پیدا نہ ہوتیں۔ تو ہماری روح اور جسم کو پوری طہارت اور پاکی حاصل نہ ہوتی۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ بظاہر تکلیف دہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں یہ روح پاک کرنے والی چیزیں ہیں۔ جیسے کہ میلے لوہا کو لوہار بھٹی میں رکھ کے کوٹتا پیٹتا ہے۔ تو وہ مصیبت پاکر زنگ وغیرہ سے صاف ہو جاتا ہے۔ اور اگر صاف اور قیمتی لوہے کو بھٹی میں رکھتا ہے۔ تو اسے کوٹ پیٹ کر پرزہ بناتا ہے جس سے اس کی قدر قیمت بڑھ جاتی ہے۔ گھڑیوں اور مشینوں میں تھوڑی قیمت کا لوہا ہے۔ لیکن کاریگر کے پاس پہنچ کر پرزہ بنا۔ اور بہت قیمتی ہو گیا۔ سونا اگرچہ نہایت قیمتی دھات ہے۔ اگر وہ سنار کی بھٹی میں نہ رکھا جائے۔ اور سنار کے ہاتھ سے چوٹیں نہ کھائے۔ تو وہ زیور بن کر محبوب کے گلے میں نہ جائے۔ تو یہ تکلیفیں بھی حقیقت میں اس کی قدر و قیمت بڑھانے والی ہیں اسی طرح گنہگاروں پر جو تکلیفیں اور مصیبتیں آتی ہیں۔ وہ انہیں زنگ آلودہ لوہے کی طرح گناہوں کے میل سے صاف کر جاتی ہیں۔ اور نیک کاروں پر جو آتی ہیں۔ ان کو عمدہ لوہے کی طرح قیمتی بنا جاتی ہیں۔ مقربین پر جو آتی ہیں۔ ان کو سونے کی طرح اور زیادہ قرب الٰہی کے قابل بنا جاتی ہیں۔ تو یہ مصیبتیں درحقیقت حق تعالیٰ کی رحمتیں ہیں۔ **اسی طرح** تکلیف دہ زہریلی چیزیں وغیرہ ہزاروں بڑی بڑی مصیبتوں کو دفع کر دیتی ہیں۔ مثلاً مچھر اور مکھی جسم انسانی سے بہت سے زہریلے مادوں کو چوس لیتے ہیں غلے کے کیڑے۔ گھن وغیرہ غلے کے بہت سے مضر اثرات کو مٹا دیتے ہیں۔ بے وقت بارشیں زہریلے دانوں کو تباہ کر کے اور گرم غلے کو ٹھنڈا کر کے کھانے کے قابل بنا دیتی ہیں۔ پھر یہ کیا ضروری ہے۔ کہ پروردگار عالم صرف انسانوں پر ہی رحم فرمائے۔ وہ بھی اس کی مخلوق اور اس کے رحم کے مستحق ہیں۔

**تعلق**، اس سے پہلے اللہ کی ربوبیت اور رحمت کا ذکر ہوا جس سے سننے والے کے قلب میں امید کا دریا موجیں مارنے لگا۔ اب ضرورت تھی۔ کہ اس کے دل میں رب کا خوف پیدا کیا جائے کیونکہ ایمان امید اور خوف کے درمیان ہے۔ لہٰذا اس آیت میں رب تعالیٰ کی ملکیت۔ غلبے وغیرہ کا ذکر فرمایا۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے۔ کہ دنیا میں کیسے ہی گناہ کرو۔ کوئی سزا نہ ملے گی۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی سولی (معاذ اللہ) سب کا کفارہ بن گئی۔ انہیں رحمت پر یقین ہو گیا۔ غضب سے بے خوف ہو کر گناہ پہ دلیر ہو گئے۔ آریوں کا عقیدہ ہے۔ کہ کسی گناہ کی معافی ہو سکتی ہی نہیں۔ اس کی سزا ضرور بھگتنی پڑے گی۔ یہ رحمت سے مایوس ہوئے۔ گناہ پر دلیر ہوئے۔ کیونکہ ناامیدی بھی گناہ پر دلیر کرتی ہے جب تک بلی کتے سے بچنے کا موقعہ دیکھتی ہے۔ بھاگتی ہے۔ مگر جب پھنس جاتی ہے۔ تو کتے پر حملہ کر دیتی ہے جس کو پھانسی کا حکم ہو جائے۔ اس کی بہت احتیاط کی جاتی ہے کہ کسی کو قتل نہ کر دے۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ انسان گناہ سے اسی وقت بچ سکتا ہے جب اس کو اپنے مولیٰ کے غضب کا ڈر اور اس کی رحمت کی امید ہو۔ اس لئے رحمتوں کے ذکر کے بعد اپنی جباری کا ذکر فرمایا **دوسرے** اس طرح کہ بعض لوگ امید پر عبادت کرتے ہیں۔ اور بعض جوتے کے خوف سے" امید والوں کے لئے پہلی آیتیں تھیں۔ اور دوسروں کے لئے یہ آیت **تفسیر**، **مَالِكِ**۔ قاریوں کا اس لفظ میں اختلاف ہے۔ بعض اسے مَالِک اور بعض مَلِک پڑھتے ہیں۔ مَلِک کے معنے بادشاہ۔ اور مالک کا معنے مالک۔ خواہ کچھ بھی ہو۔ یہ بنا ہے مِلک سے مِلک کے لفظی معنے ہیں۔ تعلق مضبوطی اور قوت۔ بادشاہ کو مَلِک اور مالک کو مالک اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اس کو اپنے مملوک اور رعیت سے تعلق بھی ہوتا ہے۔ اس پر قدرت بھی ہوتی ہے۔ اور

مضبوطی سے سب پر قابض بھی ہوتا ہے۔ جو لوگ مَلِک پڑھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ بادشاہ کا درجہ عام مالکوں کے درجے سے زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ملک پڑھنا بہتر ہے۔ جس کے معنے ہوں گے۔ قیامت کے دن کا بادشاہ۔ لیکن مالک پڑھنے والے فرماتے ہیں۔ کہ مالک پڑھنا چند وجہوں سے بہتر ہے۔ **اولاً** کہ مالک میں چار حرف ہیں۔ اور ملک میں تین۔ اور قرآن پاک کے ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں۔ لہٰذا مالک کے پڑھنے پر چالیس اور ملک کے پڑھنے پر تیس نیکیاں ملیں گی۔ **دوسرے** اس لئے کہ بادشاہ رعایا کا حاکم ہوتا ہے۔ اور مالک اپنے مال یا غلام کا لیکن بمقابلہ رعیت کے زیادہ قبضہ اپنے مملوک پر ہوتا ہے۔ کیونکہ رعیت میں بعض وہ بھی ہوتے ہیں۔ کہ جن کی بادشاہ کو مجبوراً رعایت کرنی پڑتی ہے بلکہ رعایا کو رعایا کہتے ہی اس لئے ہیں۔ کہ بادشاہ کو اس کی رعایت کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا ملک سے مالک پڑھنا بہتر ہے **تیسرے** اس لئے کہ رعایا اپنے آپ کو بادشاہ کی حکومت سے نکال سکتی ہے۔ یا تو اس طرح کہ اس کے ملک سے نکل کر دوسرے کے ملک میں پہنچ جائے۔ یا بادشاہ کو سلطنت سے معزول کر دے۔ لیکن مملوک اپنے مالک کی ملکیت سے اپنی خوشی سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ لہٰذا مالک کی ملکیت بادشاہ کی ملکیت سے قوی ہے۔ **چوتھے** اس کے لئے کہ بادشاہ اپنی رعایا کے مال و جان وغیرہ کا بالکل مالک نہیں۔ بلکہ وہ خود ان کے مالک اور قابض ہوتے ہیں۔ لیکن مالک اپنے مملوک یا غلام کی ہر چیز کا مالک ہے۔ **پانچواں** اس لئے کہ رعایا ہر کام کرنے میں بادشاہ کی اجازت لینے کی محتاج نہیں لیکن مملوک (غلام) اپنے مالک کے بغیر اجازت کوئی کام نہیں کر سکتا۔ **چھٹے** اس لئے کہ رعایا بادشاہ سے ہر چیز نہیں مانگ سکتی۔ بلکہ اپنا انتظام خود کرتی ہے۔ بادشاہ کی اطاعت صرف اس لئے کرتی ہے۔ کہ اس کے غضب سے بچ جائے۔ لیکن مملوک (غلام) اپنا کھانا کپڑا اور ہر ضروریات اپنے مالک سے مانگتا ہے۔ اور ہم بھی رب تعالیٰ سے ہر چیز مانگتے ہیں۔ اور وہ ہمارا مربّی ہے۔ لہٰذا مالک کے معنے زیادہ مناسب ہیں۔ **ساتویں** اس لئے کہ بادشاہ رعایا کے مال کا امیدوار ہوتا ہے۔ کہ یہ ٹیکس ادا کریں۔ تو ہماری سلطنت چلے۔ اور یہ ہماری فوج میں بھرتی ہوں۔ تو ہمیں مدد ملے۔ لیکن مالک اپنے غلام سے ان باتوں میں بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ اس سے مال لیتا نہیں۔ بلکہ اس کو مال دیتا ہے۔ اور وہ غلام بھی اپنے کو خالی سمجھ کر اس کے کرم و فضل کا طالب ہوتا ہے۔ ہم بھی خدائے پاک کی بارگاہ میں اس کے فضل و کرم ہی کے طالب ہیں۔ **آٹھویں** یہ کہ بادشاہ تندرست اور جوان ہی کو اپنی فوج میں بھرتی کرتا ہے اور بیماروں اور کمزوروں کو نہیں لیتا۔ لیکن مالک اپنے بیمار اور کمزور غلام کا علاج کراتا ہے اور بڑھاپے میں اس کی مدد کرتا ہے۔ اور اگر وہ کسی بلا میں پھنس جائے۔ تو مالک اسے چھڑاتا ہے۔ **نویں** یہ کہ بادشاہت میں ہیبت ہے اور ملکیت میں رحمت اور حق تعالیٰ اپنے بندوں پر رحیم و کریم ہے (تفسیر کبیر) ان وجوہ سے مالک پڑھنا بہتر ہے **یَوْمِ الدِّیْنِ** بدلے کا دن۔ یوم عربی میں دن کو کہتے ہیں۔ اور دن ہوتا ہے۔ آفتاب کی حرکت سے اور قیامت کے دن آفتاب کی حرکت نہ ہوگی۔ اس لئے یہاں یوم سے مراد وقت یا زمانہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ حق تعالیٰ قیامت کے سارے وقت کا مالک ہے۔ یا قیامت کے دن میں جو واقعات ہوں گے۔ اُن سب کا مالک ہے۔ دین کے دو معنی ہیں۔ بدلہ، فیصلہ اور انصاف **دوسرے** ملّت یعنی مذہبی عقیدے قیامت کے دن کو دین کا دِن یا تو اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اس دن تمام دینوں یعنی ملتوں کے فیصلے کئے جائیں گے۔ دنیا میں دیندار اور بے دین یکساں پل رہے ہیں۔ بظاہر حق و باطل کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن اس دن سب پتہ چل جائے گا۔ یہ اس لئے دین کا دن کہتے ہیں۔ کہ ہر دین و لادین اسی لئے دین اختیار کرتا ہے۔ کہ اسدن نجات ہو جائے۔ عیسائی یہودی۔ پارسی اور مسلمان وغیرہ جس قدر مذاہب کہ اسدن کے قائل ہیں سب اسی دن کی مصیبت سے بچنے کیلئے آج دین اختیار کر رہے ہیں اگرچہ ان میں سے بعض نے غلط دین اختیار کیا بعض نے صحیح۔ یا اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اس دن کوئی دنیوی کام نہ ہوگا۔ بلکہ سب کام دینی ہی ہوں گے دنیا میں ہم کچھ کام دنیوی کرتے ہیں۔ اور کچھ دینی۔ لیکن اس دن۔ کھانا۔ پینا۔ لباس۔ تعمیر مکان۔ ان میں سے کوئی بھی کام نہ ہوگا۔ اگر دین کے معنے جزا کئے جائیں۔ تو قیامت کو یوم الدین اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اس دن دنیا کے تمام اعمال کی جزا دی جائے گی۔ دنیا میں اچھے بُرے جیسے چاہے کام کر لو۔ یہاں بدلہ نہیں۔ لیکن وہاں بدلہ ہے کام نہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھو۔ کہ ایک طالب علم تعلیم کے زمانہ میں صرف پڑھتا ہے۔ اس زمانہ میں

اس کی محنت کی کوئی بھی تحقیقات نہیں کرتا محنت کرے یا کھیلے لیکن جب امتحان کا دن آیا۔ اس نے محنتی اور کھلاڑی کو الگ الگ کر دیا محنتی آگے بڑھائے ان کو انعام دیا۔ اور کھلاڑیوں کو سزا۔ تو گویا امتحان کا دن سال بھر کے کام کے بدلے کا دن ہے۔ یا یوں سمجھو۔ کہ کھیت میں بھوسہ اور دانہ ایک ہی زمین میں رہتے ہیں۔ ایک ہی کھاد اور پانی سے پلتے ہیں۔ ایک ہی دھوپ سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ لیکن ایک دن وہ بھی آتا ہے۔ جبکہ کھیت کا مالک اس کو گاہ کر بھوسے کو دانے سے الگ کر دیتا ہے۔ دانہ اور جگہ پہنچتا ہے بھوسہ اور جگہ۔ یونہی دنیا ایک کھیتی ہے۔ اور قیامت کا دن اس کے گاہنے کا دن ہے۔ **نکتہ** حق تعالٰے ہمیشہ سے ہمیشہ تک ہر چیز کا مالک ہے پھر اپنے کو بالخصوص قیامت کا مالک فرمانا۔ چند وجہوں سے ہے۔ **اوّلاً** یہ کہ جب مالک کی عظمت دکھانی منظور ہوتی ہے۔ تو اس کی ملکیت کو کسی بڑے مملوک کی طرف نسبت کی جاتی ہے۔ بادشاہ کی سلطنت بہت سے ملکوں، شہروں قصبوں اور گاؤں پر ہوتی ہے۔ لیکن جب اس کی عظمت ظاہر کرتے ہیں۔ تو کہتے ہیں۔ شاہ ہند۔ شاہ دہلی وغیرہ اس کا منشا یہ نہیں کہ وہ اور چیزوں کا مالک نہیں۔ مالک تو ہے لیکن اس طرح کہنے میں اسکی بھی اور چیز کی بھی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ اسی قاعدے سے حق تعالٰی کو رب کعبہ اور رب محمد صلی اللہ تعالٰے علیہ وسلم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ **دوسرے** اس لئے کہ دنیا میں بظاہر اور بھی عارضی مالک ہیں، کہا جاتا ہے۔ کہ ہندوستان کا مالک فلاں۔ جاپان کا بادشاہ فلاں۔ یہ گھر فلاں کا۔ لیکن قیامت کا دن وہ دن ہوگا جبکہ کوئی بھی کسی چیز کا ظاہری مالک بھی نہ ہوگا۔ خود ارشاد فرمائے گا۔ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۔ آج کس کا ملک ہے۔ اس وقت کوئی اس سوال کا جواب دینے والا بھی نہ ہوگا۔ تو خود ہی جواب میں ارشاد فرمائے گا۔ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ **تیسرے** اس لئے کہ بڑے مالک کی طرف نسبت کرنے سے اس چیز کی عزت ظاہر ہوتی ہے کہا جاتا ہے۔ کہ بادشاہ کا محل ہے۔ اس قاعدے سے اس نسبت سے قیامت کے دن کی عظمت اور ہیبت ظاہر ہوتی ہے۔ کہ وہ خدا کا دن ہے خداوند جل وعلا اسی دن کا مالک ہے۔ اسی لئے سب کے دل میں اس دن کی ہیبت ہے اسی دن کی ہیبت لوگوں سے نیک کام کراتی۔ اور بُرے کاموں سے بچاتی ہے۔ **نکتہ** آریوں کے عقیدے میں یہ دنیا ہی عمل اور جزاء کی جگہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ جو انسان بُرے کام کرتا ہے۔ وہ مرنے کے بعد "بُری جون" میں آتا ہے۔ اور اچھے کام کرنے والا "اچھی جون" میں۔ جسقدر جانور وغیرہ ہیں۔ یہ پہلے انسان ہی تھے لیکن یہ اپنی بد عملی کی وجہ سے ان "جونوں" میں آئے۔ تو ان کے نزدیک دنیا عمل اور جزا دونوں کی جگہ ہے۔ لیکن مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ دنیا فقط عمل کی جگہ ہے۔ یہاں جزا نہیں۔ اور آخرت فقط جزا کی جگہ ہے۔ وہاں عمل نہیں۔ اگرچہ بعض کام ایسے بھی ہیں۔ کہ جن کا کچھ نہ کچھ نتیجہ دنیا میں بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ جیسے ماں باپ کی اطاعت کرنے والا دنیا میں خوشحال رہتا ہے۔ ان کے ساتھ بد سلوکی کرنے والا دنیا میں ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ لیکن یہ خوشحالی یا ذلت اور رسوائی اس کی جزا نہیں ہوگئی۔ یہ تو ایسا ہے۔ جیسے کہ سرکاری نوکر کے لئے بھتہ یا مجرم کے لئے جیل سے پیشتر حوالات۔ بھتہ تو تنخواہ نہیں۔ اور یہ حوالات اس کے جرم کی سزا نہیں۔ سزا تو مقدمے کے بعد شروع ہوگی۔ آریوں کا یہ عقیدہ بالکل خلاف عقل ہے۔ **اوّلاً** تو اس لئے کہ جب دوسری "جون" میں پہنچ کر پہلی "جون" کا آرام یا تکلیف یاد ہی نہ رہا۔ تو اس کو اپنے گذشتہ اعمال کا احساس ہی کیا ہوگا۔ اور تکلیف اور غم محسوس ہی کیا ہوگا۔ مثلاً ایک شخص آج فقیر پیدا ہوا ہے۔ ان کے قاعدے سے وہ پہلے کسی اچھے حال میں دنیا میں زندگی گذار گیا تھا۔ لیکن اپنی بدعملی کے باعث اب فقیر بنا کے بھیجا گیا۔ جب اسے یاد ہی نہ رہا کہ پہلے میں کیا تھا۔ اور اس وقت میں نے کیا کیا تھا۔ کس عیش میں تھا۔ یہ کس عمل کی سزا ہے۔ تو اب اس کو اسی فقیری میں تکلیف ہی کیا ہوگی۔ وہ تو اپنی فقیری میں ہی خوش اور مست ہے۔ **دوسرے** اس لئے کہ اگر یہ عقیدہ صحیح ہوتا۔ تو دنیا کے جانداروں کی تعداد میں وزن قائم رہتا۔ یعنی اگر انسان بڑھتے تو دوسرے جانور گھٹ جاتے۔ اور دوسرے جانور بڑھتے تو انسان گھٹ جاتے۔ کیونکہ اوّل سے آخر تک روحوں کی تعداد ایک ہی ہے۔ وہی مختلف جسموں میں گھومتی پھر رہی ہیں۔ لیکن تجربہ یہ بتا رہا ہے۔ کہ دن بدن ہر جاندار میں زیادتی ہی ہے **تیسرے** اس لئے کہ ایک بار حضرت صدر الافاضل مرشدی واستاذی مولینا نعیم الدین صاحب قبلہ مراد آبادی دام ظلہم کا مناظرہ رام چندر دہلوی سے ہوا۔ حضرت نے

دریافت فرمایا۔ کہ مہاشہ جی! کوئی دنیا میں ایسا بھی گذرا ہے۔ کہ جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ کہا۔ لاکھوں۔ سب سے بڑے تو رشی منی گذرے ہیں جن پر یہ وید آئے حضرت نے فرمایا۔ کہ ایسے بے گناہ انسان کس جون میں جانے چاہئیں۔ ان کو تو ایسی جون میں جانا چاہیئے۔ کہ جہاں ہر طرح کا راحت اور آرام ہو۔ اس نے کہا بیشک! فرمایا بتاؤ کہ وہ جون کونسی ہے۔ کہا۔ کہ ایسے لوگ بادشاہ بن کر آتے ہیں۔ فرمایا۔ کہ بادشاہ سے بڑھ کر تو دنیا میں کوئی مصیبت میں نہیں سب کو فکر نان۔ اس کو فکر جہان غریب لوگ رات کو آرام سے سوئیں۔ اور وہ فکر سے تارے گن گن کے گذارے یہ تو بڑا ظلم ہے۔ کہ خدا تعالیٰ ان کو ایسی مصیبت میں ڈالے تو مہاشہ جی فوراً بولے کہ وہ تارک الدنیا سنیاسی بن کر آتے ہیں۔ فرمایا۔ واہ ان کی نیکیوں کا یہ بدلہ دیا۔ کہ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا۔ نہ تن پہ کپڑا نہ بدن پر لنگوٹا۔ سب تو جاڑوں میں عمدہ عمدہ لباس پہنیں۔ یہ مصیبت کا مارا آگ تاپ کے رات کاٹے۔ مہاشہ جی گھبرا گئے۔ بہت سے پلٹے کھائے۔ مگر کوئی جون ایسی نہ ملی جو بالکل راحت و آرام کی ہوتی حضرت نے فرمایا۔ کہ مہاشہ جی اگر ہماری بات مانو۔ تو ہم تمہیں بتائیں۔ کہنے لگے بتاؤ۔ فرمایا۔ کہ ان کو "رنڈی" بن کے آنا چاہیئے۔ کہ دنیا میں یہ ہی آرام سے رہتی ہے۔ دن رات نیا لطف اٹھائے۔ دوسرے کمائیں یہ مزے سے کھائے۔ مہاشہ جی گرم ہو گئے اور کہا کہ دیکھئے آپ گالیاں دیتے ہیں۔ فرمایا یہ تمہارے مذہب کی کمزوری ہے۔ قرآن کو مانو تو جنت ہی جزا کی جگہ بن سکتی ہے۔ نہ کہ دنیا **چوتھے** اس لئے کہ دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ نہایت اقبال والے مالدار۔ صاحب عزت پر کبھی ایسا وقت آ پڑتا ہے۔ کہ اس کی زندگی بالکل پلٹ جاتی ہے پہلے مالدار تھا۔ اب فقیر ہو گیا۔ پہلے عزت۔ عظمت اور اقبال مندی اس کے پاؤں چومتی تھی۔ اب ادبار نے اس کو گھیر لیا۔ اسی طرح بہت سے آدمی دیکھے گئے ہیں۔ کہ پہلے غریب تھے۔ پھر مالدار بن گئے۔ تو اگر یہ دنیوی آرام اور تکلیفیں پچھلی جون کی جزا اور سزا تھیں۔ تو چاہیئے تھا۔ کہ ایک ہی حال پر رہتا۔ یہ حال بدلے کیوں؟ **آریوں کے اعتراض** :۔ قرآن شریف کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا صرف قیامت کے دن کا مالک ہے۔ تو کیا آج اس کے سوا کوئی اور مالک ہے؟ **جواب** :۔ اس کا نہایت نفیس جواب اسی تفسیر میں اوپر گذر چکا ہے۔ **دیوبندیوں کا اعتراض** :۔ جب قیامت کے دن کا خدا ہی مالک ہے۔ تو خدا کے سوا نبیوں۔ ولیوں کو اپنا شفیع جاننا اور ان کو اس دن حاجت روا ماننا اس آیت کے خلاف ہے۔ بدعتی لوگ اولیاء اللہ اور پیروں کی نذر نیاز اس لئے کرتے ہیں۔ کہ یہ لوگ قیامت کے دن ان کے کام آئیں یہ عقیدہ بالکل مشرکانہ عقیدہ ہے۔ **جواب** :۔ شفاعت اور بندوں کی حاجت روائی حق تعالیٰ کے مالک ہونے کے بالکل خلاف نہیں، انبیاء کرام۔ اولیاء اللہ اور علماء اس لئے شفاعت نہ کریں گے۔ کہ وہ اس دن کے مالکِ حقیقی ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ مالک حقیقی کے پیارے ہیں۔ ان کی بات وہاں سنی جاتی ہے۔ اگر وہ مالک حقیقی ہوتے۔ تو شفاعت کے کیا معنے؟ وہ خود بخش دیتے دنیا میں بھی ہر چیز کا مالک پروردگار ہی ہے۔ مگر یہاں بھی بڑے حاکموں کی بارگاہ میں شفاعت (سفارش) ہی سے کام چلتا ہے۔ انشاء اللہ شفاعت کی پوری بحث آیت الکرسی کے تحت میں کی جائے گی۔ اور ہم نے اپنی کتاب "شان حبیب الرحمٰن" میں بھی اس پر کافی روشنی ڈال دی ہے۔

| اِيَّاكَ نَعْبُدُ | | |
|---|---|---|
| تجھ ہی کو | پوجیں | ہم |
| ہم تجھ ہی کو پوجیں | | |

**تعلق**، اس آیت کا گذشتہ آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ اوّلاً اس طرح کہ شروع سے اب تک حق تعالیٰ نے اپنے انعامات اور جباری اور ملکیت کا ذکر فرمایا۔ اس سے مقصود تھا۔ کہ اللہ کی مخلوق اس کی اطاعت کی طرف رغبت کرے کیونکہ احسان کی وجہ سے انسان اطاعت کی طرف رغبت کرتا ہے۔ اور خوف ڈر سے طاعت پر مجبور ہوتا ہے۔ لہذا حکم ہوا۔ کہ تم کہو اِيَّاكَ نَعْبُدُ۔ تو گویا اب تک عبادت

کی رغبت دلائی تھی۔ اور اب عبادت کا صریح حکم فرمایا۔ **دوسرے** اس طرح کہ حق تعالیٰ نے اس سے پہلے اپنے پانچ نام بیان فرمائے۔ اللہ۔ ربّ۔ رحمٰن۔ رحیم اور مالک۔ گویا یوں فرمایا کہ ہم نے تم کو پیدا فرمایا۔ لہٰذا ہم تمہارے اللہ ہیں پھر تم کو پالا۔ لہٰذا ہم ربّ ہیں۔ تم نے گناہ کئے ہم نے چھپائے۔ پس ہم رحمٰن ہیں۔ تم نے توبہ کی ہم نے مغفرت فرمائی لہٰذا ہم رحیم ہیں۔ تم ہمارے قبضے میں ہو۔ اور جزا اور سزا کا دن بھی آنے والا ہے۔ لہٰذا ہم مالک ہیں پس اے بندے تو ہماری عبادت کر۔ اور عبادت کا مستحق وہی ہے جس میں یہ صفتیں ہوں۔ لہٰذا یہ کہو کہ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں **تیسرے** اس طرح کہ انسان کے تین ہی حال ہیں۔ گذرے ہوئے۔ موجودہ اور آنیوالے۔ اور ان تینوں حالوں میں انسان رب کا محتاج۔ کیونکہ جب موجود نہ تھا۔ تو اُس نے موجود کیا جب کمانے کے قابل نہ تھا۔ اس نے رزق دیا۔ اس کو لفظ اللہ اور رب نے بیان کیا۔ پھر موجودہ حالت میں ہر ہر آن ہر طرح ہم رب کے محتاج اسی کا ذکر رحمان اور رحیم میں فرمایا۔ اور پھر آئندہ قبر اور حشر میں رب ہی کے محتاج اس کو بیان کیا "مالک یوم الدین" نے۔ تو ان آیات نے بتادیا۔ کہ اے انسان تو ہر حالت میں رب کا محتاج ہے۔ اب فرمایا گیا۔ کہ جس کے کرم کی تجھ کو ہر وقت ضرورت تھی اور ہے اور رہے گی۔ تو اسی کی عبادت بھی کر۔ **(تفسیر)** علماء کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت میں کلام کی روش چند طرح بدل گئی۔ **اولاً** یہ کہ اب تک خدا کا ذکر اس کے ناموں سے تھا۔ اب اس کو خطاب کیا گیا۔ **دوسرے** اب تک اللہ ہی کا ذکر تھا۔ اس آیت میں بندے کا بھی ذکر کیا گیا۔ **تیسرے** اب تک رب تعالیٰ کی ہی صفات کا ذکر تھا۔ اب بندے کے صفات کا ذکر فرمایا لیکن اس طرح کہ اِیَّاكَ پہلے اور نَعْبُدُ بعد میں۔ اِیَّاكَ کو اس لئے پہلے رکھا۔ تاکہ اس میں حصر کے معنےٰ پیدا ہو جائیں۔ یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ نیز حق تعالےٰ قدیم ہمیشہ سے موجود۔ ہم حادث بعد میں پیدا ہونے والے جو پہلے سے ہو۔ اس کا ذکر پہلے۔ جو بعد میں ہو اس کا ذکر بعد میں۔ **نیز** اس میں اس بات کی تعلیم ہے۔ کہ جب انسان اپنا بھی اور رب کا بھی ذکر کرے تو رب کا ذکر پہلے کرے۔ **نیز** اس میں اشارہ اس جانب ہے۔ کہ عبادت کرنے والے کی نیت خالص رب کو راضی کرنے کی ہو۔ نہ کہ دنیا کے دکھانے کی۔ کیونکہ جو شخص ریا سے عبادت کرتا ہے۔ وہ خدا کا عابد نہیں۔ بلکہ اُس کا عابد ہے جس کو دکھا رہا ہے۔ میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ جب وہ نماز میں کھڑے ہوتے۔ تو بہت روتے تھے میں نے رونے کی وجہ دریافت کی۔ فرمانے لگے مجھے خبر نہیں۔ کہ میں نماز پڑھنے میں جھوٹا ہوں یا سچا۔ کہ زبان سے تو کہہ رہا ہوں اِیَّاكَ نَعْبُدُ۔ اگر میرے قلب میں ذرّہ بھر بھی ریاء ہوئی۔ تو خدا کا حکم ہوگا۔ کہ تو جھوٹا ہے۔ ارے کم بخت مسجد میں کھڑے ہو کر نماز کی حالت میں میرے سامنے ہاتھ باندھ کر مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔ کہ زبان سے کہتا ہے۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ (ہم تجھ ہی کو پوجتے ہیں۔ اور دل میں کسی اور کی پوجا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس قول میں سچا کرے آمین خطاب کا صیغہ اس لئے لایا گیا۔ تاکہ بندہ اس وقت اپنے ربّ کو حاضر ناظر جانے کہ گویا میں اس کو دیکھ رہا ہوں۔ یا وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اس لئے میں عرض کر رہا ہوں۔ کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ۔ گویا کہ نمازی نماز شروع کرتے وقت رب سے غائب تھا۔ اور اب خدا کی صفتیں بیان کرنے کی برکت سے بارگاہ میں اس طرح حاضر ہوگیا۔ کہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور اس سے کلام کر رہا ہے **نیز** اب تک خدا کی صفتوں ہی کا بیان تھا۔ اور اب عرض معروض ہے صفتوں کا بیان غائب کے صیغے سے اچھا ہوتا ہے۔ اور عرض معروض حاضر کے صیغے سے (**نوٹ ضروری**) نماز میں کسی کو خطاب کر کے کلام کرنا جائز نہیں۔ اگر کوئی ایسا کرے تو نماز جاتی رہے گی۔ سوا اللہ کے اور اللہ کے محبوب علیہ السلام کے۔ اس طرح کہ یہاں کہتا ہے۔ اِیَّاكَ نَعْبُدُ اور اَلتَّحِیَّاتُ میں کہتا ہے۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نمازی جس طرح اللہ کو حاضر ناظر جانے اسی طرح اس کے محبوب صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو۔ اور جس طرح کہ ربّ کو راضی کرنے کی نیّت کرے۔ ایسے ہی اس کے محبوب علیہ السلام کو اسی لئے صحابہ کرام نے عین حالت نماز میں حضور علیہ السلام کا ادب کیا ہے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) نَعْبُدُ عَبَدٌ سے بنا ہے جس کے لغوی معنے ہیں "اظہار عجز" اسی لئے عام رستے کو عربی محاورے میں طریق معبد کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہر ایک پیر کے نیچے آتا ہے۔ (تفسیر کبیر) اصطلاح شریعت میں

یا یہ عِبَادَۃٌ سے بنا ہے۔ یا عُبُوْدَۃٌ سے عبادت کے معنے عابد بننا اور عبودت کے معنے عبد بننا۔ (روح البیان) یا تو یہ معنے ہوئے۔ کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ یا یہ کہ تیرے ہی بندے بنتے ہیں عبادت کے اصطلاحی معنے یہ ہیں۔ کہ کسی کو خالق یا خالق کا حصہ دار مان کر اس کی اطاعت کرنا جب تک کہ یہ نیت نہ ہو۔ تب تک اسے عبادت نہیں کہا جائیگا۔ ایک بُت پرست بُت کے سامنے سجدہ کرتا ہے۔ اور مسلمان کعبہ کے سامنے ہاں بھی پتھر ہی ہیں لیکن وہ مشرک ہے۔ اور ہم موحد۔ ہندو اپنے دیوتاؤں رام چندر وغیرہ کو مانتا ہے مسلمان نبیوں ولیوں کو۔ پھر کیا وجہ کہ وہ مشرک ہو گیا۔ اور یہ مواحد رہا۔ فرق یہی ہے۔ کہ وہ انہیں الوہیت میں حصہ دار مانتا ہے ہم ان کو اللہ کا خالص بندہ مانتے ہیں۔ بہر حال عبادت میں یہ قید ہے۔ کہ جس کی اطاعت کرے اس کو اپنا خالق مانے۔ عبادت بہت سی قسم کی ہے نماز روزہ، حج، زکوٰۃ بلکہ یوں سمجھو کہ جو جائز کام بھی رب کو راضی کرنے کی نیت سے کیا جائے وہ عبادت ہے۔ یہاں تک کہ جو آدمی ربّ کو راضی کرنے کے لئے اپنے بچوں کو پالے یہ بھی عبادت ہے۔ اور اس میں ثواب ملتا ہے۔ یہ کلمہ ان سب کو شامل ہے۔ اسی طرح بندہ بننے کی بہت سی صفتیں ہیں۔ رب کی رضا میں راضی رہنا۔ اس کی نعمت پر شکر کرنا۔ اس کی بلا پر صبر کرنا اپنے عقائد درست کرنا غرض کہ اپنے میں بندوں کے سے صفات پیدا کرنا۔ یہ سب معانی بھی اسی کلمے میں آگئے۔ نَعْبُدُ کو جمع کے صیغے سے فرمایا۔ اس میں اشارہ اس طرف ہے۔ کہ اے اللہ میں تیری بارگاہ میں اکیلا حاضر نہیں ہؤا۔ اور نہ صرف اپنی عبادت لایا۔ بلکہ تیرے سب بندوں کے ساتھ ہوں جن میں انبیاء۔ اولیاء صالحین سب ہیں۔ اگر میری عبادت قابل قبول نہ بھی ہو۔ تو ان کے طفیل قبول فرمالے کیونکہ جو موتی خریدتا ہے۔ وہ ڈورے کو واپس نہیں کرتا۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ جو شخص خراب اور عمدہ مال ملا کر فروخت کرے۔ تو خریدار یہ نہیں کر سکتا۔ کہ اچھا لے لے اور بُرا واپس کردے۔ بلکہ یا تو کُل لے لے گا۔ یا کُل واپس کرے گا۔ اور ہر ایک کی عبادت بارگاہ الٰہی سے واپس نہیں ہوتی۔ تو نیکوں کے طفیل امید ہے۔ کہ ہم بدوں کی بھی وہاں رسائی ہو جائے۔ **مسئلہ**۔ اگر کوئی شخص رب کی عبادت اکیلا ہی کرے۔ جب بھی یہ سمجھ کر کرے۔ کہ مجھ سے پہلے بہت سے مقبول بندے اس کام کو کر گئے ہیں۔ اور اب بھی کر رہے ہوں گے۔ میں اپنے کو ان میں شامل کرتا ہوں۔ مثلاً ایک آدمی نیت خیر سے یہ سمجھ کر اپنے بچوں کو پالتا یا نوکری کرتا ہے۔ کہ یہ رب کا حکم ہے۔ تو اس کا یہ کام عبادت ہے۔ اس وقت یہ نیت کرے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے اہل وعیال کی پرورش فرمائی۔ اور دیگر انبیاء کرام۔ اولیاء اللہ نے بھی رزق حاصل کرنے کے لئے بہت سے ذریعے اور پیشے اختیار کئے میں بھی انہیں کی اتباع میں یہ کام کر رہا ہوں۔ اسلئے جمع کا صیغہ یہاں بھی صادق ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیاوی کاموں کو خود کیا۔ تاکہ یہ کام سنت بن جاویں۔ یونہی اگر کوئی شخص تنہا نماز پڑھ رہا ہے۔ تو وہ بھی یہی کہے گا۔ کہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ کیونکہ ہزاروں بندے اس سے پہلے یہ عبادت کر چکے ہیں۔ اور ہزاروں اب بھی کر رہے ہوں گے۔ **نیز** اس کے ساتھی فرشتے بھی حق تعالےٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ دیکھنے میں اگرچہ اکیلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں بہتوں کے ساتھ ہے۔ اس لئے اگر ایک آدمی کو سلام کرتے ہیں۔ تو بھی السلام علیکم (یعنی تم سب پر سلام) ہی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے ساتھ فرشتے بھی ہیں۔ **مسئلہ** اس سے معلوم ہؤا کہ جماعت سے نماز پڑھنی چاہیئے۔ بلکہ ہر عبادت مسلمانوں کے اجتماع کا مقام ہے۔ کہ بغیر جماعت عبادت ناقص ہوتی ہے۔ **تفسیر صوفیانہ**۔ صوفیاء کرام کے نزدیک وہی عبادت کامل ہے جس میں فقط اللہ کو راضی کرنا منظور ہو۔ اگر جنت لینے کے لئے یا دوزخ سے بچنے کے لئے عبادت کی۔ تو وہ عبادت کیا ہوئی ایک قسم کا بیوپار ہؤا۔ اس لئے فرمایا اِیَّاكَ اے اللہ تیری عبادت کرتے ہیں یعنی ہماری عبادت سے مقصود صرف تیری ذات ہے۔ اسی وجہ سے نماز کی نیت میں کہا جاتا ہے۔ کہ واسطے اللہ کے۔ یہ نہیں کہتے۔ کہ واسطے جنت کے یا واسطے جہنم سے بچنے کے۔ **نیز** جو شخص جنت کے حاصل کرنے یا دوزخ سے بچنے کے لئے عبادت کرتا ہے۔ وہ اپنی عبادت کا نتیجہ قیامت سے پہلے نہیں دیکھ سکتا۔ کیونکہ جنت دوزخ کا معاملہ قیامت کے بعد ہے۔ لیکن جو صرف رب کی رضا کے لئے عبادت کرتا ہے۔ اس کا مقصد آج ہی سے حاصل ہو

گیا۔ لہٰذا یہ نفع میں رہا۔ **عبادت کی روح** یہ ہے کہ انسان غرور (دھوکہ) سے سرور (خوشی) کی طرف منتقل ہو جائے۔ اور دنیا کی تاریکی سے نکل کر حق کے نور اور مشاہدۂ جمال میں پہنچ جائے۔ کیونکہ دنیا اور دنیا کی چیزیں ایک اندھیرا ہیں۔ اور دین نور ہے۔ دنیا میں بے چینی ہے۔ عبادت میں چین ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ کہ اے محبوب ہم جانتے ہیں۔ کہ کفار کی باتوں سے آپ کے دل مبارک کو دکھ پہنچتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ معلوم ہوا۔ کہ عبادت دنیوی تکلیفوں کا علاج ہے۔ لہٰذا جس عبادت میں یہ بات نہ ہو۔ وہ بالکل بے جان ہے **نیز** جس چیز سے اپنا پیارا راضی ہو وہ عبادت ہے۔ اور جس سے وہ ناراض ہو۔ وہ کام گناہ ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے خیبر کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نیند پر نماز قربان کر دینا عین عبادت تھی۔ اگر نماز چھوڑنے میں اس کی رضا ہے۔ تو چھوڑنا عبادت ہے۔ اور پڑھنے میں اس کی رضا ہے۔ تو پڑھنا عبادت آفتاب نکلتے وقت نماز پڑھنا گناہ کیوں ہے۔ اس لئے کہ اس میں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم راضی نہیں۔ **اعتراضات**۔ اعتراض (۱) جب اللہ تعالےٰ غنی (سب سے بے پرواہ) ہے تو اسے بندوں کی عبادت کی کیا ضرورت ہے اور انہیں عبادت کا کیوں حکم دیا ہے۔ ہم بھی بلا وجہ عبادت کی مشقت میں کیوں پڑیں۔ **جواب**:۔ رب کو ہرگز ہماری عبادت کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ہم کو خود ضرورت ہے۔ قالین یا قیمتی بستروں پر بیٹھنے کے قابل وہی ہو گا جس کا جسم گندگی سے آلودہ نہ ہو۔ گندہ آدمی اس پر بیٹھنے کے قابل نہیں حق تعالےٰ کی جنت نہایت پاک صاف جگہ ہے۔ اس کے قابل وہی ہے۔ جو خود پاک صاف ہو۔ دنیا کی مشغولیت ہمارے قلب کو گندہ بنا دیتی ہے عبادت رحمت کا پانی ہے۔ جس کے ذریعہ سے ہم پاکی حاصل کر کے جنت کے قابل ہو سکتے ہیں **نیز** ہمارا دل ایک آئینہ ہے۔ جو دنیا کے گرد و غبار سے میلا ہو تا رہتا ہے عبادت اس کا سیقل ہے جس سے اس کو صاف کر دیا جاتا ہے۔ اگر عبادت سے صفائی نہ ہوتی رہے۔ تو آخر کار یہ آئینہ بالکل سیاہ ہو کر کسی قیمت کے قابل نہ رہے **نیز** دشمنوں میں گھرا ہوا انسان جب ہی محفوظ رہ سکتا ہے جب یا تو وہ خود ہی قدرت والا ہو۔ یا کسی قدرت والے کو پکڑ لے۔ ہم کمزور ہزاروں قوی دشمنوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ شیطان نفس امارہ۔ دنیوی الجھنیں برے یار وغیرہ ضرورت ہے۔ کہ قدرت والے حق تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھیں۔ اور یہ عبادت تعلق ہی ہے۔ **نیز** پردیسی کو اپنے دیس کے ذکر سے چین ہوتا ہے ہماری روح پردیسی ہے۔ عبادت میں اس کے وطن کا ذکر ہے۔ اس لئے اس کو اس سے چین ملتا ہے۔ تفسیر عزیزی میں لکھا ہے۔ عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ، کے کسی عضو میں ایک زخم تھا۔ کہ جس کی وجہ سے اس عضو کو کاٹنے کی ضرورت تھی مگر سخت تکلیف کی وجہ سے ہمت نہ پڑتی تھی۔ جب وہ نماز میں کھڑے ہوئے۔ تو کاٹ دیا گیا۔ اور ان کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔ **آریوں کے اعتراض** (۲) مسلمان کہتے ہیں۔ کہ ہم سب رب ہی کی عبادت کرتے ہیں۔ اور مواحد ہیں۔ حالانکہ وہ کعبہ کی طرف سر جھکاتے ہیں۔ یہ تو ہندؤں سے بڑھ کر مشرک ہوئے۔ کیونکہ وہ تو ایک پتھر کو پوجتا ہے۔ اور یہ ہزاروں پتھروں کی عمارت کو۔ اگر مسلمان کہیں کہ ہم کعبے کو خدا نہیں سمجھتے۔ تو ہندو بھی مورتی کو خدا نہیں سمجھتا۔ بلکہ اپنا دھیان یکسو رکھنے کے لئے ایک پتھر سامنے رکھ لیتا ہے **جواب** اس کا جواب نماز کی نیت ہی میں دے دیا گیا ہے۔ کیونکہ نیت میں یہ کہا جاتا ہے۔ کہ نماز واسطے اللہ کے منہ طرف کعبہ شریف کے" معلوم ہوا کہ نماز کعبہ کے لئے نہیں نماز تو اللہ کے لئے ہے۔ صرف جہت مقرر کرنے کے لئے کعبہ کی سمت تجویز کر دی گئی ہے۔ اگر نماز کعبہ کے لئے ہوتی۔ تو جس طرف کعبہ کا پتھر پہنچتا۔ ادھر ہی مسلمان جھک جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ غلاف کعبہ ہمارے پاس پہنچتا ہے ہم اس کو سجدہ نہیں کرتے۔ اگر وہاں کا کوئی پتھر بلکہ ساری عمارت پنجاب میں رکھ دی جائے۔ تو کوئی بھی ادھر سجدہ نہ کرے۔ لیکن ہندو کا یہ حال ہے۔ کہ جدھر اس کی مورتی ادھر ہی پجاری کا سر۔ معلوم ہوا۔ کہ اس کا سر مورتی کے لئے جھکا۔ اور مسلمان کا سر رب کے لئے۔ بلکہ خوف اور سفر کے نفل میں جدھر منہ کر کے نماز پڑھے گا ہو جائے گی۔ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ پھر فرق یہ بھی ہے۔ کہ ہندو پتھر کسی انسان کے نام پر بناتا ہے۔ رام چندر۔ کالی مائی۔ دیو۔ مہادیو کے نام پر وغیرہ وغیرہ

اور اُس شخص کو خدا کا شریک اور خدائی میں حصہ دار مانتا ہے۔ اور یہ سمجھ کر اُس پتھر کی طرف سر جھکاتا ہے۔ کہ جس کے نام کا یہ پتھر ہے۔ میں اس کی عبادت کر رہا ہوں۔ کعبہ شریف میں ان میں سے کوئی بات نہیں۔ یہ بھی یاد رہے۔ کہ کعبہ عمارت کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اُس جگہ کا نام ہے۔ اگر وہاں کوئی عمارت بھی نہ ہو۔ تو بھی نمازیں اُسی طرف ہی منہ کیا جائیگا۔ یہ عمارت تو اُس جگہ کا نشان ہے جب پہاڑ پر اور تہ خانوں میں نماز پڑھتے ہیں۔ اُس حالت میں اُس عمارت کا کوئی بھی حصہ سامنے نہیں ہوتا۔ **اعتراض** ۔ چاہیئے کہ تم آریوں کی عبادت کو صحیح مانو۔ کیونکہ یہ کسی مورتی کی پوجا نہیں کرتے صرف رب کا نام لیتے ہیں۔ اور تم بھی رب ہی کا نام لیتے ہو مقصود تو رب کو یاد کرنا ہے جس طرح چاہو کرو۔ **جواب** عبادت وہی سچی ہے۔ کہ جسکی تعلیم حق تعالیٰ کی طرف سے نبیوں کے ذریعے دی گئی ہو۔ اپنی عقل کی تجویز کی ہوئی کوئی عبادت عبادت نہیں۔ مسلمان جو بھی عبادت کرتا ہے وہ رب تعالیٰ کی بتائی ہوئی نبیوں کی بتائی ہوئی ہے۔ لہٰذا صحیح ہے۔ آریہ وغیرہ کی عبادت عقل سے سوچی ہوئی۔ اپنی طرف سے بنائی ہوئی ہے۔ لہٰذا وہ کچھ بھی کرے غلطی کرتا ہے۔ شاہی قانون کی پابندی اشد ضروری ہوتی ہے **دیوبندیوں کا اعتراض** ۔ دیوبندی فرقہ کے نزدیک عبادت وہ کام ہیں جو حق تعالےٰ نے اپنے لئے خاص کئے ہوں۔ اور اُن کو بندوں کے لئے بندگی کا نشان بنایا ہو۔ دیکھو "تقویت الایمان"۔ لہٰذا ایسے کام غیر خدا کے لئے کرنا شرک و بُت پرستی ہے۔ اس لئے اُن کے مذہب کی رو سے کسی کو پکارنا کسی کی دھائی دینا کسی غیر خدا سے مدد لینا۔ کسی کے گھر یا جنگل کا ادب کرنا کسی کی یادگار منانا۔ کسی کی قبر پر جھاڑو دینا۔ کسی طرف اپنے کام یا اپنے نام کی نسبت کرنا یعنی علی بخش۔ نبی بخش۔ نام رکھنا غرضکہ کسی کی کچھ تعظیم کرنا۔ غیر اللہ کی عبادت اور شرک ہے۔ اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے خلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ہم اللہ کے بندے ہیں۔ اور اُس سے وعدہ بھی کر چکے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ۔ ہم تیری ہی عبادت کریں گے۔ تو اُس کو چھوڑ کر کسی بندے کے ساتھ یہ معاملہ کرنا یقیناً شرک ہے۔ **جواب**۔ اگر عبادت کی یہ تعریف صحیح مان بھی لی جائے۔ تو جن چیزوں کو ان وہابیوں نے شرک کہا وہ شرک نہیں بنتیں۔ اور اس عقیدہ کی بنا پر دنیا میں کوئی بھی شرک سے نہیں بچ سکتا۔ نہ خود دیوبندی وہابی اور نہ کوئی اور مسلمان **اوّل** تو اس لئے کہ قبر پر جھاڑو دینا کسی کو پکارنا۔ کسی سے مدد مانگنا۔ کسی کا دن منانا۔ خداوند تعالےٰ کے ساتھ خاص نہیں اور نہ یہ چیزیں بندگی کا نشان ہیں۔ مدد کی بحث تو ہم انشاء اللہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں کریں گے لیکن اور چیزوں کو لے لو۔ رب تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو پکارا یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ مسلمانوں کو پکارا کافروں کو پکارا۔ پہاڑوں کو پکارا اس صورت میں معاذاللہ رب پہلا مشرک اور قرآن پڑھنا شرک۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اُمتیوں کو پکارا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ کو جو نہاوند میں جہاد کر رہے تھے۔ مدینہ پاک سے پکارا۔ ہم ایک دوسرے کو دن رات پکارتے ہیں۔ خود مولوی قاسم صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارا ؎

مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا　　نہیں ہے قاسم بیکس کا کوئی حامی کار

غرض کہ پکارنے کو شرک کہنا عجیب حماقت ہے۔ **کسی کی یادگار منانا** بھی خدا کے ساتھ خاص نہیں نہ خدا کسی کی یادگار مناتا ہے۔ اور نہ کوئی شخص خدا کی یادگار منائے۔ حج حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی یادگار ہے ورنہ ظاہر ہے۔ کہ دوڑنا۔ کودنا۔ پتھر پھینکنا بذاتہ ثواب کا کام نہ تھا۔ پانچ وقت کی نمازیں بھی مختلف نبیوں کی یادگاریں ہیں جس پیغمبر نے کسی خاص موقع پر جتنی رکعتیں پڑھ لی ہیں۔ انہیں کو اسلام نے قائم رکھا ہے۔ اسی لئے نمازوں کی رکعتیں مختلف ہیں۔ کہ فجر میں دو ظہر کی چار وغیرہ وغیرہ۔ دوشنبہ کے دن کا روزہ اسی لئے سنت ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پاک کی یادگار ہے۔ اگر یادگار منانا شرک ہو۔ تو بولو شرک سے کون بچا۔ **قبر پر جھاڑو دینا** یہ کام بھی خداوند تعالےٰ کے ساتھ خاص نہیں نہ تو خدائے تعالیٰ کسی کی قبر پر جھاڑو دیتا ہے۔ اور نہ خدائے تعالیٰ کی قبر ہے۔ کہ جس پر جھاڑو دی جاتی ہو۔ اور نہ جھاڑو دینا بندگی کا نشان ہے۔ اگر جھاڑو دینا بندگی کا نشان ہوتا۔ تو چاہیئے تھا۔ کہ ہر دیوبندی وہابی کی بغل میں ہر وقت ایک جھاڑو رہتی

کیونکہ نشانِ بندگی بندہ کے ساتھ چاہیئے۔ **دن** **مقرر کرنا بھی شرک نہیں**[۴] کیونکہ حج کے لئے دن مقرر۔ نماز کے لئے وقت مقرر۔ روزوں کے لئے مہینہ مقرر۔ شادی بیاہ کے لئے تاریخیں مقرر۔ مدرسہ دیوبند کے امتحان اور تعطیل اور چھٹی کے وقت نصاب تعلیم غرضکہ ہر چیز مقرر۔ تو بتاؤ شرک سے کون بچا۔ **عبد النبی نام رکھنا بھی شرک نہیں**[۵] کیونکہ یہاں عبد کے معنی عابد کے نہیں بلکہ غلام کے ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے مِنْ عِبَادِكُمْ تمہارے بندے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا۔ قُلْ یٰعِبَادِیَ فرما دو اے میرے بندو۔ مصنف دُرِّ مختار کے شیخ کا نام عبد النبی تھا۔ اگر عبد النبی نام رکھنا شرک ہو۔ تو بتاؤ۔ شرک سے کون بچا۔ **غرض** کہ یہ عبادت کے نہایت بیہودہ معنی ہیں۔ عبادت کے معنی ہیں اپنے انتہائی عجز کا اظہار اور انتہائی عجز جب ہی ہوگا۔ جبکہ عاجز اپنے کو اُس کا بندہ اور اُس کو اپنا خالق یا خالق کا حصہ دار مانیگا۔

**اعتراض**[۵]۔ مشرکین عرب اپنے معبودوں کو خدا نہیں مانتے تھے۔ بلکہ اُن کو خدا کا بندہ اور خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ کہتے تھے کہ ہم ان کو اس لئے پوجتے ہیں۔ کہ لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی۔ تاکہ یہ ہم کو خدا سے قریب کر دیں جس سے معلوم ہوا کہ کسی کو اپنا وسیلہ جاننا اور اُس کو پکارنا وغیرہ یہی عبادت ہے۔ اسی وجہ سے وہ لوگ مشرک قرار دیئے گئے۔ **جواب**۔ اس اعتراض کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ اُن مشرکین مکہ کا اِن چیزوں کو محض وسیلہ جاننا شرک نہ تھا۔ بلکہ اُن کو وسیلہ جان کر پوجنا شرک تھا۔ قرآن پاک کی یہ آیت ہے۔ کہ وَمَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی یعنی ہم اِن چیزوں کی نہیں پوجا کرتے۔ مگر اس لئے کہ یہ ہم کو اللہ کے قریب کر دیں۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا۔ کہ اُن کے جھوٹے معبود ہیں۔ تو اللہ کے بندے۔ مگر اُن کے ذریعے سے رب کی خدائی چل رہی ہے۔ اور رب کو اُن کی بات اُن سے دب کر ماننی پڑتی ہے۔ اور اُن کو رب سے ایسی نسبت ہے۔ کہ جیسے وزراء کو بادشاہ سے کہ اِن کی ناراضگی سے رب کی ربوبیت میں خلل پڑ جائے گا۔ اور اُن میں الوہیت ایسے سمائی ہوئی ہے۔ جیسے کہ گلاب کے پھول میں اُس کی خوشبو وہ یہ بھی سمجھتے تھے۔ کہ دنیا کے بڑے بڑے کام رب کرتا ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے کام یہ کرتے ہیں۔ یہ سمجھ کر اُن کی اطاعت بندگی کرتے تھے۔ اسی لئے اُن کو اٰلِهَة یا شرکاء کہتے تھے۔ اور یہ سمجھ کر اُن کی پوجا کرتے تھے۔ جیسے کہ آجکل ہندوستان کے ہندوؤں کا گنگا اور کالی اور مہادیو اور بھوانی وغیرہ کے متعلق یہی عقیدہ ہے۔ الحمد للہ کوئی مسلمان کسی نبی۔ ولی کے متعلق یہ عقیدہ نہیں رکھتا۔ اُس کا عقیدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ جو تیرے سوا ہے۔ وہ تیرا بندہ ہے۔ اس کو پوری تحقیق ہماری کتاب جاء الحق میں دیکھو۔ **دوسرے** یہ کہ اگر مان بھی لیا جائے۔ کہ مشرکین کا اُن بتوں کو وسیلہ جاننا ہی شرک تھا۔ تو یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ بیشک بتوں کو وسیلہ جاننا کفر ہے لیکن پیغمبروں۔ اللہ کے مقبول بندوں کو وسیلہ جاننا اور اپنا شفیع ماننا ہرگز شرک نہیں۔ اور یہ سمجھ کر اُن کی اطاعت کرنا اسلام کے خلاف نہیں۔ کیونکہ اُن معبودوں کو حق تعالےٰ نے اپنے تک پہنچنے کا وسیلہ نہ بنایا تھا۔ کفار فقط اپنی تجویز سے اُن کو وسیلہ مانتے تھے۔ لہذا یہ کفر تھا۔ اور انبیاء اور نیک بندوں کو حق تعالیٰ نے وسیلہ بنا کر بھیجا ہے۔ یہ انتخاب الٰہی سے منتخب ہیں۔ لہذا ان کو وسیلہ ماننا عین ایمان ہے۔ **جیسے** کہ بادشاہ کی رعایا بادشاہ کے مقرر کئے ہوئے حکام کو اپنا وسیلہ یا مددگار جانے۔ یہ بغاوت نہیں۔ بلکہ بادشاہ کی مرضی کے مطابق ہے۔ لیکن اگر رعایا کسی کو خود اپنی طرف سے حاکم مقرر کر کے اُس کو اپنا مددگار جانے اب باغی ہو گئی۔ کیونکہ شاہی انتخاب والوں کو چھوڑ کر اپنے انتخاب پر عمل کیا۔ **دیکھو** کعبہ معظمہ کی طرف ہر مسلمان سجدہ کرتا ہے لیکن اگر کوئی خود اپنی طرف سے کعبہ بنائے۔ جیسے کہ سندھ کے ایک بے دین نے کیا۔ اور ادھر سجدہ کرنا شروع کر دے۔ تو وہ یقیناً کافر ہے۔ فرق کیا ہوا۔ یہ دونوں سجدے تو رب ہی کو کر رہے ہیں۔ لیکن خود ساختہ کعبہ کی طرف سجدہ کرنا کفر کیوں ہوا۔ اسی لئے کہ کعبہ معظمہ کا رب نے انتخاب کیا تھا۔ اور یہاں اُس نے اپنے آپ اس کی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ بہرحال عبادت کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ معبود میں خدائی شان مان کر اُس کی اطاعت کی جائے۔ اسلام سے پہلے قریب قریب سارے دینوں میں بزرگوں کو تعظیمی سجدہ کیا جاتا تھا۔ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو۔ برادرانِ یوسف علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدے کئے اور رب کو بھی سجدہ ہوتا تھا۔ بتاؤ کیا فرق تھا۔ کہ رب کا

سجدہ عبادت تھا۔ اور یہ محض تعظیم فرق صرف نیت کا تھا یعنی رب کو سجدہ کرتے تھے۔ اُسے خالق مان کر اور بزرگوں کو سجدہ کرتے تھے۔ محض بزرگ جان کر لطیفہ۔ ایک بزرگ ابن سعود نجدی کے زمانہ میں مدینہ پاک حاضر ہوئے۔ روضۂ مطہرہ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوئے تھے۔ کہ نجدی پولیس نے کہا۔ کہ کیا تو نماز پڑھ رہا ہے۔ تو مشرک ہوگیا۔ انہوں نے پوچھا کیوں۔ سپاہی کہنے لگا۔ کہ کسی کے سامنے نماز کی طرح کھڑا ہونا یعنی ہاتھ باندھ کر یہ اُس کی عبادت ہے۔ بزرگ فرمانے لگے۔ کہ کیسے کھڑا ہوں۔ وہ بولا۔ کہ ہاتھ چھوڑ کر انہوں نے فرمایا۔ کہ اس طرح کھڑا ہونا بھی مالکی نماز کا قیام ہے۔ پھر بھی نماز سے مشابہت تو رہی۔ اگر ناف کے نیچے ہاتھ باندھوں تو حنفی نماز ہے۔ اور ناف کے اوپر باندھوں تو شافعی نماز۔ ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہوں۔ تو مالکی نماز ہے اب بتا کیا کروں۔ وہ خاموش ہوگیا بزرگ فرمانے لگے۔ کہ کسی کام کا عبادت بننا۔ یا نہ بننا نیت پر موقوف ہے۔

## وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| اور | تجھ ہی سے | ہم | مدد | چاہیں |

اور تجھ ہی سے مدد چاھیں

**تعلق**۔ اس کا تعلق گذشتہ آیت سے چند طریقے سے ہے۔ **اوّل** یہ کہ سورہ فاتحہ میں چند مضمون ہیں پہلا خدا کی حمد دوسرا اپنی بندگی کا اظہار **تیسرے** اُس سے دعا مانگنا۔ اس سے پہلے دو مضمون بیان ہو چکے۔ اب تیسرا شروع ہوتا ہے۔ مگر چونکہ دعا کے لئے ضروری ہے۔ کہ کسی وسیلہ سے کی جائے۔ اس لئے اس سے پہلے عبادت کا ذکر ہوا۔ اور بعد میں دُعا کا۔ یعنی اے اللہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ اور عبادت کے وسیلہ سے تجھ سے مدد مانگتے ہیں (تفسیر عزیزی یہ ہی مقام) اسی لئے مصیبتوں کے وقت نمازیں پڑھ کر صدقات وغیرہ کر کے نیک اعمال کر کے دعائیں کی جاتی ہیں۔ تاکہ وہ عبادات قبولیت دعا کا وسیلہ بنیں **نوٹ ضروری** اس سے معلوم ہوا۔ کہ ہر دعا میں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ پکڑنا ضروری ہے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری بھی رب کی عبادت ہے۔ اور ہر عبادت دعا کا وسیلہ ہے۔ رب نے فرمایا۔ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ **دوسرے**۔ اس طرح کہ اس سے پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ اے اللہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ اب عرض کیا جا رہا ہے۔ خدایا اس عبادت کے مکمل کرنے میں تجھ سے مدد مانگتے ہیں یعنی شروع کرنا ہمارا کام ہے اور اس کو انجام کو پہنچانا تیرا کام **تیسرے** اس طرح کہ عبادت کی کچھ ظاہری شرطیں ہیں جن کے بغیر عبادت ادا نہیں ہوتی جیسے نماز کے لئے وضو وغیرہ انہیں شرائط ادا کہتے ہیں۔ اور کچھ باطنی شرطیں ہیں۔ کہ جن کے بغیر نماز بارگاہ الٰہی میں قبول نہیں ہوتی جیسے دل میں خشوع و خضوع کا ہونا۔ ریا اور فخر سے پاک ہونا۔ وغیرہ وغیرہ کہ جن کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی پہلی قسم کی شرطیں وضو کرنا وغیرہ بظاہر انسان کے قبضے میں ہیں۔ لیکن دوسری قسم کی شرطوں میں انسان بالکل بے بس معلوم ہوتا ہے کیونکہ دل کا حاضر ہونا اور خیالات کا پاک و صاف ہونا۔ انسان کے قابو سے باہر ہے۔ اس لئے پہلے عرض کیا گیا اِيَّاكَ نَعْبُدُ یعنی ہم ظاہری شرطیں ادا کر کے تیری عبادت کرتے ہیں۔ اور دوسری قسم کی شرطوں کے لحاظ سے کہا گیا۔ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ خدایا ان شرطوں میں تیری مدد مانگتے ہیں **تیسرے** اس طرح کہ پہلے اپنی عبادت کرنے کا ذکر تھا اور اب عرض کیا گیا۔ کہ اس عبادت کا رب کی بارگاہ تک بخیریت پہنچ جانا۔ اور مقبول ہونا۔ یہ رب ہی کے کرم پر موقوف ہے۔ کیونکہ بہت سے ایسے عارضے پیش آجاتے ہیں۔ کہ جن سے سارا کیا دھرا برباد ہو جاتا ہے اللہ محفوظ رکھے۔ تو عرض کیا خدایا عبادت ہم نے کر دی۔ اور آئندہ اس کی حفاظت میں تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ **چوتھے** اس طرح کہ عبادت سے روکنے والی چند چیزیں ہیں نفس، شیطان۔ دنیوی اُلجھنیں۔ اور برے یار اور عبادت کرانے والی چند چیزیں ہیں۔ روح۔ ایمان۔ قرآن وغیرہ۔ تو گویا عبادت کرتے وقت دو لشکروں کا مقابلہ ہے۔ پہلے تو عرض کیا

اے اللہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ اور پھر عرض کیا خداوندا ہمارے اس جہاد میں رحمانی لشکر کو شیطانی لشکر پر فتح دے۔ اس میں ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ **تفسیر عالمانہ**۔ علماء کرام فرماتے ہیں۔ کہ یہاں مدد سے مراد یا تو صرف عبادت میں مدد مانگنا ہے۔ یا سارے دنیوی دینی کاموں میں۔ دوسرے معنے زیادہ مناسب ہیں۔ تو گویا یہ کہا جارہا ہے۔ کہ اے اللہ جس طرح کہ ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اسی طرح صرف تجھ سے ہی ہر کام میں مدد مانگتے ہیں۔ ہم مشرک نہیں ہیں۔ کہ بعض کاموں میں تجھ سے مدد لیں۔ اور بعض میں تیرے سوا کسی اور سے ہر کام میں تجھ ہی پر اعتماد ہے۔ اور تیری ہی مدد سچی مدد ہے۔ اس میں بندے کو تعلیم ہے۔ کہ وہ حق تعالےٰ پر نظر رکھے۔ اور اُسی کو اپنا حقیقی مددگار جانیں اگر مخلوق کی طرف سے کبھی کوئی مدد کر بھی دے۔ تو یہ سمجھے۔ کہ یہ بھی حق تعالےٰ ہی کی مدد ہے۔ سب چیزیں اُس کی خدام اور آلات ہیں۔ بلا تشبیہ یوں سمجھو۔ کہ بجلی صدہا کام کر رہی ہے۔ روشنی دیتی ہے پنکھے چلاتی ہے۔ گاڑیاں کھینچتی ہے لیکن یہ کام محض بجلی کے تار کا نہیں۔ بلکہ یہ سارے کام پاور ہاؤس سے ہو رہے ہیں۔ جب کسی نے ہماری مدد کی اگر اُس میں مدد کی طاقت نہ ہوتی یا اُس کے دل میں رحم نہ آتا۔ تو وہ کبھی ہماری مدد نہ کرتا۔ اور یہ طاقت اور رحم دلی رب کی طرف سے ہے۔ تو حقیقی مددگار وہی ہوا۔ لہذا رب کو چھوڑ کر کسی اور پر اعتماد کرنا محض نادانی ہے۔

**تفسیر صوفیانہ** صوفیاء کرام فرماتے ہیں۔ کہ ایک درجہ ہمارے یہاں وہ بھی ہے۔ کہ وہاں پہنچ کر انسان ظاہری اسباب پر بھی نظر نہیں رکھتا۔ بلکہ بعض موقعوں پر حق تعالےٰ سے بھی اپنی زبان سے عرض حال نہیں کرتا۔ تاکہ یہ دعائیہ الفاظ بھی آڑ نہ ہو جائیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب نمرودی آگ کی طرف چلے تو حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا۔ کہ کچھ آپ کو حاجت ہے۔ فرمایا تم سے کچھ نہیں۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا۔ کہ رب ہی سے عرض کیجئے فرمایا حَسْبِیْ مِنْ سُؤَالِیْ عِلْمُہٗ بِحَالِیْ یعنی وہ خود جانتا ہے۔ اُس کا جاننا ہی کافی ہے پھر میری عرض کی کیا ضرورت ہے۔ سبحان اللہ یہ وہ حالت ہے۔ کہ جس میں دعا مانگنے سے بھی گریز ہے۔ اُس طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ خیال رہے کہ اولیاء کرام کی یہ حالت ہر وقت نہیں ہوتی ؎

اگر درویش بر حالے بماندے  دو دست از جملہ عالم بر فشاندے

جب وقت امتحان ہو تو دعا نہ مانگنا اور راضی برضا رہنا عبادت ہے۔ اسی لئے امام حسین رضی اللہ عنہ کے لئے کسی نے دعا نہ کی۔ کہ خدایا کربلا کی مصیبت ان سے ٹال دے۔ اور جب بندگی کے اظہار کا وقت ہو۔ تو ہر چیز رب سے مانگو یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ بھی اُس سے مانگو کیونکہ بندے کا کام مانگنا ہی ہے۔ تفسیر کبیر اور روح البیان شریف نے اسی مقام پر فرمایا۔ کہ حضرت خلیل علیہ السلام نے جب اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پر عمل کیا۔ تو اُن پر نمرودی آگ گلزار بنادی گئی۔ تو جو مسلمان یہ عرض کیا کرے۔ تو ان شاء اللہ جہنم کی آگ اُسے نقصان نہ پہنچا سکے گی بلکہ جب مومن صراط سے گزرے گا۔ تو نار پکارے گی۔ کہ تیرا نور ایمانی مجھے بجھائے دیتا ہے۔ ایک وقت جنتی مسلمان گنہگار مسلمانوں کو نکالنے کے لئے جہنم میں جائیں گے۔ اُن پر آگ کچھ اثر نہ کر سکے گی۔ **دیوبندیوں کا اعتراض**۔ جب تم نے تلاوت قرآن پاک میں رب سے یہ وعدہ کر لیا۔ کہ ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ تو نبیوں اور ولیوں سے کیوں مدد مانگتے ہو۔ یہ شرک ہے۔ **جواب** انبیاء اولیاء سے امداد لینا حقیقت میں رب ہی سے امداد لینا ہے کیونکہ اُس کی امداد دو طرح کی ہے۔ بالواسطہ۔ بلاواسطہ۔ اللہ کے بندوں کی مدد رب کے فیضان کا واسطہ ہے۔ قرآن کریم نے غیر خدا سے امداد لینے کا خود حکم فرمایا چنانچہ ارشاد فرماتا ہے۔ اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ مسلمانو مدد لو صبر و نماز سے۔ صبر اور نماز بھی غیر خدا ہیں۔ نیز فرماتا ہے۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے۔ تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا۔ رب تعالیٰ غنی ہو کر بندوں سے مدد طلب فرماتا ہے۔ تو اگر ہم محتاج بندے کسی بندے سے مدد مانگیں تو اس میں کیا برائی ہے۔ نیز حضرت ذوالقرنین کا قول نقل فرماتا ہے۔ کہ اَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّۃٍ تم لوگ میری مدد کرو۔ اپنی قوت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ میرا مددگار کون ہے۔ اللہ کی طرف نیز قرآن کریم نے فرمایا۔ وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ

وَالتَّقْوٰی یعنی ایک دوسرے کی مدد کرو بھلائی اور پرہیزگاری پر غرض کہ قرآن کریم نے جگہ جگہ غیر خدا سے مدد لینے کا حکم فرمایا صحابہ کرام کی ایک جماعت کا نام ہے۔ انصار جس کے معنی ہیں مددگار اگر غیر خدا سے مدد لینا شرک ہو۔ تو یہ نام ہی مشرکانہ ہوا حالانکہ انہیں یہ لقب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا۔ اور قرآن کریم نے بھی اُن کو اسی لقب سے یاد فرمایا۔ عیسائیوں کو قرآن کریم نے نصاریٰ کے نام سے یاد فرمایا۔ اس کے معنے بھی مددگار ہیں۔ اگر وہ احادیث اور فقہی عبارتیں جمع کی جائیں۔ کہ جن میں غیر خدا سے مدد لینے کا حکم ہے تو اُس کے لئے دفتر درکار ہیں۔ اگر اس کی زیادہ تحقیق منظور ہو۔ تو ہماری کتاب "جاء الحق" کا مطالعہ کرو۔ نیز خود دیوبندی اپنی ہزارہا مصیبتوں میں پولیس کچہری حکومت۔ ڈاکٹروں وغیرہ سے مدد لیتے ہیں۔ تو ان میں سے کوئی مسلمان نہ رہا شعر ؎

تیری اٹکے تو وکیلوں سے کرے استمداد یا محمد سے بگڑتی ہے طبیعت تیری

مدرسہ دیوبند مسلمانوں ہی کی مدد سے چل رہا ہے نیز انسان پیدائش سے قبر تک بندوں کی مدد کا محتاج ہے۔ دائی کی مدد سے پیدا ہوا۔ ماں باپ کی مدد سے پرورش پائی۔ طبیب کی مدد سے شفاء پائی مالداروں کی مدد سے زندگی گزاری۔ استاد پیر کی مدد سے ایمان ملا۔ قرابت داروں کی مدد سے نزع کے وقت کلمہ نصیب ہوا مسلمان بھائیوں کی مدد سے غسل کفن دفن نصیب ہوا۔ پھر مسلمانوں کی مدد سے قبر میں ثواب پہنچتا رہا۔ اب کوئی کس منہ سے کہہ سکتا ہے۔ کہ غیر خدا سے مدد لینا شرک ہے۔ جہاں مدد کو خدا کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ وہ حقیقی مدد ہے۔ اور جہاں غیر خدا سے مدد لینے کا حکم ہے۔ وہاں مدد بالواسطہ ہے۔ لہٰذا تمام آیتیں اور احادیث مطابق ہو گئیں۔ قرآن شریف سمجھنے کے لئے ایمان کا نور اور حجازی کارخانے کی عینک چاہیئے۔ نجدی عینک رہی سہی بھی پھوڑ دے گی۔ **اعتراض**۔ زندوں سے مدد مانگنا تو جائز ہے۔ مگر مرے ہوؤں سے مدد لینا بالکل شرک ہے۔ **جواب** :۔ اس آیت میں زندہ اور مردہ کا کوئی فرق نہیں کیا گیا جیسے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں عبادت کو اللہ کے ساتھ خاص کیا گیا۔ کہ خدا کے سوا نہ زندہ کی عبادت جائز نہ مردہ کی۔ اسی طرح اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں بھی ہونا چاہیئے **جواب ۲** مدد لینا دو طرح پر ہے جسم سے اور روح سے کسی سے کہنا پانی پلا دو۔ روٹی پکا دو وغیرہ یہ جسم کی مدد ہے۔ اور کسی اللہ والے سے عرض کرنا۔ کہ ہماری بگڑی بنا دو بارگاہِ الٰہی میں عرض کر کے بچہ دلا دو۔ ہمیں جنت دے دو (جیسے کہ صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کرتے تھے) دوزخ سے بچالو۔ حق سے ملا دو۔ یہ سب روحانی مددیں ہیں۔ مرنے سے صرف بعض لوگوں کا جسم بیکار ہو جاتا ہے۔ روح کی طاقتیں تو بڑھ جاتی ہیں میت قبر میں سے اوپر کے سارے حالات دیکھتی ہے۔ اور ہلکی سی آوازیں بھی سنتی ہے۔ تو جو روح اپنی زندگی میں روحانی امداد کر سکتی ہے۔ بعد وفات بدرجہ اولیٰ مدد کر سکے گی۔ نیز دیوبندیوں کے بزرگوں اور عام اولیاء اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیشہ مددیں مانگی ہیں۔ اور مدد مانگنے کو جائز رکھا ہے۔ چنانچہ مولوی محمود حسن صاحب دیوبندیوں کے شیخ الہند اپنے ترجمہ قرآن میں جس کے چار پاروں کا ترجمہ انہوں نے کیا ہے۔ باقی کا مولوی شبیر احمد صاحب نے اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے ماتحت فرماتے ہیں۔ ہاں اگر کسی مقبول بندے کو واسطۂ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اُس سے کرے تو یہ جائز ہے۔ کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔ اس کی پوری تحقیق "جاء الحق" میں دیکھو۔ بہر حال اس اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے وہی معنی کرنے پڑیں گے جو ہم نے عرض کر دیئے۔ **آریوں کا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کسی بندے کی کتاب ہے۔ کیونکہ اگر یہ رب کی کتاب ہوتی۔ تو بتاؤ رب تعالیٰ کس کی عبادت کرتا۔ اور کس سے مدد مانگتا ہے۔ **جواب** اس کا جواب بہت تفصیل سے پہلے گذر چکا۔ ایک بار بابا خلیل داس بنارسی سے ایک آریہ نے یہی اعتراض کیا تھا۔ تو انہوں نے وہی جواب دیا جو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔ اور پھر فرمایا کہ اگر تم کہیں وید سے یہ ثابت کر دو۔ کہ یہ وید اللہ کا کلام ہے۔ تو تم کو ایک ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ بلکہ وید میں تو اللہ کا کوئی ذاتی نام بھی نہیں آیا۔ اوم۔ بھگوان۔ پرماتما سرشکتی مان وغیرہ اُس کے صفتی نام رکھ لئے گئے ہیں۔ بلکہ اوم تو گانے کا سُر ہے جس کو آریوں نے خدا کا نام سمجھ رکھا ہے۔ قرآن کریم نے تو صاف فرمایا۔ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ وغیرہ وغیرہ یعنی قرآن خدا کی طرف

سے اترا۔ آؤ۔ میں تم کو دکھاؤں۔ کہ وید بنانے والا کون ہے چنانچہ انہوں نے یجر وید کا ایک منتر پڑھا جس کا ترجمہ یہ بتایا۔ کہ اے بھگوان میں اس منتر کا بنانے والا ہوں میرا نام گوتم ہے۔ اور تو مجھے توفیق دے۔ کہ میں اس کام کو پورا کروں۔ دیکھو وید صاف کہہ رہا ہے۔ کہ یہ بندوں کا بنایا ہوا ہے۔ اس پر وہ آریہ خاموش ہو گیا۔

| اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ |||
|---|---|---|
| ہدایت دے ہم کو | راستہ | سیدھا |
| ہم کو سیدھا راستہ چلا۔ |||

**تعلق،** اس آیت کو پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **اوّل** یہ کہ پہلے ذکر ہوا تھا۔ کہ ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ یہ نہ معلوم ہوا تھا۔ کہ کس کام میں۔ اب اس استمداد کی کچھ تفصیل فرمائی گئی۔ کہ اس میں مدد مانگتے ہیں کہ تو ہم کو سیدھے رستے چلا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا۔ کہ دنیوی اور دینی تمام کاموں میں اللہ ہی سے مدد مانگی جائے بلکہ استقامت میں خاص طور پر کہ یہ تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ **دوسرے** اس طرح کہ اس سے پہلے ذکر تھا عبادت کا۔ اور اب ذکر ہو رہا ہے دعا کا جس میں اشارہ اس جانب ہو رہا ہے۔ کہ عبادت کے بعد دعا مانگنی چاہیئے۔ اسی لئے سنت ہے۔ کہ نماز کے بعد دعا مانگے **تیسرے** اس طرح کہ اب تک عرض کیا تھا۔ کہ خدایا ہم تیری عبادت کرتے اور تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ اب عرض کیا۔ کہ تو ہمیں سیدھے رستے پر قائم رکھ یعنی عبادت پر قائم رکھ ایسا نہ ہو۔ کہ کچھ روز عبادت کر کے ہم چھوڑ دیں۔ بلکہ ہمیشہ تیری عبادت میں مشغول رہیں۔ کہ یہی صراط مستقیم ہے۔ **چوتھے** اس طرح کہ اب تک عبادت کا ذکر ہوا۔ اب عرض کیا۔ کہ اے اللہ ہم کو اس عبادت میں سیدھے رستے پر قائم رکھ یعنی اس طریقے سے عبادت کرا کہ تیری بارگاہ میں قبول ہو۔ اور افراط و تفریط کے درمیان درمیان ہو۔ اور جس طرح تیرے مقبول بندوں نے عبادت کی ہو۔ ایسا نہ ہو۔ کہ دنیوی رنج و راحت کے موقعوں پر تیری عبادت سے غافل ہو جائیں۔ اور اگر کبھی عبادت میں مشقتیں ہوں۔ تو عبادت سے منہ موڑ لیں **پانچویں** اس طرح کہ عبادت وغیرہ کے بعد ہدایت کی دعا مانگنا۔ اس لئے ہے۔ کہ بغیر ہدایت کے عبادت مقصود تک نہیں پہنچاتی بڑے بڑے عابد آخر کار زندیق بن گئے۔ جیسے کہ ابلیس اور برصیصا اور بلعم ابن باعوراء وغیرہ کہ پہلے یہ لوگ اوّل درجہ کے عابد تھے۔ اور بعد میں گمراہ ہوئے۔ تو عرض کیا جا رہا ہے۔ کہ خدایا ہم اپنی اس عبادت پر نازاں نہیں ہیں۔ تجھ سے ہدایت اور ہدایت پر استقامت مانگتے ہیں **تفسیر عالمانہ** علمائے کرام کے طریقے پر چار چیزوں میں گفتگو کرنا ہے۔ اِهْدِ۔ نَا۔ الصِّرَاطَ اور الْمُسْتَقِيْمَ

**اِهْدِ** ہدایت سے بنا ہے جس کے معنے ہیں رہبری کرنا۔ یا منزل مقصود کا پتہ نشان دینا۔ ہدایت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک فقط رستہ دکھا دینا۔ دوسرے مقصود پر پہنچا دینا۔ اگر راستہ دکھانا مراد ہوتا ہے۔ تو ہدایت کے بعد اِلٰی یا لام لایا جاتا ہے۔ اور یہاں ان دونوں میں سے کوئی نہیں جس سے معلوم ہوا۔ کہ بندہ عرض کر رہا ہے۔ "اے مولا ہمیں سیدھا راستہ فقط دکھا نہ دے۔ بلکہ وہاں تک پہنچا دے۔ اور اس پر چلا بھی دے۔ کیونکہ راستے میں راہ مار بہت ہیں۔ بغیر تیری مدد اس پر چلنا ناممکن ہے۔ **نَا** سے معلوم ہوا۔ کہ دعا کرنے والا سب کے لئے دعا کر رہا ہے۔ یہ نہیں کہتا۔ کہ فقط مجھ کو ہدایت دے۔ بلکہ ہم سب کو۔ اس جمع میں چند فائدے ہیں۔ **ایک** یہ کہ جس طرح وہ عبادت زیادہ قبول ہوتی ہے جو مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کی جائے۔ اسی طرح وہ دعا زیادہ مقبول ہوتی ہے جو سب کے لئے کی جائے کیونکہ اگر ایک کے لئے بھی قبول ہوئی۔ تو امید ہے کہ سب کے لئے قبول ہو جائے گی۔ اسی لئے دعا کے اول اور آخر درود شریف پڑھا جاتا ہے کیونکہ درود پاک یقیناً قبول ہوتا ہے۔ تو رحمت الٰہی سے امید قوی ہے۔ کہ وہ درمیان کی دعا کو نہ چھوڑے گا۔ بلکہ آس پاس کے درود شریف کی برکت سے اسے بھی قبول فرمالے گا۔ (تفسیر کبیر یہی مقام) **دوسرے** اس لئے کہ اگر ایک شخص ہدایت پر آجائے۔ اور باقی سب گمراہ رہیں۔ تو گمراہوں میں اس ایک کی زندگی دشوار ہو جائے گی۔ کیونکہ اگر یہ

شخص ان سب کی موافقت کرے تو خود بھی گمراہ ہوتا ہے۔ اور مخالفت کرے۔ تو دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ اور زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ بس یہی ضروری ہے۔ کہ سب کو ہدایت ملے۔ تاکہ ان سب کی دونوں زندگیاں درست ہو جائیں۔ (تفسیر عزیزی) **تیسرے** اس لئے کہ حدیث پاک میں ہے۔ کہ تم بے گناہ زبان سے دعا مانگو صحابہ کرام نے عرض کیا۔ کہ یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بے گناہ زبان کہاں سے لائیں۔ فرمایا۔ کہ ہر ایک دوسرے کے حق میں دعا کرے۔ کہ اپنی زبان اپنے لئے گنہگار ہے نہ کہ غیر کے لئے۔ (تفسیر کبیر) اس سے معلوم ہوا۔ کہ دعا کی مقبولیت کا راز یہ ہے۔ کہ سب کے لئے کی جائے۔ جو چاہے کہ میری دعا بارگاہ الٰہی میں مقبول ہو۔ وہ اپنے ساتھ سب کے لئے دعا کرے اور کہے" اے اللہ ہم سب کو یہ عطا فرما۔ **اَلصِّرَاطَ**۔ صراط صرط سے بنا ہے جس کے معنے ہیں نگل لینا چونکہ راستہ مسافر کو اس طرح اپنے اندر لے لیتا ہے جیسے کھانے والا لقمے کو اس لئے راستے کو صراط کہتے ہیں۔ اصطلاح میں صراط اس شارع عام یعنی اس عام اور وسیع راستے کو کہتے ہیں جس میں چند آدمی مل کر چل سکیں وہ تنگ گلی کوچے جن میں چند آدمیوں کے مل کر چلنے کی گنجائش نہ ہو۔ انہیں صراط نہیں کہا جاتا چونکہ دعا سب کے لئے مانگی گئی ہے۔ اس لئے صراط فرمانا ہی بہتر تھا۔ صراط۔ سبیل اور طریق کے معنے قریب قریب ایک ہی ہیں لیکن اس جگہ صراط اس لئے بولا گیا۔ کہ پل صراط یاد آجائے اور منشا یہ ہو جائے۔ کہ اے اللہ ہمیں اس رستے پر چلا جس پر چل کر پل صراط کو آسانی سے طے کر لیں۔ **الْمُسْتَقِيْمَ** مشتق ہے۔ استقامت سے اس کا معنی ہے سیدھا ہونا سیدھا راستہ وہ ہے جو بہت جلد مقصود تک پہنچا دے۔ اور چلنے والے کو کسی طرف مڑنا نہ پڑے۔ ٹیڑھا راستہ یا تو مقصود تک پہنچائے گا ہی نہیں۔ یا بہت دیر میں اور بہت دشواری سے پہنچائے گا۔ جو کہ اس مثال میں ظاہر ہو رہے ہیں (مسافر (۱) راستہ سیدھا منزل مسافر (۲) ٹیڑھا راستہ سیدھا راستہ منزل) نقشہ (۱) میں ٹیڑھے راستے مسافر کو منزل تک پہنچا سکتے ہی نہیں۔ اور نقشہ (۲) میں آس پاس کے راستے اگرچہ منزل تک پہنچا تو دیں گے۔ لیکن بہت دشواری سے۔ اور ان میں بھٹکنے کا سخت اندیشہ ہے۔ کفر تو وہ ٹیڑھا راستہ ہے جو کبھی منزل تک پہنچا سکتا ہی نہیں۔ اور گمراہی یعنی اہل سنت والجماعت کے علاوہ دوسرے وہ گمراہ فرقے جو حد کفر تک نہ پہنچے ہوں۔ جیسے تفضیلی۔ رافضی اور وہ وہابی جنہوں نے گستاخی نہ کی ہو۔ اگرچہ آخر کار مغفرت پاکر منزل (جنت) تک پہنچ تو جائیں گے۔ لیکن بہت دشواریوں اور مصیبتوں کے بعد یہاں ان دونوں قسموں کے راستوں سے پناہ مانگی گئی ہے۔ اور دعا مانگی گئی ہے۔ کہ اے پروردگار ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔ (**صراط مستقیم کون سا راستہ ہے**) صراط مستقیم میں بہت گنجائش ہے۔ یہ دینی اور مذہبی عقیدے۔ معاملات اور عبادات اور اخلاق سب کو شامل ہے۔ تو مطلب اس کا یہ ہوا۔ کہ اے اللہ ہم کو عقیدے اور اعمال سب میں سیدھے راستے پر قائم رکھ۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ کہ ہر چیز میں تین حیثیتیں ہیں (۱) افراط "زیادتی" (۲) تفریط "کمی" (۳) میانہ روی "نہ زیادتی نہ کمی"۔ **تمام** دینوں کے لحاظ سے دین اسلام صراط مستقیم ہے۔ اس لئے کہ دین موسوی میں بہت سختیاں تھیں۔ چوتھائی حصہ زکوٰۃ واجب تھی۔ ناپاک کپڑے اور ناپاک کھال کو کاٹنا یا جلانا پڑتا تھا۔ عبادت خانوں کے سوا کہیں عبادت نہ ہو سکتی تھی۔ سخت سزا کے بعد توبہ قبول ہوتی تھی۔ دین عیسوی میں بہت نرمی تھی۔ کہ شراب اور سور بھی حلال تھے۔ دین اسلام میں نہ پہلی سی سختیاں ہیں۔ نہ دوسری نرمیاں۔ زکوٰۃ میں چالیسواں حصہ واجب اور وہ بھی صدہا آسانیوں کے ساتھ۔ ہر جگہ (مسجد یا غیر مسجد) میں نماز جائز۔ بڑے سے بڑا گناہ توبہ سے معاف۔ ناپاک کو پاک کرنے کے لئے تینتیس ۳۳ طریقے نہایت آسان آسان۔ کپڑے وغیرہ کو صرف پانی بہا کر پاک کرلو تانبے اور شیشے کے برتنوں کو صرف رگڑ کر پاک کرلو۔ ناپاک دودھ اور تیل وغیرہ کو پاک جنس کے ساتھ بہا کر پاک کرلو۔ اگر پانی میسر نہ ہو تیمم کرکے نماز ادا کرلو وغیرہ وغیرہ۔ شراب اور خنزیر جو کہ عقل اور صحت کو خراب کرنے والے ہیں۔ اور قوم میں بے غیرتی اور شر پیدا کرنے والے ہیں۔ ان کو حرام کر دیا گیا۔ **مذہبی عقائد** میں مذہب اہل سنت والجماعت صراط مستقیم ہے۔ کیونکہ جبریہ انسان کو پتھر کی طرح بالکل مجبور مانتے ہیں۔ اور قدریہ انسان کو بالکل مختار۔ اہل سنت کہتے ہیں۔ کہ انسان خلق میں مجبور اور کسب میں مختار ہے۔ اس کی تحقیق انشاء اللہ مسئلہ تقدیر میں آئے گی۔ رافضی صحابہ کرام کے دشمن خارجی اہل بیت کے دشمن لیکن اہل سنت ان دونوں جماعتوں کے بندۂ بے زر۔ کیونکہ اہل بیت کرام امت کے لئے جہاز ہیں اور صحابہ کرام تارے۔

یا قطب نما. خارجیوں نے کشتی کو چھوڑا رافضیوں نے راہنما تارے سے منہ موڑا ہو دونوں کا بیڑا غرق ہوا اہلسنت کا بیڑا پار ہے چکڑالویوں نے حدیث اور فقہ کو چھوڑا غیر مقلدوں نے فقہ سے منہ موڑا. دیوبندیوں نے دیوبندیوں نے نبیوں اور ولیوں سے رشتہ توڑا بلکہ اللہ اور رسول علیہ السلام سے مقابلے کی ٹھانی معاذ اللہ رب کو جھوٹا ٹھیرایا. اس کے محبوب علیہ السلام کو بے علم اور اپنے جیسا بتایا ہر خیر کو حرام قرار دیا. اور جہنم کا راستہ لیا. اہل سنت نے بحمدہ تعالیٰ سب کو ان کے درجے کے موافق مانا یہی راستہ صراط مستقیم قرار پایا. اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر قائم رکھے **اعمال** میں وہ اعمال صراط مستقیم ہیں. جو اسلام اور قرآن نے سکھائے عبادات اخلاق. گھر کے اخراجات سب میں درمیانی چال صراط مستقیم. ایک شخص نوافل میں مشغول ہو کر تمام اہل قرابت کے حقوق سے بے پرواہ ہو جاتا ہے. دوسرا آدمی دنیوی جھگڑوں میں مصروفیت کی وجہ سے یاد خدا سے غافل. دونو صراط مستقیم پر نہیں ہیں تیسرا رب کی یاد بھی کرتا ہے. سب کے حق بھی ادا کرتا ہے. بیشک وہی صراط مستقیم پر قائم ہے. اسی کو حدیث پاک میں اس طرح بیان فرمایا گیا. کہ سوؤ بھی اور رات کو عبادت بھی کرو. روزے بھی رکھو اور افطار بھی کرو. تمہاری آنکھ کا تم پر حق ہے تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے. تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے. وغیرہ وغیرہ. یہاں تک کہ محدثین ایک باب باندھتے ہیں ,, باب القصد فی العمل ،، یعنی اعمال میں میانہ روی کا باب. قرآن پاک نے فرمایا. کہ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا. اے مسلمانو ہم نے تم کو درمیانی امت بنایا. **اخلاق** میں وہ خلق صراط مستقیم ہے. جو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا تھا. کبھی کسی حال میں کسی پر غصہ نہ کرنا بے غیرتی ہے. اور خودداری کے خلاف ہے. اور ہر وقت غصے میں رہنا بد خلقی ہے. اللہ کے لئے غصہ کرنا. دشمنان دین سے بیزاری. اور دنیوی معاملات میں بردباری خلق مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہے. غرض کہ اگر صراط مستقیم کی پوری تفسیر کیجائے تو اس کے لئے دفتر درکار ہیں. بطور نمونہ یہ چند باتیں عرض کر دی گئی ہیں. رب تعالیٰ اس پر چلنے کی توفیق عطا فرمادے. آمین.

**,,تفسیر صوفیانہ،،** ہدایت چند طرح کی ہے. **ایک ہدایت الہامی** جو بغیر کسی کے بتائے خود بخود حاصل ہو. جیسے کہ بچہ پستان چوسنا اور رو رو کر ماں کو اپنی طرف مائل کرنا خود بخود جانتا ہے **دوسری ہدایت احساسی** جو کہ حواس درست ہونے کے بعد حاصل ہو. جیسے کہ بچہ ہوش سنبھالنے کے بعد اچھی بری چیزوں میں فرق کرتا ہے. **تیسری ہدایت عقلی** جو عقل کی مدد سے حاصل ہو. اسے ہدائت نظری بھی کہتے ہیں. یہ دلائل سے حاصل ہوتی ہے یعنی انسان اپنی عقل کی رو سے دلائل قائم کرے. اور پھر اس سے نتیجہ نکالے. **چوتھی ہدائت الہٰیہ** جو کہ پیغمبروں کی مدد اور حق تعالےٰ کے خاص کرم سے حاصل ہو یعنی جن چیزوں کو ہم عقل اور دلائل سے معلوم نہیں کر سکتے اس کی رہبری کے لئے حق تعالےٰ نے انبیاء کرام کو بھیجا. یہ پھر دو قسم کی ہے. **ایک ہدایت عامّہ** اور **دوسری ہدایت خاصّہ**. ہدائت عامہ شرعی احکام کی ہدایت ہے. جو نبی کی طرف سے عام مخلوق کو ہوتی ہے جیسے عقائد اسلامیہ اور ظاہری اعمال اسلامیہ کی ہدایتیں. اس ہدایت کو تبیانی یا توفیقی بھی کہتے ہیں. ہدایت خاصہ وہ جو نور نبوت یا نور ولایت سے خاص خاص لوگوں کو حاصل ہو (تفسیر عزیزی)،

اس کی طرف مولانا روم علیہ الرحمۃ اشارہ فرماتے ہیں ؎

گر باستدلال کارِ دیں بدے		فخر رازی رازدارِ دیں بدے
پائے استدلالیاں چوبیں بود		پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

مولینا روم نے فرمایا. کہ اس قسم کی ہدایت حاصل کرنے کے لئے فخر الدین رازی جیسی ہستی کی عقل بھی کافی نہیں. کیونکہ یہ ہدائت عقل سے وراء ہے. اسی لئے صوفیا کرام فرماتے ہیں. کہ ظاہری عالم کی پہنچ دلیل تک ہے. اور صوفی کی رسائی کشف و مکاشفہ تک ہے یعنی ظاہری عالم بتاکر اور شیخ طریقت دکھا کر سمجھاتا ہے. ظاہری عالم صاحب قال اور یہ صاحب حال ہے. مولینا اس کو یوں ادا فرماتے ہیں ؎

قال را بگذار مرد حال شو		زیر پائے کاملے پامال شو

پھر فرماتے ہیں ؎

سرمہ کن درچشم خاکِ اولیاء		تا بہ بینی ز ابتداء تا انتہاء

اس آیت کریمہ میں اس آخری قسم کی ہدایت رب سے مانگی گئی ہے۔ یعنی اے پروردگار ہم کو وہ ہدایت عطا فرما جو حواس اور عقل وغیرہ سے وراء ہے۔ اور صرف تیرے کرم سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا۔ اِھْدِ" تو ہمیں ہدایت دے۔ اب اس کا تعلق گذشتہ آیتوں سے اس طرح ہوگیا۔ کہ پہلے کہا گیا تھا۔ نَعْبُدُ اور نَسْتَعِیْنُ جس میں کہ فاعل بندہ تھا۔ یعنی جہاں تک رسائی ہماری عقل وغیرہ کی ہے۔ وہاں تک تیری مدد سے ہم نے کام کر لیا۔ لیکن جو چیزیں ہماری عقل وغیرہ سے بالاتر ہیں۔ اے مولا! اس کی ہدایت تو فرما یہاں رب کو فاعل قرار دیا گیا۔ اب نَا سے مراد ان حضرات کی وہ جماعت ہے جو ان کی یار طریقت اور واقف حقیقت ہو۔ تو گویا کہا یہ جارہا ہے۔ کہ اے اللہ اس جنگل میں ہم نے قدم تو رکھ دیا۔ لیکن اپنے تک پہنچنے کا رستہ یعنی وہ رستہ جس کی تو انتہا ہو۔ اس کی رہبری تو ہی فرمادے۔ ؎

رہبر و راہ محبت تھک نہ جانا راہ میں لذت صحرا نوردی دوری منزل میں ہے

اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ۔ صوفیاء کرام کے نزدیک صراط مستقیم کی چند تفسیریں ہیں۔ **ایک** یہ کہ صراط مستقیم وہ راستہ ہے۔ جو محبت اور عقل دونوں کو جامع ہو جس کا نام ہے سلوک کیونکہ محض عقل جو عشق الٰہی سے خالی ہو بے دینی ہے۔ اور محض عشق جس میں عقل قائم نہ رہے۔ جذب ہے۔ ان دونوں راستوں میں افراط اور تفریط ہے۔ اور رب تعالیٰ کی محبت بھی کامل ہو عقل بھی باقی ہو۔ یہ سلوک ہے۔ وہی اس جگہ مطلوب ہے۔ سالک مجذوب سے اعلیٰ ہے موسیٰ علیہ السلام تجلّی صفات دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔ یہ جذب ہوا حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم معراج میں عین ذات کو دیکھ کر تبسّم ہی فرماتے رہے۔ یہ سلوک ہوا ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک پرتوے صفات تو عین ذات مے نگری در تبسّمی

**دوسرے** یہ کہ جو راستہ ذات الٰہی تک پہنچادے۔ وہ صراط مستقیم ہے۔ اس کے علاوہ اور راستے افراط تفریط سے خالی نہیں۔ یہ حضرات فقط جنت پر قناعت نہیں کرتے حور وقصور پر صبر نہیں فرماتے۔ یہ تو اس راستے کو ڈھونڈتے ہیں جس کی یہ منزلیں ہیں۔ گویا یہ کہا جارہا ہے "اے اللہ راستے بہت سے ہیں۔ اور اُدھر بلانے والے مختلف ذوق کے لوگ ہیں۔ شیطان اور راستے کی طرف دعوت دے رہا ہے نفس اور طرف کھینچ رہا ہے۔ دشمن کہیں لے جانا چاہتے ہیں دوست کہیں پہنچانے کی تمنا رکھتے ہیں۔ لیکن اے مولا ہم تو اس راستے کے طالب ہیں جو تجھ تک پہنچادے۔ وہ راستہ وہی ہے جس میں انسان راضی برضا رہے۔ تفسیر کبیر میں اس جگہ ایک **حکایت** نقل کی کہ حضرت ابراہیم ابن ادھم پاپیادہ حج کو جارہے تھے۔ ایک ناقہ سوار بدوی نے پوچھا۔ آپ کہاں جاتے ہیں۔ فرمایا بیت اللہ شریف۔ اس نے کہا۔ کہ آپ دیوانے معلوم ہوتے ہیں۔ اتنا لمبا سفر نہ آپ کے سواری نہ توشہ۔ شاید آپ کو یہاں موت لائی ہے حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا۔ کہ تیرے پاس ایک سواری ہے۔ میں بہت سی سواریاں رکھتا ہوں لیکن وہ تجھ کو نظر نہیں آتیں۔ عرض کیا۔ وہ کونسی سواریاں ہیں؟ فرمانے لگے۔ کہ جب مجھ پر کوئی بلا آتی ہے۔ تو صبر کے گھوڑے پر سواری کرتا ہوں۔ جب نعمت پاتا ہوں تو شکر کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں۔ جب کوئی رب کی قضا آتی ہے۔ تو رضا پر سوار ہوتا ہوں۔ جب نفس کسی طرف بلاتا ہے۔ تو اپنی عمر پر بے اعتمادی کے گھوڑے پر سواری کرتا ہوں۔ بدوی بولا! بیشک آپ سوار اور میں پیادہ ہوں جس طرح کہ دنیوی سفروں میں مختلف سواریاں چاہییں۔ کہیں تانگے پر جاتے ہیں۔ کہیں ریل میں۔ کہیں موٹر پر۔ جہاز سے سمندر کو طے کرتے ہیں۔ ہوائی جہاز پر سوار ہو کر فضا کی سیر کرتے ہیں۔ اسی طرح اس سفر میں بہت سواریاں درکار ہیں۔ اور ان سواریوں کی لگام کسی اور کے قبضے میں ہے **تیسرے** یہ کہ صوفیاء کرام کے نزدیک دین پر استقامت سیدھا راستہ ہے فرماتے ہیں۔ کہ ایک استقامت ہزار کرامتوں سے بہتر ہے۔ استقامت کے معنے یہ ہیں۔ کہ اگر مولےٰ کا اشارہ ہو۔ کہ اپنے آپ کو دریا میں ڈال دو۔ تو اس کی تعمیل میں ذرا بھی تامل نہ کرے۔ جیسے کہ حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ہوا۔ اگر حکم ملے۔ کہ اپنے بچے ذبح کر دو۔ تو اس پر راضی ہوجائے۔ جیسے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کرکے دکھادیا۔ اگر راہ حق میں آگ سامنے آجائے۔ تو اس کی پرواہ نہ کرے۔ جیسے خلیل اللہ علیہ السلام نے نار نمرود کی پرواہ

نہ فرمائی۔ اگر کسی بڑے مرتبے پر پہنچ کر کسی کی شاگردی کرنے کا حکم دیا جائے۔ تو اس میں عار نہ ہو۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کر کے دکھادیا۔ کہ اسی قدر عظمت و جلالت کے باوجود حضرت خضر علیہ السلام کے پاس حاضری میں کچھ شرم نہ فرمائی۔ اگر آرے سے چرنے کی مصیبت سامنے آجائے۔ تو اس کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرے۔ جیسے حضرت زکریا علیہ السلام پر گزرا وغیرہ وغیرہ۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ جب اپنی جان و مال اور اولاد ایک پردہ بن جائے تو اس کو پھاڑ دو۔ اس وقت ان کا پھاڑنا فضول خرچی نہیں بلکہ یہ محبوب سے ملنے کا ذریعہ ہے جضرت سلیمان علیہ السلام نے نماز عصر قضا ہو جانے پر ایک ہزار گھوڑے ذبح کر دیئے۔ تو یہ فضول خرچی نہ ہوئی۔ بلکہ آڑ کو پھاڑ گیا۔ اور یہ درجہ بڑی مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے عرض کیا۔ "اے اللہ تو ہدایت دے" **اعتراض** آریہ اس آیت پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ یہ دعا بے موقعہ ہے کیونکہ انسان جو اسلام لاچکا اور نماز کے لئے حاضر ہوگیا۔ قرآن پاک کی تلاوت شروع کردی۔ تو ہدایت تو اسے مل گئی۔ اور مانگی وہ چیز جاتی ہے جو حاصل نہ ہو۔ پس یہ ہدایت مانگنا بالکل بیکار ہے۔ **جواب** اس کا جواب اس آیت کی تفسیر سے بخوبی ظاہر ہوگیا۔ کہ یا تو مراد ہے۔ ہدایت پر قائم رکھنا۔ یا اس میں ترقی دینا یا قلب کو درست رکھنا۔ یا مصیبتوں میں ثابت قدم رکھنا وغیرہ وغیرہ جیسا انسان اس کے لئے ویسی ہدایت۔ کافر کے لئے ہدایت یہ کہ وہ ایمان لے آئے۔ مومن کے لئے ہدایت یہ ہے۔ کہ تقویٰ اختیار کرے۔ متقی کی ہدایت یہ ہے۔ کہ اس پر قائم رہے جس قسم کا تلاوت کرنے والا ہوگا۔ اسی قسم کی ہدایت مراد ہوگی۔

| صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ |
| --- |
| راستہ　ان لوگوں کا　انعام احسان کیا تونے　پر　ان لوگوں |
| راستہ ان کا جن پر تونے احسان کیا۔ |

**تعلق**، اس کا گذشتہ آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **اولاً** اس طرح کہ پہلے سیدھے راستے کی ہدایت مانگی گئی تھی جس میں بہت گنجائش تھی۔ اس کو بیان کرنے کے لئے عرض کیا گیا۔ کہ اے اللہ ہم اُنکا راستہ مانگتے ہیں جن پر تونے احسان فرمایا جس سے معلوم ہوا۔ کہ سیدھے راستے کی پہچان یہ ہے۔ کہ اس کو اللہ کے نیک بندے اختیار کرلیں۔ **دوسرے** اس طرح کہ پہلی آیت میں رب سے راستہ مانگا۔ اور اب اس راستے کے رہبر مانگے۔ کیونکہ کوئی راستہ بغیر رہبر کے طے نہیں ہو سکتا۔ تو گویا عرض کیا۔ کہ پروردگار! ہم وہ راستہ مانگتے ہیں جس میں تیرے خاص بندوں کے نقش قدم موجود ہوں اور ان کی رہبری سے ہم منزل مقصود تک پہنچ جائیں **تیسرے** اس طرح کہ صراط مستقیم وہ راستہ ہے جو افراط اور تفریط کے درمیان ہو۔ اس کو واضح کرنے کے لئے تین جماعتوں کا ذکر کیا۔ درمیانی راستہ تیرے خاص بندوں کا راستہ ہے افراط والا مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ کا راستہ اور تفریط کا راستہ ضَآلِّیْنَ کا راستہ۔ تو گویا اس میں اس راستے کی حدبندی کی گئی **تفسیر عالمانہ** علماء کرام فرماتے ہیں۔ کہ راستے دو ہیں۔ ایک آتا مخلوق سے خالق کی طرف۔ اور دوسرا خالق سے مخلوق کی طرف۔ جو راستہ مخلوق سے خالق کی طرف ہے خطرناک ہے۔ اس میں بہت سے قافلے لٹ چکے ہیں۔ اور اس پر جگہ جگہ ڈکیتی ہوتی ہے۔ ڈاکوؤں کا سردار ابلیس بھی اعلان کرچکا ہے۔ کہ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِیْمَ تو ضرورت تھی۔ کہ اس قافلے کے ساتھ جائے جس قافلے میں محافظین اور سرکاری افسران موجود ہوں۔ اور جس راستے میں جگہ جگہ سرکاری حفاظتی چوکیاں ہوں جن کی وجہ سے ڈاکو کی ہمت نہ پڑے۔ کہ ہم کو لوٹے۔ اور وہ محافظین وہی حضرات ہیں جن کا اس میں ذکر کیا گیا۔

**اَنْعَمْتَ** انعام سے مشتق ہے جس کے معنے ہیں نعمت دینا۔ نعمت۔ لغت میں نرمی کو کہتے ہیں۔ اسی لئے عرب والے نرم کپڑے کو ثوب ناعم اور نرم کھال کو جلد ناعم بولتے ہیں۔ اصطلاح میں سرور اور لذت کی حالت کو نعمت کہنے لگے۔ اور اب نعمت سے مراد وہ چیزیں ہوتی ہیں جن سے انسان کو راحت حاصل ہو۔ اسی لئے مال۔ دولت۔ تندرستی وغیرہ کو نعمت کہتے ہیں **نعمت** تین طرح کی ہوتی ہے۔ **ایک** وہ جو بلا اسباب رب کی طرف سے ایجاد ہوتی ہے۔ جیسے زندگی اور بچپن کا رزق اور ہدایت وغیرہ اور **دوسری** وہ نعمت جو ہم تک بظاہر کسی بندے کے

ذریعے سے پہنچی۔ جیسے دینوی مال وغیرہ **تیسری** وہ جو ہمارے اعمال کے ذریعے ہم کو ملے۔ جیسے بعض اعمال سے رزق بڑھ جاتے ہیں۔ اور جنت وغیرہ (تفسیر کبیر) ان تینوں کی واضح مثال یہ ہے۔ کہ ایک شخص نے ایمان اور عمل کے ذریعے سے جنت کو حاصل کیا۔ جیسے کہ مطیع بندہ۔ دوسرے نے بغیر عمل کسی کی طفیل جنت لے لی۔ جیسے مسلمانوں کے نابالغ فوت شدہ بچے تیسرے نے بغیر کسی سبب کے جنت حاصل کی جیسے حور وغلماں اور رب کی وہ مخلوق جو جنت کو پُر کرنے کے لئے پیدا کی جائے گی پہلی قسم کی نعمت دو طرح کی ہے۔ ایک دنیاوی جیسے کہ ہمارے اعضاء اور ان کی قوتیں وغیرہ۔ دوسرے دینی جیسے کہ ایمان اور ہدایت وغیرہ۔ اس آیت کریمہ میں نعمت سے یہ آخری قسم کی نعمت مراد ہے یعنی دینی نعمتیں۔ تو آیت کا مقصد یہ ہوا۔ کہ "اے اللہ ہم کو ان لوگوں کے راستے پر چلا جن کو تو نے دینی نعمتوں سے نوازا ہے۔ وہ کون حضرات ہیں۔ اس کو خود قرآن کریم نے دوسری جگہ بیان فرمایا" اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ "معلوم ہوا۔ وہ حضرات چار گروہ ہیں پیغمبر صدیقین۔ شہید لوگ اور اللہ کے نیک بندے۔ ہم نے نعمت کی یہ تقسیم اس لئے کی۔ کہ اگر ہر نعمت مراد ہوتی۔ تو اس میں کفار۔ منافقین اور فاسقین بھی آجاتے۔ کہ ان کو بھی خدا تعالےٰ نے عمر۔ مال۔ اولاد۔ حکومت وغیرہ کی نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ رب تعالےٰ کی نعمت سے کوئی خالی نہیں لیکن چونکہ دنیوی نعمتیں دینی نعمتوں کے مقابلے میں حقیر ہیں۔ کہ وہ فانی ہیں اور یہ باقی۔ لہٰذا اس جگہ کامل نعمت مراد لی گئی (**اس آیت کے فائدے**) اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** یہ کہ اس سے معلوم ہوا۔ کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی خلافت حق ہے۔ کیونکہ اس آیت میں فرمایا گیا۔ کہ ان کا راستہ اللہ سے مانگو جن پر اللہ کا انعام ہوا۔ اور دوسری آیت میں فرمایا گیا۔ کہ وہ لوگ نبی اور صدیقین ہیں۔ اور اسلام میں صدیقین کے سردار ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ عنہ ہیں۔ کیونکہ صدیق کے معنے یا تو یہ ہیں۔ کہ ہر کام میں سچا۔ قول میں۔ عمل میں۔ ایمان میں اور ابوبکر صدیق میں یہ بات بطریق کامل موجود تھی۔ کیونکہ رب نے ان کو صحابی فرمایا۔ اور متقی کے خطاب سے نوازا۔ کہ ارشاد فرمایا "اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ" اور دوسری جگہ فرمایا۔ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى" یہ دونوں نیز اور بہت سی آیتیں ان کے حق میں آئیں جن کی تفسیر انشاء اللہ تعالےٰ اپنے اپنے موقعہ پر کی جائے گی۔ یا صدیق کے یہ معنے ہیں۔ کہ نبی کی بہت تصدیق کرنے والا یعنی بعض تو نبی کو اس کے معجزے سے پہچانتے ہیں۔ بعض کچھ دلائل دیکھ کر۔ لیکن صدیق اپنے نور قلبی سے پہچانتے ہیں۔ جیسے کہ طبیعت انسانی لذتوں کی خوبی۔ اپنے ذوق سے محسوس کر لیتی ہے۔ کہ اچھی چیزیں ہضم کر لیتی ہے۔ اور بُری چیز کو پھینکتی ہے۔ ایسے ہی صدیق کا نفس ایمان اور ایمانیات کو بخوشی قبول کرتا ہے۔ اور گندی چیز دل سے خود بخود نفرت کرتا ہے۔ یہ بات بھی ابوبکر صدیق میں اعلیٰ درجے پر موجود ہے۔ کہ انہوں نے اسلام سے پیشتر بھی نہ کبھی بت پرستی کی۔ اور نہ زنا وغیرہ قبیح چیزیں۔ اور حضور علیہ السلام کو بغیر معجزات طلب کئے نبی مان لیا۔ اور معراج جسمانی کی بلا دلیل تصدیق کر دی۔ تو اب دونوں آیتوں سے یہ فائدہ حاصل ہوا۔ کہ رب نے ہم کو حکم دیا۔ کہ تم ہم سے اس راستے کی ہدایت مانگو جس پر ابوبکر صدیق اور تمام صدیق تھے۔ اگر ابوبکر صدیق معاذ اللہ ظالم ہوتے تو ان کی پیروی جائز نہ ہوتی۔ **دوسرا فائدہ** یہ حاصل ہوا۔ کہ کسی امام کی تقلید کرنا سخت ضروری ہے۔ کیونکہ اس آیت میں فقط صراط مستقیم پر کفایت نہ کی گئی۔ بلکہ اس کے ساتھ اس راستے کے پیشواؤں کی اتباع طلب کرنے کا بھی حکم دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ ہمارے لئے راستہ بھی ضروری ہے۔ اور راستے کا رہبر بھی۔ نیز اس میں بتایا۔ کہ سیدھا راستہ وہ ہوتا ہے۔ کہ جس پر اللہ کے نیک بندے چلے ہوں۔ دور تبع تابعین سے لیکر اب تک اللہ کے سارے نیک بندے مفسرین۔ محدثین فقہاء، اولیاء اللہ۔ عامۃ المسلمین کسی نہ کسی امام کے مقلد ہی رہے۔ ان میں سے کوئی بھی غیر مقلد نہ گزرا معلوم ہوا۔ کہ تقلید اللہ کے نیک بندوں کا راستہ ہے۔ اگر اس کی پوری تشریح دیکھنا ہو۔ تو ہماری کتاب "جاء الحق" کا مطالعہ کرو۔ اگر تقلید کرنا شرک یا حرام ہو۔ تو دنیا سے حدیث کا علم مٹ جائیگا۔ کیونکہ سارے محدثین مقلدین اور مقلدوں کے شاگرد ہیں۔ اور جس حدیث کی اسناد میں ایک فاسق آجائے۔ وہ حدیث قابل قبول نہیں ہوتی تو اس قاعدے سے چاہئے کہ جس حدیث کی اسناد میں ایک مقلد آجائے وہ بھی قابل قبول نہ رہے تو بخاری مسلم ترمذی سب ختم کیونکہ انکی کوئی اسناد مقلد سے خالی نہیں تیسرا فائدہ اس سے یہ حاصل ہوا کہ اچھے لوگوں کی پیروی

کرنا اچھا اور بُرولں کی اطاعت کرنا بُرا۔ کیونکہ قرآن کریم نے کفار کا ایک عیب یہ بھی بیان فرمایا کہ وہ انبیاء کی تعلیم کے مقابلے میں اپنے جاہل باپ داداؤں کی پیروی کرتے ہیں۔ اور یہاں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی۔ کہ تم ہم سے یہ دعا مانگو۔ کہ خدایا ہم کو ہمارے مومنین باپ داداؤں کے راستے پر چلا۔ وہ آیتیں کفار کی تقلید کی برائی میں ہیں اور یہ آیت مومنین کی تقلید کی خوبی بیان فرما رہی ہے۔ **چوتھا فائدہ** یہ حاصل ہوا کہ جس راستے پر اللہ کے نیک بندے جائیں۔ وہی سیدھا راستہ ہے۔ اور جس کو اللہ کے نیک بندے مستحب جانیں وہ مستحب ہے۔ اسکی تفسیر اس حدیث سے ہوتی ہے۔ کہ مَارَاٰہُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَسَنًا فَھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ حَسَنٌ جس کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے۔ دوسری حدیث میں ارشاد ہوا۔ "اَنْتُمْ شُھَدَاءُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ" اے مسلمانو تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ یعنی جس چیز یا آدمی کو تم اچھا کہہ دو۔ وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہی ہے۔ کیونکہ تمہاری زبان رب کا قلم ہے۔ لہٰذا محفل میلاد شریف۔ فاتحہ۔ عرس بزرگاں اور تمام وہ چیزیں جن کو عرب و عجم کے علماء زاہدین صالحین مشائخ۔ صوفیاء اچھا جانتے اور عمل کرتے ہیں۔ وہ سب جائز اور مستحب ہیں۔ اور ان کو جائز اور مستحب جاننا ہی صراط مستقیم ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کے نیک بندوں کا راستہ ہے۔ ثابت ہوا۔ کہ مذہب اہل سنت والجماعت حق ہے۔ ایک دیوبندی کی بکواس کی وجہ سے تمام جہان کے علماء اور صالحین کو مشرک نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اس دیوبندی کو بے دین کہنا آسان ہے۔ جو تمام کی مخالفت کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتا ہے۔ **تفسیر صوفیانہ** صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ سے وہ حضرات مراد ہو سکتے ہیں۔ جن پر رب کی باطنی نعمتیں نازل ہوئیں۔ اور جن پر نور کا چھینٹا پڑا۔ کیونکہ مشکوٰۃ شریف باب الایمان بالقدر میں ہے۔ کہ حق تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کی پشت سے تمام روحوں کو نکالا پھر ان پر نور کا چھینٹا دیا۔ بعض لوگوں پر وہ نور پڑا اور بعض اس سے محروم رہے جن پر نور پہنچا۔ وہ ہدایت پر آجائیں گے۔ اور جو اس سے محروم رہے وہ گمراہ ہی رہیں گے۔ کاملین حق بات کو اسی نور سے معلوم کر لیتے ہیں۔ اور عامۃ المسلمین ان کی پیروی کر کے ہدایت پا جاتے ہیں۔ لیکن جو ان سے الگ رہا وہ تاریکی میں رہا۔ لہٰذا اَنْعَمْتَ سے مراد اولیاء اللہ اور سالکین راہ ہیں **نیز** صوفیاء کرام کے نزدیک کفار اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ میں داخل ہی نہیں ہیں۔ کیونکہ انہیں کسی قسم کی نعمت دی ہی نہ گئی۔ یہ دنیاوی نعمتیں مال و اولاد وغیرہ مسلمان کے لئے نعمت ہیں۔ اور کفار کے واسطے زحمت۔ کیونکہ ان سے مسلمان کے نیک اعمال میں ترقی ہوتی ہے۔ اور کفار کی سرکشی بڑھتی ہے۔ قرآن پاک خود فرماتا ہے۔ کہ وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْۤا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِھِمْ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَھُمْ لِیَزْدَادُوْۤا اِثْمًا اس کی یوں مثال سمجھو کہ ایک شخص نے ایک اپنے دوست کو خالص حلوا کھلایا اور دشمن کو زہر آلودہ حلوا کھلایا۔ دونو کو حلوا ہی دیا ہے۔ مگر دوست کے واسطے وہ رحمت اور دشمن کے واسطے زحمت ہے۔ یا یوں سمجھو کہ ایک ہی حلوے میں سے تندرست اور بیمار نے کھایا۔ لیکن اس سے بیمار کی بیماری بڑھ گئی۔ تندرست کو طاقت پہنچی۔ اس طرح ایک ہی نعمت مسلمان اور کافر کو ملتی ہے۔ لیکن کافر کو کفر کی بیماری ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے لئے یہ زہر ہے۔ صوفیاء کرام اس آیت کی بنا پر فرماتے ہیں۔ کہ ہر مسافر طریقت کو پیر کی ضرورت ہے۔ مولٰنا فرماتے ہیں ؎

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر ہست بس پر آفت و خوف و خطر

چوں گرفتی پیر ہیں تسلیم شو ! ہمچو موسےٰ زیر حکم خضر رَو!

انشاء اللہ پیر کی ضرورت ہم بیعت کی آیتوں میں بیان کریں گے **مسئلہ** اس آیت سے اشارۃً یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ مسلمانوں کا اجماع یعنی کسی مسئلہ پر اتفاق کرنا شرعی دلیل ہے۔ جو شخص کہ اُمت کے اجماع سے علیحدہ ہوا وہ اُس بکری کی طرح خطرے میں ہے۔ جو اپنے گلہ سے الگ ہو جائے جس طرح بھیڑیا اُس بکری کو کھا جاتا ہے۔ اسی طرح شیطان ایسے مسلمان کو جلد گمراہ کر دیتا ہے۔ لہٰذا چاہیئے۔ کہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ رہیں **اعتراض** صراط مستقیم ایک راستہ ہے۔ اور انبیاء اولیاء علماء الگ الگ راستے رکھتے ہیں۔ تو ایک راستہ ان سب کا راستہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہر نبی کی شریعت علیحدہ تھی۔ ہر ولی کے سلسلے طریقت جدا جدا ہیں۔ قادری چشتی۔ نقشبندی وغیرہ۔ علماء

کے مذہب علیحدہ علیحدہ حنفی۔ شافعی۔ مالکی حنبلی وغیرہ۔ غرض کہ ایسا کوئی راستہ نہیں مل سکتا۔ جو ان سب کا راستہ ہو **جواب**۔ تفسیر عزیزی میں نہایت نفیس مثال سے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ ایک قافلہ ایک راستے کو طے کر رہا ہے۔ لیکن اس قافلے کے آدمی مختلف کام کر رہے ہیں۔ کوئی بڑھئی ہے کوئی لوہار۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کوئی کرایہ دار۔ کوئی محافظ چوکیدار ان میں سے ہر شخص ایک ہی راستہ طے کر رہا ہے۔ ایک ہی جگہ جا رہا ہے۔ لیکن اپنے درجے کے لائق علیحدہ علیحدہ کام کرتے ہوئے۔ یہ سب ایک دن منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ یا یونانی طبیبوں کا ایک طریقہ علاج ہے۔ ڈاکٹروں کا دوسرا طریقہ۔ ویدوں کا دوسرا طریقہ۔ ان یونانی طبیبوں میں سے ہر طبیب کا طریقہ علاج جداگانہ ہے۔ کوئی مفرد دواؤں سے علاج کرتا ہے کوئی معجونوں وغیرہ سے۔ کوئی عرقیات اور شربتوں سے لیکن سارے یونانی حکیم ایک ہی قسم کے معالج مانے جاتے ہیں۔ اسی طرح انبیاء کرام۔ علماء عظام۔ صوفیائے صافیہ اگرچہ اعمال میں کسی قدر اختلاف رکھتے ہیں لیکن اصل مقصود سب کا ایک ہی ہے۔ یہ عملوں کا اختلاف۔ زمانے اور مزاجوں کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ زمانہ موسوی میں دین موسوی ہی ان لوگوں کے مزاج اور زمانے کے موافق تھا۔ اور زمانہ عیسوی میں دین عیسوی ہی موافق ہوا۔ حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ انبیاء کرام علاتی (باپ شریکے) بھائی ہیں۔ اصل توحید میں سب کا اتفاق ہے۔ اعمال میں اختلاف **غیر مقلدوں کا اعتراض**، صحابہ کرام اللہ کے مقبول بندے تھے۔ ان کے راستے پر چلنا ہدایت ہے۔ اور ان کا راستہ سیدھا راستہ ہے۔ انہوں نے تو کسی کی تقلید نہ کی۔ اور نہ ان کے زمانے میں یہ چار مذہب حنفی۔ شافعی وغیرہ بنے، لہٰذا تقلید کرنا ہی سیدھا راستہ ہے

**جواب**۔ اس اعتراض کے دو جواب ہیں۔ ایک الزامی دوسرا تحقیقی۔ الزامی جواب تو یہ ہے کہ نبیوں کا راستہ صراط مستقیم ہے۔ اور کوئی نبی کسی دوسرے نبی کا امتی نہیں ہوا۔ لہٰذا امتی بننا سنت انبیاء ہے۔ وہابیوں کو چاہیئے کہ کسی کے امتی بھی نہ بنیں۔ جواب تحقیقی یہ ہے کہ صحابہ کرام میں اصل تقلید موجود تھی۔ غیر فقیہ صحابہ فقیہ صحابہ کرام کی اطاعت کرتے تھے۔ اور فقیہ صحابہ کرام قرآن وحدیث سے قیاس فرما کے مسائل نکالتے تھے۔ رہا یہ کہ اس زمانہ میں چند مذہب نہ بنے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سینے صحبت نبی سے منور تھے مال میں اختلافات بہت کم تھے۔ گمراہ کرنے والے فرقے نہ تھے۔ لہٰذا ان کو قانونوں کی ترتیب کی ضرورت نہ پڑی۔ بعد میں جھگڑے پڑھنا شروع ہوئے۔ مسلمانوں میں کمزوریاں آنے لگیں۔ ضرورت تھی۔ کہ ان کو صحیح راستے پر لگایا جائے۔ اس کی مثال یوں سمجھو۔ کہ ان کے زمانے میں نہ قرآن پاک پر زیر زبر لگائے گئے۔ نہ رکوع بنائے گئے۔ نہ اس کے تیس سیپارے کئے گئے۔ نہ حدیث کا فن بنا۔ نہ اسماء الرجال کی ترتیب دی گئی۔ نہ حدیثوں کی اسنادوں پر جرح ہوئی۔ نہ حدیثوں کو کتاب کی شکل میں جمع کیا گیا۔ کیونکہ اس وقت ان چیزوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جس قدر ضرورت بڑھتی گئی۔ کام بھی بڑھتے گئے۔ تو اب جو بیوقوف کہے کہ علم حدیث پڑھنا حدیثوں پر جرح کرنا صحابہ کرام کے طریقے کے خلاف ہے۔ وہ محض احمق ہے۔ جس طرح کہ علم حدیث کا جمع کرنا جائز بلکہ ضروری ہے۔ ایسے ہی فقہ وغیرہ بھی ضروری ہے۔ نیز اگر فقہ کا انکار کر دیا جائے۔ تو جو مسائل کہ حدیث وقرآن میں صراحتاً نہیں ملتے۔ ان میں یہ لوگ کیا کریں گے۔ مثلاً ایک سوال قائم ہوتا ہے۔ کہ اڑتے ہوئے ہوائی جہاز میں نماز پڑھنا کیسی ہے، لاؤڈ سپیکر سے نماز پڑھانا جائز ہے۔ یا ناجائز، ریڈیو یا فونوگراف کے ذریعے سے اگر سجدہ کی آیت سنی جائے۔ تو سننے والے پر سجدہ تلاوت واجب ہوگا یا نہیں، اگر جمعہ کی پہلی رکعت میں جماعت ہو اور دوسری رکعت میں امام کے پیچھے جماعت نہ رہے۔ تو جمعہ پڑھے کہ ظہر، وغیرہ وغیرہ اسی قسم کے صدہا مسائل ایسے ہیں جن کا حکم ہم کو قرآن اور حدیث سے نہیں ملتا۔ اگر فقہ کا انکار کیا جائے تو ان کا کیا حکم ہوگا،

اس کی پوری بحث ان شاء اللہ تعالےٰ اسی آیت کے ماتحت کی جائے گی۔ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ۔

# غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ۝

| نہ | غضب کئے ہوئے | پر | اُن | اور | نہ | بہکے ہوئے۔ |
|---|---|---|---|---|---|---|

نہ ان کا جن پر غضب ہؤا اور نہ بہکے ہوؤں کا۔

**تعلق** اس کا تعلق گذری ہوئی آیتوں سے چند طرح ہے۔ **ایک** یہ کہ پہلی آیت میں صراط مستقیم کا پتہ بتایا گیا تھا۔ اور کسی چیز کا پورا پتہ جب لگتا ہے۔ جبکہ اس کے بھی کچھ نشان معلوم ہوں۔ اور اس کے ضد کے بھی کیونکہ چیز کی پہچان اس کی ضد کی پہچان سے ہوتی ہے۔ تو پہلی آیت میں تو صراط مستقیم کی علامت بتائی گئی۔ اور اس میں ٹیڑھے راستہ کا پتہ دیا گیا۔ تاکہ ان میں تمیز ہو جائے۔ **دوسرے** یہ کہ پہلے خدا کے انعام کا ذکر تھا جس کو سن کر بندے کے دل میں امید پیدا ہوتی تھی۔ اب غضب کا ذکر ہؤا جس سے خوف پیدا ہو۔ اور ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے۔ یا یوں کہو۔ کہ ایمان کے دو بازو ہیں۔ ایک خوف اور ایک امید جس طرح پرندہ بغیر دو بازوؤں کے نہیں اُڑ سکتا۔ اسی طرح مومن بغیر امید اور خوف کے اس راستے کو طے نہیں کر سکتا۔ ان دونوں میں برابری چاہیئے **تیسرے** یہ کہ پہلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر تھا جن پر اللہ نے انعام کیا۔ اس آیت میں ان ہی لوگوں کی پہچان بتائی گئی یعنی انعام والے وہ لوگ ہیں جو خدا کے غضب یعنی بدعمل اور ضلالت یعنی گمراہی اور بداعتقادی سے بچے ہوئے ہوں۔ تو مطلب یہ ہؤا کہ انعام والے کی پہچان یہ ہے۔ کہ اس کے عقائد بھی درست ہوں اور اعمال بھی یعنی کافر بھی نہ ہو اور فاسق بھی نہ ہو۔ **تفسیر عالمانہ** غیر کے تین معنے ہیں۔ نہ۔ سوا۔ اور مگر۔ یہاں تینوں معنے بن سکتے ہیں **غضب** کے لفظی معنے ہیں جوش اور بدلنا۔ اب اصطلاح میں غضب اس حالت کا نام ہے۔ جو دل میں بدلہ لینے کے خیال پر جوش پیدا ہوتا ہے۔ اور جس میں کہ اس کا حال پلٹ جاتا ہے۔ رب تعالیٰ چونکہ دل سے اور دل کی حالت پلٹنے سے پاک ہے۔ اس لئے یہاں اس کے معنی ہیں ارادۂ عذاب **ضَآلّ** ضلال سے مشتق ہے جس کے معنے ہیں حیرت جو شخص حیران ہوا سے کہتے ہیں ضال۔ اب عام عرف میں ضال کے معنے ہوتے ہیں گمراہ یعنی بدعقیدہ۔ قرآن کریم نے جہاں کہیں انبیاء کرام کے متعلق ضلال فرمایا ہے۔ وہاں لغوی معنی مراد ہیں یعنی حیرت اور وارفتگی جو شخص کسی نبی کو گمراہ جانے وہ کافر ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ کہ یہاں مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے کون لوگ مراد ہیں۔ اور ضَآلِّيْنَ سے کون؟ ترمذی شریف کی روایت میں ہے۔ کہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد یہود اور ضَآلِّيْنَ سے نصاریٰ ہیں۔ تفسیر کبیر نے اس کے علاوہ چند معنے اور بیان فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد بدعمل فاسق اور فاجر ہیں۔ اور ضَآلِّيْنَ سے مراد کفار ہیں دوسرے یہ کہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد کھلے کافر اور ضَآلِّيْنَ سے مراد منافق یعنی چھپے کافر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ سورہ بقر شریف میں اوّلاً مسلمانوں کا ذکر ہؤا ہے۔ پھر کھلے کافروں کا۔ پھر منافقوں کا۔ اگر یہاں بھی ان لفظوں کے یہ معنے ہوں۔ تو سورہ فاتحہ کی ترتیب سورہ بقر کی ترتیب کے مطابق ہو جائے گی بعض نے فرمایا۔ کہ جو لوگ خدا کے منکر ہیں۔ وہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ہیں۔ اور جو خدا کو مان کر دوسری ایمانی چیزوں کے منکر ہیں۔ وہ ضَآلِّيْنَ ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وہ لوگ ہوں جن کی بدعقیدگی حد کفر تک پہنچ گئی ہو۔ جیسے ہمارے زمانے میں چکڑالوی۔ تبرائی شیعہ۔ قادیانی۔ اور نبی علیہ السلام کی توہین کرنے والے دیوبندی۔ اور ضَآلِّيْنَ وہ جن کی بدعقیدگی حد کفر تک نہ پہنچی ہو۔ جیسے تفضیلی شیعہ اور فقط نیاز اور فاتحہ کے منکر دیوبندی کچھ بھی مراد ہو مقصود یہ ہے۔ کہ اے خدا ہم کو ان کے راستے سے بچا۔ جو تیرے غضب میں آگئے۔ اور جو گمراہ ہیں۔ **اس آیت کے فائدے**۔ اس آیت سے چند فوائد حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** فرشتے اور نبی ایک منٹ کے لئے بھی گمراہ نہیں ہو سکتے۔ اور نہ کبھی وہ گناہ کریں جس سے خدا کے غضب کے مستحق ہو جائیں۔ اس لئے کہ انبیاء کی پیروی کرنے کا حکم ہے۔ اور گمراہوں اور بدعملوں سے بچنے کا۔ اگر وہ کسی ساعت میں بدعقیدہ یا بدعمل ہوئے ہوتے۔ تو اس وقت ان سے بچنا لازم ہوتا اور یہ ان کے منصب کے خلاف ہے۔ لہٰذا اسی سے عصمت انبیاء کا ثبوت ملا۔ اس کی پوری بحث ہمارے رسالے "قہر کبریا بر منکرین عصمت انبیاء"

میں دیکھو۔ **دوسرا فائدہ**۔ اس سے معلوم ہوا کہ گمراہوں اور بد مذہبوں سے دور رہنا۔ اور اللہ کے نیک بندوں کی صحبت میں بیٹھنا سخت ضروری ہے۔ بد مذہبوں کے طریقوں ان کی صورتوں۔ ان کی سیرتوں۔ ان کی صحبتوں سے بچو جس کے پاس دولت ہو چاہیئے۔ کہ ڈاکوؤں اور چوروں سے علیحدہ رہے۔ ورنہ اس کی دولت خطرہ میں ہے۔ اسی طرح جس کے پاس دولت ایمان ہو۔ وہ ایمان کے چوروں سے علیحدہ رہے۔ زہریلا سانپ جان لے گا۔ اور بُرا یار ایمان برباد کرے گا۔ مگر افسوس کہ ہمارے زمانے میں قوم کی تنظیم اور اتفاق کے یہ معنے کئے گئے ہیں۔ کہ اللہ والوں (علماء۔ مشائخ۔ صوفیاء) سے نفرت کرو۔ اور ہر بد مذہب کو اپنا بھائی سمجھو۔ **تیسرا فائدہ** اس سورت کے شروع میں رب کی حمد و ثنا کا ذکر ہوا اور آخیر میں اس کے غضب سے پناہ کا جس سے معلوم ہوا۔ کہ جس طرح رب تعالٰے کی حمد و ثنا نیک بختیوں کی اصل ہے۔ اسی طرح بد اعتقادی اور بد عملی بد نصیبیوں کی جڑ ہے۔ **چوتھا فائدہ**۔ اللہ کے مقبول بندے جہاں بھی ہوں۔ اور جب بھی گذرے ہوں۔ اور جیسے بھی ہوں سب ایک ہی جماعت ہیں کیونکہ ان سب کا اصل ایک ہی ہے۔ لہذا آدم علیہ السلام کے زمانے سے قیامت تک کے سارے مقبول بارگاہ انشاء اللہ تعالٰے ایک ہی زمرے میں ہیں لیکن مردود دین بارگاہ قسم قسم کے لوگ ہیں۔ بعض وہ جن کی صورتیں بگڑی ہیں بعض وہ جن کی سیرتیں بگڑی ہیں۔ اور یہ اگرچہ دنیا میں متفق ہو کر رہیں لیکن آخرت میں کبھی انکا اتفاق نہ ہوگا۔ **پانچواں فائدہ** دینوی تکلیفیں اور مصیبتیں رب کا غضب نہیں جس طرح سے کہ یہاں کا محض آرام اس کی نعمت نہیں۔ بلکہ یہ تکالیف اس بھٹی کی آگ کی طرح ہیں۔ جو سونے کے مَیل کو دور کر دیتی ہے۔ یا کھوٹے کھرے سونے کو الگ کر کے دکھا دیتی ہے۔ جو دولت کہ حق تعالٰی سے غافل کر دے۔ وہ رب کا غضب ہے۔ اور جو تکلیف اس کی یاد دلائے وہ اس کی نعمت ہے۔ **تفسیر صوفیانہ**۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ مغضوب اور ضال وہ ہیں۔ جو اُس ازلی نور کے چھینٹے سے محروم رہ گئے۔ یا مغضوب وہ جو مقبول ہو کے مردود بنے۔ یا وہاں حاضر ہو کر غائب ہو گئے۔ یا مغفورین کے زمرے میں رہ کر مقہور بنے۔ دار السرور سے نکل کر دار الغرور میں آ گئے۔ جیسے ابلیس اور بلعم ابن باعورہ۔ اور ضالین وہ لوگ ہیں۔ جو وہاں تک پہنچتے ہی نہیں۔ یا تو یہاں سے چلے ہی نہیں۔ یا چلے مگر راستے میں رہ گئے۔ تو آیت کا مقصود یہ ہو گیا۔ کہ خداوندا ہم کو نہ تو ان لوگوں میں سے بنانا۔ جو تجھ تک پہنچتے ہی نہیں۔ اور نہ ان سے جو پہنچ کر لوٹے۔ یہ مقام بہت نازک ہے۔ انسان کو چاہیئے۔ کہ اپنے ظاہری علم اور تقوے پر اعتماد نہ کرے۔ بہت سی کھیتیاں پک کر برباد ہو جاتی ہیں۔ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا حُسْنَ الْخَاتِمَہ۔ ماوشما تو کیا۔ انبیاء کرام نے بھی استقامت کی دعائیں مانگی ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے عرض کیا۔ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۝ شرح فقہ اکبر میں ہے۔ کہ کسی تیلن نے سلطان العارفین بایزید بسطامی رحمتہ اللہ تعالٰے علیہ سے پوچھا۔ کہ آپ کی داڑھی اچھی ہے یا میرے بیل کی دُم۔ فرمایا۔ کہ اگر میں دنیا سے ایمان سلامت لے گیا۔ تو میری داڑھی بدرجہا بہتر ہے۔ اور اگر یہ دولت مجھ سے چھن گئی۔ تو تیرے بیل کی دم میری داڑھی سے کہیں اچھی ہے۔ کیونکہ پھر جہنم میرے لئے ہوگا۔ نہ کہ جانور کے لئے۔ اے مغرور انسان! ابھی تو کس بات پر فخر کرتا ہے۔ ابھی تیرے سامنے نزع کی سختی۔ قبر کی تنگی۔ قیامت کی دحشت۔ میزان کا معاملہ۔ پلصراط سے گذرنا باقی ہے جس وقت انشاء اللہ تعالٰی پل سے بخیریت گذر جائیں گے۔ تب یہ کہیں گے ؎

للہ الحمد نہ مردیم رسیدیم بدُست — آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ ما

مگر سب کی اصل یہ ہے ؎

گر محمدؐ کا ساتھ ہو جائے — پھر تو سمجھو نجات ہو جائے

**اعتراض**۔ حق تعالٰے نے غضب اور گمراہی کے راستے پیدا ہی کیوں کئے؟ شیطان کو بنایا ہی کیوں؟ نفس امارہ کو کیوں پیدا فرمایا؟ کیا اچھا ہوتا۔ کہ نہ یہ موذی چیزیں ہوتیں نہ دنیا میں خدا کی نافرمانی ہوتی۔ اگر رب تعالٰے نافرمانیوں سے راضی تھا۔ تو نافرمانوں پر عذاب کیسا؟ اور اگر ناراض تھا۔ تو انہیں پیدا کیوں فرمایا؟ **جواب** اس کا تفصیلی جواب ہم انشاء اللہ تعالٰے سورہ بقر کے شروع میں دیں گے۔ جہاں شیطان کی تحقیق اور اس کے پیدا کرنے کے اسرار بیان کئے جائیں گے۔

## آمین

| قبول فرما |
|---|
| قبول فرمالے |

**آمین** اسم فعل ہے. اس کے معنی یا تو ہیں ایسا ہی کر" یا قبول فرما" یہ قرآن پاک کی آیت نہیں ہے. اسی لئے نہ تو اس کو قرآن پاک میں لکھا گیا. اور نہ آج تک کسی نے اس کے قرآن ہونے کا دعویٰ کیا. ہاں سنت یہ ہے. کہ سورۂ فاتحہ کے بعد تلاوت کرنے والا اور سننے والا آمین کہہ لیا کریں. اسی طرح ہر دعا کے بعد آمین کہنا سنت ہے. **آمین کے فضائل** تفسیر روح البیان شریف نے اسی جگہ پر ایک حدیث نقل فرمائی. کہ حضرت جبریل امین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا. کہ فاتحہ کے لئے آمین ایسی ہے. جیسے کہ کتاب کے لئے مُہر یعنی جس طرح بغیر مُہر کے کتاب مکمل نہیں ہوتی اسی طرح بغیر آمین سورہ فاتحہ مکمل نہیں ہوتی. سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا. کہ آمین ربّ العٰلمین کی مہر ہے جس سے اپنے بندے کی دعا پر مہر لگاتا ہے یعنی جس طرح کہ مہر والا لفافہ سوا مکتوب الیہ کے کوئی نہیں کھول سکتا اسی طرح آمین والی دعا انشاء اللہ ضائع نہیں ہوسکتی یعنی یا تو قبول ہو جائے گی. اور اگر وہ دعا ارادۂ الٰہی کے خلاف ہے. تو دعا مانگنے والے کو ثواب مل جائے گا. حضرت وہب فرماتے ہیں. کہ آمین میں چار حرف ہیں. اور آمین کہنے والے کے لئے چار فرشتے دعا مغفرت کرتے ہیں. **حدیث** پاک میں ہے. کہ جب امام وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے تو تم آمین کہو. کیونکہ فرشتے بھی اس وقت آمین کہتے ہیں جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگی. اس کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے. حضرت امام فناری تفسیر سورۂ فاتحہ میں فرماتے ہیں. کہ شیطان اس دعا سے مایوس ہو جاتا ہے جس کے آخر میں آمین کہدی جائے. کیونکہ وہ سمجھتا ہے. کہ اس پر مہر الٰہی لگ چکی ہیں توڑ نہیں سکتا (روح البیان) دعا کرنے والا اور آمین کہنے والا دونوں دعا میں شریک ہوتے ہیں. اسی لئے حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام سے فرمایا. قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا یعنی تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی. حالانکہ فقط موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی. اور حضرت ہارون علیہ السلام نے صرف آمین فرمائی تھی. مگر رب نے اس دعا کو ان دونوں صاحبان کی طرف نسبت کیا. **بزرگان دین** فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے مجمع میں دعا کرنا بہتر ہے. کیونکہ اس صورت میں ایک شخص دعا کرے گا. اور باقی سب لوگ آمین کہیں گے. اگر ان میں سے ایک کی بھی آمین قبول ہوئی. تو انشاء اللہ سب کی دعا قبول ہو جائے گی. **آمین کے مسائل** (۱) پہلے عرض کیا جا چکا. کہ آمین قرآن پاک کا کلمہ نہیں. بلکہ یہ فقط دعا ہے اس کا دعا ہونا. قرآن پاک اور حدیث شریف اور سارے مسلمانوں کے اتفاق سے معلوم ہو چکا. رب تعالیٰ نے حضرت ہارون علیہ السلام کی آمین کو دعا فرمایا. حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قرآن ہونے کی خبر نہ دی. کسی صحابی اور تابعی نے اسے قرآن نہ کہا اور اسے قرآن میں لکھا بھی نہ گیا. ان تمام باتوں سے ثابت ہوا کہ یہ قرآن نہیں بلکہ دعا ہے. (۲) مسئلہ امام کے پیچھے آمین آہستہ کہنی چاہیئے. اور نماز کے علاوہ بھی آہستہ ہی کہنا بہتر ہے. اس کا آہستہ کہنا قرآن پاک احادیث شریفہ اور عمل صحابہ کرام اور عقلی دلائل سے ثابت ہے. **قرآن کریم** فرماتا ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ط یعنی اپنے رب سے عاجزی کے ساتھ اور چپکے سے دعا کرو جس سے معلوم ہوا کہ دعا دل میں کرنی چاہیئے. اور آمین بھی ایک دعا ہے. لہذا یہ بھی دل میں ہی چاہیئے. قرآن کریم فرماتا ہے. وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ط اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ. "اور اے محبوب علیہ السلام جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں دریافت کریں. تو فرما دیں بہت قریب ہوں قبول کرتا ہوں دعا کرنے والے کی دعا کو" اس آیت سے بھی مقصود یہی ہے. کہ دعا کرنے والا چیخنے کی زحمت گوارہ نہ کرے پکار کر اس سے کوئی چیز مانگی جاتی ہے. جو دور ہو. وہ تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے. لہذا اس سے آہستہ ہی دعا کرو. ان آیتوں سے معلوم ہوا. کہ آمین آہستہ ہی چاہیئے. **احادیث** مشکوٰۃ. "باب القرأۃ فی الصلوٰۃ" میں ہے. کہ جب امام وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے. تو تم

آمین کہو کیونکہ اس وقت ملائکہ بھی آمین کہتے ہیں جس کی آمین ملائکہ کی آمین کے موافق ہوگئی۔ اس کے سارے گزرے ہوئے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ رواہ البخاری والمسلم۔ اس حدیث سے معلوم ہوا۔ کہ گناہ جب معاف ہوں گے۔ جب کہ آمین ملائکہ کی طرح کہے گا۔ اور ملائکہ تو آہستہ کہتے ہیں۔ جو کہ ہمارے سننے میں نہیں آتی۔ تو چاہیئے۔ کہ ہم بھی آہستہ ہی کہیں۔ اگر ہم نے بلند آواز سے آمین کہی۔ تو ملائکہ کی آمین کے مخالف ہوئی پھر مغفرت کیسی؟ یہ جو فرمایا گیا۔ کہ جس کی آمین فرشتوں کے موافق ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کیفیت میں موافق ہو نہ کہ وقت میں۔ کیونکہ وقت تو آمین کہنے کا وہی ہے۔ جو بھی اس وقت آمین کہے گا۔ موافق ہو جائیگا۔ پھر اس میں یہ قید لگانا کیسی؟ کہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہو۔ اس کی مغفرت ہو۔ مراد وہی ہے جو ہم نے عرض کیا (۲) **حدیث** حضرت وائل ابن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ کہ انہوں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی جب حضور علیہ السلام یہاں پہنچے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ تو فرمایا "آمین" وَاَخْفٰی بِھَا صَوْتَہٗ۔ یعنی اپنی آواز پست کی۔ آمین آہستہ پڑھی۔ اس کو امام احمد اور ابو داؤد طیالسی اور طبرانی اور دار قطنی نے اپنی سنن میں اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا۔ اور فرمایا۔ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ (۳) **حدیث** امام محمد رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے آثار میں اور عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔ کہ حضرت ابراہیم نخعی فرماتے ہیں۔ کہ چار چیزوں کو امام آہستہ کہے۔ اَعُوْذُ بِاللہِ بِسْمِ اللہِ سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ اور آمین (۴) **حدیث** طبرانی نے تہذیب میں اور طحاوی نے اور ابن جریر نے اور ابو حفص ابن شاہین نے حضرت ابو وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی۔ کہ حضرت علی اور عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہما نہ تو بسم اللہ آواز سے پڑھتے تھے اور نہ آمین (۵) **حدیث** اسی طبرانی نے کبیر میں انہی ابی وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔ کہ حضرت علی اور عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالےٰ عنہما نماز میں اعوذ باللہ اور بسم اللہ اور آمین کو بلند آواز سے نہ پڑھتے تھے۔ (۶) **حدیث** عینی شرح ہدایہ نے حضرت ابو معمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت کی۔ کہ سیدنا عمر ابن الخطاب رضی اللہ تعالےٰ عنہ فرماتے ہیں۔ امام چار چیزیں آہستہ کہے۔ اعوذ باللہ، بسم اللہ، آمین، اور رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ (۷) **حدیث** یہی روایت منتخب کنز العمال میں ابراہیم نخعی سے ہے (۸) **حدیث** ابو داؤد ترمذی اور ابن ابی شیبہ نے وائل ابن حجر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی۔ کہ فرماتے ہیں۔ کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو سنا۔ کہ آپ نے پڑھا غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ اور آمین کہا۔ وَخَفَضَ بِھَا صَوْتَہٗ اپنی آواز کو اس میں پست کیا۔ (۹) **حدیث** بیہقی نے انہی ابی وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔ کہ سیدنا عبداللہ فرماتے ہیں۔ کہ امام چار چیزوں کو آہستہ کہے۔ بسم اللہ آمین۔ ربنا لک الحمد اور اعوذ باللہ (۱۰) **حدیث** دارمی اور بیہقی نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی۔ کہ جب قاری کہتا ہے وَلَا الضَّآلِّیْنَ تو آسمان کے فرشتے بھی آمین فرماتے ہیں جس کی آمین ان کی آمین کے موافق ہو گی۔ اس کی مغفرت ہو جائے گی۔ اس کی پوری تحقیق صحیح البہاری میں دیکھو **عقلی دلیل** آمین کے علاوہ جس قدر نماز میں دعائیں ہیں۔ یعنی دعائے قنوت۔ دعائے ماثورہ وغیرہ تمام آہستہ ہی پڑھی جاتی ہیں۔ چونکہ آمین بھی ایک دعا ہے۔ چاہیئے کہ یہ بھی آہستہ پڑھی جائے۔ **نیز** نماز میں سوا تکبیروں اور تلاوت قرآن کے کوئی ذکر بلند آواز سے نہیں کیا جاتا۔ اور آمین بھی تلاوت اور تکبیروں کے علاوہ ہی ہے۔ لہٰذا وہ بھی آہستہ ہونی چاہیئے **غیر مقلدوں کا اعتراض** غیر مقلد کہتے ہیں۔ کہ بہت سی احادیث میں آیا ہے۔ کہ بلند آواز سے آمین کہی جائے۔ چنانچہ ترمذی۔ ابو داؤد۔ ابن ماجہ نے وائل ابن حجر رضی اللہ تعالیٰ سے روایت کیا۔ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا۔ کہ آپ نے نماز میں وَلَا الضَّآلِّیْنَ پڑھا اور "آمین" فرمایا۔ مَدَّ بِھَا صَوْتَہٗ بلند کیا اس سے اپنی آواز کو۔ اسی طرح ابن ماجہ کی روایت ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی آواز سے آمین فرماتے تھے۔ کہ صف اوّل والے سن لیتے تھے۔ پھر یہ سب لوگ اتنی بلند آواز سے آمین کہتے تھے جس سے مسجد گونج جاتی تھی۔ لہٰذا آمین بلند آواز سے کہنی چاہیئے **جواب**۔ اس کے چند جواب ہیں۔ اوّل یہ کہ قرآن پاک نے آہستہ دعا مانگنے کا حکم دیا۔ اور آمین بھی ایک دعا ہے۔ اور ان احادیث سے

آمین بالجہر ثابت ہوئی یقیناً آیت قرآنی کو ترجیح دی جائے گی۔ **دوسرے** یہ کہ جب احادیث کی تحقیق کی جاتی ہے۔ تو بلند آواز کی حدیثوں میں سے صرف سیدنا وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت صحیح ہے جس میں مَدَّ بِهَا صَوْتَهٗ ہے۔ اور اس کا ترجمہ یہ نہیں کہ بلند آواز سے آمین فرمائی۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ آواز کھینچ کر آمین کہا یعنی آمین کے الف اور میم کو مد کے ساتھ کھینچ کر پڑھا۔ اب لفظ صوت کے معنے فقط آواز کے ہیں۔ خواہ چیخ کر ہو۔ خواہ آہستہ پھر جبکہ انہی حضرت وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں صراحتاً آچکا۔ کہ حضور علیہ السلام نے آمین آہستہ فرمائی۔ تو یقیناً اس روایت میں بھی صوت سے مراد آہستہ آواز ہوگی۔ تاکہ دونوں روایتیں مطابق ہو جائیں۔ **تیسرے** یہ کہ جن روایتوں میں جہر کے الفاظ موجود ہیں۔ اولاً تو اسناد کے لحاظ سے وہ صحیح نہیں۔ علاوہ ازیں ان روایت کرنے والوں نے مَدَّ بِهَا صَوْتَهٗ کا ترجمہ جہر فرما کر روایت بالمعنے کر دی ہے۔ **چوتھے** یہ کہ جب حدیثوں میں تعارض ہو۔ تو قیاس کے ذریعے سے بعض حدیثوں کو ترجیح دیدی جاتی ہے۔ تو آہستہ آمین کی حدیثیں قیاس کے مطابق ہیں اور بلند آواز سے آمین کہنے کی حدیثیں قیاس کے خلاف۔ جیساکہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ لہذا آمین آہستہ ہی کہنا چاہیئے۔ **پانچویں** یہ کہ آہستہ آمین والی حدیثوں کی قرآن پاک تائید فرما رہا ہے۔ لہذا وہی زیادہ قابل عمل ہیں **چھٹے** یہ کہ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ بلند آواز سے آمین کہنے کی روایتیں منسوخ ہیں۔ اور آہستہ والی ناسخ۔ لہذا آہستہ آمین کہنا ہی قابل عمل ہے۔ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ وَنُوْرِ عَرْشِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ

| سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ وَّهِيَ مِائَتَانِ وَسِتٌّ وَّثَمَانُوْنَ اٰيَةً وَّاَرْبَعُوْنَ رُكُوْعًا |
|---|
| سورہ بقرہ مدنی ہے اور وہ دو سو چھیاسی آیتیں ہیں اور چالیس رکوع ہیں |

**تعلق** اس سورۃ کو سورہ الحمد کے ساتھ چند طرح تعلق ہے۔ اولاً یہ کہ سورۃ الحمد میں ایسے عمدہ مضامین بیان ہوئے جن سے بیمار دل اور بیمار روح کو شفا ابدی حاصل ہوئی۔ اسی لئے اس کا نام سورہ شافیہ تھا۔ اور شفا کے بعد زندگی ضروری ہوتی ہے۔ یا یوں سمجھو۔ کہ دوا کے بعد غذا ضروری ہے کیونکہ دوا سے بیماری دور ہوتی ہے۔ اور غذا سے زندگی باقی رہتی ہے۔ سورۃ بقر کے اندر ایسے مضامین بہت زیادہ ہیں۔ جو انسان کو روحانی زندگی عطا فرماتے ہیں کیونکہ اس میں چالیس رکوع ہیں۔ مگر کوئی بھی رکوع ایسا نہیں جس میں زندگی کا ذکر نہ ہو کسی رکوع میں ایمان کا ذکر ہے کسی میں اعمال کا کسی میں غذائیں پیدا فرمانے کا۔ کسی میں بنی اسرائیل پر من وسلویٰ اتارنے کا۔ کسی میں دین ابراہیم کی پیروی کرنے کا کسی میں کعبے کے بدلنے کا۔ کسی میں مرے ہوئے کو گائے کا گوشت مار کر زندہ کرنے کا۔ کسی میں شراب وجوئے کی ممانعت کسی میں خانگی زندگی کے طریقے۔ کسی رکوع میں طلاق اور عدت وغیرہ کسی میں بچوں کی پرورش کسی میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا چار جانوروں کو مار کر زندہ کر کے دکھانا وغیرہ وغیرہ اور یہ تمام مضامین جسمانی یا روحانی حیات بخشنے والے ہیں۔ تو یوں سمجھو۔ کہ سورہ فاتحہ سورہ شفا تھی۔ اور سورہ بقر سورہ حیات یعنی زندگی کی سورت ہے۔ **دوسرے** یہ کہ سورہ بقر الحمد شریف کی تفصیل ہے یعنی جو مضامین۔ کہ وہاں اجمالی طور پر بیان کئے گئے تھے۔ وہ اس سورت میں مفصل طور پر بیان ہوئے۔ مثلاً سورہ فاتحہ میں حق تعالیٰ کی ربوبیت اور رحمت کا ذکر فرمایا گیا۔ اس سورت میں ذکر ہوا۔ کہ رب تعالےٰ نے آسمان سے پانی برسا کر قسم قسم کے پھل پیدا فرمائے۔ فلاں قوم کو من وسلویٰ عطا فرمایا۔ فلاں شخص کو بعد مرنے کے زندہ کر دیا وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح سورۂ فاتحہ میں حق تعالےٰ کی شہنشاہی کا ذکر تھا۔ کہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ اس سورۃ میں ذکر آئے گا۔ کہ بنی اسرائیل نے فلاں خطا کی۔ ان پر یہ عذاب بھیجا گیا۔ یہ اس کی شہنشاہی کا ثبوت ہے۔ اسی طرح سورہ فاتحہ میں عبادت کا ذکر تھا۔ تو اس سورہ میں روزہ۔ نماز۔ حج۔ زکوٰۃ وغیرہ سب کا ذکر آئے گا۔ اس طرح سورہ فاتحہ میں سیدھے راستے کی دعا مانگی گئی تھی۔ انعام والوں کے راستے پر چلنے کی توفیق۔ اور سورۃ بقر میں حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے پیروی کرنے والوں کا ذکر ہے۔ اسی طرح سورہ فاتحہ میں غضب والوں اور گمراہوں سے پناہ مانگی گئی تھی۔ اور سورۂ بقر میں فرعون اور نمرود وغیرہ کے حالات اور ان کی تباہی کا ذکر فرمایا گیا۔ غرض کہ سورۂ بقرہ سورہ فاتحہ کی تفصیل یا تفسیر ہے۔ اس لئے اس کو سورۂ فاتحہ

کے بعد بیان فرمانا نہایت بہتر ہے (**سورۂ بقر کا نام**) ہم سورۂ فاتحہ کے اوّل میں عرض کر چکے ہیں۔ کہ سورت کا نام اس کے بعض مضامین وغیرہ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا سورہ بقر کا نام بھی اس کے ایک مضمون سے رکھا گیا ہے۔ بقر کے معنے ہیں گائے یا بیل چونکہ اس میں گائے کے ذبح کرنے اور اس کے ذریعے سے ایک مقتول کو زندہ کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کا نام سورہ بقر رکھا گیا۔ اگرچہ اس میں اور بھی اعلیٰ مضامین موجود تھے لیکن گائے کا یہ عجیب وغریب قصہ صرف اسی سورت میں ہے۔ اور کسی میں نہیں۔ اور اس قصہ میں ہزارہا فائدے ہیں جن کی کچھ تفسیر ہم اس موقعہ پر کریں گے۔ لہٰذا اس کا نام سورت بقر ہی ہوا (**شان نزول**) اس کا ایک تو اجمالی شان نزول ہے۔ ایک تفصیلی۔ تفصیلی شان نزول تو مختلف آیتوں کے ساتھ بیان کیا جائیگا شان نزول اجمالی یہ ہے کہ جب بانیٔ اسلام علیہ السلام مکہ مکرمہ میں تشریف فرما تھے۔ تو وہاں صرف بت پرستوں اور مشرکین کا مقابلہ تھا۔ لیکن جب مدینہ منورہ میں تشریف لائے۔ تو یہاں عیسائیوں اور یہودیوں کی آبادی پائی۔ مدینہ پاک میں یہودیوں کا بہت زور تھا۔ اور عبداللہ ابن ابی یہاں کا گویا سردار مانا جاتا تھا جب اسلام کا آفتاب مدینہ پر چمکا اور سب سے پہلے ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کو چمکایا۔ اور قرآن کی آوازیں ان کے کانوں میں پہنچیں۔ تو سب کے دلوں نے تو قبول کیا۔ لیکن سوا چند دیندار لوگوں کے باقی سب حسد اور تعصّب کی وجہ سے مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔ چونکہ یہ لوگ پہلے سے علم میں مشہور تھے۔ اور اطراف مدینہ کے لوگ ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ اس لئے اکثر عرب کے جہلا ان کے ساتھ ہو گئے۔ پھر یہود و نصاریٰ جو آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ اسلام کے مقابلے کے لئے ایک ہو گئے۔ عبداللہ ابن ابی اور اس کے ساتھی جن کو عزت اور مال کی محبت نے اندھا کر رکھا تھا۔ بظاہر تو مسلمان ہو گئے۔ لیکن دل سے کافروں کے ساتھ رہے۔ اور انہوں نے درپردہ ان دشمنوں کی امداد کرنا شروع کر دی۔ تو یوں سمجھو کہ مدینہ پاک میں آکر مسلمانوں کو چار قوموں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ علماء یہود و علماء نصاریٰ۔ جہلاء مشرکین اور منافقین۔ یہ لوگ خفیہ ایذا پہنچانے کے علاوہ کج بحثیاں کرتے رہتے تھے اور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک و شبہات ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ پس حکمت الٰہی کا تقاضا ہوا۔ کہ ایک ایسی سورت اتاری جائے جس سے ان چاروں فرقوں کی سرکوبی ہو جائے۔ اور ان کے شبہات دور کئے جائیں۔ اس لئے مدینہ پاک میں پہنچتے ہی یہ سورۃ اترنا شروع ہوئی۔ یہ تو اس پوری سورۃ کے نازل ہونے کی وجہ بیان کی گئی۔ آیتوں کا شان نزول انشاء اللہ تعالےٰ ان کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

(**سورۂ بقر کے فضائل**) سورۂ بقر کے بے شمار فضائل ہیں۔ ان میں سے کچھ عرض کئے جاتے ہیں "مسلم شریف" میں سیدنا انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے روایت ہے۔ کہ وہ فرماتے ہیں۔ کہ ہم میں سے جو شخص سورۂ بقر و آلِ عمران جانتا تھا۔ اُس کی بڑی عزت ہوتی تھی (۲) مُسند امام احمد وغیرہ میں ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورہ بقر قرآن پاک میں ایسی ہے۔ جیسے کہ اُونٹ کے جسم میں کوہان (یعنی اُس کے پیٹھ کی ہڈی) یعنی جیسے کہ اُونٹ کی خوبصورتی اُس کے کوہان سے ہوتی ہے اسی طرح قرآن پاک کی زینت سورہ بقر سے ہے۔ اسی مسلم شریف میں ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ زہراوین (یعنی چمکدار نورانی) سورتوں کو پڑھا کرو یعنی سورہ بقر و آل عمران کیونکہ قیامت کے دن یہ دونوں سورتیں اپنے پڑھنے والوں پر بادل کی طرح سایہ کریں گی۔ اور اُن کی شفاعت فرمائیں گی (۳) تفسیر عزیزی میں ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ جو شخص ہر جمعہ کی شب میں سورۂ بقر و آلِ عمران پڑھا کرے۔ تو اُس کو اتنا ثواب ملتا ہے جس سے کہ بُعیدا سے عروبا تک بھر جائے۔ (بعیدا زمین کے آخری ساتویں طبقے کا نام ہے۔ اور عروبا ساتویں آسمان کا) (۴) سیدنا ام الدرداء سے روایت ہے۔ کہ ایک شخص نے جو قرآن پاک کی تلاوت کرنے والا تھا۔ ایک روز اپنے پڑوسی کو مار ڈالا صبح کو اُسے گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ جب اُسے دفن کیا گیا۔ تو تمام سورتیں اُس کی قبر سے نکل کر جاتے ہوئے دیکھی گئیں۔ مگر سورۂ آلِ عمران و سورۂ بقر اُس وقت تک نہ گئیں جب تک کہ جمعہ نہ آگیا۔ اور وہ شخص عذاب سے محفوظ نہ ہو گیا۔ (۵) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سورۂ بقر بارہ سال میں تمام حقائق و اسرار کے ساتھ پڑھی۔ اور جس دن ختم کی اُس دن ایک اُونٹ ذبح کر کے صحابہ کرام کی خوشی میں دعوت کی۔ **لوٹ ضروری**۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ دینی کتابیں شروع یا ختم کرتے وقت شیرینی تقسیم کرنا اور خوشی منانا سنت

صحابہ کرام ہے (۶) قرآن پاک میں سب سے بڑی یہی سورت ہے۔ اس سورت میں دو سو چھیاسی (۲۸۶) آیتیں۔ چالیس رکوع اور چھ ہزار ایک سو اکیس (۶۱۲۱) کلمے اور پچیس ہزار پانچ (۲۵۵۰۰) حرف ہیں (۷) قرآن پاک کی سب سے بڑی آیت یعنی آیت مدینہ اسی سورت بقر میں ہے (۸) ابن عربی فرماتے ہیں کہ سورہ بقر میں ایک ہزار حکم اور ایک ہزار نہی اور ایک ہزار خبریں ہیں یعنی جس قدر احکام کہ اس سورۃ میں ہیں۔ اتنے اور سورتوں میں نہیں۔ **فائدہ** یہ بھی قرآن پاک کا ایک معجزہ ہے۔ کہ اس کی سورتیں اور آیتیں چھوٹی بڑی ہیں جس سے رب تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ظہور ہوتا ہے۔ کہ وہ جس طرح بڑی سورت میں بے شمار خوبیاں بھر سکتا ہے۔ اسی طرح چھوٹی سی چھوٹی سورت میں بھی سورت چھوٹی ہو یا بڑی ہر ایک معجزہ ہے **غور کرو**۔ کہ ہاتھی اور اونٹ کے جسم بہت بڑے ہیں۔ اور چیونٹی کا جسم نہایت معمولی لیکن جتنے عضو کہ ہاتھی اور اونٹ میں ہیں۔ قریب قریب وہ سب عضو چیونٹی میں بھی ہیں۔ اس سے حق تعالےٰ کی قدرت کا ظہور ہوتا ہے **سورہ بقر کے فائدے**۔ سورۂ بقر کے بے شمار فائدے ہیں جن میں سے کچھ فائدے ہم تفسیر عزیزی اور تفسیر خزائن العرفان سے نقل کرتے ہیں (۱) جس گھر میں سورۂ بقر پڑھی جائے۔ اُس گھر میں تین روز تک سرکش شیطان داخل نہیں ہوتا (۲) جو شخص ہمیشہ سوتے وقت سورۂ بقر کی دس آیتیں پڑھ لیا کرے۔ وہ انشاء اللہ قرآن پاک کبھی نہ بھولے گا۔ وہ دس آیتیں یہ ہیں۔ چار آیتیں اوّل کی یعنی مُفۡلِحُوۡنَ تک اور آیۃ الکرسی اور دو آیتیں آیت الکرسی کے بعد کی اور تین آیتیں آخیر سورت کی (۳) جس کسی کے بچے کو چیچک نکل آئے۔ وہ ڈھائی پاؤ چاول پکائے۔ اور اُس میں بقدر ضرورت دہی اور کھانڈ ڈالے اور کسی فقیر کو بلا کر اُس سے کہے۔ کہ تو ان چاولوں کو اس طرح آہستہ آہستہ کھا۔ کہ میرا پڑھنا اور تیرا کھانا ایک ساتھ ختم ہو۔ وہ فقیر اس بچے کے سامنے کھانا شروع کرے۔ اور وہ شخص اُس بچے کے سامنے سورہ بقر شروع کرے۔ آہستگی سے عمدہ طریقے سے سورۂ بقر پڑھے۔ اِدھر تو یہ سورت ختم کرے۔ اُدھر وہ چاول ختم کرے۔ انشاء اللہ چیچک کو آرام ہوگا۔ اور اُس سال میں اُس گھر میں چیچک سے امن رہے گی۔ مگر شرط یہ ہے۔ کہ یہ عمل صبح کے وقت کیا جائے۔ اور عمل کرنے والا اور بیمار بچہ دونوں نہار منہ ہوں (۴) طبرانی اور بیہقی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا۔ کہ میت کو دفن کرکے اسکی قبر کے سرہانے سورۂ بقر کی اوّل کی آیتیں مفلحون تک اور قبر کی پائینتی سورۂ بقر کا آخیر رکوع پڑھنا چاہیئے۔ انشاء اللہ اس کے بقیہ اور فائدے اس سورت کے آخیر میں بیان کئے جائیں گے۔

| الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ ① |
|---|
| یہ کتاب نہیں شک میں اوس ہدایت لئے پرہیزگاروں |
| وہ بلند رُتبہ کتاب کوئی شک کی جگہ نہیں اس میں ہدایت ہے ڈر والوں کو۔ |

(الٓمّٓ) **تعلق** سورۂ فاتحہ کو الحمد سے شروع فرمایا جس کے معنی اس قدر ظاہر ہیں۔ کہ بچے بھی جانتے ہیں۔ اور ہر شخص سنتے ہی اُس کے سمجھنے اور جاننے میں کچھ تامل نہیں کرتا۔ لیکن سورۂ بقر کو الٓمّٓ سے شروع فرمایا جس کے معنے میں عام تو کیا بڑے بڑے علما اور اولیاء بھی حیران ہیں۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے۔ کہ قرآن پاک بعض لحاظ سے بہت آسان ہے۔ اور بعض اعتبار سے سخت مشکل۔ اس کے بعض ظاہری معنی تو اس قدر آسان ہیں۔ کہ سُن کر ہی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اور بعض اسرار و رموز اس قدر دشوار ہیں۔ کہ جس کے لئے عقل انسانی کافی نہیں ہوتی نقل حدیث ہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ دیکھو دنیا کی بعض چیزیں ایسی عام ہیں۔ کہ ہر شخص کو بلا تکلف مل جاتی ہیں۔ جیسے ہوا۔ پانی وغیرہ اور بعض وہ چیزیں ہیں کہ بہت دشواریوں سے خاص خاص ہی کو ملتی ہیں۔ جیسے ہیرا اور موتی وغیرہ۔ اگر قرآن کریم بالکل آسان ہوتا۔ تو کوئی شخص شیخی سے کہہ سکتا تھا۔ کہ میرا دماغ اس کے سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ ضرورت تھی۔ کہ کچھ راز کی باتیں اس میں ایسی بھی ہوں۔ کہ جن کو سنتے ہی بڑے سے بڑا عالم اپنے عجز کا اقرار کرتے ہوئے پکار کر یہ کہنے لگے۔ کہ سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ۔ کہ اے پروردگار ہمیں نہیں خبر اپنے راز تو ہی جانتا ہے سورۂ بقر

کا اوّل کلمہ وہ مقرر کیا۔ کہ جس کو سُن کر انسان اپنی عاجزی کا اقرار کرے **تفسیر** حق تو یہ ہے۔ کہ اس کے معنے اللہ اور اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ہم کو چاہیئے۔ کہ اس کے حق ہونے پر ایمان لے آئیں۔ اور یہ کہہ دیں۔ کہ اس کے معنے وہ ہیں۔ جو رب نے بتائے۔ اور محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جانے۔ تفسیر روح البیان شریف میں اس جگہ فرمایا۔ کہ یہ الٓمّٓ اُن کلاموں میں سے ہے۔ جن کے معنی کی خبر حضرت جبریل علیہ السلام کو بھی نہیں ہوتی تھی۔ ڈاک خانہ کے ذریعے حکام کے پاس کچھ شاہی تاروں میں ایسے حروف آتے ہیں۔ کہ جن کو خود تار کا لینے والا پوسٹ ماسٹر اور لانے والا تار بابو بھی نہیں سمجھتا۔ لیکن جس حاکم کے پاس وہ تار آتا ہے۔ وہ اسے خوب سمجھ جاتا ہے۔ چنانچہ روایات سے ثابت ہے۔ کہ جب کٓھٰیٰعٓصٓ نازل ہوئی۔ حضرت جبریل نے جب عرض کیا "کاف"، تو حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ میں نے جان لیا۔ پھر عرض کیا "ہا" فرمایا میں نے جان لیا۔ پھر عرض کیا "یا" فرمایا میں نے جان لیا۔ پھر عرض کیا "عین" فرمایا میں نے جان لیا۔ اور پھر عرض کیا "صاد" تو فرمایا میں نے جان لیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا۔ کہ آپؐ نے کیا جان لیا۔ مجھے تو کچھ خبر نہ ہوئی ؎

میان طالب و محبوب رمزیست کراماً کاتبیں راہم خبر نیست

لیکن بعض علماء کرام نے بطریق تاویل اِن کے کچھ معانی بیان کئے ہیں۔ لیکن وہ بھی فرماتے ہی ہیں۔ کہ حقیقی معنی وہی ہیں۔ جو رب جانے وہ تاویلیں یہ ہیں۔ (۱) الٓمّٓ قرآن پاک کا نام ہے۔ (۲) الٓمّٓ سورہ بقر کا نام ہے۔ بلکہ جو بھی سورتیں اس قسم کے حروف سے شروع ہوتی ہیں۔ وہ اُس سورت کا نام ہی ہوتی ہیں۔ جیسے حٰمٓ یا الٓرٰ وغیرہ (۳) اس کا ہر حرف حق تعالیٰ کے بعض ناموں کا پہلا حرف ہے یعنی "الف" سے مراد ہے۔ اللہ اور "لام" سے مراد لطیف "میم" سے مراد معین یا مجید یا منّان ۴ "الف" سے مراد اللہ "لام" سے جبریل اور "میم" سے مراد محمد تو مقصود یہ ہُوا۔ کہ اس میں قرآن پاک کے بھیجنے والے اور پہنچانے والے اور وصول کرنے والے کا نام ہے۔ یعنی یہ قرآن کریم اللہ نے بھیجا۔ جبریل لائے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پایا (۶) یہ حرفوں ہی کے نام ہیں یعنی اس سے مراد "الف۔ لام۔ میم" ہی ہیں۔ تو منشا یہ ہے۔ کہ قرآن پاک بھی انہیں حرفوں سے بنا ہے۔ جن سے اے انسان تیرے کلام بنتے ہیں۔ لیکن پھر اس قدر اعلیٰ کلام ہونے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ **اعتراض** (۱) قرآن پاک تو عمل کرانے کے لئے آیا ہے۔ اگر اس کی مراد اس قدر چھپی ہوئی تھی۔ تو اسے قرآن پاک میں رکھا ہی کیوں گیا۔ اگر یہ راز کی بات تھی۔ تو صیغۂ راز میں رکھی جاتی **جواب**۔ یہ خیال محض غلط ہے۔ کہ قرآن کریم صرف عمل کے لئے آیا ہے۔ ہم اس کی تحقیق مقدمہ میں کر چکے ہیں۔ حق تو یہ ہے۔ کہ بعض آیتیں فقط جاننے کے لئے ہیں جیسے اللہ کی ذات و صفات کی آیتیں۔ اور بعض آیتیں فقط ماننے کیلئے یعنی انہیں جانو مت صرف مان لو کہ یہ کلام اللہ کا ہے۔ بعض آیتیں ڈرنے کے لئے جیسے عذاب کی آیتیں۔ اور بعض آیتیں خوش ہونے اور امید کے لئے۔ جیسے رحمت کی آیتیں تو یہ متشابہات صرف ماننے کیلئے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ انہیں قرآن پاک میں کیوں رکھا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ چند حکمتوں سے (۱) اُن پر ایمان لانا (۲) اُن کی تلاوت کرنا۔ کیونکہ تلاوت میں ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں۔ تو اگرچہ الٓمّٓ کے معنے سمجھ میں نہ آئیں۔ مگر اس کے پڑھنے سے تیس نیکیاں مل جائیں گی۔ (۳) اس سے حضور علیہ السلام کی شان معلوم ہوتی ہے۔ کہ حقتعالیٰ کے ایسے رازدار ہیں۔ کہ اُن کے رازوں تک فرشتوں کی بھی رسائی نہیں (۴) عالموں کی آنکھیں نیچی ہوں گی۔ اور دل سے غرور جاتا رہے گا۔ اور انہیں اپنی عاجزی۔ نیازمندی کا اقرار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ عالم ہر چیز کے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جب ان کلمات کو نہ سمجھ سکے گا۔ تو یہی کہتے بنے گی کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے (۵) اِن کے معنی کا نہ سمجھنا قرآن کی خدائی کتاب ہونے کی دلیل ہوگی۔ کیونکہ جہاں تک دماغ کی رسائی نہ ہو۔ اُسے یہی کہتے بنتا ہے۔ کہ یہ خدا کی چیز ہے۔ **اعتراض** (۲) رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ۔ یعنی ہم نے قرآن کریم کو آسان کیا۔ اور تم کہتے ہو۔ کہ قرآن کریم کی بعض آیتیں بے حد مشکل ہیں تو تمہاری یہ بات کلام الٰہی کے خلاف ہوئی **جواب**۔ یہ آیت آپ نے پوری نہ پڑھی۔ پوری آیت یہ ہے۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ یعنی ہم نے اس قرآن کو یاد کرنے یا نصیحت حاصل

۴(م) الف سے مراد اَنَا یعنی میں۔ لام سے مراد اللہ۔ میم سے مراد اَعْلَمُ یعنی میں جانتا ہوں۔ (۵) یہ اللہ اور دوسری ذاتوں کے ناموں کے مخفف حرف ہیں یعنی

کرنے کے لئے آسان کیا ہے یعنی کوئی بھی آسمانی کتاب کسی امتی نے حفظ نہ کی۔ قرآن پاک کی یہ خصوصیت ہے۔ کہ بچوں کو بھی حفظ ہے۔ تو یہ حفظ کے لئے آسان ہے۔ نہ کہ سمجھنے کیلئے۔ اسی طرح اس قرآن پاک کے ذریعے سے رب کو پہچاننا آسان ہے۔ نہ یہ کہ اُس کی ہر آیت کے اسرار سمجھنا۔ کیا قرآن پاک کی وہ آیت نہ دیکھی وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ یعنی ان متشابہ آیتوں کے معنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

**نوٹ**۔ ہمارے اس جواب سے وہابیوں اور چکڑالویوں کے صدہا اعتراضات اُٹھ جائیں گے۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں۔ کہ قرآن کریم نور ہے۔ قرآن کریم دلیل ہے۔ قرآن کریم ہدایت دینے والا۔ قرآن کریم شفا ہے۔ قرآن کریم تبلیغ کا ذریعہ ہے۔ قرآن کریم کتاب مبین یعنی کھلی ہوئی کتاب ہے۔ اگر اس کی بعض آیتیں بالکل چھپی ہوئی اور مشکل ہوں۔ تو وہ نہ نور ہوتیں۔ نہ ہدایت نہ دلیل۔ ان سب کا جواب ہمارے مذکورہ جواب سے معلوم ہو گیا۔ کہ قرآن کریم کی ساری آیتیں حق تعالیٰ کو پہچاننے کی دلیل۔ ایمان دینے والیں۔ اور اپنے لانے والے کی صداقت کے لئے نور وغیرہ ہیں۔ نہ یہ کہ ہر ایک کا راز سمجھنا بھی آسان ہے۔

**ذٰلِكَ الْكِتٰبُ** اس کا تعلق پہلے سے یہ ہے۔ کہ اگر الٓمّٓ قرآن پاک کا یا سورۃ کا نام ہو۔ تو وہ مبتدا ہو گا۔ اور یہ اُس کی خبر تو معنی یہ ہوں گے۔ کہ الٓمّٓ یہ کتاب ہے۔ اور اگر وہ متشابہات میں سے ہے۔ تو یہ الگ جملہ بنے گا۔ اس طرح کہ ذٰلِكَ مبتدا اور الْكِتٰبُ خبر۔ یعنی یہ قرآن کتاب کامل ہے **تفسیر** ذٰلِكَ اسم اشارہ ہے۔ جیسے کہ اردو میں "یہ" اب اس میں گفتگو یہ ہے۔ کہ ذٰلِكَ سے اشارہ کس طرف ہو رہا ہے۔ اگر اہل کتاب کو سنانا مقصود ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز جس کا وعدہ توریت و انجیل وغیرہ میں کیا گیا تھا۔ آخیر زمانہ میں ایک کتاب آنے والی ہے۔ اے عیسائیو اور یہودیو یہ وہی کتاب ہے۔ اور اگر مسلمانوں کو سنانا منظور ہے۔ تو ذٰلِكَ سے اشارہ یا تو ان سورتوں کی طرف ہو رہا ہے جو سورہ بقر سے پہلے اتر چکی ہیں۔ اور یا اُن کی طرف جو آئندہ اترنے والی ہیں۔ یا اُس کی طرف جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔ چونکہ پہلے خبر دی جا چکی ہے۔ وَاِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو اس کی خبر دے دی تھی۔ تو اب معنی یہ ہوئے۔ کہ وہ سورتیں جو اس سے پہلے آچکیں یا جو آئیں گی یا جو لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہیں۔ وہ یہ کتاب ہے۔ **یہ بھی ہو سکتا ہے**۔ کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ مبتدا ہوا اور لَا رَیْبَ اُس کی خبر تو اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ کتاب وہ ہے جس میں کوئی شک نہیں **الکتاب** کتاب كَتَبَ سے بنا ہے۔ اور اس کے چند معنی ہیں۔ جمع ہونا۔ اسی لئے لشکر کو کتیبہ کہتے ہیں۔ کیوں کہ اُس میں بہت سے انسان جمع ہوتے ہیں۔ (۲) لازم کرنا کُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ (۳) دلیل اور حجت فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ (۴) میعاد یا مدت وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ (۵) غلام کو مکاتب کرنا یعنی اُس سے کہنا۔ کہ تو اتنا مال دے۔ تو تو آزاد ہے۔ وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ (۶) لکھنا اور لکھی ہوئی چیز اس جگہ یا تو پہلے معنی مراد ہیں یا آخری۔ اگر پہلے مراد ہوں۔ تو اس کے معنے یہ ہوں گے۔ کہ یہ جمع کی ہوئی چیز ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں سارے علوم جمع ہیں۔ تو گویا کامل کتاب یہی ہے۔ اگر آخری معنے مراد ہوں تو مطلب یہ ہو گا۔ کہ یہ لکھی ہوئی چیز ہے۔ یعنی لکھنے میں کامل یہی کتاب ہے۔ اس کے سوا سب ناقص اس لئے کہ سب سے پہلے یہ لوح محفوظ میں لکھی گئی۔ پھر پہلے آسمان پر۔ پھر مسلمانوں کے سینوں میں اور ہڈیوں۔ پتھروں وغیرہ پر پھر کاغذ پر اور کاغذ پر اس قدر لکھی گئی۔ کہ اس کی مثال کوئی دوسری کتاب ہو سکتی ہی نہیں۔ کیونکہ انسان جو بھی کتاب لکھتا ہے۔ وہ دو چار یا دس بیس دفعہ چھپ کر ختم ہو جاتی ہے۔ توریت و انجیل وغیرہ بھی چند بار لکھی گئی اور اب ختم ہو چکیں۔ لیکن قرآن پاک نے اس زمانہ میں بھی دنیا بھر کے پریسوں پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ اس وقت صرف لاہور سے پچاس لاکھ سالانہ اس کی اشاعت ہے۔ نہ معلوم کہ ہندوستان کے دیگر پریسوں میں ہر سال کتنا چھپتا ہو گا اب اندازا لگاؤ کہ ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک مصر۔ استنبول۔ بیروت۔ عراق۔ حجاز وغیرہ سے کس قدر اس کی اشاعت ہو گی۔ ماننا پڑے گا۔ کہ لکھنے اور چھپنے کے لحاظ سے بھی یہی کتاب مکمل ہے۔ "روح البیان" شریف نے اس جگہ بیان فرمایا۔ کہ توریت شریف کی ایک ہزار سورتیں تھیں اور ہر سورۃ میں ایک ہزار آیتیں۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا۔ کہ اے مولا اس کتاب کو کون پڑھ سکے گا۔ اور کون حفظ کر سکے گا۔ تو ارشاد باری ہوا۔ کہ

میں اس سے اعلیٰ شان والی کتاب نبی آخر الزمان پر اتاروں گا. لیکن ان کی امت کے بچوں تک کو یاد کرادوں گا نیز اسی روح البیان شریف میں ہے کہ اس سے پہلے کل آسمانی کتابیں ایک سو تین اتریں. پچاس صحیفے شیث علیہ السلام پر. اور تیس ادریس علیہ السلام پر اور بیس ابراہیم علیہ السلام پر توریت موسیٰ علیہ السلام اور زبور داؤد علیہ السلام پر اور انجیل عیسیٰ علیہ السلام پر. لیکن ان تمام کتابوں کے مضامین اس قرآن پاک میں جمع ہیں۔ لہذا یہ کتاب ان تمام کتابوں کی جامع ہے. اس لئے کہا گیا ذٰلِكَ الْكِتٰبُ قرآن پاک کے نام. تفسیر کبیر اور تفسیر عزیزی وغیرہ میں ہے کہ قرآن پاک کے ۳۲ نام ہیں. جو کہ قرآن کریم میں مذکور ہیں. (۱) کتاب (۲) قرآن (۳) فرقان (۴) ذکر و تذکرہ (۵) تنزیل (۶) الحدیث (۷) موعظة (۸) حکم حکمت حکیم محکم (۹) شفاء (۱۰) ہدیٰ (۱۱) صراط مستقیم (۱۲) حبل (۱۳) رحمت (۱۴) روح (۱۵) قصص (۱۶) بیان تبیان (۱۷) بصائر (۱۸) فصل (۱۹) نجوم (۲۰) مثانی (۲۱) نعمت (۲۲) برہان (۲۳) بشیر نذیر (۲۴) قیم (۲۵) مہیمن (۲۶) ہادی (۲۷) نور (۲۸) حق (۲۹) عزیز (۳۰) کریم (۳۱) عظیم (۳۲) مبارک یہ تمام نام قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں مذکور ہیں. وہ آیتیں یا تو کسی حافظ سے معلوم کرلی جائیں. یا تفسیر کبیر و عزیزی میں اسی مقام پر دیکھ لی جائیں.

(ان ناموں کی وجہ) قرآن و فرقان کے معنی اور ان کی وجہ تسمیہ تو ہم مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں. کتاب کے معنے بھی ابھی بیان کر دیئے باقی ناموں کی وجہ تسمیہ حسب ذیل ہے (۴) ذکر و تذکرہ کے معنی ہیں. یاد دلانا. چونکہ یہ قرآن کریم اللہ اور اس کی نعمتوں کو اور میثاق کے عہد کو یاد دلاتا ہے. اس لئے اس کو ذکر و تذکرہ کہتے ہیں. (۵) تنزیل کے معنی ہیں اتاری ہوئی کتاب. چونکہ یہ بھی رب کی طرف سے اتاری گئی ہے. اس لئے تنزیل کہتے ہیں (۶) حدیث اس کے معنے ہیں نئی چیز یا کلام اور بات چونکہ بمقابلہ توریت و انجیل کے یہ دنیا میں زمین پر بعد میں آیا. اس لئے یہ نیا ہے نیز یہ پڑھا ہوا اترا نہ کہ لکھا ہوا. اس لئے یہ بات ہے (۷) موعظة کے معنی نصیحت کے ہیں. اور یہ کتاب سب کو نصیحت کرنے والی ہے. اس لئے اس کا نام موعظة ہے. (۸) حکمت حکم محکم یہ حکم سے بنے ہیں. اس کے معنے ہیں مضبوط کرنا. لازم کرنا اور روکنا چونکہ یہ قرآن پاک مضبوط بھی ہے. کہ کوئی اس میں تحریف نہ کر سکا. اور لازم بھی ہے. کہ کسی کتاب نے اس کو منسوخ نہ کیا. اور بری باتوں سے روکنے والا بھی ہے. اس لئے اس کے یہ نام ہوئے. (۹) شفا اس لئے کہتے ہیں. کہ یہ ظاہری و باطنی بیماریوں سے سب کو شفا دینے والی کتاب ہے. (۱۰) ہدیٰ. ہادی اس لئے کہتے ہیں. کہ یہ لوگوں کو ہدایت کرتی ہے. (۱۱) صراط مستقیم اس لئے کہتے ہیں. کہ اس پر عمل کرنے والا اپنی منزل مقصود پر آسانی سے پہنچ جاتا ہے (۱۲) حبل اس لئے کہتے ہیں. کہ حبل کے معنی ہیں رسی اور رسی سے تین کام لئے جاتے ہیں. اس سے چند بکھری ہوئی چیزوں کو باندھ لیتے ہیں. رسی کو پکڑ کر نیچے سے اوپر پہنچ جاتے ہیں. رسی ہی کے ذریعہ کشتی پار لگ جاتی ہے. چونکہ قرآن کے ذریعے مختلف لوگ ایک ہو گئے. اسی طرح اس کی برکت سے کفر کے دریا میں ڈوبنے سے بچ جاتے ہیں. اور اسی کے ذریعے سے حق تعالیٰ تک پہنچتے ہیں. اسی لئے اس کو حبل کہتے ہیں. (۱۳) رحمت اس لئے کہتے ہیں. کہ یہ علم ہے. اور جہالتوں اور گمراہیوں سے نکالنے والا ہے. اور علم حق تعالیٰ کی رحمت ہے. (۱۴) روح حضرت جبریل علیہ السلام کا بھی نام ہے. اور جان کو بھی روح کہتے ہیں چونکہ یہ کتاب حضرت جبریل علیہ السلام کی معرفت آئی اور یہ جانوں کی زندگی ہے. اس لئے اس کو روح کہتے ہیں. (۱۵) قصص. قصے کے دو معنے ہیں حکایت اور کسی کے پیچھے چلنا چونکہ قرآن پاک نے انبیاء کرام اور دوسری قوموں کے سچے قصے بیان کئے. اور لوگوں کا یہ امام ہے. کہ سب لوگ اس کے پیچھے چلتے ہیں. اس لئے اس کا نام قصص ہے (۱۶) بیان تبیان مبین. ان سب کے معنی ہیں ظاہر کرنے والا چونکہ یہ قرآن سارے شرعی احکام کو اور سارے علوم غیبیہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر فرمانے والا ہے. اس لئے اس کے یہ نام ہیں. (۱۷) بصائر. جمع بصیرت کی ہے. بصیرت کہتے ہیں دل کی روشنی کو جیسے کہ بصارت آنکھ کے نور کو کہا جاتا ہے. چونکہ اس کتاب سے دلوں میں صدہا قسم کے نور پیدا ہوتے ہیں. اس لئے اسے بصائر بھی کہا جاتا ہے (۱۸) فصل کے معنی ہیں فیصلہ کرنے والی یا جدا کرنے والی چونکہ یہ آپس کے جھگڑوں کی فیصلہ کرنے والی بھی ہے. اور مسلمانوں اور کفار میں فاصلہ فرمانے والی اس لئے اس کا نام فصل ہے (۱۹) نجوم نجم سے بنا ہے. اس کے معنی تارے کے بھی ہیں. اور حصہ کے بھی ہیں. چونکہ قرآن پاک کی آیتیں تاروں

کی طرح لوگوں کو ہدایت کرتی ہیں۔ اور علیحدہ علیحدہ آئیں اس لئے اس کا نام نجوم ہؤا۔ (۲۰) مثانی جمع ہے مثنٰی کی مثنٰی کے معنی ہیں بار بار کیونکہ اس میں احکام اور قصّے بار بار آئے ہیں۔ اور یہ کتاب خود بھی بار بار اتری ہے جیسا کہ ہم مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں۔ اس لئے اس کو مثانی کہتے ہیں۔ (۲۱) نعمت کے معنی ظاہر ہیں (۲۲) برہان کے معنی ہیں دلیل اور یہ بھی رب کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق کی دلیل ہے۔ اس لئے اسے برہان کہتے ہیں۔ (۲۳) بشیر و نذیر ہونا ظاہر ہے کیونکہ یہ کتاب خوشخبری بھی دیتی ہے۔ اور ڈراتی بھی ہے۔ (۲۴) قیم کے معنی ہیں۔ قائم رہنے والی یا قائم رکھنے والی۔ اس لئے اللہ کو قیوم کہتے ہیں۔ قرآن پاک کو اس لئے قیم کہا جاتا ہے۔ کہ وہ خود بھی قیامت تک قائم رہے گا۔ اور اس کے ذریعہ سے دین بھی قائم رہے گا۔ (۲۵) مہیمن کے معنے ہیں۔ امانت دار یا محافظ چونکہ یہ کتاب مسلمانوں کی دنیا و آخرت میں محافظ ہے۔ اور رب تعالیٰ کے احکام کی امانت دار اور نبی امین پر اتری۔ اور ان صحابہ کرام کے ہاتھوں میں رہی جو کہ اللہ کے امین تھے۔ اس لئے اس کو مہیمن کہا گیا۔ (۲۶) ہادی کے معنے بالکل ظاہر ہیں۔ (۲۷) نور اسے کہتے ہیں جو خود ظاہر ہو۔ اور دوسروں کو ظاہر کرے جس کا ترجمہ ہے چمک یا روشنی چونکہ یہ قرآن پاک خود بھی ظاہر ہے۔ اور اللہ کے احکام کو انبیاء کرام کو توریت و انجیل وغیرہ سب کو ظاہر فرمانے والا ہے۔ اس لئے اس کو نور کہا گیا جن پیغمبروں کے نام قرآن نے بتا دیئے وہ سب میں ظاہر اور مشہور ہو گئے۔ اور جن کا قرآن کریم نے ذکر نہ فرمایا۔ وہ بالکل چھپ گئے نیز یہ قرآن کریم پل صراط پر نور بن کر مسلمانوں کے آگے آگے چلے گا (۲۸) حق۔ اس کے معنی ہیں سچی بات بمقابل باطل یعنی جھوٹی بات۔ قرآن پاک سچی بات بتاتا ہے۔ سچے کی طرف سے آیا سچا اس کو لایا۔ سچے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا۔ اس لئے اسے حق کہتے ہیں۔ (۲۹) عزیز کے معنی ہیں۔ غالب اور بے مثل قرآن پاک بھی سب پر غالب رہا۔ اور اب بھی سب پر غالب ہے۔ اور بے مثل بھی ہے۔ اس لئے اس کو عزیز کہا جاتا ہے۔ (۳۰) کریم۔ اس کے معنی ہیں سخی۔ چونکہ قرآن کریم علم خدا کی رحمت اور ایمان اور بے حساب ثواب دیتا ہے۔ اس لئے اس سے بڑھ کر سخی کون ہو سکتا ہے (۳۱) عظیم کے معنے ہیں بڑا۔ چونکہ سب سے بڑی کتاب یہی ہے۔ اس لئے اس کو عظیم فرمایا گیا۔ **نوٹ ضروری** رب تعالیٰ نے چند چیزوں کو عظیم فرمایا ہے۔ اپنی ذات کو۔ عرش کو۔ قرآن کو۔ قیامت کے دن کو۔ قیامت کے زلزلہ کو۔ حضور علیہ السلام کے اخلاق کریمہ کو۔ اللہ کے اس فضل کو جو حضور علیہ السلام پر ہؤا۔ عورتوں کے فریب کو۔ فرعونی جادوگروں کے جادو کو۔ اور مسلمانوں کے ثواب کو۔ منافقوں کے عذاب کو۔ (۳۲) مبارک کے معنی ہیں برکت والا۔ چونکہ اس کے پڑھنے اور عمل کرنے سے ایمان میں برکت۔ نیک عملوں میں برکت۔ عزت میں۔ آبرو میں۔ چہرے کے نور میں برکت ہے۔ اس لئے اس کو مبارک کہتے ہیں۔ **فائدہ** قرآن کریم نے چند چیزوں کو مبارک فرمایا۔ طور سینا کو۔ جہاں موسیٰ علیہ السلام رب سے ہم کلام ہوئے۔ زیتون کے درخت کو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔ بارش کے پانی کو۔ اور شب قدر کو اور قرآن کو چونکہ یہ قرآن مبارک رات میں مبارک فرشتے کے ذریعہ سے مبارک ذات پر آیا۔ اس لئے یہ صدہا برکتوں کا سرچشمہ ہے۔ **تتمہ** ربّ تعالیٰ نے سات چیزوں کو کریم فرمایا (۱) اپنی ذات کو (۲) قرآن شریف کو (۳) موسیٰ علیہ السلام کو (۴) نیک اعمال کے ثواب کو (۵) عرش کو (۶) حضرت جبریل علیہ السلام کو (۷) حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس خط کو جو بلقیس کے پاس گیا تھا۔ **اعتراض** ذٰلِكَ اسم اشارہ ہے۔ اور اس کا استعمال دور کی چیزوں میں ہوتا ہے۔ اور اشارہ کیلئے ضروری ہے۔ کہ جس طرف اشارہ ہو وہ نظر آتی ہو جب یہ فرمایا گیا تب سارا قرآن کریم نظر نہیں آ رہا تھا۔ نیز وہ دور بھی نہ تھا۔ تو یہاں ذٰلِكَ کا استعمال کیونکر صحیح ہؤا **جواب** اس کا جواب تفسیر کبیر شریف نے یہ دیا ہے۔ کہ اشارہ کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ وہ چیز نظر آ رہی ہو۔ اگر کسی موقعہ پر سننے والے کے خیال میں وہ بات ہو۔ تو بھی اس خیالی چیز کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ جیسے کہ قرآن کریم نے قیامت کے بارے میں فرمایا۔ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ یا نزع کی سختی کے متعلق فرمایا۔ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ لیکن یہ ضروری ہے۔ کہ وہ چیز ذہن میں محسوس ہو جائے۔ تب اس کی طرف اشارہ کیا جائے گا۔ **نیز** یہ ضروری نہیں کہ ذٰلِكَ دوری کے لئے آئے اور هٰذَا قریب ہی کے لئے بلکہ ذٰلِكَ بھی قریب کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ذٰلِكَ اور هٰذَا دونوں لفظ ذا سے بنے ہیں۔ فرق اتنا ہے۔ کہ هٰذا میں ذا پر ھا بڑھا دیا گیا۔ اور ذٰلِكَ میں لك

لہذا یہاں ذٰلِكَ قریب کے لئے استعمال ہوا ہے یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ چونکہ ذٰلِكَ سے اُس کتاب کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جو کہ لوح محفوظ یا توریت و انجیل میں مذکور ہے۔ اور یہ چیزیں تو سننے والوں سے دور ہیں اس لئے بعید کا کلمہ بول دیا گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ عظیم الشان چیز کی طرف بعید سے اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ گویا اُس کے مرتبے کی بلندی زیادتی فاصلہ کے قائم مقام ہے۔ اس لئے بھی یہاں ذٰلِكَ بول دیا گیا۔ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔ تعلق ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے یا تو اس کا تعلق یہ ہے۔ کہ وہ مبتدا تھی اور یہ خبر ہے۔ تو آیت کے یہ معنے ہوئے کہ یہ کتاب وہ ہے جس میں کوئی شک نہیں یا ذٰلِكَ الْكِتٰبُ علیحدہ جملہ تھا۔ اور یہ دوسرا جملہ ہے۔ تو اس کے معنے یہ ہوں گے۔ کہ یہی کامل کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اب لَا رَيْبَ فِيْهِ میں بھی دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ لَا رَيْبَ پر آیت پوری ہو جائے۔ اور فِيْهِ کا تعلق هُدًى سے ہو۔ تو آیت کے معنے یہ ہوں گے۔ کہ یہی کامل کتاب ہے بیشک۔ اس میں پرہیزگاروں کو ہدایت ہے۔ دوسرے یہ کہ فِيْهِ پر آیت پوری ہو۔ اور هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ دوسری آیت ہو۔ تو اب معنی یہ ہوں گے۔ کہ یہی کامل کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے متقیوں کو ہدایت دینے والی ہے۔ تفسیر لَا نفی جنس ہے۔ نفی جنس اُسے کہتے ہیں جو اصل چیز کا انکار کر دے۔ تو اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ اس میں اصل سے ہی شک نہیں ہے یعنی کسی قسم کے شک کی اس میں گنجائش نہیں رَيْبَ رَيْبَةٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں قلق اور پریشانی اور نئی بلا اسی لئے کہا جاتا ہے۔ رَيْبُ الزَّمَانِ یعنی زمانے کی مصیبتیں اصطلاح میں اُس شک کو رَيْب کہتے ہیں جس میں بدگمانی شامل ہو۔ تو شک اور ریب میں یہ فرق ہوا کہ شک تو تردد کو کہتے ہیں یعنی کسی بات کا یقین نہ کرنا۔ اور ریب وہ شک جس میں بدگمانی پائی جائے چونکہ ریب میں بھی دل کو پریشانی اور بے اطمینانی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو ریب کہا جاتا ہے۔ تو اب کلام کا مقصود یہ ہے۔ کہ قرآن پاک اپنے کلام الٰہی ہونے میں اس قدر ظاہر ہے۔ کہ اس میں شک کی گنجائش نہیں۔ یا اس کے کلام اللہ ہونے پر اس قدر دلائل قائم ہیں۔ کہ جن کے ہوتے ہوئے۔ شک کی گنجائش نہیں۔ ایک یہ کہ قرآن پاک اُس ملک میں آیا جہاں کے باشندوں کو اپنی زباندانی۔ فصاحت و بلاغت پر ناز تھا۔ جو اپنے کو عربی اور دوسروں کو عجمی کہتے تھے۔ عربی کے معنے ہیں بولنے والا۔ ظاہر کرنے والا عجمی کے معنی ہیں گونگا۔ اسی لئے بے زبان جانوروں کو عجماء کہتے ہیں۔ اور قرآن نے سب کو اپنے مقابلے کی دعوت دی مگر کوئی مقابلہ نہ کر سکا۔ اور جس کا مقابلہ نہ ہو سکے۔ وہ کتاب الٰہی ہے۔ دوسرے اس لئے کہ جس ذات پر قرآن کریم آیا۔ اُن کے پاس اس قرآن کریم کی اشاعت کا کوئی ظاہری سامان نہ تھا۔ نہ مال تھا۔ نہ یار و مددگار۔ نہ زیادہ قرابت دار۔ نہ والد کا سایہ۔ نہ ماں کی گود۔ نہ دادا کی میٹھی میٹھی نگاہیں۔ جو قرابت دار تھے بھی وہ جانی دشمن۔ پھر ایسے وقت میں آیا جبکہ اشاعت کا کوئی دنیوی انتظام نہ تھا۔ نہ ریڈیو۔ نہ بجلی۔ نہ پریس بلکہ نہ باقاعدہ کاغذ اور نہ دوات و قلم پھر اس قدر بے سروسامانی کے باوجود اتنی تھوڑی مدت میں اُس کا اس قدر پھیلنا۔ کلام الٰہی ہونے کی قوی دلیل ہے تیسرے یہ کہ جن لوگوں میں قرآن مجید آیا۔ وہ دنیوی تہذیب سے بالکل ناآشنا تھے۔ گویا یوں کہو کہ علم و تہذیب اُن تک پہنچے ہی نہ تھے۔ ڈکیتی۔ چوری۔ زنا۔ خونریزی۔ جنگ و جدال اُن کی پیدائشی عادتیں تھیں۔ ایسی قوم میں قرآن پاک اترا اور صرف تئیس سال بلکہ حق یہ ہے۔ کہ دس سال کے عرصہ میں صرف انہیں کی نہیں بلکہ سارے عالم کی کایا پلٹ دی۔ چوروں کو پاسبان۔ ڈاکوؤں کو عادل و منصف۔ اور بے تہذیبوں کو دنیا کی تہذیب کا اُستاد۔ بے علموں کو علمِ لدنی کا ماہر بنا دیا۔ بلکہ یوں کہو۔ کہ انہیں بے پڑھوں میں سے کسی کو صدیق کسی کو فاروق کسی کو ذوالنورین اور کسی کو حیدر بنا دیا۔ ایک بچے کو صرف بی۔ اے پاس کرانے میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔ اور بہت سا مال خرچ ہوتا ہے۔ یہ کونسا مکتب تھا۔ اور کیسا معلم تھا۔ اور کونسی کتاب پڑھائی۔ کہ جس نے آناً فاناً انہیں ہر بات میں کامل کر دیا۔ چوتھے یہ کہ اس کی چھوٹی چھوٹی آیتیں بھی فصاحت و بلاغت اور مسائل اور حکمتوں کا سرچشمہ ہیں حضرت امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف اَعُوْذُ سے دس ہزار مسائل نکالے ہیں۔ ایک بزرگ نے بسم اللہ کی تقریباً چار لاکھ ترکیبیں کی ہیں۔ ایک بزرگ نے اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ سے بہت سے مسئلے نکالے۔ اور یہ جامعیت اس بات کی کھلی دلیل ہے۔ کہ قرآن پاک کلام الٰہی ہے۔ پانچویں۔ اس لئے کہ اسکی آیتوں میں ایسی کشش ہے۔ کہ نا سمجھنے

والے لوگ بھی اس کو سُن کر رونے لگتے ہیں۔ اور اُن کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جب صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآن پاک کی تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ تو مشرکین کے بچے اور عورتیں اُن کے آس پاس جمع ہو کر گریہ وزاری کرتے تھے۔ اب بھی دیکھا گیا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص عمدہ طریقہ سے اس کی تلاوت کرے۔ تو غیر مسلموں کو بھی وجد آجاتا ہے۔ چھٹے اس لئے کہ بڑے بڑے عرب کے نامور فصیح و بلیغ عالم جب اس کا مقابلہ کرنے کے لئے آتے تھے۔ تو اس کو سن کر سجدہ کر دیتے تھے۔ اگر انسان میں تھوڑی سی عقل ہو۔ تو ان اوصاف کو دیکھ کر اس کے کلام الٰہی ہونے میں ہرگز شک نہ کرے۔ تعصب اور عناد کا کوئی علاج نہیں **نکتہ لَا رَیْبَ فِیْهِ** سے اس جانب اشارہ ہے۔ کہ چونکہ یہ کلام اللہ کا ہے۔ اور حق تعالیٰ جھوٹ سے پاک ہے یعنی اُس کا جھوٹ بولنا محال بالذات ہے۔ لہٰذا اس کلام کے سچے ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ بڑے سے بڑا سچّا آدمی بعض دفعہ غلط بیانی یا مبالغہ سے کام لے لیتا ہے۔ یہ کلام ان چیزوں سے پاک ہے۔ اس سے دیوبندی مذہب کی تردید ہو گئی۔ کیونکہ اُن کے مذہب میں خدا کا جھوٹ بولنا ممکن ہے۔ جب خدا کا جھوٹ ممکن ہؤا۔ تو اس کا سچّا ہونا ضروری نہ رہا۔ اُس کے کلام میں جھوٹ کا امکان واحتمال پیدا ہو گیا۔ اور یہ لَا رَیْبَ فِیْهِ کے خلاف ہے۔ ان عقلمندوں کے مذہب میں خدا کی سچائی کی تعریف جب ہی ہو سکتی ہے۔ جبکہ خدا جھوٹ بول سکے۔ مگر بولے نہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہ دیکھو گونگے کے جھوٹ نہ بولنے کی تعریف نہیں۔ کیونکہ وہ تو بول سکتا ہی نہیں۔ شاید یہ لوگ اس قاعدے سے سارے عیبوں کو خداوند تعالیٰ کے لئے ممکن مان لیں۔ موت۔ جہالت وغیرہ کہ جب خدا اِن پر قادر ہو۔ اور ان کو استعمال نہ کرے۔ تو اُس کی تعریف ہو۔ حق تعالیٰ جب دین لیتا ہے۔ تو عقل بھی چھین لیتا ہے۔ اس مسئلے کی تحقیق عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ میں انشاء اللہ کی جائے گی۔ **آریوں کا اعتراض** اس جگہ آریہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ قرآن کریم تو فرما رہا ہے۔ کہ قرآن میں شک نہیں۔ لیکن کفار کو اس میں شک مسلمانوں کے بہت فرقوں کو اس کے معنی میں شک۔ چنانچہ بعض فرقوں نے متشابہات کے ظاہری معنی ہی مراد لئے ہیں علمائے اسلام کو بھی بہت سے موقعوں پر شک ہو جاتا ہے۔ اسی لئے مفسرین میں بھی اور فقہا میں بھی آپس میں اختلاف رہتا ہے۔ قاری بھی قرائتوں میں اختلاف رکھتے ہیں۔ غرضکہ کفار کو تو اس کے کلام الٰہی ہونے میں شک اور مسلمانوں کے گمراہ فرقوں کو اس کے معانی میں شک۔ علمائے کرام کو اس کی توجیہوں میں شک۔ قاریوں کو اُس کی عبارت میں شک عام لوگوں کو اُس کے سمجھنے میں شک۔ اتنے شکوک کے ہوتے ہوئے۔ پھر شک کی نفی کیوں کی گئی۔ اور لطف یہ ہے۔ کہ قرآن کریم نے بھی ایک جگہ ارشاد فرمایا۔ کہ وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس میں لوگوں کو شک ہؤا۔ اور اُس کو دفع کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب یہ دونوں آیتیں مطابق کیونکر ہوں۔ **نوٹ** جس عمدہ طریقہ سے ہم نے اس اعتراض کو بیان کیا ہے۔ انشاء اللہ معترضین بھی اس طرح بیان نہ کر سکیں گے۔ **جواب** اس کا سب سے بہتر جواب وہ ہے۔ جو اسی مقام پر تفسیر روح البیان شریف میں دیا گیا۔ وہ یہ کہ اس آیت میں شک کی نفی کتاب سے کی گئی ہو۔ نہ کہ لوگوں سے یعنی یہ کتاب شک کی جگہ نہیں۔ اگر لوگوں کے دلوں میں شک ہو تو اُس کا یہاں انکار نہیں۔ اس جواب کی تفصیل یہ ہے۔ کہ شک کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ خود وہ کلام ہی مشکوک ہو دوسرے یہ کہ کلام تو سچّا تھا مگر لوگ اپنی بے علمی یا ضد کی وجہ سے اُس میں شک کرنے لگے۔ جیسے کہ سچّی بات کو لوگ جھوٹ کہنے لگیں۔ تو اُس سے وہ بات تو سچی ہی رہی مگر سننے والوں نے اپنی کم علمی یا ہٹ دھرمی سے اُس کو جھوٹ کہہ دیا۔ اسی طرح یہاں ہے۔ کہ قرآن فی نفسہٖ سچّا ہے۔ لیکن کفار نے تعصب کی وجہ سے اُس میں شک کیا علمائے ربّانی کا اختلاف اُن کی کمی علم کی بناء پر ہے۔ یعنی اُن کو تحقیق نہ ہو سکی۔ کہ فلاں آیت کے کونسے معنے یقینی ہیں۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ میں انسان کا شک بیان ہؤا ہے نہ کہ کتاب کا۔ نفی کتاب کے شک کی ہے۔ اور ثبوت انسانوں کے شک کا اسی لئے اس آیت میں ہے۔ لَا رَیْبَ فِیْهِ یعنی اس کتاب میں شک نہیں۔ اور وہاں فرمایا گیا۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ۔ یعنی اے کفار اگر تم شک میں ہو۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ۙ **تعلق**۔ یا تو هُدًى مبتدا ہے اور اس کی خبر فِیْهِ تو یہ مصدری معنی میں ہے۔ اب اس کے معنی

یہ ہوں گے کہ اس قرآن پاک میں پرہیز گاروں کو ہدایت ہے یا یہ علیحدہ جملہ ہے۔ اب یہ ھُدًی یا مصدری معنی میں ہے۔ یا اسم فاعل کے معنی میں۔ اس کے معنی یا تو یہ ہیں۔ کہ یہ قرآن پاک از اوّل تا آخر پرہیز گاروں کے لئے ہدایت ہے۔ یا یہ ہدایت دینے والا ہے۔ **تقسیر** ہدایت کے معنی اور اس کے اقسام ہم سورہ فاتحہ میں بیان کر چکے ہیں۔ متقی وَقیٰ اور وِقَایَۃٌ سے بنا ہے جس کے معنے ہیں حفاظت اور پردہ شریعت میں تقویٰ اسے کہتے ہیں۔ کہ انسان اُن کاموں سے بچے جو اُس کے لئے آخرت میں نقصان دہ ہوں۔ تو آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ یہ قرآن کریم اُن لوگوں کو ہدایت دینے والا ہے جو پرہیز گار ہیں۔ تقویٰ کے تین درجے ہیں۔ ایک دائمی عذاب سے بچنا۔ اس لحاظ سے ہر مسلمان متقی ہے۔ دوسرے عام گناہوں سے بچنا۔ اور عام طور پر تقویٰ کے یہی معنی مراد ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے پرہیز گار لوگ متقی ہیں تیسرے اُس چیز سے بچنا جو حق تعالیٰ سے روکے اس لحاظ سے اولیاء اللہ اور انبیاء کرام متقی ہیں۔ اس آخری درجہ کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ دنیوی چیز دل سے بے تعلقی رکھی جائے۔ جیسا کہ تارک الدنیا۔ فقراء اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے کر کے دکھایا۔ دوسرے یہ کہ تعلق سب سے ہو۔ مگر دل کا تعلق رب سے ہو۔ گویا یہ چیزیں اُن کے لئے آڑ ہی نہ رہیں "دل بیار اور دست بکار" کی جلوہ گری ہو۔ جیسے کہ حضور غوث پاک اور اُن اولیاء کرام کا طریقہ مبارک رہا۔ جو کہ دنیوی کاروبار سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جیسے کہ حضرت سلیمان و یوسف علیہما السلام نے عمل فرما کر ظاہر فرمایا۔ یہ قرآن مجید ہر درجہ کے متقی کے لئے اُسی کے لائق ہدایت ہے۔ لہٰذا عام لوگوں کو تو اسلام اور ایمان کی ہدایت ہے۔ اور خاص لوگوں کے لئے۔ ایقان اور احسان کی ہدایت اور خاص الخاص حضرات کے لئے حجاب کے دور کرنے اور جمال یار کے مشاہدے کی ہدایت۔ قرآن کریم میں تقویٰ چند معنی میں مذکور ہوا ہے۔ ایمان۔ توبہ۔ فرمانبرداری۔ گناہ چھوڑنا۔ اخلاص **تقویٰ کے فوائد** حقیقت یہ ہے۔ کہ تقویٰ نہایت ضروری چیز ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا۔ کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ عزّت والا وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار ہو۔ ایک جگہ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا یعنی اللہ پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرماتا ہے۔ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ ط یعنی جو شخص اللہ سے ڈرے گا۔ خدا تعالیٰ اُسے ہر مصیبت سے چھٹکارا عطا فرمائیگا اور اُس طرح اس کو رزق دے گا۔ کہ جو اُس کے خیال میں بھی نہ آئے۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ تقویٰ اور پرہیز گاری دین دنیا میں کام آنے والی چیز ہے۔ تفسیر کبیر نے سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ جو شخص چاہتا ہے۔ کہ لوگوں میں اُس کی عزّت ہو وہ اللہ سے ڈرے اور پرہیز گاری اختیار کرے۔ حضرت شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے بوستاں میں فرمایا ؎

تو ہم گردن از حکمِ داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

یعنی تو حق تعالےٰ کے حکم سے منہ نہ موڑ تو تیرے حکم سے کوئی چیز بھی سر نہ پھیرے گی۔ بعض اولیاء اللہ کو دیکھا گیا۔ کہ جانور اور کنکر وغیرہ بھی اُن کی اطاعت کرتے ہیں کیوں؟ صرف اس لئے کہ وہ اللہ کے سچے فرمانبردار ہیں۔ **تقوے کی علامتیں** تقوے کی مختلف علامتیں مختلف حضرات سے منقول ہیں۔ جو کہ تفسیر کبیر اور تفسیر عزیزی وغیرہ میں بیان کی گئی ہیں۔ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ متقی کی پہچان یہ ہے۔ کہ وہ گناہ پر قائم نہ رہے۔ اور اپنی عبادت پر غرور نہ کرے۔ حسن بصری فرماتے ہیں۔ کہ متقی وہ ہے۔ کہ اللہ کے مقابلے میں غیر اللہ کو اختیار نہ کرے۔ اور ساری چیزیں اللہ کے قبضے میں جانے۔ ابراہیم ابن ادھم فرماتے ہیں۔ کہ تقویٰ یہ ہے۔ کہ خلق تیری زبان میں اور ملائکہ تیرے کاموں میں اور پروردگار تیرے دل میں عیب نہ پائے۔ حضرت واقدی فرماتے ہیں۔ کہ تقویٰ یہ ہے۔ کہ جس طرح تو اپنے بدن کو خلقت کے لئے لباس وغیرہ سے آراستہ کرتا ہے۔ ایسے ہی اپنے دل کو حق تعالیٰ کے لئے آراستہ کر۔ حدیث میں یہ آتا ہے۔ کہ متقی وہ ہے۔ جو شبہ کی چیزوں سے بچے۔ جیسے کہ ابن سیرین رضی اللہ عنہ کے پاس چالیس گھڑے گھی تھا۔ غلام نے خبر دی۔ کہ ایک گھڑے سے مرا ہوا چوہا نکلا ہے۔ پوچھا کون سے گھڑے سے عرض کیا۔ کہ یہ مجھے یاد نہ رہا۔ فرمایا سب گھڑوں کا گھی پھینک دو۔ چونکہ سب میں شبہ

پیدا ہو گیا۔ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ اپنے کسی مقروض کے مکان پر قرض کے تقاضے کے لئے گئے سخت دھوپ تھی اور تیز گرمی۔ لیکن اُس کی دیوار کے سائے میں نہ کھڑے ہوئے بلکہ دھوپ میں کھڑے رہے کسی نے عرض کیا کہ اے امام دھوپ تیز ہے سائے میں آجایئے فرمایا میں خوف کرتا ہوں کہ یہ سایہ لینا سود نہ بن جائے (روح البیان) صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ متقی وہ ہے جو کہ اپنے یوم میثاق کے وعدے کو پورا کرے جس کے متعلق قرآن پاک فرماتا ہے۔ اَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ تم میرا وعدہ پورا کرو۔ میں تمہارا وعدہ پورا کرونگا اور اس کی علامت یہ ہے۔ کہ بلا پر صابر اور نعمتوں پر شاکر قضا سے راضی قرآن پاک کے سامنے جھکا ہوا رہے۔ **اعتراض** اس جگہ چند اعتراض ہیں۔ آریوں کا اعتراض یہ ہے۔ کہ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن کریم اُن کو ہدایت دے گا۔ جو پہلے سے پرہیزگار بن چکے ہوں۔ حالانکہ چاہیئے کہ قرآن کریم گمراہوں کو ہدایت دے۔ کیونکہ جو پرہیزگار بن چکا۔ اسے ہدائت کی کیا ضرورت رہی **جواب** اس کے چند جواب ہیں۔ سب سے بہتر جواب تو وہ ہے جو تفسیر عزیزی نے دیا۔ وہ یہ کہ اس کے معنے یہ نہیں ہیں۔ کہ جو متقی بن چکے ہیں۔ انہیں قرآن پاک ہدایت دے گا یا دے رہا ہے۔ بلکہ یہ معنی ہیں۔ کہ جو متقی نظر آرہے ہیں۔ انہیں قرآن کریم نے ہدایت دی ہے اور یہ اُس کی ہدایت سے متقی بنے۔ تو گویا یہ گزرے ہوئے زمانہ میں متقیوں کو ہدایت دے چکا۔ فرمایا یہ جارہا ہے۔ کہ مسلمانو کیا جانتے ہو۔ کہ قرآن کریم کی کیا شان ہے۔ یہ جو تم کو صدیق و فاروق اور مہاجرین و انصار متقی و ابرار نظر آرہے ہیں۔ یہ سب اس قرآن کریم کی ہدایت کا ہی کرشمہ ہے۔ انہیں جو کچھ ملا ہے۔ قرآن کریم سے ہی ملا ہے۔ تو گویا قرآن کریم نے ان حضرات کے زہد و تقویٰ و پرہیزگاری کو اپنے ہادی ہونے کا مظہر قرار دیا۔ اور یہ فرمایا۔ کہ اگر میری ہدایت دیکھنی ہے۔ تو میرے لانیوالے صلی اللہ علیہ وسلم کے یاروں کو دیکھو۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ کوئی شخص کسی عورت کی طرف اشارہ کر کے کہے کہ یہ دودھ پلانے والی عورت اس جوان کی ماں ہے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ یہ جوان اب اس کا دودھ پی رہا ہے۔ یا آئیندہ پیئے گا۔ بلکہ اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ یہ شخص اس ماں کا دودھ پی کر جوان ہوا ہے۔ یہی یہاں مراد ہے۔ **فائدہ** اس سے معلوم ہوا۔ کہ جو شخص صحابہ کرام یا اہل بیت کے ایمان کا انکار کرتا ہے۔ وہ حقیقت میں قرآن کریم کے ہادی ہونے کا منکر ہے۔ بعض حضرات نے یہ جواب دیا۔ کہ انہیں متقی آئیندہ کے لحاظ سے کہا گیا ہے۔ یعنی اُن کو ہدایت دینے والا ہے۔ جو متقی بننے والے ہیں۔ اور جن کے نصیب میں تقویٰ لکھا ہوا ہے۔ جیسے کہ ہم طالب علم کو مولوی صاحب کہہ دیتے **تیسرا جواب** یہ دیا گیا ہے۔ کہ یہاں متقی سے مراد ہے۔ اللہ سے ڈرنے والا یعنی جن کے دل میں خوف الٰہی ہے۔ وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں۔ اور جن کے دل میں محض ہٹ دھرمی ہے۔ وہ خواہ مخواہ اس کا انکار ہی کرتے ہیں۔ **چوتھا** یہ کہ ہدایت سے مراد ہے منزل مقصود تک پہنچانا۔ تو معنی یہ ہوئے۔ کہ جو پرہیزگار ہیں۔ انہیں قرآن پاک قیامت کے دن جنت تک پہنچائے گا۔ جیسا کہ روایت میں آتا ہے۔ کہ قرآن کریم نور بن کر مومنوں کے آگے آگے چلے گا۔ **پانچواں** جواب یہ ہے۔ کہ "متقین" سے مراد ہیں "مومنین" اور ہدایت سے مراد ہے نیک اعمال کی رہبری تو اب معنی یہ ہوئے۔ کہ جو لوگ ایمان لے آئیں اُن کو قرآن پاک نیک اعمال کی ہدایت کرتا ہے **نوٹ**۔ ایمان نبی سے ملتا ہے۔ اور ایمان کے بعد قرآن دل میں تشریف لاتا ہے۔ اسی لئے کافر کو کلمہ پڑھا کر مسلمان کرتے ہیں۔ اور بعد میں اُسے قرآن پاک پڑھاتے ہیں ؎

وہ جس کو ملے ایمان ملا ایمان تو کیا رحمان ملا
قرآں بھی جب ہی ہاتھ آیا جب دل نے وہ نور ہدیٰ پایا

ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کو پہچانا۔ نہ کہ قرآن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بلکہ حضور علیہ السلام کی پہچان اُن کے معجزات سے ہوئی۔ تو اب یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ قرآن کریم معجزہ ہونے کی حیثیت سے نبی کی پہچان کراتا ہے۔ اور نبی علیہ السلام کے ذریعہ سے قرآن کی پہچان ہوتی ہے۔ اب آیت کے معنی خوب چسپاں ہو گئے۔ کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ایمان لے آئے انہیں قرآن کریم تقویٰ و طہارت کی رہبری فرماتا ہے۔ **دوسرا اعتراض** اس جگہ فرمایا گیا۔ کہ قرآن کریم پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے۔ دوسری جگہ

ارشاد ہوا ھُدًی لِلنَّاسِ یعنی یہ قرآن سب لوگوں کے لئے ہدایت ہے۔ ان دونوں آیتوں میں مطابقت کس طرح کی جائے۔
**جواب** اس کے چند جواب ہیں سب سے بہتر جواب تو وہ ہے جو تفسیر کبیر نے دیا۔ وہ یہ کہ ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف پرہیزگار ہی انسان ہیں۔ اور جس کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو۔ وہ انسان ہی نہیں۔ وہ انسانی لباس میں جانور ہے۔ بلکہ جانوروں سے بدتر کیونکہ جانور تو اپنے مالک کو پہچانتا ہے۔ اور یہ نہیں پہچانتا۔ **دوسرا جواب** یہ ہے۔ کہ قرآن کریم کا ایک کام ہے۔ راستہ دکھانا وہ سب انسانوں کے لئے ہے۔ کافر، منافق مسلمان سب کو راستہ دکھاتا ہے۔ اور ایک کام ہے۔ راستہ پر لگا دینا وہ صرف مومنین کے لئے ہوا۔ نہ کہ کفار کیلئے یعنی اس کے ذریعہ سے مسلمان تو راستے پر لگ گئے اور کفار علیحدہ رہے **تیسرا اعتراض** یہ ہے۔ کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ سارا قرآن ہدایت ہے۔ حالانکہ قرآن پاک کی بعض آیتیں متشابہ ہیں۔ جو کسی انسان کے سمجھ میں نہیں آتیں۔ جب سمجھ میں نہ آئیں تو ہدایت کیا دیں گی اور بعض وہ آیتیں ہیں جن کے معنی میں بہت سے احتمالات ہیں جن کی وجہ سے مسلمانوں میں بہت سے فرقے بن گئے۔ تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کو خارجیوں سے مناظرہ کرنے کے لئے بھیجا۔ تو اُن سے فرمایا۔ کہ ان کے مقابلہ میں قرآن شریف سے دلیل نہ پکڑنا۔ کیونکہ قرآن شریف سے ہر شخص اپنا مطلب نکال سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ قرآن کریم ہدایت نہیں اگر ہدایت ہوتا تو گمراہ لوگ اس سے دلیل نہ پکڑ سکتے۔ **جواب** بعض آیتوں کے معانی کا سمجھ میں نہ آنا بھی اُس کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے۔ کیونکہ اگر یہ کلام انسانی ہوتا تو کسی نہ کسی عقلمند کی عقل اُن کی تہ تک ضرور پہنچ جاتی سبحان اللہ کیا لطف ہے۔ کہ قرآن پاک سمجھ میں آئے تو بھی رہبری کرے اور سمجھ میں نہ آئے تو بھی راہ ہدایت دکھائے۔ بہرحال یہ ہدایت ہے۔ نیز بدمذہبوں کے قرآنی آیات سے دلیل پکڑ لینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کی تہ تک نہیں پہنچے۔ اور قرآن پاک کا نور اُن کی دل کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ جیسے کہ اگر کوئی شخص آفتاب میں نگاہ جمائے تو اُس کو آفتاب کالا معلوم ہوتا ہے۔ آفتاب تو سیاہ نہیں لیکن اُس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ بارش بہت فائدہ مند چیز ہے۔ لیکن بعض گھاسیں اس سے جل جاتی ہیں۔ تو یہ بارش کا قصور نہیں۔ بلکہ اُن گھاسوں کا اپنا قصور ہے عمدہ غذائیں بیشک مقوی ہیں لیکن کمزور معدہ والے کو اُن سے نقصان ہوتا ہے۔ تو یہ غذا کا قصور نہیں۔ بلکہ کھانے والے کے معدہ کا فتور ہے۔ بہرحال قرآن کریم کا ایک ایک حرف ہدایت ہے۔ کسی کو اس سے ہدایت نہ ملنا قرآن پاک کے ہدایت ہونے میں مضر نہیں۔

| اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ | | |
|---|---|---|
| وہ | ایمان لاتے ہیں | ساتھ پیچھے ہوئے |
| وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں۔ | | |

**تعلق** پہلے فرمایا گیا تھا کہ قرآن پاک پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے۔ اب بتایا جا رہا ہے۔ کہ متقی کون لوگ ہیں۔ تو گویا یہ آیت اُس اجمال کی تفصیل ہے۔ اگر تقویٰ کے معنے یہ کئے جائیں۔ کہ ناجائز باتوں سے بچنا تو مطلب یہ ہوا کہ متقی وہ ہے جو ناجائز باتوں سے بچے۔ اور اچھی باتیں اختیار کرے۔ تو اُن اچھی باتوں کا ذکر اس آیت میں ہوا چونکہ بیماری کا دفعہ کرنا مقویات پر مقدم ہوتا ہے۔ اس لئے تقویٰ کا ذکر اِن چیزوں سے پہلے کیا گیا۔ بہرحال یہ آیت یا پہلی آیت پر مترتب ہے۔ یا اُس کی تفسیر۔ چونکہ ایمان تمام نیکیوں کی اصل اور جڑ ہے۔ کہ اگر ایمان قائم ہے تو نیک اعمال فائدہ دیں گے۔ ورنہ نہیں۔ اس لئے ایمان کو پہلے بیان کیا۔ اور اُس کے بعد نماز وغیرہ کو۔ دل ایک تختی ہے۔ اور نیک اعمال اُس کے اچھے نقش اور تختی پر نقش و نگار جبھی کئے جاتے ہیں۔ جب پہلے اُسے دھو کر صاف کر لیا جائے۔ تو ایمان رحمت کا وہ پانی ہے۔ جس سے قلب صاف ہوتا ہے۔ جب ایمان سے دل صاف ہو گیا۔ تو اب نیک اعمال کے ذریعہ سے اُس پر عمدہ عمدہ نقش و نگار کئے جا سکتے ہیں۔

**تفسیر** يُؤْمِنُوْنَ ایمان سے مشتق ہے۔ ایمان کے لغوی معنی ہیں۔ امن دینا چونکہ مومن اچھے عقیدے اختیار کر کے اپنے کو ہمیشہ کے عذاب سے امن دے لیتا ہے۔ اس لئے اچھے عقیدوں کے اختیار کرنے کا نام ایمان ہے۔ یہ بھی خیال رہے۔ کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو بھی مومن کہا گیا ہے۔ اور رب تعالیٰ کو بھی لیکن مسلمانوں کے مومن ہونے کے یہ معنی ہیں۔ کہ وہ اپنے آپ کو عذاب سے امن دیتے ہیں۔ اور رب تعالیٰ کے مومن ہونے کے یہ معنی ہیں۔ کہ وہ اپنے کرم سے ایمان والے بندوں کو عذاب سے امن دیتا ہے۔ ایمان کے دوسرے معنی مضبوط کرنے اور بھروسہ کرنے کے بھی ہیں۔ چونکہ مومن کو اپنے عقیدوں پر مضبوطی اور پورا بھروسہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے اُسے مومن کہا جاتا ہے اور کافروں کو ہمیشہ تردد ہی رہتا ہے۔ اس لئے وہ مومن کہلانے کے مستحق نہیں۔ شریعت میں ایمان کے معنی یہ ہیں۔ کہ جن باتوں کے متعلق یقین سے معلوم ہو جائے۔ کہ یہ دین محمدی میں سے ہیں۔ اُن سب کو دل سے یقیناً ماننا اور زبان سے اقرار کرنا۔ لیکن دلی تصدیق اصل ایمان ہے اور اقرار احکام اسلامی جاری کرنے کی شرط اعمال ایمان میں داخل نہیں یعنی اگر کوئی شخص عقیدہ درست رکھتا ہو لیکن نیک اعمال نہ کرتا ہو یا برے اعمال کرتا ہو۔ وہ مومن ہے۔ اسی لئے اس آیت کریمہ میں ایمان کے بعد نماز وغیرہ کا ذکر ہوا۔ تو اگر اعمال ایمان کا جز ہوتے تو ایمان کے بعد اعمال کے بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لہذا شرابی۔ چور۔ زانی اور دیگر بدکار لوگ اگر عقیدہ درست رکھتے ہوں۔ تو وہ یقیناً مومن ہیں۔ اور اگر نمازی پرہیزگار شخص کے عقیدے بگڑے ہوئے ہوں۔ تو وہ کافر ہے۔ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا ہے۔ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا یعنی اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں جنگ کر بیٹھیں الخ۔ دیکھو آپس میں لڑنا حرام ہے۔ لیکن ان لڑنے والوں کو مومنین کہا گیا۔ اگر کوئی شخص عمر بھر تک کافر اور بدکار رہے مرتے وقت اللہ اُس کے عقائد درست کر دے اور وہ کلمہ طیبہ پڑھ کے مرجائے تو وہ مومن ہے۔ اور اگر کوئی شخص عمر بھر تک نیک اعمال کرے لیکن آخیر میں مرتے وقت اُس کے عقیدے بگڑ جائیں تو وہ بے ایمان ہے جیسے کہ شیطان اور بلعم ابن باعورہ کا واقعہ ہوا۔ ہماری اس تحقیق سے اتنا معلوم ہوا۔ کہ آج کل کے نئے نئے فرقے جیسے خاکسار وغیرہ جو کہتے ہیں۔ کہ ایمان صرف خدمت خلق کا نام ہے۔ عقیدوں کی کوئی ضرورت نہیں وہ سخت غلطی پر ہیں۔ دوستو ایمان یعنی عقیدے مثل جڑ کے ہیں۔ اور اعمال اُس کے پھل پھول جبھی لگ سکتے ہیں۔ جب جڑ قائم ہو۔ اسی طرح حالی پانی پتی جو کہہ گئے ؎

یہی ہے عقیدہ یہی دین و ایماں      کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

یہ ایک خبط ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ کہ اگر تم نے ہماری نبی کی آواز پر اپنی آوازیں اونچی کر دیں۔ تو تمہارے اعمال برباد ہو جائیں گے۔ اگر ایمان صرف اعمال کا نام تھا۔ تو نبی پاک کی ادنے بے ادبی سے اعمال برباد کیوں ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ مومن کو اعمال کی ضرورت نہیں۔ نیک اعمال بھی سخت ضروری چیز ہیں۔ جو شخص عقائد درست کر کے اپنے اعمال نہ سنبھالے۔ وہ ایسا ہے جیسا درخت لگا کر اُس کے پھل نہ کھائے۔ **اسلام اور ایمان میں فرق** اسلام کے معنی ہیں۔ سر سجدہ میں رکھنا یعنی اطاعت کرنا۔ اسلام میں ظاہر کرنا معتبر ہے۔ اور ایمان چھپی ہوئی چیز ہے۔ اگر کسی کے عقائد درست نہ ہوں۔ لیکن وہ اپنے آپ کو مومن ظاہر کرتا ہو۔ جیسے کہ منافقین تو وہ مسلم ہوگا مومن نہ ہوگا۔ ایسے ہی اگر کوئی شخص آخیر وقت میں ایمان لے آیا مگر اُس کو اپنے ایمان ظاہر کرنے کا موقع نہ ملا۔ تو وہ مومن ہوگا مسلم نہ ہوگا جس شخص کے عقائد بھی درست ہوں۔ اور اقرار بھی کرتا ہو۔ لیکن اعمال خراب وہ فاسق ہے۔ اور جس کے اعمال بھی درست وہ متقی (غَيْبٌ) غیب کے معنی ہیں غائب یعنی چھپی ہوئی چیز اصطلاح میں غیب وہ چیز کہلاتی ہے۔ جو کہ ظاہری و باطنی حواس اور عقل سے چھپی ہو یعنی نہ تو آنکھ ناک کان وغیرہ حواس سے معلوم ہو سکے۔ اور نہ بغیر غور و فکر کے عقل میں آسکے۔ غیب دو طرح کا ہے۔ ایک وہ جس پر کوئی دلیل بھی قائم نہ ہو۔ جیسے کسی کی موت کا وقت۔ قیامت کے آنے کی تاریخ پیٹ کے بچے کی تحقیق کہ یہ چیزیں دلائل سے بھی نہیں معلوم ہو سکتیں۔ اسی کا نام ہے۔ مفاتح الغیب اسی کے متعلق قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ یعنی غیب کی کنجیاں اللہ ہی کے پاس ہیں۔ اسے کوئی بھی اپنے آپ معلوم نہیں کر سکتا۔ ہاں جس کو رب بتائے۔ جیسے انبیاء کرام اور خاص اولیاء اللہ اس تک پہنچ سکتے ہیں۔ دوسرا وہ غیب جس پر دلیل قائم ہو یعنی دلائل سے اُس کا پتہ لگ جائے

جیسے حق تعالےٰ کی ذات اور اُس کے صفات. انبیاء کی نبوت اور اُن کے متعلق احکام وغیرہ. یہ غیب وہ ہے. کہ غور و فکر سے معلوم ہوجاتا ہے. رب کو ہم نے نہ دیکھا. لیکن دُنیا کا ذرّہ ذرّہ اُس کے ہونے کا پتہ دے رہا ہے. یہاں غیب سے یہی مراد ہے. اب اس آیت کے معنی یہ ہوئے. کہ متقی وہ ہیں. جو اُن غیبوں پر ایمان رکھتے ہوں. جو دلائل سے معلوم ہو سکتے ہیں. اللہ کی ذات. اُس کے صفات. انبیاء کرام کی نبوت. قیامت حساب. سزا و جزاء جنت دوزخ یہ سب اسی غیب میں داخل ہیں جو شخص ان میں سے کسی چیز کا بھی انکار کرے وہ کافر ہے. تفسیر روح البیان میں فرمایا کہ غیب دو قسم کے ہیں. ایک تو وہ جو تجھ سے غائب. جیسے کہ عالم ارواح کہ پہلے تو وہاں موجود تھا. اور جب تو یہاں آگیا تو وہ تجھ سے غائب ہوگیا. دوسرا وہ جس سے تو غائب یعنی وہ تیرے پاس اور تو اُس سے دُور جیسے حق تعالےٰ کہ وہ ہم شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے. لیکن ہم اُس سے دور ہیں ؎

یار نزدیک تر از من بمن ست — وین عجب بیں کہ من ازوے دُورم

اس آیت کے تین معنے ہیں. ایک یہ کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں. یعنی حق تعالےٰ کو اور جنت دوزخ وغیرہ کو بغیر دیکھے مانتے ہیں. دوسرے یہ کہ وہ غیب یعنی دل سے ایمان لاتے ہیں. زبان ظاہر ہے اور دل چھپا ہوا. زبان سے تو منافقین بھی ایمان لے آئے تھے. مگر وہ قبول نہیں. کیونکہ وہ غیب یعنی دل سے ایمان نہ تھا. تیسرے یہ کہ غیب میں یعنی مسلمانوں کے پیچھے بھی ایمان لاتے ہیں. منافقین مسلمانوں کے سامنے تو کہہ دیتے تھے. کہ ہم ایمان لے آئے. مگر آپس میں کافروں سے ملتے تھے. تو کہتے تھے. کہ اِنَّا مَعَکُمْ ہم تمہارے ساتھ ہیں. تو اس میں فرمایا یہ گیا. کہ مومن وہ ہے. جو کہ ہر حال میں یعنی مسلمانوں کے سامنے بھی اور مسلمانوں کے پیچھے بھی ایماندار رہے.

**فائدہ.** اس سے معلوم ہوا. کہ غائب چیز پر ایمان لانا معتبر ہے. نہ کہ ظاہر پر. قرآن پاک کے ظاہری حروف کو مان لینا. کہ یہ ایک کتاب ہے. عربی زبان کی ہے. لاہور میں چھپی ہے. فلاں کاغذ پر لکھی گئی ہے. یہ ایمان نہیں. کیونکہ یہ باتیں تو بالکل ظاہر ہیں. بلکہ قرآن پاک کے چھپے ہوئے وصف پر ایمان لانا ضروری ہے. وہ یہ کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے. حضرت جبریل علیہ السلام لائے ہیں حضور علیہ السلام پر آیا ہے. کیونکہ اوصاف ظاہراً محسوس نہیں ہوتے. اسی طرح حضور علیہ السلام کے ظاہری صفات کو مان لینا ایمان نہیں. کہ وہ بشر تھے. بلکہ مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے. مدینہ منورہ میں قیام فرمایا. کھاتے پیتے تھے سیدنا عبداللہ کے فرزند تھے. آمنہ خاتون کے لخت جگر نور نظر تھے. کیونکہ یہ تو اُن کے ظاہری اوصاف ہیں. ان کے تو کفار بھی قائل تھے. بلکہ حضور علیہ السلام کے چھپے ہوئے اوصاف کو ماننے کا نام ایمان ہے. یعنی یہ کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اس کے پیارے ہیں. تخت و تاج والے ہیں. شفیع المذنبین ہیں. رحمۃ اللعٰلمین ہیں صلی اللہ علیہ وسلم. یہ اوصاف ظاہر میں محسوس نہیں. اسلئے ان کو ماننا ہی ایمان بالغیب ہوگا. وہابیہ اور دیوبندیہ کا حضور علیہ السلام کی بشریت کے پیچھے پڑ جانا محض بے دینی ہے. اُن کو بشر ماننا ایمان نہیں بلکہ اُن کو مصطفےٰ ماننا رحمۃ اللعٰلمین ماننا ایمان ہے. اسی لئے کلمہ میں پڑھا جاتا ہے. مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ نہ کہ مُحَمَّدٌ بَشَرٌ بلکہ حق تو یہ ہے. کہ اللہ کو صرف خالق عالم ماننے کا نام بھی ایمان نہیں. کیونکہ اُس کا خالق و رازق وغیرہ ہونا مثل ظاہر کے ہے. بلکہ اُس کو ربِ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ماننا ایمان ہے. اسی لئے حق تعالےٰ نے فرمایا. قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ جس سے معلوم ہوا. کہ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مانی ہوئی توحید ایمان ہے. اور فرمایا وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ جس سے معلوم ہوا. کہ رب تعالیٰ نے میثاق کے دن ساری اولاد آدم کو اپنی پہچان اس طرح کرائی. کہ ہم ربِ محمد ہیں. یہ سب باتیں ایمان بالغیب میں داخل ہیں. **اعتراض** غائب چیزوں پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے **جواب** اس لئے کہ ایمان کی حقیقت ہے. اللہ و رسول پر اعتماد ہونا. چیز کو دیکھ کر یا سن کر تو ہر شخص مان لیتا ہے. مگر جو چیز کہ حواس سے غائب ہو. اور عقل میں نہ آئے. اُس کو صرف اس لئے ماننا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے. یہ اس بات کی دلیل ہے. کہ اُس کے دل میں اطاعت ہے. مرتے وقت ملائکہ موت کو دیکھ کر. اسی طرح قیامت کے قریب

آفتاب کو مغرب سے نکلتا ہؤا دیکھ کر ایمان لانا ہرگز قبول نہیں. کیونکہ اُسے نبیوں کے خبروں پر اعتماد نہ ہؤا بلکہ اپنی آنکھ پر اعتماد ہؤا کہ اُن سے سُن کر نہ مانا. آنکھ سے دیکھ کر مانا. سچ پوچھو تو ایمان کی جان تو یہ ہے. کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر پر اپنے حواس سے زیادہ اعتماد ہو. اگر ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں. کہ اس وقت دن ہے. اور نبی کریم فرماتے ہیں. کہ اس وقت رات ہے. تو ہماری آنکھ جھوٹی ہے. اور نبی کریم سچے. کیونکہ ہماری آنکھ ہزار دفعہ غلطی کر جاتی ہے. مگر اُن کا فرمان کریم کبھی غلط نہیں ہوتا. اس پر یہ شعر خوب چسپاں ہوتا ہے ؎

اگر شہ روز را گوید شب است ایں — بباید گفت اینک ماہ و پرویں

**دوسرا اعتراض** اس آیت سے لازم آتا ہے. کہ صحابہ کرام کا ایمان درست نہ ہو. کیونکہ نبی کریم کو دیکھ کر ایمان لائے. حالانکہ ایمان بالغیب چاہیے. **جواب** صحابہ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری جسم پاک کی زیارت کی اور اس پر ایمان نہیں. ایمان تو اُن کی نبوت اور چھپے ہوئے اوصاف پر ہے. اور یہ چیزیں اُن کی نگاہوں سے بھی غائب تھیں معجزات کو دیکھنے سے نبوت محسوس نہیں ہوتی. جیسے کہ مخلوق کو دیکھنے سے خالق محسوس نہیں ہوتا. **تیسرا اعتراض** پھر چاہیئے. کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مومن نہ کہا جائے. اس لئے کہ اُن کے لئے ایمان کی کوئی چیز غائب نہیں. کیونکہ اللہ پاک کو انہوں نے دیکھا. فرشتوں کو انہوں نے ملاحظہ فرمایا. قرآن کریم کو اترتے ہوئے انہوں نے دیکھا جنت و دوزخ کی انہوں نے سیر فرمائی. نبوت تو خود اُن کا اپنا وصف ہے جس کا انہیں علم حضوری ہے. جب اُن کے لئے ان میں سے کوئی چیز غائب نہ رہی. تو اُن کے ایمان کی کیا سبیل ہے. **جواب** یہ سب گفتگو مومنوں کے متعلق تھی. وہ تو عین ایمان ہیں. اُن کے جاننے پہچاننے کا نام ہی تو ایمان. سب مومن وہ ایمان. سب عارف وہ عرفان. سب صادق وہ سراپا صدق. سب عالم وہ عین علم. سب قاصد وہ منزل مقصود. سب طالب وہ مطلوب. وہ سب کی انتہا. اُنہیں اپنے پر قیاس کیوں کرتے ہو. اُن کو مومن اس طرح کہہ دیتے ہیں جس طرح اللہ کو بھی مومن کہتے ہیں. کہ لفظ مومن ایک ہے. مگر معنی میں بہت فرق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم **نکتہ** تفسیر کبیر اور تفسیر عزیزی وغیرہ نے مسند امام احمد ابن حنبل سے روایت نقل کی. کہ حارث ابن قیس نے سیدنا عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے عرض کیا. کہ ہمیں حسرت وافسوس ہے. کہ ایک نعمت تم کو ملی اور ہم کو نہ ملی. وہ یہ کہ تم دیدار یار سے مشرف ہوئے اور ہم اُس سے محروم رہے. سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا. کہ نبوت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سب پر ظاہر ہے. لیکن اے حارث تمہارا ایمان بڑا کامل ہے. کیونکہ ہم انہیں دیکھ کر ایمان لائے اور تم بغیر دیکھے. اور یہی آیت پڑھی تفسیر عزیزی میں ابو داؤد طیالسی سے روایت ہے. کہ ایک شخص سیدنا عبد اللہ ابن عمر کے پاس حاضر ہؤا اور عرض کیا کہ کیا تم نے مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے. آپ نے فرمایا. کہ ہاں. پھر اُس شخص نے کہا. کہ کیا تم نے اپنی اِن زبانوں سے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم سے کلام بھی کیا ہے. آپ نے فرمایا. کہ ہاں. پھر اُس نے عرض کیا کہ کیا تم نے اپنے اِن ہاتھوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت بھی کی ہے. فرمایا. کہ ہاں اُس شخص پر وجد کی حالت طاری ہوگئی اور عشق کی حالت میں کہنے لگا. کہ تم لوگ کیا ہی خوش نصیب ہو. سیدنا عبد اللہ ابن عمر نے اُس کا یہ حال دیکھ کر فرمایا. کہ میں تجھے ایک حدیث پاک سناتا ہوں. وہ یہ کہ میں نے مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے. سنا کہ مبارک ہے. وہ شخص جو مجھے دیکھ کر ایمان لائے. اور بڑا مبارک ہے. وہ شخص جو بغیر دیکھے مجھ پر ایمان لائے. اِن حدیثوں سے ہمارے اس کلام کی پوری تائید ہوتی ہے. **چوتھا اعتراض** روایات سے ثابت ہے. کہ بعض اولیاء اللہ اور صحابہ کرام پر سارے غیب ظاہر ہو جاتے ہیں. جیسے کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا. کہ جنت و دوزخ کے سارے طبقے میرے سامنے ہیں. یا کہ حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں. کہ میں نے اللہ کے سارے شہروں کو اس طرح دیکھا جیسے کہ چند رائی کے دانے تو اِن حضرات کو غیب پر ایمان حاصل نہ ہؤا. کیونکہ جب کوئی چیز ان کے لئے غیب رہی ہی نہیں تو غیب پر ایمان کیسا؟ **جواب** ایک تو ہے دیکھ کر ایمان لانا اور ایک ہے ایمان لا کر دیکھنا. دیکھ کر ایمان لانا معتبر نہیں. یہ حضرات غائب چیزوں پر ایمان لائے تھے. بعد میں نور ایمانی

کی زیادتی کی وجہ سے وہ غائب چیزیں اُن پر ظاہر ہوگئیں. لہذا ان کو ایمان بالغیب اعلیٰ درجہ کا حاصل ہُوا. اس کی تائید حضرت ابراہیم ع کے اس واقعہ سے ہوتی ہے. کہ انہوں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا. کہ مجھے دکھادے. کہ تو مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا. ارشاد ہُوا. کہ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ کیا تم اس پر ایمان نہیں لائے ہو. عرض کیا کہ ہاں. لیکن دل کا اطمینان (حق الیقین) چاہتا ہوں. تو دیکھو کہ اُن کو ایمان پہلے حاصل ہوچکا تھا. بعد میں انکشاف ہُوا. تتمہ اس آیت سے یہ معلوم ہُوا. کہ علم غیب کے بغیر ایمان حاصل نہیں ہوتا. کیونکہ ایمان یقین کا نام ہے. اور یقین علم کا انتہائی درجہ ہے. جب کسی کو غیب کا علم نہ ہو تو یقین کیسے ہوگا. ہم قیامت. دوزخ جنت. رب کی ذات وصفات کو جانتے ہیں تب ہی اُس پر ایمان لاتے ہیں. اور یہ سب چیزیں غیب ہیں. اور ان کا جاننا علم غیب. تفسیر کبیر نے اسی جگہ لکھا کہ ہر مسلمان کہہ سکتا ہے. کہ میں غیب جانتا ہوں لہ لیکن علم غیب کی دو صورتیں ہیں. ایک سن کر جاننا. دوسرے دیکھ کر. سن کر جاننے کو علم بالغیب کہتے ہیں. جیسے کہ ہم کو قیامت وغیرہ چھپی چیزوں کا علم نبی پاک کے فرمانے سے ہے. اور دیکھ کر جاننے کو علم الغیب کہتے ہیں جیسے کہ انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کا علم. اسی لئے صوفیاء کرام اس آیت کریمہ کے معنی یہ فرماتے ہیں. کہ متقی وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اُس نورِ غیبی سے جو کہ رب تعالیٰ کی طرف سے اُن کو ملا. اور اُس کی تائید یہ حدیث پاک کرتی ہے. کہ مومن نورِ الٰہی سے دیکھتا ہے. (روح البیان یہی مقام)

## وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ

| اور | قائم رکھیں | نماز کو |
| --- | --- | --- |

اور نماز قائم رکھیں

**تعلق**. اس جگہ متقین کا ذکر ہو رہا ہے. متقی وہ ہیں جن کے ایمان و اعمال درست ہوں. ایمان کا ذکر پہلے کر دیا گیا. اور اب اعمال کا ذکر شروع ہُوا. چونکہ اعمال میں نماز سب سے بہتر عمل ہے. اس لئے پہلے اس کا ذکر کیا گیا. چند وجہوں سے ایمان اعمال پر مقدم ہے. **پہلی** وجہ یہ کہ ایمان اعمال کے اصل ہے جیسے کہ پہلے ذکر کیا گیا. **دوسری** یہ کہ ایمان قلب (دل) کا کام ہے. اور اعمال قالب (جسم) کا کام اور دل بادشاہ ہے. اور جسم اُس کی رعایا. لہذا دل کا کام جسم کے کام سے افضل ہے **تیسری** یہ کہ ایمان سارے پیغمبروں کے دین میں یکساں رہا. اور اعمال میں فرق ہوتا رہا. اور ہمیشہ کی چیز بدلنے والی چیز سے افضل ہے. **چوتھی** یہ کہ ایمان لانا اسلام میں اول ہی سے فرض ہُوا. اور نماز زکوٰۃ وغیرہ بعد میں. کہ نماز معراج میں فرض ہوئی. اور باقی اعمال اُس کے بھی بعد **پانچویں** یہ کہ اعمال موت پر ختم ہو جاتے ہیں. مگر ایمان. موت اور قبر حشر وغیرہ میں ہر جگہ ساتھ رہتا ہے **چھٹی** یہ کہ ایمان لانا سب پر فرض ہے. مگر اعمال سب پر فرض نہیں چنانچہ کافر پر ایمان لانا فرض. بچے اور دیوانے اپنے ماں باپ کے تابع ہو کے مومن مسلمان پر ہر حالت میں ایمان فرض لیکن نماز. زکوٰۃ وغیرہ کوئی عبادت کافروں. بچوں. دیوانوں پر فرض نہیں. اسی طرح نماز روزہ حیض ونفاس والی عورت پر فرض نہیں. زکوٰۃ اور حج غریب پر فرض نہیں. ان وجہوں سے ایمان کو پہلے بیان کیا گیا. اور نماز کو اس کے بعد. **نماز** کو زکوٰۃ وغیرہ سے اس لئے پہلے بیان کیا گیا. کہ نماز بدنی عبادت ہے. اور زکوٰۃ مالی اور بدن مال سے افضل ہے. لہذا نماز زکوٰۃ سے افضل **دوسرے** اس لئے کہ اسلام میں سب سے پہلے نماز ہی فرض ہوئی. اور اس کے بعد زکوٰۃ وغیرہ **تیسرے** اس لئے کہ رب تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو عرش پر بلا کر نماز عطا فرمائی. اور زکوٰۃ وغیرہ باقی اعمال زمین پر ہی بھیج دیئے جس سے معلوم ہوتا ہے. کہ سارے اعمال میں نماز افضل ہے **چوتھے** اس لئے کہ نماز دن بھر میں پانچ دفعہ پڑھی جاتی ہے. اور زکوٰۃ اور روزہ سال کے بعد حج عمر میں ایک مرتبہ **پانچویں** اس لئے کہ نماز ہر غریب و امیر مسافر و مقیم مسلمان پر فرض ہے. مگر زکوٰۃ غریب پر فرض نہیں اور روزہ مسافر پر فرض نہیں. کیونکہ مسافر روزہ قضا کر سکتا ہے. **چھٹے** اس لئے کہ نماز آدم علیہ السلام سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک قریباً ہر پیغمبر نے

کسی قدر فرق کے ساتھ پڑھی ہے لیکن زکوٰۃ روزے وغیرہ کا یہ حال نہیں چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے فجر پڑھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ظہر پڑھی حضرت یونس علیہ السلام نے عصر پڑھی عیسیٰ علیہ السلام نے مغرب موسیٰ علیہ السلام نے عشاء (تفسیر روح البیان) یہی مقام اس بارے میں اور بھی روایتیں ہیں **تفسیر** یُقِیْمُوْنَ۔ اِقَامَتٌ سے بنا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں سیدھا کرنا۔ اور یہاں مراد ہے نماز کو ہمیشہ پڑھنا اس کے ظاہری اور باطنی آداب کے ساتھ پڑھنا۔ ظاہری آداب۔ اس کی شرطیں فرائض سنتیں مستحبات ہیں۔ اور باطنی شرائط یہ ہیں۔ کہ دل میں عاجزی ہو ریا نہ ہو حضور قلبی ہو۔ دل ہمہ تن بارگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہو۔ اسی لئے قرآن کریم نے جہاں بھی نماز کا ذکر فرمایا۔ وہاں قائم کرنے کے ساتھ فرمایا۔ **جو شخص** نماز تو پڑھے مگر پابندی سے نہ پڑھے۔ وہ اس آیت پر عامل نہیں۔ اسی طرح جو شخص مستحب وقت پر نہ پڑھے۔ نماز میں پاکی پلیدی کا پورا خیال نہ رکھے۔ اس کی سنتیں وغیرہ ادا نہ کرے۔ ریاکاری وغیرہ کے لئے پڑھے۔ وہ سب اس آیت سے خارج ہیں۔ یُقِیْمُوْنَ میں بہت گنجائش ہے۔ شریعت وطریقت کے سارے مسائل اس میں آ گئے۔ حق تعالیٰ نماز قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ **نکتہ** یُقِیْمُوْنَ جمع کے صیغہ سے ارشاد فرمایا گیا جس سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسلمان مل کر یعنی جماعت سے نماز پڑھا کریں۔ قرآن کریم نے ایک جگہ ارشاد فرمایا۔ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ یعنی نمازیوں کے ساتھ نمازیں پڑھو۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ جماعت سے نماز پڑھنا سخت ضروری ہے۔ امام احمد ابن حنبل رضی اللہ عنہ کے نزدیک مردوں پر جماعت فرض ہے۔ ہمارے یہاں واجب۔ مگر ہمارے یہاں بھی بعض نمازوں میں جماعت فرض ہے جیسا کہ نماز جمعہ اور عیدین وغیرہ (صلوٰۃ) صَلّٰی یا صَلْوٌ سے بنا ہے۔ صَلّٰی کے معنی ہیں آگ سے گرمی حاصل کرنا جس کا ترجمہ ہے تاپنا۔ قرآن پاک فرماتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ۔ چونکہ ٹیڑھے بانس کو آگ سے گرم کر کے سیدھا کرتے ہیں۔ اسی طرح ٹیڑھے آدمی کو نماز کی برکت سے سیدھا کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کو صلوٰۃ کہتے ہیں صَلّٰی کے دوسرے معنی ہیں لازم پکڑنا قرآن کریم فرماتا ہے۔ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً وغیرہ۔ چونکہ نماز بھی مسلمان کے واسطے لازم رہتی ہے۔ اس لئے اس کو صلوٰۃ کہتے ہیں۔ صَلْوٌ کے معنی ہیں سُرین چونکہ نماز پڑھنے کی حالت میں سرین کو حرکت ہوتی ہے اس لئے اس کو صلوٰۃ کہتے ہیں۔ **قرآن پاک** میں لفظ صلوٰۃ پانچ معنی میں استعمال ہوا ہے۔ (۱) دعا کے لئے وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (۲) تعریف جیسے يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (۳) قرآن پاک کی تلاوت وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ (۴) رحمت صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ (۵) نماز جیسے اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اور حق تو یہ ہے۔ کہ نماز میں پہلی چار چیزیں بھی شامل ہیں۔ اس میں رب سے دعا بھی ہے۔ اس کی تعریف بھی۔ تلاوت قرآن بھی۔ اور اس کے پڑھنے والے پر رحمت بھی یہاں اس آیت میں صلوٰۃ کے معنی نماز بھی ہیں۔ نماز بہت قسم کی ہے۔ فرض۔ جیسے نماز پنج وقتہ اور جمعہ۔ واجب جیسے نماز عید اور وتر۔ سنت مؤکدہ جیسے ظہر مغرب کی سنتیں۔ اور سنت غیر مؤکدہ جیسے کہ نوافل۔ نماز اوابین۔ نماز چاشت واشراق وغیرہ۔ یہاں نماز سے فرض نماز مراد ہے۔ تو معنی یہ ہوئے۔ کہ متقی وہ لوگ ہیں۔ جو فرض نمازوں کو پابندی سے ادا کرتے ہیں۔ **نماز کے فضائل** کچھ فضائل تو ہم نے تعلق میں بیان کر دیئے اور کچھ یہ ہیں۔ (۱) نماز تمام ملائکہ کی عبادتوں کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ ملائکہ مقربین میں سے بعض وہ ہیں۔ جو صرف رکوع ہی کر رہے ہیں بعض صرف سجدہ۔ بعض قیام بعض صرف تسبیح وتہلیل رب تعالیٰ نے ہماری نماز میں یہ سب چیزیں جمع فرما دیں۔ جو اس کی پابندی کرے گا۔ وہ درجہ میں تمام ملائکہ کے برابر یا ان سے افضل ہوگا۔ (۲) نماز میں ساری مخلوقات کی عبادت جمع ہے وہ اس طرح کہ درخت ہر وقت قیام میں ہیں۔ اور چوپائے ہر وقت رکوع میں۔ سانپ بچھو وغیرہ ہر وقت سجدے میں۔ مینڈک وغیرہ ہر وقت قعدے میں۔ انسان چونکہ ان سب سے افضل ہے۔ اس لئے چاہیئے۔ کہ اس کی عبادت ان سب کی عبادتوں کو شامل ہو (۳) نماز انسان کی ہر حالت درست کرتی ہے۔ بُرے کاموں سے بچاتی ہے۔ یہ تو آزمائی ہوئی بات ہے۔ کہ بڑے بڑے فاسق وبدکار لوگوں نے جب صدق دل سے نماز پڑھنی شروع کر دی تو رب کے فضل سے سارے گناہوں

سے بچ گئے۔ (۴) نماز صدہا بیماریوں کا علاج ہے۔ اس وقت کے اطباء بھی کہتے ہیں۔ کہ وضو کرنے والا آدمی۔ دماغی بیماریوں میں بہت کم مبتلا ہوتا ہے۔ نمازی آدمی اکثر تلی کی بیماریوں اور جنون وغیرہ سے محفوظ رہتا ہے۔ نیز چونکہ پنج وقتہ نمازی کے اعضاء دھلتے رہتے ہیں۔ کپڑے پاک رہتے ہیں۔ گھر بھی اس کا پاک رہتا ہے۔ اس لئے وہ گندگی سے بچا رہتا ہے۔ اور گندگی بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے۔ (۵) نماز ہر مصیبت کا علاج ہے۔ اسی لئے اسلام نے ہر مصیبت کے وقت نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ بارش نہ ہو تو نماز استسقاء پڑھو سورج یا چاند کو گرہن لگے تو نماز کسوف پڑھو۔ کوئی حاجت درپیش ہو۔ تو نماز حاجت پڑھو۔ غرضکہ نماز ہر مصیبت میں کام آنے والی چیز ہے۔ مگر **نماز کیسی پڑھی جائے۔** اس کے متعلق روح البیان شریف نے اسی جگہ بیان فرمایا۔ کہ کسی شخص نے حاتم زاہد سے پوچھا۔ کہ آپ نماز کس طرح پڑھتے ہیں۔ فرمایا۔ کہ جب نماز کا وقت قریب آتا ہے تو اچھی طرح وضو کرتا ہوں پھر مصلے پر سیدھا کھڑا ہوتا ہوں۔ اور دل میں یہ محسوس کرتا ہوں۔ کہ کعبۂ معظمہ میرے چہرے کے سامنے ہے۔ اور مقام ابراہیم میرے سینے کے آگے۔ اللہ میرے پاس ہے۔ جو میرے ہر حال کو دیکھ رہا ہے۔ گویا کہ میرے قدم پل صراط پر ہیں۔ اور جنت میرے داہنی طرف اور دوزخ میرے بائیں طرف ہے۔ اور ملک الموت میرے پیچھے کھڑے ہوئے ہیں۔ اور ہر نماز کے متعلق میں یہ خیال کرتا ہوں۔ کہ یہ میری آخری نماز ہے۔ پھر تکبیر تحریمہ کہتا ہوں۔ پھر قرآن پاک کی تلاوت اس طرح کرتا ہوں۔ کہ ایک ایک لفظ کے معنی پر غور کرتا ہوں۔ عاجزی کے ساتھ رکوع کرتا ہوں۔ اور گریہ وزاری کے ساتھ سجدہ۔ اور امید قبول پر التحیات پڑھتا ہوں۔ اور سنت کے طریقہ پر سلام پھیرتا ہوں پھر جب فارغ ہوتا ہوں۔ تو اس نماز کے مقبول ہونے کی امید۔ اور مردود ہونے کے خوف میں مشغول ہوتا ہوں۔ اور فرمایا۔ کہ میں اس طرح سے تیس ۳۰ سال سے نماز پڑھ رہا ہوں **صوفیاء کرام** فرماتے ہیں۔ کہ اے اللہ کے بندو! نماز کے لئے یا تو تارے بن جاؤ۔ کہ تمام رات رب کی عبادت کرو۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے۔ تو چاند ہی بن جاؤ یعنی رات کے بعض حصہ میں عبادت کرو۔ اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے۔ تو سورج سے تو کم نہ ہو۔ کہ دن کو غفلت میں نہ گزارو۔

## نماز کے اسرار اور حکمتیں

پانچ وقت کی نماز اس لئے فرض ہے۔ کہ معراج میں اولاً پچاس وقت کی فرض ہوئی۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عرض کرنے پر پانچ وقت کی رہ گئی حق تعالیٰ کے یہاں ہر نیکی کا ثواب دس گنا ہوتا ہے۔ لہذا یہ نمازیں پڑھنے میں تو پانچ ہیں۔ اور ثواب میں پچاس **دوسری حکمت** یہ ہے۔ کہ اور امتوں نے یہ نمازیں متفرق طور پر پڑھی تھیں کبھی نے فقط فجر کسی نے فقط ظہر کسی نے فقط عصر وغیرہ حق تعالیٰ نے ان ساری نمازوں کو ہمارے لئے جمع فرمایا۔ چونکہ وہ سب مل کر پانچ ہی نمازیں ہوتی تھیں۔ اس لئے ہمارے واسطے پانچ رہیں۔ **تیسرے** یہ کہ نمازوں سے مقصود یہ ہے۔ کہ انسان کی ہر حالت اللہ کے ذکر سے شروع ہو اور دن اور رات میں پانچ ہی حالتیں ہوتی ہیں۔ اس لئے نمازیں بھی پانچ ہی رکھی گئیں۔ مثلاً صبح کو اٹھا تو اب بیداری کی حالت شروع ہوئی سب سے پہلے اللہ کا ذکر کرے۔ دوپہر تک دنیوی کاروبار سے فارغ ہوا۔ کھانا وغیرہ کھا کر دوپہری میں آرام کیا۔ اب جو اٹھا تو دن کا دوسرا حصہ اور ہماری دوسری حالت شروع ہوئی۔ لہذا پہلے نماز پڑھ لو۔ عصر کے وقت تقریباً سارے لوگ اپنے کاروبار سے فارغ ہو گئے۔ سیر و تفریح کا وقت آیا۔ بازاروں میں تجارتوں کے چمکنے کا وقت آیا۔ گویا ہماری تیسری حالت شروع ہوئی۔ اب بھی پہلے نماز پڑھ لو۔ مغرب کے وقت دن جا رہا ہے۔ رات آ رہی ہے۔ دنیا کی حالت نے کروٹ بدلی۔ اب بھی پہلے نماز پڑھ لو۔ جب سونے کے لئے چلو۔ تو بہت ممکن ہے۔ کہ یہ نیند تمہاری آخری ہو۔ اس کے بعد قیامت ہی کو اٹھنا ہو۔ اور نیند بھی ایک قسم کی موت ہے۔ لہذا اللہ پاک کا ذکر کرو۔ اور نماز پڑھ کر سو۔ جس کام کی ابتداء اچھی ہوتی ہے انشاء اللہ وہ کام آخر تک اچھا رہتا ہے دکاندار لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا پہلا گاہک کوئی مبارک ہو جس کی برکت سے تمام دن خوب تجارت ہو مسلمان کے بھی ہر کام کی ابتداء اللہ کے ذکر سے ہو۔ لہذا پانچ نمازیں رکھی گئیں۔ **نماز کی رکعتیں** مختلف اس لئے ہیں کہ یہ نمازیں گذشتہ پیغمبروں کی ایک لحاظ سے یادگار ہیں چونکہ آدم علیہ السلام نے فجر کے وقت دو ہی رکعتیں پڑھی تھیں اور حضرت خلیل اللہ نے ظہر کے وقت چار وغیرہ وغیرہ اس لئے ہم بھی اتنی ہی رکعتیں پڑھتے ہیں۔ نیز طبیب کے (

نسخہ میں دوائیں مختلف وزن کی ہوتی ہیں. کوئی دو ماشہ تو کوئی تین تولہ اور دواؤں کے یہ وزن اس کی حکمت پر مبنی ہوتے ہیں. اسی طرح نماز کی رکعتیں گویا روحانی نسخہ کے اوزان ہیں. نیز اس جگہ روح البیان شریف نے لکھا ہے. کہ ملائکہ کے بازو مختلف ہیں کسی کے دو کسی کے تین کسی کے چار. رب تعالیٰ نے نمازوں کی رکعتیں بھی مختلف رکھیں. کیونکہ یہ بھی روح کے بازو ہیں. **قبلہ کو منہ کرنے** میں یہ حکمت ہے کہ کعبہ معظمہ تمام زمین کی اصل ہے. کیونکہ زمین وہاں ہی سے پھیلی. تو چاہیئے. کہ نمازی کا جسم اپنے اجسام کے اصل کی طرف رہے. اس میں اس جانب اشارہ ہے. کہ نمازی کا دل عالم کی اصل یعنی محمد مصطفٰے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف رہے کیونکہ حضور علیہ السلام روحوں کی اصل ہیں اس لئے آپ کو ہر نمازی نماز میں سلام کرتا ہے. اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ اور اسی لئے اگر کسی نمازی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پکاریں. تو اس پر واجب ہے. کہ اپنی نماز چھوڑ کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو جائے. اس کی تحقیق کے لئے ہماری کتاب "شان حبیب الرحمٰن" کا مطالعہ کرو. اور انشاء اللہ اس کے متعلق جو قرآن پاک کی آیتیں ہیں. اُن کے ماتحت مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے گی **پہلا اعتراض** قرآن پاک کی اس آیت سے معلوم ہوا. کہ متقی وہ جو نماز قائم کرے. تو جو صحابہ کرام کہ نماز فرض ہونے سے پہلے وفات پا گئے. یا اب جو شخص اسلام لاتے ہی وفات پا جائے. وہ متقی نہ ہونا چاہیئے. کیونکہ اُس نے نماز قائم ہی نہ کی **جواب** تمامی اعمال میں قدرت کی شرط ہے یعنی عمل مطابق طاقت کے واجب ہوتا ہے. جو شخص کہ نماز پڑھنے کا موقعہ ہی نہ پائے. اُس پر نماز فرض ہی نہ ہوئی. دیکھو مالدار آدمی اسلام کے پانچوں ارکان ادا کرتا ہے. یعنی زکوٰۃ وحج بھی. غریب آدمی صرف تین یعنی کلمہ. نماز. روزہ. حائضہ عورت نماز بھی نہیں پڑھتی. مگر یہ سب ایک درجہ کے متقی ہیں. کیونکہ ان میں ہر شخص بقدر طاقت اطاعت کر رہا ہے. اسی طرح ایک شخص کی عمر سو برس کی ہوئی. دوسرے کی پچیس سال کی. سو برس والے کی عبادتیں زیادہ ہیں. لیکن دونوں ایک درجہ کے متقی ہیں. **دوسرا جواب** یہ ہے. کہ ایک تو ہے اعمال کا کرنا اور ایک ہے ماننا. متقی وہ ہے. کہ اگر اُس کو عمل کا موقع ملے. تو کرے. اور اگر نہ ملے. تو کم از کم اس کو مانے جو صحابہ کرام نماز فرض ہونے سے پہلے وفات پا چکے اُن کا بھی یہ عقیدہ تھا. کہ جتنے احکام آئیں گے. وہ سب حق ہوں گے خواہ ہمیں کرنے کا موقع ملے یا نہ ملے. آج بھی غریب آدمی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ زکوٰۃ اسلامی فرض ہے. اگر میرے پاس مال ہو تو مجھ پر زکوٰۃ دینا فرض ہو جائے. یہ ماننا ہی اُس کے متقی ہونے کے لئے کافی ہے بعض صحابہ کرام نے سارا قرآن پاک اترا ہوا نہ دیکھا. کیونکہ وہ بعض سورتوں کے اترنے سے پہلے ہی وفات پا گئے. پہلی اُمتوں نے سارے انبیاء کرام کو نہ جانا. کیونکہ بعض انبیاء اُن کے بعد آنے والے تھے. تو اب یہ نہیں کہا جا سکتا. کہ اُن کا ایمان ناقص تھا. اور ہمارا کامل. کیونکہ ہم نے سارے قرآن اور سارے پیغمبروں کو پا لیا. اس لئے کہ سب کو وہ بھی مانتے تھے. اور ہم بھی مانتے ہیں. وہ اس طرح مانتے تھے. کہ بعض انبیاء اور بعض قرآن کی آیتیں آنے والی ہیں. اور وہ سب حق ہیں ہم اس طرح مانتے ہیں. کہ یہ سب آچکے اور سب حق ہیں. **دوسرا اعتراض** چاہیئے کہ نماز فرض ہی پڑھی جائے. سنتوں کی کوئی ضرورت نہیں. کیونکہ متقی بننے کے لئے فرض نماز کی پابندی کافی ہے جیسا کہ اس تفسیر سے معلوم ہوا. **جواب** سنتوں کے بغیر فرض ناقص ہیں. بلکہ بغیر سنت فرض ادا ہو سکتے ہی نہیں. سنت کو فرض سے وہ تعلق ہے. جو پانی کو کھانے سے ہے. کہ بغیر پانی نہ تو کھانا تیار ہوتا ہے. اور نہ کھایا جا سکتا ہے. اسی طرح بغیر سنت نہ تو فرض ادا ہو سکتا ہے. اور نہ پڑھا جا سکتا ہے. دیکھو مثلاً روٹی ہے. یہ بغیر پانی بنتی بھی نہیں اور کھائی بھی نہیں جاتی. کھیت میں گیہوں پانی سے تیار ہوا. پھر آٹا پانی سے گوندھا گیا. جب کھانے کے لئے بیٹھے تو ساتھ میں پانی ہی پیا گیا جس ترکاری سے روٹی کھائی. وہ بھی کھیت میں پانی ہی سے تیار ہوئی. پھر پانی ہی سے دُھلی اور پانی ہی سے پکی. اسی طرح فرض سنت سے حاصل ہوتا ہے. نماز پڑھنے لگو تو کانوں تک ہاتھ اٹھاؤ. قیام. تلاوت. سجدہ. التحیات وغیرہ کی سنتیں ادا کرو. تو فرض ادا ہو. پھر کوئی فرض نماز ایسی نہیں جس کے ساتھ سنتیں نہ پڑھی جائیں. اسی طرح روزہ کے لئے سحری کھانا اور کھجور سے افطار کرنا وغیرہ سب سنت ہیں. زکوٰۃ کے پیسے سے اپنے اہل قرابت کی خدمت کرنا سنت. بلکہ فرض تو ہم پر بالغ ہونے کے

بعد عائد ہوتے ہیں. اور مرنے سے پہلے ہی ہمیں چھوڑ دیتے ہیں لیکن سنت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوتے ہی ہمیں اپنے دامن میں لیتی ہے. اور مرنے پر بھی بلکہ مرنے کے بعد بھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ پیدا ہوتے ہی بچے کو غسل دینا. کپڑا پہنانا. ختنہ اور عقیقہ کرنا. وغیرہ سب سنتیں ہی تو ہیں. پھر زندگی گذارنا. پیٹ بھر کھانا کھانا. جوتا. پگڑی. کرتہ. اچکن وغیرہ پہننا یہ سب سنتیں ہی ہیں. اکثر صورتوں میں نکاح کرنا اور بیوی بچوں کی پرورش کرنا. مکان بنانا وغیرہ یہ سب سُنتیں ہیں. اسی طرح مرتے وقت کلمہ پڑھانا. کفن کی ترتیب دینا. قبر کی نوعیت وغیرہ یہ سب سنتیں ہیں. بعد موت ایصال ثواب کرنا وغیرہ سنتیں ہیں. اسی لئے ہمارا نام اہل فرض نہیں. بلکہ اہل سنت والجماعت ہے. جو لوگ کہ سنت نمازوں کے منکر ہیں. اُن کو چاہیئے کہ نہ تو مکان بنائیں. نہ دو وقتہ پیٹ بھر روٹی کھائیں. نہ عمدہ عمدہ لباس پہنیں. بلکہ جب مرنے لگیں تو جان بچانے کے لئے تھوڑے سے چنے کھالیا کریں. اور صرف ناف سے گھٹنوں تک لنگوٹا باندھا کریں. اور سخت ضرورت کے بغیر نکاح ہرگز نہ کریں. اپنا نام کچھ نہ رکھیں. کیونکہ فرض صرف اسی قدر ہیں. جو ہم نے عرض کر دیئے. یہ کیا کہ نماز کی سنتوں سے انکار اور باقی تمام سنتوں پر عمل. جناب سنت نے ہم کو انسان بنایا. رب تعالیٰ سنت پر قائم رکھے. سنت چھوڑنے والا شفاعت مصطفےٰ صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے محروم ہے.

| وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ③ |
|---|
| اور سے اوس دیا ہم نے اُن کو خرچ کرتے ہیں ۔ |
| اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ میں اٹھائیں |

**تعلق:** یہاں متقین کی صفات کا ترتیب وار ذکر ہو رہا ہے. پہلے ایمان کا ذکر ہوا جو سب کی اصل تھا. پھر نماز کا جو تمام اعمال سے افضل تھی. اور جس کا تعلق مومن کے بدن سے تھا. اب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا ذکر ہوا جس کا قوی تعلق مال سے ہے. چونکہ جب انسان پیدا ہوتا ہے. تو اُس کے پاس صرف جسم ہوتا ہے. اور مال بعد میں حاصل ہوتا ہے. اس لئے نماز کا ذکر پہلے اور خرچ کرنے کا ذکر بعد میں. **دوسرے** یہ کہ زکوٰۃ نماز کے بعد فرض ہوئی. اس لئے زکوٰۃ کا ذکر نماز کے بعد ہوا. **تیسرے** یہ کہ ایمان میں نجات ہے. اور نماز میں نجات اور خرچ میں درجات اور درجات نجات منجات سے پیچھے ہیں. اس لئے اس کو بعد میں بیان کیا گیا. **چوتھے** یہ کہ ایمان بشارت ہے نماز میں کفارہ ہے. اور خرچ میں طہارت یعنی پاکی ہے. اور یہ اُن دونوں سے پیچھے **پانچویں** یہ کہ ایمان میں عزت ہے. اور نماز میں قربت ہے. اور خرچ میں زیادتی ہے. اور زیادتی اُن دونوں کے بعد ہے. اس لئے اس کا ذکر بعد میں ہوا **چھٹے** یہ کہ اس آیت میں چار چیزوں کا ذکر ہوا. تقویٰ. ایمان بالغیب. اور نماز قائم کرنا. اور خرچ کرنا. اور یہ چاروں صفتیں چاروں خلفاء (یعنی ابوبکر صدیق عمر فاروق عثمان غنی مولیٰ علی) کی صفتیں ہیں. چنانچہ صدیق اکبر متقین کے سردار عمر فاروق مومنین کے پیشوا عثمان غنی. نمازیوں کے شہنشاہ مولیٰ علی راہ خدا میں خرچ کرنے والوں کے امام رضی اللہ عنہم اجمعین (تفسیر روح البیان) **تفسیر** اس جملے میں تین الفاظ ہیں. اور تینوں بہت گنجائش رکھتے ہیں جس کی وجہ سے یہ جملہ مسائل کا ایک دریا ہے. بلکہ یوں سمجھو کہ فقط یہ ایک جملہ ہی انسان کی ساری زندگی کے لئے کافی ہے. ایک مِمَّا دوسرے رَزَقْنٰهُمْ تیسرے يُنْفِقُوْنَ. مِمَّا میں مِنْ بعضیت کے لئے ہے. یعنی اپنی روزی میں سے کچھ حصہ خرچ کرے. اس سے دو فائدے حاصل ہوئے. ایک تو یہ کہ سارا مال راہ خدا میں خرچ کر کے خود فقیر بن جانا نہ چاہیئے. اگر آپ نے اپنا سارا مال فقیروں کو دے دیا. اور اپنے کو اور اپنی اولاد کو بھوکا رکھا تو بہت سے حقوق مار کر ایک نفلی کام کیا جو یقیناً منع ہے. اور اگر بعد میں بھیک مانگتے پھرے تو نفل ادا کر کے حرام میں پھنسے. کیونکہ بلا سخت ضرورت بھیک مانگنا حرام ہے. اسی لئے اس جگہ مِمَّا فرمایا گیا. ہاں اگر کوئی

اللہ کا بندہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرح متوکل ہو۔ اور اُس کے سارے گھر والے بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کی طرح متوکل ہوں۔ اور پھر وہ اپنا سارا گھر بار مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم پاک پر نثار کر دے۔ اور گھر میں اللہ و رسول کا نام رکھے تو یہ دوسری بات ہے ؎

ہوشیا آداب دانا دیگر ند سوختہ جان و رواناں دیگر ند

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تو پروانۂ شمع مصطفائی تھے۔ اُن سوختہ جانوں کے احکام ہی دوسرے ہیں۔ لہٰذا جو شخص اس آیت کو پیش کر کے اُن پر اعتراض کرتا ہے۔ وہ عاشقوں کی رمز سے ناواقف ہے۔ دوسرے اس طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ کہ ہمارے پاس عام طور پر دو قسم کے مال ہوتے ہیں کچھ حرام اور کچھ حلال۔ راہ خدا میں وہ مال خرچ کرو۔ جو نہایت طیّب اور حلال ہو۔ کیونکہ حرام مال اُس کی بارگاہ میں قبول نہیں۔ تیسرے یہ کہ ہمارے مالوں میں سے بعض مال ردّی ہوتے ہیں۔ اور بعض کھرے اللہ کی راہ میں کھرا مال خرچ کرو جس کی دوسری آیتوں میں تصریح فرمادی گئی ہے۔ اس لئے یہاں مِنْ ارشاد فرمایا گیا۔ (رَزَقْنٰھُمْ) یہ رِزْقٌ سے بنا ہے رزق کے لغت میں دو معنی ہیں عطاء یعنی دی ہوئی چیز حصہ وَ تَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ اس آیت میں رزق حصہ کے معنی میں استعمال ہوا۔ اصطلاح میں رزق وہ ہے جس سے کوئی جاندار چیز نفع حاصل کرے۔ لہٰذا ہوا۔ پانی۔ لباس۔ غذائیں۔ زمین اولاد وغیرہ غرضکہ دنیا کی ہر نعمت رزق ہے۔ تو اب آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ ہر نعمت میں سے ہماری راہ میں خرچ کریں۔ لیکن ہر چیز کا خرچ کرنا اُس کے مواقف ہوگا۔ مثلاً ہوا سے سانس لیتے ہیں۔ تو کچھ سانسیں اللہ کے ذکر میں خرچ کرو۔ یہ سانسوں کی زکوٰۃ ہوئی۔ اگر اولاد آپ کو ملی ہے۔ تو جس طرح چند بچوں کو دُنیوی کاروبار میں ماہر بناتے ہو۔ اُن میں سے کم از کم ایک کو حافظ قرآن یا عالم دین بھی بناؤ۔ اور جس طرح سے کہ اپنی اولاد کو دنیوی کام سکھاتے ہو۔ کوئی دینی کام بھی سکھاؤ۔ اور اُن کو یہ بھی سمجھا دو۔ کہ تم کس درخت کی شاخ اور کس شاخ کے پھل ہو۔ اسی طرح اگر تمہارے پاس مال ہے۔ تو مال کو بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ لفظ رَزَقْنٰھُمْ ان سب کو شامل ہے۔ شریعت میں سات طرح مال خرچ کرنا عبادت ہے۔ زکوٰۃ اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اور ہر قسم کے ہزارہا مسائل۔ چاندی سونے کی زکوٰۃ۔ جانوروں کی زکوٰۃ زمین کی پیداوار کی زکوٰۃ وغیرہ وغیرہ (۲) صدقۂ فطر (۳) نفلی صدقے۔ اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ مہمانوں کی دعوت کمزوروں کی مدد یتیموں کی پرورش اور قرضداروں کے قرضوں کی ادائیگی۔ گیارہویں شریف۔ محفل میلاد پاک وغیرہ سب اس میں شامل ہیں (۴) وقف اسکی بھی بہت صورتیں ہیں مسجدیں دینی مدرسے پل کنوئیں سرائے وغیرہ بنانا (۵) حج کے خرچ (۶) جہاد (۷) اپنے ذمے اہل قرابت کے جو خرچ لازم ہیں اُنکا ادا کرنا۔ اسکی بھی بہت سی قسمیں ہیں بیوی کے مصارف چھوٹی اولاد کی پرورش والدین کا خرچ غریب اہل قرابت کی امداد وغیرہ اسی پر انحصار ہیں

(يُنْفِقُوْنَ) اِنْفَاقٌ نَفَقٌ سے بنا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں۔ بکھیرنا یا الگ الگ ہونا۔ اسی لئے جس کا دل اور زبان ایک نہ ہو۔ اُسے منافق کہتے ہیں کیونکہ اُس کا دل زبان سے علیحدہ ہے۔ لومڑی کے سوراخ کو نافقہ کہتے ہیں کیونکہ اُس کے علیحدہ علیحدہ دو دروازے ہوتے ہیں۔ ایک ظاہر اور ایک چھپا ہوا۔ اور رائج سکّے کو نافقہ کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک جگہ مشکل سے جمع ہوتا ہے۔ خرچ کو بھی نفقہ اسی لئے کہتے ہیں۔ کہ اس میں مال گویا بکھیر دیا جاتا ہے۔ آپ کی جیب میں پچاس روپے ہیں۔ بازار جا کر آپ نے پانچ روپے کپڑے والے کو دیئے۔ دس غلّے والے کو۔ کچھ مٹھائی وغیرہ میں صرف کئے۔ تو وہ پیسہ جو آپ کی جیب میں ایک جگہ جمع تھا منتفرق ہو گیا۔ خرچ چند طرح کا ہے۔ حرام خرچ جیسے شراب نوشی، جوا وغیرہ۔ جائز خرچ جیسے دنیوی ضروریات میں پیسہ خرچ کرنا مستحب سنت اور فرض۔ اس جگہ وہ خرچ مراد ہے۔ جو رضاء الٰہی کے لئے ہو۔ خواہ فرض ہو یا نفل۔ جن مفسرین نے اس کی تفسیر زکوٰۃ سے کی ہے۔ انہوں نے ایک خاص قسم سے تفسیر کر دی۔ بہر حال قرآن پاک کا یہ جملہ ہزارہا مسائل کو شامل ہے۔

**تفسیر صوفیانہ**۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ یہ آیت کریمہ جس طرح ظاہری نعمتوں کے خرچ کو شامل ہے۔ اسی طرح باطنی نعمتوں کا خرچ بھی اس میں داخل ہے۔ لہٰذا غنی اپنے مال سے خرچ کرے۔ علماء اپنے علم سے خرچ کریں۔ کہ لوگوں کو سکھائیں اور مسائل

بتائیں۔ عابدین اپنی جان خرچ کریں۔ کہ حق تعالیٰ کی اطاعت میں کوتاہی نہ کریں۔ اور عارفین اپنے دل کو خرچ کریں۔ کہ اس دل کو دنیا کی گندگیوں کا گھورا (روڑی) نہ بنائیں بلکہ دنیوی فکروں کو قلب میں نہ آنے دیں۔ اس گھر کو یار کے لئے صاف رکھیں گندے گھر میں بادشاہ نہیں آتا۔ اور دنیوی مصیبتوں کو دل سے اس طرح باہر رکھیں جیسے کشتی سے دریا کا پانی۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

آب در کشتی ہلاکِ کشتی است    آب اندر زیرِ کشتی پشتی است

کشتی کے لئے پانی ضروری ہے لیکن اگر پانی کشتی کے اندر جائے تو ڈوب جائے گی۔ اسی طرح دل کے لئے بھی تفکرات ضروری۔ اگر یہ تفکرات نہ ہوں۔ تو دل کس چیز پر پنپے گا۔ لیکن اگر یہ تفکرات دل میں آ گئے۔ تو دل ہلاک ہو جائیگا۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ غنی مال سے جیب خالی کرے اور فقیر غیر سے اپنے قلب کو صاف کرے۔ مثنوی شریف میں ہے ؎

آں درم دادن سخی را لائق ست    جاں سپردن خود سخائے عاشق ست

**زکواۃ کے اسرار اور فائدے** ۔ یہ قدرتی بات ہے۔ کہ خرچ کرنے سے چیز بڑھتی ہے۔ اگر عالم اپنا علم خرچ نہ کرے تو اس سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اگر کنوئیں سے پانی خرچ نہ کیا جائے تو پانی گندہ ہو جائے گا۔ اگر درختوں کی کچھ شاخیں نہ کاٹی جائیں۔ تو ان میں آئندہ پھل کم آئیں گے۔ اسی طرح اگر مال کی زکواۃ ادا نہ کی جائے۔ تو اس مال کی ترقی رُک جائے گی۔ (۲) قدرت نے ہر چیز سے زکواۃ لی ہے بیماری تندرستی کی زکواۃ ہے۔ نیند بیداری کی زکواۃ۔ تکلیفیں راحتوں کی زکواۃ۔ کھیتوں میں کچھ غلے کا برباد ہو جانا۔ اور پرندوں کا کھا جانا یہ پیداوار کی قدرتی زکواۃ۔ اگر اپنے مال میں سے زکواۃ نہیں نکالتے تو قانونِ قدرت کے خلاف کرتے ہیں۔ (۳) اگر کسی کو کوئی چیز ضرورت سے زائد دی جائے۔ تو وہ اور جگہ بھی خرچ ہونی چاہیئے۔ کتے وغیرہ کے پستان میں اتنا ہی دودھ ہے۔ جتنا اس کے بچے پی سکیں لیکن بھینس گائے کو اس کے بچے کی ضرورت سے زیادہ دودھ دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ اس میں اوروں کا بھی حق ہے۔ اگر قدرت نے آپ کو آپ کی ضرورت سے زیادہ مال دیا ہے۔ تو یقیناً اس میں فقراء اور مساکین کا بھی حصہ ہے۔ زائد چیز کو علیحدہ کرنا ہی ضروری ہے۔ آپ کے بڑھے ہوئے ناخن اور بال لبیں وغیرہ علیحدہ ہونی چاہئیں۔ اسی طرح پیٹ کا فضلہ بھی خارج ہونا چاہیئے۔ اس کا رہنا بیماری ہے اسی طرح زکواۃ کا پیسہ بھی علیحدہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس کا رہنا بیماری ہے (۵) جس طرح کہ آپ کے مال سے حکومت ٹیکس لیتی ہے۔ کہ اس کے بغیر ادا کئے آپ حکومت کے باغی قرار پاتے ہیں۔ اور وہ یہ کہتی ہے۔ کہ جب ہم تمہاری ہر طرح خدمت کرتے ہیں۔ اور تمہارے آرام کے لئے ہر قسم کے محکمے بنا دیئے ہیں۔ تو کیا ہمارا اتنا بھی حق نہیں کہ تمہارے مال میں سے ہم کچھ لیں۔ اسی طرح جب رب تعالیٰ نے ہماری ہر قسم کی پرورش فرمائی۔ ہمارے آرام کے لئے ہزاروں ملائکہ وغیرہ کے محکمے مقرر فرمائے۔ تو کیا اس کا اتنا بھی حق نہیں۔ کہ ہمارے مال میں سے کچھ طلب فرمائے۔ بلکہ حق تو یہ ہے۔ کہ یہ مال بھی اُسی کا ہے۔ اور ہم بھی اُسی کے یہ اس کا کرم ہے۔ کہ اس نے ہم کو مال دیا اور خود ہم سے لیکر ہم کو ثواب عطا فرما دیا۔ زکواۃ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے۔ کہ اس کی وجہ سے مال بربادی وغیرہ سے محفوظ رہتا ہے۔ اور اس میں ہمیشہ برکت رہتی ہے۔ زکواۃ دینے سے بظاہر جیب خالی ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت میں بھرتی ہے۔ مثنوی شریف میں فرمایا گیا ؎

ہر کہ کارد گردد انبارش تہی    لیکش اندر مزرعہ باشد بہی
وانکہ در انبار ماندہ و صرفہ کرد    اسپش وموش وحوادث ہاش خورد

یعنی ایک کسان نے غلہ بویا۔ دوسرے نے نہ بویا۔ بظاہر بونے والے کے بورے خالی ہو گئے۔ اور نہ بونے والے کے بورے بھرے رہے۔ لیکن حقیقت میں نہ بونے والا خالی ہو گیا۔ کیونکہ اس کے غلہ کو چند روز میں جانور، چوہے۔ مہمان اور بال بچے وغیرہ خرچ کر ڈالیں گے۔ لیکن جس نے بویا۔ اس کے بورے پہلے سے زیادہ بھر جائیں گے۔ تفسیر روح البیان میں اس جگہ ہے۔ کہ کسی نبی پر وحی

آئی۔ کہ فلاں شخص کی آدھی عمر غناء میں اور آدھی فقیری میں گذرنے والی ہے۔ اُس سے پوچھو کہ پہلے کونسی چیز چاہیئے۔ اُس نے عرض کیا۔ کہ میں پہلے غنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا اُس کو غنی کر دیا گیا۔ لیکن اُس نے تدبیر یہ کی کہ جتنا پیسہ اپنے نفس پر خرچ کرے۔ اتنا ہی بلکہ اُس سے زیادہ فقراء اور مساکین پر۔ جب اُس کی آدھی عمر گذر گئی۔ تو اُن پیغمبر پر دوبارہ وحی آئی۔ کہ چونکہ اس نے ہماری نعمتوں کا شکر ادا کیا۔ اور شکر سے نعمتیں بڑھتی ہیں۔ لہٰذا اس کی ساری عمر غناء ہی میں کٹے گی **پہلا اعتراض** زکواۃ قوم کو ترقی سے روکتی ہے۔ زکواۃ دینے سے غریبی آتی ہے۔ اسی لئے مسلمان دوسری قوموں سے زیادہ غریب ہیں **جواب** زکواۃ قوم کی ترقی کا اصل راز ہے۔ اگر صحیح معنی میں زکواۃ دی اور لیجائے۔ تو قوم میں کوئی بھی غریب نہیں رہ سکتا۔ مسلمان جب تک زکواۃ دیتے رہے بہت مالدار رہے جب سے زکواۃ دینے میں کمی کی غریبی آئی۔ اس وقت مسلمانوں کی غربت کی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ بیکاری پسند کرتے ہیں مقدمہ بازیوں اور شادی بیاہ کی ناجائز رسموں اور عیاشیوں میں خود کو تباہ کر رہے ہیں۔ ایسی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔ کہ کوئی شخص زکواۃ دینے سے غریب ہو گیا ہو۔

**دوسرا اعتراض** آریوں کا۔ زکواۃ کے قانون سے مسلم قوم میں بیکاری اور بھیک مانگنے کی عادت پڑ گئی کیونکہ جب انہیں معلوم ہے۔ کہ زکواۃ کا پیسہ مالداروں سے مل جائے گا تو پھر وہ محنت کیوں کریں۔ **جواب**۔ یہ زکواۃ کی خرابی نہیں۔ بلکہ زکواۃ کے غلط استعمال کی خرابی ہے اسلام نے جس طرح کہ مالداروں کو زکواۃ دینے کی رغبت دی ہے۔ اسی طرح فقراء مساکین کو کما کر کھانے کا۔ اور بھیک سے بچنے کا سخت حکم دیا جس کے متعلق قرآن پاک کی آیتیں اور احادیث بکثرت موجود ہیں۔ زکواۃ لینا تو سخت مجبوری کے وقت ہے۔ اگر کوئی شخص کسی اچھی چیز کو غلط استعمال کرے تو یہ اُس کے استعمال کی خرابی ہے۔ نہ کہ اُس چیز کی۔ کوئی شخص ریل سے خودکشی کر لے۔ تو اُس سے ریل بُری نہیں ہو گی بلکہ اُس کی حرکت بُری ہوئی۔ اگر زکواۃ سے بیکاری بڑھتی ہے۔ تو ہندوؤں میں سادھو اور بھیکاریوں کی جماعتیں کیوں موجود ہیں **تیسرا اعتراض**۔ رب کو راضی کرنے کے لئے صرف ایک نیک عمل کی ضرورت ہے۔ صدہا قسم کے اعمال شریعت نے کیوں بتائے۔

**نوٹ**۔ یہ اعتراض خاکساریت کی جڑ ہے۔ کہ اُن کے نزدیک صرف جھوٹی خدمت خلق اور نام کا غلط جہاد نجات کا مدار ہے۔ نماز روزے کو مولویوں کی شکم پروری بتایا۔ **جواب** جس طرح کہ زندہ رہنے کے لئے ہزارہا چیزوں کی ضرورت ہے۔ غذا۔ پانی لباس۔ مکان۔ دوا وغیرہ کہ ان کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ زندگی کے لئے صرف ہوا کافی ہے۔ غذا وغیرہ کی کیا ضرورت ہے۔ وہ دیوانہ ہی تو ہے تو جس طرح جسمانی زندگی کے لئے بہت سی چیزیں درکار اسی طرح روحانی زندگی کے لئے بہت سے اعمال ضروری **دوسرا جواب** یہ ہے۔ کہ دنیا میں انسان کا تعلق بہت سی چیزوں سے ہے۔ اور ہر تعلق میں انسان صدہا گناہ کر لیتا ہے۔ تو ضرورت تھی۔ کہ ہر تعلق میں کوئی نہ کوئی عبادت بھی رکھی جائے۔ تاکہ اُس سے یہ چیزیں پاک ہوتی رہیں۔ چونکہ انسان کو تعلق مال سے بھی ہے۔ اور اس مال میں بہت سی بے احتیاطیاں ہوتی رہتی ہیں اس لئے ضرورت تھی۔ کہ اس میں ایک عبادت رکھی جائے۔ اسی کا نام زکواۃ ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾

اور وہ لوگ ایمان لائے ہیں ساتھ اُس اُتارا گیا طرف آپ اور وہ اُتارا گیا سے پہلے آپ کے اور ساتھ آخرت وہ یقین کرتے ہیں

اور وہ کہ ایمان لائیں اُس پر جو اے محبوب تمہاری طرف اترا اور جو تم سے پہلے اترا اور آخرت پر یقین رکھیں۔

**تعلق**۔ اس آیت کو پہلی آیت سے چند طرح سے تعلق ہے۔ بعض تعلقات عبارت کے لحاظ سے ہیں۔ اور بعض مضمون کے لحاظ سے عبارت کے لحاظ سے یہ ہے۔ کہ یا تو یہ علیحدہ جملہ ہے۔ اور یہ مبتدا ہے۔ اور اُولٰٓئِكَ سے آخیر تک اُس کی خبر ہے۔ تو اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ جن لوگوں میں یہ تین صفتیں ہوں۔ وہ ہدایت پر ہیں۔ اور کامیاب ہیں اور یا یہ اَلَّذِيْنَ پہلے اَلَّذِيْنَ پر معطوف ہے تو

تو اس صورت میں یہ معنی ہوں گے۔ کہ یہ قرآن پاک اُن پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے جنہیں وہ پہلی تین صفتیں بھی ہوں۔ اور یہ تینوں صفتیں بھی ہوں جواب بیان ہو رہی ہیں۔ تو گویا یہ آیت بھی متقین کی تفسیر ہے۔ اور یا یہ اَلَّذِیْنَ متقین پر معطوف ہے۔ تو آیت کے معنی یہ ہونگے کہ یہ قرآن کریم پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے۔ اور اُن لوگوں کے لئے بھی جن میں یہ تین صفتیں ہوں۔ ان صورتوں میں اُولٰٓئِكَ سے علیحدہ جملہ شروع ہوگا۔ مضمون کے لحاظ سے بھی چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ پہلی آیت میں متقین کی صفت یہ بیان کی تھی۔ کہ جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور بظاہر غیب سے مراد اللہ کی ذات و صفات تھی اور فقط رب کی ذات و صفات کو ماننا متقی ہونے کے لئے کافی نہیں۔ جب تک کہ انبیاء کرام اور آسمانی کتابوں اور قیامت پر بھی یقین نہ ہو۔ ان چیزوں کو اس آیت میں بیان کیا گیا (تفسیر فتح المنان)۔ دوسرے اس طرح کہ پہلی آیت میں اُن پرہیزگاروں کا ذکر ہوا تھا۔ کہ جو بے پڑھے ہوں۔ اور مشرکین عرب میں سے ایمان لاکر پرہیزگار بنے۔ کیونکہ اُن کیلئے نبوت اور آسمانی کتابیں اور قیامت وغیرہ سب ہی چیزیں بالکل غیب تھیں کیونکہ وہ اُن سب سے ناواقف و بے خبر تھے۔ اور اب اُن اہل کتاب کا ذکر ہو رہا ہے۔ کہ جو پہلے سے نبوت اور آسمانی کتابوں اور قیامت کو جانتے اور مانتے تھے۔ اور جن کے لئے یہ چیزیں کسی قدر ظاہر تھیں۔ تو یوں سمجھو کہ پہلے اُن مسلمانوں کا ذکر ہوا جو شرک سے نکل کر اسلام میں داخل ہوں۔ اور اب اُن مسلمان کا ذکر ہو رہا ہے۔ کہ جو یہودیت اور عیسائیت سے توبہ کر کے مسلمان ہوں جس سے معلوم ہوا۔ کہ یہ کتاب دونوں قسم کے لوگوں کے لئے پوری ہدایت ہے تیسرے اس طرح کہ یہ آیت پہلی آیت کی تفصیل ہے۔ وہ اس طرح کہ پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ پرہیزگار وہ جو غیب پر ایمان لائیں۔ اور اب اُس کی تفصیل اس طرح فرمائی گئی۔ کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں۔ جو ساری آسمانی کتابوں پر ایمان لائیں مگر ان دونوں تعلقات میں غیب سے مراد ساری چھپی ہوئی چیزیں ہیں (تفسیر) ایمان کے معنی اور اُس کے اقسام اس سے پہلے بیان کئے جا چکے۔ مَآ اُنْزِلَ میں دو کلمے بہت غور کے قابل ہیں۔ اوّلاً ما اور دوسرے اُنْزِلَ مَا کے معنی ہیں ہر وہ چیز۔ اور اُنْزِلَ کے معنی جو اتاری گئی آپ کی طرف جس سے یہ بات معلوم ہوئی۔ کہ صرف قرآن پاک کو ماننا مومن و متقی بننے کے لئے کافی نہیں۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری احادیث پاک کو ماننا از بس ضروری ہے۔ ورنہ یہاں بالقرآن فرمایا جاتا۔ تو آیت کا مقصود یہ ہوا۔ کہ اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم متقی وہ ہیں جو اُن ساری چیزوں پر ایمان لائیں۔ جو آپ پر اُتریں خواہ بذریعہ ظاہر وحی کے جیسے قرآن کریم یا بذریعہ چھپی ہوئی وحی کے معنی الہام وغیرہ جیسے احادیث۔ لہذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ خواب میں دیکھ کر بیان فرمائیں۔ اُس کا ماننا۔ اور جو کچھ کہ آپ کے قلب پاک پر الہام ہو اُس کا ماننا اور جو ظاہر وحی سے آئے۔ اُس کا ماننا۔ غرضکہ جو لب پاک مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہو۔ اُن سب کا ماننا ایمان کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ یہ سب رب کی طرف سے ہوتا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى ہمارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنی خواہش سے بولتے ہی نہیں۔ بلکہ وہ سب وحی ہوتی ہے۔ جو اُن کی طرف کی جاتی ہے۔ لہذا جو شخص ان میں سے کسی چیز کا منکر ہو وہ کافر ہے۔ ہم قرآن و حدیث کا فرق مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں۔ جن احادیث شریفہ کو قرآن پاک کی آیتوں نے منسوخ فرما دیا جیسے کہ بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینا وغیرہ جس کو بے ادب کہہ دیتے ہیں کہ وہ معاذ اللہ نبی کی غلطی تھی۔ اُن کا ماننا بھی اُس وقت فرض تھا۔ جبکہ وہ کلام ارشاد ہوا تھا۔ اور اس منسوخ ہونے میں بھی عجیب راز ہیں۔ جن کو ہم نے اپنی کتاب "سلطنت مصطفٰے" میں بیان کیا ہے۔ البتہ بطور مشورہ جو باتیں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمائیں۔ اُن کا یہ درجہ نہیں۔ اسی لئے یہاں ارشاد ہوا بِمَآ اُنْزِلَ اور یہ نہ فرمایا گیا۔ کہ بِمَا قُلْتَ (یعنی جو کچھ آپ کہیں۔ انزال کے معنی ایک دم اتارنے کے ہیں۔ چونکہ ہر آیت ایک دم ہی اترتی تھی۔ اس لئے یہاں اُنْزِلَ فرمایا گیا۔ یعنی ہر اُس آیت اور حدیث پر ایمان لائیں۔ جو ایک دم آپ پر اتری۔ اتارنے کے معنی اور اس کی پوری تحقیق ہم مقدمہ میں کر چکے ہیں۔ اِلَیْكَ میں بہت گنجائش ہے۔ جو چیزیں حضور علیہ السلام کے قلب پاک پر بطور الہام اتریں۔ وہ بھی اس میں شامل ہیں۔ اور جو کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے آکر عرض کیں۔ اور حضور علیہ السلام نے کان

مبارک سے سُنیں۔ وہ بھی اس میں داخل اور جن چیزوں کو آنکھوں سے ملاحظہ فرمالیا خواہ فرش پر رہ کر یا عرش پر جاکر وہ سب اس میں شامل ہیں۔ لہذا نماز۔ روزہ۔ زکواۃ اور نماز کی رکعتیں اور زکواۃ کے نصاب وغیرہ سب اسمیں شامل ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض چیزیں وہ ہیں۔ جو حضور علیہ الصلواۃ والسلام نے قلب پاک سے معلوم فرمائیں۔ اور بعض وہ جو سُن کر یا دیکھ کر معلوم کیں۔

وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ سے معلوم ہوا۔ کہ جس طرح قرآن پاک کا ماننا ایمان کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح ساری آسمانی کتابوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ لیکن ان دونوں کتابوں کے ایمان لانے میں دو طرح فرق ہے۔ ایک یہ کہ سارے قرآن پاک کا ماننا بھی ضروری۔ اور اس کی محکم آیتوں پر عمل کرنا بھی ضروری لیکن پچھلی کتابوں کا فقط اس طرح ماننا ہی ضروری ہے۔ کہ وہ آسمانی کتابیں تھیں۔ جو اُن پیغمبروں پر آئیں تھیں۔ وہ سب حق تھیں۔ لیکن اُن پر عمل کرنا ہمارے ذمہ لازم نہیں اور قرآن کریم نے پہلے آسمانی کتابوں کے جو احکام نقل فرما دیئے (جیسے کہ قصاص۔ اور سزاؤں کے احکام، اُن پر عمل کرنا ہمیں بھی ضروری ہے لیکن اس لئے نہیں۔ کہ وہ اُن کتابوں کے حکم تھے۔ بلکہ اس لئے اُن کا ذکر بغیر تردید کے ہمارے قرآن پاک میں آگیا۔ دوسرے اس طرح کہ اُن کتابوں کا تفصیل سے جاننا ضروری نہیں صرف اتنا ماننا کافی ہے۔ کہ کچھ کتابیں آئی تھیں اور وہ حق تھیں لیکن قرآن پاک کے بقدر ضرورت احکام کی تفصیل جاننا ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔ اور پورے قرآن پاک کی تفصیل جاننا فرض کفایہ جس فریضہ کو علماء کرام ادا کرتے ہیں۔ ان فرقوں کی وجہ سے مَا اُنْزِلَ کو دوبار فرمایا گیا۔ قرآن پاک کے لئے علیحدہ اور باقی ساری آسمانی کتابوں کے لئے علیحدہ **نکتہ** منسوخ احکام کا ماننا ضروری ہوتا ہے۔ اور اُن پر عمل کرنا اکثر منع۔ وَبِالْاٰخِرَةِ۔ ہمیں تین جگہ رہنا ہے۔ کچھ روز تو دنیا میں۔ کچھ روز قبر میں یعنی عالم برزخ میں اور ہمیشہ آخرت میں۔ دنیا کی ابتدا ہماری پیدائش سے ہے۔ اور اُسکی انتہا ہماری موت پر۔ اور برزخی زندگی کی ابتداء مرنے سے اور اُسکی انتہا قیامت پر آخرتی زندگی کی ابتداء قیامت سے اور اُسکی انتہا کبھی نہیں بلکہ اُسکی بقا ہمیشہ دنیا کو دنیا اسلئے کہتے ہیں کہ یا تو یہ دُنُوٌّ سے بنا ہے یا دَنَاءَةٌ سے اگر دُنُوٌّ سے بنا ہے تو اسکے معنی ہوئے قریب کی چیز کیونکہ اسکی فنا قریب ہے اور اگر دَنَاءَةٌ سے بنا ہے تو اس کے معنی ہیں دنی یا حقیر چیز برزخ کے معنی ہیں۔ پردے کے چونکہ برزخی زندگی دنیوی اور اخروی زندگی کے درمیان ایک پردہ ہے۔ کہ نہ وہاں عمل ہیں اور نہ کئے ہوئے اعمال کی جزاء۔ لہذا اُسے برزخ کہتے ہیں۔ آخرت کے معنی دوسری چیز چونکہ وہ دوسری زندگی ہے۔ اس لئے اُس کو آخرت کہا جاتا ہے یہاں آخرت سے مراد یا تو لغوی آخرت ہے۔ یا اصطلاحی۔ لغوی آخرت میں برزخ بھی داخل ہے۔ تو معنی یہ ہوں گے۔ کہ دنیا کے علاوہ دوسری ہر حالت پر وہ یقین رکھتے ہیں یعنی برزخ کے حالات پر بھی اور آخرت کے حالات پر بھی اور اگر اصطلاحی معنے مراد ہوں۔ تو آیت کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ قیامت اور اُس کے بعد کے حالات پر یقین رکھتے ہیں کچھ بھی ہو۔ اِن سب کا ماننا ایمان کے لئے ضروری ہے۔ چونکہ دُنیا کی زندگی اور اُس کے سارے حالات محسوس ہیں۔ اور وہ دونوں حالتیں غیب ہیں۔ لہذا دنیا پر ایمان لانا ضروری نہیں۔ بلکہ اُن دونوں کا ماننا ایمان کے لئے ضروری ہے۔ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ هُمْ کا بڑھانا انحصار کے لئے ہے۔ یعنی اِن ہی لوگوں کو آخرت پر یقین ہے آریہ یا سناتنی ہندو وغیرہ چونکہ نہ قیامت کو مانیں۔ اور نہ قیامت کے بعد کے حالات کو اس لئے یہ حصر صحیح ہوا۔ اسی طرح عیسائی اور یہودی اگرچہ قیامت وغیرہ کو مانتے ہیں۔ لیکن غلط طریقہ سے چنانچہ وہ کہتے ہیں۔ کہ جنت میں صرف یہودی یا عیسائی ہی جائیں گے۔ اور نیز یہ کہ یہودیوں کو فقط چند دن ہی آگ کا عذاب ہوگا۔ اور یہ کہ جنت کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں کی طرح نہیں ہیں یعنی وہاں غذائیں اور بیویاں نہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں جسم کی پرورش اور نسل کے بڑھانے کے لئے ہوتی ہیں۔ اور ان کی وہاں ضرورت نہیں۔ بلکہ وہاں صرف روحانی خوشی اور سرور ہوگا۔ اور اُن میں سے بعض کہتے ہیں۔ کہ یہ سب چیزیں تو ہوں گی لیکن ہمیشہ نہ رہیں گی بلکہ دنیا کی طرح وہ بھی مٹ جائیں گی۔ اس لئے ان لوگوں نے حقیقتاً صحیح معنی میں آخرت کو نہ مانا (تفسیر روح البیان) ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے علاوہ کسی نے بھی آخرت کو صحیح طور پر نہ مانا بعض نے بالکل نہ مانا جیسے آریہ اور بعض نے غلط طریقہ سے مانا۔ لہذا یہ انحصار بالکل صحیح ہوا **تنبیہ** جو شخص مسلمانی کا دعویٰ کر کے جنت دوزخ وغیرہ کا انکار

کرے۔ یا وہاں کی نعمتوں میں عیسائیوں کی طرح تاویل کرے۔ جیسے کہ سرسید علیگڑھی اور اس کے ہوا خواہ وہ کافر و مرتد ہے۔ اور اس آیت سے خارج
(يُوقِنُونَ) يُوقِنُونَ یقین سے بنا ہے۔ اور یقین کے دو معنی ہیں۔ ایک کسی چیز کو بلاشبہ جاننا یعنی پہلے شبہ ہو۔ اور بعد میں تدبر
(تفسیر کبیر یہی مقام) یا دلائل سے بلاشبہ جاننا۔ اسی لئے حق تعالیٰ کے علم کو یقین نہیں کہتے۔ "تفسیر روح البیان یہی مقام" کیونکہ خداوند کریم کا علم نہ
تو دلائل سے ہے۔ اور نہ شک وشبہ کے بعد اسی طرح حضور علیہ السلام کو جو اپنی نبوت کا علم ہے۔ اس کو یقین نہ کہا جائے گا۔ کیوں کہ ان کو نہ تو
اس سے پہلے شک تھا۔ اور نہ ان کو یہ علم دلائل سے حاصل ہوا۔ ابو اللیث رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ کہ یقین تین طرح کا ہے۔ یقین عیاں۔ یقین خبر
یقین دلالت۔ یقین عیاں تو یہ ہے۔ کہ خود چیز کو دیکھ اس کا یقین حاصل ہو۔ یقین خبر وہ ہے جو کسی سے خبر پا کر اس چیز کا یقین حاصل ہو۔ جیسے
کہ ایک شخص نے بغداد کو دیکھ کر جانا۔ دوسرے نے سن کر۔ یقین دلالت یہ ہے۔ کہ چیز کی علامت اور آثار کو دیکھ کر اس کا یقین ہو جیسے کہ دھوئیں
کو دیکھ کر آگ کا اور دھوپ کو دیکھ کر آفتاب کا یقین۔ یہاں یقین سے آخری دو قسمیں مراد ہیں۔ بلکہ شریعت میں یقین خبری معتبر ہے کیونکہ جو شخص نبی کا انکار کرکے
اور ان ساری چیزوں کو اپنی عقل سے معلوم کرے وہ شریعت میں مومن نہیں۔ اسی لئے اس آیت میں آخرت کے یقین کو ذکر کیا ایمان کے بعد بیان کیا۔ **تفسیر صوفیانہ** صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ یقین کے بھی تین درجے ہیں اور
ایمان کے بھی۔ علم الیقین۔ عین الیقین۔ حق الیقین۔ علم الیقین سن کر جاننا۔ عین الیقین دیکھ کر جاننا اور حق الیقین اس میں فنا ہو کر جاننا۔ اس
کی مثال یوں سمجھو کہ ایک شخص سن کر جانتا ہے۔ کہ آگ گرم ہے۔ دوسرا آگ کے پاس بیٹھا ہوا۔ اس کی گرمی محسوس کرکے جان رہا ہے۔ کہ
آگ گرم ہے۔ تیسرے نے اپنے آپ کو آگ میں ڈال دیا اور آگ نے اس کی رگ رگ میں سرایت کی اور وہ زبان حال سے کہنے لگا

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری!

اس فنا کے بعد اس کو جاننا تو پہلا علم الیقین ہوا۔ دوسرا عین الیقین اور تیسرا حق الیقین۔ حق الیقین والا جس پر نظر فرما دے۔ اس
کو بھی رنگ دے۔ کوئلہ جب آگ بن جاتا ہے۔ تو جسم تو کوئلہ کا سا رہتا ہے۔ لیکن وہ کام آگ کا سا کرتا ہے۔ **نیز** صوفیاء کرام فرماتے ہیں
کہ جو شخص ان درجات میں ترقی چاہتا ہے۔ وہ حسب ذیل کام کرے۔ (۱) باوضو رہنا۔ (۲) کم کھانا۔ (۳) اکثر خاموش رہنا۔ (۴) اکثر خدا کا ذکر کرنا (۵) عالم کی چیزوں
میں غور کرنا۔ (۶) فرائض اور سنتوں کی پابندی کرنا۔ (۷) دنیا والوں سے بے غرض رہنا۔ (۸) کم سونا۔ (۹) حلال کھانا۔ (۱۰) سچ بولنا۔ یہ چیزیں ان قفلوں کی چابیاں
ہیں۔ یقین کا نتیجہ یہ ہونا چاہئیے۔ کہ انسان دنیا میں آخرت کی تیاری کرے۔ تفسیر روح البیان شریف میں اس جگہ ہے۔ کہ چند لوگ بہت دھوکے
میں ہیں۔ ایک وہ جو اللہ کو خالق جان کر اس کی عبادت نہیں کرتے۔ ۲۔ وہ جو اللہ کو رازق جان کر اس پر بھروسہ نہیں رکھتا۔ ۳۔ وہ جو کہ دنیا کو فانی
جان کر۔ اس پر بھروسہ کرتا ہے۔ ۴۔ وہ جو کہ اپنے وارثوں کو اپنا دشمن سمجھ کر دین کھو کر ان کے لئے مال جمع کرتا ہے۔ ۵۔ وہ جو کہ موت کو مان کر
اس کی تیاری نہیں کرتا۔ ۶۔ وہ جو کہ جانتا ہے۔ کہ قبر میری جگہ ہے۔ اور پھر اس کو آباد نہیں کرتا۔ ۷۔ وہ جو کہ جانتا ہے۔ کہ اللہ پاک حساب
لے گا۔ اور پھر اپنا حساب صاف نہیں رکھتا۔ ۸۔ وہ جو کہ جانتا ہے۔ کہ پل صراط پر چلنا پڑے گا۔ اور اپنا بوجھ ہلکا نہیں کرتا۔ ۹۔ وہ جو کہ جانتا ہے
کہ جہنم بدکاروں کی جگہ ہے۔ مگر اس سے نہیں بھاگتا۔ ۱۰۔ اور وہ جو کہ جانتا ہے۔ کہ جنت ابرار کی جگہ ہے۔ مگر اس کی طرف نہیں آتا حق تعالیٰ
ہم سب کو عمل کی توفیق دے۔ **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ سارے قرآن پاک پر ایمان لانے سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ تو جو
صحابہ کرام سارے قرآن شریف کے اترنے سے پہلے وفات پا گئے تھے۔ وہ متقی نہ ہوئے **جواب** اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے۔ کہ
ان سب کا ایمان سارے قرآن پاک پر تھا جو آ گیا تھا۔ اس پر بھی اور جو آنے والا تھا۔ اس پر بھی ایمان لانے کے لئے اس چیز کا آ جانا ضروری
نہیں۔ دیکھو ہمارا قیامت پر ایمان ہے۔ مگر وہ ابھی آئی نہیں۔ **دوسرا اعتراض** اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں
انجیل و توریت وغیرہ ساری کتابیں صحیح موجود تھیں۔ کیونکہ اگر صحیح نہ ہوتیں تو ان پر ایمان کیسے لایا جاتا۔ اور ان پر بغیر ایمان لائے تقویٰ حاصل
نہیں ہو سکتا۔ اگر مسلمان موجودہ انجیلوں وغیرہ کو غلط مانتے ہیں۔ تو وہ اپنے ایمان کی بھی خیر منائیں۔ **جواب**۔ انجیلیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام

کے زمانہ سے پہلے ہی خلط ملط ہو چکیں تھیں چنانچہ پولُس مقدس نے جو خط گلیتوں کو لکھا ہے۔ اُس کے پہلے باب میں ہے۔ کہ لوگوں نے انجیل کو اُلٹ پلٹ کر دیا۔ اور اے لوگو تم اور جعلی انجیلوں کی طرف کیوں مائل ہو گئے۔ اصل انجیل بلا توسط کسی انسان کے حضرت مسیح سے مجھ کو ملی ہے۔ اس کے سوا جو کوئی اور انجیل تم کو سنائے اُس پر لعنت (تفسیر حقانی یہی آیت) بلکہ موجودہ انجیلوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کچھ تاریخی کتابیں ہیں جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیدائش سے لیکر نقلی موت تک کے حالات جمع کر دیئے گئے ہیں اُن میں یہی ملتا ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ نے فلاں موقعہ پر یہ کہا اور فلاں سے یہ کہا وغیرہ۔ اب آپ کا یہ کہنا۔ کہ اگر اصل انجیل موجود نہ تھی تو مسلمان ایمان کس پر لائے۔ اور اس آیت کے مضمون کو کس طرح بجالائے۔ جواب اس کا بالکل آسان ہے۔ کہ مسلمان اس پر ایمان لائے تھے۔ کہ جو کتابیں اُن پیغمبروں پر آئی تھیں۔ وہ حق تھیں نہ اس پر کہ وہ اب بجنسہٖ موجود ہیں کسی چیز پر ایمان لانے کیلئے اُس کا موجود ہونا ضروری نہیں مسلمان تو عیسیٰ علیہ السلام پر بھی ایمان لائے۔ حالانکہ وہ اس وقت موجود نہ تھے **تیسرا اعتراض** قرآن پاک کی اس آیت میں بے ترتیبی ہے۔ کیونکہ قرآن کریم اُن کتابوں سے بعد میں آیا۔ اور وہ کتابیں اس سے پہلے۔ مگر یہاں قرآن کریم کا ذکر پہلے ہے۔ اور اُن کتابوں کا ذکر بعد میں۔ چاہیئے یہ تھا کہ اُن کا ذکر پہلے کیا جاتا۔ **جواب**۔ اگرچہ قرآن کریم دنیا میں آنے کے اعتبار سے اُن کتابوں سے موخر ہے۔ لیکن اب ایمان لانے اور جاننے میں اُن پر مقدم۔ کیونکہ ہمیں اُن کتابوں کا علم قرآن کریم کے ذریعہ سے ہوا مسلمان اُن کتابوں کو اس لئے مانتے ہیں۔ کہ قرآن کریم نے اُن کو منوایا۔ لہٰذا قرآن کریم کا ذکر پہلے ہی ہونا چاہیئے کیونکہ حق اس کا مقدم ہے۔ بلا تشبیہ یوں سمجھو۔ کہ باپ کا حق اولاد پر دادا سے زیادہ ہے۔ اگرچہ دادا دنیا میں آنے میں باپ سے پہلے ہے۔ لیکن اولاد کا رشتہ دادا سے باپ کے ذریعہ سے ہی قائم ہوا

| أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝٥ |
|---|
| یہ لوگ اوپر ہدایت سے پالنے والا اپنے اور یہ لوگ وہ کامیاب |
| وہ ہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں۔ اور وہ ہی مراد کو پہونچنے والے |

**تعلق**۔ اس آیت کو پہلے سے چند طرح تعلق ہے۔ عبارت کے لحاظ سے تو اس طرح کہ یا تو یہ اَلَّذِيْنَ کی خبر ہے اور یا یہ علیحدہ جملہ کہ اُولٰٓئِكَ مبتدا عَلٰى هُدًى آخیر تک اُس کی خبر مضمون کے لحاظ سے چند طرح تعلق ہے۔ اَوّلاً یہ کہ یہ آیت گذشتہ آیتوں کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کہ پہلے عمل کا ذکر ہوا۔ اب اُس کے انجام یعنی جن لوگوں میں پہلی بیان کی ہوئی صفتیں ہوں۔ اُن کا انجام یہ ہے۔ کہ وہ ہدایت پر بھی ہیں۔ اور کامیاب بھی دوسرے یہ کہ یہ پہلی آیتوں کی علت ہے۔ یعنی قرآن کریم اُن لوگوں کے لئے ہدایت ہے۔ جن میں وہ پہلی بیان کی ہوئی صفتیں ہوں اُن کے لئے ہدایت کیوں ہے۔ اس لئے کہ وہ رب تعالیٰ کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور کامیاب ہیں۔ خیال رہے۔ کہ اس ہدایت میں اور هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کی ہدایت میں فرق کرنا ضروری ہوگا۔ تاکہ علت اور معلول میں یا عمل اور اُس کے انجام میں فرق ہو جائے۔ اس کو ہم هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے ماتحت تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اور اس جگہ بھی تفسیر میں کچھ عرض کردیں گے۔ **تفسیر** اُولٰٓئِكَ اسم اشارہ ہے۔ اشارہ کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ کہ وہ سننے والے کو محسوس ہو۔ یا تو اس طرح کہ وہ اُس کو دیکھ رہا ہو۔ یا اس طرح کہ اُس کے اوصاف ایسے بیان کر دیئے جائیں۔ کہ وہ مثل محسوس کے بن جائے۔ لہٰذا اگر اَلْمُتَّقِيْنَ سے جماعت صحابہ مراد تھی۔ تو یہ اُولٰٓئِكَ پہلی قسم کا اشارہ ہوگا۔ یعنی یہ صدیق و فاروق اور مہاجرین و انصار وغیرہم ہدایت پر ہیں۔ اور اگر عام متقین مراد تھے۔ تو یہ اشارہ ذہنی ہوگا۔ یعنی قیامت تک کے وہ لوگ جن کی یہ صفتیں ہیں۔ وہ ہدایت پر ہیں۔ لیکن چونکہ ہماری نگاہوں سے جماعت صحابہ کرام بھی غیب ہے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ اشارہ ذہنی ہی ہوگا۔ اس اشارہ میں سارے گذرے ہوئے۔ اور موجودہ

اور آئندہ پرہیزگار شامل ہیں عَلٰی هُدًى، عَلٰی هُدًى میں عَلٰی اس لئے بڑھایا گیا۔ کہ عَلٰی غلبہ کے لئے آتا ہے۔ جیسے کہتے ہیں۔ کہ زید سواری پر ہے۔ یعنی زید سواری پر غالب ہے۔ اور وہ سواری زید کے قبضے میں ہے۔ اسی طرح اس میں اس طرف اشارہ ہے۔ کہ وہ لوگ ہدایت پر غالب ہیں۔ اور یہ ہدایت اُن کے قبضے میں آچکی ہے۔ کہ انشاءاللہ وہ اُن سے چھوٹ نہیں سکتی۔ کیونکہ وہ اُن کے رب کا عطیہ ہے۔ اور وہ ہمیشہ اُس کو مضبوطی سے پکڑے رہتے ہیں۔ نفس اور شیطان اور دنیوی تفکرات اور دیگر راحتیں مصیبتیں اُن کو اس ہدایت سے ہٹا نہیں سکتیں۔ وہ ان تمام سے اس طرح گذر جاتے ہیں۔ جیسے کہ کشتی دریا سے هُدًى کے نکرہ ہونے سے معلوم ہُوا کہ وہ تمامی قسم کی ہدایتوں پر ہیں۔ وہ اُس راستہ پر چل رہے ہیں۔ کہ جو جہنم سے بچتا ہُوا جنت میں ہوتا ہُوا۔ اللہ کے محبوبوں اور مقربین سے ملاتا ہُوا۔ رب تک پہنچا دیتا ہے مِنْ رَّبِّهِمْ، میں نہایت نفیس اشارہ یہ ہُوا۔ کہ جو کچھ اُن کو ملا ہے۔ یہ اُن کے رب کے کرم سے کیونکہ سارے اعمال اسباب ہیں حق تعالیٰ مسبب الاسباب۔ اُن کو یہ اعمال ملے۔ وہ بھی اُس کے کرم سے ان اعمال پر قائم رہے۔ وہ بھی اُس کے کرم سے۔ اور اعمال کے باطل کرنے والی چیزوں سے محفوظ رہے۔ یہ بھی اُس کے کرم سے۔ اور انہیں جو مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ بھی اُس کے کرم سے (وَاُولٰٓئِكَ) دوبارہ اس لئے لایا گیا۔ کہ پہلے متقیوں کی دو قسم کی صفتیں بیان ہوئی تھیں۔ ایک تو ایمان بالغیب نماز کا قائم کرنا۔ راہ الٰہی میں خرچ کرنا۔ دوسرے تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا۔ اور آخرت کا یقین کرنا پہلی صفتوں کے لحاظ سے وہ ہدایت پر ہوئے۔ اور دوسری صفتوں کے لحاظ سے کامیاب۔ یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ پہلی صفتیں عام مسلمانوں کی تھیں۔ اور دوسری صفتیں علماء کرام وغیرہم کی۔ تو اب یہ کہا گیا۔ کہ عام مسلمان ہدایت پر ہیں۔ اور خاص علماء کرام وغیرہم کامیاب۔ جیسے قرآن کریم نے اس طرح ارشاد فرمایا۔ کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى۔ کامیاب وہ ہُوا جس نے تزکیہ نفس (قلب کی صفائی) کیا۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ۔ ان آیتوں میں ایمان و عمل کے ساتھ ہدایت کا ذکر ہُوا۔ اور صفائی قلب کے ساتھ فلاح یعنی کامیابی کا (هُمْ) سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کامیابی انہی لوگوں کے ساتھ خاص ہے یہود و نصاریٰ جو اپنی کامیابی کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اس خواب کی تعبیر کبھی بھی نہ آئے گی۔ ان کی حالت اُس پیاسے کی طرح ہے۔ جو کہ دوپہری میں ریتے کو دریا سمجھ کر اُس طرف محبت محنت سے جائے۔ لیکن وہاں پہنچ کر سخت مایوس ہو۔ کفار اور مشرکین کے سارے اچھے اعمال کا یہی حال ہے۔

(اَلْمُفْلِحُوْنَ) یہ فلاح سے بنا ہے۔ اور فلاح کے لغوی معنی ہیں چیرنا اور کھلنا۔ اور قطع کرنا۔ اسی لئے کسان کو فلاح کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ زمین کو چیرتا ہے۔ اصطلاح میں فلاح کے معنی ہیں کامیابی۔ کیونکہ وہ بھی آڑول اور پردوں کو چیر کر مشکلات کو دفع کر کے حاصل کی جاتی ہے۔ تو معنی یہ ہوئے۔ کہ اس قسم کے لوگ دنیا اور برزخ اور آخرت ہر جگہ کامیاب ہیں۔ **تفسیر صوفیانہ** صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ متقی کی مثال اُس شخص کی طرح ہے۔ کہ جو ایک میدان میں جا رہا ہے جس میں کہ جگہ جگہ کانٹے اور انگارے۔ غار پھسلتیں ہیں وہ عقلمند بہت احتیاط سے اپنے کو ان کانٹوں اور غاروں وغیرہ سے بچاتا ہُوا۔ اور صاف جگہ پر قدم رکھتا ہُوا۔ لالٹین سے کام لیتا ہُوا چلا جا رہا ہے یہ شخص انشاءاللہ ہدایت پر بھی رہے گا۔ اور منزل مقصود کو بھی جلد پالے گا۔ دوسرا وہ شخص ہے۔ کہ جس کے پاس کوئی روشنی نہیں جس سے وہ ان مصیبتوں کو دیکھ سکے۔ اور اس کٹھن راستہ کو طے کر سکے۔ یہ شخص کبھی منزل مقصود کو نہیں پا سکتا۔ یا تو کسی غار میں گر کر ہلاک ہوگا۔ اور اگر آگ میں پڑ گیا۔ تو جل جائیگا تیسرا وہ شخص ہے جس کے پاس روشنی تو ہے۔ لیکن وہ چلنے میں بے احتیاطی کرتا ہے۔ اس طرح کہ آگ اور غار سے تو بچتا ہے لیکن کانٹوں کا خیال نہیں رکھتا۔ یہ شخص اگرچہ منزل تک پہنچ جائے گا۔ لیکن زخمی ہو کر۔ اور بہت دیر کے بعد یہ **دنیا** ایک غار۔ غار اور آگ والا میدان ہے سینما اور شراب خانے وغیرہ کانٹے ہیں جو اس جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ کفر پھیلے ہوئے انگارے ہیں اور شرک یہاں کے غار۔ تمام لوگ اس میدان کو طے کر رہے ہیں لیکن متقی مسلمان کے پاس قرآن پاک کا گیس ہے۔ اور اپنے تقوے

کی وجہ سے نہایت احتیاط سے اس کو طے کر رہا ہے. نیکی کی جگہ قدم رکھتا ہے. بُرے مقامات سے بچتا ہے. گنہگار مسلمان کے پاس بھی یہ روشنی تو ہے. اور وہ کفر اور شرک کی باتوں سے بچتا ہے. لیکن بے احتیاطی کی وجہ سے خود کو گناہوں کے کانٹوں میں پھنسا دیتا ہے. اور کافر چونکہ قرآن پاک کی روشنی سے علیحدہ ہے. اس لئے وہ یا تو شرک کے غار میں گر کر ہلاک ہوتا ہے. یا کفر کی آگ سے جل کر. تو متقی ہدایت پر بھی ہے. اور اعلیٰ درجہ کا کامیاب بھی. اور گنہگار مسلمان ہدایت پر تو ہے لیکن اول نمبر کامیاب نہیں. اور کافر نہ ہدایت پر نہ کامیاب. صوفیائے کرام یہ بھی فرماتے ہیں. کہ کامیابی کے تین انجام ہیں. اولاً نفس اور دنیا اور شیطان اور بُرے ساتھیوں پر غالب رہنا. دوسرے کفر و گمراہی اور جہالت اور نفس کے دھوکے اور شیطان کے وسوسوں اور قبر کی وحشتوں. قیامت کی وحشتوں اور پلصراط کی پھسلنوں اور جنت کی محرومی اور عذاب کی سختیوں سے نجات پا جانا. تیسرے ابدی ملک اور سرمدی نعمتوں اور لازوال رحمتوں اور دائمی سرور اور بے گرد و غبار کی تندرستی اور بے حجاب محبوب کو پالینا. حق تعالیٰ ہم کو نصیب فرمائے **نیز** صوفیائے کرام فرماتے ہیں. کہ ایک ہی راستہ کو کوئی شخص پیدل طے کرتا ہے. دوسرا گھوڑے پر تیسرا برق رفتار موٹر کار پر. جتنی تیز سواری ہوگی. اسی قدر جلد راستہ طے ہوگا. طریقت نہایت تیز سواری ہے. اور شریعت نہایت مضبوط اور احتیاط کی سواری. شریعت میں پھسلن کم مگر رفتار آہستہ. اور طریقت میں رفتار نہایت تیز. مگر خطرات بہت زیادہ. اسی کو مثنوی شریف میں یوں بیان فرمایا ؎

یک زمانہ صحبت با اولیاء   بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

یعنی اللہ والوں کی ایک آن کی صحبت سو برس کی خالص عبادت سے زیادہ نافع ہے **نیز** شریعت میں اپنے آپ جانا ہوتا ہے اور طریقت میں کسی اور کی طرف سے کشش ہوتی ہے. تو ھُدًی سے مراد شریعت پر چلنا ہے اور فلاح سے مراد رب کا اپنی طرف کھینچنا ہے. وہ فرماتے ہیں. کہ جو شخص نیک اعمال کی نار (آگ) سے اپنے وجود کے حجاب کو جلا دیتا ہے. اور دنیا سے نگاہ پھیر کر آخرت کا مشاہدہ کرتا ہے. تو اس کو رحمت ربانی اپنی طرف اس طرح جذب کر لیتی ہے. کہ وہ رحمت جاذب اور یہ مجذوب بلکہ یوں کہو. کہ وہ طالب اور یہ مطلوب ہوتا ہے. اس کلام کی کوئی انتہا نہیں یہ حال ہے. اس کو قال سے بیان نہیں کیا جا سکتا. **پہلا اعتراض**. اس آیت سے معلوم ہوا. کہ جن لوگوں میں پرہیزگاروں کی سی چھ صفتیں ہوں. وہ ہدایت بھی پائیں اور کامیاب بھی ہوں. لہٰذا گنہگار مسلمان چونکہ نماز اور زکواۃ کے پابند نہیں ہوتے اور وہ ان دو صفتوں سے محروم ہیں. چاہیئے. کہ وہ ہدایت اور کامیابی دونوں سے محروم ہوں **جواب** متقیوں کی جو چھ صفتیں بیان کی گئیں اُن میں سے بعض اصل ہیں. کہ جن کے نہ ہونے سے انسان ہدایت اور کامیابی سے بالکل محروم رہے گا اور بعض صفتیں فرعی ہیں. کہ جن کے نہ ہونے سے انسان کامل ہدایت اور کامل کامیابی نہیں حاصل کر سکتا. عقائد یعنی غیب پر ایمان وغیرہ یہ اصل صفتیں تھیں. اور اعمال نماز و زکواۃ کا ادا کرنا کامل کامیابی کے حاصل کرنے کے لئے ہے. اِن آیتوں کا مطلب یہ ہے. کہ جن میں یہ عقائد اور یہ اعمال پائے جائیں وہ کامل ہدایت پر ہیں. اور کامل کامیاب اور جن میں یہ اوصاف نہ ہوں وہ کامل کامیاب نہ ہوں گے. اگر عقائد درست نہیں ہیں. تو کامیابی سے یکسر محروم اور اگر صرف اعمال بگڑے ہوئے ہیں. تو ناقص کامیاب **دوسرا آریوں کا اعتراض**. خدائے تعالیٰ کی یہ بے جا طرفداری ہے. کہ مسلمانوں کے اعمال تو قبول کرے اور غیر مسلموں کے اعمال رد کر دے. جب دونوں ایک ہی سے اعمال کر رہے ہیں. تو یہ فرق کیوں. ایک ہندو کنوآں کھُدواتا ہے پُل بنواتا ہے. اور صدقہ اور خیرات کرتا ہے. وہ تو بالکل قبول نہ ہوں. اور ایک مسلمان ان میں سے دسواں حصہ بھی کرے. تو خدا کا پیارا بن جائے. **جواب** ایک شخص نہایت عمدہ حلوا بناتا ہے جس میں کہ سوجی. بادام گھی. شکر وغیرہ خوب اچھی طرح ڈالتا ہے. لیکن اُس میں چھٹانک بھر سنکھیا بھی حل کر کے ملا دیتا ہے. دوسرے آدمی نے حلوا تو معمولی بنایا. لیکن اُسے زہر سے محفوظ رکھا. یقیناً اُس بیوقوف مالدار کا قیمتی حلوا ہلاک کر دے گا. اور اس عقلمند غریب کا معمولی حلوا فائدہ مند ہوگا. یہ نیک

اعمال حلوے کے اجزاء ہیں. اور کفر زہر کافر جو نیک کام بھی کرتا ہے. اُس میں کفر کا زہر موجود ہوتا ہے. لہذا اُس کے اعمال بے کار ہیں. اور مسلمان اگرچہ معمولی نیک کام کرے. لیکن اُس کے اعمال کفر کے زہر سے محفوظ ہیں. لہذا کار آمد.

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾

تحقیق وہ لوگ کافر ہوئے برابر ہے پر اون خواہ ڈرائیں آپ انہیں یا نہ ڈرائیں وہ نہیں ایمان لائیں گے

بیشک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے اُنہیں برابر ہے چاہے تم اُنہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان لانے کے نہیں

**تعلق.** اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے. اوّلاً یہ کہ اُن آیتوں میں حق تعالےٰ کے مقبول بندوں کا ذکر تھا. اب اُن کے مقابلے میں مردودوں کا ذکر فرمایا گیا. کیونکہ ہر چیز اپنے مقابل کے ذریعہ پورے طور پر پہچانی جاتی ہے. دن رات کے ذریعہ سے اور نور ظلمت کے ذریعہ سے خوب ظاہر ہوتا ہے. دوسرے یہ کہ پہلی آیتوں میں مقبولوں کی اُن صفتوں کا ذکر تھا جن سے اُنہوں نے ہدایت اور کامیابی پائی. اب مردودوں کی اُن صفتوں کا ذکر فرمایا گیا جن کی وجہ سے وہ ہدایت وکامیابی سے محروم رہے. اور ہدایت کی حکمت یہ ہے کہ دونوں قسم کی صفتوں کا ذکر کر دیا جائے. تاکہ سننے والے بہتری کے اسباب کو حاصل کریں اور برائیوں کے اسباب سے بچیں. تیسرے یہ کہ پہلے فرمایا گیا تھا. کہ قرآن کریم اُن پرہیز گاروں کیلئے ہدایت ہے جن میں پہلی ذکر کی ہوئی چھ صفتیں ہوں. اب ارشاد ہوا. کہ قرآن کریم اُن کے لئے ہدایت نہیں جن میں یہ آنے والی صفات ہوں جس سے معلوم ہو جائے. کہ وہ چیزیں ہدایت کی علتیں تھیں. اور یہ محرومی کی. ایک قابل طبیب مریض کو علاج کی تدبیریں بھی بتاتا ہے. اور پرہیز کی چیزیں بھی. کہ فلاں فلاں چیزیں مضر ہیں. تاکہ مریض وہ تدبیریں کرے. اور ان نقصان دہ چیزوں سے بچے. **شانِ نزول** یہ آیت کریمہ ابوجہل وابولہب وغیرہ اُن کفار کے حق میں نازل ہوئی جو علم الٰہی میں ایمان سے محروم تھے. حضور صلے اللہ علیہ وسلم اُن کے ایمان نہ لانے سے غمگین ہوتے تھے. تب یہ آیت اتری. اور حق تعالےٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی. کہ نہ تو آپ کی تبلیغ میں کوتاہی ہے. اور نہ ہمارے کلام میں کچھ نقصان. اُن کا ایمان نہ لانا خود اُن کی اپنی بدنصیبی اور محرومی کی وجہ سے ہے. آپ اس پر غمگین نہ ہوں. **تفسیر اِنَّ** اس کے معنی ہیں تحقیق یا بے شک. یہ اُس مقام پر بولا جاتا ہے جہاں کوئی شخص کلام کا انکار کر رہا ہو. یا خود کلام ایسا اہم ہو. کہ جس کے انکار کا اندیشہ ہو چونکہ یہ مضمون بہت اہم تھا. اور ناسمجھ لوگ یقیناً اُس کا انکار کرنے والے تھے. اس لئے کلام کی اہمیت سمجھانے کے لئے اس جگہ اِنَّ فرمایا گیا. **اَلَّذِیْنَ** سے یا تو خاص لوگ مراد ہیں. جیسے ابولہب. ابوجہل اور ولید ابن مغیرہ وغیرہ اور یا عام وہ کفار مراد ہیں جن کی ضد اور ہٹ اُن کی طرح ہو. خیال رہے. کہ قرآن پاک کی عبارت کے عموم کا لحاظ ہوتا ہے. نہ کہ واقعہ نزول کے خصوص کا یعنی اگرچہ یہ آیت خاص چند لوگوں کے بارے میں اتری لیکن چونکہ اس کے الفاظ عام ہیں. اس لئے اس آیت سے وہ سب لوگ مراد ہو سکتے ہیں کہ جو ازلی کافر ہوں. **کَفَرُوْا** - کَفَرُوْا کفر سے بنا ہے. کفر کے لغوی معنے ہیں چھپانا اور ڈھکنا اسی لئے چھلکے کو کفور کہتے ہیں. کیونکہ وہ مغز کو ڈھانپے ہوتا ہے. کافر کو بھی کافر اسی لئے کہتے ہیں کہ اُس کی تو تمام بوئل کو ڈھک لیتی ہے. شریعت میں کفر کے معنی یہ ہیں. کہ اللہ کے وجود یا اُس کی توحید یا کسی نبی کی نبوت یا دینی ضروریات میں سے کسی چیز کا انکار کر دینا. دینی ضروریات وہ چیزیں ہیں جن کو عام مسلمان جانتے ہوں. کہ یہ دینی چیزیں ہیں. یا وہ کہ جن کا جاننا دین میں داخل ہونے کے لئے ضروری ہو تو یوں سمجھو. کہ جس چیز کو مان کر انسان مسلمان ہوتا ہے. اس کا انکار کر کے کافر بن جاتا ہے. **تتمہ** بعض کام وہ ہیں جن کو شریعت نے دین کے انکار کا نشان قرار دیا. جیسے زُنّار باندھنا اور سر پر ہندوانی چوٹی رکھنا وغیرہ یہ کام بھی کفر ہیں. کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے. کہ ان کا کرنے والا بے دین ہو چکا ہے. یوں سمجھو کہ جو کام کفار کے دینی نشان بن چکے ہوں. یعنی جن کو دیکھ کر لوگ یہ سمجھتے ہوں. کہ یہ کوئی کافر ہے. اُن کا

کرنا مسلمانوں کے لئے کفر ہے۔ جیسے قشقہ لگانا۔ چوٹی رکھنا۔ اور جو کام کفار کی قومی نشان ہوں۔ وہ مسلمان کیلئے حرام۔ جیسے کہ ہندوستان میں ہیٹ لگانا اور ہندوانی دھوتی باندھنا۔ قرآن کریم میں کفر چار معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک ایمان کا مقابل۔ دوسرے انکار تیسرے شکر کا مقابل یعنی ناشکری جیسے وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ۔ چوتھے بیزاری جیسے يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ۔ یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے ایمان کا ذکر ہو چکا ہے۔ کفر چار طرح کا ہے۔ کفر انکار۔ وہ یہ ہے۔ کہ خدا تعالےٰ کو جانے ہی نہیں۔ جیسے کہ رب سے بے خبر کفار۔ دوسرے کفر جحود۔ وہ یہ کہ رب کو دل سے جانے مگر زبان سے اقرار و اعتراف نہ کرے۔ جیسے کہ ابلیس اور ضدی کافروں کا کفر تیسرے کفر عناد۔ وہ یہ کہ دل سے جانے کبھی زبان سے بول دے۔ لیکن کسی وجہ سے اُس کی اطاعت نہ کرے جیسے ابو طالب کا کفر۔ کہ وہ فرماتے ہیں شعر

وَلَقَدْ عَلِمْتُ بِاَنَّ دِيْنَ مُحَمَّدٍ مِنْ خَيْرِ اَدْيَانِ الْبَرِيَّةِ دِيْنًا
لَوْلَا الْمَلَامَةُ اَوْ حِذَارُ مَسَبَّةٍ لَوَجَدْتَنِيْ سَمْحًا بِذَاكَ مُبِيْنًا

اور جیسے کہ آجکل کے وہ ہندو وغیرہ جو کہ حضور صلی اللہ علیہ السلام کی نعتیں لکھتے ہیں۔ اور اُن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کا اقرار کر جاتے ہیں لیکن مسلمان نہیں ہوتے۔ چوتھے۔ کفر نفاق۔ وہ یہ ہے۔ کہ زبان سے اقرار کرے۔ اور دل میں اعتقاد نہ ہو (تفسیر روح البیان) یہاں دوسری قسم کا کفر مراد ہے۔ ابو طالب کے ایمان و کفر کی بحث انشاء اللہ کسی اور جگہ کی جائے گی۔ اس میں بہت گفتگو کی گئی ہے۔ کہ یہاں کونسا کفر اور کونسے کفار کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ تمام کافر تو ایسے نہ تھے۔ کہ جن کے ایمان سے ناامیدی ہو۔ صدہا کافر مسلمان ہوئے۔ اور یہاں مایوسی کا اظہار فرمایا جا رہا ہے۔ اس لئے بعض علماء کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس سے مراد وہ کافر ہیں جو ضد کی وجہ سے کافر ہوئے۔ بعض تو بے علمی کی وجہ سے کافر رہے ہیں۔ اور بعض شبہات کی وجہ سے ان دونوں کے ایمان کی امید ہوتی ہے۔ کہ اگر اُن کو اسلام کا صحیح علم ہو جائے۔ یا اُن کے شبہات دور ہو جائیں۔ تو وہ ایمان لے آئیں لیکن بعض ایسے ہوتے ہیں۔ کہ ہر بات کو جان کر سمجھ کر محض ضد اور ہٹ کی وجہ سے اسلام قبول نہیں کرتے۔ ان کے ایمان کی کوئی امید نہیں۔ کیونکہ ضد کا علاج کسی عالم کے پاس اور وہم کی دوا کسی طبیب کے پاس نہیں۔ ضد کی چند وجہیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ رہبر کی ذات سے عناد ہو۔ تو وہ اُس کی ہر بات کا انکار ہی کرتا ہے۔ دوسرے اپنے کافر باپ داداؤں کی بے جا حمایت کہ اُن کی ہر بات مانیں گے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح تیسرے خود اُس فرمان سے ضد جو رہبر فرما رہا ہے۔ یہ تینوں قسم کے ضدی لوگ ایمان سے یکسر محروم ہیں بعض علماء کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس عالم کے علاوہ ایک اور عالم بھی ہے۔ جسے عالم مثال یا عالم غیب کہتے ہیں جو کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ یا ہونے والا ہے۔ وہ سب کچھ پہلے وہاں ہو چکا ہے۔ گویا کہ یہ عالم ظہور یا عالم شہادت اُس عالم غیب کا سایہ ہے تو ان سے مراد وہ لوگ ہیں۔ کہ جو عالم مثال میں کافر ہو چکے ہیں یعنی ازلی کافر۔ اسی کی طرف وہ حدیث شریف اشارہ کرتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے۔ کہ تمام روحیں مثل چیونٹیوں کے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالی گئیں جن میں سے بعض سفید اور بعض کالی تھیں۔ نیز حدیث معراج میں آتا ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس حال میں دیکھا۔ کہ اُن کے دائیں بائیں روحیں تھیں۔ داہنی طرف دیکھ کر خوش اور بائیں طرف دیکھ کر غمگین ہوتے تھے حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا۔ کہ یہ انکی اولاد کی روحیں ہیں۔ داہنی طرف مومنین اور بائیں طرف کفار ہیں۔ غرضیکہ دوسرے عالم میں دو قسم کے لوگ تھے۔ بعض کافر اور بعض مومن یہاں وہ ہی کفار مراد ہیں بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ اس سے وہ کفار مراد ہیں جن کے متعلق علم الٰہی میں آ چکا ہے کہ کافر مرینگے اسکے متعلق بھی مختلف احادیث وارد ہیں۔ بہت سے وہ لوگ ہیں۔ جو اس وقت مومن ہیں۔ مگر حق تعالےٰ کے علم میں کافر ہیں۔ اور بہت سے وہ لوگ بھی ہیں۔ کہ جو بظاہر یہاں کافر ہیں۔ اور حق تعالےٰ کے علم میں مومن ہیں۔ اُن کا آخیر حق تعالےٰ کے علم کے مطابق ہی ہوگا۔ وہی لوگ یہاں مراد ہیں۔ تو آیت کا مقصود یہ ہوا۔ کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن اور آپ کا کام ہدایت دینا اور راہ بتانا ہے۔ نہ کہ کسی چیز کی حقیقت کو بدل دینا جس طرح کہ ہادی کی تعلیم سے جانور انسان نہیں بن سکتا۔ اسی طرح ازلی بدبخت۔ نیک بخت نہیں ہو سکتا جو وہاں نور سے محروم رہا ہے۔ انہیں یہاں کون منور

کرے، سَوَاءٌ اور اِستواءٌ ایک ہی معنی میں آتے ہیں یعنی برابر ہونا۔ مگر یہاں یہ مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہے یعنی برابر عَلَیْھِمْ سے اس جانب اشارہ ہے۔ کہ آپ کا اُن کو ڈرانا اور نہ ڈرانا اُن کے لئے برابر ہے۔ کہ وہ بہر حال ایمان نہ لائیں گے۔ مگر اے محبوب آپ کے لئے برابر نہیں کیونکہ آپ تبلیغ کا ثواب پائیں گے۔ تو یہ تبلیغ آپ کیلئے بہت مفید اور اُن کے لئے بیکار جس کے لئے دنیا میں وعظ بیکار ہے۔ اُس کے لئے آخرت میں جہنم کی آگ پر صبر اور بے صبری برابر ہوگی۔ اور جس کیلئے جوانی اور بڑھاپا تندرستی اور بیماری آرام اور تکلیف۔ ظاہر اور چھپا ہُوا گناہ میں برابر ہو یعنی ہر حال میں گناہ کرے۔ اُس کے لئے خوف ہے۔ کہ موت کے وقت توبہ کرنا اور نہ کرنا برابر ہو۔ ایسے ہی اللہ والوں سے ملنا اور نہ ملنا برابر ہو۔ شفاعت ہونا نہ ہونا برابر ہو۔ (تفسیر تیسیر) ءَاَنْذَرْتَھُمْ۔ اِنذار سے بنا ہے جس کے لغوی معنی ہیں خطرناک چیز کی اطلاع دینا یعنی ڈرانا۔ اور شریعت میں عذاب الٰہی سے ڈرانے کو اِنذار کہتے ہیں جو شخص دنیوی مصیبتوں سے کسی کو ڈرائے اس کو شرعاً منذر نہ کہا جائے گا۔ **نکتہ** نبی ڈراتے بھی ہیں۔ اور خوشخبریاں بھی دیتے ہیں۔ اس لئے اُن کو نذیر و بشیر کہا جاتا ہے۔ اس آیت میں فقط ڈرانے کا ذکر تو فرمایا گیا۔ مگر بشارت کا ذکر نہ ہُوا۔ اس لئے کہ انسان ڈر سے زیادہ اطاعت کرتا ہے۔ بڑے سے بڑا مجرم جیل خانہ کے خوف سے جرم سے باز آتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ لات وہاں کام آتی ہے۔ جہاں بات کام نہیں آتی جب اِن بے دینوں کیلئے ڈرانا ہی مفید نہ ہُوا۔ تو بشارت کیا فائدہ دے گی۔ اس لئے ڈرانے کے ساتھ بشارت کا ذکر نہ فرمایا گیا۔ **نیز** ڈرانا مقدم اور بشارت بعد میں جب وہ اس درجہ سے نکلے ہی نہیں اور بشارت کی حد میں ہی نہ آئے۔ تو انہیں بشارت کس طرح دی جاسکتی تھی۔ لَایُؤْمِنُوْنَ میں غیب کی خبر ہے۔ اور یہ خبر بالکل سچی ثابت ہوئی۔ کہ آخر کار وہ لوگ ایمان نہیں لائے۔ اس جگہ یہ فرمایا گیا۔ کہ وہ ایمان نہ لائیں گے اور یہ نہ کہا گیا۔ کہ وہ ایمان لانے پر قدرت نہیں رکھتے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اُن کا یہ کفر اختیاری ہے۔ وہ اس میں مجبور نہیں ہیں۔ کیونکہ علم الٰہی میں یہ آیا ہے۔ کہ وہ اپنی خوشی اور اپنے اختیار سے کافر رہیں گے۔ تو جس طرح اُن کا کافر رہنا یقینی ہے۔ اسی طرح ان کا مختار رہنا بھی یقینی ہے۔ مجبور و معذور کو حق تعالیٰ عذاب نہیں دیتا۔ ہماری اس مختصر تقریر سے تقدیر کا بڑا مسئلہ بھی حل ہوگیا اس کی پوری بحث انشاء اللہ کسی اور مقام پر کی جائے گی۔

**تفسیر صوفیانہ** اس آیت میں یہ فرمایا جارہا ہے۔ کہ جنہوں نے میثاق کے دن بلٰی کہکر ہماری ربوبیت کا اقرار کیا اور بعد میں اپنے دل کے صاف آئینے کو اعمال بد سے اس قدر خراب کر لیا کہ وہ صیقل کے قابل نہ رہا۔ اور جنہوں نے کہ اپنے نفیس ارواح کے پرندوں کو قالب کے پنجرے میں بند ہونے کے بعد پانچوں حواس کے روزنوں کے ذریعہ اس دنیا کو اس طرح دکھایا۔ کہ وہ اپنے اصلی وطن کو بھول گئی۔ اور نفس اور شیطان کی صحبت میں روح کو ایسا مانوس کیا۔ کہ وہ اپنے اُس پرانے وطن کے دوستوں سے منہ موڑ بیٹھی۔ وہ لوگ اب اس قابل نہ رہے کہ وہ اُس وطن کو یاد کریں صوفیاء کرام یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ لفظ انسان اُنس سے بنا ہے جس کے معنی ہیں محبت چونکہ انسان ہر انیس یعنی ساتھی کا اثر بہت جلد لے لیتا ہے۔ اس لئے اِسے انسان کہتے ہیں۔ لہٰذا اگر انسان کے ساتھی اچھے ہوں گے۔ تو انسان بھی اچھا رہے گا۔ اور بُرے ساتھیوں سے خود بُرا ہو جائے گا۔ انسان کو ناس بھی کہتے ہیں۔ ناس کے معنے ہیں بھولنے والا یہ بھی شیطان کی صحبت اور دنیا کے میدان میں آکر اللہ کو بھول جاتا ہے۔ اس لئے اس کو ناس کہا جاتا ہے **نیز** صوفیاء کرام فرماتے ہیں۔ کہ روح دو چیزدل کو دیکھتی ہے ایک تو دنیا کو دوسرے آخرت کو دنیا کو دیکھنا۔ آنکھ۔ ناک کان وغیرہ روزنوں کے ذریعے سے اور آخرت کا دیکھنا خفیہ روزنوں سے ہے۔ جو انسان ہر وقت دنیا میں مشغول رہے گا۔ آخر کار آخرت کے روزن سب بند ہو جائیں گے۔ جس کو قرآن کریم فرما رہا ہے۔ کہ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُھَا۔ **پہلا اعتراض** جب حق تعالیٰ کے علم میں یہ بات آچکی۔ کہ وہ کفار ایمان نہ لائیں گے۔ تو اُن کی تبلیغ سے کیا فائدہ چاہیئے تھا۔ کہ اُن کو تبلیغ بھی نہ کی جاتی **جواب** تبلیغ سے دو فائدے ہوئے۔ ایک تبلیغ کرنے والے کو دوسرے اُس کو جس کو تبلیغ کی جائے۔ یہاں ایک فائدہ فوت ہو چکا۔ مگر دوسرا فائدہ یعنی مبلّغ کا ثواب باقی ہے۔ اس لئے تبلیغ بیکار نہ ہوئی **نیز** اس تبلیغ کی وجہ سے قیامت

کے دن اُن کفار کا منہ بند ہو جائے گا۔ اور وہ اپنی بے علمی کا عذر نہ کر سکیں گے۔ **دوسرا اعتراض** ۔جب رب کو خبر تھی کہ وہ ایمان نہ لائیں گے۔ تو اُن کو ہلاک کیوں نہ کر دیا جیسے کہ قوم نوح علیہ السلام کو اُن کے ایمان نہ لانے کی خبر دے کر ہلاک کر دیا گیا **جواب** ۔اس لئے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رحمتہ اللعٰلمین ہیں۔ آپؐ کے ہوتے ہوئے۔ عام عذاب الٰہی نہیں آتا۔ پہلے حق تعالےٰ کے جلال کا ظہور تھا اور اب دنیا میں امن وامان کا دور دورہ ہے جس پر قرآن کریم شاہد ہے۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ **تیسرا اعتراض** جبکہ اُن کی تقدیر میں یہ آچکا۔ کہ وہ ایمان نہ لائیں گے۔ تو اب چاہیئے کہ انہیں کفر کی سزا نہ ملے۔ کیونکہ وہ اپنے اس کفر میں مجبور ہیں۔ **جواب** ۔اس سوال سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ معترض تقدیر کی حقیقت نہیں سمجھا۔ تقدیر علم الٰہی کا نام ہے اُس علم میں جس طرح مجرم کا جرم داخل ہے۔ ایسے ہی اُس کا اختیار بھی یعنی حق تعالےٰ کو اُس کے متعلق یہ علم ہوا کہ اس شخص کو ایمان لانے اور نہ لانے کا اختیار تو ہوگا۔ مگر یہ اپنی خوشی سے ایمان نہ لائے گا۔ جب یہ کفر اختیاری ہوا تو اس کی سزا ضرور ملنی چاہیئے۔ **چوتھا اعتراض** جب حق تعالیٰ نے اُن کے کافر رہنے کی خبر دیدی۔ تو اُن کا مسلمان ہونا۔ ناممکن ہو گیا۔ کیونکہ خدا کی خبر جھوٹی نہیں ہو سکتی۔ تو ضروری ہوا کہ وہ اس کفر پر عذاب نہ پائیں **جواب** جس طرح کہ خداوند کریم کے جان لینے سے وہ کفر میں مجبور نہ ہوئے۔ اسی طرح حق تعالےٰ کے خبر دینے سے بھی وہ کفر پر مجبور نہ ہوں گے۔ کیونکہ خبر یہ دی گئی۔ کہ وہ بخوشی کافر رہیں گے۔ اس خبر سے اُن کا ارادہ سے کافر رہنا ضروری ہوا۔ اور اس ارادہ کی وجہ سے وہ مختار ہے۔ نیز یہ خبر ایسی ہے۔ جیسے کہ ایک طبیب کسی غافل مریض سے کہہ دے کہ تمہاری بیماری چوتھے درجے تک پہنچ چکی ہے جس کا علاج ناممکن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ تو نے اپنی بیماری سے بے پرواہی کر کے اور بد پرہیزی کر کے اُسے اتنا بڑھا لیا۔ کہ وہ علاج کے قابل نہ رہی۔ تو اس میں قصور بیمار ہی کا ہوگا۔ نہ کہ طبیب کا۔ اسی طرح یہاں فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اِن کفار نے اپنے کفر کو اس حد تک پہنچا دیا ہے اور وہ اُن کے دل میں اس قدر مضبوط ہو چکا۔ کہ اُس کا نکلنا ناممکن۔ تو کفر کا اتنا قوی ہونا بھی اُن کی اپنی ہی بے احتیاطی سے ہے۔ لہٰذا وہ ہی مجرم ہیں۔ اور یہ دیکھا بھی گیا ہے کہ کسی کی مخالفت معمولی درجہ کی ہوتی ہے لیکن بڑھتے بڑھتے عناد ذاتی بن جاتی ہے۔ **پانچواں اعتراض** جن کے متعلق قرآن کریم میں یہ خبر دی جا چکی۔ کہ وہ ایمان نہ لائینگے۔ اب اُن کا ایمان لانا کسی طرح بھی ممکن نہ رہا کیونکہ اب اگر وہ ایمان لائیں بھی تو اس آیت کو مانیںگے یا نہیں۔ اگر انکار کریں تو کافر کیونکہ آیت کا انکار کفر ہے اور اگر مانیں تو کافر کیونکہ اسمیں اپنے کو بے ایمان ماننا ہے۔ اسلئے کہ اس آیت کا مضمون یہی ہے۔ اور اپنے کو بے ایمان ماننا بھی کفر ہے اب بتاؤ اُن کیلئے ذریعہ ایمان کیا رہا۔ اور دل کیلئے قرآن کریم کو ماننا ایمان ہے۔ اور ان کیلئے کفر **جواب** اس قسم کے لوگ اگر ایمان لائیں تو اس آیت کو اسطرح مانینگے کہ بعض لوگ ازلی کافر ہیں۔ نہ یہ کہ ہم کیونکہ اس آیت کریمہ میں کسی کا نام لیکر یہ حکم نہیں لگایا گیا۔ اور اس آیت کے مضمون کو اس طرح مان لینا یقیناً کفر نہیں۔ لہٰذا اُن کیلئے اِس آیت کا ماننا کفر نہ ہوا۔ اسکی پوری بحث انشاءاللہ مسئلہ تقدیر میں کی جاے گی۔

ع

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ⑦

مہر کردی　خدا　اوپر　دلوں اُن کے　اور پر　کانوں اُن کے　اور پر　آنکھوں اُن کے　پردہ　اور لئے اُنکے　سزا　بڑی

اللہ نے اُن کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی اور اُن کی آنکھوں پر گھٹا ٹوپ ہے۔ اور اُن کے لئے بڑا عذاب

**تعلق** ۔اس آیت کا پہلی آیت سے یہ تعلق ہے۔ کہ پہلے ان کفار کی صفات وحالات کا ذکر ہوا تھا اور اب اس کی وجہ بیان ہوئی کہ اُن میں یہ صفات کیوں پیدا ہوئے۔ یا پہلی آیت میں اُن کفار کی صفات کا ذکر تھا۔ اور اس میں اُن کے انجام کا۔ تو یا تو پہلی آیت میں ان کی بیماری کا ذکر ہوا۔ اور اس میں اُس بیماری کی وجہ کا تذکرہ اور یا پہلے بیماری کا ذکر تھا۔ اور اب اس کے نتیجے کا۔ لہٰذا یہ آیت پہلی آیت کی یا تو وجہ ہے۔ یا اُس کا انجام **تفسیر** خَتَمَ اللّٰهُ ختم کے معنی ہیں چھپانا اور مضبوط کرنا اور انتہاء کو پہنچنا۔ مہر لگانے کو ختم اس واسطے کہتے ہیں۔ کہ اُس کی وجہ سے اندر کی چیز لوگوں کی نگاہوں سے چھپا دی جاتی ہے۔ مثلاً کسی شخص نے کسی چیز کا پارسل کیا۔ تو اُس کو تھیلے میں

ع

بھر کر اُس پر لاکھ وغیرہ کی مُہر لگادی جس سے کہ کوئی اس کو راستہ میں کھول نہ سکے یہاں ختم سے مراد مُہر لگانا ہے۔ اور دل پر مہر لگانے سے یہ مطلب ہے۔ کہ اُن کی سرکشی اس حد تک پہنچ گئی۔ کہ وہ کفر اور گناہوں کو اچھا سمجھنے لگے۔ اور ایمان واطاعت کو بُرا۔ اور کافر سرداروں کی طرف رغبت اور انبیاء اور اولیا سے بے رغبتی کرنے لگے۔ اب اُن کے دلوں کا حال ایسا ہوگیا۔ کہ نہ اُن سے کفر نکل سکتا ہے۔ اور نہ اُن تک حق جا سکتا ہے۔ جیسے کہ مہر والا پارسل کہ نہ تو اس میں سے کوئی چیز نکل سکے۔ اور نہ کوئی چیز باہر سے جا سکے۔ قرآن کریم نے اس حالت کو یہاں خَتَمَ سے بیان فرمایا۔ اسی حالت کو دوسری جگہ طبع سے بیان فرمایا۔ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ جس کے معنی ہیں چھاپنا تیسری جگہ اس حالت کو اِغفال فرمایا اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ جس کے معنی ہیں غافل کرنا چوتھی جگہ اِقساء فرمایا قُلُوْبُهُمْ قَاسِيَةً جس کے معنی ہیں سخت کرنا۔ پانچویں جگہ اسے رَین فرمایا رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ان سب الفاظ کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں دل پر کفر کی مہر لگ جانا حقیقت عذاب الٰہی ہے عَلٰى قُلُوْبِهِمْ قلوب جمع قلب کی ہے قلب کے معنی ہیں الٹا ہونا۔ اور بدلنا کھوٹے روپے کو اسی لیے قلب کہتے ہیں۔ کہ شخص اسے اکثر واپس کرتا ہے اور بدلتا ہے۔ دل کو بھی قلب اسی لئے کہتے ہیں۔ کہ وہ بائیں پہلو میں اوندھا لٹکا ہوا ہے۔ اور اُس کا حال ہر وقت بدلتا رہتا ہے ذرا میں متقی ہوتا ہو ذرا میں کافر کبھی خوش کبھی غمگین وغیرہ۔ ہماری زبان میں تو قلب اُس گوشت کے لوتھڑے کا نام ہے۔ جو غنچہ (یعنی کلی) کی شکل ہے۔ اور سینے کے بائیں طرف لٹکا ہوا ہے۔ روح اسی گوشت میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے شرائیں رگوں کے ذریعہ ہر عضو میں پہنچ جاتی ہے یہی ہر جاندار کی زندگی کی اصل ہے لیکن شریعت میں اُس ربانی لطیفہ کا نام ہے جس کا تعلق اس گوشت سے ہے۔ اسی لطیفہ پر انسانیت موقوف ہے۔ اور اسی سے رب کی فرمانبرداری اور شریعت کی پابندی ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں قلب کے اکثر یہی معنی مراد ہوتے ہیں جس طرح کہ اُس گوشت کے ساتھ جان قائم اسی طرح اس لطیفہ کے ساتھ ایمان قائم۔ اسی پر الہام الٰہی ہوتا ہے۔ اور یہی لطیفہ دلیلوں سے نتیجہ معلوم کرتا ہے۔ اس کو قرآن کریم نے کہیں قلب کہا ہے۔ جیسے لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ۔ اور کہیں نفس فرمایا ہے۔ جیسے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا اور کہیں روح۔ جیسے قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (تفسیر عزیزی) اسی کو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

نیست ایں پیکر مخروطی دل ۔۔۔ بلکہ ہست ایں قفس طوطی دل

گر تو طوطی ز قفس نہ شناسی ۔۔۔ بخدا ناس نۂ نہ شناسی

یعنی یہ غنچہ کی شکل والا گوشت دل نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو طوطی دل کا پنجرہ ہے۔ اگر تو اس پنجرہ اور طوطی میں فرق نہ کر سکے۔ تو تو قسم خدا کی انسان نہیں۔ اردو میں بھی کبھی بولا کرتے ہیں۔ کہ فلاں بڑا دل والا آدمی ہے۔ وہاں دل سے یہی مراد ہے۔ اور یہی معنی اس آیت میں مراد ہیں۔ تو آیت کا مطلب یہ ہوا۔ کہ وہ اللہ کا فضل اور لطیفہ جو ہر انسان کو ہدایت پر رہنے۔ اور رب کو پہچاننے کے لئے عطا فرمایا گیا تھا اور جو ذوق شوق اور کشف کا سرچشمہ تھا۔ اور جو کہ ایمان کے رہنے کی جگہ اور اُس کا برتن تھا جب اُس پر ہی کفر کی مہر لگ گئی۔ اور کفر سے وہ اس قدر بھر گیا۔ کہ اس میں ایمان کی جگہ ہی نہ رہی۔ تو اب اُن کے ایمان لانے کی کیا امید وَعَلٰى سَمْعِهِمْ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق قلب سے ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے۔ کہ اُن کے دلوں پر بھی مہر ہے اور اُن کے کانوں پر بھی اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ اس کا تعلق آگے یعنی اَبْصَار سے ہے۔ تو آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ اُن کے دلوں پر تو اللہ نے مہر لگادی۔ اور اُن کے کانوں اور آنکھوں پر پردے ہیں۔ لیکن پہلا قول صحیح ہے۔ اس لئے کہ دوسری آیت میں اسے صاف طریقہ سے بیان فرمایا گیا۔ وَخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً اس آیت میں صاف صاف فرمادیا۔ کہ مہر دو چیز دل پر ہے۔ دل اور کان۔ اور پردہ فقط آنکھ پر وہی معنی اس جگہ مناسب ہیں نیز کان کے واسطے مہر ہی مناسب ہے۔ اور آنکھ کیلئے پردہ۔ کیونکہ کان ہر طرف کی آواز سنتا ہے۔ اور آنکھ فقط سامنے کی چیز دیکھتی ہے۔ اور مہر ہر راستہ کو بند کرتی ہے۔ اور پردہ فقط سامنے کے راستے

کو۔ اس لئے کان اور دل پر مہر لائق اور آنکھ پر پردہ مناسب نیز مہر سے اصل مقصود یہ ہوتا ہے۔ کہ کوئی بیرونی چیز اندر نہ آسکے۔ اور پردہ سے اصل مقصود یہ ہوتا ہے۔ کہ اندر کی چیز باہر نہ آسکے۔ اس لئے عورت پردہ کرتی ہے۔ نہ کہ مرد اور چونکہ دل میں باہر سے خیالات آتے ہیں۔ اور کان میں باہر کی آوازیں۔ لہٰذا اُن کو روکنے کیلئے مہر ہی مناسب ہے۔ اور آنکھ میں کوئی بیرونی چیز نہیں آتی بلکہ خود آنکھ سے نوری شعاعیں نکل کر باہر والی چیزوں پر پڑتی ہیں۔ تو اُن کا احساس ہوتا ہے۔ اس لئے اس کیلئے پردہ مناسب ہے، اس جگہ عَلٰی کو دوبارہ اس لئے لایا گیا۔ تاکہ معلوم ہو کہ کانوں پر دل کے علاوہ علیحدہ مستقل مہر لگی ہے۔ یہ نہیں ہُوا کہ فقط دل پر تو مہر ہو۔ اور اُس کے سبب سے کان بیکار ہوں بِسَمۡعٌ کے معنی سننے کے ہیں۔ لیکن اس جگہ اُس عضو کو کہا گیا ہے۔ کہ جس میں یہ طاقت محفوظ ہے۔ اور وہ عضو دونوں کانوں کے درمیان میں ایک پٹھہ ہے جب آواز کانوں کے راستے سے اُس پٹھے تک پہنچتی ہے۔ تب اُس کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ وہ پٹھہ ایک ہی ہے۔ اس لئے اس کو یہاں صیغہ مفرد سے بولا گیا۔ سبحان اللہ کیا نفیس ترتیب ہے۔ کہ دل ایمان و کفر کا ظرف تھا۔ اُس کا ذکر پہلے ہُوا۔ اور کان اور آنکھیں ایمان کا راستہ کیونکہ کان کے ذریعہ قرآن کریم کی آیتیں نصیحتیں اور ہدایتیں دل تک پہنچتی ہیں۔ اور دل انہیں قبول کر کے ایمان لاتا ہے۔ اسی طرح آنکھوں سے قرآن کریم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ پاک اور معجزات حق تعالیٰ کی قدرت کے نمونے دیکھے جاتے ہیں۔ دل اِن کو مان کر ایمان لاتا ہے۔ تو گویا دل بادشاہ ہُوا اور یہ اعضا اُس کے خادم بادشاہ کا ذکر پہلے ہُوا۔ اور خادموں کا بعد میں۔ پھر کان آنکھوں سے چند وجوہ سے افضل ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی پیغمبر سننے کی قوت سے محروم نہ ہُوا۔ لیکن بعض پیغمبر آنکھوں کی مرض میں مبتلا ہوئے۔ جیسے حضرت یعقوب اور شعیب علیہما السلام۔ تو سننا نبوت کی شرط ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر بہرہ گونگا ضرور ہوتا ہے۔ لیکن ہر نابینا گونگا نہیں۔ بہرے سے ہماری مراد وہ ہے جو بالکل نہ سُن سکے۔ نہ وہ کہ جو اونچا سنتا ہو تیسرے یہ کہ سننے سے عقل کامل ہوتی ہے۔ نہ کہ محض دیکھنے سے چوتھے یہ کہ کان ہر طرف کی آواز سنتا ہے۔ اور آنکھ فقط سامنے کو دیکھتی ہے۔ پانچویں یہ کہ آنکھ اپنے دیکھنے میں درمیانی روشنی کی محتاج کہ نہ تو یہ تاریکی میں کام کر سکے اور نہ بہت تیز روشنی کو برداشت کر سکے۔ مگر کان کے سننے میں یہ کوئی شرط نہیں۔ چھٹے یہ کہ تبلیغ اکثر و بیشتر کان اور زبان کے ذریعے ہوتی ہے۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمان سُنے اور لوگوں سے بیان کئے جاتے ہیں۔ اس لئے کان کو آنکھ سے پہلے بیان کیا گیا۔ (تفسیر عزیزی و کبیر و روح البیان وغیرہ) وَعَلٰۤى اَبۡصَارِهِمۡ یہ جملہ علیحدہ ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ اُن کی آنکھوں پر پردے ہیں۔ اَبۡصَار جمع بَصَر کی ہے جس کے معنی ہیں دیکھنا لیکن یہاں مراد ہیں آنکھیں جن میں کہ دیکھنے کی طاقت ہے۔ غِشَاوَةٌ سے مراد وہ پردہ ہے۔ کہ جو لوگوں کو نظر نہ آئے۔ مگر خود دیکھنے والے کے لئے آڑ بن جائے جس کی وجہ سے کہ وہ آیاتِ الٰہیہ کو صحیح طور پر نہ دیکھ سکے۔ وَّلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ۔ عذاب عَذۡبٌ سے بنا ہے عَذۡبٌ کے معنی ہیں۔ روکنا۔ میٹھے پانی کو اسی لئے عَذب کہتے ہیں۔ کہ وہ پیاس کو روکتا ہے۔ سزا کو اس لئے عذاب کہتے ہیں۔ کہ وہ جُرم سے روکتی ہے۔ قرآن کریم میں عذاب سزا کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عَظِيۡمٌ عظیم حقیر کے مقابلہ میں ہے۔ اور کبیر صغیر کی ضد حقیر کے معنی ہیں ہر طرح چھوٹا۔ تو عظیم کے معنی ہوئے۔ ہر طرح بڑا۔ صغیر کے معنے ہیں۔ ایک لحاظ سے چھوٹا تو کبیر کے معنی ہوں گے۔ ایک لحاظ سے بڑا۔ لہٰذا عظیم کبیر سے بڑھ کر ہے۔ اب اس آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ اُن کے لئے وہ عذاب ہے جو ہر طرح بڑا ہو۔ وہ اس طرح کہ دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کئے جائیں۔ یا قیدی بنائے جائیں۔ آخرت میں نیز آگ، گرم پانی اور زہریلے جانوروں میں مبتلا کئے جائیں۔ اس پر سب سے بڑی مصیبت یہ کہ وہ دائمی ہو جس کی انتہا نہ ہو۔ **خلاصہ مضمون**۔ اس آیت کریمہ کا مضمون یہ ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ اُن کفار کی ہٹ دھرمی سے رنجیدہ نہ ہوں۔ اور نہ اُن کے ایمان لانے کی امید رکھیں۔ کیونکہ ایمان لانے کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اُس کا دل صحیح ہو۔ اور وہ خود بخود حق تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں اور نبی کے معجزات کو دیکھ کر ایمان لے آئے۔ دوسرے یہ کہ اُس کو خود تو عقل نہ ہو لیکن دوسرے کے سمجھانے اور بتانے سے ایمان قبول کر لے۔ یہ کفار اِن دونوں چیزوں سے محروم ہیں۔ کیونکہ ان کی ضد اور ہٹ نے اِن کے دل کو اس قابل نہ رکھا

کہ اُس سے کوئی صحیح بات سوچ سمجھ سکیں. اور کان اور آنکھوں کو ایسا معطل کر دیا کہ جن سے وہ حق کی آواز سنتے نہیں. اور حق کی آیات دیکھتے نہیں. چونکہ ایمان لانے کے سارے اسباب اِن کے لئے ختم ہو چکے. اس لئے آپ اُن کے ایمان کی امید نہ فرمائیں. اور یہ بھی ہے. کہ دِل ایمان کا مکان اور آنکھ. کان. ایمان کے راستے جب راستے بھی بند ہو چکے. اور مکان بھی ایمان کے آنے کے لائق نہ رہا. تو اب انہیں ایمان کیونکہ میسّر ہو. علماء کرام فرماتے ہیں. کہ گناہوں کی اصل تین چیزیں ہیں. حرص حسد اور تکبّر غفلت پیدا کرنے والی چند چیزیں ہیں زیادہ کھانا. زیادہ سونا. ہر طرح آرام سے رہنے کی خواہش کرنا. مال کی محبت عزت کی رغبت حکومت کی خواہش. بسا اوقات مال و حکومت کی طلب میں انسان کافر بن جاتا ہے. اور وہ یہ بھی فرماتے ہیں. کہ گناہ دل میں سیاہی پیدا کرتا ہے. اور قرآن پاک کی تلاوت. درود شریف. اللہ پاک کا ذکر. موت کا یاد کرنا. یہ سب چیزیں دِل کے صیقل ہیں. جن سے کہ وہ سیاہی دور ہوتی ہے. اسی طرح زیادہ ہنسنا دل کو بیمار کرتا ہے. اور خوف الٰہی سے رونا اس کا علاج ہے. جو شخص گناہوں کے ساتھ یہ نیکیاں بھی کرتا رہے. تو اس کا قلب میلا ہو کر دھلتا رہے گا. لیکن جو گناہوں میں مشغول رہے نیکی کی طرف متوجہ نہ ہو. اُس کے قلب کی سیاہی بڑھتے بڑھتے ایک دن سارے قلب کو سیاہ کر دے گی جس کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے. کہ اِن دِلوں پر لوہے کی طرح زنگ آتا رہتا ہے. اور اس کی صفائی تلاوت قرآن ہے. اس سیاہ قلب کو صاف کرنے کے لئے ایک عرصہ اور کافی محنت چاہیئے. ہاں اگر کسی اللہ والے کی اس پر نگاہ کرم پڑ جائے. تو وہ آناً فاناً اُس قلب کو صاف کر دیتی ہے.
اسی کے متعلق اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں ؎

تو جو چاہے تو ابھی میل میرے دِل کے دھلیں  کہ خدا دل نہیں کرتا کبھی میلا تیرا

مگر جس دل کی سیاہی اللہ والے کی نگاہ سے بھی دور نہ ہو. تو یقیناً اُس پر مہر لگ چکی. اسی طرف اس آیت میں اشارہ ہے. شعر

بخدا خدا کا یہی ہے در نہیں اور کوئی مفر مقر  جو وہاں سے ہو یہیں آ کے ہو جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

**تفسیر صوفیانہ.** صوفیائے کرام فرماتے ہیں. کہ حق تعالیٰ نے میثاق کے دِن انسانوں کو ذروں کی شکل میں ظاہر فرما کر اُن سے اپنی ربوبیت کا عہد لیا. پھر اُن ذروں کو دِلوں میں. دِلوں کو جسموں میں اور جسموں کو دنیا میں امانت کے طور پر رکھا. یہ ذرے تا وقت ولادت دِلوں کے روزن ہیں جن کے ذریعے دل کو عالم غیب نظر آتا رہا. اور وہاں کی آوازیں محسوس ہوتی رہیں. اسی لئے روایت میں آتا ہے. کہ ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے. اُس کے ماں باپ اُس کو یہودی. عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں. جب ہوش سنبھال کر انسان بُری صحبتوں میں بیٹھا. آہستہ آہستہ وہ روزن بند ہوتے گئے. یہاں تک کہ اب کھُلنے کے قابل نہ رہے اُسی حالت کا اِس آیت میں بیان ہے. اب اُس شخص کے پاس بصارت رہ گئی. بصیرت نہ رہی. ایک بزرگ نے فرمایا. کہ جو مجھے دیکھ لے وہ جنّتی ہو جائے. معترض نے اعتراض کیا. کہ ابو جہل تو رسول اللہ کو دیکھ کر جنتی نہ بنے. لوگ آپ کو دیکھ کر جنتی بن جائیں. انہوں نے جواب دیا. قسم رب کی ابو جہل نے محمد رسول اللہ کو نہ دیکھا. بلکہ محمد ابن عبداللہ کو دیکھا. اگر محمد رسول اللہ کو دیکھ لیتا. تو ممکن نہ تھا. کہ جہنم میں جاتا. کیونکہ رسول اللہ کو دیکھنے والی آنکھ جہنم میں جا سکتی ہی نہیں.
**حقیقت** یہ ہے. کہ حسن لیلےٰ کے لئے دیدۂ مجنوں چاہیئے. اور جمال مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے صدیقی نگاہ درکار ہے.
قرآن پاک فرماتا ہے. وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ اے محبوب وہ آپ کو دیکھتے تو ہیں. مگر دیکھتے نہیں نیز فرماتے ہیں. کہ بیج زمیں میں چھپایا جاتا ہے. پھر وہ درخت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے. اور درخت شاخ سے پھر شاخ سے پھل غرضکہ پھل اُس بیج کے سارے ظاہری و باطنی اوصاف کو بیان کر دیتا ہے. اور پکار کر زبان حال سے کہتا ہے. کہ اے دیکھنے والو. اگر تم میرے بیج کا ہر اندرونی و بیرونی حال معلوم کرنا چاہتے ہو. تو مجھ کو دیکھ لو. تو گویا یہ پھل بیج کے ظہور کا خاتمہ ہے اسی طرح تقدیر الٰہی کا راز. نیک بختی اور بدبختی کا تخم ہے. کہ جو اللہ کے علم میں محفوظ ہے. پھر انسان کا وجود وہ درخت ہے جس میں یہ نیک بختی اور بدبختی محفوظ. اس سے

اخلاق کی شاخیں نکلیں۔ اور ان شاخوں میں نیک و بد اعمال اور اقرار و انکار کے پھل لگے۔ ان پھلوں نے ان اسرار الٰہیہ کو جو اب تک چھپے ہوئے تھے۔ ظاہر فرمایا۔ تو یہ دل اور کانوں کی مُہر۔ اور آنکھوں کے پردے ان بھیدوں کا مظہر ہیں۔

**فائدہ** بزرگان دین فرماتے ہیں۔ کہ اللہ والوں کی عداوت سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے۔ اور ان سے دشمنی رکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ دل میں مہر لگجاتی ہے۔ کہ پھر اس کو ایمان میسر نہیں ہوتا۔ اسی لئے حدیث قدسی میں ارشاد ہوا کہ جو کوئی میرے کسی ولی سے عداوت رکھتے ہیں اس کو اعلان جنگ دیتا ہوں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے۔ کہ محبت کے کفر سے عداوت کا کفر سخت ہے یعنی ایک شخص کسی نبی کی محبت میں حد سے بڑھ کر کافر ہو گیا۔ جیسے کہ عیسائی اور دوسرا نبی کی عداوت کی وجہ سے کافر ہوا۔ جیسے یہودی۔ اگرچہ یہ دونوں فرقے اسلام سے خارج ہیں۔ لیکن یہودی بمقابلہ عیسائیوں کے سخت کافر ہیں۔ اسی لئے یہودی حق تعالےٰ کی نعمتوں سے یکسر محروم ہیں۔ کہ ان کے لئے فرمایا گیا۔ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْکَنَةُ اور آج دنیا میں کہیں بھی یہودی کی سلطنت نہیں۔ اسی طرح روافض سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں حد سے بڑھ کر ایمان سے نکل گئے۔ اور انبیاء کرام کی گستاخی کرنے والے دیوبندی اسلام سے خارج ہو گئے۔ مگر ان روافض سے یہ دیوبندی سخت کافر ہیں کیونکہ یہ دشمنیٔ انبیاء کی وجہ سے کافر ہوئے۔ **اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ ان کافروں کے لئے ایمان کے سارے راستے بند ہو چکے۔ لہٰذا یہ لوگ کافر رہنے میں بے قصور ہوئے۔ اور بے قصور کو سزا کیسی (ستیارتھ پرکاش) **جواب** یہ لوگ اس لئے مجرم ہیں۔ کہ انہوں نے اپنے ایمان کے راستے خود بند کرائے۔ کیونکہ اس کے اسباب انہوں نے جمع کئے اور حق تعالےٰ نے راستے بند کر دیئے۔ جیسے کہ کوئی شخص کسی کو ظلماً قتل کر دے۔ تو اگرچہ مقتول کی جان حق تعالےٰ نے ہی نکالی۔ لیکن جان نکلنے کے سارے اسباب (یعنی قتل وغیرہ) اس نے جمع کئے لہٰذا قاتل یقیناً مجرم ہے

| وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ |
|---|
| اور سے لوگ وہ کہتے ہیں ایمان لائے ہم ساتھ اللہ اور ساتھ دن پچھلے اور نہیں ہیں وہ ایمان دار |
| اور کچھ لوگ کہتے ہیں۔ کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے۔ اور وہ ایمان والے نہیں۔ |

**تعلق**۔ اس سے پہلے کی آیتوں میں خالص مومنوں اور خالص کافروں کا ذکر ہوا۔ اب ان منافقین کا ذکر فرمایا جارہا ہے۔ جو دل سے کافر تھے۔ اور زبان سے مومن بنتے تھے۔ چونکہ ان کی حالت مومنین اور کافرین کے درمیان تھی۔ لہٰذا ان کا ذکر ان دونوں کے بعد میں کیا گیا۔ اس لئے کہ درمیانی چیز جب ہی سمجھ میں آسکتی ہے جب اس کے دونوں کنارے معلوم ہوں۔ دوسرا تعلق اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے کھلے ہوئے۔ کافروں کا ذکر تھا۔ اور اب چھپے ہوؤں کا۔ چھپا ہوا۔ کافر ظاہر کافر کے مقابلہ میں زیادہ خطرناک ہے۔ لہٰذا اس کا ذکر بعد میں کیا۔ **شانِ نزول** مدینہ منورہ میں ایک شخص عبداللہ ابن ابی تھا جس کو وہاں اچھی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اور قریب تھا کہ اس کو وہاں کا سردار بنا دیا جائے۔ لیکن جب آفتاب اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں جلوہ گری فرمائی۔ اور مدینے والوں کے دل نور ایمانی سے جگمگائے۔ تو اس کی عزت و آبرو میں فرق آگیا۔ اس کی طرف مدینے والوں کا وہ رجحان نہ رہا جو پہلے تھا۔ اس لئے اس کے دل میں بغض و عناد کی آگ بھڑک اٹھی۔ مگر یہ بہت چالاک تھا۔ اس نے خیال کیا۔ کہ اگر میں ظاہر طور پر مسلمانوں کا مخالف رہوں۔ تو میری خیر نہیں۔ اس لئے بظاہر تو یہ مسلمان ہو گیا مگر دل سے سخت دشمن رہا اور اس نے یہ روش اختیار کی۔ کہ مسلمانوں کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف بیان کیا کرتا۔ اور کہتا۔ کہ یہ وہی نبی آخر الزمان ہیں جن کی خبر توریت میں دی گئی۔ اور جب کفار سے ملتا۔ تو مسلمانوں کے خلاف باتیں کرتا۔ اور دل میں خوش ہوتا تھا کہ ہم دونوں جماعتوں کے پیارے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے دشمن مل گئے جس سے کہ اس کی پوری جماعت ہو گئی جس کا نام منافقین ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں یہ آیات کریمہ اتریں۔ **تنبیہ** رب تعالیٰ نے مسلمانوں کی صفات میں ۱۳ جگہ چار آیتیں نازل فرمائیں۔ اور کھلے کافروں کے متعلق دو

آیتیں. لیکن منافقوں کے عیوب تیرہ آیتوں میں بیان فرمائے. یا تو اس لئے کہ یہ زیادہ خطرناک تھے. اور یا اس لئے کہ مسلمان ان کو پہچان نہ سکتے تھے. اُن کی بہت سی نشانیاں بتا دینے سے ان کا پہچاننا آسان ہو گیا. اور یا اس لئے کہ یہ مسلمانوں سے تعلق رکھتے تھے. اُن کی صحبت میں آکر بیٹھتے تھے. نمازوں میں شریک ہوتے تھے. لہٰذا ان کے ایمان کی کسی قدر امید تھی. اس لئے اُن کے عیوب زیادہ بیان کئے تاکہ وہ شرمندہ ہو کر خالص مومن بن جائیں. **اَلنَّاسُ** یہ انسان کا اسم جمع ہے. اور اس کو ناس اس واسطے کہتے ہیں کہ یہ نسیًا سے بنا ہے جس کے معنی ہیں بھولنا چونکہ یہ بھی اپنے پہلے عہد میثاق کو بھول گیا. اسی لئے اس کو انسان اور ناس کہا گیا. نیز یہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کو جلد بھول جاتا ہے. اور مصیبتوں کو یاد رکھتا ہے. اس لئے اس کو ناس کہا گیا. یا یہ اِنْسٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں دیکھنا اور ظاہر ہونا. چونکہ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے. اور ظاہری زمین پر رہتا ہے. اس لئے اس کو انسان کہتے ہیں. اور جنّ چونکہ زمین کے چھپے ہوئے حصے میں آباد ہیں. اس لئے انہیں جنّ کہتے ہیں. بعض لوگ کہتے ہیں. کہ انسان اور ناس اُنس سے بنا ہے. جس کے معنی ہیں محبت چونکہ انسان بھی اپنے ہم جنس سے بہت زیادہ محبت رکھتا ہے. اس لئے اسے انسان کہتے ہیں. **مَنْ** واحد تثنیہ جمع سب کے لئے بولا جاتا ہے. کیونکہ یہ لفظاً واحد ہے اور معناً جمع. اسی لئے اس کی طرف واحد اور جمع دونوں قسم کی ضمیریں لوٹ سکتی ہیں. اس آیت میں **یَقُوْلُ** بصیغہ واحد فرمایا گیا اور **اٰمَنَّا** اور **ھُمْ** اور **مُؤْمِنِیْنَ** یہ سب جمع کے طریقے پر. کیونکہ لفظ مَنْ میں دونوں کی گنجائش ہے. اس آیت میں دو چیزوں پر ایمان لانے کا ذکر ہوا. ایک اللہ اور دوسرے یوم آخر. اس لئے کہ یہ دونوں ایمانیات کے گویا کنارے ہیں. منافقین سارے ایمانیات کے ماننے کا دعوےٰ کر رہے ہیں. اور یہ کہتے ہیں. کہ ہم رب تعالےٰ سے یوم آخر تک کی تمام چیزوں پر ایمان لے آئے. کتاب. نبی سب اس میں آ گئے. اور یا اس لئے کہ اُن کے اس کلام میں بھی فریب تھا. کیونکہ یہ لوگ یہودی تھے. وہ اللہ اور قیامت کو تو پہلے ہی سے مانتے تھے. انہوں نے یہاں ایسا لفظ بولا کہ جس سے دو پہلو نکلیں. مسلمان تو سمجھیں. کہ یہ ایمان لے آئے. اور اپنے ہم جنس کفار سے یہ کہہ سکیں. کہ ہم مسلمان نہیں ہوئے. ہم نے تو اپنے اصلی عقیدے کو بیان کیا. (تفسیر روح البیان) **وَمَا ھُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ** میں اس کی نہایت عمدہ طریقہ سے تردید فرما دی گئی کیونکہ یہاں یہ نہ فرمایا گیا. کہ وہ ایمان نہ لائے. بلکہ فرمایا گیا. کہ وہ مومنین کی جماعت ہی سے نہیں. یا یہ کہ وہ اصل سے ہی مومن نہیں.

**خلاصۂ تفسیر.** اس آیت کریمہ میں منافقین کا کلام نقل فرمایا گیا. کہ وہ بظاہر کہتے تھے. کہ ہم ایمان لے آئے اور مسلمان ہو گئے. تاکہ مسلمانوں میں مل کر دنیاوی نفع حاصل کریں. اور اپنے ظاہری اسلام کو آڑ بنا کر ہر قسم کی سختی سے بچے رہیں. مگر چونکہ یہ ایمان حقیقی نہ تھا. اور خلوص دل انہیں میسر نہ تھا. فقط زبان سے دعوےٰ اسلام کرنا حق تعالےٰ کے نزدیک کچھ وقعت نہیں رکھتا. لہٰذا مسلمانوں کی تنبیہ کیلئے فرما دیا گیا. کہ یہ لوگ فریبی ہیں مسلمان نہیں. اِن کے عیوب قرآن کریم نے مختلف جگہ بیان فرماتے ہیں. اور جو کچھ انہوں نے غزوات میں فتور برپا کئے وہ بھی قرآن پاک میں مذکور ہیں. اِن آیات سے حق تعالےٰ نے نفاق کی جڑ کاٹ دی.

**فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے. اوّل یہ کہ انسانوں کے چند گروہ ہوئے. ایک وہ جو دل اور زبان سے مومن ہوں. ان کو مخلصین کہا جاتا ہے. دوسرے وہ کہ جو ظاہر باطن کافر. ان کو مجاہر کہتے ہیں. تیسرے وہ کہ جو دل میں کافر اور زبان سے مومن. ان کو منافق کہا جاتا ہے. جو شخص دل سے مومن اور بظاہر کافر ہو اُس کی دو صورتیں ہیں. اگر کسی سخت مجبوری کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے. تو وہ مخلصین میں داخل ہے. قرآن کریم فرماتا ہے. **اِلَّا مَنْ اُکْرِہَ وَقَلْبُہٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ** مگر اس صورت میں ضروری ہے کہ مجبوری کے دُور ہوتے ہی اپنے ایمان کو ظاہر کر دے. اور اگر بلا سخت مجبوری کے کفر ظاہر کرتا ہے. تو وہ شرعاً مسلمان نہیں. اور نہ اُس پر اسلامی احکام (جیسے کہ تجہیز و تکفین و نماز جنازہ وغیرہ وغیرہ) جاری ہوں. بہت ممکن ہے. کہ کبھی نہ کبھی اِن کی نجات ہو جائے. حدیث شفاعت میں ہے. کہ جنتیوں کو حکم ہوگا. کہ جہنم میں سے اُن لوگوں کو بھی نکال لاؤ جن کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو. چنانچہ جنتی اس

حکم پر عمل کریں گے۔ حق تعالےٰ ارشاد فرمائے گا۔ کہ شُفَعَاء اپنی شفاعت سے بخشوائے گئے۔ اب رب کی باری ہے حق تعالےٰ اپنا ایک لپ بھر کر جہنمیوں کو جہنم سے نکالے گا۔ تفسیر روح البیان شریف وغیرہ نے لکھا ہے۔ کہ یہ وہ لوگ ہوں گے۔ جو شرعاً کافر تھے۔ اور دل میں مومن۔ بہت ممکن ہے۔ کہ ابو طالب بھی انہیں میں سے ہوں۔ کیونکہ شرعی ایمان والے تو شُفَعَاء کے ذریعہ نکل گئے۔ اس لپ میں وہی آئے جن کا ایمان شرعی نہ تھا۔ **منافق** یہ لفظ نفاق سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں علیحدہ ہونا۔ چونکہ اِن کا دل و زبان علیحدہ علیحدہ ہیں۔ اس لئے انہیں منافق کہا جاتا ہے۔ نفاق کی چند قسمیں ہیں۔ (۱) یہ کہ زبان سے ایمان ظاہر کرے۔ مگر دل میں صاف منکر ہو (۲) یہ کہ زبان سے ایمان ظاہر کرے۔ مگر دل میں صاف منکر نہ ہو۔ بلکہ مذبذب ہو (۳) یہ کہ زبان سے اسلام کا اقرار کرے۔ اور دل میں تصدیق بھی ہو۔ مگر دُنیا کی محبت اُس پر ایسی غالب ہو کہ دنیوی نفع کو ایمان پر مقدم سمجھتا ہو۔ دُنیا کے لئے لشکر اسلام کا مقابلہ کرے۔ اور اسلام اور اہل اسلام کی بربادی اور دین کی مذمت اس کے نزدیک کچھ مشکل نہ ہو۔ جو کافر چاہے چند پیسے دیکر۔ اس سے ہر بُرا بھلا کام کرائے۔ یہ تینوں قسم کے لوگ سخت کافر ہیں۔ اور جہنم کے سب سے نیچے کے طبقے میں رہیں گے۔ (۴) یہ کہ جو ایسا بے حیا تو نہ ہو۔ مگر اُس کا قال حال کے مطابق نہ ہو۔ زبان سے کچھ کہے اور دل میں کچھ رکھے اس کو تقیہ کہتے ہیں۔ جو کہ شیعہ مذہب کا بڑا اصولی مسئلہ ہے۔ اس قسم کا نفاق بھی منافقین کا طریقہ تھا جو صداقت ایمان سے بالکل ہے۔ کوئی معمولی سمجھدار بھی اس کو اچھا نہیں جانتا۔ حدیث پاک میں بعض گناہوں کو بھی نفاق کہا گیا ہے۔ جیسے کہ روایت میں آتا ہے۔ کہ منافق کی علامتیں چند ہیں جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ کسی سے لڑے تو گالیاں بکے۔ وعدہ کرے۔ تو پورا نہ کرے۔ کسی کی امانت رکھے تو خیانت کرے۔ یہ عملی نفاق ہے۔ نہ کہ اعتقادی یعنی یہ منافقوں کے کام ہیں۔ **دوسرا فائدہ** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ جتنے فرقے ایمان کا دعویٰ کریں۔ اور کفر کا اعتقاد رکھیں۔ وہ سب اسلام سے خارج ہیں۔ کیونکہ محض دعویٰ کرنے سے ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ **تیسرا فائدہ** منافقوں کو مِنَ النَّاسِ کہا گیا جس میں اس طرف اشارہ ہے۔ کہ یہ لوگ فقط صورت میں مسلمان ہیں انسانی کمالات اور صفات سے ایسے خالی ہیں۔ کہ اُن کا ذکر کسی خوبی سے نہیں کیا جاتا ہاں یہ کہا جاتا ہے۔ کہ وہ بھی آدمی ہیں جس سے معلوم ہوا کہ کسی کو صرف بشر کہنے میں اُس کے فضائل و کمالات کے انکار کا پہلو نکلتا ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں جا بجا انبیاء کرام کے بشر کہنے والوں کو کافر فرمایا گیا۔ کیونکہ در اصل یہ لفظ انبیاء کرام کی شان میں ادب سے دُور اور کفار کا دستور ہے۔ (تفسیر خزائن العرفان) **چوتھا فائدہ**۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ کھُلے کافر سے منافق کافر بدتر ہے۔ اس کی چند وجوہ ہیں:۔ (۱) یہ کہ کافر تو فقط کافر ہے۔ مگر منافق کافر بھی ہے۔ اور دھوکے باز بھی۔ (۲) یہ کہ کافر گویا مرد ہے۔ مگر منافق خنثیٰ! (۳) یہ کہ کافر تو فقط کافر ہے مگر منافق کافر بھی ہے۔ اور جھوٹا بھی۔ (۴) یہ کہ کافر تو محض کافر ہے۔ مگر منافق کافر بھی ہے اور اسلام کا مذاق اڑانے والا بھی۔ **پہلا اعتراض** منافقین اللہ اور قیامت کو دل سے مانتے تھے پھر قرآن کریم نے اُن کے اس ماننے کا کیوں انکار کیا **جواب**۔ اس لئے کہ وہ غلط طریقہ سے مانتے تھے۔ خدائے تعالیٰ کو اولاد والا اور قیامت کو اپنی نجات کا دن مانتے تھے۔ اور یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بغیر مانے ہوئے کسی چیز کا ماننا معتبر نہیں۔ وہی توحید اللہ کے نزدیک معتبر ہے جو نبوت کے اقرار کے ساتھ ہو۔ چونکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرتے ہوئے۔ رب کا اقرار کرتے تھے۔ اس لئے فرمایا گیا۔ کہ وہ رب کو بھی نہیں مانتے۔ **دوسرا اعتراض**۔ قیامت کو یوم یعنی دن کیوں کہتے ہیں۔ دن تو سورج سے بنتا ہے۔ اور اُس دن تو سورج ہی فنا ہو چکا ہو گا۔
**جواب** عربی میں وقت کو بھی یوم کہتے ہیں۔ یہاں یہی معنی مراد ہیں۔ **تیسرا اعتراض** قیامت کو یوم آخر کیوں کہتے ہیں۔ اور اس کی حد کیا ہے
**جواب** قیامت سے پہلے محدود دن تھے۔ اور وہ قیامت کے آنے سے ختم ہو گئے۔ اب غیر محدود وقت ہے۔ اس لئے اس کو یوم آخر کہتے ہیں۔ قیامت کی حد کے متعلق دو قول ہیں بعض علماء کرام فرماتے ہیں۔ کہ وہ مُردوں کے اُٹھنے سے شروع ہو کر فیصلہ الٰہی پر ختم ہو گا۔ یعنی جب سارے جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے۔ اور محض کفار دوزخ میں رہ جائیں گے۔ تب اسی دن کی انتہا ہو گی بعض فرماتے ہیں۔ کہ اسکی کوئی انتہا نہیں (تفسیر کبیر)

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْاۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ⑨

وہ فریب دیتے ہیں اللہ اور اُن کو جو ایمان لائے اور نہیں فریب دیتے مگر جانوں اپنی کو اور نہیں سمجھتے۔

فریب دیا چاہتے ہیں وہ اللہ اور ایمان والوں کو اور حقیقت میں فریب نہیں دیتے۔ مگر اپنی جانوں کو اور انہیں شعور نہیں۔

**تعلق**۔ اس آیت کا پہلی آیت سے دو طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ پہلی آیت میں منافقین کی بے ایمانی کا ذکر تھا۔ اور اب اُن کے بُرے اعمال کا چونکہ کفر اعمال سے مقدم ہے۔ اس لئے اُس کا ذکر پہلے ہوا۔ اور اعمال کا بعد میں۔ دوسرے یہ کہ پہلی آیت میں یہ فرمایا گیا تھا کہ اگرچہ وہ ایمان ظاہر کرتے ہیں لیکن وہ مومن نہیں۔ اور اس آیت میں اُس کے مقبول نہ ہونے کی وجہ بیان ہو رہی ہے یعنی چونکہ اُن کا اظہارِ ایمان خلوص سے نہیں بلکہ فریب دینے کے لئے ہے۔ اس لئے قبول نہیں۔ لطف یہ ہے۔ کہ مخلص یہی کلمے بول کر مومن بنتا ہے۔ اور وہ لوگ ان ہی کلموں سے زیادہ بے دین ہو گئے۔ کیونکہ لفظوں میں نیّت کا بڑا دخل ہے۔ مکھن نکلا ہوا دودھ اگرچہ شکل و شباہت میں دودھ ہی کی طرح ہے لیکن بازار میں اُس کی کوئی قیمت نہیں۔ خلوص نیّت مانند مکھن کے ہے۔ اور محض اچھے اچھے الفاظ جو اس سے خالی ہوں۔ اُن کی رب کی بارگاہ میں کوئی قدر قیمت نہیں۔ **تفسیر** يُخٰدِعُوْنَ خَدْعٌ سے بنا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں چھپانا۔ اسی لئے خزانہ کو مَخْدَع کہتے ہیں کیونکہ اس میں روپیہ چھپا رہتا ہے۔ اور گردن کی چھپی ہوئی رگوں کو اخدعین کہتے ہیں۔ اصطلاح میں خدع کے معنی دھوکہ ہیں یعنی برائی کو دل میں چھپا کر اچھائی ظاہر کرنا۔ اَللّٰهُ اس سے مراد یا تو اللہ کی ذات ہے۔ تو يُخٰدِعُوْنَ کے معنی ہوں گے۔ کہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ رب تعالےٰ کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ یا اللہ سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ بہت سی جگہ اللہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہوتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کو آپ کی عظمت کا پتہ چل جائے۔ کہ حضور علیہ السلام کا بارگاہ الٰہی میں وہ درجہ ہے۔ کہ اُن کی اطاعت رب کی اطاعت۔ اُن کی مخالفت رب تعالیٰ کی مخالفت ہے۔ اُن کو دھوکہ دینا رب تعالےٰ کو دھوکہ دینا ہے۔ قرآن کریم ایک جگہ ارشاد فرماتا ہے۔ کہ اے محبوبؐ جو آپ سے بیعت کرتے ہیں۔ وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا۔ کہ کنکر آپ نے نہیں پھینکے ہم نے پھینکے۔ اسی قاعدہ سے یہاں فرمایا جا رہا ہے۔ کہ منافقین اللہ کو یعنی رسول اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ (تفسیر کبیر۔ تفسیر روح البیان۔ تفسیر عزیزی وغیرہ) اَنْفُسَهُمْ اَنْفُسٌ نفس کی جمع ہے۔ نفس کے چند معنی ہیں ذات روح۔ دل۔ دل کے متعلقات۔ خون۔ پانی۔ یہاں پہلے معنی مراد ہیں یعنی یہ منافقین درحقیقت اپنے کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ کیونکہ جو شخص اعلےٰ چیز کو چھوڑ کر ادنیٰ اختیار کرے۔ اور پھر اپنے کو کامیاب جانے۔ وہ بڑا بیوقوف ہے۔ اور سخت دھوکے میں ہے۔ منافقین نے دین چھوڑ کر دنیا اختیار کی اور اس پر خوش ہوئے۔ لیکن دنیا بھی ہاتھ نہ آئی۔ بلکہ رسوائی۔ ذلت نصیب ہوئی۔ تو اپنے کو دھوکہ ہی دیا۔ صحابہ کرام نے فانی دنیا۔ اور اس کی نعمتوں پر لات ماری اور اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار کیا۔ تو دنیا بھی لونڈی بن کر اُن کے قدموں میں آ گری۔ درحقیقت یہی لوگ بہت کامیاب رہے۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔ يَشْعُرُوْنَ شعور سے بنا ہے شعور کہتے ہیں حواس سے جاننے کو اس لئے حواس کو مشاعر کہتے ہیں۔ اور شعر بال کو کہتے ہیں۔ اور جو لباس جسم سے مس کئے ہوئے ہو۔ اسے شعار کہتے ہیں منظوم کلام کو بھی اسی لئے شعر کہتے ہیں۔ کہ اُس کی برائی بھلائی وزن کا درست اور نادرست ہونا حواس سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے۔ کہ ان کم بختوں کے حواس بھی ایسے بگڑ گئے۔ کہ یہ اس قدر ظاہر چیز کو بھی محسوس نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ یہ دن رات دیکھ رہے ہیں۔ کہ ہماری خفیہ مخالفتوں سے اسلام کی اشاعت میں کچھ فرق نہیں آیا بلکہ دن بدن ترقی ہو رہی ہے۔ اور مسلمانوں کو ہم پر بالکل اعتماد نہیں۔ مگر اس پر بھی اپنی اس بُری روش کو نہیں چھوڑتے۔ تو گویا یہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں اور جمادات (اینٹ۔ پتھر وغیرہ) کی طرح ہیں۔ کیونکہ محسوسات کو جانور بھی معلوم کر لیتے ہیں **خلاصہ تفسیر**۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہوا۔ کہ منافقین

جو کہتے ہیں۔ کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے۔ اپنے گمان میں وہ خدائے تعالیٰ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو فریب دے رہے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت وہ خود کو فریب دے رہے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ علّام الغیوب ہے۔ اُس پر کوئی بات چھپی ہوئی نہیں۔ اور فریب اُسی کو دیا جاسکتا ہے۔ کہ جو حقیقت سے ناواقف ہو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے خلیفۂ اعظم ہیں۔ کہ اُس نے اپنے حبیب کو سارے علوم غیبیہ عطا فرمائے ہیں۔ وہ تو ابتدا ہی سے ہر ایک کی حقیقت اور انجام سے خبردار ہیں۔ کیونکہ معراج میں سب کفار اور مومنین کو دیکھ کر آئے ہیں صحابہ کرام کو بھی مومنین اور کفار کے ناموں کے رجسٹر دکھادیئے ہیں۔ جیساکہ احادیث میں آتا ہے۔ انہوں نے تو بڑے بڑے بدکاروں کے ایمان کی خبر دے دی۔ تو وہ آخر کار مومن ہی ہو گئے۔ اور بڑے بڑے ظاہری متقیوں کے جہنمی ہونے کی خبر دے دی۔ تو وہ آخر کار جہنمی ہو کر ہی مرے۔ انہوں نے تو یہ بھی بتادیا کہ حسین و حسن جوانان جنت کے سردار ہیں۔ میری لخت جگر فاطمہ جنتی بیبیوں کی سردار ہیں۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا۔ کہ ابوطالب دوزخ میں نہیں۔ بلکہ اُس کے چھپرے میں رہیں گے۔ اور اُن کے تلوے میں آگ کی محض ایک چنگاری ہوگی۔ وغیرہ وغیرہ جس سے معلوم ہوا کہ وہ جنتیوں اور جہنمیوں کو پہچانتے ہیں۔ اور اُن کے درجات اور درکات سے بھی واقف ہیں۔ لہٰذا یہ منافق اُن کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ اسی طرح مسلمان بھی اپنے نور ایمانی سے مومن اور کافر کو پہچان لیتے ہیں۔ جیساکہ حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ مسلمان کی ذہانت سے ڈرو۔ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ بلکہ اللہ والوں کے پاس بیٹھنے والے جانور بھی کافر و مومن کی تمیز کرلیتے ہیں حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شیر آگیا۔ آپ نے فرمایا کہ اے شیر میں رسول اللہ کا غلام ہوں۔ وہ یہ سُن کر کتّے کی طرح دُم ہلانے لگا۔ (دیکھو مشکوٰۃ شریف باب الکرامات) ابولہب کے بیٹے عتیبہ جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی۔ شیر نے اُس کا منہ سُونگھ کر پھاڑ دیا۔ لہٰذا وہ مسلمانوں کو بھی دھوکہ نہیں دے سکتے۔ لیکن چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے اُن کے عیب نفاق کو ظاہر نہ فرمایا۔ اس لئے منافق سمجھے کہ ہم دھوکہ دہی میں کامیاب ہو گئے۔ حقیقتاً نہ تو خدا تعالیٰ کو دھوکہ ہوا اور نہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور نہ ہی مسلمانوں کو۔ بلکہ خود منافقوں کو ہوا۔ لیکن وہ اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ کہ اُن کی اس بکواس پر مسلمانوں کا خاموش ہوجانا درحقیقت عیب پوشی ہے جس میں ہزار ہا راز ہیں۔ لہٰذا اس فریب کا اثر اُلٹا انہیں پر پڑا۔ کہ آخر کار دُنیا میں اُن کی رسوائی ہوئی۔ اور آخرت میں سخت عذاب کے مستحق ہوئے۔ مگر چونکہ ان کے حواس میں فرق آ گیا ہے۔ اس لئے وہ اس کو سمجھ نہ سکے صوفیاء کرام فرماتے ہیں۔ کہ انسان کے پاس بھی یہ تینوں جماعتیں موجود ہیں۔ روح انسانی۔ خالص مومن اور شیطان کھُلا ہوا کافر۔ لیکن نفس امّارہ منافق کہ دل سے مل کر اپنے کو اُس کا دوست ظاہر کرتا ہے۔ اُدھر شیطان سے ملتا ہے۔ تو اس کا دوست بنتا ہے لیکن جس دل پر اللہ کا کرم ہوجائے۔ اُس پر نفس امّارہ غالب نہیں آتا۔ بلکہ آخر کار خود ہی مجبور ہو کر تابع ہوجاتا ہے۔

**پہلا اعتراض** یُخٰدِعُوْنَ۔ مُخَادَعَت سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ ایک دوسرے سے دھوکے بازی کرنا۔ لہٰذا آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ یہ منافقین رب تعالیٰ کو اور مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ اور مسلمان ان کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اور کسی کو دھوکہ دینا حق تعالیٰ کی شان کے بھی خلاف ہے۔ اور مسلمانوں کے بھی **جواب**۔ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے۔ کہ کئی جگہ باب مُفَاعَلت شرکت سے خالی بھی ہوجاتا ہے۔ جیسے سَافَرْتُ میں نے سفر کیا۔ عَاقَبْتُ اللِّصَّ یعنی میں نے چور کو سزا دی۔ اس کے معنی یہ نہیں۔ کہ چور نے بھی مجھ کو سزا دی۔ یہاں بھی یہی معنی مراد ہے۔ **دوسرا جواب** یہ ہے۔ کہ یہاں شرکت ہی کیلئے ہے۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں۔ کہ یہ منافقین تو اپنا ایمان ظاہر کرکے مسلمانوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔ اور مسلمان بھی اُن کے اس ایمان کو معلوم کرکے اُن سے بے تعلق ہوجاتے ہیں۔ کہ نہ اُن سے جہاد کرتے ہیں۔ اور نہ اُن پر جزیہ لگاتے ہیں جس سے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا داؤ چل گیا لیکن مرنے کے بعد پتہ چلے گا۔ کہ ہم تو بڑے دھوکے میں رہے۔ نیز تفسیر روح البیان میں اس جگہ بیان فرمایا گیا۔ کہ جب منافقین جہنّم میں ایک زمانے تک رہ لیں گے۔ تو اچانک جہنّم کے دروازے کھُل جائیں گے جس سے وہ یہ سمجھیں گے۔ کہ گنہگار مسلمانوں کی طرح ہمارے بھی نکلنے کی باری آگئی۔ اور دروازوں کی طرف بھاگیں گے۔

لیکن جب وہاں پہنچیں گے۔ تو دروازے بند کر دیئے جائیں گے اور انہیں دھکیل کر اُن کی جگہ پہنچا دیا جائے گا جس کے متعلق قرآن پاک فرماتا ہے۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ یہ اُن کے فریب کی سزا ہو گی۔ اور جرم کی سزا دینا عیب نہیں۔

**دوسرا اعتراض**۔ اس جگہ فرمایا گیا۔ کہ یہ منافقین جانتے نہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ کہ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یعنی تم جان بوجھ کر حق چھپاتے ہو جس سے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ جانتے ہیں۔ اب ان دونوں آیتوں میں مطابقت کس طرح کی جائے **جواب** منافقین سب کچھ جانتے تو تھے۔ لیکن اُس پر عمل نہ کرتے تھے۔ اس لحاظ سے گویا جاہل تھے۔ اُن کے عمل نہ کرنے کی وجہ سے انہیں یہاں جاہل کہا گیا۔ جیسے کہ کفار کو اندھا۔ بہرا۔ گونگا کہا گیا ہے۔ بے عمل عالم مثل جاہل کے ہے۔ اور کنجوس مالدار مثل فقیر کے۔ لہٰذا انہیں جاہل کہنا عمل کے لحاظ سے ہے۔ اور انہیں عالم کہنا حقیقت علم کے لحاظ سے۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾

بیں دلوں اُن کے بیماری پس بڑھائی اُن کی اللہ نے بیماری اور لئے اُن کے عذاب ہے دردناک بوجہ اسکے تھے وہ جھوٹ بولتے۔

اُن کے دلوں میں بیماری ہے۔ تو اللہ نے اُن کی بیماری اور بڑھا دی اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔ بدلا اُن کے جھوٹ کا۔

**تعلق**۔ گذشتہ آیتوں میں منافقین کی بدعملی کا ذکر ہوا۔ اب اُس بدعملی کی وجہ بیان ہو رہی ہے یعنی وہ یہ دھوکے بازیاں وغیرہ اس لئے کرتے ہیں۔ کہ اُن کے دل میں نفاق کی بیماری ہے۔ اور وہ برابر بڑھ رہی ہے یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ پہلی آیت میں اُن کی بدعملی کا ذکر ہوا۔ اور اس آیت میں اُس کے نتیجہ کا یعنی چونکہ وہ اس قسم کی حرکتیں کر رہے ہیں۔ اس لئے بجائے شفا ہونے کے مرض بڑھ رہا ہے۔ جیسے کوئی طبیب کہے۔ کہ فلاں مریض بدپرہیزی کر رہا ہے جس کی وجہ سے اُس کا مرض ترقی پر ہے یا تو پہلی آیت سبب ہوئی اور یہ اُس کا نتیجہ یا اس کا برعکس نیز اس سے پہلے اُن کے اقوال اور اعمال کا ذکر ہوا۔ اور اب اُن کی دلی حالت کا تذکرہ یعنی منافقین کہتے یہ ہیں۔ اور کرتے یہ ہیں۔ اور اُن کے دل کی یہ حالت ہے کبھی تو دل کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے۔ اور کبھی ظاہر کا دل پر۔ چونکہ یہاں اُن کے قول و فعل کا اثر اُن کے دلوں پر پڑ رہا ہے۔ کہ مرض بڑھ رہا ہے۔ اس لئے قلبی حالت کو ان دونوں کے بعد بیان کیا۔ **تفسیر**۔ مَرَضٌ لغت میں بدن کی اس عارضی حالت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے طبعی کاموں میں خلل پڑ جائے۔ جیسے کہ بخار جسم انسانی کو طبعی کاموں سے روک دیتا ہے لیکن مجازاً اُن نفسانی عوارضات کو بھی مرض کہہ دیتے ہیں۔ کہ جو نفس کے کمالات کو ختم کر دیں۔ جیسے جہالت۔ بدعقیدگی حسد بغض۔ دنیا کی محبت جھوٹ اور ظلم وغیرہ۔ کہ ان کی وجہ سے نفس کے کمالات زائل ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی یہ عیوب کفر تک بھی پہنچا دیتے ہیں۔ جو کہ روحانی موت ہے۔ دل کی بیماریاں چند قسم کی ہیں۔ ایک وہ کہ جن کا تعلق دین سے ہے۔ جیسے کہ بدعقیدگی اور کفر۔ دوسرے وہ کہ جن کا تعلق اخلاق سے ہے۔ جیسے کہ حسد۔ کینہ وغیرہ۔ تیسرے وہ کہ جن کا تعلق افعال سے ہے۔ جیسے کہ بُرے ارادے۔ یہاں پہلی قسم کی بیماری مراد ہے۔ یعنی اُن کے دلوں میں بدعقیدگی اور کفر تو پہلے ہی سے موجود ہے۔ اور اب دن بدن اس میں زیادتی ہو رہی ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اس سے تینوں قسم کی بیماریاں مراد ہوں یعنی منافقین کے دلوں میں بدعقیدگی۔ بدخلقی۔ بدعملی۔ موجود ہے۔ اور اس میں زیادتی ہو رہی ہے فَزَادَهُمُ اللّٰهُ۔ زَادَ لازم بھی آتا ہے۔ اور متعدی بھی یعنی زیادہ ہوا۔ اور زیادہ کیا یہاں متعدی معنی میں استعمال ہوا۔ یعنی اللہ نے اُن کی بیماری بڑھا دی۔ اس کے بڑھانے کی چند صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ انہیں اسلام کو دیکھ کر غم ہوتا تھا۔ اور اللہ نے اُس کی اشاعت فرما کر اُن کے غم کو بڑھا دیا۔ یا اس طرح کہ اُن کے دل میں بدعقیدگی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی تھی۔ اللہ نے اُن کے دلوں پر مہر اس طرح لگا کر کہ اُن میں وعظ و نصیحت اثر نہ کرے۔ کفر کو بڑھا دیا۔ یا اس طرح کہ جس قدر شرعی احکام بڑھے۔ اُن کا انکار بھی بڑھا مثلاً جب تک دس احکام آئے۔ تو وہ دس کے منکر رہے۔ اب پانچ اور آ جانے پر وہ پندرہ کے منکر ہو گئے۔ یا اس طرح کہ پہلے فقط عبادات آئی تھیں

وہی اُن پر بھاری تھیں. جب سزائیں اور جہاد آ گئے. تو اِن پر ادر مصیبت لوٹ پڑی. اللہ کی شان ہے کہ شرعی احکام اور قرآنی آیتیں مسلمانوں کے ایمان کو قوی کریں. لیکن اُن سے کفار کا کفر بڑھے. جیسے کہ بارش کا پانی گندگی پر پڑ کر اُس کو زیادہ پھیلا دیتا ہے. مگر پاک چیزوں پر پڑ کر اُن کو اور بھی پاک صاف کر دیتا ہے. یہی بات یہاں پر ہے. یا اس طرح کہ جب وہ کھلے کافر تھے. تو اُن میں بہادری تھی مگر اسلام کے دبدبے اور شوکت کو دیکھ کر اُن میں بزدلی پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے وہ منافق بننے پر مجبور ہو گئے جس طرح کہ دنیا میں اُن کی بیماریاں بڑھتی جا رہی ہیں اسی طرح آخرت میں اُن کا عذاب اور مسلمانوں کا ثواب بڑھتا رہے گا. عَذَابٌ اَلِیْمٌ. اَلِیْمٌ. اَلَمٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں درد اور تکلیف. الیم کے معنی ہوئے. دردناک اور تکلیف دہ. کفار کے عذاب کو عظیم فرمایا گیا تھا. اور منافقوں کے عذاب کو اَلِیْم کہا گیا اس لئے کہ بمقابلہ کفار کے اِن کو عذاب کی زیادہ تکلیف ہو گی کیونکہ کافروں نے ایمان کی لذت بالکل نہ چکھی تھی اور نورِ ایمانی اُن کے ظاہری حواس تک بھی نہ پہنچا تھا. انہیں خبر ہی نہ تھی. کہ نماز میں کیا لطف ہے. اور ایمان میں کیا بہار. لیکن منافقین ایمان کے دروازہ تک پہنچ چکے تھے. اور اُس کی شیرینی اُن کے تالو اور زبان میں لگ چکی تھی. پھر اُس کے پھل نہ کھا سکیں گے. تو یقیناً اُن کو اپنی محرومی پر بہت صدمہ ہو گا. جیسے کہ ایک شخص نے عمدہ میووں کا مزہ چکھا ہی نہیں ہے. دوسرے نے چکھا تھا. مگر اب اس کو میسر نہیں. تو یقیناً نہ ملنے کی حسرت زیادہ انہیں کو ہو گی. جو چکھ کر محروم ہو گئے. (تفسیر عزیزی) نیز کھلے کافروں کو تو صرف دوزخ کا عذاب ہی ہو گا. اور منافقوں کو عذاب بھی اور طعنے بھی. اس لئے ان کو تکلیف زیادہ ہو گی. نیز چونکہ انہوں نے جھوٹ بھی بولا تھا. اس لئے اِن کو جہنم کے سب سے نیچے کے طبقے میں رکھا جائے گا. جہاں کہ اور طبقات سے دوزخیوں کی پیپ وغیرہ بہ کر آئے گی. اور وہ ہی ان کو پلائی جائے گی. تو کفر کی وجہ سے ان کو یہ عذاب ہوا اور فریب کی وجہ سے یہ درد پہنچا. یَکْذِبُوْنَ میں اس طرف اشارہ ہے. کہ اُن پر یہ مصیبتیں جھوٹ کی وجہ سے آئیں. یَکْذِبُوْنَ کذب سے بنا ہے. اس کے معنی ہیں جھوٹ. جھوٹ کئی قسم کا ہوتا ہے. (۱) قول میں جھوٹ وہ اس طرح کہ خلافِ واقع خبر دے. (۲) فعل میں جھوٹ. وہ اس طرح کہ عمل قول کے خلاف ہوں. یعنی کہے کچھ اور کرے کچھ. (۳) عقیدے میں جھوٹ. وہ اس طرح کہ غلط عقائد اختیار کرے. مثلاً خالق ایک ہے. اور کسی کا عقیدہ یہ ہو کہ خالق چند ہیں. تو یہ عقیدے کا جھوٹ ہوا. ہر جھوٹ بُرا ہے. لیکن عقیدے کا جھوٹ سخت بُرا. اور یہ منافق ہر طرح جھوٹے تھے. اس آیت سے معلوم ہوا. کہ جھوٹ بدترین گناہ اور فحش عیب ہے. بلکہ ہزار ہا گناہوں کی جڑ ہے. اگر کوئی شخص جھوٹ نہ بولنے کا عہد کرے تو انشاء اللہ بہت سے گناہوں سے بچ جائیگا. انبیاءِ کرام سارے گناہوں سے اور خصوصاً جھوٹ سے بالکل محفوظ و معصوم ہوتے ہیں. جو شخص انہیں جھوٹا مانے وہ بے دین ہے. حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق جو آیا ہے. کہ انہوں نے معاذ اللہ تین جھوٹ بولے. یہاں جھوٹ سے مراد تعریض ہے. یعنی دو معنی والا کلام بولنا. اور اُس سے خلافِ ظاہر معنی مراد لینا. اور یہ تعریض ضرورتاً جائز ہوتی ہے. جیسے کہ آپ کی بیوی حضرت سارہ کے متعلق ایک ظالم بادشاہ نے پوچھا. کہ یہ آپ کی کون ہیں. آپ نے خیال فرمایا. کہ اگر میں نے کہہ دیا. کہ میری بیوی ہیں. تو یہ ظالم مجھ سے جبراً چھین لے گا. اس لئے آپ نے کہہ دیا. کہ یہ میری بہن ہے. وہ نسبی بہن سمجھا اور آپ نے دینی بہن مراد لی. اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہجرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے ہیں. کسی کافر نے پوچھا. کہ اے ابوبکر تمہارے ساتھ یہ کون ہیں. آپ نے راز چھپانے کے لئے فرمایا. کہ مجھے راستہ بتانے والے ہیں. وہ یہ سمجھا. کہ اس سے دنیوی راستہ مراد ہے. اور آپ کی مراد تھی راہِ الٰہی. یہ تعریض ہے. اور ضرورتاً جائز. تتمہ جھوٹ بہرحال منع ہے. سوا چند موقعوں کے بتحت مجبوری کی حالت میں دو مسلمانوں میں صلح کرانے کے لئے. اپنی بیوی کو راضی کرنے کے لئے. جہاد کے موقعہ پر ضرورتاً (تفسیر روح البیان و شامی وغیرہ) جھوٹ سے جس طرح اُخروی عذاب آتا ہے. ایسے ہی دنیا میں بھی مصیبتیں نازل ہوتی ہیں. مثنوی شریف میں ہے

صبح کاذب کارواں ہا را زدہ است	که بوئے روز بیرون آمدہ است

صبح کاذب خلق را رہبر مباد کو دہد بس کارواں ہا را بباد

صبح کاذب بھی صد ہا قافلوں کو برباد کر چکی ہے۔ خدا کرے جھوٹا کسی کا رہبر نہ بنے **خلاصۂ تفسیر**۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ ان کی فطرت میں ہی تندرستی نہیں۔ اور ان کے دلوں پر جھوٹ کی بیماری سوار ہے۔ جوں جوں صحت بخش باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی گئیں۔ اُن کی مخالفت سے ان کا مرض بڑھتا گیا۔ اور جس طرح کہ جسمانی مرض کا انجام موت ہے۔ اسی طرح روحانی بیماریوں کا نتیجہ دردناک عذاب ہے۔ بارش ہر درخت کو بڑھاتی ہے۔ مگر جس درخت کا تخم خراب ہو اُس میں کانٹے۔ اور کڑوے پھل آتے ہیں۔ اور جس کا تخم اچھا ہو۔ اُس میں عمدہ پھل پھول لگتے ہیں اسی طرح قرآن کریم کی آیتیں رحمت کی بارش ہیں جس سے مومنوں کو شفا ہوتی ہے۔ اور جن کی اصل میں کجی ہے۔ اُن کی بیماری بڑھتی ہے۔ اس میں اُن کا اپنا قصور ہے۔ نہ کہ قرآن کریم کا۔ **تفسیر صوفیانہ** عام طور پر دل میں اچھے خیالات بھی آتے ہیں۔ اور بُرے بھی۔ اچھے خیالات رحمانی الہام ہوتے ہیں جس کے لئے ایک فرشتہ مقرر ہے۔ اور بُرے خیالات شیطانی وسوسے جن دلوں پر اللہ کا کرم ہے۔ اُن کو الہام زیادہ اور وسوسے کم ہوتے ہیں بلکہ بعض مقبولان خدا ایسے بھی ہیں۔ کہ جو ان وسوسوں سے بالکل محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اور جن کے دلوں میں بیماری ہے۔ انہیں الہام کم اور وسوسے زیادہ ہوتے ہیں اگر اس مرض کا علاج کسی قابل طبیب روحانی سے کرا لیا جائے۔ تو صحت ہو جاتی ہے۔ ورنہ یہ مرض بڑھتا بڑھتا اس حد تک پہنچ جاتا ہے۔ کہ دل میں اچھے خیالات کا آنا ہی بند ہو جاتا ہے۔ اور کبھی یہاں تک ترقی ہو جاتی ہے۔ کہ بُرے کاموں کو اچھا۔ اور اچھے کاموں کو بُرا سمجھنے لگتا ہے۔ اور بدکاروں کو عزیز رکھنے اور نیک کاروں سے نفرت کرنے لگ جاتا ہے یہی دل کی موت ہے۔ اسی طرح بعض اوقات دل سے غیبی آواز آتی ہے جو انسان کو برائی سے روکتی ہے۔ اور بُرے کام کرنے پر ملامت کرتی ہے۔ اللہ کے مقبول بندوں کی یہ آواز نہایت قوی ہوتی ہے۔ کہ وہ بُرے راستہ پر آتے ہی نہیں۔ اور گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے یہ آواز کمزور پڑ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ بند ہو جاتی ہے۔ پھر غلط آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ کہ گناہ کرنے پر خوشی کی آواز نکلتی ہے۔ یہ اس قلب کی موت ہے۔ اور اس آیت میں انہی بیماریوں کا ذکر ہو رہا ہے جس طرح سے کہ بعض دوائیں اور بعض جگہ کی آب و ہوا تندرستی بخشتی ہے۔ اسی طرح بعض اعمال اور کسی جگہ کی آب و ہوا روحانی تندرستی دیتی ہے۔ اولیاء اللہ کی زیارت۔ اُن کی قبور پر حاضری دینے کا اسی لئے حکم ہے۔ کہ وہاں کی آب و ہوا۔ ایمان کے لئے زیادہ مفید ہے جس طرح کہ بیمار سفر کر کے طبیبوں کے پاس جاتے ہیں۔ اسی طرح گناہوں کا بیمار اگر سفر کر کے روحانی اطباء کے پاس حاضری دے تو کیا حرج ہے۔ سفر عرس اور سفر زیارت قبور میں یہی حکمتیں ہیں۔ اس کی زیادہ تحقیق کے لئے شامی جلد اوّل بحث زیارت قبور اور **اشعۃ اللمعات** اور کتب تصوف اور ہماری کتاب جاء الحق وغیرہ کا مطالعہ کرو۔ اور جس طرح کہ بعض بیماریاں اڑ کر لگتی ہیں۔ اسی طرح روحانی بیماری بھی اڑ کر لگنے والی ہے۔ اسی لئے بد مذہبوں اور بے دینوں کی صحبت سے دُور رہنا سخت ضروری ہے **حکایت** ایک شخص کسی حکیم کے پاس جا کر کہنے لگا۔ کہ حکیم صاحب مجھے گناہوں کی دوا درکار ہے حکیم صاحب حیران ہو گئے۔ اُن کا کمپونڈر کوئی مرد خدا تھا۔ کہنے لگا کہ توبہ کے پتے۔ شکر کے پھول۔ عبادت کے بیج۔ قناعت کی جڑیں۔ ہموزن لے کر۔ مجاہدے کے ہاون دستے میں کوٹ لے۔ اپنے آنسوؤں میں ذکر کے صبر کی آگ پر پکا لے۔ اخلاص کی شکر سے میٹھا کر کے دل کی آہوں سے ٹھنڈا کر کے پی جا۔ انشاء اللہ شفا ہو گی۔ کہنے لگا۔ کہ اس کا پرہیز کیا۔ جواب دیا۔ کہ اپنے دل کو اغیار کے کوڑے سے صاف رکھ۔ تاکہ یار وہاں تجلی فرمائے۔ اور اس کی گذرگاہ اور دروازے کو عبادات کی جھنڈیوں سے آراستہ رکھ۔ گناہوں کے گرد و غبار سے صاف کر دے۔ تاکہ یہ راستہ یار کے آنے کے قابل بن جائے **نیز** اپنے نفس امارہ کے گلے میں کسی شیخ کی غلامی کا پٹہ ڈال۔ تاکہ وہ مارا نہ جائے۔ اللہ پاک ہمیں یہی علاج نصیب فرمائے۔ **اعتراض** اس جگہ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ کیوں بولا گیا مختصر عبارت یہ تھی۔ کہ قُلُوۡبُهُمۡ مَرِیۡضَۃٌ یعنی اُن کے دل بیمار ہیں **جواب**۔ اس میں اس جانب اشارہ ہے۔ کہ اُن کی یہ بیماری عارضی ہے۔ اصلی نہیں **نیز** یہ مرض ابھی راسخ نہیں ہوا۔ بلکہ قابل علاج ہے۔ اسی لئے ان کو ایمان کی طرف بلایا جا رہا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾

اور جب کہاجاوے لئے اُنکے نہ فساد کرو میں زمین کہتے ہیں اسکے سوانہیں ہم اصلاح کرنیوالے ہیں

اور جو اُن سے کہاجاوے۔ زمین میں فساد نہ کرو۔ تو کہتے ہیں۔ ہم توسنوارنے والے ہیں۔

**تعلق**۔ اس سے پہلے بتایا گیا تھا۔ کہ ان منافقوں کی دلی بیماری انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اب اس کی نشانی بتائی گئی۔ کہ وہ نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہر ایک کو غلط سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ طبیب بیماریوں کے ساتھ اُن کی علامات بھی بتاتے ہیں۔ اسی طرح اس مرض کی یہاں یہ پہچان بتائی گئی۔ تو گویا یہ آیت پہلی آیت کا نتیجہ ہے۔ اس کا عکس بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی چونکہ اُن کے حواس ایسے بگڑے کہ نیک کو بد اور بد کو نیک سمجھنے لگے۔ تو لامحالہ اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔ یہ بھی تعلق ہے۔ کہ اس سے پہلے منافقین کی بدعقیدگیوں اور بکواس اور بُرے اعمال کا ذکر تھا۔ اب اُن کی بدمعاملگی کا ذکر ہو رہا ہے۔ یعنی دل اُن کے بیمار۔ زبانیں اُن کی جھوٹی۔ عبادتیں اُن کی غلط۔ اور اُن کے معاملات بھی خراب ہیں۔ چونکہ عبادات معاملات سے پہلے ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن کا ذکر پہلے ہؤا۔ اور معاملات کا بعد میں تتمہ جن اعمال کا تعلق رب سے ہو۔ اُن کو عبادات کہتے ہیں جیسے نماز۔ روزہ۔ حج زکواۃ وغیرہ۔ اور جن کا تعلق بندوں سے ہو۔ انہیں معاملات کہتے ہیں جیسے تجارت۔ آپس کے لین دین و دیگر برتاوے۔ منافقین کے دونوں قسم کے اعمال خراب تھے۔ اُن میں سے آخری قسم کا ذکر یہاں ہو رہا ہے۔ **تفسیر** وَاِذَا قِيْلَ قِيْلَ قول سے بنا ہے جس کے چند معنی ہیں۔ ۱ بات۔ ۲ بولنا یا کہنا۔ ۳ دل کے خیالات ۴ رائے ۵ مذہب۔ یہاں یا تو کہنا مراد ہے یا رائے دینا۔ کہنے والا کون ہے۔ اس میں چند احتمال ہیں۔ رب تعالےٰ کہ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اُن سے یہ فرمایا۔ دوسرے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ تیسرے عام مومنین۔ چوتھے وہ مسلمان جن سے وہ فتنے کی باتیں کرتے تھے۔ لَا تُفْسِدُوْا فساد سے بنا ہے۔ جس کے معنے ہیں بگڑنا۔ یعنی کسی چیز کا اعتدال سے نکل جانا اور نفع کے قابل نہ رہنا۔ اس کا مقابل ہے صلاح جس کے معنی ہیں سنورنا اور نفع کے قابل ہونا۔ اس فساد و صلاح میں بہت گنجائش ہے۔ نفس کا فساد۔ دو شخصوں کا فساد۔ گھر کا فساد۔ شہر کا فساد۔ کسی خاص ملک کا فساد اور زمین کا فساد۔ فِي الْاَرْضِ نے یہ بتایا کہ یہاں آخری فساد مراد ہے۔ تو منافقین سے کہا جا رہا ہے۔ کہ اگر تم خود بگڑے ہوئے ہو۔ تو اوروں پر تو مہربانی کرو۔ اور اللہ کی زمین میں فساد نہ پھیلاؤ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ منافقین کی بیماری متعدی یعنی پھیلنے والی تھی۔ اب یہاں فساد سے کیا مراد ہے؟ اس میں چند قول ہیں۔ سیدنا عبداللہ ابن عباس حسن قتادہ، سُدّی رضی اللہ عنہم کا یہ قول ہے۔ کہ یہاں فساد سے مراد ہے علانیہ گناہ کرنا۔ کیونکہ علانیہ گناہ سے خدا کی رحمتیں بند ہو جاتی ہیں۔ عذاب نازل ہوتے ہیں۔ قتل و خون و غارت گری وغیرہ شروع ہو جاتی ہے۔ چونکہ وہ لوگ موقع پاکر علانیہ گناہ بھی کرتے تھے۔ اس سے اُن کو روکا گیا۔ دوسرا قول یہ ہے۔ کہ فساد سے مراد کفار سے ملنا اُن کی تواضع و خاطر اور خوشامد کرنا ہے۔ تو گویا یہاں یہ کہا جا رہا ہے۔ کہ تم ایک طرف کے ہو کے رہو۔ تمہاری یہ منافقانہ حرکتیں فساد پھیلا دیں گی۔ تیسرا قول یہ ہے۔ کہ فساد سے مراد ہے مسلمانوں کے راز کفار تک پہنچانا۔ چونکہ منافقین مسلمانوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ اس لئے اُن کو کچھ مسلمانوں کی جنگی تدبیریں معلوم ہو جاتی تھیں۔ اور وہ کفار کو ان کی خبر کر دیتے تھے۔ اس حرکت سے انہیں روکا گیا۔ چوتھا قول یہ ہے۔ کہ یہ منافقین نومسلموں سے خفیۃً مل کر اُن کے دلوں میں اسلام کے خلاف تشکوک و شبہات ڈال دیتے تھے۔ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے۔ کہ جب پرانے مسلمان اسلام پر مطمئن نہیں تو ضرور اسلام میں کچھ خرابی ہوگی یہاں فساد سے اُن کی یہی حرکت مراد ہے۔ اور اسی سے اُن کو روکا جا رہا ہے۔ قَالُوْٓا ظاہر یہ ہے۔ کہ یہ انہیں منافقین کا قول ہے۔ جن کو فساد سے روکا گیا۔ اس قول کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ ہم فساد نہیں پھیلاتے بلکہ اصلاح کرتے ہیں۔ یعنی اے مسلمانو! جس چیز کو تم فساد کہتے ہو اُس کو ہم اصلاح سمجھتے ہیں۔ کیونکہ تمہارا اسلام فساد ہے۔ اور اسی کو ہم مٹانا چاہتے ہیں۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے۔ کہ مُصْلِحُوْنَ سے مراد ہو

صلح کرانا۔ یعنی منافقین کہتے تھے۔ کہ ہم کافروں سے اس لئے ملتے اور ان کی خاطر و مدارات کرتے ہیں۔ تاکہ تم میں وان میں صلح قائم رہے۔ اور مدینہ پاک کی زمین خون سے رنگین نہ ہو۔ اور اے مسلمانو تمہاری کوشش یہ ہے کہ یہاں کشت وخون ہو جائے۔ لہٰذا ہم ہی مصلح ہیں۔ نہ کہ تم اسی لئے انہوں نے اِنَّمَا بولا جو کہ حصر کیلئے آتا ہے۔ قرآن کریم نے دوسرے مقام پر ان منافقین کا قول اس طرح نقل فرمایا۔ قَالُوْا اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا اِحْسَانًا وَّتَوْفِیْقًا **خلاصۂ تفسیر**۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ ان منافقین پر دلی بیماری اس قدر غالب آگئی۔ کہ انہیں برے بھلے کی تمیز نہ رہی۔ کیونکہ جب ان سے کہا جاتا ہے۔ کہ چغل خوری۔ غمازی۔ اور گناہوں سے ملک میں فساد برپا نہ کرو۔ تو وہ جواب دیتے ہیں۔ کہ ہم تو بھلائی کرتے ہیں۔ وہ ان گناہوں کو بھلائی سمجھ بیٹھے جیسے کہ بعض بیمار میٹھی چیز کو کڑوی اور کڑوی کو میٹھی محسوس کرتے ہیں یہی ان کا حال ہے۔ جب انسان اپنے عیب کو ہنر سمجھنے لگے۔ تو اس کی ہدایت بہت مشکل ہے۔ کیونکہ وہ جاہل مرکب ہے۔ **لوٹ**۔ یہ سمجھنا۔ کہ اس قسم کے لوگ پہلے ہی تھے۔ اب نہیں ہیں سخت غلطی ہے۔ اب بھی بکثرت موجود ہیں۔ بت پرستی۔ گنگا اشنان کرنا وغیرہ سب اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔ مبارک وہ شخص ہے جس کو دنیا ہی میں حقیقت حال کی خبر ہو جائے۔ اور برے بھلے کی تمیز۔ ورنہ مرنے کے بعد تو ہو ہی جائے گی۔ **اس آیت کے فائدے**۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ ایک یہ کہ کفر و حقیقت فساد ہے کیونکہ یہ حق تعالےٰ کی بغاوت ہے۔ اور بادشاہ کی بغاوت سے بڑھ کر کوئی فساد نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ اسلام اور شریعت مطہرہ کی اطاعت زمین کی اصلاح ہے۔ کیونکہ یہ وفاداری ہے۔ اگر کوئی شخص کفر کر کے کشت وخون بند کر دے۔ تو وہ بھی مفسد ہے۔ دوسرا شخص اسلام پھیلانے اور ہدایت دینے کے لئے جہاد و قتال بھی کرے تو وہ مصلح ہے۔ اس کی مثال یہ ہے۔ کہ کسی مریض کا کوئی عضو گل گیا۔ اگر اسے نہ کاٹا جائے۔ تو دوسرے اعضا کے گلنے کا بھی اندیشہ ہے طبیب حاذق اس کو کاٹنا چاہے۔ اور وہ بیوقوف اس سے بچے اور کہے کہ عضو کا کاٹنا جسم کو فاسد کرنا ہے میں تو اصلاح چاہتا ہوں۔ ہر عضو کو اپنے حال پر ہی رہنے دوں گا۔ اگرچہ بظاہر طبیب جسم کو بگاڑ رہا ہے۔ اور خون بہا رہا ہے۔ اور وہ بیمار اس فساد سے بچنا چاہتا ہے لیکن درحقیقت طبیب مصلح ہے۔ اور مریض مفسد اسی لئے کہتے ہیں۔ کہ بیمار کی رائے بھی بیمار ہوتی ہے۔ منافقین جس قسم کی اصلاح چاہتے تھے۔ وہ دونوں جہان میں خرابی کا باعث تھی۔ ضرورت کے وقت جہاد نہ کرنا فساد ہے۔ اور کرنا اصلاح۔ تیسرے یہ کہ کفار سے میل جول رکھنا۔ اور ان کی دینی معاملات میں خاطر تواضع کرنا۔ ان کے ساتھ چاپلوسی اور خوشامدیں کرنا۔ ان کی خوشی کے لئے صلح کل بن جانا۔ اور حق گوئی سے باز رہنا۔ منافقوں کی شان ہے۔ اور حرام۔ جیسا کہ اس زمانہ میں بہت لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کر لیا ہے سمجھ لو۔ کہ مسلمانوں کی ترقی محض تعداد بڑھانے سے نہ ہوگی۔ بلکہ حق کے ذریعہ ہوگی۔ آپ تولہ بھر عطر کو بڑھانے کے لئے ایک مٹکا پیشاب میں ملا دیں۔ تو اس سے عطر بڑھا نہیں۔ بلکہ فنا ہو گیا۔ وہ تولہ بھی تھا تو عطر تھا۔ اور اب مٹکا بھر ہو گیا۔ مگر عطر نہ رہا۔ اتفاق بے شک اچھی چیز ہے۔ مگر کس سے؟ مسلمانوں سے۔ اور تنظیم بڑی ضروری چیز ہے۔ مگر کس کی؟ مسلمانوں کی۔ غلط تنظیم کو مٹانا اسلام کا اولین فرض ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جلوہ گری فرما کر غلط تنظیم ہی کو مٹایا۔ اور سید الشہدا شہید کربلا امام حسین رضی اللہ عنہ نے یزیدی تنظیم کی دھجیاں اڑا دیں۔ اپنی قلت اور مخالفین کی کثرت کی بالکل پرواہ نہ کی۔ اس وقت تنظیم کی رٹ لگانے والے اور اتفاق اتفاق کا گیت گانے والے اسلامی تنظیم سے منہ موڑ کر غلط سیاسی تنظیم کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اور دیوبندی۔ وہابی۔ قادیانی بلکہ ہنود اور عیسائی وغیرہ سب مل کر ایک ہو جائیں۔ نہ ایسا ہو سکا ہے۔ اور نہ ہو سکے گا۔ اور روشنی اور تاریکی کفر و ایمان میں کبھی اتفاق ہوا ہی نہیں۔ اگر یہ لوگ اس خود ساختہ تنظیم کی بجائے مسلم قوم کی صحیح معنیٰ میں تنظیم کرتے تو یقیناً بہت کامیاب ہوتے۔ اور چھوٹی چھوٹی جماعتیں دیوبندی۔ قادیانی وغیرہ کبھی کی فنا ہو کر اسلام میں داخل ہو چکی ہوتیں۔ ان تمام جماعتوں کا پھیلنا اس بیہودہ تنظیم کے شور کا نتیجہ ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے۔ کہ مسلمان ہر ایک سے لڑتے پھریں۔ بلکہ یہ ہے۔ کہ ان سب سے علیحدہ رہیں۔ اور ان میں سے کسی کو دوست نہ بنائیں قرآن کریم فرماتا ہے۔ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مسلمان کفار کو دوست نہ بنائیں۔ حق تعالےٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

**تفسیر صوفیانہ** جس طرح سے کہ عمدہ زمین میں جس قسم کا بیج ڈالا جائے گا۔ اسی قسم کا درخت اُگے گا۔ جو شخص بجائے باردار درختوں کے خاردار (کانٹے والے) درخت بوئے وہ اُس زمین کو بگاڑتا ہے۔ اور اپنے کو اس کے فوائد سے محروم کرتا ہے۔ اسی طرح انسانی دل میں ہر قسم کی استعداد ہے۔ اگر اُس میں ایمان کا بیج بویا گیا۔ تو اُس سے عمدہ پھل حاصل ہوں گے۔ اور کفر کے بیج سے کانٹے ہاتھ لگیں گے۔ یہاں یہ کہا جا رہا ہے۔ کہ اے منافقو! اپنے اس قلب کی کھیتی میں کفر و نفاق کا بیج ڈال کر اُس کو فاسد نہ کرو۔ بلکہ ایمان بو کر اور عبادات کا پانی دے کر۔ نیک صحبتوں کی ہوا لگا کر پھلدار درخت پیدا کرو۔ لیکن وہ اپنی بیوقوفی سے کانٹے بو کر پھل کے امیدوار ہیں۔ ہر شخص کو چاہیئے۔ کہ اپنے اس قلب کی کھیتی میں اچھا بیج بوئے۔ اور اس کو بُری صحبت کی تباہ کن آندھیوں سے محفوظ رکھے۔ تاکہ اُس سے پھل حاصل کرے۔ **اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ منافقین اپنی بے ایمانیاں ظاہر کرتے تھے۔ اور مسلمانوں کے سمجھانے پر ایسے بیہودہ جواب بھی دیتے تھے۔ تو اس صورت میں وہ منافق کہاں رہے۔ بلکہ کھلے کافر ہو گئے۔ **جواب**:۔ یہ لوگ خفیہ طور پر ایسی بدکاریاں کرتے تھے۔ اور جب کبھی کسی مسلمان کو پتہ لگ جاتا تھا۔ اور وہ اُن کو سمجھاتا تھا۔ تو وہ خاموش ہو جاتے تھے۔ مگر اپنے دل میں یہ سوچتے تھے۔ کہ ہماری یہ روش ٹھیک ہے۔ حق تعالٰے نے اسی آیت میں اُن کے دلی راز کو ظاہر فرمایا۔

| اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ |
| --- |
| خبردار تحقیق وہ ہی فسادی ہیں اور لیکن نہیں شعور رکھتے |
| سنتا ہے وہ ہی فسادی ہیں۔ مگر اُنہیں شعور نہیں۔ |

**تعلق**۔ اس سے پہلے منافقین کی بکواس کا ذکر ہوا۔ اب اُس کی تردید ہو رہی ہے۔ مگر جس شد و مد سے انہوں نے اپنی تعریف کی تھی۔ اُس سے بڑھ کر ان کی برائی بیان ہوئی۔ **تفسیر**۔ اَلَآ حرف تنبیہ ہے۔ کبھی تو یہ لفظ غافل کو آگاہ کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ اور کبھی مضمون کی اہمیت بتانے کے لئے جس کا ترجمہ ہے۔ خبردار۔ اگر کلام کی توجہ منافقین کی طرف ہے۔ تب تو یہ غافلوں کو بیدار کرنے کیلئے ہے۔ اور اگر مسلمانوں سے خطاب ہے۔ تو چونکہ وہ تو پہلے ہی سے خبردار ہیں۔ اس لئے محض مضمون کی اہمیت کے لئے ہے۔ اِنَّهُمْ۔ اِنَّ اُس جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں کہ اُس کلام کا کوئی منکر ہو یا اُس کے انکار کا احتمال ہو۔ چونکہ اس مضمون کے منافقین و کفار منکر تھے۔ اور ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے انکار کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ بظاہر معلوم ہوتا تھا۔ کہ منافقین امن پسند اور صلح کل ہیں۔ اور مسلمان جنگجو اور شورش پسند۔ اس لئے اس جگہ اِنَّ لایا گیا۔ اور فرمایا گیا۔ کہ یقیناً یہ صلح پسندی ہی عین فساد ہے۔ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ دوبارہ هُمْ لانے سے حصر کے معنی پیدا ہو گئے یعنی منافقین ہی مفسد ہیں نہ کہ مسلمان۔ منافقین نے اپنے کلام میں اِنَّمَا بول کر بتایا تھا۔ کہ اصلاح کرنا ہمارا ہی کام ہے۔ نہ کہ مسلمانوں کا۔ حق تعالٰے نے هُمْ فرما کر بتا دیا۔ کہ فساد پھیلانا منافقوں کا ہی کام ہے۔ نہ کہ مسلمانوں کا۔ اَلْمُفْسِدُوْنَ میں بہت گنجائش ہے۔ کیونکہ اس کے معنی ہیں بگاڑنے والے۔ تو یہ منافقین اپنے دل۔ زبان۔ خیال اور سارے اعضاء کو کفر سے بگاڑنے والے ہیں۔ اور لوگوں کو بھی ایمان سے روک کر بگاڑتے ہیں۔ کافروں کو کفر میں مضبوط کر کے بگاڑتے ہیں۔ زمین کو اللہ کا ذکر روک کر بگاڑتے ہیں۔ اس لئے ہر طرح مفسد ہی ہوئے۔ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ شعور حواس سے جاننے کو کہتے ہیں۔ تو اس میں اس جانب اشارہ ہو رہا ہے۔ کہ منافقوں کا مفسد ہونا ایسا ظاہر ہے۔ کہ گویا آنکھوں سے نظر آ رہا ہے۔ مگر ان کی آنکھیں بھی پھوٹی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے ایسی کھلی ہوئی چیز کبھی محسوس نہیں کر سکتے۔ **تفسیر** یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ دیکھو یہی لوگ اوّل درجہ کے مفسد ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اوّل درجہ کے بے شعور بھی ہیں۔ کہ ان کو فساد و اصلاح کی تمیز نہ رہی۔ دل کے اندھے ہونے سے ظاہری اعضاء بھی بے کار ہو جاتے ہیں۔ **تفسیر صوفیانہ** انسان کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور دین سے بھی

لیکن دنیا اور دین آپس میں ضد ہیں۔ کہ دنیا کا سنبھالنا دین کو بگاڑتا ہے۔ اور دین کی اصلاح دنیا کو فاسد کرتی ہے۔ حقیقت پر نظر رکھنے والے دین کی زیادہ فکر رکھتے ہیں۔ اور بہت دفعہ دین کے مقابلے میں دنیا کو بگاڑ لیتے ہیں۔ لیکن ظاہر بین لوگ دنیا کو دین پر مقدم سمجھتے ہیں۔ کہ دنیا کے لئے دین کو برباد کر ڈالتے ہیں۔ منافقین ان ہی لوگوں میں سے تھے۔ کہ جن کی نگاہ میں فقط دنیا کا حاصل کر لینا انتہائی کمال تھا۔ اس لئے وہ اپنے اس کام کو اصلاح کہتے تھے۔ اور رب تعالیٰ نے اُس کو فساد قرار دیا۔ کیونکہ یہ اپنی دنیا سنبھال کر دین بگاڑ رہے تھے۔ باقی کو چھوڑ فانی چیز اختیار کرنا یقیناً فساد ہی ہے۔ **تتمہ** خیال رہے کہ صوفیاء کرام کے نزدیک دنیا وہ ہے جو حق سے غافل کر دے۔ خوراک و پوشاک۔ زن و فرزند اور دیگر جائز کاروبار اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے لئے ہوں۔ تو وہ سب عین دین ہیں ؎

چیست دنیا از خدا غافل بودن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

**پہلا فائدہ**۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو کوئی اللہ والوں کا مقابلہ کرتا ہے۔ وہ حق تعالیٰ کا مقابل قرار پاتا ہے۔ اور مقبول بندوں پر اعتراض کرنا در پردہ حق تعالےٰ پر اعتراض ہے۔ کیونکہ منافقین نے مسلمانوں پر اعتراض کیا تھا۔ نہ کہ رب پر مگر جواب رب نے دیا جس سے معلوم ہوا۔ کہ حق تعالےٰ نے اس اعتراض کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ جیسے کہ بارہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراضات ہوئے۔ اور رب تعالےٰ نے اُن کے جواب دیئے۔ **دوسرا فائدہ** اس سے معلوم ہوا۔ کہ جو کوئی اللہ کا ہو جاتا ہے۔ اللہ اُس کا ہو جاتا ہے یعنی جو دنیا میں اللہ کا وکیل بن جائے۔ کہ اُس کے احکام اپنی کوشش سے پھیلائے۔ تو رب تعالےٰ بھی اس کا وکیل ہو جاتا ہے۔ کہ جو اس پر مصیبت پڑے۔ اُسے خود دفع فرما دے اسی لئے فرمایا گیا۔ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا حق یہ ہے۔ کہ جو شخص اطاعت رب کی فکر میں رہتا ہے۔ رب تعالےٰ اُس کو دنیوی فکروں سے بچا لیتا ہے۔ **اعتراض** اس آیت کے حصر سے معلوم ہوا کہ صرف منافقین ہی مفسد ہیں۔ تو کیا دوسرے کفار اور بے دین مفسد نہیں۔

**جواب**:۔ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حصر مسلمانوں کے مقابلے میں ہے یعنی مسلمان مفسد نہیں۔ بلکہ وہ ہی مفسد ہیں۔ لہٰذا یہ حصر اضافی ہوا۔ نہ کہ حصر مطلق۔ دوسرے یہ کہ جس فساد کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ وہ صرف منافقین ہی پھیلاتے ہیں۔ اس قسم کا فساد اور کوئی نہیں پھیلاتا۔ تو یہ حصر خاص اس فساد کے لحاظ سے ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا

اور جب کہا جاوے اُن کیلئے ایمان لاؤ جس طرح ایمان لائے لوگ کہتے ہیں کیا ایمان لاویں جسطرح ایمان لائے بیوقوف لوگ خبردار

اور جب اُن سے کہا جاوے ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں۔ تو کہیں کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں۔ سنتا ہے۔

إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾

تحقیق وہ ہی بیوقوف ہیں۔ اور لیکن نہیں جانتے۔

وہ ہی احمق ہیں۔ مگر جانتے نہیں۔

**تعلق**:۔ اس آیت کا گذشتہ آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ اس سے پہلے منافقین کی دو قسم کی برائیاں بیان ہو گئیں۔ اب تیسری قسم کی برائی بیان ہو رہی ہے۔ دوسرے اس طرح کہ پہلی آیت میں بتایا گیا تھا۔ کہ مسلمان منافقین کو فساد سے منع کرتے ہیں۔ اور وہ نہیں مانتے۔ اب بتایا جا رہا ہے۔ کہ مسلمان اُن کو حقیقی ایمان کی طرف بلاتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں مانتے۔ چونکہ مکمل تبلیغ یہی ہے۔ کہ گمراہ کو برائی سے روکا جائے۔ اور بھلائی کی طرف بلایا جائے۔ تو گویا کہ مسلمانوں کی تبلیغ کا ایک حصہ یعنی برائی سے روکنا پہلے ذکر ہوا۔ اور دوسرا حصہ یعنی حقیقی ایمان کی دعوت دینا اب مذکور ہوا۔ اس میں مسلمانوں کو تبلیغ کا طریقہ بھی سکھایا جا رہا ہے۔ اور یہ بھی بتلایا جا رہا ہے۔ کہ برائی سے

بچانا بھلائی کرانے پر مقدم ہے چونکہ فساد سے باز رہنا حقیقی ایمان کی شرط ہے. اس لئے پہلے اسے بیان کیا گیا. اور بعد میں ایمان کو.
**تفسیر** قِیْلَ میں یہاں بھی وہی احتمالات ہیں جو پہلے بیان ہوئے. کہ یا تو یہ قول رب کا ہے. یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یا مخلص مسلمانوں کا. اٰمِنُوْا میں ایمان کا حکم ہے. حالانکہ وہ تو پہلے ہی سے بظاہر مومن تھے جس سے معلوم ہوا کہ محض زبانی ایمان بالکل معتبر نہیں. یہاں ایمان کا تو حکم ہے. لیکن اس کا ذکر نہیں. کہ کس پر ایمان لاؤ. کیونکہ آئندہ عبارت اس کو ظاہر کر رہی ہے. کہ جیسے سب لوگ ایمان لائے اُس پر تم بھی لاؤ. اَلنَّاسُ. اَلنَّاسُ سے مراد یا تو جنس انسان ہیں. تو آیت کے معنی یہ ہوئے. کہ تم آدمیوں کی طرح ایمان لاؤ جس سے معلوم ہوا. کہ جو صحیح مومن نہ ہو. وہ حقیقت میں آدمی ہی نہیں. بلکہ جانور سے بھی بدتر ہے. کہ وہ تو اپنے مالک کو پہچانے اور یہ نہ پہچانے یا اس سے خاص لوگ مراد ہیں. اُن خاص میں چند احتمال ہیں. یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے سارے جان نثار صحابہ یا اِن منافقین کے دوسرے اہل وطن مخلصین یا اُن کے اہل قرابت مومنین. جیسے عبداللہ ابن سلام رضی اللہ عنہم تفسیر عزیزی نے سیدنا عبداللہ ابن عباس سے روایت کیا. کہ یہاں اَلنَّاسُ سے مراد ابوبکر، عمر، عثمان و علی ہیں. رضی اللہ عنہم اجمعین. چونکہ اُس زمانہ میں یہ حضرات خلوص ایمان میں بہت مشہور ہو چکے تھے اس لئے اُن کا ایمان اور دل کے ایمان کے لئے ایک معیار بن چکا تھا. کہ جس کا ایمان اِن حضرات کی طرح ہو وہ تو مومن ہے ورنہ نہیں. گویا یہ کہا جا رہا ہے. کہ اے منافقو! تم ظاہری ایمان تو لے آئے. مگر یہ بیکار ہے. اگر اپنی بھلائی چاہتے ہو. تو صدیق و فاروق والا ایمان لاؤ. بازار میں اُس چیز کی قدر و منزلت ہوتی ہے جس پر کارخانے کی مہر ہو. ایسے ہی بازار محبت میں اُسی ایمان کی قیمت ہے جس پر مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر ہو. اور وہ صدیقی اور فاروقی ایمان ہے. اَلسُّفَهَاءُ سَفَهٌ سے بنا ہے. اس کے لغوی معنی ہیں. ہلکا پن. اہل عرب بولتے ہیں. سَفَهَتْهُ الرِّيحُ یعنی اُس کو ہوا اڑا لے گئی. اصطلاح میں اس کے معنی ہیں. بیوقوفی اور حماقت کیونکہ اس میں بھی عقل کا ہلکا پن ہوتا ہے اس کا مقابل حلم اور دانائی جس کے معنی ہیں بُردباری اور دُور اندیشی. منافقین نے مخلص مسلمانوں کو چند وجوہ سے بیوقوف کہا. ایک یہ کہ اُس وقت اکثر مسلمان فقراء و مساکین تھے. اور منافقین مالدار. اُن کی حقارت بیان کرتے ہوئے. اُن کے لئے یہ لفظ بولا. دوسرے اس لئے کہ منافقین اسلام کو باطل دین اور کفر کو سچا دین سمجھتے تھے. اور جو باطل دین اختیار کرے وہ بیوقوف ہوتا ہے. اس لئے اُن مسلمانوں کو اس لفظ سے یاد کیا. تیسرے اس لئے کہ مسلمانوں نے دین کے مقابلہ میں دنیا پر لات مار دی تھی. منافقین سمجھے کہ دنیوی نفع نقد ہیں. اور دینی نفع اُدھار اور اُدھار بھی ایسے کہ موت یا قیامت سے پہلے وصول نہ ہو سکیں. تو نقد کو چھوڑ کر اُدھار لینے والا اُن کے نزدیک بیوقوف تھا. چوتھے اس لئے کہ منافقین کے خیال میں دنیوی راحتیں یقینی تھیں. اور دینی فائدے (جنت اور وہاں کی نعمتیں وغیرہ محض خیالی اور وہمی کہ اولاً تو یہی نہیں معلوم کہ اُن کی کچھ حقیقت بھی ہے. یا نہیں اور اگر کچھ ہے. تو ہمیں ملیں یا نہ ملیں. اور اگر ملیں تو نہ معلوم کب اور کس طرح تو محض وہمی اور خیالی چیزوں کی امید پر اِن یقینی نفعوں کو چھوڑنا بیوقوفی ہے. پانچویں اس لئے کہ کفار مدینہ سے ہمیشہ تعلقات رہے ہیں. اور رہیں گے. اسلام ایک پردیسی مذہب ہے. اور مسلمان مسافر لوگ. نامعلوم کہ یہ دین باقی رہے یا نہ رہے. اِن پردیسی لوگوں اور عارضی دین کی محبت میں اپنے اصلی اور حقیقی دوستوں سے بگاڑ لینا بیوقوفی ہے. ہم نے ایسی عقلمندی کی ہے. کہ اس پر شیطان بھی قربان ہو جائے. وہ یہ کہ دونوں کو راضی رکھا اگر مسلمان غالب رہے تو ہم اِن سے نفع حاصل کریں گے. اور اگر کفار غالب آ گئے. تو ہماری پانچوں گھی میں ہیں. دو طرفہ رہنا نہایت عقلمندی ہے. رب تعالےٰ نے اُن کی اس جھوٹے خیال کی نہایت نفیس تردید فرمائی. کہ ارشاد فرمایا. اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ اَلَآ. اِنَّ اور هُمْ کے فوائد ہم پہلے بیان کر چکے ہیں. حق تعالےٰ نے اِن منافقین کو چند وجہوں سے بیوقوف فرمایا. اولاً اس لئے کہ انہوں نے مٹنے والے نفع کی خاطر باقی رہنے والی نعمتوں کو چھوڑ دیا. اور جو باقی کے مقابل فانی اختیار کرے. وہ نہایت بیوقوف ہے. دوسرے اس لئے کہ انہوں نے قوی دلائل کے مقابلہ میں اپنے فاسد خیالات پر اعتماد کیا. اور ایسا شخص بڑا احمق ہے. تیسرے اس لئے کہ یہ دو

گھر کے مہمان بنے اور دو گھر کا مہمان ہمیشہ بھوکا رہتا ہے۔ یعنی اُن کی ان حرکتوں سے نہ تو مسلمانوں میں اُن کا اعتبار رہے گا۔ اور نہ ہی کفار میں جو تھے۔ اس لئے کہ ان کا یہ مکر اُس وقت چل سکتا تھا جب مسلمان ان کی حقیقت سے بے خبر رہتے۔ حالانکہ رب نے ان کی قلعی کھول دی۔ اور مسلمانوں کو ان کے دلی ارادوں سے خبردار کر دیا۔ پانچویں اس لئے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی۔ جو کہ درحقیقت رب کی مخالفت ہے۔ اور رب کی مخالفت کر کے کوئی بھی کبھی عزت نہیں پا سکتا۔ ان کی مثال تو بالکل ایسی ہے۔ کہ کوئی شخص شفا حاصل کرنے کے لئے سانپ سے کٹوائے لَا یَعْلَمُوْنَ پہلی آیت میں لَا یَشْعُرُوْنَ فرما کر احساس کی نفی فرمائی گئی تھی۔ اور یہاں لَا یَعْلَمُوْنَ فرما کر علم اور سمجھ کی نفی فرمائی گئی۔ اس میں چند حکمتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہاں فساد کا ذکر تھا۔ جو حواس سے محسوس ہوتا ہے۔ اور یہاں بیوقوفی کا ذکر ہوا۔ جو عقل سے معلوم ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ منافقین نے مسلمانوں کو بیوقوف کہا۔ تو رب تعالےٰ نے اُن کو جاہل فرمایا تیسرے یہ کہ رب تعالےٰ نے انہیں یہاں بیوقوف فرمایا۔ اور پھر فرمایا کہ اُنھیں اپنی بیوقوفی کی بھی خبر نہیں کیونکہ علم تو عقل سے حاصل ہوتا ہے جب یہ عقل ہی سے محروم ہیں۔ تو علم کیسے پا سکتے ہیں۔ روح البیان شریف نے اس جگہ بیان فرمایا کہ جب آدم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ تو اُن کی خدمت میں جبریل امین تین تحفے لے کر حاضر ہوئے۔ علم۔ حیا اور عقل اور عرض کیا۔ کہ آپ ان میں سے ایک کو اختیار فرمالیں۔ حضرت آدم علیہ السلام نے عقل اختیار فرمائی۔ جبریل امین نے علم اور حیا سے کہا کہ تم واپس جاؤ۔ اُن دونوں نے عرض کیا۔ کہ ہم عالم ارواح میں بھی عقل کے ساتھ ہی رہے۔ اور اب بھی ساتھ ہی رہیں گے چنانچہ عقل دماغ میں اور علم دل میں اور حیا آنکھوں میں قائم ہو گئے۔ مثنوی شریف میں فرمایا ؎

جملہ حیواں را پئے انساں بکش — جملہ انساں را بکش از بہر ہش

لطفِ او عاقل کند مرنیل را — قہرِ او ابلہ کند قابیل را

**خلاصہ تفسیر:۔** اس آیت کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ جب کوئی خیرخواہ اُن سے کہتا ہے۔ کہ تم اللہ والوں کی طرح حقیقی ایمان لے آؤ۔ جس سے فتنہ فساد بند ہو جائے۔ اور دنیا سے نفرت اور آخرت سے الفت حاصل ہو۔ اور تمہارا شمار بھی اللہ کے اُن پیارے لوگوں میں ہو جائے جو حقیقتاً انسان ہیں۔ تو منافقین جواب دیتے ہیں۔ کہ کیا ہم بھی اُن بیوقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں جنہوں نے خیالی جنت کیلئے دنیوی راحتوں کو ٹھکرا دیا۔ بھائی دنیا دین سے مقدم ہے۔ آخرت کس نے دیکھی ہے اور وہاں کی نعمتیں کیا خبر کیسی ہیں۔ اس جگہ آرام کر لینے دو۔ اُس ادھار کی امید پر یہ نقد کون چھوڑیں۔ اور کیا ہم اُن کی طرح ہو جائیں۔ کہ جو دنیا کے عیش و آرام کو چھوڑ کر دن کو روزے اور رات کو عبادت الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ اُنہیں دنیا سازی آتی ہی نہیں بھائی یہ مسلمان ناعاقبت اندیش ہیں۔ اندھا دھند ایک طرف چل پڑے۔ ہم عقلمند اور نہایت پولیٹیکل آدمی ہیں۔ دنیا سازی کوئی ہم سے سیکھے۔ ہم نے وہ تدبیر کی ہے۔ اور ایسی چال چلی ہے۔ کہ جس سے ہمارا کبھی نقصان ہو سکتا ہی نہیں۔ اگر مسلمانوں کا دور دورہ رہا۔ تو ہم ان کے یار بنے رہیں گے۔ اور درپردہ کفار سے بھی ساز باز رکھیں گے تاکہ اگر اُن کا غلبہ ہو جائے۔ تو بھی ہمارا مدعا ہاتھ سے نہ جائے۔ چند غریبوں کی وجہ سے سب بڑے بڑے آدمیوں کو ناراض کر لینا عقلمندوں کا کام نہیں۔ حق تعالےٰ نے جواب دیا۔ کہ یہ لوگ بڑے ہی احمق اور بیوقوف ہیں کیونکہ ان کی یہ دورنگی چال ہر طرح خطرناک ہے کبھی ایسا وقت آجائے گا۔ کہ دنیا میں انہیں کوئی بھی نہ پوچھے گا۔ اور قیامت تک ان پر لعن طعن ہوتی رہے گی۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک** یہ کہ دینی باتوں میں اللہ کے مقبول بندوں کی پیروی کرنی ضروری ہے۔ کیونکہ یہاں حکم دیا گیا ہے۔ کہ مقبولوں کی طرح ایمان لاؤ۔ **دوسرے** یہ کہ اس سے معلوم ہوا۔ کہ مذہب اہل سنت والجماعت حق ہے۔ اس لئے کہ اس میں سنت رسول اللہ اور صالحین کا اتباع ہے۔ **تیسرے** یہ کہ وہابی۔ دیوبندی وغیرہ۔ تمام باطل فرقے گمراہ ہیں۔ کیونکہ غیر مقلدوں کے نزدیک تقلید کرنا یعنی اللہ والوں کے راستے پر چلنا بُرا ہے۔ اور دیوبندی اُن سارے امور خیر کو شرک کہتے ہیں جن پر عرب و عجم کے مسلمانوں کا عمل ہے **چوتھے** یہ کہ صالحین کو بُرا کہنا منافقوں کا طریقہ ہے۔ آجکل بھی رافضی خلفاء راشدین کو

اور خارجی علی مرتضےٰ کو بُرا کہتے ہیں۔ غیر مقلد اماموں۔ خاص کر امام اعظم رضی اللہ عنہ کو گالیاں دیتے ہیں۔ دیوبندی تمام زمانہ کے اولیاء اللہ مقبولین بارگاہ۔ علماء کرام کو مشرک اور کافر جانتے ہیں۔ کیونکہ جب میلاد شریف کرنا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریفیں کرنا ہی شرک ٹھہرا۔ تو اس صورت میں کوئی عالم اور ولی شرک سے نہ بچا۔ اگر تقویۃ الایمان کے شرکیات پر غور کیا جائے۔ تو خود اسلام کا ماننا شرک ہے۔ مرزائی گذشتہ انبیاء کو چکڑالوی صحابہ کرام اور محدثین کو نیچری تمام اکابرین کو بُرا کہتے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ سب گمراہ ہیں۔ (تفسیر خزائن العرفان) **پانچویں**۔ یہ کہ اس میں دیندار عالموں کو تسلی ہے۔ کہ وہ بے دینوں کی بدزبانی سے رنجیدہ نہ ہوں۔ بلکہ یہ سمجھ لیں۔ کہ اہل باطل کا ہمیشہ یہ دستور رہا ہے۔ (تفسیر مدارک) حق یہ ہے۔ کہ علماء کرام دین مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظ اور چوکیدار ہیں۔ چور پہلے چوکیدار ہی پر حملہ کرتا ہے۔ کیونکہ اُس کے ہوتے ہوئے وہ چوری نہیں کرسکتا۔ اسی لئے آج جو بھی بے دین اٹھتا ہے۔ وہ علماء پر ہی طعن کرتا ہی اُٹھتا ہے۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے۔ کہ اِن کی موجودگی میں ہم دین مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں چوری نہیں کرسکتے۔ مگر یاد رہے۔ کہ چوکیدار پر شہنشاہ کا ہاتھ اور اُس کی پشت پر سلطانی عملہ ہوتا ہے۔ اسی طرح علماء دین پر مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ کرم ہے۔ اور ملائکہ ان کی حمایت پر ہیں۔ اسی لئے بڑی بڑی طاقتیں۔ جیسے خاکساری۔ نیچری وغیرہ علماء سے ٹکرائیں مگر خود پاش پاش ہوگئیں۔ علماء کے اقبال و وقار میں بفضلہ تعالےٰ کوئی فرق نہ آیا۔ علماء کو بھی لازم ہے۔ کہ دین حق کی خدمت کو اپنا اصلی مقصد قرار دیں۔ اگر یہ خادمِ دین بن کر رہیں گے۔ تو انشاء اللہ دنیا خود بخود ان کے پیرچومے گی۔ **چھٹے** یہ کہ مقبولان خدا کا دشمن درحقیقت حق تعالےٰ کا دشمن ہے۔ دیکھو اُن منافقین نے مسلمانوں کو بیوقوف کہا تھا۔ حق تعالےٰ نے خود اُن کو بدلہ دیا۔ اور اُن کو بیوقوف فرمایا۔

**تفسیر صوفیانہ** صوفیاء کرام فرماتے ہیں۔ کہ انسان دنیا میں مسافر کی حیثیت سے ہے۔ اپنے وطن یعنی عالم ارواح سے اپنے مالک سے کچھ عہد و پیماں کر کے کمائی کرنے یہاں پردیس میں آیا ہے۔ لیکن یہاں کے باغ و بہار میں پھنس کر اپنے اصلی وطن اور حقیقی مقصد کو بھول گیا۔ وطن سے برابر چٹھیاں۔ تار۔ اور قاصد آرہے ہیں۔ کہ اے پردیسیو پردیس سے کما کر اپنے دیس کو بھیجتے رہو۔ تمہیں یہ موقعہ پھر ہاتھ نہ آئیگا۔ عقلمند تو ان پیغاموں کو سُن کر فوراً ہوش میں آجاتے ہیں۔ اور اپنے وطن کی تیاری میں مشغول ہوجاتے ہیں۔ مگر غافل لوگ اس جھوٹی زیب و زینت میں کچھ ایسے مست ہیں۔ کہ اِن پیغاموں سے بھی اِن کی آنکھ نہیں کھلتی۔ بلکہ جب کوئی خیرخواہ اُن سے کہتا ہے۔ کہ دیکھو فلاں شخص کی طرح تم بھی سفر کی تیاری کرو۔ تو بجائے اس کے کہ اُس کا احسان مانتے۔ اُلٹے اُن کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ اور دل والوں کو مجنوں اور دیوانہ کہتے ہیں۔ پردیس کے ساز و سامان پر ایسے قناعت کر چکے ہیں۔ کہ انہیں اپنے دیس کا کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ وہ اِن اللہ والوں کے پھٹے پرانے کپڑوں اور زرد چہروں کو دیکھتے ہیں۔ اُن کے دِل کی نورانیت اور سینوں کے خزینوں سے بے خبر ہیں۔ یہ اللہ والے اُس چاند سورج کی طرح ہیں۔ جو کہ گرد و غبار کی آڑ میں اغیار کی نگاہوں سے چھپے ہوں مثنوی شریف میں فرمایا ؎

گر تو سنگِ صخرہ و مرمر شوی — چوں بصاحب دِل رسی جوہر شوی

المنھم تحت قبابی کامنوں — جز کہ یزدانش ندانند آزموں

صوفیاء کرام فرماتے ہیں۔ کہ علم دو قسم کا ہے۔ ایک علم ظاہری دوسرا علم لدُنّی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ قلب کے دو دروازے ہیں۔ ایک بیرونی اور ایک اندرونی۔ بیرونی دروازہ تو ظاہری حواس ہے۔ کہ اِن کے ذریعے سے قلب علم ظاہری حاصل کرتا ہے۔ اور اندرونی دروازہ الہام ہے کہ جس سے علم باطنی حاصل ہوتا ہے۔ جو شخص کہ فقط ظاہری علم پر اعتماد کر کے باطنی دروازہ بند کرلے وہ اگرچہ کتنا ہی پڑھا لکھا ہو۔ مگر جاہل ہے۔ یہ منافقین بڑے چالاک اور دنیوی سمجھ رکھنے والے تھے۔ مگر چونکہ علم لدنی سے بے بہرہ تھے۔ اس لئے انہیں فرمایا گیا۔ لَا يَعْلَمُوْنَ جو شخص کہ ظاہری علم کی اصطلاحیں یاد کرے اور اُس کا دروازۂ قلب نہ کھلے وہ علم کے انوار سے محروم رہتا ہے۔ بلکہ اکثر یہ علم اُس کے لئے حجاب بن جاتا ہے۔ اَلْعِلْمُ حِجَابُ الْاَكْبَرُ ؎

چند خوانی حکمت یونانیاں حکمت ایمانیاں راہم بخواں

**پہلا اعتراض**۔ اس زمانہ پاک میں منافقین کو اتنی جرأت ہی کیسی ہوتی تھی۔ کہ وہ صحابہ کرام کی بدگوئی کر لیتے تھے۔ اس پر مسلمان خاموش کیوں رہتے تھے۔ اس گئے گزرے زمانہ میں بھی کسی بے دین کی یہ جرأت نہیں کہ علی الاعلان صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کر سکے **جواب** ان کی یہ بدزبانی مسلمانوں کے سامنے نہ تھی۔ یہ تبرّا بازیاں وہ اپنی خاص خاص مجلسوں میں کرتے تھے۔ رب تعالےٰ نے ان کا پردہ فاش کر دیا۔ آج کل کے گمراہ فرقے بھی اپنے بُرے عقیدے مسلمانوں سے چھپاتے پھرتے ہیں۔ مگر حق تعالےٰ ان کی تحریروں اور کتابوں سے ان کے راز فاش فرما دیتا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو ہوشیار کیا گیا ہے۔ کہ وہ گمراہوں کے اچھے الفاظ سے دھوکہ نہ کھائیں۔ (تفسیر خزائن العرفان) **دوسرا اعتراض** عقائد میں تقلید کرنا منع ہے۔ اور تقلیدی ایمان کا اعتبار نہیں لیکن اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ دین میں بھی تقلید چاہیئے۔ کیونکہ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ اور مسلمانوں کی طرح تم بھی ایمان لے آؤ۔ **جواب** یہ تقلیدی ایمان نہیں۔ اس آیت کا منشا ہی کچھ اور ہے۔ تقلیدی ایمان اسے کہتے ہیں۔ کہ انسان خود تو ایمانیات سے بالکل بے خبر رہے۔ اور محض یہ کہہ کر ایمان لے آئے۔ کہ جو فلاں کا ایمان ہے۔ وہ میرا۔ یا یہ کہ خود اسلام کی خوبیوں سے بالکل ناواقف رہے اور یہ کہے کہ مجھے نہیں خبر کہ اسلام حق ہے یا باطل ہیں تو محض فلاں کی دیکھا دیکھی مسلمان ہو گیا۔ یہ دونوں قسم کے ایمان مقبول نہیں۔ اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے۔ کہ ایمان تو سوچ سمجھ کر اختیار کیا جائے مگر اللہ والوں کی رہبری میں۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا

اور جب ملیں ان سے جو ایمان لائے کہیں ہم ایمان لائے اور جب تنہا ہوں طرف شیطانوں اپنے کے کہیں

اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے۔ اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوں۔ تو کہیں

اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾

تحقیق ہم ساتھ تمہارے ہیں اس کے سوا نہیں کہ ہم ہنسی کرنے والے ہیں۔

ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو یوں ہی ہنسی کرتے ہیں۔

**تعلق**۔ اس آیت کا پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ اس سے پہلے منافقوں کے تین عیب بیان ہو چکے۔ اب یہ چوتھا عیب بتایا جا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ پہلے منافقین کی دینی حالت اور صرف مسلمانوں کے ساتھ برتاوے وغیرہ کا بیان ہوا۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ ان کا معاملہ مومنین اور کفار دونوں سے کیسا ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ آیت پہلی آیت کی تفصیل ہے۔ کیونکہ وہاں فرمایا گیا تھا۔ کہ منافقین اپنے کو عقلمند اور مسلمانوں کو بیوقوف کہتے ہیں۔ اب ان کے اس فریب کا ذکر کیا گیا جس کو وہ عقلمندی سمجھتے تھے۔ **ہدایت** بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت مکرر ہے۔ کیونکہ منافقین کے ایمان ظاہر کرنے کا پہلا ہی ذکر ہو چکا وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا اور اب بھی اسی کا ذکر ہے لیکن یہ خیال محض غلط ہے۔ تکرار وہ ہے۔ کہ جو فائدے سے خالی ہو۔ اس جگہ پہلے ان کی دینی حالت کا ذکر ہوا تھا۔ اور اب ان کے معاملہ کا یعنی پہلے ان کا عقیدہ بتانا مقصود تھا۔ اور اب ان کا فریب **شان نزول**۔ یہ آیت عبداللہ ابن ابی منافق وغیرہ منافقین کے حق میں نازل ہوئی۔ ایک بار انہوں نے صحابہ کرام کی ایک جماعت کو آتے دیکھا تو عبداللہ ابن ابی منافق اپنے یاروں سے کہنے لگا۔ کہ دیکھو میں انہیں کیسا بناتا ہوں جب یہ حضرات قریب پہونچے تو عبداللہ نے پہلے حضرت صدیق اکبر کا دست مبارک پکڑا اور بولا کہ مبارک ہیں آپ کہ جناب صدیق ہیں بنی تمیم کے سردار شیخ الاسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غار کے ساتھی اپنی جان و مال کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر قربان فرمانے والے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ کہ سبحان اللہ آپ بنی عدی کے سردار ہیں۔ فاروق آپ کا لقب ہے۔ اپنی جان و مال حضور علیہ السلام پر قربان فرمانے

والے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ مبارک پکڑ کر کہنے لگا۔ کہ ماشاء اللہ آپ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی بنی ہاشم کے سردار اور حضور کے داماد ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا۔ کہ اے عبداللہ رب سے ڈر نفاق چھوڑ منافقین سب سے بدتر ہیں وہ بولا۔ کہ اے علی آپ یہ کیوں فرماتے ہیں۔ ہمارا ایمان بھی آپ حضرات کی طرح ہے۔ پھر یہ حضرات وہاں سے روانہ ہو گئے۔ عبداللہ اپنی جماعت والوں سے کہنے لگا۔ کہ دیکھا میں نے کیا چال چلی اُن لوگوں نے اس کی تعریف کی تب یہ آیت کریمہ اُتری (تفسیر روح البیان وتفسیر خزائن العرفان معہ تصنیف

**تفسیر** لَقُوْا یہ لفظ لُقُوْءٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ ملاقات کرنا۔ اور سامنے آنا۔ یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں مخلص مسلمان مراد ہیں زبانی مسلمان تو منافقین ہی تھے۔ مگر اُن کو ایسی چالیں مخلصین کے سامنے چلنی پڑتی تھیں۔ اٰمَنَّا میں حقیقی ایمان مراد ہے۔ اُن کے زبانی ایمان میں کسی کو شک نہ تھا حقیقی ایمان مشکوک تھا۔ یہ لوگ بار بار قسمیں کھا کھا کر اپنے اخلاص کا لوگوں کو یقین دلایا کرتے تھے۔ ولایتی گھی کا نام ہے اصلی گھی آج بھی بے دین لوگوں کا یہی طریقہ ہے۔ کہ قسمیں کھا کھا کر اپنا ایمان ظاہر کرتے پھرتے ہیں۔ مگر لوگوں کو اُن کا اعتبار نہیں ہوتا۔ خالص مشک تعریف کا محتاج نہیں۔ اسی طرح مخلص مسلمان کو قسموں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کا نورِ ایمانی خود بخود اپنی جلوہ گری کرتا ہے۔ خَلَوْا خُلُوٌّ سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں اکیلا ہونا اور گزرنا قَدْ خَلَتْ اور تمسخر کرنا۔ اس جگہ پہلے معنی مراد ہیں یعنی جب منافقین اپنے شیطانوں کے پاس تنہائی میں جاتے ہیں۔ کہ جہاں کوئی مسلمان نہیں ہوتا۔ تو یہ گفتگو کرتے ہیں۔ شَیٰطِیْنِهِمْ شیاطین شیطان کی جمع ہے۔ لفظ شیطان کی تحقیق اَعُوْذُ بِاللّٰہِ میں ہو چکی اور اُس کی حقیقت انشاء اللہ آگے بیان کی جائے گی۔ لیکن یہاں تو اُن کے دوست مراد ہیں یا منافقین کے سردار جو کہ شیطان کی طرح سرکش اور گمراہ کُن ہیں۔ اہل عرب ہر سرکش کو شیطان کہہ دیتے ہیں۔ ضحاک نے فرمایا۔ کہ اس جگہ شیاطین سے کفار کے کاہن (نجومی پنڈت) مراد ہیں۔ کیونکہ اُن کے پاس شیطان آیا کرتے تھے۔ اور یہ چند لوگ تھے۔ بنی قریظہ میں کعب ابن اشرف اور بنی اسلم میں ابو بردہ اور جُہینہ میں عبدالدار اور بنی اسد میں عوف ابن عامر اور ملک شام میں عبداللہ ابن سوداجن کے متعلق اہل عرب کا یہ خیال تھا۔ کہ یہ لوگ غیب کی خبر رکھتے ہیں۔ اور اسرار الٰہی جانتے ہیں۔ اور بیماروں کا علاج کرتے ہیں۔ اِنَّا مَعَکُمْ سے مراد یہ ہے۔ کہ ہم تمہارے ساتھی ہیں یعنی منافقین ان سرداروں کے پاس آ کر کہتے تھے۔ کہ ہم دین عقائد۔ اعمال میں ہر طرح تمہارے ہی ساتھی ہیں۔ خیال رہے کہ منافقین نے مسلمانوں سے صرف اٰمَنَّا کہا یعنی ہم ایمان لے آئے جملہ فعلیہ استعمال کیا۔ اور اُس کے ساتھ کسی قسم کی تاکید کا ذکر نہ کیا۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے۔ کہ مسلمان سیدھے سادے ہیں۔ صرف ہمارے کہنے سے ہی مان جائیں گے۔ اور ہماری بات میں کچھ شک نہ کریں گے اس لئے بغیر تاکید کلام کیا۔ اور یہ بھی کہتے تھے۔ کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں یعنی پہلے کافر تھے۔ اب مومن بن گئے۔ مگر کفار کے متعلق ان کا خیال تھا۔ کہ یہ لوگ بہت چالاک ہیں۔ ہماری ہر بات بلا تحقیق ہرگز نہ مانیں گے۔ اس لئے اِنَّا وغیرہ سے کلام کی تاکید کرتے تھے اور جملہ اسمیہ بولکر یہ بتاتے تھے۔ کہ ہم پہلے بھی تمہارے ساتھی تھے۔ اور اب بھی ہیں۔ لیکن پھر بھی چونکہ اُن کو شک وشبہ ہوتا تھا۔ کہ یہ تو مسلمانوں کے ساتھ نمازیں پڑھتے ہیں اُن کے وعظوں میں جاتے ہیں اُن کے ساتھ جہادوں میں شریک ہوتے ہیں۔ پھر یہ ہمارے ساتھی کیونکر ہوئے۔ اس شبہ کو مٹانے کے لئے کہتے تھے۔ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ یعنی اے دوستو ہمارے ظاہری برتاوے سے تم دھوکا نہ کھانا ہم تو مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کے لئے یہ حرکتیں کرتے ہیں۔ ہمارے دل تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ ظاہری برتاوے محض اس لئے ہیں۔ کہ اُن کے ساتھ رہ کر اپنے جان۔ مال اولاد کی حفاظت کریں۔ اور اُن کے ساتھ غنیمتیں حاصل کریں۔ اُن کے خفیہ راز معلوم کر کے تم تک پہنچا دیں مُسْتَهْزِءُوْنَ۔ هَزْءٌ سے بنا ہے جس کے لفظی معنی ہیں۔ ہلکا پن جو شخص اچانک مر جائے۔ اُسے هَازِیْ کہتے ہیں۔ اسی طرح تیز رفتار جانور پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اِسْتِهْزَا کے معنی ہیں کسی کو جاہل بنانا۔ یا اُس سے ہنسی ٹھٹھا کرنا۔ اور خفیف و ذلیل کرنا۔ یہاں تینوں معنی بن سکتے ہیں۔ **خلاصہ تفسیر** جب وہ منافق۔ مسلمانوں سے ملتے تھے۔ تو اُن کو خوش کرنے کے لئے کہہ دیتے تھے۔ کہ میاں ہم تو مسلمان ہو چکے ہیں۔ اور جب اپنے سرداروں اور دوستوں

کے پاس جاتے تو نہایت تاکید سے قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے۔ کہ ہم تو ہر طرح تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم مسلمانوں سے دل لگی کرنے کے لئے اُن کے سامنے کلمہ پڑھ دیتے ہیں۔ اور وہ نرے بیوقوف ہیں۔ ہماری باتوں کو سچا سمجھ کر اپنی خاص مجلسوں میں ہمیں شریک کر لیتے ہیں جس سے کہ ہم اُن کے دلی ارادوں اور خاص مشوروں سے خبردار ہو کر تمہیں بھی آگاہ کر دیتے ہیں۔ اے کافرو ہمارا یہ طریقہ تمہارے لئے بھی مفید ہے۔ تمہیں ہمارا احسان ماننا چاہیئے۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ دل لگی اور مذاق کے لئے کلمہ پڑھنا کفر ہے کیونکہ قرآن کریم نے اُن کے اس اظہار ایمان کو کفر قرار دیا۔ **دوسرے** یہ کہ انبیاء علیہم السلام اور دین کے ساتھ تمسخر کرنا کفر ہے **تیسرے** یہ کہ صحابہ کرام اور دینی پیشواؤں کا مذاق اڑانا بھی کفر ہے (خزائن العرفان) بلکہ ہر دینی چیز (قرآن شریف۔ مسجد علمائے کرام رمضان شریف۔ اولیاء اللہ کے مزارات وغیرہ) کی توہین کرنی بھی کفر ہے۔ اور ان کی تعظیم ایمان و تقویٰ کی علامت۔ قرآن کریم نے فرمایا۔ کہ جو کوئی شعائر اللہ (اللہ کی نشانیوں) کی تعظیم کرے وہ دلی پرہیزگار ہے۔ **چوتھے** یہ کہ ہر ایک کی مجلس میں بیٹھنا اور بدمذہبوں کو اپنا دوست بنانا منافقوں کا طریقہ ہے۔ آجکل یہ مرض عام مسلمانوں میں ہے۔ **پانچویں** یہ کہ لوگوں کا مذاق اڑانا سخت برا ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا۔ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ کوئی قوم دوسری قوم سے مذاق نہ کرے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے عرض کیا تھا۔ کہ کیا آپ ہم سے دل لگی کرتے ہیں تو فرمایا۔ کہ خدا مجھے اس سے بچائے کہ میں جہلا میں سے ہو جاؤں۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ کسی کا مذاق اڑانا جہالت ہے۔ **خیال** رہے کہ مذاق اڑانا اور بات ہے۔ اور خوش طبعی کرنا اور چیز۔ خوش طبعی کو مزاح کہتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے۔ کہ مذاق اڑانے میں کسی کو ذلیل کرنا منظور ہوتا ہے۔ اور خوش طبعی میں صرف دل خوش کرنے اور غم دور کرنے والی باتیں ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی خوش طبعی کرنا جائز بلکہ سنت سے ثابت ہے۔ مگر شرط یہ ہے۔ کہ اس میں جھوٹ نہ ہو۔ یہ بھی واضح رہے۔ کہ مذاق کی ابتداء منع ہے۔ اگر کوئی شخص ہمارا مذاق اڑائے اور ہم جواب میں اس کا مذاق اڑا دیں۔ تو ہم کو جائز ہے۔ ہاں مسلمان سے درگزر کرنا۔ اور کافر کی رعایت نہ کرنا سنت صحابہ ہے حضرت حسان رضی اللہ عنہ جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نعت گو اور نعت خواں ہیں۔ وہ جواباً کفار کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو دعائیں دیتے تھے۔ **تفسیر صوفیانہ** دنیا اور آخرت اُن دو سوکنوں کی طرح ہیں جن کا اجتماع ناممکن ہے منافقین نے چاہا تھا۔ کہ ہم زبان سے دیندار اور دل سے کافر رہ کر دونوں کو جمع کر لیں۔ انجام یہ ہوا۔ کہ کہیں کے نہ رہے۔ اسی طرح جو شخص چاہے۔ کہ میں اپنے دل میں دین و دنیا دونوں جمع کر لوں۔ وہ غلطی کرتا ہے۔ دنیا کے معنے ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ صوفیاء کرام کا عمل یہ ہے ؎

دنیا میں تو ایسا ہو رہ جوں مرغابی ساگر میں نام خدا کا ایسے جپنا جوں جیت ناری گاگر میں

مرغابی دریا میں پہنچ کر مچھلی کی طرح تیرتی ہے مگر ہوا میں پرندہ بن کر اڑتی ہے۔ پانی بھرنے والی عورتیں تین چار گھڑے بیکر راستہ طے کرتی ہیں۔ مگر اُن کی حالت یہ ہوتی ہے۔ کہ نگاہ راستہ پر ہے۔ دھیان گھڑوں کی طرف۔ اور کان اور زبان اپنی سہیلیوں کی طرف متوجہ۔ اپنی کہہ رہی ہیں۔ دوسری کی سن رہی ہیں۔ اسی طرح مرد میدان وہ ہے۔ کہ گھر میں دنیا دار معلوم ہو مسجد میں دینداروں کا سردار دنیا کا ہر کام کرے۔ مگر دین کا ہر وقت دھیان رکھے۔ تارکِ دنیا کمزور ہے۔ اور تارکِ دین بے ایمان۔

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١٥﴾

| اللہ | استہزاء فرماتا ہے | ساتھ اُن کے اور ڈھیل دیتا ہے اُنکو | میں سرکشی اپنی | کہ بھٹکتے ہیں۔ |
|---|---|---|---|---|

اللہ اُن سے استہزاء فرماتا ہے اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں

**تعلق** اس سے پہلے منافقین کا جو تھا فریب بیان ہوا تھا۔ اب اس کی سزا کا ذکر ہو رہا ہے۔ تاکہ سننے والا اس سے عبرت پکڑے

اور اس حرکت سے باز آئے۔ **تفسیر** اَللّٰہُ اِس آیت کو اللہ کے نام سے شروع کرنے میں اس طرف اشارہ ہے۔ کہ مسلمانوں کو اُن کے مذاق کے جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ اُن کی طرف سے خود رب تعالیٰ اُن کو جواب دے رہا ہے۔ نیز اس سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ کے استہزا کے مقابلہ میں منافقین کا مذاق بالکل بے کار ہے۔ جیسے کہ کوئی قوی کسی کمزور سے کہے کہ تو کیا بدلہ لے گا۔ بدلہ تو میں لونگا یَسْتَهْزِئُ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ کہ استہزا کے تین معنی ہیں۔ جاہل بنانا۔ ذلیل کرنا۔ دل لگی کرنا۔ یہاں پہلے دو معنی بن سکتے ہیں۔ نہ کہ تیسرے۔ کیونکہ حق تعالیٰ دل لگی کرنے سے پاک ہے۔ تو آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ خداوند تعالیٰ انہیں جاہل قرار دیتا ہے۔ یا ذلیل کرتا ہے۔ اس جگہ یَسْتَهْزِئُ میں تین احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ بمعنی حال ہو یعنی اُنہیں دنیا میں ذلیل کرتا ہے۔ کہ کسی جگہ اُن کی عزت نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ بمعنی استقبال ہو یعنی انہیں قیامت یا دوزخ میں ذلیل فرمائیگا۔ وہ اسطرح کہ یہ منافقین مسلمانوں کیساتھ رہینگے کفار جہنم میں ڈالدیئے جائیں گے۔ حق تعالیٰ ان سب پر تجلی فرمائیگا۔ مومنین تو سجدے میں گر جائینگے۔ مگر منافقین کی پشت ایسی سخت ہو جائے گی۔ کہ بجائے سجدہ کرنے کے اوندھے گر پڑیں گے۔ تب انہیں کتّوں کی طرح جہنّم میں پھینکا جائے گا۔ اور یا یہ دوام تجددی کے معنی میں ہے یعنی منافقین تو ایک بار ہی مسلمانوں سے مذاق کر چکے۔ مگر رب تعالیٰ اُن کے ساتھ ہمیشہ اور ہر جگہ طرح طرح سے استہزاء فرماتا رہے گا۔ دنیا میں موت کے وقت۔ قبر۔ قیامت غرض ہر جگہ ان کے ساتھ استہزاء ہوتا رہے گا۔ وَيَمُدُّهُمْ يَمُدُّ یا تو مَدٌّ سے بنا ہے یا مَدَادٌ سے۔ مَدٌّ کے معنی ہیں مہلت دینا اور مَدَادٌ کے معنی ہیں بڑھانا۔ قوت دینا اور اصلاح کرنا۔ اگر یہ مَدٌّ سے بنا ہو تو آیت کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ اللہ تعالیٰ اِن منافقوں کو ڈھیل دیئے ہوئے ہے۔ کہ وہ جرم کرتے ہیں۔ اور اُن کی پکڑ نہیں ہوتی۔ اور اگر مَدٌّ سے بنا ہو۔ تو معنی یہ ہوں گے۔ کہ حق تعالیٰ اُن کی سرکشی۔ گمراہی کو زیادہ فرماتا ہے۔ اور اس کو قوی اور مضبوط کرتا ہے۔ کیونکہ انہیں مال دیتا ہے۔ اور اولاد وغیرہ سے بھی بڑھاتا ہے جس کی وجہ سے وہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اگر رب تعالیٰ ہم سے ناراض ہوتا۔ تو ہمیں یہ انعامات کیوں دیتا۔ لیکن صحیح یہی ہے۔ کہ یہ مَدٌّ سے بنا ہے کیونکہ اگر مَدٌّ سے بنتا تو اس کے بعد لام ہوتا۔ یعنی يَمُدُّ لَهُمْ ہوتا۔ تفسیر کبیر میں ہے۔ کہ قرآن کریم میں مَدٌّ شر کیلئے اور اِمداد خیر کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے۔ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ وَاَمْدَدْنَاكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ چونکہ یہاں سرکشی اور گمراہی کا ذکر ہے۔ اس لئے مَدًّا فرمایا گیا۔ فِيْ طُغْيَانِهِمْ طُغْيَانٌ کے لغوی معنی ہیں۔ حد سے بڑھ جانا۔ اسی لئے پانی کے سیلاب کو طغیانی بولتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی اپنی حد سے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اب اس کا استعمال کفر و سرکشی میں حد سے بڑھ جانے پر ہوتا ہے۔ اور یہاں بھی یہی معنی ہیں۔ کہ منافقین اپنی سرکشی میں حد سے آگے بڑھ چکے ہیں۔ يَعْمَهُوْنَ عَمَهٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ دل کا اندھا ہو جانا۔ جسے ہندی میں کہتے ہیں۔ ہیئے کی پھوٹ جانا عمیٰ آنکھ کے اندھے ہونے کو کہتے ہیں۔ اور عَمَهٌ دل کے اندھے ہونے کو۔ یہاں اس سے مراد ہے۔ حیران اور پریشان ہونا۔ کیونکہ اگر اندھے کو میدان میں اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ تو وہ بھی حیران ہو کر ادھر اُدھر بھٹکتا پھرے گا۔ منزل مقصود پر نہ پہنچے گا۔ اسی طرح دنیا کے میدان میں اِن منافقین نے قرآن پاک اور صاحب لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح معنی میں نہ پکڑا۔ اس لئے انہیں کچھ نہیں سوجھتا۔ کہ کدھر جائیں کبھی کافروں کی طرف اور کبھی مسلمانوں کی طرف بھٹکتے پھرتے ہیں **خلاصہ تفسیر**۔ منافقین خود کو عقلمند اور مسلمانوں کو بیوقوف سمجھتے ہوئے کہا کرتے تھے۔ کہ ہم تو اُن سے دل لگی کیا کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اُن کی اس بکواس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ کہ وہ بے چارے تو مسلمانوں سے کیا دل لگی کریں گے خود مسلمانوں کا رب اُن کو ذلیل و خوار کر رہا ہے۔ اور کرتا رہے گا۔ وہ اس طرح کہ جیسے ان کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ اسی طرح ان کے ساتھ رب کا معاملہ بھی دنیا میں کچھ اور ہے۔ اور آخرت میں کچھ اور دنیا میں تو اُن پر سارے اسلامی احکام بظاہر جاری کر دیئے گئے۔ کہ نہ اُن سے جہاد نہ اُن پر جزیہ نہ اُن کو مسجدوں میں آنے سے کوئی روک ٹوک اور نہ اسلامی کاموں میں شرکت کرنے سے ممانعت مرنے کے بعد کفن۔ دفن وغیرہ سارے اسلامی احکام اُن پر جاری جس سے کہ وہ سمجھے کہ مسلمانوں پر ہمارا داؤ خوب چلا۔ مگر جب قبر میں پہنچیں گے تو پتہ لگے گا۔ کہ "غلط بود آں چہ ماپنداشتیم"۔ تب رو رو کر کہیں گے۔ کہ ہمیں بڑا دھوکا ہوا۔ ہم کچھ سمجھتے تھے اور کچھ ظاہر ہوا

پھر اُن کی حالت یہ ہے۔ کہ جب اسلام کے دلائل سنتے ہیں۔ تو سمجھتے ہیں۔ کہ شاید اسلام سچا دین ہو۔ مگر جب کفار کی مالداری۔ اُن کا عیش اور مسلمانوں کی غربت وافلاس پر نظر کرتے ہیں۔ تو سوچتے ہیں۔ کہ اگر رب تعالےٰ کفار سے ناراض تھا۔ تو اُن کو اتنا مال کیوں دیا۔ اور اگر مسلمانوں سے راضی تھا۔ تو اُن کو اس حال میں کیوں رکھا۔ لہٰذا کفر سچا ہے۔ اور معاذ اللہ اسلام جھوٹا۔ غرضکہ وہ ایسے حیران وپریشان ہیں۔ کہ اس کے متعلق کچھ فیصلہ ہی نہ کر سکے۔ بخلاف مسلمانوں کے کہ وہ جب مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں۔ تو صابر بن کر درجات حاصل کر لیتے ہیں۔ اور جب نعمتیں پاتے ہیں تو شاکر بن کر خدا کے پیارے اور مقبول بن جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ دنیاوی مصیبتیں اور راحتیں مسلمانوں کے لئے حق تعالےٰ کی نعمتیں ہی ہیں۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ ایمان سے دل کا اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اور کفر میں بے اطمینانی رہتی ہے۔ مومن اُس مضبوط درخت کی طرح ہے۔ کہ جو تیز آندھیوں کا مقابلہ نہایت اطمینان سے کر لیتا ہے۔ نہ تو مصیبت میں گھبراتا ہے۔ اور نہ راحتوں پر اتراتا ہے۔ کافر اُس کچی کھیتی کی طرح ہے۔ کہ جو ہر ہوا کا اثر لے لیتی ہے مصیبت آئے تو گھبرا جائے۔ اور راحتیں پاکر غرور کرے۔ **دوسرے** یہ کہ بندے کو چاہیئے کہ درازی عمر اور زیادتی مال واولاد پر فخر نہ کرے۔ اور اس سے دھوکا نہ کھائے۔ بہت دفعہ یہ چیزیں حق تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہوتی ہیں۔ کفار کے لئے اِن چیزوں کی زیادتی۔ عذاب کی زیادتی کا باعث بن جاتی ہے۔ کہ اُن کو دنیا میں مال محدود اور آخرت میں وبال ممدود ملتا ہے۔ اور مخلصین کیلئے یہ چیزیں زیادتی ثواب کا باعث ہیں۔ یعنی اُس کے لئے دنیا میں مال محدود اور آخرت میں ظلِّ ممدود ہیں۔ (دراز سایہ) بعض بزرگان دین زیادہ دنیاوی راحتوں سے گھبراتے تھے۔ کہ ایسا نہ ہو۔ کہ یہ راحتیں ہمارے نیک اعمال کا بدلہ ہو گئی ہوں **تیسرے** یہ کہ دنیوی ترقیاں قابل اعتماد نہیں۔ اس کی مثال پتنگ کی سی ہے۔ کہ وہ اس قدر اونچی اڑتی ہے۔ کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے مگر اُس کی ڈور پتنگ والے کے ہاتھ میں ہے۔ کہ ایک جھٹکے میں اس کو زمین پر لے آتا ہے۔ انسان بھی دنیوی ترقی کرتے کرتے بادشاہ بن جائے۔ مگر ایک جھٹکے میں قصر (محل) سے نکل کر قبر میں پہنچ جاتا ہے۔ **چوتھے** یہ کہ حق تعالےٰ مسلمانوں کا ایسا والی ہے۔ کہ جو انہیں تکلیف پہنچائے۔ خود رب تعالےٰ اُس سے بدلہ لیتا ہے۔ **پانچویں** یہ کہ جو کوئی اپنے ذاتی معاملے میں کسی سے بدلہ نہ لے تو حق تعالےٰ اُس کی طرف سے بدلہ لیتا ہے۔ اور جو خود بدلہ لینے کے درپے ہو جائے۔ وہ یہ درجہ نہیں پاتا۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیئے۔ کہ اپنے ذاتی معاملات میں درگزر کیا کریں۔ اور دینی معاملات میں ہرگز کسی کی رعایت نہ کریں۔ مگر افسوس کہ آج ہمارا طریقہ اس کے برعکس ہو گیا۔ کہ جس شخص سے ہمیں کوئی ذاتی نقصان پہنچ جائے ہم اُس کے پکے دشمن ہیں۔ لیکن جن بدمذہبوں سے کہ دین کو نقصان پہنچ رہا ہو۔ اُن کو اپنا بھائی بنانے کیلئے تیار۔ **تفسیر صوفیانہ** تصوّف کا آخری درجہ ہے۔ فنا فی اللہ جس میں پہنچ کر بندہ اپنے کو رب کی بارگاہ میں ایسا فنا کر دیتا ہے۔ کہ صرف قالب تو بندہ کا رہ جاتا ہے۔ مگر اُس کے سارے کام رب کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اُس سے دوستی رب سے دوستی اُس سے جنگ رب سے جنگ۔ اُس کا کہنا رب کا کہنا۔ اُس کی بات رب کی بات جیسے کہ کوئلہ آگ میں پہنچ کر ایسا فنا ہوا کہ قالب تو کوئلے کا رہا۔ مگر شکل اور نام اور کام سب آگ کا سا ہو گیا۔ چونکہ صحابہ کرام فنا فی اللہ کے درجہ پر فائز تھے اس لئے اُن کو دھوکا دینا اور اُن کا مذاق اڑانا در حقیقت رب کو دھوکا دینا اور اُس سے مذاق کرنا ہے۔ اس لئے رب نے گویا منافقین سے اپنا بدلہ لیا۔ اور فرمایا اَللّٰہُ یَسْتَہْزِئُ بِہِمْ نیز جس قدر رسی لمبی ہوتی ہے۔ اُسی قدر جھٹکا سخت لگتا ہے۔ اور جس قدر چکی دیر میں پیستی ہے اسی قدر باریک پیستی ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کیلئے یہ مہلتیں خطرناک ہیں ؎

تو مشو مغرور بر حلم خدا		دیر گیرد سخت گیرد مر ترا

نیز زیادہ چالاک حق تعالےٰ کے یہاں بڑا بیوقوف ہوتا ہے۔ اور سیدھا سادا مسلمان بڑا عقلمند۔ ان سیدھے سادوں کی مخالفت بڑی خطرناک ہے۔ شعر

خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر		توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

ہر بہتری کو پاگل نہ سمجھو۔ کیوں کہ اُن میں سے بعض بڑے بھیدی ہیں **اعتراض**۔ ستیارتھ پرکاش میں دیانند نے اعتراض کیا۔ کہ قرآن کریم نے خدا تعالےٰ کو عیب لگائے۔ کیونکہ قرآن سے ثابت ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ منافقوں سے دل لگی اور مذاق کرتا ہے۔ اور قرآن سے یہ بھی ثابت ہے۔ کہ مذاق کرنا جہالت ہے نتیجہ جو نکلا وہ خود سمجھ لو۔ اسی طرح رب تعالیٰ کیلئے قرآن کریم نے بڑے بڑے عیب ثابت کئے ہیں **جواب** ایسے اعتراضات کے چند جوابات ہیں۔ **ایک** یہ کہ فعل کے معنی فاعل کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ جیسا فاعل ویسے فعل کے معنی دیکھو اردو میں بولتے ہیں "میں بیٹھ گیا" یعنی کھڑے سے بیٹھ گیا۔ فلاں سیٹھ بیٹھ گیا یعنی اُس کا دیوالہ ہو گیا۔ فلاں دیوار بیٹھ گئی یعنی زمین میں دھنس گئی۔ فلاں کا دل بیٹھ گیا۔ یعنی اُس کی حرکت بند ہو گئی۔ فلاں کی دکان بیٹھ گئی یعنی اب چلتی نہیں۔ فلاں کی آنکھ بیٹھ گئی یعنی دماغ میں گھس گئی۔ فلاں مشین کا پرزہ ٹھیک بیٹھ گیا یعنی اپنی جگہ میں فٹ یعنی ٹھیک آگیا۔ تمہاری بات میرے دل میں بیٹھ گئی یعنی دل نے اُسے قبول کر لیا شکر نیچے بیٹھ گئی یعنی تہ میں جم گئی۔ نشانہ صحیح بیٹھ گیا یعنی تیر نشانہ پر لگا وغیرہ وغیرہ خیال تو کرو۔ کہ ان سب مثالوں میں بیٹھنا ایک ہی لفظ ہے مگر فاعلوں کے لحاظ سے کتنے معنے بن گئے۔ اسی طرح قرآن پاک میں ایک لفظ جب بندوں کے لئے آئے گا۔ تو اُس کے معنی کچھ اور ہوں گے۔ اور جب رب کیلئے بولا جائے۔ تو کچھ اور۔ بندوں کے لئے استہزاء کے معنی ہیں مذاق کرنا مگر رب تعالےٰ کے لئے اس کے معنی ہوں گے ذلیل کرنا یعنی اللہ اُن کو ذلیل کرتا ہے۔ **دوسرے** یہ کہ بہت دفعہ جرم اور اُس کی سزا کو ایک ہی لفظ سے بیان کر دیتے ہیں۔ جیسے کہ کہتے ہیں کہ جتنا کوئی تم پر ظلم کرے۔ اتنا ہی تم بھی اُس پر ظلم کرو۔ یا عربی زبان میں بولتے ہیں جَزَآءُ سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ یعنی برائی کا بدلہ برائی ہے۔ دیکھو ظلم کی سزا دینا ظلم نہیں۔ بلکہ عین انصاف ہے لیکن اُس کو بھی ظلم کہہ دیا گیا۔ اسی طرح اس آیت میں مذاق کی سزا کو بھی استہزاء یعنی مذاق کہہ دیا گیا **تیسرے** یہ کہ کسی سے ابتداءً مذاق کرنا جہالت ہے لیکن مذاق کا بدلہ میں مذاق کرنا عین حکمت اور کمال انصاف ہے۔ خاص کر جب کوئی اپنے محبوبوں سے دل لگی کرے تو محب کا بدلہ میں استہزاء فرمانا دنیائے محبت میں ضروری ہے۔ (تفسیر عزیزی) چونکہ اللہ کے پیاروں کا منافقین نے ابتداءً مذاق اڑایا۔ یہ عین جہالت تھا۔ اور رب تعالےٰ کا اُن سے بدلہ لینا عین حکمت کسی کو مار ڈالنا ظلم ہے۔ مگر قاتل کو پھانسی دینا عین انصاف **چوتھے** یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ حق تعالیٰ اُن کے ساتھ استہزاء کرنے والوں کی طرح دنیا و آخرت میں معاملہ فرمائے گا جس کو یہاں استہزاء فرمایا گیا۔ ان معاملات کی پوری تفصیل ہم پہلے کر چکے ہیں **نکتہ** چونکہ منافقین اور رب تعالےٰ کے استہزاء میں چند طرح فرق تھا۔ اس لئے ان دونوں استہزاؤں کو نہ تو ایک جملہ میں بیان کیا گیا اور نہ اس جملہ کا پہلے جملہ پر عطف کیا گیا۔ بلکہ دونوں جملوں کو بالکل مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا۔ کہ جس سے معلوم ہو جائے۔ کہ یہ دونوں استہزاء علیحدہ علیحدہ نوعیت اور حقیقت رکھتے ہیں **تتمہ** آریوں نے لفظ استہزاء سے ایسے ہی دھوکا دیا۔ جیسے کہ دیوبندی وغیرہ لفظ بشر سے دھوکا دیتے ہیں۔ فَافْهَمْ

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

یہ لوگ وہ ہیں کہ خریدا گمراہی کو بعوض ہدایت پس نہ نفع دیا بیوپار نے اُن کے اور نہ تھے وہ ہدایت پانیوالے

یہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو اُن کا سودا کچھ نفع نہ لایا اور وہ سودے کی راہ جانتے نہ تھے۔

**تعلق**۔ اس سے پہلے منافقین کی کچھ حرکتیں بیان فرما کر یہ بتایا گیا تھا۔ کہ یہ نادان اپنی ان حماقتوں کو دانائی سمجھتے ہیں۔ اب اس کو ایک نہایت بہترین تمثیل سے سمجھایا جا رہا ہے جس سے کہ اُن کی حالت اچھی طرح سب کے ذہن نشین ہو جائے۔ یا یوں کہو۔ کہ اس سے پہلے کی آیتوں میں منافقین کے چند عیوب بیان کئے گئے۔ اور یہاں اُن عیبوں کا نتیجہ بیان ہو رہا ہے۔ جیسے کہ کوئی شخص کسی بیوپاری کی تجارتی غلطیوں کو بیان کر کے آخر میں کہے۔ کہ انجام کار اُس کا دیوالہ ہو گیا۔ اور وہ اپنی اصل پونجی بھی کھو بیٹھا **شانِ نزول**۔ یہ آیت یا تو اُن لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جو کہ مخلص مومن بننے کے بعد کافر ہو گئے۔ یا اُن یہود کے حق میں آئی۔ جو پہلے سے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے تھے۔ مگر جب حضور

کی تشریف آوری ہوئی تو منکر ہو کر بعض تو مجاہر کافر اور بعض منافق بن گئے۔ یا اُن تمام کفار کے حق میں آئی جنہیں اللہ نے عقل سلیم عطا فرمائی تھی اور جن کے سامنے دلائل قائم فرما کر ہدایت کا راستہ ظاہر فرما دیا مگر انہوں نے عقل و انصاف سے کام نہ لیا۔ ضد سے گمراہ ہو گئے (تفسیر خزائن العرفان)

**تفسیر۔** اُولٰٓئِكَ اسم اشارہ ہے۔ چونکہ منافقین کی صفتیں اس طرح بیان کر دی گئیں، کہ وہ دوسروں سے بالکل چھنٹ گئے اور ہر شخص کو اُن کی پہچان ہو گئی۔ اور جو چیز کہ خیال میں موجود ہو اُس کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ لہذا یہاں اُن کی طرف اشارہ کیا گیا لیکن چونکہ وہ مسلمانوں سے درجہ میں بہت دُور تھے۔ اس لئے اشارۂ بعید استعمال ہُوا۔ اشْتَرَوُا۔ اِشْتِرَاءٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں خریدنا یعنی قیمت خرچ کر کے مال مقصود حاصل کرنا لیکن یہاں اس معنی میں استعمال ہُوا۔ کہ اپنی چیز کے بدلے میں غیر کی چیز لینا۔ اور اِشْتِرَاءٌ ایک چیز سے بے رغبتی اور دوسری چیز کے لالچ کرنے کو بھی کہہ دیتے ہیں۔ چونکہ راہ راست پر چلنا اور ایمان اختیار کرنا۔ یہ ہر مسلمان کا اپنا اصلی فرض ہے۔ پھر جبکہ کفار اور منافقین شیطان سے گمراہی سیکھ کر اس فرض کو چھوڑ بیٹھے اس لئے اُن لوگوں کے ہدایت چھوڑنے اور گمراہی اختیار کرنے کو خرید و فروخت سے بیان کیا گیا۔ اَلضَّلٰلَةَ اس کے چند معنی ہیں ظلم کرنا۔ درمیانی حالت سے ہٹ کر افراط و تفریط میں پڑ جانا۔ ہدایت کا گم ہو جانا۔ یہاں دین سے بہک کر بے دینی اختیار کرنا مراد ہے جس کے معنی ہیں گمراہی۔ لیکن یہی لفظ ضلالت جہاں کہیں انبیاء کرام کے لئے بولا گیا ہے۔ وہ وارفتگی یا جذب وغیرہ کے معنی میں ہے۔ جو انبیاء کرام کو گمراہ جانے وہ سخت بے دین ہے۔ اس مسئلہ میں ہم نے ایک مستقل کتاب لکھی جس کا نام ہے "قہر کبریا بر منکرین عصمت انبیاء"۔ اس کی پوری تحقیق کیلئے اُس کا مطالعہ کرو۔ بِالْهُدٰى عربی زبان میں لین دین کے معاملات میں بؔ اُس پر آتی ہے جس کو چھوڑنا مقصود ہو (یعنی قیمت) تو آیت کے معنے یہ ہوئے۔ کہ انہوں نے ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کر لی۔ ہدایت کے معنی اور اس کے اقسام ہم سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔ فَمَا رَبِحَتْ رِبْحٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں نفع اپنی اصل پونجی کے علاوہ جو کچھ حاصل ہو۔ وہ منافع یا ربح کہلاتا ہے۔ تِجَارَتُ خرید و فروخت کے کاروبار کو کہتے ہیں۔ اسی طرح جو شخص یہ کاروبار کرتا ہو۔ اُسے تاجر یعنی بیوپاری کہا جاتا ہے۔ جو شخص کہ کبھی کوئی چیز فروخت کرے اُسے بائع کہتے ہیں نہ کہ تاجر وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ کے دو معنی ہو سکتے ہیں **ایک** یہ کہ وہ پہلے ہی سے اس تجارت سے ناواقف تھے۔ اس لئے وہ نفع تو کیا کماتے اصل پونجی بھی ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ **دوسرے** یہ کہ وہ اس تجارت میں ہدایت پانے والے نہ ہوئے۔ یعنی اور تجارتوں میں تو خوب ہوشیاری سے کام کرتے ہیں۔ مگر اس تجارت میں ایسے بیوقوف بنے کہ بجائے نفع حاصل ہونے کے اُن کے اصلی مال کو بھی زوال آ گیا **خلاصہ تفسیر** حق تعالےٰ کی طرف سے انسان کو عقل ملتی ہے۔ اور پھر نیک و بد راستے اُس کے سامنے ہوتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنی عقل سے کام لیکر اچھے راستے کو اختیار کرے۔ اور بُرے سے بچے۔ ان منافقوں نے اپنے اندر بُرے اخلاق پیدا کر کے اُس نور عقل کو بجھا دیا۔ اور ہمیشہ کی مصیبتوں کو مول لے لیا۔ انہوں نے کلمہ توحید کی صرف یہ قیمت جانی۔ کہ اُس کے ذریعہ دنیاوی نفع حاصل کر لئے۔ حالانکہ آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں اُن نفعوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ تو اِن لوگوں نے عقل اور کلمۂ توحید کو دنیا کے لئے خرچ کیا اور پھر اس پر خوش بھی ہوئے۔ اُن کی مثال بالکل ایسی ہوئی۔ کہ کوئی احمق قیمتی موتی دے کر مٹی کا کھلونا خرید لے۔ یا اصلی سونا دیکر ولایتی نقلی سونا لے۔ تجارت کے اصول سے یہ لوگ بہت گھاٹے میں رہے۔ عقل مند لوگ اپنی عقل مال جان۔ اولاد۔ صرف کر کے سچا ایمان لیتے ہیں۔ اور وہ واقعی عقلمند بیوپاری ہیں۔ کیونکہ فانی کے عوض باقی حاصل کرتے ہیں۔ **فائدے** اس آیت سے معلوم ہُوا۔ کہ بیع تعاطی جائز ہے۔ یعنی بغیر منہ سے بولے محض لین دین سے کوئی چیز خرید لینا کیونکہ منافقین نے اپنے منہ سے خرید و فروخت کے الفاظ نہ بولے تھے۔ محض ہدایت چھوڑ کر گمراہی اختیار کی تھی۔ اس کو قرآن کریم نے خریدنا فرمایا۔ تو معلوم ہُوا۔ کہ اگر کوئی شخص قیمت دیکر چیز لے لے اور بیچنے والا بھی اس پر راضی ہو جائے تو بیع ہو جائے گی۔ اور یہ بھی معلوم ہُوا کہ جو شخص بڑے سے بڑے دنیوی نفع کو چھوڑ کر دینی معمولی نفع حاصل کرے۔ وہ کامیاب تاجر ہے۔ اور اس کا برعکس کرنے والا محض بیوقوف۔ کیونکہ دنیا بھر کے نفع آخرت کے معمولی

نفع کے مقابل ہیچ ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص دینی کام ریاکاری کیلئے کرتا ہے۔ وہ نہایت ہی بیوقوف ہے۔ کیونکہ وہ بھی انہیں منافقین کی طرح ہے جنہوں نے محض مسلمانوں کو راضی کرنے کیلئے کلمہ پڑھا تھا۔ دینی کاموں کی قیمت اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص نوافل ادا کرے۔ اور واجبات و فرائض میں غفلت کرے وہ بیوقوف ہے بعض لوگ کثرت سے وظیفے پڑھتے ہیں لیکن فرض نماز زکواۃ اور روزوں وغیرہ کی پرواہ نہیں کرتے وہ سخت غلطی پر ہیں۔ فرض نماز اصل پونجی ہے۔ اور نوافل اُس کا نفع۔ اصل پونجی کھو کر نفع کے چند پیسے حاصل کرنا کونسی عقلمندی ہے۔ (تفسیر روح البیان یہی مقام) یہ بھی معلوم ہوا کہ مجبوری نیکی کرنے کا کوئی ثواب نہیں۔ ثواب اُسی نیک عمل کا ملے گا۔ جو انسان دلی رغبت اور خوشی سے کرے۔ کیونکہ منافقین کلمہ اور نماز وغیرہ مجبوراً پڑھتے تھے۔ اس لئے انہیں کچھ فائدہ حاصل نہ ہوا۔ مثنوی شریف میں ہے۔

اختیار آمد عبادت را نمک ۔۔۔ ورنہ میگرد و بنا خواہ ایں فلک

ائتیا کرہاً مہار عاقلاں ۔۔۔ ائتیا طوعاً مہار بے دلاں

یعنی رغبت عبادت کا نمک ہے مجبوراً تو چاند سورج وغیرہ سب حرکت کر رہے ہیں۔ مگر انہیں اس پر کوئی ثواب نہیں۔

**تفسیر صوفیانہ** انسان کے لئے دو ہدایتیں ضروری ہیں۔ ایک فطری ہدایت جو کہ عالم ارواح میں مل چکی ہے۔ اور جس پر ہر بچہ پیدا ہوتا ہے۔ دوسری کسبی جو دنیا میں اللہ والوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے جو شخص ان دونوں ہدایتوں کو پالے وہ نورٌ علی نور ہے۔ جو اس دوسری ہدایت سے محروم رہا اُس کی پہلی ہدایت بیکار ہے۔ جیسے کہ آفتاب اور آنکھ کا نور مل کر فائدہ مند ہوتے ہیں۔ اگر آفتاب تو نور دے رہا ہو اور کسی کی آنکھ میں نور نہ ہو۔ تو وہ کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ یا آنکھ میں نور موجود ہے لیکن دوسرا نور اُس کو حاصل نہیں یعنی وہ اندھیرے میں ہے۔ وہ بھی دیکھنے سے محروم۔ ان منافقوں کو پہلا نور یعنی ہدایت فطری حاصل تھی لیکن نور مصطفائی سے علیحدہ رہے۔ اُس فطری کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کی لہٰذا اس تجارت میں کامیاب نہ ہوئے **حکایت** مثنوی شریف میں اسی کے مطابق ایک نہایت بہتر حکایت بیان فرمائی۔ وہ یہ کہ ایک شکاری ترکش میں تیر لے کر باز کے شکار کیلئے نکلا۔ باز ہوا میں اڑتا ہوا ملا جس کا سایہ زمین پر پڑ رہا تھا۔ اُس نے تاک تاک کر اُس سایہ پر تیر چلائے یہاں تک کہ سارا ترکش خالی ہو گیا۔ مگر باز ہاتھ نہ آیا۔ محروم واپس ہوا۔ اپنے کسی دوست سے کہنے لگا۔ کہ میں نے صحیح نشانے پر تیر لگائے۔ مگر باز نہ مرا۔ کیا وجہ ہوئی۔ اُس نے کہا اے بیوقوف جس کو تو نے نشانہ بنایا وہ باز نہ تھا بلکہ باز کا سایہ تھا۔ اصل باز اوپر تھا۔ جہاں تیری نگاہ نہ پہنچ سکی۔ ان منافقین نے بھی اسی طرح اپنے ترکش کے سارے تیر دنیا کے لئے استعمال کئے۔ لہٰذا دین اُن کے ہاتھ نہ آیا قیمتی تیر بھی برباد گئے۔

**اعتراض** جب اِن منافقین کے پاس ہدایت تھی ہی نہیں۔ تو اُس کے بدلے میں گمراہی کیونکر خریدی **جواب** اس کا جواب عالمانہ اور صوفیانہ تفسیروں سے معلوم ہو چکا۔ وہ یہ کہ انہوں نے فطری ہدایت کے بدلے میں گمراہی خریدی۔ یا کسبی ہدایت حاصل کرنے کا ان کو موقع تو ملا لیکن اُس کو چھوڑ کر گمراہی حاصل کی۔ یا انہوں نے کلمہ طیبہ زبان سے پڑھا۔ نماز روزے ادا کئے۔ اگر وہ چاہتے تو اپنے اِن اعمال سے جنت حاصل کر لیتے لیکن انہوں نے دنیا حاصل کی۔ لہٰذا خرید و فروخت کے معنی اُن پر بخوبی چسپاں ہو گئے۔

## مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ

کہاوت اُن کی ۔ مثل ۔ اُس کے ہے ۔ کہ روشن کی ۔ آگ ۔ پس جبکہ ۔ روشن ہو گئی ۔ وہ جگہ ۔ اندگرد اُس کے ۔ لے گیا

اُن کی کہاوت اُس کی طرح ہے جس نے آگ روشن کی۔ تو جب اُس سے آس پاس جگمگا اٹھا

## اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾

اللہ ۔ نور ۔ اُن کا ۔ اور ۔ چھوڑ دیا اُن کو ۔ میں ۔ اندھیروں ۔ نہیں ۔ دیکھتے

اللہ اُن کا نور لے گیا۔ اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا۔ کہ کچھ نہیں سوجھتا

**تعلق.** اس سے پہلے منافقین کے عیوب بیان کئے گئے. اب اُن کو اور زیادہ ظاہر کرنے کے لئے ایک مثال دیکر سمجھایا گیا کیونکہ مثال سے مشکل بات بھی بہت جلد سمجھ میں آجاتی ہے. مثال دو طرح کی ہوتی ہے. ایک مفرد کی مفرد سے جیسے کہ زید کو شیر سے تشبیہ دینا اور ایک قصے کی قصے سے. پہلی قسم کو تشبیہ اور دوسری کو مثال کہا جاتا ہے. **تفسیر مَثَلُهُمْ** مَثَلٌ کے لغوی معنی ہیں مثل اور مانند لیکن اصطلاح میں اُس مشہور کہاوت کو کہتے ہیں. جو عجیب چیز کے لئے بیان کی جائے. جیسے اُردو میں بے درد آدمی کے لئے بولتے ہیں. کہ جس کے نہ نکلی ہو بیائی. وہ کیا جانے پیر پرائی یعنی جو کبھی مصیبت میں گرفتار نہ ہو. وہ مصیبت زدوں کے درد کو کیا جانے. یہاں یہی معنی مراد ہیں چونکہ دلائل سے فقط عقلمند بات سمجھتے ہیں. مگر مثالوں سے بیوقوف بھی سمجھ جاتے ہیں. اس لئے قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں بے شمار مثالیں بیان فرمائی گئیں. توریت و انجیل میں تو مثالوں کی پوری سورتیں تھیں جن کا نام تھا سورۃ الامثال **كَمَثَلِ** اس میں کاف زائدہ ہے. کیونکہ کاف کے معنی بھی مثل ہی ہیں. جب مثل پر داخل ہوا تو اُس نے کچھ معنی نہ دیئے جیسے **لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ** میں یا اس جگہ مثل بمعنی حالت کے ہیں. تو کاف اپنے معنی میں ہے. آیت کریمہ کے یہ معنی ہوئے. کہ منافقین کی عجیب حالت اُن لوگوں کی حالت کی طرح ہے الخ **الَّذِي** یہ لفظ صورتاً واحد ہے اور معناً جمع کیونکہ اس سے پہلے **مَثَلُهُمْ** آچکا. اور اس کے بعد بھی **بِنُوْرِهِمْ** آرہا ہے. یعنی اُس جماعت کی طرح ہے. جیسے قرآن پاک میں آتا ہے. **وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا. اِسْتَوْقَدَ.** وَقُوْدٌ سے بنا ہے. جس کے معنی ہیں آگ کا بھڑکنا. اور اس سے شعلے نکلنا. ایندھن کو بھی اسی لئے وَقُوْدٌ کہتے ہیں. کہ اس سے آگ بھڑکتی ہے. تو مطلب یہ ہوا. کہ اُن لوگوں نے خوب تیز آگ جلائی اور اُسے خوب بھڑکایا. **نَارًا.** نُوْر سے بنا ہے جس کے معنی ہیں تڑپنا اور حرکت کرنا چونکہ آگ میں بھی تڑپ اور حرکت ہے. اس لئے اُسے نار کہتے ہیں پھر چونکہ آگ میں روشنی بھی ہے. اس لئے روشنی کو نور کہہ دیا گیا ہے. اور مینارے کو بھی اس لئے مینارہ بولتے ہیں. کہ اُس پر اذان دی جاتی ہے. اور اُس کو دور سے دیکھ کر لوگ منزل کا پتہ لگا لیتے ہیں. چونے کو نورہ کہتے ہیں. اس لئے کہ وہ بال اڑا کر بدن کو چمکا دیتا ہے. غرضکہ نور کا استعمال دو معنی میں ہوگیا. ایک حرکت اور تڑپ دوسرے روشنی چمک یا ظہور. **فَلَمَّآ اَضَآءَتْ. اَضَآءَتْ.** ضَوْءٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں. تیز روشنی نور اور ضوء میں یہ فرق ہے. کہ نور ہلکی روشنی کو بھی کہہ دیتے ہیں. مگر ضوء تیز ہی پر بولا جاتا ہے. اس لئے قرآن کریم نے آفتاب کو ضیاء اور چاند کو نور فرمایا. **نیز** نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن شریف کو بھی اسی لئے نور فرمایا گیا. کہ اُن سے ہر ایک فیض حاصل کرسکتا ہے. وہ مثل سورج کے جلالی نہیں. جو کہ آنکھوں کو خیرہ کردے. یہاں **اَضَآءَتْ** لازم بھی ہوسکتا ہے. اور متعدی بھی اگر لازم ہو تو یہ معنی ہوں گے. کہ بس جبکہ چمک گئی. آس پاس کی جگہ. اگر متعدی ہو. تو یہ معنی ہوں گے. کہ بس جب خوب چمکا دیا اُس آگ نے آس پاس کی جگہ کو. **مَا حَوْلَهٗ** لفظ حَوْل کے معنی ہیں گھومنا اسی لئے برس کو بھی حَوْل کہتے ہیں. کہ وہ گردش کرتا رہتا ہے. اصطلاح میں حول ملی ہوئی چیز کو کہتے ہیں **نیز** اس کے معنے بدلنے کے بھی ہیں. اسی لئے قرض منتقل کرنے کو حوالہ کہتے ہیں. اور کسی چیز کی جستجو کرنے کو بھی محاولہ کہتے ہیں. یہاں دوسرے معنی مراد ہیں. یعنی قریب کی جگہ. **ذَهَبَ اللّٰهُ.** عربی زبان میں **ذَهَبَ بِهٖ** اور **اَذْهَبَهٗ** کے ایک ہی معنی ہیں یعنی اُس کو لے گیا. لیکن **ذَهَبَ بِهٖ** وہاں بولا جاتا ہے. کہ جہاں بالکل لے گیا ہو. اور واپسی کی امید نہ ہو. اور **اَذْهَبَ** میں یہ دونوں باتیں نہیں کہتے ہیں **ذَهَبَ السُّلْطَانُ بِمَالِهٖ** بادشاہ نے اُس کا سارا مال بالکل ضبط کرلیا یعنی کچھ نہ چھوڑا. اور اُس کی واپسی کی بھی امید نہیں. قرآن کریم نے یہی لفظ یہاں استعمال فرمایا. تاکہ معلوم ہو کہ رب نے اُن کا نور بالکل بجھادیا. اب اُن کے منور ہونے کی کوئی امید نہیں. اس **ذَهَبَ** کو اللہ کی طرف اس لئے نسبت کیا گیا. تاکہ معلوم ہو کہ منافقین کی آگ کسی عارضے سے نہیں بجھی. کہ وہ دوبارہ جلا سکیں. بلکہ خود اللہ نے بجھائی ہے. جسے اللہ بجھادے اُسے کون روشن کرے. **بِنُوْرِهِمْ** نور کے معنی ہیں. روشنی یعنی جو خود ظاہر ہو. اور دوسرے کو ظاہر کرے. اسکا مقابل

ہے ظلمت جس کے معنیٰ ہیں تاریکی۔ نور کی نسبت منافقوں کی طرف اس لئے کی گئی کہ وہ اس سے فائدہ حاصل کر رہے تھے۔ وَتَرَكَهُمْ اس لئے فرمایا گیا تاکہ معلوم ہو کہ ان کی آگ بالکل ہی بجھا دی گئی جس سے کہ وہ پورے طور پر اندھیرے میں رہ گئے فِي ظُلُمٰتٍ۔ ظُلُمٰتٌ کی جمع ہے۔ اس کے لغوی معنیٰ ہیں۔ کم ہونا۔ برف کو اسی لئے ظلم کہتے ہیں۔ کہ وہ بہت جلد گل کر کم ہو جاتا ہے۔ ستانے کو بھی ظلم اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اس کی وجہ سے ظالم کے نیک اعمال برباد ہو کر کم ہو جاتے ہیں۔ نیز ظلم دانت کے پانی۔ اور اس کی تری اور اس کی سفیدی کو بھی کہتے ہیں۔ (تفسیر کبیر) مگر یہاں اس سے مراد ہے تاریکی۔ ظلمات جمع اس لئے بولا گیا۔ کہ منافقین صرف ایک تاریکی میں نہ تھے۔ بلکہ بہت سی تاریکیوں سے گھرے ہوئے تھے۔ ایک تو کفر کی تاریکی دوسرے مکر و فریب کی تیسرے جھوٹ بولنے کی چوتھے مسلمانوں پر طعنہ زنی کی۔ پانچویں جہل مرکب کی۔ چھٹے گناہوں اور شہوتوں کی وغیرہ وغیرہ لَا يُبْصِرُونَ میں تاریکیوں کا ہی بیان ہے یعنی انہیں اندھیرے میں اس طرح چھوڑ دیا۔ کہ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ **خلاصہ تفسیر** مدینہ منورہ کے لوگ اول تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر خوش ہوئے۔ اور بہت سے لوگوں نے کلمہ پڑھ لیا۔ لیکن ان میں سے بعض نے دنیاوی اغراض و مقاصد کی بنا پر بعد میں منافقت شروع کر دی۔ تو ان کی اس حالت کو اس جماعت کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ کہ جو اندھیرے جنگل میں گھر گئی ہو۔ پھر انہوں نے روشنی اور گرمی حاصل کرنے اور درندوں سے بچنے کے لئے خوب آگ بھڑکائی جب آگ بھڑکنے لگی اور انہوں نے گرمی اور نور بھی حاصل کر لیا۔ تب وہ اس پر مطمئن ہو گئے۔ کہ اب آگ نہ بجھے گی۔ اور ہم اس کے فوائد سے محروم نہ ہوں گے۔ وہ اسی خیال میں تھے۔ کہ اچانک آگ بالکل بجھ گئی۔ اور ایسی بجھی کہ اس کا کوئی شعلہ اور چنگاری بھی باقی نہ رہی۔ کہ جس سے دوبارہ آگ جلا لیں۔ اور نہ ہی ایندھن آگ قبول کرنے کے قابل رہا۔ اب یہ حیران و پریشان ہیں۔ کہ کیا کریں۔ اور کدھر جائیں۔ اسی طرح ان منافقین نے مسلمانوں کے خوف اور ان کے نفع کی امید سے بظاہر اسلام قبول کر لیا۔ جو مثل آگ جلانے کے ہوا۔ حق تعالیٰ کی طرف سے بھی ان پر ظاہری اسلامی احکام جاری کر دیئے گئے۔ یہ اس آگ کی روشنی ہوئی۔ منافقین مطمئن ہو گئے۔ کہ جس طرح ہم نے اس زبانی کلمے اور ظاہری اسلام سے دنیا میں کام نکال لیا۔ آخرت میں بھی کام بنا لیں گے۔ یہ ان کا اس ظاہری روشنی پر اعتماد ہوا۔ وہ اسی خیال میں تھے۔ کہ اچانک ان کو موت نے آ دبایا۔ یہ اس آگ کا گل ہونا ہوا۔ مرتے ہی آنکھ کھل گئی اور بزبان حال یوں کہنے لگے۔ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

جب قبر میں پہنچے تو معلوم ہوا۔ کہ ان کا ظاہری اسلام کا چراغ یہاں کچھ کام نہ آیا۔ اب ان کو نہ تو نیک اعمال کرنے کا موقعہ رہا۔ اور نہ وہاں سے لوٹنے کی کوئی صورت رہی۔ کہ دنیا میں آ کر نیکیاں کر جائیں۔ یہ اس کی مثال ہوئی۔ کہ دوبارہ آگ جلنے کے قابل نہ رہی **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ جو چیز کہ نام و نمود کے لئے ہو وہ دنیا ہے۔ اور اس کا فائدہ عارضی اور جو حق تعالیٰ کے لئے ہو وہ عین دین ہے۔ اور اس کا فائدہ لازوال جو نماز روزہ وغیرہ دکھلاوے کیلئے ہو۔ وہ بالکل دنیا ہے۔ اور جو دنیوی کاروبار بھی سنت پر عمل کی نیت سے کئے جائیں۔ وہ دین۔ دیکھو منافقین کے سارے اعمال دنیا بن کر رہ گئے۔ **دوسرے** یہ کہ کوئی شخص اپنے ان اعمال پر بھروسہ نہ کر بیٹھے جب تک کہ اس کو خاتمہ بالخیر میسر نہ ہو جائے۔ اس جگہ اعمال کی بہت ڈکیتیاں ہوتی ہیں۔ ہندی میں ایک مثل ہے ہری ہری کھیتی اور گابھن گائے جب جانو جب منہ تک جائے **تیسرے** یہ کہ ظاہری اعمال قالب ہیں۔ اور نیت اخلاص مثل قلب۔ کہ قالب بغیر قلب بیکار ہے۔ اور اعمال بغیر صحیح نیت کے بے فائدہ **تفسیر صوفیانہ** خالص آگ پائدار اس کی گرمی قابل اعتبار اور اس کا نور برقرار ہے جیسے کہ کرۂ نار اور انسانی مزاج کے خلط کی آگ، کہ نہ تو اس کے لئے ایندھن کی ضرورت اور نہ اس کے بجھنے کا بفضلہ تعالیٰ اندیشہ لیکن غیر خالص آگ۔ نہ تو خود پائدار نہ اس کی گرمی کا اعتبار اور نہ ہی اس کے نور کو قرار جیسے کہ دنیا کی عام آگ کہ یہ ایندھن کی محتاج اور ہوا۔ پانی ہی سے اس کے بجھنے کا ہر وقت اندیشہ۔ کیونکہ یہ خالص نہیں اس میں مٹی کے اجزا ہیں۔ اسی طرح خالص ایمان ان شاء اللہ پائدار ہے۔ اس کی حرارت ثابت رہنے والی۔ جیسا کہ قرآن کریم فرما رہا ہے

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ اللہ تعالےٰ مسلمانوں کو اس کلمہ طیبہ پر زندگی، موت قبر و حشر میں ثابت رکھے گا۔ اسی طرح اس کا نور زندگی و قبر اور حشر میں برقرار۔ قرآن شریف فرماتا ہے۔ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ یعنی قیامت میں مسلمانوں کا نور اُن کے آگے آگے چلے گا۔ انشاءاللہ حقیقی و خالص ایمان کی آگ کے بجھنے کا اندیشہ نہیں۔ منافقین کا ایمان چونکہ خالص نہ تھا بلکہ ریاکاری اور دنیوی اغراض سے مخلوط تھا۔ لہذا بجھ گیا۔ **نیز** یہ منافقین ایمان پر تو کیا ثابت رہتے کم بخت اپنے کفر پر بھی پورے طور پر قائم نہ رہے۔ **نکتہ** صوفیاء کرام فرماتے ہیں۔ کہ آفتاب کی شعاعوں سے کپڑا نہیں جل سکتا۔ لیکن آتشی شیشے کے ذریعہ سے جل جاتا ہے۔ اسی طرح توحید کی شعاعیں کفر و فسق کے خرمن کو نہیں جلاتیں جب تک کہ نبوت کے آتشی شیشے میں سے چھن کر نہ آئیں۔ پھر نبوت کی شعاعیں بھی دل کی خواہشوں اور سامان گناہ کو نہیں جلاتیں جب تک کہ کسی وَلی کے شیشے میں سے چھن کر نہ آئیں۔ توحید کی تاثیر کیلئے نبوت کی آڑ ضروری ہے اور نبوت کی تاثیر کے لئے ولی کا دامن درکار۔ یہ منافقین توحید کے قائل تھے۔ مگر نبوت اور ولایت سے علیحدہ لہذا اُن کا نور بجھ گیا۔ اِس آیت سے شیطانی توحید کے حامی دیوبندیوں اور وہابیوں کو عبرت پکڑنی چاہئیے ؎

اَلرُّوْحُ فِدَاكَ فَزِدْ حَرَقًا ایک شعلہ دگر برزن عشقا  میرا تن من دھن سب پھونک دیا یہ جان بھی پیارے جلا جانا

عشق کی آگ وہ آگ ہے۔ جو محبوب کے سوا کو جلا ڈالتی ہے۔ اللہ وہ آگ نصیب کرے۔ آمین

**اعتراض** یہ مثال اس جگہ بظاہر چسپاں نہیں ہوتی کیونکہ منافقین کا دھوکے کیلئے کلمہ پڑھنا عین بے ایمانی تھا۔ اُن کو اوّل ہی سے ایمان کا عارضی نور حاصل نہ ہُوا پھر بجھانے کے کیا معنیٰ۔ اور مثال میں اُن لوگوں کا ذکر ہے۔ کہ جنہوں نے آگ جلا تو لی مگر بعد میں بجھ گئی۔ **جواب** چونکہ منافقین نے اس ظاہری کلمے سے مسلمانوں کی تلوار اور جزیہ سے امن پالی۔ اور اُن کے ساتھ غنیمتوں اور جہادوں اور نمازوں میں شریک ہو گئے۔ یہ اُس کلمے کا عارضی نور تھا۔ جو اُن کو حاصل ہو گیا۔ لیکن چونکہ مرنے کے بعد اُن کی یہ کلمہ گوئی کام نہ آئی۔ اس لئے نور کا بجھنا اُن پر خوب چسپاں ہو گیا۔ اس مثال میں چند جماعتیں شامل ہیں۔ ایک تو منافق جنہوں نے دل میں کفر رکھ کر اظہار ایمان کیا۔ دوسرے وہ جو مخلص مومن ہونے کے بعد مُرتد ہو گئے۔ تیسرے وہ جنہیں قدرت نے صحیح فطرت عطا فرمائی اور دلائل نے اُن پر حق واضح کر دیا۔ مگر انہوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔ (تفسیر خزائن العرفان)

| صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ |
| --- |
| بہرے گونگے اندھے پس وہ نہیں لوٹیں گے۔ |
| بہرے گونگے اندھے تو وہ پھر آنے والے نہیں۔ |

**تعلق** اس میں اعلےٰ کی طرف ترقی ہے یعنی پہلی آیت میں فرمایا گیا۔ کہ منافقین اُن کی طرح ہیں۔ کہ جو آگ جلائیں اور اُن کی آگ بجھ جائے۔ اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ دنیوی آگ بجھنے پر فقط آنکھ بیکار ہو جاتی ہے۔ کان، زبان پر اُس کا کچھ اثر نہیں ہوتا لیکن منافقین کی آگ تو ایسی بجھی کہ جس سے ان کے کان، زبان، آنکھ، دل سب ہی بیکار ہو گئے۔ **تفسیر** صُمٌّ صَمَمٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کان کا بوجھ اور یہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہ کہ جس سے سننے کی قوت ہی جاتی رہے۔ دوسرے وہ کہ جس سے اونچا سنائی دینے لگے۔

بُكْمٌ زبان کی اُس بیماری کا نام ہے جس سے حروف ادا نہ کئے جا سکیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس سے حروف بگڑ کر ادا ہوں جس کو اُردو میں توتلا پن کہتے ہیں اور عربی میں عُقْدَةُ اللِّسَان دوسرے وہ جس سے بولنا ہی ناممکن ہو جس کو اُردو میں گونگا پن کہتے ہیں اور عربی میں خرس اور یہ دوسرے معنی ہی یہاں مراد ہیں عُمْيٌ آنکھ کی وہ بیماری ہے جس میں بینائی بالکل جاتی رہتی ہے جسے اُردو میں اندھا پن کہتے ہیں۔ پھر

اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک پیدائشی اندھاپن جس کو عربی میں کہتے ہیں۔ کَمَہٌ اور اس عارضے والے کو اَکْمَہ۔ دوسرے وہ کہ پہلے انکھیارا ہو بعد میں اندھا ہوا ہو۔ یہ آخری معنی یہاں مراد ہیں۔ پھر اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ سرے سے آنکھ ہی نہ ہو۔ جیسے عربی میں طَمَسٌ کہتے ہیں دوسرے یہ کہ آنکھ تو قائم ہو۔ مگر اُس میں روشنی نہ ہو یہی آخری معنی اس جگہ مراد ہیں۔ خیال رہے۔ کہ اس بیماری کی کل چار قسمیں ہوئیں۔ عُمْیٌ[1] طَمْسٌ[2] کَمَہٌ[3] عَمَہٌ[4]۔ عَمَہٌ جس کے معنی ہیں دن کا اندھا ہونا یَعْمَهُوْنَ اسی سے بنا ہے۔ اس جگہ عُمْیٌ سے مُراد آنکھ اور دل دونوں کا اندھاپن ہے۔ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ یعنی انسان کے راہ راست پر آنے کی تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اُس کی بینائی قائم ہو جس سے وہ راستہ دیکھ لے۔ دوسرے یہ کہ اُس میں بولنے کی طاقت ہو کہ کسی کو پکار کر اُس کی مدد سے راہ راست پر آجائے تیسرے یہ کہ اُسکے کان درست ہوں۔ کہ کسی ہادی کی آواز سن کر درست ہو جائے۔ جب اُن منافقین کی یہ تینوں قوتیں ختم ہوچکیں۔ تو اب ان کے کفر سے لوٹنے کی کوئی امید نہیں **خلاصۂ تفسیر** مسلمانوں کو یہ امید ہوگی۔ کہ شاید منافقین کبھی تو ہدایت پر آجائیں۔ اس لئے وہ ان کو ہدایت پر لانے کی کوشش بھی کرتے ہوں گے۔ اور پھر اپنی ناکامی پر رنجیدہ ہوتے ہوں گے حق تعالیٰ نے مسلمانوں کے اس رنج وغم کو دُور فرمانے کیلئے اُن کے ایمان سے مایوس فرمادیا۔ اور فرمادیا کہ اے مسلمانو! یہ تو بہرے گونگے اندھے ہو چکے ہیں۔ اب تم ان کے ایمان لانے کی بالکل امید نہ رکھو۔ وہ اپنی ان حرکتوں سے ہرگز باز نہ آئیں گے۔ چونکہ ناامیدی بھی ایک راحت ہوتی ہے۔ اس لئے مسلمان اُن کے ایمان سے ناامید ہو کر انتظار کی تکلیف سے بچ گئے۔

**فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ اللہ کے نزدیک وہ ہی عضو کام کا ہے۔ جو اپنے مقصود کو پورا کرے۔ اور جس میں یہ صفت نہیں وہ محض بیکار ہے۔ چونکہ زبان حق بولنے۔ کان حق سننے۔ اور آنکھیں حق دیکھنے کے لئے عطا فرمائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ جو بھی دنیاوی کام ان سے لئے جاتے ہیں وہ سب تابع ہیں جب ان اعضائے اپنا اصلی کام نہ کیا۔ تو اُن کو بیکار کہا گیا۔ اولیاء اللہ اور شہدا اگرچہ بظاہر وفات پاجاتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم فرماتا ہے۔ کہ وہ زندہ ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی کے مقصود کو پورا کر دیا۔ جیسے کہ سرکاری ملازم سرکاری کام کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں۔ اور اُن کے آرام وآسائش کے لئے بڑی تنخواہ عمدہ مکان سواریاں وغیرہ کا انتظام حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اصل مقصود تو خدمت سرکار ہے۔ یہ موٹر اور کوٹھی وغیرہ اُس کے لئے ہے۔ جو نوکر آرام کرے۔ اور کام نہ کرے۔ وہ شاہی نوکر ہی نہیں رہے۔ اور نہ تنخواہ پانے کا مستحق۔ لیکن جس نے اپنی خدمت کے زمانہ میں بخوبی خدمت کی بعد میں اُس کی پنشن ہوگئی۔ اگرچہ وہ اب کوئی خدمت نہیں کر رہا۔ مگر ملازم سرکار ہے۔ یہ کفار اور منافقین کام چور نوکر ہیں۔ اور یہ وفات شدہ اولیاء اللہ پنشن یافتہ سرکاری عہدہ دار۔

**دوسرے** یہ کہ جو حق تعالیٰ کی طرف بخوشی رجوع کرتا ہے۔ وہ اُس کی بارگاہ میں عزت وکرامت سے بلایا جاتا ہے۔ کہ مرتے وقت اُس کو کہا جاتا ہے۔ کہ اِرْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً یعنی اے مبارک روح اپنے رب کی طرف چل کہ تو اُس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی اور جو کہ بخوشی اُس طرف رجوع نہیں کرتے۔ انجام کار ان کو بھی وہیں جانا پڑے گا۔ مگر ہتھکڑی اور بیڑی کے ساتھ۔ اور ان کے لئے فرمایا گیا۔ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ط یعنی ہم اُن کو قیامت کے دن اُن کے چہروں کے بل اندھا۔ گونگا۔ بہرا اُٹھائیں گے۔ **صوفیاء کرام** فرماتے ہیں۔ کہ تین چیزیں دل کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہیں۔ [1] اعضاء کو گناہوں میں مشغول رکھنا [2] ریا سے عبادت کرنا۔ [3] خالق کو چھوڑ کر خلق سے امید رکھنا۔ یہ بیماری تپ دق کی طرح اوّلاً تو ہلکی معلوم ہوتی ہے لیکن آخر میں مہلک ثابت ہوتی ہے ؎

آباد وہی دل ہے کہ جس میں تمہاری یاد ہے　　جو یاد سے غافل ہو ویران ہے برباد ہے

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ

یا ۔ مثل تیز بارش ۔ سے ۔ آسمان ۔ میں اُس ۔ اندھیریاں ۔ اور ۔ گرج ۔ اور ۔ چمک ہے ۔ کرتے ہیں ۔ اُنگلیاں اپنی

یا جیسے آسمان سے اُترتا پانی کہ اُس میں اندھیریاں ہیں۔ اور گرج اور چمک اپنے کانوں میں اُنگلیاں

فِیْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِیْطٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹﴾

میں کانوں اپنے سے کڑک خوف سے موت کے اور اللہ گھیرنے والا ہے کو کافروں

ٹھونس رہے ہیں کڑک کے سبب موت کے ڈر سے اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

**تعلق**۔ پہلی آیت میں منافقوں کی ایک کہاوت بیان کی گئی تھی۔ یہ انہیں کی دوسری کہاوت ہے۔ اس میں اور اُس میں یہ فرق ہے کہ وہاں تو آگ جلاکر روشنی حاصل کرنے کا ذکر تھا۔ اور یہاں بجلی سے ملنے کا تذکرہ۔ وہاں تو معمولی وحشت اور خوف کا ذکر ہوا تھا۔ اور یہاں سخت گھبراہٹ پریشانی کا بیان ہوا۔ لہٰذا یہ کہاوت پہلی سے اعلیٰ ہے۔ چند کہاوتوں سے فائدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اصل چیز ہر ایک کے سمجھ میں بخوبی آجاتی ہے۔ **شانِ نزول** منافقوں میں سے دو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے مشرکین کی طرف بھاگے۔ راستے میں یہی بارش آگئی جس کا اس آیت میں ذکر ہو رہا ہے۔ اُس میں سخت گرج اور چمک تھی۔ اِن کا یہ حال ہوا۔ کہ جب گرج ہوتی تو کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیتے۔ کہ کہیں اس سے ہمارے کان نہ پھٹ جائیں۔ اور جب چمک ہوتی تو چلنے لگتے۔ جب اندھیری ہو جاتی تو ٹھہر جاتے۔ آپس میں کہنے لگے۔ کہ شاید اس گناہ سے ہم پر یہ مصیبت آئی ہے۔ خُدا خیر سے سویرا کر دے۔ تو ہم حضور کی خدمت میں واپس جاکر اُن کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیں گے۔ رب نے اُن پر فضل فرمایا اس مصیبت سے نجات دی۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ کہ سچے مسلمان بن گئے۔ اور پھر اسلام پر صحیح معنی میں قائم رہے۔ اس موقعہ پر یہ آیت کریمہ اتری۔ حق تعالیٰ نے اُن کے اس واقعہ کو باقی منافقین کے لئے کہاوت بنایا۔ اور اس قصے کو اُن کی روش پر منطبق فرمایا۔ (تفسیر خزائن العرفان)

**تفسیر** اَوْ عربی زبان میں شک کی جگہ اَوْ استعمال کرتے ہیں۔ جیسے اُردو میں "یا"۔ مثلاً کہا جائے۔ کہ زید آیا تھا یا عمر۔ لیکن حق تعالےٰ شک سے پاک ہے اس لئے اس اَوْ میں چند احتمال ہیں **ایک** یہ کہ اختیار کے لئے ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے۔ کہ لاری میں آنا یا ریل میں۔ یعنی تمہیں اختیار ہے۔ جس میں چاہو۔ آؤ۔ ایسے ہی یہاں فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اے مسلمان تجھے اختیار ہے۔ کہ خواہ تو منافقوں کے لئے پہلی کہاوت بیان کرے۔ یا دوسری۔ **دوسرے** یہ کہ منافق دو قسم کے تھے بعض اُن آگ والوں کی طرح اور بعض اِن بارش والوں کی مثل۔ لہٰذا یہ دو کہاوتیں دو جماعتوں کیلئے ہیں۔ **تیسرے** یہ کہ یہ اَوْ بلکہ کے معنے میں ہے یعنی منافقین اُن آگ والوں کی طرح بلکہ اِن بارش والوں کی طرح ہیں **چوتھے** یہ کہ یہ اَوْ واؤ کے معنی میں ہے۔ یعنی منافقین اُن کی اور اِن کی طرح ہیں۔ قرآن پاک میں اَوْ اِن سب معنی میں استعمال ہوا۔ (تفسیر کبیر) **کَصَیِّبٍ** صَیِّبٌ صَوْبٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ اترنا جھکنا اور ارادہ کرنا۔ سر جھکانے کو تَصْوِیْبُ الرَّاْسِ کہتے ہیں۔ لیکن یہاں پہلے معنے کا لحاظ ہے۔ اور یہاں صیب سے مراد یا تو تیز بارش ہے۔ (کیونکہ یہ اوپر سے گرتی ہے) اور یا بادل (کیونکہ یہ بھی نیچے جھک کر برستا ہے) **مِنَ السَّمَآءِ** سَمَآءٌ سَمُوٌّ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ اونچائی۔ بلندی آسمان کو سماء اسی واسطے کہتے ہیں۔ کہ وہ اونچا ہے۔ اور بادل کو بھی سماء کہتے ہیں۔ یہاں یا تو آسمان مراد ہے یا بادل۔ اگرچہ بارش اوپر ہی سے برستی ہے لیکن پھر بھی مِنَ السَّمَآءِ فرمادینے میں چند فائدے ہیں۔ **ایک** یہ کہ فلاسفہ کہتے ہیں۔ کہ بارش دریاؤں کا پانی ہے۔ جو گرمی پاکر بھاپ بن کر اوپر گیا اور وہاں ٹھنڈا ہو کر بادل بنا اور پھر برس گیا۔ اس میں اس کی تردید کردی گئی۔ کہ بارش زمین سے نہیں آتی بلکہ آسمان سے آتی ہے۔ کیونکہ بہت دفعہ گرمی ہوتی ہے۔ مگر بارش نہیں ہوتی۔ اور بارہا سخت سردی میں تیز بارش ہو جاتی ہے۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے تو اس کی کیا وجہ کہ کبھی چھوٹے قطرے گرتے ہیں۔ اور کبھی بڑے کبھی برف اور کبھی اولہ۔ اور اگر سب باتوں سے چشم پوشی کر کے مان بھی لیا جائے۔ کہ بارش سمندر سے ہوتی ہے۔ تو بتاؤ سمندر میں پانی کہاں سے آیا۔ یقیناً آسمان ہی سے آیا ہم کو خزانے سے روپیہ ملتا ہے۔ لیکن خزانہ میں ٹکسال سے روپیہ آتا ہے۔ تو آیت میں بارش کی ٹکسال کا ذکر فرمایا گیا (تفسیر روح البیان) میں سیدنا عبداللہ ابن عباس سے روایت کیا۔ کہ عرش کے نیچے ایک دریا ہے جس سے تمام حیوانات پر رزق اترتے ہیں۔ رب تعالیٰ کی مرضی کے مطابق تمام رزق آسمانوں سے گزرتے ہوئے۔ دنیاوی آسمان کی طرف پہنچتے ہیں۔ بادل مثل چھلنی کے ہے۔ کہ پانی آسمان سے آتا ہے۔ اور اس سے چھن کر زمین پر گرتا ہے۔ ہر قطرہ ایک فرشتہ لے کر آتا ہے۔ جو

زمین پر آہستہ سے رکھ جاتا ہے **دوسرا فائدہ** مِنَ السَّمَاءِ فرمانے میں یہ ہے۔ کہ اس میں اس جانب اشارہ ہو رہا ہے۔ کہ یہ بارش عالمگیر بارش تھی۔ یہ نہ تھا۔ کہ بعض جگہ ہو اور بعض جگہ نہ ہو **تیسرا فائدہ** یہ کہ فلاسفہ کے قول کے مطابق اگرچہ بارش زمین کے پانی سے ہوتی ہے مگر اس کے اسباب آسمان سے بنتے ہیں کیونکہ آفتاب کی گرمی سے پانی بخار بن کر اوپر چڑھتا ہے۔ اور وہاں کی ٹھنڈک سے جم کر بادل بن جاتا ہے۔ لہٰذا بارش آسمان ہی کے ذریعہ سے ہوئی **تتمہ** فلاسفہ کہتے ہیں کہ گرمی سے پانی بخار بن جاتا ہے۔ اور زمین کے اجزاء دھواں جیسے کہ لکڑی سے دھواں اور دیگچی سے گرم پانی بھاپ بن کر اڑتا ہے۔ یہ زمین کا دھواں جب ہوا کی حرکت سے آگے بڑھ کر کرۂ آگ تک پہنچ جاتا ہے۔ اور وہاں جاکر روشن ہو جاتا ہے۔ تو کبھی تو چند روز تک روشن رہتا ہے۔ اور دُمدار ستارے اور نیزے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اور کبھی روشن ہو کر جلد بُجھ جاتا ہے جس کو شہاب کہتے ہیں (تارہ ٹوٹنا) اور کبھی روشن نہیں ہوتا بلکہ جل جاتا ہے اور آسمان کی سرخی اور سیاہی بن کر نظر آنے لگتا ہے۔ اسی طرح بخار زمین سے اٹھ کر چند صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ ایک یہ کہ زیادہ اونچا ہو کر جم جاتا ہے۔ اور قطرہ قطرہ ہو کر زمین پر گر پڑتا ہے۔ اس جمے ہوئے بخار کو بادل اور ان قطروں کو بارش کہتے ہیں۔ اور کبھی یہ بخار زیادہ اونچا نہیں جاتا۔ بلکہ زمین کے قریب ہی سردی سے جم کر گر جاتا ہے۔ اس کو شبنم یا اُوس کہتے ہیں۔ اور کبھی سخت سردی کی وجہ سے یہ بخار راستہ ہی سے جم کر زمین پر گر پڑتا ہے۔ اس کو اولہ کہتے ہیں۔ یہ تو بخار اور دھوئیں کے علیحدہ علیحدہ حالات تھے **لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے۔** کہ آفتاب کی گرمی پاکر بخار۔ دھواں اور غبار مخلوط ہو کر زمین سے اوپر اٹھتے ہیں اور وہاں پہنچ کر علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ غبار الٹا واپس ہوتا ہے۔ اسی کا نام آندھی ہے۔ اور بخار اور دھواں ٹھنڈک کی حد کو پہنچتے ہیں۔ جہاں بخار ٹھنڈا ہو کر بادل بن جاتا ہے۔ اور دھواں اُس کو چیر کر اوپر جانا چاہتا ہے۔ کہ جس سے سخت آواز پیدا ہوتی ہے۔ اسی آواز کا نام اُردو میں گرج اور عربی میں رعد ہے۔ اور کبھی یہ دھواں تیز حرکت کی وجہ سے بھڑک کر روشن ہو جاتا ہے۔ اسی کو اُردو میں بجلی اور عربی میں برق کہتے ہیں اور کبھی بہت سردی کی وجہ سے یہ دھواں بھی جم کر زمین کی طرف لوٹتا ہے۔ یہ جما ہوا دھواں جب بادل کو چیرتا ہے۔ تو اس سے سخت آواز پیدا ہوتی ہے۔ اور زمین پر گر کر بہت سی چیزوں کو فنا کر دیتا ہے۔ اسی کو عربی میں صاعقہ اور اردو میں بجلی گرنا کہتے ہیں۔ اس کی قوت اس قدر ہے۔ کہ دریا میں گر کر مچھلیوں کو بھی جلا ڈالتا ہے بعض جگہ یہ بُجھی ہوئی بجلی لوہے کی شکل میں ملی ہے۔ یہ وہی پکا اور جما ہوا دھواں ہے۔ مگر ؎

دِل کے بہلانے کو لیکن یہ خیال اچھا ہے

یہ سب عقلی ڈھکوسلے ہیں لیکن حقیقت میں یہ تمام قدرت کے کرشمے ہیں۔ چونکہ فلاسفہ کے قول پر بھی ان سب چیزوں میں آفتاب کی گرمی کو پورا دخل ہے۔ اور وہ آسمان پر ہے۔ لہٰذا ان سب میں آسمانی اسباب کو دخل ہوا۔ اس لئے مِنَ السَّمَا اُن کے قول پر بھی خوب چسپاں ہو گیا فِيْهِ ظُلُمٰتٌ۔ فِیْہِ کی ضمیر صَیِّب کی طرف لوٹتی ہے۔ اگر اُس کے معنی بادل کے ہوں۔ تو آیت کا ترجمہ یہ ہو گا۔ کہ اُس بادل میں بہت تاریکیاں ہیں۔ اور اگر اس کے معنی بارش ہوں۔ تو یہ مطلب ہو گا۔ کہ اُس بارش میں بہت تاریکیاں ہیں۔ اور دونوں صحیح ہیں۔ وہ چند تاریکیاں یہ ہیں ۱؎ بادل کی تاریکی ۲؎ تیز بارش کی تاریکی ۳؎ رات کی تاریکی ۴؎ چاندنی نہ ہونے کی تاریکی۔ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ رعد بادل کی آواز۔ اور برق اُس کی چمک کو کہتے ہیں۔ اگر کہا جائے۔ کہ یہ چیزیں بارش میں ہیں۔ تو بھی صحیح ہے۔ کیونکہ ان دونوں کا اور بارش کا تعلق بادل سے ہے اور اگر کہا جائے۔ کہ یہ دونوں بادل میں ہیں۔ تو بالکل ظاہر ہے ترمذی شریف میں ہے۔ کہ ایک دفعہ یہودیوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ کہ رعد اور برق کیا چیز ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ رعد اُس فرشتے کا نام ہے۔ جو بادلوں پر مقرر ہے۔ اور یہ آواز اُسی فرشتے کی ہے۔ کہ جس سے وہ بادلوں کو چلاتا ہے۔ اور برق اُس کا آتشی کوڑا ہے جس سے بادلوں کو ہانکتا ہے تفسیر روح البیان نے لکھا۔ کہ وہ فرشتہ شہد کی مکھی کے مشابہ ہے مگر اُس کی قوت کا یہ حال ہے بعض روایات میں آتا ہے۔ کہ یہ آواز اُس فرشتے کی تسبیح ہے۔ اسی لئے اس آواز کو سُن کر تسبیح پڑھنی چاہیئے سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں۔ کہ جو شخص بادل کی کڑک اور گرج سُن کر یہ پڑھے سُبْحَانَ الَّذِیْ یُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِکَةُ مِنْ

خِيفَتِهٖ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ تو وہ شخص بجلی گرنے سے انشاءاللہ محفوظ رہے گا۔ اور فرماتے ہیں کہ اگر اُس پر بجلی گر جائے۔ تو میں اُس کی دیت (خون بہا) دینے کو تیار ہوں۔ یہ عمل نہایت مجرب ہے۔ اَصَابِعَهُمْ انسان کڑک سُن کر اپنے پوروے کانوں میں لگاتا ہے۔ نہ کہ پوری انگلیاں۔ لیکن یہاں فرمایا جا رہا ہے۔ کہ وہ اپنی پوری انگلیاں کانوں میں ڈالتے ہیں۔ یا تو اس لئے کہ انگلیوں سے پوروے ہی مراد ہیں۔ اور یا یہ مطلب ہے۔ کہ وہ خوف کے مارے ساری انگلیاں کانوں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مِنَ الصَّوَاعِقِ صواعق۔ صاعقۃ کی جمع ہے۔ صاعقہ اُس گرنے والی بجلی کو کہتے ہیں۔ جو کسی چیز پر گر کر اس کو جلا دیتی ہے۔ یعنی وہ لوگ بجلی گرنے کے اندیشہ سے اپنے کان بند کرتے ہیں۔
حَذَرَ الْمَوْتِ۔ حذر کے معنی ہیں۔ ڈر اور پرہیز یعنی بچنا۔ یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ یعنی موت کے ڈر کی وجہ سے یا موت سے بچنے کیلئے وَاللّٰهُ مُحِيطٌ اُس کے لفظی معنی یہ ہیں۔ کہ اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے کیونکہ محیط احاطہ سے بنا ہے جس کے معنے ہیں۔ کہ کسی چیز کے آس پاس اس طرح گھیر ڈال لینا کہ وہ بالکل درمیان میں آجائے۔ اور یہ بات حق تعالیٰ کے لئے ناممکن ہے کیونکہ وہ جگہ وغیرہ میں ہونے سے پاک ہے۔ اس لئے محیط وغیرہ کے معنی یہ ہوتے ہیں۔ کہ حق تعالیٰ کا علم اور قدرت ان کو گھیرے ہوئے ہے یعنی کوئی چیز اُس کے علم اور قدرت سے باہر نہیں۔ دیوبندیوں نے اس قسم کی آیات سے ثابت کیا۔ کہ حق تعالیٰ کی ذات ہر جگہ میں موجود ہے۔ لہٰذا نبی علیہ السلام کو ہر جگہ میں حاضر ماننا شرک ہے۔ یہ عقلمند اتنا نہ سمجھے کہ ہر جگہ میں تو وہ ہو جس کا جسم ہو اور جگہ میں آسکے حق تعالیٰ ان دونوں چیزوں سے پاک ہے۔ ہر جگہ میں بعض مخلوق ہی ہو سکتی ہے۔ خالق نہیں ہو سکتا جیسے کہ ملک الموت۔ منکر نکیر۔ فرشتہ کاتب تقدیر۔ چاند سورج اور سب کا نور نگاہ کی یہ چیزیں بیک وقت ہر جگہ موجود ہیں۔ اس مسئلہ حاضر ناظر کی تحقیق کیلئے ہماری کتاب جاء الحق کا مطالعہ کرو۔ بِالْكٰفِرِيْنَ سے یہ مقصود نہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کا علم صرف کافروں کو گھیرے ہوئے ہے نہ کہ مسلمانوں کو۔ وہ تو سب کو محیط ہے۔ لیکن چونکہ یہاں کافروں کا ہی تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس لئے انہیں کا ذکر فرمایا گیا **خلاصہ تفسیر** منافقین کی حالت کو دوسری نہایت نفیس کہاوت سے سمجھایا جا رہا ہے۔ کہ ان کی حالت اُن لوگوں کی طرح ہے۔ جو اندھیری رات میں سنسان جنگل طے کر رہے ہوں۔ کہ اچانک اُن کو نہایت کالا بادل آگھیرے۔ یہ لوگ سخت اندھیرے میں پھنس جائیں پھر اُس سے بارش اور سخت اور تیز بجلیاں اور گرج ظاہر ہو۔ گرج کو سُن کر تو اُن لوگوں کو اپنی موت کا اندیشہ ہو جائے جس سے وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے لگیں۔ کہ کہیں اس آواز سے ہمارے کان کے پردے نہ پھٹ جائیں۔ اور بجلی کی روشنی پاکر چلنے لگیں۔ اور اندھیرا ہو جانے پر کھڑے رہ جائیں۔ غرضکہ عجب کش مکش میں پھنس جائیں۔ اور وہ اسی حالت میں نہایت حیران و پریشان ہوں کچھ سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کیا کریں۔ اور کدھر جائیں یہی حال ان منافقین کا ہے۔ کہ یہ اپنی زندگی کی اندھیری رات میں دنیا کا جنگل طے کر رہے ہیں۔ کہ اچانک ان کے شہر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے۔ جو کہ رحمت الٰہی کا گہرا بادل ہیں۔ اور آپ پر قرآن کریم اترنے لگا جو مثل تیز بارش کے ہے جس طرح بارش تمام زمین کو سرسبز و شاداب بنا دیتی ہے۔ اور اُس میں باغ کھیت اور اُن میں پھل پھول لگا دیتی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی بارش نے دلوں کی زمین میں ایمان کے باغ لگا دیئے۔ اور اُن باغوں میں تقوے اور پرہیزگاری کے پھول کھلا دیئے۔ مگر اسی قرآن میں شرعی احکام اور جرموں کی سخت سزائیں۔ اور دنیا سے بے رغبتی کرنے کا حکم بھی ہے۔ جو کہ مثل گرج اور کڑک کے ہے۔ یہ منافقین کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ کہ کہیں یہ کلام ہمارے دلوں میں اثر نہ کر جائے جس سے کہ ہمارے دنیاوی عیش و آرام میں فرق آجائے۔ مال کی زکوٰۃ دینی پڑ جائے۔ جہاد میں اسلام پر جاں نثاری کرنی پڑے۔ کیونکہ یہ چیزیں اُن کے نزدیک موت ہیں۔ مگر جب کبھی اُن کے مال یا اولاد میں برکت ہوتی۔ یا غنیمت اور زکوٰۃ کا مال اُن کے ہاتھ آتا۔ تو بجلی کی چمک والوں کی طرح کچھ چل پڑتے اور کہتے کہ اسلام سچا دین ہے۔ جب سے ہم نے ظاہری کلمہ پڑھا ہے۔ ہمارے گھر میں اللہ کا فضل ہے۔ اور اگر کوئی مصیبت آپڑے۔ مثلاً اولاد یا مال میں کمی ہو جائے وغیرہ وغیرہ تو بارش اور اندھیریوں میں ٹھٹک رہنے والوں کی طرح کہنے لگتے۔ کہ جب سے ہم نے ظاہری کلمہ پڑھا ہے۔ تب ہی سے ان مصیبتوں میں گرفتار ہوئے ہیں۔ یہ دین سچا نہیں۔ یہ کہہ کر اسلام سے پلٹ جاتے مگر حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ وہ کفر کر کے ہمارے قبضے سے باہر نہیں ہو سکتے کیونکہ سب مخلوق اور خاص کر

کفار پر ہماری قدرت کا پورا احاطہ ہے۔ کوئی بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے۔ اور کسی کی کیا مجال کہ اپنے تدبیری قلعے کے ذریعہ ہم سے بچ جائے۔ طبیب کی تلخ دوا سے بچ کر یعنی شریعت کی پابندی چھوڑ کر اپنی غلط تدبیروں سے شفا چاہنا حماقت ہے **نوٹ**. اس آیت کے فوائد وغیرہ دوسری آیت کے بعد بیان کئے جائیں گے۔ کیونکہ ابھی اس کہاوت کا مضمون پورا نہیں ہوا۔

**يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ**

قریب ہے بجلی اوچک لے آنکھیں اون کی جب کبھی چمکتی ہے لئے اون کے چلتے ہیں بیچ اوس اور جب تاریک ہو جاتی ہے

بجلی یوں معلوم ہوتی ہے۔ کہ اُن کی نگاہیں اوچک لے جائے گی۔ جب کچھ چمک ہوئی اُس میں چلنے لگے اور جب اندھیرا

**عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾**

اوپر اُن کے کھڑے ہو گئے اور اگر چاہتا اللہ البتہ لے جاتا کان اُن کے اور آنکھیں اون کی تحقیق اللہ اوپر ہر چیز کے قادر ہے

ہوا کھڑے رہ گئے اور اللہ چاہتا تو اُن کے کان اور آنکھیں لے جاتا۔ بیشک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

**تعلق**. اس آیت کا مضمون پہلے مضمون کا بقیہ ہے۔ کیونکہ اُس میں بارش میں پھنسنے والوں کے ایک حال کا ذکر ہوا یعنی کانوں میں انگلیاں دینا۔ اُن کے باقی حالات کا ذکر اب ہو رہا ہے لیکن چونکہ ہیبت کے وقت وہ حرکتیں انسان پہلے کرتا ہے اور چلنا پھرنا اُس کے بعد اس لئے پہلے کان بند کرنیکا ذکر ہوا۔ اور اب اُن کے چلنے پھرنے کا۔ **تفسیر** يَكَادُ كَوْدٌ سے بنا ہے جسکے معنے ہیں قریب ہونا۔ اور یہ وہاں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں کام ہوا تو نہ ہو۔ مگر اُس کے ہونے کا قوی اندیشہ یا امید ہو۔ یہاں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے۔ کہ بجلی نے اُن کو اندھا تو نہیں بنایا۔ مگر اُن کو اس کا سخت خطرہ پیدا ہو چکا۔ يَخْطَفُ خَطْفٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اچانک چھین لینا (یعنی اچک لینا) أَبْصَارَهُمْ أَبْصَارُ بصر کی جمع ہے جس کے معنی ہیں۔ آنکھ کی روشنی وہ اگرچہ ایک ہی ہوتی ہے۔ مگر چونکہ یہاں بہت سے آدمیوں کا ذکر ہے۔ اس لئے ان کی آنکھوں روشنیاں بھی بہت سی ہیں۔ قاعدہ یہ ہے۔ کہ تیز روشنی پر نگاہ جمانے سے آنکھ بیکار ہو جاتی ہے۔ سورج اور تیز گیس پر اس کا تجربہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ بجلی کی روشنی بھی بہت تیز ہوتی ہے۔ اس لئے اُن کو اپنے اندھے ہونے کا اندیشہ ہے۔ كُلَّمَا اور إِذَا دونوں وقت کیلئے آتے ہیں مگر كُلَّمَا میں زیادہ گنجائش ہے۔ کیونکہ اس کے معنی ہیں۔ جب کبھی اور إِذَا کے معنی ہیں۔ جب اگرچہ اُس بجلی کا چمکنا اور بجھنا دونوں بار بار ہو رہے ہیں۔ مگر چونکہ وہ لوگ چمکنے سے راضی ہیں۔ اور بجھنے سے ناخوش۔ اس لئے چمکنے کو كُلَّمَا سے اور بجھنے کو إِذَا سے ارشاد فرمایا گیا۔ أَضَاءَ یہ لازم بھی ہو سکتا ہے۔ اور متعدی بھی یعنی یا تو اس کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ جب کبھی اُن کے سامنے بجلی چمکتی ہے۔ اور یا یہ کہ جب کبھی راستے کو چمکاتی ہے مَشَوْا فِيهِ مَشَوْا مَشْيٌ سے بنا ہے۔ جسکے معنی ہیں۔ آہستہ آہستہ چلنا۔ لپک کر چلنے کو عربی میں خَبَبٌ کہتے ہیں۔ اور دوڑنے کو هَرْوَلَةٌ مطلب یہ ہوا۔ کہ وہ لوگ روشنی میں بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہیں۔ اور پھونک پھونک کر رکھتے ہیں۔ کیونکہ دہشت نے اُن میں بھاگنے کی طاقت ہی نہ چھوڑی فِيهِ کی ضمیر یا تو أَضَاءَ کی طرف لوٹتی ہے۔ یا راستہ کی طرف یعنی وہ اُس روشنی میں چلتے ہیں یا راستے میں۔ أَظْلَمَ میں بھی لازم متعدی ہونے کا احتمال ہے۔ یعنی جب وہ بجلی تاریک ہو جاتی ہے۔ یا راستے کو تاریک کر دیتی ہے۔ قَامُوا قیام سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ کھڑا ہو جانا اور کھڑا رہ جانا۔ بیٹھے سے اٹھنے کو کھڑا ہونا بولتے ہیں۔ اور چلتے چلتے رُک جانے کو کھڑا رہ جانا۔ اور یہاں یہ دوسرے معنی ہی مراد ہیں۔ یعنی اُن بیوقوفوں میں اتنی بھی عقل نہیں ہے۔ کہ اندھیرے میں پہلے چمکے ہوئے راستے پر کچھ قدم چل لیں۔ بلکہ بجلی کے بجھتے ہی ٹھٹک رہتے ہیں۔ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ سے یہ فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اُن کی یہ تدبیریں بالکل بے سود ہیں حق تعالےٰ کا فضل و کرم ہے۔ کہ جو اُن کی آنکھیں اور کان محفوظ رہے۔ وہ اس پر بھی قادر ہے۔ کہ کڑک اور چمک سے اُن کے آنکھ کان کو بہر حال بیکار کر دے۔ خواہ وہ اپنے کانوں میں انگلیوں کی بجائے کہنیاں ہی

ٹھونس دیں لِسَمۡعِهِمۡ وَاَبۡصَارِهِمۡ سَمۡعٌ سننے کی قوت کو بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور کان کے اُس پردے کو بھی جس میں یہ قوت محفوظ ہے۔ یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ اسی طرح ابصار بصیر کی جمع ہے۔ اس میں بھی یہی دونوں احتمال ہیں۔ کہ یا تو اُن کے دیکھنے کی قوت مراد ہو۔ یا آنکھوں کے وہ تل جن میں یہ قوت ہے۔ چونکہ دونوں کانوں کے درمیان پٹھا ایک ہی ہے۔ اور دونوں آنکھوں کے تل جدا جدا۔ اس لئے سمع کو واحد اور ابصار کو جمع لایا گیا۔ تو آیت کے معنی یہ ہوئے۔ اگر اللہ چاہتا تو اُن کی دیکھنے اور سننے کی طاقت زائل فرما دیتا یا اُن کے کان کے پردے ہی پھاڑ دیتا اور آنکھوں کے تل ہی ضائع فرما دیتا۔ اِنَّ اللّٰهَ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ کہ اِنَّ یا تو وہاں بولتے ہیں جہاں کلام کا منکر موجود ہو یا وہاں جہاں انکار کا احتمال ہو۔ چونکہ عرب کے مشرکین اور کفار حق تعالیٰ کی قدرت عامہ کے منکر تھے اور آئندہ اسلام میں بھی اس کے منکرین پیدا ہونے والے تھے۔ اس لئے یہاں اِنَّ ارشاد فرمایا گیا۔ چونکہ مشرکین چند معبود مانتے تھے۔ اس لئے انہوں نے خدا کو ہر شے پر قادر نہ مانا۔ کیونکہ مجبور ہی اپنے کاموں میں کسی مددگار کو اپنا شریک بناتا ہے۔ اور جو خود ہر چیز پر قادر ہو۔ اُسے مددگار کی کیا ضرورت۔ اسی طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے حق تعالیٰ کے لئے اولاد ثابت کی۔ اور مجبور ہی اولاد کا محتاج ہوتا ہے۔ نہ کہ ہر شے پر قادر۔ اسی طرح آریوں نے حق تعالیٰ کو روح اور مادے کا محتاج مانا۔ معتزلہ نے خود بندوں کو اپنے کاموں کا خالق مانا۔ غرضکہ بہت سے فرقے قدرت الٰہیہ کے منکر ہوئے۔ اس لئے یہاں اِنَّ فرمایا گیا عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ۔ شَیۡءٍ کے لغوی معنی ہیں۔ چاہنا۔ اور اصطلاح میں شے اُسے بولتے ہیں جس کا تعلق چاہنے سے ہو جس کا اردو ترجمہ ہے چیز۔ آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے قرآن شریف میں شیٔ چار معنے میں استعمال ہوا [1] بمعنی ممکن موجود۔ جیسے خَالِقُ كُلِّ شَيۡءٍ کیونکہ مخلوق موجود ہی ہے نہ کہ غیر موجود [2] ممکن خواہ موجود ہو یا نہ ہو جیسے کہ اس آیت میں کیونکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے جو اُس کے چاہنے اور ارادے میں آسکے۔ اور وہ ممکنات ہی ہیں۔ اس لئے کہ واجب اور محال خدا کے ارادے میں آسکتے ہی نہیں۔ لہٰذا وہ قدرت میں داخل بھی نہیں۔ پروردگار نہ تو اپنا شریک بنا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ محال ہے اور نہ خود عیوب سے موصوف ہو سکتا ہے کیونکہ یہ بھی محال ہے۔ اور نہ خود اپنی ذات وصفات پر قادر ہے۔ کیونکہ وہ واجب ہے۔ لہٰذا اس شیٔ سے محال اور واجب دونوں خارج ہیں۔ [3] بمعنی معلوم جیسے کہ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيۡمًا یہاں شَیۡءٍ میں واجب محال ممکن سب داخل ہیں۔ کیونکہ خدا ان سب ہی کو جانتا ہے [4] بمعنی موجود خواہ واجب ہو یا ممکن۔ جیسے قُلۡ اَیُّ شَیۡءٍ اَکۡبَرُ شَہَادَۃً قُلِ اللّٰہُ اسی طرح رب کا فرمانا كُلُّ شَيۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ ان دونوں آیتوں میں شَیۡءٌ بمعنی موجود ہے۔ حق تعالیٰ بھی اس میں داخل ہے۔ اگر شَیۡءٌ کے ان معنی میں فرق نہ کیا جائے۔ تو بہت دشواری ہوگی **دیوبندیوں** نے اس آیت سے سمجھا کہ اللہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ کیونکہ جھوٹ بھی شے ہے۔ اور ہر شے پر خدا قادر۔ اس کی بحث انشاء اللہ ہم اسی آیت کے آخیر میں عرض کریں گے۔ قَدِيۡرٌ قَدۡرٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اندازہ لگانا۔ اور قادر ہونا۔ یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں اس لئے کہ حق تعالےٰ ہر چیز کو اندازے سے پیدا فرماتا ہے۔ نہ اُس سے کم نہ زیادہ۔ لہٰذا اندازہ فرمانے والا ہے۔ اور کسی چیز سے وہ مجبور نہیں۔ لہٰذا وہ ہر شے پر قدرت رکھنے والا بھی ہے۔ دوسرے معنی یہاں زیادہ چسپاں ہیں۔ اگرچہ روح البیان نے پہلے معنی ابھی کئے ہیں۔ قدیر اور قادر کا فرق۔ قادر اسم فاعل ہے۔ اور قدیر صفت مشبہ۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے۔ کہ صیغۂ اسم فاعل اُس پر بولتے ہیں جس سے فعل صادر ہو رہا ہو۔ اور صفت مشبہ اُس کے لئے بولا جاتا ہے جس میں فعل کرنے کی صفت موجود ہو۔ خواہ فی الحال وہ کر رہا ہو یا نہ۔ جیسے کہ سامع اُسے کہا جائیگا جو فی الحال کچھ سُن رہا ہو۔ مگر سمیع وہ ہے جس میں سُننے کی قوت موجود ہے خواہ وہ فی الحال سُنے یا نہ سنے۔ سمیع کا مقابل ہے بہرا۔ ایسے ہی متکلم وہ جو فی الحال بول رہا ہو۔ اس کا مقابل ساکت یعنی خاموش۔ مگر کلیم وہ ہے جس میں بولنے کی طاقت ہو جس کا مقابل ہے گونگا۔ لہٰذا حق تعالیٰ ہمیشہ سے قدیر ہے۔ خواہ مقدورات یعنی عالم موجود ہوں یا نہ ہوں **خلاصہ تفسیر** اس آیت میں منافقین کے حال کو اور زیادہ واضح فرمایا گیا۔ کہ جس طرح بارش میں بجلی کی چمک سے آنکھیں چکا چوند ہو جاتی اور بند ہو جاتی ہیں۔ اور اس کی روشنی سے مسافر کچھ چلنے لگتا ہے۔ اور اندھیرا ہونے پر ٹھہر جاتا ہے۔ اس حال میں وہ حیران ہوتا ہے۔ نہ منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اور نہ لوٹ سکے۔ اسی طرح یہ منافقین جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کھلے ہوئے معجزے اور قرآن پاک کی

آیات دیکھتے ہیں جو مثل چمکتی ہوئی بجلی کے ہیں، تو مجبوراً دل سے تصدیق کر لیتے ہیں۔ جیسے کہ وہ مسافر اس روشنی میں کچھ چل لیتے تھے۔ اور پھر شکوک و شبہات کی تاریکی میں آکر رک جاتے ہیں جیسے کہ وہ مسافر اندھیرے ہو جانے پر ٹھہر جاتے تھے۔ لہٰذا ان کے دل کو سکون و قرار نہیں۔ بلکہ حیران ہیں کہ اسلام کو مانیں یا نہ مانیں۔ نیز برق قرآنی کی روشنی سے آنکھ بند کرنا۔ اور اس کا انکار کئے جانا بیکار ہے کیونکہ اوّل تو اس سے بصیرت دور نہیں ہوتی اور پھر بھی رب تعالیٰ اُن کو اندھا بہرا کر سکتا ہے۔ اب بھی بہت سے لوگ دیکھے جاتے ہیں جو دل سے اسلام کی حقانیت کا اقرار کرتے ہیں۔ پھر اُن کے دلوں میں ایسے شبہات آجاتے ہیں۔ کہ جس سے وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ اس کی دوسری تفسیر وہ بھی ہو سکتی ہے۔ جو پہلے عرض کی گئی یعنی عیش و آرام پا کر اسلام کی حقانیت کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی مصیبت پڑ جائے۔ تو منکر۔ **اس آیت کے فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ اسباب کی تاثیر اللہ کے ارادے پر موقوف ہے۔ اگر وہ نہ چاہے۔ تو کسی سبب سے کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ **دوسرے** یہ کہ حق تعالیٰ کا ارادہ کسی سبب کا محتاج نہیں۔ وہ جو چاہے بغیر سبب بھی کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہاں فرمایا جا رہا ہے۔ کہ بجلی اور گرج نہایت تیز تھیں مگر اُن کی آنکھیں اور کان سلامت رہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے اُن کو اندھا اور بہرا کرنا نہ چاہا۔ اور اگر وہ چاہتا تو بغیر ان اسباب کے بھی کر سکتا تھا۔

**تیسرے** یہ کہ آج بھی جو لوگ اللہ کی عبادت دنیوی آرام کے لئے کرتے ہیں۔ وہ سخت غلطی پر ہیں۔ ہم نے بعض ایسے لوگ دیکھے کہ اگر اُن کا کوئی نقصان ہو گیا۔ تو نماز چھوڑ دی اور کہنے لگے۔ کہ نماز ہم کو پھلتی نہیں۔ اگر ہم کو پھلتی ہوتی تو ہمارا یہ نقصان نہ ہوتا۔ یہ لوگ اس آیت سے عبرت حاصل کریں۔ اگرچہ نیک کاموں سے بلائیں ٹل جاتی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ نیک کار پر کبھی کوئی دنیاوی مصیبت آئے ہی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو صحابہ کرام خصوصاً امام حسین رضی اللہ عنہ پر کوئی تکلیف نہ آتی۔ بلکہ صوفیاء کرام فرماتے ہیں۔ کہ اپنے ذاتی فائدے کو مدنظر رکھ کر عبادت کرنا ٹھیک نہیں لہٰذا محض جنت کیلئے نماز نہ پڑھو۔ وہ تو اللہ کے فضل سے ملے گی نماز وغیرہ تو رب کو راضی کرنے کے لئے ہیں۔ بارگاہ الٰہی میں تاجر بن کر نہ آؤ۔ بلکہ بھکاری بن کر آؤ یعنی یہ نہ کہو۔ کہ خدایا ہمارے اعمال کے بدلے جنت دے۔ بلکہ یہ کہو۔ کہ اپنے فضل سے ہمارے گناہ معاف کر دے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

من نہ گویم کہ طاعتم بپذیر　　قلم عفو بر گناہم کش　　ع ما گدائیم نہ بازر گانیم

**چوتھے** یہ کہ ایمان اطمینان سے حاصل ہوتا ہے نیز ایمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے کا نام ہے۔ نہ کہ محض جاننے کا۔ مشرکین بھی جانتے تھے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ انشاء اللہ ہم جاننے اور ماننے کا فرق اسی آیت کے ماتحت بیان کرینگے۔

**تفسیر صوفیانہ** صوفیاء کرام فرماتے ہیں۔ کہ طریقت کے مسافر کو بھی یہ مصیبتیں در پیش آتی ہیں۔ جو کہ یہاں بیان ہوئیں۔ کیونکہ جو شخص اس راستہ میں قدم رکھتا ہے۔ اور کچھ محنت کے بعد اُس میں کچھ تجلی انوار ہوتی ہے۔ تو وہ خوش ہو کر خوب آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر پھر اچانک وہ تجلیات کچھ دنوں کے لئے بند ہو جاتی ہیں۔ تو یہ گھبرا جاتا ہے۔ اور اس کی ہمت ٹوٹنے لگتی ہے۔ اگر مستقل مزاج ہے۔ تو ان حالتوں کی پرواہ نہ کرتا ہوا کوشش کئے جاتا ہے۔ ورنہ تھک کر بیٹھ رہتا ہے۔ اور تھک کر بیٹھنا ہی بڑی محرومی ہے طالب مولیٰ کو لازم ہے۔ کہ ان حالات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا کام کئے جائے۔ اور یہ بھی خیال رکھے کہ یہ دشوار گذار راستہ ہے۔ اور سخت کٹھن منزل اس بھنور میں ہزاروں کشتیاں ڈوب چکی ہیں۔ اور ہزاروں مسافر اس جنگل میں شیطانی ڈاکوؤں کے ہاتھ لٹ چکے ہیں۔ دنیوی زیب و زینت شیطانی خیالات اور غرور وغیرہ اس سفر کی مصیبتیں ہیں۔ **یہ بھی خیال رہے** کہ صوفی اور ولی ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہتا کبھی دنیا بھر کی خبر رکھتا ہے۔ اور کبھی اپنے سے بھی غافل ہو جاتا ہے شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

گہے بر طارم اعلیٰ نشینیم　　گہے بر پشت پائے خود نہ بینیم!

ولی پر فیض کبھی زیادہ کبھی کم کچھ روز کے لئے بالکل بند بھی ہو جاتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی وحی یکساں نہ آتی تھی کبھی کبھی چند روز کے لئے بند بھی ہو جاتی تھی لہٰذا اس راستے کی ان مصیبتوں کی پرواہ نہ کرے۔ **اعتراض و جواب مسئلہ امکان کذب** چونکہ اس آیت سے موجودہ زمانہ کے دیوبندیوں نے حق تعالیٰ میں جھوٹ جیسے عیب کا امکان مانا ہے۔ اس لئے کچھ اس کے متعلق بھی روشنی ڈالنی ضروری ہے ہم ان

کے متعلق ایک مقدمہ اور دو فصلیں پیش کرتے ہیں۔ ناظرین سے توقع انصاف اور اپنے رب سے امید قبول رکھتے ہیں **مقدمہ** جھوٹ تمام عیبوں سے
بدتر عیب ہے۔ چند وجہ سے **ایک** یہ کہ انسان بغیر جھوٹ کی مدد کے کوئی گناہ کر سکتا ہی نہیں۔ اگر کوئی سچ بولنے کا عہد کر لے تو انشاءاللہ تمام گناہوں
سے خود بخود توبہ کر لے گا۔ دیکھو۔ چور۔ شرابی۔ زانی یہ حرکتیں جب ہی کر سکتے ہیں جبکہ وہ پہلے سے جھوٹ بولنے کے لئے آمادہ ہو جائیں اور یہ خیال کریں
کہ اگر ہم پکڑے گئے۔ تو صاف انکار کر جائیں گے۔ اگر پہلے سے سچ بولنے کا ان لوگوں نے عہد کر لیا ہو۔ تو وہ یہ حرکتیں کبھی کر سکتے ہی نہیں۔ **دوسرے**
یہ کہ کوئی بھی گناہ کفر نہیں مگر جھوٹ کفر اور شرک کی حد تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ مشرک کہتا ہے۔ کہ رب دو ہیں۔ یہ جھوٹ ہے اور کفر ہے عیسائی
کہتا ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام رب کے بیٹے ہیں۔ جھوٹا ہے۔ کافر ہے۔ ایک شرابی جواری ان جرموں کو حرام کہتے ہوئے کرتا ہے۔ تو وہ گنہگار ہے مگر کافر
نہیں۔ کیونکہ ابھی جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ لیکن جب اس نے یہ کہہ دیا کہ یہ چیزیں حلال ہیں اب جھوٹ بولا کافر ہو گیا۔ ماننا پڑے گا۔ کہ بڑے سے بڑا
گناہ بھی کفر نہیں۔ اور جھوٹ اکثر کفر ہے۔ شریعت نے جن اعمال کو کفر قرار دیا۔ جیسے کہ زنار باندھنا۔ چوٹی رکھنا۔ وہ بھی اسی لئے کہ یہ تکذیب دین کی
علامات ہیں۔ وہاں یہی جھوٹ ہی کفر ہوا **تیسرے** یہ کہ قرآن کریم میں کسی گنہگار پر لعنت نہیں فرمائی گئی۔ سوا جھوٹے کے۔ کہ فرمایا گیا۔ لَعْنَتُ اللّٰهِ
عَلَى الْكٰذِبِيْنَ خیال رہے کہ ظالم اور کافر پر جو لعنتیں آئی ہیں۔ وہ بھی جھوٹ کی ہی وجہ سے ہیں۔ کیونکہ کفر و شرک میں جھوٹ ضرور ہو گا۔ اور ظالمین
سے بھی کفار ہی مراد ہیں۔ لہٰذا ماننا پڑے گا۔ کہ جھوٹے کے سوا کوئی لعنت کا مستحق نہیں **چوتھے** یہ کہ جھوٹا آدمی چھچھورا ہوتا ہے۔ اور چھچھورا حکومت کے
قابل نہیں۔ بہر حال جھوٹ تمام عیبوں سے بدتر عیب ہے۔ یہ بات اپنے ذہن میں رکھو انشاءاللہ آئندہ کام آئے گی **پہلی فصل** خدائے تعالیٰ کے
جھوٹ سے پاک ہونے کے دلائل **پہلی دلیل** چونکہ جھوٹ عیب ہے بلکہ تمام عیبوں سے بدتر عیب ہے اور رب تعالیٰ تمام عیبوں سے پاک لہٰذا جھوٹ سے بھی پاک خیال
رہے کہ جسطرح دوسرے عیبوں کا حق تعالیٰ کیلئے امکان بھی نہیں یعنی چوری اور زنا وغیرہ اس کیلئے محال بالذات ہیں۔ اسی طرح اس کا جھوٹ بولنا بھی محال بالذات۔
**دوسری دلیل**۔ جب کسی کلی کی دو ہی فردیں ہوں تو ہر ایک کا حکم دوسری فرد کے لحاظ سے ہو گا۔ خبر کی دو ہی قسمیں ہیں سچی یا جھوٹی۔ لہٰذا اگر خدا کی
خبروں میں جھوٹ کی گنجائش ہو تو ان کا سچا ہونا واجب نہ رہا۔ تو جھوٹ کے امکان سے سچ کی ضرورت جاتی رہی **تیسری دلیل** خدا کی تمام صفتیں
واجب ہیں۔ اگر جھوٹ کا احتمال ہو تو سوال یہ پیدا ہو گا۔ کہ وہ جھوٹ خدا کی **صفت** بنے گا۔ یا نہیں۔ اگر صفت ہے۔ تو اس کو واجب ہونا چاہیئے تھا اور
اگر صفت نہیں ہے۔ تو اس کے امکان کے کیا معنیٰ **چوتھی دلیل**۔ کلام صادق خدا کی صفت ہے جب خدا کا جھوٹ ممکن ہوا۔ تو سچ بھی واجب نہیں
رہا جس سے لازم یہ آیا۔ کہ خدا کی صفت ممکن ہوئی **پانچویں دلیل** جھوٹ بولنے کی صرف تین وجہیں ہوتی ہیں ۱۔ بے علمی۔ ۲۔ عاجزی اور ۳۔ خباثت۔ اگر
کسی شخص کو غلط خبر ملی اس نے وہی لوگوں سے بیان کر دی۔ تو یہ شخص اپنی بے خبری کی وجہ سے جھوٹی بات کہہ گیا۔ زید نے وعدہ کیا۔ کہ میں ایک
ماہ کے بعد قرض ادا کر دوں گا۔ مگر اس مدت میں روپیہ اس کے ہاتھ نہ آیا۔ اور اس وعدہ میں جھوٹا ہو گیا۔ یہ جھوٹ اس کی مجبوری کی وجہ سے ہوا۔ اسی طرح
کسی شخص کو جھوٹ بولنے کی عادت ہو گئی۔ کہ بلا وجہ جھوٹ بولا کرتا ہے۔ یہ جھوٹ خباثت نفس کی وجہ سے ہوا۔ لیکن خدائے تعالیٰ ان تینوں عیوب
سے پاک لہٰذا جھوٹ سے پاک **چھٹی دلیل** کوئی چیز خدا کی مثل نہیں ہو سکتی۔ خدا کی شان سب سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ انبیاء کرام کا جھوٹ بولنا۔
ممکن بالذات اور محال بالغیر ہے۔ اگر رب تعالیٰ کا جھوٹ بھی ایسا ہی ہو۔ تو معاذاللہ اس وصف میں انبیاء اس کی مثل ہو گئے **ساتویں دلیل** جس
کلام میں جھوٹ کا احتمال ہو۔ سننے والے کو اس کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اگر خدا کی خبروں میں جھوٹ کا امکان ہے۔ تو اس کی کوئی خبر یقینی نہ رہی اور بغیر
یقین ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا کوئی دیوبندی امکان کذب کا مسئلہ مان کر مومن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسے خدا کی ہر خبر میں جھوٹ کا امکان نظر آئیگا
اور وہ یقین جو ایمان کے لئے ضروری ہے۔ اس کو حاصل نہ ہو گا۔ **آٹھویں دلیل** جس طرح کہ دوسرے عیوب الوہیت کے خلاف ہیں۔ اسی طرح
جھوٹ بھی اس کے خلاف ہے۔ دیکھو تفسیر کبیر و تفسیر روح البیان اور دیگر کتب علم کلام **نویں دلیل** بعض چیزیں بندوں کے لئے کمال ہیں اور
رب کے لئے عیب جیسے کھانا پینا۔ اور عبادت کرنا یہ بھی حق تعالیٰ کے لئے محال بالذات ہیں۔ تو جو جھوٹ کہ بندوں کے لئے ہی اول نمبر کا

عیب ہو۔ وہ رب کے لئے ممکن کیونکر ہوگا۔ **دسویں دلیل** دیوبندیوں میں بھی منطق داں لوگ ہیں۔ وہ اس مسئلہ کے قائل نہ ہوئے اور تمام علماء منطق نے اس مسئلہ کی تردید ہی کی چنانچہ مولانا عبداللہ ٹونکی اور شاہ فضل حق صاحب خیر آبادی نے اس کی تردید میں رسالے لکھے۔ دیوبندیوں کے مایۂ ناز منطقی مولانا عبدالوحید صاحب سنبھلی یہی کہا کرتے تھے۔ کہ ہمارے بڑوں سے اس مسئلہ میں سخت غلطی ہوگئی جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مسئلہ نہایت بیہودہ ہے۔ **دوسری فصل اعتراض و جواب۔** **پہلا اعتراض** اگر خدائے تعالیٰ جھوٹ پر قادر نہ ہو۔ تو مجبور ہوگا۔ اور مجبوری اس کی الوہیت کے خلاف **جواب** مجبوری اُسے کہتے ہیں۔ کہ جہاں مفعول میں اثر قبول کرنے کی قابلیت ہو۔ مگر فاعل میں اثر کی طاقت نہ ہو۔ اور اگر خود مفعول ہی اثر نہیں لے سکتا۔ تو یہ قصور مفعول کا ہے۔ نہ کہ فاعل کا۔ اگر کوئی روشنی میں قریب کی چیز نہ دیکھے تو اندھا ہے۔ لیکن اگر اندھیرے میں یا بہت دور کی چیز نہ دیکھ سکے۔ تو اندھا نہیں۔ کیونکہ یہاں اُس کی آنکھ کا قصور نہیں بلکہ اُس چیز کا قصور ہے۔ کہ جو اس کے دیکھنے کے قابل نہ رہی۔ اسی طرح خود عیوب اس قابل نہیں کہ خدا کی قدرت میں داخل ہوں۔ لہٰذا یہ قصور ان عیوب کا ہے۔ نہ کہ قدرت کا۔ اگر اسی کا نام مجبوری ہوتا تو تمہارے نزدیک بھی خدائے تعالےٰ بہت سے عیوب پر قادر نہیں۔ جیسے کہ موت وغیرہ **دوسرا اعتراض** جھوٹ بھی ایک شے ہے۔ اور ہر شے خدا کی قدرت میں داخل **جواب** خدا کا جھوٹ شے نہیں۔ کیونکہ وہ محال ہے اور بندوں کا جھوٹ بولنا بیشک شے ہے۔ خدائے تعالےٰ اسکے پیدا کرنے پر واقعی قادر ہے۔ نہ کہ خود اُس سے موصوف ہونے پر۔ کیونکہ سارے عیب بھی خدا کی مخلوق ہیں۔ مگر خدا اُن سب سے پاک ہے۔ عیب کو پیدا کرنا اور جاننا عیب نہیں۔ ہاں عیب کرنا عیب ہے **تیسرا اعتراض** خدا کی خبریں بھی خبر ہی ہیں۔ اور خبر اسی کو کہتے ہیں جس میں جھوٹ سچ کا احتمال ہو۔ اگر جھوٹ کا احتمال نہ ہوگا۔ تو سچ کا بھی امکان نہ رہے گا۔ لہٰذا اُس کی خبروں کو خبر ماننے کیلئے ان میں جھوٹ کا امکان مانو۔ مگر چونکہ وہ خدا کی خبریں ہیں اسلئے جھوٹی ہوں گی نہیں۔ لہٰذا ان خبروں کا جھوٹا ہونا ممکن بالذات اور محال بالغیر ہے **جواب** مطلق خبر جنس ہے۔ اور حق تعالےٰ کی خبر اس کی نوع۔ اس نوع میں حق تعالیٰ کی طرف نسبت مثل فصل کے ہے۔ فصل کے ذریعے سے نوع پر جو احکام جاری ہوتے ہیں، وہ سب ذاتی ہوتے ہیں۔ ہاں جنس کے لئے عارضی۔ جیسے کہ ناطق کے احکام انسان کے لئے ذاتی ہیں۔ اور حیوان کیلئے عارضی لہٰذا جب نسبت الٰہی نے جھوٹ ہونے کو محال کیا۔ تو محال ہونا رب کی خبر کیلئے بالذات اور مطلق خبر کے لئے بالعرض ہوا۔ ہماری اس تقریر سے بفضلہٖ تعالیٰ دونوں اعتراض کافور ہوگئے **چوتھا اعتراض** حق تعالےٰ کے سچے ہونے کی تعریف جب ہی کی جاسکتی ہے۔ جبکہ وہ جھوٹ پر قادر ہو۔ مگر نہ بولے۔ اگر اس کو جھوٹ پر قدرت ہی نہ ہو۔ تو پھر سچے ہونے میں کیا کمال جیسے کہ دیوار کے جھوٹ نہ بولنے کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ اُس میں بولنے کی طاقت ہی کہاں ہے۔ (یہ اعتراض اسمٰعیل دہلوی کی ذہانت کا نتیجہ ہے) **جواب** ماشاء اللہ کیا اچھا قاعدہ ایجاد کیا۔ خدا تعالیٰ کے فنا نہ ہونے کی تعریف۔ چوری نہ کرنے کی تعریف۔ سارے عیبوں سے پاک ہونے کی تعریف کی جاتی ہے۔ اس قاعدے سے لازم آتا ہے کہ یہ سارے عیب خدا کیلئے ممکن ہوں۔ کیونکہ بغیر امکان خدا کی تعریف ناممکن ہے۔ جناب حق تعالیٰ کی تعریف اس طرح کی جائیگی۔ کہ اُس کی بارگاہ تک کسی عیب کی رسائی ہی نہیں یاد رہے کہ دیوار کا جھوٹ محال بالغیر نہیں۔ بلکہ محض محال عادی ہے۔ ابنیاء کرام۔ اولیاء عظام سے پتھروں نے کلام کیا ہے۔ اور آئندہ بھی کریں گے۔ تو مولوی اسمٰعیل صاحب کے اس قاعدہ سے لازم آتا ہے۔ کہ حق تعالےٰ کا جھوٹ محال بالغیر تو کیا محال عادی بھی نہ ہوتا کہ اُس کی تعریف کی جاسکے۔ **پانچواں اعتراض** یہ سب مانتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کی وعیدوں کا خلاف ہو سکتا ہے۔ مثلاً اُس نے خبر دی کہ مسلمان کو ظلماً قتل کرنے والے کی سزا جہنم ہے لیکن سب مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ کہ وہ اگر چاہے تو قاتل کو جہنم میں نہ بھیجے اور یہی جھوٹ ہے **جواب** معاذ اللہ۔ اس کو جھوٹ سے کیا تعلق اولاً تو خدا کی ساری وعیدیں اُس کے ارادے پر موقوف ہیں کہ اگر وہ چاہے تو سزا دے اور چاہے تو معاف فرما دے۔ قرآن کریم نے فرمایا وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ اس آیت نے شرک کے سوا ساری وعیدوں کو رب کے چاہنے پر موقوف کر دیا۔ لہٰذا جس گنہگار کی بخشش ہوگی وہ اسی مضمون کا ظہور ہوگا۔ **دوسرے** یہ کہ قصور معاف کرنا کرم ہے نہ کہ جھوٹ اور جھوٹ عیب ہے **تیسرے** یہ کہ یہ اعتراض تو تم پر بھی پڑتا ہے کیونکہ رب کے جھوٹ کو تم محال بالغیر مانتے ہو۔ اور وعید کی مخالفت

واقع ہے۔ اگر یہ کذب ہے۔ تو تم خدا کے کذب کو واقع مالو نہ کہ محال بالغیر **چھٹا اعتراض** رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے ہوتے ہوئے ہم کفار مکہ پر عذاب نہ بھیجیں گے۔ اور پھر خود ہی فرمایا۔ قُلِ اللّٰهُ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ یعنی اے کفار مکہ اللہ قادر ہے۔ کہ تم پر اوپر یا نیچے سے عذاب بھیجے۔ دیکھو اِن کفار مکہ سے عذاب نہ بھیجنے کا وعدہ فرمایا گیا۔ لیکن دوسری آیت میں عذاب بھیجنے پر قدرت ثابت فرما دی گئی جس سے معلوم ہوا۔ کہ خدائے تعالیٰ اپنے وعدہ توڑنے پر بھی قادر ہے۔ اور یہی جھوٹ ہے (یہ اعتراض دیوبندی مذہب کا انتہائی ہے جس کو مولوی خلیل احمد و رشید احمد صاحبان ہر جگہ بیان کرتے ہیں) **جواب** عالم کی ہر چیز کا ہونا حق تعالیٰ کے ارادے پر موقوف ہے۔ فرماتا ہے۔ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ۔ اور فرماتا ہے۔ کہ عَلٰى مَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ۔ کفار مکہ پر عذاب آنا چونکہ یہ بھی عالم کی ایک چیز ہے۔ لہذا ممکن اور رب اس پر قادر اسی امکان و قدرت کا ذکر تمہاری پیش کردہ دوسری آیت میں ہوا لیکن جب عالم کی کسی چیز سے حق تعالیٰ کے ارادے کا تعلق ہو جائے تو اب اُس کے خلاف ہونا محال بالذّات۔ اس کا ذکر پہلی آیت میں ہوا۔ تو خلاصہ یہ ہوا۔ کہ کفار مکہ پر عذاب کا آنا اور نہ آنا خود اپنے لحاظ سے دونوں ممکن ہیں مگر اس لحاظ سے کہ عذاب نہ آنے کا حق تعالیٰ نے وعدہ فرما لیا اور اُس کے ارادے کے خلاف ہونا محال بالذّات۔ لہٰذا اس حال میں عذاب کا آنا محال بالذات مثال سمجھو زید کھڑے ہونے اور بیٹھنے دونوں پر قادر ہے۔ مگر جب کھڑا ہو گیا۔ تو کھڑے ہونے کی حالت میں بیٹھنا محال بالذات ہے۔ کیونکہ وہ اجتماع ضدین کی فرد ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ ہر چیز کے پیدا کرنے اور فنا کرنے پر قادر لیکن جب کسی کو پیدا فرما دیا۔ تو پیدا ہو چکنے کی حالت میں فنا ہونا محال بالذات اس طرح کہ ہستی اور نیستی دونوں جمع ہو جائیں ہاں جب نیستی کی جائے گی۔ تو ہستی فنا ہو جائے گی۔ ہر دو نقیضوں کا یہی حال ہے۔ کہ اُن میں سے ہر ایک ممکن۔ لیکن ایک کے ہوتے ہوئے دوسرے کا ہونا محال بالذّات اور موٹی مثال سمجھو کنواری لڑکی جس مسلمان سے چاہے نکاح کرے یعنی بطریق بدلیت ہر مسلمان کے نکاح میں آسکتی ہے۔ مگر جب ایک سے نکاح کر لیا تو دوسرے سے نکاح کرنا اس حال میں شرعاً محال بالذات ہو گیا۔ اور سمجھو۔ زید کے پیدا ہونے سے پیشتر ہر شخص بطریق بدلیت اس کا باپ بن سکتا تھا۔ لیکن جب وہ بکر کے نطفے سے پیدا ہو چکا اور بکر اس کا باپ بن چکا تو اس حالت میں کسی اور کا باپ محال بالّذات ہے کہ حق تعالیٰ قادر نہیں کہ کسی اور کو بھی زید کا باپ بنا دے۔ کذب جب ہوتا جبکہ تعلق ارادے کے باوجود حق تعالیٰ ان کے عذاب پر قادر ہوتا جناب تعدد امکان اور چیز ہے۔ اور امکان تعدد دوسری چیز اس عذاب بھیجنے اور نہ بھیجنے میں امکان کا تعدد ہے۔ نہ کہ تعدد کا امکان۔ قرآن پاک سمجھنے کے لئے عقل و علم بھی ضروری ہے۔ اور دین بھی۔ مگر دیوبندیوں کے یہاں ان تینوں کا دیوالہ ہے۔ یہ دیوبندیوں کا انتہائی اعتراض تھا جو بفضلہ تعالیٰ پاش پاش ہو گیا۔ اور ہم تو اس سے یہ سمجھے کہ وہ ابھی تک امکان کذب کے معنی سمجھے ہی نہیں۔ یہ کون کہتا ہے۔ کہ عالم کی بعض چیزیں ممکن ہیں اور بعض ناممکن نقیضین ضدین ہر ایک ممکن لیکن اُن کا جمع ہونا محال بالذّات اسی طرح خبر الٰہی کے ساتھ خُلف کا ہونا محال بالّذات اسی کا نام امکان کذب ہے۔ **ساتواں اعتراض** عام متکلمین فرماتے ہیں۔ کہ مَقْدُوْرُ الْعَبْدِ مَقْدُوْرُ اللّٰهِ یعنی جس پر بندہ قادر ہے۔ اُس پر خدا بھی قادر ہے۔ اور جھوٹ پر تو بندہ قادر تو چاہیئے کہ خدا بھی قادر ہو۔ **جواب** اس قول کا مطلب یہ ہے۔ کہ جس کے کسب یعنی کرنے پر بندہ قادر ہے۔ اُس کے خلق یعنی پیدا کرنے پر خدا قادر کیونکہ وہ ممکن ہی ہوگا۔ نہ یہ کہ خدا بھی اُس کے کرنے پر قادر ہو جائے۔ اگر یہ مطلب ہوتا تو بندہ زنا چوری وغیرہ سب پر قادر ہے۔ کیا رب کو ان پر قادر مانو گے۔

**آٹھواں اعتراض** خدا پاک قادر ہے کہ ہزاروں محمدؐ بنا دے۔ اہلسنت جو کہتے ہیں۔ کہ اب نئے نبی کا آنا محال بالذات ہے یہ غلط ہے۔ اسی طرح یہ جو یہ کہتے ہیں۔ کہ حضور کا مثل ناممکن ہے غلط ہے جس نے ایک محمدؐ کو پیدا کیا۔ کیا وہ لاکھوں محمدؐ نہیں بنا سکتا (ماخوذ از تقویت الایمان) **جواب** دیوبندی فوج میں تھمنا کہاں۔ گنگا کی موج میں جمنا کہاں۔ یہ مسئلہ امکان نظیر ہے۔ کہ جو امکان کذب کی ہی شاخ ہے۔ اس میں دو گفتگوئیں ہیں۔ ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نئے پیغمبر کا آسکنا اور دوسرے آپؐ کا مثل ہو سکنا پہلے مسئلہ کی تحقیق تو بفضلہ تعالیٰ سوال نمبر ۲ کے جواب میں پوری پوری ہو چکی یعنی حق تعالیٰ اس پر قادر تھا۔ کہ لاکھوں میں جس کو چاہتا خاتم النبیین بنا کر بھیج دیتا یعنی بطریق بدلیت لاکھوں کا خاتم النبیین بنانا ممکن تھا۔ مگر جب

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتخاب ہو گیا۔ اور آپ خاتم النبیین بن گئے۔ تو اب کسی کا نبی بننا محال بالذات ہے جس کی نہایت نفیس مثالیں ہم پہلے دے چکے۔ کہ ہر شخص ہندہ کا شوہر اور زید کا باپ بن سکتا تھا۔ مگر جب ایک بن گیا تو دوسرے کا بننا محال۔ جب زید کا دوسرا باپ نہیں ہو سکتا۔ تو دوسرا خاتم النبیین کیسے ہو سکتا ہے۔ رہا دوسرا مسئلہ اس کی تفصیل کیلئے رسالہ مبارکہ امتناع النظیر مصنفہ حضرت شاہ فضل حق صاحب خیر آبادی کا مطالعہ کرو۔ میں مختصراً عرض کرتا ہوں۔ یہ سب کو معلوم ہے۔ کہ دو نقیضوں اور دو ضدوں کا جمع ہونا محال بالذات ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مثل ملنے میں یہ دونوں باتیں لازم رہے اس طرح کہ حضور علیہ السلام آخری نبی ہیں۔ آپ کا دین آخری دین ہے۔ آپ کی کتاب آخری کتاب ہے۔ اب اگر کوئی شخص حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مثل فرض کیا جائے۔ تو اگر وہ ان باتوں میں آخری ہو۔ تو حضور آخر نہ رہے۔ اور اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام آخری ہوں۔ تو وہ دوسرا آخر نہیں۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے شفاعت فرمانے والے رب سے پہلے رب سے کلام فرمانے والے سب سے پہلے صراط سے گزرنے والے سب سے پہلے جنت میں جانے والے۔ سب سے پہلے آپ کی قبر انوار کھلے گی۔ سب سے پہلے آپ ہی کا نور پیدا ہوا۔ میثاق کے دن سب سے پہلے آپ ہی نے بلیٰ (ہاں) فرمایا۔ اتنی باتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے ہیں۔ اگر کوئی آپ کی مثل ہو۔ تو اس میں یہ اولیتیں جمع ہوں گی یا نہیں۔ اگر ہوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ رہیں گی۔ ورنہ دو نقیضیں جمع ہوں گی۔ اور اگر نہ ہوں تو وہ آپ کا مثل کیا۔ تیسرے یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ساری اولاد آدم کے سردار ہیں۔ سارے انسان قیامت میں آپ کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔ سارے انسانوں کے آپ خطیب ہوں گے۔ سارے روتوں کو آپ ہنسائیں گے۔ سارے گرتوں کو آپ سنبھالیں گے۔ سارے جلتوں کو آپ بجھائیں گے۔ سارے بگڑوں کو آپ بنائیں گے۔ ساری آنکھیں آپ کا منہ تکیں گی۔ سارے ہاتھ آپ کے دامن کی طرف بڑھیں گے سارے لوگوں میں سے آپ کو مقام محمود ملے گا۔ سارے لوگوں میں آپ کو وسیلہ (جنت کا اعلیٰ مقام) ملے گا سارے لوگوں کے آپ نبی ہیں رسول اللہ الیکم جمیعا۔ اگر کوئی آپ کا مثل ہو تو بتاؤ اس میں یہ صفتیں ہوں گی یا نہیں اگر ہوں تو اجتماع نقیضین ہے اور اگر نہ ہوں تو وہ مثل کیسا۔ حق یہ ہے کہ حق تعالیٰ خالقیت میں وحدہٗ لاشریک ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان اوصاف میں وحدہٗ لاشریک۔ جس طرح دو خدا کا ہونا محال۔ ایسے ہی دو مصطفےٰ ہونا محال ہمارا ایک شعر یاد کر لو ؎

کوئی مثل ان کا ہو کس طرح وہ ہیں سب کے مبتدا و منتہا　　نہیں دوسرے کی یہاں جگہ کہ یہ وصف دو کو ملا نہیں۔

ڈاکٹر اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

رُخِ مصطفےٰ ہے وہ آئینہ نہیں جس کے رنگ کا دوسرا　　نہ کسی کے وہم و گمان میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۲۱﴾

اے　لوگو　عبادت کرو　رب اپنے کی　وہ رب　جس نے پیدا کیا تم کو اور　اُن کو　سے پہلے تمہارے　شاید کہ تم　متقی بن جاؤ

اے لوگو اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا۔ یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔

الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ

وہ　بنایا　واسطے تمہارے　زمین کو　بچھونا　اور　آسمان کو　عمارت　اور　اتارا　سے　آسمان　پانی　پس　نکالا　سے اُس　بعض

وہ جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا تو اُس سے کچھ

الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۲﴾

پھلوں کو　کھانے کیلئے تمہارے　پس نہ　بناؤ　واسطے اللہ کے برابر والے　حالانکہ تم　جانتے ہو

پھل نکالے تمہارے کھانے کو تو اللہ کے لئے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھیراؤ

**تعلق** نبی کے لئے ضروری ہے۔ کہ سب سے پہلے اپنی کتاب کا کتاب الٰہی ہونا بیان کرے۔ اس کے بعد اس مقصد کو دنیا کے سامنے پیش کرے جس کے لئے وہ دنیا میں بھیجا گیا ہے چنانچہ یہاں بھی پہلے قرآن کریم کا کتاب الٰہی ہونا بیان فرمایا۔ اور اس کی یہ صفت بیان فرمائی۔ کہ وہ ازلی نیک بختوں یعنی متقیوں کے لئے ہدایت ہے۔ اور متقیوں کی پہچان کے لئے کھلے اور چھپے دونوں قسم کے کافروں کا بھی ذکر فرمایا۔ اسی سبب سے قرآن پاک کا پہنچانا مقصود تھا جب یہ مرحلہ طے ہو چکا اور بندوں کو ہدایت حاصل کرنے اور بدبختی سے بچنے کا مشتاق بنا دیا تو اب اس مقصود کو بیان فرمایا جس کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ یعنی باغیوں کو وفادار بنانا اور سب کو حق تعالیٰ کا عبادت گزار بنانا۔ لہٰذا ان سب آیتوں کے بعد عبادت کا ذکر فرمایا۔ **دوسرے** اس طرح بھی تعلق ہو سکتا ہے۔ کہ اس سے پہلے ایمان اور کفر و نفاق کا ذکر فرمایا گیا۔ تاکہ سننے والا ایمان اختیار کرے۔ اور کفر و نفاق سے بچے۔ اب اس کے بعد عبادت کا ذکر ہو رہا ہے۔ کیونکہ ایمان لانا اور کفر سے بچنا عبادت سے پہلے ہے **تیسرے** اس طرح کہ اس سے پہلے قرآن کی صفت بیان ہوئی۔ اب خدا کی ذات و صفات کا ذکر ہے۔ چونکہ قرآن سے خدائے پاک کو صحیح طرح پہچانا جاتا ہے۔ اس لئے کتاب کا ذکر پہلے فرمایا گیا۔ **تفسیر** یَا پکارنے کا حرف ہے۔ پکارنے سے چند مقصود ہوتے ہیں۔ (۱) غافل کو اپنی طرف متوجہ کرنا۔ جیسے یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ (۲) غائب کو حاضر کرنا (۳) عتاب ظاہر کرنا۔ جیسے یَا خَبِیْثُ یَا اِبْلِیْسُ (۴) اظہار کرامت۔ جیسے یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ (۵) اظہار محبت جیسے یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ (۶) اظہار عجز یا اللہ (۷) تکوین۔ تاثیر جیسے یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ وغیرہ وغیرہ۔ رب تعالیٰ ہم کو پکارتا ہے۔ ہماری غفلت دور کرنے کیلئے اپنے نبی کو پکارتا ہے۔ کرامت محبت ظاہر فرمانے کے لئے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی خدا سے غافل نہیں رہتے۔ آسمان و زمین کو پکارا اطاعت کرانے کیلئے وغیرہ وغیرہ ایسے ہی ہم رب کو پکارتے ہیں۔ اپنی عاجزی کے اظہار کے لئے کیونکہ رب تعالیٰ ہم سے کبھی بھی غافل نہیں غرضکہ ایک ہی ندا سے بہت سے معنی حاصل ہوتے ہیں یہاں یہ ندا غافلوں کی تنبیہ کے لئے بھی ہو سکتی ہے۔ اور غائبوں کو حاضر کرنے کے لئے بھی۔ اور عتاب کیلئے بھی۔ کیونکہ ناس کے لغوی معنی ہیں بھولنے والے۔ تو مطلب یہ ہوا۔ کہ اے ہم کو بھول جانے والو ہماری طرف آجاؤ اَیُّهَا جب معرف باللام پر یا لگاتے ہیں۔ تو ان میں فاصلہ کرنے کیلئے اَیُّهَا داخل کر دیا جاتا ہے چونکہ اس اَیُّهَا میں تنبیہ کی بو ہے۔ اس لئے اللہ پر نہیں آتا۔ یعنی یٰٓاَیُّهَا اللہ اور یٰٓاَیُّهَا الرَّحْمٰن نہیں کہا جاتا۔ **اَلنَّاسُ** مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اکثر اَلنَّاسُ سے مکے والوں کو اور اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مدینے والوں کو پکارا جاتا ہے مگر یہاں اَلنَّاسُ میں تمام انسانوں سے خطاب ہے۔ یعنی کافر مومن منافق وغیرہ (تفسیر خزائن العرفان و روح البیان) اور حق یہ ہے۔ کہ قیامت تک آنے والے انسان اس خطاب میں داخل ہیں۔

**اُعْبُدُوْا**۔ اُعْبُدُوْا عبادت سے بنا ہے۔ اور عبادت کے معنی ہم سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں چونکہ یہاں اَلنَّاسُ میں سارے کفار مومنین منافقین داخل ہیں۔ اس لئے ضروری ہے۔ کہ اُعْبُدُوْا کے معنی بھی ایسے وسیع کئے جائیں جو ان سب کے لئے مناسب ہوں لہٰذا اس کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ اے کافرو عبادت کرو یعنی ایمان لے آؤ۔ اور اے منافقو عبادت کرو یعنی مخلص بن جاؤ۔ اے گنہگارو عبادت کرو۔ یعنی نمازی بن جاؤ۔ اے بخیلو عبادت کرو یعنی زکوٰۃ دو۔ اے بے روزہ دارو عبادت کرو یعنی روزے رکھو وغیرہ وغیرہ **رَبَّكُمُ** حق تعالیٰ کے تمام ناموں میں سے رب اس لئے فرمایا گیا۔ کہ سننے والوں کو عبادت کا شوق پیدا ہو۔ اور حکم معہ وجہ کے ہو جائے۔ یعنی تم خدا کی عبادت کرو۔ کیونکہ وہ تمہارا پالنے والا ہے۔ اور پالنے والے کا حق ہوتا ہے۔ کہ اس کی اطاعت کی جائے **اَلَّذِیْ خَلَقَكُمْ** میں حق تعالیٰ کی ربوبیت ہی کا ذکر ہے۔ چونکہ پالنا پیدا کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ اس لئے پیدا کرنے کا ذکر پہلے فرمایا گیا۔ اور رزق کا ذکر بعد میں **خَلَقَ** خَلْقٌ سے بنا ہے خلق کے معنی ہیں نیستی سے ہستی میں لانا جو صرف خدا کا ہی کام ہے۔ اور اسباب جمع کرنے کو کسب کہتے ہیں۔ بندہ کاسب ہے۔ خالق نہیں کسب کے معنی ہیں۔ اسباب جمع کرنا عورت مرد کا ملنا بچے کی پیدائش کا سبب ہے لیکن اس کا پیدا ہونا حق تعالیٰ کی ہی طرف سے ہے۔ **وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ** سے یہ بتایا گیا۔ کہ وہ تمہارا بھی پیدا کرنے والا ہے۔ اور تم سے پہلی امتوں کا بھی یا تمہارے باپ داداؤں کا بھی جس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ وہ

تمہارا قدیمی محسن اور تم اس کے قدیم غلام ہو۔ لہٰذا تم پر دو طرح حق ہے۔ کہ تم اس کی عبادت کرو۔ لَعَلَّکُمْ عربی زبان میں لَعَلَّہٗ شک کے لئے آتا ہے۔ اور رب تعالیٰ شک سے پاک ہے۔ اس لئے یہاں اس کے تین معنی کئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا استعمال عربی زبان کے محاورے کے مطابق ہے یعنی چونکہ عربی میں لَعَلَّ بولا جاتا ہے۔ اور یہ قرآن بھی عربی ہے محض اس لئے لَعَلَّ فرمایا گیا۔ دوسرے یہ کہ بندوں کے حق میں لَعَلَّ شک کے لئے ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کی طرف سے یقین کے لئے کیونکہ کریم اُسی کی امید دلاتا ہے جو کہ یقینی ہونیوالی ہو اب اسکے معنی ہوں گے۔ تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ تیسرے یہ کہ یہ لَعَلَّ بندوں کے لحاظ سے ہے۔ نہ کہ رب کے لحاظ سے تو مطلب یہ ہوا کہ اے لوگو تم رب کی عبادت اس امید پر کرو۔ کہ شاید تمہیں تقویٰ حاصل ہو جائے یعنی نہ تو دنیاوی لالچ سے کرو۔ نہ خدا سے ناامید ہو کر اور نہ اُس سے بے خوف ہو کر کیونکہ مرنے سے پہلے اپنی کامیابی کا یقین نہیں ہو سکتا۔ بڑے بڑے پرہیزگار مرتے وقت بے ایمان ہو گئے۔ لہٰذا تم عبادت کرتے جاؤ۔ اور رب سے ڈرتے جاؤ۔ تَتَّقُوْنَ یہ لفظ تقوے سے بنا ہے۔ اور یہاں تقوے کے تین معنے ہو سکتے ہیں۔ عذاب الٰہی سے بچ جانا۔ پرہیزگار ہو جانا دل میں پرہیزگاری کا نور پیدا ہو جانا تو آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو۔ شاید کہ تم اُس کے عذاب سے بچ جاؤ۔ یا شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ یا شاید کہ تمہارے قلب میں پرہیزگاری کا نور جلوہ گر ہو جائے۔ عبادت تقویٰ کی ابتداء ہے۔ اور تقویٰ اصل مقصود یا عبادت ایک راستہ ہے اور پرہیزگاری منزلِ مطلوب اس راستے کو طے کئے جاؤ۔ شاید تم منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤ۔ یا اپنے ظاہر جسم کو عبادت کے زیور سے آراستہ کئے جاؤ۔ شاید تمہیں نور قلبی میسر ہو جائے۔ یا اپنی بندگی کو درست کئے رہو۔ تاکہ تمہاری روح کو قوت حاصل ہو۔ اَلَّذِیْ جَعَلَ رب تعالیٰ نے اپنی پہچان یوں کرائی تھی۔ کہ وہ اللہ وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور یہ ایک چھپی ہوئی بات تھی۔ اس لئے کہ جب انسان کو اپنا پیدا ہونا۔ اور ابتدائی پرورش ہی یاد نہیں۔ تو یہ کیسے جانے کہ میرا خالق کون ہے۔ اس لئے رب تعالیٰ کی اور کھلی ہوئی نشانیاں بتائی گئیں۔ کہ میاں تمہارا خالق وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کا بچھونا اور آسمان کو چھت بنا دیا ہے۔ اور زمین میں قسم قسم کے رزق پیدا فرما کر تمہاری دعوت کا سامان کر دیا لَکُمُ الْاَرْضَ لَکُمْ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دنیا کا سارا انتظام صرف انسانوں کیلئے کیا گیا ہے۔ جانور وغیرہ انسان کے تابع ہیں۔ اسی لئے حضرت آدم علیہ السلام کو ملائکہ کا مسجود بنایا۔ کیونکہ فرشتے تابع تھے۔ اور حضرت آدم اصل مقصود۔ تو فرمایا جا رہا ہے۔ کہ تم پر اتنا بڑا اکرم ہے۔ کہ تمہارے لئے ساری چیزیں بنائیں اور پھر ہر چیز خدا کی عبادت کرے۔ اور تم بت پرستی کتنے افسوس کی بات ہے۔ ارض کے معنی یا تو ہیں کھا جانا۔ اور یا کچل جانا چونکہ زمین بھی ہر چیز کو کھا جاتی ہے یعنی گلا ڈالتی ہے اور قدموں سے کچلی جاتی ہے اس لئے اسے ارض کہتے ہیں۔ فِرَاشًا اس کے معنے ہیں بستر زمین کو بستر بنانے کا یہ مطلب ہے۔ کہ اس کی اصل جگہ سمندر کے نیچے ہے۔ لیکن انسانوں کی خاطر کچھ حصہ پانی کے اوپر کر دیا گیا پھر زمین گول بھی ہے لیکن اُس کی گولائی ایسی نہیں۔ کہ جس سے آدمی لڑک جائیں۔ بلکہ اس کا ایسا پھیلاؤ ہے جس کی وجہ سے وہ بستر کا کام دیتی ہے۔ پھر نہ تو گارے کیطرح اس کو نرم کیا گیا۔ اور نہ پتھروں لوہے اور روڑوں کی طرح سخت کہ اس پر چلنا پھرنا دشوار ہو جائے۔ بلکہ درمیانی حالت میں رکھا گیا۔ کہ جس پر چلنا پھرنا عمارتیں بنانا آسان ہوں۔ وَالسَّمَآءَ بِنَآءً سَمَا کے معنی ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ بناء سے مراد یا تو چھت ہے۔ یا عمارت یعنی قبہ تو فرمایا جا رہا ہے۔ کہ ہم نے تمہارے خاطر زمین پر آسمان کو قُبے کی طرح بنایا جس میں رنگ برنگی تیز و ہلکی قندیلیں یعنی چاند سورج تارے وغیرہ جڑ دیئے۔ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً۔ اس میں یہ بتایا جا رہا ہے۔ کہ تمہارے مکانات کی چھتیں صرف سایہ دینے اور بارش سے بچنے کا کام دیتی ہیں لیکن آسمان ایسی انوکھی چھت ہے۔ کہ جس سے تمہارا رزق بھی آتا ہے۔ فَاَخْرَجَ بِہٖ میں یہ بتایا گیا۔ کہ پھلوں کے پیدا فرمانے والے ہم ہی ہیں۔ بارش تو صرف اُس کا ظاہری سبب ہے اور اس سے مقصود یہ ہے۔ کہ تم اپنی حقیقت کو معلوم کرو۔ کیونکہ زمین مثل ماں کے ہے۔ اور آسمان مثل والد کے اور پانی کے قطرے نطفے کی طرح اور پھل وغیرہ اولاد کیطرح گویا تمہارے اور ان چیزوں کے پیدا کرنے کا طریقہ ایک ہی ہے تفسیر روح البیان۔ مِنَ الثَّمَرٰتِ۔ یہ مِن یا تو بیانیہ ہے۔ تو معنی یہ ہوئے۔ کہ نکالا اُس بارش کے ذریعے پھلوں کو اور یا تبعیضیہ ہے جس

کے معنے یہ ہوئے۔ کہ نکالا اُس بارش سے بعض پھلوں کو بعض فرمانے کی تین وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ ہر پھل بارش سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ بعضے بغیر بارش بھی پیدا ہو جاتے ہیں جیسے کھجوریں وغیرہ بلکہ بعض پھل بارش سے خراب بھی ہو جاتے ہیں دوسرا یہ کہ ہر جگہ سارے پھل نہیں پیدا ہوتے کشمیر میں اور قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں اور بنگال میں دوسرے قسم کے عرب میں اور طرح کے تو مطلب یہ ہوا کہ اُس پانی سے ہر جگہ بعضے پھل پیدا فرمائے۔ تیسرا یہ کہ اس کا تعلق آئندہ عبارت سے ہے۔ تو آیت کے معنے یہ ہوئے۔ کہ بارش سے بعض پھل تمہارے کھانے کیلئے پیدا فرمائے اور بعض جانوروں کیلئے کیونکہ انسان ہر پھل نہیں کھاتا کسی درخت کا پھل کھاتا ہے کسی کے پتے کسی کی صرف جڑیں رِزْقًا لَّكُمْ میں یہ فرمایا گیا۔ کہ ہر چیز تمہارے لئے ہی اگر کوئی چیز جانور بھی کھالیں۔ وہ بھی تمہاری برکت سے حیوانات کیڑے مکوڑے وغیرہ سب تمہارے طفیل پل رہے ہیں۔ بادشاہ اپنے کسی حاکم کی دعوت کرے۔ اور اُس میں اُس حاکم کے نوکروں چاکروں کو بھی شریک فرما دے۔ بلکہ اُس کے گھوڑوں وغیرہ کے لئے چارے کا انتظام فرمائے۔ تو یہ سب اس حاکم پر احسان ہے فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا یہ اس پوری آیت کا مقصود ہے۔ یعنی جب تم ان ساری باتوں کو جان چکے۔ تو تم رب کی بغاوت نہ کرو اور کوئی اُس کا ہمسر نہ مانو انداد جمع ہے۔ ندکی جس کی معنی ہے مثل لوگ چند طرح شرک کرتے تھے بعض تو خالق ہی چند مانتے تھے یعنی یہ کہتے تھے۔ کہ بڑی چیزوں کا بنانے والا ایک رب ہے۔ اور چھوٹی چیزوں کا دوسرا اور بعض کہتے تھے۔ کہ عالم کا بنانے والا تو ایک ہے۔ مگر اُس کا انتظام کرنیوالے چند اکیلا رب اتنے بڑے عالم کا انتظام نہیں کر سکتا بعض کہتے تھے۔ کہ رب تو ایک ہی ہے۔ مگر صاحب اولاد ہے۔ اور بعض کہتے تھے۔ کہ رب ایک ہی ہے مگر یہ ہمارے بُت اُس کی بارگاہ میں دھونس کے ساتھ ہماری شفاعت کر سکتے ہیں بعض کہتے تھے۔ کہ رب تو ایک ہی ہے۔ اور سب اُس کے بندے ہیں۔ مگر بعض بندے اس کی طرح قدیم ہیں اور اُس سے بے پرواہ وغیرہ وغیرہ اس مختصر سے جملے میں اِن سب کی تردید فرما دی گئی۔ اور فرما دیا گیا کہ تم کسی کو کسی طرح بھی رب کا ہمسر نہ جانو نہ ذات میں نہ صفات میں نہ الوہیت کے دخیل ہونے میں اور نہ وجود میں۔ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ میں یہ بتایا گیا۔ کہ عقلاً و نقلاً ہر طرح تم جان چکے کہ خالق ایک ہی ہے اور اب اگر تم شرک کرو گے۔ تو تمہارا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہو گا۔ **خلاصۂ تفسیر** اس آیت کا اصل مضمون یہ ہے۔ کہ اے لوگو تم اپنے اُسی رب کی عبادت کرو جو عبادت کے لائق ہو۔ اور عبادت کے لائق وہی ذات ہو سکتی ہے جو بڑی عظمت اور قدرت والی ہو نہ کہ تمہارے وہمی اور خیالی معبود وہ عظمت والی ذات وہ ہے جس نے تم کو اور تمہارے باپ دادوں کو پیدا فرما دیا عبادت بھی اس امید پر کرو۔ کہ تم کو حق تعالیٰ کی طرف سے تقوے کا انعام مل جائے کیونکہ جب آئینہ آفتاب کے سامنے آجاتا ہے۔ یا کوئلہ اور لوہا کچھ دیر آگ میں رہ لیتا ہے۔ تو ضرور اُس میں آفتاب اور آگ کا اثر آجاتا ہے جس سے کہ وہ آفتاب اور آگ کا کام کرتا ہے۔ اسیطرح اگر تم بھی عبادت کے ذریعے سے اپنے رب سے تعلق قائم کرو گے تو ضرور رب کی رحمت تمہاری دستگیری کرے گی۔ اور تم کو تقوے حاصل ہو جائیگا جس سے کہ تم سے خلاف عادت کام یعنی (کرامتیں) صادر ہونے لگیں گی۔ اُس خالق حقیقی کی پہچان یہ ہے۔ کہ اُس نے تمہارے آرام کے لئے زمین کے ایک ٹکڑے کو پانی سے باہر نکالا اور پھر اُس کو گارے کیطرح نرم اور لوہے کی طرح سخت نہ کیا اور نہ اس کی گولائی ایسی رکھی جس سے تم اُس پر ٹھہر نہ سکو۔ غرضکہ ہر طرح اُس کو تمہارے لئے بستر کی طرح آرام دہ بنایا پھر یہ کرم فرمایا۔ کہ زمین پر آسمان کا خیمہ لگایا جس سے کہ یہ جہان ایک گھر کی طرح ہو گیا۔ اور تم کو اُس میں رکھ کر تمہاری روزانہ تین دعوت کا انتظام فرمایا۔ کہ پانی برسا کر رنگ برنگے پھول پھل پیدا فرمائے۔ اب تم خود ہی غور کرلو۔ کہ اگر کوئی دولتمند تم کو معمولی تنخواہ پہ نوکر رکھے۔ تو تم ہر طرح اُس کی خدمت اطاعت کرتے ہو۔ جو رب کہ تم پر اتنے احسانات فرمائے۔ اُس کو چھوڑ کر اوروں کی عبادت کرنا یا اوروں کو اُس کا شریک جاننا بالکل خلاف انسانیت ہے یا کہ نہیں۔ **اس آیت کے فائدے**۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ جو شخص رب کی عبادت نہ کرے۔ وہ انسان نہیں کیونکہ یَاَیُّهَا النَّاسُ فرمایا گیا۔ **دوسرے** یہ کہ کافروں پر بھی عبادت کرنا فرض ہے۔ کہ جس کے نہ کرنے پر اُن کو عذاب ہو گا۔ کیونکہ یہاں سارے انسانوں سے فرمایا گیا۔ کہ عبادت کرو۔ جیسے کے بے وضو پر فرض ہے۔ کہ وضو کرے اور نماز پڑھے۔ ایسے ہی کافر پر فرض ہے۔ کہ ایمان لائے۔ اور نماز پڑھے

وتفسیر خزائن العرفان) لیکن فرق اس قدر ہے۔ کہ کافر پر نماز وغیرہ کی فرضیت شرعی نہیں۔ اسی لئے جو کافر مسلمان ہو اُس کو زمانۂ کفر کی نمازیں قضا کرنی لازم نہیں بلکہ فرض ہونے کے یہ معنی ہیں۔ کہ دوزخ میں اُن کو کفر کرنے اور عبادت نہ کرنے کا عذاب ہوگا۔ چنانچہ جب دوزخیوں سے مسلمان پوچھیں گے۔ کہ تم دوزخ میں کیوں آئے۔ تو وہ جواب میں اپنے کفر کے ساتھ بدعملیوں کا ذکر بھی کریں گے۔ اور کہیں گے کہ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ کہ ہم نمازی نہ تھے اور صدقات نہ دیتے تھے وغیرہ وغیرہ **تیسرا** یہ کہ عبادت کا فائدہ عابد ہی کو ملتا ہے۔ خدا تعالیٰ اس سے پاک ہے۔ کہ کسی کی عبادت سے فائدہ خود حاصل کرے۔ اس لئے ارشاد ہوا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ **چوتھا** یہ کہ باپ دادوں پر احسان اولاد پر احسان ہے اسی لئے فرمایا گیا۔ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

**تفسیر صوفیانہ** چونکہ عبادت میں تکلیف بھی ہوتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے بندوں کو براہ راست پکارا تاکہ اس پکارنے کی لذّت سے عبادت کی مشقّت بھول جائیں اور سمجھیں کہ عبادت ایسی پیاری چیز ہے۔ کہ جس کی برکت سے ہمارے پیارے نے ہم کو پکار لیا۔ اگر ہم جان بھی قربان کردیں تو اس پکارنے کی نعمت کا شکریہ ادا نہیں ہوسکتا اور کیسے پکارا کہ اے بھولنے والے انسانو! تم دنیا میں آکر ہمیں بھول گئے۔ مگر ہم تمہیں نہ بھولے آؤ۔ اب بھی وقت ہے۔ اپنے اُس رب کو پوجو جس نے ہر وقت تمہارا خیال رکھا۔ اپنی بندگی کو یہاں تک ظاہر کرو کہ تم فنا فی اللہ ہوکر ماسوی اللہ سے علیحدہ ہو جاؤ جس سے تم کو متقی کا خطاب مل جائے وہ اللہ وہ ہے جس نے تمہاری قلب کو زمین بنایا اور اُس کی طرف اپنے محبوب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو آسمان کی طرح سایہ دینے والا مقرر کیا۔ اس آسمان نبوت سے تمہارے قلب کی زمین پر قرآن کا پانی برسایا جس سے کہ ہدایت اور تقویٰ اور نور اور رحمت اور شفاء اور برکت نیک بختی نجات قرب الٰہی صلاح اور کامیابی اور حکمت اور علم اور حلم اور آداب اور اخلاق اور عزت اور غنا کے پھل پیدا ہوئے۔ لہٰذا تم اِن دلوں سے ماسوی اللہ کی محبت نکال ڈالو اپنے دل کو صرف رب کا تجلّی گاہ بناؤ جب ہم تمہارے ہیں تو تم بھی ہمارے ہو جاؤ **حکایت** حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن حساب وکتاب کا وعظ فرمایا جس سے کہ لوگ چیخیں مار کر رونے لگے۔ اسی حال میں حضرت ابوالحسن نوری وہاں سے گذرے اور فرمایا۔ کہ اے شبلی اللہ کے بندوں کو کیوں اتنا پریشان کرتا ہے۔ قیامت کا حساب بہت دراز نہ ہوگا اُس کا لب لباب صرف یہ دو باتیں ہیں کہ فرمایا جائے گا۔ کہ من ترا بودم تو کرا بودی یعنی اے بندو ہم تو تمہارے تھے۔ تم کس کے تھے۔ خداوندا تو اپنے فضل وکرم سے ہم کو اپنا بنا لے **پہلا اعتراض دیوبندیوں کا**۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ خالق کے سوا دوسرے سے مدد لینی اور مصیبت کے وقت پکارنا شرک ہے۔ اس ہی کی یہاں تردید کیجاتی ہے مشرکین عرب یہی سمجھتے تھے کہ دنیا کے انتظام میں ہماری معبودوں کو دخل ہے۔ اسی لئے وہ اُن سے مرادیں مانگتے تھے اس زمانے کے مسلمان بھی سمجھتے ہیں کہ نبیوں اور ولیوں کو عالم کاروبار میں دخل ہے اور اُن سے وہ بھی مرادیں مانگتے ہیں لہٰذا یہ بھی مشرک **جواب** بزرگان دین سے مدد مانگنے کی پوری بحث ہم اپنی کتاب جاء الحق میں کی ہے اور بقدر ضرورت وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی تفسیر میں کرچکے ہیں۔ یہاں صرف اتنا بتاتے ہیں۔ کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے تفسیر عزیزی میں اسی آیت کے ماتحت اطاعت اور عبادت میں بڑا اچھا فرق بیان فرمادیا ہے وہ یہ کہ حاکم کا حکم بجالانے کو اطاعت کہتے ہیں اور اپنی بندگی کے اظہار کرنے کو عبادت کہتے ہیں غیر اللہ کی اطاعت تمام دینوں میں جائز ہے پیغمبر اور مرشد عالم دین اور حاکم وقت کی اطاعت ہر شخص کرتا ہے لیکن ان میں سے کسی کی عبادت کوئی مسلمان نہیں کرتا کیونکہ معبود ہونے کے لئے ذاتی عظمت ضروری ہے۔ اور اطاعت میں یہ لازم نہیں۔ اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ کسی کو اپنا مستقل اور ذاتی حاکم مان کر اور اپنے کو اُس کا بندہ سمجھ کر اُس کی فرماں برداری کرنا عبادت ہے۔ اور کسی کو غیر مستقل مجازی عطائی حاکم مان کر اور اپنے کو اُس کا ماتحت اور غلام سمجھ کر اُس کی فرماں برداری کرنا عبادت نہیں۔ اس سے مشرکین اور مسلمانوں میں بڑا فرق ہو گیا۔ **دوسرے سوال کا جواب یہ ہے** کہ بیشک حق تعالےٰ نے فرشتوں انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کو اپنی خلقت کا انتظام سپرد فرمایا ہے جس کا ثبوت قرآن کریم اور حدیث پاک سے ہے۔ بچہ بنانے جان نکالنے وغیرہ وغیرہ کاموں کے لئے فرشتے مقرر ہیں لیکن اس بارے میں مشرکین اور مسلمین کے عقیدے میں یہ فرق ہے۔ کہ مشرکین سمجھتے تھے کہ حق تعالیٰ یہ سارے کام خود بخود نہیں کرسکتا مجبوراً ہمارے بتوں کو مقرر کیا گیا۔ جیسے کہ دنیوی بادشاہ مجبوراً افسروں کو مقرر کرتے ہیں مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ سب حق تعالےٰ کے بندے اور خدام بارگاہ ہیں۔ خدائی میں دخیل نہیں حق تعالیٰ نے محض اپنے کرم سے اُن کو

یہ مرتبہ عطا فرمایا۔ **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تقویٰ عبادت کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ عبادت خود تقویٰ ہے **جواب** اس کا جواب اسی آیت کی تفسیر میں گذر گیا۔ کہ تقویٰ قلب کی ایک صفت ہے۔ اور اکثر عبادت ظاہری بدن سے ہوتی ہے۔ اور چونکہ ظاہری جسم کا اثر دل پہ پڑتا ہے۔ اس لئے ظاہری عبادت سے دل پرہیزگار بنے گا۔ جیسے قرآن کریم نے فرمایا اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ صلوٰۃ عبادت ہے اور برائیوں سے بچنا تقویٰ

**وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا**

اور اگر ہو تم بیچ شک کے سے اس جو ہم نے اوتارا اوپر بندے ہمارے کے پس لاؤ ایک سورۃ کو سے مثل اس کے اور بلالو

اور اگر تمہیں کچھ شک ہو۔ اس میں جو ہم نے اپنے خاص بندے پر اوتارا تو اس جیسی ایک سورت تو

**شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۳﴾**

مددگاروں اپنے کو سے سوا اللہ کے اگر ہو تم سچے

لے آؤ۔ اور اللہ کے سوا اپنے سب حمائیتیوں کو بلالو اگر تم سچے ہو۔

**تعلق**۔ اس آیت کو پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ پہلے حق تعالےٰ کی ذات وصفات کا ذکر فرمایا گیا جس سے اُن لوگوں کی تردید ہوگئی۔ جو حق تعالیٰ کی ذات اور اُس کی صفات کے منکر تھے۔ اب نبوّت کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ تاکہ نبوّت کے منکرین کی تردید ہو جائے۔ لیکن جس طرح کہ حق تعالےٰ نے اپنی پہچان اپنی مخلوق کے ذریعے سے کرائی۔ اسی طرح نبی کی پہچان بذریعہ کتاب **دوسرے** یہ کہ اس سے پہلے بندوں کو عبادت کا حکم دیا گیا۔ اور عقل انسانی مقبول اور غیر مقبول عبادت میں فرق نہیں کر سکتی۔ بہت سے عقلمند لوگ بُت پرستی کو مقبول عبادت سمجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے بندوں کو ضرورت تھی۔ کہ حق تعالیٰ خود اپنی مقبول عبادت کا طریقہ بتائے۔ اور یہ تعلیم صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ اُسکی طرف سے کوئی قانونی کتاب بندوں کو ملے جسکا کتاب اللہ ہونا کھلی ہوئی دلیل سے ثابت ہو **تیسرا** یہ کہ پہلے بندوں کو تو خدا تک پہنچنے کا حکم دیا گیا۔ ابھی بتایا جا رہا ہے کہ اے بندو تم ادنیٰ ہم اعلیٰ تمہاری پہنچ ہم تک کیسے ہو سکتی ہے اس لئے درمیان میں ایک واسطہ رکھا جاتا ہے جسکا نام نبی ہے تم اُن تک پہنچو۔ اور اُن تک پہنچنا گویا ہم تک پہنچنا ہوگا۔ اُس ذات کی نبوت ثابت کرنیکیلئے عربوں کے مذاق کے مطابق دلیل قائم فرمائی گئی بہرحال یہ آیت کتاب اور نبوّت دونوں کے متعلق ہے **تفسیر**. وَاِنْ كُنْتُمْ اِن شک کے موقعہ پر بولا جاتا ہے۔ اور کفار کا شک کرنا یقینی تھا۔ لہٰذا اس جگہ اِن لانا حکیمانہ طریقہ تعلیم کی بنا پر ہے عقلمند واعظ اپنے مخالفین کی جماعت میں کھڑے ہو کر یہ نہیں کہتا۔ کہ تم میرے مخالف ہو۔ بلکہ یہ کہتا ہے۔ اگر تم کو میری بات میں شک ہو۔ تو فلاں فلاں دلائل پر غور کرو تمہیں میری بات کا یقین ہو جائیگا۔ جس سے کہ سننے والے ہٹ دھرمی سے باز آجاتے ہیں۔ فِیْ رَیْبٍ۔ ریب کے معنی ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یہاں یہ نہ فرمایا گیا کہ اگر تمہارے دل میں شک ہو۔ بلکہ فرمایا گیا۔ کہ اگر تم شک میں ہو جس سے معلوم ہوا کہ یہ شک ایک عارضی چیز ہے جسمیں تم مبتلا کر دیئے گئے ہو۔ اس عارضی بیماری کا علاج وہ ہے جو ہم بتا رہے ہیں۔ مِمَّا نَزَّلْنَا۔ نزّلنا تنزیل سے بنا ہے جس کے معنی ہیں آہستہ آہستہ اترنا۔ چونکہ کفار عرب یہ بھی اعتراض کرتے تھے۔ کہ خدائی کتاب ایک دم آجانا چاہیئے بشعراء کا یہ کام ہے۔ کہ دو دو۔ چار چار شعر بنا بنا کر دیوان تیار کر لیتے ہیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام بھی دو دو۔ چار چار آیتیں سوچ سوچ کر بناتے ہیں۔ اور جمع کرتے جاتے ہیں۔ اُن کے اسی شبہ کا ذکر کر کے فرمایا گیا۔ کہ اگر تم کو اس قرآن کے آہستہ اُترنے پر شک ہو تو آئندہ دلیل پر غور کرو ہم آہستہ اُترنے کے فوائد مقدمے میں بیان کر چکے ہیں عَلٰى عَبْدِنَا اس میں بھی کفار عرب کے دوسرے شبہ کا ذکر ہے۔ وہ کہتے تھے۔ کہ کلام الٰہی کسی بندے خاص کر انسان اور خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ذات پر نہ آنا چاہیئے جن کے پاس نہ مال نہ دولت نہ کسی سے علم حاصل کیا نہ علماء کی صحبت میں رہے۔ تو فرمایا گیا۔ کہ اگر تمہیں اس ذات کریم

پر قرآن کے اترنے میں شک ہے۔ تو مذکورہ علاج کرو۔ گویا یہ آیت صدہا بیماریوں کی دوا اور بہت سے شبہات کا دفعیہ ہے۔ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ سورۃ یا تو سور سے بنا ہے۔ یا سؤر سے یعنی یا تو اس کا واؤ اصلی ہے۔ یا ہمزہ سے بدلا ہوا۔ اگر واؤ اصلی ہو تو اس کے معنی ہیں شہر پناہ اور منزل درجہ اور قوت عرب والے بولتے ہیں سورۃ الاسد یعنی شیر کی قوت چونکہ قرآن کی سورۃ بھی ایک مضمون کو گھیرے ہوتی ہے۔ یا پڑھنے والا ان کو اس طرح طے کرتا ہے۔ جیسے مسافر منزلوں کو یا بمقابلے آئتہ کے سورۃ زیادہ قوی ان وجہوں سے اس کو سورۃ کہتے ہیں۔ اور اگر یہ ہمزہ والے سؤر سے بنا ہے۔ تو اس کے معنی ہوتے ہیں ٹکڑا اور بچی ہوئی چیز چونکہ سورۃ بھی قرآن پاک کا ایک جز ہے۔ اور ہر ایک دوسرے سے علیحدہ ہے۔ اس لئے اس کو سورۃ کہتے ہیں۔ اصطلاح میں سورۃ قرآن کے اس حصے کو کہتے ہیں جس میں پورا مضمون بیان ہو۔ اور اس کا کوئی نام بھی ہو۔ اور اس میں کم از کم تین آیتیں ہونی چاہئیں۔ مِنْ مِّثْلِهٖ مِن یا بیانیہ ہے۔ تو اس کے معنے ہوں گے۔ کہ ایسی سورۃ لاؤ جو قرآن کی مثل ہو۔ یا تبعیضیہ ہے۔ چونکہ کفار کہتے تھے۔ کہ لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ یعنی اگر ہم چاہیں۔ تو ایسا قرآن ہم بھی کہہ لیں۔ یا یہ فرمایا جا رہا ہے۔ اے لوگو اگر تم ایسا قرآن کہو۔ تو اس میں سے ایک سورۃ بارگاہ نبوی میں بھی پیش کرنا۔ تاکہ تم کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے۔ یا یہ مِنْ ابتدائیہ ہے۔ تب بھی اس کا مطلب وہی ہوگا۔ یعنی ایسی سورت لے آؤ۔ جو تمہارے بنائے ہوئے قرآن میں سے نکل کر آئے مثل سے مراد لفظاً اور معناً قرآن کی طرح ہونا ہے۔ یعنی وہ سورۃ لاؤ۔ جسکی عبارت اور مضمون فصاحت اور بلاغت اور غیبی خبریں دینے وغیرہ میں قرآن کی مثل ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن کریم ہر طرح بے مثل ہے مثلہ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ ماکیطرف لوٹے تو آیت کے معنی یہ بنیں گے۔ کہ قرآن کی طرح ایک سورۃ لاؤ۔ اور اس سے قرآن پاک کا بے مثل ہونا ثابت ہوگا دوسرا یہ کہ عبد کی جانب لوٹے۔ تب معنی یہ ہوں گے۔ کہ ایک سورۃ ایسی لاؤ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ہستی کیطرف سے ہو (تفسیر کبیر خازن و مدارک) یعنی پہلے تو آسمان کے نیچے ایسی ہستی تلاش کرو۔ جو میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ہو۔ پھر اس سے ایک سورۃ بنوا کر لاؤ نہ ان جیسا آج تک پیدا ہوا نہ ہو۔ لہٰذا نہ تمہیں کوئی ایسا ملے گا۔ نہ ایسا قرآن سنائے گا۔ اب آیت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بے مثل و بے نظیر ہونا معلوم ہوا حضور کی بے مثلی کی تحقیق ہماری کتاب شان حبیب الرحمٰن میں دیکھو۔ اور کچھ ہم اسی تفسیر میں امکان کذب کی مسئلے میں بیان کر چکے ہیں۔ اور زائد تحقیق انشاء اللہ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کے ماتحت کی جائیگی یہاں اتنا سمجھ لو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایمان اعمال دنیوی دینی احکام ظاہر و باطن غرض کسی وصف میں ہماری مثل نہیں وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ۔ شہداء جمع شہید کی ہے جس کے معنی ہیں حاضر مگر گواہ اور مددگار اور حاکم کو اسی لئے شہید کہتے ہیں۔ کہ گواہ اور مددگار تو موقعہ پر حاضر ہوتا ہے۔ اور حاکم مقدمے کے فیصلے کیوقت جو راہ الٰہی میں مارا جائے۔ اس کو بھی شہید اسی لئے کہتے ہیں۔ کہ وہ مرتے ہی حق تعالےٰ کی بارگاہ یا جنت میں حاضر ہو جاتا ہے یعنی دوسرے مسلمان تو قیامت کے بعد جنت میں پہنچیں گے۔ مگر یہ مرتے ہی وہاں پہنچ گیا۔ یہاں سب معنی بن سکتے ہیں۔ یعنی اے کافرو تم اپنی مدد کے لئے اپنے فرضی حاکم بتوں کو بلا لو یا اپنے ان عالموں کو بلاؤ جو تمہارے ہر بات کی گواہی دیتے ہیں۔ یا عرب کے ان فصیح و بلیغ لوگوں کو بلاؤ جو کہ تمہارے دل میں حاضر رہتے ہیں۔ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ دُوْن کے معنی ہیں۔ پاس اور قریب کتاب لکھنے کو تدوین اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اس میں مضامین ایک دوسرے کے پاس رکھے جاتے ہیں دنیا کو دنیا اسی لئے کہتے ہیں۔ کہ وہ آخرت کے قریب ہے۔ پھر بطور مجاز کم رتبہ کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ پھر اس کے بعد حد سے بڑھنے کو بھی دون کہنے لگے۔ تو معنی یہ ہوئے۔ کہ اے کافرو تم خدا کو چھوڑ کر جس کسی کو اپنا معبود یا مددگار سمجھ بیٹھے ہو۔ ان سب کو جمع کر لو۔ تاکہ وہ تمہاری اس کام میں مدد کریں۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ کفار کے سچے ہونے کا احتمال ہے۔ بلکہ چیلنج کے موقعہ پر اسی قسم کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ کہ اگر تجھ میں کچھ بل بوتہ ہے تو مقابلے میں آجا۔ **خلاصۂ تفسیر** کفار عرب قرآن پاک کے متعلق چند قسم کی بدگمانیاں کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے۔ کہ یہ کلام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود بنا کر رب کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں آسمانی اور انسانی کتاب کی ایسی اچھی پہچان بتائی گئی ہے۔ کہ سبحان اللہ وہ یہ کہ دنیا میں ہر شخص قدرتی اور مصنوعی چیز دل کو پہچان لیتا ہے دیکھو جگنو اور

چیونٹی کو ہر شخص جانتا ہے۔ کہ یہ کسی انسان کی بنائی ہوئی نہیں۔ اور ریل کے انجن اور گیس کے متعلق ہر ایک کو یقین ہے۔ کہ یہ انسان کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں۔ حالانکہ انجن کی رفتار زیادہ چیونٹی کی کم گیس کی روشنی بہت تیز اور جگنو کی بالکل ہلکی پھر کیا وجہ ہے۔ کہ آپ نے ان کو پہچانا پہچان صرف ایک ہے وہ یہ کہ انسانی چیز وہ جس کا مثل انسان سے بن سکے اور قدرتی چیز وہ جو انسان کی طاقت سے بالا ہو۔ انجن اور گیس اگرچہ بہت طاقتور چیزیں ہیں مگر دن رات کارخانوں سے بن کر نکلتے رہتے ہیں معلوم ہوا کہ یہ انسانی چیزیں ہیں چیونٹی اور جگنو اگرچہ کمزور ہیں لیکن آج تک کسی کارخانے سے نہ بنے معلوم ہوا کہ قدرتی ہیں۔ اسی قاعدے سے یہاں ارشاد ہو رہا ہے کہ اے کافرو اگر تم کو ہمارے قرآن کے کتاب الٰہی ہونے میں اور نبی کے پیغمبر خدا ہونے میں کچھ شک ہے۔ تو اور معجزات تو کیا صرف اس کلام ہی کا مقابلہ کرلو۔ کیونکہ وہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم بھی انسان ہی ہیں تمہارے ملک میں پیدا ہوئے تم بڑے بڑے زبان داں علم والے شاعر فصیح و بلیغ ہو تم نے ہر قسم کے مجمع اور میلے دیکھے ہیں۔ علماء اور شعراء کے کلام سنے ہیں۔ اہل علم اور تاریخ دانوں کی صحبتیں اٹھائیں ہیں۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو علماء کی صحبت میں رہے اور نہ انہوں نے مؤرخین کی کتابیں دیکھیں۔ بلکہ ان کی ابتدائی پرورش تو ایک معمولی سے گاؤں میں حلیمہ دائی کے گھر ہوئی۔ جہاں کہ علم کی روشنی بالکل نہ پہنچی تھی۔ پھر شروع عمر سے ہی وہ عبادت ریاضت گوشہ نشینی میں مشغول رہے۔ تم میں اور ان میں اس قدر فرق ہوتے ہوئے۔ تم کو اعلان عام دیا جاتا ہے۔ کہ وہ تو اکیلے سارا قرآن پڑھ کر سناتے ہیں۔ تم سارے ملک عرب کے علماء، فضلاء، شعراء، فصحاء، بلغاء جمع ہو کر اس کے مقابلے کی صرف چھوٹی سی ایک سورۃ ہی بنا لاؤ۔ اگر تم سب کی کوشش سے ایک سورت بھی اس جیسی بن سکے۔ تو سمجھنا۔ کہ قرآن خدائی کتاب نہیں۔ اور اگر تم سب مجبور ہو جاؤ۔ تو اسی چیونٹی اور انجن والے قاعدے سے یہاں بھی سمجھ لینا۔ کہ قرآن بشر کا نہیں بلکہ خالق بشر کا ہے۔ **قرآن پاک کی خوبیاں** قرآن پاک میں لاکھوں وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے عرب کے لوگ مقابلے سے عاجز رہے ہم ان میں سے کچھ بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ **ایک** یہ کہ اسی شاعر کا کلام اعلیٰ ہوتا ہے۔ جو کہ جھوٹ اور مبالغہ سے کام لے سچی سچی اور سیدھی سادھی باتیں معمولی معلوم ہوتی ہیں مگر قرآن پاک کی یہ خوبی ہے۔ کہ جھوٹ اور مبالغہ سے بالکل پاک لیکن پھر بھی اس میں وہ کشش ہے۔ کہ سننے والے تڑپ جاتے ہیں۔ اسی قرآن نے صحابہ کرام میں وہ جوش پیدا کر دیا۔ کہ وہ گھر بار مال دولت بال بچے عیش و آرام حتیٰ کہ وطن تک چھوڑ کر حضور کے ساتھ ہو لئے سچی اور سیدھی بات کہتا ہے مگر تڑپا دیتا ہے۔ **دوسرا** یہ کہ دیکھی ہوئی چیز کی خوبیاں بیان کی جاسکتی ہیں شعراء معشوق اور شراب گھوڑا بادشاہ وغیرہ دیکھی ہوئی چیز کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ مگر بے دیکھی چیز کی تعریف کر کے اس کے اوصاف دلوں میں اتار دینا قرآن شریف کی خصوصیت ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ قیامت جنت دوزخ یہ تمام چیزیں بے دیکھی ہوئی ہیں۔ قرآن نے انہی بے دیکھی چیزوں کو ایسا منوایا۔ کہ عرب کے بڑے بڑے فاسق متقی پرہیز گار بن گئے۔ **تیسرا** یہ کہ بڑے بڑے شعراء کے کلام میں ایک یا دو شعر اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں۔ اور باقی معمولی۔ لیکن قرآن پاک اول سے آخر تک ایسا فصیح ہے۔ کہ اس کے مقابلے سے خلقت عاجز ہے۔ اسی لئے اس آیت میں بسورۃ فرمایا گیا۔ **چوتھے** یہ کہ اگر عمدہ سے عمدہ کلام چند بار بولا جائے۔ تو اس میں پہلی سی لذت نہیں رہتی۔ قرآن پاک کی یہ خصوصیت ہے۔ کہ ایک مضمون کو مکرر بیان فرماتا ہے۔ لیکن ہر جگہ نیا ہی لطف آتا ہے۔ **پانچویں** یہ کہ بڑے بڑے خطیب و شعراء کہتے ہیں۔ کہ عشقیہ مضامین پر لطف ہوتے ہیں لیکن حرام حلال کے مسئلے خشک جن کے بیان سے مجمع کو وجد نہیں آتا لیکن قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے۔ کہ یہ خشک مضامین بھی اس طریقے سے بیان فرماتا ہے۔ کہ سننے والوں کو وجد آجاتا ہے۔ **چھٹے** یہ کہ اچھے سے اچھا کلام ہر موقعہ پر لطف نہیں دیتا۔ خوشی کے موقعہ پر مرثیہ اور غم کے موقعہ پر دل خوش کن قصیدے نہیں پڑھے جاتے۔ قرآن پاک کی یہ خصوصیت ہے۔ کہ ہر وقت اس کا پڑھنا لطف دیتا ہے۔ خوشی و غم راحت و مصیبت جس وقت بھی پڑھا جائے دل کو تسکین اور سرور حاصل ہوتے ہیں۔ **ساتویں** یہ کہ قرآن کریم تمام علموں کی اصل ہے۔ علم کلام علم فقہ علم اصول علم نحو علم لغت علم زہد غیب کی خبریں علم اخلاق غرضکہ ہر علم پورا پورا اس میں موجود ہے اور کتابیں ایک ہی فن بیان کرتی ہیں۔ **آٹھویں** یہ کہ اعلیٰ سے اعلیٰ کلام چند بار پڑھنے سے پرانا ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے۔ کہ اس کو پڑھے جاؤ۔ لطف بڑھے جائیگا۔ **نویں** یہ کہ بہتر سے بہتر دوا اپنے میں ایک یا دو وصف رکھتی ہے۔ قرآن پاک کی یہ خصوصیت ہے۔

کہ یہ ہر جسمانی روحانی بیماری کا مکمل علاج ہے۔ اس کی عبارت تعویذ بنیں اس کا پڑھ کر دم کرنا مصیبتوں کو ٹلائے اس پر عمل کرنے سے دونوں جہاں کی بھلائیاں حاصل ہو۔ دسویں یہ کہ سارے علوم اس کے خادم اور یہ سب کا اصلی مقصود ہے۔ صرف نحو منطق فلسفہ وغیرہ اسی کے لئے پڑھا جاتا ہے پھر چند اُستاد اس کو سکھاتے ہیں۔ تب یہ آتا ہے ابتدائی استاد اس کی حروف کی پہچان کراتا ہے۔ قاری اس کے پڑھنے کا طریقہ بتاتا ہے۔ عالم اس کے مضامین ذہن نشین کراتا ہے۔ صوفی اس کی اسرار بیان فرماتا ہے۔ اتنے استادوں سے پڑھ کر پھر بھی کوئی نہیں کہہ سکتا ہے۔ کہ میں نے قرآن پورے طور پر جان لیا۔ یہ وہ وجوہ تھیں جن کی بنا پر تمام عرب کے فصحاء بلغاء مقابلے سے عاجز رہ گئے۔ **تفسیر صوفیانہ** معترضین کے اعتراضات دل کے پردے ہیں جس کی وجہ سے وہ کمال قرآن اور جمال صاحب قرآن نہ دیکھ سکے معترضین اغیار ہیں۔ اور اغیار جمال یار اور اسرار کے قابل نہیں ہوتے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ شعر

انداز حسینوں کو سکھائے نہیں جاتے — اُمی لقبی ہوں وہ پڑھائے نہیں جاتے
ہر ایک کا حصہ نہیں دیدار کسی کا! — بوجہل کو محبوب دکھائے نہیں جاتے

اس آیت میں یہ فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اے بوجہلی آنکھ والو تم اگر مگر کے چکر میں ہو اس بھنور سے نکلو۔ قرآن اور قرآن لانے والے مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کو صرف بصارت سے نہیں۔ بلکہ بصیرت سے دیکھو۔ تو تم پر اُن کے اسرار ظاہر ہو جائیں گے۔ مثنوی میں ہے

تو ز قرآں اے پسر ظاہر مبیں — دیو آدم را نہ بیند جز کہ طیں
ظاہرِ قرآں چو شخصے آدمیست — کہ نقوشش ظاہر و جانش خفی است

یہ قرآنی دلائل اور علماء و صوفیا کی صحبتیں اِن پردوں کو پھاڑنے والی قینچیاں ہیں۔ کہ عالم اصل حقیقت بتا کر اور صوفی دکھا کر اِن پردوں کو چاک کر دیتے ہیں۔ چونکہ اس آیت کا مضمون ابھی مکمل نہیں ہوا۔ اس لئے اس کے فوائد اور اعتراض و جواب آئندہ آیت کے ساتھ بیان کئے جائیں گے۔

**فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ**

پس اگر نہ کرسکو تم اور ہرگز نہ کرسکو گے پس ڈرو آگ سے وہ جو کہ ایندھن اُس کا آدمی اور پتھر ہیں

پھر اگر نہ لاسکو اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے تو ڈرو اُس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

**اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ (۲۴)**

تیار کی گئی ہے واسطے کافروں کے

تیار کر رکھی ہے کافروں کے لئے

**تعلق** ۔ یہ آیت پہلی آیت کا مقصود بیان کر رہی ہے۔ پہلے کفار کو مقابلے کا چیلنج دیا گیا تھا۔ اب یہ فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اس چیلنج سے مقصود صرف یہ ہے۔ کہ تم اپنی مجبوری معلوم کر کے قرآن پر ایمان لے آؤ نیز اس طرح بھی تعلق ہو سکتا ہے۔ کہ یہ آیت پہلی آیت کی دلیل ہو کیونکہ اس میں غیب کی خبر دی گئی ہے۔ کہ تم سے قیامت تک کبھی مقابلہ ہو سکے گا ہی نہیں۔ لہٰذا یہ قرآن اس لئے بھی بے مثل ہے۔ کہ اس میں غیبی خبریں ہیں۔

**تفسیر** فَاِنْ شک کے لئے آتا ہے۔ یہاں مخاطبین کے لحاظ سے فرمایا گیا۔ کہ اے کافرو۔ اگر تم یہ کام نہ کر سکو۔ لَمْ تَفْعَلُوْا ماضی کے معنی دیتا ہے۔ مگر یہاں اِن کی وجہ سے مستقبل کے معنی میں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کفار کے کوشش مقابلہ سے پہلے یہ فرمایا جا رہا ہے۔ یعنی تم کوشش کر دیکھو۔ پھر اگر ناکام رہو تو ایمان لے آنا۔ وَلَنْ تَفْعَلُوْا یہ غیب کی خبر ہے جس میں بلا تردد فرما دیا گیا۔ کہ سُن لو تم یہ ہرگز نہ کر سکو گے۔ اور الحمدللہ یہ خبر بالکل سچی ہوئی۔ کہ اس چیلنج سے کفار عرب کے دلوں میں آگ سی بھڑک گئی بہت کچھ مقابلے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اگر ایک سورت بھی

اُن سے بن جاتی ہے۔ تو آج تک کفار اُس کی اشاعت کرتے۔ مگر اللہ کے فضل سے اب تک سب سرنگوں رہے۔ شعر

تیرے آگے یوں ہی پیچے دبے فصحاء عرب کے بڑے بڑے ۔ کہ کوئی منہ میں زباں نہیں نہیں بلکہ جسم میں جاں نہیں

**فَاتَّقُوْا** یہ وَقِیْ سے بنا ہے جس کے معنے ہیں ڈرنا اور بچنا یہاں یہ دونوں معنی بن سکتے ہیں مقصود یہ ہے۔ کہ اُن اعمال سے بچو۔ جو جہنم کا ذریعہ ہیں۔ **اَلنَّارَ الَّتِیْ** جہنم میں ٹھنڈے طبقے بھی ہوں گے اور آگ کے ساتھ دوسری تکلیفیں بھی ہوں گی۔ لیکن صرف آگ کا اس لئے ذکر فرمایا گیا۔ کہ وہاں اکثر طبقوں میں آگ ہی ہے۔ اور آگ اصل ہے۔ اور باقی تکلیفیں اس کے تابع **اَلَّتِیْ** سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہنم کی ہر آگ کا ایندھن آدمی اور پتھر نہیں ہیں۔ بلکہ اُس آگ کا جو انسان کفار کیلئے بنی ہے کیونکہ جس طبقے میں کفار جن رہیں گے۔ اُس کا ایندھن جن ہیں۔ اور جس طبقے میں کچھ روز کے لئے گنہگار مسلمان رہیں گے۔ اُس کا ایندھن اِن کے بداعمال ہوں گے۔ نہ کہ وہ خود (تفسیر روح البیان و تفسیر کبیر) **وَقُوْدُ** اس کے لفظی معنی ہیں روشن کرنا اور بھڑکانا یہاں مراد روشن کرنے کا آلہ یعنی ایندھن ہیں۔ **اَلنَّاسُ** میں مراد کافر انسان ہیں۔ **وَالْحِجَارَۃُ** اس میں تین قول ہیں بعض حضرات فرماتے ہیں۔ کہ اس سے گندھک مراد ہے کیونکہ اُس کی آگ بہت تیز ہوتی ہے اور دیر میں بجھتی ہے۔ اور اُس میں گرمی کے ساتھ سخت بدبو بھی ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا۔ کہ اس سے مراد بُت ہیں۔ کیونکہ کفار اِن بتوں کو خدا مانتے تھے۔ وہاں اِن کی ذلت کیلئے یہ پتھر بھی آگ میں ڈال دیئے جائینگے۔ بعض نے فرمایا۔ کہ اس سے مراد عام پتھر ہیں۔ تو آیت کا مقصود یہ ہوا۔ کہ دینوی آگ پتھر سے بجھ جاتی ہے۔ لیکن اُس آگ کی تیزی کا یہ عالم ہے۔ کہ وہ پتھروں سے اور بھڑکے گی **اُعِدَّتْ** اس سے معلوم ہوا۔ کہ وہ آگ کافروں کیلئے بنی ہے پتھروں وغیرہ کا اُس میں جانا۔ اِن کافروں کے طفیل ہے۔ اِسی طرح گنہگار مسلمان بھی اگرچہ دوزخ میں جائینگے لیکن کافروں کے تابع ہوکر جیسے لوہار کی بھٹی ٹیڑھے لوہے کو سیدھا کرنے کیلئے بنی ہے۔ مگر اس میں کوئلے بھی جلتے ہیں۔ اور کبھی میلے لوہے کو اُس کے ذریعے صاف بھی کر دیا جاتا ہے **خلاصہ تفسیر**۔ جب کفار کو قرآن کریم کے مقابلے کا اعلان دیا جا چکا۔ تو اُن کو بتایا گیا۔ کہ اگر تم اس مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکو اور ہم تم سے کہہ دیتے ہیں۔ کہ کبھی بھی نہ ہو سکو گے۔ تو سمجھ لینا۔ کہ اس کا انکار حقیقت میں خدائے قادر کا مقابلہ ہے۔ اور اُس کا مقابلہ کرنا جہنم میں ٹھکانا بنانا ہے جہنم کی آگ کی تیزی کا یہ حال ہے۔ اور دوسری آگ تو نرم اور پتلی لکڑیوں سے سُلگتی ہے لیکن وہ پتھروں اور آدمیوں سے سُلگتی ہے۔ یا دوسری آگ میں لکڑیاں جلتی ہیں لیکن اُس میں انسان اور پتھر جلتے ہیں۔ لہذا تم کو لازم ہے۔ کہ آگ سے بچنے کا سامان کرو یعنی اس قرآن پر ایمان لے آؤ اور اس کو اپنا دستور العمل بناؤ۔ **فائدے**۔ اِن آیتوں سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ ایک یہ کہ قرآن کریم معجزہ ہے۔ اگلے انبیاء کرام کے معجزے قصے بن کر رہ گئے۔ لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ یعنی قرآن شریف قیامت تک لوگوں کے سامنے رہیگا۔ **نوٹ ضروری**۔ جو عجیب بات مدعی نبوت کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا۔ کہ اُس سے اُس نبی کی سچائی معلوم ہو۔ اُسے معجزہ کہتے ہیں۔ اور پیغمبروں کو ایک ایک یا دو دو معجزے ملتے تھے۔ سب سے زیادہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئے یعنی نو لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چھ ہزار (۶۰۰۰) معجزے تو روایتوں میں آتے ہیں۔ اُن سب میں بڑا معجزہ قرآن کریم ہے۔ اور حق یہ ہے۔ کہ خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم از سر مبارک تا قدم پاک معجزہ ہیں یعنی آپ کا ہر عضو شریف معجزہ بلکہ ہر وصف ہر حال معجزہ ہے۔ اس کی پوری تحقیق ہمارے کتاب شان حبیب الرحمٰن میں دیکھو۔ اور انشاء اللہ اس آیۃ کے ماتحت بھی عرض کی جائیگی۔ **قَدْ جَآءَکُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ** اور جو عجیب باتیں انبیاء اکرام سے بچپن شریف میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کو ارہاص کہتے ہیں۔ جیسے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا پیدا ہوتے ہی کلام فرمانا یا ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انکے بچپن شریف میں پتھروں کا کلام و سلام کرنا۔ اور جو عجیب باتیں اولیاء اللہ کے ہاتھ پر ہوتی ہیں۔ انہیں کرامت کہتے ہیں۔ بُت پرست جوگیوں اور دیگر کفار سے جو عجیب باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اُن کو اِستدراج کہتے ہیں۔ جیسے دجّال کے ہاتھ پر عجائبات کا ظاہر ہونا **معجزے تین طرح کے ہوتے ہیں** **ایک** وہ جو کہ ہر وقت نبی کے ساتھ رہتے ہیں۔ جیسے کہ حضور کے جسم اطہر کا بے سایہ ہونا۔ یا دندان مبارک سے نورانی شعاع کا نکلنا دوسرے وہ جو ہر وقت اُن کے قبضے میں رہتے ہیں۔ کہ جب چاہیں۔ تب ظاہر فرما دیں۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کا ید بیضا اور لاٹھی کا سانپ بن جانا تیسرے وہ جن کا

ظاہر ہونا صرف رب کے کرم پر موقوف ہوتا ہے پیغمبر کا اس پر قبضہ نہیں ہوتا جیسے قرآن پاک کی آیتوں کا اترنا **دوسرا فائدہ** ہر زمانے کے پیغمبر کو اسی قسم کا معجزہ عطا ہوا۔ جس کا اس زمانے میں بہت زور تھا موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادو کا زور تھا۔ تو آپکی لاٹھی کو سانپ بنانے کا معجزہ دیا گیا حضرت عیسےٰ علیہ السلام کے زمانے میں علم طب کا بہت شور تھا تو آپ کو مردہ زندہ کرنے اور اندھوں کو اچھا کرنیکا معجزہ دیا گیا جس کا تعلق علم طب سے ہے ہمارے حضور کے زمانے میں فصاحت بلاغت بہت زوروں پر تھی اسلئے آپکو قرآن کا معجزہ عطا فرمایا گیا۔ لہذا اگر مرزا جی بھی نبی ہوتے تو ان کو سائنسی ایجادات کا معجزہ ملنا کیونکہ آجکل اسی کا زور ہے۔ مگر انہوں نے خطبہ الہامیہ بطور معجزہ پیش کیا جس سے قدسو غلطیاں حضرت پیر قبلہ مہر علی شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے نکالی سچ ہے کہ غلط نبی کے غلط معجزے چاہیئے **تیسرا فائدہ** اس سے معلوم ہوا کہ ہر امر وجوب کیلئے نہیں ہوتا۔ قرآن کریم میں امر سولہ معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ امر فاتو اظہار عجز کے لئے ہے۔ **چوتھا فائدہ**۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہنم میں پیدا ہو چکا۔ کیونکہ اُعِدَّتْ فرمایا گیا جو کہ ماضی ہے۔ **پانچواں فائدہ** اس سے اشارۃً معلوم ہوا۔ کہ مسلمان جہنم میں ہمیشہ نہ رہیں گے کیونکہ جہنم صرف کفار کے لئے بنی ہے مسلمان عارضی طور پر وہاں رہیں گے **چھٹا فائدہ** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ فقط حرفوں کے یکساں ہونے سے کوئی کلام قرآن کی مثل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کفار یہ نہ کہہ سکے۔ کہ ہمارا عربی کلام بھی انہی ۳۲ حرفوں سے بنا ہے جس سے قرآن کی عبارت بنی ہے۔ لہذا ہمارے قصیدے قرآن کی مثل ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ظاہری اعضاء اور ظاہری حالات کی بنا پر ہماری مثل نہیں جو شخص ان ظاہری اوصاف کو دیکھ کر اپنے کو ان کی مثل سمجھے وہ حماقت میں کفار مکہ سے بڑھ کر ہے۔ انشاء اللہ اس کی پوری تحقیق اور موقع پر کی جائیگی۔

**پہلا اعتراض آریوں کا** جس طرح قرآن کریم کا مثل کسی سے نہ بن سکا۔ اسی طرح ہمارے وید کا مثل بھی آج تک کوئی نہ بنا سکا چاہیئے کہ اس کو بھی کلام الہٰی مان لو۔ **جواب** وید نے کبھی کسی کو اپنے مقابلے کا چیلنج دیا ہی نہیں۔ تو اس کا مقابلہ کون کرتا۔ رستم پہلوان تو کہہ سکتا ہے۔ کہ میں نے اخباروں میں اپنے مقابلے کے چیلنج دیئے مگر کوئی سامنے نہ آیا۔ مگر بدھوا چھدوا کمزور لوگ یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ میرے مقابلے میں بھی آج تک کوئی نہیں آیا۔ کیونکہ انہوں نے اپنے مقابلے کیلئے کسی کو بلایا ہی کب تھا جو کوئی آتا۔ **دوسرا جواب** یہ ہے۔ کہ وید سنسکرت زبان میں آیا۔ اور یہ زبان کسی کی ملدیعی زبان نہیں نہ اس کا کوئی ماہر مقابلے کا چیلنج اس فن کے ماہروں کو دیا جاتا ہے۔ کوئی عربی خواں انگریزی خوانوں کی جماعت کو چیلنج دے۔ تو غلط ہے۔ اس کو چاہیئے کہ عربی علماء کے مجمع میں اعلان کرے۔ قرآن کریم عربی زبان میں آیا۔ اور ملک عرب میں آیا۔ اس زمانے میں آیا جبکہ فصاحت و بلاغت پر ناز کرنے والے لوگ وہاں موجود تھے۔ پھر اس نے سب کو للکارا کہ اگر کچھ بل بوتا ہے۔ تو آؤ ہمارا مقابلہ بھی کر لو۔ بے چارہ وید کس کو پکارتا۔ وہ تو بقول تمہارے ایسی بے ڈھنگی زبان میں آیا جس کا ماہر دنیا میں موجود نہیں۔ **دوسرا اعتراض عیسائیوں کا**۔ اگر یہ بات صحیح ہے۔ کہ خدائی کتاب کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ تو چاہیئے توریت و انجیل کو صحیح مانا جاوے۔ مگر تم کہتے ہو۔ کہ لوگوں نے ان میں اپنی طرف سے آیتیں بڑھا بھی دیں اور گھٹا بھی دیں بدل بھی دیں۔ انسانی بنائی ہوئی آیتیں خدا کی بھیجی ہوئی آیتوں کے ساتھ کیسے مل گئیں۔ ان میں فرق کیوں نہ ہو سکا۔ **جواب** ان کتابوں کی عبارتیں معجزہ بنا کر نہ بھیجی گئی تھیں۔ کیونکہ اس زمانے میں عبرانی زبان دان اپنی فصاحت پر نازاں نہ تھے۔ اور پھر بھی جو بناوٹی آیتیں ان میں بڑھائی گئیں وہ بھی کسی طرح اصلی آیتوں سے حقیقتاً مل جل نہ سکیں۔ زمین و آسمان کا ان میں فرق رہا۔ لیکن لوگ اپنی بے علمی سے اس فرق کو محسوس نہ کر سکے۔ کلام کا فرق اس کا جاننے والا کر سکتا ہے۔ آج اگر کوئی شخص جاہل دیہاتیوں کو کوئی عربی سنا کر کہہ دے۔ کہ یہ قرآن شریف ہے۔ وہ یقیناً محض عبارت سے نہ پہچان سکیں گے یہی معاملہ وہاں ہو گیا۔ **لطیفہ** پنڈت دیانند سرسوتی نے کتاب اللہ کی تین پہچانیں بتائی ہیں۔ **ایک** یہ کہ وہ دنیا میں ہمیشہ سے ہو۔ وید چونکہ ہمیشہ سے ہے۔ اور قرآن کچھ دنوں سے آیا ہے۔ لہذا وید ہی خدائی کتاب ہے۔ **دوسرے** یہ کہ اس میں ( نسخ یعنی تبدیلی نہ ہو **تیسرے** یہ کہ وہ کسی خاص قوم کی زبان میں نہ ہو۔ بلکہ ایسی زبان میں ہو جو سب کیلئے اجنبی ہو ورنہ خدا طرفدار ٹھیرے گا۔ کہ اپنا کلام ایک قوم کیلئے آسان کر دیا۔ دوسری کیلئے مشکل یہ دونوں وصف بھی وید میں ہیں قرآن میں نہیں لہذا وید ہی خدائی کتاب ہے۔ **چوتھے** یہ کہ اس میں ایک مضمون کو بار بار بیان نہ کیا گیا ہو۔ یہ خوبی بھی وید میں ہی ہے قرآن تو ایک ہی مضمون کو بار بار بیان کرتا ہے۔ لہذا یہ خدائی کتاب نہیں ہو سکتی۔ **مگر یہ چاروں اصول بالکل غلط اور عقل کیخلاف**

ہیں۔ خدائی چیز کی پہچان ایسی ہونی چاہیئے جو ہر جگہ کام دے۔ اگر پہلی پہچان صحیح ہو۔ تو چاہیئے کہ دنیا کی کوئی چیز بھی خدا کی بنائی ہوئی نہ ہو۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی ہمیشہ سے نہیں دن رات آسمان زمین چاند سورج سب ہی کچھ عرصے سے بنے ہیں۔ بولو پنڈت جی تم بھی خدا کے بنائے ہوئے ہو کہ نہیں تم بھی کچھ عرصہ پہلے ہی بنے ہو۔ اگر دوسری پہچان صحیح ہو تو بھی دنیا کی کوئی چیز خدا کی نہ ہوگی۔ کیونکہ ہر چیز میں تبدیلی ہے۔ دن جاتا ہے رات آتی ہے اسی طرح ہمارا بچپن۔ جوانی۔ بڑھاپا۔ تندرستی۔ بیماری سب بدلتے رہتے ہیں۔ چاہیئے۔ کہ ان میں سے کوئی بھی خدائی نہ ہو۔ اسیطرح اگر تیسری پہچان صحیح ہو تو بھی دنیا کی کوئی چیز خدائی نہ رہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی ساری نعمتیں خاص مخلوق کے ذریعے عالم کو ملتی ہیں۔ آفتاب کے ذریعے سے روشنی بادل کے ذریعے سے بارش تالاب اور دریا کے ذریعے سے پانی عالموں کے ذریعے سے علم مالداروں کے ذریعے سے مال بادشاہ کے ذریعے سے انصاف عام مخلوق کو ملتا ہے۔ تو اگر اہل عرب کے ذریعے قرآن ساری دنیا کو ملے۔ تو کون سی بُری بات ہے۔ چوتھی پہچان بھی غلط ہے۔ اگر یہ صحیح ہو۔ تو بھی دنیا کی کوئی چیز خدا کی نہیں ہو سکتی کیونکہ دن رات بار بار آتے ہیں موسم فصلیں اور پھل وغیرہ سب بار بار ہی آتے رہتے ہیں۔ اگر قرآن پاک میں ایک مضمون بھی بار بار آئے تو کیا خرابی ہے جس مضمون کو خوب یاد کرانا منظور ہوتا ہے۔ وہ بار بار بیان کیا جاتا ہے نیز قرآن کریم جس مضمون کو چند جگہ بیان فرماتا ہے اس میں ہر جگہ نیا لطف اور نئی حکمتیں ہوتی ہیں۔ یہ تو قرآن کی حقانیت کی دلیل ہے۔ کہ ایک چیز کئی جگہ بیان ہو۔ مگر نئے انداز سے اور نرالے طریقے سے بہر حال یہ پہچانیں سب غلط ہیں۔ صحیح پہچان وہی جو قرآن پاک نے فرمائی۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

اور خوشخبری دو تم اُن کو جو ایمان لائے اور کئے انہوں نے اچھے کام کہ تحقیق واسطے اُن کے باغات ہیں کہ بہتی ہیں سے نیچے اُن کے نہریں

اور خوشخبری دے اُنہیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے۔ کہ اُن کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں رواں

كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا

جب کبھی دے جاویں گے وہ اُس سے کوئی پھل کھانے کیلئے تو کہینگے وہ یہ وہ ہی ہے جو دیئے گئے ہم پہلے اس سے اور دیئے جاوینگے وہ لوگ وہ پھل ملتے جلتے ہیں

جب اُنہیں ان باغوں سے کوئی پھل کھانے کو دیا جاوے گا صورت دیکھ کر کہیں گے یہ تو وہی رزق ہے جو ہمیں پہلے ملا تھا۔ اور وہ صورت میں ملتا جلتا انہیں دیا جاویگا۔

وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٥﴾

اور واسطے اُن کے اُس میں بیویاں ہیں پاک وصاف اور وہ لوگ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

اور اُن کے لئے اُن باغوں میں ستھری بیبیاں ہیں اور وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے۔

**تعلق** اس آیت کا گزری آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک** یہ کہ اس سے پہلے جہنم کا ذکر تھا۔ اب جنت اور اس کے مستحقین کا ذکر فرمایا گیا۔ کیونکہ ہر چیز اپنے مقابل سے خوب پہچانی جاتی ہے۔ **دوسرے** یہ کہ ہر حکم کو تین طرح قبول کرایا جاتا ہے۔ دلیلوں سے ڈرا کر لالچ دے کر۔ اس سے پہلے قرآن پاک کی حقانیت دلائل سے بیان فرمائی گئی پھر اس کے نہ ماننے پر عذاب سے ڈرایا دھمکایا گیا۔ اب اس کے ماننے پر ثواب کی امید دلائی گئی۔ کیونکہ دنیا میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں بعض تو دلائل سے بات مان لیتے ہیں۔ اور بعضے خوف سے۔ بعضے لالچ سے۔ یا یوں کہو کہ انسان کی عقل دلیل سے بات مانتی ہے۔ اور دل ڈر سے نفس لالچ سے انہی تین چیزوں کا یہاں ذکر ہوا **تیسرا** یہ کہ انسان کو ضروری ہے۔ کہ تین چیزیں معلوم کرے۔ ایک اپنی ابتدا کہ میں کہاں سے آیا دوسرے اپنی غذا کہ میں کہاں سے کھاتا پیتا ہوں تیسرے اپنی انتہا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ اس سے پہلے دو چیزوں کا ذکر تو ہو گیا تھا۔ کہ اَلَّذِيْ خَلَقَكُمْ میں انسان کی ابتداء اور اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ میں اس کی غذا کا ذکر فرمایا گیا۔ یہی انتہا وہ کفار کی تھی اور یہی مسلمانوں کی اور۔ لہٰذا پہلے کفار کی انتہا بیان فرما کر اب مسلمانوں کی انتہا کا ذکر ہو رہا ہے۔

تفسیر۔ وَبَشِّرِ۔ یہ لفظ بشارت سے بنا ہے جس کے معنے ہیں خوشخبری اور خوشخبری کو بشارت اس لئے کہتے ہیں۔ کہ وہ بشرہ سے بنا ہے جس کے معنے ہیں ظاہری کھال چونکہ اچھی خبر کا اثر چہرے وغیرہ پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ کہ حسن کر ہنسی آجاتی ہے۔ چہرے کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس کو بشارت کہا جاتا ہے۔ یہاں یا تو صرف حضور سے خطاب ہے یعنی اے نبی صلے اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو آپ خوشخبری دیجئے یا عام علماء اور واعظین سے یعنی اے علماء اور واعظو تم مسلمانوں کو خوشخبری دیتے رہو۔ بشر کو باب تفعیل سے لایا گیا۔ جس سے معلوم ہوا۔ کہ ہمیشہ تھوڑی تھوڑی خوشخبریاں دیتے رہنا چاہیئے۔ کہ واعظ کا کوئی وعظ خوشخبری سے خالی نہ ہو۔ مگر خیال رہے۔ کہ خوشخبری کے ساتھ ڈرانا بھی ضروری ہے۔ تاکہ مسلمانوں کو امید اور خوف رہے الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اس سے یا تو قرآن پر ایمان لانا مراد ہے۔ کیونکہ پہلے اسی کا ہی ذکر ہوا۔ یا ساری ایمانی باتوں پر اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ اس ایک کلمے سے ساری ایمانیات کا ذکر ہو گیا۔ ایمان کو عمل سے اس لئے مقدم کیا گیا۔ کہ ایمان سارے نیک اعمال کی اصل ہے۔ کافر کا کوئی نیک عمل قابل ثواب نہیں۔ نیز جنت میں داخل ہونے کیلئے ایمان شرط ہے رہے نیک اعمال وہ بسا اوقات ضروری نہیں رہتے۔ جو شخص ایمان لاتے ہی مرجائے وہ یقیناً جنتی ہے۔ حالانکہ اس نے نیک کام کوئی بھی نہ کیا۔ بدکار مسلمان بھی آخر کار جنت میں ضرور پہنچیں گے۔ مگر بے ایمان جنت سے بالکل محروم ہیں۔ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ایمان کے بعد نیک عمل کا اس لئے ذکر فرمایا گیا۔ کہ کوئی شخص ایمان پر بھروسہ نہ کر بیٹھے کیونکہ ایمان بنیاد ہے اور اعمال عمارت فقط بنیاد سے مکان نہیں بن جاتا۔ بغیر عمل جنت کی طلب حماقت ہے۔ نیز ایمان نور ہے۔ اور عمل اس کی زیادتی کہ جس کی برکت سے مسلمان کا ظاہر و باطن چمک جاتا ہے۔ نیز جنت کے راستے میں صدہا خندقیں ہیں۔ یہ اعمال وہ سواری ہیں جس سے یہ خندقیں آسانی سے طے ہو جاتی ہیں بلکہ یوں کہو کہ خود ایمان کے جاتے رہنے کا ہر وقت اندیشہ ہے یہ اعمال ایمان کی روک تھام ہیں اَلصّٰلِحٰت جمع صالحۃ کی ہے جس کے معنی ہیں نیک کام اور جو جائز کام بھی رضائے الٰہی کیلئے کیا جائے وہ صالح ہے اس میں عبادات معاملات وغیرہ سب ہی داخل ہو گئے چونکہ ہر شخص سارے نیک کام نہیں کر سکتا۔ فقیر سے زکوٰۃ اور کمزور سے حج ناممکن ہے۔ اس لئے یہاں طاقت کے مطابق اعمال مراد ہیں۔ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ لھم کے مقدم کرنے سے معلوم ہوا۔ کہ جنت صرف مومن کیلئے ہے۔ جنّٰتٍ جمع جنت کی ہے جس کے معنے ہیں گھنا باغ چونکہ گھنے باغ کی زمین درختوں سے چھپ جاتی ہے۔ اس لئے اس کو جنت کہا جاتا ہے جنت میں اگرچہ اور بھی صدہا نعمتیں ہوں گی لیکن باغ ان سب میں اصل ہے۔ اس لئے اس کا ذکر ہر جگہ فرمایا جاتا ہے جنت کے آٹھ طبقے ہیں جنتِ الفردوس، جنتِ عدن، جنتِ ماویٰ، دار الخلد، دار السلام دار المقامہ، علیین، جنتِ نعیم (تفسیر عزیزی) ان کے ناموں میں کچھ اختلاف بھی ہے مسلمانوں کو ان کے اعمال کے مطابق ان طبقوں میں رکھا جاویگا۔ چونکہ سارے مسلمانوں کیلئے یہ ساری جنتیں ہیں۔ اس لئے آیت کا مطلب یہ ہوا۔ کہ جنتیں مسلمانوں میں تقسیم ہو جائینگی۔ جیسے کہ ریل میں تھرڈ سیکنڈ وغیرہ کئی درجے ہوتے ہیں۔ اور وہ سب مسافروں کیلئے ہی ہیں لیکن جتنا روپیہ خرچ کیا جائیگا اتنا ہی بڑا درجہ ملے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ اعلیٰ درجے والے ادنےٰ درجے کے بھی مالک ہوں لیکن وہ اعلیٰ میں ہی رہیں گے۔ جیسے کہ فسٹ کلاس کا مسافر تھرڈ میں سفر کر سکتا ہے مگر کرتا نہیں۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یہ ان باغوں کی صفت ہے چونکہ باغ کی سرسبزی پانی سے ہی ہوتی ہے۔ اور جس باغ میں نہریں جاری ہوں۔ وہ بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں نہریں جاری ہونگی اَنْهٰر نہر کی جمع ہے جس کے معنے ہیں چیرنا چونکہ زمین چیر کر دریا سے پانی لایا جاتا ہے۔ اس لئے اسے نہر کہتے ہیں جنت میں بھی حوض کوثر وغیرہ سے پانی آئیگا۔ اور ان باغوں میں ہوتا ہوا نکل جائیگا۔ اور یہ نہ تو بالکل نالی کی طرح تنگ ہو گی۔ اور نہ دریا کی طرح فراخ اور ٹیڑھی بل کھائی ہوئی۔ بلکہ نہایت سیدھی اور درمیانی فراخ اس لئے ان کو نہر کہا گیا بعضوں نے کہا ہے۔ کہ یہاں انھٰر سے صرف پانی ہی کی نہریں مراد ہیں۔ کیونکہ باغ کی سرسبزی صرف پانی سے ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ نہریں ہر طبقے میں ہوں گی اور بہت سی ہوں گی۔ اس لئے ان کو جمع لایا گیا بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ وہ چار قسم کی نہریں ہوں گی پانی کی شہد کی۔ دودھ کی۔ اور شراباً طہوراً کی کیونکہ یہ مومنین کے پینے کے لئے ہونگی۔ اور وہاں کی سرسبزی قدرتی ہو گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ان پھلوں میں

اِن دودھ اور شہد وغیرہ کا مزہ ہو. کیونکہ دنیا میں بھی اگر کسی درخت کی دودھ اور شہد سے پرورش کی جائے. تو اُس کے پھلوں میں لذّت اور شیرینی بڑھ جاتی ہے. (تفسیر عزیزی) کُلَّمَا رُزِقُوْا. اس کا مطلب یہ نہیں ہے. کہ جنّتیوں کے پاس رزق ہر وقت نہ ہوگا. اور کبھی کبھی دیا جائیگا بلکہ یہ مراد ہے. کہ وہاں کا ہر پھل ہر وقت میں موجود ہوگا. لیکن اُنکا کھانا وقتاً فوقتاً خواہش کے مطابق ہوگا. رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ قبل سے مراد دنیوی پھل ہوں یعنی جب جنّتی کوئی پھل پایا کریں گے. تو کہا کریں گے. کہ یہ ویسا ہی پھل ہے. جیسے ہم کو دنیا میں ملتے تھے. کیونکہ یہ اُن کے ہمشکل اور ہم رنگ ہوں گے مگر جب کھائیں گے تو مزا نرالا پائیں گے. اور یا اس سے خود جنت کے پہلے پھل مراد ہیں یعنی جنت کا ہر پھل شکل وصورت میں پہلے پھلوں کی طرح ہی ہوگا. مگر ہر بار لذّت اور ہی قسم کی ہوگی مثلاً جب بھی سیب کھائیں گے علیحدہ مزا پائیں گے. وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا. اس کا مقصود یہ ہے. کہ جنت کے پھل یا تو دنیا وی پھلوں کے ہمشکل ہوں گے. یا وہاں کے ہی پھلوں کے. اس لئے کہ اجنبی چیز کی طرف دل راغب نہیں ہوتا. اُن کے دلوں کو راغب کرنے کیلئے پھلوں کی شکل تو دنیا وی پھلوں کی طرح ہوگی مگر لذّت جُدا تاکہ اُن کو ہر بار نیا لطف آئے. تفسیر روح البیان میں فرمایا گیا. کہ ہر جنّتی کو کھانے پینے اور جماع میں سَو آدمی کی قوت دی جائے گی. اور وہاں پیشاب پاخانہ کی بالکل ضرورت نہ ہوگی. بلکہ ان کی غذا خوشبو دار پسینہ بن کر جسم سے نکل جائیگی. اَزْوَاجٌ جمع زوج کی ہے جس کے معنی ہیں جوڑا. لہٰذا یہ لفظ شوہر اور بیوی دونوں کو بولا جا سکتا ہے. مگر یہاں بیویاں ہی مراد ہیں. کیونکہ لَهُمْ کی ضمیر مذکّر تھی. اور آگے مُطَهَّرَةٌ جو کہ ازواج کی صفت ہے. وہ مونث ہے. چونکہ شوہر بیوی کا گویا مالک ہوتا ہے. اور بیوی شوہر کیلئے نعمتِ الٰہی ہے. اس لئے جنت کی عورتوں کو خواہ وہ حُوریں ہوں یا دنیاوی بیویاں. وہاں کی نعمتوں میں سے شمار کیا گیا. خیال رہے کہ جو عورت جس مسلمان کے نکاح میں مرے گی. وہ جنّت میں اُس کے ساتھ رہے گی. اسی لئے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کا نکاح کسی سے نہیں ہو سکتا. کیونکہ وہ جنّت میں حضور کیلئے خاص ہیں. اور جس عورت کا شوہر کافر ہو کر مرا. یا جو کہ کنواری ہی مر گئی. اُس کا نکاح اُن جنّتیوں میں سے کسی سے کرا دیا جائیگا. جو کہ جنّت کے بھرنے کیلئے پیدا کئے جائینگے. اور جس کی بیوی کافر ہو کر مری یا جو کنوارا ہی مر گیا. اُس کے نکاح میں صرف حوریں ہوں گی. اور جس کی بیوی بھی مسلمان مرے وہ جنّت میں اپنی اس بیوی کو بھی پائیگا. اور حوروں کو بھی. لیکن وہاں یہ دنیاوی بیویاں حسن وجمال میں حوروں سے کسی طرح کم نہ ہوں گی. روایات میں آیا ہے. کہ حضرت مریم عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت آسیہ فرعون کی بیوی جنّت میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئے گی. اس کی پوری تحقیق انشاء اللہ سورۃ مریم میں کی جائے گی. مُطَهَّرَةٌ اس سے معلوم ہُوا. کہ جنّتی عورتیں خواہ حوریں ہوں. خواہ دنیا کی عورتیں تمام ظاہری اور باطنی عیبوں اور گندگیوں سے بالکل پاک ہوں گی یعنی حیض. نفاس. پیشاب. پاخانہ. منی. تھوک. میل. ہر قسم کی بیماری وغیرہ سے بھی پاک ہوں گی. اور بد خلقی سخت زبانی. نافرمانی وغیرہ سے بھی. ایک دم دور اُن کے چہرے کا نور آفتاب کی روشنی کو شرما دے گا. فِيْهَا خٰلِدُوْنَ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے. اور کبھی نہ مریں گے. کیونکہ اُن کے جسم پر روحانیت غالب ہوگی. نہ کہ عنصریت اور فنا عنصریت کیلئے ہے. نہ کہ روح کیلئے حضرت عکرمہ فرماتے ہیں. کہ جنّتی مرد و عورتیں ہمیشہ پنتیس ۳۵ سال کے جوان رہیں گے ان کا قد حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ساٹھ ہاتھ کا ہوگا. بے ڈاڑھی ہوں گے. سب کی آنکھیں قدرتی سرمگیں ہوں گی. ہر ایک کے جسم پر ستّر جوڑے ہوں گے. ہر جوڑے کا علیحدہ رنگ ہوگا. اور وہ جوڑے ایسے شفاف ہوں گے. کہ اِن سب کا رنگ اُوپر سے نظر آئیگا. روزانہ اِن کا حسن جمال بڑھے گا نہ کبھی بوڑھے ہوں گے نہ دُبلے نہ کمزور اور نہ اُن کے کپڑے کبھی میلے ہونگے (تفسیر روح البیان) خلاصۂ تفسیر قرآنِ پاک کے نہ ماننے پر سزا کا ذکر ہو چکا. اب اُس کے ماننے کی جزا کا ذکر ہو رہا ہے. کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو صحیح معنے میں مسلمان ہوئے. اور ایمان پر ان کا خاتمہ ہُوا. اور انہوں نے عبادت. سخاوت. خوش اخلاقی وغیرہ نیک اعمال کئے اُنہیں یہ خوشخبری سنا دو. کہ اُن کے مرنے کے بعد اُس عالم میں ایسے عمدہ اور گھنے ہوئے. خوبصورت باغ دیئے جائیں گے. کہ جن میں دودھ شہد وغیرہ کی نہریں بہتی ہوں گی. اور اُن باغوں کے میووں میں عجیب لطف یہ ہوگا. کہ سب کی شکل وصورت رنگت وخوشبو تو یکساں مگر مزے الگ الگ

اس مشابہت کی وجہ سے جنتی کھاتے وقت تو سمجھیں گے۔ کہ یہ وہی میوہ ہے مگر جب کھائیں گے۔ تو ہر بار نیا ہی لطف پائیں گے۔ اور ان کو صرف کھانا اور مکان ہی نہ ملے گا۔ بلکہ ان کے دل لگنے کیلئے اور گھروں کی آبادی کیلئے نہایت پاکیزہ بیویاں بھی دی جائیں گی جو کہ ساری نفرت کی چیزوں سے پاک ہوں گی۔ صورت نہایت زیبا اور سیرت نہایت اعلیٰ ہو گی۔ ان نعمتوں پر طرہ یہ کہ ان کو بڑھاپا بیماری وغیرہ کی تکلیفیں نہیں اور موت کا کھٹکا نہیں۔ دنیا کے سارے عیش موت کی وجہ سے تلخ ہیں۔ وہاں یہ تلخی بھی نہ ہو گی۔ بلکہ وہ اپنی عیش و آرام کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ **فائدے** اس آیت سے اتنے فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ جنت پیدا ہو چکی ہے۔ کیونکہ آدم علیہ السلام وہاں رہ چکے ہیں۔ حضور معراج میں وہاں کی سیر فرما چکے ہیں۔ اور اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ جنت جنتیوں کے لئے نامزد ہو چکی ہے۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوثر دیا جا چکا ہے۔ اور دی وہی چیزیں جاتی ہیں جو موجود ہوں **دوسرے** یہ کہ جنت اور جنت والوں کیلئے فنا نہیں۔ وہ ہمیشہ باقی رہیں گے **تیسرے** یہ کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں۔ بلکہ ایمان کے علاوہ ہیں۔ کیونکہ یہاں اعمال کا ایمان پر عطف کیا گیا۔ اور عطف غیریت چاہتا ہے۔ نیز بہت سے مومنین کو عمل کا موقعہ نہیں ملتا۔ اگر عمل ایمان کے جز ہوتے تو یہ لوگ مومن کیونکر ہوتے۔ **چوتھے** یہ کہ دنیا میں حائضہ عورت سے جماع کرنا منع ہے۔ اسلئے کہ وہ گندی ہے۔ اور مرد پاک جنتی عورتیں ہر طرح پاک ہیں۔ لہٰذا جو مرد گناہوں کی پاکی میں لتھڑا ہو گا۔ وہ اُن کے پاس نہ جا سکے گا۔ **پانچواں** یہ کہ دنیا میں جو شخص حلال جماع سے جنبی ہو اُس کو مسجد میں آنا حرام ہے۔ تو جو حرام شہوتیں پوری کرے اُس کو جنت میں جانا بھی حرام ہو گا۔ کیونکہ وہ جگہ پاکوں کی ہے۔ **تفسیر صوفیانہ** جن لوگوں نے اپنے دلوں میں ایمان حقیقی (ایمان مقبول) کا بیج بویا اور اُس کو نیک اعمال کا پانی دیا تو اُس کو ایسے باغات ملیں گے جن میں توکلؔ۔ یقینؔ۔ زہدؔ۔ تقویٰؔ۔ صدقؔ۔ اخلاصؔ۔ ہدایتؔ۔ قناعتؔ۔ پاک دامنیؔ مجاہدہؔ۔ شوقؔ ذوقؔ۔ رغبتؔ۔ خوفؔ۔ امیدؔ۔ صفائی قلبؔ۔ وفاؔ۔ طلبؔ۔ محبتؔ۔ حیاؔ۔ کرمؔ۔ سخاوتؔ۔ شجاعتؔ۔ علمؔ۔ حلمؔ۔ معرفتؔ۔ عزتؔ۔ رفعتؔ۔ رحمتؔ۔ ہمتؔ کے گھنے درخت ہوں گے جن کے نیچے اللہ کی رحمت اُس کے کرم اس کی عنایت۔ اس کے فضل اور توفیق کی نہریں ہوں گی جب کبھی وہ ان درختوں سے مشاہدہ کشف تجلی انوار کے پھل پائیں گے تو کہیں گے۔ کہ یہ تو ہم اس سے پہلے بھی پا چکے ہیں۔ مگر ہر کشف میں علیحدہ لذت اور ہر تجلی میں نیا نور ہو گا۔ اس لئے کہ اس راہ میں نئے آنیوالے لوگ مشکل سے فرق کرتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طور کے نور کو نار یعنی آگ سمجھا۔ اور فرمایا۔ کہ اِنِّیْٓ اٰنَسْتُ نَارًا۔ مگر جب سالک واصل ہو جاتا ہے۔ تو ہر نار میں علیحدہ ذوق پاتا ہے۔ ان حضرات کیلئے اِس تہی باغ میں ان پھلوں کے علاوہ عالم غیب سے اور بھی رحمتوں کے جوڑے ملیں گے جو کہ اغیار کی نظر سے پاک ہوں گے۔ اور وہ ان سے واپس نہ لئے جائیں گے۔ بلکہ ہمیشہ ان کے پاس ہی رہیں گے۔ **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ جنتی لوگ ہر پھل کو دیکھ کر یہی کہیں گے۔ کہ یہ وہی پھل ہے۔ جو ہم کو پہلے مل چکا ہے۔ اس پہلے سے کیا مراد ہے۔ آیا دنیا میں پہلے مل چکا ہے۔ یا جنت ہی میں اگر کہا جائے۔ کہ دنیا میں پہلے مل چکا تھا۔ تو لازم آتا ہے۔ کہ جنت میں دنیوی نعمتوں کے علاوہ کوئی نعمت نہ ہو۔ تاکہ وہ ہر نعمت پر یہ کہہ سکیں کہ یہ تو ہم دنیا میں ہی پا چکے۔ حالانکہ قرآن کریم فرما رہا ہے۔ کہ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ اور حدیث پاک میں آیا ہے۔ کہ رب تعالیٰ نے جنت میں نیک بندوں کیلئے وہ نعمتیں مہیا فرمائی ہیں۔ جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کان نے سنی نہ کسی کے خیال میں آئیں جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جنتی نعمتیں گمان و وہم سے بھی بالاتر ہیں۔ اور یہاں فرمایا جا رہا ہے۔ کہ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا۔ ان آیات میں مطابقت کیونکر ہو سکتی ہے۔ نیز بعض جنتی فقراء اور مساکین ہوں گے جن کو دنیوی نعمتیں دنیا میں بہت کم میسر آئی تھی۔ نیز دنیا میں ہر ملک میں علیحدہ قسم کے پھل پائے جاتے ہیں۔ پھر جنتی وہاں ہر پھل کو دیکھ کر یہ کیونکر کہہ سکیں گے۔ کہ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ اور اگر اس قبل سے مراد خود جنت ہی کی پہلی نعمتیں ہیں۔ تو بھی درست نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ جنتی ہر پھل کو دیکھ کر یہی کہیں گے۔ تو جب بالکل پہلی بار وہ پھل کھائیں گے تو کیا کہیں گے **جواب** یہ اعتراض نہایت قوی ہے علماء نے اس کے دو جواب دیئے ہیں ایک یہ کہ مِنْ قَبْلُ دونوں قسم کے پھلوں کو شامل ہے یعنی جنتی پہلوں کو دیکھ کر تو دنیا کے پھل یاد کریں گے۔ اور بعض کو دیکھ کر جنت کے اگلے پھل

دوسرے یہ کہ هٰذَا الَّذِیْ میں لفظ جزاء پوشیدہ ہے یعنی جنتی ہر پھل کو دیکھ کر یہ کہیں گے۔ کہ یہ ان اعمال کا بدلہ ہے جن کی ہم کو دنیا میں توفیق ملی تھی۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ جنت کی نعمتیں درحقیقت نیک اعمال ہوں۔ جو کہ ان نعمتوں کی شکل میں ظاہر ہوئے (تفسیر عزیزی) اس کی تائید اُن احادیث صحیحہ سے بھی ہوتی ہے جن میں فرمایا گیا۔ کہ دنیوی نیک و بد اعمال آخرت میں اچھی بُری شکلوں میں ظاہر ہوں گے۔ **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بغیر اعمال جنت نہیں مل سکتی۔ کیونکہ یہاں جنت کی خوشخبری کو ایمان اور عمل دونوں سے متعلق کیا گیا۔ حالانکہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ کہ جنت بغیر اعمال بھی مل سکتی ہے **جواب**۔ یہ خوشخبری صالحین کے لئے بلاقید ہے۔ اور گنہگار مسلمان کیلئے۔ ارادہ الٰہی کی قید سے کہ اگر وہ چاہے تو اُن کے گناہ معاف فرمادے۔ اور چاہے تو سزا دے کر جنت دے (تفسیر خزائن العرفان) **تیسرا اعتراض** آریوں کا جنتی مرد اور عورت پینتیس ۳۵ سال کے نوجوان ہوں گے خوبصورت اور قوی ہوں گے۔ حالانکہ یہ لوگ دنیا میں کمزور بوڑھے وغیرہ تھے۔ اسی کا نام آوا گون ہے۔ آریہ مانتے ہیں۔ کہ دنیا ہی میں ایک روح مختلف جسموں میں آتی ہے۔ اور مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ کہ یہ معاملہ آخرت میں ہوگا۔ نیز قرآن پاک سے ثابت ہے۔ کہ بعض اُمتیں سؤر بندر وغیرہ بنادی گئیں موسیٰ علیہ السلام کا عصا کبھی سانپ بن جاتا تھا کبھی لاٹھی یہی ہمارا عقیدہ ہے **جواب**۔ اس مسئلے کی تحقیق انشاء اللہ عصاء موسوی کے ذکر کے موقعہ پر کی جائیگی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لو۔ کہ جسم کا بدلنا ممکن بلکہ واقع ہے لیکن روح کی تبدیلی ناممکن ہے۔ دن رات جسموں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ آگ ہوا بن جاتی ہے۔ اور ہوا آگ جسم انسانی مرنے کے بعد مٹی ہوجاتا ہے زندگی میں بھی بچپن۔ جوانی بڑھاپا۔ بیماری تندرستی کی حالت میں جسم کی حالتیں بدلتی رہتی ہیں۔ یہ ہرگز آواگون نہیں۔ آواگون یہ ہے۔ کہ رُوح انسانی اس جسم انسانی سے نکل کر گدھے کے جسم میں پہنچے اور حماری بن جائے یہ ناممکن ہے **چوتھا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ جو بھی ایمان دار ہو کر نیک اعمال کرے۔ وہ جنت کا مستحق ہے۔ شیطان نے بھی مومن رہ کر بہت نیک کام کئے تھے۔ چاہیئے۔ کہ وہ جنتی ہو۔ کیونکہ اس آیت میں بقاء ایمان کی قید نہیں **جواب**۔ یہاں ایمان سے مراد حقیقی ایمان ہے۔ اور وہی اللہ کے نزدیک مقبول ہے۔ اور ایمان حقیقی وہی ایمان ہے۔ جو دنیا سے مومن کے ساتھ جائے۔ شیطان کے متعلق فرمایا گیا۔ کہ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِيْنَ یعنی وہ ایمان کی حالت میں ہی اللہ کے علم میں کافر تھا۔ جو ایمان ساتھ نہ جائے۔ وہ حقیقت میں ایمان ہی نہیں۔ **پانچواں اعتراض نیچریوں کا**۔ شعر

ایسی جنت کا کیا کرے کوئی — جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں

جب جنت قیامت کے بعد دی جائے گی۔ تو اتنے پہلے اُس کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت زیادہ عمر سے چیزیں خراب ہوجاتی ہیں۔

**جواب** حقیقت میں یہ دو اعتراض ہیں ایک یہ کہ جنت قیامت سے پہلے کیوں پیدا ہوئی۔ دوسرے یہ کہ پرانی چیزیں خراب ہوجائیں گی۔ کیونکہ پرانی چیز کمزور اور خراب ہوجاتی ہے پہلے سوال کا جواب یہ ہے۔ کہ قیامت سے پہلے بھی جنت میں صدہا کام ہو رہے ہیں۔ جنت میں آدم علیہ السلام کو اوّلاً رکھا گیا۔ اب بھی وہاں الیاس علیہ السلام موجود ہیں۔ اب بھی وہاں بعض صالحین کی روحیں پرندوں کی شکل میں رہتی ہیں۔ اب بھی وہاں حور و غلمان وغیرہ رب کی تسبیح و تہلیل کر رہے۔ وہاں کی سیر حضور علیہ السلام کو کرائی گئی۔ مسلمان اُس پر ایمان لاتے ہیں۔ کہ جنت حق ہے۔ اب بھی وہاں کا پانی حضور علیہ السلام نے صحابہ کرام کو پلایا یعنی اپنی انگلیوں پاک سے پانی جاری فرمادیا۔ یہ وہ ہی پانی تھا (روح البیان وغیرہ) حضور نے وہاں کی بعض نعمتیں صحابہ کرام کو کھلادیں۔ کہ حضرت جابر کے گھر تھوڑے گوشت و آٹے سے صدہا آدمیوں کی دعوت فرمادی۔ یہ آٹا وغیرہ وہاں سے ہی آرہا تھا۔ اب بھی وہاں کا پتھر سنگ اسود خانہ کعبہ میں نصب ہے۔ اب بھی وہاں کا لباس یعنی ناخن ہر انسان کے پاس موجود ہے۔ اور اگر یہ نفعے فی الحال حاصل بھی ہوتے۔ تب بھی اُس کا ہونا بیکار نہ ہوتا۔ ہر حکومت اپنے سارے محکمے پہلے ہی سے قائم کر لیتی ہے۔ کچہری جیلخانہ شفاخانہ پہلے ہی سے بنالیئے جاتے ہیں۔ اس کا انتظار نہیں ہوتا۔ کہ کوئی جرم کرے تب جیل بنے کوئی بیمار ہو تب شفاخانہ بنے نہیں پہلے سے ان سب چیزوں کا ہونا سلطنت کی شان اور سلطان کا رعب ہے۔ **دوسرے سوال کا جواب** یہ ہے۔ کہ پرانا ہونا خراب یا کمزور ہونا اِن عنصری

جسموں کی خصوصیت ہے۔ غیر عنصری جسم نہ پرانے ہوتے ہیں نہ خراب۔ بتاؤ تو کہ چاند سورج تارے زمین آسمان وغیرہ کب کے بنے ہوئے ہیں۔ کیا یہ پرانے ہو کر خراب ہو گئے۔ آپ کی روح کتنی پرانی ہے۔ کیا کمزور یا خراب ہو گئی ہرگز نہیں تو جنت کی نعمتیں کیوں خراب ہوں گی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

تحقیق اللہ نہیں حیا فرماتا یہ کہ بیان فرمائے کہاوت کوئی سی مچھر پس وہ جو اوپر ہے اس سے پس لیکن وہ جو کہ ایمان لائے

بے شک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا۔ کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز کا ذکر فرمادے مچھر ہو یا اس سے بڑھ کر تو وہ جو ایمان لائے

فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا

پس جانتے ہیں تحقیق وہ سچی ہے طرف سے رب ان کے اور لیکن وہ جو کہ کافر ہوئے پس کہتے ہیں کیا ہے وہ جو ارادہ کیا اللہ نے ساتھ اس

وہ تو جانتے ہیں۔ کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔ رہے کافر وہ کہتے ہیں۔ ایسی کہاوت میں خدا کا کیا مقصود ہے۔

مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ

کہاوت کے گمراہ فرماتا ہے ساتھ اس کے بہت کو اور ہدایت دیتا ہے ساتھ اس کے بہت کو

اللہ بہتیروں کو اس سے گمراہ کرتا ہے۔ اور بہتیروں کو ہدائیت دیتا ہے

**تعلق**۔ اس سے پہلے قرآن پاک کی حقانیت دلائل سے ثابت فرمائی گئی۔ اور اس کے ماننے کی جزا اور نہ ماننے کی سزا کا ذکر فرما کر اس پر ایمان لانے کی رغبت دی گئی۔ اب ان شبہات کو دور فرمایا جا رہا ہے۔ جو کہ کفار قرآن پاک پر کرتے تھے۔ جن کی وجہ سے وہ قرآن کو کتاب اللہ نہ مانتے تھے۔ کیونکہ کسی شئے کے ثبوت کیلئے جس طرح دلائل کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مخالفین کی شبہات کے جوابات کی بھی۔ **شان نزول** سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں۔ کہ جب قرآن کریم میں بتوں کو مکڑی کے جالے سے تشبیہ دی گئی۔ تو یہود نے کہا۔ کہ اگر قرآن کریم خدائی کتاب ہوتا۔ تو اس میں ان حقیر چیزوں کا ذکر نہ ہوتا۔ کیونکہ ایسی چیزوں کا ذکر خدا کی شان کے خلاف ہے۔ ان کی تردید میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ جب منافقین کی حالت کو آگ اور تاریکیوں اور گرج اور بجلی سے تشبیہ دی گئی۔ تو منافقین نے طعنہ دیا۔ کہ اتنی بڑی عظمت والے رب تعالیٰ کو ان جیسی مثالوں کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ یہ خدائی کتاب نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ یہ طعنہ مشرکین دیا کرتے تھے۔ اس موقعہ پر یہ آیت آئی۔ شان نزول کی یہ سب صورتیں اس طرح جمع ہو سکتی ہیں۔ کہ یہ تینوں جماعتیں جب ایسے واہیات شبہات کر چکیں تب ان سب کی تردید میں یہ آیت کریمہ اتری کیونکہ یہ تینوں جماعتیں بلکہ سارے کفار حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینے میں متفق تھے۔ اور سورۃ بقر کے شروع سے اب تک ان تینوں جماعتوں کا ذکر بھی ہو چکا ہے (تفسیر کبیر) **تفسیر** اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ حیا سے بنا ہے جس کے معنی ہیں شرم و غیرت جب بدنامی اور برائی کے خوف سے دل میں کسی کام سے رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس رکاوٹ کا نام حیا ہے۔ یہ ایک درمیانی حالت ہے۔ اس کے نیچے ہے خجالت یعنی شرمندگی اور اس کے اوپر ہے۔ وقاحت جسکے معنی ہیں بے غیرتی بے شرمی ان تینوں میں فرق یہ ہے۔ کہ حیا کی وجہ سے انسان وہ کام کرتا ہی نہیں۔ خجالت میں کام کر کے شرمندہ ہوتا ہے۔ وقاحت میں بے غیرتی کے کام پر دلیری اور جرأت کرتا ہے۔ حیا اور غضب اور رحمت وغیرہ کے حقیقی معنے سے خداوند پاک ہے۔ کیونکہ یہ دل کی صفتیں ہیں۔ اور دل جسموں میں ہوتا ہے۔ لہٰذا حق تعالےٰ پر جہاں کہیں یہ الفاظ استعمال کئے جائیں گے۔ وہاں ان کا نتیجہ مراد ہوگا۔ مثلاً حیا کا نتیجہ ہے۔ کام کا چھوڑ دینا غضب کا نتیجہ ہے۔ بدلہ لینا رحمت کا نتیجہ ہے۔ نفع پہنچانا حق تعالےٰ کے لئے ان الفاظ کے یہی معنی مراد ہیں۔ حیا نہ فرمانے کے معنی ہے۔ ان مثالوں کو نہ چھوڑنا اَنْ يَّضْرِبَ ضربٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں مارنا

چلتا مثال بیان کرنا یہاں تیسرے معنی مراد ہیں۔ **مَثَلًا** اس لفظ کی تحقیق ہم پہلے کر چکے ہیں۔ کہ مثل اُس کہاوت کو کہتے ہیں۔ جو عجیب و غریب موقعہ پر بولی جائے۔ **مَا** یہ لفظ تنکیر یہ ہے جس کی وجہ سے مثلاً کا ابہام اور بھی زیادہ ہوگیا۔ مثلاً کے معنی کہاوت اور **مَثَلًا مَّا** کے معنی ہیں کوئی سی کہاوت تو آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ اللہ تعالےٰ کسی بھی کہاوت سے حیا نہیں فرماتا۔ **بَعُوْضَۃً** بعض سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ٹکڑا چیز کے حصے کو اسی لئے بعض کہتے ہیں۔ کہ وہ کل کا ایک ٹکڑا ہے۔ چونکہ ٹکڑا کل سے چھوٹا اور حقیر ہوتا ہے۔ اس حقارت کے لحاظ سے مچھر کو بعوضہ کہا گیا۔ چونکہ یہ بہت چھوٹا جانور ہے۔ یا اس لئے کہ یہ مچھر گویا مکھی کا ٹکڑا ہے۔ **فَمَا فَوْقَھَا**۔ اس کے معنی ہیں مچھر سے اوپر کی چیزیں ہیں اوپر میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ اس لفظ سے مچھر سے بڑی چیزیں مراد ہوں۔ جیسے مکھی۔ مکڑی وغیرہ تو آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ حق تعالےٰ مچھر اور اُس سے بڑی چیزوں (جیسے مکھی و مکڑی وغیرہ) کی کہاوت سے شرم نہیں فرماتا۔ دوسرے یہ کہ مچھر سے بھی بڑھ کر حقیر چیزیں مراد ہوں یعنی جو چیزیں یا کہ مچھر سے بھی زیادہ چھوٹی اور حقیر ہوں۔ تب آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ حق تعالےٰ مچھر اور اُس سے بھی کم تر چیزوں کی کہاوت سے حیا نہیں فرماتا۔ **نکتہ** مچھر وغیرہ میں چند عجیب خصوصتیں ہیں۔ **ایک** یہ بھوکا رہ کر زندہ رہتا ہے پیٹ بھر کر مر جاتا ہے۔ اسی طرح دنیا دار مصیبت میں رب کی یاد کرتا ہے عیش میں رب کو بھول جاتا ہے۔ **دوسرے** یہ کہ چھوٹی چیزیں حق تعالےٰ کی قدرت کو بڑی چیزوں سے زیادہ ظاہر کرتی ہیں کیونکہ چھوٹی چیزوں میں بھی وہی سارے اعضاء موجود ہوتے ہیں۔ جو بڑی میں ہیں۔ چنانچہ مچھر میں ہاتھی کے سارے عضو موجود ہیں حتیٰ کہ اس کی سونڈ بھی ہے۔ بلکہ دو پر اور زیادہ ہیں۔ نیز انسان بڑی چیز کا اچھی طرح فوٹو کھینچ سکتا ہے مگر مچھر وغیرہ کا صحیح فوٹو جس میں کہ اس کے سارے اعضا موجود ہو جائیں۔ ناممکن ہے۔ **تیسرے** یہ کہ مچھر ہاتھی کو مار ڈالتا ہے لیکن ہاتھی مچھر کو نہیں مار سکتا **چوتھے** یہ کہ مچھر بہت بہادر دلیر ہے۔ کہ شیر اور ہاتھی اور سانپ وغیرہ قوی جانور تو انسان سے ڈر کر جنگل میں رہتے ہیں لیکن یہ بہادر انسان کے گھروں میں رہے۔ اور آواز دیکر انسان کو کاٹے جس سے معلوم ہوا کہ حق تعالےٰ چاہے تو چھوٹے سے بڑا کام لے لے۔ اگر مچھر کی سی بہادری شیر اور سانپ میں ہوتی ہے۔ تو کوئی بھی انسان زندہ نہ رہتا۔ **پانچویں** یہ کہ بڑے بڑے بادشاہ مچھر سے عاجز ہوئے۔ کہ اس کے دفعہ کرنے کی صدہا تدبیریں کرتے ہیں مگر اس سے امن نہیں ملتی۔ نمرود جیسے جابر بادشاہ کو ایک مچھر سے اتنے جوتے لگوائے کہ اُس کا خدائی کا نشہ دور ہوگیا۔ اور آخر کار مچھر ہی نے اُس کو ہلاک کیا جس سے معلوم ہوا۔ کہ جب بڑے سے بڑا انسان ایک مچھر کی برداشت نہیں کر سکتا۔ تو جہنم کے سانپ بچھو کیسے برداشت کریگا۔ **حکایت** سلطان مامون رشید خطبہ پڑھ رہا تھا۔ ایک مچھر اُس کی آنکھ پر آبیٹھا۔ بار بار اُڑایا مگر وہ دفع نہ ہوا آخر کار سلطان کو خطبہ چھوڑنا پڑا۔ اور کہنے لگا۔ کہ خدا نے مچھر کو کیوں پیدا کیا ہے حضرت مولانا ابو ہذیل بصری نے فرمایا۔ کہ مچھر اس لئے پیدا ہوا تا کہ اس سے بڑے جابر بادشاہ مجبور ہو کر رب کی قہاری معلوم کریں۔ **چھٹے** یہ کہ بڑی چیزوں کے راز و اسرار معلوم کرنے آسان لیکن چھوٹی چیزوں کے مشکل **فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا** اما میں شرط کے معنی ہیں۔ اسی لئے اس کے جواب میں "ف" آتی ہے اور اس سے کلام کی تاکید ہو جاتی ہے۔ زیدٌ ذاھبٌ اور اَمَّا زیدٌ فذاھبٌ میں دوسرا جملہ زاید تاکید والا ہے۔ اٰمَنُوْا سے یا وہ لوگ مراد ہیں۔ جو اس وقت ایمان لا چکے۔ یا وہ جو کہ علم الٰہی میں مومن ہیں۔ اگرچہ بظاہر ابھی کافر ہوں۔ تو آیت کے معنی یہ ہوئے۔ جو ایمان لا چکے ہیں وہ ان مثالوں کو حق جانتے ہیں اور یا یہ کہ جو علم الٰہی میں مومن ہیں۔ وہ عنقریب جان لیں گے۔ کہ یہ حق ہے۔ **فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّہُ الْحَقُّ** حق کے چند معنی ہیں صحیح ثابت۔ واجب یہاں پہلے دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں یعنی یہ مثالیں بالکل صحیح ہیں۔ یا یہ مثالیں ایسی مضبوط ہیں۔ کہ جن کے انکار کی گنجائش نہیں حق اور صدق میں یہ فرق ہے۔ کہ صدق یعنی (سچ) وہ ہے جو واقعہ کے مطابق ہو اور حق (صحیح) وہ کہ واقعہ اُس کے مطابق ہو **مِنْ رَّبِّھِمْ** اس سے معلوم ہوا۔ کہ مومنین ان جیسی مثالوں کی وجہ سے قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا انکار نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں۔ کہ جب مچھر وغیرہ کو پیدا کرنا عیب نہیں۔ تو اُن کی مثال دینا کیوں عیب ہوگا۔ بلکہ یہ تو عین حکمت ہے۔ کیونکہ چھوٹی چیز کی مثال چھوٹی سے اور بڑی کی بڑی سے ہی دی جا سکتی ہے۔ **وَاَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا** صحیح یہ ہے۔ کہ کفروا سے یہود۔ مشرکین۔ منافقین سب مراد ہیں۔ کیونکہ سب ہی کا یہ اعتراض تھا۔

**فَيَقُولُونَ** ۔ یہ لفظ یا تو حال کے معنی میں ہے۔ یا استقبال کے یا دونوں کے بطریقے عموم مشترک تو آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ کفار یہ اعتراض کرتے بھی ہیں۔ اور کریں گے بھی۔ لہٰذا یہ غیب کی خبر ہے۔ اس کی سچائی اب بھی ظاہر ہو رہی ہے۔ کہ آریے۔ عیسائی وغیرہ اب بھی یہ اعتراض کر رہے ہیں۔ **مَاذَا** یہ **ما** استفہامیہ اور **ذَا الَّذِي** کے معنی میں ہے یعنی وہ کون سی حکمت ہے۔ **اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا** یہ **ہٰذا** حقارت کے لئے ہے یعنی ان جیسی حقیر مثالوں سے خدا نے کیا ارادہ کیا۔ **يُضِلُّ بِهٖ** یہ کفار کے سوال کا جواب ہے۔ کیونکہ وہ کہتے تھے۔ کہ اللہ ان حقیر مثالوں سے کیا چاہتا ہے۔ تو جواب دیا گیا۔ کہ یہ مثال کفر و ایمان کی کسوٹی ہیں جس سے مومن اور کافر کی پہچان ہو گئی۔ کافروں کو اس کے ذریعے سے گمراہ کر دیا اور مومنوں کو ہدایت دے دی۔ گمراہ کرنے کے معنی وہی ہیں جو ہم ختم اللہ کی آیت میں بیان کر چکے **كَثِيرًا** یہاں کثیر (بہت) تھوڑوں کے مقابلے میں نہیں ہے۔ بلکہ یہ معنی ہیں۔ کہ اس کے ذریعے بہتیرے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اور بہتیرے ہدایت پا جاتے ہیں۔ **وَيَهْدِي بِهٖ كَثِيرًا** ۔ **يَهْدِي** سے مراد یا تو ہدایت دینا ہے۔ یا ہدایت پر قایم رکھنا اور یا ہدایت کو کامل بنانا یعنی ان مثالوں سے بہتوں کو ہدایت مل جاتی ہے۔ اور بہت ہدایت پر قایم رہتے ہیں۔ اور بہت سوں کی ہدایت کامل ہو جاتی ہے۔ **خلاصۂ تفسیر** جب قرآن کریم نے اہل عرب کو اپنے مقابلے کی دعوت دی اور کفار نے مقابلے کیلئے ایڑی چوٹی کے زور لگا دیے پھر بھی ان سے نہ ہو سکا۔ بڑے بڑے نامور علماء و فضلاء کی کمیٹیاں ہوئیں۔ مگر کوئی بھی ایک آیت قرآن جیسی نہ بنا سکا۔ ہاں **مسیلمہ کذاب** نے کچھ سورتیں بنائیں۔ مگر جب وہ خود کفار کے سامنے پیش کی گئیں۔ تو انہوں نے ہی اُن کا قہقہ اڑایا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہونے کا موقعہ ہی نہ آیا۔ جیسے کہ اس زمانہ میں بعض شیعہ علماء نے سورۃ حسنین اور سورۃ فاطمہ بنائیں۔ مگر مارے غیرت کے اُن کے ظاہر کرنے کی ہمت نہ کی اور سُنا گیا ہے۔ کہ سید احمد خاں علی گڑھی نے بھی قرآن پاک میں اپنی طرف سے کچھ ترمیم کی۔ مگر یہ سب چیزیں دنیا کے سامنے آنے سے پہلے ہی گم ہو گئیں۔ تو کفار کو اور کچھ تو بن نہ پڑا۔ یہ کہنے لگے۔ کہ اگر یہ قرآن شریف خدائی کلام ہوتا۔ تو اس میں ایسی چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں سے مثل کیوں دی جاتی۔ اتنی بڑی ذات اور ایسی چھوٹی چیزوں کا ذکر کرے۔ خدا تعالےٰ ان کو جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے۔ کہ حق تعالیٰ چھوٹی چیزوں کی مثال سے کچھ شرم نہیں فرماتا۔ کیونکہ مثال سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ معقول چیز محسوس بن کر ہر ایک کی سمجھ میں آ جائے اور اس کے ذریعے مضمون کو دل قبول کرے کسی چیز کا جیسا حال ہوگا۔ اُسی قسم کی چیز سے اُس کی مثال دی جائیگی۔ بڑی چیز کی مثال بڑی اور حقیر چیز کی مثال حقیر اس پر اعتراض کرنا محض غلط اور بے جا ہے۔ بلکہ یہ تو کمال حکمت ہے کہ مثال اصل کے مطابق ہو۔ حقیر چیزوں کی مثال چھوڑ دینی اور اُن کو بغیر مثال لانا اُن کے سمجھانے کے لئے کافی نہ ہوگا۔ مثل مشہور ہے۔ کہ مثالی اقوال کا چراغ ہے چراغ خواہ سونے کا ہو خواہ مٹی کا روشنی میں فرق نہیں رکھتا۔ ہاں فحش و گندی باتیں جھوٹی خبریں اللہ تعالےٰ کی شان کے خلاف ہے۔ اسی لئے قرآن کریم ان دونوں سے پاک ہے۔ اے کافرو تم جو کہتے ہو۔ کہ ان معمولی مثالوں سے مقصد کیا ہے۔ تو اصلی مقصد جو تھا۔ وہ بتا دیا گیا اُس کے ساتھ ہی ساتھ ان سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوا۔ کہ بے ایمانوں کی بے ایمانی اور ایمانداروں کے ایمان ان مثالوں کو سن کر اور بڑھ گئے۔ یہ مثالیں اس پانی کی طرح ہیں۔ جو کھاری زمین میں پہنچ کر کانٹے وغیرہ اور عمدہ زمین میں گلاب و چنبیلی وغیرہ اگاتا ہے۔ بارش تو ایک ہی ہے مگر مختلف زمینوں میں مختلف اثر کرتی ہے۔ اسی طرح مثالیں ایک ہی ہیں۔ مگر مسلمانوں کے دلوں میں پہنچ کر اور اثر کرتی ہیں اور کفار کے قلوب میں اور **فائدے**۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ جب ضدی انسان دلائل سے عاجز ہوتا ہے۔ تو وہم اور بے جا شکوک کے دلدل میں پھنس جاتا ہے اسی لئے بزرگان دین فرماتے ہیں۔ کہ ہدائت دلیلوں سے نہیں ملتی۔ بلکہ حق تعالےٰ کے فضل سے **دوسرے** یہ کہ بُری چیز کا جاننا۔ اور اُس کا ذکر کرنا بُرا نہیں۔ ہاں فحش طریقے سے بیان کرنا بُرا ہے۔ اس سے دیوبندیوں کا یہ اعتراض بھی اُٹھ گیا۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے شیطان کا علم زیادہ ہے۔ کیونکہ شیطان بُری چیزوں کو بھی جانتا ہے۔ اور حضور کے لئے اُن کا جاننا عیب ہے۔ **تیسرے** یہ کہ بدکاروں کے لئے اچھا وعظ بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتا ہے۔ اور یہ وعظ کی خرابی نہیں۔ بلکہ اُس کے دل کی خرابی ہے۔ **پہلا اعتراض**۔ قرآن کریم میں کہیں بھی مچھر سے

تشبیہ نہیں دی گئی۔ ہاں مکڑی اور مکھی کا ذکر ضرور آیا ہے۔ تو یہاں یہ فرمانا۔ کہ رب تعالےٰ مچھر کی مثال سے شرم نہیں فرماتا کیونکر صحیح ہوگا۔ **جواب**۔ یہ کفار کے اعتراض کا کامل طور پر جواب ہے یعنی اے کافرو تم تو مکھی اور مکڑی کے ذکر سے مرے جارہے ہو حق تعالےٰ تو مچھر بلکہ اس سے بھی حقیر چیز کے ذکر سے شرم نہیں فرماتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ کہیں مچھر کا ذکر آیا ہے۔ **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ مومنین بہت ہیں کیونکہ ارشاد ہوا۔ وَيَهۡدِي بِهِۦ كَثِيرٗا مگر دوسری جگہ فرمایا گیا۔ وَقَلِيلٞ مِّنۡ عِبَادِيَ ٱلشَّكُورُ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شکر گزار بندے تھوڑے ہیں۔ **جواب** مومنین تعداد میں لاکھوں کروڑوں ہیں۔ لہٰذا بہت ہیں لیکن کفار کے مقابلے میں کم اس آیت میں ان کی تعداد کی زیادتی مراد ہے۔ اور وہاں کفار کے مقابلے میں کمی نیز مومن اگرچہ کافروں سے بظاہر کم ہیں لیکن حقیقت میں ان سے زیادہ کیونکہ یہ سچے ہیں۔ اور وہ جھوٹے اور تھوڑے سچے بہت سے جھوٹوں سے زیادہ ہیں۔ اسی لئے حدیث پاک میں ارشاد ہوا۔ کہ بڑے گروہ کے ساتھ رہو اگر ایک آدمی بھی حق پر ہے۔ تو وہ ہی بڑا گروہ ہے کیونکہ حق اعظم (بڑا) ہے۔ (تفسیر روح البیان شرح فقہ اکبر ملا علی قاری) اس لئے کہ اس ایک کے ساتھ پچھلا سارا بڑا گروہ ہے۔ لہٰذا اس آیت میں مسلمانوں کی حقیقی زیادتی بیان ہوئی۔ اور کفار کے تعداد کی زیادتی اور وہاں مسلمانوں کی تعداد کی کمی **تیسرا اعتراض**۔ اس آیت میں صرف یہ تو بتایا گیا۔ کہ اللہ چھوٹی چیزوں کے ذکر سے حیا نہیں فرماتا مگر اس کی وجہ نہیں بتائی گئی کہ کیوں حیا نہیں کرتا۔ لہٰذا کفار کا اعتراض ویسا ہی باقی رہا کیوں کہ وہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ جو اس سے حیا نہ کرے۔ وہ خدا نہیں **جواب** یہ مسئلہ بالکل ظاہر تھا۔ اس لئے اس کی وجہ بتانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ قرآن کریم عربی زبان میں آیا۔ اور اہل عرب عام چھوٹی بڑی مثالیں دیا کرتے ہیں۔ قرآن نے بھی مثالیں دیں۔ تو کیا خرابی ہوئی۔ مشرکین تو اس سے خاموش ہو گئے۔ رہے یہودی وغیرہ اُن سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ توریت و انجیل میں صدہا اس قسم کی مثالیں موجود ہیں۔ بتاؤ تم انہیں خدائی کتاب مانتے ہو کہ نہیں۔ چنانچہ انجیل میں مثال دی گئی۔ کہ کسی نے اپنے کھیت میں گیہوں بوئے جب یہ سو گیا تو اُس کے دشمن نے اُس میں منمنے (گیہوں کی طرح زہریلے دانے) بکھیر دیئے اُس کے غلاموں نے عرض کیا کہ مولیٰ تیرے کھیت میں گیہوں کے ساتھ منمنے بھی جم گئے۔ اُس نے جواب دیا کہ ابھی ان کو نہ اُکھیڑو۔ ورنہ گیہوں بھی اُکھڑ جاویں گے۔ غرضکہ یہ دونوں قسم کے درخت پرورش پاتے رہے جب کھیت کاٹا گیا تب گیہوں کو علیحدہ اور منمنوں کو علیحدہ کر دیا گیا۔ منمنے جلا دیئے گئے اور گیہوں مکان میں بھیج دیئے گئے اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام نے زمین میں اپنی نیک اولاد پیدا کی شیطان نے اُس میں برائیوں کے بیج بھی ڈال دیئے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ دنیا میں رہتے بستے رہے۔ مگر پھر بوقت موت ملک نے ان دونوں قسم کے لوگوں کو علیحدہ کر دیا۔ دیکھو۔ اس میں گیہوں اور منمنوں کی مثال بیان فرمائی (روح البیان تفسیر کبیر و عزیزی) اسی طرح انجیل میں ارشاد ہوا۔ کہ اُے لوگو تم چھلنی نہ بنو جس میں سے آٹا نکل جاتا ہے۔ اور بھوسی رہ جاتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے منہ سے حکمت کی باتیں نکلیں اور سینوں میں حسد رہے" غرضکہ اس قسم کی مثالیں بہت ہیں۔ اب بتاؤ کہ انجیل خدائی کتاب ہے۔ یا نہیں۔ اگر ہے اور ضرور ہے۔ تو اُس میں بھی تو ایسی مثالیں موجود ہیں۔ لہٰذا اگر قرآن کریم میں بھی ایسی مثالیں ہوں تو کیا حرج ہے **چوتھا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ حق تعالیٰ گمراہ کرتا ہے۔ مگر دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ شیطان یا سرداران کفار لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا۔ وَأَضَلَّ فِرۡعَوۡنُ قَوۡمَهُۥ ارشاد ہوا کہ وَأَضَلَّهُمُ ٱلسَّامِرِيُّ نیز فرمایا گیا۔ کہ شیطان نے عرض کیا تھا۔ وَلَأُضِلَّنَّهُمۡ تو ان آیات میں مطابقت کس طرح ہوگی۔ نیز جو گمراہ کرے۔ اُس سے بچنا چاہیے تو کیا حق تعالےٰ سے بھی بچنا چاہیئے۔ **جواب**۔ اس کا تفصیلی جواب تو آیت خَتَمَ ٱللَّهُ کی تفسیر میں گزر گیا۔ اس جگہ تفسیر کبیر میں اس کے بہت سے جواب دیئے گئے ہیں سب میں بہتر یہ ہے۔ کہ یہاں تین صورتیں ہیں۔ گمراہی پیدا فرمانا۔ گمراہی کے اسباب جمع کر دینا یا گمراہی کی رغبت دینا۔ گمراہی اختیار کرنا۔ شیطان انسان کو گمراہی کی رغبت دیتا ہے اور اُس کے اسباب جمع کرتا ہے۔ انسان اُن اسباب کو اختیار کرتا ہے۔ اسکے بعد حق تعالیٰ اُس میں گمراہی پیدا فرماتا ہے۔ لہٰذا ایک ہی گمراہی کی نسبت شیطان کی طرف تو اور معنی سے ہے۔ اور اُس گمراہ کرنے کی نسبت حق تعالےٰ کی طرف دوسرے معنی سے دیکھو کسی نے چھری سے بکری ذبح

کی تو یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ فلاں شخص نے بکری کی جان لے لی۔ اور یہ بھی کہ چھری نے جان لے لی۔ اور یہ بھی کہ حق تعالےٰ نے جان لے لی۔ یہ تین نسبتیں تین معنٰی سے ہیں۔ انسان اور چھری جان نکلنے کا سبب بعید یا سبب قریب ہیں۔ اور حق تعالےٰ حقیقۃً اُس کی موت کا خالق۔ لہٰذا یہ تمام آیات مطابق ہیں۔ پھر گمراہی کی رغبت دینے والے سے بچنا ضروری ہے۔ نہ کہ خالق سے بلکہ شیطان سے بھاگ کر خالق کی امن میں آنا چاہیئے چونکہ ابھی آیت کا مضمون مکمل نہیں ہؤا۔ لہٰذا اس کی تفسیر صوفیانہ آئندہ بیان ہوگی۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۖ وَ

اور نہیں گمراہ کرتا ساتھ اُسکے مگر اُن بدکاروں کو جو کہ توڑتے ہیں وعدہ اللہ کا پیچھے سے مضبوطی اُس کی کے اور

اور اس سے انہیں گمراہ کرتا ہے۔ جو بے حکم ہیں اور جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں پکا ہونے کے بعد اور

يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

کاٹتے ہیں اُس کو کہ حکم دیا اللہ نے جس کا یہ کہ جوڑا جاوے اور فساد پھیلاتے ہیں بیچ زمین کے یہ لوگ ہی نقصان والے ہیں

کاٹتے ہیں اُس چیز کو جس کے جوڑنے کا خدا نے حکم دیا۔ اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، وہ ہی نقصان میں ہیں۔

**تعلق**۔ اس سے پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ رب ان مثالوں سے بہت لوگوں کو گمراہ فرماتا ہے۔ مگر اُن کی تفصیل نہ فرمائی تھی۔ کہ کن کو۔ اب اُن گمراہ ہونے والوں کی تفصیل فرمائی جارہی ہے۔ مگر چونکہ گمراہوں کی تفصیل سے ہدایت والوں کی تفصیل خود بخود حاصل ہو جاوے گی۔ اس لئے ان کی تفصیل نہ فرمائی گئی۔ یعنی جن لوگوں میں یہ مذکورہ عیوب ہیں وہ تو اس سے گمراہ ہوتے ہیں جس سے معلوم ہؤا۔ کہ جن میں یہ عیوب نہ ہوں۔ وہ ہدایت پاتے ہیں۔ **تفسیر** وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۔ فَاسِقِيْنَ فسق سے بنا ہے جس کے لغوی معنی ہیں نکلنا اہل عرب کہتے ہیں۔ فسقت الرطبۃ عَنْ قشرھا یعنی چھوہارا اپنے پوست سے باہر آگیا۔ شریعت میں اسکے معنی ہیں حق تعالیٰ کی اطاعت سے نکلنا۔ فاسق وُہ نافرمان بندہ ہے۔ جو گناہ کبیرہ کرے فسق کے تین درجے ہیں۔ تغابی۔ انہماک۔ جحود۔ تغابی یہ کہ آدمی اتفاقیہ طور پر کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو جاوے مگر اُس کو بُرا ہی جانتا رہے۔ انہماک یہ کہ گناہ کبیرہ کا عادی ہو گیا۔ اُس سے بچنے کی پرواہ نہ رہی۔ مگر اُس کو گناہ جانتا رہا۔ جحود یہ کہ حرام کو اچھا جاننے لگا۔ یعنی اُس کی حرمت کا انکار کر دیا۔ یہ درجہ کفر ہے پہلے دو درجے کفر نہیں۔ کہ اگر کوئی شخص کفر و شرک کے علاوہ کیسے ہی گناہ کرے مگر عقیدہ نہ بگڑا ہو۔ تو اگرچہ گنہگار ہوگا۔ مگر کافر نہ ہوگا۔ کیونکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں قتال کریں مسلمان کو قتل کرنا سخت جرم ہے۔ مگر قاتل کو قرآن نے مومن فرمایا۔ یہاں فاسقین سے یہ تیسرا درجہ والا فاسق ہی مراد ہے قرآن کریم فرماتا ہے۔ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ یہاں منافق کو جو کہ کافر ہیں فاسق فرمایا اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ ۔ یہ لفظ نقض سے بنا ہے جس کے معنے ہیں کھولنا۔ چونکہ وعدہ اور عہد اس رسی کے مشابہ ہے جس سے کسی کو مضبوط باندھا جاتا ہے۔ اس لئے وعدہ خلافی کرنے اور عہد توڑنے کو نقض فرمایا گیا۔ عَهْدَ اللّٰهِ لفظ عہد کے معنی ہیں حفاظت۔ جس کا خیال رکھا جاوے اُسے بھی عہد کہتے ہیں۔ گھر اور زمانے کو بھی اسی لئے عہد کہا جاتا ہے۔ کہ اس کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ اب عہد اُس وعدے کو کہنے لگے جس کے پورا کرنے کا بہت خیال رکھا جائے۔ تو آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ قرآن کریم سے وہ فاسق گمراہ ہوتے ہیں۔ جو اللہ سے وعدہ خلافی کرتے ہیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ اس عہد سے کون سا عہد مراد ہے بعض حضرات فرماتے ہیں۔ کہ اس سے مراد وہ عہد ہے۔ جو اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل سے پہلی کتابوں میں لیا تھا۔ کہ جو کوئی زمانہ خاتم النبیین کا پائے۔ وہ اُن پر ایمان لائے۔ اس سے وہ بنی اسرائیل مراد ہوں گے جنہوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پا کر ایمان کو قبول نہ کیا۔ دوسرا قول یہ ہے۔ کہ اِس سے وہ عہد مراد ہے۔ جو منافقین اسلام لاتے وقت کرتے تھے۔ اس صورت میں منافقین

ان میں داخل ہوں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ اس عہد سے مراد میثاق کا عہد ہے۔ اُس دن تین عہد لئے گئے تھے۔ ایک سارے انسانوں سے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى یعنی یہ کہ حق تعالےٰ کی ربوبیت کا اقرار کریں۔ دوسرے انبیاء سے کہ رسالت کی تبلیغ کریں۔ اور دین کو قائم رکھیں جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ تیسرا علماء سے کہ حق کو نہ چھپائیں۔ اس کا بیان اس آیت میں ہے۔ کہ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اس صورت میں اس آیت سے سارے ہی کفار مراد ہیں۔ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ۔ میثاق وثوقٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں مضبوطی اور یہ مصدر ہے۔ جیسے کہ میلاد اور میعاد اس کے معنی ہیں مضبوط کرنا۔ آیت کا مطلب یہ ہوا۔ کہ وہ کافر گمراہ ہوتے ہیں۔ جو اپنے عہد کو مضبوط کر کے توڑ دیتے ہیں۔ اس میں بہت گفتگو ہے۔ کہ اس جگہ عہد کی مضبوطی سے کیا مراد ہے۔ بعضوں نے فرمایا۔ کہ دنیا میں توحید و رسالت کے جو دلائل قائم فرمائے گئے۔ وہ اُس وعدے کی مضبوطی ہے بعضوں نے فرمایا۔ کہ انبیاء کرام کا تشریف لانا آسمانی کتابوں کا اترنا علماء کرام کے وعظ یہ اُس کی پختگی ہے۔ بعض نے فرمایا۔ کہ بنی اسرائیل حضور کی تشریف آوری سے پیشتر قسمیں کھا کر کہتے تھے۔ کہ ہم نبی آخرالزمان پر ایمان لائیں گے۔ یہ اُس عہد کی مضبوطی تھی۔ پھر آپ کا زمانہ پا کر کفر کرنا اُس کا توڑنا ہوا۔ بعض نے فرمایا۔ کہ کفار جب مصیبت میں پھنستے ہیں تو عہد کر لیتے ہیں۔ کہ اگر خدا ہم کو اس سے نجات دے تو ہم نیک بن جائینگے۔ مگر نجات پا کر پھر اُسی گمراہی پر قائم رہتے ہیں۔ وَيَقْطَعُوْنَ قَطْعٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنے ہیں کاٹنا اور توڑنا نقضٌ و قطعٌ میں یہ فرق ہے۔ کہ نقض رسی کے کھولنے کو کہتے ہیں۔ جس سے اس کی بناوٹ بگڑ جائے اور قطع کاٹنے کو کہ جس سے بناوٹ تو قائم رہے لیکن بیچ سے ٹوٹ جائے جو شخص رشتے داروں کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ تو اُس کا رشتہ تو قائم رہتا ہے۔ مگر محبت ٹوٹ جاتی ہے۔ مگر جو وعدے پر قائم نہیں رہتا اُس کا وعدہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہاں نقض فرمایا گیا تھا اور یہاں قطع مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ یہ کفار کا دوسرا عیب ہے۔ یعنی وہ اُن رشتوں کو توڑ دیتے ہیں جن کے جوڑنے کا حکم دیا تھا۔ اس آیت میں بہت گنجائش ہے۔ اس میں دنیا و دین کے سارے تعلق آ گئے۔ اس کی تفصیل کیلئے دفتر چاہئیں۔ ہم ایسا مختصر سا قاعدہ عرض کرتے ہیں جس سے تمام رشتوں کا حال معلوم ہو جائے۔ انسان کے رشتے اور تعلق کل دو قسم کے ہیں۔ ایک روحانی دوسرا جسمانی۔ روحانی پانچ ہیں۔ ایک حق تعالےٰ سے دوسرا انبیاء کرام سے تیسرا آسمانی کتابوں سے چوتھا علماء اور مشائخ سے پانچواں عام مسلمانوں سے اسیطرح جسمانی رشتے بھی چند ہیں۔ ماں باپ سے اولاد سے بھائی بہن سے بیوی سے عام قرابت داروں سے اپنے گھر کے پالے ہوئے جانوروں سے جس جگہ رہتے ہیں۔ اُس جگہ سے کامل شخص وہ ہے جو ان تمام حقوق کو پورا کر کے دنیا سے جائے اللہ کی عبادت کرے۔ انبیاء پر ایمان لائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے۔ ساری آسمانی کتابوں کی عزت کرے۔ علماء و مشائخ کی خدمت کرے مسلمانوں پر مہربان رہے ماں باپ کو راضی رکھے۔ بیوی بچوں کو کمائی کر کے کھلائے۔ اہل قرابت کی مصیبت میں کام آئے وغیرہ وغیرہ۔ پھر جس کا احسان زیادہ اُس کا حق مقدم اسی لئے سارے حقوق سے اللہ و رسول کے حق زیادہ قوی ہیں۔ کہ اُن سبب سے جان ملی ان سے ایمان پھر جسمانی حقوق والوں کے مقابلے میں روحانی حقوق اعلیٰ ہیں۔ اسی لئے عالم اور شیخ کا حکم ماں باپ کے حکم پر مقدم کیونکہ ماں باپ ہم کو اوپر یعنی عالم ارواح سے نیچے لائے۔ اور علماء مشائخ نے ہم کو نیچے سے اوپر پہنچایا پھر جسمانی رشتہ داروں میں بھی یہی ترتیب ہے کہ حق بقدر احسان سب سے مقدم۔ ماں کا حق پھر باپ کا پھر دیگر اہل قرابت کا حقوق کی پوری تحقیق انشاء اللہ تیرھویں سیپارہ میں کی جائے گی۔ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ۔ یہ کفار کا تیسرا عیب ہے۔ کہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ یا اسطرح کہ ایمان قبول نہیں کرتے۔ یا اس طرح کہ لوگوں کو ایمان سے روکتے ہیں۔ یا اس طرح کہ مال اور عزت کی طمع میں بُری رسمیں پھیلاتے ہیں۔ یا اس طرح کہ شہوت اور غصے میں پھنس کر قتل اور خون مار اور پیٹ گالی گلوچ کرتے ہیں۔ چونکہ اُن کو زمین میں رب تعالےٰ کی اطاعت کیلئے بھیجا گیا تھا۔ اور وہ کافر رہے۔ لہٰذا کافر رہ کر جو کام بھی کریں وہ فساد ہی ہے۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ یہ کفار کے عیوب کا انجام ہے یعنی جنہوں نے

وہ ذکر کئے ہوئے عیب اختیار کئے وہ سخت نقصان میں رہے۔ تاجر کو نقصان تین قسم کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اصل رقم لوٹ آئے نفع حاصل نہ ہو دوسرے یہ کہ اصل رقم بھی پوری وصول نہ ہو تیسرے یہ کہ اصل رقم بھی بالکل حاصل نہ ہو۔ یہ کفار تیسرے قسم کا خسارہ پانے والے ہیں کیونکہ ان کو ہاتھ پاؤں آنکھ ناک زبان عقل و ہوش کی رقم عطا فرمائی گئی تھی۔ کہ اس سے تجارت کر کے نیک اعمال کا نفع حاصل کریں۔ انہوں نے کفر کر کے اعمال تو کیا اصل پونجی کو بھی برباد کر دیا۔ **خلاصۂ تفسیر**۔ اس سے پہلے معلوم ہوا تھا۔ کہ قرآن کریم سے بعض لوگ گمراہ بھی ہو جاتے ہیں۔ اب بتایا جا رہا ہے۔ کہ وہ گمراہ ہونے والے کون ہیں اس آیت کو دیکھ کر ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈالے اور سوچے۔ کہ میں کس زمرے میں ہوں۔ فرمایا گیا کہ جس میں یہ چار عیب ہیں۔ وہ کبھی بھی قرآن پاک سے ہدایت حاصل نہیں کر سکتا۔ ایک[۱] یہ کہ اللہ کی اطاعت سے باہر رہے۔ اور اُس کی ذات، و صفات کا انکار کرے۔ دوسرے[۲] یہ کہ اللہ سے جو عہد کیا تھا۔ اُس کو مضبوط کر کے توڑ دے۔ خواہ میثاق والا عہد توڑے یا اسلام لاتے وقت جو عہد کیا تھا۔ اُس کو توڑے یا مرشد کے ہاتھ پر بیعت ہوتے وقت جو استقامت کا عہد کیا تھا۔ اُس کو توڑ دے تیسرے[۳] یہ کہ جن حقوق کے ادائیگی کا حکم تھا۔ اور جن رشتوں کے جوڑنے کا فرمان تھا۔ اُن کے پورا کرنے میں کوتاہی کرے یعنی رب کی توحید انبیاء کی نبوّت آسمانی کتابوں کی حقانیت کا قایٔل نہ ہو۔ علماء مشائخ کی بات نہ مانے قرابت داروں کے حقوق ادا نہ کرے۔ ان کی مصیبت میں کام نہ آئے۔ چوتھے[۴] یہ کہ حرام کام کر کے زمین میں فساد پھیلائے۔ ایسا شخص قرآن کریم سے ہرگز نفع حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ پورا نقصان و خسارے میں ہے۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ ایک یہ کہ اصل ایمان محض قرآن پاک کے پڑھنے سے نہیں ملتا۔ کیونکہ ایمان تخم ہے۔ اور قرآن پاک بارش کا پانی بارش کا پانی ہر جگہ پہنچتا ہے۔ لیکن جہاں جیسا بیج ہوگا۔ ویسا ہی درخت اُگے گا۔ یہ تخم درحقیقت محبت خدا و رسول ہے۔ جو کہ محض فضل الٰہی سے حاصل ہوتی ہے۔ **دوسرا فائدہ** یہ کہ وعدہ عہد میثاق میں کچھ تھوڑا فرق ہے۔ وعدہ تو یہ کہ کسی کو بھلائی کا امیدوار بنایا جائے اُس کی حفاظت کی ذمہ داری ہو یا نہ ہو میں نے آپ سے زبانی کہہ دیا۔ کہ میں تم کو فلاں چیز دوں گا۔ کوئی ایسا ظاہری انتظام نہ کیا جس سے کہ مجھے پورا کرنا پڑ جائے۔ عہد وہ وعدہ ہے۔ جس کی پورا کرنے کی ذمہ داری کیجائے جیسے کہ میں نے چند گواہوں کے سامنے وعدہ کیا میثاق وہ وعدہ جس میں بہ حفاظت کی ذمہ داری بھی ہو۔ اور اس کے علاوہ کوئی اور پختگی بھی جیسے کہ میں آپ سے کوئی وعدہ کروں مگر اُس پر گواہ بھی بنالوں تحریر بھی کر دوں۔ اور اس تحریر کی رجسٹری بھی کرا دوں۔ جیسا وعدہ ایسے ہی اُس کی ذمہ داری عام وعدہ کے خلاف کرنا بھی جرم عہد کی مخالفت کرنا اُس سے زیادہ جرم میثاق توڑنا سب سے بڑھ کر حق تعالیٰ نے بندوں سے نہایت مضبوط عہد و پیمان لئے تھے۔ اب جو اس کو توڑے۔ وہ یقیناً حکومت الٰہیہ کا مجرم ہے **تیسرا** یہ کہ بادشاہ کی فرمانبرداری کے لئے جو بھی کشت و خون وغیرہ کیا جائے وہ فساد نہیں بلکہ عین اصلاح ہے۔ مگر اس کی مخالفت کرنا بغاوت۔ اور فساد ڈاکوؤں اور پولیس میں گولی چلی بہت کشت و خون ہوا ان دونوں نے ایک ہی سا کام کیا۔ مگر ڈاکو فسادی ہیں۔ اور پولیس والے مصلح ہیں۔ اسی طرح کفار اور مسلمانوں میں فی سبیل اللہ جنگ ہو تو کفار مفسد ہیں اور مسلمان مصلح۔ اسی طرح عالم دین کوئی ضروری مسئلہ بیان کرے اور بدمذہب اُس پر شور مچائیں۔ فتنہ برپا کریں۔ اگرچہ لوگ تو اُس عالم کو فسادی کہتے ہیں۔ لیکن اللہ کے نزدیک وہ عالم عین مصلح ہے۔ یزیدی اور حسینی لشکروں میں کربلا کے میدان میں جنگ ہوئی۔ یقیناً حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ مصلح تھے۔ اور یزید مفسد **چوتھے** یہ کہ اگر انسان اپنے جسم کو دنیوی کاموں میں مشغول رکھے۔ اور آخرت کو بالکل بھول جائے۔ وہ چاہے امیر کبیر بن جائے۔ نقصان میں ہے۔ اور جو شخص رب کو راضی رکھے۔ خواہ وہ غریب ہی رہے۔ فائدے میں ہے۔ کیونکہ زندگانی کا مقصود رضائے الٰہی ہے۔ **تفسیر صوفیانہ**۔ الفاظ لباس ہیں۔ اور حقیقت معنے اسکی اصل بصارت (آنکھوں) سے تو لباس اور بصیرت (دل کی روشنی) سے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کفار چونکہ دل کے اندھے تھے۔ اس لئے اُن کے کانوں میں ان مثالوں کے فقط الفاظ پہنچے۔ جیسے کہ جانور کے کان میں مالک کی فقط آواز پہنچتی ہے۔ اس لئے وہ کہنے لگے۔ کہ یہ الفاظ بے معنی ہیں۔ لیکن مومنین نور ایمانی سے حقیقت کو دیکھ کر کہتے تھے۔ کہ نہیں یہ رب کا کلام ہے۔ چونکہ نورِ ایمان سے نور قرآن اور نورِ قرآنی سے رضائے

رحمان اور حور و قصور جنان (جنت کی حوریں اور محل) حاصل ہوتے ہیں۔ جو اس نور سے محروم وہ ہر نعمت سے محروم وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى جو یہاں اندھا وہ وہاں بھی اندھا چونکہ رحمان۔ غفار بھی ہے اور قہار بھی اس لئے اس کا قرآن شفا بھی ہے اور شقاء (بدنصیبی) بھی شفاء ان لوگوں کے لئے ہے جو پیدائش کے دن نور کے چھنٹے سے بچکر فاسق ہو گئے اور توحید اور عبادت اور اخلاص کے وعدے کو توڑ بیٹھے اور جنہوں نے کہ اس راستے کو کاٹ دیا۔ جو حق سے ملانے والا تھا۔ اور جس پر چلنے کا حکم تھا۔ یعنی خالق کو چھوڑ کر مخلوق سے ملے اور دل کی زمین کو بگاڑ دیا۔ وہ اس طرح کہ نہ تو اس میں توحید کا بیج بویا اور نہ اس کو انبیاء کرام کی اطاعت کے پانی سے سیراب کیا۔ بلکہ شرک کا تخم بو کر اغیار کی صحبت سے اس کو خراب پانی دیا۔ لہٰذا وہ اس میں سخت نقصان میں رہے۔ کیونکہ اُن کے فطری ایمان کی کھیتی اس پانی کے نہ ملنے کی وجہ سے خشک ہو گئی۔ اب جب کہ مومنین اپنا کھیت کاٹیں گے۔ تو یہ حسرت سے ہاتھ کاٹیں گے۔ اور جب مومنین پھل کھائیں گے۔ تو یہ غم کھائیں گے۔ **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ قرآن کریم کافروں کو گمراہ کرتا ہے۔ کافر تو پہلے ہی سے گمراہ ہیں اُنہیں گمراہ کرنے کے کیا معنی **جواب**۔ گمراہی کے بہت درجے ہیں۔ کفار نے ایمان نہ قبول کر کے اُس کا پہلا درجہ حاصل کیا۔ پھر جس قدر قرآن پاک کا انکار کرتے گئے گمراہی میں ترقی کرتے گئے۔ یا یہ کہ قرآن سے پہلے بھی اُن میں گمراہی موجود تھی۔ مگر ظاہر نہ تھی۔ قرآن پاک سے اُس کا ظہور ہوا۔ **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ جو کافر رشتوں کو توڑے وہ گمراہ ہو۔ اور صدہا کافر اپنے ماں باپ کی خدمت کرتے ہیں۔ خیرات صدقات کرتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کو اپنے پیسے سے نفع پہنچاتے ہیں چاہیئے۔ کہ وہ گمراہ نہ ہوں۔ **جواب**۔ رشتہ جوڑنا اور حقوق کا ادا کرنا جب ہی معتبر ہے۔ جبکہ اللہ و رسول کی رضامندی کیلئے ہو جو شخص ماں باپ کی خدمت بہن بھائی کے حقوق کی ادائیگی۔ بلکہ نماز و روزہ اس لئے کرتا ہے۔ کہ دنیا میں اُس کا نام ہو۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ چونکہ کفار بھی یہ سارے کام اپنے نام کیلئے یا بتوں کے راضی کرنے کے لئے یا رب کو راضی کرنے کیلئے ہی (مگر بغیر واسطۂ مصطفےٰ ؑ) کرتے ہیں۔ اس لئے اِن کے کسی کام کا اعتبار نہیں جیسے کہ ہمارے جاہل مسلمان شادی بیاہ کے موقع پر بہت کچھ خرچ کرتے ہیں مگر رب کیلئے نہیں رسموں کی پابندی اور دنیا کے دکھاوے کیلئے لہٰذا یہ سب برباد نہ دنیا میں نام ہوا آخرت میں کام **تیسرا اعتراض**۔ میثاق کے دن کا عہد جب کسی کو یاد ہی نہ رہا تو بیکار ہے **جواب**۔ بیکار جب ہوتا جب کہ یاد دلایا بھی نہ جاتا۔ جب کہ حق تعالےٰ نے نبیوں۔ کتابوں اور علماء مشائخ کے ذریعے یاد دلا دیا پھر بیکار کیوں رہا۔ گورنمنٹ کے یہاں آپ نے بیع نامہ تحریر کر کے رجسٹری کرا دیا۔ اب آپ کو وہ بیع (بیچنا) یاد رہے یا نہ رہے آپ کو بہرحال پابندی کرنا پڑے گی۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۵﴾

کیسے　انکار کرتے ہو تم　خدا کا　حالانکہ　تھے تم　مُردے　پس زندہ کیا تم کو　پھر موت دیگا تم کو　پھر زندہ کرے گا تم کو　پھر طرف اُسکے لوٹائے جاؤ گے تم

بھلا تم کیونکر خدا کے منکر ہو گئے۔ حالانکہ تم مُردے تھے اُس نے تمہیں جلایا پھر تمہیں مارے گا۔ پھر تمہیں جلائے گا۔ پھر اُس کی طرف پلٹ کر جاؤ گے۔

**تعلق**۔ اس آیت کا پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ اس سے پہلے توحید اور رسالت اور کتاب اللہ کی حقانیت کو دلائل سے ثابت فرمایا گیا۔ اب حق تعالیٰ کی خاص نعمتوں اور عجیب عجیب قدرتوں کا ذکر فرما کر سب کو ایمان کی رغبت دی جا رہی ہے۔ کیونکہ محسن کا احسان ماننا شرافتِ انسانی کا تقاضا ہے۔ دوسرے اس طرح کہ اب تک توحید و رسالت اور قرآن کی حقانیت کے قوی دلائل ارشاد ہوئے تھے۔ اور چونکہ قیامت پر ایمان لانا بھی مسلمان بننے کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے نہائت نفیس طریقے سے اب قیامت کو عقلی دلائل سے بیان فرمایا جا رہا ہے مگر سبحان اللہ طریقۂ بیان السیا ز لا اور دلکش ہے۔ کہ اس کو سُن کر ہر طبقے کا انسان ماننے پر مجبور ہوگا۔ اور اس کے ضمن میں خالق کی ہستی کا ثبوت بھی اچھی طرح سے فرما دیا گیا۔ **تفسیر** كَيْفَ۔ تعجب دلانے کا سوال ہے۔ یعنی ان دلائل کے ہوتے ہوئے اے مشرکو تمہارا

کفر کرنا بہت ہی عجیب بات ہے۔ کیونکہ کم درجے کے محسن کی ناشکری سخت عیب ہے۔ ماں باپ کی نافرمانی ہر دین میں بری ہے۔ تو وہ رب تعالیٰ جس کا احسان تمام کے احسانوں سے اعلیٰ ہے۔ اُس کی نافرمانی یقیناً خلاف عقل ہے۔ تَكْفُرُوْنَ کفر سے بنا ہے جس کے معنی ہیں چھپانا اور انکار کرنا۔ مگر یہاں انکار مراد ہے بِاللّٰهِ کفار چند قسم کے تھے۔ بعض دہریئے یعنی حق تعالیٰ کے منکر بعض خدا کی صفات اور قیامت وغیرہ کے منکر بعض نبوت انبیاء کے منکر ان تمام سے یہ خطاب ہے۔ کیونکہ ان میں کسی چیز کا انکار حقیقت میں حق تعالیٰ کا انکار ہے۔ حکومت کے مقرر کئے ہوئے کسی حاکم کی بغاوت حکومت کی بغاوت ہے۔ اور اُس کے ایک فرمان کا انکار بھی سلطنت کا انکار ہے۔ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا۔ اموات یا تو میّت کی جمع ہے۔ یا میتہ کی جیسے قول یا قیل کی جمع اقوال ہے۔ یہ دونوں لفظ موت سے بنے ہیں جس کے معنی یا تو ہیں بے جان ہونا۔ یا زندہ ہو کر مردہ ہو جانا۔ فرمایا یہ جا رہا ہے۔ کہ اے لوگو تم پہلے بے جان تھے۔ پھر رب نے تم کو جان بخشی اگر موت کے معنی زندہ ہو کر فنا ہونا ہے۔ تو اُس حالت کو موت فرمانا مجازاً ہے۔ اور اگر اس سے مراد بے جان ہونا ہے۔ تو یہ حقیقت ہے۔ اردو اور عربی دونوں زبانوں میں بے جان جسم کو مردہ بول دیتے ہیں۔ خشک زمین کو کہہ دیتے ہیں کہ زمین مردہ ہو گئی۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوا۔ يُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ بَلْدَةً مَّيْتًا اس آیت کا مطلب یہ ہوا۔ کہ تم بہت سے بے جان جسموں سے گھومتے ہوئے آئے ہو۔ وہ اس طرح کہ اوّل تم مٹی تھے۔ پھر دانہ بنے پھر آٹا پھر خون پھر نطفہ پھر گوشت کا لوتھڑا اتنے بے جان جسموں میں چکر لگا کر اس موجودہ شکل میں نمودار ہوئے کسی نے کیا خوب کہا شعر

ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام:

اس شعر سے یہی مراد ہے۔ فَاَحْيَاكُمْ۔ احیا۔ حیات سے بنا ہے جس کے معنی ہے۔ زندگی۔ اور اس زندگی سے مراد وہ زندگی ہے۔ جو ماں کے پیٹ میں بچے کو مل جاتی ہے۔ چونکہ یہ زندگی پہلی موت سے ملی ہوئی ہے۔ اس لئے یہاں "ف" ارشاد فرمایا گیا۔ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ اس موت سے مراد وہ موت ہے۔ جو عمر ختم ہونے پر آئے گی۔ چونکہ یہ موت دنیاوی مصیبتوں سے نجات دیتی ہے۔ اور دوسری ابدی زندگی کا وسیلہ ہے حق تعالیٰ کی ساری اُخروی نعمتوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس کو نعمتوں میں شمار فرمایا۔ نیز جاندار کو بے جان کرنا حق تعالیٰ کی قدرت کی بڑی دلیل ہے۔ اس لئے ان دلائل میں موت کو بھی شمار فرمایا چونکہ زندگی کے ملنے اور موت کے آنے میں بڑا فاصلہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں ثمّ ارشاد ہوا۔ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ یہ اُس دوسری زندگی کا ذکر ہے۔ جو موت کے بعد ملنے والی ہے۔ اور جس کے کفار منکر ہیں پہلی تین حالتوں کے (یعنی پہلے بے جان پھر زندہ ہونا پھر مر جانا) تمام لوگ متفق تھے۔ لیکن اس زندگی کے منکر اس لئے پہلے اُن باتوں کو بیان کر کے اب اس کا ذکر ہوا۔ تاکہ معلوم ہو۔ کہ جو ذات اوّلاً زندہ کرنے اور موت دینے پر قادر ہے۔ وہ دوبارہ زندگی دینے پر بھی قادر ہے۔ اس زندگی سے یا قبر کی زندگی مراد ہے۔ جو سوال و جواب کیلئے ہر شخص کو دی جائے گی۔ اور یا حشر کی جو حساب کتاب کیلئے عطا ہو گی۔ مگر ظاہر یہی ہے۔ کہ اس سے زندگی قبر مراد ہے۔ جیسا کہ احادیث میں وارد ہوا۔ کہ مردہ دفن ہونے کے بعد لوگوں کے پیروں کی آہٹ کو سنتا ہے۔ اور اُس سے تین سوال ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ رب تیرا کون۔ دوسرا یہ کہ دین تیرا کیا تیسرے یہ کہ تو اُس سبز گنبد والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تیرے سامنے جلوہ گر ہیں کیا کہتا تھا۔ چونکہ یہ دوسری زندگی موت کے کچھ دیر کے بعد ہوتی ہے۔ کفن دفن وغیرہ میں دیر لگتی ہی ہے۔ اس لئے یہاں بھی ثمّ ہی فرمایا گیا۔ اگر اس سے مراد حشر کی زندگی ہوتی تو اس کے بعد ثمّ نہ فرمایا جاتا۔ کیونکہ وہ زندگی رب کی طرف لوٹنے سے ملی ہوئی ہے۔ اور اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ پھر تم زندہ ہو گے اور پھر کچھ عرصہ بعد رب کی طرف لوٹو گے۔ چونکہ اس زندگی اور حشر کے درمیان میں برزخ کا زمانہ ہے۔ اس لئے آگے۔ ثمّ لانا صحیح ہوا۔ لہٰذا یہ آیت برزخی زندگی اور وہاں کے راحت و تکلیف کو بتا رہی ہے۔ اس لئے کہ جس طرح دنیوی زندگی میں بعض آرام سے ہیں بعض تکلیف سے اسی طرح برزخی زندگی میں بھی ہو گا۔ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ یہ انسان کی پانچویں حالت ہے۔ اور اس میں بتایا جا رہا ہے۔ کہ اے لوگو! تم ایک حالت گذار کر اب دوسری حالت میں آئے ہو۔ تمہارے سامنے تین میدان اور ہیں جس کو طے کرنا ہے۔ ایک موت پھر قبر کی زندگی پھر

حشر میں رب کی طرف لوٹنا۔ اس کے بعد تم کو قرار ہو گا۔ لہٰذا تم کو چاہیئے۔ کہ تم اِن منزلوں میں نہ پھنس جاؤ۔ بلکہ اپنے اصلی مقصود کا خیال رکھو۔ اور وہاں کا انتظام رکھو۔ **خلاصۂ تفسیر** جب توحید و رسالت اور قرآن کی حقانیت کے مسائل سلسلہ وار ثابت ہو چکے۔ اور اُسکے ساتھ ہی ساتھ کفار کے شبہات کے جواب بھی دے دیئے گئے جس سے کہ منصفین ماننے پر مجبور ہو گئے۔ تو اَب اُن ہٹ دھرم کافروں کے سمجھانے کیلئے جو کہ ضد کی وجہ سے دلائل پر نظر نہیں کرتے تھے۔ ایک نئی دلیل بیان فرمائی گئی کیونکہ جیسی بیماری ویسا اُس کا علاج ایک ہی بخار مختلف سببوں سے ہوتا ہے۔ دانا طبیب سبب کا خیال فرما کر علاج فرماتا ہے۔ لہٰذا پہلے دلائل سے سمجھایا گیا۔ اور اب دوسرے طریقے سے اس دلیل میں رب تعالےٰ کی نعمتوں کا بھی ذکر ہے۔ اور اُس کی رحمتوں کا بھی اور پھر انسان کی بے کسی بے بسی کا بھی تذکرہ ہے۔ اور اُس کے ایک حال میں نہ ٹھہرنے کا بھی تاکہ یہ چاروں باتیں انسان کو ایمان لانے پر مجبور کر دیں کیونکہ کفار کی نظر محسوسات تک تھی۔ اور وہ نہ دیکھی ہوئی چیز کو قبول نہ کرتے تھے۔ اسی لئے وہ حشر اور جنت دوزخ وغیرہ کے منکر تھے۔ بلکہ اُن میں سے بعض رب کے بھی قائل نہ تھے۔ اس لئے پہلے ترتیب وار اُن محسوس حالتوں کا ذکر فرمایا گیا جن کا کوئی انکار نہ کر سکتا تھا۔ اور پھر ان کے ذریعے اُن چیزوں کو ثابت فرمایا گیا جن کے وہ منکر تھے۔ فرمایا گیا۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ تم پہلے بے جان تھے۔ اور تمہیں یہ معلوم ہی ہے۔ کہ تم اس حالت میں کہاں کہاں کے سیر کر چکے کبھی سبزہ بن کر اُگے اور کبھی دانہ بن کر پسے کبھی روٹی بن کر اپنے باپ کے معدے میں پہنچے اور پھر وہاں سے چل کر خون بن کے نطفہ بنے پھر رحم مادر میں آکر بہت سے انقلاب دیکھے۔ پھر زندہ ہو کر نہ معلوم کتنی حالتیں تم پر گزریں بچپن۔ جوانی بڑھاپا۔ نادانی۔ دانائی۔ کمزوری۔ قوت۔ بیماری۔ تندرستی علم جہالت ہوشمندی بے ہوشی غرض یہ کہ صدہا حالتوں میں تم بدلتے رہے۔ پھر جب تمہیں موت آئی۔ تو تم سب کچھ ہو کر پھر کچھ نہ رہے۔ اتنی باتوں کو دیکھ کر تم کس طرح اللہ کا انکار کر سکتے ہو۔ اگر تم خود اپنی حالت ہی پر غور کر لو۔ تو بھی رب کا انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمہاری حالتوں کا بدلنے والا کوئی اور ہی ہے۔ پھر جب تم پر یہ موت اور زندگی گزر چکی تو اگر آئندہ بھی زندگی اور موت آئے تو کونسی تعجب کی بات ہے۔ ایجاد کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دوبارہ بنانا آسان جب خالق عالم تم کو ایجاد فرما چکا۔ تو دوبارہ بنانا کونسا مشکل ہے۔ نیز تم کو یہ معلوم ہوا کہ تم اپنے اِن حالات میں بالکل مجبور ہو نہ تم لڑکپن اور جوانی کو جانے سے روک سکتے ہو۔ نہ بڑھاپے کو آنے سے بڑے بڑے قدرت والے شہنشاہ جن کے نام کے دنیا میں ڈنکے بجتے تھے۔ وہ نہائت بے بسی کی حالت میں یہاں سے ایسے گئے۔ کہ اُن کا نام بھی باقی نہ رہا۔ تو ایسے مجبور مسافر کو چاہیئے۔ کہ اپنے قدرت والے رب کو راضی رکھے۔

**فوائد**۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ عالم کی ہر چیز بلکہ خود ہم اپنے خالق کی ذات اور صفات کی کھلی ہوئی دلیل ہیں۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے۔ کہ جو اپنے کو پہچان لے وہ رب کو پہچان لے گا۔ **دوسرے** یہ کہ دنیا عمل کی جگہ ہے۔ نہ سزا و جزا کی اس ہی لئے اس کو قرار نہیں **تیسرے** یہ کہ حیات برزخ اور قبر کے سوال و جواب حق اور قرآن سے ثابت ہیں چکڑالوی وغیرہ اس کے منکر ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ یہ قرآن سے ثابت نہیں اُن کا یہ قول محض جہالت پر مبنی ہے۔ ایک تو یہی آیت قبر کی زندگی بتا رہی ہے جیسا کہ ہم تفسیر میں عرض کر چکے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ کہ قیامت میں کفار عرض کریں گے۔ رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ اے پروردگار تو نے ہم کو دو زندگیاں بخشیں دو موتیں بالکل ظاہر ہیں۔ ایک زندگی سے پہلے ایک زندگی کے بعد بتاؤ دو زندگیاں کونسی ہیں۔ خیال رہے کہ یہ دونوں زندگیاں حشر کی زندگی سے پہلے ہو چکی ہیں۔ کیونکہ انہیں ماضی سے بیان فرمایا جا رہا ہے۔ ماننا پڑے گا کہ یہ دونوں زندگیاں ایک دنیا کی اور ایک قبر کی نیز قرآن پاک میں ارشاد ہوا۔ کہ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ یعنی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دنیوی زندگی اور آخرت میں کلمہ طیبہ پر ثابت قدم رکھتا ہے۔ یہاں آخرت سے مراد قبر کی زندگی ہے۔ یعنی مسلمان دنیا میں مصیبت اور آرام ہر حال میں اور قبر میں نکیرین کے سوال کے وقت کلمہ طیبہ پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ یہاں آخرت سے حشر مراد نہیں۔ کیونکہ وہاں ایمان و کفر کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ اعمال کا حساب۔ اس کے علاوہ زندگئ قبر کے متعلق بے شمار احادیث صحیحہ اور اُمت رسول اللہ کا اجماع ہے۔ اس کی زائد تحقیق ہمارے فتاویٰ میں دیکھو اور انشاء اللہ اس

تفسیر میں بھی مختلف آیتوں کے ضمن میں کچھ عرض کیا جاتا رہے گا۔ **تفسیر صوفیانہ** اس جگہ مسلمانوں سے خطاب ہو رہا ہے۔ کہ اے مسلمانو۔ تم آئندہ کیسے کافر بن سکتے ہو۔ حالانکہ تم آدم علیہ السلام کی پشت میں بے جان ذرّے تھے۔ پھر تم کو رب نے اس طرح زندہ فرمایا کہ اُن کی پشت سے تم کو نکالا اور اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کا پُر لطف کلام سنایا۔ اور تمہیں اپنے خطاب کی عزت بخشی اور تم کو جواب باصواب کی توفیق بخشی۔ کہ تم نے خوشی سے بَلٰی کہا۔ کفار کی طرح بے رُوتی اور خوف سے نہ کہا۔ پھر تم کو اس طرح موت دیتا ہے۔ کہ عالم ارواح سے عالم اجسام کی طرف منتقل فرماتا ہے۔ پھر تم کو انبیاء کرام اور آسمانی کتابیں بھیج کر دوبارہ زندگی بخشتا ہے۔ اور پھر تم اُسی کی طرف بے اختیار لوٹ کر جاؤ گے۔ یا یہ خطاب انبیاء اکرام سے ہے۔ کہ اے پیغمبرو تم معصوم ہونے کی وجہ سے کبھی خدا کی نعمتوں کا انکار نہیں کر سکتے ہو۔ اس لئے کہ تم پہلے عدم کے پردے میں تھے۔ پھر ربّ نے تم کو نورِ عنایت کے پانی اور دستِ محبت سے خمیر فرمایا۔ پھر اُس کو نور سے منوّر فرما کر زندگی بخشی پھر جمال کے مشاہدے سے جُدا کر کے تم کو موت عطا فرمائی۔ پھر حق کے نور سے منوّر فرما کر زندگی بخشی۔ پھر جذباتِ حق کی کشش سے تم رب کی طرف ہی لوٹ گے **پہلا اعتراض** نحوی قاعدے سے فعل اور حال کا زمانہ ایک چاہیئے۔ مگر یہاں ایسا نہیں۔ کیونکہ یہاں تَكْفُرُوْنَ فعل ہے۔ اور کفار کی موت اور حیات رب کی طرف لوٹنا حال اور ان سب کا زمانہ علیٰحدہ علیٰحدہ کیونکہ کفر تو آج ہو رہا ہے۔ اور یہ حالات یا تو پہلے ہو چکے ہیں۔ یا آئندہ ہوں گے۔ لہٰذا یہ ترکیب کیونکر صحیح ہو گی۔ **جواب**۔ چونکہ یہ سارے گذشتہ اور آئندہ واقعات حق تعالےٰ کے نزدیک بہت قریب قریب ہوئے ہیں۔ اس لئے گویا ان کا زمانہ ایک ہی ہے۔ قیامت اگرچہ ہم کو دُور معلوم ہوتی ہے مگر اللہ و رسول کے نزدیک بہت قریب ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ اور حضور فرماتے ہیں۔ کہ ہم اور قیامت دو ملی ہوئی انگلیوں کی طرح ہیں۔ **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ ہر شخص کیلئے دو موتیں ہیں۔ ایک دنیا کی زندگی سے پہلے دوسری اُس کے بعد مگر قرآن سے ہی ثابت ہو رہا ہے۔ کہ بعض لوگوں کو تین موتیں آئیں چنانچہ حضرت عزیر علیہ السلام کو سَو برس تک مردہ رکھ کر زندہ فرمایا گیا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام کی دُعا سے وہ بنی اسرائیل دوبارہ زندہ کئے گئے۔ جو کہ وبا کے خوف سے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اور جنگل میں ان کو مار دیا گیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جو بنی اسرائیل اُن کے ساتھ کوہ طُور پر گئے تھے اور تجلی سے مر گئے تھے اُنہیں زندہ کیا گیا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے بہت سے مردوں کو زندہ فرمایا ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے والدین کریمین کو زندہ کر کے ایمان دیا۔ اور حضرت جابر کے مرے ہوئے بچوں کو زندہ فرمایا۔ جیسا کہ احادیث میں آتا ہے۔ ان سب کو یقیناً تین موتیں آئیں۔ پھر ان آیتوں کو کس طرح جمع کیا جائے۔ **جواب**۔ اس جگہ انسان کی عام حالت کا ذکر ہو رہا ہے کیونکہ عام طور پر دو ہی موتیں آتی ہیں۔ یہ واقعات اتفاقیہ ہیں۔ نیز اس آیت میں کفار و مشرکین سے خطاب ہے۔ اور اُن میں سے بہت لوگ اِن واقعات کے قائل نہ تھے **تیسرا اعتراض آریوں کا**۔ اگر انسان نے اس زندگی سے پہلے اتنے جسموں کی سیر کی ہے۔ تو چاہیئے۔ کہ آواگون درست ہو **جواب**۔ اس کا جواب پہلے گذر چکا۔ کہ یہ جسموں کی تبدیلی ہے۔ نہ کہ روحوں کی اور آواگون روح کی تبدیلی کا نام ہے۔ یہ بھی خیال رہے۔ کہ جسم کے اصلی اجزاء اور وہ نہایت چھوٹے چھوٹے ذرّے ہیں۔ جو کہ خوردبین سے بھی نظر نہیں آسکتے جن کو عربی میں عجب الذنب کہتے ہیں۔ اور یہ ریڑھ کی ہڈی میں محفوظ ہیں۔ یہ کسی حال میں نہیں بدلتے۔ اگر کسی انسان کو شیر نے کھا لیا۔ اور وہ پائخانہ بن کے نکل گیا۔ پھر بھی اُس کے اصلی اجزا پاخانے میں باقی رہے۔ یہی اجزاء گیہوں۔ روٹی اور خون اور منی میں برابر محفوظ رہتے ہیں۔ جب انسان مرنے کے بعد مٹی بن جاتا ہے تو مٹی میں بھی وہ اجزاء سلامت رہتے ہیں۔ انہی اجزاء پر قیامت کے دن اجسام بنائے جائیں گے۔ اس ہی وجہ سے ہر حال میں کہا جاتا ہے۔ کہ یہ وہی انسان ہے۔ جو کہ پہلے منی یا گوشت کا لوتھڑا یا بچہ وغیرہ تھا۔ وہی کہنا اس لئے ہے۔ کہ اُس کے اصلی اجزاء محفوظ ہیں۔ آواگون والوں کے نزدیک دوسرا جسم پہلے جسم کا بالکل غیر ہوتا ہے۔ اور اسلام میں وہ پہلا ہی جسم ہوتا ہے۔ صرف صورت بدل جاتی ہے۔ لہٰذا اس مسئلے کو آواگون سے کوئی تعلق نہیں۔ **چوتھا اعتراض چکڑالویوں کا**۔ جو لوگ قبر میں دفن نہیں ہوتے مثلاً جلا دیئے جاتے ہیں۔ یا اُن کو شیر وغیرہ کھا جاتا ہے۔ اُن سے حساب قبر کیونکر ہو گا۔ **جواب**۔ قبر خاص اُس گڑھے کا نام نہیں جس میں مُردے دفن کیئے

جاتے ہیں۔ بلکہ اُس برزخی حالت کا نام ہے۔ جو مرنے اور قیامت میں اُٹھنے کے درمیان ہے۔ اس حالت میں انسان کہیں بھی ہو۔ اُس کی روح کو جسم کے اصلی اجزاء سے متعلق کر کے اُس سے سوال جواب ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر جسم انسانی شیر یا مچھلیوں کے پیٹ میں ہے۔ یا جل کر اور راکھ ہو کر میدان میں اُڑ رہا ہے۔ یا دریا میں بہہ رہا ہے۔ کہیں بھی ہے۔ اُس کے روح کو اُس سے متعلق کر کے وہاں ہی سوال جواب کر لئے جاتے ہیں۔ جب ماں کے پیٹ میں بچہ بنتا ہے۔ تو فرشتہ وہیں آکر تمام نقش نگار بھی کر جاتا ہے۔ اور اُس کی تقدیر بھی لکھ جاتا ہے۔ مگر ماں کو خبر نہیں ہوتی۔ اسیطرح شیر وغیرہ کے پیٹ میں ہی حساب ہوتا ہے۔ اور اُس کو خبر نہیں ہوتی۔

هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ لَـكُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا ثُمَّ اسۡتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰٮهُنَّ

وہ ہے کہ پیدا فرمایا اُس نے واسطے تمہارے وہ جو بیچ زمین کے ہے سارا پھر قصد کیا طرف آسمان کے پس برابر کیا اُن کو

وہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے بنایا جو کچھ زمین میں ہے۔ پھر آسمان کی طرف استواء (قصد) فرمایا تو ٹھیک

سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ‌ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۲۹﴾

سات آسمان اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

سات آسمان بنائے اور وہ سب کچھ جانتا ہے۔

ع ۹ / ۳

**تعلق**۔ اس آیت کا پہلے سے چندطرح تعلق ہے۔ **ایک** یہ کہ حق تعالےٰ نے پہلی آیت میں انسان کی داخلی نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا۔ اب خارجی نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ جو کہ زمین وغیرہ سے ہم کو حاصل ہوتی ہیں۔ **دوسرے** یہ کہ پہلے ہم کو زندگی بخشنے کا ذکر فرمایا گیا تھا۔ اور اب زندہ رہنے کے اسباب کا کیونکہ زمین کی نعمتوں کے بغیر ہماری زندگی ناممکن ہے۔ مگر چونکہ زندگی اصل ہے اور نعمتوں سے نفع حاصل کرنا۔ اُس کی فرع اس لئے زندگی کا ذکر پہلے فرمایا۔ ان کا بعد میں **تیسرے** یہ کہ کفار کہہ سکتے تھے۔ کہ ہمیں رب نے پیدا نہیں فرمایا۔ بلکہ اتفاقیہ اسباب جمع ہو گئے اور ہم پیدا ہو گئے۔ لہٰذا ہم پر رب کا کوئی احسان نہیں سورج سے دانہ پکا اُس سے آٹا بنا جو ہمارے والد کے پیٹ میں جا کر خون بنا اور وہ خون نطفہ بن کر ماں کے رحم میں آگیا۔ اور ہم پیدا ہو گئے۔ اس میں رب کا کون سا احسان ہے۔ اس وہم کی تردید کے لئے اب فرمایا گیا۔ کہ یہ تو سوچو کہ یہ اسباب کس نے پیدا فرمائے۔ اور اُن میں یہ تاثیریں کس نے بخشی کہنا پڑے گا۔ کہ رب نے۔ لہٰذا احسان رب ہی کا ثابت ہوا۔

**تفسیر** هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ یہاں خلق قدر کے معنی میں ہے۔ یعنی اُس رب نے تمہارے لئے زمین کی ساری نعمتوں کو مقرر فرمایا کیونکہ آیت کے نازل ہونے کے وقت نہ تو ساری چیزیں پیدا ہوئی تھیں نہ سارے انسان اب آیت کا مقصد یہ ہوا کہ جو کچھ پیدا فرما چکا وہ تمہارے لئے تھا اور جو کچھ پیدا کیا ہے اور کرے گا۔ وہ سب تمہاری ہی خاطر لَـكُمۡ اس میں لام نفع کا ہے۔ یعنی تمہارے نفع کے لئے چیزیں پیدا ہوئیں۔ کہ جس سے تم دینی یا دنیوی نفع حاصل کرو۔ بعض چیزوں کا کھانا۔ بعض کو پہننا۔ بعض کو پینا وغیرہ یہ دنیوی نفع ہیں بعض چیزوں سے بچ کر ثواب حاصل کرنا ان سب چیزوں کو دیکھ کر خالق کو پہچاننا وغیرہ دینی نفع ہیں۔ مَا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ زمین کی ساری چیزیں خواہ وہ زمین پر ہوں یا زمین میں ہوں۔ سب ہمارے نفع کیلئے پیدا کی گئیں۔ یعنی کانیں۔ سبزے۔ جانور۔ دریا۔ پہاڑ۔ سانپ۔ بچھو وغیرہ سب ہمارے نفع کے لئے ہیں۔ کہ بلا وسیلہ یا وسیلے سے یہ سب ہمارے ہی کام میں آتی ہیں۔ عمدہ غذائیں۔ پاکیزہ خوشبوئیں۔ دلپسند آوازیں۔ اور حسین صورتیں اور لذیذ چیزیں بلا واسطہ ہمارے لئے ہیں۔ اور لکڑی لوہا۔ تیر کمان رسی وغیرہ اسی لئے بنی کہ اِن کے ذریعے ہم غذائیں وغیرہ حاصل کریں۔ اور بیماری اور مشقت ہمارے عبرت کیلئے پیدا فرمائی گئیں۔ موت اس لئے بنی تاکہ دنیاوی نعمتوں سے سارے اگلے اور پچھلے لوگ نفع حاصل کریں۔ اگر سب پیدا ہوتے اور کوئی نہ مرتا تو زمین بھی تنگ ہو جاتی اور روزی بھی۔ اور بے شمار لڑائی جھگڑے واقع ہوتے اور پہلے لوگ حکومت پر قائم رہتے۔ اور پچھلے اس سے محروم اور مشقتیں

اور مصیبتیں بھی ہمارے ہی فائدے ہی کیلئے بنی کہ اگر یہ نہ ہوتیں تو دنیا میں کوئی کارخانہ ہی نہ ہوتا۔ اگر چور نہ ہوتا تو پولیس کا محکمہ نہ بنتا اور لاکھوں آدمی بے کار رہتے۔ اگر جرم نہ ہوتے کچہریاں ویران ہوتیں۔ اگر دشمن نہ ہوتا تو فوج کا محکمہ بے کار تھا۔ اگر سردی گرمی کی مصیبت نہ ہوتی تو اونی کپڑے کے کارخانے اور خسخانے اور پنکھے وغیرہ کچھ نہ ہوتے۔ اگر بھوک نہ ہوتی سارے باورچی بے کار تھے۔ اگر بیماری نہ ہوتی۔ تو دوا اور شفاخانے بے کار اور حکیم عطار اور جرّاح سب رائیگاں جاتے۔ غرض کہ ان مصیبتوں نے ہی دنیا کو آباد فرمایا۔ حتیٰ کہ زہر قاتل اور سانپ وغیرہ بھی بہت دواؤں میں کام آتے ہیں۔ بہرحال سب چیزیں ہمارے ہی نفع کیلئے ہیں۔ (تفسیر عزیزی) ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ استوٰی سویٰ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں برابری اور مساوات اسی لئے سیدھی چیز کو مستوی کہتے ہیں کیونکہ اس کے اجزاء آپس میں برابر ہوتے ہیں۔ نہ تو اونچے نیچے اور نہ ٹیڑھے۔ پھر اس کا استعمال قصد اور ارادے کیلئے ہونے لگا عرب والے بولتے ہیں۔ اِسْتَوٰی اِلَیْهِ کَالسَّھْمِ الْمُرْسَلِ یعنی اس کا چھوٹے ہوئے تیر کی طرح قصد کیا۔ چونکہ پہلے معنی یعنی برابری سے رب تعالیٰ پاک ہے۔ اسلئے دوسرے ہی معنی مراد ہیں۔ چونکہ زمین کی نعمتیں ہمارے لئے ہی پیدا فرمائی گئی تھیں۔ اور زمین کی ساری چیزیں آسمانی مدد (بارش اور چاند سورج ستارے وغیرہ) کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتیں۔ اس لئے آسمان کو بھی پیدا فرمایا گیا۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ اصل مقصود زمین ہے۔ کیونکہ ہم اسی پر ہی رہتے ہیں۔ اور زمین کیلئے آسمان کو بنایا گیا۔ اس لئے یہاں ثم ارشاد فرمایا گیا۔ خواہ آسمان زمین سے پہلے بنا ہو یا بعد میں لیکن ہے۔ زمین کے تابع اس لئے درجے اور رتبے میں زمین سے پیچھے ہی ہے۔ اس لئے ثم صحیح ہے۔ ہماری اس تقریر سے بہت بڑا اعتراض اٹھ گیا جس کو ہم اعتراض جواب کے موقع پر عرض کریں گے۔ سَمَآءٌ اونچی چیز کو بھی سما کہتے ہیں۔ اور آسمان کو بھی مگر یہاں آسمان مراد ہے۔ جیسے کہ آئندہ عبارت سے معلوم ہو رہا ہے۔ اس سے معلوم یہ ہوا۔ کہ آسمان بھی ہمارے لئے ہی بنا ہے۔ کیونکہ ہمارے لئے زمین بنی اور زمین کے لئے آسمان تو ہمارے لئے آسمان فَسَوّٰىهُنَّ یہاں سوا برابر کرنے اور ٹھیک کرنے کے معنے میں ہے یعنی آسمانوں کو ایسا ٹھیک بنایا۔ کہ اس میں کہیں بھی سوراخ یا شگاف یا ٹیڑھا پن نہ رہا۔

سَبْعَ سَمٰوٰتٍ اس سے معلوم ہوا کہ آسمان سات ہیں بعض علماء فرماتے ہیں کہ مع عرش و کرسی کے سات ہیں۔ اور بعض فرماتے ہیں۔ کہ ان کے علاوہ لہذا مع عرش و کرسی کے نو ہوئے۔ پرانے فلاسفہ نو آسمان مانتے ہیں۔ اور اس آئت کا یہی معنی کرتے ہیں۔ آسمانوں کے سات ہونے میں عجیب حکمت ہے۔ کیونکہ ہر آسمان پر ایک سیارہ ہے۔ اگر آسمان ایک ہی ہوتا اور سب سیارے تارے اسی ایک پر ہوتے تو زمین کا انتظام درہم برہم ہو جاتا۔ وہ اس طرح کہ پہلے آسمان پر چاند ہے۔ اور چوتھے پر سورج۔ سورج سے غلہ وغیرہ پکتا ہے۔ اور چاند اور دیگر سیاروں سے اس میں رنگت و لذت پیدا ہوتی ہے۔ پھر سورج کبھی قریب آجاتا ہے کبھی دور جس کی وجہ سے کہ موسم بدلتے ہیں اور ہر موسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ اگر سورج پہلے آسمان پر ہوتا تو سخت گرمی کی وجہ سے جاندار فنا ہو جاتے اور کھیت باغ جل جاتے اور اگر چاند چوتھے آسمان پر ہوتا۔ تو اتنی ہلکی شعاعیں زمین تک پہنچتیں جو کہ پھلوں میں رنگت و لذت پیدا کرنے کیلئے کافی نہ ہوتی۔ لہٰذا جس تارے کا زمین سے جس قدر دور رہنا مناسب تھا۔ اس کو اسی قدر دور رکھا گیا۔ انہیں فاصلوں کے فرق کے لئے سات آسمان بنائے گئے اور ان میں صدہا حکمتیں ہیں جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں جن کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ ربنا ما خلقت ہذا باطلا۔ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ اسمیں یہ بتایا گیا۔ کہ رب نے جو کچھ بھی پیدا فرمایا بہت بڑے علم کیساتھ پیدا فرمایا۔ یوں ہی بے فائدہ نہ بنایا جس چیز کو جہاں رکھا اور جس کو جیسا بنایا اسکو ویسا ہی ہونا چاہیئے تھا اور اسمیں یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ جسطرح عالم کا ذرہ ذرہ ہمارے علم میں ہے ایسے ہی تمہارے جسم کے سارے اجزاء ہمارے علم میں ہیں خواہ وہ اجزا تمہارے مرنے کے بعد ہوا میں اڑ جائیں یا پانی میں بہ جائیں یا ذروں سے مل جائیں اور پھر ان پراگندہ اجزاء کو جمع کر کے ان میں دوبارہ روح ڈال دینا ہمارے واسطے کوئی مشکل نہیں مشکل تو اسے ہو جس کے علم میں کچھ کمی ہو یا قدرت میں۔ لہٰذا تم قیامت کا انکار نہ کرو۔

خلاصۂ تفسیر حق تعالےٰ نے جب اپنی پہلی نعمت یعنی انسان کو زندہ کرنا یاد دلا دیا۔ تو اب ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے جن پر زندہ رہنا موقوف ہے یعنی تم اس رب سے کیوں منہ موڑتے ہو جس نے کہ تم کو نیست سے ہست کیا۔ اور پھر موجود کر کے تم کو یوں ہی بے سر و سامان نہ چھوڑا۔ بلکہ اس نے محض تمہاری خاطر زمین اور اس کی ساری نعمتیں پیدا فرمائیں اور چونکہ زمین کی نعمتیں آسمانی اثرات کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتی۔ اس لئے آسمان کو

بھی تمہاری ہی خاطر بنایا۔ اور چونکہ ایک یا دو آسمانوں سے بھی زمین کا انتظام مکمل نہیں ہوتا۔ اس لئے تمہاری ہی خاطر آسمان سات بنائے۔ اور چونکہ زمین و آسمان میں تعلق کے بغیر بھی زمین کی نعمتیں نہیں بن سکتیں۔ اسلئے تمہاری خاطر ان دونوں میں ایسا تعلق پیدا فرمایا۔ کہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ تمہارا رزق آسمان سے آتا ہے۔ اور زمین سے ملتا ہے۔ اور یہ اس لئے ہے۔ کہ خداوند تعالےٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اور ہر چیز کی اسرار اور مصلحتیں اُس کو معلوم ہیں۔ غرض کہ اے انسانو۔ یہ ساری کائنات تمہاری خاطر بنی ہے۔ پھر بھی اگر تم ہمارا احسان نہ مانو تو بہت تعجب ہے۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ ایک یہ کہ زمین اور آسمان کی ساری چیزیں انسان کے نفع کیلئے بنائی گئیں۔ اسی لئے انسان کو ساری مخلوقات سے پیچھے پیدا فرمایا کیوں کہ سامان پہلے جمع کیا جاتا ہے۔ اور جس کی خاطر یہ سامان ہو۔ وہ بعد میں آتا ہے۔ اگر کہیں جلسۂ وعظ ہو۔ تو فرش و تخت و روشنی صفائی وغیرہ کا انتظام پہلے ہو جائیگا سننے والوں کا اجتماع بھی پہلے ہو جائیگا۔ اور مولوی صاحب کی تشریف آوری بعد میں ہوگی۔ وہ جو حدیثِ قدسی میں آتا ہے۔ کہ اے محبوب لولاك لما خلقت الافلاك اُس کی اس آیت سے پوری تائید ہوتی ہے حضور کی تشریف آوری سارے پیغمبروں کے بعد اسی لئے ہوئی۔ کہ مقصود ذات اوست دگر جملگی طفیل۔ نیز انسان تمام چیزوں کے بغیر زندگی نہیں گذار سکتا۔ لیکن وہ تمام چیزیں انسان کے بغیر رہ سکتی ہیں جس سے معلوم ہؤا۔ کہ انسان بادشاہ ہے۔ باقی سب خدّام کیوں کہ خادم بغیر آقا کے اکثر گذر کر لیتا ہے۔ لیکن آقا بغیر خدّام نہیں رہ سکتا۔ سبحان اللہ آناں کہ غنی تراند محتاج تراند۔ نیز انسان ہر چیز ــــــ سے نفع حاصل کرتا ہے۔ دیگر چیزوں میں یہ وصف نہیں فرشتے کھانے پینے سے دُور جنّات مکانات وغیرہ سے بے پرواہ جانور لباس وغیرہ کے غیر محتاج اور غذائیں بھی اُن کے لئے معمولی اور خاص خاص مگر حضرت انسان کو اِن سب چیزوں کی حاجت پھر اِن میں سے ہر ایک کی ہزار ہا قسمیں چاول ہزار ہا ترکیب سے استعمال کئے جائیں۔ کپڑوں میں سینکڑوں وضع قطع مکان کی صدہا قسمیں پتہ لگا۔ کہ سب چیزیں انہی حضرت کیلئے بنی ہیں۔ **دوسرے** یہ کہ جو چیزیں نفع کے قابل ہیں۔ وہ سب حلال ہیں یعنی جس کو شریعت نے حرام فرمایا وہ حرام اور جس سے سکوت فرمایا وہ حلال کیونکہ جب سب چیزیں ہمارے ہی لئے بنی ہیں۔ تو اُن کا حلال ہونا بھی ہمارے لئے ضروری ہے۔ وہابیوں اور دیوبندیوں کا یہ عقیدہ ہے۔ کہ جو چیز حضور پاک کے زمانہ اقدس میں نہ ہو وہ سب بدعت اور حرام جس سے لازم آیا کہ اعراب دالا قرآن شریف اور بخاری شریف وغیرہ پڑھنا۔ پلاؤ بریانی کھانا۔ ریل کی سواری وغیرہ سب حرام کیا کوئی دیوبندی ہے جو اپنے اس اصول پر عمل کر کے دکھا دے **تیسرے** یہ کہ آسمان ہیں اور وہ جسم ہیں۔ اور سات ہیں۔ قرآن مجید نے بھی یہ بتایا۔ اور توریت اوّل کے پہلے باب میں ارشاد ہؤا۔ کہ ابتدا میں خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔ اسی توریت شریف کے ساتویں باب میں طوفانِ نوح کے بیان میں ذکر ہؤا کہ آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں آٹھویں باب میں فرمایا گیا۔ کہ آسمان کی کھڑکیاں بند ہوگئیں وغیرہ وغیرہ انجیل متی کے تیسرے باب میں ہے۔ کہ جب عیسیٰ علیہ السلام یحییٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے دریا میں غوطہ لگا کر باہر آئے۔ تو اُن کیلئے آسمان کُھل گیا۔ انجیل لُوقا کے اٹھارویں باب میں ہے۔ کہ اتنا بھی نہ چاہا۔ کہ آسمان کی طرف آنکھ اٹھا دے اسی طرح مکاشفاتِ یوحنا کے آٹھویں باب سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ آسمانوں پر تارے ہیں۔ ہندؤں کے دید اور پارسیوں کے وساطیر سے بھی آسمانوں کے متعلق اس قسم کے مضامین ثابت ہیں۔ غرضکہ ہر مذہب کی الہامی اور غیر الہامی کتابوں سے آسمانوں کا ثبوت ہوتا ہے۔ پُرانے فلاسفہ بھی اس کے قائل رہے۔ مگر ایک دیوانہ فلسفی جس کا نام فیثا غورس ہے۔ اس نے آسمانوں کا انکار کیا اُس کی اس بات پر کسی عقلمند نے دھیان نہ دیا۔ اُس زمانے کے فلاسفہ اُس کے اس قول کو دیوانوں کی بڑ سے زیادہ وقعت نہ دی مگر اب کچھ عرصہ سے یورپ میں یہ عقیدہ بہت پھیلا اور اُن کی تقلید میں بعض ہندوستان کے فیشنی مسلمان بھی آسمان کا انکار کرنے لگے۔ اور سید احمد خاں علی گڑھی کے مقلد بن کر جہاں جنّت دوزخ کی آیتوں میں تاویلیں کی۔ ویسے ہی یہ بھی کہا۔ کہ سماء سے مراد انتہائے نظر ہے۔ اور یہ تارے وغیرہ بغیر آسمان کے موجود ہیں۔ اور آسمان کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان کا کلام محض لغو و باطل ہے۔ کہ اس میں ساری آسمانی کتابوں کا انکار ہے۔ اور محسوسات کی مخالفت اُن کے پاس آسمان کے نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ **تفسیر صوفیانہ** وہ اللہ ایسی قدرت والا ہے جس نے تمام جسمانی اور روحانی چیزوں کو تمہارے

لئے پیدا فرمایا کہ وہ سب تمہارے کام آئیں اور تم کو اُن کیلئے نہ بنایا کہ تم اُن میں پھنس کر رب کو بھول جاؤ۔ بلکہ تم کو اپنی عبادت کیلئے پیدا کیا۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ بلکہ خاص اپنے لئے جیسے خود فرمایا کہ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِىْ اے بندے میں نے کوئی کام تیرے غیر کی خاطر نہ کیا۔ تو بھی اپنا کوئی کام میرے غیر کے لئے نہ کر جس قدر تو میرے لئے ہوگا۔ اسی قدر میں تیرا ہوں گا۔ جیسا کہ روایت میں ہے۔ کہ جو اللہ کا ہو رہتا ہے۔ اللہ اُس کا ہو جاتا ہے۔ اور سوا انسان کے کسی میں یہ استعداد نہیں۔ کہ وہ اللہ کا ہو رہے اور اللہ اُس کا ہو جائے۔

**حکایت** ۔ تفسیر روح البیان سورۃ رعد شریف میں فرمایا۔ کہ ایک بزرگ سے رب نے ارشاد فرمایا۔ کہ میں نے عالم کی ساری چیزیں تیرے لئے بنائیں۔ تو نے میرے لئے کیا کیا انہوں نے اپنی عبادات پیش کیں۔ ارشاد الٰہی ہوا۔ کہ یہ عبادتیں بھی تو نے اپنے لئے ہی کہیں تاکہ تو دوزخ سے بچ جائے۔ اور جنت حاصل کرلے بتا میرے لئے کیا کیا عرض کیا۔ مولا پھر تیرے لئے کونسا کام ہوتا ہے۔ فرمایا۔ کہ میرے پیارے دل سے محبت اور میرے دشمنوں سے عداوت اسی لئے صوفیائے کرام کے نزدیک جنت کیلئے عبادت کرنا کمال نہیں محض رضائے الٰہی کیلئے چاہیئے۔ اور جس طرح سے آسمان و زمین کو تیری خاطر بنایا۔ اسی طرح تو بھی اپنے دنیوی کاروبار بھی میری ہی رضا کیلئے کر۔ خود اس لئے کھا پی۔ کہ تو اس سے عبادت کرے۔ بچوں کی اس لئے پرورش کر کہ یہ میرا حکم ہے۔ اور وہ رب تعالیٰ اپنے ہر مخلوق کے ہر حال کو بخوبی جانتا ہے۔ **پہلا اعتراض** جب رب تعالیٰ نے سب چیزیں ہمارے ہی لئے پیدا کی ہیں۔ تو پھر ہم کو بعض چیزیں کیوں دیں۔ اور بعضے انسان غریب و فقیر کیوں رہے بلکول اور انسانوں کے حالات مختلف کیوں ہوئے **جواب** رب نے ساری چیزیں سارے انسانوں کیلئے پیدا کیں۔ نہ کہ فقط تمہارے ایک کے لئے دنیا کی تمام چیزیں تمام انسانوں کو تقسیم ہو کر بقدر حصہ مل گئیں۔ انگلستان والوں کو ایک قسم کے پھل اور غذائیں وغیرہ ہندوستانیوں کو دوسری طرح کے بعض کو کم بعض کو زیادہ تاکہ دنیا کا نظام قائم رہے **دوسرا اعتراض** جب چیزیں ہمارے ہی لئے بنی تو شریعت میں بعض چیزیں حرام کیوں فرمادیں چاہیئے تھا کہ ہم ہر چیز کو ہر طرح استعمال کر سکتے۔ **جواب** ۔ ہر چیز تمہارے نفع کے لئے بنی۔ نہ کہ تمہارے کھانے کے لئے۔ ہر چیز کا نفع علیحدہ علیحدہ ہے۔ کسی کو کھاؤ۔ کسی کو پہنو۔ کسی کو دیکھو۔ کسی کو سونگھو۔ کسی سے بچو۔ تمہارے گھر میں تمہاری بیوی۔ ماں۔ بہن۔ بیٹی۔ یہ سب تمہارے نفع کے لئے ہی ہیں۔ لیکن ان سب کا نفع یکساں نہیں۔ بیوی سے وطی کی جاتی ہے اور ماں بہن سے امداد اور شفقت حاصل کی جاتی ہے۔ پانی اور آگ سب تمہارے نفع کے لئے ہیں۔ مگر پانی پیا جاتا ہے۔ اور آگ کھائی پیئی نہیں جاتی اور جس طرح ہر چیز کا طریقہ استعمال سکھانے والے کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح انبیاء کرام کے تعلیم کے بغیر کسی چیز کو استعمال کرنا فائدے مند نہ ہوگا۔ انبیاء کرام نے فرمایا۔ کہ بکری سے استعمال کر کے نفع لو اور خنزیر سے بچو۔ **تیسرا اعتراض** ۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ زمین پہلے پیدا ہوئی۔ اور آسمان بعد میں مگر دوسری آیتوں سے ثابت ہے۔ کہ آسمان پہلے بنا اور زمین بعد میں اب ان آیتوں میں مطابقت کس طرح کی جائے۔ **جواب** ۔ اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ زمین کی پیدائش آسمانوں سے پہلے ہے مگر اُس کا پھیلاؤ آسمان کے بعد وہ اس طرح کہ سب سے پہلے پانی پیدا ہوا۔ اُس پانی میں کچھ جھاگ نمودار ہوئے۔ وہ جھاگ اس جگہ محفوظ رکھے گئے جہاں اب خانہ کعبہ ہے۔ یہ جھاگ ہی اصل زمین ہیں۔ پھر پانی سے بخار اُٹھا وہ بخار آسمان بنا پھر ان جھاگوں کو پھیلا دیا گیا چنانچہ دوسری آیت میں ارشاد ہوا۔ کہ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا یعنی اس کے بعد زمین کو پھیلایا۔ مگر یہ جواب ضعیف ہے۔ کیونکہ یہاں کی آیت سے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ زمین کی ساری چیزیں پیدا کر کے آسمان پیدا کیا اور زمین کی ساری چیزیں زمین کے پھیلنے کے بعد ہی ہوسکتی ہیں۔ بعض لوگوں نے فرمایا۔ کہ اصل آسمان زمین سے پہلے بنا لیکن اُس کا ہموار ہونا اور اُن کا سات بننا زمین کے بعد ہوا۔ لہٰذا اصل آسمان پیدائش میں زمین سے پہلے ہے۔ اور تسویت (ہموار اور یکساں ہونا بعد میں) مگر یہ جواب بھی کمزور ہے۔ کیونکہ دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آسمان کی تکمیل کے بعد زمین بنی ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۔ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۔ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۔ لہٰذا صحیح جواب یہی ہے۔ کہ آسمان پہلے بنا۔ بعد میں زمین لیکن جہاں کہیں آسمان کو زمین کے بعد بیان فرمایا گیا ہے وہ اس لئے ہے کہ زمین کی پیدائش اصل مقصود ہے اور آسمان اُس کی تابع لہٰذا یہاں

لفظ ثم فقط ذکر اور درجے کی ترتیب کے لئے ہے (تفسیر کبیر)۔ **چوتھا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان و زمین کی پیدائش میں بہت وقت صرف ہوا بلکہ بعض جگہ فرمایا گیا۔ کہ ان کی پیدائش چھ دن میں ہوئی۔ مگر دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان سب کی پیدائش فقط کُن فرما دینے سے ہوئی نیز جب اُس وقت سورج بنا ہی نہ تھا۔ تو چھ دن کیسے معلوم ہوئے۔ دن رات تو سورج سے ہوتا ہے **جواب**۔ اس کا مکمل جواب انشاء اللہ آیت فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ میں دیا جائیگا یہاں صرف اتنا سمجھ لو۔ کہ ایک تو ہے بنانے کا طریقہ دوسرے اُس کی مدت کُن والی آیت میں طریقۂ پیدائش بیان فرمایا گیا۔ کہ رب تعالیٰ نے ان سب چیزوں کو کُن فرما کر بنا دیا۔ آریوں کے پرمیشور کی طرح روح اور مادے کا وہ محتاج نہ تھا۔ اور سِتَّۃِ اَیَّام والی آیت میں مدتِ پیدائش ذکر ہوئی۔ کہ چھ دن میں چھ بار کُن فرما کر یہ تمام چیزیں پیدا فرمائیں۔ نیز چھ دن سے اتنا وقت مراد ہے۔ کہ اگر اُس وقت سورج ہوتا۔ تو اُس کے چھ دن بن جاتے یا دن سے مراد دفعہ ہے یعنی چھ دفعہ کن کی توجہ ہوئی۔ اور یہ تمام چیزیں بن گئیں۔ اب رہی یہ بات کہ کُن فرمانے سے کیا مراد ہے۔ اور جب کہ اُس وقت کوئی چیز موجود تھی ہی نہیں تو کُن کس سے کہا گیا۔ اور کس نے سُنا۔ اور چھ دن میں کیوں پیدا فرمایا یہ تمام باتیں انشاء اللہ ان ہی آیتوں کی تفسیر میں بیان ہوں گی۔ اس قسم کے اعتراضات پنڈت دیانند کے اوہام ہیں۔ نیز آسمانوں کی حقیقت اور ان کی پیدائش کا پورا واقعہ اور اُن کی ترتیب انشاء اللہ اُسی جگہ بیان ہوگی۔ یہاں اس کا موقع نہیں۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا

اور جبکہ فرمایا رب نے آپکے واسطے فرشتوں کے تحقیق میں بنانیوالا ہوں بیچ زمین کے نائب کہا اُنہوں نے کیا بنائیگا تو بیچ اُس کے

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔ بولے کیا ایسے کو نائب کرے گا۔ جو اس میں فساد پھیلائے گا۔

مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ

اُسکو جو فساد پھیلائیگا بیچ اُس کے اور بہائے گا خون اور ہم تسبیح کرتے ہیں ساتھ تعریف تیری کے اور پاکی بولتے ہیں واسطے تیرے فرمایا رب نے

اور خون ریزیاں کرے گا اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے ہیں۔ اور تیری پاکی بولتے ہیں۔ فرمایا۔

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾

تحقیق میں جانتا ہوں۔ وہ جو نہیں جانتے تم

مجھے معلوم ہے۔ جو تم نہیں جانتے

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک** یہ کہ پچھلی آیتوں میں اُن نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا۔ جو بلا واسطہ ہر انسان کو ملتی ہیں۔ یعنی زندگی اور موت اور زمین و آسمان کی نعمتیں اب اُس خاص نعمت کا ذکر ہے جو انسانوں کے والد حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعے سے اُن کو ملی یعنی آدم علیہ السلام کی عزت افزائی اور اُن پر خاص کرم خداوندی کیونکہ باپ کی عزت سے اولاد کی عزت ہے۔ **دوسرے** یہ کہ پچھلی آیتوں میں قیامت تک ملنے والی دائمی نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا۔ یعنی زندگی و موت اور زمین و آسمان کی ظاہری نعمتیں اور اب اُس نعمت کا ذکر ہو رہا ہے۔ جو شروع پیدائش کے وقت صرف ایک بار دی جا چکی اور جس کی وجہ سے نسل انسانی قیامت تک فخر کرے گی مگر چونکہ وہ پچھلی نعمتیں ہر شخص کو محسوس ہوتی تھیں اور کوئی بھی اُس کا انکار نہ کر سکتا تھا۔ اور یہ نعمت انبیاء کرام سے سُن کر ہی معلوم ہوئی۔ اس لئے اُن کا ذکر پہلے ہوا۔ اور اس کا ذکر بعد میں **تیسرے** یہ کہ پہلی آیت سے معلوم ہوا تھا۔ کہ عالم کی ساری چیزیں انسان کیلئے ہی پیدا ہوئیں۔ اس پر سوال پڑ سکتا تھا۔ کہ انسان تو ہزارہا مخلوق سے کمزور ہے فرشتے جنات ہاتھی اور شیر وغیرہ سب اُس سے بڑھ کر طاقت ور ہیں۔ پھر یہ سب کا حاکم۔ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس آیت میں اُس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ کہ اے معترض انسان کی محض جسمانی کمزوری کو مت دیکھ بلکہ اسکی اُس لیاقت اور قابلیت پر بھی نظر کر جو قدرت نے اُسکو عطا فرمائی ہے ہم تجھکو تیری ابتدا پیدائش کا قصہ سناتے ہیں جس سے

تجھکو معلوم ہوگا۔ کہ بہترین مخلوقات یعنی ملائکہ نے تیرے پدر بزرگوار آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا۔ اور اُن کو اپنا خلیفہ مانا۔ حالانکہ فرشتے تمام مخلوق سے زیادہ طاقت ور ہیں جسمانی طاقت اور چیز ہے۔ اور روحانی کمالات دوسری چیز **تفسیر** **وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ** لفظ اِذْ ظرف ہے۔ جو فعل کو چاہتا ہے۔ عام مفسرین اس جگہ اُذکر نکالتے ہیں یعنی اے محبوب ذکر کرو قرآن کریم نے بھی بعض جگہ اِذْ کے ساتھ اذکر ارشاد فرمایا ہے وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ اور فرمایا۔ وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ یہ آئتیں یہاں کے آیت کی تفسیر ہیں۔ پچھلی آیتوں میں محسوس نعمتوں کا ذکر تھا۔ اس لئے وہاں اُذکر کی ضرورت نہ تھی۔ مگر یہاں اُذکر ضروری ہے۔ اس اُذکر کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ یاد کرو۔ اِن لوگوں سے ذکر کرو۔ خیال رہے۔ کہ وہ چیز یاد دلائی جاتی ہے۔ جو پہلے سے علم میں ہو۔ یا تو بتا دی گئی ہو یا دکھا دی گئی ہو معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سارے واقعات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں ہیں اور ظاہر ہے۔ کہ اس سے پہلے بتائے نہیں گئے تھے۔ کیونکہ قرآن کریم تو اب اتر رہا ہے۔ اور حضور نے تواریخ بھی نہ پڑھی تھی۔ ثابت ہوا۔ کہ وہ سب حضور کو دکھا دیئے گئے تھے۔ اس لئے فرمایا جاتا ہے۔ کہ اے محبوب ذرا اُس واقعہ کو تو یاد کرو۔ بعض جگہ ارشاد ہوا ہے۔ **اَلَمْ تَرَ** یعنی اے محبوب کیا تم نے وہ واقع نہ دیکھا یعنی دیکھا ہے۔ اس سے حضور کا علم غیب بھی ثابت ہوا۔ اور حاضر ناظر ہونا بھی **قَالَ رَبُّكَ** یہ خبر سیدنا آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے فرشتوں کو دے دی گئی تھی۔ اسمیں چند حکمتیں تھیں۔ ایک یہ کہ بندوں کو مشورہ کرنے کی ہدائت ہو اور اس سے معلوم ہو جائے۔ کہ مشورہ سنت الٰہیہ ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کی عظمت ظاہر ہو کہ اُن کی تشریف آوری سے پہلے ہی اُن کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ سلطنت کے معمولی حکام دن رات آتے جاتے رہتے ہیں۔ لیکن جب وائسرائے دارالسلطنت سے چلتا ہے۔ تو سارے ہندوستان میں اُس کا اشتہار ہو جاتا ہے۔ کہ فلاں وائسرائے آنیوالا ہے۔ کیوں کہ وہ سلطنت کا بڑا رکن ہے۔ آدم علیہ السلام بھی عالم کے اصل مقصود تھے۔ اس لئے اُن کی آمد کا اس طرح اعلان فرمایا گیا۔ تیسرے یہ کہ اُن کی تشریف آوری سے پہلے ہی ملائکہ کے سارے شبہات دور کر دیئے جائیں تاکہ اُن کی آمد کے بعد سوال وجواب کا موقع نہ رہے۔ **رَبُّكَ** اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا اظہار ہے۔ اس لئے کہ یہاں یہ نہ فرمایا گیا۔ کہ میں نے کہا۔ یا اللہ نے فرمایا۔ بلکہ یوں فرمایا۔ کہ اے محبوب تمہارے رب نے فرمایا۔ یعنی رب نے اپنا ذکر حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے ساتھ کیا اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے۔ کہ یہ سب کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہو رہا تھا۔ چونکہ آپ کو پیدا کرنا منظور تھا۔ اس لئے یہ سارے انتظامات ہوئے۔ جیسے کہ پھول کیلئے سارا باغ لگایا جاتا ہے **لِلْمَلٰٓئِكَةِ** ۔ ملائکہ مَلَک کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں فرشتہ یہ لفظ علوکہ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پیغام اہل عرب کہتے ہیں۔ الکنی الیہ یعنی مجھ کو اُس کی طرف بھیجا اس سے مَألَکٌ بنا۔ اُس کو بدل کر مَلْئِکٌ ہوا پھر ہمزہ گر کر مَلَکٌ رہا۔ اُس کی جمع ملائک ہوئی۔ جیسے شمَأل کی جمع شمائل پھر جمع کو مؤنث کرنے کیلئے "ت" لگا دی گئی۔ اب اس کے معنی ہوئے قاصد چونکہ فرشتے حق تعالیٰ اور اُس کے پیغمبروں کے درمیان وحی لانے والے قاصد ہوتے ہیں۔ نیز اس دنیا میں رحمتیں اور عذاب لے کر آتے ہیں۔ اس لئے انہیں مَلَک کہتے ہیں **فرشتے کی حقیقت** یہ نوری جسم ہیں مختلف شکل بدل سکتے ہیں۔ بہت طاقتور ہیں۔ عالم ملکوت میں سے ہیں۔ ان کی کثرت کا یہ حال ہے۔ کہ تفسیر کبیر وروح البیان وغیرہ نے فرمایا۔ کہ انسان جنات کا دسواں حصہ اور جن وانس خشکی کے جانوروں کا دسواں حصہ اور یہ سب مل کر پرندوں کا دسواں حصہ اور یہ سب مل کر دریائی جانوروں کا دسواں حصہ اور یہ سب مل کر زمین کے فرشتوں کا دسواں حصہ اور یہ ساتویں آسمان تک یہ ترتیب ہے۔ پھر یہ تمام مخلوقات کرسی کے فرشتوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ وہ سب مل کر عرش اعظم کے ایک پردے کے فرشتوں کے مقابلے میں خیال رہے۔ کہ عرش اعظم کے چھ لاکھ پردے ہیں۔ اور ہر پردے پر اسی قدر ملائکہ ہیں۔ پھر یہ تمام مخلوق اُن فرشتوں کے مقابلہ میں جو عرش اعظم کے آس پاس گھومتے رہتے ہیں۔ ایسے ہیں۔ جیسے دریا کے مقابلے میں قطرہ اُن کی تعداد رب ہی جانتا ہے۔ یہ تمام فرشتے رب کے مطیع بندے اور ہر دم اُس کی عبادت میں مشغول رہنے والے ہیں جس سے معلوم ہوا۔ کہ سب سے بڑی مخلوق فرشتے ہی ہیں۔ قرآن کریم بھی فرما رہا ہے۔ **وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ** ۔ یعنی رب کے لشکروں کو وہی جانتا ہے۔ اس جگہ تفسیر کبیر اور روح البیان نے فرمایا۔ کہ حضور

صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج میں ایک جگہ فرشتوں کی قطاریں جاتی ہوئی دیکھیں جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا۔ کہ یہ کہاں جا رہے ہیں جبرائیل نے عرض کیا۔ کہ میں تو جب سے پیدا ہوا ہوں اس قطار کو ایسے ہی دیکھا مجھ کو خبر نہیں۔ کہ کہاں سے آرہے ہیں کہاں جا رہے ہیں۔ ہاں جو فرشتہ ایک بار گزر جاتا۔ دوبارہ لوٹ کے نہیں آتا فرمایا چلو ان سے پوچھیں چنانچہ اُن میں سے ایک سے سوال کیا گیا۔ کہ تیری عمر کتنی ہے۔ اُس نے جواب دیا مجھے خبر نہیں ہاں اتنا جانتا ہوں۔ کہ رب تعالیٰ ہر چار لاکھ سال کے بعد ایک تارہ پیدا فرماتا ہے۔ اور میں نے چار لاکھ تارے پیدا ہوتے ہوئے دیکھے۔ **ملائکہ کی قسمیں** فرشتے چند قسم پر ہیں جن کا ذکر قرآن میں آرہا ہے۔ ایک عرش کے اٹھانے والے دوسرے عرش اعظم کے ارد گرد گھومنے والے تیسرے بڑے جلیل القدر ملائکہ جیسے حضرت جبرائیل ومیکائیل چوتھے جنت کے فرشتے پانچویں جہنم کے جن کے سردار کا نام مالک ہے۔ دیگر فرشتوں کا نام زبانیہ ہے چھٹے وہ فرشتے جو انسانوں کی حفاظت کیلئے مقرر کیئے گئے ساتویں اعمال نامہ لکھنے والے فرشتے جنہیں کراماً کاتبین کہتے ہیں آٹھویں وہ فرشتے جن کے سپرد دنیا کے انتظامات ہیں۔ پھر ان کی بہت سی قسمیں ہیں بعض پانی برسانے والے بعضے رحم میں بچہ بنانیوالے بعضے مصیبت کیوقت انسانوں کی مدد کرنیوالے وغیرہ وغیرہ اسی جگہ تفسیر کبیر نے سیدنا عبداللہ ابن عباس سے روائیت کی۔ کہ جو شخص کسی جنگل میں پھنس جائے۔ تو اس طرح آواز دے۔ اَعِیْنُوْنِیْ عِبَادَ اللہِ یَرْحَمُکُمُ اللہُ۔ یعنی اے اللہ کے بندو میری مدد کرو۔ اسی طرح حصن حصین میں بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے بندوں کو مصیبت کے وقت پکارنا سنت صحابہ کرام ہے **فرشتوں کے صفات** (۱) فرشتے اللہ اور رسول کے درمیان واسطہ ہیں (۲) وہ ہمیشہ عبادت گذار اور ساجد ہیں (۳) حق تعالیٰ سے ان کو بہت قرب حاصل ہے (۴) وہ معصوم ہیں۔ کہ کبھی حق تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کر سکتے (۵) وہ حق تعالیٰ سے نہائیت ڈرنے والے ہیں (۶) وہ خدا تعالیٰ کے دوستوں کی مدد کرتے ہیں۔ بلکہ اُن کے ساتھ ہو کر کفار سے لڑتے ہیں۔ جیسا کہ جنگ بدر میں ہوا اُن کے بازو اور پر ہیں یہ ساری قسمیں اور اُن کی ساری صفات قرآن پاک میں صراحتاً آئی ہیں۔ اگر اُن تمام آئیتوں کو جمع کرنا ہو تو تفسیر کبیر یہی مقام یا تفسیر حقانی کا مقدمہ دیکھو۔ **خیال رہے**۔ کہ اولاً حق تعالیٰ نے فرشتوں کو آسمان میں اور جنات کو زمین میں بسایا تھا۔ یہ واقعہ آدم علیہ السلام کی پیدائیش سے ساٹھ ہزار سال پہلے ہوا۔ یہ جنات زمین میں سات ہزار سال تک آباد رہے۔ پھر ان کا آپس میں حسد و بغض شروع ہوا چنانچہ انہوں نے آپس میں خوب جنگ و خون ریزی کی اس وقت تک **ابلیس** جس کا نام عزازیل تھا۔ بہت مقبول بارگاہ الٰہی تھا۔ اور تمام ملائکہ میں بڑا عالم و عابد اس کو حکم ہوا۔ کہ اپنے ساتھ فرشتوں کی ایک جماعت لے جا۔ اور جنات کو زمین سے نکال کر اُن کو جزیروں اور پہاڑیوں میں آباد کر دے۔ چنانچہ ابلیس نے ایسا ہی کیا۔ جو فرشتے کہ ابلیس کے ساتھ آئے تھے۔ وہ اس زمین پر آباد کر دیئے گئے۔ لہٰذا اب فرشتوں کے دو حصے ہو گئے۔ ایک زمین والے اور ایک آسمان والے حق تعالیٰ نے اس خدمت کے انعام میں ابلیس کو زمین اور پہلے آسمان کی بادشاہت اور جنت کے خزانے عطا فرمائے۔ لہٰذا یہ کبھی زمین میں عبادت کرتا کبھی آسمان میں کبھی جنت میں اس کے اس عروج و ترقی نے اس کے دل میں فخر پیدا کر دیا۔ اور وہ سوچنے لگا۔ کہ میں تمام ملائکہ سے افضل ہوں۔ اتنا واقعہ خیال رہے یہ آئیندہ تفسیر میں کام آئیگا۔ اس میں اختلاف ہے۔ کہ حضرت آدم کی آمد کی خبر کن فرشتوں کو دی گئی تھی۔ آیا سب کو یا بعض کو بعض فرماتے ہیں۔ کہ صرف زمین کے رہنے والوں کو ہی خبر دی گئی تھی

مگر صحیح یہ ہے۔ کہ سارے فرشتوں کو ہی بتایا گیا تھا۔ کیونکہ آیت میں کوئی قید نہیں۔ **نکتہ**۔ صرف فرشتوں کو ہی خبر دی گئی۔ نہ کہ دیگر مخلوقات کو اس لئے کہ فرشتے دنیا کے انتظام کرنے والے ہیں۔ اور باقی مخلوقات ان کے تابع چونکہ اب فرشتوں کو سیدنا آدم کا ماتحت ہونا ہوگا۔ اس لئے اُن کو ہی بتانا سخت ضروری تھا۔ وائیسرائے کی آمد کی خبر سلطنت کے نوکروں کو خاص طور پر دی جاتی ہے۔ نیز اس وقت فرشتے ہی ساری مخلوقات سے افضل اور طاقتور تھے جب یہی مطیع بنا دیئے گئے تو دوسرے خود بخود مطیع ہو جائیں گے۔ اسی لئے فرشتوں ہی سے سجدہ بھی کرایا گیا۔ نیز جب فرشتوں کو اطلاع دے دی گئی۔ تو باقی مخلوقات کو خود بخود ہو گئی۔ کیونکہ اِن کا سب میں دور دورہ تھا حکومت کی خبریں پہلے خاص محکمے کیطرف ہی آتی ہیں۔ نیز فرشتوں ہی کو اپنے خلیفہ ہونے کی امید ہو سکتی تھی۔ کیونکہ وہ طاقتور۔ عبادت گذار اور معصوم

بندے تھے۔ انہی کو خبر دی گئی۔ تاکہ اپنے سارے سوال وجواب کریں۔ **اِنِّیْ جَاعِلٌ** اس جگہ جَاعِلٌ فرمایا گیا نہ کہ خَالِقٌ اس لئے کہ خلق کے معنی ہیں پیدا کرنا اور جَعْل کے معنی ہیں۔ بنانا محسوس چیزوں کے پیدا کرنے کو خلق کہتے ہیں۔ اور اُس کے باطنی صفات کے پیدا کرنے کو جعل اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا۔ کہ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ آسمان زمین محسوس جسم تھے۔ اُن کے لئے خَلَقَ فرمایا گیا۔ اور تاریکی اور روشنی ملکوتی چیزیں ہیں۔ اس لئے جَعَلَ فرمایا گیا۔ چونکہ اس جگہ صرف حضرت آدم علیہ السلام کے جسم شریف کے بنانے کی خبر دینا منظور نہیں جسم تو بہت سی مخلوقات کے پیدا ہو چکے تھے۔ بلکہ اُن کے خلافت کی خبر دینا منظور تھی۔ اس لئے جاعلٌ فرمایا گیا۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ اس میں ان کی صرف پیدائش کا ذکر ہوا۔ **فِی الْاَرْضِ** سیدنا آدم کی خلافت زمین میں اس لئے مقرر فرمائی گئی۔ کہ آسمان میں تو جھگڑے۔ فساد۔ جنگ وجدال خون ریزیاں وغیرہ کبھی ہوں گی ہی نہیں۔ اس لئے وہاں کسی منتظم خلیفہ کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ ساری بیماریاں زمین میں ہی ہونے والی تھیں۔ اس لئے یہاں ہی خلیفہ کی ضرورت تھی۔ رہی یہ بات کہ ساری زمین کا خلیفہ بنایا گیا۔ یا بعض کا ظاہر یہی ہے۔ کہ ساری کا کیوں کہ یہاں کوئی قید نہیں۔

**خَلِیْفَۃً**۔ خَلْفٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ پیچھے خلیفہ بروزن فعیل صفت مشبہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں پیچھے آنے والا یا نائب جو کسی کے پیچھے یا غیر موجودگی میں اُس کا کام کرے۔ ظاہر یہ ہے۔ کہ یہاں اللہ کا خلیفہ مراد ہے۔ اگرچہ خدا تعالیٰ ہر وقت موجود ہے اُس کو خلیفہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ مگر بندوں کو ضرورت ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ تک ان کی رسائی نہیں درمیان میں ایک ایسے واسطے کی ضرورت پڑی۔ جو رب سے فیض لے اور بندوں کو پہنچائے۔ وہی رب کا خلیفہ ہے۔ اس لحاظ سے سارے پیغمبر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک ہر زمانے کے قطب خلیفۃ اللہ ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے فرمایا۔ کہ یا داؤد اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ پہلے خلیفہ آدم علیہ السلام ہوئے۔ اور آخری خلیفہ عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے۔ کیونکہ وہ امت مصطفےٰ صلی اللہ کے خاتم الاولیاء یعنی آخری ولی ہیں۔ مگر اس آیت میں خلیفہ سے آدم علیہ السلام ہی مراد ہیں۔ کیونکہ یہاں سارے واقعات اُنہی کے بیان ہو رہے ہیں۔ حضرات انبیاء کرام چند وجہوں سے خلیفۃ اللہ ہوئے۔ **ایک** یہ کہ یہ آسمانی اور زمینی چیز کے مجموعہ ہیں۔ کہ اِن کا جسم فرشی اور روح عرشی ہے۔ **دوسرے** یہ کہ یہ حق تعالیٰ کی ساری صفات کا مظہر ہیں۔ **تیسرے** یہ کہ ان کو رب نے اپنا علم عطا فرمایا جس سے انہوں نے قوانین اور قاعدے بنا ڈالے۔ **چوتھے** یہ کہ اِن کو اپنا کلام دیا۔ کہ رب کے کلام کو اپنی زبان سے مخلوق تک پہنچایا۔ **پانچویں** یہ کہ اِن کو ایسی قدرت کاملہ عطا فرمائی جو کہ رب کی قدرت کا نمونہ ہے۔ اگرچہ بظاہر فرشتے بڑے قوی ہیں۔ لیکن نبی کی قوت وقدرت اُن سے کہیں بڑھ کر ہے حضرت ملک الموت موسیٰ علیہ السلام کے ایک تھپیڑ کی تاب نہ لا سکے۔ جیسا کہ احادیث میں آیا ہے۔ **چھٹے** یہ کہ دنیا کی ہر چیز کو اِن کے قبضے میں کیا گیا۔ کہ حیوانات۔ جمادات۔ بلکہ آسمان وزمین پر اِن کی حکومت قائم ہوئی **ساتویں** یہ کہ جسمانیات کے علاوہ روحانیات میں بھی ان کا بہت دور دورا ہے۔ کہ جنات فرشتے ان کے قبضے میں خیال تو کرو۔ کہ عرب کا ایک ناقہ نشین۔ شہنشاہ صلی اللہ علیہ وسلم آن کی آن میں زمین وآسمان کو طے فرماتا ہوا۔ وہاں تشریف فرما ہو کر آگیا۔ جہاں فرشتوں کا خیال بھی نہیں پہونچ سکتا۔ یہ تو قوت انبیاء کا کچھ ذکر ہوا شاید اس کا کفار انکار کر جائیں۔ لیکن اب سائنس کی کرشمے اور مسمریزم کی طاقتیں تو سب پر ظاہر ہو گئیں۔ کہ جس نے انسان کی طاقت وقوت کو بالکل ظاہر کر دیا۔ بھلا خیال کرو۔ کہ انسان نے زمین پر بیٹھے بیٹھے آسمانوں کی پیمائش کر ڈالی اور چاند تاروں کی حرکتیں معلوم کر کے اُن کی تقسیم کر ڈالی جس سے گھنٹے منٹ اور سیکنڈ بنا لئے آوازوں کو فونوگراف میں قید کر لیا۔ ٹیلیفون اور تار برقی کے ذریعہ تین سیکنڈ میں آواز کو ساری زمین میں گھما دیا۔ غرض کہ اُس نے وہ کام کر کے دیکھائے جن کی مثال نہیں ملتی۔ معلوم ہوا۔ کہ یہی حق تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہے۔ اور یہی خلافت کے لائق **بعض** نے فرمایا۔ کہ یہاں خلیفہ سے مراد جنات اور فرشتوں کا خلیفہ ہے۔ کیونکہ یہ اِن دونوں کے بعد زمین میں آباد ہوئے۔ اس معنی سے سارے انسان خلیفہ ہیں۔ قرآن کریم نے فرمایا جَعَلَکُمْ

خُلَفَاءَ الْاَرْضِ شیخ ابن عربی فتوحات مکیہ کے دسویں باب میں فرماتے ہیں۔ کہ آدم علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے خلیفہ اور نائب ہوئے۔ امام بوصیری قصیدہ بردہ شریف میں فرماتے ہیں۔

فَاِنَّکَ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ کَوَاکِبُهَا يُظْهِرْنَ اَنْوَارَهَا لِلنَّاسِ فِی الظُّلَمِ

یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ بزرگی کے سورج ہیں اور سارے پیغمبر آپ کے تارے اسی قسم کا مضمون مولوی محمد قاسم صاحب بانی مدرسہ دیوبند نے بھی تحذیر الناس میں لکھا اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آدم علیہ السلام بلکہ سارے پیغمبر حضور صلے اللہ وسلم کے خلیفہ ہیں۔ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا۔ یہ وہ عرض ہے۔ جو فرشتوں نے خلیفہ کی خبر سن کر بارگاہ الٰہی میں پیش کی یا تو یہ کلام سارے فرشتوں کا ہے۔ یا زمین والوں کا اور بعض علما فرماتے ہیں۔ کہ صرف ہاروت وماروت کا علماء کرام فرماتے ہیں۔ کہ جن فرشتوں نے یہ عرض کر کے خون ریزی اور فساد کو انسان کی طرف نسبت دی ان کو حق تعالیٰ نے اسلئے مقرر کیا ہے۔ کہ جہاد میں شرکت کر کے مسلمانوں کی امداد کیا کریں۔ (تفسیر روح البیان) مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ فرشتوں نے سمجھا۔ کہ انسان کی خلافت سے زمین میں دو زبردست خرابیاں پیدا ہوں گی۔ ایک فساد دوسرے خون ریزی یا تو اس لئے سمجھا۔ کہ وہ لوح محفوظ میں یہ دیکھ چکے تھے۔ یا اس لئے۔ کہ جنات نے یہی خرابیاں کی تھیں۔ اور جو شہوت اور غصہ اُن میں تھا۔ وہ انسان میں بھی ہے۔ لہٰذا اِن دونوں کے کام بھی یکساں ہی ہوں گے۔ خیال رہے کہ اِن کی مُراد فساد سے گناہ اور بدکاریاں ہیں۔ چونکہ انسان میں شہوت ہے۔ اس لئے وہ اپنے سارے اعضاء کو گناہوں میں صرف کرے گا۔ اپنے کان اور آنکھوں کو غیبت چغلی سننے اور نامحرم عورتوں لڑکوں کو دیکھنے میں صرف کریگا۔ اور زبان کفریات بکنے جھوٹ بولنے بُروں کو بھلا کہنے اور بھلوں کو گالیاں دینے میں استعمال کرے گا۔ اور چونکہ اُس کو بھوک وغصہ بھی ہے۔ اس لئے گوشت کھانے اور پوست پہننے کے واسطے خشکی اور دریائی جانوروں کو قتل کرے گا۔ بلکہ ملک اور مال حکومت عزت حاصل کرنے کے لئے خود انسانوں کو قتل کر کے زمین کو خون سے رنگین کرے گا۔ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ نُسَبِّحُ۔ تسبیح سے بنا ہے جس کے معنی ہیں عیوب سے پاک کرنا۔ اور پاک جاننا یہاں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی ہم سب فرشتوں کا یہی کام ہے کہ ہمیشہ تیری پاکی بولا کریں۔ اور تیری تعریف کیا کریں۔ یا تیرا شکر بجالایا کریں۔ وَنُقَدِّسُ لَكَ۔ نُقَدِّسُ۔ تقدیس سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کسی کے صفات کمالیہ بیان کرنا تسبیح میں عیبوں کی نفی اور تقدیس میں صفات کا اثبات ہے۔ تو اُن کا مطلب یہ ہوا۔ کہ مولیٰ ہم فرشتوں میں گناہ کرنے کا مادہ ہی نہیں۔ کیونکہ ہم میں نہ غضب ہے۔ نہ غصہ ہے۔ نہ شہوت نہ غرور حسد وغیرہ ہمارے کام صرف تین ہی ہیں۔ تیری پاکی بولنا تیرا شکر کرنا۔ اور تیری عظمت بیان کرنا۔ لہٰذا اگر ہم کو ہی اس خلافت سے سرفراز فرمایا جائے۔ تو تیرا عین کرم ہے کیوں کہ ہماری وجہ سے تیری زمین گندی نہ ہوگی۔ جواب ملا۔ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ یعنی اے فرشتو ہم کو تمہاری عبادت اور انسان کی نافرمانی کا پورا پورا علم ہے۔ مگر پھر بھی اُس کو خلیفہ بنانے میں جو راز ہیں وہ تم نہیں جانتے۔ تم میں اور اُس میں چند فرق ہیں۔ اسی وجہ سے وہ خلافت کا زیادہ حق دار ہے ایک یہ کہ تم کامل عابد ہو۔ اور وہ کامل عالم ہوگا۔ اور عابد کیلئے مسجد کا محراب اور عالم کے لئے خلافت کا تخت وتاج ہے۔ دوسرے یہ کہ تمہارا تعلق فقط عالم ارواح سے ہے۔ اُس کا تعلق اجسام وارواح دونوں سے ہوگا۔ کیونکہ اُسے جسم اور روح دونو ملیں گے تیسرے یہ کہ تمہاری عبادت جبری ہے کیونکہ وہ تمہاری غذا ہے۔ اُن کی عبادت اختیاری ہوگی چوتھے یہ کہ تمہیں عبادت سے کوئی چیز روکنے والی نہیں اُس کے سلئے ہزاروں چیزیں درپیش ہوں گی۔ پھر وہ اُن سب پر لات مار کر ہماری اطاعت کرے گا۔ اس لئے اُس کا ایک سچّا سجدہ تمہاری ہزار ہا عبادتوں سے افضل ہوگا۔ پانچویں یہ کہ تم میں کوئی گنہگار نہیں۔ اس لئے تم سے ہماری شان ستّاری غفّاری ظاہر نہیں ہوسکتی اُن میں گنہگار بھی ہوں گے۔ جن کے گناہوں کو میں چھپاؤں گا۔ اور جب وہ روتے ہوئے توبہ کریں گے۔ تو میں مغفرت کروں گا۔ بیشک اُن میں شہوت اور غصہ ہوگا۔ مگر جب وہ میرے لئے صرف ہوگا۔ تو اُس سے بڑے بڑے عمدہ نتیجے نکلیں گے۔ اُس کے دل میں میرے عشق اور محبت کا جوش اور اُس کے خیال میں میرا

جذبہ ہوگا۔ اور جب وہ اپنا غصہ میری رضا کے لئے استعمال کرے گا۔ تو میدان جہاد میں جانباز غازی بن کر آئے گا۔ اور شہید یا فتح مند بن کر ہٹے گا۔ اور چونکہ اُن میں یہ برائیاں قباحتیں ہوں گی۔ اس لئے اُن میں رسول اور کتابیں احکام بھیجے جائینگے۔ اور اُن سے وعدے اور وعید کئے جائیں گے اے ملائکہ اور اے فرشتو جس طرح اُن میں فاسق و فاجر و بدکار ہوں گے۔ ایسے ہی اُن میں عابد و زاہد متقی پرہیز گار بھی ہوں گے میرے وفادار اور رازدار بھی ہوں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن میں احمد مختار ہوں گے۔ اور ان کے صحابہ کبار اور اہلبیت اطہار **خلاصۂ تفسیر** السالوں کو دو نعمتیں بتاکر تیسری نعمت یاد دلائی جارہی ہے۔ اور فرمایا جارہا ہے۔ کہ رب تعالیٰ نے تم پر اتنا بڑا افضل فرمایا جو کسی مخلوق پر نہ فرمایا تھا۔ کہ تمہارے دادا حضرت آدم علیہ السلام کو وہ عزت بخشی کہ فرشتوں کو اُن کی پیدائش کی خبر کی۔ کہ ہم زمین میں اپنا نائب پیدا فرمانا چاہتے ہیں۔ کہ اُس کے اور اُس کی اولاد انبیاء کرام کی معرفت اپنے احکام جاری کریں گے۔ جب ملائکہ نے سُنا تو وہ سمجھے کہ آدم علیہ السلام خدا کے بڑے برگزیدہ بندے ہوں گے۔ کیونکہ اُن کی پیدائش سے پہلے اُن کے خلافت اور حکومت کی منادی ہورہی ہے مگر جب انہیں یہ معلوم ہُوا۔ کہ اُن کے خمیر میں آگ پانی ہوا اور مٹی موجود ہیں جس سے کہ اُن میں شہوت اور غصہ یقیناً ہوگا۔ جو کہ فساد کی جڑ ہے۔ تو نہایت تعجب سے کہنے لگے۔ کہ مولا ایسے کو خلیفہ بنانے میں کیا حکمت ہے جس میں ایسے فسادات کا اندیشہ ہو۔ رہی تیری تسبیح و حمد اس کے لئے ہم فرشتے موجود ہیں۔ جن میں نہ غصہ ہے نہ شہوت رب تعالےٰ نے مجملاً یہ جواب ہی دے دیا۔ کہ اس میں جو حکمت ہے۔ وہ تم کو نہیں معلوم۔ ہم کو معلوم ہے۔ تم میں شہوت و غصہ کا نہ ہونا ہی اس بات کا باعث ہے۔ کہ تمہارے سوا انکو خلیفہ بنایا جائے

## آدم علیہ السلام کی پیدائش!

تفسیر عزیزی وغیرہ میں آدم علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ اس طرح نقل فرمایا۔ کہ حق تعالےٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا۔ کہ تمام روئے زمین سے ہر قسم کی سیاہ، سفید، سُرخ، کھاری، میٹھی، نرم، خشک ایک مٹھی خاک اٹھالاؤ۔ حضرت جبرئیل نے زمین پر تشریف لاکر خاک اٹھانی چاہی۔ زمین نے سبب پوچھا۔ حضرت جبرئیل نے سارا واقعہ بیان کیا۔ زمین نے عرض کیا۔ کہ میں اس سے خدا کی پناہ پکڑتی ہوں۔ کہ تو مجھ سے خاک اٹھا کر انسان بنائے جسکی وجہ سے میرا کچھ حصہ جہنم میں پہونچے۔ حضرت جبریل خالی واپس گئے۔ اور عرض کیا۔ کہ خدایا زمین نے تیری عزت کی پناہ پکڑی۔ میں تیرے نام اور عزت کے ادب سے اُس سے خاک نہ اٹھا سکا۔ حق تعالےٰ نے پھر حضرت اسرافیل و میکائیل کو باری باری بھیجا مگر وہ بھی اسیطرح واپس گئے۔ آخر میں حضرت ملک الموت بھیجے گئے۔ انہوں نے زمین کی ایک نہ سُنی۔ بلکہ فرمایا۔ کہ میں اللہ کے حکم کا تابعدار ہوں۔ تیری عاجزی اور زاری کی وجہ سے رب کی اطاعت نہیں چھوڑ سکتا۔ اسی لئے اُن کو جان نکالنے کا کام سپرد کیا گیا۔ کہ تم نے ہی اس خاک کو زمین سے الگ کیا ہے۔ تم ہی اس کو ملانا۔ اب انہیں حکم ہُوا۔ کہ اس خاک کو وہاں رکھو۔ جہاں آج خانہ کعبہ ہے۔ فرشتوں کو حکم دیا۔ کہ اس خاک کا مختلف پانیوں سے گارا بنائیں چنانچہ اُس پر چالیس روز تک بارش ہوئی۔ اُنتالیس دن تو غم و رنج کا پانی برسا۔ اور ایک دن خوشی کا۔ اسی لئے انسان کو رنج و غم زیادہ رہتے ہیں۔ اور خوشی کم ہوتی ہے۔ پھر اس گارے کو مختلف ہواؤں سے اتنا خشک کیا۔ کہ کھنکھنانے لگا۔ جیسے قرآن کریم فرمارہا ہے۔ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ۔ پھر فرشتوں کو حکم ہُوا۔ کہ اس خشک گارے کو مکے اور طائف کے درمیان وادیٔ نعمان میں عرفات پہاڑ کے نزدیک رکھیں۔ پھر حق تعالےٰ نے خاص اپنے دست قدرت سے اس گارے کو حضرت آدم کا قالب بنایا۔ اور اُن کی صورت تیار کی۔ فرشتوں نے کبھی ایسی صورت نہ دیکھی تھی۔ تعجب سے اُس کے آس پاس پھرتے تھے۔ اُس کی خوبصورتی سے حیران تھے۔ ابلیس کو بھی اس سارے اعلان وغیرہ کی خبر ہوچکی تھی۔ وہ بھی اس قالب کو دیکھنے آیا۔ اور اُس کے گرد پھر کر بولا۔ کہ اے فرشتو تم اسی کا تعجب کرتے ہو یہ تو ایک اندر سے خالی جسم ہے جس میں جگہ جگہ سوراخ ہیں۔ اور اس کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر بھوکا ہو تو گر پڑے۔ اور اگر خوب سیر ہوجائے تو چل پھر نہ سکے۔ اس قالب خاکی سے کچھ نہ ہوسکے گا۔ پھر بولا ہاں اس کے سینے کی بائیں طرف ایک بند کوٹھری ہے (دل)، یہ خبر نہیں۔ کہ اس میں کیا ہے۔ شائد کہ یہی لطیفہ ربانی کی جگہ ہو جس کی وجہ سے یہ خلافت کا حقدار ہوا۔ پھر روح کو حکم ہُوا۔ کہ اس

قالب میں اور اس کے گڑھوں میں بھر جائے۔ جب روح قالب کے پاس پہنچی تو جسم کو تنگ و تاریک پایا۔ اندر جانے سے ٹھہر گئی بعض روایت میں آتا ہے۔ کہ تب نورِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ قالب جگمگا دیا گیا۔ یعنی وہ نور پیشانیٔ آدم علیہ السلام میں امانت رکھا گیا۔ اب روح آہستہ آہستہ داخل ہونے لگی۔ ابھی سر میں تھی۔ کہ آدم علیہ السلام کو چھینک آئی۔ اور زبان سے نکلا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ حق تعالےٰ نے ارشاد فرمایا۔ یرحمك اللہ۔ یہی اب بھی سنت ہے۔ جب روح کمر تک پہنچی حضرت آدم نے اُٹھنا چاہا۔ مگر گر پڑے۔ کیونکہ نیچے کے دھڑ میں روح پہنچی ہی نہ تھی۔ حق تعالےٰ نے فرمایا۔ کہ خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ جب تمام بدن میں روح پھیل گئی۔ تو حکم ہوا۔ کہ فرشتوں کے پاس جاکر اُن کو سلام کرو۔ اور سنو وہ تمہیں کیا جواب دیتے ہیں۔ تب آدم علیہ السلام ادھر تشریف لے گئے اور فرمایا اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ انہوں نے جواب دیا وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ ارشاد الٰہی ہوا۔ کہ یہی الفاظ تمہارے اور تمہاری اولاد کے لئے مقرر کئے گئے۔ حضرت آدم نے عرض کیا۔ کہ مولا میری اولاد کون تب اُنکی پشت پر دستِ قدرت پھیر کر اس سے ساری انسانی روحیں نکالی گئیں۔ اور آدم علیہ السلام کو سب دکھائی گئیں۔ اور انہیں کافر مومن منافق اولیاء قطب انبیاء دکھائے گئے جس کا ذکر آگے کی آیتوں میں آتا ہے۔ **آیت کے فائدے۔** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ کوئی اہم کام بغیر مشورہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ مشورہ کرنا سنت الٰہی بھی ہے۔ اور ہم کو اس کا حکم بھی ہے۔ **دوسرے** یہ کہ کام میں جلد بازی ہرگز نہ کرنی چاہیئے حق تعالےٰ نے جو کہ قادرِ مطلق ہے۔ سیدنا آدم کا خمیر چالیس دن میں تیار فرمایا **تیسرے** یہ کہ چالیس کا عدد بڑا مبارک ہے۔ کہ خمیر حضرت آدم چالیس میں ہوئی۔ اب بھی ماں کے پیٹ میں نطفے کا ہر حال چالیس دن میں بدلتا ہے۔ پھر عورت کو چالیس ہی دن تک نفاس کا خون آسکتا ہے۔ چالیس سال میں ہی انسان کی عقل کامل ہوتی ہے۔ اسی لئے اکثر انبیاء کرام کو نبوت اسی عمر میں ملی۔ **چوتھے** یہ کہ آدم علیہ السلام کا دبدبہ زمین و آسمان ہر جگہ ہے۔ ہاں اُن کا پایۂ تخت زمین ہے۔ کیونکہ اس آیت میں خلیفہ کو بغیر قید کے رکھا۔ زمین اُن کا قیام گاہ فرمایا۔ **پانچویں** یہ کہ خلیفہ کے لئے معصوم ہونا ضروری نہیں۔ جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں۔ ہاں نبوت کیلئے عصمت ضروری ہے۔ اگر خلیفہ کا معصوم ہونا ضروری ہوتا۔ تو فرشتے ہی خلیفہ بنائے جاتے۔ یہی وہ عرض بھی کر رہے تھے۔ حق تعالےٰ نے انسان کے گنہگار ہونے کا انکار نہ فرمایا۔ بلکہ صرف یہ فرمایا۔ کہ گنہگاروں کو ہی خلافت دینی مصلحت ہے **چھٹا** یہ کہ خلیفہ کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔ غائب خلافت نہیں کرسکتا۔ کیونکہ لوگوں کی نگاہ سے حق تعالےٰ کی ذات بھی غائب ہے۔ اسی وجہ سے تو اس نے اپنا خلیفہ بنایا۔ تاکہ لوگ ظاہر خلیفہ سے فیض لے سکیں۔ اگر خلیفہ بھی غائب ہو جائے۔ تو خلافت کا مقصد ہی پورا نہ ہو۔ نیز اگر غائب کی خلافت صحیح ہو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی قیامت تک خلیفہ رہنے چاہئیں۔ حضرت علیؓ اور امام مہدی کی خلافت کی کوئی ضرورت نہیں۔ **ساتویں** یہ کہ چھوٹوں کو یہ حق حاصل ہے کہ بڑوں کے کام کی حکمت پوچھ لیں۔ جیسے کہ فرشتوں نے حق تعالیٰ سے دریافت کی۔ **آٹھویں** یہ کہ بڑوں کو یہ حق ہے۔ کہ راز کی بات چھوٹوں پر ظاہر نہ کریں۔ بلکہ اُن کو خاموش رہنے کا حکم دیں۔ جیسے کہ اس واقعہ میں ہوا۔ **نویں** یہ کہ علم عبادت سے افضل ہے۔ کیونکہ فرشتے عابد تھے اور آدم علیہ السلام عالم مگر آدم علیہ السلام افضل ہوئے **دسویں** یہ کہ اللہ کا کرم اعمال پر موقوف نہیں۔ دیکھو لاکھوں سال کے عابدوں کو اُن آدم علیہ السلام کے سامنے جھکایا گیا جنہوں نے ابھی ایک سجدہ بھی نہ کیا تھا۔ چونکہ ابھی مضمون پورا نہیں ہوا۔ اس لئے تفسیر صوفیانہ آئندہ کی جائے گی **پہلا اعتراض** تم فرشتوں کو گناہوں سے معصوم مانتے ہو۔ مگر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے بہت سے گناہ کئے۔ **ایک** یہ کہ انہوں نے حق تعالےٰ پر اعتراض کیا۔ اور یہ بڑا گناہ ہے **جواب** یہ اعتراض نہ تھا۔ بلکہ حکمت دریافت کرنا تھی۔ اور یہ بالکل جائز **دوسرے** یہ کہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی غیبت کی کہ اُن کے غیر موجودگی میں اُن کو بُرا کہا **جواب**۔ اگر مسئلہ پوچھنے میں کسی کی بُرائی کا ذکر آجائے۔ تو غیبت نہیں۔ بلکہ جائز ہے ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے حضور کی خدمت میں عرض کیا۔ کہ یا حبیب اللہ میرے شوہر بخیل آدمی ہیں مجھ کو بقدر ضرورت مال نہیں دیتے۔ کیا میں اُن کے بغیر پوچھے کچھ اُن کا مال لے لیا کروں حضور نے فرمایا۔ کہ ہاں بقدر ضرورت لے سکتی ہو۔ اور یہ نہ فرمایا کہ تم نے اُن کی غیبت کی۔ ایسے ہی یہاں ہے۔ **تیسرے** یہ کہ فرشتوں نے اپنی بڑائی ظاہر کی اور یہ غرور ہے جو کہ حرام ہے **جواب**۔ یہ بڑائی نہ تھی۔ بلکہ حق تعالیٰ کی نعمت کا اقرار

کہ خدایا۔ تونے ہم کو اپنے تسبیح اور تقدیس کی توفیق عطا فرمائی ہے۔ اور رب تعالےٰ کی نعمت کا ظاہر کرنا عبادت ہے۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ **چوتھے** یہ کہ فرشتوں نے رب کا جواب سن کر بارگاہ الٰہی میں معذرت کی۔ کہ عرض کیا لَا عِلْمَ لَنَا تو اگر یہ باتیں گناہ نہ ہوتیں تو معذرت کی کیا ضرورت تھی۔ **جواب** زاہد لوگ گناہ سے توبہ کرتے ہیں اور عارفین عبادت کر کے بھی اُن کا یہ توبہ کرنا ترک اولیٰ کی بنا پر تھا۔ شعر

زاہداں از گناہ توبہ کنند عارفاں را از عبادت استغفار

**پانچویں** یہ کہ ملائکہ سے رب نے فرمایا۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ معلوم ہوا۔ کہ وہ جھوٹے تھے اور جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ **جواب** فرشتوں نے اپنے کو عبادت کی وجہ سے خلافت کے لائق سمجھا تھا۔ جو کہ ایک غلط فہمی تھی۔ حق تعالےٰ کی طرف سے اُس کو دُور کر دیا گیا۔ اور غلط فہمی گناہ نہیں۔ اگر کوئی شخص غلط فہمی کی بنا پر قسم بھی کھائے۔ تو بھی گنہگار نہیں ہوتا۔ اگر یہ امور گناہ ہوتے۔ تو رب تعالےٰ اُن پر عتاب فرماتا۔ جیسے کہ حضرت آدم پر ہوا۔ **چھٹے** یہ کہ ہاروت ماروت فرشتے تھے۔ اور اُن سے گناہ کبیرہ سرزد ہوئے۔ جیسا کہ آگے آنے والا ہے۔ **ساتویں** یہ کہ شیطان کو بھی بعض علماء نے فرشتہ مانا ہے۔ حالانکہ وہ تمام گنہگاروں کا سردار ہے۔ پھر ملائکہ کی عصمت کے کیا معنی۔ **جواب**۔ ان دونوں سوالوں کے جواب انشاء اللہ وہاں ہی دیئے جائیں گے۔ جہاں ان کا ذکر آئیگا۔ **دوسرا اعتراض شیعہ کا**۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خلیفہ کا انتخاب رب تعالیٰ کی طرف سے ہونا ضروری ہے۔ نہ کہ لوگوں کی رائے سے دیکھو۔ ملائکہ بظاہر خلافت آدم علیہ السلام کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حق تعالےٰ کے فیصلے کے مقابل اُن کی مخالفت کا کوئی اعتبار نہ کیا گیا۔ چونکہ صدیق و فاروق کی خلافت محض مسلمانوں کی رائے سے ہوئی تھی۔ نہ کہ رب کے انتخاب سے لہٰذا وہ خلافتیں باطل ہیں۔

**جواب** اس سوال کے دو جواب ہیں۔ ایک تحقیقی دوسرے الزامی جواب تحقیقی تو یہ ہے۔ کہ خلافت دو قسم کی ہے۔ ایک نبوّت کے ساتھ ایک بغیر نبوّت پہلی قسم کی خلافت محض حق تعالےٰ کے انتخاب سے ہی ہوگی کسی کی رائے کا اُس میں کچھ دخل نہ ہوگا۔ کیونکہ نبوّت انتخاب الٰہی ہے۔ نہ تو اس میں عمل کو دخل ہے۔ نہ کسی کی رائے کو اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ہاں یہ ثابت ہے۔ کہ بعض انبیاء کرام کی دُعا سے کسی کو نبوّت عطا ہوئی۔ جیسے کہ حضرت ہارون کی نبوّت موسےٰ علیہ السلام کی دُعا سے کہ اُنہوں نے عرض کیا تھا۔ کہ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ مگر یہ نبوّت ملی۔ رب ہی کی طرف سے آدم علیہ السلام کی خلافت اسی قسم کی تھی۔ اس لئے انتخاب رب تعالےٰ کی طرف سے ہوا۔ رہی دوسری قسم کی خلافت یعنی بغیر نبوّت والی اُس کے لئے خا۔ہ تو حق تعالےٰ کی طرف سے بنایا جائیگا۔ مگر اس قاعدے کے مطابق مقرر کرنا مسلمانوں کی طرف سے ہوگا۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ یعنی اللہ نے پرہیزگار مسلمانوں سے وعدہ کر لیا۔ کہ اُنہیں زمین میں خلافت دے گا۔ جس سے معلوم ہوا۔ کہ اس خلافت کے لئے ایمان اور پرہیزگاری درکار ہے۔ نہ کہ انتخاب ربانی بھی موسےٰ علیہ السلام نے سفر میں جاتے وقت حضرت ہارون سے فرمایا۔ اُخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ کہ تم میری قوم میں میرے خلیفہ بن جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض سفر کے موقعہ پر عبد اللہ ابن ام مکتوم کو اپنا خلیفہ بنایا وغیرہ وغیرہ مسلمانوں کے انتخاب کی **چند صورتیں** ہیں۔ **ایک** یہ کہ خود بادشاہ اپنی زندگی میں کسی کو اپنا خلیفہ اور ولی عہد مقرر کر دے۔ جیسے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت **دوسرے** یہ کہ عام مسلمان اُس کو اپنا خلیفہ مان لیں۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت **تیسرے** یہ کہ خاص رائے والے لوگ جن پر عام مسلمانوں کو اعتماد ہو۔ وہ کسی کو اپنا خلیفہ مقرر کر لیں۔ جیسے کہ حضرت عثمان غنی اور حضرت مولیٰ علی کی خلافتیں **جواب الزامی** یہ ہے۔ کہ اگر خلافت کے لئے انتخاب الٰہی ضروری ہے۔ تو نبوّت و خلافت میں کیا فرق رہا وائسرائے بادشاہ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے۔ لیکن چیئرمین اور اسمبلی کا ممبر رعایا کے انتخاب سے نیز بارہ اماموں کے خلافت کی شیعہ کونسی آیت یا نص پیش کریں گے شاید ستر گندا ہے چھپے ہوئے۔ قرآن میں ہوں تو ہوں۔ اس قرآن میں تو نہیں ہیں۔ لہٰذا اگر ہماری تین خلافتیں ختم تو تمہاری پوری بارہ ہی ختم۔ نیز جس طرح نبی اپنی نبوّت کو نہیں چھپا سکتا۔ اور جھوٹے نبی کو نبی نہیں مان سکتا۔ ورنہ خود کافر ہو جائے گا۔ اسی طرح مولا علیؓ پر لازم تھا۔ کہ صدیق اور فاروق کے زمانے میں اپنی خلافت کا اعلان کرتے اور اُن کو خلیفہ نہ مانتے۔ کیا شیعہ حضرات صدیق و فاروق کی

خلافت کا انکار کر کے اہل بیت اطہار کا ایمان بھی ثابت کر سکیں گے (خدا کی پناہ) **تیسرا اعتراض** فرشتوں نے حضرت آدم کے متعلق فرمایا تھا۔ کہ وہ فساد و خون ریزی کریں گے۔ انہوں نے تو کچھ نہ کیا۔ بلکہ وہ تو معصوم نبی تھے۔ **جواب** فرشتوں کو یہ علم تھا۔ کہ خلافت سارے انسانوں میں رہے گی۔ اور ان میں فساد و خون ریزی بھی ہوگا۔ تو یہ عرض معروض نوع انسان کے متعلق ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ

اور　سکھایا　آدم کو　نام　سب کے سب　پھر　پیش کیا ان کو　اوپر　فرشتوں کے　پس　فرمایا　خبر دو تم سب مجھ کو

اور اللہ تعالےٰ نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھائے۔ پھر سب اشیاء ملائکہ پر پیش کر کے فرمایا۔

بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾

ناموں کی　ان کے　اگر　ہو تم　سچے

سچے ہو تو ان کے نام تو بتاؤ

**تعلق**۔ اس آیت کا پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ ہم آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے والے ہیں مگر خلافت پورے علم کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ بادشاہ کو اپنی رعایا کے سارے حالات کا جاننا ضروری ہے۔ اس لئے اب اُن کو علم عطا فرمانے کا ذکر فرمایا گیا۔ **دوسرے** یہ کہ فرشتوں نے حضرت آدم کو خلیفہ بنانے کی حکمت پوچھی تھی۔ اُس کا اجمالی جواب رب تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا۔ کہ اس کو ہم جانتے ہیں تم نہیں جانتے اس سے فرشتے خاموش تو ہو گئے تھے۔ مگر اُن کو تسکین نہ ہوئی تھی۔ اب عملی طور پر اُس کا تفصیلی جواب دیا جا رہا ہے جس سے کہ فرشتوں کو پوری تسکین حاصل ہو۔ **تفسیر وَعَلَّمَ**۔ عَلَّمَ تعلیم سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ آہستہ آہستہ علم دینا اور سکھانا چونکہ آدم علیہ السلام کو حق تعالےٰ کی ذات و صفات اور سارے ایمانیات کا علم اُن کے پیدائش سے پہلے ہی دے دیا گیا تھا۔ اسی لئے انہوں نے چھینک آتے ہی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہا جس میں خدا کی ذات اور صفت کا ذکر ہے۔ اور پھر جیسا کہ روایات میں آتا ہے۔ کہ پیدا ہوتے ہی ساق عرش پر لکھا ہوا پڑھ لیا۔ کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ جس سے معلوم ہوا کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جانتے ہیں۔ اور اُن کی نبوت و رسالت کو بھی پہچانتے ہیں۔ اور لکھے ہوئے حروف پڑھ لیتے ہیں۔ مگر ساری چیزوں کا علم پیدائش کے بعد عطا ہوا۔ اس لئے عَلَّمَ باب تفعیل سے فرمایا گیا خیال رہے۔ کہ آدم علیہ السلام کو نہ تو کسی مدرسے میں جانا پڑا تھا۔ اور نہ کسی استاد کی شاگردی کرنی پڑی۔ بلکہ بطور الہام خود بخود سب علوم اُن کو آ گئے جیسے کہ بعد مرنے کے ہر شخص کو زبان عربی خود بخود آ جاتی ہے۔ کہ قبر کے سوال جواب اور محشر کا حساب کتاب اور جنت والوں کی بول چال سب عربی ہی زبان میں ہیں۔ **اٰدَمَ** یا تو اُدمۃٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ گندمی رنگ ہونا اور یا ادیمٌ سے جس کے معنی ہیں۔ ظاہری زمین چونکہ آپ کا رنگ شریف گندمی تھا۔ آپ کا جسم پاک ظاہری زمین کی مختلف مٹیوں سے بنا تھا اس لئے آپ کا نام آدم ہوا اور آپ کی اولاد کو آدمی یعنی آدم والا کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اس جسم میں پانی ہوا کا بھی دخل تھا۔ مگر وہ سب مٹی کو خمیر کرنے کے لئے تھا۔ جیسے کہ آٹے کو گوندھنے کے لئے اس میں پانی ملایا جاتا ہے۔ اسی لئے انسان زمین پر رہتا ہے نہ ہوا اور پانی میں آپ نہایت خوبصورت تھے اور جسم شریف آپ کا ساٹھ ہاتھ تھا جنتی لوگوں کا بھی اتنا ہی قد ہوگا۔ رہے جہنمی اُن میں سے بعض اتنے بڑے ہوں گے۔ کہ اُن کی ایک ایک ڈاڑھ بقدر پہاڑ ہو گی۔ جیسا کہ روایات میں آیا ہے۔ **اَلْاَسْمَآءَ** اسماء وسمٌ یا سموٌّ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ علامت یا پہچان یا بلندی اور اب نام کو بھی کہتے ہیں۔ تفسیر کبیر وغیرہ نے فرمایا۔ کہ یہاں پہلے ہی معنے مراد ہیں۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کو فقط چیزوں کے نام ہی نہ بتائے گئے تھے۔ بلکہ اُن کی حقیقتیں اور خاصیتیں اور نفع نقصان اور اُن کا طریقۂ استعمال اور اُن کے بنانے کا طریقہ غرضکہ ہر چیز کے سارے حالات بتائے گئے تھے۔ اور ہر حال

اُس چیز کی علامت تھی۔ اس لئے وہ سب اسماء میں ہی داخل ہیں کیونکہ فقط نام بتانے سے علم کامل نہیں ہوتا۔ اور اُس سے خلافت کا مقصود بھی حاصل نہیں۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہاں اسم کے معنی نام ہی ہیں۔ مگر چونکہ ہر چیز کے حالات بھی چیزیں ہیں اور اُن کے بھی کچھ نام ہیں۔ اُن سب کی بھی تعلیم فرمائی گئی تھی۔ غرض کہ یہ تو سب مانتے ہیں کہ حضرت آدم کا علم ہر چیز کو شامل تھا۔ لیکن اس وسعت علمی کو بعض تو الا اسماء سے ثابت کرتے ہیں بعض کُلَّهَا سے دعوے سب کا ایک دلیلیں علیحدہ کُلَّهَا اس میں بہت گنجائش ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی نام بھی آدم علیہ السلام کے علم سے باقی نہ بچا۔ جیسے خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا ہر چیز کا خالق ہے۔ ایسے ہی یہاں کُلَّهَا سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آدم علیہ السلام ہر نام والی چیز کے عالم خیال رہے کہ آدم علیہ السلام کا علم اس قدر وسعت کے باوجود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کے دریا کا قطرہ ہے۔ کیونکہ اُن کا علم ہر اُس چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ کہ جہاں تک الفاظ اور ناموں کی رسائی ہے۔ لیکن میرے شہنشاہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم اُن چیزوں کو بھی گھیرے ہوئے ہے۔ کہ جہاں تک الفاظ و نام بلکہ کسی کا خیال بھی نہیں پہنچا اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا۔ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ یہاں نہ اسم کی قید ہے۔ نہ الفاظ و حروف کی پابندی اب ہم کُلَّهَا کی کسی قدر گنجائش دکھاتے ہیں۔ یہ سب جانتے ہیں۔ کہ دنیا میں اوّل سے آخر تک لاکھوں زبانیں بولی گئیں اور ہر زبان کے حروف نقش اور اُن کے الفاظ علیحدہ علیحدہ پھر ہر زبان میں کروڑوں لغات جس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ دنیا میں کروڑوں چیزیں اور ہر چیز کے لاکھوں صفات اور ہر صفت کے لاکھوں نام اور نام کے لکھنے اور بولنے کے لاکھوں طریقے مثلاً الف لکھنے کا انگریزی میں اور طریقہ ہے۔ اردو میں اور عربی فارسی میں اور پھر مثلاً پانی کو اردو میں پانی۔ فارسی میں آب۔ عربی میں ماء۔ ہندی میں جل۔ انگریزی میں واٹر اور نہ معلوم کس کس زبان میں کیا کیا کہتے ہوں گے۔ پھر اگر لفظ پانی لکھا جائے۔ تو ہر زبان کی عبارت میں علیحدہ طریقے سے مثلاً انگریزی میں ( PANNI ) اور ہندی میں ( पानी ) اور گجراتی میں ( પાણી ) اردو میں ( پانی ) عربی میں ( پانی ) وغیرہ وغیرہ طریقوں سے پھر اس پانی کے ہزاروں حالات اور ہزاروں قسمیں ہیں۔ ٹھنڈا گرم صاف میلا کھاری میٹھا بھاری ہلکا گاڑھا پتلا سفید کالا وغیرہ وغیرہ یہ سب علوم سیدنا آدم علیہ السلام کو دیئے گئے۔ بھلا خیال تو کرو۔ اس علم کی کوئی حد ہے تفسیر روح البیان میں اس جگہ فرمایا گیا۔ کہ آدم علیہ السلام کو سات لاکھ زبانوں کا علم تھا۔ اور ایک ہزار پیشوں میں خوب ماہر تھے۔ مگر آپ نے کھیتی باڑی کا کام کیا۔ **لطیفہ**۔ آدم علیہ السلام کا پیشہ کھیتی باڑی نوح علیہ السلام کا نجاری (لکڑی بنانا۔ یعنی بڑھئی پیشہ) ادریس علیہ السلام کا درزی گری صالح علیہ السلام کا تجارت داؤد علیہ السلام کا زرہ سازی (زرہ بنانا یعنے لوہاری کام) سلیمان علیہ السلام کا زنبیل سازی اور موسیٰ علیہ السلام شعیب علیہ السلام اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک بکری چرانا تھا۔ (روح البیان) نیز کُلَّهَا سے معلوم ہوا کہ حق تعالےٰ نے اپنی ذات اور صفات کے سارے نام بھی ان کو تعلیم فرمائے تھے۔ اب تو آدم علیہ السلام کے علم کی کوئی انتہا ہی نہ رہی روح البیان وغیرہ نے اس جگہ لکھا کہ آدم علیہ السلام کو تمام فرشتوں اور اُن کی اپنی اولاد کے سارے نام اور حیوانات جمادات پرندے چرندے اور ہر وہ جاندار جو قیامت تک پیدا ہونے والے ہیں۔ تمام شہروں اور گاؤں ہر کھانے پینے چیز اور جنت کی ہر نعمت بلکہ یوں کہو۔ کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کے نام بتا دیئے گئے۔ یہاں تک کہ پیالہ اور پیالی اور ڈھال اور دودھ نکالنے کا برتن بلکہ آہستہ اور زور سے گوز مارنا کے نام بھی بتا دیئے گئے۔

**ثُمَّ عَرَضَهُمْ**۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ فقط غائبانہ نام ہی نہ بتائے گئے تھے۔ بلکہ وہ سب چیزیں دکھائی گئی تھیں۔ یعنی جو چیزیں قیامت تک کبھی بھی پیدا ہونے والی تھی مثلاً ریلوے۔ موٹر کار۔ ٹیلیفون۔ ریڈیو۔ ہوائی جہاز وغیرہ یہ سب چیزیں اُن کو دکھا کر اُن کے نام اور بنانے کی ترکیبیں اور اُن کے سارے حالات بتائے گئے۔ اور پھر ان سب چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ ظاہر یہ ہے۔ کہ تمام فرشتوں پر ہی یہ ساری چیزیں پیش کی گئی تھیں۔ کیونکہ اس جگہ ملائکہ میں کوئی قید نہیں ہے۔ نیز حکمت پوچھنے والے سارے ہی فرشتے تھے اور چونکہ ان چیزوں میں بعض عقل والی اور بعض بے عقل تھیں۔ اس لئے بطریق تغلیب عَرَضَهُمْ فرمایا گیا فَقَالَ أَنْبِئُونِي یہ امر ملائکہ کی عاجزی کے

اظہار کے لئے ہے۔ کیونکہ جب انہیں ناموں کی خود ہی خبر نہ تھی۔ تو حق تعالےٰ سے کیا عرض کرتے۔ خیال رہے۔ کہ یہاں اَنۡبِئُوۡنِیۡ فرمایا گیا۔ یعنی صرف خبر ہی دے دو جو کہ علم سے ادنٰے ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمہیں ان چیزوں کا پورا علم تو کیا ہوتا معمولی خبر بھی نہیں ہے۔ بِاَسۡمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ لفظ اسما پہلے آچکا تھا۔ اب یہاں دوبارہ اس لئے کہا گیا۔ کہ وہاں اس سے سب چیزوں کی حقیقت اور ان کے سارے حالات اور سارے نام مراد تھے۔ اس لئے وہاں عَلَّمَ وَكُلَّهَا فرمایا گیا تھا۔ لیکن یہاں صرف نام ہی مراد ہیں۔ کہ اے فرشتو تم دوسرے حالات تو کیا بیان کرو گے۔ فقط ان کے نام ہی بتا دو۔ ورنہ یہاں ضمیر ہی کافی تھی یعنی بِهَا۔ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ۔ فرشتوں نے جو کچھ عرض کیا تھا۔ وہ بظاہر بالکل سچ تھا کیونکہ واقعی انسانوں میں فساد بھی ہوگا۔ اور واقعی فرشتے رب کی تسبیح و تقدیس بھی کرتے ہیں۔ لیکن ان دو باتوں سے جو انہوں نے نتیجہ نکالا تھا جس کو صاف بیان نہ کیا۔ اس میں غلطی کی تھی۔ اس آیت میں ان کی اسی غلط فہمی کو دور کرنا منظور ہے۔ وہ یہ سمجھے تھے۔ کہ خلافت عابد اور معصوم کا حق ہونا چاہیئے۔ نہ اس جماعت کا کہ جس میں گناہ و جرم بھی ہوتے ہوں۔ یہاں ان کو فرمایا گیا۔ کہ انتظام سلطنت صرف عبادت سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے رعایا کے سارے حالات کی خبر ضروری ہے۔ تم کو نام بھی نہیں معلوم اور حالات کیا معلوم ہوں گے۔ تفسیر عزیزی میں اس کے دوسرے نہایت نفیس معنے کئے گئے وہ یہ کہ ملائکہ سمجھے تھے۔ کہ ہم حق تعالےٰ کی کامل حمد و تسبیح کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم ہی کامل عابد ہیں۔ اس آیت میں فرمایا گیا۔ کہ کامل حمد وہ کر سکتا ہے۔ جو حق تعالےٰ کے سارے نام اور صفات سے واقف ہو۔ اور پورا شکر وہی بجا لا سکتا ہے۔ جو اس کی ساری نعمتوں کی خبر رکھتا ہو۔ اے فرشتو جب تم کو اس کی ساری نعمتوں کا نام تک نہیں معلوم اور رب کے صفات اور سارے ناموں کا پورا پتہ نہیں۔ تو تم اس کی پوری حمد اور شکر کیسے کر سکتے ہو۔ اے فرشتو پوری حمد بھی وہی کرے گا جس کا علم کامل ہوگا۔ غرضکہ اس میں فرشتوں کو جھوٹا کہنا منظور نہیں۔ بلکہ ان کی غلط فہمی کا دور کرنا۔ خلاصۂ تفسیر۔ جب آدم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور فرشتوں نے ان کے چھینک آنے پر اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ کہنے اور فرشتوں کو اَلسَّلَامُ عَلَيۡكُمۡ کہنے سے ہی معلوم کر لیا تھا۔ کہ یہ کوئی ہونہار ہستی ہے۔ لیکن ابھی تک ان کے خلافت کے حقدار ہونے کی کوئی خاص وجہ معلوم نہ ہوئی تھی۔ اس لئے حق تعالےٰ نے تمام چیزوں کے نام ان کی صفات ان کا طریقہ استعمال بلکہ سب کی حقیقتیں آدم علیہ السلام کے دل میں القا کر دیئے۔ اس کے بعد ان تمام چیزوں کو فرشتوں کے سامنے کر کے دربار عام میں سوال کیا۔ کہ تم مجھ کو ان چیزوں کا نام تو بتاؤ۔ اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو۔ کہ ہم کامل عابد ہیں۔ اور عابد خلافت کا کام انجام دے سکتا ہے جب وہ چیزوں کے نام ہی نہ بتا سکے۔ تو ان پر اپنی عاجزی اور آدم علیہ السلام کی افضلیت اور حق تعالےٰ کی حکمت ظاہر ہو گئی۔ فائدے۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے ایک یہ کہ علم خلوتوں اور تنہائیوں کی عبادت اور چلہ کشی سے افضل ہے۔ کیونکہ رب نے آدم علیہ السلام کی افضلیت علم سے ہی ظاہر فرمائی دوسرے یہ کہ انبیاء علیہم السلام فرشتوں سے افضل ہیں تیسرے یہ کہ بری چیزوں کا جاننا برا نہیں۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کو ہر بری بھلی چیز کا علم دیا گیا۔ اور اس سے ان کی افضلیت ظاہر فرمائی گئی۔ نیز سب سے بری چیز کفر ہے۔ لیکن اس کا بچنے کیلئے سیکھنا فرض ہے۔ نیز حق تعالےٰ کو بھی بری بھلی باتوں کا علم ہے۔ اگر بری بات کا جاننا برا ہوتا تو حق تعالےٰ اس سے پاک ہوتا۔ لہٰذا وہابیوں دیوبندیوں کا یہ کہنا۔ کہ بری چیزوں کا علم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف ہے۔ محض غلط ہے۔ رہی یہ آیت وَمَا عَلَّمۡنٰهُ الشِّعۡرَ۔ اس کی تحقیق ہم انشاءاللہ اسی آیت میں کریں گے۔ نیز اس کے لئے ہماری کتاب جاء الحق کا مطالعہ کرو۔

خاتمہ علم کے فضائل کے بے شمار عقلی اور نقلی دلائل ہیں ہم تفسیر کبیر اور تفسیر عزیزی سے کچھ پر لطف چیزیں بیان کرتے ہیں فقیہ ابو لیث سمرقندی نے فرمایا۔ کہ عالم کی صحبت میں حاضر ہونے میں سات فائدے ہیں۔ خواہ اس سے علم حاصل کرے یا نہ کرے۔ ایک یہ کہ وہ شخص طالب علموں کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور ان کا ثواب پاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جب تک اس مجلس میں بیٹھا رہے گا۔ گناہوں سے بچا رہے گا۔ تیسرے یہ کہ جس وقت یہ اپنے گھر سے طلب علم کی نیت سے نکلتا ہے۔ ہر قدم پر نیکی پاتا ہے۔ چوتھے یہ کہ علم کے

حلقہ میں رحمت الٰہی نازل ہوتی ہے جس میں یہ بھی شریک ہو جاتا ہے۔ پانچویں[۵] یہ کہ یہ علم کا ذکر سنتا ہے جو کہ عبادت ہے۔ چھٹے[۶] یہ کہ وہاں جب کوئی مشکل مسئلہ سنتا ہے۔ جو اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اس کا دل تنگ ہوتا ہے۔ تو حق تعالےٰ کے نزدیک منکسر القلوب میں شمار کیا جاتا ہے۔ ساتویں[۷] یہ کہ اس کے دل میں علم کی عزت اور جہالت سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ **دوسری فضیلت** حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ علم دین مال پر سات وجہ سے افضل ہے۔ اوّل[۱] یہ کہ علم پیغمبروں کی میراث ہے۔ اور مال فرعون۔ ہامان۔ شداد اور نمرود کی۔ دوسرے[۲] یہ کہ مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے۔ مگر علم بڑھتا ہے تیسرے[۳] یہ کہ مال کی انسان حفاظت کرتا ہے۔ مگر علم انسان کی حفاظت کرتا ہے۔ چوتھے[۴] یہ کہ مرنے کے بعد مال تو دنیا میں رہ جاتا ہے۔ اور علم قبر میں ساتھ جاتا ہے۔ پانچویں[۵] یہ کہ مال مومن وکافر سب کو مل جاتا ہے مگر علم دین کا نفع ایمان دار ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ چھٹے[۶] یہ کہ کوئی بھی عالم سے بے پرواہ نہیں۔ لیکن بہت سے لوگوں کو مال داروں کی ضرورت نہیں۔ ساتویں[۷] یہ کہ علم سے پلصراط پر گذرنے کی قوت حاصل ہوگی۔ اور مال سے کمزوری **تیسری فضیلت** قرآنِ مجید میں سات چیزوں کے بارے میں فرمایا گیا۔ کہ وہ آپس میں برابر نہیں۔ عالم[۱] جاہل کے برابر نہیں۔ خبیث[۲] اور طیب برابر نہیں[۳] دوزخی اور جنتی برابر نہیں[۴] اندھا اور آنکھ والا ایسے طرح[۵] اندھیری اور روشنی[۶] اور سردی اور گرمی۔ نیز زندے اور مُردے آپس میں برابر نہیں **چوتھی فضیلت** سات پیغمبروں کو علم کی وجہ سے بڑے بڑے فائدے حاصل ہوئے[۱] آدم علیہ السلام کو اُن کے علم نے فرشتوں سے سجدہ کرا دیا[۲] خضر علیہ السلام کو علم نے موسیٰ علیہ السلام کی اُستاذی عطا کی[۳] یوسف علیہ السلام کو علم نے قید سے نکال کر تخت وتاج شاہی عطا کیا[۴] حضرت سلیمان علیہ السلام کو علم نے بلقیس جیسی صاحب مال اور صاحب تخت وتاج بیوی عطا کی[۵] داؤد علیہ السلام کو علم نے بادشاہی دی[۶] عیسیٰ علیہ السلام کو علم نے اُن کی ماں سے تہمت دُور کرائی[۷] حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرِ مبارک پر خلافت الٰہیہ اور شفاعت کبریٰ کا سہرہ باندھا۔ **پانچویں فضیلت** تعلیم یافتہ کتے کا شکار بھی حلال ہے۔ یہ علم کی برکت سے ہی ہے۔ **چھٹی فضیلت** حضرت سلیمان کی چیونٹی کو علم کی بدولت یہ مرتبہ عطا فرمایا۔ کہ اُس کا ذکر قرآن کریم میں فرمایا۔ بلکہ اس کے نام کی ایک سورۃ قرآنی مقرر فرمائی یعنی (سورۂ نمل) اور رب نے اس کا کلام پسند فرماتے ہوئے۔ قرآن میں نقل فرمایا۔ کہ اُس نے اور چیونٹیوں سے کہا تھا۔ کہ تم اپنے سوراخوں میں گھس جاؤ۔ کہیں تم کو حضرت سلیمان علیہ السلام اور اُن کا لشکر بے خبری میں کچل نہ ڈالے جس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اور اُن کے ساتھی جان بوجھ کر چیونٹی پر ظلم نہیں کرتے۔ مگر افسوس کہ چیونٹی کا تو یہ عقیدہ۔ مگر شیعوں کا یہ عقیدہ کہ صدیق اکبر اور فاروق اعظم نے اہل بیت پر ظلم کیا۔ اور وہ ظالم تھے۔ یہ تو عقل میں چیونٹی سے بھی کم ہیں۔ **ساتویں فضیلت** حق تعالےٰ نے ارشاد فرمایا کہ سارے بندوں میں رب سے علماء ہی ڈرتے ہیں۔ اور دوسری جگہ فرمایا کہ جنت ڈرنے والوں کے لئے ہی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ جنت علماء ہی کے لئے ہے۔ اور دوسروں کو بھی ان ہی کے طفیل سے ملے گی۔ اور یہ بات بالکل ظاہر بھی ہے۔ کیونکہ رب کو بغیر جانے پہچانے اُس سے خوف کیونکر ہوگا۔ علماء ربانی ہی اُس کو خوب جانتے ہیں۔ اور وہی اُس سے خوف بھی کرتے ہیں۔ **آٹھویں فضیلت** حدیث پاک میں ارشاد ہوا۔ کہ عالم کی بزرگی عابد پر ایسی ہے۔ جیسے چودھویں رات کے چاند کی تاروں پہ **نویں فضیلت** نمام پر بادشاہ حکومت کرتا ہے۔ مگر بادشاہ پر علم والا دیکھو طبیب بادشاہ کو صد ہا کھانوں سے روک سکتا ہے۔ اور کڑوی دوائیں پلا سکتا ہے **دسویں فضیلت** حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ کہ دنیا چار شخصوں سے قائم ہے عالم باعمل سے علماء سے۔ محبت رکھنے والے جاہلوں سے۔ سخی مالداروں سے۔ اور صابر فقیروں سے۔

**پہلا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ آدم علیہ السلام کو ساری چیزوں کا علم عطا ہوا۔ پھر انہوں نے گندم کیوں کھا لیا۔ اگر جان بوجھ کر کھایا تو یہ سخت گناہ ہوا جس سے انبیاء معصوم ہیں۔ اگر بے علمی سے کھایا۔ تو اُن کا علم مکمل نہ ہوا۔ **جواب**۔ اُن کو ہر چیز کا علم تھا۔ مگر کھاتے وقت اس کو بھول گئے۔ بھولنا اور خطا انبیاء سے سرزد ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَہٗ عَزْمًا۔ یعنی وہ بھول گئے ہم نے اُن کا ارادہ نہ پایا۔ بڑے سے بڑا حافظ بعض وقت قرآنِ پاک میں ایسا لقمہ کھاتا ہے کہ بغیر بتائے ہوئے۔ اس کو حل نہیں

کر سکتا۔ **دوسرا اعتراض**۔ جب اُس وقت ساری چیزیں پیدا ہی نہ ہوئیں تھیں۔ تو دکھائی کیسے گئیں **جواب**۔ ہماری کمزور آنکھیں دیکھنے کے لئے بہت سی چیزوں کی محتاج ہیں۔ کہ وہ چیز موجود ہو۔ نہ بہت دور ہو نہ بہت قریب روشنی میں ہو۔ تیز روشنی بھی نہ ہو۔ جیسے کہ آفتاب زیادہ شفاف بھی نہ ہو۔ جیسے کہ ہوا وغیرہ لیکن مقبول بندوں کی نگاہ ہر موجود و غیر موجود دُور اور قریب شفاف اور غیر شفاف چیز کو دیکھ لیتی ہے ہماری عقل اور خیال بھی اِن چیزوں کو محسوس کر لیتے ہیں۔ خواب میں آنے والی اور گذری ہوئی چیزیں دیکھ لی جاتی ہیں۔ دور کی چیزیں اور بالکل نہ دیکھی ہوئی چیزیں جیسے کہ جنّت دوزخ وغیرہ معلوم ہو جاتی ہیں۔ اُن حضرات کی آنکھیں ہمارے خیال اور عقل سے زیادہ قوی ہیں۔ قیامت میں سب لوگ اپنے گزرے ہوئے اعمال مختلف شکلوں میں دیکھیں گے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدہا برس بعد آنے والے واقعات کے متعلق فرمایا کہ میں اُن کو دیکھ رہا ہوں **تیسرا اعتراض** حق تعالےٰ نے فرشتوں کو ہی اتنا وسیع علم کیوں نہ عطا فرما دیا **جواب**۔ اس لئے کہ اُن کی طبیعت اتنے علم کے لئے موزوں نہ تھی۔ اور نہ ان میں اس کی قابلیت تھی **چوتھا اعتراض**۔ اُن میں قابلیت کیوں نہ پیدا فرمائی **جواب**۔ وہ استعداد و قابلیت انسان کی خصوصیت ہے۔ اگر اُن میں پیدا کر دی جاتی۔ تو وہ فرشتے نہ رہتے۔ بلکہ انسان بن جاتے۔ اس سوال کا مطلب تو یہ ہوا۔ کہ فرشتوں کو انسان کیوں نہ کر دیا گیا۔ **پانچواں اعتراض**۔ جب فرشتے انسان کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ تو وحی کا لانا اُن کے ذمّے کیوں کیا گیا وحی سے ہی تو اصلاح ہوتی ہے۔ **جواب** فرشتے فقط حق تعالےٰ کے سفیر ہیں انسانوں کے مُصلح نہیں۔ اتنا وسیع علم مُصلح کے لئے ضروری ہے۔ نہ کہ فقط قاصد کے لئے کلکٹر کے یہاں سارے احکام ڈاک خانے کے ذریعے آتے ہیں۔ مگر اُن کے مرتبوں میں فرق ہے اسی لئے فرشتے نبیوں کے استاذ نہیں بلکہ اُن کے خدمتگار اور پیغام رساں ہیں۔ اِسی لئے بارہا حضرت جبریل نے شکل انسانی میں آکر حضور سے سوالات کئے **چھٹا اعتراض** اگلی آیت سے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ آدم علیہ السلام نے اپنے سارے علوم فرشتوں کو سکھا دیئے۔ اگر فرشتوں میں اس کی قابلیت نہ تھی۔ تو پھر انہیں اتنا علم کیسے آگیا۔ **جواب** اِس کا جواب انشاء اللہ اگلی آیت ہی میں آئے گا۔ **ساتواں اعتراض**۔ جب فرشتے انسانوں پر خلافت نہیں کر سکتے کیونکہ وہ اِن کے ہم جنس نہیں۔ تو چاہیئے۔ کہ انسان بھی جنّوں فرشتوں وغیرہ پر خلافت نہ کرے۔ حالانکہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ساری مخلوق کے نبی ہیں۔ **جواب**۔ اُن کو خلافت نہ ملنے کی وجہ اُن کے علم کی کمی ہے۔ نہ کہ محض جنسی اختلاف چونکہ انسان ساری مخلوقات میں افضل اور اکمل ہے۔ اور بڑا اپنے چھوٹے پر حکومت کر سکتا ہے۔

## قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾

| اُنہوں نے کہا۔ پاکی ہے تجھے نہیں ہے علم واسطے ہمارے مگر وہ جو سکھایا تو نے ہم کو تحقیق تو ہی جاننے والا حکمت والا ہے۔ |
|---|
| بولے پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں۔ مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا۔ بے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے۔ |

**تعلق**۔ اس سے پہلے رب تعالےٰ کے جواب کا ذکر ہوا سننے والے کو انتظار تھا۔ کہ پھر فرشتوں نے کیا عرض کیا۔ اُس کا اِس آیت میں ذکر ہے۔ یا یوں کہو۔ کہ پہلے معلوم ہوا تھا۔ کہ حق تعالےٰ نے فرشتوں سے اُن چیزوں کے نام دریافت فرمائے۔ اب فرشتوں کے جواب کا ذکر فرمایا گیا۔ **تفسیر**۔ **قَالُوْا** ظاہر یہ ہے۔ کہ تمام ملائکہ نے یک زبان ہو کر یہ عرض کیا۔ یا تو ہر ایک نے براہ راست یا بعض مقرّبین نے سب کی طرف سے۔ **سُبْحٰنَكَ**۔ یہ لفظ سُبْحٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ تیرنا کُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ چونکہ تیرنے والا کنارے سے دُور نکل جاتا ہے۔ اس لئے دُور ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ اور چونکہ جو ذات عیوب سے پاک ہو وہ تمام برائیوں سے دُور ہوتی ہے۔ اس لئے پاکی کے معنی میں اس کا استعمال ہوا۔ اصل میں عبارت یوں تھی نُسَبِّحُكَ سُبْحٰنًا یعنی ہم تجھ کو پاک جانتے ہیں۔ پاک جاننا پھر سُبحان کو کاف کی طرف مضاف کیا گیا اور فعل گرا دیا گیا۔ فرشتوں نے یہ لفظ یا تو اس لئے بولا۔ کہ بارگاہ الٰہی کا ادب یہ ہے۔ کہ اگر کچھ عرض کرنی ہو تو پہلے رب

کی حمد کی جائے۔ اسی لئے نمازی سب سے پہلے سُبحان پڑھتا ہے۔ اور بعد میں کچھ عرض کرتا ہے۔ یا اس لئے کہ تعجب کے موقع پر بھی سُبحان بولا جاتا ہے۔ چونکہ فرشتوں کو بھی اس واقعہ سے بہت تعجب ہوا تھا۔ انہوں نے یہ عرض کر دیا یا اس لئے کہ توبہ کے اوّل یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ موسٰی علیہ السلام نے عرض کیا تھا۔ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَیْكَ یونس علیہ السلام نے عرض کیا تھا۔ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ چونکہ فرشتے بھی اپنے گذشتہ سوال سے معذرت کر رہے ہیں۔ اس لئے انہوں نے بھی یہ کہا۔ یا اس لئے کہ وہ اس لفظ سے اپنا مقصود عرض کر رہے ہیں۔ کہ خداوندا ہم تجھ کو ہر عیب سے پاک جانتے ہیں۔ ہمارا مقصد اُس سوال سے اعتراض کرنا نہ تھا۔ بلکہ فقط حکمت دریافت کرنا یا یہ کہ مولیٰ ہم تجھ کو اس الزام سے پاک جانتے ہیں۔ کہ تو نے آدم علیہ السلام کو بلا وجہ زیادہ علم دے دیا۔ اور ہم کو کم بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ تو نے ہر ایک کو بقدرِ قابلیت علم عطا فرمایا۔ بیشک ہم میں اس قدر علم کی استعداد ہی نہیں ہے۔ کمی ہمارے لینے میں ہے۔ نہ کہ تیری عطا میں لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اس میں فرشتوں نے اپنی عاجزی کا نہایت عمدہ طریقے سے اقرار کیا۔ کہ مولا ہم بذاتِ خود تو تمام کمالات سے خالی ہیں۔ اور علم بھی ایک کمال ہے۔ ہم میں جو کچھ کمال ہے۔ وہ تیرا دیا ہوا ہے۔ چونکہ اس علم کی تیری طرف سے عطا نہیں ہوئی۔ اس لئے ہماری کیا مجال کہ ہم تیرے حضور محض اپنے اٹکل اور قیاس سے کچھ کہہ دیں۔ مولیٰ ہم کو اپنی کم علمی کا اقرار ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ خدایا کوئی چیز سکھا کر امتحان لیا جاتا ہے۔ جب تو نے ہمیں ان کے نام سکھائے ہی نہیں تو۔ تو ہمارا امتحان کیوں لے رہا ہے۔ اس لئے کہ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ۔ تو ہر چیز کا جاننے والا اور کامل حکمت والا ہے۔ تو ہر ایک کی قابلیت اور لیاقت بھی جانتا ہے۔ اور یہ بھی کہ کون کس نعمت کے لائق ہے جس قدر علم کے لائق ہم تھے وہ ہم کو دیا اور جس کے لائق آدم علیہ السلام تھے۔ وہ اُن کو چیونٹی کو کُن اور ہاتھی کو من دیتا ہے۔ **خلاصۂ تفسیر**۔ جب فرشتوں کو حکم ہوا کہ تم اِن چیزوں کے نام بتاؤ۔ تو وہ سمجھ گئے۔ کہ اس سے ہمارا امتحان مقصود نہیں ہے۔ کیونکہ امتحان تو بتائی ہوئی چیز کا ہی لیا جاتا ہے۔ انہوں نے بلا عذر اور بلا تامل اپنی عاجزی کا اقرار کر لیا۔ مگر اس نفیس طریقے سے کہ سُبحان اللہ بظاہر تو رب کی حمد کی۔ لیکن اس حمد میں حق تعالےٰ کے صفاتِ کمالیہ اور اپنے قصور کا اقرار کیا۔ اور یہی توبہ کی حقیقت ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنی عاجزی کو خود اپنی طرف نسبت دی نہ کہ رب کی طرف یعنی یہ نہ کہا۔ کہ مولےٰ تو نے ہمیں بہت کم علم دیا۔ آدم علیہ السلام کو زیادہ بلکہ یہ عرض کیا۔ کہ ہم میں اتنے ہی علم کی طاقت تھی۔ جتنا تو نے عطا فرمایا۔ تیرا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ شیطان نے یہ کہا۔ کہ بِمَآ اَغْوَیْتَنِیْ۔ مولےٰ تو نے مجھے گمراہ کر دیا۔ اس لئے وہ تو مردود ہوا۔ اور یہ سب محبوب رہے **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ دعا سے پہلے رب کی حمد ضروری ہے۔ کیونکہ ملائکہ نے پہلے سُبْحٰنَكَ کہا بعد میں کچھ عرض کیا۔ **دوسرے** یہ کہ جس قسم کی دُعا ہو اُسی قسم کی حمد کریں۔ مثلاً اگر دعائے مغفرت کرنا ہے۔ تو عرض کرے۔ کہ مولےٰ ہم سب گنہگار ہیں۔ اور تو غفار۔ اگر رزق مانگنا ہے۔ تو عرض کرے مولیٰ ہم سب فقرا ہیں۔ تو غنی رزّاق **تیسرے** یہ کہ بندے کو چاہیئے۔ کہ اپنے قصور کے ماننے میں جرأت اور مولےٰ کے فضل و کرم کا انکار نہ کرے۔ **چوتھے** یہ کہ بڑے سے بڑا عالم اگر کسی مسئلے سے ناواقف ہو۔ تو اپنی عزت رکھنے کے لئے غلط جواب نہ دے۔ بلکہ اپنی کم علمی کا اقرار کرے۔ کیونکہ اسی میں عزت ہے۔ **حکایت**۔ ایک عالم سے برسرِ منبر کوئی مسئلہ پوچھا گیا۔ اُنہوں نے فرمایا۔ کہ مجھے اس کی خبر نہیں۔ سائل نے کہا۔ جب آپ جاہل ہیں۔ تو منبر پر کیوں بیٹھ گئے۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ اس قدر علم سے منبر پر بیٹھا۔ اگر میں جہالت سے کام لیتا تو آسمان پر پہنچ جاتا۔ **پانچویں**۔ یہ کہ کسی شخص کو بغیر فضل مولےٰ علم غیب نہیں مل سکتا۔ جو شخص کہ علم نجوم یا کہانت وغیرہ سے علم غیب حاصل کرنا چاہے۔ وہ جاہل ہے۔ کیونکہ ملائکہ نے عرض کیا۔ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (تفسیر کبیر) لہٰذا جو شخص کسی مخلوق کو بغیر عطائے الٰہی ایک چیز کا بھی علم مانے وہ بے دین ہے۔ بلکہ حق یہ ہے۔ کہ کوئی علم بھی حق تعالےٰ کے فضل کے بغیر نہیں مل سکتا۔ کتابیں پڑھنا وعظ سننا علماء کے پاس حاضر رہنا یہ سب محض اسباب ہیں۔ اصل چیز مسبب اسباب کے قبضے میں ہے۔ **چھٹے** یہ کہ حکمت کبھی علم کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اور کبھی دوسرے معنی میں بھی یہاں دوسرے ہی معنی میں استعمال ہوا۔ ورنہ علیم کے بعد

حکیم فرمانے سے کچھ فائدہ نہ ہوتا۔

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ

فرمایا رب نے اے آدم خبر دو اُن کو ناموں کی ان کے پس جبکہ خبر دی اُن سب کو ناموں کی اُن چیزوں کے فرمایا رب نے کیا نہ

فرمایا اے آدم بتا دے انہیں سب اشیاء کے نام جب آدم نے انہیں سب کے نام بتا دیئے۔ فرمایا میں نہ

اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ

کہا میں نے واسطے تمہارے تحقیق میں جانتا ہوں چھپی چیز آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں میں وہ جو ظاہر کرتے ہو تم

کہتا تھا۔ کہ میں جانتا ہوں۔ آسمانوں اور زمین کی سب چھپی چیزیں اور میں جانتا ہوں۔ جو کچھ تم ظاہر کرتے

وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور جو تھے تم چھپاتے

اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔

**تعلق**۔ اس آیت کو پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک** یہ کہ پہلے واقعہ سے فرشتوں کو اپنا عجز۔ تو معلوم ہوگیا۔ لیکن آدم علیہ السلام کے کمال کا پتہ نہ لگا۔ اور اُن کی خلافت اُن کی کمال ہی کے وجہ سے تو تھی۔ اس لئے حق تعالےٰ نے آدم علیہ السلام کا علم فرشتوں پر اس طرح ظاہر فرمایا۔ تو گویا کہ آدم علیہ السلام کے خلافت کے مستحق ہونے کی دو وجہیں تھیں۔ فرشتوں کا عاجز ہونا اور اُن کا کامل ہونا جن میں ایک کا ذکر پہلے کر دیا گیا۔ اور دوسری کا اب **دوسرے** یہ کہ پہلی آیت میں فرشتوں کے معذرت کرنے کا ذکر تھا۔ اور اب اُس کے قبولیت کا تذکرہ یعنی جب انہوں نے اپنے قصور کا اقرار کر لیا۔ تو ہم نے اُن کو یہ انعام عطا فرمایا۔ **تیسرے** یہ کہ پہلی آیت میں فرشتوں کی کمیٔ علم کا ذکر تھا۔ اور اب اُن کی تکمیل کا **تفسیر**۔ قَالَ يٰٓاٰدَمُ۔ اب رب نے آدم علیہ السلام سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ کہ اے آدم خیال رہے کہ قرآن کریم میں سارے پیغمبروں کو نام لیکر پکارا ہے۔ مگر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر جگہ اُن کے پیارے صفات کے ساتھ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ۔ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ۔ يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ وغیرہ خیال رہے۔ کہ پکارنے سے چند مقصود ہوتے ہیں۔[1] غافل کو بیدار کرنا۔[2] کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنا۔[3] محبت کا ظاہر کرنا۔ جیسے کہ اے میرے پیارے۔[4] غضب اور قہر کا ظاہر فرمانا۔ جیسے کہ اے خبیث انبیاء کرام کو اکثر محبت کے اظہار کے لئے پکارا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ حضرات رب سے غافل نہیں ہوتے۔ ہم جو دُعاؤں میں رب کو پکارتے ہیں۔ اُس کو غافل سمجھ کر نہیں پکارتے۔ بلکہ یا تو محبت کی وجہ سے یا اُس کا کرم حاصل کرنے کے لئے اَنْۢبِئْهُمْ۔ اس جگہ انبۂ فرمایا گیا جس کے معنی ہیں خبر دے دو۔ اور آدم علیہ السلام کے لئے عَلَّمَ۔ ارشاد ہوا تھا جس کے معنی ہیں۔ سکھا دیا۔ اس لئے کہ آدم علیہ السلام کو تو ہر چیز کا پورا پورا علم دیا گیا۔ اور انہوں نے حاصل کر لیا جس سے کہ وہ عالمِ کُل کہلانے کے مستحق ہوئے۔ مگر آدم علیہ السلام نے اُن چیزوں کی فقط خبر دے دی۔ خواہ فرشتوں کو اُس سے علم حاصل ہوا ہو یا نہ ایک مدرّس اپنے شاگرد کو باقاعدہ پڑھاتا ہے۔ جس سے وہ شاگرد بھی عالم بن جاتا ہے۔ پھر کبھی ممبر پر بیٹھ کر بطریق وعظ کچھ مسائل بیان کر دیتا ہے۔ جس سے کہ سننے والے پورے عالم نہیں بن جاتے۔ بلکہ ان کے کانوں میں علم کی آواز پہنچ جاتی ہے۔ بِاَسْمَآئِهِمْ اس سے پہلے اسماء کا ذکر ہو چکا ہے۔ چاہیئے تھا۔ کہ یہاں ضمیر لائی جاتی۔ مگر چونکہ وہاں اسماء سے مراد سارے صفات و حالات تھے۔ اور یہاں فقط چیزوں کے نام اس لئے اسماء ہی فرمایا گیا جس سے معلوم ہوا کہ آدم

علیہ السلام کو فقط چیزوں کے نام بتانے کا حکم دیا گیا۔ نہ کہ سارے حالات اسی لئے فرشتے اس تعلیم کے بعد بھی آدم علیہ السلام کے برابر عالم نہ ہوئے۔ (ماخوذ از تفسیر عزیزی) فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ آدم علیہ السلام نے فوراً حکم کی تعمیل کی روح البیان نے اس جگہ فرمایا کہ آدم علیہ السلام کے لئے ممبر بچھایا گیا۔ اور تمام ملائکہ اُن کے سامنے بیٹھے آپ نے اُس پر کھڑے ہو کر تمام چیزوں کے نام بیان فرمائے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مجلس وعظ تھی۔ نہ کہ آدم علیہ السلام کا مدرسہ اس سے ہماری پہلی تقریر کی تائید ہوتی ہے۔ اِس آیت سے یہی معلوم ہو رہا ہے۔ کہ آپ نے یہ سارے نام آن کی آن میں بتا دیئے کچھ دیر نہ لگی کیونکہ انباء باب افعال سے ہے۔ یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ تھوڑے وقت میں بڑے سے بڑا کام کر لیا جائے۔ ورنہ بے شمار چیزوں کا نام بتانے کیلئے بڑا وقت درکار تھا سبحان اللہ آدم علیہ السلام تو اپنے زمانے میں فرشتوں کو یہ سب کچھ بتایا۔ لیکن ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک مرتبہ ممبر پر قیام فرما کر ابتدائے پیدائش سے قیامت تک کے سارے حالات پورے بیان کر دیئے۔ جیسا کہ بخاری شریف میں ہے۔ بلکہ مُسندِ امام احمد میں ہے کہ قیامت تک اگر کوئی پرندہ پر بھی ہلائے گا۔ اُس کی بھی خبر دے دی۔ وہ پہلے نبی کی پہلی مجلس تھی۔ اور یہ خاتم النبیین کی آخری مجلس وہاں سننے والے فرشتے تھے اور یہاں صحابہ کرام یہاں بھی اسماء اسی لئے فرمایا گیا۔ کہ صرف نام ہی بتایا گیا۔ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ جب فرشتوں کو آدم علیہ السلام کا کمال علمی معلوم ہو چکا۔ تب رب نے فرمایا۔ کہ کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا۔ یہ استفہام انکاری ہے۔ یعنی کہا تھا۔ کہ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا ہوں۔ بہت پرلطف بات یہ ہے۔ کہ اس واقعہ سے فرشتوں کو آدم علیہ السلام کا علم غیب معلوم ہوا تھا۔ مگر رب نے فرمایا۔ کہ اس سے تم کو میرا علم معلوم ہو گیا جس سے معلوم ہوا۔ کہ انبیاء کا کمال رب کے کمال کا آئینہ ہے۔ اُنہیں کی عظمت سے رب کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ شاگرد کی قابلیت سے استاد کے علم کا پتہ چلتا ہے۔ دیوبندیوں کے یہاں خدا کی تعظیم نبیوں کی توہین سے ہوتی ہے۔ اُن کی شیطانی توحید کے معنی ہیں پیغمبروں کو گالیاں دینا "معاذ اللہ" لیکن مسلمانوں کے نزدیک نبیوں کی عزت میں رب کی اور اسلام کی عزت ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ فرشتے بھی بغیر انبیاء کے وسیلے سے خدا تعالیٰ کے ذات و صفات کو نہیں جان سکتے۔ تو ہم تم کس شمار میں ہیں۔ کیونکہ اس آیت میں رب نے آدم علیہ السلام کے علم کو اپنے علم کی دلیل بنایا اور فرمایا۔ کہ اے فرشتوں اب تک تم نے ہم کو بغیر دلیل جانا تھا تو آج دلیل سے پہچان لو۔ کہ آدم کے علم کو دیکھ کر ہمارے علم کا پتہ لگا لو کہ اگرچہ تمہاری پیدائش اِن سے بہت پہلے ہے۔ تمام جہان کی تم نے سیر کر ڈالی اور تم عالم بالا کے رہنے والے اور یہ ذات عالم سفلی کی مخلوقات میں سے ایک ہے۔ اور ابھی ابھی پیدا ہوئے۔ انہوں نے کہیں کی سیر بھی نہ فرمائی۔ لیکن اِن کو زمین و آسمان کے ایسے راز معلوم ہیں۔ جو تم کو نہیں معلوم۔ اور جو چیزیں کہ ان سے ہزاروں برس پہلے پیدا ہو چکیں یہ اُن تمام کے پورے واقف ہیں وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ۔ تمام مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ اے فرشتو میں تمہاری ہر ظاہری بات اور چھپے ہوئے خیال کو جانتا ہوں یعنی بظاہر تم نے یہ کہا تھا۔ کہ انسان فساد و خونریزی کرے گا۔ اور ہم رب کی تسبیح اور تحلیل کرتے ہیں۔ مگر تمہارے دل میں یہ تھا۔ کہ ہم ہی خلافت کے مستحق ہیں۔ بھلا ہم سے افضل اور زیادہ علم والی کون سی مخلوق پیدا ہو سکتی ہے۔ اس میں رب کی قدرت کا انکار نہیں تھا۔ بلکہ یہ اُن کی سمجھ میں نہ آ سکتا تھا۔ کہ ہم سے بڑھ کر بھی کوئی پیدا ہو گا۔ کیونکہ ہم نوری ہیں۔ اور نور سب سے اعلیٰ ہم بہت پہلے پیدا ہو چکے ہیں۔ اور تمام دنیا کا تجربہ کر چکے ہیں۔ اب جو کوئی نیا پیدا ہو گا۔ وہ یقیناً ہم سے علم میں کم ہو گا۔ رب نے فرمایا۔ کہ اے فرشتو ہم تمہاری کہی ہوئی بات اور چھپا ہوا خیال جانتے ہیں۔ مگر تفسیر کبیر نے اس جگہ ایک نئی بات فرمائی۔ وہ یہ کہ عبداللہ ابن مسعود اور عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں۔ کہ فرشتوں کے ظاہری بات سے اُن کا یہ قول مراد ہے جنہوں نے بارگاہ الٰہی میں پیش کیا۔ اور چھپی ہوئی بات سے ابلیس کا دلی ارادہ مراد ہے۔ کہ اُس نے آدم علیہ السلام کی خبر پاتے ہی دل میں سوچ لیا تھا۔ کہ میں اُن سے بڑا ہوں۔ اور کبھی بھی اُن کی اطاعت نہ کروں گا۔ چونکہ ابلیس بھی فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اور انہیں میں اُس کا بھی شمار تھا۔ لہٰذا

اُس کے اس خیال کو سب کی طرف نسبت کر دیا گیا. قوم میں سے بعض کا کام سب کی طرف نسبت پاجاتا ہے. تو مطلب یہ ہوا. کہ اے فرشتو جو بات تم نے ظاہر طور پر کی وہ بھی ہم جانتے ہیں. اور جو کچھ تم میں سے بعض نے ارادہ کر لیا ہے. اُس کی بھی ہمیں خبر ہے. **تفسیر عزیزی** نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا. کہ فرشتوں کی بعض صفتیں بالکل ظاہر تھیں. جیسے کہ رب کی عبادت کرنا. اور اُن کا گناہوں سے معصوم ہونا وغیرہ وغیرہ اور بعض صفتیں ایسی چھپی ہوئی تھیں جس کی خود اُن کو بھی خبر نہ تھی. کہ ہم کو رب نے یہ قوتیں بھی عطا فرمائی ہیں جیسے کہ عورتوں کے رحم میں بچہ بنانا مسجدوں کی خدمت کرنا لوگوں کی جانیں نکالنی قبر کے سوالات اللہ والوں سے محبت رکھنا غازیوں اور حاجیوں کی مدد کرنا زندوں کی نذر ونیاز مردوں تک پہنچانا مسلمانوں کے درود سبز گنبد کے اندر رے جا کر شہنشاہ کونین کی خدمت میں حاضر کرنا. وحی آثار نی انبیاء کرام تک کتابوں کا پہچانا وغیرہ وغیرہ کہ خود اُن کو اپنی ان صفتوں کا پتہ نہ تھا. اگر آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد پیدا نہ ہوتی تو ہرگز فرشتوں کی یہ صفتیں ظاہر نہ ہوتیں. اس لئے رب نے فرمایا. کہ اے فرشتو ہم تمہاری ظاہری صفتوں کو بھی جانتے ہیں. اور تمہارے باطنی کمالات کو بھی اسی لئے ہم نے اس خلیفہ کو پیدا کیا. لہٰذا تم پر اس خلیفہ کا بڑا حق ہے. کہ اس کی بدولت تم اپنی حقیقت سے آگاہ ہو گئے. انہیں کے سبب سے تمہارا درجہ بارگاہ الٰہی میں بڑھا. **خلاصہ تفسیر**. جب فرشتوں نے اپنی معذوری اور کم علمی کا اقرار کر لیا. اور بارگاہ الٰہی میں اپنی عرض معروض کی معذرت کی. تب خدا تعالےٰ نے آدم علیہ السلام کو حکم دیا. کہ آپ ان کو ان سب چیزوں کا نام بتا دیں. آدم علیہ السلام نے حکم پاتے ہی آناً فاناً بلا تامل سب کچھ ان کو بتا دیا. جب اس واقعہ سے فرشتوں کو اپنی عاجزی اور آدم علیہ السلام کے کمال علمی کا ثبوت ہو گیا. تب رب تعالیٰ نے اُن کو متنبہ کرنے کو فرمایا. کہ تم اپنے دل میں کیا سمجھتے تھے. اور ظاہر کیا ہوا. میں ہی ہر چیز کی حکمت اور مصلحت زمین وآسمان کی پوشیدہ باتیں تمہارے ظاہری اور باطنی حالات جانتا ہوں. لہٰذا اس آیت میں اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی شرح ہو گئی. یعنی تمہارا تعجب کرنا بے جا تھا. ہم جو کچھ کرتے ہیں. اُس میں ہزارہا حکمتیں ہوتی ہیں. **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے. **ایک** یہ کہ علم عبادت سے افضل ہے. اور عالم عابد سے بہتر **دوسرے** یہ کہ تعلیم کو حق کی طرف نسبت کر سکتے ہیں. کہ رب نے ہی سکھایا. مگر اُس کو معلم کہنا جائز نہیں. کیونکہ معلم "پیشہ ور تعلیم دینے والے کو کہتے ہیں. **تیسرے** یہ کہ تمام لغتیں اور ساری زبانیں حق تعالےٰ کی طرف سے ہیں. کیونکہ انسانوں کی پیدائش سے پہلے ہی وہ سب آدم علیہ السلام کو سکھائی گئیں. (تفسیر خزائن العرفان) **چوتھے** یہ کہ فرشتوں کے علم اور کمالات میں زیادتی ہوتی ہے. کیونکہ آدم علیہ السلام کے ذریعے فرشتوں کا علم بھی بڑھا اور اُن کے چھپے ہوئے کمالات بھی ظاہر ہوئے. اگر وہ پیدا نہ ہوتے تو فرشتوں کے وہ درجات کیونکر ہوتے جو اب حاصل ہوئے **پانچویں** یہ کہ عارف کامل وہ ہے. جو حق تعالےٰ کے صفات انبیاء اکرام کے ذریعے جانے. کیونکہ فرشتے اس سے پہلے عارف باللہ تو تھے مگر بواسطہ رسول اللہ نہ تھے. آج حق کے صفات آئینہ نبوت سے دیکھے جس سے کہ اُن کا عرفان اور کامل ہو گیا. اسی لئے رب نے فرمایا هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ. یعنی رب کو اس طرح پہچانو کہ اس نے اپنے رسول کو بھیجا **چھٹے** یہ کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے. کہ فرشتوں کے ذریعے انبیاء کو علم ملتا ہے. کیونکہ وحی اور کتاب فرشتے ہی لے کر آتے ہیں. مگر حقیقت میں نبی کے ذریعے فرشتوں کو علم ملا جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوا. اب نبی کے پاس جو وحی آئے گی. وہ اُن کے علم میں پہلے سے ہو گی. اس وحی سے یا تو ان کا علم ظاہر ہو گا. یا اُن کا ذہول اور نسیان دُور ہو گا. ہمارا یہ دعویٰ حضرت آدم علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ہے. ہم نے اس کی پوری تحقیق اپنی کتاب جاء الحق" میں بھی کر دی ہے **ساتویں** یہ کہ حضرات انبیاء کرام رب کی طرف سے مالک ومختار ہوتے ہیں. کہ خدا تعالےٰ جو بھی جس کو دیتا ہے. وہ ان کے ذریعے سے دیکھو. رب نے آدم علیہ السلام کو علم بلاواسطہ عطا فرمایا. لیکن فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے ذریعے حالانکہ وہ اس پر بھی قادر تھا. کہ فرشتوں کو سب کچھ خود ہی بتا دے. مگر نہ بتایا. اس کی بہت نفیس بحث ہماری کتاب شان حبیب الرحمٰن" میں دیکھو **آٹھویں** یہ کہ جو بغیر وسیلۂ انبیاء خدا تک پہنچنا چاہے. وہ محض بے وقوف ہے. فرشتوں کو جو کہ نوری ہیں. رب کا قُرب خاص آدم علیہ السلام سے ذریعے عطا ہوا. شیطان نے براہ راست رب تک پہنچنا چاہا. مردود کر کے نکال دیا گیا. آج بھی جب شیاطین

آسمان پر جانا چاہتے ہیں۔ تو اُن کو شہاب (ٹوٹا ہوا تارہ) سے مار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ مدینے والے راستے کو چھوڑ کر راہ راست جانا چاہتا ہے اور بعض صحابہ کرام کی نعشیں آسمان پر اٹھالی گئیں۔ کیونکہ وہ نبی کے ذریعے سے گئے تھے۔ نویں یہ کہ حق تعالے انبیوں کو پیدا فرمانے والا ہے اور یہ حضرات اُس کی ذات وصفات کے ظاہر کرنے والے۔ لہذا رب خالق انبیاء اور پیغمبر مظہر کبریا کیونکہ رب تعالے نے آدم علیہ السلام کے علوم دکھا کر اپنی شان علمی کا خطبہ ارشاد فرمایا شعر

جب محمد ہوئے رسول اللہ ۔۔۔ تب کھلا لا الٰہ الا اللہ

**پہلا اعتراض**۔ پہلی آیت سے معلوم ہوا تھا۔ کہ فرشتوں میں اس قدر وسیع علم کی استعداد ہی نہ تھی۔ اسی لئے خلافت آدم علیہ السلام کو دی گئی۔ تو آدم علیہ السلام کے ذریعے اُن کو یہ سارے علوم کیوں حاصل ہو گئے۔ **جواب**۔ اُن کو صرف ناموں کی خبر لگی۔ نہ کہ سارے حالات کا پورا علم اسی لئے اُس کو انبیاء سے بیان کیا۔ **لطیفہ**۔ مولوی اشرف علی صاحب نے اس جگہ کمال ہی کر دیا۔ وہ تفسیر بیان القرآن میں فرماتے ہیں۔ کہ آدم علیہ السلام کے اس نام بتانے سے فرشتے چیزوں کے نام بھی نہ سمجھ سکے۔ بلکہ اس تمام تقریر سے اُن کو صرف آدم علیہ السلام کے علم کا پتہ لگا۔ یعنی انہوں نے صرف اتنا سمجھا۔ کہ آدم علیہ السلام واقعی بڑے عالم ہیں۔ پھر مثال دیکر سمجھاتے ہیں۔ کہ جیسے ناسمجھ کے سامنے کوئی سمجھدار آدمی کسی باریک مسئلے کی تقریر کرے تو وہ ناسمجھ اس تقریر سے وہ مسئلہ نہ سمجھے گا۔ مگر اس عالم کے زور علمی کا قائل ہو جائیگا **سبحان اللہ**۔ یہاں تو آدم علیہ السلام کے ایسے خیر خواہ بنے کہ فرشتوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر انہیں عالم مان لیا۔ لیکن یہی جناب سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا علم جانوروں اور پاگلوں کی طرح بتا رہے ہیں۔ اور انہیں کے قوت بازو مولوی خلیل احمد صاحب شیطان اور ملک الموت کا علم حضور سے زیادہ مان رہے ہیں۔ اور ان کے پیشوا مولوی قاسم صاحب حضور کا علم آدم علیہ السلام سے زیادہ مانتے ہیں۔ ان تمام صاحبوں کے کلام سے یہ ثابت ہوا۔ کہ آدم علیہ السلام کا علم سارے فرشتوں اور شیطان سے زیادہ کیونکہ اس موقعہ پر شیطان بھی چیزوں کا نام نہ بتا سکا۔ اور حضور علیہ السلام کا علم آدم علیہ السلام سے زیادہ تو نتیجہ یہ نکلنا چاہیئے تھا۔ کہ حضور کا علم سارے فرشتوں اور شیطان سے کہیں زیادہ مگر ان صاحبوں نے نتیجہ یہ نکالا۔ کہ حضور کا علم ملک الموت اور شیطان سے کم۔ واللہ یہ اُلٹی منطق ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ کیا کوئی دیوبندی یا وہابی اس معمہ کو سلجھادیں گے۔ اور اس ضدین کے اجتماع کو ہمیں سمجھادیں گے۔ ہم اُن کے نہایت مشکور ہوں گے۔ **دوسرا اعتراض**۔ حق تعالے نے یہ سارے نام فرشتوں کو خود ہی کیوں نہ بتا دیئے۔ **جواب**۔ اس کا جواب پہلے گذر چکا۔ کہ اس میں آدم علیہ السلام کی افضلیت کا اظہار کرنا منظور تھا۔ اور سارے انسانوں کو بتانا مقصود تھا۔ کہ خدا کی ہر نعمت انبیاء کرام سے حاصل کریں۔ **تیسرا اعتراض**۔ جب آدم علیہ السلام کو سارے علم پہلے ہی حاصل ہو گئے۔ تو اُن پر وحی کیوں آتی تھی۔ **جواب**۔ اس کا جواب بھی پہلے گزر چکا۔ کہ یا تو وحی لوگوں پر اظہار کرنے کیلئے ہوتی ہے۔ یعنی وحی سے پہلے اُس مسئلہ کا اظہار نہیں ہوتا۔ اور بعد وحی ہوتا ہے یا اس لئے کہ بعض مسائل کا خود اُن کو خیال نہیں رہتا۔ وحی سے وہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ **تفسیر صوفیانہ**۔ حق تعالے کے سارے ملک علیحدہ علیحدہ تھے۔ عالم اجسام عالم ارواح سے بے تعلق اور عالم امر عالم خلق سے علیحدہ نور ظلمت سے دور اور ظلمت نور سے کافور ایسی کوئی ہستی موجود نہ تھی۔ جو ان سارے عالموں میں تعلق پیدا کر دے۔ کیونکہ فرشتے اس دنیا سے بے نیاز تھے۔ اور یہاں کے جانور جنات وغیرہ اُس طرف سے بے خبر نیز حق تعالے کے بہت سے صفات اب تک ظاہر نہ ہوئے تھے۔ کیونکہ کوئی ایسا کامل مظہر نہ آیا تھا جو ان سب کو ظاہر کرے۔ اس لئے منشاء الٰہی یہ ہوا۔ کہ اپنا ایسا خلیفہ بناؤں جو ملک کو ملکوت سے خلق کو امر سے ظلمت کو نور سے غم کو سرور سے ملادے نیچوں کو اوپر پہنچادے۔ اور اوپر کی رحمتیں نیچے والوں تک لادے۔ اور جو کہ اپنے ظاہری اور باطنی صفات سے میرے تمام اوصاف ظاہر کر دے۔ اُس میں روح و روحانیات۔ جسم وجسمانیات سما اور سماویات ارض اور ارضیات دُنیا اور دین جماد اور نباتات اور حیوانات ملکوت وملکوتیات سب جمع ہوں۔ جو کہ اپنے وجود سے رب کا وجود اپنی وحدانیت سے رب کی وحدانیت اپنی زندگی سے رب کی حیات اپنی قدرت اور ارادہ سمع بصر اور کلام اور علم سے رب کی قدرت اور ارادے اور سمع بصر علم وغیرہ کو ظاہر کر دے۔ اور اپنے روح کی لامکانیت اور لاجھتیت سے رب کی ان صفات

ظاہر فرمائے۔ اور اس لئے وہ خلیفۃ اللہ اعظم کا لقب پائے۔ لہٰذا رب نے ایسے خلیفہ کے پیدائش کا نوری فرشتوں میں اعلان فرمایا۔ فرشتے اس کی تہ تک نہ پہنچ سکے۔ انہوں نے اس کے ظاہر سے دھوکہ کھایا۔ انہیں کیا خبر تھی۔ کہ اس مٹی کے چراغ میں روحانیت کا روغن ہوگا۔ اور وہ چراغ قلب کے فانوس میں رکھا جائیگا۔ اور وہ فانوس اس کے جسم کے طاق میں محفوظ ہوگا جس میں اسرار الٰہی کی بتی ہوگی۔ اور نور الٰہی کی نار سے روشن ہوگا۔ پھر اس کو عقل کا نور دے کر نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ بنایا جائے گا۔ جس سے حق تعالیٰ کے سارے صفات عدل اور احسان محبت اور رحمت عزت اور غلبہ اور غضب اور انتقام عالم میں ظاہر ہوں گے۔ اس لئے انہوں نے سوال کر دیا۔ کہ مولےٰ اس میں وہ کیا کمال ہوگا۔ جو ہم میں نہیں ہے۔ اس وقت تو ان فرشتوں کو یہ فرما کر خاموش کر دیا گیا۔ کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ لیکن پھر اس خلیفہ کو پیدا فرما کر اس کے علم کی کچھ تجلی فرشتوں پر ڈالی وہ اس طرح کہ اس خلیفہ کو تین قسم کے علم دیئے۔ روحانیات اور ملکوتیات کا جس کی کسی قدر فرشتوں کو بھی خبر تھی۔ دوسرے جسمانیات کا جس سے فرشتے ناواقف تھے۔ تیسرے الٰہیات کا جو کہ فرشتوں کے وہم سے بھی بالاتر تھا کیونکہ فرشتے ملکوت میں سے تھے۔ اور یہ باتیں عالم غیب عالم جبروت کی سیدنا آدم کا علم وہاں تک پہنچایا۔ کہ جہاں فرشتے بھی کہنے لگے۔ کہ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ۔ لیکن باغ خلیل کے گُل زیبا اور چمن آدم کے تخم مقصود حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں وہاں پہنچایا کہ اور فرشتے تو کیا حضرت جبرئیل کو یہ عرض کرنی پڑی: شعر

اگر یک سرے موئے برتر پرم — فروغ تجلّی بسوزد پرم

غرضکہ حضرت آدم کے سامنے فرشتوں کو اپنی کم علمی کا اقرار اور حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے کم قدرتی کا اقرار کرنا پڑا۔ چونکہ آدم علیہ السلام درخت عالم کے پھل تھے پھل سارے درخت کے اوپر رہتا ہے۔ اور تمام درخت کا خلاصہ ہوتا ہے۔ اس لئے آدم علیہ السلام بھی خلاصہ موجودات تھے۔ جب فرشتوں نے حضرت آدم کے علم کی جھلک دیکھی ان پر ایک حالت وجد طاری ہوئی۔ لہٰذا ان سے کہا گیا۔ کہ گر جاؤ آدم کے سامنے

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى

اور جبکہ کہا ہم نے واسطے فرشتوں کے سجدہ کرو تم واسطے آدم کے پس سجدہ کیا سب نے سوا شیطان کے انکار کیا اس نے

اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا۔ کہ آدم کو سجدہ کرو۔ تو سب نے سجدہ کیا۔ سوا ابلیس کے منکر ہوا

وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

اور غرور کیا اور ہو گیا کافروں میں سے

اور غرور کیا اور کافر ہو گیا۔

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک** یہ کہ اس سے پہلے حق تعالےٰ نے اپنی تین نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ اوّلاً ہمارے جد امجد آدم علیہ السلام کا خلیفۃ اللہ ہونا دوسرے ان کو بہت سا علم ملنا تیسرے فرشتوں کا عاجز ہو کر ان کی شاگردی کرنا۔ اب چوتھی نعمت کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ یعنی فرشتوں کا ان کو سجدہ کرنا جس ترتیب سے یہ واقعات ہوئے۔ اس ہی ترتیب سے ان کا ذکر بھی ہوا۔ **دوسرے** یہ کہ اس سے پہلے آدم علیہ السلام کی خلافت کا ذکر ہوا تھا۔ اور خلافت کیلئے دو وصف ضروری ہیں ایک خلیفہ کا عالم ہونا۔ دوسرے اس کا قدرت والا ہونا۔ کہ سب رعایا اس کے سامنے جھک جائے پہلے ان کے علم کا ذکر ہو چکا۔ اب ان کی قدرت کا ذکر ہو رہا ہے۔ **تیسرے** یہ کہ اس سے پہلے آدم علیہ السلام کے استاذی کا ذکر تھا۔ اب اس کے نتیجہ کا کہ جب وہ فرشتوں کے استاذ ہوئے۔ تو فرشتوں نے ان کی اس طرح تعظیم کی **تفسیر وَاِذْ قُلْنَا** ظاہر یہ ہے۔ کہ سجدے کا حکم آدم علیہ السلام کے کمال علمی کے ظاہر کرنے کے بعد ہوا۔ کہ جب فرشتے ان کی قابلیت اور لیاقت دیکھ چکے۔ تب ان سے فرمایا گیا۔ کہ آدم کو سجدہ کرو۔ لیکن بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ یہ حکم آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ کیونکہ دوسری جگہ قرآن

کریم فرما رہا ہے۔ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ۔ لیکن ان دونوں باتوں کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ فرشتوں کو آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہی سجدے کا حکم دے کر آن کو اس کے لئے تیار کر دیا گیا تھا۔ اب اس علم کے ظہور کے بعد سجدہ کرایا گیا۔ یعنی سجدے کا حکم پہلے اور سجدہ کرانا بعد میں جیسے کہ مال آتے ہی زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ لیکن سال گزرنے پر ادا کرائی جاتی ہے۔

لِلْمَلٰٓئِكَةِ بعض لوگوں نے یہاں زمین کے فرشتے مراد لئے ہیں۔ یعنی یہ سجدہ اور تعظیم وغیرہ صرف زمین کے فرشتوں نے ادا کیا۔ لیکن صحیح یہی ہے۔ کہ یہاں سارے فرشتے مراد ہیں۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کی افضلیت سارے ہی فرشتوں پر ظاہر ہوئی اور سب ہی نے اُن کی شاگردی کی تو چاہیئے۔ کہ سجدہ اور تعظیم بھی سب ہی کریں۔ نیز اس جگہ ملائکہ میں کوئی قید نہیں ہے۔ تو بلا وجہ قید لگانا معتبر نہ ہوگی۔ نیز آئندہ ارشاد ہو رہا ہے كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ۔ یعنی سب نے مل کر سجدہ کیا پھر اتنی تاکیدوں کے ہوتے ہوئے خاص کرنے کا اعتبار نہیں۔ اُسْجُدُوْا یہ لفظ سجدے سے بنا ہے جس کے لغوی معنی ہیں۔ عاجزی اور فرمانبرداری کرنا قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ اور عربی شعراء نے بھی اسی معنی میں اس کو استعمال کیا ہے۔ مگر شریعت میں زمین پر پیشانی رکھنے کو سجدہ کہا جاتا ہے بشرطیکہ اس میں سجدے کی نیّت بھی ہو۔ بلکہ سجدے میں سات عضو زمین پر لگنے چاہئیں پاؤں کے دونوں انگوٹھے دونوں گھٹنے دونوں ہتھیلیاں اور ایک ناک پیشانی سجدہ دو قسم کا ہے سجدۂ تعبدی اور سجدہ تعظیمی۔ سجدہ تعبدی یہ ہے کہ کسی کو اپنا خالق مان کر اُس کے لئے جھکے۔ سجدۂ تعظیمی یا سجدۂ تحیت یہ کہ کسی کو فقط بزرگ جان کر اُس کے سامنے سر زمین پر رکھے۔ سجدہ تعبدی خدا کے سوا دوسرے کو کرنا شرک ہے کسی بھی دین میں جائز نہ ہوا سجدۂ تعظیمی پہلی امتوں میں جائز تھا۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اُن کو سجدہ کیا۔ اس جگہ سجدے میں چار قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں فقط تعظیم مراد ہے یعنی لغوی سجدہ لیکن یہ قول نہائت ہی ضعیف ہے۔ بلکہ قرآنی آیات کے خلاف اس لئے کہ قرآن کریم نے کہیں تو فرمایا ہے۔ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ اور کہیں فرمایا خَرُّوْا جن دونوں کے معنی ہیں گر جانا فقط تعظیم میں گرنا نہیں ہوتا۔ دوسرا قول یہ ہے۔ کہ اس سے فقط جھکنا مراد ہے۔ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ یہی فرماتے ہیں لیکن یہ قول بھی قابل قبول نہیں کیونکہ اس میں بھی گرنا نہیں ہوتا۔ اور قرآن کریم سے گرنا ثابت ہے۔ نیز قرآن کریم کی عبارتوں میں شرعی معنی چھوڑ کر لغوی معنی مراد لینا بڑے فتنے کا دروازہ کھولنا ہے۔ کیونکہ اگر آپ سجدے سے جھکنے یا تعظیم کرنا مراد لے سکتے ہیں۔ تو بعض لوگ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ میں صلوٰۃ کے لغوی معنی یعنی فقط دعا بھی مراد لے سکیں گے۔ تیسرا قول یہ ہے۔ کہ یہاں سجدے سے مراد پیشانی زمین پر لگانا ہی ہے۔ اور فرشتوں کو اسی کا حکم ہوا تھا۔ لیکن اس میں پھر دو قول ہیں بعض فرماتے ہیں۔ کہ یہ سجدہ عبادت تھا۔ یعنی سجدہ اللہ کو تھا۔ اور آدم علیہ السلام مثل قبلے کے جس طرح کہ ہم کعبے کے سامنے جھک کر سجدہ اللہ کو کرتے ہیں۔ ایسے ہی فرشتوں نے آدم علیہ السلام کے سامنے جھک کر اللہ کو سجدہ کیا یہی قول شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ لیکن یہ بھی ضعیف ہے۔ تفسیر کبیر نے اس کی بہت تردید فرمائی ہے۔ اس لئے کہ اگر آدم علیہ السلام محض قبلہ ہوتے تو اِلٰی اٰدَمَ فرمایا جاتا نہ کہ لِاٰدَمَ جس کے معنی ہوتے کہ آدم کی طرف سجدہ کرو۔ مگر فرمایا گیا۔ لِاٰدَمَ جس کے معنی ہیں۔ کہ آدم کے لئے سجدہ کرو۔ اور یہاں لام کو اِلٰی کے معنی میں لینا۔ بلا وجہ حقیقی معنی کو چھوڑنا ہے۔ نیز اگر آدم علیہ السلام فقط قبلہ ہوتے تو فقط اس سے اُن کی افضلیت اور عزت ثابت نہ ہوتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کی طرف سجدہ کرتے تھے۔ حالانکہ آپ کعبہ سے افضل تھے (تفسیر کبیر) نیز اگر آدم علیہ السلام فقط قبلہ ہوتے۔ تو ابلیس انکار نہ کرتا کیونکہ اس نے اب تک بیت المعمور کے سامنے رب کیلئے لاکھوں سجدے کئے تھے۔ وہ یہ سمجھتا۔ کہ میرے پہلے سجدے بھی رب کیلئے تھے۔ اور یہ بھی پہلے بیت المعمور (آسمان والوں کا کعبہ) کی طرف تھے۔ اور اب آدم علیہ السلام کی طرف اُس کے انکار سے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ یہ سجدہ آدم علیہ السلام کو ہی تھا۔ چوتھا قول یہ ہے۔ کہ یہ سجدہ تعظیمی تھا۔ اور آدم علیہ السلام کے لئے ہی تھا پہلی شریعتوں میں جائز تھا ہمارے اسلام میں منسوخ ہو گیا۔ اب رب کے سوا کسی کو کسی قسم کا سجدہ کرنا جائز نہیں۔ یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ اور اسی کی قرآنی آیت اور احادیث صحیحہ سے تائید ہوتی ہے تتمہ اسلام میں جس طرح سجدہ حرام کیا گیا۔ اسی طرح جھک کر تعظیم کرنا بھی لہٰذا بقدر رکوع جھک کر سلام کرنا۔ یا کسی بڑے آدمی کے سامنے کی زمین چومنا سب منع ہیں۔ ہاں اگر

کسی اور فعل کے لئے جُھکا۔ اور وہ کام تعظیم کے لئے ہے۔ تو جائز جیسے کہ کسی بزرگ کے پاؤں چومنے اور جُوتے سیدھے کرنے کیلئے جُھکنا اس کی پوری تحقیق کیلئے ہماری کتاب "جاء الحق" کا مطالعہ کرو۔ نیز اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ نے اس بارے میں ایک مستقل رسالہ لکھا۔ اَبرُّ المِقَال۔ لِاٰدَمَ لام سے وہ فائدے حاصل ہوئے۔ جو اوپر بیان کئے گئے۔ اس سجدہ کرانے میں چند مصلحتیں تھیں۔ ایک یہ کہ جب دنیوی بادشاہ کسی کو وزیر اعظم بناتا ہے۔ تو دوسرے امیروں وزیروں کو حکم دیتا ہے۔ کہ اس کی سلامی کرو۔ اور اس کو نذرانے اور ہدیئے پیش کرو اسی طرح یہاں ملائکہ سے سجدے کا نذرانہ پیش کرایا گیا جو کہ حقیقت میں وفاداری کا حلف ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی علاقہ کے حاکم کیلئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک اُس علاقے کا پورا پورا علم دوسرے سب پر حکومت اور قدرت جب آدم علیہ السلام تمام جہان کے حاکم بنائے گئے۔ تو اُن کو سارے جہان کا علم بھی دیا گیا۔ اور سب پر قدرت بھی علم تو پہلے ظاہر فرما دیا گیا۔ اور قدرت اور تصرف کا اب اظہار ہُوا۔ کیونکہ جب فرشتے ہی اُن کے سامنے جھک گئے۔ اور اُن کے زیر فرماں ہو گئے۔ تو باقی چیزیں خود بخود قبضے میں آگئیں۔ فَسَجَدُوْا یہ حکم سنتے ہی سارے فرشتے بلا تامل آدم علیہ السلام کے سامنے سجدے میں گر گئے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ سب سے پہلے حضرت جبریل سجدے میں جھکے پھر میکائیل پھر اسرافیل پھر عزرائیل پھر سارے فرشتے۔ اسی لئے حضرت جبریل کو سب سے بڑا درجہ عطا فرمایا گیا۔ یعنی خدمت انبیاء (تفسیر خزائن العرفان)۴ خیال رہے کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش بھی جُمعہ کو ہوئی تھی۔ اور یہ سجدہ بھی اور اُن کا جنت سے تشریف باہر لانا بھی جُمعہ کے دن ہُوا اور توبہ کی قبولیت بھی اور بڑے بڑے اہم کام بھی جمعے ہی کے دن ہوئے قیامت بھی جمعے ہی کے دن قائم ہوگی۔ انشاءاللہ جمعہ کے پورے فضائل سورۃ جمعہ کی تفسیر میں اور کچھ اس سے پہلے بھی بیان کئے جائیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ یہ سجدہ ظہر کے وقت سے عصر تک رہا دوسرا قول یہ ہے۔ کہ ملائکہ سو برس سجدے میں گرے رہے اور تیسرا قول یہ ہے۔ کہ پانچسو سال تک سجدے میں رہے (تفسیر خزائن العرفان اور روح البیان) ان قولوں کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے۔ کہ اولاً فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا جس کا شیطان نے انکار کیا یہ سجدہ تھوڑی دیر تک رہا۔ پھر انہوں نے سر اُٹھا کر دیکھا کہ شیطان آدم علیہ السلام کیطرف پیٹھ پھیرے کھڑا ہُوا ہے۔ تب اُنہوں نے دوسرا سجدہ اس سجدے کی توفیق کے شکریئے میں ادا کیا یہ سجدہ رب کے لئے تھا۔ اور سجدۂ شکر تھا پھر جب سر اٹھایا۔ تو انہوں نے دیکھا کہ شیطان پہلے بہت خوبصورت تھا۔ لیکن اب اُس کی صورت مسخ ہو کر جسم خنزیر کا سا اور چہرہ بندر کا سا ہو گیا۔ تب انہوں نے ہیبت الٰہی سے ایک اور سجدہ ادا کیا یہ تینوں سجدے آدم علیہ السلام ہی کیطرف تھے۔ مگر تین قسم کے اور ان کی مدتیں علیحدہ علیحدہ (ماخوذ از تفسیر روح البیان)۔ اِلَّآ اِبْلِيْسَ۔ تمام فرشتوں نے تو سجدہ کر لیا۔ لیکن ابلیس اپنی عبادت اور شیطانی توحید کے نشے میں مست رہ کر اس سجدہ کا انکاری ہو گیا۔ خیال رہے۔ کہ مردود ہونے سے پہلے اس کا نام عزازیل تھا۔ مگر پھر اس کا نام ابلیس و شیطان منکر ہو گیا۔ لفظ ابلیس بلسٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ ناامید یا مکار چونکہ شیطان بھی رحمت الٰہی سے ناامید ہو چکا۔ اور اُس نے مکر و فریب کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ اس لئے اُسے ابلیس کہا جانے لگا۔ لفظ شیطان شطوٌ سے بنا ہے۔ شطوٌ کے معنی ہیں۔ دُور ہونا۔ چونکہ یہ بھی ہر رحمت سے دور ہے۔ اس لئے اس کو شیطان کہا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ بروزن فیعال ہے۔ اور اس کا نون اصلی ہے۔ اور یا شیطٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ باطل اور جھوٹا ہونا اس صورت میں اس کے الف اور نون زیادہ ہوں گے۔ اب ہر مکار فریبی چیز کو بھی شیطان یا ابلیس کہا جانے لگا قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ تحقیق شیطان اس زمانے کے مغربی آفت کے مارے ہوئے علیگڑھی اور نیچری عقیدے میں ڈوبے ہوئے لوگ جس طرح جنت دوزخ قیامت وغیرہ کے منکر ہوئے۔ اسی طرح وہ شیطان کا بھی انکار کر بیٹھے اور قرآن پاک کو اپنی رائے کے موافق کرنے کے لئے اس میں طرح طرح تحریفیں کرنا شروع کر دیں۔ اور کہہ دیا۔ کہ اس سے مراد انسان کے بُرے صفات ہیں۔ اُن کا یہ قول اہل اسلام۔ عیسائیوں یہودیوں مجوسیوں وغیرہ سب کے ہی خلاف ہے۔ کیونکہ شیطان کا ثبوت توریت۔ انجیل اور وساطیر وغیرہ سب ہی سے ہے۔ اگر شیطان انسانی صفت کا نام ہوتا تو اُس کو آگ سے پیدا ہونے اور آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے اور فرشتوں کی جماعت سے نکالے جانے قیامت تک اُسے مہلت

۴ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت اسرافیل نے سجدہ کیا۔ اسی لئے اُن کی پیشانی پر سارا قرآن لکھ دیا گیا (تفسیر روح البیان)

ملنے اور اُس کی اولاد ہونے کے کیا معنی اُن کی یہ کلام توجہ کے قابل نہیں ہے۔ ہاں اس میں محققین کا اختلاف ہے۔ کہ شیطان کی حقیقت کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ وہ فرشتہ ہے۔ کیونکہ اگر فرشتہ نہ ہوتا۔ تو سجدے کے حکم میں کیونکر داخل ہوتا رہا۔ قرآن کریم میں اُس کو جن فرمانا۔ کہ کَانَ مِنَ الْجِنِّ اُسکے معنی ہیں چھپا ہوا۔ یا تو وہ انسانوں کی نگاہ سے چھپا رہتا ہے اور فرشتے بھی ہر وقت اُسکو نہیں دیکھ سکتے تھے اسلئے اُسے جن فرمایا گیا بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جن بھی فرشتے ہی ہیں یعنی اطاعت کرنیوالوں کو ملک کہا گیا۔ نافرانوں کو جن لیکن یہ دونوں قول ضعیف ہیں حق یہی ہے کہ شیطان جنات میں سے ہی ہے اور جنات کی حقیقت ہے اور فرشتوں کی اور اسلئے کہ جنات کی پیدائش نار سے ہے۔ وہ خود کہتا ہے۔ کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ اور دوسری جگہ فرمایا گیا۔ کہ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ۔ نیز فرمایا گیا۔ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ۔ اور فرشتے نوری ہیں۔ جیسا کہ احادیث صحیحہ میں وارد ہوا۔ نیز شیطان کی ذریت اور اولاد ہے۔ فرشتے اسی سے پاک کیونکہ اُن میں کوئی نر و مادہ ہی نہیں یہ دونوں باتیں قرآن کریم سے ثابت ہیں۔ نیز فرشتے معصوم ہیں اور شیطان نابکار بدکاروں کا سردار قرآن کریم فرشتوں کے بارے میں فرماتا ہے۔ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ نیز فرشتے اللہ کے رسول ہیں۔ شیطان اور جنات میں یہ بات نہیں۔ ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جن اور فرشتوں کی علیحدہ علیحدہ حقیقتیں ہیں۔ اور شیطان جنات میں سے ہے۔ مگر اپنے عبادت اور تقوے کی وجہ سے چونکہ فرشتوں میں رہتا تھا۔ اسلئے سجدے کے حکم میں وہ بھی شامل ہو گیا۔ جیسے کہ بادشاہ اپنے سپاہیوں کو کچھ حکم کرے۔ تو اُن کے ساتھ رہنے والے سائیس اور دربان اور فراش بھی اس حکم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ جب فرشتے سجدے میں گرے۔ تو شیطان آدم علیہ السلام کیطرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا اُسی وقت سے اُس کی صورت مسخ کر دی۔ اور وہ نکال دیا گیا۔ تفسیر عزیزی میں اس جگہ ہے۔ کہ ایک بار شیطان نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا۔ کہ آپ تو اللہ کی بارگاہ میں بڑے مقبول ہیں میری شفاعت فرما دیجئے۔ کہ حق تعالےٰ میری توبہ قبول فرمائے موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی حکم الٰہی ہوا۔ کہ آپ کی شفاعت قبول اور شیطان کی توبہ منظور مگر شرط وہی پہلی ہے۔ کہ آدم علیہ السلام کی قبر کو سجدہ کرے۔ موسیٰ علیہ السلام نے شیطان کو خبر دی اُس نے جواب دیا۔ کہ جب میں نے زندہ آدم کو سجدہ نہ کیا۔ تو مُردے کو کیا سجدہ کروں۔ مگر اے موسیٰ تمہاری شفاعت کا مجھ پر احسان ہے اس لئے میں آپ کو ایک فائدے کی بات بتاتا ہوں۔ کہ میں تین وقتوں میں آدمی کو بہت خراب کرتا ہوں۔ ایک غصے کی حالت میں کہ اس وقت بجائے خون کے اُس کے جسم میں میں دوڑتا ہوں۔ اور جو چاہتا ہوں۔ اُس سے کرا لیتا ہوں۔ دوسرا جہاد کی حالت میں کہ غازی کو گھر بار یاد دلا کر جہاد سے روکتا ہوں تیسرے غیر عورت کے ساتھ خلوت کی حالت میں کہ زنا کرا دیتا ہوں روح البیان نے اس جگہ فرمایا۔ کہ حق تعالیٰ شیطان کو ایک لاکھ برس جہنم میں رکھ کر وہاں سے نکالے گا۔ اور فرمائے گا۔ کہ تو اب بھی حضرت آدم کو سجدہ کرے۔ مگر انکار کریگا۔ اور دوزخ میں واپس کر دیا جائیگا۔ اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ اَبَا اِبَآءٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ دیدہ دانستہ اور بلا وجہ انکار کر دینا یعنی شیطان نے بلا عذر جان بوجھ کر سجدے سے انکار کر دیا انکار کیوں کرا تکبر کی وجہ سے اِسْتَکْبَرَ اِستکبارٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ اپنے کو بڑا سمجھنا شیطان نے تین وجہوں سے اپنے کو آدم علیہ السلام سے بڑا سمجھا۔ ایک یہ کہ میں آگ سے پیدا اور وہ خاک سے اور آگ خاک سے افضل ہے۔ اور جو افضل سے پیدا ہو وہ بھی افضل لہذا میں آدم سے افضل دوسرے یہ کہ میں ہزاروں سال عبادت میں مشغول رہا۔ آدم علیہ السلام نے ابھی کوئی عبادت نہ کی۔ لہذا میں اُن سے افضل تیسرے یہ کہ میں نے دنیا میں بڑے بڑے کام انجام دیئے۔ جیسے کہ زمین کو جنات سے خالی کرانا وغیرہ اور انہوں نے اب تک کوئی مشقت نہ اُٹھائی۔ لہذا میں ان سے افضل حق تعالےٰ نے میری ناقدری کی اور سالہا سال کا حق خدمت برباد کر دیا۔ اس لئے سجدے سے انکاری ہو گیا۔ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ مفسرین نے اس کے دو معنی کئے ہیں۔ ایک یہ کہ کَانَ صارَ کے معنی میں ہے یعنی شیطان کافروں میں سے ہو گیا۔ یعنی اب تک مومن تھا۔ آج اس انکار سے کافر ہوا۔ دوسرے یہ کہ کَانَ اپنے ہی معنی میں ہے۔ یعنی وہ پہلے ہی سے کافروں میں سے تھا۔ یا تو اس لئے کہ وہ منافقت سے رب تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا۔ آج اُس کا نفاق ظاہر ہو گیا۔ یا خلافت کی امید پر ساری عبادتیں کر رہا تھا۔ نہ کہ رب کی رضا کے لئے آج جب اس سے مایوسی ہوئی سجدے کا انکار کر گیا۔ یا اس لئے کہ وہ اللہ کے علم میں پہلے ہی کافر تھا۔ اُس کی عبادت وغیرہ اللہ کے ہاں قبول نہ تھی۔ کافرین

سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس وقت کافروں کی اور بھی جماعت موجود تھی جن میں آج شیطان بھی داخل ہوگیا۔ سب سرکش جن کافر ہی تو تھے۔

**خلاصۂ تفسیر**۔ جب آدم علیہ السلام کا علم تمام پر ظاہر ہوگیا۔ تو تمام فرشتوں کو جن میں شیطان بھی رہتا تھا حکم ہؤا۔ کہ تم سب کے سب آدم علیہ السلام کو تعظیمی سجدہ کرو۔ وہ سب سجدے میں گر گئے لیکن ابلیس سجدے سے انکاری ہؤا۔ اور اپنے کو بڑا جان کر دل میں سوچنے لگا۔ کہ حق تعالیٰ کا یہ حکم غلط ہے میں بہت بڑا آدم علیہ السلام بہت چھوٹے چھوٹا بڑے کے سامنے جھک سکتا ہے۔ نہ کہ بڑا چھوٹے کے سامنے رب نے میری ہزارہا برس کی خدمتوں کی کوئی قدر نہ فرمائی۔ اور میرا حق نہ پہچانا۔ اس لئے وہ کافروں میں سے ہوگیا۔

**حضرت حوّا کی پیدائش**۔ اس واقعہ کے بعد آدم علیہ السلام تنہا زمین میں پھرتے تھے۔ اور ہر جانور کو اپنا غیر جنس دیکھ کر گھبراتے تھے اور تمنا کرتے تھے۔ کہ کاش کوئی میرا ہم جنس ہوتا جس سے مجھے اُنس حاصل ہوتا دوسرے جمعہ کو آدم علیہ السلام سو رہے تھے۔ کہ فرشتوں نے اُنکی بائیں پسلی چاک کی جس سے اُنہیں کچھ تکلیف نہ ہوئی۔ اور اُس سے آناً فاناً ایک نہائت خوبصورت عورت بنائی آدم علیہ السلام کی چری ہوئی پسلی کو ملا دیا گیا۔ جب وہ جاگے تو اپنا ہم جنس اپنے پاس بیٹھا ہؤا دیکھا پوچھا تم کون ہو۔ ندا آئی۔ کہ یہ ہماری بندی ہے۔ تمہاری وحشت دور کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے آدم علیہ السلام نے چاہا کہ اُن کو ہاتھ لگائیں حکم ہؤا۔ کہ اے آدم پہلے ان کا مہر ادا کرو پھر ہاتھ لگانا۔ عرض کیا۔ کہ مولیٰ مہر کیا ہے۔ فرمایا کہ میرے نبی آخر الزماں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر دس بار درود شریف پڑھو۔ کیونکہ اگر اُن کی پیدائش منظور نہ ہوتی تو تم بھی نہ ہوتے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام نے درود شریف پڑھا اور فرشتوں کی گواہی سے اُن کا نکاح ہؤا (تفسیر عزیزی) ان کا نام حوّا اس لئے ہے۔ کہ یہ لفظ حیٌّ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ زندہ چونکہ یہ زندہ انسان (آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئیں) یا ہر زندہ انسان کی والدہ ہیں۔ اس لئے انہیں حوّا کہا گیا۔ یا یہ لفظ حَوۃٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں سرخی مائل بسیاہی چونکہ ان کے ہونٹ کا رنگ ایسا ہی تھا۔ اس لئے انہیں حوّا کہا گیا عربی زبان میں۔ عورت کو مرءۃٌ کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ مرءٌ (یعنی مرد) سے بنی ہیں۔ اس کو عورت اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اس کے بے پردہ ہونے میں عار یعنی شرم ہوتی ہے۔ اس لئے شرم گاہ کو بھی عورت کہا جاتا ہے۔ حضرت حوّا کا قد بھی ساٹھ ہاتھ کا تھا۔ ان کی عمر شریف نو سو ستانوے (۹۹۷) سال ہوئی۔ آدم علیہ السلام کے بعد ساڑھے ساٹھ سال زندہ رہیں۔ (تفسیر روح البیان) ان کی پیدائش کہاں ہوئی انشاء اللہ اگلی آیت میں بیان کیا جائیگا۔ اس آیت کے **فائدے**۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل ہیں۔ کیونکہ اُنہیں سجدہ کرایا گیا۔ **دوسرے** یہ کہ استاد کا ادب شاگرد پر بہت ضروری ہے۔ کیونکہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کا ادب کیا **تیسرے** یہ کہ تکبر اور غرور نہایت بُری چیز ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے شیطان تکبر ہی سے گمراہ ہؤا **چوتھے** یہ کہ خدا کا حکم وجوب کیلئے ہوتا ہے۔ اسی لئے تو شیطان اُس کی مخالفت سے گمراہ ہؤا **پانچویں** یہ کہ کسی شخص کو اپنی عبادت پر ناز نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اعتبار خاتمے کا ہے۔ اور اُس کی خبر نہیں **چھٹے** یہ کہ شریعت میں بھی اور اللہ کے نزدیک بھی ظاہر پر حکم ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک شیطان عابد تھا۔ تو اگرچہ خدا کے علم میں وہ کافر تھا۔ مگر اُس وقت کی حالت کے لحاظ سے اُس کو فرشتوں میں عزت دی گئی۔ اور جب اُس کا کفر ظاہر ہؤا تب نکالا گیا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منافقوں کی رعائت فرمانا بے علمی کی وجہ سے نہیں تھا۔ بلکہ اسی طرح ہے۔ **ساتویں** یہ کہ بغیر عظمت انبیاء توحید لعنت کا سبب ہے۔ شیطان نے توحید الٰہی کا انکار نہ کیا۔ بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تعظیم کا اس واقعہ سے دیوبندیوں اور وہابیوں کو سخت عبرت پکڑنی چاہیئے۔ **آٹھویں** یہ کہ گناہ کرنا کفر نہیں۔ ہاں گناہ کو اچھا سمجھنا کفر ہے۔ کیونکہ شیطان ایک سجدے کے چھوڑنے سے مردود ہؤا۔ اور ہم گنہگار صدہا سجدے چھوڑ کر بھی مسلمان ہی رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ انکار سے تھا۔ اور یہ شرم ساری کے ساتھ **نویں** یہ کہ اللہ والوں کو حقیر جاننا اتنا بڑا جرم ہے۔ کہ پھر توبہ کی توفیق بھی نہیں ہوتی۔ فقہا فرماتے ہیں۔ کہ سنتِ غیر مؤکدہ کا بھی مذاق اڑانا کفر ہے **دسویں** یہ کہ توہین پیغمبر کے ہوتے ہوئے علم اور عبادت سب بیکار ہیں **گیارھویں** یہ کہ حکم الٰہی کے مقابلے میں قیاس کرنا کفر ہے۔ کیونکہ شیطان نے یہی تو کیا تھا۔

**پہلا اعتراض**۔ سب کو شیطان گمراہ کرتا ہے۔ مگر بتاؤ شیطان کو کس نے گمراہ کیا۔ اسی طرح شیطان کے گمراہ ہونے سے پیشتر جو جنّات نے فتنہ و فساد کیا وہ کس کے بہکانے سے **جواب**۔ ان سب کو اُن کے نفسوں نے گمراہ کیا۔ اصل گمراہ کرنے والی چیز نفس ہی ہے۔ شیطان تو اُس کی رہبری کرتا

ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ دیکھو ماہ رمضان میں شیطان قید ہو جاتا ہے مگر پھر بھی لوگ گناہ کرتے ہیں نفس کی وجہ سے **دوسرا اعتراض** حق تعالیٰ نے شیطان کو پیدا ہی کیوں فرمایا۔ جو کہ تمام گناہوں کی اصل ہے۔ **جواب**۔ اگر شیطان نہ ہوتا۔ تو دنیا اور دین میں کچھ بھی نہ ہوتا۔ کیونکہ پھر نہ بادشاہ کی ضرورت ہوتی۔ اور نہ پولیس اور کچہری اور نہ فوج وغیرہ کے محکمے کی اسی طرح نہ پیغمبروں کی اور نہ ولیوں اور پیروں کی نیز دوزخ اور عذاب کے فرشتے بیکار رہتے۔ نیز خدا کی صفتیں غفاری۔ ستاری۔ قہاری جباری وغیرہ کا ظہور نہ ہوتا۔ کیونکہ یہ صفات بندوں کے گناہوں سے ظاہر ہوتے ہیں بلکہ یوں کہو۔ کہ پھر تو نہ آدم علیہ السلام دانہ کھاتے نہ زمین پر آتے نہ دنیا آباد ہوتی۔ بلکہ غور سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ گرم و سرد۔ پاک و ناپاک۔ اچھی بری چیزوں سے ہی دنیا کا نظام قائم ہے۔ ان میں سے اگر ایک بھی نہ ہو تو دنیا کا خاتمہ ہے۔ دیکھو پاک پانی اور گندے کھاد سے دانہ اگتا ہے۔ سُریلی اور بھدّی آوازیں مل کر باجہ بجتا ہے۔ گرم اور ٹھنڈی طاقت سے بجلی بنتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ اسی لئے جب دنیا میں اہل ایمان نہ رہیں گے۔ تو قیامت آجائے گی **تیسرا اعتراض** جب شیطان مردود ہونے والا تھا۔ تو پہلے اس کو اتنی عزت کیوں دی گئی **جواب** تاکہ قیامت تک لوگوں کو اس سے عبرت حاصل ہو جائے۔ کوئی شخص اپنے علم اور تقوے اور پرہیزگاری کے نشے میں کسی پیغمبر کی توہین نہ کرے سمجھ لے۔ کہ یہ وہ نازک بارگاہ ہے۔ کہ اس کی بے ادبی کرنے پر سارے علم و عمل برباد ہو جاتے ہیں۔ شیطان کو مولوی بنا کے مارا۔ صوفی بنا کے مارا۔ عابد زاہد بنا کے مردود کیا۔ تاکہ سب مولویوں اور صوفیوں کو عبرت حاصل ہو جائے بہت سے لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے۔ کہ دیوبندی مولویوں نے واقعی حضور کی توہین تو کی ہے مگر وہ ہیں بڑے عالم و عامل۔ وہ اس واقعہ سے عبرت پکڑیں۔ دیوبندی مولوی شیطان سے بڑھ کے عالم اور عابد نہیں۔ **چوتھا اعتراض**۔ انبیاء کرام کی نعلین پاک کی بھی توہین کرنا کفر کیوں ہے۔ اور دل کی توہین کفر کیوں نہیں (نئے دیوبندی) **جواب**۔ اس لئے کہ ان کی ہر چیز رب کی تجویز سے اور ان کی ہر ادا رب کی رضا سے ہے۔ جب کفار نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حضرت زینب کے ساتھ نکاح کرنے پر اعتراض کیا۔ تو رب نے فرمایا۔ زَوَّجْنٰكَهَا یعنی اے کافرو محبوب کا نکاح میں نے کرایا ہے تم ان پر کیوں اعتراض کرتے ہو سبحان اللہ رب نے نکاح کرانے کو اپنی طرف نسبت دی۔ لہٰذا ان کی کسی چیز پر اعتراض در پردہ رب پر اعتراض ہے۔ اگر کوئی شخص فوج کی وردی یا غذا وغیرہ پر اعتراض کرے۔ تو حقیقتاً بادشاہ پر اعتراض کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ سب شاہی تجویز ہے **تفسیر صوفیانہ** فرشتے اب تک رب کیلئے سجدے کرتے رہے جو ان کی ملکی اور روحانی طبیعتوں کا تقاضے تھا۔ ان سجدوں میں براہ راست رب ہی کی تعظیم تھی ماسوا اللہ کی تعظیم کو دخل نہ تھا۔ آج اس سجدے کا حکم دیا جا رہا ہے جس میں بواسطہ حضرت آدم رب کی تعظیم ہوگی۔ کیونکہ آج حضرت آدم نور الٰہی کی تجلی گاہ ہیں۔ جو ان کے سامنے جھکے گا۔ وہ حقیقت میں رب ہی کو سجدہ کرے گا جس طرح سے کہ اپنے حبیب سے فرمایا۔ کہ جو آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ لہٰذا سچا سلوک وہی ہے جو پیغمبر کے ذریعے سے حاصل ہو۔ نیز فرشتوں کی عبادت سے نہ تو ان کو ثواب ملتا ہے۔ اور نہ ان کو ترقی درجات حاصل ہوتی ہے۔ آج فرمایا گیا۔ کہ اے فرشتو آج تم وہ سجدہ کرو۔ جو فائدہ مند ہو۔ تم کو پورا فائدہ اس سے نہ ہوگا۔ ہاں آدم علیہ السلام کو فائدہ ضرور پہنچے گا۔ کیونکہ ان کی اولاد تمہارے سجدے کو دیکھ کر اور سن کر بزرگوں کے ادب کرنے کا طریقہ سیکھے گی جس سے وہ میری بارگاہ تک پہنچنے کے قابل ہو گی۔ اور آج کا یہ سجدہ تمہارے صدہا سال کے سجدوں کا خلاصہ ہے۔ کیونکہ یہ حق و باطل کو علیحدہ کر بنوالانے۔ اب تک کے سارے سجدے اس شان کے نہ تھے۔ فرشتے چونکہ نوری تھے اور نور کی شان ہے اطاعت کرنا۔ شیطان ناری تھا۔ نار کی طبیعت ہے۔ اوپر کو چڑھنا۔ اس لئے آج اس نار نے بغیر وسیلۂ پیغمبر اوپر چڑھنا چاہا۔ نیچے گرا دیا گیا۔ یہ ایک وہ سجدہ تھا جس نے لاکھوں کے سجدے مقبول بنا دیئے اور ابلیس کے لاکھوں سجدے مردود کرا دیئے۔ کسی نے کیا خوب کہا شعر

جبینِ ہو قضا ایک ہی سجدے میں ادا ہو! گر وقت اجل سر تیری چوکھٹ پہ جھکا ہو!

تصور میں تیرے رہنا عبادت اسکو کہتے ہیں ریاضت نام ہے تیری گلی میں آنے جانے کا

بعض حضرات فرماتے ہیں۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیشانی میں نور مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ گر تھا۔ یہ سب برکتیں اور عظمتیں اسی کی وجہ سے تھیں اور در حقیقت یہ سجدہ اس نور ہی کو تھا۔ اس نور سے ہر جگہ رحمت رب کا ظہور ہوا۔ سب سے پہلے اس نور مصطفےٰ نے اپنے والد ماجد کو فرشتوں

کا مسجود بنایا۔ پھر اسی نور نے اپنے اٰبائی والا کی توبہ قبول کرائی۔ اسی کی برکت سے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کنارے لگی۔ اسی نے خلیل رب جلیل پر نار کو نور بنایا۔ اسی نے اسمٰعیل ذبیح اللہ کو ذبح سے بچایا۔ اسی نے اپنے باپ عبداللہ کو عبدالمطلب کی چھری سے ذبح ہونے سے بچایا۔ خود فرماتے ہیں۔ اَنَا ابْنُ الذَّبِيحَيْنِ میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں مولانا جامی فرماتے ہیں شعر

اگر نام محمدؐ را نیاوردے شفیع آدم  نہ آدم یافتے توبہ نہ نوح از غرق نجینا

وَقُلْنَا يَآ اٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا

اور ہم نے فرمایا اے آدم رہیے آپ اور بی بی آپ کی اسی جنت میں اور تم دونو کھاؤ اس سے سیر ہو کر جہاں چاہو تم دونوں

اور ہم نے فرمایا اے آدم تو اور تیری بی بی اس جنت میں رہو اور کھاؤ اس میں سے بے روک ٹوک جہاں تمہارا جی چاہے

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

اور نہ قریب جانا اِس درخت کے پس ہو جاؤ گے ظالموں سے

مگر اس پیڑ کے پاس نہ جانا۔ کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے۔

**تعلق**۔ اس آیت کو پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک** یہ کہ اس سے پہلے حق تعالےٰ کے چند احسانات کا ذکر کیا گیا تھا۔ کہ ہم نے تمہارے والد کو فلاں فلاں درجے عطا فرمائے۔ اُس سلسلے میں اب ایک اور احسان کا ذکر ہو رہا ہے۔ کہ ہم نے تمہارے والد حضرت آدم علیہ السلام کو جنت جیسے آرام اور پاکیزہ جگہ میں رکھا دوسرے یہ کہ اس سے پہلے خلافت کے متعلق آدم علیہ السلام کی دو صفتوں کا ذکر فرمایا گیا۔ ایک اُن کا بہت بڑا علم دوسرے اُن کی قدرت اور عزت اس آیت میں ان کی تیسری صفت کا ذکر ہے۔ جو خلافت کیلئے ضروری ہے یعنی حکومت کرنے اور زمین کو آباد کرنے کا طریقہ اور اس کا تجربہ چونکہ اُن کو اور اُن کی اولاد کو زمین میں رہنے کیلئے مکان بنانا اور باغات اور کھیتیاں لگانا اور اللہ کی اطاعت کرنا۔ دوسروں پر حکومت کرنا وغیرہ ضروری تھے۔ اس لئے اُن کو گویا سکھانے کے لئے جنت میں رکھا گیا۔ تاکہ وہ ان تمام چیزوں کا تجربہ فرما کر پھر زمین میں تشریف لائیں۔ پہلے انہیں علم دے دیا گیا تھا۔ اور اب تجربے کیلئے عارضی طور پر جنت میں رکھا گیا۔ **تفسیر وَقُلْنَا** جب شیطان مردود ہو چکا۔ تو اُس کو فرشتوں کی جماعت سے بھی نکال دیا گیا اور جنت وغیرہ اعلیٰ مقامات سے بھی اور اُس کے بعد آدم علیہ السلام کو حکم دیا گیا۔ کہ **يَآ اٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ**۔ اگرچہ جنت میں حضرت آدم اور حوّا دونوں ہی کو رکھا گیا تھا۔ لیکن اصل مقصود صرف آدم علیہ السلام کا رکھنا تھا۔ اور حضرت حوّا اُن کی دل بستگی کیلئے تھیں کیونکہ جنت میں رکھ کر خلافت کرنے کا طریقہ صرف آدم علیہ السلام کو سکھانا منظور تھا۔ اِس لئے اس جگہ خطاب صرف آدم علیہ السلام کو فرمایا گیا۔ اور اُن کی بیوی کا ذکر بطریقہ عطف ہوا **وَزَوْجُكَ**۔ عربی میں زوج کے معنی ہیں جوڑا شوہر اور بیوی دونوں کیلئے بولا جاتا ہے۔ یہاں بیوی کے معنی میں استعمال ہوا کبھی فرق کے لئے بیوی کو زوجہ کہہ دیتے ہیں۔ مگر یہاں اُس فرق کی ضرورت نہ تھی کیونکہ جب اُن کی نسبت آدم علیہ السلام کی طرف ہو رہی ہے۔ تو خود بخود سمجھ میں آجائیگا۔ کہ یہاں بیوی مراد ہے حضرت حوّا کو جنت میں رکھنے کی تین حکمتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اُن کے ذریعے آدم علیہ السلام کو اطمینان رہے دوسرے یہ کہ وہ جنتی مکانوں کی زیب و زینت اور صفائی دیکھ کر دنیاوی گھروں کو سجانا اور صاف رکھنا سیکھ لیں۔ تیسرے یہ کہ جنتی زیور اور پوشاکیں استعمال کر کے دنیا میں بھی اسی پر عمل کریں۔ گویا بیرونی زندگی تو آدم علیہ السلام سیکھیں اور خانگی زندگی حضرت حوّا **حضرت حوّا کی پیدائش** کا واقعہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ اب یہ بھی خیال رہے۔ کہ یہ تو سب مانتے ہیں۔ کہ آدم علیہ السلام وہاں پیدا ہوئے۔ جہاں آج مکہ معظمہ آباد ہے لیکن حضرت حوّا کی پیدائش میں اختلاف ہے۔ کہ کہاں ہوئی۔ عبداللہ ابن عباس اور ابن مسعود تو فرماتے ہیں۔ کہ جنت میں ہوئی۔ سیدنا آدم علیہ السلام ایک دن سو رہے تھے۔ اُن کی پسلی سے اِن کو پیدا فرما دیا گیا۔ تو آیت کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ اے آدم علیہ السلام آپ اور آپ کی بیوی جنت میں ٹھہرے رہو۔ لیکن حضرت عمرؓ

اور دیگر صحابہ کرام نے روایت فرمائی۔ کہ فرشتوں نے آدم و حوا علیہم السلام کو نوری لباس پہنایا۔ ان کے سر پر تاج رکھے۔ سونے کے تخت پر بٹھایا حضرت حوا کو مختلف قسم کے زیوروں سے آراستہ کیا۔ اور پھر ان دونوں کو جنت میں پہنچا دیا گیا۔ (تفسیر کبیر روح البیان) اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت حوا کی پیدائش بھی زمین میں ہوئی۔ اب آیت کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ آپ اور آپ کی بیوی جاکر جنت میں رہیئے اَلْجَنَّۃَ تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ کہ اس سے وہی جنت مراد ہے جس میں نیک کار ثواب کے لئے جائیں گے یعنی بہشت ہاں بعض بے دینوں نے کہا ہے۔ کہ یہ فلسطین یا فارس یا کرمان میں کوئی باغ تھا جس میں آدم علیہ السلام کو کچھ دن کے واسطے رکھا گیا۔ پھر ایک خطا کی وجہ سے ہندوستان کی طرف بھیج دیا گیا لیکن یہ بات محض غلط ہے۔ اس لئے کہ بعد میں آدم علیہ السلام سے فرمایا گیا ہے۔ اِھْبِطُوْا مِنْھَا یعنی جنت سے اُتر جاؤ۔ اترنا اونچی جگہ سے ہوتا ہے۔ اگر یہ کوئی زمین کا باغ ہوتا تو فرمایا جاتا کہ اُخْرُجُوْا نیز دوسری جگہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔ وَلَکُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ یعنی تمہارا ٹھکانا زمین ہے۔ اگر وہ باغ بھی زمین میں ہی ہوتا۔ تو یہ کیوں کہا جاتا۔ کہ تم جنت سے اُتر کر زمین میں جاکر رہو۔ کیونکہ پھر تو وہ زمین میں پہلے ہی سے تھے۔ اِھْبِطُوْا کو اُخْرُجُوْا کے معنی میں لینا بلا وجہ حقیقی معنی کو چھوڑنا ہے۔ نیز روایات میں بھی صراحتاً یہی آیا ہے۔ کہ آدم علیہ السلام بہشت میں رہے اپنے وہم کی وجہ سے احادیث کو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ دوسرے فریق کے دلائل بھی انشاء اللہ اسی آیت کے اعتراضات جوابات بیان کئے جائیں گے۔ وَکُلَا مِنْھَا۔ چونکہ فقط جنت کی چیزیں دیکھنے سے پورا تجربہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے اُن کو عام نعمتیں کھانے کی عام اجازت دی گئی۔ تاکہ یہاں کھاکر دنیوی نعمتوں کو بھی کھانا سیکھ جائیں۔ اور چونکہ اس کھانے کی ان دونوں حضرت آدم و حوا کو یکساں اجازت تھی۔ اس میں کوئی کسی کے تابع نہیں۔ اس لئے یہاں تثنیہ کا صیغہ ارشاد ہوا۔ رَغَدًا اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن کو جنتی نعمتوں کے کھانے میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ جب چاہیں۔ اور جو کچھ چاہیں اور جتنا چاہیں کھائیں۔ نہ تو وہاں نعمتوں کے ختم ہونے کا اندیشہ ہے۔ اور نہ بدہضمی وغیرہ کا دغدغہ نیز کسی چیز کے فقط چکھ لینے سے اُس کی خاصیتیں اور نفع نقصان پورے پورے نہیں معلوم ہوتے۔ حَیْثُ شِئْتُمَا یہ فرماکر اُن کو جنت میں ہر جگہ جانے کی اجازت دی گئی۔ چونکہ بہشت کے ہر طبقے کی آب و ہوا مختلف تھی۔ اور ہر جگہ کے مکانات اور حویلیاں اور محل رنگ برنگے۔ اس لئے اُن کو ہر جگہ کی چیزیں دیکھنے کا موقعہ دیا گیا۔ تاکہ اسی کے مثل وہ اور اُن کی اولاد دنیا کو آباد کریں اور وہاں کا جو نمونہ اُن کے خیال میں بیٹھا ہوا ہو۔ دنیا میں ظاہر کرے۔ تاکہ دنیا آخرت کا نمونہ بن جائے۔ وَلَا تَقْرَبَا۔ چونکہ دنیا میں آدم علیہ السلام اور اُن کی اولاد پر احکام خداوندی جاری ہونے والے تھے۔ اور دنیا کی بعض چیزوں سے اُن کو روکا جانے والا تھا۔ لہذا اُن کے نفس کو اس پابندی کا عادی بنانے کے لئے یہاں بھی اُنہیں بعض چیزوں سے روک دیا گیا۔ اور فرما دیا گیا۔ کہ اے آدم و حوا تم جنت میں جو چاہو کھاؤ۔ اور جہاں چاہو جاؤ۔ لیکن اس درخت کے قریب نہ جانا۔ یعنی نہ اسے کھانا نہ اُدھر جانا خیال رہے۔ کہ اس قرب مکانی یعنی فقط پاس جانے کی ممانعت نہیں ہے۔ ورنہ لَا تَقْرَبَا رے کے پیش سے ہوتا ہے۔ کیونکہ جو قرُب کے پاس جانے کے معنی میں ہے۔ وہ مطسرد کے پانچویں باب سے ہے (تفسیر روح البیان) بلکہ اس سے قربِ استعمالی مراد ہے یعنی اس درخت کو کھانا تو کیا کھانے کے قریب بھی نہ ہونا (یعنی کھانے کے خیال اور اُس کے اسباب سے بچنا) جیسے قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوْھُنَّ یعنی حائضہ عورتوں کے پاس نہ جاؤ یا فرماتا ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ یہاں بھی تقربو کی رے کو زبر ہی ہے۔ نہ کہ پیش جس سے معلوم ہوا کہ حائضہ عورت اور یتیم کے مال کے پاس جانے سے ممانعت نہیں ہے۔ بلکہ اُن کو غلط استعمال کرنے سے روکا گیا ہے۔ ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کوئی خاص درخت دکھا کر اُن سے یہ فرمایا گیا تھا۔ وہ کونسا درخت تھا۔ اس میں چار روائتیں ملتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ گیہوں کا تھا۔ اور جنت کا گیہوں بیل کے گردے کے برابر تھا۔ اور شہد سے زیادہ میٹھا اور مکھن سے زیادہ نرم و لذیذ تھا (تفسیر روح البیان و تفسیر عزیزی) چونکہ اس گیہوں کی وجہ سے آدم علیہ السلام جنت سے باہر تشریف لائے۔ اسی لئے اُن کی اکثر اولاد کا رزق گیہوں قرار دیا گیا۔ اور یہ گیہوں ہی تمام مصیبتوں کی جڑ ہے۔ دوسری روایت میں ہے۔ کہ وہ درخت انگور تھا۔ اسی لئے دنیا میں انگور کی شراب وغیرہ حرام کی گئی تیسری روایت میں ہے۔ کہ وہ درخت انجیر تھا۔ اسی لئے آدم علیہ السلام اپنے جسم پاک پر انجیر کے پتے لپیٹ کر جنت سے باہر تشریف

لائے چوتھی روایت یہ ہے۔ کہ وہ کوئی ایسا درخت تھا۔ کہ جس کے کھانے سے پاخانہ کی حاجت ہوتی تھی۔ اور جنت ان گندگیوں سے پاک ہے۔ وہاں تو سارے کھانے صرف ڈکار سے ہضم ہوتے ہیں۔ تو فرمایا گیا۔ کہ اب تم وہاں جاؤ جہاں تمہاری یہ ضرورت (رفع حاجت) پوری ہو سکے۔ مگر ان سب میں ترجیح پہلی روایت یعنی گیہوں والی کو ہے یہی سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں **فَتَكُونَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ**۔ یہ بھی فرما دیا گیا۔ کہ اگر تم نے اس حکم کے خلاف کیا تو تم ظالموں یعنی خطاکاروں میں سے ہو جاؤ گے۔ کیونکہ مالک کی بغیر اجازت اس کی چیز استعمال کرنا ظلم ہی تو ہے۔ اسی طرح خطا کرنا اپنی ذات پر ظلم کرنا ہے۔ **خلاصۂ تفسیر**۔ یہ تو پہلے معلوم ہو چکا تھا۔ کہ آدم علیہ السلام کو زمین میں رہنے اور وہاں حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ یہ جو کچھ اب تک ہوا تھا ان کی خلافت ہی کا پیش خیمہ تھا۔ لہذا جبکہ آدم علیہ السلام کے سر پر دستار خلافت بندھ چکی اور سارے فرشتوں نے نذرانۂ سجود پیش کر کے وفاداری کا حلف دے دیا۔ تب رب نے ان سے فرمایا۔ کہ اے آدم تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو۔ وہاں تمہیں کوئی روک ٹوک نہیں۔ جو جی چاہے خوب کھاؤ۔ اور جہاں چاہو سیر و تفریح کرو۔ تمہیں ہر چیز کی اجازت تو ہے۔ مگر اس درخت (گیہوں یا انجیر یا انگور یا کوئی اور خاص درخت) کے پاس تک نہ جانا یعنی کھانا تو کیا اس کا خیال تک نہ کرنا۔ اور جو ایسا کرو گے۔ تو یاد رکھنا۔ کہ خرابی میں پڑ جاؤ گے۔ اور اس سے تمہارے اوپر آفت آ جائے گی **خیال رہے** کہ آدم علیہ السلام کو کچھ روز کے لئے جنت میں رکھنے کی چند حکمتیں ہیں۔ ایک تو وہی جو ہم تفسیر میں عرض کر چکے۔ کہ بادشاہ جس کو بڑا عہدہ دینا چاہتے ہیں اس کو بی۔ اے وغیرہ اعلیٰ قابلیت کی ڈگری دینے کے بعد ٹریننگ بھی دیتے ہیں جس سے کہ ان کو حکومت کرنے کا تجربہ ہو جائے علم اور چیز ہے اور تجربہ دوسری چیز آدم علیہ السلام نے جنت میں رہ کر وہاں کے فرشتوں پر حکومت بھی فرمائی وہاں کے مکانات اور باغات کی بناوٹ بھی دیکھی وہاں کی نعمتوں کو استعمال بھی کیا۔ پھر بعض چیزوں کی ممانعت بھی سن لی پھر خطا ہو جانے پر عتاب الٰہی کا لطف بھی حاصل کر لیا۔ ایک محبوب اور پیاری چیز پا کر اس کے چھوٹ جانے کا غم بھی محسوس فرما لیا۔ اور دنیا میں ان کو اور ان کی اولاد کو انہی تمام باتوں سے واسطہ پڑنا تھا اس لئے اب جب دنیا میں تشریف لائے۔ تو بالکل تجربہ کار اور پختہ ہو کر آئے۔ دوسرے یہ کہ رب تعالےٰ نے ان کے اور ان کی اولاد کیلئے جنت بنائی جو کہ ان کی اصلی قیام گاہ ہے۔ دنیا تو ایک عارضی جگہ اور اس کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ لہذا ان کو جنت پہلے ہی دکھا دی گئی تاکہ وہ اور ان کی اولاد ان نعمتوں کو دیکھ کر یا سن کر ان کے حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اور ان کی طلب سے ایک دم بھی غافل نہ رہیں تیسرے یہ کہ دنیا میں ان پر احکام ربانی بھیجے جانے والے تھے جن کی مخالفت کی وجہ سے تکلیفیں آنے والی تھیں۔ اس لئے یہاں ہی یہ کام کر کے ان کو دکھایا گیا۔ **فائدے**۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ نکاح حق تعالےٰ کی بڑی نعمت ہے۔ کہ اس میں صدہا دینی اور دنیاوی فائدے ہیں۔ ایسی کوئی عبادت نہیں جو آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک ہر دین و ملت میں جاری رہی ہو سوائے ایمان اور نکاح کے رب تعالیٰ نے قرآن کریم میں انہی پیغمبروں کا ذکر فرمایا جو نکاح والے ہیں عیسیٰ علیہ السلام بھی دوبارہ دنیا میں تشریف لا کر نکاح کریں گے۔ اور یحییٰ علیہ السلام نے بھی نکاح تو کیا تھا۔ لیکن اس کی لذتوں میں زیادہ مشغول نہ ہوئے۔ اسی لئے رب نے ان کو حصور فرمایا۔ **دوسرے** یہ کہ جنت کی نعمتوں میں سے بیویاں اعلیٰ نعمت ہے۔ کیونکہ رب نے آدم علیہ السلام کی دل بستگی کے لئے ان کی بیوی کو بھی وہاں رکھا لہذا جن لوگوں نے جنت کی حوروں کا انکار کیا ہے۔ انہوں نے سخت غلطی کی **تیسرے** یہ کہ جنت پیدا ہو چکی ہے۔ **چوتھے** یہ کہ وہاں کی ساری نعمتیں بھی پیدا ہو چکیں۔ ورنہ آدم علیہ السلام کے وہاں رہنے اور وہاں کی نعمتیں استعمال کرنے کے کیا معنی **پانچویں** یہ کہ انسان کی پیدائش چار طریقوں سے ہوئی ماں[۱] اور باپ سے جیسے کہ عام انسان[۲] بغیر ماں باپ کے جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام [۳] بغیر ماں کے جیسے حضرت حوا[۴] بغیر باپ کے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام **پہلا اعتراض** حضرت حوا آدم علیہ السلام کی بیٹی تھیں۔ کیونکہ ان کے جسم پاک سے پیدا ہوئیں۔ تو ان کے ساتھ زوجیت کا برتاؤ کیونکر جائز ہوا **جواب**۔ اولاد وہ کہلاتی ہے۔ جو کہ اپنے نطفے سے پیدا ہو۔ یہاں ایسا نہ ہوا لہذا وہ ان کی بیٹی نہ ہوئیں۔ ہمارے جسم سے بہت سی جاندار چیزیں بن جاتی ہیں۔ سر میں اور کپڑوں میں اور پیٹ میں بہت سے جانور پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ ہماری اولاد نہیں کہلاتے۔ کیونکہ ہمارے نطفے سے نہیں ہیں۔ اس ہی لئے بعض علماء اکرام فرماتے ہیں۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ابن مریم کہنا مجازاً

ہے: اس لئے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام حضرت جبرائیل کی پھونک سے پیدا ہوئے۔ اور حضرت مریم کا شکم شریف اُن کے امانت کی جگہ تھی۔ وہاں مریم کا بھی نطفہ نہ تھا۔ اس کی پوری بحث انشاءاللہ سورۂ مریم میں کی جائیگی۔ اور اگر مان بھی لیا جائے۔ کہ حضرت حوا آدم علیہ السلام کی بیٹی ہی تھیں تو بھی جس طرح اُن کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا۔ اس طرح یہاں مجبوراً اس بیٹی سے نکاح کرنا جائز قرار دیا گیا کیونکہ دوسری عورت کا ملنا ناممکن تھا۔ اگر آدم علیہ السلام کی طرح حضرت حوا کو بھی مٹی ہی سے بنا دیا جاتا۔ تو یقیناً عورت مرد میں وہ محبت نہ ہوتی جواب ہے۔ کیونکہ اب تو اس لئے محبت ہے کہ عورت مرد کا جزو ہے۔ اور نہ عورت کا مرد کے تابع ہونا معلوم ہوتا۔ اور نہ عورت مرد کی ہمجنس ہوتی۔ جیسے دوسری جاندار چیزیں انسان کو غیر جنس تھیں۔ ویسے یہ بھی ہوتیں۔ **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس جنّت میں آدم علیہ السلام کو رکھا گیا تھا۔ وہ بہشت بریں نہ تھی بلکہ کوئی اور باغ تھا چند وجہ سے **ایک** یہ کہ اگر یہ بہشت بریں ہوتا۔ تو آدم علیہ السلام وہاں سے باہر نہ آتے۔ کیونکہ وہاں ہمیشگی ہے۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا **جواب** جب ثواب کے لئے بہشت میں داخلہ ہوگا۔ تو وہاں ہمیشگی ہوگی۔ اس وقت آدم علیہ السلام کا وہاں رہنا ثواب کے لئے نہ تھا۔ فرشتے بھی وہاں جاتے آتے رہتے ہیں۔ اور ادریس علیہ السلام بھی وہاں گئے ہوئے ہیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی معراج کی رات وہاں تشریف لے گئے۔ شہیدوں کی روحیں بھی جنت میں رہتی ہیں۔ مگر اس رہنے میں ہمیشگی نہیں ہے۔ اسی لئے حضور علیہ السلام جنّت سے دنیا میں واپس تشریف لائے۔ ادریس علیہ السلام اور شہدا کی روحیں بھی قیامت میں وہاں سے باہر آئیں گی۔ پھر فیصلہ ہونے کے بعد وہاں ثواب کیلئے جاویں گی۔ **دوسری وجہ** یہ کہ شیطان کو سجدے سے انکار کرتے ہی جنّت سے نکال دیا گیا تھا۔ پھر وہ آدم علیہ السلام کو دھوکہ دینے وہاں کس طرح پہنچ سکا۔ نیز جنّت شیطان کی جگہ ہی نہیں ہے۔ وہ تو نیک کاروں کی جگہ ہے۔ **جواب**۔ اس کا تفصیلی جواب تو انشاءاللہ اگلی آیت میں آئے گا۔ یہاں اتنا سمجھ لو۔ کہ اگر اُس وقت شیطان جنت میں گیا بھی ہو۔ تو وہاں ثواب کے لئے نہ گیا۔ بلکہ اور مقصد کے لئے بے شک مسجد نمازیوں کی جگہ ہے مگر بعض لوگ جُوتے چرانے کے لئے بھی وہاں آجاتے ہیں۔ وہاں شیطان بھی چوری کرنے کے لئے گیا۔ نیز جنّت وغیرہ اعلیٰ مقامات سے شیطان چند بار نکالا گیا ہے۔ ایک تو سجدے کا انکار کرتے ہی۔ اس نکالنے کا مقصد یہ تھا۔ کہ وہاں اُس کا مقام نہ رہا چھپ چھپا کر جانا آنا۔ باقی رہا۔ جیسے نکالا ہوا مجسٹریٹ بھی کچہری میں عام لوگوں کی طرح جا سکتا ہے۔ لیکن دوسری نوعیت سے پھر جب آدم علیہ السلام وہاں سے اُتارے گئے۔ تو شیطان کا داخلہ جنّت بھی بند ہو گیا۔ لیکن پھر بھی آسمانوں پر جاتا آتا رہا۔ اور فرشتوں کی گفتگو سنتا رہا۔ اور کاہنوں کو جھوٹ سچ ملا کر اُس کی خبر دیتا رہا پھر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے وہاں سے بھی روک دیا گیا۔ اب جانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر پلٹ کر واپس آتا ہے۔ اس کی پوری تحقیق انشاءاللہ سورہ جنّ میں کی جائے گی **تیسری وجہ** یہ کہ بہشت میں شرعی احکام جاری نہیں اور نہ وہاں کسی چیز سے روک ٹوک ہے۔ اور آدم علیہ السلام کو ایک درخت سے روکا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ کوئی اور باغ تھا۔ نہ کہ بہشت بریں **جواب** جنّت کی یہ صفت بھی جب ہی ہوگی۔ جب لوگ ثواب کے لئے وہاں داخل ہوں گے **چوتھی وجہ** یہ ہے۔ کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جنّت میں آدم علیہ السلام سوئے تب اُن کی پسلی سے حضرت حوا پیدا ہوئیں اور بہشت بریں میں کسی کو نیند نہیں۔ کیونکہ نیند ایک قسم کی موت ہے۔ اور وہ جگہ موت سے پاک **جواب** جنّت کا یہ وصف بھی جب ہی ہوگا۔ جب ثواب کے لئے وہاں داخلہ ہوگا **تیسرا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہؤا۔ کہ ممنوعہ درخت کا کھانا ظلم تھا۔ آدم علیہ السلام نے بھی اپنے اس ظلم کا اقرار کیا۔ کہ عرض کیا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا دوسری جگہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ یعنی میری نبوّت ظالموں کو نہ پہنچے گی۔ اِن دونوں آیتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ آدم علیہ السلام نبی نہ تھے۔ کیونکہ اُن سے ظُلم سرزد ہؤا۔ اور ظالم نبی نہیں ہو سکتا۔ **جواب** اس کے نہایت مفصل مکمل جواب کے لئے ہماری کتاب "قہر کبریا بر منکرین عصمت انبیاء" دیکھو جس میں اس جیسے بہت سے سوالوں کے جواب دے دیئے گئے ہیں۔ اور کچھ تفصیل اگلی آیت میں بھی کی جائیگی۔ یہاں اس قدر سمجھ لو۔ کہ قرآن پاک میں ظلم چند معنی میں استعمال ہؤا ہے۔ بمعنی کفر و شرک بمعنی ستانا بمعنی فسق فجور بمعنی حد سے آگے بڑھنا وغیرہ وغیرہ اس آیت میں ظلم کے معنی حد سے نکلنا یا کسی چیز کو بے موقع استعمال کرنا ہے۔ آیت ربّنا ظلمنا میں ظلم سے مُراد خطاء لغزش ہو جاتا ہے۔ اور لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ میں ظلم سے مراد بدکاری اور فسق و فجور ہے یعنی

بدکاروں فاسقوں کو نبوت نہیں ملے گی. قرآن کریم نے سیدنا آدم علیہ السلام کی پاک دامنی کا ہر جگہ اعلان فرمایا. کہیں فرمایا. کہ وہ بھول گئے. کہیں فرمایا. کہ اُن کو شیطان نے بہکا دیا. وغیرہ وغیرہ یہ اعتراض تو ایسا ہوا. جیسے کوئی کہہ دے. کہ اللہ مومن ہے. قرآن سے ثابت ہے. اور ہر مومن ہمارا بھائی ہے یہ بھی قرآن سے ثابت ہے. لہٰذا اللہ ہمارا بھائی ہے. جیسے یہاں مومن کے چند معنی میں فرق نہ کیا گیا. ایسے یہاں بھی **تفسیر صوفیانہ** اس خطاب سے اشارۃً معلوم ہو رہا تھا. کہ آدم علیہ السلام کا یہ قیام دائمی نہ ہوگا. کیونکہ جس کو ہمیشہ رکھنا ہو اُس کو کسی چیز سے روکا نہیں جاتا. یہ بھی سمجھ میں آ رہا تھا. کہ اُن سے یہ خطا ضرور ہوگی. یہ بھی معلوم ہو رہا تھا. کہ اِن کو زمین میں جانا ہوگا. کیونکہ وہ زمین ہی کی خلافت کے لئے پیدا فرمائے گئے تھے. اس لئے رب نے اُن کو امتحان کا خطاب فرمایا. اور اُن کی عزت افزائی کے لئے اُس درخت سے روکا کیونکہ فرمایا اے آدم تمہارے لئے ساری جنت اور وہاں کی نعمتیں مباح ہیں. مگر اس درخت کے پاس نہ جانا کیونکہ یہ درخت محبت اور معرفت کا ہے جس کے لئے محنت لازم ہے. اور یہ منع کرنا ہی اُن کے کھانے کا سبب بنا کیونکہ انسان ممنوعی چیز کی طرف زیادہ رغبت کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آدم علیہ السلام نے وہ درخت کھا لیا جس کے کھاتے ہی خلافت اور محبت اور محنت کے اسرار کھل گئے اور جمال و جلال کا ظہور شروع ہو گیا. خدا کی صفت توابی. ستاری غفاری. قہاری وغیرہ جو کہ اب تک دُرِّ مکنون کی طرح راز میں تھیں. ظاہر ہونے لگیں. کیونکہ اس درخت کے کھانے سے وہ خطا کار قرار دیئے گئے جس سے کہ انہیں توبہ کرنی پڑی اور اس توبہ سے اُن کو حق تعالےٰ کی طرف سے محبت اور طہارتِ قلبی کے انعام عطا ہوئے. اس پر قرآن گواہ ہے. کہ فرماتا ہے. اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ اس ممانعت سے یہ سبب نسیان عصیاں ہوا عصیاں سے توبہ توبہ سے محبت الٰہی اور محبت سے طہارت غرضکہ اس ممانعات میں ہزار ہا راز اور اس ربانی عتاب اور سیدنا آدم علیہ السلام کی ندامت و توبہ میں ہزاروں ناز و انداز (تفسیر روح البیان) اور سچ تو یہ ہے کہ سارے عالم کا ظہور اُن کی خطا کی برکت ہے. اُن حضرات کی خطائیں اور ہماری عبادتوں سے افضل ہیں. کیونکہ اُن کی خطا سے رب کی عطا ہوتی ہے. حضرت فاروق اعظم کی خطا سے قیامت تک کے مسلمانوں کو رمضان کی راتوں میں اپنی بیویوں سے جماع کرنیکی اجازت ملی حضرت ابو امیہ ضمری رضی اللہ عنہ کے منہ سے مجبوراً کلمۂ کفر نکال دینے کی برکت سے ہمیشہ کیلئے مسلمانوں کو ایسی مجبوری میں اس کی اجازت ملی. اسی لئے مولانا فرماتے ہیں ؎

ہر چہ گیرد علتی علت شود      کفر گیرد ملتی ملت شود

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ

پس پھسلا دیا اُن دونوں کو ابلیس نے اُس سے پس علیحدہ کر دیا. اُن کو اُس سے کہ تھے وہ بیچ اُس کے اور کہا ہم نے اُتر جاؤ بعض تمہارے

تو شیطان نے جنت سے اونہیں لغزش دی اور جہاں رہتے تھے. وہاں سے اُنہیں الگ کر دیا. اور ہم نے فرمایا نیچے اترو آپس میں ایک

لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾

واسطے بعض کے دشمن ہیں اور واسطے تمہارے بیچ زمین کے ٹھہرنا اور نفع پانا ہے طرف ایک وقت کے

تمہارا دوسرے کا دشمن اور تمہیں ایک وقت تک زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے.

**تعلق:** اس آیت کا پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے. **ایک** یہ کہ اس میں بھی حق تعالےٰ کی ایک خاص اُس نعمت کا ذکر ہے. جو ہم کو حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعے عطا ہوئی یعنی اُن کا جنت سے باہر تشریف لانا. کیونکہ یہ تشریف آوری ہزاروں نعمتوں کی اصل ہے. البتہ اتنا فرق ہے. کہ پچھلی آیتوں میں اُن نعمتوں کا ذکر تھا جو ظاہر و باطن ہر طرح نعمت تھیں یعنی اُن کا خلیفہ ہونا. اور مسجود ملائکہ بننا وغیرہ وغیرہ اس آیت میں اُس نعمت کا ذکر ہے. جو بظاہر زحمت ہے اور حقیقتاً رحمت **دوسرے** یہ کہ پہلی آیتوں میں دائمی نعمتوں کا ذکر تھا یعنی خلافت وغیرہ اور جنت کا داخلہ عارضی اور منقطع ہونے والی نعمت تھی جس کا اس سے پہلے ذکر ہوا. اب اس آیت میں اس عارضی نعمت کے ختم ہونے کے اسباب کا ذکر فرمایا جا رہا ہے.

**تفسیر** فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ. اَزَلَّ زَلَّةٌ سے بنا ہے. اس کے چند معنی ہیں دُور ہونا. لے جانا. پھسل جانا. اسی لئے مَزَلّ پھسلنی زمین

کو کہتے ہیں۔ کہ جس پر قدم نہ ٹھہرے یہاں تینوں معنی بن سکتے ہیں یعنی شیطان نے ان آدم و حوا کو لغزش دے دی یا جنّت سے دُور کر دیا یا وہ اُن کو جنّت سے لے گیا۔ بہرحال یہ لفظ بتا رہا ہے۔ کہ حضرت آدم و حوّا سے جو کچھ ہوا وہ خطاءً ہوا نہ کہ جان بوجھ کر **اگرچہ** فاعل حقیقی تو رب تعالیٰ ہے لیکن چونکہ ان افعال کا شیطان سبب بنا۔ اس لئے اُس کی طرف نسبت کر دی گئی۔ اس بہکانے کا **واقعہ یہ ہوا**۔ کہ شیطان کے دل میں آدم علیہ السلام کی طرف سے سخت حسد پیدا ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ اِن کی فکر میں رہتا تھا۔ ایک دفعہ موقعہ پاکر یا تو جنّت میں خود پہنچا اس لئے کہ اگرچہ وہ جنّت سے نکالا جا چکا تھا۔ مگر اب تک اُس کا وہاں جانا آنا بند نہ ہوا تھا۔ اور یا اس طرح گیا۔ کہ جنّت میں مور اور سانپ نہایت خوبصورت جانور تھے۔ اور یہ دونوں آدم علیہ السلام کی خدمت کیا کرتے تھے۔ شیطان جنّت کے دروازے کے باہر پہنچا اُدھر مور بھی دروازہ بہشت پر آیا ہوا تھا۔ شیطان اور مور نے آپس میں مشورہ کیا۔ کہ کسی صورت سے آدم اور حوّا علیہم السلام کو دروازۂ بہشت تک لے آنا چاہیئے اُدھر شیطان نے سانپ سے مشورہ کیا۔ کہ تو مجھ کو اپنے منہ میں لیکر جنّت کی دیوار پر اس وقت پہنچا دینا جبکہ آدم علیہ السلام دروازے پر آئے ہوئے ہوں۔ یہ تجویز طے ہونے کے بعد مور نے حضرت آدم و حوّا کے سامنے ناچنا شروع کیا۔ یہ دونوں حضرات اس رقص کے دیکھنے میں مشغول ہوئے۔ مور ناچتے ناچتے پیچھے ہٹنے لگا۔ یہ دونوں صاحب اُس کی طرف آگے بڑھنے لگے۔ یہاں تک کہ مور ناچتا ہوا دروازۂ جنّت پر آگیا۔ جس کے ساتھ ہی ساتھ یہ دونوں صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ ادھر سانپ بھی تیار کھڑا تھا۔ شیطان کو فوراً اپنے منہ میں لے کر جنّت کی دیوار پر چڑھ گیا۔ اس ترکیب سے شیطان آدم علیہ السلام کے سامنے آگیا۔ اور اُس کو کچھ اِن سے گفتگو کرنے کا موقعہ مل گیا۔ لہٰذا شیطان تو جنّت سے باہر رہا۔ آدم علیہ السلام اندر اور پھر اُن کی گفتگو ہوگئی۔ تفسیر کبیر میں اس قصے پر کچھ جرح فرمائی ہے۔ مگر تفسیر عزیزی نے بلا جرح اس کو نقل فرمایا۔ کچھ بھی ہوا ہو۔ بہرحال شیطان اُن کے روبرو پہنچ گیا۔ اور جاکر عرض کی کہ مجھ سے آپ کی جناب میں بڑی بے ادبی ہوئی۔ کہ میں نے آپ کو سجدہ نہ کیا جس کے سبب میں ملعون ہوگیا۔ اب میں چاہتا ہوں۔ کہ اُس گناہ کا کفارہ ادا کروں۔ اور آپ کو ایسے مرتبے کی طرف پہنچادوں جس سے آپ مجھ سے راضی ہو جائیں۔ اور آپ کو مجھ پر جو غصّہ ہے وہ جاتا رہے۔ یہ کہہ کر بولا کہ آپ اپنی اِس تعظیم اور تکریم پر فریفتہ نہ ہو جائیں۔ کیونکہ آپ کو آخر کار موت آنے والی ہے جس سے کہ یہ تمام عیش و آرام ختم ہو جائیں گے حضرت آدم نے پوچھا کہ موت کیا چیز ہے۔ شیطان مردہ جانور کی طرح اُن کے سامنے پڑ گیا اور جانکنی کے وقت جو حالت ہوتی ہے۔ ہاتھ پاؤں ٹپکنا روح کا نکلنا تڑپنا وغیرہ اُن کو دکھلایا۔ یہ دونوں حضرات اِس حالت کو دیکھ کر ڈر گئے۔ اور اُس سے پوچھنے لگے۔ کہ کیا اس موت سے بچنے کی کوئی تدبیر ہے۔ اُس نے کہا۔ کہ ہاں قرآن کریم نے خود اُس کا کلام نقل فرمایا۔ کہ هَلْ اَدُلُّكُمَا عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى یعنی میں تم کو ایسے درخت کا پتہ بتاتا ہوں کہ جو اُسے کھالے ہرگز نہ مرے۔ اور اُس کی بادشاہت بھی فنا نہ ہو۔ اُنہوں نے پوچھا۔ کہ وہ کون درخت ہے۔ اُس نے وہی درخت بتایا جس سے ان صاحبوں کو منع کیا گیا تھا۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ یہ درخت تو سلطنت جانے کا سبب ہے۔ ہم کو حق تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے۔ اگر ہم یہ درخت کھالیں۔ تو اُس کے عتاب میں آجائیں گے۔ اگر یہ فائدے مند ہوتا۔ تو ہم کو اُس کے پاس جانے سے کیوں منع فرمایا جاتا۔ شیطان نے کہا مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ۔ یعنی رب تعالیٰ نے تم کو اس درخت سے اس لئے منع نہیں کیا ہے۔ کہ اس سے تمہیں کچھ نقصان پہنچے گا۔ بلکہ اس لئے کہ تمہیں خلافت کیلئے پیدا کیا گیا۔ اور خلافت وہی کرسکتا ہے۔ جو کہ حق تعالیٰ کے ذکر کے علاوہ دوسری فکروں میں بھی مشغول رہے اور حق تعالیٰ سے کچھ دُور بھی رہے فرشتوں کی طرح صرف عابد اور رب سے بالکل قریب نہ ہو۔ اس درخت میں یہ تاثیر ہے۔ کہ جو کوئی یہ کھالیتا ہے۔ وہ فرشتہ بن جاتا ہے۔ پھر اُس سے خلافت کا بوجھ نہیں اُٹھ سکتا۔ دیکھو بادشاہ اُسی شخص کو کہیں کا حاکم بنا کے بھیجتا ہے۔ جو کہ بادشاہ کی دوری گوارہ کرسکے نیز اس درخت کا کھانیوالا کبھی بہشت سے نہیں نکل سکتا۔ اور یہاں موت نہیں۔ چونکہ تمہیں خلیفہ کرنا منظور ہے۔ اور خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جس کو موت بھی آسکے تاکہ خلافت اُس کی نسل میں جاری ہو۔ غرضکہ حق تعالےٰ کی یہ ممانعت نہی تنزیہی ہے۔ نہ کہ تحریمی اور نہی تنزیہی کی مخالفت گناہ نہیں اور نہی تنزیہی کی پہچان ہی یہ ہے۔ کہ جو انسان کے دینوی فائدے کی خاطر کی جائے (جیسے قرآن شریف میں ہے۔ وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا قرض کم ہو یا زیادہ اُس کے لکھنے میں میں کوتاہی نہ کرنا) یہ کہہ کر قسمیں کھا گیا۔ کہ میں تمہارا بڑا ہی خیر خواہ ہوں۔ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّىْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ حضرت آدم علیہ السلام

کو اُس کی قسموں پر اعتبار آگیا۔ وہ سمجھے کہ کسی میں یہ ہمت ہی نہیں کہ رب تعالٰے کی جھوٹی قسم کھائے۔ خیال رہے۔ کہ شیطان نے حضرت آدم و حوّا کو ایک دم نہیں بہکایا۔ بلکہ حضرت حوّا کو پہلے اور بعد میں آدم علیہ السلام کو اسی طرح پہلے وہ درخت حضرت حوّا نے کھایا پھر آدم علیہ السلام نے (تفسیر عزیزی) عَنْهَا اس ضمیر کا مرجع یا جنت ہے یا درخت یعنی شیطان نے اُن آدم و حوّا کو جنّت سے لغزش دے دی یا اُس درخت کے متعلق فَاَخْرَجَهُمَا اس سے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ شیطان اپنی کوشش میں ناکام رہا کیونکہ اُس کا مقصود یہ نہ تھا۔ کہ آدم علیہ السلام صرف جنت سے باہر ہو جائیں۔ بلکہ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے درجے سے گر جائیں۔ اس میں وہ کامیاب نہ ہؤا کیونکہ آدم علیہ السلام جنّت سے باہر تو آ گئے۔ مگر اُن کا درجہ اور زیادہ ہو گیا۔ پھر قرآن کریم نے فرمایا فَتَابَ عَلَيْهِ، مِمَّا كَانَا فِيْهِ اس میں بھی بہت پُر لطف نکتہ ہے۔ وہ یہ کہ یہاں مِنَ الْجَنَّةِ نہ فرمایا گیا۔ بلکہ اتنی بڑی عبارت ارشاد ہوئی۔ تاکہ معلوم ہو جائے۔ کہ آدم علیہ السلام جنّت سے بالکل محروم نہ ہوئے۔ بلکہ اُن کا وہ عارضی قیام جاتا رہا جو وہاں تھا۔ اور اُن کو وہاں بھیجا گیا۔ جہاں کی خلافت کے لئے انہیں پیدا کیا گیا تھا۔ لہٰذا یہ شر اُن کے لئے سبب خیر بنی وَقُلْنَا اهْبِطُوْا اهْبِطُوْا صیغہ جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ تم سب نیچے اُتر جاؤ۔ یا تو اس میں خطاب آدم علیہ السلام کو اور اُن کی اُن اولاد کو ہے۔ جو اُس وقت اُن کی پیٹھ میں تھے یعنی اے سارے انسانو۔ تم سب جنّت سے اُتر جاؤ۔ یا پانچ چیزوں سے حضرت آدم اور حضرت حوّا اور شیطان اور مور اور سانپ خیال رہے۔ کہ اِن سب کو اترنے کا حکم یکساں دیا گیا ہے لیکن اُن کی نوعیتوں میں بڑا فرق ہے۔ آدم علیہ السلام اُتر کر اپنی دار السلطنت یعنی زمین پر تشریف لائے یا اپنے جسمانی وطن میں آئے۔ کیونکہ اُن کا جسم پاک زمین سے ہی بنا تھا۔ شیطان وغیرہ فساد برپا کرنے کے لئے پردیس میں آیا۔ یا یوں سمجھو کہ مسلمان کمانے کے لئے زمین پر بھیجے گئے اور کفار اپنی کمائی فنا کرنے کیلئے یہ بھی خیال رہے۔ کہ شیطان کا یہ نکلنا دوبارہ ہے۔ کہ جس کے بعد اُس کا جنّت میں داخلہ ہی بند ہو گیا۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اُس میں یا تو انسانوں سے خطاب ہے۔ کہ بعض انسان بعض کے دشمن ہیں۔ کافر مومنوں کے بدبخت نیک بختوں کے جاہل۔ عالموں کے فاسق فاجر۔ لوگ دین داروں کے ہمیشہ دشمن رہیں گے۔ اور یا اُن پانچوں سے خطاب ہے۔ جو جنّت سے باہر آئے یعنی شیطان انسان کا دشمن اور انسان شیطان کا اسی طرح سانپ انسان کا اور مور کا دشمن انسان و مور سانپ کا بَعْضُكُمْ اس لئے فرمایا۔ کہ ان میں سے سب ایک دوسرے کے دشمن نہ ہوں گے۔ چنانچہ مرد و عورت آپس میں دشمن نہیں اسی طرح مور اور انسان یا سانپ اور شیطان آپس میں دشمن نہیں۔ نیز بعض انسان اپنی حماقت بیوقوفی سے سانپ یا شیطان سے محبت کر لیتے ہیں۔ نیز مومنین آپس میں دوست ہیں۔ اور کفار آپس میں لہٰذا نہ تو تمام افراد ایک دوسرے کے دشمن نہ تمام نوعیں وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ اس سے معلوم ہؤا۔ کہ سب کا ٹھہرنا زمین ہی میں ہے۔ بعض زمین کے اوپر جیسے کہ زندے انسان اور بعض زمین کے اندر جیسے جنات اور سانپ اور اگر کچھ دیر کے لئے انسان یا مور۔ درخت یا ہوا میں بھی رہ لے تب بھی وہ زمین پر ہی ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں زمین پر ہیں۔ غور کیا جائے۔ تو سب چیزیں زمین پر چند طریقے سے رہتی ہیں۔ کبھی باپ کی پیٹھ میں کبھی ماں کے رحم میں زندگی میں زمین کے اوپر اور بعد موت زمین کے اندر وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ۔ اس میں یہ بتایا گیا۔ کہ تمہارے سارے زندگی کے سامان غذا لباس وغیرہ زمین ہی سے پیدا ہوں گے۔ اور تم اِن سے نفع حاصل کرو گے۔ مگر ہمیشہ نہیں۔ بلکہ خاص وقت تک یا تو موت تک یا قیامت تک اس سے معلوم ہؤا۔ کہ زمین میں ہمیشہ کوئی نہ رہے گا۔ سب یہاں سے منتقل کر کے مختلف مقامات میں بھیج دیئے جائیں گے۔ مومن انسان جنت میں اور کفار دوزخ میں اور باقی جانور وغیرہ مٹی بنا کر فنا کر دیئے جائیں گے۔ اس میں آدم علیہ السلام کو خوشخبری دی گئی۔ کہ جس طرح آپ کا جنّت میں یہ قیام عارضی تھا۔ اسی طرح زمین میں رہنا بھی عارضی ہوگا۔ پھر آپ کو یہاں ہی بلایا جائیگا۔ پھر آپ مستقل یہاں ہی رہیں گے۔ خلاصۂ تفسیر۔ اس سے پہلے آدم علیہ السلام کی جنّت میں جانے اور شیطان کے وہاں سے نکل جانے کا واقعہ بیان کیا جا چکا۔ اب فرمایا گیا۔ کہ اُس جانی دشمن یعنی شیطان نے کسی صورت سے حضرت آدم و حوّا کے پاس جا کر اُن کو سبز باغ دکھائے اور بہت دلیلوں سے سمجھایا۔ کہ یہ درخت تمہارے لئے فائدہ مند ہے۔ اور قسمیں کھا کر انہیں اطمینان دلایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں جس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ آدم علیہ السلام اُس کے دھوکے میں آ گئے۔ ممانعات الٰہی کے اصل مقصد کو بھول گئے۔ اُس درخت کو کھا لیا۔ آخر شیطان نے اُن کو علیحدہ ہی کر دیا۔ ہم نے بھی انہیں حکم دے دیا۔ کہ اب

تم سب کے سب زمین پر اُتر جاؤ اور وہاں آپس کی عداوت کی تکلیف اٹھاؤ اور موت تک وہیں رہو۔ اور وہاں ہی کماکر کھاؤ۔

## آدم علیہ السلام کا جنّت سے باہر تشریف لانا

آدم علیہ السلام کے جنّت سے تشریف لانے کا مختصر واقعہ جو قرآن کریم اور احادیث شریفہ اور محدثین و مؤرخین سے ثابت ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ حضرت حوّا نے پہلے خود وہ دانہ کھایا۔ اور بعد میں حضرت آدم کو کھلایا۔ اُس کھانے کا اثر یہ ہوا کہ ان کے جسموں سے جنتی لباس جاتا رہا۔ اور وہ حضرات برہنہ رہ گئے۔ مارے شرم کے انجیر کے درخت کے پتوں سے اپنے جسموں کو چھپانے لگے۔ اسی حالت میں رب کی طرف سے ندا آئی کہ اے آدم و حوّا۔ کیا ہم نے تم کو اس درخت سے منع نہ کیا تھا۔ اور کیا تم سے نہ کہا تھا۔ کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس کے فریب میں نہ آنا۔ یہ حضرات عذر کے سوا اور کیا عرض کر سکتے تھے۔ پھر فرشتوں کو حکم ہوا کہ ان سب کو زمین پر اُتار دو چنانچہ آدم علیہ السلام کو ہندوستان میں شہر سراندیپ کے اس پہاڑ پر اتارا گیا جس کو نوذ کہتے ہیں۔ اور حضرت حوّا کو ساحل عرب پر جدّے میں اور مور کو مرج الہند میں اور شیطان کو جنگل میسان میں جو کہ بصرے سے کچھ فاصلے پر ہے۔ یا وہاں جہاں اب یاجوج ماجوج کی دیوار قائم ہے۔ سانپ کو مقام سجستان یا اصفہان میں اسی لئے وہاں اب بھی سانپ زیادہ ہوتے ہیں حضرت آدم علیہ السلام کو کھیتی باڑی کرنے اور معاش حاصل کرنے کی تکلیف دی گئی حضرت حوّا کو حیض و حمل اور کمی عقل اور نقصان میراث ملا۔ سانپ کے پاؤں غائب کر دیئے گئے۔ اور اُس کو پیٹ کے بل چلایا گیا۔ اور اُس کی غذا مٹی قرار دی گئی مور کے پاؤں بدشکل کر دیئے گئے۔ ابلیس کی صورت مسخ کر دی گئی۔ اور نہایت رسوا کر کے دنیا میں رکھا گیا۔ سیّدنا مولےٰ علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ ہندوستان کی زمین اس لئے عمدہ اور سرسبز بھری ہے۔ اور عود اور قرنفل وغیرہ خوشبوئیں اسی لئے وہاں پیدا ہوتی ہیں۔ کہ آدم علیہ السلام جب اُس زمین پر آئے۔ تو اُن کے جسم پر جنتی درخت کے پتے تھے۔ وہ پتے ہوا سے اُڑ کر جس درخت پر پہنچے وہ ہمیشہ کے لئے خوشبو دار ہو گیا آدم علیہ السلام جنّت سے مختلف قسم کے بیج اور تین قسم کے پھل اور حجر اسود (وہ سیاہ پتھر جو اب خانۂ کعبہ میں لگا ہوا ہے) اور وہ عصا جو بعد میں موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ آیا جس کی لمبائی دس گز تھی اپنے ساتھ لے کر آئے۔ اور کچھ سونا اور چاندی اور کچھ کھیتی باڑی وغیرہ کے اوزار بھی اپنے ساتھ لائے۔ آدم علیہ السلام اس قدر گریہ زاری میں مشغول ہوئے۔ کہ ان تخموں سے بے خبر ہو گئے۔ شیطان نے موقعہ پاکر اُن کو اپنا ہاتھ لگایا جس جس تخم پر اُس کا ہاتھ لگا۔ وہ زہریلا اور بے نفع ہو گیا۔ اور جو اُس کے ہاتھ سے محفوظ رہا اس کا نفع برقرار رہا سیّدنا آدم کے ساتھ تین قسم کے جنّتی میوے آئے۔ ایک وہ جو پورے کھالئے جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کا اوپری حصّہ کھالیا جاتا ہے۔ اور گٹھلی پھینک دی جاتی ہے۔ جیسے خرما وغیرہ تیسرے وہ جن کا اوپری چھلکا پھینک دیا جاتا ہے۔ اور اندرونی حصہ کھایا جاتا ہے صحیح روایت میں ہے۔ کہ اُن کے ساتھ تین لوہے کے اوزار بھی تھے۔ ایک سنڈاسی جس سے لوہا پکڑتے ہیں۔ دوسرے ہتھوڑا تیسرے اہرن نیز حجر اسود جب جنّت سے آیا تو اس کی روشنی کئی میل تک جاتی تھی جہاں تک اُس کی شعاعیں پہنچتی تھیں۔ اُسی حد تک حرم کی حدیں قائم ہوئیں۔ نیز آدم علیہ السلام کو دنیا میں آکر بہت وحشت اور گھبراہٹ ہوئی حضرت جبرائیل علیہ السلام بحکم الٰہی زمین پر آئے اور بلند آواز سے **آذان** کہی جب آدم علیہ السلام نے آذان میں حضور علیہ السلام کا نام سُنا تب ان کی وہ وحشت دُور ہوئی۔ یہ تمام واقعات صحیح احادیث سے ثابت ہیں جن کو شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی میں اسی مقام پر جمع فرمایا ہے۔ **ذریعہ معاش** اسی تفسیر عزیزی میں ہے۔ کہ سب سے اوّل کپڑا بننے کا کام آدم علیہ السلام نے کیا۔ اور بعد میں آپ کھیتی باڑی کے کام میں مشغول رہے نوح علیہ السلام کا ذریعہ معاش لکڑی کا کام تھا (بڑھئی پیشہ) ادریس علیہ السلام درزی گری، حضرت ہود اور صالح تجارت، حضرت ابراہیم علیہم السلام کھیتی باڑی حضرت شعیب علیہ السلام نے جانور پالنا اور اُن کے دودھ اور اُن سے معاش حاصل کرتے تھے حضرت لوط علیہ السلام کھیتی باڑی کرتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کچھ مدت بکریاں چرائیں۔ داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے سلیمان علیہ السلام اتنے بڑے بادشاہ ہو کر درختوں کے پتوں سے پنکھیاں اور زنبیلیں وغیرہ بنا کر گذر کرتے تھے عیسیٰ علیہ السلام نے کوئی پیشہ اختیار نہ فرمایا بلکہ ہمیشہ سیر فرماتے تھے اور فرماتے تھے کہ جس نے مجھے ناشتہ دیا ہے۔ وہی شام کا کھانا بھی دے گا۔ اسی تفسیر عزیزی میں ہے۔ کہ آدم علیہ السلام نے ہمیشہ بارش کا پانی پیا کوئیں کا پانی کبھی نہ پیا۔ سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے ہی چاندی سے روپیہ اور سونے سے اشرفیاں بنائیں۔

## آدم علیہ السلام کی وفات

جب آدم علیہ السلام کا وقتِ اخیر آیا۔ تو آپ کو جنتی میوے کھانے کی خواہش ہوئی۔ اپنے فرزندوں سے کہا۔ کہ کعبہ معظمہ میں جاؤ۔ اور وہاں دعا کرو۔ کہ اللہ تعالےٰ میری یہ تمنا پوری کرے۔ فرزندانِ آدم حکم پاکر وہاں پہنچے انہیں حضرت جبریل و دیگر فرشتے ملے جن سے انہوں نے آدم علیہ السلام کی فرمائش کا حال بیان کیا فرشتوں نے کہا ہمارے ساتھ آؤ ہم جنت کے میوے اپنے ساتھ لائے ہیں چنانچہ یہ سب آدم علیہ السلام کے پاس پہنچے حضرت حوا ان فرشتوں کو دیکھ کر ڈرنے لگیں اور چاہا کہ آدم علیہ السلام کے دامن میں چھپ جائیں۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ حوا اب تم مجھ سے الگ رہو۔ میرے اور رب کے قاصدوں کے درمیان آڑ نہ ہو۔ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی روح قبض کی اور ان کے بیٹوں سے کہا۔ کہ جس طرح ہم آپ کے والد کا کفن دفن کریں ویسے ہی تم بھی کیا کرنا۔ جبریل علیہ السلام جنت کی مرکب خوشبو اور جنتی حلے کا کفن اور بہشتی بیری کے کچھ پتے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اُن کو خود غسل دیا اور کفن پہنایا اور خوشبو ملی اور ملائکہ اُن کی لاشۂ مبارک کعبہ میں لائے۔ اور اُن پر سارے فرشتوں نے نمازِ جنازہ کی جس میں حضرت جبریل امام تھے۔ اور باقی فرشتے مقتدی اور اس نماز میں چار تکبیریں کہیں۔ جیسے کہ آج ہوتی ہیں۔ پھر مکہ معظمہ سے تین میل فاصلے پر مقام منیٰ میں لے گئے۔ جہاں کہ حاجی قربانی کرتے ہیں۔ اور اسی جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سیدنا اسمٰعیل کی قربانی کی وہاں مسجد خیف کے قریب بغلی قبر کھودی گئی۔ اور اُن کو دفن کر کے اُن کی قبر کو اونٹ کی پیٹھ کی طرح ڈھلواں بنایا بعض روایت میں یہ بھی آیا ہے۔ کہ ان کی لاشۂ مبارک کو ان کی اولاد میں سے ڈیڑھ سو آدمی خانہ کعبہ میں لائے۔ لہٰذا آدم علیہ السلام کی قبر منیٰ میں مسجد خیف کے پاس ہے۔ اور حضرت حوا کی قبر جدّے شریف میں اسی طرح تفسیر عزیزی میں حضرت مجاہد سے روایت ہے۔ ان کے کچھ اور واقعات انشاء اللہ اگلی آیت میں بھی آئیں گے۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ کوئی شخص اپنے سے شیطان کو دُور نہ جانے اور نہ اپنے تقوے اور پرہیز گاری کا بھروسہ کرے۔ دیکھو اس نے ایک پیغمبر کو جنت میں پہنچ کر فریب دیا۔ **دوسرے** یہ کہ شیطان بڑے بڑوں کو عورتوں کے ذریعے پھانستا ہے۔ روائت میں آیا ہے۔ کہ عورتیں شیطان کی رسیاں ہیں۔ دیکھو سیدنا آدم کو حضرت حوا کے ذریعے درخت کھلایا **تیسرے** یہ کہ خطا کی وجہ سے اللہ کی نعمتیں چھین لی جاتی ہیں۔ سیدنا آدم کی ایک خطا سے جنت کی ساری نعمتیں دُور ہو گئیں **چوتھے** یہ کہ اگرچہ ساری چیزیں رب ہی کی طرف سے ہیں لیکن ادب یہ ہے۔ کہ برائیوں کو اپنے یا شیطان کی طرف نسبت کرے۔ اور بھلائیوں کو رب کی طرف دیکھو اس جگہ آدم علیہ السلام کے جنت سے علیحدہ ہونے کو شیطان کی طرف نسبت دی گئی۔ اور خود آدم علیہ السلام نے اپنی خطا کو اپنی طرف نسبت دی۔ کہ عرض کیا۔ کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا ہاں شیطان نے کہا بِمَا اَغْوَيْتَنِىْ یعنی خدایا تُو نے مجھے گمراہ کر دیا اس لئے وہ تو مردود ہوا۔ اور آدم علیہ السلام محبوب رہے۔ **پانچویں** یہ کہ دشمن سے غافل نہیں رہنا چاہیئے وہ ہمیشہ تاک میں رہتا ہے۔ جیسے کہ شیطان آدم علیہ السلام کے پیچھے پڑا رہا **چھٹے** یہ کہ ہر ایک کی عمدہ باتیں سُن کر دھوکہ نہ کھانا چاہیئے کیونکہ بہت دفعہ زبان دل کے خلاف ہوتی ہے شیطان نے کتنی اچھی باتیں کیں مگر دل میں حسد تھا۔

**پہلا اعتراض**۔ آدم علیہ السلام نے ہم کو جنت سے نکالا خطا تو انہوں نے کی اور اُس کو بھگت ہم رہے ہیں (عام بے دین) حافظ شیرازی کہتے ہیں۔ شعر۔ من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود ٭ آدم آورد دریں دیر خراب آبادم۔ **جواب**۔ یہ بالکل غلط ہے۔ بلکہ تم جیسے بے دینوں نے آدم علیہ السلام کو جنت سے باہر کیا۔ کیونکہ تم اُن کی پُشت میں تھے۔ اور جنت بے دینوں کی جگہ نہیں ہے۔ اس لئے مرضیٔ الٰہی یہ ہوئی۔ کہ آدم علیہ السلام ان بے دینوں کو زمین پر پھینک آئیں۔ پھر ہمیشہ کے لئے جنت میں تشریف لائیں انسان کو پلیدی پائخانہ میں لے جاتی ہے۔ نہ کہ پلیدی کو انسان یعنی جب حاجت ہوتی ہے۔ تب اُس کو نکالنے کے لئے پائخانہ جانا پڑتا ہے۔ حافظ شیرازی کے شعر کا مطلب غلط سمجھا وہ یہ فرما رہے ہیں۔ کہ میں اس سے پہلے عالم ارواح میں نہایت بے فکری میں تھا میرے ماں و باپ مجھ کو دنیا میں لے آئے۔ آدم سے مراد انسان ہے جس کا مطلب یہ ہوا شعر

میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں نہ اس کا بھید سمجھایا گیا ہوں

یا یہ کہ حافظ صاحب یہ مضمون آدم علیہ السلام کی طرف سے فرما رہے ہیں یعنی آدم علیہ السلام کہتے ہیں۔ کہ میں بہشت بریں میں رہتا تھا لیکن میری بعض

اولاد مجھ کو یہاں اُتار لائی. آدم بمعنی انسان کیونکہ ظاہر ہے. کہ جنّت میں آدم علیہ السلام رہتے تھے. نہ کہ حافظ صاحب **دوسرا اعتراض** پہلی آیت سے معلوم ہوا. کہ حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ساری چیزوں کے نام اُن کے خواص اور سارے حالات کی تعلیم فرمادی تھی تعجب ہے کہ شیطان نے اُس درخت کے متعلق غلط خبر دے دی اور آدم علیہ السلام نے قبول کر لی. آدم علیہ السلام کو تو خبر ہونی چاہیئے تھی. کہ اس درخت کے وہ خواص نہیں ہیں جو شیطان بیان کر رہا ہے پھر تعجب ہے. کہ شیطان کو اپنا دوست کیسے سمجھ گئے. انہیں تو اس کے کفر و ایمان کا بھی پتہ ہونا چاہیئے تھا. کیونکہ وہ سب کے سارے حالات سے واقف تھے. **جواب**. اس کے دو جواب ہیں **ایک** یہ کہ شعر ہونیوالا ہوتا ہے جب کوئی کار ؛ غیب سے ہوتے ہیں اسباب آشکار یہ سب باتیں آدم علیہ السلام کے علم میں تھیں مگر ہونیوالی بات ہو کے رہتی ہے. جب یہ موقع آیا سب کچھ بھول گئے. جیسے قرآن کریم فرما رہا ہے فَنَسِیَ آدم علیہ السلام بھول گئے. جاننا اور چیز ہے. اور علم کا حضور دوسری چیز انہیں اُس وقت علم تھا حضور نہ رہا. جیسے کہ دنیا میں سب جانتے ہیں. کہ حضور علیہ السلام شفیع المذنبین ہیں. مگر قیامت کے دن عیسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی نبی ولی قطب غوث کو یہ خیال نہ رہے گا. اور اِدھر اُدھر کسی شفاعت کرنیوالے کو ڈھونڈتے پھریں گے. اور سوا عیسیٰ علیہ السلام کے کوئی پیغمبر شفیع المذنبین کا صحیح پتہ نہ دیں گے. **دوسرا جواب** یہ ہے. کہ آدم علیہ السلام کو جس طرح اور سب باتیں معلوم تھیں ایسے ہی اپنا یہ سارا واقعہ بھی معلوم تھا. کہ ایسا ہو کر رہے گا. اس لئے شیطان سے بہت جرح نہ کی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ جب کربلا کی طرف روانہ ہوئے. تو لوگوں نے ڈرا کر روکنا چاہا. تو فرمایا کہ میں خود نہیں جا رہا ہوں مجھے کوئی لئے جا رہا ہے. صاحب اسرار حضرات مرضیٔ الٰہی پا کر دانستہ کو نادانستہ بنا دیتے ہیں. اس کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں **تیسرا اعتراض** آدم علیہ السلام سے یہ گناہ سرزد ہوا. پھر انہیں معصوم کیونکر کہا جا سکتا ہے. حق تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے. فَعَصٰٓی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی یعنی آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی نافرمانی کی خود انہوں نے بھی عرض کیا. کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا جس سے معلوم ہوا. کہ انبیاء کو معصوم ماننا غلط ہے **جواب** اس کا تفصیلی جواب ہماری کتاب "قہر کبریائی" میں دیکھو یہاں اتنا عرض کئے دیتے ہیں. کہ اہل سنت والجماعت کے نزدیک انبیاء اکرام کفر و شرک اور عمداً گناہ کبیرہ اور ایسے گناہ صغیرہ سے ہمیشہ معصوم رہتے ہیں. جو نبوّت کی شان کے خلاف ہیں. ہاں خطاءً یا بھول کر ایسا صغیر گناہ سرزد ہو سکتا ہے جس سے کہ شانِ نبوّت میں فرق نہ آئے. حضرت آدم علیہ السلام سے یہ جو کچھ ہوا یا تو بھول کر ہوا. یا خطائے اجتہادی کی وجہ سے مگر چونکہ نیکوں کی بھلایاں بھی مقربین کے درجے کے لحاظ سے برایاں ہوتی ہیں. اسلئے اِن خطاؤں کو بھی وہ حضرات گناہ فرما دیتے ہیں. اور ہم جیسے گنہگاروں سے اِن جیسی خطاؤں کی پرسش نہیں ہوتی لیکن اُن کے بلند درجے کے لحاظ سے ان لغزشوں پر بھی عتاب آجاتا ہے. یہاں بھی ایسا ہی ہوا. عصمت انبیاء کی بے شمار دلیلیں ہیں جن میں سے صرف چند دلیلیں یہاں عرض کرتا ہوں **پہلی دلیل** گنہگار فاسق ہوتا ہے. اور فاسق کی مخالفت کرنا ضروری اور نبی کی اطاعت کرنا فرض. اگر نبی گنہگار یا فاسق ہوں. تو اُن کی اطاعت بھی ضروری ہو جائے اور مخالفت بھی یہ اجتماع ضدین ہے. **دوسری دلیل** فاسق کی بات بلا تحقیق نہ ماننی چاہیئے. قرآنی حکم ہے. اور پیغمبر کی بات بلا تحقیق ہی ماننا ضروری ہے اگر نبی بھی فاسق ہوں. تو اُن کی بات کا ماننا اور نہ ماننا دونوں ضروری ہوں گے. اور یہ اجتماع نقیضین ہے **تیسری دلیل** گنہگار سے شیطان راضی ہوتا ہے. اسی لئے وہ حزب الشیطان میں داخل ہے. اور نیک کار سے رحمان راضی اور وہ حزب اللہ میں داخل اگر پیغمبر ایک آن کے لئے بھی گنہگار ہوں تو معاذ اللہ وہ حزب الشیطان (شیطانی گروہ) میں داخل ہوں گے. نیز پیغمبر کے گناہ کرتے وقت اگر کوئی اُمتی نیکی کر رہا ہو. تو اُس وقت اور اُس آن میں وہ اُمتی نبی سے افضل ہو گا. اور یہ بات بالکل باطل ہے **چوتھی دلیل** رسول فرشتوں سے افضل ہیں قرآن فرما رہا ہے. اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ جس سے معلوم ہوا. کہ سارے پیغمبر تمام جہان سے افضل اور جہان میں فرشتے بھی داخل ہیں. لہٰذا نبی فرشتوں سے افضل اور فرشتے یقیناً گناہوں سے معصوم اُن کی شان میں رب فرما رہا ہے. لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ یعنی فرشتے کبھی گناہ نہیں کرتے. اب اگر نبی گناہ کریں. تو درجے میں فرشتوں سے کم ہو جائیں گے. کیونکہ قرآن فرما رہا ہے. اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ جس سے معلوم ہوا. کہ متقی گنہگار کے برابر نہیں ملائکہ تو متقی ہیں. اگر نبی ایک آن کے لئے فاسد بن جائیں. تو ملائکہ کے برابر نہ رہیں گے. **پانچویں دلیل** قرآن کریم سے ثابت ہے. کہ رب نے

شیطان سے فرمایا تھا۔ کہ میرے خالص بندوں پر تیرا داؤ نہ چلے گا۔ شیطان نے بھی کہا تھا۔ کہ خداوندا میں تیرے سارے بندوں کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے خاص بندوں کے۔ صالح علیہ السلام نے بھی فرمایا۔ کہ اے لوگو جس بات سے میں تم کو روکوں اس کو خود کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں کرتا۔ فرماتے ہیں وَمَا اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَکُمْ اِلٰی مَا اَنْھٰکُمْ عَنْہُ۔ جب رب کہے کہ میرے نبیوں پر شیطان غالب نہیں آسکتا۔ انبیاء بھی فرمائیں۔ کہ ہم گناہ کا ارادہ بھی نہیں فرماتے شیطان بھی کہے کہ پیغمبروں پر میرا داؤ نہیں چلتا۔ اب جو شخص اُن کو گنہگار مانے وہ شیطان سے بھی بدتر ہے۔ لہٰذا جو حدیثیں ایسی ملیں۔ جن سے پیغمبروں کے گناہ ثابت ہوں وہ کوئی قابل قبول نہیں۔ اور جن آیات سے اُن کے گناہ کرنے کا دھوکہ پڑتا ہے۔ اُن کی توجیہ یا تاویل ضروری ہے۔ تاکہ قرآنی آیتوں میں تعارض نہ ہو۔ مجھ سے ایک شخص نے یہی اعتراض کیا تھا۔ اور کہنے لگا۔ کہ نبیوں کا کفر و شرک اور گنہگار ہونا قرآن سے ثابت ہے۔ میں نے اُس کو یہی جواب دیا۔ وہ نہ مانا۔ میں نے کہا۔ کہ پھر تو تم رب کو بھی گنہگار مانو۔ کیونکہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ کہ وَمَکَرَ اللّٰہُ نیز فرمایا گیا۔ وَھُوَ خَادِعُھُمْ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حق تعالیٰ دھوکہ اور مکر فرماتا ہے۔ اور یہ باتیں گناہ ہیں۔ تب وہ کہنے لگا۔ کہ ان آیتوں کا یہ مطلب نہیں۔ بلکہ یہ ہے۔ ہم نے کہا۔ کہ جیسے یہاں اور مطلب نکلتے ہوا ایسے ہی وہاں انبیاء اکرام کے لئے بھی اور مطلب نکال لو۔ **تفسیر صوفیانہ** فرشتے محض عابد تھے۔ اور انسان عبادت مع محبت کے لئے پیدا کیا گیا۔ محبت کیلئے محنت ضروری ہے۔ جنت محنت سے پاک ہے۔ اس لئے ضروری تھا۔ کہ آدم علیہ السلام امتحان محبت کیلئے زمین کی امتحان گاہ (یونیورسٹی) میں آئیں نیز یہ زمین حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے پیدائش تھی اور جنت وغیرہ اُن کے معراج کا مقام اس لئے ضروری تھا۔ کہ آدم علیہ السلام وہ جگہ خالی کرکے زمین میں تشریف لائیں۔ لہٰذا اُن کی تشریف آوری کی صورت یہ ہوئی۔ کہ دست قدرت نے اچھی تدبیر سے شیطان کی آڑ میں آدم علیہ السلام کو وہاں سے اُتارا۔ جیسے کہ یوسف علیہ السلام کو اُن کی بھائیوں کی آڑ میں کنعان سے مصر پہنچایا۔ تاکہ وہاں عنا کے بعد عطا فرمائی جائے۔ آدم علیہ السلام کو بھی سلامت سے ملامت کی طرف فرح سے طرح کی طرف نعمت سے نقمت کی طرف محبت سے محنت کی طرف قربت سے غربت کی طرف الفت سے کلفت کی طرف وصلت سے فرقت کی طرف منتقل کیا گیا۔ اُن کو جنت میں ہر چیز سے اُنس تھا۔ محبوب یہ کب چاہتا۔ کہ میرا حبیب کسی اور کو بھی چاہے محبت میں شرکت اسرار والوں کے مذہب میں شرک ہے۔ لہٰذا اُن سب سے علیحدہ کرکے اور سب کو حضرت آدم کا دشمن بنا کر پیاروں سے چھڑا کر چلہ کشی کیلئے گوشۂ زمین میں بھیجا گیا۔ اور فرمایا گیا۔ کہ اپنے اس چلے کو پورا کرکے پھر ہمارے پاس تشریف لاؤ۔ آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا ایسا تھا۔ جیساکہ دانے کا زمین میں جانا کہ دانہ مالک کے گھر سے نکل کر غربت کے جنگل میں جاتا ہے۔ وہاں بارش دھوپ کی سختیاں برداشت کرکے ہرا بھرا کھیت بنتا ہے۔ پھر پھل بن کر اور بھوسہ پتے دور کرکے مالک کے گھر لوٹ آتا ہے۔ آدم علیہ السلام کو زمین کی کھیتی میں بھیجا گیا۔ اطاعت کے پانی سے سیراب کیا گیا جس سے کہ عبادت کی شاخیں نکلیں۔ اور اسی میں شریعت حقیقت۔ طریقت۔ معرفت کے پھل لگے۔ کفار جو بھوسہ کے مثل تھے۔ علیحدہ چھانٹ دیئے گئے۔ اور وہ دانہ اپنے ساتھ بہت سے دانوں کو لے کر جہاں سے آیا وہیں گیا۔

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّہٖ کَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْہِ ؕ اِنَّہٗ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ﴿۳۷﴾

پس پائے آدم نے سے رب اپنے کچھ کلمے پس توبہ قبول کی اوپر اُن کے تحقیق وہ ہے بہت توبہ قبول کرنیوالا مہربان

پھر سیکھ لئے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے تو اللہ نے اُس کی توبہ قبول کی بے شک وہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان

**تعلق**۔ اس آیت کا گزری ہوئی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ اس میں بھی خدا کی ایک اُس نعمت کا ذکر ہے۔ جو آدم علیہ السلام کے ذریعے سب انسانوں پر کی گئی۔ دوسرے یہ کہ اس سے پہلے کی آیت میں خطا کا ذکر تھا۔ اور اب عطا کا یا پہلے عتاب کا ذکر ہوا تھا اور اب اُس کی انتہا کا۔ **تفسیر** فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ عربی زبان میں "ف" فوراً کے معنی میں آتی ہے جس سے بلا تاخیر بعد میں ہونا سمجھا جاتا ہے یعنی پہلے آدم علیہ السلام سے وہ خطا ہوئی۔ اور پھر فوراً اُن کو توبہ کیلئے کچھ کلمات کی عطا ظاہر تو یہی ہے کہ آدم علیہ السلام کے زمین پر تشریف لانے اور بہت

عرصے تک معافی کے لئے بے قرار رہنے اور بہت گریہ وزاری کرنے کے بعد یہ توبہ کی قبولیت کا واقعہ ہوا۔ روائیتوں سے بھی یہی ثابت ہے چنانچہ روائیت میں آتا ہے۔ کہ آدم علیہ السلام نے زمین پر آکر تین سو برس تک شرم کی وجہ سے آسمان کی طرف سر نہ اٹھایا۔ اور اس قدر روئے کہ آپ کے آنسو تمام زمین والوں کے آنسوؤں سے زیادہ ہیں۔ تب کچھ دعائیہ کلمے انہیں یاد آئے اس صورت میں یا تو یہ "ف" ثم کے معنی میں ہے۔ تو معنی آیت کے یہ ہوں گے۔ کہ پھر بہت عرصے کے بعد یہ توبہ قبول ہونے کا واقعہ ہوا۔ اور یا اس آیت سے پہلے ایک پورا مضمون محذوف ماننا پڑے گا یعنی آدم علیہ السلام کو نیچے آنے کا حکم ملا پس وہ نیچے آئے۔ اور کئی سو سال تک پریشان رہے جب یہ سب گریہ وزاری کر چکے تب فوراً اُن کی توبہ قبول ہوئی بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ قبول توبہ کا واقعہ جنت میں ہی ہو چکا تھا۔ اور آدم علیہ السلام قبول توبہ کے بعد زمین پر تشریف لائے (تفسیر روح البیان) اور دنیا میں آکر اُن کا گریہ وزاری فرمانا جنت اور حضرت حوّا کے فراق پر ہوا۔ صوفیاء اکرام اُس رونے کے کچھ اور اسرار بیان کرتے ہیں جس کو ہم تفسیر صوفیانہ میں بیان کریں گے۔ تو آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ جب انہیں جنت سے نیچے آنے کا حکم ہوا۔ تب اُن کی توبہ قبول ہونے کا واقعہ بھی ہو گیا۔ پھر اُس کے بعد زمین پر تشریف لائے۔ اس صورت میں "ف" اپنے معنی میں رہی اور آئندہ جو دوسرا اِهْبِطُوْا آرہا ہے۔ اُس نے علیحدہ معنی دیئے۔ اور اس صورت میں آدم علیہ السلام کا زمین پر آنا خطا کی بناء پر نہ رہا۔ بلکہ عطائے خلافت کیلئے۔ فَتَلَقّٰٓی تَلَقِّیْ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ ملنا کسی چیز کا پانا۔ حاصل کرنا۔ یہاں تینوں معنی بن سکتے ہیں آدَمُ دعائیہ کلمے حضرت آدم اور حوّا دونوں کو عطا ہوئے تھے۔ لیکن صرف آدم علیہ السلام کا ذکر ہوا۔ کیونکہ عورتیں مرد کے تابع ہوتی ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم کے اکثر احکام مردوں کے خطاب سے ہیں۔ عورتیں اُس میں تبعاً داخل ہیں۔ مِنْ رَّبِّهٖ اس سے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ باتیں رب کی طرف سے سکھائی گئی تھیں۔ یا تو بطور الہام یا بطریق وحی اگر الہام تھا تو حضرت آدم و حوّا دونوں کو ہوا۔ اور اگر بطریق وحی تھا تو آدم علیہ السلام پر وحی آئی اور انہوں نے وہ وحی حضرت حوّا کو سنائی اس صورت میں آدم علیہ السلام نے پہلے توبہ کی حضرت حوّا نے بعد میں کَلِمٰتٍ اس میں دو قراتیں ہیں۔ کلمات کے "ت" کو پیش اور زبر یعنی آدم علیہ السلام نے کچھ کلمے پالئے یا اُن کلموں نے آدم علیہ السلام کو پالیا وہ کلمے کیا تھے۔ اسے قرآن کریم نے دوسری جگہ خود بیان فرمایا ہے۔ کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا الخ مگر تفسیر عزیزی اور تفسیر خزائن العرفان اور تفسیر روح البیان نے طبرانی حاکم ابو نعیم اور بیہقی کی روائیت نقل کی کہ سیدنا عمر فاروق اور علی المرتضٰے رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ جب آدم علیہ السلام کی پریشانی انتہا کو پہنچ چکی۔ تو اُن کو ایک دن یاد آیا۔ کہ میں نے اپنی پیدائش کے وقت عرش اعظم پر لکھا دیکھا تھا۔ کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ محمد رسول اللہ کا وہ درجہ ہے۔ کہ اُن کا نام عرش اعظم پر رب کے نام کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ تدبیر یہی ہے۔ کہ انہیں کے وسیلے سے دعا مغفرت کروں۔ چنانچہ اُس دعا کے ساتھ یہ بھی عرض کیا۔ اَسْئَلُكَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اَنْ تَغْفِرَلِیْ ابن منذر کی روایت میں یہ کلمات ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُكَ بِجَاهِ مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَكَرَامَتِهٖ عَلَيْكَ اَنْ تَغْفِرَلِیْ خَطِيْئَتِیْ یعنی یا رب میں تجھ سے تیرے بندۂ خاص محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اور مرتبے کے طفیل اور اُس بزرگی کے صدقے میں جو انہیں تیرے دربار میں حاصل ہے مغفرت چاہتا ہوں۔ تب فوراً جواب الٰہی آیا۔ کہ اے آدم تم نے اُس شہنشاہ کو کہاں سے جانا۔ حضرت آدم نے سارا ماجرا عرض کیا۔ حکم الٰہی آیا۔ کہ اے آدم وہ محبوب سب پیغمبروں سے پچھلے پیغمبر ہیں۔ تمہاری اولاد سے ہیں اگر وہ نہ ہوتے۔ تو تم کو بھی پیدا نہ کیا جاتا۔ فَتَابَ عَلَيْهِ تَابَ تَوْبٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں لوٹنا اور رجوع کرنا بندے کی توبہ ہے۔ گناہ سے اطاعت کی طرف رجوع کرنا اور حق تعالٰے کی توبہ ہے۔ سزا سے مغفرت کی طرف رجوع فرمانا۔ لہٰذا توبہ رب کی بھی صفت ہے۔ اور بندے کی بھی مگر علیحدہ علیحدہ معنی سے بندے کی مکمل توبہ یہ ہے۔ کہ گذشتہ گناہوں سے شرمندہ ہو۔ اور فی الحال وہ گناہ چھوڑ دے اور آئندہ اُس گناہ سے بچنے کا عہد کرے۔ اگر حقوق سے توبہ کرتا ہے۔ تو اُن کو ادا بھی کر دے مثلاً نمازیں رہ گئیں ہیں۔ تو اُن کی قضا کر ڈالے۔ اگر کسی کا قرض ہے۔ تو ادا کر دے خیال رہے کہ توبہ کے کچھ ارکان ہیں کچھ شرطیں اور کچھ مستحبات اور نماز روزے کی طرح توبہ کا بھی ایک وقت ہے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ کسی اور مقام پر بیان کریں گے۔ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔ اس میں اللہ کی دو صفتوں کا

ذکر ہے۔ ایک توّاب دوسرا رحیم۔ توّاب کے معنی ہیں بہت توبہ قبول فرمانے والا۔ کہ اگر انسان ہزاروں بار توبہ کرے۔ اور پھر غلطی سے گناہ صادر ہوتا ہے تب بھی اُس کی توبہ قبول ہوتی رہتی ہے۔ نیز وہ خود ہی توبہ کی توفیق دیتا ہے۔ اور اُس کے اسباب جمع فرماتا ہے۔ رحیم کے معنی بسم اللہ کی تفسیر میں بیان ہو چکے۔ **خلاصہ تفسیر** جب آدم علیہ السلام جنّت سے زمین پر تشریف لائے۔ تو ایک دم بہت سی مصیبتوں میں گرفتار ہو گئے۔ جنّت سے چھوٹنے کا غم اپنی بیوی حوّا کی جدائی اپنی وحشت۔ اور تنہائی پھر رب تعالیٰ کا عتاب اس عتاب کی وجہ سے سخت پریشانی تھی۔ اس پریشانی میں تین سو سال تک اس قدر روئے کہ اُن کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ **پانچ** آدمی بہت روئے ہیں۔ **آدم** علیہ السلام اپنی خطا پر **یعقوب** علیہ السلام فراقِ فرزند میں **یحییٰ** علیہ السلام خوف الٰہی سے حضرت **فاطمہ زہرا** حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد۔ امام **زین العابدین** واقعہ کربلا کے بعد مگر ان تمام حضرات میں آدم علیہ السلام کی گریہ وزاری سب سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ تین سو برس تک متواتر روئے ہیں۔ تفسیر عزیزی میں ہے۔ کہ حضرت جبریل علیہ السلام کو بھی اُن کی گریہ وزاری سے رونا آگیا اور انہوں نے بھی بارگاہِ الٰہی میں آدم علیہ السلام کی سفارش اور شفاعت کی۔ تب رحمت الٰہی نے اُن کی دستگیری فرمائی اور اُن کو رحمت العالمین علیہ السلام کا نام یاد دلا دیا اور اُس کے ذریعے توبہ قبول فرمائی۔

## آدم علیہ السلام کی توبہ

یہ تو معلوم ہو چکا۔ کہ آدم علیہ السلام کئی سو برس تک اپنے خطا پر نادم رہے۔ جب توبہ کا وقت آیا۔ اور آدم علیہ السلام کے دل میں اِن دعاؤں کا القا ہوا۔ وہ عاشورہ یعنی دسویں محرّم اور غالباً جمعہ کا دن تھا۔ آپ کو اِن کلمات کے ملنے سے بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے وضو فرمایا۔ اور خانۂ کعبہ کے سامنے کھڑے ہوئے دو رکعت نماز ادا کی اور پھر اُن کلمات سے دُعا مانگی۔ جب آدم علیہ السلام جنّت سے تشریف لائے تھے۔ تب اُن کے چہرے مبارک کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ اور توبہ قبول ہونے کے بعد اُن کو حکم ہوا۔ کہ چاند کی تیرھویں اور چودھویں اور پندرھویں کا روزہ رکھو چنانچہ آپ نے یہ روزے رکھے۔ اور ہر دن میں جسم کا تہائی حصّہ اصلی رنگ پر آتا رہا۔ پندرھویں تاریخ کو تمام جسم پاک اصلی رنگ پر آگیا۔ یہ تینوں روزے نوح علیہ السلام کے زمانے تک مسلمانوں پر فرض رہے۔ اسلام میں بھی کچھ زمانے ہر مہینے کے یہ تین روزے فرض رہے بات فرض تو نہیں۔ مگر سنّت ہیں۔ توبہ قبول ہونے کے بعد عرفات کے مقام میں حضرت حوّا سے ملاقات ہوئی۔ اور ایک نے دوسرے کو پہچانا۔ اسی لئے اُس میدان کو عرفات کہتے ہیں یعنی پہچاننے کی جگہ۔ جب آدم علیہ السلام جنّت سے آئے تھے۔ تو اُن سے عربی زبان بھی سلب کر لی گئی تھی یعنی بھلا دی گئی اتنے روز تک سریانی زبان میں کلام فرمایا توبہ قبول ہونے کے بعد عربی زبان پھر عطا ہوئی۔ پھر حضرت جبریل نے تمام عالم کے جانوروں کو آواز دی۔ کہ اے جانورو حق تعالیٰ نے تم پر اپنا خلیفہ بھیجا ہے۔ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔ دریائی جانوروں نے اپنا سر اٹھا کر اطاعت ظاہر کی اور خشکی کے جانور آپ کے آس پاس جمع ہو گئے۔ آدم علیہ السلام اُن پر ہاتھ پھیرنے لگے جس پر اُن کا ہاتھ پہنچ گیا۔ وہ اہلی اور خانگی ہوا۔ جیسے گھوڑا۔ اُونٹ۔ بیل بکری۔ کُتّا۔ بلی وغیرہ اور جس پر آپ کا ہاتھ نہ پہنچا وہ جنگلی وحشی رہا۔ جیسے ہرن وغیرہ۔ اس واقعہ کے بعد آدم علیہ السلام نے عرض کیا۔ کہ مولےٰ میری اولاد بہت کمزور ہے۔ اور ابلیس کا فریب بہت سخت اگر تو اُن کی امداد نہ کرے۔ تو وہ ابلیس سے کیونکر بچ سکیں گے حکم الٰہی آیا۔ کہ اے آدم تمہارے اور احکام تھے۔ اُن کے لئے دوسرے احکام ہوں گے۔ ہم ہر انسان کے ساتھ ایک فرشتہ رکھیں گے۔ جو کہ اُس کو شیطان کے وسوسے سے بچائے گا۔ اور ہر ایک کے لئے اُس کے مرنے کے وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا رکھیں گے تب آپ نے خوش ہو کر شکر کیا۔ اسی تفسیر عزیزی میں ہے۔ کہ آپ کی اولاد بیٹے پوتے وغیرہ آپ کی موجودگی میں چالیس ہزار تک پہنچ چکے تھے۔ اور آپ نے آخری عمر میں خاموشی اختیار فرمائی تھی۔ کہ بجز ذکر الٰہی اور کلام بہت کم فرماتے تھے۔ آپ کی وفات کا پورا واقعہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ پہلا فائدہ یہ کہ مقبولانِ بارگاہ کے وسیلے سے دُعا مانگنی جائز اور سنت آدم علیہ السلام ہے دوسرے یہ کہ کوئی عبادت بغیر وسیلہ نبی قبول نہیں ہوتی دیکھو آدم علیہ السلام کئی سو برس تک گریہ وزاری میں مشغول رہے مگر بغیر حضور کے نام مقصد پورا نہ ہوا۔ تیسرے یہ کہ دعائیں بحقِّ فلاں کہنا جائز ہے چوتھے یہ کہ توبہ کیلئے گریہ وزاری کرنا بہت فائدے مند ہے۔ مثنوی شریف میں ہے۔ شعر:-

طفل یک روزہ ہمیں داند طریق | کہ بگریم تا شود دایہ شفیق
تو نمی دانی کہ دایہ دائیگاں | چوں دہد بے گریہ شیر اندر دہاں
چوں خدا خواہد کہ ما یاری کند | میل ما را جانب زاری کند
باش چوں دولاب نالاں چشم تر | تا ز صحن جان بر روید خضر
آخرے ہر گریہ آخر خندہ ایست | مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

**پانچویں** یہ کہ انسان نے زمین پر آکر سب سے پہلی عبادت توبہ کی ہے۔ اس لئے انسان کو چاہیئے۔ کہ ہر وقت توبہ کرتا رہے **چھٹے** یہ کہ دنیاوی بادشاہوں کا یہ حال ہے۔ کہ اُن کے قریب رہنے والوں کو اُن کا خوف کم ہوتا ہے۔ مگر بارگاہ الٰہی میں جس قدر زیادہ قرب اسی قدر زیادہ ہیبت

**پہلا اعتراض**:۔ جب آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہی کر لی تھی۔ تو اُن کو اتنے روز تک پریشان کیوں رکھا گیا۔ **جواب** جو چیز مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ اُس کی قدر بھی ہوتی ہے۔ اور دوسروں کو اُس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ نیز حضرات انبیاء اکرام کی یہ پریشانیاں اُن کے درجے بڑھانے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ **دوسرا اعتراض** فقہا فرماتے ہیں۔ کہ دُعا میں بحق فلاں کہنا منع ہے۔ اور اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جائز ہے **جواب** یہ دونوں کلام صحیح ہیں۔ حق تعالےٰ پر کسی کا اپنا ذاتی حق نہیں۔ اس معنی سے حق فلاں کہنا منع ہے۔ لیکن اُس نے اپنے مقبول بندوں کو اپنے فضل و کرم سے کچھ حقوق عطا فرمائے۔ جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔ اس معنی سے یہ کہنا جائز ہے **تفسیر صوفیانہ** فرشتے ہمیشہ عبادت کرتے تھے۔ لیکن اب تک اُنہوں نے توبہ و گریہ زاری کی عبادت نہ کی تھی۔ سیدنا آدم علیہ السلام نے زمین پر آتے ہی پہلی یہی عبادت کی جنّت کا فراق حضرت حوّا کی جُدائی تو رونے کا بہانہ تھا۔ درحقیقت اپنی محبّت میں اُن کو رولانا تھا۔ مجاز حقیقت کا پُل ہے۔ **حکایت** مثنوی شریف میں فرمایا۔ کہ ایک بار مجنوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا۔ کہ مولےٰ تو نے مجھے عشق لیلیٰ دے کر اس مصیبت میں کیوں ڈال دیا۔ کہ تمام دنیا میں میں رُسوا ہو گیا۔ اور یہاں کی لذتیں اور عیش سب بھول گیا۔ جواب ملا۔

عشق لیلیٰ نیست ایں کار من است | حسن لیلیٰ عکس رخسارے من است
خوش بیاید نالۂ شب ہائے تو | ذوق ہا دارم بیار ہائے تو

اے دیوانے یہ لیلیٰ کا عشق نہیں ہے۔ وہ تو فقط ایک پردہ ہے لیلیٰ کا رخسار آئینۂ جمال یار ہے جس کے ذریعے تجھ کو اُس کا دیدار حاصل ہوتا ہے روح البیان شریف نے ایک مقام پر فرمایا۔ کہ بظاہر یعقوب علیہ السلام فراق یوسف میں رو رہے تھے۔ مگر درحقیقت خالق یوسف کی محبت اُن کو رولا رہی تھی۔ کیونکہ وہ کنعان میں بیٹھے ہوئے۔ یوسف علیہ السلام کا ہر حال دیکھ رہے تھے۔ پھر اُن کے لئے فراق کیسا اس پر لطف مضمون کو انشاءاللہ ہم سورۂ یوسف کی تفسیر میں بیان کریں گے۔ اور اپنی کتاب جاء الحق میں بھی بیان کر چکے ہیں۔ روایات میں ملتا ہے۔ ایک بار لیلیٰ مجنوں کے پاس آگئی۔ اور کہا کہ میں ہی وہ لیلیٰ ہوں جس کے فراق میں تو تڑپ رہا ہے۔ اُس نے جواب دیا۔ تو میری لیلیٰ کہاں سے آئی۔ تو تُو ایک انسان ہے۔ غرضکہ نام لیلیٰ کا رہ گیا۔ اور کام کسی اور کا غرضکہ قلب آدم علیہ السلام کو جب توبہ کے صابن سے خوب صاف کر دیا۔ اور آنکھوں کے پانی سے اُس کو خوب دھو دیا۔ تب رحمت الٰہی کی بارش اُن پر ہوئی۔ اور اُن کو اپنا قرب خاص عطا فرمایا۔ تفسیر روح البیان نے اس جگہ فرمایا۔ کہ آدم علیہ السلام کے قلب میں محبت الٰہی کا تخم بویا گیا۔ اور چشمۂ چشم کے پانی (آنسوؤں) سے اُس کو سیراب کیا گیا۔ تو اُس تخم کی پہلی شاخ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا ظاہر ہوئی۔ اور اس شاخ پر توبہ کی کلیاں نمودار ہوئیں جس سے ہدایت کا پھول کھلا اور اجتباع اور معرفت کا پھل حاصل ہوا جسے قرآن کریم نے فرمایا۔ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى

**قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ**

کہا ہم نے اُترو تم اس سے سب کے سب پس اگر آوے تمہارے پاس طرف سے میری ہدایت پس جس نے کہ پیروی کی ہدایت میری کی

ہم نے فرمایا۔ تم سب جنت سے اُتر جاؤ۔ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آوے تو جو میری ہدایت کا پیرو ہُوا

**فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۳۸)**

پس نہیں ہے کوئی ڈر اُوپر اُن کے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اُسے نہ کوئی اندیشہ اور نہ کچھ غم

**تعلق**۔ اس آیت کا پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک** یہ کہ اس میں بھی اُس ایک نعمت کا ذکر ہے جو آدم علیہ السلام کے ذریعے انسانوں کو ملی۔ یعنی انکا زمین پر تشریف لانا۔ اور پھر زمین میں احکام الٰہی کا آنا۔ ان کی وجہ سے مومن و کافر میں فرق ہونا دوسرے یہ اس سے پہلے کی آیت میں اُس خطا کا ذکر ہُوا۔ جو آدم علیہ السلام کو بہشت سے زمین پر لائی۔ اب اُن نیک عملوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ جو کہ پھر اُن کو اور اُن کی اولاد کو زمین سے جنت میں پہنچائیں گے۔ **تیسرے** یہ کہ اس سے پہلے آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہونے کا تذکرہ ہُوا۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے۔ کہ فقط اس سے ہی جنت میں واپسی نہ ہوگی۔ بلکہ اُس کے لئے نیک اعمال کرنا ہوں گے۔ **تفسیر قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا** یہ جملہ اس سے پہلے بھی آچکا ہے۔ لیکن اس میں اور اُس میں چند طرح فرق ہے۔ ایک یہ کہ وہ قبول توبہ سے پہلے فرمایا گیا تھا۔ اور یہ اُس کے بعد اگر جنت ہی میں توبہ ہوئی تھی۔ جیسا کہ بعض علماء فرماتے ہیں۔ تو جنت ہی میں دو بار اُتر جانے کا حکم دیا گیا۔ پہلے اترنے کا حکم دیا۔ بعد میں توبہ قبول ہوئی۔ پھر فرمایا گیا۔ کہ اگرچہ توبہ تو قبول ہوگئی۔ مگر اُترنا ضرور پڑے گا۔ لہٰذا پہلا اِهْبِطُوْا آدم علیہ السلام کے علم کے لئے تھا۔ اور دوسرا عمل کے لئے اور اگر زمین پر توبہ قبول ہوئی۔ جیسا کہ روائت سے ثابت ہے۔ تو اس کا یہ مطلب ہُوا۔ کہ تم زمین میں ہی رہو۔ جہاں تم کو اُتارا گیا۔ کیونکہ اب تمہاری بعض اولاد جنت میں آئے گی۔ اور بعض نہ آئیگی۔ کیونکہ اگر بغیر عمل ہی جنتیوں کو جنت میں بلا لیا جائے۔ تو دوزخیوں کو اعتراض کرنے کا موقعہ ملے گا۔ لہٰذا عمل کر کے آؤ۔ **دوسرا فرق** یہ ہے۔ کہ پہلے اِهْبِطُوْا میں سارے اُترنے والوں کو خطاب تھا۔ لیکن یہاں صرف اولاد آدم کو کیونکہ آگے احکام کا ذکر ہے جن سے سانپ اور مور وغیرہ علیٰحدہ ہیں **تیسرا فرق** یہ ہے۔ کہ اُس اِهْبِطُوْا کے ساتھ عداوت وغیرہ کی تکلیف وغیرہ کا ذکر تھا جس سے معلوم ہوُا تھا۔ کہ زمین تکلیف کی جگہ ہے۔ اس اِهْبِطُوْا کے ساتھ رب کے احکام کا ذکر ہے۔ اور یہ بتایا جا رہا ہے۔ کہ جو کوئی دنیا میں رہ کر ہماری فرمانبرداری کریگا۔ وہ وہاں کے خوف وغم سے محفوظ رہے گا۔ **چوتھا فرق** یہ ہے۔ کہ اُس اِهْبِطُوْا میں حق تعالیٰ سے دور ہونے کا ذکر تھا۔ اور یہاں اُس سے قرب کا یعنی دنیا میں رہو۔ لیکن اگر ہماری اطاعت کرو گے تو وہاں بھی ہم سے قریب ہی رہو گے بہر حال دوبارہ اس کا ذکر بے کار نہیں ہے۔ **جَمِيْعًا** اس سے معلوم ہوا۔ کہ سب ہی کو جنت سے نکلنے کا حکم ہُوا۔ کوئی انسان وہاں باقی نہ رکھا گیا۔ لیکن اس سے لازم یہ نہیں۔ کہ سب ایک دم ہی نکلے ہوں۔ ممکن ہے کہ ایک ساتھ نکلے ہوں یا آگے پیچھے **فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ** لفظ اِمَّا۔ اِنْ شرطیہ اور مَا زائدہ سے بنا ہے۔ اس کا استعمال شک کے موقعہ پر ہوتا ہے اور **يَاْتِيَنَّ** میں نون سے تاکید پیدا ہوئی۔ تو آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ اگر ضرور آئے تمہارے پاس۔ چونکہ رب کی طرف سے انبیائے کرام اور کتابوں کا آنا یقینی تھا۔ اس لئے نون استعمال فرمایا گیا۔ لیکن بندوں کو اس ہدایت کے پانے میں شک تھا۔ کیونکہ بعض ماں کے پیٹ میں بعض بچپن میں ہی مرجاتے ہیں اور بعضے دیوانگی میں عمر گذارتے ہیں۔ اور بعضے وہ ہیں جن تک نبوت کی روشنی نہیں پہنچتی جیسے زمانہ جاہلیت کے لوگ ان کے لحاظ سے بطریق شک اِمَّا ارشاد ہوا یعنی رب کیطرف سے ہدایت تو ضرور آئے گی۔ لیکن اگر تم اُس کو پالو۔ تو تم اطاعت کرنا۔ یہاں کم سے خطاب صرف انسانوں کو ہے کیونکہ شیطان اور سانپ

اور مور کے پاس نہ کوئی کتاب آئی نہ رسول۔ اور بہت ممکن ہے کہ اس خطاب سے حضرت آدم و حوا بھی خارج ہوں۔ کیونکہ آدم علیہ السلام لوگوں کے لئے خود ہدایت تھے اور حضرت حوا اُس ہدایت کو پا چکی تھیں اب اُن کے پاس ہدایت آنے کے کیا معنی۔ لیکن اس کی ایک تفسیر ایسی بھی ہو سکتی ہے جس میں انسان و جن و جانور وغیرہ سب داخل ہو جائیں۔ وہ انشاء اللہ تفسیر صوفیانہ میں عرض کی جائے گی۔

مِنِّیْ سے معلوم ہوا۔ کہ ہدایت رب کی طرف سے ہی آتی ہے۔ خواہ کسی ذریعہ سے ملے۔ فرشتے بلا واسطہ پاتے ہیں۔ انبیاء کرام کبھی فرشتوں کے ذریعے سے کبھی بلا واسطہ صحابہ اکرام انبیاء کے ذریعے سے اور اُن کے بعد کے لوگ علماء مشائخ کے ذریعے غرضکہ ہدایت کی ابتداء ایک مگر انتہاء میں فرق اس سے معلوم یہ بھی ہوا۔ کہ جو باتیں شیطان کی طرف سے آئیں نہ وہ ہدایت ہیں۔ اور نہ اُن کی اطاعت فائدے مند۔

هُدًى یہ مصدر یا تو اپنے ہی معنی میں ہے۔ یا اسم فاعل کے معنی میں یعنی اگر تمہارے پاس ہدایت آئے یا ہدایت دینے والی چیزیں آئیں۔ جیسے کہ انبیاء کرام آسمانی کتابیں اور پیغمبروں کی شریعتیں فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ اس جگہ بجائے ضمیر کے لفظ ہدایت ارشاد ہوا یعنی تَبِعَهٗ نہ فرمایا۔ کیونکہ پہلی ہدایت میں اور اس میں بہت فرق ہے۔ یہاں اس سے عقائد اور اعمال وغیرہ مراد ہیں۔ نیز ہر ایک کی ہدایتیں علیحدہ ہیں اور اُس کی اتباع میں فرق فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ خوف کے معنی ہیں۔ ڈر یعنی آئندہ مصیبت پر خطرہ اور اندیشہ اس سے معلوم ہوا۔ کہ جو ہدایت پر قائم رہے اُسے یا تو موت کے وقت یا قیامت کے دن یا قبر میں کوئی خوف نہ ہوگا۔ اور یا دنیا اور آخرت میں اُن کے لئے کوئی حقیقتاً خوف کی بات نہ ہوگی۔ خیال رہے۔ کہ خوف دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک فائدے مند اور دوسرا نقصان دہ رب کا پیغمبر کا قیامت کا جہنم کا خوف فائدہ مند ہے جس سے کہ ایمان اور تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ مگر رب کے مقابلے میں مخلوق کا خوف جس کی وجہ سے انسان رب کی اطاعت نہ کر سکے۔ نقصان دہ ہے۔ سردی کے خوف سے نماز چھوڑ دی جائے بے دینوں کے ڈر سے تبلیغ بند کر دی جائے یہ نقصان دہ خوف ہے۔ اور یہاں اسی ہی خوف کی نفی ہے۔ کیونکہ علیٰ نقصان کے لئے آتا ہے۔ یعنی اُن کے لئے وہ خوف نہیں۔ جو اُن پر وبال بن جائے۔ رہا خوف الٰہی جس کو خشیۃ کہتے ہیں یہ تو اُن کو اعلیٰ درجے کا حاصل ہوتا ہے۔ نیز سانپ بچھو وغیرہ موذی جانوروں سے ڈرنا بھی اس میں داخل نہیں۔ کیونکہ یہ خوف بھی مُضر نہیں ہے۔ یا مطلب اس کا یہ ہے۔ کہ اُن کے لئے حقیقتاً کوئی خوف کی چیز نہیں ہے یعنی اگرچہ وہ دل میں ڈریں۔ لیکن ڈر کی کوئی چیز نہیں۔ جیسے کہ وکیل مدعی سے کہتا ہے۔ کہ تمہیں اس مقدمے میں کوئی خوف نہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے۔ کہ تم پر کوئی ایسی آفت آنے والی ہی نہیں جس کا کوئی اندیشہ ہو نہ یہ کہ تمہارے دل میں خوف نہیں اسی لئے لَا خَوْفٌ فرمایا نہ کہ لَا يَخَافُوْنَ

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ يَحْزَنُوْنَ حزنٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں غم اور افسوس یعنی یہ اللہ والے یا تو موت کے وقت یا قبر و حشر میں غم نہ کریں گے۔ کیونکہ دنیا سے کامیاب آئے ہیں۔ کما کر لائے ہیں یا یہ مطلب ہے۔ کہ وہ دنیا و آخرت میں دنیاوی نفعوں کے حاصل نہ ہونے پر غم نہیں کرتے۔ کیونکہ اُن کی نگاہ میں دین ہوتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے۔ کہ اُن کو وہ غم نہ ہوگا۔ جو کفار اور فاسقوں کو ہوگا

**خلاصۂ تفسیر** آدم و حوا علیہم السلام جب جنت سے چلے۔ تو اب انہیں یہ خبر نہ تھی۔ کہ آیا ہم ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں۔ یا پھر کبھی بھی یہاں آنا میسر ہوگا۔ اور اُس جگہ رہ کر بھی تعلقِ رب قائم رہے گا یا نہیں۔ اُن کے اطمینان کے لئے فرمایا گیا۔ کہ اب تم سب جنت سے اُتر کر زمین پر جاؤ۔ لیکن وہاں تم پر ہماری نظر عنایت رہے گی۔ اور ہم تمہارے پاس اپنی ہدایت یعنی عقل سلیم اور عجائبات قدرت اور انبیاء اور کتابیں اور پھر انبیاء کے نائب علماء و مشائخ بھیجیں گے۔ دیکھو اس بار تم چوک گئے آئندہ ایسا نہ کرنا۔ اس غلطی سے سبق حاصل کرنا ہماری ہدایت کے موافق چلنا جو ہدایت کے موافق عمل کرے گا۔ تو اُس کو نہ آئندہ کا خوف ہوگا۔ اور نہ کبھی گذری عمر سے غم ہو۔ بلکہ دونوں عالم میں شاد و خرم رہے گا۔ اسی لئے روایت میں آتا ہے۔ کہ قیامت کا دن بے دینوں کو پہاڑ سا معلوم ہوگا یعنی بہت سخت اور دراز لیکن نیک کاروں کو ایسا محسوس ہوگا۔ جیسے چار رکعت پڑھنے کے بقدر وقت کیونکہ یہ راحت میں ہوں گے۔ اور وہ تکلیف میں اگرچہ روایات میں آتا ہے۔ کہ قیامت میں ہر شخص کو افسوس ہوگا۔

بدکاروں کو نیکی نہ کرنے کا اور نیک کاروں کو زیادہ نیکی نہ کرنے کا۔ مگر بدکاروں کا غم تکلیف دِہ ہوگا۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ دنیا میں نیک اعمال کرنے کے لئے انسان کو بھیجا گیا ہے۔ نہ کہ فقط کھانے پینے کے لئے کھانا پینا۔ تو اعمال کے لئے ہے۔ **دوسرے** یہ کہ جو چیز رب کی طرف سے ملے وہ ہدائیت ہے۔ خواہ کسی ذریعے سے آئے اور جو شیطان کی طرف سے ملے وہ گمراہی **تیسرے** یہ کہ نیک اعمال سے دل مضبوط و قوی ہو جاتا ہے۔ کہ اس کی وجہ سے دینوی رنج و خوشی کا اثر نہیں لیتا۔ بلکہ ہر حالت اُسے خدا کی طرف مائل کرتی ہے۔ وہ مثل اُس پہاڑ کی ہوتا ہے۔ جو کسی قسم کی آندھی سے جنبش نہیں کرتا۔ **پہلا اعتراض** ایک بار اھبطو فرمانے کے بعد دوبارہ اھبطو فرمانا بے کار ہے۔ اس لئے کہ پہلے آچکا ہے۔ **جواب** اس کا جواب گذر چکا۔ کہ اس تکرار میں چار فائدے ہیں **دوسرا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہُوا کہ اللہ والوں کو خوف و غم نہیں ہوتا۔ اور حدیث پاک میں آتا ہے۔ کہ جس قدر انسان کا درجہ اعلیٰ اُسی قدر رنج و غم بلا و مصیبت اس کے لئے زیادہ۔ نیز ہر مسلمان کو عبادت قبول نہ ہونے۔ خاتمہ خراب ہونے یا اعمال برباد ہونے کا خطرہ لگا ہوا ہے **جواب**۔ اس کا جواب بھی گذر گیا۔ کہ یا تو اس سے قیامت کا خوف و غم مراد ہے۔ یا جنت میں پہنچ جانے کے بعد یا دنیا میں نقصان دہ خوف و غم کی نفی مقصود ہے۔ **تفسیر صوفیانہ**۔ جب رب نے آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے کی آزمائش میں مبتلا فرمایا۔ تو اُن کو تسلی دی کہ یہ امتحان اگرچہ بہت سخت ہے۔ مگر اس میں ممتحن کی طرف سے چند طرح تمہاری اور تمہاری اولاد کی مدد فرمائی جاوے گی۔ اور تم کو کامیاب ہونے اور اچھے نمبر لینے میں بہت مدد بھیجی جاوے گی۔ اور تم سے اور تمہاری اولاد سے ہمارا تعلق ٹوٹ نہ جاوے گا۔ بلکہ کسی کو بلا واسطہ کسی کو ایک واسطے سے اور کسی کو چند واسطوں سے وحی کتاب احکام وغیرہ پہنچائے جاویں گے۔ جس نے اپنے قلب میں آدم علیہ السلام کی طرح ہماری محبت کا تخم بویا۔ اور اُس تخم کو توبہ اور گریہ و زاری اور استغفار وغیرہ کے پانی سے پرورش کیا۔ یہاں تک کہ اُس میں اطاعت عبادت معرفت وغیرہ کا پھل لگ گیا۔ تو اُن کو کھیتی بگڑنے اُجڑنے کا خوف اور اس تخم کے خراب ہو جانے کا غم نہ ہوگا۔ یعنی نہ تو اُن کا تخم فاسد ہوگا۔ اور نہ اُن کی کھیتی برباد اور دنیا کی کوئی مصیبت اُن کے لئے نقصان دِہ نہ ہوگی۔ بلکہ ہر مصیبت اُن کو زیادہ راغب الی اللہ کرے گی۔

آب در کشتی ہلاک کشتی است  آب اندر زیر کشتی پشتی است

کیونکہ اُن کا دل ہمارے محبت سے بھرا ہوگا۔ اُس میں کسی بھی رنج و غم کی گنجائش نہ ہوگی۔ ہر مصیبت دل سے دبی ہوئی رہے گی۔ نیز دُنیا کی خوفناک چیزیں خود اُن سے خوف کریں گی۔ لہٰذا وہ کسی سے خوف نہ کریں گے۔ جیسا کہ ثابت ہے۔ کہ سانپ بچھو وغیرہ بعض اولیاء اللہ کے تابعدار ہوئے اور بڑے بڑے سرکش جن و انسان اللہ والوں کے مطیع و فرمان رہے۔ دوزخ کی آگ بھی اِن سے خوف کرے دنیا کی آگ زہر وغیرہ ان کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ تو اب وہ بجز پروردگار کس سے خوف کریں۔ **خیال** رہے کہ ہر ایک کے لئے ہدائیت علیحدہ اور اُس کی اتباع جدا گانہ اسی طرح اُن کا خوف و غم سے نجات پانا مختلف نوعیت کا غریب کے اور احکام اور مالدار کے دوسرے۔ عورت کے علیحدہ مرد کے الگ۔ اغیار کے اور احکام۔ صاحب اسرار کے دوسرے۔ اہل شریعت کے ہدائیت کی ایک نوعیت۔ اہل طریقت و حقیقت و معرفت کی دوسری نوعیت کی جس قسم کی ہدائیت اُس قسم کی اتباع پھر اُس طرح کی جزاء۔ جیسا تخم ویسا ہی درخت اور اُس ہی طرح کا پھل جانوروں وغیرہ کی بھی علیحدہ علیحدہ ہدائتیں بعض دشمن انبیاء جیسے کہ چھپکلی اور چوہا وغیرہ اور بعض جانور خدام نبی جیسے ہُدہُد اور کبوتر وغیرہ اُن کی ہدائیت اُن کی طبعی حالت ہے۔

موسیا آداب دانا دیگر اند  سوختہ جاں و رواناں دیگر اند

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

اور وہ جنہوں نے کفر کیا اور جھٹلایا آیتوں کو ہماری یہ لوگ ساتھی ہیں آگ کے وہ بیچ اس کے ہمیشہ رہنے والے ہیں ۔

اور وہ جو کفر کریں . اور میری آیتیں جھٹلائیں . تو وہ دوزخ والے ہیں اُن کو ہمیشہ اُسمیں رہنا

**تعلق**. اس آیت کا پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے. **ایک** یہ کہ پہلے مومنین کا ذکر ہوا تھا. اب کفار کا اور ہر چیز کا پورا علم اُسکی ضد سے ہوتا ہے. **دوسرے** یہ کہ پہلے اُس جماعت کا ذکر ہوا. جو کہ جنت میں واپس آنے والی ہے. اب اُس کا ذکر ہوا جو کہ وہاں پھر نہ جائے گی **تیسرے** یہ کہ اس سے پہلے جنت کے پہونچانے والے اعمال کا ذکر ہوا تاکہ اُن کو اختیار کیا جاوے. اب جنت سے محروم کرنے والی چیزوں کا تذکرہ ہوا تاکہ اُس سے پرہیز کیا جاوے. یعنی وہ علاج تھا. یہ اُس کا پرہیز **تفسیر** **وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا**. **كَفَرُوْا**. کفر سے بنا ہے جس کے معنی ہیں انکار کرنا یہاں دل کا انکار مراد ہے. کیونکہ زبانی انکار کا ذکر تو آئندہ آرہا ہے چونکہ دل کا انکار زبانی انکار سے پہلے ہوتا ہے. اس لئے اس کا ذکر بھی پہلے ہوا. اور تکذیب کا بعد میں. نیز جہنمی بن جانے کے لئے صرف دل کا انکار ہی کافی ہے. خواہ زبانی انکار ہو یا نہ ہو. اس لئے بھی اُس کو پہلے ہی فرمایا گیا. **وَكَذَّبُوْا**. اس سے مراد ہے. اللہ کی آیتوں کو جھوٹا کہنا خواہ زبان سے ہو یا قلم سے یا افعال سے یا کسی اور علامات سے مثلاً کسی کافر نے ساری عمر اپنے منہ سے کسی آیت کو جھوٹا نہ کہا. بلکہ وہ اپنی پوجا پاٹ میں مشغول رہا. وہ بھی اس میں داخل ہے. کیونکہ اُس کا ہندوانی کام کرنا اور کفر کی نشانیاں زُنار وغیرہ استعمال کرنا ہی اس کی علامت ہے. کہ وہ اسلامی احکام کو جھوٹا جان رہا ہے. **خیال رہے**. کہ اس آیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جو کفر اور تکذیب دونوں کام کرے. صرف وہ ہی جہنمی ہو. بلکہ ان دونوں میں سے کوئی بھی کام کرے. یقیناً جہنمی ہو جاوے گا. لہٰذا منافقین جو کہ دل سے کافر اور زبان سے مصدق تھے. وہ بھی جہنمی اور وہ مُشرکین و کفار جو دل سے حق جانیں مگر زبان سے تکذیب وہ بھی جہنمی جیسے کہ ابو جہل وغیرہ. لہٰذا لغت گو ہندو وغیرہ سب اس میں داخل ہیں. ہاں جو کہ دل سے اسلام مان چکا مگر زبان سے تصدیق کا موقعہ نہ ملا. وہ انشاء اللہ جنتی ہے. نیز اگرچہ خطاب کے وقت کفر اور تکذیب آئندہ ہونے والی تھی. مگر چونکہ یہ یقینی چیز تھی. لہٰذا ان دونوں کو بصیغۂ ماضی بیان فرمایا گیا. **بِاٰيٰتِنَا**. آیات سے اللہ کی یقینی نشانیاں مراد ہیں یعنی جو بھی اللہ کی نشانیوں کو جھٹلادے یعنی یا تو آسمانی کتاب کا انکار کرے. یا کسی پیغمبر کا یا قیامت و دوزخ و جنت کا یا کہ کسی بھی اسلامی حکم قطعی کا وہ سب جہنمی ہیں نیز اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ کم سے کم تین آیتوں کا انکار کرے. وہ دوزخی ہو. اگر ایک آیت کا بھی انکار کر دیا جہنمی ہو گیا. کیونکہ ایک آیت کا انکار کل کا انکار ہے. بادشاہ کے ایک قانون کو توڑنا تمام کا توڑنا ہے. **اُولٰٓئِكَ**. اگرچہ یہ کفار سننے والے کی نگاہ سے غائب تھے. مگر چونکہ اُن اوصاف بتا دیئے گئے جس سے کہ وہ مثل محسوس کے ہو گئے. لہٰذا اُن کی طرف اُولٰٓئِكَ سے اشارہ فرمادیا گیا. **اَصْحٰبُ النَّارِ**. اصحاب جمع صاحب کی ہے جس کے معنی ہیں ساتھی یعنی کافر آگ کے ساتھی ہیں. اور اُس میں ہمیشہ رہنے والے. یا اس کے معنی ہیں. والے اور مالک جیسے کہا جاتا ہے. کہ صاحب علم اور صاحب مال. تو آیت کا مطلب یہ ہوا. کہ یہ لوگ آگ والے ہیں. اور آگ انہی کی خاطر بنائی گئی ہے. بعض گنہگار مسلمان بھی اگرچہ عارضی طریقے پر آگ میں رہیں گے. لیکن آگ اُن کی خاطر بنی نہیں ہے. وہ کافروں کے طفیلی ہوں گے. **النَّارِ** اگرچہ دوزخ میں ٹھنڈے طبقے بھی ہیں. لیکن تھوڑے اور اُس کے مستحقین بھی تھوڑے اس لئے جہنم کو آگ ہی سے تعبیر کرتے ہیں. یا یوں کہو. کہ اُن کی ٹھنڈک بھی آگ ہی کی وجہ سے ہے. دوزخ میں آگ ایک ہی جگہ جل رہی ہے. لیکن اُسکے قرب اور دُور ہونے کی وجہ سے ہر طبقے کی گرمی مختلف جیسے کہ حمام میں آگ ایک جگہ مگر گرمی مختلف یا آسمان پر سورج ایک جگہ مگر زمین کی ہر ولائت میں گرمی سردی جُداگانہ تو دوزخی کسی بھی طبقے میں رہے. اُس کا تعلق آگ سے ہی ہے. کوئی آگ سے قریب رہ کر گرمی میں ہے کوئی دُور رہ کر سردی میں **هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ**. **هُمْ** سے معلوم ہوتا ہے. کہ آگ میں ہمیشہ رہنا صرف کافروں کے لئے ہے مومن کتنا

ہی گنہگار ہو کبھی نہ کبھی دوزخ سے ضرور نکل جائے گا خیال رہے۔ کہ مومن و کافر ہونے میں خاتمے کا اعتبار ہے یعنی جس کا خاتمہ ایمان پر ہو۔ وہ مومن ہے۔ اور جس کا کفر پر ہو وہ کافر اگرچہ زندگی میں کیسے ہی ہوں۔ وہ ہی اُس جگہ مراد ہیں۔ **خلاصۂ تفسیر** جبکہ مومنوں کا انعام بیان فرمادیا گیا۔ تو اب کافروں کے عذاب کا ذکر ہوا۔ اور فرمایا گیا۔ کہ جو ہماری ہدایت کو دل سے نہ مانے گا۔ اور ہماری کسی نشانی دکتاب یا پیغمبر یا دینی چیز، کا زبان سے انکار کریگا۔ یا اُن میں غور تامل نہ کرے گا۔ بلکہ جانوروں کی طرح کھانے پینے اور دنیا کے مزے اڑانے ہی کو اپنا مقصد اصلی سمجھے گا۔ وہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں جلے گا۔ اور کبھی بھی وہاں سے نکل نہ سکے گا۔ **فائدے**۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا** یہ کہ کفر و ایمان کے درمیان کوئی اور درجہ نہیں یعنی انسان یا مومن ہوگا یا کافر۔ یہ ناممکن ہے۔ کہ نہ مومن ہو نہ کافر۔ کیونکہ اس آیت میں انسانوں کی دو ہی قسمیں کی گئیں۔ لہٰذا منافقین تو کافر ہیں۔ اور مسلمانوں کے بچے مومن۔ کفّار کے بچے شرعاً کافر عنداللہ رب جانے **دوسرے** یہ کہ دوزخ اور جنّت کے علاوہ کوئی مستقل جگہ نہیں۔ اعراف ایک عارضی مقام ہوگا۔ جیسے کہ راستے میں منزل اس کی تحقیق انشاءاللہ سورہ اعراف میں ہی کی جائے گی کیونکہ قرآن پاک میں ہر جگہ ان دو ہی مقامات کا ذکر آتا ہے **تیسرے** یہ کہ دل کا کفر اور زبان کا انکار دونوں کا ایک ہی حکم ہے کیونکہ یہاں کَفَرُوْا اور کَذَّبُوْا کی ایک ہی سزا بیان فرمائی **چوتھے** یہ کہ دین کی کسی یقینی بات کا انکار درحقیقت اُس کی ساری باتوں کا انکار ہے۔ کیونکہ یہاں فرمایا گیا۔ اٰیٰتِنَا **پانچویں** یہ کہ ایمان کی طرح کفر میں بھی زیادتی کمی ناممکن ہے یعنی سارے قرآن پاک کا منکر اور ایک آیت کا منکر یا صرف قیامت کا منکر پورے کافر ہیں۔ اِن میں سے کوئی آدھا یا چوتھائی کافر نہیں۔ کیونکہ اس آیت میں ہر کافر کی ایک ہی سزا بیان ہوئی۔ ہاں ایمان کی طرح کفر کے بھی چند عارضی مرتبے ہیں بعض سخت کافر بعض ہلکا۔ بعض کافر گر۔ اس لحاظ سے دوزخ کے طبقے اور اُن کے عذاب علیحدہ علیحدہ ہیں **چھٹے** یہ کہ جس شخص تک اسلامی احکام نہ پہنچے ہوں۔ اُس کے لئے صرف اللہ کو ایک ماننا کافی ہے۔ اگر وہ موحد ہو جائے۔ تو مومن ہوگا۔ نہ کہ کافر کیونکہ کفر کے معنی ہیں۔ انکار اور انکار بغیر خبر نہیں ہو سکتا۔ اور نہ بے خبر کو منکر کہا جا سکے۔ لہٰذا حضور کے والدین کریمین کو کافر نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وہ موحد تھے۔ اور اسلام کے تشریف لانے سے پہلے انتقال فرما گئے۔ اس آیت میں فرمایا گیا۔ کہ جو ہماری آیتوں کو جھٹلائے وہ جہنمی بتاؤ۔ انہوں نے کونسی آیات الٰہی کا انکار کیا تھا۔ بلکہ حق تو یہ ہے۔ کہ از آدم علیہ السلام تا حضرت عبداللہ حضور کے نسب میں کوئی کافر نہ گزرا۔ انشاءاللہ اس کی تحقیق لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ اور تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ میں کی جائے گی اور ہماری کتاب "شان حبیب الرحمٰن" میں بھی دیکھو۔ **پہلا اعتراض** جس کے دل میں ایمان ہو اور زبان سے ظاہر کرنے کا موقعہ نہ ملے وہ کس زمرے میں شمار ہے **جواب** وہ اللہ کے نزدیک مومن ہے۔ مگر شرعاً اُس کا اسلام ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے اُس کی نماز جنازہ وغیرہ نہیں پڑھ سکتے۔ **دوسرا اعتراض** ایسا شخص جنّت میں ہوگا۔ یا دوزخ میں **جواب** وہ آخر کار بغیر شفاعت جنّت میں جائیگا۔ حدیث شریف میں ہے۔ کہ شفاعت کرنے والے رائی بھر ایمان والوں کو بھی جہنّم سے نکال لے جائیں گے۔ تب رب تعالیٰ اپنا دست قدرت بھر کر جہنّمیوں کو جنّت میں پہنچائے گا۔ اِس دستِ قدرت میں اسی قسم کے لوگ ہوں گے جن کا ایمان شرعی نہ تھا **تیسرا اعتراض** مشرکین کے بچے کس زمرے میں ہیں۔ کیونکہ اُن پر اس آیت کا کوئی جز وصادق نہیں آتا **جواب** بہت ممکن ہے۔ کہ وہ جنّت میں مومنوں کے خادم بنا کر رکھے جائیں۔ مگر بہتر یہ ہے۔ کہ اُن کے متعلق خاموشی اختیار کی جائے کیونکہ اس میں روائتیں مختلف ہیں۔ **چوتھا اعتراض**۔ ابوطالب اس آیت کے دونوں مضمونوں سے خارج معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اُنہوں نے نہ تو ہدایت اختیار کی اور نہ انکار کیا۔ اُن کے اشعار سے حضور کی تعریف ثابت ہے۔ **جواب**۔ اِن کا ایمان شرعاً ثابت نہیں ہوا۔ صرف نعت گوئی یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس لئے خدمت کرنا۔ کہ وہ میرے بھائی کے فرزند ہیں۔ اس سے شرعاً ایمان ثابت نہیں ہو سکتا۔ ایمان نام تصدیق کا ہے یعنی سچا ماننا نہ کہ محض جاننا ہاں بہت ممکن ہے۔ کہ یہ اللہ کے نزدیک مومن ہوں۔ انشاءاللہ اس کی تحقیق بھی کسی مقام پر کردی جائیگی **تفسیر صوفیانہ** ہر انسان فطرت (پیدائشی ایمان) پر پیدا ہوتا ہے جو کہ اُس کے قلب میں تخم کی طرح ہے جنہوں نے کہ اُس تخم محبت کو نفسانی شہوتوں میں چھپا دیا۔ اور انکار کی گرم ہواؤں سے اُس کو جلا دیا۔ وحی اور الہام کی خوش گوار پانی اور ہوائیں اُس تک نہ پہنچنے دیں۔ اور اُس میں معرفت

قربت کے پھل نہ لگنے دیئے یہاں تک کہ اُس کو فاسد کر دیا وہ ہمیشہ نار فراق میں رہیں گے۔ اور کبھی اُس سے نجات نہ پائیں گے۔

## حضرت آدم کے قصّے کے فائدے

اس پورے واقعہ سے چند عجیب عجیب فائدے حاصل ہوئے۔ ایک یہ کہ سب کا بہکانے والا شیطان اور شیطان کو بہکانے والا نفس لہٰذا نفس شیطان سے زیادہ خطرناک ہے مولانا فرماتے ہیں ؎ نفس ماہم کمتر از فرعون نیست ؛ لیک اورا عون ماراعون نیست دوسرے یہ کہ دنیا میں سب سے پہلا گناہ (شیطان کی نافرمانی) حسد سے ہوا معلوم ہوا کہ حسد تمام گناہوں کی جڑ ہے حسد کی وجہ سے نفس عقل کو ڈھک لیتی ہے۔ دیکھو حسد۔ حرص۔ ہوس۔ طمع یہ سب نقطوں سے خالی ہیں۔ ایسے ہی حاسد وغیرہ بھی دنیا کی ہر نعمت سے محروم تیسرے یہ کہ جہاں تک شیطان براہ راست نہ پہنچ سکے۔ وہاں عورت کے ذریعے سے پہنچتا ہے۔ جیسے کہ آدم علیہ السلام پر بذریعے حضرت حوّا اُس نے حملہ کیا چوتھے یہ کہ نبوّت اعمال سے نہیں حاصل ہوتی۔ بلکہ محض رب کے فضل سے ورنہ شیطان یا کسی فرشتے کو ملنی چاہیئے تھی۔ پانچویں یہ کہ پیغمبر کی توہین کرنیوالے کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی رب نہیں چاہتا کہ میری جنت میں کوئی میرے دوست کا دشمن آجائے چھٹے یہ کہ نبی کی توہین کے ساتھ خدا کی توحید شیطانی توحید ہے۔ جو کہ مردود بنا دیتی ہے۔ ساتویں یہ کہ انسان نے دنیا میں آکر سب سے پہلی عبادت گریہ وزاری اور استغفار کی۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ

اے اولاد یعقوب کی یاد کرو احسان میرا وہ جو کہ احسان کیا میں نے اوپر تمہارے اور پورا کرو عہد میرا

اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان۔ جو میں نے تم پر کیا۔ اور میرا عہد پورا کرو

اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾

پورا کروں گا میں عہد تمہارا اور مجھ سے ہی پس ڈرو تم لوگ

میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ اور خاص میرا ہی ڈر رکھو۔

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ پہلے عام انسانوں کو رب کی عام نعمتیں یاد دلا کر ایمان کی رغبت دی گئی۔ اب خاص بنی اسرائیل کو اُن کے خاص احسان الٰہی یاد دلا کر ایمان کی طرف راغب کیا گیا۔ کیونکہ سورہ بقر مدنی ہے۔ اور مدینہ منورہ میں بنی اسرائیل بکثرت آباد تھے۔ اور یہ لوگ اہل علم بھی تھے۔ اور اہل کتاب بھی۔ انکی وہاں عزت بھی تھی انکے ایمان لانے سے دوسرے بہت سے لوگ ایمان لے آتے۔ اور یہی لوگ نبی آخر الزمان کی خوشخبریاں بھی دیا کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس سے پہلے عام لوگوں کو وہ عہد وپیمان یاد دلائے گئے تھے جو کہ انہوں نے میثاق کے دن رب سے کئے تھے۔ اب بنی اسرائیل کو وہ خاص عہد وپیمان یاد دلائے جا رہے ہیں جو کہ اُن سے خاص طور پر لئے گئے تھے۔ تیسرے یہ کہ بنی اسرائیل کا قصہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصّے کے مطابق تھا کہ آدم علیہ السلام سے بھی ایک خطا کی وجہ سے جنت کا عیش و آرام چھوٹا۔ دنیا کی مشقتیں پڑگئیں بنی اسرائیل سے بھی ایک خطا کی وجہ سے من وسلوٰی کا آرام چھوٹا۔ اور اُن پر دنیاوی مصیبتیں نازل ہوئیں چوتھے یہ کہ پہلے معلوم ہو چکا۔ کہ شیطان کو حسد نے تباہ کر دیا کہ وہ آدم علیہ السلام سے پہلے اپنے کو خلافت کا حقدار سمجھتا تھا۔ آدم علیہ السلام کی قدر ومنزلت اُس سے دیکھی نہ گئی۔ اور اُن کا انکار کر کے ملعون ہوا۔ کفار بنی اسرائیل بھی حضور علیہ السلام کی تشریف آوری سے پہلے سمجھتے تھے۔ کہ پہلے پیغمبروں کی طرح نبی آخر الزمان بھی بنی اسرائیل ہی میں سے ہوں گے۔ مگر جب بنی اسمٰعیل میں سے حضور تشریف فرما ہوئے۔ تو یہ لوگ حسد سے منکر ہو گئے۔ نیز حضورؐ سے پہلے مدینہ منورہ میں علماء بنی اسرائیل کی بہت عزت اور اُن کو کافی آمدنی تھی۔ مگر حضور علیہ السلام کی تشریف آوری سے اُن کی وہ قدر ومنزلت نہ رہی جس کی وجہ سے بعض تو کھلے دشمن بن گئے۔ اور بعض منافق۔ لہٰذا اب اُن سے خطاب

ہو رہا ہے۔ کہ اے بنی اسرائیل تم شیطان کے واقعہ سے عبرت حاصل کرو۔ وہ بھی حسد ہی کا شکار ہوا تھا کہیں تم بھی حسد سے اُس کی طرح نہ ہو جاؤ۔ لہٰذا یہاں سے سیقول تک اُن سے ہی کلام جاری ہے۔ **پانچویں** اس طرح کہ اس سے پہلے آدم علیہ السلام کے واقعات بیان فرما کر حضور علیہ السلام کی نبوت ثابت فرمائی گئی۔ کہ اگر ہمارے محبوب علیہ السلام سچے پیغمبر نہ ہوتے۔ تو بغیر پڑھے ہوئے گذشتہ واقعات اس طرح سچے اور صحیح کیسے بیان فرما دیتے۔ اب بنی اسرائیل کے گذرے ہوئے سارے واقعات بلا کم و کاست بیان ہو رہے ہیں۔ تاکہ یہ لوگ ان واقعات کو اپنی کتابوں کے موافق پا کر حضور علیہ السلام کی نبوت کے قائل ہوں۔ اس کے سواء اور بھی وجوہ تعلق نکل سکتے ہیں۔ مگر اتنے ہی میں کفایت ہے۔ یہ قصے کا قصے سے تعلق تھا۔ آیات کا تعلق ہر آیت کے ساتھ انشاء اللہ بیان ہوگا۔ **تفسیر** یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ندا چند طرح کی ہوتی ہے۔ یہاں غافلوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی نداء ہے۔ بنی ابن کی جمع بنین بھی آتی ہے۔ اور ابناء بھی یہاں پہلی جمع ہے۔ اگرچہ ابن لغتہً بیٹے کو کہتے ہیں مگر اصطلاح میں اولاد کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ خواہ بیٹی ہو یا بیٹا اور خواہ قریبی ہوں یا دور کے۔ جیسے کہ بنی آدم اسی معنی میں یہ بنی بھی ہے۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ آپ کا نام یعقوب تھا یعقوب عقب سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پیچھے۔ چونکہ حضرت یعقوب اور اُن کے بھائی عیص ایک ساتھ (جڑواں) پیدا ہوئے تھے مگر حضرت عیص کسی قدر پہلے اور یعقوب پیچھے اسلئے ان کا نام یعقوب ہوا۔ یہ اپنے والد اسحاق علیہ السلام کے بہت خدمتگار فرزند تھے۔ ایک دفعہ حضرت اسحاق عبادت کے لئے گوشہ نشین ہوئے۔ اور ان کو دروازہ حجرے پر بٹھا دیا۔ کہ کسی کو اندر نہ آنے دینا۔ اچانک ایک مقرب فرشتہ انسانی شکل میں آیا۔ اور حضرت اسحاق کی ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ آپ نے منع کیا۔ مگر وہ نہ مانا۔ انہوں نے اُس کو جبراً روکا حضرت اسحاق علیہ السلام دروازے کا شور سُن کر باہر آئے۔ دیکھا۔ تو حضرت یعقوب فرشتہ سے جھگڑ رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ برخوردار یہ فرشتہ مقرب ہے۔ اور فرشتہ سے معذرت فرمائی۔ کہ انہوں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ اُس فرشتہ نے یعقوب علیہ السلام کی بہت تعریف کی اور فرمایا۔ کہ اسی طرح حق خدمت ادا کرنا چاہیئے۔ اور فرمایا۔ کہ ہماری طرف سے ان کا نام اسرائیل رکھو (تفسیر عزیزی) اسرائیل دو لفظوں سے بنا ہے۔ اسر اور ایل دسرا کے معنی یا تو بندہ ہیں اور یا برگزیدہ اور ایل زبان عبرانی میں حق تعالیٰ کا نام ہے۔ لہٰذا اسرائیل کے معنی یا تو ہیں اللہ کا بندہ یعنی عبداللہ اور یا اللہ کا مقبول بندہ چونکہ یہ نام فرشتہ نے تجویز کیا تھا۔ اس لئے فرشتوں کا سا ہی نام ہے۔ جیسے کہ جبرائیل میکائیل۔ اسرافیل وغیرہ **خیال** رہے۔ کہ اُن کی اولاد کا نام بنی اسرائیل ہوا۔ نہ کہ بنی یعقوب کیونکہ یہ نام حضرت یعقوب کو خدمت کے صلہ میں ملا تھا۔ اُن کی اولاد کو بنی اسرائیل فرمانے میں اُن کو اطاعتِ الٰہی کی رغبت دینا ہے۔ کہ تم اُس کے فرزند ہو جس نے اطاعت کر کے ہماری طرف سے اعلیٰ خطاب پایا۔ تم بھی اپنے خطاب یافتہ والد کے نقش قدم پر چل کر اچھا خطاب حاصل کرو۔ بنی اسرائیل کے باقی واقعات اور یعقوب علیہ السلام کے کچھ حالات انشاء اللہ اسی آیت کے خلاصہ تفسیر میں بیان ہوں گے۔ اُذْكُرُوْا یہ لفظ یا تو ذکر ذال کے پیش سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ یاد رکھنا یعنی بھول نہ جانا۔ یا ذِکر ذال کے زیر سے جس کے معنی ہیں بیان کرنا جس کا مقابل ہے خاموشی لہٰذا یا تو اس کے معنی ہوئے۔ کہ اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھو۔ یا کہ اُن کا چرچہ کرو (تفسیر روح البیان) ہم کو بھی حکم ہے۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔ نِعْمَتِیَ نعمت اُس نفع کو کہتے ہیں جو کہ بطریق احسان کسی کو پہونچایا جاوے۔ یہاں اس سے جنس نعمت مراد ہے نہ کہ خاص ایک نعمت یعنی اُس نعمت و کرم کو یاد کرو جو کہ خاص تم پر کئے گئے۔ جیسے کہ فرعون کو ہلاک کرنا تمہیں مصر کا ملک دینا۔ تمہارے لئے دریا کو خشک کرنا۔ تم پر من وسلویٰ برسانا۔ تم کو توریت شریف وغیرہ عطا فرمانا تمہارے لئے پتھر سے پانی کے چشمے نکالنا۔ تمہارے گروہ میں پیغمبروں کا بھیجنا وغیرہ وغیرہ اَلَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ یعنی وہ نعمتیں جو ہم نے خاص تم کو عطا فرمائیں یعنی تم کو ایک تو عام لوگوں کے ساتھ عام نعمتوں سے حصہ دیا۔ اور اُن کے علاوہ خاص وہ نعمتیں دیں۔ کہ جو تمہارے سواء دوسرے قبیلوں کو نہ ملیں۔ اور زیادہ نعمتیں زیادہ شکر کا باعث ہیں۔ اور بمقابلہ دوسروں کے تم کو بہت جلد ایمان لانا چاہیئے۔ بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری تمہارے واسطے خصوصاً بڑی نعمت ہے۔ کیونکہ ان کی تشریف آوری سے تمہاری کتابوں تمہارے پیغمبروں کا دنیا بھر میں قیامت تک

کے لئے چرچا ہوگا وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْ۔ اَوْفُوْا۔ وفاءٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ پورا کرنا۔ اور عہد باہمی قرار داد اور آپس کے معاہدے کو کہتے ہیں۔ تو مطلب یہ ہوا۔ کہ اے بنی اسرائیل تم نے جو کچھ ہم سے عہد و پیمان کر لیا ہے۔ اب وہ پورا کرو۔ اس عہد میں چند احتمالات ہیں۔ ایک یہ کہ حق تعالےٰ نے سارے بندوں سے اپنی ذات وصفات اور تمام پیغمبروں پر ایمان لانے کا عہد لیا تھا جس میں بنی اسرائیل بھی شامل تھے۔ تو مطلب یہ ہوا۔ کہ سب کو ہی عہد پورا کرنا ضروری ہے۔ مگر تم کو خاص طور پر زیادہ ضروری۔ کیونکہ تم پر سرکاری انعام زیادہ ہوئے دوسرے یہ کہ اس سے خاص وہ عہد مراد ہے۔ جو کہ بنی اسرائیل سے لیا گیا جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا تیسرے یہ کہ اس سے نبی آخر الزمان پر ایمان کا عہد مراد ہے۔ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ چوتھے۔ یہ کہ اس سے وہ عہد مراد ہے۔ جو کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے اُترتے وقت لیا گیا تھا۔ کہ جب ہماری طرف سے ہدایت پہونچے تو اُس کی پیروی کریں۔ پانچویں یہ کہ اس سے وہ عہد مراد ہے جو کہ تمام پیغمبروں سے نبی آخر الزمان کی اطاعت کرنے کا لیا گیا چونکہ نبی کا عہد ساری اُمّت کا عہد ہوتا ہے۔ اس لئے فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اے بنی اسرائیلیو اگر تمہارے پیغمبران عظام ہی بظاہر دنیا میں جلوہ گر ہوتے۔ تو اس نبی پر ایمان لاتے۔ خوش قسمتی سے تم کو یہ موقعہ ملا ہے۔ تم فوراً وہ عہد پورا کرو چھٹے یہ کہ اس سے وہ عہد مراد ہے جو کہ علماء اہل کتاب سے لیا گیا۔ کہ ہماری نبی آخر الزمان کے اوصاف جو توریت وانجیل میں ہوں۔ اُن کو نہ چھپائیں اور نہ مٹائیں تو فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اے بنی اسرائیل اُس عہد کے پورا کرنے کا وقت اب آیا اُٹھو ہاتھ میں توریت وانجیل لو۔ اس محبوب کے اوصاف لوگوں کو سناؤ اور سب کو ان کی طرف بلاؤ اور رب جانتا ہے۔ کہ اگر علماء اہل کتاب حضور کے وہ اوصاف جو کہ پچھلی کتابوں میں تھے نہ چھپاتے تو میرے خیال میں کوئی عیسائی اور یہودی کافر نہ رہتا سب اسلام لے آتے۔ انشاء اللہ حضور کے اس قسم کے اوصاف ہم اس تفسیر میں آئندہ بیان کریں گے۔ اور اپنی کتاب شان حبیب الرحمٰن میں بھی بیان کر چکے ہیں وَاُوْفِ بِعَهْدِكُمْ سبحان اللہ کیا پیارا اور امید افزا ارشاد ہے۔ کہ رب فرما رہا ہے۔ تم میرا عہد پورا کرو۔ تو میں تمہارا عہد پورا کرونگا۔ خیال رہے۔ کہ پہلے جملہ میں عہد کی اضافت فاعل کی طرف ہے اور دوسرے میں مفعول کی طرف تو معنی یہ ہوئے۔ کہ تم وہ عہد پورا کرو۔ جو کہ میں نے تم سے لیا اور میں وہ عہد پورا کروں گا۔ جو کہ میں نے اپنے کرم سے تم سے کر لیا ہے۔ رب نے بھی ہم سے اپنے فضل سے بہت سے وعدے فرمائے ہیں۔ [۱] تمہارے اعمال قبول فرمائے جائیں گے۔ [۲] تم کو جنت میں واپس بلایا جاوے گا۔ [۳] تمہارے گناہ معاف کئے جائیں گے۔ [۴] تم کو دین ودنیا کے غم سے نجات دی جاویگی۔ [۵] تم کو عزت وعظمت بلکہ سلطنت دی جاویگی۔ [۶] تم کو اپنا دیدار دیا جاویگا۔ مگر یہ تمام عہد اس صورت میں ہیں۔ کہ تم اُس محبوب کے وفادار رہو۔

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں — یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

خلاصہ یہ ہوا۔ کہ اوّل تو یوں بھی مرد کو اپنی زبان کا پاس چاہیئے جو کہے وہ کر کے دکھاوے۔ تم بھی میرا عہد پورا کر کے دکھا دو۔ دوسرے یہ عہد تو رب کے ساتھ نفع بخش تجارت بھی ہے۔ کہ ایک عہد پورا کرو ہزار ہا گونہ نفع پاؤ۔ پھر عہد کو توڑنا سراسر نافرمانی اور نامردی کی بات ہے۔ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ علماء بنی اسرائیل کو خطرہ تھا کہ اگر ہم اسلام قبول کرلیں۔ تو ہماری وہ آمدنیاں بند ہو جائیں گی۔ اور وہ نذریں نیازیں اور تحفے ہدیے وغیرہ ختم ہو جائیں گے۔ جو ہم کو اپنے جہلا سے حاصل ہوتے ہیں۔ نیز ہماری وہ سرداری بھی جاتی رہے گی جو ہم کو اب حاصل ہے۔ تو ان کو فرمایا گیا۔ کہ تم دنیا والوں اور یہاں کی مصیبتوں وغیرہ سے نہ ڈرو۔ بلکہ صرف ہم سے خوف کرو یعنی ایمان لانے میں تم کو دنیوی نقصان ہے۔ اور ایمان نہ لانے میں ہماری ناراضگی جو دنیا اور آخرت کا وبال ہے۔ اور اُس سے یہ زیادہ سخت ہے۔ لہذا ہم سے ہی خوف کر کے ایمان لے آؤ خیال رہے۔ کہ ڈر دو قسم کا ہوتا ہے۔ عذاب سے اور جلال سے پہلا ڈر تو دور ہو سکتا ہے۔ دوسرا نہیں یعنی خوف جلال ہر وقت رہتا ہے۔ اسی لئے یہاں اِيَّايَ فرمایا گیا یعنی میری کبریائی اور جلالت ذات سے ڈرو یہ نہ کہا گیا۔ وَعِقَابِیْ فَارْهَبُوْنِ یہ بھی خیال رہے۔ خوف اور رہب میں فرق ہے۔ خوف تو محض ڈر جانا ہے۔ اور رہب ڈر کر بُرائیوں سے رُک جانا۔ اللہ کا عذاب سنا۔ دل کانپ گیا۔ چار آنسو بہہ گئے۔ یہ خوف ہوا۔ اور اللہ کی پکڑ سے ڈر کر گناہوں سے توبہ کر لی۔ اور پھر ان

کے قریب نہ گئے۔ یہ رعب ہوا۔ یہاں فرمایا گیا۔ کہ مجھ سے ڈر کر میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے باز آجاؤ۔ **خلاصۂ تفسیر** بنی اسرائیل حسد اور خوف کی وجہ سے اسلام قبول نہ کرتے تھے کیونکہ اُن کا خیال تھا۔ کہ نبی آخر الزمان بھی ہمارے ہی خاندان سے ہوں گے جب اولاد اسمٰعیل ع میں یہ آفتاب چمکا یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جلوہ گری ہوئی۔ تو یہ لوگ جل کر خاک سیاہ ہو گئے حق تعالٰے نے ارشاد فرمایا کہ اے بے وقوفو تم اپنے انعامات کو بھی یاد کرو۔ کہ تم میں انبیاء علیہم السلام بھیجے کتابیں نازل فرمائیں۔ تمہیں غلبہ دیا حکومت اور عزت عنایت کی دولت اور سلطنت عطا فرمائی۔ جلالت اور حشمت تمہارے حصے میں آئی۔ علم وفضل تمہیں دیا گیا۔ جاہ وجلال تمہیں بخشا گیا۔ اب اگر آخری نبی علیہ السلام بنی اسمٰعیل میں تشریف لے آئے تو اس میں تمہارا کیا بگڑ گیا کیا رب کی ساری نعمتوں کے تم ہی ٹھیکیدار ہو۔ اس حسد سے باز آجاؤ۔ اور اپنی تمام نعمتوں کو یاد کر کے اپنا وہ وعدہ پورا کرو۔ جو تم نے ہم سے کیا تھا۔ کہ جب نبی آخر الزمان تشریف لائیں گے۔ تو ہم اُن پر ایمان لائیں گے۔ ہم نے بھی جو تم سے وعدہ کیا ہے۔ پورا کر دیں گے۔ یعنی تم کو غلبہ دیں گے۔ اور دینی اور دنیاوی نعمتوں سے مالا مال کر دیں گے۔ اور تم کو جو اپنی آمدنی وغیرہ کے بند ہونے کا ڈر لگا ہے۔ اس کو دل سے نکال دو۔ صرف ہم سے خوف کرو۔ اگر تم ایمان لے آئے۔ تو دیکھنا۔ کہ تمہاری عزت آبرو مال و دولت وغیرہ میں اور ترقی ہوگی۔

**بنی اسرائیل** حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل کے پاس شہر کسدیون میں رہتے تھے جس کا دوسرا نام آر تھا۔ وہاں سے آپ کے والد تارح اپنے بیٹے ابراہیم اور پوتے لوط اور حضرت ابراہیم کی بیوی سارہ کو لے کر وہاں سے جنوب کی طرف مقام حرآل میں آبسے۔ وہاں ہی تارح نے وفات پائی پھر وہاں سے ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی سارہ اور لوط علیہ السلام کو لے کر ملک کنعان میں آئے اور حیتون کے علاقہ میں مقام حبرون میں قیام فرمایا۔ آپ کی دو بیبیاں تھیں بڑی بیوی حضرت سارہ اور چھوٹی حضرت ہاجرہ اور آپ کے آٹھ بیٹے تھے حضرت سارہ سے ایک بیٹا حضرت اسحاق اور ہاجرہ سے سات اسمٰعیل[1] جو سب سے بڑے تھے۔ زمران[2] دوسرے یقسان[3] تیسرے مدان[4] چوتھے۔ مدیان[5] پانچویں اسباق[6] چھٹے۔ سوخ[7] ساتویں (تفسیر حقانی) ان میں سے اسمٰعیل علیہ السلام عرب میں آن بسے تھے۔ ان کی اولاد کو بنی اسمٰعیل کہتے ہیں۔ اور انہیں میں سے حضرت محمد مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم ہیں مگر اسحاق علیہ السلام کنعان میں ہی رہے۔ اسحاق علیہ السلام نے لوط علیہ السلام کی لڑکی سے نکاح کیا جن سے دو بیٹے ایک ہی حمل سے پیدا ہوئے۔ ایک عیص اور دوسرے یعقوب علیہ السلام۔ اسحاق علیہ السلام نے اپنی آخر عمر میں اُن کو اپنا سجادہ نشین بنایا۔ اور یعقوب ع کو دعا دی۔ کہ حق تعالٰی تمہاری اولاد میں نبوت جاری رکھے۔ اور عیص سے فرمایا۔ کہ تمہاری نسل میں بادشاہت رہے۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنا خاص جانشین بنا کر وصال فرما گئے۔ عیص بہت مالدار ہو گئے۔ اور یعقوب علیہ السلام مسکین ان کی والدہ نے مشورہ دیا کہ اے یعقوب تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ تم اپنے ماموں لایان کے گھر چلے جاؤ۔ وہ مالدار آدمی ہیں تمہاری پرورش بھی کریں گے۔ اور ممکن ہے کہ اپنی بیٹی سے تمہارا نکاح بھی کر دیں۔ یعقوب علیہ السلام اپنے ماموں کے گھر آگئے۔ وہ اُن کے آنے سے بہت خوش ہوئے۔ اور کچھ روز بعد اپنی بڑی بیٹی سے ان کا نکاح بھی کر دیا جس سے چار بیٹے پیدا ہوئے۔ روبیل[1]۔ شمعون[2]۔ لادہ[3]۔ یہودا[4]۔ اس کے بعد یعقوب علیہ السلام کی بیوی انتقال کر گئیں۔ لایان نے اپنی دوسری بیٹی ان کے نکاح میں دے دیں۔ جن سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ اور وہ بھی فوت ہو گئیں۔ پھر لایان نے اپنی تیسری بیٹی انکے نکاح میں دی جن سے چند بیٹے پیدا ہوئے۔ اور یہ بھی انتقال کر گئیں۔ پھر لایان کی چوتھی بیٹی آپ کے نکاح میں آئیں جن کا نام راحیل تھا۔ انہیں سے یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے۔ اب یعقوب علیہ السلام کی عمر چالیس سال کی ہو چکی تھی۔ ان کو نبوت ملی۔ اور حکم ملا۔ کہ کنعان جا کر تبلیغ کرو۔ لایان اپنے داماد کی نبوت پر بہت خوش ہوئے۔ اور یعقوب علیہ السلام کو مع ان کی بیوی راحیل اور ان کی ساری اولاد کے رخصت کیا۔ اور رخصت کے وقت پانچ سو بکریاں اور پانچ سو بیل اور پانچ سو اونٹ اور پانچ سو خچر جہیز دیا۔ بہت سے غلام بہت سے جوڑے اور بہت روپیہ ان کو دیا۔ جب آپ اس ساز وسامان کے ساتھ کنعان پہنچے۔ تو عیص نے ان کا استقبال کیا۔ اور ان کی آمد کی بڑی خوشی منائی اور عرض کیا۔ کہ میرے لئے دعا کرو۔ کہ میری نسل میں بھی کوئی پیغمبر ہو۔ آپ نے فرمایا۔ کہ تمہاری اولاد میں ایوب علیہ السلام

اور سکندر ذوالقرنین ہوں گے۔ یوسف علیہ السلام دو برس کے تھے کہ اُن کے بھائی بنیامین پیدا ہوئے۔ اور ان کی پیدائش میں انکی والدہ راحیل کا انتقال ہوگیا۔ جب لایان نے یہ واقع سنا۔ تو انہوں نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کا نکاح بھی یعقوب علیہ السلام سے کردیا۔ اور اسی بیٹی نے یوسف علیہ السلام اور بنیامین کی پرورش کی (تفسیر عزیزی) یعقوب علیہ السلام کے کل بارہ بیٹے تھے۔ روبیل۱ شمعون۲۔ لاوی۳۔ یہودا۴۔ اسکار۵۔ زبلون۶ دان۷۔ نفتالی۸ جد۹۔ اشر۱۰۔ یوسف۱۱۔ بنیامین۱۲۔ ان بارہ بیٹوں کی اولاد بہت ہوئی۔ اور ان کے نام سے بارہ قبیلے مشہور ہوئے۔ ہر ایک قبیلے کو سبط کہتے ہیں جس کو جمع ہے۔ اسباط ان قبیلوں میں بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبر پیدا ہوتے رہے۔ جیسے حضرت موسےٰ۔ داؤد و سلیمان و عیسیٰ علیہم السلام انہیں قبیلوں کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ یہ لوگ روئے زمین پر بہت متبرک مانے جاتے تھے حضور علیہ السلام کے زمانے میں مدینہ منورہ اور خیبر وغیرہ میں بکثرت آباد تھے۔ اب بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ اللہ کی نعمتوں کا ذکر کرنا حکم قرآنی ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کو اس کا حکم دیا گیا۔ لہٰذا محفل میلاد شریف بہت مبارک ہے۔ کیونکہ اس میں حضور علیہ السلام کی تشریف آوری کا ذکر پاک ہوتا ہے جو کہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ دوسری جگہ قرآن پاک فرماتا ہے قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَبِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔ یعنی اللہ کی رحمت پر خوب خوش ہو۔ **دوسرا** یہ کہ نعمت کا شکر اور وعدہ پورا کرنا بہت ضروری ہے۔ **تیسرے** یہ کہ مسلمان کو چاہیئے۔ کہ اللہ کے سوا کسی سے خوف نہ کرے۔ **چوتھے** یہ کہ امت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیل سے افضل ہے۔ کیونکہ اُن سے تو کہا گیا۔ کہ تم میری نعمتوں کو یاد کرو۔ اور ہم سے ارشاد ہوا۔ اُذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ۔ تاکہ اُن کو نظر نعمت سے منعم کی طرف جائے اور ہماری نظر منعم سے نعمت کی طرف **پانچواں** یہ کہ جس قدر زیادہ نعمت ہوگی۔ اسی قدر نافرمانی کرنا زیادہ وبال۔ **اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ خدا کے سوا کسی سے خوف نہ کرنا چاہیئے۔ پھر تم نبیوں ولیوں سے کیوں خوف کرتے ہو (دیوبندی وہابی) **جواب**۔ اس کا جواب لَاخَوْفٌ کی تفسیر میں گزر چکا انبیاء اولیاء سے خوف حقیقت میں رب سے خوف ہے خدا کے مقابلہ میں کسی سے خوف کرنا جرم ہے تم بھی بادشاہوں اور حاکموں سے خوف کرتے ہو۔

**تفسیر صوفیانہ** رب تعالےٰ نے ایمان فطری اور عقل سلیم دلائل قوی سب کو عطا فرما کر بڑا احسان فرمایا۔ پھر پیغمبروں کو بھیج کر کتابیں اُتار کر علماء و مشائخ کو قائم فرما کر ہم سے ایمان اور نیک اعمال کا عہد لیا۔ اور اپنے فضل و کرم سے اپنے دیدار کا وعدہ فرمایا ہماری طرف سے پہلی وفاء عہد کلمہ شہادت پڑھنا ہے۔ اور رب کی طرف سے ہمارے جان و مال کا محفوظ فرمانا ہے۔ ہماری آخری وفاء عہد دریائے توحید میں۔ اسطرح غرق ہو جانا ہے۔ کہ اپنی بھی خبر نہ رہے لَآ اِلٰہَ کو تلوار سے غیر اللہ کو قطع کر دیا۔ اور اِلَّا اللّٰہ میں فنا ہو کر باقی باللہ بن جانا رب تعالیٰ کی طرف سے دائمی دیدار کا عطا ہونا۔ اس کے درمیان وفاء عہد کے صدہا درجات اور اُس طرف سے عطا کے ہزارہا درکات ہیں۔ امام قشیری فرماتے ہیں۔ کہ اس سے مراد یہ ہے۔ کہ اے بندو تم دار الحجاب یعنی دنیا میں میرا عہد پورا کرو میں دار قربت یعنی جنت میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ تم ہمیشہ ربی ربی کہہ کر میرا عہد پورا کرو میں اُسکے جواب میں عبدی عبدی کہہ کر اپنا عہد پورا کروں گا۔ تم دار الفراق میں میرا عہد پورا کرو۔ کہ میرے سوا کسی کو مت ڈھونڈو میں دار الوصال میں اپنا عہد پورا کروں گا۔ کہ اپنے سوا اور کسی کی طرف نہ بھیجوں گا۔ تم میرے ہو جاؤ میں تمہارا ہو جاؤں گا۔

ہر سو دود آں کس ز در خویش براند
انرا کہ بخد تد بدر کس نہ دواند

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠

اور ایمان لاؤ ساتھ اُسکے جو اُتاری میں نے سچا کرنے والی واسطے اُسکے جو ساتھ تمہارے ہے اور نہ ہو تم پہلے منکر ساتھ اُس کے

اور ایمان لاؤ اُس پر جو میں نے اُتارا اُس کی تصدیق کرتا ہو۔ جو تمہارے ساتھ ہے اور سب سے پہلے اُس کے منکر نہ بنو

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۡ وَّ اِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

اور نہ خرید و بدلے آیتوں میری کے قیمت تھوڑی اور مجھ سے ہی پس ڈرو تم

اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو۔ اور مجھ سے ڈرو۔

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک** یہ کہ پہلے عہد پورا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اب اُس کی تفصیل فرمائی جا رہی ہے۔ چونکہ عہد بہت تھے۔ اور اُن سب میں ایمان مقدم اس لئے پہلے اسی کا ذکر ہؤا **دوسرے** یہ کہ پہلے اجمالاً نعمت الٰہی کے یاد کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اب اس کی تفصیل فرمائی گئی۔ کہ اے بنی اسرائیل قرآن کریم اور نبی آخر الزمان تمہارے حق میں خاص طور پر بڑی نعمت ہیں۔ کیونکہ ان سے تمہاری کتابوں وغیرہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ لہٰذا فوراً مان جاؤ۔ **شانِ نزول** یہ آیت کعب ابن اشرف اور دوسرے رؤساء اور علماء یہود کے حق میں نازل ہوئی جو اپنی قوم کے جاہلوں سے روپیہ وصول کرتے تھے۔ اور ان کی پیداوار میں اپنے حصے مقرر کر رکھے تھے انہیں فکر ہوئی۔ کہ توریت میں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت موجود ہے۔ اگر ہم اس کو ظاہر کردیں۔ یا خود حضور پر ایمان لے آئیں۔ تو ہماری قوم بھی اُن پر ایمان لے آئے گی۔ اور ہماری یہ آمدنی جاتی رہے گی۔ اس لئے انہوں نے توریت کو بدل ڈالا۔ اور جب لوگ اُن سے پوچھتے۔ کہ توریت میں نبی آخر الزمان کے کیا اوصاف مذکور ہیں۔ تو وہ چھپا لیتے اور ہرگز نہ بتاتے (تفسیر خزائن العرفان وتفسیر خازن) روح البیان نے اس جگہ فرمایا کہ ایک بار کعب ابن اشرف نے علماء یہود سے کہا۔ کہ تم حضور علیہ السلام کے بارے میں کیا کہتے ہو۔ انہوں نے کہا۔ کہ وہ سچے نبی ہیں۔ کعب بولا۔ کہ اگر تم کچھ اس کے خلاف جواب دیتے تو میں تم کو انعام دیتا۔ وہ کہنے لگے۔ کہ ہم نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا۔ ہم کو سوچنے کا موقعہ دو۔ کعب نے کہا اچھا سوچ لو۔ یہ لوگ اس مجلس سے اُٹھے۔ اور حضور کی نعت توریت سے نکال دی اور نبی آخر الزمان کی وہ نعتیں بیان کیں جو دجّال کی ہیں۔ پھر کعب سے آکر کہا۔ تب اُس نے ہر ایک عالم کو چار چار سیر جَو اور چار چار چادریں دیں اُس موقعہ پر یہ آیت کریمہ اُتری مثنوی شریف میں ہے۔

بود در انجیل نامِ مصطفےٰ آں سرِ پیغمبراں بحرِ صفا

بود ذکرِ حلیہائے شکلِ اُو بود ذکرِ غزو و صوم اکلِ اُو

نیز علماء یہود اپنے جہلا سے کچھ رشوت لے کر توریت کے سخت احکام کو بدل کر نرم کر دیتے تھے۔ بلکہ اُمراء یہود کی طرف سے ان علماء کی تنخواہیں اسی لئے مقرر تھیں۔ کہ جب کبھی ہم کو ضرورت پڑے۔ تو دین کے احکام بدل دیا کریں (تفسیر) **وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ** یہ خطاب اُن بنی اسرائیل سے ہے۔ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے جیسے کہ اُذْكُرُوْا اور اَوْفُوْا میں اُن سے تھا۔ پھر قیامت تک کے بنی اسرائیل کو یہ حکم شامل ہو گیا۔ مَآ اَنْزَلْتُ میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے صرف قرآن کریم مراد ہو۔ دوسرے یہ کہ اس سے قرآن پاک اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے باقی تمام فرمان مراد ہوں (تفسیر کبیر) خیال رہے کہ اس جگہ بالقرآن نہ فرمایا۔ بلکہ بِمَآ انزلت فرمایا۔ اس میں اشارہ اس جانب ہے۔ کہ اے بنی اسرائیل تم ان توریت و زبور و انجیل وغیرہ پر اس ہی لئے تو ایمان لائے ہو کہ وہ ہماری اتاری ہوئی ہیں۔ لہٰذا قرآن بھی ہمارا اُتارا ہؤا ہے۔ تمہارا فرض ہے۔ کہ اس پر ایمان لاؤ۔ جیسے کہ ایک آسمانی کتاب کے بعض حصے کا انکار کفر ہے۔ ایسے ہی کسی پوری کتاب آسمانی کا انکار کرنا بھی کفر ہے۔ اور جیسے کہ تم نے موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کو اس لئے مانا کہ وہ ہمارے پیغمبر ہیں۔ اسی طرح نبی آخر الزمان کو بھی مان لو۔ تم کو معلوم ہے۔ کہ یہ قرآن میرا اتارا ہؤا ہے کیونکہ یہ معجزہ ہے۔ اور سراسر ہدایت اور پھر لطف یہ کہ **مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ** تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمانے والا بھی ہے۔ خیال رہے۔ کہ اس مَعَ میں بھی چند احتمال ہیں۔ یا یہ کہ اس سے پہلی آسمانی کتابیں مراد ہوں۔ یا پچھلے پیغمبر بھی اور

کتابیں بھی اور یا اُن کتابوں کے سارے اصلی عقیدے اور احکام یعنی یہ قرآن کریم پچھلے پیغمبروں اور ان کی کتابوں اور ان کے سارے احکامُ فرمادنکی تصدیق کرتا ہے قرآن کریم نے اُنکی کئی طرح تصدیق کی ایک یہ کہ اُن سب کتابوں میں آخری نبی اور آخری کتاب کے آنے کی خبر تھی اُسکے آنے سے وہ سب خبریں سچی ہوگئیں ،اگر یہ نہ آتا. تو وہ جھوٹی ہوجاتیں .میں کسی سے کہوں کہ کل بارش ہوگی. اگر بارش ہو جائے تو میں سچا ورنہ جھوٹا .دوسرے یہ کہ دنیا میں ہزار ہا پیغمبر تشریف لائے. اور بہت سی کتابیں اور صحیفے آئے .لیکن جن کا قرآن نے ذکر فرمادیا. وہ تو دنیا میں مشہور ہو گئے. باقی ایسے گم ہوئے .کہ دنیا اُن کے نام سے بھی بے خبر ہوگئی یعنی جسکا قرآن نے ذکر کر دیا. اُس کا قیامت تک سارے جہاں میں چرچا ہوگیا .اور جس کا ذکر نہ کیا گیا. وہ گم ہوگیا .تیسرے یہ کہ توریت و انجیل کو ماننے والے صرف بنی اسرائیل ہی تھے .اور قرآن پاک کا ماننے والا سارا جہان. اور ظاہر ہے .کہ جو بھی قرآن کو مانے گا. وہ اُن کتابوں کو ضرور مانے گا. توگویا قرآن نے تمام دنیا سے یہ کتابیں منوالیں .اور وہ کام کر کے دکھایا. جو نہ تو خود اِن کتابوں نے کیا. اور نہ ان کے ماننے والے بنی اسرائیل سے ہو سکا. دیکھو بتول کنواری مریم صدیقہ رضی اللہ عنہا کو لوگوں نے تہمت لگائی قرآن نے اُن کو پاک دامن فرماکر سارے جہان میں ان کی عصمت کے خطبے پڑھوا دیئے .سارے بے ادب گستاخ شرمندہ ہوکر چُپ ہو گئے .حقیقت میں قرآن پاک کا اُن ساری کتابوں پر بڑا بھاری احسان ہے. بلکہ جن پچھلے احکام کو منسوخ کیا گیا. اُس سے بھی اُن کتابوں کی تصدیق ہوئی .کیونکہ اُن کتابوں ہی نے خبر دی تھی. کہ نبی آخر الزمان سخت احکام کو نرم فرمانے والا اور گندگیوں کو دُور فرمانے والا ہوگا .تو اگر یہ نسخ نہ ہوتا تو وہ خبر سچی نہ رہتی. وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ بِہٖ کی ضمیر یا تو مَآ اَنْزَلْتُ کی طرف لوٹ رہی ہے .یا مَا مَعَكُمْ کی طرف یعنی تم اُس قرآن کے پہلے منکر نہ ہو. یا قرآن کا انکار کر کے خود اپنی کتابوں کا انکار نہ کرو کیونکہ قرآن کریم کا انکار ان سب کا انکار ہے .اَوَّلَ كَافِرٍ کے چند معنی ہو سکتے ہیں. ایک یہ کہ تم قرآن سنتے ہی بے سوچے سمجھے بے دھڑک شروع سے ہی انکار نہ کر دو .بلکہ اپنی کتابوں کو دیکھو پھر اس قرآن کریم اور ان پیغمبر کے حالات کو ان کے مطابق کرو. اور ایمان لے آؤ. دوسرے یہ کہ اے بنی اسرائیل تم جان بوجھ کر قرآن کے پہلے منکر نہ بنو کیونکہ تم سے پہلے جن مشرکین نے انکار کیا ہے .وہ جہالت اور نادانی کی وجہ سے تھا تمہارا انکار جان بوجھ کر ہے .لہذا تم اس قسم کے انکار اور کفر میں سب سے پہلے ہو. تیسرے یہ کہ اے مدینہ کے اسرائیلیو اپنی جماعت میں سب سے پہلے تم ہی نے قرآن کریم سُنا ہے .کیونکہ صاحب قرآن مدینہ میں ہی تشریف لائے ہیں. اگر تم نے اس کا انکار کیا. تو تمہاری دیکھا دیکھی خیبر وغیرہ کے اسرائیلی بھی انکار کردیں گے .اور تم اِن کے لحاظ سے پہلے کافر بنو گے. چوتھے یہ کہ اے علماء بنی اسرائیل تمہارے معتقدین و متبعین تمہاری پیروی کرتے ہیں. اگر تم نے انکار کیا. تو وہ بھی انکار کریں گے .لہذا تم پہلے کافر نہ بنو. پانچویں یہ کہ تم اپنی آئندہ نسل کے لحاظ سے پہلے کافر نہ بنو. کیونکہ اولاد اکثر اپنے باپ دادوں کے دین پر ہوتی ہے. وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا یا تو یہاں آیات سے قرآنی آیات مراد ہیں. یا توریت انجیل کی آیتیں .کیونکہ وہ نذر و نیاز و رشوت کے لئے قرآن کریم کو چھوڑتے تھے .اس لئے فرمایا گیا. کہ آیات قرآنی کے مقابلے میں دنیا کو نہ لو. جو کہ تھوڑی سی قیمت ہے. یا چونکہ علماء یہود دنیوی نفعوں کی وجہ سے توریت کی آیتیں بدل ڈالتے تھے .لہذا فرمایا. کہ میری آیتیں اس معمولی قیمت پر بیچ نہ ڈالو خیال رہے کہ دنیا اور دنیوی چیزیں کتنی بھی ہوں. آخرت کے مقابلے میں تھوڑی ہیں .ساری دنیا جنت کے ایک موتی کے برابر نہیں ہو سکتی. پھر اس کے باوجود یہ سب فانی اور آخرت باقی اس آیت میں دنیا کے دو عیب بیان کئے گئے. ایک اس کا ثمن یعنی قیمت ہونا. دوسرے اس کا تھوڑا ہونا قیمت وہ چیز کہلاتی ہے. جو کہ بذات خود فائدہ نہ دے .بلکہ اُس سے فائدے مند چیزیں حاصل کی جاویں. روپیہ پیسہ نہ تو کھایا جا سکتا ہے نہ پہننے میں آتا ہے. ہاں اس سے غذا اور لباس خرید سکتے ہیں. اسی طرح دنیا بذاتِ خود بالکل بے فائدہ ہاں اس کے ذریعے سے آخرت کو حاصل کر سکتے ہیں. تو دنیا قیمت اور آخرت اصل مقصود ہے .بے وقوف اسرائیلیوں نے آیات الٰہی کے عوض دنیا کو لیا. تو گویا اصل کے بدلے قیمت کو خریدا. ارے بے وقوفو قیمت سے اصل چیز خریدو. وَاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ یعنی تم مجھ ہی سے ڈرو نہ کہ لوگوں سے پہلی آیت میں فَارْهَبُوْنِ فرمایا تھا. اور یہاں فَاتَّقُوْنِ اس کی چند وجہیں ہیں. ایک یہ کہ پہلے عوام بنی اسرائیل سے خطاب تھا یہاں ان کے علماء سے اور رہبت

سلوک کی ابتدائی منزل ہے۔ اور تقویٰ انتہائی۔ لہٰذا ابتدائی لوگوں کو ابتدائی چیز کا حکم دیا۔ اور انتہائی یعنی علماء کو انتہائی درجے کا (تفسیر روح البیان) دوسرے یہ کہ رھبت خطرناک چیز کے اندیشے پر ہوتی ہے۔ اور تقویٰ اس کے یقین پر کسی کو سانپ کا شبہ پڑ گیا وہ ڈر گیا یہ رھبت ہے۔ دوسرے نے سانپ بالیقین دیکھ لیا۔ اور وہ اُس سے بھاگا یہ تقویٰ ہے۔ جہلا کو قرآن کی حقانیت کا یقین نہ تھا۔ اس لئے اُن کو عذاب الٰہی کا صرف وہم تھا۔ اور ان کے علماء کو دونوں چیزوں کا یقین لہٰذا علماء کے لئے **اتقون** فرمایا گیا (تفسیر کبیر) تیسرے یہ کہ رھبت بنی اسرائیل کا اپنا لفظ تھا۔ اسی لئے خدا پرستوں کو راھب کہتے تھے۔ اور تقویٰ اسلامی کلمہ جو شخص اپنا پرانا دین چھوڑ کر مسلمان ہو اس کو چاہیئے۔ کہ اُس دین کے خاص الفاظ کو بھی چھوڑ دے (تفسیر عزیزی) لہٰذا مسلمان ہو کر ربّ کو بھگوان مت کہو اور اپنے مشرکیہ نام بھی بدل ڈالو۔ **خلاصہ تفسیر** بنی اسرائیل سے فرمایا جا رہا ہے۔ کہ تم میری نعمتوں کو اس طرح یاد کرو۔ اور میرے وعدوں کو ایسے پورا کرو۔ کہ اس قرآن والے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن اور ان کے سارے معجزات پر ایمان لے آؤ۔ ایک تو اس لئے کہ پچھلی کتابوں اور رسولوں کی طرح یہ بھی ہمارے بھیجے ہوئے ہیں تو بعض کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا اسکے کیا معنی دوسرے اس لئے کہ یہ کتاب و رسول تمہارے محسن ہیں۔ کہ انہوں نے آکر اُن سب کتابوں اور نبیوں کو سچا کر دیا۔ کہ اُن میں فرمایا گیا تھا۔ کہ اس شکل شباہت والا ان اخلاق وصفات والا ایسی خوبیوں کا مالک مکہ میں پیدا ہو کر مدینہ میں رہنے والا اس قسم کی تعلیم دینے والا اچھے کام سکھانے والا سیدھا رستہ دکھانے والا سچی بات بتانے والا توحید کا سبق پڑھانے والا کفر وضلالت مٹانے والا شمع ایمان جلانے والا رحمان کی طرف سے قرآن کریم لانے والا مرجھائی ہوئی کلیاں کھلانے والا ڈوبتی کشتیاں ترانے والا چھوٹی نبضیں چلانے والا روتوں کو ہنسانے والا جلتوں کو بجھانے والا رازداروں کو کُنْتُ کَنْزًا مَّخْفِیًّا کا راز سمجھانے والا بے گانوں کو اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ سنا کر اپنی طرف بلانے والا خود غریبی میں گزار کر غریبوں کو تخت و تاج دلوانے والا فرش پر رہ کر عرش پر حکومت کرنے والا صحراء عرب میں بیٹھ کر سارے جہان کو دیکھنے والا محبوب صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لانے والا ہی ان کے آنے کا سارے پیغمبروں کو انتظار تھا خلیل ان کی دعائیں مانگ کر گئے حضرت مسیح گویا یہ کہہ کر بشارت دے گئے۔ کہ میں اس صبح کے تارے کی طرح ہوں۔ جو آسمان پر چمک کر آفتاب کے آنے کی خبر دیتا ہے۔ اور خبر دے کر آفتاب ہی کے دامن نور میں چھپ جاتا ہے۔ حضرت مسیح یہ بھی فرما گئے۔ کہ میں اُس آخری نبی کے تسمے کھولنے کے لائق نہیں دیکھو (انجیل برنباس فصل ستانوے) اس نبی کے آنے سے سارے پیغمبر سچے ہو گئے۔ تم بھی اس کے انکار سے حیا کرو۔ اور اس کے پہلے منکر نہ بنو اور اپنے پچھلوں کا بیڑا غرق نہ کرو کیونکہ اگلے پر پچھلوں کا بوجھ ہوتا ہے۔ اور عالم کے بگڑنے سے عالم بگڑ جاتا ہے۔ اور تھوڑے پیسوں اور آمدنی کے لالچ سے اپنا اصل ایمان نہ فروخت کرو۔ سامان سے قیمت نہ خریدو بلکہ قیمت سے سامان خریدو۔ اور ہم سے ہی ڈرتے رہو۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ عالم گمراہ جاہل گمراہ سے بدتر ہے۔ کیونکہ جاہل اُس کی پیروی کر کے گمراہ ہوتے ہیں۔ **دوسرے** یہ کہ دین کو دنیا حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنائے۔ کہ دنیا کی خاطر دین چھوڑ دے۔ **تیسرے** یہ کہ یہ آیت اگرچہ بنی اسرائیل کے لئے آئی ہے مگر اس میں مسلمانوں کے بھی چند فرقے داخل ہیں۔ **پہلا فرقہ** وہ علما جو نفسانی خواہش کے لئے حکام سے ملیں اور ان کے ناجائز افعال کو جائز ثابت کرنے کے لئے قرآن وحدیث میں تاویلیں کریں۔ **دوسرا فرقہ** وہ واعظین و مدرسین جو اپنے عوام کا میلان خاطر دیکھ کر مسائل بیان کریں۔ اور ضروری احکام کو اس لئے چھپالیں۔ کہ اس سے ہماری آمدنی میں فرق پڑے گا **تیسرا فرقہ** وہ علماء جو غلطی کر کے اپنی آبرو کے خیال سے توبہ نہ کریں۔ جیسے کہ علماء دیوبند۔ ان بدنصیبوں کو اپنے کفر کا یقین ہو چکا ہے۔ مگر عار کے مقابلے میں نار قبول کرتے ہیں۔ **چوتھا فرقہ** وہ قاضی اور مفتی جو کہ رشوت لے کر حکم شرع بدل دیتے ہیں۔ جیسے کہ آج کل پنجاب کے دیوبندی مولوی جو کہ روپیہ لے کر کچہری کے فسخ نکاح پر دوسرا نکاح پڑھا دیتے ہیں۔ **پانچواں فرقہ** وہ حُکّام جو کہ ظالم سے رشوت لے کر انصاف نہیں کرتے **چھٹا فرقہ** وہ مدرسین اور مبلغین جو کہ محض دنیا کے لئے یہ کام کریں یعنی جہاں دنیوی فائدے کی امید ہو۔ صرف وہاں تبلیغ کریں۔ اور جس شخص سے دنیوی نفع ہو صرف اُسی کو علم دین سکھائیں (تفسیر عزیزی) **دوسرا فائدہ** تنخواہ لے کر علم دین پڑھانا۔ اجرت پر تعویذ لکھنا اور دم کرنا قرآن پاک

چھاپ کر فروخت کرنا۔ اس آیت سے خارج ہیں۔ کیونکہ بیچنے کے یہ معنی ہیں کہ پیسہ لے کر احکام شرعی بدل دیئے جائیں۔ پریس والا درحقیقت کاغذ اور لکھائی چھپائی کی قیمت لے رہا ہے۔ اسی طرح تعویذ لکھنے والا اور دم کرنے والا ایک طرح کے علاج کی اُجرت لے رہا ہے۔ کیونکہ اُس نے قرآن سے علاج کیا ہے۔ صحابہ کرام نے ایک سانپ کاٹے ہوئے پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کر دی۔ اور اُس پر تیس بکریاں اُجرت لی۔ خود بھی کھائیں اور اُس میں سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ملاحظہ فرمایا۔ اس طرح قرآن پڑھانے والا قرآن پاک کو فروخت نہیں کرتا۔ بلکہ اپنا وقت گھرنے اپنا کاروبار چھوڑنے اور بچوں کی نگرانی کرنے۔ وغیرہ کی اُجرت لیتا ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت پر تنخواہ لی۔ حالانکہ خلافت دینی کام تھا۔ **مسئلہ** خالص عبادت اور حرام کاموں پر اجرت لینا منع ہے۔ جیسے نماز روزہ اور تلاوتِ قرآن کہ یہ خالص عبادتیں ہیں اور گانا بجانا وغیرہ کہ یہ حرام ہیں۔ اس لئے کہ اس کی حدیث میں ممانعت آئی۔ لیکن علماء متاخرین نے امامت اور آذان وغیرہ کی اُجرت جائز رکھی کیونکہ اگر یہ جائز نہ ہو۔ تو مسجدیں ویران ہو جائیں گی تفسیر عزیزی میں اس جگہ نہایت عمدہ **فائدہ** بیان فرمایا وہ یہ کہ جائز کام پر اجرت لینی جائز ہے۔ اسی طرح جس فرض یا واجب میں جائز کام مل جائے۔ اُس پر بھی اُجرت لینی جائز ہے۔ اور یہ اُجرت اُس جائز کی ہوگی۔ نہ کہ واجب و فرض کی لہٰذا چونکہ امامت میں دو چیزیں ہیں۔ ایک ادائے نماز جو کہ فرض ہے اور ایک خاص جگہ اور وقت کی پابندی یعنی فلاں مسجد میں فلاں وقت حاضری دینا یہ جائز فعل ہے۔ اور تنخواہ اسی پابندی کی ہے۔ نہ کہ نماز کی۔ **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم بنی اسرائیل کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ حالانکہ اُن کے پاس بدلی ہوئی اور مخلوط کتابیں تھیں جس کو قرآن نے جھٹلایا ہے۔ **جواب** اس جگہ فرمایا گیا ہے۔ کہ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ یعنی قرآن اُس کی تصدیق فرمانے والا ہے۔ جو تمہارے ساتھ ہے۔ نہ اُس کی جو تم نے بنائی ہے۔ ساتھ ہونے کے یہ معنی کہ جو رب کی طرف سے آئی ہو۔ اور تمہارے پاس موجود ہو یعنی اسی بدلی ہوئی کتابوں میں جو اصلی آیتیں ہیں۔ اُن کی تصدیق فرماتا ہے۔ اسی لئے یہاں لِکِتٰبِکُمْ نہ فرمایا۔ **دوسرا اعتراض** قرآن کریم نے اُن کی اصلی کتابوں کی بھی تصدیق نہ فرمائی۔ بلکہ اُن کو منسوخ فرمایا۔ **جواب** منسوخ فرمانا تصدیق کے خلاف نہیں قرآن کریم نے یہ کہیں نہ فرمایا کہ وہ کتابیں جھوٹی تھیں۔ بلکہ یہ بتایا کہ وہ کتابیں سچی مگر اب اُن کا حکم جاری نہیں۔ ایک طبیب اپنا نسخہ بدلتا ہے۔ تو اس میں پہلے نسخے کی تکذیب (جھوٹا کرنا) نہیں ہے۔ بلکہ مریض کی حالت کے لحاظ سے اب اُس کا استعمال بند کر دیا گیا۔ بلکہ یہ نسخ بھی اُن کی تصدیق ہے۔ کیونکہ اُن کتابوں نے خبر دی تھی کہ نبی آخر الزماں سختیاں دور فرمائے گا۔ اگر وہ سخت احکام باقی رہتے تو یہ خبر سچی کیسے ہوتی **تیسرا اعتراض** اس جگہ فرمایا گیا۔ کہ تم قرآن کریم کے پہلے منکر نہ بنو ان بنی اسرائیل سے پیشتر اور بہت سی قومیں انکار کر چکیں تھیں۔ تو یہ لوگ پہلے منکر کیونکر بن سکتے تھے **جواب** اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا کہ اپنی جماعت یا اپنی نسل میں یا جان بوجھ کر پہلے منکر نہ بنو **چوتھا اعتراض** کیا پہلا منکر بننا منع ہے اور پچھلا منکر بننا جائز **جواب** پہلا منکر بننا زیادہ عذاب کا باعث ہے۔ کیونکہ جو بھی اس کے دیکھا دیکھی منکر بنے گا۔ اُن سب کا عذاب بھی اس اکیلے کو ہوگا۔ کیونکہ یہ برائی کا موجد ہے۔ پچھلے منکر کو صرف اپنے انکار کا عذاب ہوگا۔ نیز ہر منکر اپنی نسل کے لحاظ سے پہلا منکر ہے۔ آج بھی ہر کافر اپنی اولاد کے لحاظ سے پہلا کافر ہے۔ کہ اس کی وجہ سے وہ سب اولاد وغیرہ کافر ہوئی **پانچواں اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ آیتوں کو تھوڑی قیمت سے نہ بیچو تو کیا بہت سی قیمت سے بیچ دیں۔ یعنی دو چار روپیہ میں نہ بیچیں سو پچاس میں بیچ دیں (آریہ) **جواب** آیات کے لحاظ سے ساری دنیا بھی تھوڑی قیمت ہے۔ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ تو آیت کا مطلب یہ ہوا۔ کہ دنیا کے عوض نہ بیچو جو کہ تھوڑی اور حقیر ہے۔ یا یوں کہو۔ کہ یہ اُس واقعہ کی حکایت ہے۔ علمائے بنی اسرائیل تھوڑے پیسوں سے ہی فروخت کیا کرتے تھے۔ جیسے کہ قرآن پاک میں آتا ہے۔ کہ دوگنا تگنا سود نہ کھاؤ۔ اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ سوایا ڈیوڑھا کھالو۔ بلکہ اُس زمانے میں جو کچھ تھا۔ اُس کا بیان ہے۔ **چھٹا اعتراض** اس جگہ فرمایا گیا۔ کہ میری آیتوں کے عوض تھوڑی قیمت نہ خریدو۔ حالانکہ یوں کہنا چاہیئے تھا۔ کہ میری آیتوں وتھوڑی قیمت کے عوض نہ بیچو۔ یا میری آیتوں کے عوض تھوڑے سامان کو نہ خریدو۔ کیونکہ قیمت سے چیز خریدتے ہیں۔ نہ کہ چیز سے قیمت۔

**جواب**۔ اس کا جواب تفسیر ہی میں گزر چکا کہ دنیا بذاتِ خود آخرت کی قیمت ہے۔ کہ جس کے ذریعے آخرت حاصل کی جائے اور آیات الٰہی اصل مقصود ان بے دقوفوں نے دنیا کو اصل مقصود سمجھ کر دین کے عوض اُس کو حاصل کیا لہٰذا دنیا کو ثمن (قیمت) فرمانا اصل واقعہ کے لحاظ سے ہے۔ اور لَا تَشْتَرُوْا فرمانا اُن کے عمل کے لحاظ سے **ساتواں اعتراض** اس سے معلوم ہوا۔ کہ آئتیں بدل کر پیسہ لینا حرام ہے لیکن آئتیں بدلوا کر پیسہ دینا بھی حرام ہے۔ کہ نہیں۔ **جواب** جب لینا حرام ہوا۔ تو دینا پہلے ہی حرام ہوا۔ کیونکہ لینا دینے ہی سے ہوتا ہے قرآن کریم میں ہے۔ کہ سود نہ کھاؤ جس طرح سود کھانا حرام ہوا۔ ایسے کھلانا اور دینا بھی۔

| وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۴۲) |
|---|
| اور نہ ملاؤ حق کو ساتھ باطل کے اور نہ چھپاؤ حق کو حالانکہ تم جانتے ہو۔ |
| اور حق سے باطل کو نہ ملاؤ اور دیدہ و دانستہ حق نہ چھپاؤ |

**تعلق**:۔ اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے **ایک** یہ کہ پہلے علمائے بنی اسرائیل کو خود ایمان لانیکا حکم دیا گیا۔ اور کفر سے روکا گیا۔ اور اب اُن کو اوروں کو گمراہ کرنے سے منع فرمایا جا رہا ہے یعنی پہلے کہا گیا تھا۔ کہ تم خود کافر نہ ہو۔ اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اوروں کو کافر نہ بناؤ۔ مگر چونکہ اپنا ایمان و کفر دوسروں کو مومن یا کافر بنانے سے پہلے ہوتا ہے۔ اسی ترتیب سے اُس کا ذکر ہوا ہے۔ **دوسرے** یہ کہ پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ میری آیتوں کے عوض مال نہ لو۔ اس آیت میں اُس کا مطلب بتایا گیا۔ کہ مال لے کر حق کو نہ چھپاؤ **تیسرے** یہ کہ علمائے یہود تین حرکتیں کرتے تھے۔ ایک تو روپیہ لے کر آئتیں بدل ڈالنا۔ دوسرے آیات میں اپنی طرف سے کچھ زیادتی کر دینا تیسرے اپنی مخالف آیات کو چھپا لینا۔ ایک فعل سے پہلے روکا گیا تھا۔ اور دو حرکتوں سے اب منع فرمایا جا رہا ہے **تفسیر وَلَا تَلْبِسُوْا** تَلْبِسُوْا لبس سے بنا ہے جسکے معنی ہیں خلط یعنی ملاوٹ کرنا جیسے کہ دودھ میں پانی اور اصلی گھی میں ولایتی گھی کو اسطرح ملا دینا جس سے اصل و نقل کی پہچان نہ رہے علماء یہود بھی کتاب کی آیتوں یا اُسکے معانی میں اپنی طرف سے ایسی زیادتی کر دیتے تھے جس سے اصل و نقل کی پہچان نہ رہتی تھی اُس سے اُن کو منع فرمایا جا رہا ہے **اَلْحَقَّ بِالْبَاطِلِ** حق واقعی چیز کو کہتے ہیں اور باطل غیر واقعی کو صدق سچ اور حق میں اسطرح کذب (جھوٹ) اور باطل میں یہ فرق ہے۔ کہ سچ جھوٹ صرف کلام کی صفت ہے۔ اور حق اور باطل عام غلط عقیدے اور غلط خیالات کو باطل کہا جاتا ہے۔ کاذب نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح صحیح عقائد کو حق کہا جائیگا نہ کہ صادق (سچا)۔ نیز حق و باطل میں مطابقت واقع کی طرف سے معتبر ہے۔ اور صادق و کاذب میں کلام کی طرف سے یعنی صادق وہ جو واقع کے مطابق ہو۔ اور حق وہ کہ واقعہ اُس کے مطابق ہو لہٰذا حق صادق سے اعلیٰ ہے چونکہ علمائے یہود آیتوں اور اُن کے معانی اور اُن کے مطالب میں ہر طرح خلط ملط کرتے رہتے تھے اس لئے یہاں حق فرمایا گیا۔ تاکہ سب کو شامل ہو جائے۔ یعنی نہ آیتوں کے الفاظ میں خلط ملط کرو۔ اور نہ اُس کے معانی اور مطلب میں۔ **وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ** یہاں لا پوشیدہ ہے۔ اسی لئے نون گر گیا یعنی حق کو نہ چھپاؤ۔ خیال رہے کہ خلط اور چھپانے میں یہ فرق ہے۔ کہ خلط کے معنی ہیں۔ ملا کر ظاہر کرنا اور کَتْم (چھپانا) کے معنی ہیں۔ ظاہر نہ کرنا۔ اُن کے علماء یا تو احکام ظاہر ہی نہ کرتے تھے۔ اور یا ملاوٹ کر کے ظاہر کرتے تھے۔ ان دونوں کاموں سے اُن کو روک دیا گیا۔ **وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ**۔ یعنی اے علماء بنی اسرائیل تم جان بوجھ کر یہ حرکتیں کرتے ہو۔ نہ کہ بے علمی اور بھول سے اس میں اس جانب اشارہ ہو رہا ہے۔ کہ جان بوجھ کر یہ دونوں کام کفر ہیں۔ بلا ارادہ یا نادانی یا بھول کر کفر نہیں۔ ایک حافظ قرآن پاک غلط پڑھ گیا۔ کسی کاتب نے نادانی سے آیت غلط لکھ دی کسی شخص نے بے علمی سے آیت کا مطلب غلط سمجھ لیا۔ کسی مجتہد سے آیت سے مسئلہ نکالنے میں غلطی ہو گئی۔ یہ سب اس حکم سے خارج ہیں **خلاصۂ تفسیر**۔ علمائے یہود دو طرح لوگوں کو ایمان سے روکتے تھے۔ بے خبروں کو تو سچی بات سُناتے ہی نہ تھے۔ اور باخبر اور ہوشیار لوگوں کو شبہ میں ڈال دیتے تھے۔ یا تو کتاب کی آیتوں میں ہی خلط ملط

کر دیتے تھے۔ اور یا اُن کے مطالب اس طرح بیان کرتے تھے۔ کہ جس سے وہ شبہ میں پڑ کر حق تک نہ پہنچ سکے مثلاً جاہلوں سے کہتے تھے۔ کہ ہماری کتابوں میں نبی آخر الزمان کی خبر ہی نہیں ہے۔ اور جاننے والوں سے کہتے تھے۔ کہ اُن کی خبر تو دی گئی ہے۔ مگر وہ صفتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں پائی جاتیں۔ اس لئے ارشاد ہو رہا ہے۔ کہ اے بنی اسرائیل یہ دونوں حرکتیں چھوڑ دو۔ نہ تو حق و باطل کو ملاؤ نہ حق کو چھپاؤ۔ اور تمہارا جان بوجھ کر یہ دو حرکتیں کرنا اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔ **خیال رہے** کہ اُس زمانے میں نہ تو کوئی اُن کتابوں کا حافظ تھا اور نہ کوئی خاص کتب خانہ اور نہ لکھنے کا زیادہ رواج نہ کتابوں کی عام اشاعت بلکہ آسمانی کتابیں خاص خاص راہبوں یا کاہنوں کے پاس ہی ہوتی تھیں۔ اس لئے اُن کو بدلنا کچھ مشکل نہ تھا۔ الحمد للہ کہ قرآن کریم میں اس قسم کی تحریف کبھی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کی اشاعت بہت ہو چکی۔ اور حافظوں کے سینہ میں بھی آگیا۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک** یہ کہ اگرچہ یہ آیت علماء بنی اسرائیل کے لئے ہی آئی ہے لیکن اس میں وہ موجودہ علماء بھی داخل ہیں جو کہ قرآن پاک کی معانی یا مطالب میں تبدیلی کرتے ہیں۔ جیسے کہ خاتم النبیین کے معنی ہیں آخری نبی مگر دیوبندیوں اور قادیانیوں نے اس کے معنی کئے اصلی نبی اور حضور علیہ السلام کے بعد بھی نئے پیغمبروں کا آنا جائز مانا نیز وہ علماء بھی اس میں داخل ہیں جو قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کو کانگریس یا دیگر کفار کے مطابق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے کہ ابوالکلام آزاد اور دیگر کانگریسی اور احراری اور خاکساری علماء ہم کو خوب یاد ہے۔ کہ جب کانگریس نے نمک بنا کر سول نافرمانی کرنے کا اعلان کیا۔ تو دیوبند سے وہ حدیثیں نکلیں۔ کہ نمک لکڑی اور گھاس آزاد چیزیں ہیں۔ جو ان کو پائے وہ ہی اِن کا مالک اور جب کانگریس نے چرخہ کاتنے کا حکم دیا۔ تو مدرسہ دیوبند سے چرخے کی حدیث بھی نکل آئیں۔ جب وہ تحریکیں ختم ہو گئیں۔ تب یہ احادیث بھی چھُپ گئیں۔ **دوسرے** یہ کہ جان بوجھ کر قرآن کے الفاظ یا معانی یا مطالب کا بگاڑنا کفر ہے۔ جو قراءتیں اور معنی کہ متواتر طور پر منقول ہیں۔ اُسی کی پیروی کی جائیگی اور بغیر قصد غلطی کا یہ حکم نہیں بے علم اگر نادانی سے غلطی کرتا ہے۔ تو گنہگار ہے۔ اُس پر فرض تھا۔ کہ علم حاصل کر کے صحیح پڑھے عالم اگر سستی سے غلطی کر جائے۔ تو بھی گنہگار ہے۔ اُس کو چاہیئے تھا۔ کہ محنت سے صحیح مسائل معلوم کرے۔ ایک مجتہد کوشش کے باوجود غلطی کر جائے تو وہ گنہگار بھی نہیں۔ بلکہ اس کوشش کا ثواب پائے گا۔ **پہلا اعتراض**۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ جان بوجھ کر گناہ کرنا بُرا ہے۔ نادان بن کر جو چاہو سو کر لو۔ **جواب**۔ اس کا جواب گذر گیا۔ کہ دونوں چیزیں گناہ ہیں لیکن جان بوجھ کر کرنا کفر **دوسرا اعتراض**۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم سے جہالت بہتر کیونکہ جاہل کا گناہ گناہ ہے۔ عالم کا گناہ کبھی کفر بن جاتا ہے۔ امام احمد نے کتاب الزہد میں فرمایا۔ کہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جاہل بے عمل پر ایک وبال ہے۔ اور عالم بے عمل پر سات **جواب** جہالت کا وبال علم کے وبال سے زیادہ ہے۔ اس لئے کہ عالم بے عمل فقط بے عملی کا گنہگار ہے۔ اور جاہل بے عمل ڈبل گنہگار ایک تو بے علمی کی وجہ سے دوسرا بد عملی سے علم سیکھنا فرض تھا۔ جاہل اس فرض کا تارک ہے۔ گنہگار ہے۔ ایک شخص اپنے باپ کو نہ پہچان کر اُس کو مارے پیٹے عقل کہتی ہے۔ کہ یہ شخص بڑا بد نصیب ہے۔ جاہل کا ایک وبال عالم کے سات وبالوں سے سخت ہوگا۔ گنہگار مومن کے صدہا بد عملیوں کی سزا ملے گی۔ اور کافر کو صرف کفر کی۔ مگر ایک کفر کی سزا دیگر صدہا جرموں کی سزا سے سخت ہوگی۔ حدیث صحیح سمجھو۔ (تفسیر عزیزی) **خیال رہے**۔ کہ کفریات وغیرہ میں بے علمی عذر نہیں۔ اگر کوئی جاہل بھی کلمہ کفر منہ سے نکال دے شراب وغیرہ پی لے۔ تو وہ ضرور مجرم ہے۔ کوئی شخص تعزیرات ہند سے ناواقف ہو کر چوری کرے یا بے ٹکٹ ریل میں سفر کرے اور گرفتار ہونے پر کہے کہ مجھے خبر نہ تھی۔ کہ یہ کام جرم ہے۔ وہ بھی ضرور سزا کا مستحق ہوگا۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

| اور | قائم رکھو | نماز کو | اور | دو تم | زکوٰۃ | اور | رکوع کرو | ساتھ | رکوع کرنے والوں کے |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|

اور نماز قائم رکھو۔ اور زکوٰۃ دو۔ اور رکوع کرنیوالوں کے ساتھ رکوع کرو۔

**تعلق** ۔اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے ۔**ایک** یہ کہ پہلے بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی رغبت دی گئی ۔ اور اب نیک اعمال کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے ۔ چونکہ ایمان اعمال پر مقدم ہے ۔ اس لئے ایمان کا حکم پہلے دیا گیا ۔ اور اعمال کا بعد میں خیال رہے ۔ کہ خود کفر کرنا بھی کفر ہے ۔ اور دوسروں کو ایمان سے روکنا بھی کفر اور کسی کو کفر کی رغبت دینا بھی کفر ۔ ان تینوں قسم کے کفر سے منع فرما کر اب انہیں نماز وغیرہ کا حکم دیا گیا یعنی خود کفر نہ کرو ۔ اوروں کو ایمان سے روک کر کافر نہ بنو ۔ پھر نیک اعمال کرو ۔ **دوسرے** یہ کہ اب تک انہیں ایمان کا حکم دیا گیا تھا ۔ اب فرمایا جا رہا ہے ۔ کہ صرف ایمان ہی سے قناعت نہ کرنا ۔ بلکہ اس کے بعد نیک اعمال بھی کرنا **تیسرے** یہ کہ پہلے فرمایا گیا ۔ کہ تم لوگوں کو ایمان سے روک کر اپنی علیحدہ جماعت نہ بناؤ ۔ اب فرمایا جا رہا ہے ۔ کہ خود ایمان لا کر مسلمانوں کی جماعت میں آجاؤ ۔ **چوتھے** یہ کہ علماء بنی اسرائیل تین بیماریوں میں گرفتار تھے ۔ [۱] خود پسندی ۔ [۲] مال کی حرص ۔ [۳] حسد وغیرہ ان کے لئے تین علاج تجویز فرمائے گئے ۔ [۱] نماز ۔ [۲] زکوٰۃ ۔ [۳] جماعت ۔ نماز میں شرکت نماز سے خود پسندی دور ہوگی ۔ زکوٰۃ سے مال کی محبت میں کمی آئے گی شرکت جماعت سے حسد دور ہوگی ۔ تو گویا ایمان لا کر وہ شفاخانہ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہوں گے ۔ اور یہ تین نسخے استعمال کر کے بیماریوں سے آرام پائیں گے ۔ **تفسیر وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ** چونکہ ایمان کے بعد نماز سارے اعمال سے مقدم ہے ۔ اسی لئے اس کے بعد نماز کا ذکر فرمایا گیا ۔ اور فرمایا گیا ۔ کہ اے بنی اسرائیلیو ایمان لا کر نماز قائم کرو ۔ نماز پڑھنے اور نماز قائم کرنے کا فرق ہم سورۂ بقر کے شروع میں بیان کر چکے ہیں ۔ اَلصَّلٰوۃ میں الف لام عہد خارجی ہے ۔ یعنی وہ مسلمانوں والی نماز قائم کرو ۔ یہود اور عیسائی بھی نماز پڑھتے تھے ۔ لیکن اب اسلامی نماز قبول ہے ۔ نہ کہ دوسری خیال رہے ۔ کہ یہ حکم ایمان لانے کے بعد دیا جا رہا ہے ۔ یعنی پہلے ایمان لاؤ پھر نماز پڑھو ۔ یہ نہیں کہ بے ایمان رہ کر نماز پڑھ لو ۔ جیسے کہ بے وضو شخص سے کہا جائے ۔ کہ نماز پڑھ ۔ تو یہ مطلب نہیں ۔ کہ اسی حالت میں پڑھ لے ۔ بلکہ وضو کر کے نماز پڑھ یا یہ مطلب ہے ۔ کہ اے بنی اسرائیلیو نماز کی فرضیت کے قائل ہو جاؤ ۔ گویا یہ آیت اٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ کی تفصیل ہے ۔ **وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ** نماز کے بعد ادائے زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ۔ کیونکہ نماز بدنی عبادت تھی اور زکوٰۃ مالی عبادت اور بدن مال سے افضل ہے ۔ اس لئے نماز زکوٰۃ سے افضل خیال رہے کہ دونوں جگہ حکم بظاہر یکساں ہے ۔ یعنی نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو لیکن نماز کا حکم زکوٰۃ سے عام ہے ۔ کیونکہ نماز ہر غریب و امیر پر فرض ہے اور زکوٰۃ صرف مالداروں پر زکوٰۃ کے لفظی معنی ہیں ۔ بڑھنا اور پاک ہونا ۔ عرب والے کہتے ہیں ۔ کہ زَکَا الزَّرۡعُ یعنی کھیتی بڑھ گئی ۔ اور قرآن پاک فرماتا ہے ۔ غُلٰمًا زَکِیًّا یعنی پاک لڑکا اور فرماتا ہے ۔ کہ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی یعنی کامیاب ہو گیا ۔ وہ جو پاک ہوا چونکہ زکوٰۃ نکالنے سے باقی مال پاک و صاف ہو جاتا ہے ۔ جیسے کہ ختنہ کرنے اور ناخن و بال کٹوانے سے جسم پاک و صاف ہو جاتا ہے ۔ اس لئے اس کو زکوٰۃ کہتے ہیں نیز اگرچہ زکوٰۃ سے بظاہر مال گھٹتا ہے ۔ لیکن حقیقت میں اس سے مال اور عمر میں برکت ہوتی ہے ۔ بلائیں دور ہوتی ہیں ۔ مصیبتوں سے امن ملتی ہے ۔ اس لئے اس کو زکوٰۃ کہتے ہیں ۔ تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا ۔ کہ صدقہ و خیرات میں چھ فائدے ہیں ۔ تین دنیا میں اور تین آخرت میں دنیا میں تو رزق میں برکت مال میں زیادتی گھر میں آبادی ہوتی ہے ۔ اور آخرت میں صدقہ عیبوں کو چھپائے گا ۔ قیامت کی دھوپ سے بچائے گا ۔ آگ سے آڑ بنے گا ۔ یہاں بھی اَلزَّکٰوۃ میں الف لام عہد خارجی ہے یعنی اسلامی زکوٰۃ ادا کرو بنی اسرائیل پر چوتھائی مال زکوٰۃ فرض تھی اور اس کے قوانین کچھ اور تھے مگر اب مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے ۔ اس لئے اب انہیں قانون پر عمل کرنا پڑے گا ۔ **وَارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ** ۔ یہ تیسرا حکم ہے ۔ یعنی اے بنی اسرائیل رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو ۔ رکوع کے لغوی معنی ہیں جھکنا اور پست ہونا ۔ اصطلاح شریعت میں نماز کے ایک رکن کا نام ہے ۔ یہاں یا تو لغوی معنی مراد ہے یعنی جس طرح مسلمان اللہ تعالےٰ اور رسول علیہ السلام کے احکام پر سر خم کر دیتے ہیں تم بھی سرکشی چھوڑ کر ان کے ساتھ اطاعت کیا کرو ۔ اور یا اصطلاحی معنی یعنی تم ان نمازیوں کے ساتھ رکوع والی نماز پڑھا کرو ۔ کیونکہ یہودیوں کی نماز میں رکوع نہ تھا ۔ تو گویا یہ جملہ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃ تفسیر ہے ۔ یعنی کونسی نماز قائم کرو ۔ رکوع والی ۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ جماعت سے نماز پڑھا کرو کیونکہ جماعت کی نماز تنہا پر ستائیس [۲۷] درجہ افضل ہے ۔ تفسیر روح البیان نے اس جگہ عجیب نکتہ بیان کیا ۔ وہ فرماتے ہیں ۔ کہ جماعت جمع سے بنا ہے اور جمع کم از کم

تین پر بولی جاتی ہے۔ اور ایک نماز میں دس نیکیاں تو تین آدمیوں کی تیس ۳۰ نیکیاں ہوئیں۔ ہر ایک کی ایک اصل نماز اور نور رب کا عطیہ لہذا جماعت میں تین اصل نمازیں اور ستائیس عطیے خیال رہے کہ یہ تیسرا حکم پہلے دو حکموں سے زیادہ خاص ہے۔ اس لئے کہ ہر نماز جماعت سے نہیں پڑھی جاتی جمعہ اور عیدین کے لئے جماعت فرض ہے۔ اور پنجگانہ فرض نمازوں کے لئے واجب نماز کسوف (سورج کے گرہن کی نماز) نماز استسقاء نماز تراویح کے لئے جماعت سنت باقی نفلوں کے لئے اہتمام سے جماعت کرنا منع ہے پھر ہر شخص کے لئے جماعت ضروری نہیں مسافر اور سخت بیمار سے جماعت معاف ایسے ہی تیز بارش اور آندھی کی حالت میں جماعت معاف عورتوں بچوں بعض اندھوں اور لنگڑوں وغیرہ پر جماعت معاف اس لئے جماعت کا حکم اُن نماز و زکوٰۃ کے حکموں کے بعد دیا **خلاصہ تفسیر** جب بنی اسرائیل کو ایمان اور ایمانیات کا حکم دیا جا چکا تو اس کے بعد تقویٰ اور طہارت کا حکم دیا۔ کہ نماز کو اچھی طرح قائم کرو۔ تاکہ تمہارے دل نرم ہوں اور دلوں کی سیاہی دور ہو اور پھر خدا سے ڈر کر اپنے مال میں سے کچھ مقرر حصہ بھی فقراء وغیرہ کو دیا کرو جس سے تمہارا مال پاک ہو اور خوب بڑھے اور نماز اپنے گھروں میں اکیلے ہی نہ پڑھ لیا کرو۔ بلکہ پنجگانہ جماعت میں شامل ہو کر نمازیوں کے ساتھ ادا کیا کرو۔ تاکہ تم کو دین کی برکتیں اور انوار حاصل ہوں۔ **فائدے**۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک** یہ کہ ایمان سارے اعمال سے افضل ہے۔ اور نماز باقی اعمال سے بہتر اس لئے کہ ایمان قلب کا فعل ہے۔ اور نماز قالب کا اور زکوٰۃ مال کا نیز تمام احکام عرش سے فرش پر بھیجے گئے۔ لیکن نماز حضور علیہ السلام کو عرش پر بلا کر دی گئی نیز نماز کا فائدہ براہِ راست اپنی ذات کو حاصل ہوتا ہے۔ اور زکوٰۃ کا فائدہ دوسرے کو یعنی فقیر کو اور اپنا فائدہ دوسرے کے فائدے پر مقدم ہے۔ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ پہلے اپنے لئے دعا ہے۔ پھر دوسروں کے لئے نیز نماز میں بدن سے کام کرنا پڑتا ہے۔ اور زکوٰۃ میں مال سے اور بدن مال سے افضل ہے نیز نماز ہر مخلوق ادا کرتی ہے۔ فرشتے اور جنات درخت وغیرہ لیکن زکوٰۃ سوا انسان کے کوئی ادا نہیں کرتا۔ **دوسرے** یہ کہ نماز کے بعد درجہ زکوٰۃ کا ہے۔ کیونکہ نماز بھی ایک فعل ہے اور زکوٰۃ بھی رہا روزہ یہ فعل نہیں۔ بلکہ ترکِ فعل ہے۔ یعنی روزہ کسی کام کا نام نہیں بلکہ کھانے پینے کے چھوڑنے کا نام ہے۔ **تیسرے** یہ کہ نماز جماعت سے پڑھنا افضل ہے۔ اس لئے کہ تنہا نماز صرف ایک نماز ہوگی۔ نہ معلوم قبول ہو کہ نہ ہو لیکن جماعت میں اگر ایک کی بھی قبول ہو گئی تو اس کے طفیل سب کی قبول ہے۔ نیز جو دعا مل کر مانگی جائے۔ وہ ہی زیادہ قابل قبول ہوتی ہے۔ **چوتھے** یہ کہ جس نے رکوع پالیا اس نے رکعت پالی۔ اس لئے کہ یہاں فرمایا گیا۔ کہ رکوع والوں کے ساتھ رکوع کرو جس سے معلوم ہوا۔ کہ تم اگر رکوع میں مل جاؤ گے۔ تو اس رکعت میں سب کے ساتھ مانے جاؤ گے ورنہ نہیں **پہلا اعتراض** حنفیوں کے نزدیک کافروں کو روزے نماز کا حکم نہیں ہوتا۔ اور یہاں کافر بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا جا رہا ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مذہب شافعی حق ہے۔ **جواب**۔ ظاہر میں یہ آیت تو شافعیوں کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک بھی کفار کو ادائے نماز وغیرہ کا حکم نہیں اسی لئے نو مسلم سے وہ بھی گذشتہ نمازیں قضا نہیں کراتے صرف اختلاف اس میں ہے۔ کہ آخرت میں کفار کو صرف کفر کا عذاب ہوگا۔ یا کہ دیگر گناہوں کا بھی شافعیوں کے نزدیک اعمال کا بھی عذاب ہوگا حنفیوں کے نزدیک صرف کفر کا اس جگہ نماز و زکوٰۃ کا حکم ایمان کے حکم کے ساتھ ہے جس کے معنی یہ ہوئے۔ کہ تم ایمان لا کر نماز پڑھو فی الحال اُن کو نماز کا حکم نہیں دیا جا رہا ہے۔ لہذا یہ ہمارے خلاف نہ ہوا کیونکہ کفار کو بحالت کفر اعمال کا حکم نہ دیا گیا۔ **دوسرا اعتراض**۔ پھر بھی مذہب شافعی قوی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ قرآن کریم فرما رہا ہے۔ کہ جب مسلمان دوزخی کفار سے پوچھیں گے۔ کہ مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ یعنی تم کو جہنم میں کون چیز لائی۔ تو وہ جواب دیں گے۔ کہ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ کہ ہم نمازی نہ تھے۔ زکوٰۃ نہ دیتے تھے معلوم ہوا۔ کہ اُن کو اعمال کا بھی عذاب ہوگا۔ **جواب**۔ اس آیت سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ کہ اُن کو نماز نہ پڑھنے کا عذاب ہوگا۔ بلکہ ثابت یہ ہو رہا ہے۔ کہ مسلمان نہ ہونے کا عذاب ہوگا۔ کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں۔ کہ ہم نمازیوں میں سے نہ تھے یعنی مسلمانوں کی جماعت سے خارج تھے ورنہ کہتے مَا كُنَّا نُصَلِّي بہرحال اُن کو اعمال کے نہ ماننے کا عذاب ہوگا۔ نہ کہ نہ کرنے کا **تیسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جماعت بھی مثل نماز و زکوٰۃ کے فرض ہے۔ کیونکہ ان سب کے لئے یکساں حکم آ رہا ہے۔ اور حکم فرضیت کے لئے ہوتا ہے

پھر تم جماعت کو واجب یا سنتِ موکدہ کیوں مانتے ہو۔ جواب اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ شریعت میں فرض وہ کہلاتا ہے۔ کہ جس کی طلب ضروری ہو۔ اور اُس کا ثبوت بھی قطعی ہو۔ اور دلالت بھی ارکعو کا ثبوت تو یقینی ہے۔ مگر دلالت یقینی نہیں یعنی یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کہ اس سے مراد جماعت ہی ہے۔ بلکہ اس کے اور معنی بھی ہو سکتے ہیں جو ہم تفسیر میں عرض کر چکے۔ لہٰذا جب اس کا یقین نہ رہا۔ تو فرضیت ثابت نہ ہو سکی۔ دوسرے یہ کہ اگر ایک نماز کے لئے بھی جماعت فرض ہو جاوے۔ تب بھی آیت کا مقصود حاصل ہو گیا۔ اور جمعہ و عیدین کیلئے جماعت فرض ہے۔ لہٰذا آیت پر عمل ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ ہر حکم وجوب کیلئے نہیں۔ یہاں پہلے دو حکم تو وجوب کے تھے۔ مگر یہ نہیں۔ کیونکہ جماعت فرض کرنے میں طاقت سے زیادہ انسان پر بوجھ پڑے گا۔ ہر شخص اپنے کام کا مختار ہے۔ نہ کہ دوسروں کا۔ اور جماعت کرنا دوسروں کا فعل ہے۔ پھر اس پر کیوں فرض ہو۔ اس قرینہ سے معلوم ہوا۔ کہ یہ حکم وجوب کے لئے نہیں (تفسیر عزیزی) **چوتھا اعتراض** تو چاہیئے۔ کہ جمعہ اور عیدین کے لئے بھی جماعت فرض نہ ہو کیونکہ اُس جماعت میں بھی طاقت سے زیادہ تکلیف ہے۔ **جواب** جمعہ اور عیدین میں اگر جماعت میسر نہ ہو۔ تو یہ نمازیں بھی معاف ہو جاتی ہیں۔ اور پنج گانہ نمازیں بہر حال فرض ہیں۔ لہٰذا یہاں طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں۔ **تفسیر صوفیانہ** مقام عشق میں حق کو باطل سے نہ ملاؤ۔ اور تم پر جو کچھ انوار اور تجلیات نازل ہوں۔ جو شریعت کی تصدیق کرتی ہوں۔ اُس کو فوراً قبول کرو۔ اور اُس کے منکر نہ ہو۔ اور منزل عشق کی تکلیفوں کو برداشت کرو۔ کیونکہ یہ راستہ خار دار ہے۔ اور تھوڑے آرام اور دنیوی راحتوں کے عوض میری ان فیوض و برکات کو فروخت نہ کر ڈالو۔ اور نماز عشق شروع کرنے سے پیشتر ہر حالت سے اپنی بندگی ظاہر کرو نفی و اثبات کے شغل میں عملاً مشغول رہو۔ اہل شریعت پڑھتے ہیں لا معبود الا اللّٰہ اہل طریقت کہتے ہیں۔ لا موجود الا اللّٰہ یعنی ماسوا اللہ کی نفی کر کے بحر توحید میں غوطے لگاتے ہیں۔ جب نماز عشق شروع کرنے لگو۔ تو سب سے پہلے اس پر عمل کرو کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی جب تم کو محبت دنیا کثرت رنج و غم ماسوا اللہ پر نظر کا نشہ چڑھا ہو۔ تو نماز عشق کے قریب مت آؤ۔ یہ سب نشے عشق کی ترشی سے اتار دو۔ اور پھر یہ نماز شروع کرو۔ جب شروع کرو۔ تو اقیموا الصلوٰۃ پر عمل ہو یعنی نماز سیدھی ہو ٹیڑھی نہ ہو۔ قلب و قالب ایک ہی طرف متوجہ ہوں یہ نہ ہو کہ قالب اور جگہ اور قلب اور جگہ قلب کے ٹیڑھا ہونے سے ہر چیز ٹیڑھی ہوگی۔ شعر

خشت اوّل چوں نہد معمار کج — تا ثریا مے رود دیوار کج

نماز کی پہلی اینٹ سیدھی رکھو۔ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ نفس کو حرص ہوس برے اخلاق سے پاک کرو۔ دل کو ماسوا اللہ کے مطالبے سے دور رکھو۔ کیونکہ ماسوا اللہ حق پر زیادتی ہے۔ اور کمال پر زیادتی نقصان ہے۔ لہٰذا یہ زیادتی دور کرو۔ اور وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ پر اس طرح عمل کرلو۔ اور انکسار اور اپنی ہستی کو مٹانے میں اُس جماعتِ اولیا کے ساتھ ہو۔ جنہوں نے موجود حقیقی کی طلب میں اپنے وجود فانی کو فنا کر دیا۔ اس راستے میں اکیلے مت جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے مولانا فرماتے ہیں۔

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر — ہست بس پر آفت و خوف و خطر

**حکایت**۔ امام محمد غزالی کے چھوٹے بھائی حامد غزالی رحمۃ اللہ علیہ بڑے ولی کامل تھے۔ یہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے نماز نہ پڑھتے تھے انہوں نے اپنی والدہ سے شکایت کی۔ کہ حامد بھائی مجھ میں کیا خرابی دیکھتے ہیں۔ کہ میرے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ امام حامد نے عرض کیا۔ کہ ان کا قالب نماز میں رہتا ہے۔ اور قلب کتابوں میں یعنی نماز میں قرأت کے وقت فقہی جھنجھٹوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔ والدہ نے فرمایا۔ کہ بیٹا حامد یہ مرض تو تم کو بھی ہے۔ کہ وہ تو نماز میں مسائل ڈھونڈتا ہے اور تم اُس کی عیب جوئی کرتے ہو۔ تم سے وہ بہتر ہیں۔ کہ اُن کا قلب کتابوں میں رہتا ہے۔ اور تمہارا قلب عیب جوئی میں۔ نماز کامل وہ تھی۔ کہ تم کو ماسوا اللہ کی خبر نہ رہتی اللہ پاک ایسی نماز نصیب فرمائے۔

**اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾**

کیا حکم دیتے ہو تم لوگوں کو ساتھ بھلائی کے اور بھولتے ہو تم جانوں کو اپنی حالانکہ تم لوگ تلاوت کرتے ہو کتاب کو کیا پس نہیں عقل رکھتے تم

کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور اپنی جانوں کو بھولتے ہو۔ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ تو کیا تمہیں عقل نہیں

**تعلق۔** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ اس سے پہلے علمائے بنی اسرائیل کے اُن عیبوں کی اصلاح کی گئی تھی۔ جو سراسر عیب تھے۔ اور اب اُن برائیوں سے روکا گیا جو ایک لحاظ سے برائیاں تھیں۔ اور دوسرے لحاظ سے بھلائیاں یعنی دوسروں کو اچھی باتوں کا حکم کرنا اور خود اُس پر عمل نہ کرنا دوسرے یہ کہ گذشتہ آیتوں سے ایک شبہ پیدا ہوتا تھا اس آیت میں اُس کو دفع کر دیا گیا شبہ یہ تھا۔ کہ علمائے بنی اسرائیل بعض لوگوں کو درپردہ اسلام قبول کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ اور اُن سے نیک کام بھی کراتے تھے۔ اور راستہ بتانے والے کو کرنے والے کی طرح ثواب ملتا ہے۔ وہ کہہ سکتے تھے۔ کہ اگرچہ ہم خود ایمان نہ لائیں۔ مگر جن لوگوں نے ہمارے مشورے سے ایمان قبول کیا۔ اُن کا ثواب ہم کو مل گیا۔ اب ہم کو ایمان اور اعمال کی ضرورت نہیں۔ اس آیت میں جواب دیا گیا۔ کہ شریعت کے احکام ایسے نہیں یہاں تو جو غذا کھائے گا۔ اُسی کا پیٹ بھرے گا۔ اور جو دوا پیئے گا وہی صحت پائے گا۔ اپنی کرنی اپنی بھرنی ہے۔ اگر نجات حاصل کرنا ہے۔ تو اپنے اعمال اپنے ساتھ لاؤ۔

**شانِ نزول۔** علمائے یہود سے اُن کے مسلمان رشتہ داروں نے پوچھا۔ کہ دین اسلام سچا ہے۔ کہ نہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ تم اس پر قائم رہو۔ یہ دین سچا ہے۔ اور قرآن حق ہے۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ ایک روائت یہ ہے۔ کہ عرب کے یہودی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے مشرکین عرب کو نبی آخر الزمان کی تشریف آوری کی خبر دیتے تھے۔ اور اُن کی اطاعت کرنے کی ہدایت کرتے تھے۔ پھر جب حضور تشریف لائے۔ تو یہ ہدائت کرنے والے حسد سے خود کافر ہو گئے۔ تب یہ آیت کریمہ اتری (تفسیر خزائن العرفان) تفسیر روح البیان نے اس جگہ فرمایا کہ علماء یہود اُن غریب یہودیوں سے جن سے کچھ دنیاوی لالچ نہ تھا چپکے سے کہدیتے تھے کہ تم ان نبی آخرالزمان پر ایمان لے آؤ یہ سچے ہیں اور مالدار یہودیوں سے جن سے اُنکو آمدنی بھی ہوتی کہتے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں نبی آخر الزمان کی بعض علامتیں تو ہیں بعض نہیں۔ لہذا ایمان لانے میں جلدی نہ کرو۔ ذرا غور کر لینے دو کیونکہ وہ سمجھتے تھے۔ کہ اگر یہ لوگ ہاتھ سے نکل گئے تو ہماری آمدنی جاتی رہیگی۔ انکے متعلق یہ آیت کریمہ آئی

**تفسیر اَتَاْمُرُوْنَ** یہ ہمزہ استفہام سوال، کا ہے۔ اور یہ استفہام یا اظہار تعجب کیلئے ہے یا جھڑکنے کیلئے یعنی تعجب ہے۔ یا سخت افسوس ہے۔ کہ تم لوگوں کو تو اچھی باتیں بتاتے ہو۔ اور اپنے کو بھول جاتے ہو۔ تَاْمُرُوْنَ۔ اَمْرٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ اپنے چھوٹے کو کسی چیز کا حکم کرنا چونکہ کہنے والے علماء تھے۔ اور سننے والے اُن کے ماتحت جہلاء اس لئے تَاْمُرُوْنَ فرمایا گیا خیال رہے کہ چھوٹے سے کچھ طلب کرنا اَمر کہلاتا ہے۔ برابر والے سے التماس بڑے سے طلب کرنے کو دعا یا استدعاء کہتے ہیں اور کبھی امر مشورے کے معنی میں بھی استعمال ہو جاتا ہے

**اَلنَّاسَ** اس سے مراد یا تو علماء یہود کے وہ قرابت دار ہیں۔ جو مسلمان ہو چکے تھے یا غریب یہودی یا مشرکین عرب جیسا کہ شانِ نزول میں بیان کیا جا چکا۔ **بِالْبِرِّ** لفظ بِر کے لغوی معنی وسعت اور فراخی کے ہیں۔ اس لئے وسیع میدان کو بَر کہا جاتا ہے۔ اصطلاح میں نیک کام اور سچائی اور سچے کو بِر کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں۔ بِرّ الوالدین اور حج مَبْرُوْرٌ یعنی مقبول حج جو اپنی قسم کو پورا کرے تو بولتے ہیں۔ بَرَّ فِیْ یَمِیْنِهٖ یعنی اپنی قسم میں سچا نکلا قرآن پاک فرماتا ہے۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى یعنی سچا وہ ہے۔ جو پرہیزگار ہے۔ اس جگہ بِر سے یا تو ہر اچھی بات مراد ہے۔ یا لوگوں کو ایمان کی رغبت دینا یا ایمان پر قائم رہنے کا مشورہ دینا یا اُن کو نماز اور زکواۃ وغیرہ کا حکم دینا یا توریت کی پیروی کرنے کا حکم دینا یعنی اے علمائے یہود تم دوسروں کو تو ایمان لانے ایمان پر قائم رہنے توریت پر عمل کرنے اور صدقہ و خیرات کا حکم دیتے ہو لیکن خود ان سب سے ایک دم دُور ہو۔

**وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ** تنسون نسیان سے بنا ہے جس کے معنی ہیں بھول جانا۔ خیال رہے۔ کہ علم کے بعد بھولنے کو نسیان کہتے ہیں اور مطلق بھولنے کو سہو یہاں نسیان ترک (چھوڑنا) کے معنی میں ہے یعنی تم اپنے کو عمل سے ایسے دُور رکھتے ہو۔ جیسے کہ بھول ہی گئے یا گویا کہ تمہارے

حق میں یہ آئتیں آئی ہی نہیں **وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ**. تَتْلُوْنَ. تلاوتٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں متبرک چیز کو پڑھنا. تلاوتٌ بھی تلوٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پیچھے ہونا. اسی لئے پیچھے آنے والے کو تالی کہتے ہیں چونکہ پڑھنے والا بھی کتاب کا مضمون پڑھ کر پیچھے چھوڑتا ہے. اور خود آگے بڑھتا ہے. اس لئے اس کو تلاوت کہتے ہیں. اَلْکِتٰبَ سے توریت شریف مراد ہے یعنی. تم دن رات توریت شریف میں جا بجا یہ پڑھتے ہو. کہ جس کا قول اُس کے عمل کے مخالف ہو وہ عذاب اور وبال کا مستحق ہے. اور پھر تم وہی حرکت کرتے ہو. **اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ**. یہ استفہام بھی تعجب یا عبنت دینے کیلئے ہے یعنی تعجب ہے کہ تم اتنی موٹی بات سمجھتے کیوں نہیں یا کیا تم میں اتنی عقل بھی نہیں جو ایسی ظاہر بات کو سمجھ لو. تعقلون عقلٌ سے بنا ہے جس کے لغوی معنی ہیں. منع کرنا. باز رکھنا. اسی لئے جس رسی سے جانور کو باندھا جائے اُسے عقال کہتے ہیں. اصطلاح میں عقل اُس نورِ روحانی کو کہتے ہیں جس سے باریک باتیں معلوم کی جائیں عقل کا خزانہ دماغ یا دل ہے. اسی لئے دماغ خراب ہو جانے پر اور دل کے سخت غمگین ہونے پر انسان بے عقل ہو جاتا ہے. چونکہ یہ نور بھی انسان کو بُری باتوں سے روکتا ہے. اور نیکی پر قائم رکھتا ہے. اس لئے اس کو عقل کہا جاتا ہے **خلاصہ تفسیر**. اے علمائے بنی اسرائیل تم دوسروں کو تو اچھے اعمال کا حکم دیتے ہو اور خود عمل نہیں کرتے. حالانکہ تم توریت میں جگہ جگہ پڑھ چکے ہو. کہ جو شخص لوگوں کو وعظ اور نصیحت کرے اور خود اُس پر عامل نہ ہو. وہ بہت بُرا اور مستحق عذاب شخص ہے. اور یہ بات تو عقل سے بھی معلوم ہو سکتی ہے. کہ دوسروں سے کچھ کہنا اور خود اُس کے خلاف عمل کرنا بدتر گناہ ہے. کیونکہ اس حرکت سے وعظ کا اثر جاتا رہے گا. اوّلاً تو اس لئے کہ واعظ بے عمل کی آواز لوگوں کے صرف کانوں تک پہنچتی ہے. اور عالم باعمل کا کلام دلوں میں اثر کرتا ہے. دوسرے اس لئے کہ واعظ بے عمل کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہیں. کہ یہ جو کچھ کہا گیا سب جھوٹ ہے. اگر سچ ہوتا تو واعظ صاحب کے دل میں خوف ہوتا. اور وہ اس کے عامل ہوتے اس وجہ سے واعظ کا وعظ بے تاثیر رہ جاتا ہے. اور اس وعظ گو کی ساری محنت رائیگاں جاتی ہے کیونکہ وعظ سے مقصود عمل ہے. جب وہی حاصل نہیں ہوا تو وعظ کا ہونا نہ ہونا برابر ہوا. اس آیت سے **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے. **ایک یہ کہ** وعظ گو کو چاہیئے کہ پہلے خود اپنے وعظ پر عامل ہو. ورنہ اُس کا وعظ بے تاثیر ہوگا. اور خود اُس کو دنیا و آخرت میں رسوائی حاصل ہوگی. **روائیت حدیث** معراج میں ہے. کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو دیکھا. کہ اُن کے ہونٹ آگ کی مقراض (قینچی) سے کاٹے جا رہے ہیں. حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں. عرض کیا یہ واعظین بے عمل ہیں "مسلم" اور بخاری شریف میں اسامہ ابن زید رضی اللہ عنہ سے روائیت ہے. کہ قیامت کے دن ایک شخص کو دوزخ میں لا کر ڈالا جائیگا. اُس کی انتڑیاں باہر نکل پڑیں گی جن کو کھینچتا ہوا. وہ اُس طرح چکر لگائیگا جیسے کہ چکی کے ارد گرد گدھا. دوسرے دوزخی اُس سے پوچھیں گے. کہ تو تو بڑا اچھا واعظ تھا. تو اس بلا میں کیوں گرفتار ہوا. وہ کہے گا. کہ میں واعظ تو تھا مگر بے عمل تھا. **روائیت** حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں. کہ عالم بے عمل چراغ کی بتی کی طرح ہے. کہ خود جلتی ہے اور دوں کو روشنی پہنچاتی ہے. (تفسیر کبیر) **روائیت** جنتیوں کا ایک گروہ دوزخیوں کی ایک جماعت کو آواز دیں گے. کہ ہم تمہاری تعلیم سے جنت میں آ گئے. تم خود جہنم میں کیوں پہنچے (افسوس ہے. کہ شاگرد جنت میں اور اُستاد دوزخ میں) وہ جواب دیں گے. کہ تمہارے پاس عمل تھا ہمارے پاس نہ تھا (تفسیر کبیر) **دوسرا فائدہ** جو فقط قول سے وعظ کرتا ہے. اُس کا کام برباد ہے. اور جو اپنے عمل سے وعظ کرے. اُس کا وعظ دلوں کو شکار کر لیتا ہے. دیکھو صحابہ کرام کے زمانے میں نہ بڑے بڑے جلسوں کا رواج تھا. اور نہ اس زمانے کی طرح اُن میں تیز طرار مقرر تھے. اُن کی سیدھی سادھی باتیں ہوتی تھیں. اور بے تکلف تقریریں. مگر اُن سیدھی باتوں نے دنیا کو پلٹ دیا. عالم میں انقلاب برپا کر دیا. کیونکہ اُن کے پاس دل کی آواز تھی. اور عمل والا وعظ حق تعالےٰ انہیں کے طفیل سے ہم لوگوں کو بھی وہی آواز عطا فرمائے. **تیسرا فائدہ** یہ کہ جس طرح واعظ بے عمل قابل ملامت ہے. اُسی طرح واعظ باعمل لائق ہزار کرامت اُس کا درجہ دنیا میں بھی بڑا آخرت میں بھی **حکائیت** تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا. کہ یزید ابن ہارون واعظ باعمل اور زاہد بے ریا تھے. اُن کے انتقال کے بعد کسی نے اُن کو خواب میں دیکھا. پوچھا. کہ قبر میں کیسی گزری انہوں نے جواب دیا. کہ نکیرین نے مجھ سے پوچھا کہ

رب تیرا کون. میں نے کہا. کہ جس نے ہزاروں کو رب کی طرف بلایا. کیا وہ خود رب کو بھول جائے گا **حکایت** حضرت شبلی سے نزع کے وقت کہا گیا. کہ کہو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ آپ نے جواب میں یہ شعر فرمایا. اِنَّ بَیْتًا اَنْتَ سَاکِنُہٗ ٭ غَیْرُ مُحْتَاجٍ اِلَی السُّرُجِ
یعنی جس گھر میں اے پیارے تو رہے وہاں چراغ کی ضرورت نہیں جس دل میں اُن کا دھیان ہو اُسے اب زبان ہلانے کی ضرورت نہیں.

**پہلا اعتراض.** اس سے معلوم ہوتا ہے. کہ عالم بے عمل کو وعظ کہنا جائز نہیں. لہٰذا اگر ہمیں کوئی مسئلہ معلوم ہو جس کے ہم عامل نہ ہوں تو چاہیئے. کہ کسی کو غلطی کرتے ہوئے دیکھ کر بھی نہ بتائیں. **جواب** اس میں وعظ کی بُرائی معلوم نہ ہوئی. بلکہ عمل نہ کرنے کی واعظ بے عمل کو چاہیئے. کہ وعظ بند نہ کرے. بلکہ عمل کرنا شروع کر دے. اگر خود عامل نہ بھی ہو. تب بھی دین کی تبلیغ کئے جائے. کیونکہ ابھی تو ایک گناہ کر رہا ہے. اور وعظ بند کرنے پر دو گناہ ایک بد عملی اور دوسرے دین کو چھپانا عالم بے عمل کی مثال چراغ والے اندھے کی سی ہے. کہ وہ خود تو اُس سے فائدہ حاصل نہیں کرتا. مگر دوسروں کو فائدہ پہنچا دیتا ہے. اور یہ بھی ایک نیکی ہے. **دوسرا اعتراض.** غریب مولوی کو چاہیئے. کہ زکوٰۃ اور حج کے احکام نہ بیان کیا کرے کیونکہ وہ اپنی غریبی کی وجہ سے خود ان کا عامل نہیں ہے لہٰذا وہ بے عمل ہے. **جواب** بے عمل وہ کہلاتا ہے جس پر عمل کرنا ضروری ہو. اور نہ کرے جس کو شریعت نے معافی دی ہو. وہ بے عمل نہیں. ایک طبیب بیمار کو دوا پلاتا ہے. اگر بیمار کہے کہ حکیم صاحب پہلے دوا آپ پیو. اور پھر مجھے پلاؤ. تو وہ بیوقوف ہے. کیونکہ اُس کو دوا کی ضرورت ہی نہیں ہے. حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر زکوٰۃ فرض نہ تھی. لیکن آپ نے اوروں کو اُس کا حکم دیا.

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ ﴿۴۵﴾

اور مدد حاصل کرو ساتھ صبر اور نماز کے اور تحقیق وہ البتہ بھاری ہے مگر اوپر دل سے رجوع کرنے والوں کے

اور صبر اور نماز سے مدد چاہو اور بے شک نماز ضرور بھاری ہے. مگر اُن پر جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں.

الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَاَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

جو کہ یقین کرتے ہیں کہ تحقیق وہ ملنے والے ہیں رب اپنے سے اور تحقیق وہ طرف اُس کے لوٹنے والے ہیں.

جنہیں یقین ہے. کہ اُنہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اُس کی طرف پھرنا.

**تعلق.** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے. **ایک** یہ کہ پہلے بنی اسرائیل کو اپنے پرانے دین چھوڑنے اور نئے دین اختیار کرنے کا حکم دیا گیا. نیز نماز معہ جماعت ادا کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی گئی. اور یہ کام اُن پر بہت شاق اور بھاری تھے. لہٰذا اب اس آیت میں وہ ترکیب بتائی گئی جس سے اُن کی مشکل آسان ہو جائے جیسے کہ طبیب بیمار کو بد مزا دوا دیتا ہے اور ہدایت کرتا ہے. کہ اسمیں شکر ملا کے پینا **دوسرے** یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کو علاج بتایا گیا تھا. اور اب وہ ترکیب بتائی گئی جس سے وہ علاج آسان ہو. قابل ڈاکٹر جب کسی کمزور بیمار کا اپریشن کرتا ہے. تو اُس کو پہلے کلورا فارم (بے ہوشی کی دوا) سُونگھا دیتا ہے. تاکہ اُسے تکلیف محسوس نہ ہو. رب نے بھی اُن کمزوروں کو صبر و نماز کے لئے کلورا فارم تجویز فرمایا جس سے کہ ان کو اعمال کی مشقت محسوس نہ ہو. **تفسیر وَاسْتَعِیْنُوْا.** استعانت کے معنی مدد مانگنا اور مدد حاصل کرنا ہے. یعنی اللہ سے بذریعہ صبر و نماز کے مدد مانگو یا نماز اور صبر سے مدد حاصل کرو. بعض علماء فرماتے ہیں. کہ یہ مومنین کو حکم ہو رہا ہے کیونکہ علمائے بنی اسرائیل اب تک ایمان لائے ہی نہ تھے. اُن کو یہ احکام دینا کیا معنی مگر صحیح یہی ہے. کہ یہ علمائے بنی اسرائیل سے خطاب ہے. ورنہ اس آیت کا تعلق گذشتہ سے نہ رہے گا. اور آیت بے جوڑ ہو جائے گی. اور کفار کو شرعی احکام دینے کی پوری بحث ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں. **بِالصَّبْرِ** یہ ب یا استعانت کی ہے یا صلہ کی یعنی صبر و نماز کے ذریعے رب سے مدد مانگو یا اس صبر و نماز سے مدد حاصل کرو. صبر کے معنی ہیں روکنا اصطلاح میں کامیابی کی امید سے مصیبت پر بے قرار نہ ہونے کو صبر کہتے ہیں. صبر کی تین قسمیں ہیں. ۱ مصیبت پر صبر کرنا ۲ عبادت

اور طاعت کی مشقتوں پر صبر کرنا۔ اور اُن پر قایم رہنا[۳] نفس کو گناہ کی طرف مائل ہونے سے روکنا اس کو یوں سمجھو کہ مصیبت میں دل چاہتا ہے کہ بے قراری اور بے چینی کا اظہار کرے۔ اب دل کو قابو میں رکھنا اور راضی بہ رضا رہنا پہلی قسم کا صبر ہے۔ اور سردی کے موسم میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اسی طرح زکوٰۃ نکالنے کو دل نہیں چاہتا اب دل پر جبر کر کے ان کاموں کو کر گزرنا دوسری قسم کا صبر ہے۔ اور گانے باجے کی طرف دل مائل ہے۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ سود خوار بڑے مزے سے پیسے کما رہے ہیں ہمارا دل بھی چاہتا ہے۔ کہ یہ حرکت کریں۔ اب دل کو روکنا اور اُدھر نہ جانے دینا۔ تیسری قسم کا صبر ہے۔ اس جگہ تینوں قسم کے صبر مراد ہو سکتے ہیں بعض علماء کرام فرماتے ہیں۔ کہ یہاں صبر سے روزہ مراد ہے۔ کیونکہ اس میں بھی نفس کو خواہشات سے روکنا ہوتا ہے۔ اگرچہ نماز روزے پر مقدم ہے۔ لیکن اس جگہ روزہ نماز پر مقدم بعض نے فرمایا ہے۔ کہ صبر ہر مقام کا علیحدہ ہے۔ جہاد میں نہ بھاگنا صبر ہے۔ نماز کو ہمیشہ پڑھنا صبر ہے۔ گناہ سے استغفار کرنا اُس کا صبر ہے۔ غرض کہ اس میں بہت گنجائش ہے۔ صبر ایک قسم کی ورزش ہے جس طرح ورزش کرنیوالا پہلوان بھاری بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ اور کبھی دشمن کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح صابر بندہ بڑی بلاؤں کا مقابلہ کر جاتا ہے اور بے صبرا دل چھوڑ دیتا ہے۔ وَالصَّلٰوۃِ چونکہ نماز میں بھی صبر ہے ظاہری و باطنی اعضاء کو پابند کرنا پڑتا ہے۔ نیز بعض وقت اس کی وجہ سے کچھ تکلیف بھی برداشت کرنی ہوتی ہے۔ اسلئے صبر کے بعد اس کا ذکر ہوا یہاں صلوٰۃ سے یا تو پنجگانہ نماز مراد ہے یا خاص نماز یعنی پنجگانہ نمازوں کے ذریعے مدد حاصل کرو یا۔ ہر مصیبت کے وقت خاص نمازوں سے قحط سالی میں نماز استسقاء سے اور خاص مصیبت کے وقت نماز حاجت وغیرہ سے چونکہ نماز انسان کو دنیا سے بے خبر کر کے اللہ کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔ اس لئے اُس کی برکت سے دنیا کی مشکلیں دل سے فراموش ہو جاتی ہیں تفسیر عزیزی نے اس جگہ بیان فرمایا۔ کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں فاقہ ہوتا تھا۔ اور رات میں کچھ ملاحظہ فرماتے تھے اور بھوک غلبہ کرتی تھی۔ تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم بار بار مسجد میں تشریف لا کر نماز میں مشغول ہوتے تھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فرزند کی وفات ہوئی۔ آپ یہ خبر سُن کر نماز میں مشغول ہو گئے۔ اور اُس کو اتنا دراز کیا۔ کہ جب لوگ دفن کر کے لوٹے تب آپ فارغ ہوئے۔ لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی۔ تو فرمایا۔ کہ مجھے اس فرزند سے بہت محبت تھی میں اس کی جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکتا تھا۔ ناچار نماز میں مشغول ہو کر اس صدمے سے بے خبر ہو گیا اور آپ نے یہی آیت پڑھی۔ اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ اوّلاً تو صبر سے مدد لو۔ اور جب صبر سے کام نہ چلے۔ تو نماز میں مشغول ہو جاؤ۔ چونکہ نماز میں کمال مشغولیت ہوتی ہے۔ اور روح حضور الٰہی کی لذتوں میں اس قدر مشغول ہو جاتی ہے۔ کہ پھر اُس تک کوئی خطرہ اور خیال نہیں پہنچ سکتا۔ لہذا دنیوی تکلیفوں سے راحت پا جاتی ہے۔ وَاِنَّھَا یہ ضمیر یا تو صرف نماز کی طرف لوٹتی ہے۔ یا صبر و نماز دونوں کی طرف یا استعانت کی طرف یعنی وہ نماز یا صبر و نماز دونوں یا اُس سے مدد لینا بڑا بھاری ہے۔ لَکَبِیْرَۃٌ یہاں کبیرہ کے معنی شاق دشوار اور ثقیل یعنی بھاری کے ہیں۔ جیسے قرآن پاک میں ہے۔ کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ مشرکین پر بھاری پڑ گیا۔ یعنی وہ نماز وغیرہ کفار منافقین وغیرہ پر بہت بھاری ہے۔ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ ۝ خَاشِعِیْنَ۔ خشوعٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں عاجزی یا رب کی طرف مائل ہونا یا سکونِ قلب قرآن کریم فرماتا ہے۔ تَرَی الْاَرْضَ خَاشِعَۃً یعنی ساکنۃً اور آیتہ خاشعًا یعنی مائل یا عاجز یہاں تینوں معنی بن سکتے ہیں یعنی نماز سب پر بھاری ہے۔ سوا اُن کے جن کے دل میں سکون ہے یا رب کے سامنے عاجزی یا اُس کی طرف میلان جس سے معلوم ہوا۔ کہ وہ نماز کار آمد ہے جس میں قلب اور قالب دونوں اللہ کی طرف مائل ہوں۔ اگر جسم مسجد میں رہا۔ اور دل بازار میں تو اُس کا یہ فائدہ نہ ہوگا۔ اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ یَظُنُّوْنَ ظَنٌّ سے بنا ہے جس کے حقیقی معنی گمان ہیں۔ اور مجازی معنی ہیں یقین قرآن کریم فرماتا ہے۔ اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِکَ اَنَّھُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ یہاں ظن بمعنی یقین ہے۔ کیونکہ قیامت وغیرہ پر یقین رکھنا ہی ایمان ہے۔ اور شک کفر اور ہو سکتا ہے۔ کہ یہ ظن گمان کے معنی میں ہو۔ تو اب مُلٰقُوْ کے دوسرے معنی ہوں گے اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ مُلٰقُوْ مُلَاقَاتٌ سے بنا جس کے معنی ہیں۔ ملنا یہاں یا تو قیامت میں رب سے ملنا مراد ہے۔ یا حالت نماز میں یا موت کے وقت وغیرہ یعنی نماز اُن لوگوں پر بھاری نہیں جن کو قیامت میں رب سے ملنے کا یقین ہے۔ یا اُن پر جو ہر لحظہ اپنے موت کا اندیشہ رکھتے ہیں یعنی ہر نماز کو اپنی

آخری نماز سمجھ کر پڑھتے ہیں. یا اُن پر جو اپنے رب کے ثواب پانے کی امید رکھتے ہیں یا اُن پر کہ جو نماز کے وقت یہ سمجھتے ہیں. کہ ہم رب سے ملاقات کر رہے ہیں. اور رب ہم کو دیکھ رہا ہے. **وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ**. راجعون رجوعٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں واپس ہونا. اور لوٹنا جتنے ملاقات میں احتمال تھے. اتنے ہی یہاں لوٹتے ہیں یعنی اُن پر نماز بھاری نہیں جنہیں یقین ہے. کہ وہ قیامت میں رب کی طرف رجوع کریں گے. یا موت اور رجوع قریب ہے. اور یا ہم بحالتِ نماز رب کی طرف متوجہ ہیں. اور اُس سے کلام کر رہے ہیں. لہذا یہاں ظن سے مراد یقین بھی ہو سکتا ہے. اور گمان بھی جو کفار کہ قیامت وغیرہ کے قائل ہی نہیں اسی طرح جو مسلمان درازی زندگی کا یقین رکھ رہے ہیں. یا جو کہ نماز بے پڑھی سے ادا کرتے ہیں. اُن پر نماز یقیناً بھاری ہے. اور اُن کو اس نماز سے پورا پورا فائدہ حاصل نہیں ہوتا (تفسیر عزیزی اور تفسیر کبیر)

**خلاصہ تفسیر** بنی اسرائیل کو حضور علیہ السلام پر ایمان لانے اور مسلمانوں کی جماعت سے مل جانے کا حکم دیا گیا. اور یہ اُن پر بہت بھاری تھا. لہذا انہیں وہ تدبیر بتائی گئی جس سے کہ یہ سارے کام آسان ہو جائیں فرمایا گیا. کہ اگر تم پر یہ بات گراں ہو تو صبر اور نماز سے مدد لینا پھر صبر میں تو اتنی مشقت نہ تھی البتہ نماز ضرور دشوار تھی یعنی نماز دیگر دشواریوں کا علاج ہے. لیکن یہ خود بھی دشوار ہے. اُس کو آسان کرنے کی نہایت بہتر تدبیر بتائی گئی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز میں دشواری کی وجہ یہ ہے. کہ انسان کا دل میدان خیال میں آزاد پھرنے کا عادی ہے. اور ظاہری اعضاء دل کے تابع نماز میں ظاہر اعضاء کو تو پورا پورا پابند کر لیا گیا ہے کہ ہنسنا بولنا. کھانا پینا چلنا سب حرام کر دیئے اس ظاہری پابندی کا اثر دل پر پڑتا ہے جس سے کہ وہ گھبرانے لگتا ہے. اس گھبراہٹ کی وجہ یہ ہے. کہ دل ہر وقت حرکت چاہتا ہے. اُس کو سکون اور چین کی عادت نہیں. لہذا سب سے پہلے حکم ہوا. کہ دل میں خشوع یعنی سکون اور قرار پیدا کر دو یہ سکون نماز کو آسان کر دے گا چونکہ نفس ایک وقت میں دو طرف توجہ نہیں کر سکتا. اُس کو اگر ایک خیال میں لگا دیا جائے. تو دوسرے خیالات خود بخود جاتے رہتے ہیں. اس لئے خشوع کے بعد وہ خیال بتا دیا گیا جس میں دل کو لگا دینا چاہیئے یعنی اپنے رب سے ملاقات کا خیال اور اُسی کی طرف رجوع ہونے کا دھیان جب دل میں یہ خیال پیدا ہو گا. تو دنیوی خیالات خود بخود جاتے رہیں گے جس سے اُسی کو قرار حاصل ہو گا. اور قرار سے نماز آسان ہو گی. بلکہ اُسی میں لذت حاصل ہو گی. اور دل لذیذ چیز کا حریص ہوتا ہے. لہذا وہ نماز پر حریص ہو کر اُس کا پابند ہو گا. اور پابندیٔ نماز سے انشاء اللہ سب مشکلیں حل ہو جائیں گی سبحان اللہ کیسا باقاعدہ اور بہتر علاج تجویز فرمایا گیا. اب خواہ دل میں یہ خیال پیدا ہو. کہ ہمیں قیامت میں رب کے سامنے پیش ہونا ہے. اور اپنا حساب زندگی دینا ہے جس سے کہ خوف اور امید پیدا ہو. اور نماز کا شوق ہو یا یہ خیال ہو کہ ممکن ہے. کہ یہ نماز ہماری آخری نماز ہو اور پھر ہم کو موقعہ نہ ملے. یا یہ کہ ہم رب کو دیکھ رہے ہیں. اور اُس سے کلام کر رہے ہیں. اور یا یہ کہ رب ہم کو دیکھ رہا ہے. اور ہمارا کلام سُن رہا ہے. حدیث پاک میں ارشاد ہوا. کہ یہ سمجھ کر عبادت کرو. کہ تم رب کو دیکھ رہے ہو. اگر یہ نہ سمجھ سکو تو کم از کم یہ ہی سمجھ لو. کہ وہ ہم کو دیکھ رہا ہے. حق تعالےٰ ایسی نماز اور یہ خیالات ہم سب کو نصیب فرمائے.

**فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک** یہ کہ صبر و نماز سے بڑی بڑی مشکلیں حل ہو جاتی ہیں. تفسیر عزیزی نے اس جگہ فرمایا. کہ حدیث شریف میں ہے. کہ علم مسلمان کا دوست ہے اور حلم یعنی بُردباری اُس کا وزیر اور عقل اُس کی رہبر اور تواضع اور نرمی اُس کا بھائی اور صبر اُس کے لشکر کا جرنیل جس طرح بغیر جرنیل کے کوئی ملک فتح نہیں ہو سکتا. اسی طرح بغیر صبر کوئی مشکل نہیں حل ہو سکتی **دوسرے** یہ کہ دنیوی کاموں میں بھی بغیر صبر کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی. اگر تاجر استقلال سے تجارت نہ کرے. اور وہ تجارت کے مشکلات اور اُس کے نقصانات پر صبر نہ کرے تو کبھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا. اسی لئے یہاں استعینو مطلق فرمایا گیا جس سے معلوم ہوا. کہ ہر دینی و دنیوی مشکلات میں صبر و نماز سے مدد لینی چاہیئے **تیسرے** یہ کہ عابد گوشہ نشیں سے عالم دین افضل ہے کیونکہ وہ نہ لوگوں سے میل جول رکھتا ہے. اور نہ اُن سے تکلیفیں اٹھاتا ہے. نہ صبر کرتا ہے. عالم دین لوگوں میں رہ کر تبلیغ دین کرتا ہے جس کی وجہ سے صدہا اُس کے دشمن بن جاتے ہیں سب کی اذیتیں برداشت کرتا ہوا صبر سے اپنا کام کئے جاتا ہے. وہ یقینی بڑے درجے والا ہے حضرات صحابہ کرام نے کسی کا باپ نہیں مارا تھا. لیکن آج صدہا سال کے بعد بھی اُن پر تبرّہ ہو رہا ہے تفسیر عزیزی نے اس جگہ ایک حدیث نقل فرمائی. کہ ایک صحابی نے حضور ؐ

علیہ السلام کے زمانے میں ایک پہاڑ کی غار میں گوشہ نشینی اختیار کر لی حضور علیہ السلام نے چند روز بعد صحابہ کرام سے دریافت کیا۔ کہ وہ غیر حاضر کیوں ہیں لوگوں نے یہ واقعہ عرض کیا فرمایا۔ اُن کو بلاؤ۔ جب وہ حاضر ہوئے۔ تو اُن سے اس کی وجہ دریافت کی انہوں نے عرض کیا کہ لوگوں کی صحبت عبادت میں خلل ڈالتی ہے۔ تو حضورؐ نے فرمایا۔ کہ مسلمانوں کی صحبت میں رہ کر مشقّتیں برداشت کرنا۔ ساٹھ سالہ تنہائی کی عبادت سے افضل ہے۔ **چوتھے** یہ کہ رب سے بذریعہ اعمال دعا کرنا زیادہ قابل قبول ہے۔ اس لئے کہ اس آیت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ بذریعہ صبر و نماز رب سے مدد مانگو **پانچویں** یہ کہ مسلمانوں کو انشاء اللہ آخرت میں دیدار الٰہی ہوگا۔ کیونکہ یہاں فرمایا گیا مُلَاقُوْا رَبِّهِمْ اور بغیر دیدار ملاقات ناقص ہے۔ **چھٹے** یہ کہ نماز کا بھاری معلوم ہونا نفاق کی علامت ہے۔ حدیث پاک میں فرمایا گیا۔ کہ عشاء و فجر کی نمازیں منافقین پر بہت دشوار ہوتی ہیں۔ کیونکہ منافق نماز کو بیکار جانتا ہے۔ اور مسلمان اُس سے ہزارہا امیدیں رکھتا ہے۔ امید کی وجہ سے بھاری کام بھی ہلکے معلوم ہوتے ہیں۔ کسان غلّے کی امید میں کڑی دھوپ میں سخت محنت کر لیتا ہے۔ طالب علم کامیابی کی امید میں بہت کوشش کر جاتا ہے۔ **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ نماز مسلمانوں کے لئے آسان اور منافقین کیلئے مشکل ہے۔ تو چاہیئے۔ کہ منافقین کو اس کا ثواب زیادہ ملے اور مسلمانوں کو کم۔ کیونکہ جو مشکل کام کرے اُس کا ثواب زیادہ ہونا چاہیئے۔ **جواب** اس آیت کا مطلب یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کو نماز آسان معلوم ہوتی ہے۔ اور منافقین کو بھاری۔ نماز ایک ہی فعل ہے۔ اور مسلمانوں کے لئے زیادہ سخت کیونکہ وہ قلب و قالب دونوں سے ادا کرتا ہے۔ لیکن رضائے الٰہی کی خوشی میں اُس کو یہ دشواری محسوس نہیں ہوتی جیسے کہ بیمار تندرستی کی لالچ میں کڑوی دوائیں پی جاتا ہے۔ دوا تو کڑوی ہی ہے لیکن شفا کی امید نے اس کا پینا آسان بنا دیا۔ کیا تم نے نہیں سُنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم پاک پر نماز سے ورم آجاتا تھا۔ لیکن پھر فرماتے ہیں کہ نماز میں میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔ **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدائے تعالیٰ کسی خاص جگہ میں رہتا ہے۔ جہاں کہ ہم مرنے کے بعد جائیں گے کیونکہ فرمایا گیا ہے۔ وَاِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ **جواب** اس کا تفصیلی جواب مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کی تفسیر میں دیا گیا یعنی اُس جگہ جانا مراد ہے جہاں سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کی ظاہری حکومت وغیرہ بھی نہ ہو یعنی میدان محشر کیونکہ دنیا میں بظاہر اوروں کی بھی حکومت ہے۔ **تیسرا اعتراض** اِلَيْهِ انتہا کیلئے آتا ہے۔ اور انتہا کسی جسم کی طرف ہونی چاہیئے معلوم ہوا۔ کہ رب تعالیٰ جسم ہے **جواب**۔ انتہا کے لئے جسم ضروری نہیں کہا جاتا ہے۔ کہ فلاں اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ گیا۔ دیکھو حالت جسم نہیں۔ مگر رجوع کی انتہا ہے۔ یہاں مطلب یہ ہے۔ کہ رب کی بلاواسطہ حکومت **چوتھا اعتراض** رجوع کے معنی ہیں۔ کہ پہلی حالت کی طرف لوٹ جانا جس سے معلوم ہوا۔ کہ روحیں قدیم ہیں ہمیشہ سے ایک عالم میں تھیں۔ عارضی طور پر دنیا میں آکر پھر وہیں لوٹ جائیں گی **جواب** اس کا جواب وہی دوسرے اعتراض کا جواب ہے۔ بیشک اس سے پہلے عالم ارواح میں روحیں تھیں لیکن یہ کیسے معلوم ہوا۔ کہ ہمیشہ سے تھیں **تفسیر صوفیانہ** اس سے پہلے لوگوں کو راہِ عشق طے کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور محبوب حقیقی نے سب کو اپنی طرف دعوت دی تھی۔ اب فرمایا گیا۔ کہ چونکہ میرا راستہ خار دار ہے اور اس کا طے کرنا دشوار ہے۔ اس لئے ہم تم کو دو سواریاں یا دو بازو عطا فرماتے ہیں۔ کہ جن پر سوار ہو کر یا جن سے اُڑ کر ہم تک پہنچو ایک صبر یعنی شہوات نفسانیہ اور خواہشات حیوانیہ سے پرہیز دوسرے نماز یعنی دروازۂ غیب پر معتکف رہنا اور رب کی بارگاہ میں دائم قائم رہنا۔ مگر یہ بھی خیال رہے کہ ان سواریوں پر سوار ہونا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ ہر ایک کے حصے میں نہیں آتیں سوا اُس کے جن پر حق تعالیٰ اپنی تجلی فرمائے اور جس سے اُن میں سکون پیدا ہو جائے۔ اور یہ تجلی حق سے الفت پیدا کر دے۔ اور خلق کی کلفت دور کر دے اور پھر اُن کو یقین ہو جائے۔ کہ ہم انشاء اللہ اس راستے کو ضرور طے کریں گے اور ایک دن جمال یار کا ضرور مشاہدہ کریں گے۔ پھر یہ بھی انہیں یقین ہو کہ ہم خود اپنی کوشش سے یہ وادی طے نہیں کر رہے ہیں بلکہ جذبات حق ہم کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ اور اس بحر کی لہر ہم کو ادھر بہائے لئے جا رہی ہیں۔ پھر یہ خیال رہے کہ جس طرح پُل صراط پر گذرنے والے مختلف ہوں گے۔ بعض تیز رو اور بعض سُست رفتار اسی طرح اس راستے کو طے کرنے والے مختلف ہیں۔ بعض وہ جن کے لئے یہ نماز اور صبر تیز رفتار سواری ہیں۔ اور بعض وہ جن کے لئے یہ دونوں چیزیں اُڑنے والے بازو ہیں بعض کا جذب ہلکا بعض کا قوی مولانا فرماتے ہیں۔

یک زمانہ صحبت با اولیا ⁂ بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّىۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۷﴾

اے اولاد | یعقوب کی | یاد کرو | میری نعمت | وہ جو کہ | انعام کیا میں نے | اوپر تمہارے | اور تحقیق میں نے بزرگی دی تم کو | اوپر | اُن جہان والوں کے

اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ اُس سارے زمانہ پر تمہیں بڑائی دی۔

**تعلّق**۔ اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ نماز لوگوں پر بہت بھاری ہے۔ ہاں جو اپنے رب سے ملنے کا یقین رکھتے ہوں۔ اُن کیلئے ہلکی۔ اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اے بنی اسرائیل تم دوسری جماعت میں رہو کیونکہ تم پر ہمارے خاص انعامات ہیں۔ اور جس پر خاص انعام ہوں۔ اُس کو چاہیئے۔ کہ مشقّتیں برداشت کرے۔ دوسرے یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کو فرمایا گیا تھا۔ کہ ایمان اور تقویٰ کے حاصل کرنے کا طریقہ صبر اور نماز ہے۔ اور یہ بہت مشکل اور بھاری ہے۔ اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اگر تم یہ راستہ نہ چل سکو۔ تو اس سے آسان تر دوسرا راستہ بتایا جاتا ہے۔ اور وہ راہِ شکر ہے۔ اس لئے اپنی خاص نعمتوں کا ذکر فرما کر اُن کو شکر کی طرف مائل کیا جا رہا ہے۔ یوں سمجھو کہ پہلے گرم علاج بتا کر اب نرم بتایا جا رہا ہے۔ کہ یا تو صبر سے تقویٰ حاصل کرو۔ اور اگر یہ نہ کر سکو تو شکر سے **تفسیر** يٰبَنِىٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اس سے پہلے بھی یہ خطاب ہو چکا ہے۔ اور اسرائیلیوں کو رب کی نعمتیں یاد دلائی جا چکی ہیں لیکن وہ خطاب اور قسم کے احکام کی تمہید تھی۔ اور یہاں دوسرے قسم کے احکام کی وہاں اُن کو وفائے عہد (وعدہ پورا کرنا) کا حکم دیا گیا تھا۔ اور یہاں تقوےٰ وغیرہ کا ان لوگوں کو بنی اسرائیل کہہ کر پکارنے میں اس جانب اشارہ ہے۔ کہ تم بڑے باپ کے بیٹے ہو تم کو چاہیئے۔ کہ اُن کی قدم بقدم چلو تاکہ تمہاری عزّت برقرار رہے۔ اُذۡكُرُوۡا اس سے یہ مطلب نہیں کہ تم صرف زبان سے اُن نعمتوں کو یاد کر لیا کرو۔ یا اپنی بڑائی کے لئے لوگوں کو جتاتے پھرو۔ بلکہ عملی طور پر شکر یئے کے ساتھ یاد کرو کیونکہ یہی حقیقی یاد ہے۔ فخریہ یاد کرنا حرام اور بلا فائدہ ذکر کرنا بے کار اسی لئے تفسیر روح البیان نے اُذۡكُرُوۡا کے معنی اُشۡكُرُوۡا کئے ہیں۔ نِعۡمَتِىَ نِعمت (نون کے کسرے کے ساتھ) کے معنی ہیں۔ احسان خواہ ظاہری ہو یا باطنی اور خواہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَتِلۡكَ نِعۡمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَىَّ نَعمت (نون کے فتح سے) کے معنی ہیں عیش و آرام کا سامان قرآن کریم میں ہے۔ وَنَعۡمَةٍ كَانُوۡا فِيۡهَا فٰكِهِيۡنَ (تفسیر کبیر) چونکہ بنی اسرائیل پر ہر قسم کے ظاہری باطنی دنیوی اور دینی احسانات کئے گئے تھے۔ اس لئے نِعمت نون کے کسرے سے فرمایا گیا۔ الَّتِىۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ بظاہر اس سے دنیاوی نعمتیں مراد ہیں۔ جیسے کہ من و سلویٰ اُتارنا۔ لق و دق بیابان میں بادلوں سے اُن پر سایہ کرنا اُن کے لئے پتھر سے پانی نکالنا بحرِ قلزم کو خشک کرنا وغیرہ یا اس سے بالواسطہ نعمتیں مراد ہیں یعنی اُن نعمتوں کو یاد کرو۔ جو تمہارے باپ داداؤں پر کی گئی تھیں جن سے تم ہمیشہ فخر کرتے رہو گے۔ وَاَنِّىۡ فَضَّلۡتُكُمۡ بظاہر اس سے دینی نعمتیں مراد ہیں یعنی یہ بھی یاد کرو۔ کہ ہم نے تم کو بڑی بزرگی دی۔ کہ تمہاری گروہ میں چار ہزار پیغمبر پیدا فرمائے۔ اور توریت زبور و انجیل اور دوسرے صحیفے تمہاری زبان میں تمہاری جماعت پر اُتارے اور تم میں بڑے بڑے عادل بادشاہ اور باعمل عالم اور اولیاء اللہ اور مشائخ پیدا فرمائے۔ جس کی وجہ سے تم سارے فرقوں پر اعلیٰ ہوئے۔ تم ہی وحیٔ الٰہی کا جائے نزول رہے۔ تم ہی آسمانی کتابوں کے خزانے تم ہی احکام شرعیہ کے واقف کار اور عالم کے سردار رہے۔ لہٰذا تم کو چاہیئے۔ کہ اب اس نبیِ آخر الزماں پر ایمان لے آؤ۔ تاکہ تمہاری عزّت اور عظمت باقی رہے اور تم اس عہدے سے معزول نہ کر دیئے جاؤ۔ اب تک تم اولادِ انبیاء ہونے کی وجہ سے تمام پر سردار رہے اور اب سیّد الانبیاء کی اُمّت بن کر كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ کا اعلیٰ خطاب حاصل کرو عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ یہ عالم کی جمع ہے جس کے حقیقی معنی ہیں۔ ماسواء اللہ اور مجازاً بڑے گروہ کو بھی عالم بول دیتے ہیں۔ کہہ دیتے ہیں۔ کہ ہمارے جلسے میں ایک عالم جمع ہو گیا۔ اگر یہاں حقیقی معنی مراد ہوں۔ تو اس آیت کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ ہم نے تمہارے باپ داداؤں کو اُن کے زمانے میں سارے عالم پر بزرگی دی تھی۔ یا بعض وجہوں سے تم کو اب بھی سارے عالم پر بزرگی حاصل ہے جیسے کہ اولادِ انبیاء ہونا وغیرہ وغیرہ اور اگر عالم کے معنی مجازی مراد ہوں تو معنی یہ ہوں گے۔ کہ تم کو ہم نے بہت سے لوگوں (مشرکین وغیرہ) پر بزرگی دی۔ ہماری اس تقریر سے واضح ہو گیا

کہ بنی اسرائیل کا مسلمانوں سے افضل ہونا لازم نہیں مسلمانوں کیلئے رب نے فرمایا۔ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ یہ آیت اس کے خلاف نہیں کیونکہ ایک زمانے میں وہ افضل تھے۔ اور اب مسلمان افضل اور اگر وہ بھی مسلمان ہو جائیں۔ تو وہ اب بھی افضل یا بعض جزوی حیثیتوں سے بنی اسرائیل افضل اور کلّی طور پر مسلمان جیسے کہ حضرت مریم سے فرمایا گیا۔ کہ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ اے مریم تم کو تمام جہاں کی عورتوں پر بزرگی دی اس سے لازم یہ نہیں۔ کہ حضرت مریم حضرت خدیجہ حضرت عائشہ و حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہن سے افضل ہوں حضور کے ازواج کے بارے میں فرمایا گیا۔ کہ اے نبی کی بیویو تم کسی بیوی کی طرح نہیں یعنی سب سے افضل ہو ایک زمانے میں حضرت مریم افضل تھیں اور دوسرے زمانے میں یہ بیویاں۔

**خلاصۂ تفسیر**۔ اے بنی اسرائیل صبر و نماز کے ذریعے سے ایمان اور تقوی اختیار کرو۔ اور بیشک یہ چیزیں بہت دشوار ہیں مگر چونکہ تم پر ہماری نعمتیں بہت زیادہ ہیں۔ اس لئے تم اُن کو برداشت کرو۔ یا اے بنی اسرائیل اگر تم سے صبر و صلوٰۃ کا راستہ طے نہ ہو سکے۔ تو تم شکر کے راستے سے ہم تک آ جاؤ کیونکہ تم پر زیادہ نعمتیں ہیں۔ لہٰذا زائد شکر واجب بھلا ہماری نعمتوں کو یاد تو کرو۔ کہ ہم نے تم پر کتنی نعمتیں فرمائیں۔ ان نعمتوں کی خود قرآن کریم نے کچھ تفصیل فرمائی ہے۔ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ تم میں نبی بھیجے۔ اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ وہ نعمتیں دیں جو اُس وقت دنیا میں کسی کو نہ دیں۔ اور سب سے بڑی نعمت یہ دی کہ تم کو تمام جہان سے افضل کر دیا۔ ان باتوں کو یاد کرو۔ اور اُس کا شکریہ اس طرح ادا کرو۔ کہ آج دین اسلام کی خدمت میں سب سے آگے آ گئے ہو۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک** یہ کہ نسبی بزرگی بھی اللہ کی نعمت ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل کو اُن کے اولاد انبیاء ہونے پر احسان جتایا گیا۔ یقیناً سیّد متقی یا سیّد عالم دوسرے متقی اور عالموں سے افضل ہو گا۔ کیونکہ وہ پیغمبر کی اولاد ہیں۔ اسی طرح گنہگار سیّد دوسرے گنہگاروں سے اس لحاظ سے بہتر ہو گا۔ کہ وہ نبی کی اولاد ہے۔ بلکہ حق تو یہ ہے۔ کہ سیّد گنہگار بھی دوسرے پرہیزگاروں سے نسبی لحاظ سے افضل ہے۔ شامی جلد اوّل میں صلوٰۃ جنازہ کی بحث میں ایک حدیث نقل فرمائی۔ کہ حضور فرماتے ہیں۔ کہ موت سے سارے نسب ٹوٹ جاتے ہیں سوا میرے نسب کے اور فرماتے ہیں۔ کہ قرآن پاک کی یہ آیت فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ (یعنی قیامت میں نسب کام نہ آئیں گے) اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب علیحدہ ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا۔ کہ اے میرے اہل قرابت لَآ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْئًا اس سے مطلب یہ ہے۔ بغیر اذن الٰہی میں تم سے عذاب دفع نہیں کر سکتا۔ پھر شامی فرماتے ہیں۔ کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اولاد سے عذاب دور نہ کریں۔ حالانکہ آپ تو اجنبی گنہگاروں کی شفاعت فرما کر عذاب سے بچا لیں گے۔ یا نکال لیں گے۔ شامی نے ساداتِ کرام کے فضائل کے بارے میں ایک مستقل رسالہ لکھا اَلْعِلْمُ الظَّاهِرُ فِیْ نَفْعِ النَّسَبِ الطَّاهِرِ بلکہ میرا ایمان تو کہتا ہے۔ کہ گنہگار سیّد کیچڑ میں آلودہ موتی ہے۔ کہ اگرچہ گناہوں کے کیچڑ میں ہے۔ مگر سیّد ہے۔ **دوسرے** یہ کہ تمام عظمتیں اور عزّتیں ایمان سے قائم رہتی ہیں۔ بے ایمان کی رب کے یہاں کوئی عزّت نہیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل کو صرف اولاد انبیاء ہونے پر نہ رہنے دیا۔ بلکہ انہیں دعوت ایمان دی گئی۔ کہ کنعان نبی کا بیٹا تھا۔ مگر بے ایمانی کی وجہ سے تباہ ہو گیا۔ اسی طرح شیعہ اور مرزائی دیوبندی وغیرہ مرتدین سیّد تو کیا مسلمان بھی نہیں۔ انہیں سیّد کہنا بھی غلطی ہے۔ سیّد ہونے کے لئے ایمان شرط ہے۔ دیکھو بے ایمان بنی اسرائیلیوں کی کوئی عزّت نہ ہوئی **تیسرے** یہ کہ علم تاریخ کا جاننا اور اُس کا یاد کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اُس سے خدا کی نعمتیں معلوم ہوتی ہیں **چوتھے** یہ کہ اگر نعمت الٰہی ظاہر کرنے کے لئے اپنے بزرگوں کے دینی فضائل بیان کئے جائیں۔ تو جائز ہے۔ کیونکہ یہاں بنی اسرائیل کو یہی حکم ہو رہا ہے۔ **پانچویں** یہ کہ کسی کی یادگاریں منانا جائز بلکہ بہتر ہے کیونکہ یہ بھی نعمت الٰہی کے ذکر کا ذریعہ ہے۔ اور یہاں اُذْكُرُوْا مطلق ہے۔ لہٰذا عرس بزرگان اولاد کی سالگرہ یا تخت و تاج ملنے کی خوشی میں جشن کرنا وغیرہ سب جائز ہیں۔ بشرطیکہ اس نیّت سے ہوں۔

**پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تمام بنی اسرائیل سارے عالم سے افضل ہیں۔ تو کیا قارون اور سامری اور وہ اسرائیلی جن کی صورتیں مسخ کی گئیں۔ کیا وہ بھی افضل تھے۔ کیونکہ وہ بھی اسرائیلی تھے **جواب** قوم اسرائیل دوسری قوموں سے افضل اس سے لازم نہیں آتا۔ کہ اُن کا ہر شخص افضل ہو۔ قرآن کریم میں آتا ہے۔ کہ مرد عورتوں کے سردار ہیں۔ اس سے لازم یہ نہیں۔ کہ کافر مرد مومن عورتوں سے افضل ہوں۔ یا دوسرے

مسلمان ازواج مطہرات سے افضل ہوں. دوسرا اعتراض اگر اسرائیلی مسلمان ہو جائیں. تو کیا سارے عالم سے افضل ہوں گے. اگر اُن کو افضل نہ مانا جائے. تو اس آیت کے خلاف ہے. اور اگر مانا جائے. تو عالم میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم بھی ہیں. یا جس وقت بنی اسرائیلی افضل تھے. تو کیا انبیاء سے بھی افضل تھے. **جواب** اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا. کہ یہاں عالمین کا استغراق حقیقی نہیں ہے.

**تفسیر صوفیانہ** اس آیت میں بظاہر بنی اسرائیل سے خطاب ہے لیکن درپردہ سارے مومنین کے لئے عام ہے. ارواح مومنین کو خطاب کر کے فرمایا گیا — کہ اے لوگو اللہ کی اُس نعمت کو یاد کرو جو تم پر ہوئی. وہ یہ کہ تم کو فیضانِ نبوت حاصل کرنے کے قابل بنایا اور پھر فقط قابل بنا کر ہی نہ چھوڑا بلکہ نبوت کی ظاہری اور باطنی انوار کی شعاعیں تم پر ڈالیں جس کی وجہ سے کہ تمہارا قالب شریعت کے راستے پر اور قلب راہ طریقت کو عبور کر سکے لہٰذا نبی آخر الزمان پر ایمان لاؤ کیونکہ یہ ان شعاعوں کا خاصہ ہے. اور میں نے تمہاری جماعت کو جن میں انبیاء اور صدیقین اور شہدا اور صالحین سب داخل ہیں. یہ نعمت دے کر باقی سارے عالم پر بزرگی دے دی.

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا

اور ڈرو تم اُس دن سے کہ نہ بدلہ دے گا کوئی نفس طرف سے کسی نفس کے کچھ بھی اور نہ قبول کی جاوے گی طرف سے اُسکی کوئی سفارش اور نہ

اور ڈرو اُس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی. اور نہ کافر کے لئے کوئی سفارش مانی جاوے. اور نہ کچھ

يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

لیا جاوے گا طرف سے اُسکی فدیہ اور نہ وہ لوگ مدد کئے جائیں گے.

لے کر اُس کی جان چھوڑی جاوے. اور نہ اُس کی مدد ہو.

**تعلق**. اس آیت کا پہلی آیت سے کئی طرح تعلق ہے. ایک یہ کہ بنی اسرائیل کو اس سے پہلے اُن کے فضائل سُنا کر خوش کیا گیا تھا اب قیامت کی کچھ مصیبتیں سُنا کر ڈرایا جا رہا ہے. تاکہ وہ خوشی میں پھول کر رب کو نہ بھول جائیں. اور امید و خوف کے درمیان رہیں جس پر ایمان کا دارومدار ہے. دوسرے یہ کہ شاید بنی اسرائیل اپنے گذشتہ فضائل سُن کر یہ کہہ دیتے کہ ہمارے بزرگوں نے رب کا شکر بخوبی ادا کر لیا اب وہ اس مرتبے پر ہیں. کہ جو کوئی اُن کا وسیلہ پکڑے اُس کو قیامت کے حساب کا ڈر نہیں اور خاص ہمارے لئے. اُن کی شفاعت کافی ہے اور اُن کی بزرگیاں ہی ہم کو نجات دلا دیں گی. کیونکہ ہم اُن کی اولاد میں ہیں. لہٰذا اُن سے فرمایا گیا. کہ تم اس خیال میں مت رہنا. اور آخرت کو دنیا پر قیاس مت کر لینا. وہاں کے حالات ہی کچھ اور ہیں. **تفسیر** وَاتَّقُوْا یہ لفظ وقیٰ سے بنا جس کے معنی ہیں. بچنا اور ڈرنا اور یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں. یعنی اُس دن سے ڈر کر ایمان لے آؤ یا ایمان لا کر اُس دن کی مصیبتوں سے بچ جاؤ کیونکہ وہاں گنہگار پریشان اور نیک کار انشاء اللہ راحت میں ہوں گے يَوْمًا یوم لغت میں دن کو کہتے ہیں. اور کبھی وقت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے. یہاں یا دن ہی کے معنی میں ہے. کیونکہ قیامت میں آفتاب سامنے ہو گا. بلکہ سروں سے قریب ہو گا. اور آفتاب کے سامنے ہونے کے وقت کا نام دن ہے. اور یا اس سے مطلقاً وقت مراد ہے. کیونکہ وہاں آفتاب کو طلوع غروب نہ ہو گا. جس سے کہ دن اور رات مقرر ہوں. بلکہ ایک جگہ پر ہی قائم رہے گا. اور حساب ختم ہونے پر اُس کو بے نور کر کے دوزخ میں بھیج دیا جائیگا. یہ بھی خیال رہے. کہ یہاں یا تو خود قیامت کے دن سے ڈرنا مراد ہے. اور یا وہاں کے حساب و کتاب اور عذاب سے یعنی اُس دن سے ڈرو یا اُس دن کے حساب و کتاب سے ڈرو لَا تَجْزِىْ قیامت میں صدہا مصیبتیں ہوں گی. لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہو گی. کفار کا کوئی غمخوار مددگار نہ ہو گا. اُسی کا یہاں ذکر کیا گیا. کیونکہ بنی اسرائیل کو یہی تو دھوکہ تھا. کہ ہم اگر کافر ہی رہیں. تو ہمارے بزرگ ہم کو بچا لیں گے. **خیال** رہے کہ مدد کی چار صورتیں ہوتی ہیں یا تو مددگار اپنے ساتھی کو اپنی قوت بازو اور زور سے

بچالے اسے نصرت کہتے ہیں۔ یا بغیر زور کے کسی اور طرح بچالے یا تو سفارش کر کے اس کو شفاعت کہتے ہیں۔ یا کچھ دے کر اب جو چیز ملزم کے ذمہ تھی وہی دے کر بچا یا گیا۔ تو اُسے جزاء کہتے ہیں اور اگر جرمانہ وغیرہ دے کر چھڑایا گیا۔ تو اُس کا نام فدیہ ہے۔ اس آیت میں ان چاروں باتوں کی ترتیب وار نفی فرمائی گئی۔ تَجْزِیْ جزاءٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ ادا کرنا۔ یا بدلہ دینا۔ یعنی قیامت کے دن نہ تو کوئی کسی کی طرف سے اعمال کر سکے گا اور نہ اپنے اعمال دے کر اُس کو چھڑا سکے۔ اور نہ کسی کے بدلے میں کوئی عذاب بھگت سکے مثلاً کسی مشرک کے چار بیٹے مومن متقی ہیں۔ اور وہ چاہیں کہ ہم اپنے باپ کو کچھ اپنے نیک اعمال دے دیں۔ یا اُس کی طرف سے کوئی نیک کام کرلیں۔ یا اُس کی سزا خود بھگت لیں۔ تو یہ سب ناممکن ہے۔ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ یہاں پہلے نفس سے نفس مومن اور دوسرے سے نفس کافر مراد ہے۔ (تفسیر خزائن العرفان روح البیان و مدارک) تو معنی یہ ہوئے۔ کہ کوئی مومن متقی پرہیزگار نفس بھی کسی کافر کی حاجت روائی نہ کر سکے گا۔ یہ معنی ضرور خیال میں رہنے چاہئیں اسی جگہ دھوکہ ہوتا ہے۔ شَيْـًٔا یا یہ لَا تَجْزِیْ کا مفعول بہ ہے یعنی کسی قدر تکلیف کو دور نہ کر سکے گا۔ یا مفعول مطلق کی صفت یعنی نہیں دفع کریگا اُس کافر سے تھوڑا دفع کرنا بھی (تفسیر کبیر) یعنی عبادات معاملات۔ عقائد اور عام اعمال غرض کسی شئے میں کچھ بھی حاجت روائی نہ کر سکے گا۔ وَلَا يُقْبَلُ۔ اس کے لفظی معنی ہیں۔ کہ اُس کی شفاعت قبول نہ کی جائیگی اور قبول نہ ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ یا شفاعت بالکل نہ ہو یا ہو مگر قبول نہ کیجائے یہاں پہلے ہی معنی مراد ہیں۔ کفار بنی اسرائیل کا خیال تھا کہ ہمارے باپ دادے ہمیں بخشوالیں گے۔ یہاں فرمایا گیا۔ کہ وہ تمہاری سفارش نہ کرینگے یا یہ معنی ہیں۔ کہ اگر شفاعت ہو بھی تو قبول نہ کی جائے گی۔ کیونکہ اُس کے لئے ایمان شرط ہے۔ اور تم بے ایمان ہو۔ مِنْهَا یہ ضمیر یا تو پہلے نفس کیطرف لوٹتی ہے۔ یا دوسرے کی طرف لہذا یا تو اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ مومن کی سفارش کافر کے حق میں قبول نہ ہو گی۔ یا یہ کہ نفس کافرہ کی طرف سے پیش کی ہوئی۔ سفارش قبول نہ ہو گی یعنی اگر کافر اپنا کوئی سفارشی پیش کرے۔ تو منظور نہ ہو۔ اس دوسرے معنی کو بھی تفسیر کبیر وغیرہ نے اختیار کیا ہے۔ شَفَاعَةٌ یہ لفظ شفعٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ ساتھی ہونا اور ہمراہی بننا دو رکعت نماز کو شفعہ کہتے ہیں۔ اور ہر جوڑے عدد کو شفع اور طاق عدد کو وتر کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ پڑوسی کو شفیع اور اُس کے حق پڑوسیت کو شفعہ کہتے ہیں کیونکہ وہ اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ اب یہ سفارش کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ کیونکہ سفارشی بھی حاجتمند کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔ بلکہ اُس کا ساتھی بن کر اُسی کی حمایت کرتا ہے۔ شفاعت کی پوری بحث انشاء اللہ اسی آیت کے خلاصہ تفسیر میں کی جائیگی۔ وَلَا يُؤْخَذُ یہ تیسری قسم کی مدد کی نفی ہے۔ یعنی نفس کافر سے کوئی معاوضہ و فدیہ بھی نہ لیا جائیگا۔ خیال رہے کہ یہاں بھی لینے کی نفی فرمائی گئی ہے۔ اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ فدیہ دے ہی نہ سکے۔ دوسرے یہ کہ دینا چاہے۔ مگر قبول نہ ہو۔ یہاں پہلے معنی ظاہر ہیں۔ یعنی کافر کے پاس کچھ دینے کو ہوگا ہی نہیں۔ تاکہ اُس سے وہ قبول کیا جائے۔ اور دوسرے معنی کا بھی احتمال ہے۔ کہ اگر اُس کے پاس سارے خزانے ہوں۔ اور وہ دے کر عذاب سے چھوٹنا چاہے۔ تو بھی منظور نہ ہو۔ مِنْهَا ظاہر یہ ہے۔ کہ یہ ضمیر دوسرے نفس کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی کافر نفس سے فدیہ نہ لیا جائیگا۔ اور یہ بھی احتمال ہے۔ کہ نفس اوّل کی طرف لوٹے یعنی اگر مومن شخص کافر کی طرف سے اعمال یا مال کا کوئی فدیہ پیش کرے۔ تو منظور نہ ہو (تفسیر عزیزی) عَدْلٌ لفظ عدل کے معنی برابری اور مساوات کے ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ۔ اس ہی سے لئے نظیر اور مثل کو عدیل کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اُس کے برابر ہوتا ہے۔ نیز انصاف کو عدل اور انصاف کی جگہ کو عدالت کہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں ظالم سے بدلہ لے کر مظلوم کے برابر کیا جاتا ہے اب اُس مال کو عدل کہتے ہیں جو جان وغیرہ کے عوض میں دیا جائے یعنی خون بہا اور فدیہ آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ کافر کو رشوت یا نذرانہ یا خون بہا لے کر بھی نہیں چھوڑا جائیگا۔ خیال رہے۔ کہ پہلے جملے میں جزاء کی نفی تھی اور یہاں عدل کی ہماری تقریر سے اِن دونوں میں فرق ظاہر ہو گیا۔ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ یہ چوتھی قسم کی مدد کی نفی ہے۔ نصر کے معنی بالجبر مدد کے بھی ہیں۔ اور بدلہ لینے کے بھی (تفسیر کبیر) قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا یہاں نصرنا کے معنی اِنْتَقَمْنَا ہیں۔ لہذا اس جملے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ یعنی نہ تو دھونس سے اُن کی مدد ہو سکے گی۔ اور کس میں یہ طاقت

سے ہے. کہ اللہ سے یا عذاب کے فرشتوں سے بدلے سکے. خلاصہ یہ ہے. کہ کفار سے کسی طرح بھی مصیبت دور نہ ہو سکے گی.

**خلاصہ تفسیر** اے بنی اسرائیل تم کو چاہیئے. کہ ہماری نعمتوں کو یاد کر کے شکر گزاری کرو. اور سرکشی سے باز آجاؤ. ہماری اطاعت کرو. نہ کہ غرور اور سرکشی اگر تم اس سے باز نہیں آتے تو خیال رکھو. کہ تم کو ایک دن ہمارے سامنے آکر حساب دینا ہے. اس دن سے خوف کرو. وہاں کسی صورت سے بھی تم عذاب سے نہیں بچ سکتے. نہ تو یہ ممکن ہے. کہ دوسرا شخص تمہارا ذمے دار بن جائے. کہ تمہارے حقوق اور حساب و کتاب کو اپنے پرلے کر تمہیں چھڑا دے. اس دن کی سختی ایسی ہوگی. کہ ہر شخص نفسی نفسی پکارے گا. کوئی کسی کے کام نہ آئے گا. يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ الخ نہ یہ ممکن ہے. کہ کوئی بھی کسی کافر کی سفارش کر کے چھڑا لے. رب کی مرضی بغیر کوئی نبی یا بزرگ کسی کے حق میں سفارش نہ فرمائیں گے. اور نہ یہ ممکن ہے. کہ تم یا تمہاری طرف سے کوئی دوسرا جرمانہ بھگت کر معاوضہ دے کہ مال وغیرہ خرچ کر کے تم کو آزادی دلادے. کیونکہ رب تعالیٰ کو مال و دولت کی پرواہ نہیں. نہ یہ ممکن ہے. کہ تمہارے یار و مددگار اہل برادری اور قرابت دار خدا کا مقابلہ کر کے تم کو زور سے چھڑالیں کیونکہ رب سے مقابلہ کرنے کی کسی میں طاقت نہیں.

## شفاعت

قریباً ساری امتِ مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے. کہ باذنِ پروردگار جناب احمد مختار صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی شفاعت فرمائیں گے. اور ان کے طفیل علماء و مشائخ بھی شفاعت کریں گے لیکن اس سے پہلے معتزلہ فرقے نے اس کا انکار کیا. اسی لئے تفسیر کبیر وغیرہ نے اُن کی بہت تردید فرمائی. اب وہ فرقہ مٹ بھی گیا. اور اس کا نام و نشان بھی جاتا رہا. اس زمانے میں دیوبندیوں اور وہابیوں نے شفاعت کا پرزور انکار کیا. چنانچہ ان کے امام الطائفہ مولوی اسمٰعیل دہلوی نے تقویت الایمان میں صاف صاف لکھ دیا. کہ خدا کے ہاں کوئی کسی کا سفارشی اور حمایتی نہیں. اسی تقویت الایمان میں صفحہ ۱۶ سولہ پر شفاعت بالاذن کا اقرار تو کیا. مگر اس کے معنی ایسے بگاڑے جس سے شفاعت کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی. یہ لکھ دیا. کہ شفاعت کی صورت صرف یہ ہے. کہ ایک بادشاہ کسی مجرم کو خود چھوڑنا چاہتا ہے لیکن اپنے قانون ٹوٹنے کے ڈر سے بظاہر کسی سے سفارش کرا لیتا ہے. اور وہ سفارش کرنے والا بھی شاہی اشارہ پاکر (منت کرم داشتن) کے طریقے سے کچھ ظاہری سفارش کر دیتا ہے. خدا کے ہاں کسی کی عزت نہیں. جو کہ عزت سے سفارش کرے نہ رب کو کسی سے محبت کہ اس کی بات محبت کی وجہ سے مان لے اس میں درپردہ شفاعت ہی کا انکار کر دیا. اب دیوبندی اور وہابی خدا کے خوف سے نہیں. بلکہ مسلمانوں کے ڈر سے شفاعت کا اقرار تو کر لیتے ہیں. اور حضور کو شفیع المذنبین بھی مان لیتے ہیں لیکن اسی بگڑے ہوئے معنی سے جیسے کہ قادیانی حضور کو خاتم النبیین دیگر معنی سے مان لیتے ہیں چونکہ انکارِ شفاعت کی وبا لوگوں میں درپردہ پھیلائی جا رہی ہے. اس لئے ہم اس کے متعلق کچھ تھوڑی سی بحث کرتے ہیں. اس بحث کے کچھ مضامین تو تفسیر کبیر سے لئے ہیں. اور کچھ مضامین وہ ہیں. جو رب نے ہم پر ظاہر فرمائے. اس بحث کے دو باب کئے جائیں گے پہلے باب میں شفاعت کا ثبوت قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ اور عقلی دلائل سے ہوگا اس میں یہ بھی بتایا جائیگا. کہ حضور کی شفاعت فقط رب کا بہانہ نہ ہوگی. بلکہ بالمحبت بھی ہوگی. اور شفاعت بالعزت بھی اور یہ دونوں قسم کی شفاعتیں شفاعت بالاذن میں ہی داخل ہیں. اور دوسرے باب میں اس پر اعتراض و جواب.

### پہلا باب شفاعت کے ثبوت میں

(۱) حق تعالیٰ فرماتا ہے. عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا اس سے معلوم ہوا. کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رب نے مقام محمود عطا فرمایا. اور مقام محمود وہی مقام ہوگا. جہاں تشریف فرما کر حضور شفاعت کا دروازہ کھولیں گے. اور آپ کی شانِ عالی کو دیکھ کر سارے دشمن و دوست آپ کی تعریف کریں گے.

(۲) وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى اس سے یہ معلوم ہوا. کہ رب تعالیٰ حضور کو راضی فرمائے گا. مسلم شریف میں ہے. کہ ایک دن

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھ اُٹھا کر رو رو کر اُمت کے حق میں دُعا فرما رہے تھے۔ کہ جبریل امین نے حاضر ہو کر رونے کا سبب پوچھا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ ہم کو اُمت کا غم رُلا رہا ہے۔ جبریل امین نے بارگاہ الٰہی میں جا کر یہی عرض کیا۔ ارشاد الٰہی ہوا۔ کہ میرے محبوب سے کہہ دو۔ کہ ہم آپ کو آپکی اُمت کے بارے میں راضی کرلیں گے۔ حدیث شریف میں ہے۔ کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ تو حضور نے فرمایا۔ کہ جب تک میرا ایک اُمتی دوزخ میں رہا میں راضی نہیں ہوں گا۔ (تفسیر خزائن عرفان سورۃ والضحیٰ) اس سے معلوم ہوا۔ کہ حضور علیہ السلام شفاعت فرمائیں گے۔ اور وہ شفاعت بالمحبت یا بالوجاہت ہوگی۔ کیونکہ حضور کو راضی کرنے کے لئے ہوگی سبحان اللہ کیا ناز محبوبانہ ہے۔ کہ رب فرما رہا ہے ہم راضی کرلیں گے۔ اور محبوب فرماتے ہیں۔ کہ ہم راضی نہ ہوں گے۔ اگر ہم یہ بات کہیں تو کافر ہو جائیں (۳) وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ الخ اس سے معلوم ہوا جو مجرم بھی اپنی معافی چاہے وہ بارگاہ مصطفےٰ علیہ السلام میں حاضر ہو۔ اور حضور علیہ السلام اُس کے لئے سفارش فرمائیں۔ تو رب معافی فرماتا ہے۔ یہی شفاعت ہے۔ (۴) وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ یہاں حضور کو حکم دیا جا رہا ہے۔ کہ آپ مسلمانوں کے صدقے لے کر اُن کو پاک فرما دو۔ اور اُن کے لئے دعا بھی کرو۔ آپ کی دُعا سے اُن کو چین حاصل ہوتا ہے۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ کوئی عمل حضور کی سفارش بغیر قبول نہیں ہوتا۔ اور مسلمانوں کو طہارت پاکیزگی حضور کے کرم سے حاصل ہوتی ہے۔ نہ کہ محض اپنے اعمال سے دوسرے یہ کہ صحابہ کرام کو فقط اپنے اعمال پر چین نہ آتا تھا۔ بلکہ حضور کی سفارش اور دعا سے اِن تمام آیتوں کی نہایت عمدہ تفسیر ہماری کتاب شان حبیب الرحمٰن میں دیکھو (۵) وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ اس میں حضور علیہ السلام سے فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اپنی خطاؤں کی اور مسلمانوں کے گناہوں کی مغفرت مانگو اس میں سارے ہی مجرم مسلمان داخل ہو گئے۔ اور یہی شفاعت ہے (۶) حق تعالیٰ ملائکہ حاملین عرش کی تعریف میں فرماتا ہے۔ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا معلوم ہوا۔ کہ فرشتے مسلمانوں کے لئے دعا کرتے ہیں (۷) عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا۔ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۸) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا تھا۔ کہ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ ان دو آیتوں سے معلوم ہوا۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام نے گنہگاروں کی دنیا ہی میں شفاعت فرمائی۔ اسی جگہ تفسیر کبیر نے فرمایا۔ کہ حضور علیہ السلام نے یہ آیتیں پڑھ کر اپنی اُمت کے حق میں دعا کی اور بہت گریہ وزاری فرمائی۔ اور پھر وہ حدیث نقل کی جو ہم نے آیت والضحیٰ میں بیان کر دی (۹) رب تعالیٰ نے سورۂ مریم میں متقین کی صفات بیان فرماتے ہوئے فرمایا۔ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ متقی اُس کی شفاعت کریں گے جس نے رب سے عہد کر لیا ہے۔ اور ہر مسلمان رب سے عہد کرنے والا ہے (۱۰) حق تعالےٰ صفات ملائکہ میں فرماتا ہے۔ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى اس سے معلوم ہوا۔ کہ جس سے خدا راضی ہو اُس کے لئے فرشتے شفاعت کریں گے۔ اور ہر مسلمان سے اسلام کی وجہ سے خدا راضی ہے (۱۱) رب نے فرمایا۔ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ الخ جس سے معلوم ہوا۔ کہ جب کوئی سلام کرے۔ تو اُس کا اچھا جواب دینا چاہیئے اور سارے مسلمانوں کو حکم ہے۔ کہ ہمارے نبی پر صلوٰۃ و سلام پڑھو۔ صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ جب ہم حضور پر صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہیں۔ تو حضور ہم کو جواب میں دعا دیتے ہیں یا کہ نہیں۔ اگر نہیں دیتے تو پہلی آیت کے خلاف ہے۔ اور اگر دیتے ہیں۔ تو یقیناً ہمارے سلام سے بہتر ہی جواب دیں گے کیونکہ یہی حکم ہے۔ لہٰذا یقیناً آپ ہمارے جواب میں اعلیٰ درجے کی شفاعت فرماتے ہیں (تفسیر کبیر) (۱۲) مشرکین کی برائی میں فرمایا گیا۔ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ جس سے معلوم ہوا۔ کہ کفار پر یہ قہر الٰہی ہوگا۔ کہ انہیں شفاعت نفع نہ دے گی۔ اگر مسلمانوں کا بھی یہی حال ہو۔ تو اُن میں اور کفار میں کیا فرق رہا۔ (۱۳) يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ جس سے معلوم ہوا۔ کہ مشرکین کا مال اور اولاد انہیں کچھ فائدہ نہ دے گی۔ لیکن مسلمانوں کے لئے مال بھی کار آمد اور اولاد بھی۔ احادیث شفاعت کے متعلق بے شمار احادیث ہیں۔ یہاں کچھ بطور نمونہ عرض کی

جاتی ہیں (۱) تفسیر کبیر نے اس جگہ بحوالہ مسلم فرمایا کہ حضور فرماتے ہیں کہ ہر نبی کو حق تعالٰے کی طرف سے ایک دعا ملتی ہے اور سب نے اپنی دعائیں یہاں استعمال کرلیں مگر میں نے اپنی دُعا محفوظ رکھی ہے۔ اُس سے قیامت کے دن اپنی اُمّت کی شفاعت کروں گا۔ اور یہ شفاعت میرے ہر اس اُمتی کو پہنچے گی جو مومن ہو کر مرے۔ (۲) مشکوٰۃ میں بحوالہ مسلم بخاری ہے کہ لوگ قیامت کی گرمی سے گھبرا کر شفیع کی تلاش میں نکلیں گے۔ آدم علیہ السلام کے پاس پہنچ کر شفاعت چاہیں گے وہ فرمائیں گے کہ مجھ سے خود ایک خطا ہو گئی ہے۔ لب کشائی کرنے کی میری ہمت نہیں پڑتی۔ نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ شائد وہاں شفاعت ہو جائے۔ وہ بھی یہی جواب دے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بھیجیں گے۔ وہ بھی یہی جواب دے کر موسٰی علیہ السلام کے پاس اور وہ عیسٰی علیہ السلام کے پاس بھیجیں گے عیسٰی علیہ السلام فرمائیں گے۔ کہ آج سوائے محمد رسول اللہ کے تمہاری شفاعت کوئی نہیں کرسکتا۔ تب سب لوگ ہمارے پاس آئیں گے ہم کہیں گے کہ بیشک شفاعت کرنا ہمارا کام ہے۔ پھر ہم سجدے میں سر رکھ کر شفاعت فرمائیں گے حکم الٰہی ہوگا کہ اے محمدؐ اپنا سر مبارک اٹھاؤ بات کرو سُنی جائے گی شفاعت کرو قبول کی جائے گی کچھ مانگو دیا جائے گا۔ تب ہم سر اٹھائیں گے۔ اور شفاعت فرمائیں گے الخ

خلیل و نجی مسیح و صفی سبھی سے کہی کہیں نہ بنی ۔۔۔ یہ بے خبری کہ خلق پھری کہاں سے کہاں تمہارے لئے
فقط اتنا سبب ہے انعقادِ بزمِ محشر ہیں ۔۔۔ کہ اُن کی شانِ محبوبی دکھائی جانے والی ہے

**لطیفہ**۔ دنیا میں سب جانتے ہیں کہ حضور ہی شفیع المذنبین ہیں مگر قیامت میں بھول جائیں گے محدثین مفسرین علماء مشائخ سب ہی اُس مجمع میں موجود ہیں مگر کسی کو یہ یاد نہیں آتا۔ انبیاء کرام کو بھی خیال نہ رہا صحیح پتہ نہ بتا سکے۔ اس میں کیا راز ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر اوّل ہی سے حضور علیہ السلام تک پہنچ جاتے۔ تو شائد کوئی بدگو کہتا کہ اس شفاعت میں حضور کی کیا تخصیص ہے۔ ایسی شفاعت تو ہر جگہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے پہلے ان سب کو تمام جگہ پھرا لیا گیا۔ تاکہ شانِ مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کا پتہ چل جائے۔ اور سب معلوم کرلیں۔ کہ آج سارے انبیاء نفسی نفسی فرما رہے ہیں اُمتی اُمتی کہنے والی صرف مصطفٰے علیہ السلام کی زبان پاک ہے۔ سب اِذْھَبُوْا اِلٰی غَیْرِیْ فرمائیں گے۔ (کسی اور کے پاس جاؤ) لیکن آج اَنَا لَھَا فرمانے والے صرف حضور ہی ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی فرما رہے ہیں۔ کہ میں تو باہر کا دوست ہوں۔ اندرون سرا مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ (۳) مشکوٰۃ شریف باب الشفاعت میں ہے۔ کہ تین جماعتیں قیامت کے دن شفاعت فرمائیں گی اوّل انبیاء پھر علماء پھر شہداء (۴) اسی جگہ ہے۔ کہ حضرت انس نے حضور سے عرض کیا۔ کہ قیامت میں آپ میری شفاعت فرمائیں۔ فرمایا ہم ضرور کریں گے۔ عرض کیا کہ میں آپ کو وہاں کس جگہ ڈھونڈوں فرمایا۔ صراط پر۔ عرض کیا اگر وہاں نہ پاؤں۔ فرمایا میزان پر۔ عرض کیا۔ اگر وہاں بھی نہ پاؤں۔ فرمایا حوض کے پاس (۵) اسی مشکوٰۃ باب البکاء علی المیت میں ہے۔ کہ حضور نے فرمایا۔ کہ جس کے دو چھوٹے بچے مر جائیں وہ اُسے جنّت میں لے جائیں گے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا۔ کہ اگر ایک مر جائے۔ فرمایا ایک بھی۔ عرض کیا اگر کوئی نہ مرا ہو فرمایا اُس کو میں جنت میں لے جاؤں گا۔ (۶) اسی میں اسی جگہ ہے۔ کہ کچا بچہ اپنے رب سے اپنے والدین کے بارے میں جھگڑا کرے گا۔ تو اُس سے فرمایا جائیگا۔ کہ اے اپنے ربّ سے جھگڑنے والے بچے جا اپنے ماں باپ کو جنّت میں لے جا۔ پس وہ ان دونوں کو اپنی نال سے کھینچ کر جنت میں لے جائیگا۔ (۷) اسی مشکوٰۃ باب الوصایا میں ہے۔ کہ حضور فرماتے ہیں۔ کہ اگر مسلمان میت کی طرف سے صدقہ کیا جائے یا غلام آزاد کئے جائیں یا حج کیا جائے۔ تو وہ اس کو پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بے شمار احادیث پیش کی جا سکتیں ہیں مگر یہاں اتنی ہی پر کفائت ہے۔

## شفاعت کے عقلی دلائل

دنیا آخرت کا نمونہ ہے۔ اور دنیا میں تو بادشاہوں کے ہاں حکام اور مقربین مجرم کی سفارش کرکے چھڑا لیتے ہیں۔ ایسے ہی آخرت میں بھی مقبولانِ الٰہی شفاعت سے مجرموں کو عذاب سے بچائیں گے۔ مگر باغی کی سفارش کوئی نہیں کرسکتا۔ ایسے ہی کفار کی شفاعت بھی نہ ہوگی۔ (۲) کبھی بادشاہ اپنے پیارے کی عزت افزائی کے لئے کسی کو اُس کے

ذریعے کچھ دیتا ہے۔ تاکہ لوگوں میں اُس کی عزت ہو۔ اسی طرح رب تعالیٰ اپنے محبوبوں کے ذریعے لوگوں پر رحم فرماتا ہے۔ تاکہ اُن کی عزت ظاہر ہو۔ (۳) حق تعالیٰ تقریباً ساری نعمتیں وسیلے اور ذریعے سے عطا فرماتا ہے۔ وہ رازق شافی خالق ہے لیکن مالداروں کے ذریعے رزق اور شفاء طبیبوں کے ذریعے عطا فرماتا ہے۔ اسی طرح بیشک وہ غفار ہے۔ لیکن بذریعہ مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم گنہگاروں کی مغفرت کرے گا۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف باب ذکر الیمن میں ہے۔ کہ شام میں چالیس ابدال رہیں گے جن کی برکت سے بارشیں ہوں گی دشمنوں پر فتح حاصل ہوگی۔ اور اہل شام سے عذاب دفع ہوگا۔ (۴) اگر شفاعت کوئی چیز نہ تھی۔ تو نماز جنازہ بھی نہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ وہ بھی شفاعت ہی ہے۔ جو ان میت کو مسلمان سامنے رکھ کر اُس کے لئے دعا کرتے ہیں۔ اور بچے کو اپنا شفیع بناتے ہیں۔ چنانچہ بچے کے جنازے پر پڑھتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ لَنَا فَرَطًا پھر اخیر میں کہتے ہیں۔ وَاجْعَلْہُ لَنَا شَافِعًا وَّمُشَفَّعًا یعنی اے اللہ اس بچے کو ہمارا شفیع بنا غرضکہ نماز جنازہ مسئلہ شفاعت پر مبنی ہے۔ خیال رہے۔ کہ یہ شفاعت محض حیلے کے طور پر نہ ہوگی۔ جیسا کہ مولوی اسمٰعیل نے تقویت الایمان میں لکھا بلکہ شفاعت بالوجاہت اور شفاعت بالمحبت اور شفاعت بالاذن ہر طرح کی ہوگی رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَلْعِزَّۃُ لِلّٰہِ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ موسےٰ علیہ السلام کے بارے میں فرماتا ہے۔ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰہِ وَجِیْھًا عیسیٰ علیہ السلام کے لئے فرماتا ہے۔ وَجِیْھًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ والوں کو رب نے اپنی بارگاہ میں بڑی عزت دی ہے۔ رب فرماتا ہے۔ یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ نیز فرماتا ہے۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ معلوم ہوا کہ یہ لوگ اللہ کے پیارے ہیں۔ اور اس لئے ان کی بات وہاں مانی جاتی ہے۔ مشکوٰۃ باب فضل الفقراء میں ہے۔ کہ حضور فرماتے ہیں۔ کہ میری اُمت کے بہت سے پریشان حال اور پراگندہ بال ایسے ہوں گے۔ کہ اگر وہ اللہ پر قسم کھا جائیں۔ تو رب اُن کی قسم پوری فرمادے۔ یعنی اگر وہ قسم کھالیں۔ کہ فلاں کو جنت میں لے جاؤں گا۔ تو رب تعالیٰ ضرور اُس کو جنت میں بھیجے۔ ابھی آپ پڑھ چکے۔ کہ چھوٹے بچے اپنے والدین کے لئے رب سے جھگڑا کریں گے معلوم ہوا۔ کہ یہ حضرات بارگاہِ الٰہی میں ناز کرتے ہیں۔ اور ان کے ناز قبول فرمائے جاتے ہیں۔ نیز شفاعت بالاذن کے معنی یہ نہیں ہے۔ کہ ہر مجرم کے لئے خاص اذن حاصل کر کے شفاعت کی جائے۔ یا رب کو خود بخشنا منظور ہو اور بہانے کے لئے مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب اشارہ کردے۔ بلکہ معنی یہی ہیں۔ کہ بارگاہِ الٰہی میں کسی کو بغیر اجازت بولنے کی جرأت نہیں۔ ہاں حضرات کو اجازت عام ہوگی۔ کہ ہر مسلمان کی شفاعت کریں۔ اور بخشالیں۔ اور جس کو عذاب دینا منظور ہوگا۔ اُس کی طرف شفیع المذنبین کا خیال ہی نہ جائیگا۔ یہ سب باتیں خدا کی عطا سے ہیں۔ نہ کہ اُس پر دھونس واضح رہے کہ اس آیت میں جو فرمایا گیا۔ کہ نہ کوئی نفس کسی کا بدلہ بنے نہ کوئی شفاعت قبول کی جائے۔ نہ اُسے فدیہ لے کر چھوڑا جائے۔ اور نہ کسی کی مدد کی جائے۔ یہ سب کفار کے لئے ہیں مسلمانوں کو انشاء اللہ یہ چاروں نعمتیں حاصل ہونگی۔ روایات میں آتا ہے۔ کہ کفار مسلمانوں کا فدیہ بن کر جہنم میں جائیں گے۔ اور مسلمان جنت میں اپنی جگہ بھی لیں گے۔ اور کفار کی بھی نیز مسلمانوں کے مالی عبادتیں یعنی صدقات وخیرات اُن کے کام آئیں گی۔ کہ ان کی برکت سے غضب الٰہی کی آگ بجھ جائے گی۔ مسلمانوں کی شفاعت بھی ہوگی۔ جیسا کہ گزر چکا۔ مسلمانوں کے بچے علماء ومشائخ اُنکی باذن الٰہی مدد بھی کریں گے۔ یہ آیت مسلمانوں پر چسپاں کرنا جہالت ہے۔ **فصل** شفاعت کے متعلق چند باتیں یاد رکھو ایک یہ کہ قیامت کے دو وقت ہیں۔ پہلا عدل کا دوسرا افضل کا پہلے وقت میں دیگر انبیاء اکرام بھی کچھ بولنے کی ہمت نہ کریں گے۔ اُس وقت صرف حضور ہی شفاعت فرمائیں گے۔ اور دروازۂ شفاعت آپ ہی کھولیں گے۔ اسی لئے آپ کو شفیع المذنبین کہا جاتا ہے۔ یعنی بے کسی کیوقت میں گنہگاروں کی شفاعت فرمائیں گے۔ اسی کا نام شفاعتِ کبریٰ ہے۔ اور یہ حضور کی خصوصیت ہے۔ دروازہ کھلنے کے بعد ہر نیک کار بدکار کی شفاعت کرے گا۔ **دوسرے** یہ کہ شفاعت چار قسم کی ہوگی۔ (۱) میدان محشر سے نجات دلانے کے لئے (۲) عذاب الٰہی کم کرانے کے لئے (۳) گناہ معاف کرانے اور جہنم سے بچانے کے لئے (۴) درجے بڑھانے کے لئے پہلی شفاعت سے سارا عالم فائدہ

اُٹھائیگا۔ کفار بھی اور مومنین بھی دوسری قسم کی شفاعت کفار کے لئے ہے۔ احادیث میں آیا ہے۔ کہ حضور کی برکت سے بعض کفار کا عذاب ہلکا ہوتا ہے۔ جیسے کہ ابو طالب اور ابولہب کا۔ ابو طالب تو حضور کی خدمت کی وجہ سے اور ابولہب حضور کی ولادت پاک کی خوشی منانے سے عذاب میں ہلکے ہیں۔ روح البیان نے فرمایا ہے۔ کہ حاتم طائی کو بھی ہلکا عذاب ہوگا۔ تیسری شفاعت مومن گنہگاروں کے لئے اور چوتھی شفاعت نیک کاروں کے لئے ہوگی وہ جو حدیث میں آتا ہے۔ کہ سنت کو چھوڑنے والا شفاعت سے محروم ہے۔ اُس سے چوتھی شفاعت مراد ہے۔ یعنی بلندئ درجات کی ورنہ دوسری روایت میں ہے۔ کہ میری شفاعت گناہ کبیرہ والوں کیلئے بھی ہوگی۔ نیز یہ جو عقیدہ ہے۔ کہ کافر شفاعت سے محروم ہیں۔ اُس سے اخیر کی دو شفاعتیں مراد ہیں۔ ہماری اس تقریر سے معلوم ہوا۔ کہ ہر نیک و بد حضور کی شفاعت کا محتاج ہے چوتھے یہ کہ شفاعت صغریٰ اتنے حضرات کریں گے۔ انبیاء، اولیاء، علماء، مشائخ، حجر اسود۔ قرآن کریم۔ خانہ کعبہ۔ ماہ رمضان۔ اور چھوٹے بچے بلکہ مشکوٰۃ باب آذان میں بحوالۂ بخاری و احمد وغیرہ ہے۔ کہ جہاں تک موذن کی آذان پہنچتی ہے۔ وہاں تک کی ہر چیز قیامت کے دن اُسکے ایمان کی گواہی دے گی۔ مولوی عبدالحی صاحب نے مقدمہ ھدایہ میں لکھا۔ کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ قیامت کے دن حجر اسود کی آنکھیں اور منہ ہوں گے۔ اور وہ حاجیوں کی شفاعت کرے گا۔ بعض جہنمی بغیر شفاعت بھی جنت میں جائیں گے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ رب تعالیٰ اپنا لپ (ٹک) بھر کر جہنمیوں کو جنت میں ڈالے گا۔ اور ان لوگوں کا نام عتقاالرحمٰن ہوگا۔ (مشکوٰۃ باب الشفاعت بحوالہ مسلم بخاری) تفسیر روح البیان نے آیۃ الکرسی کی تفسیر میں لکھا۔ کہ یہ لوگ وہ ہوں گے جو عنداللہ مومن تھے۔ نہ کہ عند شریعت۔

## دوسرا باب مسئلہ شفاعت پر اعتراض و جوابات

مسئلہ شفاعت پر آریوں نیچریوں اور دیوبندیوں کے کچھ اعتراضات ہیں جسکو ہم مع جواب عرض کرتے ہیں۔ **پہلا اعتراض۔** بہت سی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا کے یہاں کسی کی شفاعت نہیں۔ حضور علیہ السلام نے اپنی اوّل تبلیغ میں حضرت فاطمہ زہرہ سے فرمایا کہ میں تم سے خدا کا عذاب دفع نہیں کرسکتا۔ (نیچری اور دیوبندی) **جواب۔** اس قسم کی ساری آیتوں اور احادیث میں کفار مراد ہیں۔ سیدنا فاطمہ الزہرہ سے بھی یہی فرمایا جارہا ہے۔ کہ اگر تم نے ایمان قبول نہ کیا۔ تو تمہاری شفاعت نہ ہوگی۔ اسی لئے بہت آیات قرآنیہ میں اِلّا فرماکر مستثنیٰ فرمایا گیا۔ **دوسرا اعتراض۔** اگر خدا پیغمبر کی سفارش سے جنت دیدے تو خدا طرف دار ہے (ستیارتھ پرکاش باب چودہ[14]) **جواب۔** اس کا جواب شروع سورہ بقر میں گزرچکا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت بعض کے ذریعے بعض کو پہنچتی ہے۔ اور بیشک خدائے تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کا طرف دار ہے اچھوں کی طرف داری کرنا اچھا ہے۔ پنڈت جی کو سورج سے روشنی اور مالداروں سے بھیک ملتی ہے **تیسرا اعتراض** کفار عرب بتوں کو اپنا شفیع جانتے تھے۔ قرآن کریم نے اس عقیدے کو کفر قرار دیا۔ بہت آیتیں اس پر گواہ ہیں۔ مسلمان پیغمبروں ولیوں کو شفیع مان کر کافر ہوتے ہیں **جواب** کفار غیر ماذون بلکہ رب کے دشمنوں کو شفیع مان کر کافر ہوتے ہیں (بتوں کو) ہم اُن محبوبوں کو شفیع مانتے ہیں جن کو رب نے شفیع بنایا۔ نیز کفار دھونس کی شفاعت مانتے تھے وہ سمجھتے تھے۔ کہ رب تعالیٰ کو بتوں کی شفاعت مجبوراً ماننی پڑے گی کیونکہ وہ اُس کی خدائی میں دخیل ہیں۔ لہٰذا وہ کافر تھے۔ ہم مقبولان خدا کی شفاعت بالاذن اور شفاعت بالعزت اور بالوجاہت عطائی مانتے ہیں **چوتھا اعتراض۔** شفاعت کے عقیدے سے مسلمان بدعمل بن جائیں گے۔ کیونکہ وہ شفاعت پر اعتماد کر کے اعمال سے غافل ہوجائیں گے۔ (دیوبندی اور وہابی) **جواب** یہ اعتراض تو ایسا ہی ہے۔ جیسے آریہ کہتے ہیں۔ کہ توبہ کا مسئلہ بدعمل بناتا ہے۔ جناب شفاعت سے امید بڑھے گی۔ اور امید سے شوق عمل زیادہ ہوگا۔ **پانچواں اعتراض** ہم بھی حضور کے واسطے رحمت مانگتے ہیں۔ اور اُن پر درود پڑھتے ہیں۔ اور حضور بھی ہمارے لئے دعا ہی کرتے ہیں۔ اور کریں گے۔ تو چاہیئے۔ کہ حضور ہمارے شفیع ہوں اور ہم آپ کے **جواب** ان دونوں دعاؤں میں بڑا فرق ہے اور حضور کی دعا سے ہمارے بیڑے پار ہوں گے۔ اُن کی دُعا کے بغیر ہمارا کام چل سکتا ہی نہیں۔ ہمارا دُعا کرنا اُن سے بھیک مانگنے کے

لئے ہے۔ جیسے کہ بھکاری سخی کو دعائیں دے کر بھیک مانگتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے جہاں درود کا حکم دیا۔ وہاں پہلے ہی فرمادیا کہ ہم نبی پر رحمتیں بھیج رہے ہیں۔ تم بھی اُن کے لئے دُعا کیا کرو یعنی تمہاری دعا پر ہماری رحمت موقوف نہیں۔ پہلی قسم کی دعا شفاعت ہے۔ اور دوسری دعا بھیک مانگنا۔ لہٰذا حضور ہمارے شفیع ہیں۔ اور ہم اُن کے بھکاری

وَاِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ

اور جبکہ نجات دی ہم نے تم کو فرعون کی ذرّیت سے چکھاتے تھے وہ تم کو سختی عذاب کی ذبح کرتے تھے وہ بیٹوں کو تمہارے

اور یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے نجات بخشی۔ کہ تم پر بڑا عذاب کرتے تھے۔ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے

وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْؕ وَفِیْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ (۴۹)

اور زندہ چھوڑتے تھے لڑکیوں کو تمہاری اور بیچ اس کے بلا ہے طرف سے رب تمہارے کے بڑی

اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے۔ اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی یا بڑا انعام ہوا۔

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ پہلے اجمالاً بنی اسرائیل کی نعمتوں کا ذکر ہوا تھا۔ اب اُسکی تفصیل فرمائی جارہی ہے۔ چونکہ اُن پر دو قسم کے احسانات ہوئے تھے۔ ایک تو مصیبت دور کرنا۔ دوسرے رحمتیں عطا فرمانا اور ظاہر ہے۔ کہ مصیبت سے نجات ملنا حصول نعمت پر مقدم ہے۔ اس لئے پہلے اُسی کا ذکر ہوا۔ دوسرے یہ کہ اس سے پہلے ارشاد ہوا تھا کہ قیامت میں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ اب یہ سمجھانے کے لئے فرعون کے ظلم کا واقعہ بیان ہو رہا ہے جس سے معلوم ہوا کہ جب دنیوی مصیبت میں کوئی کسی کے کام میں نہیں آتا۔ تو قیامت میں کون کام آسکتا ہے۔ اور اے اسرائیلیو دنیوی بادشاہ کے غضب سے تم سخت مصیبت میں گرفتار ہوگئے۔ تو اگر کفر کر کے تم غضب الٰہی میں آگئے۔ تو تمہارا کیا حال ہوگا۔ تیسرے یہ کہ یہ بنی اسرائیل دنیوی عزت کی خاطر اور اپنی حکومت باقی رکھنے کے لئے اسلام قبول نہ کرتے تھے۔ جیسا کہ پہلے معلوم ہوا۔ اب انہیں فرعون کا واقع یاد دلا کر بتایا جارہا ہے۔ کہ ملک اللہ کا ہے۔ جس کو چاہے دے۔ جیسے کہ فرعون سے چھین کر تم کو ملک مصر دیا۔ اُسی طرح ہو سکتا ہے۔ کہ تم سے چھین کر مسلمانوں کو دے دیا جائے۔ لہٰذا آخرت کی عزّت طلب کرو نہ کہ محض دنیا کی چوتھے یہ کہ بنی اسرائیل مسلمانوں کو غریب اور حقیر سمجھ کر اُن سے علیحدہ رہتے تھے۔ اور کفار کی عزّت وعظمت پر نظر کر کے اُن سے تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا اُن کو فرعون کا قصہ یاد دلا کر بتایا جارہا ہے۔ کہ دیکھو کہ پہلے تم حقیر و غریب تھے۔ مگر حق پر تھے۔ اور فرعونی لوگ عزّت والے تھے۔ مگر جھوٹے آخر کار تمہاری فتح ہوئی۔ اور وہ ہلاک ہوئے۔ اب تم جھوٹے ہو۔ اور غریب مسلمان سچے۔ لہٰذا یقین کرلو۔ کہ تم ہلاک ہوجاؤ گے۔ اور وہ غالب رہیں گے۔ مسلمانوں کی غریبی سے دھوکہ مت کھاؤ۔ **تفسیر وَاِذْ** یہ اُذکروا فعل کا مفعول ہے۔ یعنی وہ وقت یاد کرو۔ چونکہ بنی اسرائیل تاریخ سے واقف تھے اس لئے اُن کو یہ واقعہ یاد دلایا جارہا ہے۔ **نَجَّیْنٰكُمْ** یہ لفظ نجوٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں علیحدہ یا اونچی جگہ چونکہ جو کوئی فتنے سے علیحدہ بھاگ جائے وہ اُس سے بچ جاتا ہے۔ اس لئے اُس بچنے کو نجات بولتے ہیں اس نجوٌ سے بہت سے لفظ بنتے ہیں مگر سب میں علیحدگی کے معنی ملحوظ ہیں اس سے استنجا بنا ہے۔ کیونکہ یہ بھی علیحدگی میں کیا جاتا ہے۔ اسی سے مناجات بنا جس کے معنی ہیں تنہائی میں دعا کرنا۔ اسی سے نجوا بنا جسکے معنی مشورہ کرنا کیونکہ وہ بھی علیحدگی میں کیا جاتا ہے۔ اس کے معنے ہوئے۔ کہ ہم نے تم کو فرعون والوں سے علیحدہ کرلیا۔ اور نجات دے دی۔ اگرچہ یہ واقعہ موجودہ بنی اسرائیل کے باپ دادوں کو پیش آیا تھا۔ مگر چونکہ اُن کا بچنا گویا انہیں کا بچنا تھا۔ اگر وہ نہ بچتے تو یہ کیسے پیدا ہوتے۔ اس لئے ان سے فرمایا گیا۔ کہ تم کو نجات دی۔ **مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ** آل اہل سے بنا ہے۔ مگر ان میں فرق یہ ہوگیا۔ کہ اہل کو ہر طرف نسبت کر دیتے

ہیں کہتے ہیں۔ اہل بیت اہل شہر اہل علم مگر آل صرف بڑے آدمی کی طرف نسبت ہوتا ہے خواہ دینوی لحاظ سے بڑا ہو خواہ دینی کہا جاتا ہے آل عمران۔ آل نبی۔ آل فرعون وغیرہ آل گھر میں رہنے والوں کو بھی کہتے ہیں۔ جیسے بیوی بچے خدام وغیرہ اور گھر میں پیدا ہونے والوں کو بھی یعنی اولاد اور تابعداروں کو بھی یہاں تیسرے معنی ہی مراد ہیں یعنی فرعون کے نوکر چاکر پولیس والے وغیرہ کیونکہ فرعون کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اور اس کی بیوی سے بنی اسرائیل کو تکلیف نہ پہنچی فرعون بادشاہ مصر کا لقب تھا کیونکہ مصری زبان میں اس کے معنی تھے بادشاہ جیسے عربی میں سلطان فارسی میں پادشاہ ہندی میں راجہ اور انگریزی میں کنگ ہر بادشاہ مصر کو فرعون کہا کرتے تھے۔ اس فرعون کا نام ولید ابن مصعب تھا۔ اور چونکہ یہ بہت خوبصورت تھا۔ اس لئے لوگ اُسے قابوس کہتے تھے جس کے معنی ہیں۔ روشن چنگاری اور بادشاہ ہونے کی وجہ سے فرعون کہا جاتا تھا۔ یہ بہت سخت مزاج اور ظالم شخص تھا۔ اس کے باقی حالات خلاصہ تفسیر میں آئیں گے۔ خیال رہے کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے۔ کہ یہی یوسف علیہ السلام کا فرعون بھی تھا۔ مگر یہ غلط ہے۔ اُس کا نام ریان ابن ولید تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام میں چار سو برس کا فاصلہ ہے۔ لہٰذا یہ وہی فرعون کیسے ہو سکتا ہے۔ یَسُوْمُوْنَكُمْ یہ لفظ سومٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ڈھونڈنا اور تلاش کرنا۔ اسی لئے نرخ (بھاؤ) کو بھی سوم کہتے ہیں۔ کہ اُس سے چیز تلاش کی جاتی ہے۔ یہاں پہنچانے یا چکھانے کے معنی میں استعمال ہوا چونکہ وہ بھی بنی اسرائیل کو تلاش کر کے تکلیف دیتے تھے۔ سُوْٓءَ الْعَذَابِ۔ سُوْ کے معنی برائی اور سختی بھی ہیں۔ اور بُرا اور سخت بھی یہاں ہر معنی بن سکتے ہیں یعنی تم کو عذاب کی سختی یا سخت عذاب پہنچاتے تھے۔ فرعون کی سختیاں بنی اسرائیل پر بے پناہ تھیں۔ اُن کے بچوں کو اپنی قوم کا غلام بنا لیا تھا۔ اُن کی عورتیں فرعونیوں کی خادمائیں تھیں۔ اُن کے جوانوں کے ذمے سخت دشوار کام تھے۔ وہ پتھر ڈھوتے تھے جس سے اُن کی کمر اور گردنیں زخمی ہو گئی تھیں۔ غریبوں پر ٹیکس مقرر تھے۔ جو روزانہ شام سے پہلے وصول کر لئے جاتے تھے۔ اگر کسی سے ایک دن کا ٹیکس بھی ادا نہ ہوتا تھا۔ تو اس کے ہاتھ گردن کے ساتھ باندھ دیئے جاتے تھے۔ اور مہینے بھر تک اُس کو اس مصیبت میں رکھا جاتا تھا۔ کمزور بڈھے اسرائیلی نہایت ذلیل کام پر مقرر کئے گئے تھے چنانچہ وہ فرعونیوں کے لئے اینٹیں بنا کر پکاتے تھے۔ اُن کے مکانات تیار کرتے تھے۔ اُن کے پاخانوں اور گلیوں میں جھاڑو دیا کرتے تھے۔ اُن کی بڈھی عورتیں فرعونیوں کے لئے سوت کات کر کپڑے بناتی تھیں وغیرہ وغیرہ (تفسیر کبیر و روح البیان و عزیزی و خزائن العرفان)۔ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ یا تو یہ اُس سخت عذاب کی کچھ تفصیل ہے۔ یا علیحدہ چیز یعنی اُس کا ظلم تم پر یہاں تک بڑھ گیا تھا۔ کہ تمہارے بچوں کو ذبح کر ڈالتا تھا۔ اس کا پورا واقعہ انشاء اللہ خلاصۂ تفسیر میں آئے گا۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لو کہ فرعون اسرائیلی کے چھوٹے لڑکوں کو ذبح کراتا تھا۔ اور یہ سخت مصیبت تھی۔ کیونکہ لڑکوں کے ذبح ہونے سے اس نسل کے ختم ہونے کا اندیشہ تھا۔ نیز بغیر مردوں کے عورتوں کی زندگی دشوار اور اُن کی عزت اور عصمت خطرے میں ہوتی ہے۔ نیز چھوٹے بچوں کے ذبح کرنے میں اُس کی ماں کو سخت تکلیف ہوتی ہے کیونکہ بڑی مشقت سے اُس کو حاصل کرتی ہے۔ اور اُس سے بہت سی امیدیں رکھتی ہے۔ نیز قدرتی طور پر بمقابلہ بیٹی کے بیٹا زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ لہٰذا بیٹوں کا ماں باپ کے سامنے ذبح ہو جانا بڑی ہی مصیبت تھی اور پھر اگر فرعونی ان کی ساری اولاد قتل کر دیتے تو غنیمت تھا۔ مگر وہ یہ نہ کرتے تھے۔ بلکہ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ تمہاری لڑکیوں کو زندہ چھوڑتے تھے۔ خیال رہے۔ کہ قرآن کریم نے لڑکوں کیلئے اَبْنَآءَ فرمایا نہ کہ رجال لڑکیوں کے لئے نِسَآءَ فرمایا نہ کہ بنات چھوٹی لڑکیوں کو بنات اور جوانوں کو نساء کہا جاتا ہے۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے۔ کہ وہ اُن بچیوں کو زندہ چھوڑتے تھے۔ کہ جو جوان ہو کر تمہارے لئے وبال جان بن جاتی تھیں۔ کیونکہ لڑکی جوان ہو کر ماں باپ کیلئے بوجھ بن جاتی ہے۔ اور خاص کر جب کہ قوم کے بچے ذبح کئے جا رہے ہیں۔ کہ آپ تو اور مصیبت تھی۔ کہ لڑکیاں جوان ہو کر کہاں جائیں گی جب ان کے نکاح کیلئے قوم میں مرد نہ ملیں گے۔ تو نہ معلوم ان کا انجام کیا ہو

وَفِیْ ذٰلِکُمْ۔ یہ تمام کی طرف اشارہ ہے یعنی اس ذبح کرنے زندہ چھوڑنے اور سخت عذاب میں بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ
یہ بلا یا آفت کے معنی میں ہے یا امتحان کے یعنی یہ تم پر بڑی مصیبتیں تھیں یا سخت امتحان کیونکہ امتحان نعمت سے بھی ہوتا ہے۔ اور
محنت سے بھی۔ بلا سے مراد نعمت بھی ہو سکتی ہے۔ تو معنی یہ ہوں گے کہ اس نجات دیئے ہیں اور احسانات کرنے میں تمہارا امتحان
بھی تھا کہ اب تم خدا کا شکر کرتے ہو یا کہ نہیں۔ خلاصہ تفسیر بنی اسرائیل کو یہ دوسرا انعام یاد دلایا جارہا ہے۔ کہ اے اسرائیلیو تم فرعون والی
مصیبت کو یاد کرو۔ کہ تم کو ہر روز اُس کی قوم کی طرف سے ایک نئی مصیبت کا سامنا ہوتا تھا۔ اُس نے تم کو طرح طرح کے عذابوں میں جکڑ
رکھا تھا۔ یہاں تک کہ تمہارے لڑکے قتل کراتا۔ اور لڑکیاں باقی چھوڑتا تھا۔ اس میں تم پر سخت مصیبت تھی نسل و قوم کا کم ہونا لڑکیوں کو دوسرے
کے استعمال میں آنے کا اندیشہ پھر زندہ اولاد کا قتل دیکھنا۔ اور اپنی گود میں بچوں کے ذبح ہونے کا نظارہ رب نے تم کو سب مصیبتوں سے
موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے نجات دی۔ یہ کتنا بڑا احسان ہے۔ اور کیسی نعمت ہے۔ تم اُس احسان کو یاد کرو۔ اور اس نبی آخر الزمان پر ایمان لاؤ۔

## بنی اسرائیل۔ فرعون۔ موسیٰ علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد یعقوب علیہ السلام تک اُن کی اولاد کنعان میں ہی آباد رہی پھر یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں کے حسد
کی وجہ سے بظاہر غلام بن کر مصر میں تشریف لائے۔ یہاں ان کو حق تعالےٰ نے بڑا عروج عطا فرمایا جب کنعان میں سخت قحط پڑا تب
یعقوب علیہ السلام اور اُن کی ساری اولاد مصر میں آگئے۔ اُن سب کو خدا نے بہت بڑھایا۔ اور چند صدیوں میں مصر میں اُن کے لاکھوں آدمی
ہو گئے۔ اور اس عرصے میں وہاں اسرائیلیوں کا بہت دبدبہ رہا۔ یوسف علیہ السلام والا فرعون اور اُس کے ساتھی سب مر کھپ گئے اور
ملک مصر میں بدنظمی پیدا ہوئی۔ ولید ابن مصعب جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا فرعون ہے۔ یہ شہر اصفہان کا ایک غریب عطار تھا جب اس پر بہت
قرض ہو گیا۔ تو اصفہان سے بھاگ کر شام میں پہنچا۔ لیکن وہاں اُسے کوئی ذریعہ معاش ہاتھ نہ آیا تب وہ تلاش روزی کے لئے مصر میں
آیا۔ یہاں اُس نے دیکھا۔ کہ گاؤں میں تربوز بہت سستے بکتے ہیں اور شہر میں مہنگے۔ دل میں سوچا کہ یہ نفع بخش تجارت ہے چنانچہ اس نے گاؤں
سے بہت تربوز خریدے۔ مگر جب شہر کی طرف چلا تو راستے میں بہت سے محصول لینے والوں نے کئی جگہ اس سے محصول لیا۔ بازار آتے
آتے صرف اس کے پاس ایک تربوز بچا باقی سب محصول میں چلے گئے جس سے یہ سمجھ گیا۔ کہ اس ملک میں کوئی شاہی انتظام نہیں۔ جو
چاہے حاکم بن کر مال حاصل کرے۔ اُس وقت مصر میں کوئی وبائی بیماری تھی جس سے لوگ بہت مر رہے تھے۔ یہ قبرستان میں بیٹھ گیا۔ اور
کہا۔ کہ میں شاہی افسر ہوں۔ مردوں پر ٹیکس لگا ہے۔ فی مردہ مجھے پانچ درم دو اور دفن کرو۔ اس بہانے سے چند روز میں اس نے بہت مالی
جمع کر لیا۔ اتفاقاً ایک روز کوئی بڑا آدمی دفن کے واسطے لایا گیا۔ اس نے اُس کے وارثوں سے بھی روپے مانگے۔ انہوں نے اسے گرفتار
کر کے بادشاہ تک پہنچایا اور سارا واقعہ بادشاہ کو بتایا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ تجھے کس نے اس جگہ مقرر کیا ہے۔ ولید بولا۔ کہ میں نے
آپ تک پہنچنے کا یہ بہانہ بنایا تھا۔ میں آپ کو خبر دیتا ہوں۔ کہ آپ کے ملک میں بڑی بدنظمی ہے۔ میں نے تین مہینے کے عرصہ میں ظلماً اتنا مال
جمع کر لیا۔ آپ خیال کر سکتے ہیں۔ کہ دوسرے حکام کیا کچھ نہ کرتے ہوں گے۔ یہ کہہ کر وہ سارا مال بادشاہ کے سامنے ڈال دیا۔ اور کہا۔ کہ اگر آپ
انتظام میرے سپرد کریں۔ تو میں آپ کا ملک درست کر دوں۔ بادشاہ کو یہ بات پسند آئی اور اُسے کوئی معمولی عہدہ دیدیا۔ ولید نے وہ طریقہ اختیار
کیا جس سے بادشاہ بھی خوش رہا۔ رعایا بھی۔ رفتہ رفتہ یہ تمام لشکر کا افسر بنا دیا گیا۔ اور ملک کا انتظام اچھا ہو گیا۔ جب بادشاہ مصر مرا تو رعایا
نے ولید کو تخت پر بٹھا دیا۔ (تفسیر روح البیان) اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اعلان عام کیا۔ کہ لوگ مجھے سجدہ کیا کریں۔ سب سے پہلے اس
کے وزیر ہامان نے اس کو سجدہ کیا۔ اور پھر دوسرے امیروں اور سرداروں نے مصر کے لوگوں سے خود اپنے کو سجدہ کراتا تھا۔ اور دوڑ والوں

کے لئے اس نے اپنے نام کے بُت بنا کر بھیج دیئے تھے۔ کہ وہ اِن بتوں کو سجدہ کیا کریں۔ تمام اہل مصر فرعون کی پرستش میں گرفتار ہو گئے مگر بنی اسرائیل نے اس سے انکار کیا۔ فرعون نے ان کے سرداروں کو بُلا کر بہت ڈرایا دھمکایا۔ مگر انہوں نے کہا۔ کہ ہم تیری عبادت نہیں کر سکتے صرف رب کی عبادت کریں گے۔ تو جو چاہے سو کر فرعون غصے میں آگیا اور دیگوں میں زیتون کا تیل اور گندھک کھولا کر بنی اسرائیل کو ڈالنا شروع کیا بنی اسرائیل نے یہ سب کچھ برداشت کیا۔ مگر رب کی اطاعت سے منہ نہ موڑا اور فرعون کو سجدہ نہ کیا۔ جب بہت سے بنی اسرائیل جلا دیئے گئے۔ تب ہامان نے فرعون سے کہا۔ کہ اِن کو مہلت دے۔ اور اِن کو دنیا میں ذلیل کر کے رکھ۔ تب اُس نے جلانے سے ہاتھ کھینچا۔ اور اسرائیلیوں پر بہت سختیاں شروع کر دیں (تفسیر عزیزی) اسی زمانے میں فرعون نے خواب دیکھا۔ کہ بیت المقدس کی طرف سے ایک آگ آئی جس نے تمام قبطیوں (فرعونیوں) کو جلا ڈالا مگر اسرائیلیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا۔ اور پھر دیکھا۔ کہ بنی اسرائیل کے محلّے سے ایک بڑا اژدہا نکلا جس نے اُس کو تخت سے نیچے ڈال دیا۔ اُس نے تعبیر دینے والوں سے اپنی خواب بیان کی انہوں نے کہا۔ اے فرعون بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ جو تیری حکومت کے ٹکڑے اڑا دے گا۔ اُس نے فوراً کوتوال شہر کو بلا کر حکم دیا۔ کہ ایک ہزار سپاہی ہتھیار بند اور ایک ہزار دائیاں بنی اسرائیل کے محلّے میں مقرر کر دو۔ کہ جس گھر میں لڑکا پیدا ہو اُسے فوراً قتل کر دیا جائے۔ چند سال میں بنی اسرائیل کے بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) بچے اور ایک روایت میں ہے۔ کہ ستر ہزار (۷۰۰۰۰) قتل کرا دیئے گئے۔ اور نوّے ہزار (۹۰۰۰۰) حمل گرائے گئے۔ خدا کی شان بنی اسرائیل کے بوڑھے بھی جلد جلد مرنے لگے۔ تب قبطیوں نے فرعون سے شکایت کی۔ کہ بنی اسرائیل میں موت کا بازار گرم ہے۔ اور ادھر اُن کے بچے قتل کئے جا رہے ہیں۔ اگر یہ حال رہا۔ تو یہ قوم جلد فنا ہو جائیگی پھر ہمیں خدمت گار کہاں سے ملیں گے۔ تب فرعون نے حکم دیا۔ کہ اچھا ایک سال بچے قتل کئے جایا کریں۔ اور ایک سال چھوڑے جائیں۔ رب کی شان کہ چھوڑنے کے سال میں حضرت ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے۔ (موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی) اور قتل کے سال موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی (تفسیر عزیزی و خزائن العرفان)

## موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش

لاوی ابن یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں حضرت عمران اُس وقت اپنی قوم کے سردار تھے۔ اِن کی بیوی کا نام حضرت عائذ تھا موسیٰ علیہ السلام انہیں کے فرزند ہیں جب حضرت عائذ حاملہ ہوئیں۔ تو فرعون کی دائیاں ان کے گھر میں اور سپاہی دروازے پر آنے لگے جب زمانہ ولادت قریب آیا۔ تو ایک دائی اِن کے گھر میں رہنے لگی۔ موسیٰ علیہ السلام رات کے وقت پیدا ہوئے فرعون کی دائی اِن کو دیکھ کر بے اختیار اِن پر عاشق ہو گئی۔ اور ان کی والدہ سے کہا۔ کہ کسی صورت سے اِن کو قتل سے بچاؤ۔ یہ کہہ کر ایک بکری کا ذبح کیا ہوا بچہ ایک ہانڈی میں ڈال کر سپاہیوں سے کہا۔ کہ اس گھر میں لڑکا پیدا ہوا تھا۔ میں نے اُس کو ذبح کر دیا ہے۔ اور دیکھو میں اُس کو دفن کرنے جنگل لئے جا رہی ہوں۔ سپاہیوں نے اُس پر اعتبار کیا۔ اور کوئی زائد تحقیقات نہ کی۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے گھر میں پرورش پاتے رہے۔ مگر نجومیوں نے فرعون کو خبر دی۔ کہ بنی اسرائیل میں وہ بچہ پیدا ہو چکا ہے۔ فرعون اس خبر سے پریشان ہو گیا۔ اور کوتوال کو سخت تنبیہ کی۔ کوتوال نے سپاہیوں پر سختی کی۔ انہوں نے کہا۔ کہ ہم نے بہت کوشش سے اُن کے لڑکے قتل کئے مگر عمران کے لڑکے کو اپنے ہاتھ سے نہ مارا صرف دائی کے کہنے پر اعتماد کر لیا۔ کوتوال نے کہا۔ کہ فوراً اُس گھر کی تلاشی لو اور بلا تامل گھس جاؤ۔ سپاہی بے پردہ حضرت عمران کے گھر میں گھس آئے۔ اُس وقت موسیٰ علیہ السلام اپنی بڑی بہن (مریم) کی گود میں تھے۔ مریم نے یہ ماجرا دیکھ فوراً اُن کو بھڑکتے ہوئے تنور میں اس طرح ڈال دیا۔ کہ سپاہیوں کو خبر نہ ہوئی۔ مریم نے خیال کیا۔ کہ اگر پولیس نے بچہ کو دیکھ لیا۔ تو یہ فرزند اور ہم سب قتل کر دیئے جائیں گے۔ پولیس نے گھر کی تلاشی لی کچھ نہ پا کر واپس لوٹ گئی۔ والدہ نے مریم سے پوچھا۔ کہ موسےٰ علیہ السلام، کہاں ہیں۔ اُس نے سب ماجرا کہا۔ ماں غم سے تڑپ گئی۔ تنور پر

جاکر دیکھا کہ اُس سے شعلے نکل رہے ہیں مگر موسیٰ علیہ السلام امن امان سے ہیں۔ آج اُن کی عمر چالیس دن کی تھی۔ والدہ کے دل میں خیال آیا کہ اس فرزند کی زندگی مشکل ہے۔ اس کو کسی کشتی میں رکھ کر دریائے نیل میں بہا دینا بہتر ہے۔ شاید کوئی دوسرا شخص ان کو اُٹھالے اور وہاں یہ پرورش پالیں۔

## موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے گھر پہونچنا

گھر کے سب لوگوں نے مشورہ کر کے محلہ کے ایک بڑھئی سے جس کا نام سالوم تھا۔ ایک صندوقچہ لکڑی کا بنوایا۔ مگر اُس سے عہد لیا کہ کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ سالوم نے صندوقچہ بنایا ادھر فرعون کی طرف سے اعلان ہوا کہ جو شخص ہم کو اُس لڑکے کا پتہ دے جو کہ بنی اسرائیل کے گھر پیدا ہوا ہے۔ تو اُس کو بہت انعام دیا جاویگا۔ سالوم کو طمع ہوئی خبر دینے کے لئے گھر سے نکلا۔ دروازے پر پہونچا کہ زمین میں ٹخنوں تک دھنس گیا۔ اور غیبی آواز کان میں آئی۔ کہ اگر یہ راز تو نے ظاہر کیا تو تجھ کو زمین میں دھنسا دیا جاویگا۔ سالوم گھبرا گیا۔ اور صندوقچہ عمران کے گھر پہونچایا اور عرض کیا۔ کہ مجھے اُس پاکیزہ فرزند کی صورت دکھا دو۔ والدہ نے اُس کو موسیٰ علیہ السلام کی زیارت کرائی۔ سالوم نے اُن کے قدم پاک سے اپنی آنکھیں ملیں۔ اور اُن پر ایمان لایا چنانچہ سب سے پہلا مومن یہ ہی ہے۔ اور اس صندوقچہ کی اُجرت بھی نہ لی۔ والدہ ماجدہ نے موسیٰ علیہ السلام کو غسل دیا عمدہ کپڑے پہنائے خوشبو لگائی اور صندوقچہ میں رکھ کر دریائے نیل پر روتی ہوئی لے گئیں۔ اور خدا کے حوالہ کر کے دریا میں بہا دیا۔ دل بہت بے چین ہوا مگر قدرتی طور پر تسکین ہوئی کہ یہ بچہ پھر مجھ ہی کو ملے گا۔ دریا سے ایک نہر نکال کر فرعون کے باغ میں پہونچائی گئی تھی جس نہر کا نام عین الشمس تھا۔ یہ صندوقچہ اُس نہر میں داخل ہو کر فرعون کے باغ میں پہونچا۔ . . . . . . . . اُس وقت فرعون باغ کی سیر کر رہا تھا۔ اور اُس کی بی بی حضرت آسیہ اور دیگر خاص لوگ ساتھ تھے۔ یہ لوگ اس صندوقچہ کو اُٹھا کر فرعون کے پاس لے گئے۔ فرعون نے اُس کو جو کھولا تو اُس میں نہایت حسین و جمیل لڑکا پایا۔ بولا کہ یہ وہ ہی بچہ ہے جس کی نجومیوں نے خبر دی تھی۔ یہ میرا اقبال ہے کہ وہ خود میرے پاس آگیا۔ اس کو بھی فوراً قتل کر دیا جاوے۔ حضرت آسیہ (فرعون کی بی بی) آپ کا حسن و جمال دیکھ کر آپ پر عاشق ہو گئیں۔ اور فرعون سے بولیں۔ کہ تو نے محض گمان سے ہزارہا بچے قتل کرا دے اس کو قتل نہ کرا یا بچہ شاید کسی اور جگہ سے آرہا ہے۔ بنی اسرائیل کا نہیں ہے۔ میرے کوئی بیٹا نہیں ہے۔ میں اس کو بیٹا بناؤں گی۔ خدا نے میری گود بھر دی۔ فرعون نے یہ بات مان لی۔ ادھر مریم (موسیٰ علیہ السلام کی بہن) نے ماں کو خبر کی۔ کہ بھائی تو فرعون کے پاس پہنچ گیا۔ ماں بے قرار ہو گئیں۔ مگر رب کی طرف سے القا ہوا۔ کہ گھبراؤ نہیں۔ تمہارا بچہ تم کو ہی ملے گا۔ اب حضرت آسیہ نے شہر کی دائیاں (دودھ پلانے والیاں) بلوائیں جو کہ ان کو دودھ پلائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کسی کا دودھ نہ پیا۔ مریم بھی وہاں موجود تھیں کہنے لگیں۔ کہ ایک بہت قابل دائی ہے جس کا دودھ بہت اچھا ہے اس شہر میں رہتی ہے فرماؤ تو اُس کو بھی بلا لاؤں۔ فرعون بولا فوراً لاؤ۔ وہ اپنی والدہ کو لے گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کا دودھ پیا۔ اور ان کی گود میں سو گئے۔ فرعون نے مُٹکی ایک اشرفی روزانہ اُجرت مقرر کر دی۔ اور کہا کہ تم اس بچہ کی پرورش کرو۔ قدرت کے قربان فرعون نے جس کے ڈر سے بارہ ہزار ۱۲۰۰۰ بچے ذبح کرائے اُس کو خود پرورش کر رہا ہے۔ آسیہ نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے سونے کا گھوارہ طیار کرایا۔ اور بہت ناز و نعمت سے ان کی پرورش کی دو برس تک موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ان کی پرورش کی۔ اس مدت کے گزرنے پر آسیہ نے ایک خچر بھرا ہوا سونا۔ اور کئی اُونٹ لدے ہوئے دیگر نفیس تحفے دیکر عابذہ (موسیٰ علیہ السلام کی والدہ) کو رخصت کیا۔ مسئلہ ماں اپنے بچہ کی پرورش پر اُجرت نہیں لے سکتی کیونکہ یہ اُس پر واجب ہے۔ اور واجب کی اُجرت لینا منع۔ مگر موذی کافر کا مال جس طرح ہاتھ لگے۔ لینا جائز ہے۔ اس لئے عابذہ نے فرعون سے یہ مال لیا۔ نیز اگر وہ فرما دیتیں۔ کہ میں اس کی ماں ہوں۔ تو قتل کر دی جاتیں اس عذر کی وجہ سے بھی اُجرت جائز ہوئی۔

# موسیٰ علیہ السلام کی پرورش

پھر حضرت آسیہ نے خود اِن کی پرورش شروع کی اور فرعون بھی ان سے محبت کرنے لگا جب آپ تین برس کے ہوئے۔ تو ایک دن فرعون آپ کو گود میں کھلا رہا تھا۔ کہ اچانک آپ نے اُس کی داڑھی پکڑ کے ایک طمانچہ مارا فرعون غصہ میں بھر کر آسیہ سے بولا۔ کہ یہ وہ ہی بچہ معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو اس نے میری ایسی بے حرمتی کی۔ آسیہ فرمانے لگیں۔ کہ بچے ناسمجھ ہوتے ہیں ان کے فعل کا اعتبار نہ کرنا چاہیئے۔ یہ تو آگ میں بھی ہاتھ ڈالدیتے ہیں۔ فرعون نے کہا کہ اچھا امتحان کرو۔ ایک طشت میں سونا رکھ دو۔ دوسرے میں آگ۔ اگر یہ آگ میں ہاتھ ڈالدے۔ تو واقعی تم ٹھیک کہتی ہو۔ ایسا ہی کیا گیا۔ قریب تھا۔ کہ آپ سونے کی طرف دوڑتے مگر حضرت جبرائیل نے آپ کا رُخ آگ کی طرف کر دیا۔ آپ آگ میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا سا انگارہ منہ میں رکھ لیا جس سے آپ کی زبان جل گئی۔ اور آپ کو لکنت ہوگئی۔ تب فرعون کو آسیہ کی بات پر پورا یقین ہوا۔ آپ کے زمانہ پرورش میں فرعون نے آپ کے بہت سے معجزے دیکھے ایک بار آپ نے مرغ سے تسبیح پڑھوادی۔ ایک دفعہ پکے ہوئے مرغ کو زندہ فرمایا جس سے کہ فرعون کے دِل میں آپ کا رعب بیٹھ گیا۔ مگر غلبہ محبت اور اپنی بیوی کی وجہ سے قتل نہ کرا سکا۔ جب موسےٰ علیہ السلام تقریباً جوان ہوئے تب آپ کا میلان قلبی بنی اسرائیل کی طرف ہوا۔ آپ اُن سے ہی میل جول زیادہ رکھتے تھے۔ فرعونیوں کو ناگوار گزرتا تھا مگر کچھ دم نہ مار سکتے تھے۔ جب آپ ۲۳ سال کے ہوئے۔ تب ایک دن سرداران بنی اسرائیل کو علیحدہ جمع کر کے اُن سے پوچھا کہ تم فرعون کی مصیبت میں کب سے گرفتار ہو۔ انہوں نے جواب دیا۔ کہ بہت عرصہ سے آپ نے فرمایا۔ کہ یہ تمہارے گناہوں کی شامت ہے۔ تم نذر مانو کہ جب رب تعالیٰ تم کو اس سے نجات دے۔ تو تم وہ پوری کرو۔ اُن سب نے کہا۔ کہ کیا نذر مانیں آپ نے فرمایا۔ کہ رب کی اطاعت و فرماں برداری کی سب نے نذر مان لی۔

# موسیٰ علیہ السلام کی مصر سے روانگی

جب آپ ۳۰ سال کے ہوئے۔ تو ایک دن ایک قبطی اور اسرائیلی میں کچھ جھگڑا ہو رہا تھا قبطی اسرائیلی کو لکڑیوں کا بوجھ اٹھانے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ انکار کرتا تھا۔ اسرائیلی نے آپ کو پکارا۔ کہ اے موسیٰ مجھے اس ظالم سے نجات دلواؤ۔ آپ نے قبطی کو ظلم سے منع کیا۔ وہ باز نہ آیا۔ آپ نے اُس کے ایک مُکا مارا جس سے قبطی مر گیا۔ اسرائیلی اپنے گھر گیا۔ خیال رہے۔ کہ آپ نے قبطی کو ہلاک کرنے کے ارادے سے نہ مارا تھا۔ صرف چھوڑانے کے لئے وہ اتفاقیہ مر گیا۔ اتفاقیہ موت پر قصاص نہیں ہوتا۔ نیز وہ کافر حربی تھا جس کا قتل گناہ بھی نہیں کچھ روز بعد تو سارے ہی قبطی ہلاک کئے گئے۔ الغرض فرعون کو خبر پہونچی۔ اُس نے کہا۔ کہ موسیٰ (علیہ السلام) ایسا نہیں کر سکتے دوسرے دن وہ ہی اسرائیلی دوسرے قبطی سے اُلجھا ہوا تھا۔ آپ کو دیکھ کر آپ سے فریاد کی۔ آپ نے اسرائیلی کو جھڑکا اور چاہا۔ کہ اُس کو قبطی سے چھڑادیں۔ اسرائیلی سمجھا۔ کہ آج یہ مجھے مار رہے ہیں۔ وہ چیخا۔ کہ اے موسیٰ کل تو قبطی کو مارا تھا۔ کیا آج مجھے ہلاک کرنا ہے۔ یہ بات لوگوں نے سنی اور فرعون کے پاس گواہی دی۔ قبطی سرداروں نے فرعون سے مطالبہ کیا۔ کہ موسےٰ علیہ السلام کو ہمارے حوالہ کرو۔ تاکہ ہم قبطی کا اُن سے قصاص لیں۔ فرعون نے ایسا کرنے میں تامل کیا۔ اُس مجلس میں ایک شخص موجود تھا جس کا نام حزقیل تھا۔ اور وہ درپردہ ایمان لا چکا تھا۔ اُس نے موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی۔ کہ آپ کے قتل کا مشورہ ہو رہا ہے۔ بہتر ہے۔ کہ آپ یہاں سے کسی جگہ چلے جاویں۔ موسےٰ علیہ السلام بے سروسامان مدین کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر ٹھہر گئے۔ اور ان کی لڑکی سے جن کا نام صفورا تھا نکاح کیا۔ دس سال وہاں رہے۔ پھر مصر کی طرف تشریف لائے۔ راستہ میں آپ کو نبوت عطا ہوئی اور پھر چالیس سال تک مصر میں فرعون کے مقابلے میں مشغول رہے۔ اور تبلیغ احکام فرماتے رہے۔ یہ واقعہ خیال میں رکھنا چاہیئے۔ آئندہ اس سے فائدہ ہوگا۔ (تفسیر عزیزی)

**تفسیر صوفیانہ** نفس امارہ فرعون ہے۔ اور اُس کے عیوب آل فرعون روح انسانی گویا بنی اسرائیل ہے۔ اور اُس کے عمدہ صفات بنی اسرائیل کے بچے۔ اور بعض قلبی صفات اُس کی لڑکیاں نفس امارہ اور اُس کے عیوب صفات حمیدہ کو ذبح کر کے دور کرتے ہیں۔ اور قلبی صفات کو باقی رکھ کر اُن سے اپنی خدمت لیتے ہیں۔ تاکہ ان سے حیوانی کام لئے جاویں۔ اس فرعون نفس سے نجات بغیر رحمت کردگار ممکن نہیں اس میں انسان کا سخت امتحان ہے جس کو رب ہدایت دیتا ہے۔ اُس کے نفس اور نفسانی عیوب کو بحر قہر میں فنا کر کے روح و قلب کو اُس سے نجات دیتا ہے۔ اور رہبر طریقت کے ذریعہ اُس کو ترقیاں نصیب فرماتا ہے۔ یہ رہبر طریقت اُس کے لئے مثل حضرت موسےٰ علیہ السلام کے ہادی مطلق ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ شعر

نفس ماہم کمتر از فرعون نیست    لیک اورا عون مارا عون نیست

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور جبکہ پھاڑ دیا ہم نے بوجہ تمہارے دریا کو پس نجات دی ہم نے تم کو اور ڈبویا ہم نے ذریت فرعون کو حالانکہ تم لوگ دیکھتے تھے۔

اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا پھاڑ دیا۔ تو تمہیں بچا لیا۔ اور فرعون والوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈبو دیا۔

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ پہلے فرعونی طاقت سے بنی اسرائیل کو نجات دینے کا اجمالاً ذکر ہوا تھا۔ اب اُس کی تفصیل ارشاد ہو رہی ہے یعنی اس طرح نجات دی کہ اس کو ڈبو دیا۔ اور تم کو دریا سے صحیح و سلامت پار کر دیا۔ دوسرے یہ کہ یہ تیسرا انعام ہے۔ جو کہ بنی اسرائیل پر ہوا تھا یعنی اولاً تم کو سب پر فضیلت دی۔ دوسرے موسےٰ علیہ السلام کے ذریعہ تمہیں فرعونی قوم کی غلامی سے چھڑایا۔ تیسرے اُس کو ہلاک کر کے تم کو تخت و تاج کا مالک بنایا۔ **تفسیر وَاِذْ** یہاں بھی اُذکُر فعل چھپا ہوا ہے۔ یعنی اے اسرائیلیو وہ وقت بھی یاد کرو۔ اگر یہ آیت گذشتہ آیت ہی کی تفصیل ہے۔ تو وَاِذْ فرما کر اُس کو اس لئے علیحدہ فرمایا۔ کہ یہ اُن تمام نعمتوں سے اعلیٰ ہے۔ اور ایک ہی واقعہ میں بعض اہم باتوں کو علیحدہ طور پر بھی بیان کر دیتے ہیں۔ اور اگر یہ تیسرا انعام ہے۔ تو وَاِذْ فرمانا بالکل ظاہر ہے۔ **فَرَقْنَا** یہ فرق سے بنا ہے جس کے معنیٰ ہیں علیحدہ علیحدہ کرنا اور چیر دینا۔ چونکہ اُس وقت دریائے قلزم کا پانی پھٹ کر اُس میں راستہ بن گیا تھا۔ اور اُس راستہ کے بھی بارہ حصے ہوئے تھے۔ جن کے درمیان پانی کی دیواریں تھیں۔ اس لئے فَرَقْنَا فرمایا گیا۔ اگر کوئی شخص پانی میں گھس جاوے جب بھی اگرچہ پانی چر جاتا ہے۔ مگر یہ چرنا نہ تو محسوس ہوتا ہے۔ اور نہ عجیب بات ہے۔ اور اس موقعہ پر چرنے کی عجیب ہی نوعیت تھی۔ اس لئے اہتمام سے اس کا ذکر ہوا **بِكُمْ** یہ باسببیہ ہے۔ یعنی تمہاری وجہ سے دریا چیر اگیا۔ اگرچہ اس چرے ہوئے دریا میں گھس کر فرعون بھی غرق ہوا۔ مگر یہ چرنا ہوا اسرائیلیوں ہی کے لئے۔ یا یوں کہو۔ کہ غرق فرعون بھی اسرائیلیوں کے لئے ہی ہوا تھا۔ لہٰذا یہ سب کچھ ان ہی کے لئے ہوا **اَلْبَحْرَ** عربی میں بحر کھاری دریا کو کہتے ہیں۔ دریا کو بحر کہنا مجازاً ہوتا ہے۔ یہاں بحر سے دریائے قلزم مراد ہے۔ قلزم ایک شہر کا نام ہے۔ جہاں یہ دریا ختم ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو بھی قلزم کہا جاتا ہے۔ یہ دریا سمندر کی ایک شاخ ہے۔ حبش اور دیگر بلاد عرب کے درمیان سے گذرتی ہے۔ اور اس کو بحر احمر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا طول ۴۶۰ فرسخ جنوباً شمالاً ہے۔ اور عرض صرف ۶۰ فرسخ ہے۔ یہ مصر سے تین دن کے فاصلہ پر واقعہ ہے۔ اور دریائے نیل مصر کے مغربی جانب ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ دریائے نیل میں فرعون غرق ہوا محض غلط ہے (تفسیر عزیزی) **فَاَنْجَيْنٰكُمْ** اُس دریا سے تم کو تو نجات دے دی۔ کہ تم کو وہاں سے بخیر و خوبی نکال دیا۔ اور تمہارے لئے دریا کا پانی پھاڑ بھی دیا اور زمین بھی خشک کر دی۔ تاکہ تم کو چلنے میں آسانی ہو۔ اور صرف اس پر کفایت نہ کی بلکہ تمہاری خاطر **وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ** تمام فرعونی ذریت کو ڈبو دیا۔ یہاں آل فرعون سے خود فرعون اور اُس کی ساری قوم مراد ہے۔ یعنی قبطی مرد اس میں لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے۔ کہ صرف فرعونی

قوم ہی کو ڈبویا۔ اور اُن کے سارے مال زمین باغات کھیتیاں وغیرہ باقی رکھیں۔ بلکہ اُن کے جسم پر جو زیور وغیرہ تھا۔ وہ بھی دریا نے باہر پھینک دیا۔ اور اگر اُن پر اور قسم کا عذاب آتا تو اُن کے مکانات وغیرہ گر جاتے اور زمین مصر خراب ہو جاتی اور پھر تم کو مصر میں رہنا جائز نہ ہوتا کیونکہ عذاب کی جگہ مسلمانوں کو نہ رہنا چاہیئے۔ **وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ** یعنی یہ سارا واقعہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ دریا کا پھٹنا اور پھر تمہارا اُس سے گزر جانا۔ اور سارے فرعونیوں کا اُس میں ڈوب جانا تم نے (تمہارے باپ داداؤں نے) اپنی آنکھوں سے دیکھا یا یہ مطلب ہے کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے ڈوبنے میں کچھ شبک تھا۔ اُن کے یقین کے لئے دریا نے اس کی لاش باہر پھینک دی جس کو دیکھ کر انہیں یقین آیا۔ ان دونوں صورتوں میں موجودہ بنی اسرائیل سے باپ دادا مراد ہیں۔ اور تَنۡظُرُوۡنَ ماضی ناتمام کے معنی میں یعنی تمہارے باپ دادے اُس کو دیکھتے تھے۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ اے اسرائیلیو اب بھی تم اُس واقعہ کو دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ فرعون اور ہامان کی لاشیں اب تک موجود ہیں۔ آج چودہ سو برس بعد بھی لوگوں نے ان کو دیکھا۔ **خلاصہ تفسیر** یہ تیسرا انعام ہے جو مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل پر ہوا جب موسیٰ علیہ السلام ان کو فرعون کی قید سے چھڑا کر کنعان کی طرف روانہ ہوئے۔ تو فرعون اور اُس کے لشکر نے اِن کا پیچھا کیا۔ اور بحر قلزم کے پاس ان کو آلیا۔ اب پیچھے فرعون تھا۔ اور آگے سمندر جس سے اِن کے حواس باختہ ہو گئے۔ ایسی مصیبت کے وقت میں تم پر رب نے فضل کیا۔ اور تمہارے لئے سمندر خشک کر کے اُس میں بارہ راستے بنا دیئے جب تم سوکھے پار اتر گئے اور تمہارے پیچھے لشکر فرعونی نکلنے لگا۔ تو اُن پر پانی ہموار ہو گیا جس سے کہ وہ سب ڈوب گئے۔ تم یہ سارا تماشا پرلے کنارے پر کھڑے دیکھ رہے تھے۔ خونخوار دشمن سے نجات پانا ایسی خوفناک حالت سے بچ جانا۔ اپنے ایسے سخت دشمن کو مع ساز و سامان کے ڈوبتا ہوا دیکھنا کیسی خوشی اور کیسا انعام ہے۔ تم کو چاہیئے کہ ان انعامات کو خیال میں رکھو۔ اور اس نبی آخر الزمان پر ایمان لاؤ۔

## غرقِ فرعون

جب موسےٰ علیہ السلام مدین سے مصر میں تشریف لائے۔ اور راستے میں نبوت اور رسالت سے مشرف ہوئے تو چالیس برس تک یہاں قیام فرما کر فرعون اور فرعونیوں سے مقابلہ کرتے رہے۔ اور اُن کو بڑے بڑے معجزے دکھاتے رہے۔ تاکہ وہ ایمان لے آئیں۔ مگر وہ نہ لائے۔ تب آپ نے مایوس ہو کر بارگاہِ الٰہی میں عرض کی۔ کہ خدایا کسی صورت سے بنی اسرائیل کو قبطیوں کے ہاتھ سے چھڑا تاکہ بے خوف و خطر یہ تیری عبادت کریں۔ حکم الٰہی آیا۔ کہ آپ بنی اسرائیل کو جمع کر کے راتوں رات یہاں سے کوچ کر جاؤ۔ اگر فرعون تمہارے پیچھے آئے گا۔ تو ہلاک کر دیا جائیگا۔ تب آپ نے خفیۃً سب اسرائیلیوں کو خبر کر دی۔ سارے اسرائیلیوں نے ایک جگہ جمع ہونے کا ارادہ کیا فرعون کو کچھ وہم ہوا۔ پوچھا۔ کہ یہ مجمع کیوں ہو رہا ہے۔ اسرائیلیوں نے کہا ہمارے عاشورے کا دن قریب ہے۔ آدم علیہ السلام اسی دن پیدا ہوئے تھے۔ یہی ہماری عید کا دن ہے۔ ہم چاہتے ہیں۔ کہ سب لوگ شہر سے باہر جمع ہو کر رب کی عبادت کریں اور وہاں عید منائیں۔ فرعون خاموش ہو گیا۔ اور عام بنی اسرائیلیوں نے قبطیوں سے بیش قیمت زیور اور عمدہ پوشاکیں عاریۃً مانگ لیں۔ اور عید کے بہانے سے پیچھے اور ڈیرے شہر سے باہر لگا دیئے یہ واقعہ نویں ۹ محرم اور جمعرات کے دن ہوا۔ اس وقت موسےٰ علیہ السلام کی عمر شریف اسی برس اور اُن کے بھائی ہارون کی تراسی ۸۳ برس پچھلی رات کو یعنی محرم کو دسویں شب جمعہ میں ان سب نے مع ساز و سامان کے کوچ کر دیا۔ اور ہارون علیہ السلام اُن کے آگے تھے۔ اور موسےٰ علیہ السلام پیچھے بنی اسرائیل چھ لاکھ ستر ہزار ۶۷۰۰۰۰ تھے۔ آگے چل کر راستہ بھول گئے۔

**یوسف علیہ السلام کی لاش مبارک ساتھ میں لینا۔**

موسےٰ علیہ السلام نے بڈھے لوگوں سے کہا۔ یہ راستہ تمہارا دیکھا ہوا ہے۔ تم کو ملتا کیوں نہیں۔ انہوں نے عرض کیا۔ کہ یوسف علیہ السلام نے وصیت فرمائی تھی۔

کہ جب میری قوم بنی اسرائیل مصر سے جائے۔ تو میرا تابوت قبر سے نکال کر ساتھ لے جائیں۔ اور میرے بزرگوں کے ساتھ مجھے دفن کریں۔ ہم نے وہ وصیت پوری نہیں کی۔ اس لئے راستہ بھول گئے۔ آپ نے پوچھا کہ اُن کی قبر مبارک کہاں ہے۔ سب نے کہا۔ کہ ہمیں پتہ نہیں آپ نے سارے لشکر میں منادی کرائی۔ کہ جس کو یوسف علیہ السلام کی قبر معلوم ہو۔ وہ مجھے بتائے۔ ایک بوڑھیا عورت نے کہا۔ کہ مجھ کو معلوم ہے۔ لیکن اگر آپ مجھ سے عہد کرلیں۔ کہ میں جو مانگوں سو پاؤں۔ تب میں پتہ دوں گی۔ آپ نے کچھ تامل کیا۔ وحی آئی کہ اے موسیٰ اِن سے عہد کرلو۔ اور وہ جو چاہے سو اُس کو دو۔ آپ نے عہد فرمالیا۔ بڑھیا بولی۔ کہ میں چاہتی ہوں۔ کہ بہشت میں آپ کے ساتھ رہوں۔ آپ نے قبول فرمایا۔ تب اُس بڑھیا نے کہا۔ کہ اُن کی قبر شریف دریائے نیل میں غرق ہوچکی ہے۔ اگر فلاں جگہ سے پانی ہٹا کر زمین کھودی جائے۔ تو اُس سے آپ کا صندوق نکل سکتا ہے۔ آپ نے حکم دیا۔ بنی اسرائیل نے فوراً اُس جگہ سے اُن کا تابوت نکالا۔ یہ تابوت سنگ مرمر کا ایک صندوق تھا جس میں یوسف علیہ السلام کی لاش مبارک تھی۔ آپ نے یہ تابوت سب کے آگے رکھا۔ اور اس تابوت کی برکت سے راستہ ظاہر ہوا۔ رب کے فضل سے رات کے تھوڑے حصے میں بہت راستہ طے کرلیا۔ اگر آپ سیدھا فلسطین کا راستہ اختیار کرتے جو مصر سے شمال مشرق میں تھا۔ تو آپ کو یہ دشواریاں پیش نہ آتیں لیکن مرضی الٰہی یہی تھی لہٰذا آپ مشرقی جانب قلزم کی طرف روانہ ہوگئے۔ اور منزل سقاء طامیں ہوتے ہوئے۔ مقام ایتام میں پہنچے اور وہاں سے کوچ کرکے فی الحیرات پہنچ کہ بعل سفون کے مقابل دریائے قلزم پر واقعہ تھا۔ مقام کیا۔ اور وہاں اپنے ڈیرے ڈالدیئے صبح کے وقت فرعون کو جاسوسوں نے خبر دی۔ کہ کل جہاں بنی اسرائیل جمع ہوئے تھے۔ وہاں سے راتوں رات کوچ کرگئے۔ فرعون کے دل میں غصے کی آگ بھڑک گئی۔ اُس نے فوراً حکم دیا۔ کہ تیز گھوڑے اور عمدہ سوار جمع ہوں۔ روایت میں ہے کہ ستر ہزار ...... گھوڑے سوار فوج اُس کے لشکر کے آگے آگے تھی۔ اور باقی فوج کے متعلق کچھ صحیح پتہ نہیں لگتا۔ تفسیر روح البیان نے فرمایا۔ کہ ستر لاکھ ...... گھوڑے سوار فوج تھی۔ تفسیر عزیزی میں فرمایا۔ کہ ایک لاکھ ...... تیر انداز ایک لاکھ نیزے باز اور ایک لاکھ گرز مارنے والے ان میں تھے۔ فرعون مع اس لشکر یہ راستہ بہت جلد طے کرکے دوپہر کے قریب بنی اسرائیل کو جالیا۔ بنی اسرائیل فرعونی لشکر دیکھ کر گھبرا گئے اور موسیٰ علیہ السلام سے عرض کرنے لگے۔ کہ بتاؤ ہم کہاں جائیں۔

## فرعون کی غرقابی

آپ نے فرمایا مایوس نہ ہو۔ میرے ساتھ میرا رب ہے۔ جو مجھے ہدایت کریگا۔ وحی آئی۔ کہ اے موسیٰ دریا پر اپنا عصا مار کر کہو کہ تو پھٹ جا اور ہم کو راستہ دے آپ نے ایسا ہی کیا۔ حکم الٰہی سے تیز ہوا چلی جس نے پانی کو پھاڑ کر اس میں راستہ بنادیا۔ دریا میں بارہ راستے پیدا ہوگئے جن کے درمیان پانی دیواروں کی طرح کھڑا ہوگیا۔ آناً فاناً آفتاب نے زمین کو خشک کردیا۔ اور آپ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا۔ کہ ان راستوں میں داخل ہوجاؤ۔ یہ لوگ ہمت نہ کرتے تھے۔ کہ کہیں ہم ڈوب نہ جائیں۔ سب سے پہلے یوشع علیہ السلام نے اپنا گھوڑا ڈالا۔ اُن کے پیچھے حضرت ہارون نے جب اسرائیلوں نے ان کو گذرتے دیکھا۔ تو مجبوراً یہ بھی دریا میں چل دیئے۔ انکے بارہ قبیلے تھے۔ ہر قبیلہ ایک راستے میں داخل ہوا۔ ان سب کے پیچھے موسیٰ علیہ السلام داخل ہوئے۔ اِن کے گروہ نے کہا۔ کہ اے موسیٰ ہمیں خبر نہیں۔ کہ ہمارے دوسرے گروہ زندہ ہیں یا ڈوب گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اُن پانی کی دیواروں میں لاٹھی ماری جس سے کہ ان میں جالے کی مثل روشندان بن گئے اور ہر جماعت اُن راستوں میں سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور آپس میں باتیں کرتے گزر گئے۔ اتنے میں فرعونی لشکر بھی دریا کے اس کنارے آپہنچا۔ فرعون نے دیکھا۔ کہ دریا میں راستے بنے ہوئے ہیں۔ جن میں جابجا آبی دیواریں کھڑی ہیں۔ دل میں حیران ہوا مگر لشکر والوں سے کہا۔ کہ میرے اقبال سے دریا خشک ہوگیا۔ تاکہ میں اپنے بھاگے ہوئے غلاموں کو زندہ پکڑ سکوں۔ اگر یہ اسرائیلی ڈوب جاتے

تو مجھے غلام کہاں سے ملتے۔ ہامان نے چپکے سے فرعون سے کہا۔ کہ دریا میں قدم نہ رکھنا۔ ورنہ تجھ کو اپنی خدائی کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا بہت جلد کشتیاں جمع کر اُن کے ذریعے دریا کو پار کر فرعون نے اپنے گھوڑے کو روک لیا۔ اسی حالت میں حضرت جبریل شکل انسانی میں گھوڑی پر سوار فرعون کے گھوڑے کے آگے نمودار ہوئے۔ اور اپنی گھوڑی دریا میں ڈال دی۔ فرعون کا گھوڑا گھوڑی کی بو پا کر اُس کے پیچھے ہو لیا۔ فرعون نے لاکھ روکا مگر نہ رُکا اور اس خشک راستے میں داخل ہو گیا جب لشکریوں نے فرعون کو دریا میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ بھی ہر طرف سے داخل ہونے لگے۔ اس جگہ اتنی بات اور یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا سامری۔ اُس نے دیکھا۔ کہ جس جگہ حضرت جبریل کی گھوڑی کی ٹاپ پڑتی ہے۔ وہاں سبزہ اُگ آتا ہے۔ وہ سمجھا۔ کہ اس ٹاپ کی نیچے والی مٹی میں تاثیر زندگی ہے۔ اُس نے تھوڑی سی مٹی اپنے ساتھ لے لی۔ غرضکہ سارا فرعونی لشکر بیچ دریا میں آگیا۔ اُدھر بنی اسرائیل نکل کر یہ تماشہ دیکھنے لگے خیال رہے کہ جہاں یہ واقعہ ہوا وہاں قلزم کا عرض بہت تھوڑا یعنی صرف چار فرسخ (کوس) تھا۔ اس لئے دوسرے کنارے سے یہاں کے حالات بخوبی نظر آتے تھے۔ جب سارا لشکر دریا میں داخل ہو چکا۔ تو اُس کو حکم الٰہی پہنچا۔ کہ تو آپس میں مل جا دریا آپس میں مل گیا۔ اور یہ سب غرق ہو گئے۔ یہ واقعہ دسویں محرم جمعہ کے دن بوقت دوپہر ہوا موسیٰ علیہ السلام نے اس خوشی میں روزہ رکھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ پاک تک یہود عاشورے کے دن روزہ رکھتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منوّرہ تشریف لائے اور بنی اسرائیل کو روزہ رکھتے ہوئے دیکھا۔ تو فرمایا۔ کہ ہم اس خوشی منانے کے زیادہ حقدار ہیں چنانچہ اسلام میں بھی عاشورے کا روزہ فرض ہو گیا۔ اب اگرچہ اس کی فرضیت منسوخ ہو چکی۔ لیکن اب بھی مستحب ہے۔ بنی اسرائیلیوں کے دل میں فرعون کی ایسی ہیبت بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ انہیں اُس کے ڈوبنے کا یقین نہ آتا تھا۔ تب دریا نے اُس کی اور چند لوگوں کی لاشیں باہر نکال پھینکیں۔ تب ان کو یقین ہوا۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ رب تعالیٰ اپنے بندوں کو تکلیف و آرام سے آزماتا ہے۔ ہر حال میں راضی رہنا احرار کا کام ہے۔ اور کسی وقت اُس کو بھول جانا اغیار کا کام **دوسرے** یہ کہ رب کے یہاں دیر ہے۔ مگر اندھیر نہیں۔ ظالم کو ضرور سزا ملتی ہے مگر مظلوم کو چاہیئے۔ کہ جلدی نہ کرے۔ **تیسرے** یہ کہ عاشورے کا روزہ سنت ہے۔ مگر بہتر یہ ہے۔ کہ دو روزے رکھے۔ نویں [9] اور دسویں تفسیر روح البیان نے اس جگہ فرمایا۔ کہ شیخ عبد القادر قدس سرہٗ نے عبد اللہ ابن عباس سے ایک روایت نقل فرمائی۔ کہ جو شخص عاشورے کے دن چار رکعت نماز نفل پڑھے۔ اور ہر رکعت میں ایک بار سورہ فاتحہ اور پچاس بار قل ھو اللہ پڑھے۔ تو رب تعالیٰ اُس کے پچاس سال کے گناہ معاف فرمائے گا۔ اور اُس کو جنت میں نور کے ہزار منبر عطا فرمائے جائیں گے۔ نیز عاشورے کی رات کو جاگنا بھی بہتر ہے۔ تفسیر روح البیان نے اس جگہ فرمایا۔ کہ اسی رات جاگنے والے کو ملائکہ مقربین کا ثواب ملتا ہے۔ مشائخ عظام فرماتے ہیں۔ کہ اسی دن غسل کرنے سے سال بھر تک بیماری سے محفوظ رہتا ہے شامی نے کتاب صوم میں فرمایا۔ کہ جو شخص عاشورے کے دن اپنے گھر میں خوب عمدہ اور اچھے کھانے پکائے۔ تو انشاء اللہ سال بھر تک اُس گھر میں برکت رہیگی۔ اور اس دن سرمہ لگانے سے سال بھر تک آنکھیں نہیں دکھتیں۔ اس حدیث کی بنا پر ہمارے ملک میں عاشورے کے دن حلیم (کھچڑا) پکایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں ہر قسم کے غلّے اور گوشت ہوتا ہے جس سے امید ہے۔ کہ سال بھر تک ہر غلّے میں برکت رہے۔ بعض روایات میں ہے۔ کہ نوح علیہ السلام کی کشتی عاشورے کے دن زمین پر لگی کشتی والوں نے نیچے اُتر کر ہر قسم کے دانے ملا کر پکائے جس سے کہ حلیم بن گیا۔ اس کا پورہ واقعہ انشاء اللہ بارھویں [12] سیپارہ میں بیان ہوگا۔ اس دن میں ماتم کرنا سر پیٹنا بال نوچنا سخت حرام ہے۔ **چوتھے** یہ کہ انبیاء اکرام پر جو نعمت الٰہی ہو اُس کی یادگار منانا۔ اور شکر بجالانا سنت ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے اسی دن موسیٰ علیہ السلام کی نجات کی خوشی منائی۔ لہٰذا ہم کو بھی عید میلاد اور عید معراج وغیرہ منانا بہت بہتر ہے۔ خیال رہے کہ خوشی کی یادگار منانا مسنون ہے۔ اور غم کی یادگار منع **پانچویں** یہ کہ یادگاروں کے لئے دن مقرر کرنا سنت ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے روزے کیلئے

عاشورے کا دن مقرر فرمایا۔ **چھٹے** یہ کہ اگر کفار بھی انبیاء کرام کی یادگاریں مناتے ہوں۔ تو اُن کی مشابہت کے خوف سے مسلمان نہ چھوڑیں۔ ہاں کسی صورت سے کچھ فرق کردیں۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے یہود کی وجہ سے عاشورے کا روزہ نہ چھوڑا **ساتویں** یہ کہ بزرگانِ دین سے بعد وفات بھی فیض لینا سنت انبیاء ہے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے تابوتِ یوسف علیہ السلام سے راستے کی ہدایت حاصل کی۔ اس کی پوری بحث ہماری کتاب جاء الحق میں دیکھو اور کچھ دوسرے سیپارہ کے آخیر میں بھی آئے گی۔ **پہلا اعتراض** موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اُن کی پرورش پر اُجرت کیوں لی۔ یہ اُجرت ناجائز ہونی چاہیئے۔ **جواب**۔ اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا۔ کہ اُن کو مجبوری بھی تھی۔ اور کافر حربی کا مال جب کسی صورت سے اپنے پاس آجائے جس میں غدر یا عہد شکنی نہ ہو۔ تو جائز ہے۔ **دوسرا اعتراض** بنی اسرائیل نے قبطیوں کا سونا اور پوشاک پر کیوں قبضہ کرلیا۔ **جواب**۔ اُن کو خبر تھی۔ کہ یہ مال آخرکار ہمارے پاس ہی آنے والا ہے۔ اور یا ڈوب جائیگا۔ اس لئے ابھی آجائے تو بہتر ہے۔ نیز دشمن کے مال پر قبضہ کرنا جائز ہے **تیسرا اعتراض** بنی اسرائیل نے فرعون سے جھوٹ کیوں بولا۔ کہ ہمارے ہاں عید ہے۔ جھوٹ بولنا حرام ہے۔ **جواب** یہ جھوٹ نہ تھا۔ بلکہ توریہ تھا۔ انکی مراد تھی کہ ہمارے نجات کی اور تمہارے غرق ہونے کی عید ہے۔ وہ سمجھا کہ دوسری قسم کی عید ہے۔ اور مجبوری کے وقت توریہ جائز ہے **تفسیر صوفیانہ** دنیا گویا بحر قلزم ہے۔ اور دنیوی لذتیں اُس بحر کا پانی اور قلب مومن گویا موسیٰ ہے۔ اور صفات قلبیہ بنی اسرائیل نفس امارہ فرعون اور اُس کے عیوب قبطی قوم جو کہ موسیٰ قلب اور اس کی صفات کے دشمن ہیں۔ قلب ہر وقت رب کی طرف متوجہ ہے۔ اور نفس امارہ اُس کا جانی دشمن اُس کے پیچھے۔ دنیا کی فانی لذتوں اور اُس کی شہوتوں کا دریا سامنے جس کا عبور کرنا از بس ضروری ہے۔ چاہیئے۔ کہ موسیٰ قلب اس دریا میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا عصا مار کر اس کو ایسا خشک کرے۔ کہ تمام عالم کی لذتیں ہر چہار طرف کھڑی رہیں۔ اور یہ اس کے درمیان سے نکل جائے۔ جب موسیٰ قلب اِلَّا اللّٰہُ کے عصا سے اس دریا کو خشک کرے گا۔ تو رب تعالیٰ اس پر عنایت کی ہوا۔ ہدایت کا سورج بھیجکر اس راستے کو قابل عبور بنادے گا جس سے کہ قلب اور اُس کے صفات ساحل تک پہنچ جائیں گے۔ اس کا ساحل کون ہے۔ وَاِنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَهٰی اور فرعون نفس اور اُس کی قوم کو اس میں غرق کیا جائے گا۔ مگر ثابت قدمی ضروری ہے۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

اور جبکہ وعدہ فرمایا ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا پھر بنالیا تم نے بچھڑا پیچھے سے اسکے حالانکہ تم لوگ ظالم تھے

اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ فرمایا پھر اُس کے پیچھے تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کردی۔ اور تم ظالم تھے

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ

پھر معاف فرمایا ہم نے تم سے پیچھے سے اس کے تاکہ تم شکر کرو۔ اور جبکہ دیدی ہم نے موسیٰ کو کتاب

پھر اُس کے بعد ہم نے تمہیں معافی دی۔ کہیں تم احسان مانو۔ اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی

وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور فرق کرنیوالی چیز تاکہ تم لوگ ہدایت پاجاؤ

اور حق و باطل میں تمیز کردینا۔ کہ کہیں تم راہ پر آؤ۔

**تعلق**۔ ان آیتوں کا گزری ہوئی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کی چار نعمتوں کا ذکر ہوچکا۔

اب پانچویں نعمت کا ذکر ہو رہا ہے. دوسرے یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کو جسمانی نجات دینے کا ذکر تھا. اب روحانی نجات کا ذکر ہو رہا ہے. کہ ہم نے اُن کو ایسی کتاب عطا فرمائی جس پر وہ عمل کرکے اُخروی مصیبتوں سے بچ جائیں تیسرے یہ کہ اس سے پہلے فرعون اور فرعونیوں کے شرک کا ذکر ہوا. اب فرمایا جا رہا ہے. کہ اے اسرائیلیو تم نے اُن سے بھی بڑھ کر جرم کیا. کہ انہوں نے تو فرعون بادشاہ کو خدا مانا تھا. اور تم نے بے عقل بچھڑے کو. انہوں نے پہلے ہی سے. اور تم نے ایمان کے بعد انہوں نے نادانی سے تم نے جان بوجھ کر انہوں نے بے نور ہونے کی وجہ سے تم نے نورِ نبوت پانے اور موسیٰ علیہ السلام کے صحبت حاصل کرنے کے بعد چاہیئے تھا. کہ تم بھی اُن کی طرح سب ہلاک کر دیئے جاتے. لیکن ہمارا فضل ہُوا. کہ تمہیں توبہ کی توفیق عطا فرمائی **التفسیر وَاِذْ** یہاں یا تو اُذکرُ فعل پوشیدہ ہے. یا اُذکر یا تو بنی اسرائیل سے خطاب ہے. یا نبی کریم علیہ السلام سے یعنی اے اسرائیلیو اُس قصے کو بھی یاد کرو یا اے نبی صلے اللہ علیہ وسلم انہیں وہ قصہ بھی یاد دلا دو. **وٰعَدْنَا** اس کے معنی ہیں. آپس میں ایک دوسرے سے وعدہ کیا یعنی ہم نے موسےٰ علیہ السلام سے توریت دینے کا وعدہ فرمایا. اور اُنہوں نے طور سینا پر حاضر ہونے کا. یا یہ وَعَدْنَا (ضَرَبَ سے) کے معنی میں ہے. **مُوْسٰی** یہ موسیٰ علیہ السلام کا ذاتی اسم شریف ہے. بعض علماء نے کہا. کہ یہ لفظ عربی ہے. بروزن فعلیٰ ہے. اور مَاسَا یَمِیْسُ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اکڑ کر چلنا چونکہ آپ کی رفتار بہت قوت سے ہوتی تھی. اس لئے آپ کا نام موسیٰ رکھا گیا. اور بعض نے کہا. کہ یہ بروزن مُفْعَلٌ ہے. یعنی بابِ افعال کا اسم مفعول وسیٰ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں. درخت سے پتے جھاڑ لینا. مگر صحیح یہ ہے. کہ یہ لفظ عبرانی ہے. اور مُو اور شیٰ سے بنا ہے. عبرانی زبان میں مُو پانی کو اور شیٰ درخت کو کہتے ہیں. چونکہ آپ کو بیوی آسیہ کی لونڈیوں نے اُس نہر سے پایا تھا. جو اُن کے باغ میں بہتی تھی. اور ایک صندوقچے میں پایا تھا. اس لئے حضرت آسیہ نے ان کا نام موشیٰ رکھا یعنی درخت و پانی سے پایا ہُوا فرزند پھر عربی میں آکر شین سین بن گیا. اور موسیٰ رہ گیا. آپ کا نسب شریف یہ ہے. موسیٰ ابن عمران ابن یصہر ابن ناہث ابن لاوی ابن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم علیہ السلام **اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً** یہاں پوری مدت بیان فرمائی گئی ہے. اوّلاً تیس۳۰ رات طور سینا میں قیام کرنے حکم تھا. لیکن جب آپ یہ میعاد پوری کر چکے. اور تیس۳۰ دن روزے رکھ چکے بارگاہ الٰہی میں توریت لینے کیلئے حاضر ہونے لگے. تو اس خیال سے کہ میں نے بہت روزے سے مسواک نہیں کی ہے. شاید منہ میں بُو ہو مسواک کر لی حکم الٰہی آیا. کہ اے موسیٰ تم نے وہ منہ کی خوشبو دور کر دی جو ہم کو مشک سے زیادہ پیاری تھی. لہٰذا دس روزے اور رکھو تاکہ تمہارے منہ میں پھر وہی خوشبو پیدا ہو یہ دونوں مدتیں مل کر چالیس بنیں. اسی لئے قرآن کریم نے یہاں چالیس فرمایا. اور دوسری جگہ تیس۳۰ راتیں اور اُس کے بعد میں دس۱۰ کا ذکر ہُوا. یعنی اجمال ہے. وہ تفصیل **لَیْلَۃً** یہاں چالیس دن نہ فرمایا. بلکہ چالیس راتیں. کیونکہ عربی تاریخیں چاند سے ہیں جس میں رات پہلے ہوتی ہے. اور دن بعد میں نیز اس لئے کہ رات میں تاریکی اور دن میں روشنی ہے اور تاریکی روشنی پر مقدم. یا اس لئے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے اعتکاف کرانا. اور اپنا وصال عطا فرمانا مقصود تھا. اور رات وصال کا وقت ہے. اور دن فراق کا اسی لئے اہل اللہ رات کا آخری حصہ جاگ کر گزارتے ہیں. اور تہجد وغیرہ پڑھتے ہیں. اور روزانہ رات ہی میں رحمت الٰہی خلق کی طرف متوجہ ہوتی ہے. نہ کہ دن میں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے. یا اس لئے کہ چالیس راتیں مقرر ہوئیں تھیں. نہ کہ ۴۰ دن کیونکہ پہلی ذیقعدہ سے موسیٰ علیہ السلام کا اعتکاف شروع ہوا. اور دسویں ذوالحجہ دوپہر کے وقت انہیں توریت ملگئی لہٰذا راتیں ۴۰ ہوئیں اور دن ۳۹ کیونکہ دسویں ذوالحجہ کو اعتکاف نہ فرمایا **ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ** یہاں ثمہ مہلت کے لئے نہیں ہے. بلکہ اظہار تعجب کے لئے کیونکہ بنی اسرائیل نے چالیس دن کے اندر ہی سونے کا بچھڑا بنا لیا تھا. نہ کہ اُس مدت کے بعد یعنی ہم نے تم پر اتنی نعمتیں کیں. مگر تعجب ہے. کہ تم نے پھر بھی گائے کا بچہ بنایا. اِتَّخَذْتُمْ سے یا تو مراد ہے. گائے کو معبود ماننا اس صورت میں اس کا دوسرا مفعول پوشیدہ ہے یعنی تم سب نے بچھڑے کو معبود بنا لیا. یا مراد ہے. ڈھالنا اور تیار کرنا یعنی تم سب نے بچھڑا تیار کر لیا. اگرچہ صرف سامری نے ہی بچھڑا بنایا تھا. لیکن چونکہ ان سب اسرائیلیوں نے اُس کی مدد کی تھی. کہ اُس کو سونا اور جواہرات

دیئے تھے۔ اور آگ وغیرہ دھونک کر اُس کا ہاتھ بٹایا تھا۔ اس لئے فرمایا گیا۔ کہ تم سب نے بنایا۔ یہ پورا قصہ انشاء اللہ خلاصۂ تفسیر میں آئیگا
اَلْعِجْلَ عربی میں عجل گائے کے نر بچے کو کہتے ہیں یعنی بچھڑا اس میں بھی ان کی حماقت کا اظہار ہے کیونکہ بیل بے وقوفی میں مشہور ہے۔
بے وقوف کو کہتے ہیں۔ تُو تو نِرا بیل ہے۔ تو فرمایا گیا۔ کہ تم نے بیل جیسی بیوقوف چیز کو خدا مان لیا۔ تم تو فرعونیوں سے بدتر ہو گئے۔ اور کب مانا۔
مِنْۢ بَعْدِهٖ یعنی موسےٰ علیہ السلام کے بعد یا اس وعدے کے بعد یا اُن کے کوہ طور جانے کے بعد وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ یعنی تم نے
یہ کام بے خبری سے نہ کیا بلکہ جان بوجھ کر اور موسیٰ علیہ السلام کی صحبت کا فیض پاکر لہٰذا تم بڑے ظالم ہوئے۔ خیال رہے کہ ظلم کے معنی
ہیں کسی چیز کو بے موقع استعمال کرنا۔ یا کسی کی چیز بغیر اس کی اجازت استعمال کر لینا۔ بُت پرست غیر خالق کے لئے اپنی ہات استعمال کرتا ہے
نیز رب تعالیٰ کے دیئے ہوئے اعضاء کو اُس کی بے اجازت دوسرے کی عبادت میں استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا ظالم ہے۔ بلکہ کفر اور شرک
بہت بڑا ظلم ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوا۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ مشرک شرک کرکے اپنی روح کو ستاتا ہے
کہ اُسے جہنم میں لے جاتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے پر ظالم ہے۔ ثُمَّ یا تاخیر زمانی کے لئے ہے۔ یا اظہار تعجب کے لئے یعنی کچھ دنوں بعد ہم
نے تمہارا گناہ معاف کر دیا۔ یا ہمارا کرم تو دیکھو کہ تمہاری اس قدر سرکشی کے بعد ہم نے معافی دے دی عَفَوْنَا عَنْكُمْ۔ عفو کے معنی ہیں۔
مٹانا چونکہ بخش دینے سے گناہ مٹ جاتا ہے۔ اس لئے اُسے عفو کہتے ہیں۔ گویا تمہارا دامن عفت اس گناہ کے داغ سے داغدار
ہو گیا تھا۔ ہم نے رحمت کے پانی سے وہ داغ دور کر دیا۔ خیال رہے کہ عفو سے یہ مراد ہے۔ کہ تم کو فرعونیوں کی طرح بالکل ہلاک نہ کر دیا۔ اور
تمہاری توبہ قبول کرکے آخرت کے عذاب سے بچا لیا۔ یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ تمہاری پکڑ ہی نہ کی۔ کیونکہ ستر ہزار مجرموں کو قتل کرا کر توبہ قبول
ہوئی تھی۔ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ یعنی اس بچھڑے بنانے اور اُس کی پرستش کرنے وغیرہ کے بعد بھی تمہاری معافی ہو گئی۔ کیوں لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ کہ تم اس واقعہ کو یاد رکھ کر آئندہ گناہ سے بچو اور اُس کے احسان کا شکر کرو۔ اس میں ادھر بھی اشارہ ہے۔ کہ تم میں اور
فرعونیوں میں یہ فرق تھا۔ کہ اُن سے شکر کی اہلیت جاتی رہی تھی۔ اور اُن کے ایمان کی امید نہ رہی تھی۔ لہٰذا وہ ہلاک کر دیئے گئے تم نے اگرچہ
اُن سے بڑھ کر جرم کیا لیکن تم میں اہلیت موجود تھی۔ اگر اب تم بھی اپنی اہلیت فنا کر دو گے۔ تم کو بھی عذاب دیا جائیگا۔ پھر یہی نہ کیا۔

بلکہ یہ بھی یاد کرو۔ کہ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ۔ جب کہ ہم نے تمہارے پیغمبر موسےٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی کتاب سے
مراد توریت شریف ہے۔ چونکہ یہ زبرجد کی تختیوں پر لکھی ہوئی ملی تھی۔ اس لئے اس کو کتاب فرمایا گیا۔ وَالْفُرْقَانَ اس کے معنے ہیں فرق کرنے
والی چیز یا تو اس سے توریت ہی مراد ہے۔ اور یہ عطف تفسیری ہے یعنی وہ کتاب دی جو کہ حق و باطل میں فرق کرنیوالی ہے۔ یا اس سے دین
کے شعائر مراد ہیں۔ جیسے کہ اُن کے لئے شنبہ (سنیچر) کی تعظیم کرنا۔ اور اُس دن کاروبار نہ کرنا اور اونٹ کا دودھ اور گھی نہ استعمال کرنا اور
ختنہ اور قربانی وغیرہ (تفسیر عزیزی)، لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ یہ توریت عطا فرمانے کی حکمت ہے۔ نہ کہ علت کیونکہ رب کے کام علت سے
پاک ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ موسیٰ اور ہارون علیہ السلام کو اس کتاب کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ بلکہ اصل ضرورت تم کو تھی۔ تاکہ تم
اس کے ذریعے ہدایت پا جاؤ۔ یا ہدایت پر قائم رہو۔ یا ایمان تو لا چکے تھے۔ اب اس سے اعمال سیکھ لو۔ لہٰذا اگر تم اس نبی آخر الزمان پر ایمان
نہ لائے۔ تو سمجھ لو۔ کہ تم نے توریت کا مقصد پورا نہ کیا۔ خلاصۂ تفسیر پچھلی آیتوں کی تفسیر میں آپ معلوم کر چکے۔ کہ بنی اسرائیل نے نذر مانی
تھی۔ کہ اگر ہم کو رب تعالیٰ فرعون سے نجات دیگا تو ہم اُس کی اطاعت کریں گے۔ جب انہیں نجات مل گئی۔ اور بنی اسرائیل فرعونیوں کے
ہلاکت کے بعد مصر کی طرف لوٹے (تفسیر خزائن العرفان)، تب موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو وہ نذر یاد دلائی تب انہوں نے عرض کیا۔ کہ ہم
کو دل و جان سے یہ بات منظور ہے لیکن ہمیں رب کے احکام کی خبر نہیں ہم اطاعت کیسے کریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں عرض
کیا۔ تب اُن سے فرمایا گیا۔ کہ تم کوہِ طور پر آنا۔ اور وہاں چالیس دن اعتکاف اور عبادت کرنا۔ تاکہ جسمانی تعلقات کم ہو کر ملکیت کا ظہور ہو تب

تم سے بلا واسطہ کلام بھی کیا جائے گا۔ اور تمہیں توریت بھی دی جائے گی موسیٰ علیہ السلام توریت لینے کوہ طور تشریف لے گئے۔ اور اے اسرائیلیو تم نے اُن کے پیچھے یہ غضب ڈھایا۔ کہ سونے کا بچھڑا بنا کر اُسکی پرستش شروع کر دی ہم نے اس پر بھی درگزر کر کے تمہیں ایک دم ہلاک نہ کیا۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک تم کو باقی رکھا۔ اور اُن کے تشریف لانے پر تمہیں توبہ کا طریقہ بتایا۔ اور تم کو اس پر عمل کرنے کی توفیق دی۔ اور جب تم نے توبہ کر لی۔ تو معاف بھی کر دیا۔ تاکہ ٹھوکر کھا کر آئندہ کے لئے ہوشیار ہو جاؤ۔ اور ہمیشہ اُس کے شکر گزار ہو۔ اور یہ بھی یاد رکھو۔ کہ تمہاری نذر پوری کرنے کیلئے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب بھی عطا فرما دی۔ اور قانون شریعت بھی دے دیا۔ تاکہ تم ہدایت پر رہو۔

## موسیٰ علیہ السلام کو توریت ملنا اور بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی

اس واقعہ کے معلوم کرنے سے پیشتر چند باتیں دھیان میں رہنی چاہئیں۔ ایک[۱] یہ کہ بنی اسرائیل مصر سے چلتے وقت قبطیوں سے قیمتی اور جڑاؤ زیور مانگ لائے تھے۔ اور ان کو اس کا استعمال جائز نہ تھا۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے ہاں غنیمت کا مال مسلمان استعمال نہ کر سکتے تھے بلکہ آگ اُس کو جلا جاتی تھی۔ دوسرے[۲] یہ کہ بنی اسرائیل میں ایک سنہار تھا۔ جس کا نام میخی یا موسیٰ ابن ظفر تھا۔ قبیلۂ بنی سامرہ کا شخص تھا۔ اس لئے اُس کو سامری کہتے تھے۔ یہ فن زرگری میں بڑا ماہر تھا۔ اور منافقت سے ایمان لایا تھا۔ اور اس کے پاس حضرت جبرئیل کی گھوڑی کے نیچے کی مٹی موجود تھی۔ جو کہ فرعونیوں کے غرق کے وقت بحر قلزم سے اُٹھا لایا تھا۔ تیسرے[۳] یہ کہ جب بنی اسرائیل بحر قلزم سے نجات پا کر نکلے تھے۔ تو راستے میں آتے ہوئے۔ انہوں نے ایک قوم کو گائے پوجتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا تھا۔ کہ ہمارے لئے بھی کوئی پروردگار کی صورت بنا دو۔ تاکہ اُس کو سامنے رکھ کر ہم عبادت کیا کریں جس سے ہمارا دھیان نہ بٹے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو ڈانٹ دیا تھا۔ مگر سامری نے پتہ لگا لیا تھا۔ کہ بنی اسرائیل میں فرعونیوں کی محبت سے مخلوق پرستی کا مادہ موجود ہے۔ اگر انکو بہکایا جائے۔ تو آسانی سے گمراہ ہو جائیں گے۔ اب اصل واقعہ سنو۔

موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے تیس دن کا وعدہ فرما کر جانب کوہ طور روانہ ہوئے۔ اور وہاں پہنچ کر یکم ذیقعدہ سے روزہ اور اعتکاف اور عبادت شروع کر دی تیس ذیقعدہ کو مسواک کر کے توریت لینے کے لئے خاص پہاڑ پر حاضر ہوئے جس کی وجہ سے اُن کو دس دن اور ٹھہرنا پڑ گیا ادھر تیس دن گزرتے ہی اسرائیلیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ اولاً تو انہوں نے حضرت ہارون سے پوچھا۔ کہ ہم اس زیور کو کیا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کو ایک گڑھے میں ڈال کر جلا کر راکھ کر دو۔ اور اُس کی راکھ زمین میں دفن کر دو خیال رہے کہ ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے نائب ہو کر یہاں ہی موجود تھے) اُدھر سامری نے ان لوگوں سے کہا۔ کہ موسیٰ علیہ السلام تمہاری ہی طرح بشر ہیں۔ صرف طلسماتی عصا کی وجہ سے یہ معجزے دکھاتے ہیں۔ اور تم سے بڑھ گئے ہیں۔ تم وہ سارا سونا میرے حوالے کر دو۔ میں تمہارے لئے اُس سے بھی عجیب تر طلسم بنا دوں جس سے تم کو موسیٰ علیہ السلام کی ضرورت نہ رہے۔ اور یہ بھی کہا۔ کہ موسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے۔ کیونکہ اُن کے آنے کی میعاد گذر گئی۔ ان لوگوں نے وہ سارا سونا اُس کے حوالے کر دیا۔ سامری نے اس سے جواہر و یاقوت علیحدہ نکال لئے اور سونا گلا کر نہائت خوبصورت بچھڑا بنایا۔ اور جواہر و یاقوت کو اُس کی کان آنکھ زانو اور قدم پر نہائت قرینے سے جڑ دیا جس سے وہ بہت خوبصورت معلوم ہونے لگا۔ اور وہ جبریلی خاک اُس کے منہ میں ڈالی جس سے کہ اس میں آواز اور جنبش پیدا ہو گئی۔ بعض لوگوں نے کہا ہے۔ کہ اُس کی ناک میں کچھ سوراخ رکھے تھے۔ جس میں ہوا گذر کر آواز پیدا کرتی تھی۔ جیسے آج کل کی بانسری اور سیٹی وغیرہ۔ لیکن صحیح یہ ہے۔ کہ یہ آواز اُس خاک کی تاثیر سے پیدا ہوئی تھی۔ کیونکہ روایت میں آتا ہے۔ کہ وہ بچھڑا حرکت بھی کرتا تھا۔ اور اسرائیلیوں سے کہا۔ کہ دیکھو خدا نے اس میں حلول کیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اس کو وہاں ڈھونڈ رہے ہیں۔ اور یہ ہمارے پاس آ گیا۔ اسرائیلی اُس کے بہکانے میں آ گئے۔ اُس نے ایک بڑے خیمے میں یہ بچھڑا کھڑا کیا۔ اور اُس کے آس پاس پُر تکلف فرش بچھائے۔ اور خیمے کے سامنے نوبت اور چنگ بجائی اور گیت گانے شروع کئے اسرائیلی مرد و عورتیں وہاں جمع

ہو گئے۔ کوئی اُس کی عبادت کرنے لگا۔ اور کوئی اُس کے سامنے گوشہ نشیں ہو گیا۔ سوا ہارون علیہ السلام اور ان کے بارہ ہزار (۱۲۰۰۰) ساتھیوں کے باقی سارے اسرائیلی اس میں مبتلا ہو گئے۔ بنی اسرائیل کے تین گروہ بن گئے۔ ایک وہ جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی۔ دوسرے وہ جو حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ تبلیغ دین میں مشغول ہوئے۔ اور اس عبادت سے لوگوں کو روکتے رہے۔ تیسرے وہ جو خاموش رہے انہوں نے نہ عبادت کی۔ نہ اس سے انکار پہلا اور تیسرا گروہ عتاب الٰہی میں آگیا۔ اور دوسرا گروہ سلامت رہا (تفسیر عزیزی) ادھر حضرت موسےٰ علیہ السلام کو دسویں ذوالحجہ دوپہر کے وقت توریت شریف عطا ہوئی۔ اور رب تعالےٰ نے ان کو خبر دی۔ کہ تمہارے پیچھے تمہاری قوم شرک میں مبتلا ہو گئی۔ موسےٰ علیہ السلام یہ سن کر سخت غمگین ہوئے۔ اور وہاں سے بہت جلد واپس آئے۔ اور اپنی قوم کا یہ حال دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ اور غصّے میں توریت شریف کی تختیاں آپ کے ہاتھ سے گر گئیں۔ یا آپ نے گرا دیں۔ اور اپنے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو مارنے لگے۔ کہ تم نے بنی اسرائیل میں شرک کیوں ہونے دیا حضرت ہارون نے بنی اسرائیل کی سرکشی اور اپنی معذوری اور مجبوری بیان فرمائی کہ میں نے اُن کو بہت کچھ روکا۔ لیکن یہ نہ مانے تب آپ نے توریت کی تختیاں اٹھالیں۔ اور اپنے بھائی کے اور اپنے لئے دعائے مغفرت کی تفسیر روح البیان نے اس جگہ فرمایا۔ کہ توریت شریف کے کُل سات حصّے تھے۔ اس گر جانے سے چھ حصّے غائب کر دیئے گئے۔ اور ایک حصّہ جس میں کہ صرف ضروری مسائل تھے باقی رہ گیا۔ وہی بنی اسرائیل کو ملا۔ پھر آپ نے بنی اسرائیل سے بازپُرس کی۔ کہ تم نے یہ کیا کیا۔ انہوں نے کہا۔ کہ ہمیں سامری نے بہکا دیا۔ سامری سے پوچھا۔ اس نے کہا۔ کہ میرے دل میں کچھ ایسا ہی آگیا۔ لہٰذا آپ نے بنی اسرائیل کو توبہ کا حکم دیا۔ سامری کے حق میں بددُعا فرمائی۔ اور بچھڑے کو جلا کر اس کی راکھ دریا میں پھینک دی بعض پُوجاری اسرائیلیوں کو بچھڑے سے ایسی محبت ہو گئی تھی۔ کہ انہوں نے تبرّک کے لئے دریا کا وہ پانی چھُپ کر پیا جس میں یہ راکھ پھینکی ہوئی تھی جس سے کہ اُن کے ہونٹ کالے پڑ گئے اور پیٹ پھُول گئے۔ اور ان کی توبہ قبول نہ ہوئی (تفسیر روح البیان) **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔

ایک یہ کہ بمقابلے ہدایت گمراہی جلدی پھیلتی ہے گمراہی ایک بیماری ہے۔ اور ہدایت تندرستی بیماری خود بخود اور جلدی پھیلتی ہے۔ اور صحت بمشکل حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی شخص کو اپنے نفس پر اعتماد نہ چاہیئے۔ بڑے سے بڑے عابد کو یہ ایک دم بہکا دیتا ہے۔ دیکھو بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صحبت میں رہ کر بھی ایک ذرا سی بات میں پھسل گئے تیسرے یہ کہ بُری صحبت سے ہر شخص کو دور رہنا چاہیئے۔ بنی اسرائیل سامری کی صحبت سے بگڑ گئے چوتھے یہ کہ شرک سے مسلمان مُرتد ہو جاتا ہے جیسا کہ بنی اسرائیل پر گزرا۔ پانچویں یہ کہ الحمدللہ امت مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم بنی اسرائیلیوں سے کہیں افضل ہے۔ کیونکہ وہ اس قدر معجزات دیکھ کر بھی معمولی شبہ سے دھوکہ کھا گئے۔ لیکن عام مسلمان بحمدہٖ تعالیٰ بڑے سے بڑے شبہات سے بھی دھوکہ نہیں کھاتے۔ چھٹے یہ کہ عقائد میں تقلید حرام ہے عقائد دلائل سے معلوم ہونے چاہئیں۔ اس لئے کہ بنی اسرائیل نے فقط سامری کے کہنے پر بچھڑا پُوجا اگر دلیل پر غور کرتے تو ایسا کبھی نہ کرتے خیال رہے کہ اماموں کی تقلید اعمال میں ہے۔ نہ کہ عقائد میں۔ ساتویں یہ کہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی۔ کہ آپ مشرکین عرب اور یہودیوں عیسائیوں کی مخالفت سے غم نہ کریں۔ انہوں نے تو معجزات دیکھ کر اور رب کی نعمتیں پا کر بھی کفر کیا پھر جیسے کہ موسےٰ علیہ السلام نے صبر فرمایا۔ آپ بھی صبر فرمائیں۔

آٹھویں یہ کہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی ہونا ثابت ہوا۔ کہ آپ نے بغیر کتب و تواریخ پڑھے اور بغیر تاریخ جاننے والوں کی صحبت حاصل کئے ہوئے۔ نہائت صحیح قصّہ بیان فرما دیا معلوم ہوا۔ کہ آپ صاحب وحی ہیں۔ نویں یہ کہ چالیس کا عدد رب کو بہت پیارا ہے۔ چالیس دن آدم علیہ السلام کا خمیر ہوا۔ اور چالیس دن میں موسےٰ علیہ السلام کو توریت دی۔ چالیس سال کی عمر میں اکثر پیغمبروں کو نبوت عطا ہوئی۔ چالیس دن تک ہی ماں کے پیٹ میں نطفہ اپنی شکل پر ہی رہتا ہے۔ پھر چالیس دن تک خون پھر چالیس دن تک پارہ گوشت بچے کی پیدائش کے بعد چالیس دن تک ہی عورت کو نفاس آسکتا ہے۔ چالیس سال کی عمر میں انسان کی عقل پختہ ہوتی ہے۔ تفسیر عزیزی نے اس جگہ ایک حدیث نقل

فرمائی کہ جو شخص چالیس دن خلوص دل سے عبادت کرے خدا تعالیٰ اس کے دل اور زبان پر حکمت کے چشمے ظاہر فرماتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس دن میں حالات کا انقلاب ہوتا ہے۔ اسی لئے صوفیائے کرام چالیس دن کے چلے کرتے ہیں۔ اور یہ بھی مشہور ہے کہ جو شخص چالیس دن نماز پڑھ لے انشاء اللہ وہ نمازی ہو جاتا ہے۔ دسویں یہ کہ اس سے معلوم ہوا کہ میت کا چالیسواں کرنا نہایت بہتر چیز ہے "انوار ساطعہ" نے بحوالہ بیہقی سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ انبیاء کرام اپنے قبور میں چالیس دن سے زیادہ نہیں چھوڑے جاتے ان کو بارگاہ الٰہی میں خاص قرب عطا فرمایا جاتا ہے۔ زرقانی شرح "مواہب" نے اس حدیث کے معنی یوں بیان فرمائے کہ انبیاء کرام کی روح کا تعلق اس جسم مدفون سے چالیس روز تک بہت زائد رہتا ہے۔ اور پھر قرب الٰہی میں عبادت کرتی ہے۔ گیارھویں یہ کہ کچھ دن کیلئے تارک الدنیا ہو کر عبادات و مجاہدہ کرنا ایمانی ترقی کا باعث ہے۔ جیسے کہ موسےٰ علیہ السلام کے اس قصے سے ثابت ہوا۔ اور صوفیائے کرام کا اسی پر عمل ہے۔ بارھویں یہ کہ گناہ سے رحمت الٰہی جاتی رہتی ہے بنی اسرائیل کی خطا سے توریت کا اکثر حصہ غائب ہو گیا حضور علیہ السلام شب قدر کی خبر دینے تشریف لائے۔ دو شخص آپس میں لڑ رہے تھے۔ فرمایا کہ ان کی لڑائی سے شب قدر اٹھالی گئی۔ اب سال بھر تلاش کرنی پڑتی ہے۔ یہ گناہ کا وبال ہے۔ **پہلا اعتراض**۔ موسیٰ علیہ السلام نے غصے میں توریت شریف کی تختیاں کیوں پھینکیں۔ اگر آج کوئی قرآن پاک کو پھینک دے۔ تو کافر ہو جائے۔ حالانکہ اس کا کاغذ لکھائی چھپائی سب انسانی صنعت ہے۔ صرف کلام رب کا ہے۔ توریت شریف کی وہ تختیاں اور ان کی روشنائی اور تحریر سب ربانی تھی۔ اس کو پھینکنا کفر کیوں نہ ہوا۔ **جواب** قرآن پاک کے گرنے میں تین صورتیں ہیں۔ غلطی سے گر جائے۔ کسی پر غصہ آجائے۔ اور اتفاقاً اس وقت ہاتھ میں قرآن شریف ہو۔ اور جھنجلا کر بے خودی میں گرا دیا جائے تیسرے خود قرآن کریم کی اہانت کے لئے پھینکا جائے۔ پہلی صورت میں گناہ بھی نہیں دوسری صورت حرام ہے مگر کفر نہیں تیسری صورت کفر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سے یا تو وہ تختیاں غصے میں بلا قصد گر گئیں۔ یہ کوئی جرم نہیں۔ یا قوم پر دین کی خاطر غصہ آیا۔ اور جھنجلاہٹ میں گرا دیں۔ یہ خطا ہوئی جس کی انہوں نے رب سے معافی چاہ لی۔ کہ عرض کیا۔ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَلِاَخِیْ توریت شریف کی توہین مقصود نہ تھی۔ نیز توریت کی تختیوں پر کلام اللہ تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ ہیں۔ اور کلیم اللہ ان تختیوں سے یقیناً افضل ہے۔ ہمارے اور احکام ہیں۔ ان کے دوسرے دیکھو عام مسلمان مسجد میں بحالت جنابت نہیں آسکتے مگر حضرت صدیق کو اس کی اجازت تھی۔ **دوسرا اعتراض**۔ ہارون علیہ السلام پیغمبر ہیں۔ اور موسےٰ علیہ السلام سے عمر میں بڑے موسیٰ علیہ السلام نے ان کو بلا قصور مارا۔ اس میں ان پر ظلم ہوا۔ اور نبی کی توہین بھی ظلم کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ اور نبی کی توہین کفر **جواب** موسےٰ علیہ السلام کے اگر یہ افعال ناجائز ہوتے۔ تو ان پر ضرور عتاب الٰہی آجاتا۔ جیسے کہ آدم علیہ السلام پر گندم کھانے سے آگیا۔ موسےٰ علیہ السلام حضرت ہارون سے درجے میں اعلیٰ و افضل تھے۔ ان سے خطا اجتہادی ہوئی۔ وہ سمجھے کہ حضرت ہارون نے تبلیغ میں کوشش نہ کی۔ اس لئے ان پر عتاب کر دیا۔ اور خطا اجتہادی معاف ہے۔ اگر حاکم غلطی سے کسی کو سزا دیدے۔ تو اس کے بدلے میں حاکم کو سزا نہیں دی جاسکتی۔ نیز حاکم اپنے ملزم باپ پر عتاب کر سکتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ

اور جبکہ فرمایا موسےٰ نے واسطے قوم اپنی کے اے میری قوم تحقیق تم نے ظلم کیا جانوں اپنی پر بوجہ بنانے تمہارے بچھڑا

اور جب موسےٰ نے اپنی قوم سے کہا اے قوم میری تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا

فَتُوبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ

پس توبہ کرو طرف پیدا کرنیوالے اپنے کے پس قتل کرو جانوں اپنی کو یہ سب اچھا ہے واسطے تمہارے نزدیک خالق تمہارے کے پس توبہ قبول کی اس نے

تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع لاؤ. تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو یہ تمہارے پیدا کرنیوالے کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے.

عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

اوپر تمہارے تحقیق وہ ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان

تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی. بیشک وہ ہی ہے. بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان

**تعلق.** اس آیت کا پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے. ایک یہ کہ یہ آیت پچھلی آیت کی تفسیر ہے. کیونکہ پہلے فرمایا گیا تھا. کہ ہم نے تمہارا گناہ معاف کر دیا. اب اس معافی کی کیفیت کا ذکر فرمایا. دوسرے یہ کہ پہلے فرمایا گیا تھا. کہ ہم موسےٰ علیہ السلام کو "فرقان" یعنی فرق کرنے والی چیز عطا فرمائی. اب اسرائیلیوں کی توبہ کا ذکر ہوا. کیونکہ توبہ بھی باغی اور خطا کار میں فرق کر دیتی ہے. یا توبہ کی برکت سے مجرم کے حال میں فرق آجاتا ہے. کہ وہ فاسق سے صالح بن جاتا ہے. تیسرے یہ کہ اس سے پہلے اسرائیلیوں پر چار نعمتوں کا ذکر ہوا اب پانچویں نعمت کا تذکرہ ہو رہا ہے. یعنی ان کی توبہ قبول ہونا. البتہ فرق اتنا ہے. کہ پہلے وہ نعمتیں ذکر کی گئیں. جو ظاہر و باطن ہر طرح نعمتیں تھیں. یہاں اس نعمت کا ذکر ہے. جو بظاہر زحمت اور حقیقتاً نعمت ہے. خیال رہے. کہ بعض لوگوں نے کہا ہے. کہ اس آیت کا پہلے سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ پہلے نعمتوں کا ذکر تھا. اور یہاں ان کے قتل کا اور قتل عذاب ہے. نہ کہ رحمت مگر یہ غلط ہے. کیونکہ اس قتل سے بنی اسرائیل آخرت کے وبال سے بچ گئے. اور دنیا سے شہید ہو کر گئے. گناہ سے صاف ہو گئے. اور جس قتل کے یہ فائدے ہوں وہ یقیناً رحمت ہے. نہ کہ عذاب. شہادت بھی قتل سے حاصل ہوتی ہے. اسے عذاب نہیں سمجھا جاتا. لہٰذا اس قتل کو نعمتوں میں شمار کرنا بالکل صحیح ہے. ڈاکٹر کا بیماری معلوم کر کے مریض کا اپریشن کرنا نعمت ہے. عذاب نہیں. نیز حق تعالےٰ نے ان کو قتل کا حکم دے کر سب مجرموں کو فنا نہ کر دیا. بلکہ بعض کو باقی رکھا جو مر گئے وہ شہید ہوئے. جو بچے وہ مغفور لہٰذا یہ نعمت ہوئی **تفسیر** وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى یہاں بھی ایک فعل پوشیدہ ہے. یعنی اے بنی اسرائیلیو یاد کرو. یا اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم انہیں یاد دلاؤ. جب موسےٰ علیہ السلام اپنے برادر معظم حضرت ہارون علیہ السلام سے واقعہ کی تحقیق فرما چکے. اور سامری کے حق میں بد دعا کر چکے. اور بچھڑے کو جلا کر اس کی راکھ دریا میں بہا چکے. تب پوجنے والے اسرائیلیوں کی طرف متوجہ ہوئے. اور ان سے فرمایا. لِقَوْمِهٖ اس جگہ قوم سے مراد ساری قوم نہیں ہے. بلکہ صرف بچھڑے کی پوجاری کیونکہ ظالم صرف وہی تھے. چونکہ ساری قوم کو بھی قوم کہدیتے ہیں. اور قوم کے بعض لوگوں کو بھی اس لئے یہاں قوم فرمایا گیا.

يٰقَوْمِ اصل میں یا قومی تھا جس کے معنی ہوئے اے میری قوم ی گرا دی گئی. یہ اضافت شفقت و مہربانی کے اظہار کے لئے ہے. تاکہ قوم آپ کی اطاعت کرے خیال رہے کہ لفظ قوم کے معنی ہیں. درست ہونا اور سیدھا ہونا کہا جاتا ہے. اَقَامَةُ الصَّلٰوةِ نماز کا درست یا سیدھا کرنا. قِيَامُ النَّاسِ لوگوں کا سیدھا کھڑا ہونا. قِوَامُ الشَّيْءِ چیز کی درستی اب اصطلاح میں مشترک جماعت کو قوم کہا جاتا ہے. ہم پیشہ. ہم وطن. ہم مذہب اور ہم قبیلہ لوگوں کو قوم کہتے ہیں. کیونکہ اس جماعت سے کسی چیز کا انتظام درست اور قائم رہتا ہے. کہتے ہیں. تاجر قوم. ہندوستانی قوم. مسلم قوم اور سید قوم وغیرہ یہاں موسےٰ علیہ السلام کا ان پجاریوں کو اپنی قوم فرمانا. ہم وطن یا ہم قبیلہ ہونے کی وجہ سے ہے. یعنی اے میرے قبیلے یا وطن والو ہم مذہب ہونے کے لحاظ سے نہیں. کیونکہ یہ لوگ مرتد ہو کر دین سے نکل چکے تھے. اور ابھی انہوں نے توبہ نہ کی تھی. اسی طرح جس پیغمبر نے بھی کفار کو اپنی قوم فرمایا. وہ اسی معنی میں ہے. اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ

یعنی اے پجاری اسرائیلیو تم نے نہ تو میرا کچھ بگاڑا اور نہ میرے بھائی حضرت ہارون کا اور نہ رب تعالیٰ کو کوئی نقصان پہنچایا بلکہ خود اپنے کو ستایا. ظُلْمٌ کے چند معنی ہم بیان کر چکے ہیں. یہاں ستانے اور نقصان پہنچانے کے معنی میں ہے. اَنْفُسَ جمع نفس کی ہے. نفس کے بہت سے معنی ہیں نفس امارہ اور نفس مطمئنہ وغیرہ کو بھی نفس کہتے ہیں. اور ذات. جان اور عین کو بھی نفس بولتے ہیں. یہاں آخری تین معنی مراد ہیں یعنی تم نے اپنی جانوں کو یا اپنی ذاتوں کو یا اپنے آپ کو نقصان پہنچایا. بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ اگر یہاں معبود پوشیدہ ہو. تو اس کے معنی بالکل ظاہر ہیں. کہ تم سب نے بچھڑے کو معبود مان کر اپنے پر ظلم کر لیا. اور اگر اتخاذ کے معنی بنانے کے کئے جائیں. اور معبود پوشیدہ نہ ہو. تو چونکہ یہ سارے پجاری بچھڑا بنانے میں سامری کے مددگار تھے. اس لئے یہ کام سب پجاریوں کا مانا گیا یعنی تم سب بچھڑا بنا کر ظالم ہو چکے. تب بنی اسرائیل نے عرض کیا کہ یہ قصور تو ہم سے ہو چکا فرمایئے. کہ اسکا کفارہ کیا. تب آپ نے فرمایا فَتُوْبُوْا ف سببیہ ہے یعنی چونکہ تم ظالم ہو چکے. لہٰذا توبہ کرو توبہ کے معنی اور اسکی ساری قسمیں ہم آدم علیہ السلام کے قصے میں بیان کر چکے ہیں اِلٰى بَارِئِكُمْ یعنی تمہاری یہ توبہ محض مجھ کو راضی کرنے یا قوم کے دکھلاوے کیلئے نہ ہونی چاہیئے. بلکہ رضائے الٰہی کیلئے خیال رہے بَارِئُ بَرْءٌ سے بنا ہے جسکے معنی ہیں دور ہونا یا کسی سے علیحدہ ہونا جیسے کہتے ہیں کہ بَرِئَ الْمَرِيْضُ بیمار اچھا ہو گیا یعنی بیماری سے علیحدہ ہو گیا. بَرِئَ الْمَدْيُوْنُ یا بَرِئَ الْحَالِفُ یعنی مقروض اور قسم والے نے قرض اور مرض سے خلاصی پائی. اب ایجاد کرنے اور پیدا کرنے کو بھی بَرِئَ کہنے لگے. کیونکہ اس میں بھی نیستی سے علیحدہ ہو کر ہستی میں آنا ہوتا ہے. یہاں باری کے معنی خالق ہے یعنی اپنے پیدا کرنیوالے کی طرف توبہ کرو. اس مقام میں ایک نہایت باریک نکتہ ہے نکتہ یہ ہے کہ اس کی عبادت چاہیئے جس نے ہم کو بنایا. اور اے اسرائیلیو تم نے اس بچھڑے کو پوجا جس کو خود تم نے بنایا. تم نے بیوقوفی کی انتہا کر دی. فَاقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ یہ جملہ توبہ کی تفسیر نہیں ہے کیونکہ توبہ کی حقیقت گذشتہ جرم پر نادم ہونا اور آئندہ کیلئے عہد کرنا ہے. اپنے کو قتل کرنا. بلکہ یہ توبہ کی شرط کا ذکر ہے یعنی تم اپنے کو قتل کراؤ جس سے تمہاری توبہ قابل قبول ہو جائے. جیسے کہ آج بھی قاتل کی توبہ کی شرط یہ ہے. کہ وہ اپنے کو قصاص کے لئے پیش کر دے. یا غاصب کی توبہ کی شرط یہ ہے. کہ مغصوب چیز مالک کو دیدے. اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے دین میں مرتد کی توبہ بغیر قتل کی تیاری کے توبہ قبول نہ ہوتی تھی قَتْلٌ کے لغوی معنی ہیں کسی ہتھیار کے ذریعے سے کسی کی جان نکالنا خواہ فوراً یا کچھ مہلت سے چاقو لاٹھی تلوار پتھر وغیرہ سے سر پھاڑ کر مار ڈالنا بھی قتل ہے. اور ان چیزوں سے زخمی کر دینا جسکے کچھ عرصہ بعد زخمی آدمی مر جائے. یہ بھی قتل ہے. موت کا سبب قائم کرنا قتل نہیں راستے میں کنواں کھود دیا جس سے کوئی گر کر مر گیا یہ قتل نہیں اور ذبح یہ ہے. کہ دھار والی چیز سے گردن کاٹ دی جائے. یہاں دوسرے ہی معنی مراد ہیں. ظاہری آیت سے معلوم ہوتا ہے. کہ ان کو خودکشی کرنے کا حکم دیا گیا. یعنی ہر مجرم خود اپنے کو ہلاک کرے. لیکن یہ معنی روایت کے خلاف ہے. اس لئے اس سے مفسرین فرماتے ہیں. کہ یا تو اس کا مقصد یہ ہے. کہ اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کر دو اور یا یہ خطاب ان اسرائیلیوں سے ہے. جو بچھڑے کی پوجا سے محفوظ رہے یعنی اے بے گناہ اسرائیلیو تم اپنے نفسوں یعنی اپنے اہل قرابت مجرموں کو قتل کر ڈالو چونکہ قبیلے کو قتل کرنا گویا اپنے کو قتل کرنا ہے. جیسے قرآن کریم فرماتا ہے. وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ یہاں بھی انفس سے مراد مسلمان بھائی ہیں بعض علماء فرماتے ہیں. کہ یہ خطاب بھی مجرموں سے ہی ہے. یعنی اے مجرمو تم ایک دوسرے کو قتل کرو. ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ یہ کلام بھی موسیٰ علیہ السلام کا ہے. یعنی اے اسرائیلیو یہ قتل ہو جانا اور توبہ کر لینا. زندہ رہنے سے بہتر ہے. کیونکہ توبہ کی موت جرم کی زندگی سے اچھی ہے کیونکہ وہ موت حیات ابدی اور فرحت سرمدی کا ذریعہ ہے. اور شرک کی نجاست سے طہارت. عِنْدَ بَارِئِكُمْ یعنی ظاہر یہ بہت سخت ہے. نفس پر بڑا بھاری ہے بیوقوفوں کے نزدیک برا برا ہے. مگر رب کے نزدیک بہت بہتر فَتَابَ عَلَيْكُمْ یہ رب کا کلام ہے. اور اس میں مدینہ پاک کے اسرائیلیوں سے خطاب ہے. یعنی تمہارے باپ دادؤں نے بخوشی جان دینا منظور کی اور کئی ہزار آدمی ذبح ہو گئے. لہٰذا ہم نے ان پر کرم فرمایا. اور ان کی توبہ قبول کر لی محبوب کا جان لے کر بھی راضی ہو جانا عین کرم ہے. اور فانی چیز فنا کر کے نعمت باقیہ عطا فرما دینا عین اسکی مہربانی ہے. اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ یا تو توّاب کے معنی ہیں. بہت توبہ قبول فرمانے والا اور یا توبہ کی توفیق دینے والا یعنی اسی کے فضل

سے بندہ توبہ کرنے کی ہمت کر لیتا ہے۔ اور پھر وہی اپنے فضل سے قبول فرما لیتا ہے۔ **اَلرَّحِیْمُ** بڑی رحمت والا ہے۔ کہ اس نے قتل کو کفارہ گناہ بنادیا۔ اور بعضوں کو قتل کرا کر سب کے گناہ معاف فرما دیئے۔ اور مقتولین کو شہدا اور محفوظین کو مغفور اور قاتلین کو غازی بنادیا۔

**خلاصہ تفسیر** یہ پانچواں انعام یاد دلایا جا رہا ہے۔ کہ اے بچھڑا پوجنے والے اسرائیلیو اگر تم کو اس جرم کی سزا میں اس سرے سے اس سرے تک ہلاک کیا جاتا تو بھی کوئی بات نہ تھی۔ کیونکہ تم نے بغاوت کی تھی۔ اور باغی کی سزا یہی ہے۔ جیسا کہ فرعون کی قوم کے ساتھ کیا گیا۔ مگر پھر بھی تم پر کرم کیا گیا۔ کہ تم سے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ تم ظالم ہو چکے ہو۔ لہٰذا تم توبہ کرو۔ اور اپنی جانوں کو قتل کے لئے پیش کر دو۔ پھر تم کو اس بھاری کام کی ہمت بھی ہم نے دی کہ تم نے اس بوجھ کو برداشت کر لیا۔ پھر کچھ لوگوں کو قتل کرا کر سب کی خطا معاف کر دی۔ بلکہ مقتولین کو درجۂ شہادت عطا فرما دیا یعنی باغی تھے۔ انہیں شہید بنادیا۔ بیشک رب تعالیٰ بہت ہی توبہ قبول فرمانے والا اور مہربان ہے۔

## قتل بنی اسرائیل

جب موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑا پوجنے والوں کو قتل کا حکم دیا۔ تو انہوں نے کہا۔ کہ ہم رب کے حکم پر راضی ہیں۔ تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا۔ کہ مجرمین بغیر ہتھیار اور بغیر خود اور زرہ کے باہر آجائیں۔ اور اپنے دروازوں پر دو زانو بیٹھ جائیں۔ اور اپنے زانو اپنی پیٹھ سے باندھ دیں اور اپنے سر زانوؤں پر رکھ لیں۔ اور تلوار اپنی گردن پر لیں۔ نہ تو کوئی اپنا زانو بند کھولے نہ تڑپے اور نہ ہاتھ پاؤں ہلائے۔ اگر کسی نے قاتل کو آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا یا اس کی تلوار کا وار اپنے ہاتھ یا پاؤں سے روکا تو اس کی توبہ قبول نہ ہوگی۔ جب یہ سب لوگ اس پر تیار ہو گئے۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون سے فرمایا۔ کہ ان بارہ ہزار آدمیوں کو حکم دو جو بچھڑے کی پوجا سے محفوظ رہے ہے۔ کہ ننگی تلواریں لیکر ان بندھے ہوئے آدمیوں کے پاس جائیں۔ اور انہیں قتل کرنا شروع کر دیں چنانچہ اس پر فوراً عمل کیا گیا۔ آپ نے ایک بلند جگہ کھڑے ہو کر آواز دی۔ کہ اے مجرم اسرائیلیو تمہارے بھائی تلواریں سونتے ہوئے تمہیں قتل کرنے آرہے ہیں۔ اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔ جب قاتلین مجرمین کے پاس پہنچے تو محبت کی وجہ سے قتل نہ کر سکے۔ کیونکہ یہ ان کے بھائی بھتیجے اور بیٹے پوتے تھے۔ اور موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا۔ کہ ہمارے ہاتھ ان پر نہیں اٹھتے اپنے ہاتھوں سے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کیسے قتل کیا جائے۔ تب ان پر ایک نہایت سیاہ بادل بھیجا گیا۔ جس سے سارے میدان میں اندھیرا ہو گیا۔ اور کوئی کسی کو نہ دیکھ سکا اور حکم ہوا۔ کہ جاؤ اب انہیں قتل کرو چنانچہ ایک دن میں اور بعض روایت میں ہے۔ کہ تین دن میں ستر ہزار آدمی قتل ہو گئے۔ تب بنی اسرائیل کے بچے اور عورتیں موسیٰ علیہ السلام کے پاس آکر شور و فریاد کرنے لگے۔ کہ اے موسیٰ رب سے رحم کی درخواست کرو حضرت موسیٰ و ہارون علیہم السلام ننگے سر روتے ہوئے عاجزی کرتے ہوئے میدان میں آئے۔ اور عرض کیا۔ کہ اے مولیٰ! اسرائیلی ہلاک ہوئے جا رہے ہیں۔ اب رحم فرما۔ تب وہ سیاہ بادل ہٹا۔ اور حکم آیا۔ کہ اب قتل بند کرو سب کی توبہ قبول ہو گئی۔ ہم ان سب کو جنت دیں گے۔ اس آیت کے **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** یہ کہ کفار کو مسلمان اپنی قوم کہہ سکتا ہے۔ مگر ہم وطن یا ہم قبیلہ کے معنی میں نہ کہ بمعنی ہم مذہب کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے ان مرتدین کو اپنی قوم فرمایا۔ **دوسرا فائدہ** یہ کہ تبلیغ نرمی اور محبت سے چاہیئے۔ کیونکہ اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ اور سختی سے دلوں میں ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے انہیں یَا قَوْمِ فرمایا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بے دین بچے کو یَا بُنَیَّ فرمایا۔ ہاں جب کسی کے ایمان کی امید نہ رہے۔ تو ان پر خوب سختی کرنا سنت الٰہیہ اور سنت نبویہ اور سنت صحابہ ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ اے نبی ان بے ایمانوں پر خوب سختی فرمایئے۔ نیز خود رب تعالیٰ نے ابولہب وغیرہ کفار کی بہت برائیاں بیان فرمائیں حتیٰ کہ ولید کے سورۂ نون میں گیارہ عیوب بیان کئے اور آخر میں فرمایا۔ زنیم وہ حرام کا جنا ہے۔ جو شخص لاعلاج کافروں پر خوشامدانہ نرمی کرتا ہے۔ وہ خود دین میں مداہن ہے۔ ہم تو نماز سے پہلے بھی شیطان کو رجیم کہہ لیتے ہیں۔ تو

نماز پڑھتے ہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جن کفار کے ساتھ نرم برتاؤ فرمایا۔ وہ وہی کفار تھے جن کے ایمان کی امید تھی۔ اگر ہر کافر سے خوش خلقی برتی گئی تھی۔ تو بتاؤ کہ جہاد کس سے ہوا۔ غرض کہ ہماری نرمی اور سختی دونوں اللہ کے لئے چاہئیں۔ نہ کہ اپنی ذات کے لئے تبلیغ نہائت نرمی سے کی جائے۔ اور تردید خوب سختی سے تیسرا فائدہ یہ کہ موجودہ بنی اسرائیل کو دعوت دی گئی۔ کہ تمہارے باپ دادا وٗں نے توبہ کے لئے اپنے کو قتل کرا دیا۔ اب نبی آخرالزمان بغیر قتل ہی کے نہائت نرم توبہ کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس کی قدر کرو۔ اور توبہ کرلو۔ چوتھا فائدہ یہ کہ مسلمانوں کو توبہ میں بہت جلدی کرنی چاہیئے۔ دیکھو اسرائیلیوں پر توبہ کرنا بہت دشوار تھا۔ اور مسلمانوں کے لئے آسان ہے اگر اب بھی توبہ نہ کریں۔ تو ان کی سخت بدنصیبی ہے۔ پانچواں فائدہ یہ کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سارے جہان کے لئے نعمت ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کی وجہ سے تمام وہ مصیبتیں جو بنی اسرائیل پر تھیں ٹل گئیں۔[1] ان کے یہاں ناپاک عضو کو کاٹنا پڑتا تھا۔[2] ان کی نماز سوا مسجد کے اور کہیں نہ ہو سکتی تھی۔[3] ان کی طہارت صرف پانی سے ہی ہو سکتی تھی۔[4] ان کا روزہ دار رات کو سونے کے بعد کچھ نہ کھا پی سکتا تھا۔[5] ان پر گناہوں کی وجہ سے حلال چیزیں حرام ہو جاتی تھیں۔[6] ان پر چوتھائی مال زکوٰۃ واجب تھی۔ روپیہ میں چار آنہ۔[7] ان کے رات کے چھپے ہوئے گناہ صبح دروازے پر لکھے جاتے تھے جس سے وہ سخت رسوا ہوتے تھے وغیرہ وغیرہ (تفسیر روح البیان) اسلام میں ان میں سے کوئی بات نہیں۔ چھٹا فائدہ یہ کہ توبہ حق تعالےٰ کی بڑی نعمت ہے۔ توبہ کے چار درجے ہیں۔ ایک نفس امارہ کی توبہ جو کہ عام مسلمانوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کی حقیقت بُری باتوں سے بچنا اچھے کام کرنا فوت شدہ عبادتیں قضا کر دینا حق والوں کے حق دے دینا مظلوموں سے معافی مانگ لینا۔ اور گذشتہ گناہوں سے شرمندہ ہونا۔ اور آئندہ نہ بچنے کا عہد کرنا ہے۔ اسے توبہ محض کہتے ہیں۔ یا توبۂ نصوح دوسرا درجہ نفس لوّامہ کی توبہ ہے۔ یہ اولیاء اللہ اور خاص مومنین کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کی حقیقت ترک دنیا اور حق سے غافل کرنیوالی چیزوں سے بچنا۔ اخلاق کی درستی نفس کی صفائی اور اس کی مخالفت ہے۔ اس کا نام انابت ہے۔ اس سے نفس امارہ قلب قلب کے درجے میں آجاتا ہے قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَجَاءَ بِقَلْبٍ مُّنِيبٍ تیسرا درجہ نفس ملہمہ کی توبہ ہے یہ خاص اولیاء اللہ کو حاصل ہوتی ہے جس کی حقیقت دنیا سے نفرت اور آخرت کی طرف رغبت ہے۔ اس کا نام اوبہ ہے۔ اس کی برکت سے نفس روح کے مقام میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور تنہائی پسند کرتا ہے خلقت سے وحشت اور خالق سے رغبت رکھتا ہے۔ اور خالق کی طلب میں کونین سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔ چوتھا درجہ نفس مطمئنہ کی توبہ ہے۔ یہ خاص اولیا اور انبیاء کرام کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ خود عنائت ربانی ان نفسوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جیسے مقناطیس لوہے کو اور اپنی انانیت سے نکال کر ربوبیت کی ہویت میں گم کر دیتی ہے۔ اس درجے میں دوئی سے نفرت اور یکی کی طلب ہوتی ہے۔ ادھر سے حکم ہوتا ہے۔ کہ اِرْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ اور اس طرف سے بزبان حال عرض ہوتی ہے۔ کہ شعر

تجھ میں میں ایسا سما جاؤں کہیں ہی نہ رہوں ‏‏‏‏ مجھ میں تو ایسا سما جائے تو ہی تو ہو جائے

**تفسیر صوفیانہ** ہر قوم بچھڑے کی پجاری ہے۔ جو چیز رب سے غافل کرے وہی بچھڑا ہے۔ کوئی دولت کے بچھڑے کی پوجا کر رہا ہے اور کوئی شہوت کے اور کوئی عزت کے بچھڑے کی اور کوئی خواہشات نفسانی کے بچھڑے کی ہر مومن کا قلب جو کہ مثل موسےٰ علیہ السلام کے ہادی ہے۔ بنی اسرائیل خواہشات سے پکار کر کہہ رہا ہے۔ کہ تم نے اس بچھڑے کی پوجا کر کے اپنے پر ظلم کر لیا ہے۔ اب تم ما سوی اللہ کو چھوڑ کر متوجہ الی اللہ ہو جاؤ۔ اور اپنے نفس امارہ کو قتل کر ڈالو۔ اللہ کی مدد مانگو۔ کافر کو لوہے کی تلوار سے قتل کیا جاتا ہے۔ مگر نفس کو صدق وصفا کی تلوار سے کافر کا قاتل غازی اور اس کا مقتول شہید ہے۔ اور نفس کا قاتل صدیق ہے۔ اور یقیناً صدیق کا درجہ غازی اور شہید سے زیادہ ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے صدیقین کو شہدا سے پہلے بیان فرمایا اور نبی علیہ السلام نے جہاد کفار کو جہاد اصغر اور

جہاد نفس ناہنجار کو جہاد اکبر فرمایا کیونکہ وہ مجاہد تو ایک بار قتل ہو کر مصیبتوں سے بچ جاتا ہے۔ اور اس کے سارے اعمال بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن صدیق ہر دن ہزاروں بار نفس کو قتل کرتا۔ اور ہر قتل میں نئی لذت پاتا ہے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی نفس کا صدق کی تلوار سے قتل کرنا تمہارے واسطے بہتر ہے۔ کیونکہ اس کے ہر قتل میں بلندی ہے۔ اور ہر حملے میں ایک درجہ۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔ کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ؛ ہر زمان از غیب جانِ دیگر است

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ

اور جبکہ کہا تم نے اے موسٰے ہرگز نہ ایمان لائیں گے ہم واسطے آپکے یہاں تک کہ دیکھ لیں ہم اللہ کو ظاہر ظہور پس پکڑ لیا تم کو کڑک نے

اور جب تم نے کہا اے موسٰی ہم ہرگز تمہارا یقین نہ لائیں گے جب تک علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں تو تمہیں کڑک نے آلیا

وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

حالانکہ تم لوگ دیکھ رہے تھے۔ پھر زندہ کیا ہم نے تمکو پیچھے سے مرنے کے تمہارے تاکہ تم شکر کرو۔

اور تم دیکھ رہے تھے پھر مرے پیچھے ہم نے تمہیں زندہ کیا۔ کہ کہیں تم احسان مانو۔

**تعلق۔** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ اس سے پہلے پانچ نعمتیں بیان کی جاچکیں۔ جو کہ بنی اسرائیل پر کی گئیں۔ اب چھٹی نعمت کا ذکر ہے۔ دوسرے یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کی شرک کرنے کا ذکر ہوا۔ اب مخالفت پیغمبر کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ کہ وہ ایک بار تو مشرک ہوئے اور دوسری بار موسےٰ علیہ السلام کے منکر تیسرے یہ کہ اس سے پہلے بھی اُن کے قتل کئے جانے کا ذکر ہوا۔ اور اب بھی اُن کے مارے جانے کا یعنی جب انہوں نے بت پرستی کی تب تو ستر ہزار ذبح کرا دیئے گئے۔ اور جب انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی۔ تو اُن کو کڑک سے ہلاک کر دیا گیا۔ مگر فرق یہ ہے۔ کہ اس بار موسےٰ علیہ السلام کے عرض کرنے پر دوبارہ اُن کو زندگی دیدی گئی۔ **تفسیر وَاِذْ قُلْتُمْ** یہاں بھی وہی فعل پوشیدہ ہے یعنی اے اسرائیلیو تم اس وقت کو بھی یاد کرو۔ یا اے نبی علیہ السلام انہیں وہ وقت بھی یاد دلاؤ۔ جب کہ تم نے کہا تھا۔ یہاں اُن ستر آدمیوں کا کہنا مراد ہے۔ جو کہ موسےٰ علیہ السلام کے ساتھ طور پر گئے تھے۔ خیال رہے کہ موسےٰ علیہ السلام دو بار اپنے ساتھ ستر اسرائیلیوں کو طور پر لے گئے۔ پہلے توریت لینے کے وقت اور دوسرے اس جرم کے بعد یہاں دوسری بار کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ کہ یہ واقعہ بنی اسرائیل کے قتل سے پہلے ہوا یا بعد میں بعض مفسرین نے فرمایا ہے۔ کہ پہلے ہوا۔ یعنی جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو بت پرستی کے کفارے میں قتل کا حکم دیا۔ تب انہوں نے کہا۔ کہ ہمیں کیسے یقین آئے۔ کہ آپ کو رب نے یہ حکم دیا ہے۔ تب آپ اُن میں سے ستر نیک لوگوں کو طور پر لے گئے۔ اور وہاں یہ واقعہ پیش آیا۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ یہ قتل کے بعد ہوا۔ یعنی جب ستر ہزار بنی اسرائیل قتل ہو چکے۔ تو موسےٰ علیہ السلام اس بت پرستی کی معذرت کرنے کے لئے بحکم پروردگار ان ستر آدمیوں کو طور پر لے گئے۔ تب یہ واقعہ پیش ہوا یٰمُوْسٰى۔ اُس زمانے میں پیغمبروں کو نام لے کر پکارنا جائز تھا۔ ہمارے لئے حکم قرآنی ہے۔ کہ ہم حضور علیہ السلام کو عام معمولی خطابوں سے نہ پکاریں۔ بلکہ ادب کے ساتھ ہمارے نبی علیہ السلام کو رب نے بھی نام لے کر نہ پکارا۔ بلکہ ان کے پیارے القاب کے ساتھ لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ ہم آپ کی بات نہ مانیں گے۔ یا صرف آپکی وجہ سے اس پر ایمان نہ لائیں گے حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً۔ نرٰی رویت سے بنا ہے جس کے معنی ہیں دیکھنا۔ اور یہاں آنکھ سے دیکھنا مراد ہے۔ نہ دلائل کے ذریعہ عقل سے پہچاننا۔ کیونکہ یہ تو ان کو پہلے بھی حاصل تھا۔ اس لئے وہ کہتے ہیں جَهْرَةً یعنی صاف صاف اور ظاہر ظہور جہر کے لغوی معنی ہیں ظہور اور کشف بلند آواز کو صوت جہیر

کہتے ہیں۔ اور خوبصورت چہرے کو وجہ جھیر۔ نیز اہل عرب بولتے ہیں کہ جَھَرْتُ الشَّيْئَ یعنی اس چیز کی میں نے تحقیقات کرلی۔ اور جَھَرْتُ الْبِئْرَ کنوئیں کا پانی کیچڑ وغیرہ نکال کر صاف کردیا۔ اُن اسرائیلیوں کا مقصد یہ تھا کہ ہم خدا کو صورت و شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ نہ کہ بنا دنی خیالات سے اور نہ اس طرح جیسا کہ آخرت میں بلاکیف اس کے دیدار کا وعدہ ہے کیونکہ یہ ہماری عقل میں نہیں آتا۔ فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ یہاں صٰعِقَة سے مراد آسمانی آگ ہے۔ نہ وہ بجلی جو کہ بادل سے نکل کر گرتی ہے کیوں کہ اسوقت طور پر بادل نہ تھا نیز بادل کی بجلی ایک شخص پر گرتی ہے۔ نہ کہ جماعت پر (تفسیر عزیزی) بعض لوگوں نے کہا ہے۔ کہ اس کے گرنے سے وہ لوگ صرف بیہوش ہو گئے تھے مرے نہ تھے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی فرمایا گیا ہے۔ کہ وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا یہاں صعق سے مراد بیہوشی ہے۔ نہ کہ موت نیز اس جگہ فرمایا جا رہا ہے۔ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ یعنی تم اُس کو دیکھ رہے تھے۔ اگر یہ لوگ مر گئے ہوتے تو دیکھنے کے کیا معنی مگر صحیح یہی ہے۔ کہ یہ لوگ مر گئے تھے کیونکہ آگے ارشاد ہو رہا ہے۔ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ اور لفظ صعق قرآن کریم میں مرنے کے معنی میں بھی ارشاد ہوا ہے۔ رب فرماتا ہے۔ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ۔ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ یعنی تم اُس صعقہ کا آنا اور بعض کا ہلاک ہونا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کیونکہ یہ لوگ ترتیب وار ہلاک ہوئے۔ تم ان کی ہلاکت دیکھ کر نہ تو بچ سکے۔ اور نہ کہیں بھاگ کر جا سکے۔ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ چونکہ یہ لوگ ایک دن اور رات مرے رہے دوسرے روز زندہ کئے گئے اس لئے یہاں ثُمَّ فرمایا گیا یعنی تم کو مار کر کچھ دیر کے بعد زندہ کیا گیا۔ نہ کہ فوراً بَعَثْنَا بَعْثٌ سے بنا ہے جس کے معنی میں اٹھانا بھیجنا اور زندہ کرنا۔ یہاں آخری معنی مراد ہیں یعنی زندہ کرنا جس طرح کہ یہ لوگ ترتیب وار مرے تھے۔ اسی طرح ترتیب وار زندہ ہوئے تاکہ ہر ایک مرنا اور جینا آنکھوں سے دیکھ لے مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ اس سے صاف معلوم ہوا کہ وہ لوگ حقیقت میں مر گئے تھے۔ اُن پر نیند یا بیہوشی طاری نہ ہوئی تھی۔ موت سے بیہوشی مراد لینا بلا دلیل ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ یہ سارے کام اس لئے ہوئے۔ کہ تم زندگی پانے اور ایمان پانے کا شکر کرو۔ اور آئندہ پیغمبر سے اس قسم کے مطالبے نہ کیا کرو **خلاصہ تفسیر** اے اسرائیلیو تم اس نعمت کو بھی یاد کرو جب کہ تم میں سے کچھ لوگ کوہ طور پر موسےٰ علیہ السلام کے ساتھ گئے۔ اور انہوں نے اپنے کانوں سے رب کا کلام سنا جو کہ موسےٰ علیہ السلام سے ہو رہا تھا۔ اس پر بھی انہوں نے کہا۔ کہ اے موسیٰ ہم تو جب مانیں جبکہ اپنی آنکھوں سے رب کو دیکھ لیں۔ یہ جرم اتنا سنگین تھا۔ کہ اس پر سخت سزا تم کو ملنی چاہیئے تھی کیونکہ تم نے موسیٰ علیہ السلام کا اعتبار نہ کیا تم کو آسمانی آگ سے ہلاک کر دیا گیا پھر موسےٰ علیہ السلام کی عرض پر دوبارہ زندہ کیا گیا۔ تم نے سرکشی پر سرکشی کی۔ خطا پر خطا کرتے رہے۔ مگر ہم عطا پر عطا فرماتے رہے جس طرح کہ گذشتہ زمانہ میں تمہاری خطائیں معاف ہوتی رہیں۔ اگر اب بھی اپنی خطاؤں پر نادم ہو کر اس نبی آخر الزمان پر ایمان لے آؤ۔ تو تمہاری خطائیں معاف فرما دی جاویں۔ جیسا کہ تم کو تجربہ ہو چکا ہے۔ کہ ہم کرم فرمایا ہی کرتے ہیں۔

## بنی اسرائیل کی موت اور اُن کا پھر زندہ ہونا

جب ستر ہزار اسرائیلی کفارے میں قتل ہو چکے۔ تب موسےٰ علیہ السلام کو حکم الٰہی ہوا۔ کہ تم کچھ باقی ماندہ لوگوں کو لیکر اس گناہ کی معذرت کے لئے کوہ طور پر حاضر ہو چنانچہ موسےٰ علیہ السلام نے اُن میں سے ستر بہترین آدمی چُنے جب یہ لوگ طور کی طرف روانہ ہوئے۔ تب انہوں نے عرض کیا۔ کہ اے موسیٰ ہمیں رب کا کلام سنوادو۔ آپ نے دُعا فرمائی۔ رب نے قبول کی جب کوہ طور پہنچے تو آپ نے فرمایا۔ کہ تم سب غسل کرلو۔ اور اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرو اور تین تین روزے رکھو اور تسبیح و تہلیل میں مشغول رہو۔ جب آپ پہاڑ پر پہنچے تو ان لوگوں کو نیچے کھڑا کیا۔ اور خود اوپر تشریف لے گئے۔ انہوں نے دیکھا۔ کہ ایک نورانی ستون ابر سفید کے رنگ کا نمودار ہوا۔ اور آہستہ آہستہ پھیلتا گیا یہاں تک کہ سارے پہاڑ کو اُس نے گھیر لیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام اُس میں گھر گئے پھر رب نے اُن سے کلام شروع فرمایا۔ یہ لوگ نیچے کھڑے ہوئے کلام الٰہی سن رہے تھے۔ انہوں نے عرض کیا۔ کہ یہ تمام گفتگو صرف موسےٰ علیہ السلام سے ہو رہی ہے۔ ہم پر بھی کرم فرمایا جاوے۔ اور کوئی بات ہم سے بھی خطا...

کر کے فرمادی جاوے۔ کہ یکایک نور کی تجلی اُن کی طرف کوندی اور پھر اُن کے کان میں آواز آئی۔ کہ اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا ذُوْبَکَّۃَ اُخْرِجُکُمْ مِنْ اَرْضِ مِصْرَ فَاعْبُدُوْنِیْ وَلَاتَعْبُدُوْا غَیْرِیْ۔ یعنی ہم اللہ ہیں۔ ہمارے سواء کوئی معبود نہیں۔ ہم مکہ والے ہیں۔ ہم تم کو مصر سے نکالیں گے۔ تم ہماری ہی عبادت کرنا کسی اور کی نہ کرنا جب یہ ابر صاف ہوگیا اور موسےٰ علیہ السلام نیچے تشریف لائے۔ تب آپ نے پوچھا۔ کہ کہو تم نے رب کا کلام سنا۔ وہ بولے۔ کہ سنا تو ہے مگر کیا خبر کہ کون بول رہا تھا۔ کیا ہم نے رب کو دیکھا تھا۔ یہ صرف آپ فرماتے ہیں۔ کہ بولنے والا رب تھا۔ ہم کو یقین نہیں آتا۔ آپ رب کو صاف صاف شکل وصورت میں دکھادیں توہم مان لیں۔ تب اُن پر آسمانی آگ معہ سخت آواز کے آئی جس سے وہ سب مردہ ہوگئے۔ ایک دن و رات مردہ رہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا۔ کہ مولیٰ اب میں بنی اسرائیل کو کیا جواب دونگا وہ کہیں گے۔ کہ تم نے ستر ہزار آدمی تو یہاں قتل کروائے۔ اور ستر آدمی باہر لے جاکر نہ معلوم کس طرح ہلاک کردیئے۔ مولیٰ میری بڑی بدنامی ہوگی۔ میں تو اُن کو اپنا گواہ بناکر لایا تھا۔ یہ کیا ہوگیا۔ خدایا تو انہیں زندہ فرمادے۔ اُن کی دعا سے یہ تمام لوگ ترتیب وار زندہ کیئے گئے۔ اور پھر موسیٰ علیہ السلام ان سب کو لیکر واپس تشریف لائے۔ اس آیت کے **فائدے**۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک فائدہ** یہ کہ انبیاء کرام کی ایسی شان ہے۔ کہ اُن کی بارگاہ میں بے ادبی کرنے سے عذاب الٰہی آتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کا اعتبار نہ کیا۔ اس موت میں گرفتار ہوئے۔ **دوسرا فائدہ** حق تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کی دعا سے مردے زندہ فرمادیتا ہے **تیسرا فائدہ** یہ کہ رب تعالیٰ کو انبیاء کرام کی عزت وعظمت باقی رکھنا منظور ہے۔ کہ صرف موسیٰ علیہ السلام کی عزت وعظمت برقرار رکھنے کے لئے یہ زندگی اُن کو عطا ہوئی۔ **چوتھا فائدہ** یہ کہ اگر موجودہ بنی اسرائیل حضور علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر ایمان نہ لائیں۔ تو تعجب نہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ تو رب کا کلام سن کر بھی نہ مانے تھے۔ **پانچواں فائدہ** یہ کہ اے نبی علیہ السلام آپ ان کی مخالفت پر رنجیدہ نہ ہوں۔ یہ تو مخالفت کرنے کے عادی ہوچکے ہیں۔ رب تعالیٰ ضد اور ہٹ دھرمی سے بچائے۔ آمین۔ **پہلا اعتراض**۔ جب رب نے ان ستر آدمیوں سے بھی کلام فرمایا۔ تو چاہیئے۔ کہ ان کو بھی کلیم اللہ کہا جاوے۔ صرف موسیٰ علیہ السلام کی یہ خصوصیت نہ رہی۔ **جواب**۔ کلیم اللہ وہ جو کہ خود رب سے کلام کرکے جواب حاصل کرے۔ یہاں ایسا نہ ہوا۔ صرف کلام الٰہی اُن کو سنا دیا گیا۔ مخاطبہ نہ ہوا۔ **دوسرا اعتراض**۔ جب یہ لوگ دوبارہ زندہ ہوئے تو چاہیئے۔ کہ پھر شریعت کے احکام کے مکلف نہ رہتے۔ کیونکہ مرنے کے بعد سارے احکام ختم ہوجاتے ہیں۔ **جواب**۔ چونکہ یہ لوگ دوبارہ زندہ ہوکر بھی اس دنیا میں رہے۔ اس لئے اُن پر احکام شرعیہ بھی باقی رہے۔ ہاں برزخی اور اُخروی زندگی میں احکام نہ ہوں گے۔ کیونکہ وہ عالم ہی دوسرا ہوگا۔ **تیسرا اعتراض**۔ جن لوگوں کو مار کر زندہ فرمادیا گیا۔ اُنکی عمر ختم ہوچکی تھی۔ یا نہیں۔ اگر ہوچکی تھی۔ تو دوبارہ زندہ کیوں رہے۔ اور اگر نہ ہوئی تھی۔ تو موت کیوں آئی۔ موت تو زندگی ختم ہونے پر آتی ہے **جواب** ابھی اُن کی عمر ختم نہ ہوئی تھی۔ یہ موت عارضی تھی۔ پھر اُنہوں نے دوبارہ زندہ ہوکر اپنی بقیہ عمر پوری کی۔ جیسے کہ کسی چراغ میں روغن اور بتی موجود ہو۔ مگر ہوا سے گل ہوجاوے۔ پھر کوئی اللہ کا بندہ اُس میں دیا سلائی لگاکر روشن کردے۔ اسی طرح ان کی شمع حیات میں روغن عمر باقی تھا مگر نافرمانی کی تیز آندھی سے وہ گل ہوگئی حضرت موسےٰ علیہ السلام کی دعاء دیا سلائی کی مثل تھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ اُن کی پہلی عمر ختم ہوچکی ہو حضرت موسےٰ علیہ السلام کی دعا سے دوبارہ دوسری عمر عطا فرمائی گئی ہو سیدنا آدم علیہ السلام نے اپنی عمر میں سے چالیس سال حضرت داؤد علیہ السلام کو دیئے۔ روایات میں ہے کہ اہل قرابت کے ساتھ اچھا سلوک کرنے سے عمر بڑھتی ہے بعض اعمال عمر بڑھادیتے ہیں۔ تو پیغمبر کی دعا سے بھی نئی عمر مل سکتی ہے۔ حضرت زلیخا کو یوسف علیہ السلام کی دعا سے دوبارہ جوانی عطا ہوئی۔ وغیرہ۔ اس کی زیادہ تحقیق انشاء اللہ عیسیٰ علیہ السلام کے مردے زندہ کرنے اور تقدیر کی اقسام کی بحث میں آوے گی **چوتھا اعتراض**۔ اس واقعہ سے معلوم ہوا۔ کہ دیدار الٰہی ناممکن ہے۔ اگر ممکن ہوتا۔ تو ان کو اس کے مانگنے پر سزا کیوں ملتی۔ اور ناممکن چیز کبھی ہی نہیں ہوسکتی۔ لہذا آخرت میں بھی دیدار نہ ہوگا۔ نیز حق تعالیٰ مکان اور جہت سے پاک ہے۔ اور اس کے بغیر دیکھنا محال **جواب** دیدار الٰہی ممکن ہے۔ بلکہ ہمارے حضور کو ہوا۔ اور انشاء اللہ قیامت میں عام

مسلمانوں کو حاصل ہوگا۔ اگر ناممکن ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام اس کی دعا نہ فرماتے۔ کیونکہ ناممکن کی دعا کرنا گناہ ہے۔ اور نبی گناہ سے معصوم۔ نیز جب موسیٰ علیہ السلام نے دعاءِ دیدار کی۔ تو رب نے فرمایا کہ اس پہاڑ پر نظر کرو۔ اگر یہ اپنی جگہ قائم رہ جاوے۔ تو تم بھی ہم کو دیکھ لینا۔ یعنی اپنے دیدار کو ایک ممکن چیز پر موقوف رکھا۔ اور ممکن پر موقوف بھی ممکن ہوتا ہے۔ یہ قاعدہ بھی غلط ہے۔ کہ دیدار کے لئے مکان اور جہت ضروری ہے۔ یہ اس دنیا کا حال ہے انشاء اللہ آخرت میں بغیر کیفیت اور بغیر جہت کے ہوگا۔ ان اسرائیلیوں پر یہ عتاب طلب دیدار کی وجہ سے نہ ہوا۔ اگر اس لئے ہوتا تو چاہیئے تھا کہ موسیٰ علیہ السلام پر بھی ہوتا۔ کیونکہ انہوں نے بھی اس کی خواہش کی تھی۔ **پانچواں اعتراض** موسیٰ علیہ السلام نے تمنا دیدار کی۔ وہ تو محبوب رہے اور ان اسرائیلیوں نے کی۔ تو یہ معتوب ہو گئے۔ وجہ فرق کیا ہے **جواب** موسیٰ علیہ السلام نے اشتیاق ملاقات اور شوقِ دیدار میں تمنا کی تھی۔ انہوں نے سرکشی اور عناد کی وجہ سے اور موسیٰ علیہ السلام پر بے اعتباری کرتے ہوئے۔ کہا تھا۔ کہ ہم آپ کی بات نہ مانیں گے۔ بلکہ خود دیکھ کر۔ یہ کفر ہوا اس وجہ سے وہ معتوب ہوئے۔ نیز انہوں نے کہا تھا۔ کہ رب کو صورت اور شکل میں ہم کو دکھاؤ جیسا کہ ہم جَھْرَۃً کی تفسیر میں لکھ چکے۔ اور رب شکل و صورت سے پاک ہے۔ اگر وہ یہ دو باتیں نہ کہتے۔ تو ہرگز خرابی میں نہ پڑتے **مسئلہ** اس دنیا میں رہ کر کوئی شخص بحالتِ بیداری ان آنکھوں سے رب کو نہیں دیکھ سکتا۔ ہمارے حضور علیہ السلام نے معراج کی رات رب کو دیکھا۔ مگر دوسری دنیا یعنی عالم امر میں پہنچ کر سارے مسلمان رب کا دیدار کریں گے۔ مگر آخرت میں نہ کہ اس دنیا میں۔ امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے رب کو سو بار دیکھا۔ مگر خواب میں۔ نہ کہ ان آنکھوں سے یہاں دیدار نہ ہونے میں چند حکمتیں ہیں **پہلی حکمت** یہ کہ اگر یہاں مسلمان رب کو دیکھ لیتے۔ تو کفار کہہ سکتے تھے ہم بھی دیکھ کر اس کی عبادت کرینگے اور اگر کفار کو بھی دکھایا جاتا۔ تو مسلمانوں کو ان پر کچھ فوقیت نہ رہتی۔ **دوسری حکمت** یہ ہے۔ کہ رب کے نزدیک غائبانہ محبت مقبول ہے۔ یہاں بغیر دیکھے اس سے محبت کرو۔ تاکہ یہ محبت اس کے دیدار کا ذریعہ بنے۔ کیونکہ دنیا کے سودے دیکھ کر خریدو مگر آخرت کے بغیر دیکھے **تیسری حکمت** یہ ہے۔ کہ اگر یہاں دیدار الٰہی ہوتا۔ تو دنیوی کاروبار سب ختم ہو جاتے۔ کیونکہ جو آنکھ اُسے دیکھ لیتی۔ وہ کسی اور کو نہ دیکھتی **چوتھی حکمت** یہ ہے۔ کہ اس کی قدر ہو۔ کیونکہ جو چیز مشکل سے ملتی ہے۔ اس کی قدر ہوتی ہے۔ **پانچویں حکمت** یہ ہے۔ کہ دنیا غیرت کی جگہ ہے۔ یہاں ہر عاشق چاہتا ہے۔ کہ نہ میں محبوب کے سوا کسی کو دیکھوں۔ اور نہ محبوب کو کوئی دیکھے۔ اور نہ خود وہ کسی کو دیکھے اس لئے سب کو تکلیف ہوتی کسی شاعر نے خوب کہا ہے **شعر**

نیناں میں جو آن بسو تو نیناں جھانپ ہی لوں ناہیں دیکھوں اور کو نا توے دیکھن دوں

آخرت میں چونکہ یہ حال نہ رہے گا۔ لہذا وہاں دیدار ہوگا **چھٹی حکمت** یہ ہے۔ کہ دنیوی آنکھ اتنی کمزور ہے۔ کہ سورج کے نور کی بھی تاب نہیں لاتی۔ تو خالق سورج کو کیا دیکھ سکے۔ حوران بہشتی اور فرشتے اسی لئے چھپا لئے گئے۔ کہ کسی آنکھ میں ان کے دیکھنے کی طاقت نہیں۔ ہاں اگر سورج پر ہلکے بادل کا غلاف آجائے یا اُس کا عکس پانی میں لے لیا جاوے۔ تو اُس کا دیدار ہو جاتا ہے۔ نیز چاند تاروں کے ذریعے سورج کا نور معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں اگر رب کا کمال دیکھنا ہے۔ تو مصطفےٰ کا جمال دیکھو۔ کیونکہ یہ جمال آئینۂ حق نما ہے۔ معراج کی رات موسیٰ علیہ السلام کے لئے قبول دعا کی رات تھی۔ کہ رَبِّ اَرِنِیْ والی دعا کا اثر آج ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ ان کو رب نے آئینۂ مصطفائی میں اپنا دیدار دکھایا اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تجلی گاہ رحمٰن کے درمیان بار بار حضور علیہ السلام کی آمد و رفت رہی **تفسیر صوفیانہ** اغیار کا یار کے دروازے پر آکر دیدار کیلئے شور مچانا اُس دربار کی بے ادبی ہے اور دوری اور شقاوت کا ذریعہ یہی قصور ان اسرائیلیوں سے ہوا تھا جس کی سزا میں ان کو موت دیدی گئی۔ مگر چونکہ یہ اس دروازے تک خود نہ گئے تھے۔ بلکہ یار کے بلائے ہوئے۔ اور اس کے مقبول بارگاہ کے ذریعے سے۔ اور بلانے والوں کو اپنے لانے کا پاس ہوتا ہے۔ اور بازو پکڑنے کی لاج اسی لئے موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا۔ کہ مولیٰ یہ ہیں تو بے ادب مگر میرے لائے ہوئے۔ اس لئے ان پر رحمت کی بارش ہوئی۔ اور بعد موت ان کو زندگی بھی عطا ہوئی اور جنت بھی۔ جیسا کہ روایت میں آتا ہے۔ کیونکہ غیرت والے کسی کو بلا کر گھر سے خالی نہیں پھیرتے کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے **شعر**

لج پال پریت کو توڑت ناہیں جو بانہہ پکڑیں سو چھوڑت ناہیں گھر آئے کو خالی موڑت ناہیں

اس بارگاہ میں واصل وہ ہوسکتا ہے۔ جو کسی کے ساتھ جائے۔ اور قرب حق کی منزلیں صبر سے طے کرے۔ زبان سے شور مچلے نہ اور اس کے گھر کے دروازے سے جائے۔ اور سوال و جواب میں ادب ملحوظ رکھے بنی اسرائیل کو ایک ہی بار مار کر زندہ کیا گیا لیکن طالب مولیٰ ہر آن مرتے اور زندہ ہوتے ہیں۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ

اور سایہ کیا ہم نے اوپر تمہارے ہلکے بادل سے اور اتارا ہم نے اوپر تمہارے من اور سلوے کو کھاؤ تم ستھری چیزوں میں سے وہ جو دی ہم نے تم کو

اور ہم نے ابر کو تمہارا سائبان کیا اور تم پر من و سلویٰ اتارا کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں

وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور نہ ظلم کیا انہوں نے ہم پر اور لیکن تھے وہ جانوں اپنی پر ظلم کرتے

اور انہوں نے ہمارا کچھ نہ بگاڑا۔ ہاں اپنی جانوں کو بگاڑتے تھے

**تعلق**۔ اس کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کی چھ نعمتیں بیان فرمائی گئیں۔ اب ساتویں نعمت کا ذکر ہے۔ دوسرے یہ کہ پچھلی آیتوں میں بنی اسرائیل کو قتل کر کے یا موت دے کر رحم فرمانے کا ذکر تھا اب انکو قید فرما کر کرم فرمانے کا ذکر ہوا تیسرے یہ کہ پہلی آیتوں میں بنی اسرائیل کی بت پرستی اور موسیٰ علیہ السلام کے انکار اور ان پر سزا اور پھر عفو خطا کا ذکر تھا۔ اور اب اُن کی نافرمانی اور رب کی پکڑ اور اُس سے نجات کا ذکر فرمایا جا رہا ہے یعنی پہلے سخت جرم اور ان کی سخت سزا یعنی موت اور بڑی عطاؤں کا ذکر ہوا۔ اور اب ان کے ہلکے جرم اور ہلکی سزا یعنی سزا قید اور رحم خسروانہ کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ **تفسیر** پچھلی ساری نعمتوں کو لفظ اِذْ سے شروع فرمایا گیا تھا مگر اس نعمت کو بغیر اِذْ۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ یہ پہلی نعمت ہی کا ایک جزء ہے مستقل دوسری نعمت نہیں یعنی ہم نے تم کو موت کے بعد زندہ کیا۔ اور پھر تم پر سایہ کیا دوسرے یہ کہ یہ نعمتیں یعنی ابر کا سایہ کرنا اور من و سلویٰ کا اتارنا اُس وقت عطا ہوئیں جبکہ ان کو مصر کی سرسبز زمین سے نکال کر بیابان جنگل میں قید کر دیا جیسے کہ بادشاہ کی طرف سے جیل خانے میں قیدیوں کو کھانا پانی اور مکان دیا جاتا ہے۔ کہ یہ چیزیں اگرچہ نعمتیں ہیں مگر بظاہر عذاب ہر شخص اس جیل خانے کے کھانے سے پناہ مانگتا ہے۔ لہذا چونکہ یہ نعمتیں ایک قسم کا عذاب بھی تھیں اس لئے یہاں اِذْ نہ فرمایا گیا۔ ظَلَّلْنَا ظِلٌّ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ سایہ۔ سایہ کی تین صورتیں ہیں۔ ایک تو آفتاب کا نہ ہونا۔ دوسرے ہونا مگر درخت و مکان وغیرہ زمینی چیزوں کی وجہ سے دھوپ کا ہم تک نہ پہنچنا تیسرے آسمانی چیزوں بادل وغیرہ کی وجہ سے زمین پر دھوپ کا نہ آسکنا۔ جنت کی نعمتوں میں فرمایا گیا۔ وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ یعنی دراز سایہ یہاں پہلی قسم کا سایہ مراد ہے کیونکہ وہاں آفتاب ہے ہی نہیں۔ وہ جو روایت میں آتا ہے۔ کہ درخت طوبیٰ کے سایہ میں سو برس تک سوار دوڑ سکتا ہے۔ اس سایہ سے مراد اسکے نیچے کی زمین ہے کہ اگر آفتاب ہوتا۔ تو وہاں تک سایہ ہوتا۔ اس آیت میں تیسری قسم کا سایہ مراد ہے یعنی بادل کی وجہ سے دھوپ کا میدان میں نہ آنا۔ تو آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ بذریعہ بادل کے تم پر سایہ کیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ یہ ظُلَّةٌ سے بنا ہو جس کے معنی ہیں۔ سائبان یا شامیانہ یعنی ہم نے تم پر بادل کو شامیانہ بنا دیا عَلَيْكُمْ اس سے سارے بنی اسرائیل مراد ہیں نہ کہ صرف وہ ستر جو طور پر مار کر زندہ کئے گئے کیونکہ یہ سایہ ان پر ہوا جو کہ مصر سے نکل کر شام کی طرف جہاد کے لئے بھیجے گئے۔ اور پھر ایک نافرمانی کی وجہ سے جنگل میں قید کر دیئے گئے جس کا پورا قصہ انشاء اللہ خلاصہ تفسیر میں آئیگا۔ اَلْغَمَامَ یہ لفظ غَمٌّ سے بنا ہے جسکے معنی ہیں۔ ڈھانپنا رنج کو بھی اسی لئے غم کہتے ہیں۔ کہ وہ دل پر چھا جاتا ہے۔ اور اسکو ڈھانپ لیتا ہے یہاں اس سے سفید باریک اور ٹھنڈا بادل مراد ہے جسکی وجہ سے وہ آفتاب کی دھوپ سے بچ جائیں اور نہ برسے کہ بھیگنا نہ ہو۔ اسکی وجہ سے وہ میدان ان کے لئے ایک مکان سا بن گیا۔ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ چونکہ وہ کھانے

کے حاجتمند تھے۔ اسلئے ان پر مَنّ اتارا گیا۔ مَنّ کے لغوی معنی ہیں۔ احسان اور جو چیز بغیر مشقت کے حاصل ہو جائے۔ وہ مَن کہلاتی ہے۔ کیونکہ وہ محض اللہ کے فضل سے ملی۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے۔ کہ کماۃ (یعنی کھنبی جو کہ بارش میں گلی ہوئی لکڑی سے چھتری کی طرح نکلتی ہے) مَن میں سے ہے۔ اور اس کا پانی آنکھوں کیلئے شفا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ بنی اسرائیل پر اسی قسم کا مَنّ اترا تھا۔ بلکہ یہ مطلب ہے۔ کہ بغیر مشقت ہم کو مل گئی۔ اس معنی سے جھربیری کے بیر اور تمام خودرو درختوں کے پھل مَن میں داخل ہیں طبیبوں کی اصطلاح میں مَن وہ شبنم ہے جو کہ درخت یا پتھر پر گرے۔ اور اس میں مزہ اور مزاج ہو جیسے کہ ترنجبین اور شیر خشت اور گز انگبین اور بید انگبین چونکہ بنی اسرائیل پر بھی شبنم گر کر جم جاتی تھی۔ اسلئے اسکو مَنّ فرمایا۔ اس میدان میں صبح صادق سے آفتاب نکلنے تک ایک شبنم گرتی تھی۔ جو کہ جم کر برف کی طرح سفید اور لذت میں گھی اور شہد کی معجون کی طرح ہوتی تھی۔ یہ لوگ اپنی چادروں اور کپڑوں پر اسکو جمع کر لیتے اور اُس پر گزارہ کرتے سَلویٰ ایک دریائی پرندے کا نام ہے جس کا قد چھوٹے مرغ کے برابر ہوتا ہے۔ اُس کا گوشت نہائت لذیذ اور زود ہضم ہے۔ طبیبوں کی اصطلاح میں اس کو قتیل الرعد کہتے ہیں کیونکہ یہ بادل کی گرج سُن کر مر جاتا ہے۔ اسکا عربی میں دوسرا نام سمانے اور فارسی میں ادھی ہے اسکا پاخانہ چڑیا کے پاخانہ کے مشابہ ہوتا ہے۔ اسکا پتہ مرگی کیواسطے مفید ہے۔ اور اس کا خون کان کے درد کو دور کرتا ہے۔ اس کے ہمیشہ کھانے سے دل نرم ہوتا ہے۔ اور یہ مصر اور حبشہ کے علاقہ میں کھاری سمندر کے پاس زیادہ پایا جاتا ہے۔ روزانہ شام کیوقت اِن پرندوں کو ہوا اُڑا کر لاتی تھی۔ اور یہ شکار کر کے اُنکے کباب کھاتے تھے۔ **كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ** اُس میدان میں ان بے محنت نعمتوں کا ان کے ذمہ صرف یہ شکر واجب کیا گیا۔ کہ یہ مَن سلویٰ روز کا روز کھا لو۔ کل کیلئے جمع نہ رکھو۔ کیونکہ نیا روز اور نئی روزی ہوگی۔ ہاں چونکہ ہفتہ کے دن مَن سلویٰ نہ آئیگا۔ اس لئے جمعہ کے دن ایک دن کا جمع کر لو۔ اس جملہ کا یہی مقصود ہے۔ طَيِّبَاتٌ جمع طَيِّبَةٌ کی ہے طیبہ وہ حلال چیز ہے۔ جو طبیعت کو مرغوب ہو۔ جو چیز حلال تو ہو۔ مگر مرغوب نہ ہو۔ وہ طیبہ نہ کہلائیگی۔ جیسے کہ طلاق اسی لئے اسکو ابغض المباحات کہتے ہیں جو مرغوب ہو۔ مگر حلال نہ ہو۔ وہ بھی طیب نہیں جیسے زنا وغیرہ بلکہ خبیث ہے **رَزَقْنَا** میں ادھر اشارہ ہے۔ کہ ہم نے بغیر تمہارے کسب کے یہ چیزیں عطا فرمائیں۔ لہٰذا ان کی قدر کرو۔ **وَمَا ظَلَمُونَا** ان لوگوں نے اس پر عمل نہ کیا۔ بلکہ بے صبری کی وجہ سے جمع کر رکھا۔ نیز موسےٰ علیہ السلام سے شکایت بھی کی۔ کہ ہم سے روزانہ ایک غذا نہیں کھائی جاتی ہمیں تو زمینی خوراکیں چاہئیں۔ جیسے کہ گیہوں، مسور، ککڑی، پیاز، لہسن وغیرہ اس ناشکری سے انہوں نے ہمارا کچھ نہ بگاڑا۔ کیونکہ ہماری کسی شان میں فرق نہ آیا۔ **وَلَكِنْ كَانُوا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ**۔ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ اور اپنا ہی کھو بیٹھے۔ کیونکہ انہوں نے وہ روزی کھو دی جس پر نہ دنیا میں محنت تھی نہ آخرت میں حساب اور اپنی قابلیتِ فیض بھی کھو بیٹھے۔ اگر یہ لوگ یہ حرکتیں نہ کرتے تو ہمیشہ ان کو یہ نعمتیں ملتی رہتیں۔ اب محنت سے کمائیں گے اور آخرت میں حساب بھی دیں گے۔

**خلاصہ تفسیر** اے بنی اسرائیل تم اس نعمت کو بھی تو یاد کرو جبکہ تم مصر سے جہاد کرنے کیلئے ملک شام کیطرف روانہ کئے گئے۔ اور ایک نافرمانی کی وجہ سے مقام تیہ میں قید کر دیئے گئے۔ جو کہ سخت گرم اور آب و دانہ سے خالی تھا۔ اگر وہاں تم پر ہمارا فضل نہ ہوتا۔ تو تم وہاں ہی بھوک پیاس سے جل بھن کر ختم ہو جاتے۔ لیکن ہم نے وہاں بھی تمہاری دستگیری فرمائی۔ کہ تم پر ہلکے بادل کا سایہ کیا۔ اور لذیذ مزے دار حلوا اور کباب تمہیں بغیر مشقت عطا فرمایا تم سے صرف اتنا کہا گیا۔ کہ خدا پر توکل سے کھانا آج کا رزق کل کے لئے جمع نہ کرنا۔ مگر تم سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ تم نے وہاں بھی ہم پر توکل نہ کیا اور جمع کر کے اپنے رزق کو بند کر لیا۔ غور تو کرو۔ اس میں ہمارا کیا بگڑا۔ تم نے اپنا ہی بگاڑ لیا۔ مولانا فرماتے ہیں۔ سالہا خوردی و کم نامد ز خور ۔۔ ترک مستقبل کن و ماضی نگر بے صبرا آئندہ کو دیکھتا ہے۔ کہ میں کیا کھاؤں گا۔ صابر بندہ گذشتہ کو دیکھ کر کہتا ہے۔ کہ جس نے مجھے پہلے کھلایا تھا۔ وہ آئندہ بھی کھلائے گا۔

**بنی اسرائیل پر من و سلویٰ کا اترنا** جب موسیٰ علیہ السلام ان ستر اسرائیلیوں کو زندہ کرا کے مصر میں لے گئے۔ تو سارے اسرائیلیوں کو حکم الٰہی پہنچا۔ کہ مصر سے روانہ ہو کر ملک شام کی طرف چلو۔ کیونکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کا مدفن ہے اور وہاں ہی بیت المقدس ہے تھی جس پر ایک ظالم اور سخت قوم عمالقہ نے قبضہ کر رکھا ہے۔ ان سے جہاد کر کے اس ملک سے ان کو نکالو۔ اور وہاں ہی آباد ہو جاؤ۔ جیسے کہ تم نے مصر کو فرعونیوں سے پاک کر دیا۔ اس حکم میں راز یہ تھا۔ کہ بنی اسرائیل ملک مصر میں فرعونیوں کے عیش و آرام دیکھ چکے تھے

اور اب سارے مصر کے مالک ہو گئے۔ اندیشہ تھا کہ یہ بھی فرعونیوں کی طرح عیش و آرام میں پھنس کر اللہ کی عبادت بھول جائینگے۔ نیز فرعون کہا کرتا تھا کہ موسیٰ اور ہارون علیہ السلام صرف یہ چاہتے ہیں کہ مجھ کو مصر سے نکال کر بنی اسرائیل کو یہاں کا مالک بنادیں۔ اگر اسرائیلی وہاں ہی رہتے۔ تو دوسرے لوگ کہتے۔ کہ فرعون کا خیال صحیح تھا۔ صرف ملک گیری کے خیال سے یہ سب کچھ کیا گیا تھا۔ اور یہ تمام باتیں دنیا حاصل کرنیکے بہانے تھے۔ اسلئے حکم دیا گیا۔ کہ اس جگہ کو چھوڑو۔ اور فی سبیل اللہ جہاد کر کے شام کی مقدس زمین کو دشمنانِ دین سے خالی کرالو۔ بنی اسرائیل مصر کی زمین سے بہت راضی تھے۔ کیونکہ بغیر مشقت ثمرۂ تر ان کو ہاتھ آگیا تھا۔ اسلئے ان کو وہاں سے نکلنا بہت شاق گزرا۔ چار ناچار روانہ تو ہو گئے۔ لیکن بات بات کی موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کرتے تھے۔ اور زبان درازی کر کے ان کو تنگ کرتے تھے۔ جب مصر اور شام کے درمیان بے آب و دانہ اور سخت گرم میدان میں پہنچے جس کا نام تیہ ہے اور انہیں خبر لگی۔ کہ جن عمالقہ قوم سے ہم جنگ کرنے جا رہے ہیں۔ وہ سخت جنگجو اور بہادر ہے۔ ان کے جسم تقریباً سات سات گز کے ہیں۔ تو جنگ سے ہمت ہار بیٹھے اور موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا۔ کہ آپ اپنے رب کے ساتھ جاکر ان سے جنگ کریں ہم تو یہیں رہیں گے۔ رب نے ان کو یہاں ہی چالیس سال کیلئے قید کر دیا۔ یہ میدان تیہ صرف بارہ کوس میں تھا۔ لیکن وہ اس میں ہی حیران و پریشان پھرے۔ اور یہاں سے نکل نہ سکے۔ اسی لئے اسکو تیہ کہتے ہیں جس کے معنی ہیں حیرانی (تفسیر روح البیان) اب ان کا انتظام یہ کیا گیا۔ کہ دن میں سفید ہلکا بادل ان پر سایہ کر کے انہیں گرمی سے بچاتا تھا۔ اور اندھیری رات میں ایک نوری ستون اترتا تھا جس کی روشنی میں یہ اپنا کام کاج کرتے تھے اور آفتاب نکلنے سے پیشتر نہایت لذیذ حلوا برس جاتا تھا یعنی من جو کہ ہر شخص کو روزانہ ایک صاع یعنی تقریباً چار سیر ملتا تھا۔ جو کہ ان کو دن بھر کیلئے بخوبی کافی ہوتا۔ اور جمعہ کے دن دگنا برستا۔ تاکہ ہفتہ کے دن بھی کام آئے۔ یہ لوگ شیرینی سے گھبرا گئے۔ اور نمکین چیز کا موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا چنانچہ روزانہ عصر کے بعد ان کیلئے نفیس کبابوں کا انتظام کیا گیا یعنی سلویٰ جیسا کہ ہم تفسیر میں عرض کر چکے۔ لیکن اس میں پابندی یہ تھی۔ کہ روز کے روز کھالو کل کیلئے جمع نہ کرو۔ اب بھی جس کسی بزرگ کو دست غیب ہوتا ہے۔ اس میں بھی یہی پابندی ہے۔ اور جمع کرنے سے بند ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں توکل تام شرط ہے۔ ان لوگوں سے صبر نہ ہوا۔ اور انہوں نے کل کیلئے رکھ چھوڑا جس کا انجام یہ ہوا۔ کہ وہ کباب سڑنے لگے اور اسکی بو سے لوگوں کو تکلیف ہونے لگی۔ اور اس کا آنا بند ہو گیا (تفسیر عزیزی) خیال رہے کہ اس کے پہلے گوشت کبھی نہ سڑتا تھا حدیث شریف میں ہے۔ کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو کھانا نہ سڑا کرتا۔ اور اگر حوا کی خیانت (یعنی حضرت آدم کو گندم کھلا دینا) نہ ہوتی۔ تو کوئی بھی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی۔ اس زمانہ میں اسرائیلیوں کے نہ بال بڑھتے تھے اور نہ ناخن تاکہ حجامت کی ضرورت ہی نہ پڑے اور نہ کپڑے میلے ہوتے نہ پھٹتے۔ تاکہ دھوبی یا درزی کی ضرورت نہ پڑے اور جو بچے پیدا ہوتے تھے۔ ان کے جسم پر قدرتی لباس ہوتا تھا۔ جو کہ کھال کی طرح جسم کے ساتھ بڑھتا تھا۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** یہ کہ نافرمانی سے عذاب الٰہی آتا ہے۔ جیسے کہ بنی اسرائیل نافرمانی کی وجہ سے قید کر دیئے گئے **دوسرا فائدہ** یہ کہ جب رب تعالیٰ کوئی مصیبت بھیجتا ہے۔ تو ساتھ ہی اس کا علاج بھی۔ جیسے کہ بنی اسرائیل پر میدان تیہ میں بادل اور من و سلویٰ اتارا **تیسرا فائدہ** یہ کہ بے صبری سے نعمت چھن جاتی ہے۔ جیسے کہ بنی اسرائیل سے من سلویٰ کی نعمت چھن گئی **چوتھا فائدہ** یہ کہ سڑا ہوا کھانا حرام ہے۔ نیز تندرستی کیلئے مضر کیونکہ سلویٰ طیب یعنی حلال اور مرغوب چیز تھی۔ ان کی نافرمانی سے اسے غیر طیب بنا دیا گیا۔ **مسئلہ** سڑا ہوا طعام حرام ہے لیکن سڑا ہوا دودھ اور تیل اور گھی حلال (الاشباہ والنظائر و روح البیان) **پانچواں فائدہ**۔ گناہ سے انسان اپنا نقصان کرتا ہے۔ نہ کہ رب اور انبیاء کرام کا ان حضرات کا کرم ہے۔ کہ ہمارے نقصان سے رنج کرتے ہیں جس سے لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ ہماری اطاعت سے کچھ ان کا فائدہ ہے۔ اور ہماری نافرمانی سے ان کا نقصان **چھٹا فائدہ** جو چیز آرام سے ملتی ہے۔ اُس کی قدر نہیں ہوتی۔ جیسے کہ بنی اسرائیل کو من اور سلویٰ کی قدر نہ ہوئی۔ آج ہم کو دین کے مقابلہ میں دنیا کی زیادہ قدر ہے۔ اور ہمارے بزرگوں کو دین کی قدر تھی۔ کیونکہ دین انہوں نے کمایا تھا۔ اور دنیا ہم نے ایک شخص قیمتی چادر سے اپنے پھٹے ہوئے جوتے جھاڑ رہا تھا لوگوں نے کہا یہ کیا۔ اس نے کہا جوتے میری اپنی کمائی کے ہیں۔ اور چادر میرے باپ کی کمائی جو میں نے

میراث سے پائی یہی حال ہمارا ہے۔ ساتواں فائدہ مفت خور قوم میں اولوالعزمی، غیرت، جفاکشی نہیں رہتی۔ آرام طلبی آجاتی ہے فسق و فجور اور کاہلی ان کا شیوہ ہو جاتا ہے۔ اسلئے وہ جفاکش قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور آخر وہ ان کا شکار بن جاتی ہے۔ اسیلئے رب تعالیٰ محنت سے رزق عطا فرماتا ہے اسلام نے جفاکشی کا حکم دیا۔ ہمیشہ آرام طلب امیر قوم جفاکش سپاہی قوم کی غلام بن جاتی ہے **پہلا اعتراض** آسمان سے حلوے کا مینہ برسنا عقل کے خلاف ہے۔ یہ تو ان بچوں کی سی کہانی ہے جو کہا کرتے تھے کہ کھیلوں بتاشوں کا مینہ برستا ہے (عام نیچری طبقہ قرآن کا مذاق) **جواب** معترض دنیوی موجودہ حالات سے بھی بے خبر ہے۔ اب بھی روزانہ بہت سی چیزیں شبنم اور بارش کے ذریعے سے بنتی ہیں۔ برفانی علاقہ میں جو برف کی سلیں زمین پر جم جاتی ہیں۔ یہ جمی ہوئی شبنم ہی تو ہے۔ اسی طرح ترنجبین، خشک انجبین، شیر خشت اور گز انگبین اور بید انگبین یہ سب جمی ہوئی شبنمیں ہیں بعض پتھروں پر شبنم جم کر شیر خشت بن جاتی ہے۔ اور بعض درختوں پر جم کر ترنجبین وغیرہ قیمتی موتی بارش کا جما ہوا قطرہ ہی تو ہے۔ جو کہ سیپ میں جم کر موتی کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ اور حضرت خود آپ اور آپ کی یہ بیہودہ زبان جما ہوا منی کا قطرہ ہی تو ہے جو ماں کے رحم میں جم کر بے وقوف نیچری کی شکل میں آ گیا۔ جو مولیٰ پانی اور شبنم کو جما کر اتنی چیزیں بنا دے۔ اگر وہ تیہ کی زمین میں یہ تاثیر پیدا کر دے۔ کہ وہاں شبنم گر کے حلوا بن جائے۔ تو کون سی بعید بات ہے **دوسرا اعتراض**۔ اگر تیہ کی زمین میں شبنم کو حلوا بنا دینے کی تاثیر تھی۔ تو پھر کیوں نہ رہی **جواب**: تاثیر رب قدیر کے حکم سے ہوتی ہے۔ اگر نیچری صاحب کی والدہ کے رحم میں منی کو جما کر بچہ بنانے کی تاثیر تھی تو بڑھاپے میں وہ تاثیر کیوں نہ رہی یہ اعتراض نہیں بلکہ مجنون کی بڑ ہے۔

**تفسیر صوفیانہ**۔ جب رب تعالیٰ نے ان کو غربت کے کوڑے سے ادب دیا۔ تو عین کربت کی حالت میں رحمت سے ان کی دستگیری فرمائی کیونکہ جس مصیبت میں رب مبتلا کرتا ہے۔ تو مدد بھی کرتا ہے۔ اور جس میں بندہ خود پھنستا ہے۔ تو رب کی طرف سے اس کو امداد نہیں ہوتی۔ روح انسانی عالم ارواح میں عیش و عشرت کے مصر میں آباد تھی۔ رب کی طرف سے ان کو دنیا کے میدان تیہ میں پھنسایا گیا۔ تو ان پر رحمتوں کی بارش بھیجی گئی۔ رزق کا انتظام کیا گیا۔ اور آسمان نبوت سے ان پر تقوے کا من و سلویٰ برسایا گیا جن لوگوں نے اس پر کفایت نہ کی اور حرص و ہوا کے شہر میں متاع دنیوی کی تلاش میں نافرمانی کرتے ہوئے داخل ہو گئے۔ پھر جو ان پر مصیبت بھیجی گئی۔ اس میں کوئی بھی امداد نہ کی گئی۔ کیونکہ یہ اس میں خود داخل ہوئے تھے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا

اور جبکہ فرمایا ہم نے گھس جاؤ تم | اس | بستی میں | پس کھاؤ تم | اس سے | جہاں کہیں | چاہو تم | وسیع | اور | داخل ہو تم

اور جب ہم نے فرمایا اس بستی میں جاؤ۔ پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک کھاؤ اور

الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

دروازے میں | سجدہ کرتے ہوئے | اور کہو تم | معافی | بخش دیں گے ہم | واسطے تمہارے | خطائیں تمہاری | اور عنقریب زیادہ دینگے ہم | نیک کاروں کو

دروازہ میں سجدہ کرتے داخل ہو۔ اور کہو ہمارے گناہ معاف ہوں ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے۔ اور قریب ہے نیکی والوں کو اور زیادہ دیں۔

**تعلق**۔ اس آیت کا گذشتہ آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کی سات نعمتوں کا ذکر ہوا۔ اب آٹھویں نعمت کا ذکر ہو رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ پہلی آیت میں ان کے مقام تیہ میں قید ہونیکا ذکر تھا۔ اب قید سے چھوٹنے کا تیسرے یہ کہ اس سے پہلے قدرتی غذا من و سلویٰ کے عطا فرمانے کا ذکر ہوا۔ اب انکو شہر میں پہنچا کر ہر قسم کی نعمتیں دینے کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ من و سلویٰ بھی بغیر محنت ہی ملا تھا۔ اور اس شہر کی نعمتیں بھی اسیطرح۔ کیونکہ قوم عمالقہ جمع کر گئے تھے۔ اور اسرائیلیوں نے اسکو استعمال کیا چوتھے یہ کہ اس سے پہلے غذا جسمانی یعنی من و سلویٰ کا ذکر ہوا اب غذاء روحانی یعنی توبہ اور مغفرت اور دیگر انعامات الٰہیہ کا۔ **تفسیر وَاِذْ قُلْنَا** یہاں بھی ایک فعل پوشیدہ ہے یعنی اے اسرائیلیو اس نعمت کو بھی یاد کرو۔ یا اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں وہ نعمت بھی یاد دلاؤ جب کہ ہم نے ان کے باپ دادوں سے تیہ سے نکلتے وقت کہا۔ کہ اُدْخُلُوْا

ظاہر یہ ہے کہ یہ امر وجوب کیلئے ہے جس سے کہ بنی اسرائیل پر اس شہر میں جانا واجب ہوگیا یعنی اے اسرائیلیو اس میدان سے نکلکر اس بستی میں جاؤ نہ کسی اور جگہ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ امر اباحت کا کہ اب تک تم اس جنگل میں قید تھے اب اس بستی میں جاسکتے ہو۔ هٰذِهِ الْقَرْيَةَ جس بستی میں انکو بھیجنا منظور تھا وہ انکو دکھادی گئی کہ وہ بستی جو تم کو نظر آرہی ہے اس میں چلے جاؤ۔ اسلئے ہٰذہٖ فرمایا گیا قَرْيَةَ قری سے بنا ہے جسکے معنی ہیں جمع ہونا اسلئے مہمانی کے کھانیکو قری کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ مجمع میں کھایا جاتا ہے۔ بستی کو قریہ اس لئے کہتے ہیں۔ کہ وہاں مختلف قسم کے لوگ جمع ہوکر رہتے ہیں۔ قریہ گاؤں اور شہر دونوں کو بولا جاتا ہے۔ اس میں اختلاف ہے۔ کہ یہ کون سی بستی تھی بعض علماء نے فرمایا۔ کہ یہ بیت المقدس شہر تھا۔ اس صورت میں یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کے وفات کے بعد کا ہوگا۔ اور اس وقت اسرائیلیوں کے قید کا زمانہ ختم ہوچکا۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے تیہ میں ہی وفات پائی ہے۔ ان کے بعد یوشع علیہ السلام بنی اسرائیل کے حاکم ہوئے۔ اور آپ ہی ان کو نکال کر بیت المقدس میں لیگئے۔ اس صورت میں اعتراض یہ پڑیگا۔ کہ آئندہ آیت میں پھر تیہ کا ہی ذکر آرہا ہے۔ تو اگر یہ واقعہ تیہ سے نکلنے کا ہے تو واقعات کے بیان میں بے ترتیبی ہوگئی۔ لیکن اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں۔ اس لئے کہ ان حکایتوں میں فقط نعمتوں کا شمار کرانا منظور ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ اس بستی سے اریحا مراد ہے۔ یہ بیت المقدس کے پاس ایک گاؤں تھا جسمیں قوم عمالقہ رہتی تھی۔ اور لشکر بنی اسرائیل کے خوف سے اس گاؤں کو خالی کر کے چلے گئے تھے۔ اور اس میں غلہ اور میوے بے شمار چھوڑ گئے تھے۔ اس صورت میں یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی شریف کا ہی ہے۔ اور یہ زمانہ تیہ میں قید ہونے کا ہی زمانہ ہے۔ تو گویا بنی اسرائیل کی اس قید کے دو حصے ہیں۔ ایک جنگل میں رہنے کا زمانہ اور دوسرے اس بستی میں جنگل میں رہ کر ان پر من وسلویٰ آیا۔ اور یہاں رہ کر قسم قسم کی نعمتیں ملیں۔ اس صورت میں ساری آیتوں کے مضمون ترتیب وار ہوجائیں گے۔ فَكُلُوا مِنْهَا بنی اسرائیل کو اس بستی کی ساری نعمتیں استعمال کرنیکا حق تھا۔ کہ وہاں کی غذائیں کھاؤ لباس پہنو مکانات میں رہو تمہارے واسطے سب چیزیں حلال ہیں۔ لیکن چونکہ کھانا سب سے بڑھ کر نعمت ہے۔ اسی لئے اس کا ذکر کیا گیا۔ حَيْثُ شِئْتُمْ اس میں یہ بتایا گیا۔ کہ وہاں تم پر مقام تیہ کی سی پابندی نہ ہوگی۔ اور نہ وہ جگہ تمہارے واسطے سخت جیل ہوگی۔ بلکہ تم کو اختیار ہوگا۔ کہ وہاں ہی رہ کر نعمتیں کھاؤ۔ یا باہر لے جاکر رَغَدًا اس کے معنی ہم آدم علیہ السلام کے قصہ میں بیان کرچکے ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہے۔ کہ یہاں تم پر من سلویٰ کی سی پابندی نہ ہوگی۔ بلکہ تمہارے لئے عام اجازت ہوگی۔ نیز یہ نہ سمجھنا کہ یہ غذائیں بقدر ضرورت کھانا جائز ہیں۔ جیسے کہ مجبور آدمی کے لئے حرام غذا۔ بلکہ خوب سیر ہوکر کھاؤ پیؤ۔ اور چین کرو خیال رہے۔ کہ یہ امر اباحت کیلئے ہے۔ وَادْخُلُوا الْبَابَ۔ اب اُس شہر کے آداب کا ذکر فرمایا گیا۔ کہ تم کو وہاں جانے کی اجازت تو ہے مگر شرط یہ ہے۔ کہ شہر کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا بعض علماء نے فرمایا ہے۔ کہ اس سے بیت المقدس شریف کا دوسرا دروازہ مراد ہے۔ جو آج بھی موجود ہے جس کا نام باب حطہ یا باب القبہ ہے۔ اب بھی جو شخص اُس مسجد میں آتا ہے۔ اسی دروازے سے آتا ہے۔ اور عام مسلمان اسکی زیارت کرتے ہیں۔ اور اس دروازے سے داخل ہونے کو مغفرت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جیسے کے مسجد نبوی شریف میں ستون ابولبابہ کے پاس کھڑے ہوکر لوگ توبہ کرتے ہیں یا ہمارے ہندوستان میں پاک پٹن شریف میں بہشتی دروازے سے لوگ داخل ہوتے ہیں بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ اس دروازے سے اس بستی کا دروازہ مراد ہے۔ کیونکہ بیت المقدس کی مسجد اور باب حطہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بنا موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں نہ یہ مسجد تھی۔ اور نہ یہ باب حطہ۔ پھر اُس دروازے سے داخل ہونے کے کیا معنی۔ مگر یہ ہوسکتا ہے۔ کہ جس جگہ سے بنی اسرائیل داخل ہوئے ہوں۔ وہاں ہی حضرت سلیمان نے باب حطہ بنایا ہو۔ یا اس دروازے کو اسلئے حطہ کہا گیا ہو۔ کہ یہ خاصیت میں اُس دروازے کیطرح ہے۔ جہاں سے بنی اسرائیل داخل ہوئے تھے۔ سُجَّدًا سجدے کے لغوی معنی ہیں جھکنا۔ اور شرعی معنی ہیں سر زمین پر رکھنا۔ اگر یہاں لغوی معنی مراد ہوں۔ تو آیت کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ تم اپنی فتح اور بہادری پر اتراتے ہوئے اکڑ کر مت جانا۔ بلکہ عاجزی کرتے ہوئے اور جھکے ہوئے داخل ہونا۔ کیونکہ یہ پیغمبروں کا شہر ہے۔ یہاں تو فرشتے بھی جھک کر ادب سے آتے ہیں یہ جگہ اکڑنے کی نہیں ہے۔ اور اگر شرعی معنی مراد ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ داخل ہوتے وقت شکر کے سجدے کرلینا۔ کہ خدا تعالیٰ نے تم کو اس قید سے آزاد کیا۔ اور تمہارے

دشمنوں کو یہاں سے بھگا دیا۔ اور تم کو اس مقدس شہر میں داخل ہونے کی توفیق عطا فرمائی کیونکہ انسان سجدہ کرتے ہوئے نہیں چل سکتا۔ **وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ** اور
اے اسرائیلیو صرف بدنی عبادت کرنے پر ہی کفایت نہ کرنا بلکہ وہاں داخل ہوتے وقت اپنی زبان سے کہنا خدایا ہمارے گناہ معاف کر دے یعنی وہاں شیخی
مارتے ہوئے مت جانا۔ بلکہ بدنی عمل کے ساتھ قلبی اور زبانی شرمندگی بھی ظاہر کرنا **حِطَّةٌ** عربی لفظ ہے جسکے معنی ہیں گرا دینا یا دور کر دینا۔ یا تو بنی اسرائیل
کو یہ لفظ ہی سکھایا گیا تھا۔ کہ تم عربی زبان میں توبہ کرتے ہوئے جانا۔ یا اسکا ہم معنی عبرانی لفظ انکو بتایا گیا تھا جس کا عربی ترجمہ قرآن پاک نے نقل فرمایا تفسیر کبیر
نے فرمایا کہ اس کے معنی اترنے اور رہنے کے بھی ہیں۔ اب یہ مطلب ہوا خداوندا ہم اس گاؤں میں رہیں گے۔ **نَّغْفِرْ لَكُمْ** نَغْفِرُ غفرٌ سے بنا ہے
جسکے معنی ہیں چھپانا چھپانا۔ خود کو اسی لئے مغفر کہتے ہیں۔ کہ وہ سر کو چھپائے ہوتا ہے۔ یہاں مراد ہے بخشنا اور معاف کرنا۔ کیونکہ بخشش سے گناہ چھپ جاتا ہے
یا بخشا ہوا گنہگار رحمت الٰہی میں چھپ جاتا ہے۔ یعنی اے اسرائیلیو اگر تم نے اس پر عمل کر لیا۔ تو ہم تمہاری خطائیں معاف کریں گے **خَطٰیٰكُمْ** خطایا
خطیئۃ کی جمع ہے۔ جسکے معنی ہے غلطی خواہ بھول سے ہو یا جان بوجھ کر یعنی ہم تمہارے سارے گناہ معاف کر دیں گے۔ **وَسَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ**
مُحْسِنِیْن احسان سے بنا ہے۔ جسکے معنی ہیں۔ اچھے کام کرنا۔ اصطلاح میں محسن وہ شخص ہے جس کے عقائد اور اعمال اچھے ہوں۔ یا وہ جو اچھے کام کرے
اور برائیوں سے بچے۔ یا وہ جو ایسے کام کرے۔ جو شرعاً اور عقلاً بہتر ہوں۔ چونکہ ان بنی اسرائیل میں انبیاء کرام بھی تھے جو کہ خطاؤں اور گناہوں سے معصوم
ہیں۔ اسلئے فرمایا گیا کہ اس شہر میں داخلے کیوقت ہر شخص حِطَّۃٌ کہے۔ اسکی برکت سے گناہگاروں کے تو گناہ معاف ہو جاویں گے اور معصوموں کے
درجے بلند ہونگے یعنی ایک ہی لفظ دو قسم کی جماعتوں کیلئے علیحدہ علیحدہ فائدہ دیگا کیونکہ جو کام گنہگاروں کے گناہ معاف کراتا ہے۔ وہ نیک کاروں کے
درجے بڑھاتا ہے۔ نَزِیْدُ کا دوسرا مفعول چھپا ہوا ہے یعنی ہم محسنین کا ثواب یا درجے بڑھائینگے **خلاصہ تفسیر**۔ اے بنی اسرائیل ہماری اس نعمت
کو بھی یاد کرو جبکہ تم مقام تیہ میں قید کر دیئے گئے۔ اور وہاں تم ایک معین غذا کھاتے کھاتے گھبرا گئے۔ اور اس جگہ رہنے سے تم اکتا بھی گئے۔ اور تم
نے موسیٰ علیہ السلام سے اپنی مصیبت بیان کی۔ تو ہم نے تم پر یہ کرم فرمایا۔ کہ تمہارے دشمن قوم عمالقہ جو کہ بیت المقدس یا اریحا میں آباد تھی۔ اس کے
دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیا۔ کہ وہ بہادر قوم تم کمزوروں سے ڈر کر بغیر لڑے بھڑے شہر خالی کر گئی۔ اور پھر ہم نے تم سے کہا۔ کہ جاؤ۔ وہ شہر تمہارے
واسطے خالی ہے۔ تمہارے دشمن جو نعمتیں وہاں چھوڑ گئے ہیں۔ تم جا کر اپنے استعمال میں لاؤ۔ مگر تم پر صرف دو پابندیاں لگائیں۔ ایک یہ کہ اس شہر کے
دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے جھکے ہوئے عاجزی کرتے ہوئے داخل ہونا۔ اور دوسرے یہ کہ اس داخلے کیوقت تمہاری زبان پہ کوئی فخریہ کلمہ نہ ہو۔
بلکہ ہم سے معافی چاہتے ہوئے جاؤ جس سے کہ ہم گنہگاروں کی خطائیں معاف کر دینگے۔ اور نیک کاروں کے درجے بڑھا دینگے **فائدے**۔ اس آیت
سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** یہ کہ اگرچہ توبہ کی حقیقت یہ ہے۔ کہ انسان گذشتہ جرم پر نادم ہو۔ اور آئندہ ہمیشہ بچنے کا عہد کرے۔
لیکن اسکے ساتھ ہی ساتھ زبان سے توبہ کے کلمے بولنا اور اس وقت کوئی نیک کام کرنا بھی چاہیئے۔ جیسے کہ بنی اسرائیل سے سجدہ بھی کرایا گیا۔ اور
حِطَّۃٌ بھی کہلوایا گیا۔ اسی لئے رب ہی حکم ہے۔ کہ توبہ کے وقت نماز توبہ اور صدقہ و خیرات ادا کرے۔ کیونکہ یہ توبہ کی قبولیت کا ذریعہ ہیں۔ **دوسرا فائدہ**
یہ کہ توبہ گناہ کے مطابق ہونی چاہیئے۔ یعنی چھپے گناہ کی چھپی توبہ اور ظاہر گناہ کی ظاہر توبہ جیسے کہ یہاں بنی اسرائیل کو علانیہ توبہ کا حکم دیا گیا۔ تاکہ جس کو ہمارے
گناہ کی خبر ہوئی ہے اسکو ہماری توبہ کی بھی خبر ہو جاوے۔ بلکہ بہتر یہ ہے۔ کہ اپنی توبہ پر متقی اور پرہیزگاروں کو گواہ بنا لے۔ اسیطرح جو شخص بد مذہبی
سے توبہ کرے۔ اسکو چاہیئے کہ اس توبہ کا اعلان کرے۔ **تیسرا فائدہ** یہ کہ متبرک مقامات جہاں رحمت الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ وہاں جا کر توبہ کرنا
اور طاعت بجالانا زیادہ قبولیت کا سبب ہے۔ جیسے کہ بنی اسرائیل کو توبہ کرنے کیلئے اس شہر متبرک میں بھیجا گیا۔ تفسیر عزیزی نے اس جگہ فرمایا
کہ بعض خاندانی اور بزرگ لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ کہ جن کے پاس بیٹھ کر توبہ کرنے اور عبادت کرنے سے جلد قبولیت ہوتی ہے چنانچہ ابن
مردویہ نے ابو سعید خدری سے روایت کی۔ کہ ایک دن ہم حضور علیہ السلام کے ساتھ سفر میں تھے رات کے آخری حصہ میں حضور علیہ السلام ایک
پہاڑ سے گزرے جس کا نام ذات الحنظل تھا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ یہ گھاٹی بنی اسرائیل کے اس دروازے کی طرح ہے جس سے انکو سجدہ کرکے داخل

ہونے کا حکم تھا۔ اور جہاں اُن سے توبہ کرائی گئی۔ ابن ابی شیبہ نے بروایت صحیح فرمایا۔ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔ کہ اس امت میں ہم اہل بیت کشتی نوح اور بنی اسرائیل کے دروازے حطّۃ کیطرح ہیں یعنی جسطرح بنی اسرائیل کا اس دروازہ میں آنا گناہ کی معافی کا ذریعہ تھا۔ ایسے ہی امت مصطفےٰ علیہ السلام کا ہمارے سلسلہ میں داخل ہو اور بیعت اور توبہ کرنا گناہوں کی معافی کا سبب ہے۔ (تفسیر عزیزی) بلکہ مثنوی شریف میں تو فرمایا گیا۔ گر نداری تو دمِ خوش در دعا ۔ رو دعا می خواہ زاخوانِ صفا ۔ ہر کرا دل پاک شد از اعتدال ۔ آں دعائش می رود تا ذوالجلال ۔ یعنی بجاہیں قوم اے مبتلا ۔ ہین غنیمت دار شاں پیش از بلا یعنی بہتر ہے۔ کہ اپنے لئے کسی بزرگ سے دعا کراؤ۔ کیونکہ اُن کی زبان کی نکلی ہوئی دعا حق تعالےٰ تک پہنچتی ہے۔ جیسے کہ کمان کا تیر اور بندوق کی گولی۔ اگر گولی ہم ہاتھ سے پھینک دیں۔ تو وہ اثر نہ ہوگا جو بندوق سے پھینکنے کا ہوگا۔ دعا گولی ہے۔ اور اُن کی زبان بندوق چوتھا فائدہ انبیاء و اولیاء کے مزارات پر حاضر ہو کر دعا کرنا بہت بہتر ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ دعا کیلئے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مزار شریف پر آتے تھے (شامی) ہم کو قرآن نے بھی حکم دیا۔ کہ توبہ کیلئے ہمارے نبی پاک کی بارگاہ میں جاؤ۔ پانچواں فائدہ۔ بزرگان دین کے شہر کی تعظیم کرنا بھی نیک بختی کی علامت ہے۔ جیسے کہ بنی اسرائیل سے اس شہر کی تعظیم کرائی گئی۔ اسلئے کہ یہ انبیاء کرام کا آرام گاہ تھا۔ مدینہ منورہ اور بغداد شریف کی تعظیم کی یہی اصل ہے۔ چھٹا فائدہ جن عملوں سے ہم گناہگاروں کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اُن سے نیک کاروں کے درجے بڑھتے ہیں۔ ہماری توبہ گناہ مٹاتی ہے۔ انکی توبہ اُن کے درجے بڑھاتی ہے۔ ہماری مصیبتیں ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہیں۔ انکی مصیبتیں ترقی درجات کیلئے جیسے کہ میدان تیہ میں بنی اسرائیل بھی رہے اور موسیٰ علیہ السلام بھی مگر یہ میدان بنی اسرائیل کیلئے قید خانہ تھا موسیٰ علیہ السلام کیلئے اعلیٰ مقام جو شخص اُن حضرات کی توبہ یا مصیبتوں کو دیکھ کر انہیں گناہ گار یا بے دین مانے وہ خود بے دین ہے۔ گناہ گار کی قبر پر پھول یا سبزہ ڈالا جائے۔ تو اس سے عذاب میں کمی ہوتی ہے۔ اور نیک کاروں کی قبر پر ڈالنے سے اُنکے ثواب میں زیادتی پہلا اعتراض اس بستی میں داخل ہونے کے وقت کا سجدہ کس کو تھا۔ رب تعالیٰ کو یا اس شہر کو۔ اگر رب تعالیٰ کو تھا۔ تو کس طرف تھا اور اگر بستی کو تھا۔ تو یہ بت پرستی ہوئی جواب۔ اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا۔ کہ یا تو اس سجدہ سے مراد جھک کر جانا ہے۔ تو اسمیں اس شہر کی تعظیم منظور ہے۔ اور یا جاتے وقت سجدہ شکر ادا کرنا۔ تب اس بستی کا دروازہ انکے لئے مثل کعبہ کے تھا۔ کہ سجدہ رب کو اور جھکنا اس بستی کی طرف بت پرستی کا جواب ہم آدم علیہ السلام کے سجدہ میں دے چکے ہیں۔ اس کی تفسیر صوفیانہ اگلی آیت میں کی جائیگی۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا

پس بدل دی انہوں نے جنہوں نے ظلم کیا وہ بات سوا اُس بات کے جو کہی گئی واسطے اُنکے پس اُتارا ہم نے اوپر اُن کے جنہوں نے ظلم کیا

تو ظالموں نے اور بات بدل دی جو فرمائی گئی تھی اُس کے سوا

رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

عذاب آسمان سے بوجہ اس کے کہ فسق کرتے تھے۔

تو ہم نے آسمان سے اُن پر عذاب اُتارا بدلہ اُن کی بے حکمی کا

**تعلق** - یہ آیت پچھلی آیت کا تتمہ ہے۔ کہ وہاں رب کے حکم کا ذکر تھا۔ اور یہاں اسرائیلیوں کے عمل کا نیز پہلی آیت میں وعدہ کی شرطوں کا ذکر ہوا اور اس آیت میں اُن اسرائیلیوں کے شرائط پورے نہ کرنے کا **تفسیر فَبَدَّلَ** یہ لفظ تبدیل سے بنا ہے۔ جسکے معنی ہیں بدل دینا یا بدل لینا۔ بدلنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو اپنی چیز دیکر دوسرے کی چیز لینی۔ جیسا کہ تجارت میں ہوتا ہے۔ دوسرے لینے کے قابل چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز اختیار کرنا۔ جو نہ لینی چاہیئے تھی یہاں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی اُن کو جو کہنا چاہیئے تھا وہ نہ کہا اور جو نہ کہنا چاہیئے تھا کہا خیال رہے کہ بدلنا دو طرح کا ہے ایک تو اصل کو بدلنا اس طرح کہ الفاظ بھی بدل جائیں اور مضمون بھی دوسرے وصف کو بدلنا۔ اسطرح کہ الفاظ بدل جائیں اور مضمون وہی رہے پہلے کو

تبدیل اور دوسرے کو تغیر کہتے ہیں۔ ان اسرائیلیوں نے پہلی قسم کی تبدیلی کی کہ نہ مضمون باقی رکھا نہ الفاظ اسی لئے یہاں بَدَّلَ فرمایا گیا نہ کہ غَیَّرَ اگر وہ لوگ بجائے حِطَّۃٌ کے مَغْفِرَۃٌ یا غُفْرَانَکَ وغیرہ مغفرت کے الفاظ بول لیتے تو غالباً رب کے غضب میں نہ آتے انہوں نے الفاظ و معنیٰ تو کیا مقصود بھی بدل دیا کیونکہ حِطَّۃٌ سے شرمندگی کا اظہار مقصود تھا مگر انہوں نے اسوقت تمسخر اور دل لگی کا اظہار کیا۔ اسی لئے قرآن کریم نے بدل باب تفعیل سے فرمایا نہ کہ ابدل باب افعال سے یعنی انہوں نے خوب بدل دیا یا بالکل ہی بدل دیا اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اس سے معلوم ہوا کہ سب نے نہ بدلا تھا۔ بلکہ محض ظالمین نے ان میں جو انبیاء اور صالحین تھے۔ وہ حِطَّۃٌ کہتے ہوئے ہی داخل ہوئے۔ اس ظلم سے یا تو بچھڑے کی پوجا وغیرہ مراد ہے۔ یا یہ بدلنا ہی یعنی جو پہلے ہی جرم کر چکے تھے۔ انہوں نے ہی آج بھی یہ حرکت کی۔ یا یہ کہ بدلنے والے ظالمین نے بدلا۔ باقی نے نہیں قَوْلًا بعض علما فرماتے ہیں۔ کہ قول سے کلام مراد ہے۔ بنی اسرائیل کو حکم تھا سجدہ کرتے ہوئے جائیں اور یہ کہتے ہوئے۔ انہوں نے فعل تو باقی رکھا۔ یعنی سجدہ کرتے ہوئے گئے مگر قول بدل دیا بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ یہاں قول سے مراد حکم ہے یعنی انہوں نے پورا حکم بدل دیا۔ نہ تو سجدہ کرتے ہوئے گئے۔ اور نہ حِطَّۃٌ کہتے ہوئے۔ بلکہ خاموش گھس گئے۔ اور بعضوں نے فرمایا کہ انہوں نے قول و عمل دونوں بدل دیئے کہ حِطَّۃٌ کی بجائے کچھ اور کہا۔ اور سجدہ کے بجائے سرین کے بل چلے۔ تفسیر روح البیان نے اس جگہ لکھا۔ کہ حق تعالیٰ نے وہ دروازہ نیچا کر دیا تھا۔ تاکہ انہیں خود بخود جھکنا پڑ جائے۔ لیکن یہ لوگ بیٹھ کر سرین پر گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے۔ تفسیر کبیر نے فرمایا۔ کہ انہوں نے کہا۔ کہ موسیٰ علیہ السلام حِطَّۃٌ کہلوا کر کھیل کراتے ہیں حِطَّۃٌ کیا چیز۔ یہ تیسری تفسیر ہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ اگلا جملہ اسی کی تائید کرتا ہے۔ غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَھُمْ یہ تبدیلی کا بیان ہے۔ کہ وہ خاموش نہ گئے کچھ کہتے ہوئے ہی گئے۔ مگر وہ نہ کہا جو ہم نے بتایا تھا۔ بلکہ اس کے سوا وہ بات کہی جو ہمارے حکم کے بالکل ہی خلاف تھی مضمون۔ عبارت مقصود سب ہی بدل دیا۔ قرآن نے یہاں سَوَاءٌ نہ کہا۔ غَیْرَ کہا یہ ہی بتانے کیلئے حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ وہ کہتے گئے حِنْطَۃٌ فِیْ شَعِیْرَۃٍ یعنی ہم کو گیہوں اور جو دے۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے۔ کہ وہ کہتے ہوئے گئے حِطِّیْ سَھْمَاثَا یہ لفظ عبرانی ہے جس کے معنی ہیں سرخ یا شربتی گیہوں۔ شاید حدیث پاک میں انکے کلام کا ترجمہ فرمایا گیا ہوگا کیونکہ ان کی زبان عبرانی تھی۔ فَاَنْزَلْنَا ف سے معلوم ہوا کہ ان پر فوراً ہی بلا تاخیر عذاب آگیا عَلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ عذاب فقط مجرمین پر ہی آیا۔ نیک کار اس سے محفوظ رہے۔ اگر یہاں عَلَیْھِمْ فرمایا جاتا تو غلط فہمی ہو جاتی۔ کہ سب پر عذاب آیا ہو۔ اس ظلم سے کلمہ بدلنا مراد ہے۔ اور پہلے ظلم میں چند احتمال نیز پہلے ظلم میں گناہ کبیرے اور صغیرے سب مراد ہو سکتے ہیں۔ اور اس ظلم میں صرف کبیرہ ہی۔ کیونکہ آگے ان کو فاسق فرمایا گیا۔ لہٰذا کلام میں تکرار نہیں رِجْزًا رجز کے لفظی معنی سزا اور عذاب اور گندگی ہیں۔ جیسے کہ رجس یہاں عذاب مراد ہے۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ ان پر اچانک موت (ہارٹ فیل) کا عذاب نازل ہوا بعض نے فرمایا۔ کہ طاعون جس سے کہ ایک ساعت میں چوبیس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے اور کئی روز تک ان میں طاعون رہی کل ستر ہزار آدمی مر سے۔ مِنَ السَّمَآءِ جس آسمان سے کہ ان پر من و سلویٰ کی نعمتیں آئی تھیں۔ اسی سے اب طاعون وغیرہ آئی۔ تفسیر عزیزی میں ہے۔ کہ زہریلی ہوا چلی جس سے کہ ان کے خون میں زہریلا مادہ پیدا ہوا۔ اور جسم کے نرم مقامات پر گلٹیوں کی شکل میں نمودار ہوا۔ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ۔ یہ عذاب اس لئے آیا کہ وہ فسق و فجور کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ **خلاصہ تفسیر** بنی اسرائیل کی سرکشی اس حد تک پہنچ چکی تھی۔ کہ بڑے سے بڑا مجرم بھی اتنی دراز قید کاٹ کر کچھ روز کے لئے سیدھا ہو جاتا ہے لیکن یہ چالیس سالہ قید گزارنے کے بعد جب وہاں سے چھوٹے تو ان سے کہا گیا تھا۔ کہ تم اس شہر میں سجدہ اور توبہ کرتے ہوئے داخل ہونا۔ انہوں نے اس فرمان عالی کو بالکل بدل ڈالا بجائے سجدہ کے اپنی سرین پر گھسٹتے ہوئے گھسے۔ اور بجائے ندامت کے دل لگی اور مذاق کرتے ہوئے۔ اور بجائے معافی مانگنے کے گیہوں جو وغیرہ مانگتے ہوئے گئے۔ اس سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہم نے ان پر آسمانی عذاب طاعون وغیرہ نازل فرمایا کیونکہ وہ عادی مجرم تھے۔ تو اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم آپ انکی نافرمانی سے غمگین نہ ہوں۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے پہلا فائدہ یہ کہ انبیاء اکرام کی مخالفت سے دنیاوی عذاب بھی آجاتے ہیں اور ان کا مذاق اڑانا کفر

ہے. دوسرا فائدہ یہ کہ مومن کیلئے دنیوی تکلیفیں کفارہ گناہ ہیں جس سے کہ وہ آخرت کے عذاب سے بچ جاتا ہے. کافر کیلئے نہیں جیسے کہ دنیوی نعمتیں کافروں کیلئے انکے ظاہری نیک اعمال کا بدلہ مومن کیواسطے نہیں دنیوی عذاب کافر کیلئے مثل حوالات کے ہے. اور مومن کیلئے دنیوی نعمت مثل بھتہ کے کہ تنخواہ اسکے علاوہ ہے تیسرا فائدہ طاعون بنی اسرائیل کے زمانہ سے شروع ہوا یہ اُن کیواسطے عذاب تھا. اور مسلمانوں کیلئے رحمت. حدیث پاک میں ہے. کہ جب طاعون تمہارے شہر میں واقع ہو. تو وہاں سے نہ بھاگو. دوسرے شہر میں ہو تو وہاں نہ جاؤ. نیز حدیث صحیح میں وارد ہوا. کہ جو لوگ وبا کی جگہ میں رب کی رضا پر صابر رہیں. اگر وہ وبا سے محفوظ بھی رہے جب بھی شہادت کا ثواب پائیں گے (تفسیر خزائن العرفان وغیرہ) چوتھا فائدہ یہ کہ چند حضرات وہ ہیں جن کو شہادت کا درجہ ملتا ہے [1] جو پانی میں ڈوب جائے [2] جل کر مرے [3] سفر میں مرے. [4] دب کر مرے [5] پیٹ کی بیماری میں مرے [6] طاعون سے مرے [7] زچہ عورت مدت نفاس میں مرے [8] جو جمعہ کی رات میں مرے [9] ذات الجنب کی بیماری میں مرے [10] طالب علمی کے زمانہ میں مرے (علم دین) [11] جو سل [12] یا مرگی [13] یا بخار کی مرض سے مرے [14] جو کسی کے عشق میں مرے بشرطیکہ پاکدامن اور عشق کو چھپانے والا ہو [15] جس کو درندہ کھا جائے [16] جسکو زہریلا جانور کاٹ لے [17] فی سبیل اللہ اذان دینے والا [18] سچا تاجر [19] حلال کی روزی کما کر بال بچوں کو پالنے والا [20] دریا کا مسافر [21] جو روزانہ پچیس بار یہ پڑھ لیا کرے. اَللّٰھُمَّ بَارِكْ لِیْ فِی الْمَوْتِ وَفِیْ مَا بَعْدَ الْمَوْتِ [22] جو شخص نماز چاشت اور ہر مہینہ میں تین روزوں کا پابند ہو [23] جو وتر کا پابند ہو [24] جو سنت کا پابند ہو. جب کہ مسلمان سنت چھوڑ رہے ہوں [25] جو اپنی بیماری میں چالیس بار آیت کریمہ پڑھ لے [26] جو ہر رات سورۂ یٰسین پڑھنے کا پابند ہو [27] جو روزانہ سو بار درود شریف پڑھا کرے. جو شہادت کی تمنا میں رہے [29] جو تاجر ضرورت کے وقت باہر سے مسلمانوں کیلئے غلہ لائے [30] جو کہ روزانہ صبح و شام تین بار اَعُوْذُ پڑھ کر سورۂ حشر کی آخری آیتیں لَا یَسْتَوِیْ سے آخر تک پڑھ لیا کرے (شامی باب الشہید) مسئلہ جو طاعون سے مرے اُس سے حساب قبر نہیں ہوتا. مسئلہ مدینہ منورہ طاعون اور دوسرے وبائی امراض سے محفوظ ہے. مسئلہ طاعون کی جگہ سے بھاگنا حرام ہے. ہاں اگر کسی دوسری ضرورت کی وجہ سے باہر گیا تو جائز. مسئلہ مرض اُڑ کر نہیں لگتا. اس کا مطلب یہ ہے کہ کفار بیماریوں میں قدرت مانتے ہیں. اسی لئے ان کی پوجا کرتے ہیں. چیچک اور ماتا کے بُت بنا کر پوجتے ہیں. یہ عقیدہ مشرکانہ ہے. حدیث لاعدویٰ کے یہی معنی ہیں. ہاں یہ ہو سکتا ہے. کہ کسی بیمار کی وجہ سے وہاں کی آب و ہوا میں بگڑ جائے جس سے دوسرے لوگ بھی بیمار ہو جائیں جس طرح کہ متعفن آب و ہوا سے بچنا بہتر ہے. ایسے ہی بعض بیماروں سے احتیاط کرنا بھی جائز ہے. جیسے جذامی اور مدقوق وغیرہ اسی لئے بعض احادیث میں ان سے بچنے کا حکم دیا گیا. البتہ وبائی امراض سے بھاگنا حرام ہے جس کی حکمت ہم انشاء اللہ عنقریب سوال و جواب میں بیان کرینگے. پانچواں فائدہ موت سے کوئی تدبیر نہیں بچا سکتی. حکایت جالینوس نے اپنے دوستوں کو اپنی موت کیوقت دو گولیاں دیں. اور کہا کہ میرے مرنے کے بعد ایک کو لوہے پر ڈال دینا اور دوسری کو پانی کے بھرے ہوئے گھڑے میں اور پھر گھڑا توڑ دینا لوگوں نے ایسے ہی کیا. لوہا تو اُس گولی سے پگھل گیا. اور پانی جم گیا. اُسوقت کے حکماء نے کہا. کہ جالینوس نے یہ دکھایا ہے. کہ میں پانی کو جمانے اور لوہے کو گلانے پر قدرت رکھتا تھا. مگر اپنے کو موت سے نہ بچا سکا. بلکہ جو حکیم جس بیماری کے علاج میں زیادہ ماہر تھا. خود اُس کی اپنی موت اُسی بیماری سے ہی ہوئی. سانپ کا منتر جاننے والا سانپ سے ہی مرتا ہے کسی نے خوب کہا ہے.

اَلَا یَا اَیُّھَا الْمَغْرُوْرُ تُبْ مِنْ غَیْرِ تَاخِیْرٍ فَاِنَّ الْمَوْتَ قَدْ یَاْتِیْ وَلَوْ صُیِّرْتَ قَارُوْنَا

بِسِلٍّ مَاتَ اَرَسْطَالِیْسُ بُقْرَاطُ بِاَفْلَاجٍ وَاَفْلَاطُوْنُ بِبِرْسَامٍ وَجَالِیْنُوْسُ مَبْطُوْنَا

یعنی ارسطو سِل کی بیماری سے اور بقراط فالج سے اور افلاطون برسام اور جالینوس پیٹ کی بیماری سے مرے (تفسیر روح البیان) وبا کا علاج امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں. کہ طاعون کا سب سے بہتر علاج تسبیح و تہلیل. اور درود شریف ہے. بشرطیکہ ظاہری اور باطنی شرطوں کے ساتھ ہو. [illegible] بتایا گیا ہے. کہ وبا کے زمانہ میں سورۂ دخان شریف بلند آواز سے صبح کیوقت پڑھنے سے جہاں تک اس کی آواز جائے. وہاں تک امن رہتا

ہے۔ نیز وبا کا ایک علاج یہ بھی ہے۔ کہ کسی نقارے یا تاشہ پر سورۂ جمعہ دائرہ کی طرح لکھی جاوے۔ اور درمیان میں پندرہ کا نقش بنایا جائے۔ پھر ایک خصی بکرا کو ساتھ لے کر تاشہ بجاتے ہوئے سارے شہر میں گشت لگائی جائے مگر شرط یہ ہے۔ کہ چوب نقش پر پڑے۔ نہ کہ حروف پر پھر کنارۂ شہر پر پہنچکر وہ جانور ذبح کرکے اس کا گوشت خیرات یا دفن کر دیا جائے۔ انشاء اللہ وبا سے امن ملے گی۔ نیز اس زمانہ میں بلند آواز سے اذانیں کہنا بھی مفید ثابت ہوا ہے۔ اسلئے کہ طاعون جنات کا اثر ہے۔ اور غلبہ جن کیوقت آذان کہنا سنت ہے (شامی باب الآذان) چھٹا فائدہ رب کا فرمان بدلنا باعث عذاب ہے جیساکہ اس آیت سے معلوم ہوا مسئلہ قرآن کے الفاظ یا اس کے متواتر معنی یا مقصود کو دیدہ ودانستہ بدلنا کفر ہے جو شخص عمداً غلط پڑھے وہ بھی کافر ہے (شرح فقہ اکبر) ہاں اگر قرآنی آیۃ تلاوت کی نیت سے نہ پڑھی جائے۔ بلکہ دعا یا جواب کی نیت سے تو اس میں زیادتی کمی یا تبدیلی وغیرہ جائز ہے کیونکہ اس صورت میں یہ آیت ہی نہیں ہے۔ بلکہ وہ اپنا کلام ہے۔ جیسے کسی نے آپکی مزاج پرسی کی آپ نے اس کو جواب میں کہدیا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الْكَرِيْمِ الرَّءُوْفِ الرَّحِيْمِ۔ یا جیسے کہ بعض حفاظ تلاوت سے پہلے کہتے ہیں۔ بتبرکت بِسْمِ اللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اسی کا نام اقتباس ہے اور قرآن سے اقتباس جائز ہے (شامی کتاب الجہاد) کیونکہ اب یہ ہمارا کلام ہوگیا۔ اسی واسطے اس نیت سے جنبی کو پڑھنا جائز اور نمازی کو پڑھنا منع بلکہ اس کی نماز کو باطل کردے گا۔ دعاؤں اور وظیفوں کے الفاظ بدلنے سے اُن کی تاثیر جاتی رہتی ہے صرف ثواب باقی رہ جاتا ہے۔ دلائل الخیرات میں ایک درود شریف چودہ بار پڑھا جاتا ہے کسی شاگرد نے اپنے شیخ الدلائل شاہ عبدالحق الہ آبادی سے پوچھا۔ کہ ہم پندرہ بار کیوں نہ پڑھ لیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ کہ جس قفل میں چار دانت والی چابی پڑتی ہے۔ وہ پانچ دانت والی چابی سے نہیں کھلتا۔ پندرہ بار سے ثواب تو مل جاویگا۔ مگر دروازہ نہ کھلیگا جو دعائیں اور اذکار عبادات میں درکار ہیں۔ اُن میں اگر الفاظ بدل جائیں اور مضمون باقی رہے تو عبادت درست ہوجائیگی۔ لہذا اگر کوئی نماز کی تکبیروں میں بجائے "اللہ اکبر" کے "اللہ اعظم" یا "الرحمان اکبر" کہدے۔ تب بھی نماز جائز ہے۔ اس طرح ذبح کرتیوقت بجائے "بِسْمِ اللّٰهِ اللّٰهُ اکبر" کے رب کا کوئی اور نام لے لیا جب بھی ذبح درست ہے۔ اگرچہ ثواب کم ہوجائیگا۔ **پہلا اعتراض** چاہیئے کہ ذکر و دعا میں بالکل فرق نہ کیا جائے۔ کیونکہ بنی اسرائیل نے دعا کے لفظ ہی بدلے تھے جس سے ان پر عذاب آگیا **جواب**۔ اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا۔ کہ انہوں نے صرف لفظ نہ بدلے تھے۔ بلکہ عبارت معنی مقصود سب بدل دیا تھا اور پیغمبر کا مذاق اُڑاتے ہوئے۔ حِنْطَةٌ وغیرہ کہتے ہوئے گئے تھے۔ یہ کفر ہوا۔ اس وجہ سے ان پر عذاب آیا۔ الحمدللہ کوئی مسلمان یہ نہیں کرتا محض آسانی کیلئے تبدیلی الفاظ کی اجازت دیگئی ہے۔ کہ اگر کسی کو دعاء قنوت یا دعا جنازہ یاد نہ ہو یا اللہ اکبر اس سے صحیح ادا نہ ہوتا ہو تو اس لئے نماز نہ چھوڑدے۔ بلکہ یہ مضمون دوسرے الفاظ میں ادا کردے۔ **دوسرا اعتراض**۔ جب قحط سالی اور دوسری بلاؤں سے بھاگنا جائز ہے۔ تو طاعون جوکہ سب سے سخت بلا ہے اس سے بھاگنا کیوں حرام ہے **جواب**۔ اسکے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ وبا میں اکثر اپنے اہل قرابت اور دوست احباب بیمار ہوجاتے ہیں جس سے وہ بھاگ نہیں سکتے اگر اس موقعہ پر تندرستوں کو بھاگنے کی اجازت دی جائے۔ تو ان بیماروں کی تیمارداری کون کرے۔ یہ لوگ یقیناً سخت تکلیف سے مریں اور انکو گور کفن بھی میسر نہ ہو۔ اسلئے یہاں ٹھہرنا بہت ثواب کا باعث ہے۔ جیسے کہ جہاد کی صف میں ٹھہرنا قحط سالی و دیگر بلاؤں میں یہ بات نہیں وہاں سب بھاگ سکتے ہیں۔ بلکہ مفلس اور غریب ہی پہلے بھاگتے ہیں (تفسیر عزیزی) میں نے خود دیکھا۔ کہ ایک بار بدایون میں طاعون پڑی مسلمانوں کے جنازے بہت عزت اور احترام سے جاتے تھے۔ کہ انکے ساتھ بڑا مجمع اور آگے نعت خوانی ہوتی تھی۔ ہندوؤں کی لاشوں کو حکومت نے چھکڑوں اور بیل گاڑیوں میں لدوا کر پھنکوایا یا زمین میں دبوایا کیونکہ تندرست ہندو انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اس واقعہ سے کئی ہندو مسلمان ہوگئے۔ دوسرا جواب۔ یہ ہے۔ کہ طاعون اور وبا خبیث جنات کے اثر سے ہے۔ اسی لئے اس کو طاعون کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ طعن سے بنا ہے جسکے معنی ہیں۔ نیزہ مارنا طاعونی بیمار کو بھی یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرے کوئی برچھیاں مار رہا ہے۔ انکے مقابلہ سے بھاگنا گویا اس سے ڈر جانا ہے جس طرح ظاہری جہاد میں کفار کے مقابلہ سے بھاگنا منع ہے۔ ایسے ہی وبا میں ان کے مقابلہ سے بھی۔ **تفسیر صوفیانہ**۔ انہوں کو دنیا کی بستی میں

بھیجا گیا اور اس کو حکم دیا گیا۔ کہ اعضاء جسم کو جس طرح چاہے استعمال کر اور دینا کی نعمتیں خوب کھا اور پی لیکن دروازۂ حیات میں رب کی اطاعت کرتے ہوئے۔ اور توبہ کرتے ہوئے جانا۔ تیری خطائیں معاف ہوں گی اور تجھے بڑا اجر دیا جائیگا۔ مگر اس ظالم نفس نے نہ کہنے کی بات کہی۔ اور نہ کرنیکے کام کیئے۔ کہ طلب دنیا میں ایسی مشغول ہوئی۔ کہ آخرت کو بھول گئی۔ فکر معاش میں خیال معاد سے غافل ہو گئی۔ شعر

عمر گراں مایہ دریں صرف شد ٭ تا چہ خورم صیف چہ پوشم شتا +

کھانا ذکر الٰہی کیلئے تھا مگر نفس نے سمجھا کہ زندگی کھانے کیلئے ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس غافل نفس پر عذاب الٰہی موت کی شکل میں نمودار ہوا۔ اور وہ تمام دنیا کی جمع کی ہوئی نعمتیں چھوڑ کر چل دیا۔ خیال رہے۔ کہ موت غافل کیلئے عذاب آسمانی اور عاقل کیلئے ذریعہ شادمانی اور راحت جاودانی ہے۔ اسی لئے اللہ والوں کے موت کے دن کو عرس یعنی شادی کا دن کہتے ہیں۔ حق تعالےٰ غفلت کی زندگی سے بچائے۔

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ فَقُلْنَا اضْرِب بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانفَجَرَتْ مِنْهُ

اور جبکہ پانی مانگا موسیٰ نے واسطے قوم اپنی کے پس کہا ہم نے مارو تم ساتھ لاٹھی اپنی کے پتھر کو پس بہنے لگے اس سے

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لئے پانی مانگا۔ تو ہم نے فرمایا۔ اس پتھر پر اپنا عصا مارو۔ فوراً اس میں سے

اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ

(۱۲) بارہ چشمے بیشک جان لیا ہر گروہ نے گھاٹ اپنا کھاؤ تم لوگ اور پیو تم رزق سے اللہ کے

بارہ چشمے بہ نکلے۔ ہر گروہ نے اپنا گھاٹ پہچان لیا۔ کھاؤ۔ اور پیو۔ خدا کا دیا۔

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٦٠﴾

اور نہ پھیلو تم بیچ زمین کے فساد کرتے ہوئے

اور زمین میں فساد اٹھاتے نہ پھرو۔

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح سے تعلق ہے۔ ایک یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل پر آٹھ احسانات کا ذکر ہو چکا۔ اب نویں احسان کا ذکر ہے۔ جو کہ بہت بڑا اور عجیب قسم کا احسان ہے۔ اسلئے کہ خشک جنگل میں جہاں پانی کی امید نہ ہو۔ پیاسوں کو پانی مل جانا بہت ہی بڑی نعمت ہے۔ اور ایسی جگہ سے پانی ملنا جو کہ بالکل خلاف عادت ہو۔ بہت عجیب احسان ہے۔ دوسرے یہ کہ اب تک ان نعمتوں کا ذکر ہوا جس کی بنی اسرائیل نے ناشکری کی۔ اب اس نعمت کا ذکر ہے جس کی بظاہر ناشکری تو نہ کی۔ لیکن اس سے ان کی فرقہ بندی اور اختلاف ظاہر ہوئے۔ کیونکہ وہ سب ایک چشمہ پر پانی نہ پی سکے تیسرے یہ کہ اب تک کھانا عطا فرمانے کا ذکر ہوا تھا۔ اور کھانا بغیر پانی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اسلئے اب پانی کا ذکر ہوا۔ جیسے کہ کھانا یعنی من و سلویٰ عجیب طریقہ سے انکو دیا گیا۔ ایسے ہی پانی بھی چوتھے یہ کہ اس سے پہلے من و سلویٰ کا ذکر ہوا جو کہ دنیوی نعمت تھی جس سے کہ ان کا پیٹ بھرتا تھا۔ اب اس پانی کا ذکر ہوا جو ان کیلئے دنیوی نعمت بھی تھی۔ اور دینی بھی اس سے پیاس بھی بجھتی تھی۔ اور ایمان بھی ملتا تھا۔ کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا جس سے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور موسیٰ علیہ السلام کی نبوت ثابت ہوئی۔ پانچویں یہ کہ اس سے پہلے آسمانی نعمتوں کا ذکر ہوا یعنی ابر کا سایہ کرنا اور من و سلویٰ کا برسنا۔ اب زمینی نعمتوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ یعنی پتھر سے پانی وغیرہ کا نکلنا **تفسیر** وَإِذِ۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ یہ واقعہ ایک سفر میں درپیش آیا جبکہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو کہیں لے جا رہے تھے۔ اور وہ پیاس سے ہو کر ان سے پانی مانگنے لگے۔ مگر تفسیر کبیر نے فرمایا۔ کہ عام مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ یہ واقعہ میدان تیہ کے زمانہ قیام میں ہوا۔ کہ رب تعالیٰ نے ان کے رہنے کے لئے بادل کا سایہ فرمایا۔ اور کھانے کیلئے من و سلویٰ اتارا۔ لباس کا وہ انتظام کیا جو ہم پہلے بیان

کر چکے۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا۔ کہ مولیٰ پانی کا بھی انتظام فرما۔ اسْتَسْقٰى مُوسٰى موسیٰ علیہ السلام سے اولاً بنی اسرائیل نے پانی مانگا۔ پھر انہوں نے رب سے جیسا کہ سورہ اعراف میں ہے۔ اِذِ اسْتَسْقٰهُ قَوْمُهٗ یہ لفظ سقیٌ سے بنا ہے۔ جسکے معنی ہیں بارش سے سیرابی لہذا استسقٰے کے معنی ہیں۔ بارش مانگی۔ اس صورت میں رب نے طلب سے زیادہ دیا کہ بادل سے پانی مانگا تھا پتھر سے نکال کر عطا فرمایا۔ یا سقیٌ کے معنی ہے۔ مطلق سیرابی جیسے کہ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا۔ لہذا جو مانگا تھا۔ وہ ہی ملا۔ لِقَوْمِهٖ قوم کے معنی ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ انہوں نے صرف اپنی قوم کیلئے پانی مانگا تھا۔ نہ کہ سارے جہان کے لئے۔ نیز فقط پینے کیلئے مانگا۔ نہ کہ کھیتی باڑی کیلئے۔ اسی لئے ان پر بارش نہ آئی۔ بلکہ پتھر سے پانی نکلا۔ ہمارے نبی علیہ السلام نے استسقاء کے موقعہ پر سارے جہان کے لئے پانی مانگا اور فقط پینے کیلئے نہیں۔ بلکہ کھیتی باڑی کیلئے اس لئے آپ کی دعا پر بارش آئی۔ فَقُلْنَا اضْرِبْ یا تو بطور الہام رب نے فرمایا۔ یا بطریق وحی بِعَصَاكَ معلوم ہوا۔ کہ لاٹھی سے پتھر کو مارنے کا حکم تھا۔ نہ کہ پتھر سے لاٹھی کو یعنی زمین پر رکھے ہوئے پتھر پر لاٹھی ماریئے موسیٰ علیہ السلام کا عصا جنت کے درخت آس کی ایک لکڑی تھی جو آدم علیہ السلام وہاں سے اپنے ساتھ لائے۔ اور ان سے منتقل ہوتا ہوا حضرت شعیب علیہ السلام تک پہنچا تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کی بکریاں چرائیں۔ تو یہ ان کو دیا گیا۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کے قد کی طرح دس ہاتھ تھا۔ اس میں دو شاخیں تھیں جو تاریکی میں دو مشعلوں کی طرح چمکتیں تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام اس عصا سے بکریوں کے لئے پتے بھی جھاڑتے تھے۔ اور اس پر تکیہ بھی لگاتے تھے۔ دیگر ضروریات بھی اس سے پوری فرماتے تھے۔ اس میں چند خصوصیات تھیں۔ دریاء قلزم کو اسی عصا سے خشک کیا گیا۔ یہاں پتھر سے اسی کے ذریعے پانی نکالا گیا۔ یہ عصا سانپ بن کر موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت کرتا تھا۔ اور پھر پکڑ لینے پر لاٹھی ہو جاتا تھا۔ اندھیری رات میں مشعل کا کام دیتا تھا۔ پھر خوبی یہ کہ صرف موسیٰ علیہ السلام ہی کے ہاتھ میں یہ کام کرتا تھا۔ نہ تو ان سے پہلے کسی نبی کے دستِ مبارک میں یہ معجزات اس سے ظاہر ہوئے۔ اور نہ آپ کے زمانہ میں کسی دوسرے کے ہاتھ میں اسی لئے کہتے ہیں۔ کہ کمالاتِ عصا کیلئے یدِ بیضاء چاہیئے غالباً اسکو عصا اسواسطے کہتے ہیں۔ کہ یہ عصو یا عصی سے بنا ہے جسکے معنی ہیں۔ نافرمانی اس ہی لفظ سے عصیان اور معصیت بنا۔ چونکہ یہ فرعون وغیرہ نافرمانوں کی اصلاح کیلئے عطا ہوا تھا۔ اسلئے اسکو عصا کہا گیا۔ پھر ہر لاٹھی کو عصا کہنے لگے الْحَجَرَ اس میں اختلاف ہے۔ کہ اس پتھر سے کوئی خاص پتھر مراد ہے۔ یا عام یعنی اس میں الف لام جنسی ہے۔ یا عہدی بعض علما فرماتے ہیں۔ کہ یہ وہ ہی پتھر تھا۔ جو کہ موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے لیکر بھاگا تھا جس کا ذکر سورہ احزاب میں ہے حضرت جبریل نے عرض کیا تھا۔ کہ آپ اس کو کسی تھیلے میں سنبھال کر رکھیں۔ اس سے معجزات صادر ہونگے بعض نے فرمایا۔ کہ یہ طور کا پتھر تھا۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ یہ پتھر بھی عصا کی طرح جنتی تھا۔ جس کو آدم علیہ السلام اپنے ہمراہ لائے تھے۔ اور انبیاء کرام میں منتقل ہوتا ہوا شعیب علیہ السلام تک پہونچا۔ اور انہوں نے عصا کیساتھ موسیٰ علیہ السلام کو یہ پتھر بھی عنایت فرمایا۔ یہ پتھر سنگ مرمر تھا چار گز مربع یعنی ایک گز لمبا اور ایک گز چوڑا تھا بعض نے فرمایا کہ اس سے عام پتھر مراد ہیں۔ یعنی جس پتھر پر آپ عصا مارتے اُس سے ہی پانی جاری ہو جاتا تھا۔ یہ ہی حسن بصری اور وہب ابن منبہ رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔ اور یہ ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے (تفسیر عزیزی و روح البیان) کیونکہ اس صورت میں اعلیٰ معجزہ ظاہر ہوگا۔ اگر کوئی خاص پتھر ہو تو کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ اُس پتھر کی تاثیر تھی۔ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ یہاں ایک عبارت پوشیدہ ہے یعنی موسےٰ علیہ السلام نے عصا مارا پس پتھر سے بارہ چشمے بہ نکلے تفسیر عزیزی نے فرمایا۔ کہ آپ نے پتھر میں بارہ چوٹ ماریں۔ اور ہر چوٹ سے ایک چشمہ جاری ہوا۔ ہر جگہ عورت کا سا پستان ظاہر ہوتا تھا جس سے پہلے عرق سا آتا پھر قطرہ قطرہ ٹپکتا پھر پانی بہنے لگتا۔ انفجار فجر سے بنا ہے۔ جسکے معنی ہیں پھٹنا یا چر جانا صبح صادق کو اسی لئے فجر کہتے ہیں۔ کہ اس وقت سیاہی پھٹ کر سفید نور سے نمودار ہوتے ہیں۔ بدکار آدمی کو اسی لئے فاجر کہتے ہیں۔ کہ وہ اپنی بدکرداری سے مسلمانوں کی جماعت میں شگاف پیدا کر دیتا ہے۔ (تفسیر کبیر) تو آیت کا مطلب یہ ہوا۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کے عصا مارنے سے پتھر میں شگاف پیدا ہوا اور اُس سے پانی بہنے لگا۔ پانی بہنے کو بھی انفجار

اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ پانی کسی جگہ شگاف کرکے نکلتا ہے۔ یا تو قدرتی طور پر پتھر میں پانی پیدا ہو جاتا تھا۔ یا وہ پتھر زمین سے اس طرح پانی کھینچ لیتا تھا جیسے کہ مقناطیس لوہے کو یا آجکل نل پانی کو یا اُس پتھر سے اردگرد کی ہوا مس کرکے پانی بن جاتی تھی۔ جیسے کہ آج بھی ٹھنڈے برتن سے چھو کر ہوا پانی بن جاتی ہے۔ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا چونکہ میدان تیہ میں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ اگر اُن سب کیلئے ایک ہی گھاٹ ہوتا۔ تو وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے اس لئے رب تعالیٰ نے بارہ چشمے جاری فرمائے۔ تاکہ ان میں جھگڑا نہ پیدا ہو۔ اس پتھر کی ہر سطح سے تین تین چشمے پھوٹتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ہر گروہ کو حکم دیا تھا۔ کہ وہ علیحدہ علیحدہ بارہ گڑھے کھود لیں پتھر سے پانی آکر اُن گڑھوں میں جمع ہو جاتا۔ اور ہر گروہ اپنے کام میں لاتا۔ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ اُن میں سے ہر گروہ نے اپنا گھاٹ پہچان لیا تھا۔ اور کوئی دوسرے کے گھاٹ سے پانی نہ لیتا تھا۔ اس میں اشارۃً یہ فرما دیا گیا۔ کہ جب موسیٰ علیہ السلام کی زندگی پاک میں ہی اُن میں آپس میں اتنا اختلاف تھا۔ کہ ایک گھاٹ سے پانی بھی نہ پی سکتے تھے۔ تو اُن کی وفات کے بعد ان میں اتفاق و محبت کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ وہاں چھ لاکھ تھے۔ اور بارہ میل میدان میں قیام کئے ہوئے تھے۔ علیحدہ علیحدہ بارہ محلے سے قائم تھے۔ ہر محلہ میں ایک نہر پہنچتی تھی اور اُن کے کھودے ہوئے گڑھے میں گرتی تھی۔ كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ۔ یا تو رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ اُن سے کہلوایا یا خود موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ لہٰذا اس جگہ یا تو قلنا پوشیدہ ہے۔ یا قال یعنی ہم نے یا موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ اے اسرائیلیو تم خوب کھاؤ پیو اللہ کا وہ رزق جو کہ تم کو بلا محنت و مشقت عطا ہوا کہ بغیر کھیتی باڑی کے من و سلویٰ مل رہا ہے۔ اور بغیر کنواں وغیرہ کھودے ہوئے پانی لیکن یہ نعمتیں کھا کر وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ زمین میں فساد برپا نہ کرتے پھرو۔ بلکہ اُس کا شکر بجا لاؤ۔ لفظ تَعْثَوْا عَثْيٌ سے بنا ہے۔ جسکے معنی ہیں۔ خوب فساد کرنا یعنی فساد پھیلانا لَا تَعْثَوْا میں فساد برپا کرنے سے منع فرمایا گیا۔ آگے مفسدین فرما کر بتایا گیا۔ کہ فساد تمہارے دلوں میں جم چکا ہے۔ تو خلاصہ مضمون یہ ہوا۔ کہ تم دراصل مفسد تو ہو۔ مگر مہربانی کرکے اس زمین میں فساد نہ پھیلانا۔ اور اپنی عادت فساد کو یہاں ظاہر نہ کرنا (تفسیر عزیزی)

**خلاصہ تفسیر** اے بنی اسرائیل رب کی یہ نعمت بھی یاد کرو۔ جبکہ میدان تیہ میں تمہارے سایہ اور خوراک و لباس کا انتظام ہو چکا تو موسیٰ علیہ السلام نے تمہارے لئے رب سے پانی مانگا ہم نے جس طرح کہ وہاں تم کو غذا ایک عجیب غریب طریقہ سے عطا فرمائی ایسے ہی پانی بھی کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ اپنا عصا پتھر پر ماریں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ تب پتھر سے بارہ چشمے جاری ہو گئے۔ تمہارے بارہ قبیلوں میں سے ہر قبیلے نے اپنا گھاٹ خوب پہچان لیا۔ اور ہر طرح آرام سے پانی حاصل کیا ہم نے فرمایا کہ ہم ان نعمتوں کا شکریہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم آئندہ زمین میں فساد انگیزی سے بچے رہو۔ رب کی نعمتیں خوب سیر ہو کر کھاتے پیتے رہو پتھر سے پانی نکالنے کا واقعہ کئی دفعہ اور کئی جگہ پیش آیا۔ ایک تو یہاں مقام تیہ میں اور دوسرے جبکہ یہ لوگ ایلیم میں پہنچے وہاں بھی اُن کو بارہ چشمے پانی کے اور ستر درخت کھجور کے عطا ہوئے تیسری بار جبکہ یہ لوگ مقام قادس میں پہنچے۔ یا تو ہر جگہ اسی پتھر سے پانی نکلا۔ یا علیحدہ علیحدہ پتھروں سے (تفسیر حقانی)

**فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ پہلا فائدہ یہ کہ اپنے ساتھ لاٹھی رکھنا سنت ہے۔ دیگر انبیاء کرام کا بھی یہ عمل رہا ہے اور خود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی مشہور ہے۔ کہ بعض وقت بھائی ساتھ چھوڑ جاتا ہے مگر لاٹھی نہیں چھوڑتی دوسرا فائدہ یہ کہ پتلا بید یا چھوٹی چھڑی سے سنت ادا نہ ہوگی۔ بلکہ اپنے قد کے برابر لاٹھی ہونی چاہیئے۔ یا سینے تک موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی قد کے برابر اور حضور علیہ السلام کی سینہ تک تھی۔ حضور علیہ السلام کی لاٹھی کے نیچے لوہے کا گولہ بھی ہوتا تھا جس سے بوقت ضرورت استنجاء کیلئے ڈھیلا بھی توڑا جا سکتا تھا۔ اور جنگل میں نماز پڑھتے وقت سامنے گاڑ کر سترہ کا بھی کام لیا جاتا تھا۔ اب نوبٹ وغیرہ میں بھی وہ ہی لاٹھی زیادہ کام دیتی ہے۔ جو کہ سینے تک ہو تیسرا فائدہ یہ کہ استسقاء یعنی رب سے پانی طلب کرنا سنت ہے حضور علیہ السلام نے کبھی تو فقط دعا ہی فرمائی ہے۔ اور کبھی اس کیلئے نماز استسقاء بھی پڑھی۔ اب دعا ہر طرح جائز ہے۔ بہتر یہ ہے۔ کہ جب بارش کی دعا کرنا ہو تو اولاً توبہ کریں پھر صدقہ خیرات کریں۔ اگر روزہ بھی رکھیں تو بہت بہتر پھر معمولی لباس پہن کر عاجزی کرتے ہوئے عیدگاہ وغیرہ میں جائیں جانوروں اور کمزور بچوں کو بھی ساتھ لیجاویں

کفار و مشرکین کو ہرگز ہمراہ نہ لیں پھر وہاں نماز استسقاء ادا کریں اور دعا کریں تین روز تک یہ عمل کریں بارش کیلئے یہ دعا بہت نافع ہے۔ اَللّٰھُمَّ اَغِثْنَا غَیْثًا مُغِیْثًا ھَنِیْئًا مَرِیْئًا مَرِیْعًا غَدَقًا مُجَلِّلًا سَحًّا طَبَقًا دَائِمًا (درمختار و شامی) اگر یہ الفاظ بھی کہہ لئے جاویں تو بہتر ہے۔ نَافِعًا غَیْرَ ضَارٍّ عَاجِلًا غَیْرَ آجِلٍ۔ کہ احادیث سے ثابت ہیں۔ جب رب تعالیٰ بارش بھیجے تب دعا مانگنا مستحب ہے اور بہتر ہے۔ کہ صحن میں کھڑے ہوکر وہ پانی اپنے سینے اور منہ پر کچھ لے۔ اور اگر سُنے کہ فلاں ملک میں بارش نہیں۔ تو اُن کیلئے بھی دعا کرنا مستحب ہے۔ مگر اس صورت میں نماز نہ پڑھی جاوے تیسرا فائدہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات تمام انبیاء کرام کے معجزات سے بالاتر ہیں موسیٰ علیہ السلام نے تو پتھر سے بارہ چشمے نکالے مگر حضور علیہ السلام نے اپنی انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری فرما دیئے۔ ایک بار سفر میں پانی کی تنگی ہوئی صحابہ کرام نے عرض کیا۔ فرمایا کسی پیالے میں تھوڑا پانی لاؤ۔ لایا گیا دست مبارک رکھ دیا۔ اور پندرہ سو آدمیوں کو پانی پلا بھی دیا غسل و وضو بھی کرا دیا اور پیاسے جانوروں کو سیراب بھی فرما دیا۔ خالی مشکیزے اور برتن بھروا دیئے حضرت جابر نے سوچا۔ کہ دیکھوں یہ پانی کہاں سے آرہا ہے۔ نظر کی تو مبارک انگلیوں سے جاری تھا۔

اُنگلیاں ہیں فیض پر ٹوٹے ہیں پیاسے جھوم کر ✽ ندیاں پنجاب رحمت کی ہیں جاری واہ واہ

پتھر سے پانی نکلنا آسان ہے۔ پہاڑوں وغیرہ سے نکلتا رہتا ہے۔ مگر انگلیوں سے جاری ہونا بہت ہی عجیب اور یہ تو بارہا ہوا۔ کہ کسی بوڑھی عورت کے مشکیزے سے کسی برتن سے صدہا آدمیوں کو پانی پلا دیا مگر اُس میں سے ایک قطرہ کم نہ ہوا دیکھو مشکوٰۃ شریف باب المعجزات" میرے آقا نے تو دودھ کی نہریں بھی جاری فرمائی ہیں۔ کہ ہجرت کے دن ام معبد رضی اللہ عنہا کی خشک بکری کے تھن کو ہاتھ مبارک لگایا جس سے تھن دودھ سے بھر گئے۔ اور اس قدر دودھ نکلا کہ ساتھیوں نے پیا اور ام معبد کے گھر والوں نے پیا اور تمام گھر کے برتن بھر گئے پتھر سے پانی کے بارہ چشمے نکلنا بیشک بڑا معجزہ۔ مگر دودھ کی دو نہریں خشک بکری کے تھنوں سے جاری ہونا بہت بڑا معجزہ۔ عیسیٰ علیہ السلام نے دعا فرما کر آسمان سے غیبی خوان کھانے سے بھرا ہوا منگا لیا۔ مگر میرے شہنشاہ نے حضرت جابر کے گھر چار سیر جو کے آٹے اور تھوڑے سے گوشت سے سارے لشکر والوں اور مدینہ والوں کو سیر فرما دیا۔ گوشت کی بوٹیاں شوربا اور شوربے کا مصالحہ آٹا وغیرہ تمام چیزیں جنت سے منگا کر حضرت جابر کی ہانڈی سے نکال کر سب کو کھلا دیں۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے پتھر سے پانی نکالا بیشک بڑا معجزہ ہے۔ مگر میرے شہنشاہ نے منبر پر کھڑے ہوکر ایک بار دعا بارش فرمائی ابھی منبر سے نیچے نہ آئے تھے۔ کہ پانی برسنے لگا۔ اور نماز جمعہ پڑھتے پڑھتے مدینہ پاک کے گلی کوچوں میں بہنے لگا۔ دوسرے جمعہ کو اس منبر پر کھڑے ہوکر جو انگشت پاک کا اشارہ فرمایا۔ تو بادل پھٹ گیا۔ اور جہاں حکم دیا۔ وہاں جاکر برسا معلوم ہوا کہ دیگر انبیاء کرام کی حکومت زمین اور زمینی چیزوں پر ہے۔ مگر سید الانبیاء کی سلطنت زمین و آسمان بلکہ دونوں جہاں میں ہے۔ اس کیلئے ہماری کتاب "سلطنت مصطفیٰ" کا مطالعہ کرو۔ غرضکہ حضور علیہ السلام کے معجزات سب معجزات سے اعلیٰ ہیں۔ چوتھا فائدہ یہ کہ رب تعالیٰ اپنی نعمتیں انبیاء کرام کے ذریعہ عطا فرماتا ہے۔ بلا واسطہ کسی کو نہیں دیتا وہ قادر تھا۔ کہ پتھر سے بغیر عصا مارے ہی پانی عطا فرما دے۔ مگر نہ فرمایا۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام کا واسطہ درمیان میں رکھا۔ کہ وہ عصا ماریں تب اسرائیلیوں کو پانی ملے۔ تاکہ اُن کی عظمت لوگوں کے دلوں میں قائم ہو جاوے۔ اور اس سے سمجھ جاویں۔ کہ دنیا کی طرح آخرت کی نعمتیں بھی ان ہی حضرات کے نظر کرم سے ملیگی پانچواں فائدہ یہ کہ رب سے جو مانگتا ہو۔ وہ اگر انبیاء سے ہی مانگا جاوے۔ تو بھی درست ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل ہر موقعہ پر موسیٰ علیہ السلام ہی سے شکایت کرتے تھے اور آپ یہ نہ فرماتے تھے۔ کہ تم مشرک ہو گئے۔ تم نے رب کو چھوڑ کر مجھ سے کیوں شکایت کی۔ بلکہ اُن کی حاجت روائی فرماتے رہتے۔ یہ ہی طریقہ صحابۂ کرام کا تھا۔ کہ ہر دکھ درد مصطفیٰ علیہ السلام سے عرض کرتے۔ دیکھو ہماری کتاب "جاء الحق" چھٹا فائدہ یہ کہ مفت نعمتیں ملنے اور مصیبتیں نہ آنے سے لوگ فساد برپا کرتے ہیں۔ بنی اسرائیل نے بغیر مشقت غذائیں کھائیں۔ پانی پیا تو آپس میں ایسے جھگڑے کہ ایک جگہ سے پانی بھی نہ پی سکے۔ ساتواں فائدہ یہ کہ فساد سے نعمتیں چھین لی جاتی ہیں۔ جیساکہ اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ بنی اسرائیل کو فرمایا گیا۔ کہ نعمتیں تو کھاؤ پیو مگر فساد نہ پھیلانا یعنی ورنہ سلب ہو جائینگی۔ پہلا اعتراض۔ یہاں فرمایا گیا فَانْفَجَرَتْ یعنی پتھر سے پانی خوب بہ نکلا۔ اور سورہ اعراف میں فرمایا گیا فَانْبَجَسَتْ یعنی تھوڑا

تھوڑا نکلا (یعنی صرف رسنا) ان دونوں آیتوں تعارض ہے **جواب** اولاً تو پانی تھوڑا تھوڑا نکلتا تھا۔ پھر خوب بہنے لگتا تھا۔ وہاں پہلی حالت بیان ہوئی اور یہاں آخری **دوسرا اعتراض** جب ابر کا سایہ اور من وسلویٰ کا اترنا اور پانی جاری ہونا ایک ہی میدان میں ہوا۔ تو اس کو علیحدہ علیحدہ آیت میں کیوں بیان فرمایا سب ایک ساتھ ہی کیوں نہ فرما دیئے گئے **جواب**۔ وہ نعمتیں آسمانی نہیں اور یہ زمینی اُن نعمتوں میں اسرائیلیوں کا اختلاف ظاہر نہ ہوا اس سے ظاہر ہوا نیز اس نعمت سے موسیٰ علیہ السلام کی سلطنت وحکومت بھی علی وجہ الکمال معلوم ہوتی تھی۔ ان وجوہ سے اس کو علیحدہ بیان فرمایا۔ **تیسرا اعتراض** اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ کے معنی یہ نہیں ہیں۔ کہ لاٹھی سے پتھر مارو۔ بلکہ یہ کہ لاٹھی کے سہارے پتھریلے میدان کو طے کرلو یا پہاڑ پر چڑھ جاؤ ضرب کے معنی چلنے کے بھی آتے ہیں۔ یہاں وہ ہی مراد ہیں۔ کیونکہ پتھر سے پانی نکلنا خلاف عقل ہے۔ (علی گڑھی ٹکسال) **جواب** جب ضرب کے معنی چلنا ہوتے ہیں۔ تو اُس کے بعد فِیْ لایا جاتا ہے۔ اگر یہاں یہ ہی ہوتا۔ تو عبارت یوں ہوتی اِضْرِبْ بِعَصَاكَ فِي الْحَجَرِ اور فی یہاں نہیں جس سے معلوم ہوا کہ ضرب مارنے کے معنی میں ہے۔ نیز یہ ہی معنی عام روایات سے ثابت ہیں۔ اس پر امت کا اجماع اس کو غلط بتانا اس کو سخت گمراہی ہے۔ جب پتھر سے بال اُڑ جاتے ہیں۔ لوہا کھچ آتا ہے۔ اب بھی پہاڑوں سے دریا جاری ہو جاتے ہیں۔ وہ پانی پتھر ہی سے نکلتا ہے۔ کنوؤں میں مٹی سے ہی پانی کے سوتے جاری ہوتے ہیں۔ تو اگر اُس وقت بھی ایسا ہوا ہو تو کون سی بات ہے۔ ان وہمیات کی وجہ سے معجزات کا انکار کرنا سخت جہالت ہے۔ **چوتھا اعتراض** ایک چیز سے چند متضاد کام نہیں ہو سکتے۔ ایک ہی عصا سے بحر قلزم خشک بھی ہو اور یہاں پتھر سے پانی بھی جاری ہو عقل میں نہیں آتا **جواب**۔ یہ دنیا میں بہت ہوتا ہے۔ ایک سورج سے سردی بھی پڑتی ہے۔ گرمی بھی ایک مینہ سے بعض سبز چیزیں جل جاتی ہیں۔ اور بعض پیدا ہوتی ہیں۔ ایک ہی دوا قابض بھی ہوتی ہے اور قبض کشا بھی مقوی باہ بھی ہوتی ہے۔ اور نقصان دہ بھی ہم اپنی آنکھ سے روتے ہیں سوتے بھی ہیں۔ دیکھتے بھی ہیں اشارے بھی کرتے ہیں۔ اس سے نیک کام بھی کرتے ہیں اور بد بھی جب ہمارے اعضاء اور دنیاوی چیزیں اپنے میں اتنی تاثیریں رکھتیں ہیں۔ تو اگر موسےٰ علیہ السلام کے عصا سے عجائبات ظاہر ہوں۔ تو کیا تعجب ہے۔ ہمارے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا لعاب دہن (تھوک) کھاری کنوئیں میں پڑے تو میٹھا کر دے خشک کوئیں کو جاری فرما دے۔ حضرت جابر کی ہانڈی میں پڑ کر گوشت اور شوربا بڑھا دے۔ آٹے میں پہنچ کر اس میں برکت دے حضرت علی کی دُکھتی ہوئی آنکھ میں لگ کر شفا بخشے۔ عبد اللہ ابن عتیک کی ٹوٹی ہوئی ہڈی پر لگ کر جوڑ دے معاذ ابن عمرو ابن جموح کے کٹے ہاتھ پر لگے تو اس کو صحیح کر دے۔ غرضکہ ایک چیز میں چند فائدے ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں **تفسیر صوفیانہ**۔ انسانی روح اور اس کے صفات مثل موسےٰ اور بنی اسرائیل کے ہیں۔ کہ وہ اپنے رب سے حکمت ومعرفت کا پانی مانگ رہے ہیں۔ روح کے پاس لا الٰہ الا اللہ کا عصا ہے جس میں نفی اور اثبات کی دو چمکتی ہوئی شاخیں ہیں۔ اس کو روح بارگاہ الٰہی سے لے کر آئی۔ روح کو حکم ہے۔ کہ یہ عصا اُس قلب پر مارے جو کہ مثل پتھر کے یا اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اس چوٹ سے بفضلہ تعالیٰ بارہ چشمے جاری ہوتے ہیں۔ کیونکہ لا الٰہ الا اللہ کے بارہ حرف ہیں۔ اور صفات انسانی بھی بارہ گروہ پانچ ظاہری حواس۔ قوت باصرہ۔ سامعہ۔ شامہ۔ لامسہ اور ذائقہ اور پانچ باطنی حس مشترک۔ حافظہ۔ خیال۔ وہم اور قوت متصرفہ اور ایک قلب اور ایک نفس ان میں سے ایک اپنے گھاٹ کو پہچانتی ہے۔ قلب کا گھاٹ تقویٰ اور اطاعت ہے۔ روح کا گھاٹ کشف اور مشاہدہ یہ روح حقیقت کے چشمے کا پانی تجلّٰی کے پیالے سے ساقی کے عطا سے پیتی رہتی ہے۔ اور فرمان ہوتا ہے۔ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا۔ رب کا حکم ہے۔ کہ یہ حقیقی رزق کھاؤ پیو لیکن دین کو دنیا کے بدلہ میں بیچ کر اور آخری چیز کو ادنیٰ پر ترجیح دے کر اور ان دونوں کو مولیٰ پر مقدم جان کر فساد مت پھیلاؤ کسی شاعر نے کیا خوب کہا۔

دھن دے تن کو راکھئے اور تن دے رکھئے لاج
تن من دھن سب واریئے ایک دھرم کے کاج

## وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا

اور جبکہ کہا تم نے اے موسیٰ ہرگز نہیں صبر کرینگے ہم اوپر کھانے ایک کے پس دعا کیجئے آپ واسطے ہمارے اپنے رب سے نکالے واسطے ہمارے

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا۔ تو آپ اپنے رب سے دعا کیجئے

## مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ

اس میں سے جو اوگاتی ہے زمین سگ اس کے سے اور ککڑی اس کی سے اور گیہوں اس کے اور مسور اس کی اور پیاز اس کی فرمایا موسیٰ نے

کہ زمین کی اوگائی ہوئی چیزیں ہمارے لئے نکالے کچھ ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز فرمایا

## اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ

کیا بدلتے ہو تم اس کو کہ وہ گھٹیا ہے بعوض اس کے کہ وہ بہتر ہے۔

کیا ادنے چیز کو بہتر کے بدلے مانگتے ہو۔

**تعلق۔** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ اس سے پہلے نو نعمتیں بیان ہوچکیں۔ اب دسویں نعمت کا ذکر ہو رہا ہے۔ لیکن فرق اس قدر ہے۔ کہ وہ نعمتیں اعلیٰ تھیں۔ اور یہ نعمت درحقیقت ان سے ادنیٰ لیکن بظاہر بنی اسرائیل کو یہ پیاری معلوم ہوئی۔ کیونکہ وہ اُن سے اکتا چکے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس سے پہلے آسمانی نعمتوں کے بعد زمینی نعمت یعنی پانی عطا فرمانے کا ذکر ہوچکا۔ اب اُن زمینی غذاؤں کا ذکر ہے۔ جو نعمت مع زحمت تھی۔ تیسرے یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کی نعمتوں کا ذکر تھا۔ اب ان کی نااہلی اور کم ہمتی اور نافرمانی کا ذکر ہو رہا ہے۔ کہ وہ آسمانی نعمتوں کے اہل ثابت نہ ہوئے۔ اعلیٰ ہستی کھو کر پستی کے طالب ہوئے۔ اس صورت میں یہ واقعہ دسویں نعمت نہیں۔ بلکہ اُن کی ناقدری کی وجہ ہے۔ ہاں اگر یوں کہا جائے۔ کہ یہ لوگ اس قابل تھے۔ کہ اِن سے تمام نعمتیں چھین لی جائیں۔ مگر ہمارا کرم ہی تھا۔ کہ ہم نے نہ چھینیں تو یہ نہ چھیننا بھی ایک نعمت ہے۔ **تفسیر وَاِذْ قُلْتُمْ** یہاں بھی وہ ہی فعل پوشیدہ ہے یعنی اے اسرائیلیو وہ واقعہ بھی یاد کرو جب تم نے کہا تھا۔ یا اے نبیؐ انہیں یاد دلا دو۔ خیال رہے۔ کہ یہ واقعہ بھی میدان تیہ کا ہی ہے۔ جبکہ وہ من وسلویٰ کھاتے کھاتے گھبرا گئے تھے۔ کیونکہ وہ تو مصر میں رہ کر مختلف ترکاریاں کھانے کے عادی تھے۔ تفسیر کبیر نے فرمایا۔ کہ اُن کا یہ مطالبہ کرنا گناہ نہ تھا۔ کیونکہ من وسلویٰ کھانا اِن پر واجب نہ تھا۔ بلکہ فقط مباح۔ اور مباح کھانے کے بدلنے کی خواہش جرم نہیں۔ البتہ چونکہ یہ بغیر محنت ملتا تھا جس سے یہ لوگ عبادت کا کافی موقعہ پا لیتے تھے۔ اس لئے موسےٰ علیہ السلام نے اُس کو خیر فرمایا اور اس کو ادنیٰ **یٰمُوْسٰی** تفسیر عزیزی نے فرمایا۔ کہ اتنے بڑے پیغمبر کو نام لے کر پکارنا کمال بے ادبی ہے۔ انہیں چاہیئے تھا۔ کہ یا رسول اللہ یا نبی اللہ کہہ کر پکارتے۔ دیوبندیوں کے پیشوا میاں اسمٰعیل دہلوی اِن سے کئی درجہ آگے ہیں کیونکہ وہ تو انبیاء کو بشر اور ایلچی اور چوہدری اور نمبردار اور بھائی کہتے ہیں۔ **لَنْ نَّصْبِرَ** یعنی ہم صبر کر سکتے تو ہیں۔ مگر کریں گے نہیں۔ انہوں نے اپنی ناطاقتی بیان کی۔ بلکہ بے صبری لہٰذا یہ دوسری بے ادبی تھی۔ مانگنے کیلئے بھی ادب و تمیز چاہیئے **عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ** طعام طُعْم سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ لذت دار لذت والی غذا کو کہتے ہیں۔ اسی لئے کڑوی دواؤں کو طعام نہیں کہا جاتا۔ یہاں ایک کھانے سے مراد ہے۔ نہ بدلنے والا کھانا۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں۔ کہ ہم سے ہر روز ایک سا ہی کھانا نہیں کھایا جاتا۔ چند وجہوں سے ایک یہ کہ۔ کہ یہ کھاتے کھاتے عرصہ ہوچکا دوسرے یہ کہ ہم پہلے سے اس کھانے کے عادی نہ تھے۔ تیسرے یہ کہ ایک کھانے سے معدہ کمزور ہوتا ہے۔ اور خواہش میں کمی آتی ہے۔ نفس بھی اسے قبول نہیں کرتا۔ چوتھے یہ کہ ہم زمین کے رہنے والے ہیں۔ زمینی ہی غذائیں چاہتے ہیں۔ بعض لوگوں نے کہا۔ کہ ایک کھانے سے مراد یکساں کھانا ہے جو کہ غریب و امیر سب کو

برابر ملے۔ گویا وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم کو مختلف کھانے چاہئیں جس سے بڑے اور چھوٹے کا فرق ظاہر ہو۔ اور جس میں بعض بعض کے خدمت گار بنیں۔ (تفسیر روح البیان) اس صورت میں یہ ان کی تیسری بیہودگی ہوئی۔ فَادْعُ لَنَا بنی اسرائیل بھی جانتے تھے۔ کہ رب پیغمبر کی بہت سنتا ہے۔ اس لئے براہ راست خود دعا نہ کرتے تھے۔ بلکہ پیغمبر سے دعا کراتے تھے۔ نیز وہ سمجھتے تھے۔ کہ پیغمبر خلق کے حاجت روا ہوتے ہیں۔ اس لئے اپنے دکھ درد ان سے عرض کرتے تھے۔ لَنَا سے یہ بتایا کہ اے موسیٰ یہ دعا ہمارے واسطے ہے۔ نہ کہ آپ کے واسطے کیونکہ آپ تو اسی پر صابر شاکر ہیں۔ بے صبرے تو ہم ہیں۔ رَبَّكَ تفسیر عزیزی نے فرمایا۔ کہ اس میں بوئے غیریت آتی ہے۔ کہ انہوں نے رَبَّكَ کہا رَبَّنَا نہ کہا یعنی اپنے رب سے عرض کرو۔ مگر یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ انہوں نے اپنے کو حقیر جانتے ہوئے رَبَّنَا نہ کہا۔ جیسے ہم رب کو رب العرش، رب کعبہ، رب محمد کہہ دیتے ہیں۔ يُخْرِجْ لَنَا یہ جملہ یا دعا کا بیان ہے۔ یا اس کا جواب یعنی آپ رب سے دعا کریں۔ کہ وہ ہمارے لئے اگا دے۔ یا اگر آپ دعا کریں گے۔ تو وہ ضرور اگا دے گا کیونکہ آپ مقبول الدعا ہیں یُخْرِجْ سے یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ یہ ساگ پات بھی من وسلویٰ کی طرح بغیر محنت ہی پیدا ہو جائیں۔ ہم کو جوتنے بونے کی ضرورت نہ پڑے۔ کیونکہ ہم حالت سفر میں ہیں کھیتی باڑی نہیں کر سکتے مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ یہ یُخْرِجْ کا مفعول ہے یعنی ہم کو وہ چیزیں دے۔ جو زمین اگاتی ہے۔ مِنْ بَقْلِهَا بقل کا ترجمہ ہے سبزی ترکاری یہ دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو پکا کر کھائی جائے۔ جیسے خرفہ، پالک اور میتھی، سویا۔ وغیرہ دوسرے وہ جو کچی بھی کھائی جائے۔ جیسے دھنیا، پودینہ وغیرہ یہ لفظ دونوں قسم کی ترکاریوں کو شامل ہے۔ وَقِثَّآئِهَا اس کے معنی ہیں خیار۔ یہ دو قسم کا ہے۔ خیار دراز یعنی ککڑی اور خیار خورد یعنی کھیرا۔ ان دونوں کو خیارین کہتے ہیں۔ یہ کچی بھی کھائی جاتی ہے۔ اور پکا کر بھی یعنی یہ غذا بھی ہے۔ اور دیہاتی میوہ بھی وَفُوْمِهَا گیہوں کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ پیس کر پکا کر کھایا جاتا ہے۔ اس لئے اس کو ترکاریوں کے بعد بیان کیا۔ ایک قرأت ثُوْمِهَا بھی ہے جس کے معنی ہیں لہسن اور بعض علماء نے فوم کے معنی بھی لہسن کئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ف۔ ث کے عوض میں آئی ہے۔ کیونکہ آگے پیاز کا ذکر بھی آ رہا ہے۔ اور اس کا جوڑا لہسن ہے نہ کہ گیہوں نیز وہ لوگ ادنیٰ چیزیں مانگ رہے ہیں۔ اور گیہوں اعلیٰ ہے۔ لیکن صحیح یہی ہے۔ کہ یہاں فوم بمعنی گیہوں ہے۔ کیونکہ آگے مسور کا ذکر ہے۔ جو کہ گیہوں سے کھائی جاتی ہے اور پیاز کا ذکر تو اس کے بھی بعد ہے۔ نیز گیہوں اگرچہ خود اعلیٰ ہے مگر من وسلویٰ کے مقابلے میں ادنیٰ اور گیہوں کی روٹی عمدہ چیز ہے۔ مگر جب ساگ اور پیاز وغیرہ معمولی ترکاریوں سے کھائی جائے۔ تو ادنیٰ شمار کی جاتی ہے۔ کیونکہ روٹی سالن کے تابع ہے۔ وَعَدَسِهَا عدس مسور کو کہتے ہیں۔ یہ چھیل کر اور بغیر چھیلے ہر طرح نہایت آسانی سے پک جاتی ہے۔ اسی لئے انہوں نے یہاں طلب کی۔ وَبَصَلِهَا بصل پیاز کو کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ خود بھی ترکاری بن جاتی ہے۔ کہ سرکے میں اور کچی اور پکا کر روٹی سے کھائی جاتی ہے۔ اور دیگر ترکاریوں کی بھی اصلاح کرتی ہے۔ اس لئے مسور کے بعد اس کا ذکر ہوا قَالَ۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے نہ کہ رب کا اَتَسْتَبْدِلُوْنَ یہ بدل سے بنا ہے جس کے معنی ہیں معاوضہ یہاں حقوق کا بدلہ مراد ہے یعنی من وسلویٰ کا عوض کیوں بدلے لیتے ہو۔ اس جواب سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بنی اسرائیل من وسلویٰ کے عوض یہ چیزیں مانگتے تھے نہ یہ کہ وہ بھی رہے اور یہ بھی الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی۔ ان تمام چیزوں کو ادنیٰ فرمایا گیا کیونکہ یہ قدر اور قیمت اور فائدے اور لذت سب ہی میں ادنیٰ ہیں۔ نیز یہ زمینی چیزیں ہیں اور اس میں تمہاری محنت کا دخل ہے۔ بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ من وسلویٰ چند لحاظ سے بہتر تھا۔ وہ آسمانی نعمت تھی۔ قدر و قیمت لذت و فائدہ سب میں اعلیٰ تھا۔ اور بے محنت حاصل ہوتا تھا جس سے کہ انہیں عبادت کیلئے وقت خوب ملتا تھا۔ دنیا میں مشغولی نہ ہوتی تھی **خلاصہ تفسیر** اے اسرائیلیو تم میدان تیہ کا وہ وقت بھی یاد کرو۔ کہ جب تم پر اس دشت پرخار میں جہاں کوئی سامان نہ تھا۔ رب کی طرف سے من وسلویٰ اترنے لگا۔ تو تم بجائے شکر کرنے کے وہاں موسیٰ علیہ السلام سے لڑنے جھگڑنے لگے۔ کہ آپ نے ہمیں مصر جیسے سرسبز شاداب خطے سے نکال کر ایسے جنگل میں لا ڈالا۔ کہ جہاں من وسلویٰ کے سوا کچھ نہیں۔ ہم تو مصر میں ہر قسم کی پیداوار کھاتے تھے۔ یہاں عرصے سے ایک ہی قسم کا کھانا کھا رہے ہیں۔ اب ہم اس پر صبر نہ کریں گے۔ اپنے رب سے عرض کرو کہ وہ ہمارے لئے اس جنگل میں بھی ساگ پات اور ککڑی گیہوں مسور اور پیاز وغیرہ زمینی غذائیں ہمیں بغیر مشقت کے دے موسیٰ علیہ السلام

نے فرمایا۔ کہ اسے تم کیا غضب کر رہے ہو۔ کیا رب تعالیٰ کی اعلیٰ نعمتیں چھوڑ کر ادنیٰ لئے لیتے ہو۔ اس پر اگر تم کو ہلاک کر دیا جاتا۔ تو کچھ بعید نہ تھا۔ مگر رب نے درگزر فرمایا اور عذاب نہ بھیجا **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** یہ کہ حرص و ہوس کا نتیجہ برا ہے۔ بنی اسرائیل نے من وسلویٰ پر صبر نہ کیا دیگر کھانوں کی ہوس کی جس کی وجہ سے خرابی میں پڑے۔ حرص۔ ہوس۔ طمع تینوں لفظ جیسے نقطے سے خالی ہیں۔ ویسے ہی فائدے سے بھی خالی **دوسرا فائدہ** ہر چھوٹی بڑی چیز رب سے مانگنی چاہیئے۔ یہ نہ خیال کیا جاوے۔ کہ اتنی بڑی بارگاہ میں معمولی چیزیں کیا مانگیں بنی اسرائیل نے ککڑی پیاز جیسی معمولی چیزیں بھی رب سے مانگنے کی درخواست کی موسیٰ علیہ السلام نے اس سے منع نہ فرمایا۔ کہ معمولی چیزیں نہ مانگو۔ اگر کسی کے جوتہ کا تسمہ بھی ٹوٹ جاوے تو رب سے ہی مانگے حکایت مشہور ہے۔ کہ سکندر بادشاہ سے کسی نے ایک پیسہ مانگا۔ اُس نے کہا۔ کہ تو نے ایک پیسہ مانگ کر میری توہین کی کیا اتنے بڑے بادشاہ سے ایک پیسہ بھی مانگا جاتا ہے۔ سائل نے کہا۔ کہ اچھا ایک ملک مجھے عنایت کر دیجئے۔ سکندر نے جواب دیا۔ کہ یہ تو نے اپنی لیاقت سے زیادہ مانگا۔ تو ملک کے لائق نہیں۔ سائل کہنے لگا۔ کہ یہ رب ہی کی شان ہے۔ کہ ایک پیسہ بھی اُس سے مانگا جاتا ہے۔ اور ملک بھی اور وہ کسی پر ناراض نہیں ہوتا بلکہ مانگنے کا حکم دیتا ہے۔ فرماتا ہے اُدْعُوْنِیْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ تم دعا کرو ہم قبول فرمائیں گے مولانا فرماتے ہیں ؎ اے کہ با ہر دل ترا رازِ دگر ؛ ہر گدا را بر درت نازے دگر

**تیسرا فائدہ** یہ کہ بزرگوں کو چاہیئے کہ جب کوئی اُن سے دعا کرا دے تو اُس کو دعا کے متعلق نیک مشورہ دیدیں۔ کہ یہ دعا نہ کراؤ اس میں بہتری نہیں موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو یہ ہی مشورہ دیا۔ کہ تم ادنیٰ چیز اعلیٰ کے بدلہ نہ لو۔ **چوتھا فائدہ** یہ کہ اعلیٰ اور ادنےٰ چیزیں جمع نہیں ہوتیں جو شخص چاہے کہ دین بھی حاصل ہو اور دنیا کمینی بھی ہاتھ سے نہ جاوے وہ دو ضدوں کو جمع کرتا ہے۔ دیکھو بنی اسرائیل نے یہ نہ کہا۔ کہ من وسلویٰ بند ہو جاوے بلکہ وہ چاہتے تھے۔ کہ یہ بھی آتا رہے اور ساگ پات بھی ملے۔ فرمایا یہ نہ ہوگا۔ بلکہ تبادلہ ہوگا۔ اور تبادلہ اچھا نہیں **پانچواں فائدہ** یہ کہ دل کی ہر بات نہ ماننا چاہیئے۔ بسا اوقات یہ ادنیٰ چیز کو اعلیٰ دکھاتا ہے۔ بنی اسرائیل کو ساگ پات اچھا معلوم ہؤا۔ مگر حقیقت میں یہ ادنےٰ تھا۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ عَسٰۤی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ دل نادان بچہ یا بیوقوف مریض کی طرح ہے جو کہ رنگت و خوشبو پر مرتا ہے۔ اور بسا اوقات نقصان دہ چیزوں کی خواہش کر لیتا ہے۔ **پہلا اعتراض**۔ بنی اسرائیل کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ غذا کا تبادلہ نہ چاہتے تھے۔ بلکہ اس من وسلویٰ کے ساتھ اور بھی غذائیں مانگ رہے تھے۔ پھر موسیٰ علیہ السلام نے تبادلہ کو اُن کی طرف کیوں منسوب فرمایا اور کیوں فرمایا اَتَسْتَبْدِلُوْنَ کیا تم بدلنا چاہتے ہو۔ یہ تو خلاف واقعہ ہے۔ **جواب** اُنہوں نے اس آسمانی کھانے سے ناخوشی اور بے رغبتی ظاہر کی جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ یا تو وہ اب اس غذا کو بالکل نہ کھائیں گے۔ یا شکم سیر ہو کر نہ کھائیں گے کیونکہ اُس سے اکتا گئے ہیں۔ اس ناقدری کی بنا پر اس کا بند ہونا لازم تھا۔ تو چونکہ انہوں نے تبادلہ غذا کا سبب قائم کر دیا تھا۔ اس لئے اُن کی طرف نسبت کیا گیا۔ **دوسرا اعتراض** بنی اسرائیل کی یہ خواہش جائز تھی یا ناجائز اگر ناجائز تھی تو موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو اس نے صراحۃً کیوں نہ روک دیا۔ ناجائز چیز کی دعا کرنا بھی ناجائز ہے۔ اور اگر جائز تھی تو جائز کام میں پس و پیش کیوں فرمایا۔ **جواب** یہ خواہش جائز تھی پسند کھانے کھانا بھی جائز اور اُن کی رغبت بھی مباح مگر اُن کیلئے تکلیف کا سبب تھی لہذا اس خواہش سے منع تو نہ فرمایا صرف اُس کے نقصان پر اُن کو مطلع کر دیا جیسے کہ کوئی شخص اپنی اچھی آمد نی پر لات مارنا چاہتا ہے تو اُس کو سمجھایا جاتا ہے۔ اس آیت کی تفسیر صوفیانہ انشاء اللہ اگلی آیت میں کی جائیگی۔

اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ

اُتر جاؤ تم کسی شہر میں پس تحقیق واسطے تمہارے وہ ہے جو تم نے مانگا اور مقرر کر دیگئی اوپر اُن کے خواری اور فقیری

اچھا مصر یا کسی شہر میں اتر و تمہیں ملیگا جو تم نے مانگا اور اُن پر مقرر کر دیگئی خواری اور ناداری

وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ

اور لوٹے وہ بیچ غضب اللہ کے یہ بوجہ اسکے ہے کہ وہ لوگ تھے انکار کرتے نشانیوں کا اللہ کی اور

اور خدا کے غضب میں لوٹے یہ بدلہ تھا۔ اس کا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور

يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

قتل کرتے تھے نبیوں کو بلا حق کے یہ بوجہ اسکے ہے کہ نافرمانی کی انہوں نے اور تھے وہ حد سے آگے بڑھتے۔

انبیاء کو ناحق شہید کرتے یہ بدلہ تھا۔ اُن کی نافرمانیوں اور حد سے بڑھنے کا۔

**تعلق**۔ اس جملہ کا پچھلے جملہ سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ یہ اُس کا تتمہ ہے۔ وہاں معلوم ہوا تھا۔ کہ اسرائیلیوں نے دعا کرانا چاہی موسٰے علیہ السلام نے اُنکو مشورہ دیا۔ کہ ایسا نہ کریں۔ اب فرمایا گیا۔ کہ انہوں نے حضرت کا مشورہ قبول نہ کیا تب۔ آپ نے اُن سے فرمایا۔ دوسرے یہ کہ پہلے فرمایا گیا۔ کہ اسرائیلیوں نے اپنی یہ معروض رب کی بارگاہ میں پیش کرانا چاہی۔ موسٰی علیہ السلام نے فرمایا۔ یہ تمہارا مدعا قابل عرض نہیں ہے میں پیش نہ کرونگا اگر تم میرا مشورہ نہیں مانتے۔ تو تم کو اس کی یہ تدبیر بتاتا ہوں (تفسیر عزیزی) تیسرے یہ کہ پہلے معلوم ہوا تھا۔ کہ بنی اسرائیل چاہتے تھے۔ کہ ہم کو یہ تمام چیزیں اسی جنگل میں من وسلوٰی کی طرح مل جاویں۔ اس میں فرمایا گیا۔ کہ تم کو یہ نعمتیں یہاں نہ ملیں گی۔ بلکہ اس کیلئے تم کو شہر میں جانا ہوگا۔ لہذا یہ جملہ اُن کے خواہش کی تردید ہے۔ چوتھے یہ کہ پہلے معلوم ہوا تھا۔ کہ اسرائیلی چاہتے تھے۔ کہ رب تعالیٰ یہ چیزیں بغیر محنت ہم کو عطا کرے۔ یہاں فرمایا گیا۔ کہ یہ محنت سے ملینگی۔ **تفسیر** اِهْبِطُوْا یہ لفظ ہبوط سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اُترنا یعنی اُتر جاؤ۔ تم یا تو یہ میدان تیہ بلندی میں واقع تھا۔ اور جہاں اُن کو بھیجا جارہا ہے۔ وہ پستی میں اس لئے اِهْبِطُوْا فرمایا۔ یا مسافر سفر میں تو کسی سواری پر رہتا ہے۔ اور جہاں ٹھہرنا ہوتا ہے۔ وہاں اُترتا ہے۔ اس لئے فرمایا گیا۔ کہ تم سواریوں پر بیٹھو اور اُس شہر سواریوں سے اُتر جانا یعنی ٹھہر جانا۔ یا مطلب یہ ہے۔ کہ پیچھے کو ہی لوٹ جاؤ۔ کیونکہ واپس لوٹنا ناکامی کی دلیل ہے۔ اور ناکامی میں اپنے درجہ سے اُترنا ہوتا ہے۔ اس میں اس جانب بھی اشارہ ہے۔ کہ تم ان غذاؤں کے حاصل کرنے سے کم ہمت اور پست حوصلہ ہوجاؤ گے۔ تمہاری پہلی سی شان نہ رہے گی۔ کیونکہ دنیاوی ہوس سے یہ عیوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور تم ہوس ہی کر رہے ہو۔ لہذا یہ بظاہر امر اور درپردہ غیب کی خبر ہے۔ کہ ابھی تو تمہارے پاس سلطنت وحکومت ہے۔ پھر فقط کسان بن کر رہ جاؤ گے۔ اور ہمیشہ کے لئے تخت وتاج سے محروم ہوجاؤ گے۔ کیونکہ تمہاری طبیعت میں کسانی چیزوں اور کسانی کاموں کی طرف رغبت ہے۔ مِصْرًا مصر کے لغوی معنی ہیں قطع یعنی علیحدہ ہونا اور اب بستی یا شہر کو مصر کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ جنگل سے منقطع اور علیحدہ ہوتا ہے۔ کبھی گاؤں کو بھی مصر کہہ دیتے ہیں جیسے کہ شہر کو قریہ کہا جاتا ہے مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (روح البیان) مصر خاص فرعونی شہر کا نام بھی تھا۔ اور ہر شہر کو بھی کہا جاتا ہی جیسے کہ لفظ مدینہ ہر شہر کو بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور خاص مدینہ منورہ کا نام بھی ہے۔ اگر اس سے خاص شہر مصر مراد ہو تو یہ غیر منصرف ہے۔ علمیت اور عجمہ کی وجہ سے قرآن کریم نے فرمایا مِنْ مِّصْرَ اور عام شہر کیلئے ہو تو منصرف بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ اس سے وہ فرعونی مصر ہی مراد ہے۔ تو مطلب یہ ہے۔ کہ آپ نے فرمایا۔ کہ تم جہاں سے آئے ہو۔ وہاں ہی واپس چلو۔ یعنی مصر اور چونکہ یہ ساکن الاوسط ہے۔ اس لئے منصرف بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے کہ نوح وہند وغیرہ لیکن یہ قول ضعیف ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل سے فرما دیا گیا۔ کہ اُدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِكُمْ۔ یعنی تم بیت المقدس زمین یعنی شام میں داخل ہونا پیچھے نہ واپس ہونا جب اُنہیں واپسی سے منع کر دیا گیا تھا۔ تو اب حکم کیوں دیا جاتا ہے۔ [illegible] نے فرمایا کہ اس سے مراد وہی جگہ ہے۔ جہاں کہ لے جانا منظور تھا۔ مگر یہ بھی ضعیف ہے۔ کیونکہ رب نے فرمایا تھا فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ یعنی شہر اُن پر چالیس سال کے لئے حرام کر دیا گیا۔ اسی میدان میں حیران وپریشان پھریں گے۔

موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام کے ساتھ یہ لوگ وہاں گئے۔ اور یہ واقعہ اُن کی زندگی شریف کا ہے۔ لہٰذا قوی یہی قول ہے۔ کہ اس سے کوئی عام شہر مراد ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ یہ چیزیں تم کو یہاں تو ملیں گی نہیں کسی بستی میں چلے جاؤ وہاں پاؤ گے۔ فَاِنَّ لَکُمْ اس میں بتایا گیا۔ کہ یہ چیزیں بغیر محنت نہ ملیں گی۔ بلکہ تم کو محنت کرنا ہوگی۔ کیونکہ یُخْرِجُ اللّٰہُ لَکُمْ نہ فرمایا صرف لَکُمْ فرمایا یعنی تمہارے لئے وہاں مَا سَاَلْتُمْ وہ چیزیں ہیں جو تم نے مانگیں مجھے یہ لائق نہیں۔ کہ رب سے یہ چیزیں مانگوں تم نے مانگی ہیں۔ تم ہی پاؤ گے وَضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ ضرب کے چند معنی ہیں۔ مارنا۔ زمین پر چلنا۔ مثال بیان کرنا۔ لازم کرنا۔ مقرر کرنا۔ ڈالنا یہاں آخیری تین معنی مراد ہیں۔ کیونکہ علیٰ سے متعدی ہے۔ یعنی اُن پر ذلّت ڈالدی گئی۔ جیسے کہ کسی زمین پر خیمہ ڈالدیا جاتا ہے۔ اور وہ ہر طرف سے گھیر لیتا ہے۔ یا ذلت مقرر یا لازم قرار دی گئی۔ جیسے کہ سکہ پر نقش اس لئے اُس کو سکہ مضروب کہتے ہیں۔ الذِّلَّۃُ اس کے معنی خواری ہیں یعنی یہود پر خواری لازم کر دی گئی کہ قیامت تک اُن سے سلطنت چھین لی اور ہمیشہ کیلئے اُن کو مسلمانوں یا عیسائیوں کا غلام بنا دیا گیا۔ وَالْمَسْکَنَۃُ یہ سکن سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ٹھہر جانا۔ اور بیٹھ رہنا غریبی کو مسکنت اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اس سے بھی انسان بیٹھ کر رہ جاتا ہے۔ یعنی یہود پر ہمیشہ دوسری حکومتوں کی طرف سے ٹیکس وغیرہ اس قدر لگتے رہینگے جس سے وہ غریب رہیں گے۔ یا ٹیکس کے خوف سے ہمیشہ اپنی غریبی ظاہر کریں گے۔ کہ کوئی ہم کو مالدار سمجھ کر ہم پر ٹیکس نہ لگا دے۔ یا اُن کے دل حرص و ہوس کی وجہ سے ہمیشہ مسکین رہیں گے۔ اگرچہ بظاہر مالدار ہی ہو جاویں۔ اَلْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ "تونگری دل است نہ بہ مال" لہٰذا یہودی اگر مالدار بھی ہو جاوے تب بھی اُس کا دل غریب ہی رہتا ہے۔ یا یہ کہ اُن کے چہروں پر رونق نہ ہوگی چہروں سے فقر و فاقہ ظاہر ہوگا۔ جیسا کہ آج بھی ظاہر ہے۔ بہر حال بہت سی وجہوں سے وہ ذلیل و مسکین رہیں گے۔ خیال رہے۔ کہ مسکینیت تو خوبی ہے۔ اور مسکنت عیب مسکینیت کے معنی ہیں دل میں غرور وغیرہ نہ ہونا۔ اور مالداری کی وجہ سے غفلت نہ آنا مسکنت کے وہ معنی ہیں۔ جو ہم نے عرض کر دیئے حدیث میں جو آتا ہے۔ کہ اے اللہ مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ اور مسکین ہی بنا کر وفات دے۔ اس سے پہلے معنی مراد ہیں۔ قلب کا مسکین ہونا بہت کمال ہے۔ اور مسکنت بہت بڑا عیب وَبَآءُوْا یہ لفظ بوءٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ لوٹنا۔ برابر ہونا مستحق ہونا یعنی وہ لوگ غضب الٰہی میں لوٹے یا غضب کیساتھ لوٹے۔ یا غضب کے مستحق ہوئے۔ یا غضب اُن پر برابر ہوا (تفسیر کبیر) بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ غضب کے معنی ہیں بدلہ کا ارادہ یا قہر تنوین تعظیم کی ہے یعنی وہ رب کے بڑے ہی قہر کے مستحق ہو گئے۔ کہ دنیاوی عزت اور آخرت کی جنّت سے محروم رہے اور انبیاء کرام و اولیاء عظام کی برکت سے جو رتبے انہیں حاصل ہوئے۔ وہ سب جاتے رہے ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ یعنی یہ غضب الٰہی محض چند کھانے مانگنے کی وجہ سے نہ تھا۔ یہ تو ایک جائز کام تھا۔ بلکہ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وہ پہلے ہی سے رب کی نشانیوں کو جھٹلاتے تھے موسیٰ علیہ السلام کے فرمان پر دھیان نہ دیتے تھے۔ اور توریت شریف کی جو آیات اُن کی خواہشات کے خلاف ہوتیں۔ اُن کو بدل ڈالتے اور دوسرے پیغمبروں کا انکار کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اُن کو ذلت و رسوائی موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں حاصل نہ ہوئی۔ بلکہ بعد کو موسیٰ علیہ السلام نے آئندہ کی خبر دے دی تھی۔ کہ اب تمہاری خیر نہیں ہے۔ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ اگرچہ پیغمبروں کا قتل بھی کفر میں ہی داخل تھا۔ مگر چونکہ یہ تمام کفریات سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے اس کو علیحدہ بیان کیا یہودیوں نے بہت سے پیغمبروں کو شہید کیا۔ جیسے کہ حضرت شعیا و زکریا و شعیب و یحییٰ علیہم السلام اور بہت کو قتل کرنے کی کوشش کی جیسے کہ عیسیٰ علیہ السلام کہ ان کو سولی دینا چاہا۔ اور ہمارے حضور علیہ السلام کو زہر بھی دیا اور دوسری بھی کوششیں کیں۔ ایک دفعہ ایک دن میں ۷۰ پیغمبروں کو شہید کیا بِغَیْرِ الْحَقِّ۔ اگرچہ پیغمبر کو شہید کرنا ناحق ہی ہوتا ہے۔ مگر یہاں حق سے شرعی حق مراد نہیں ہے۔ بلکہ ظاہری حق مراد ہے یعنی وہ بظاہر بھی کوئی وجہ اس قتل کی پیش نہیں کر سکتے بلا وجہ ہی شہید کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو صرف چند روپیہ کی لالچ میں شہید کرنے کی کوشش کی حضرت زکریا و یحییٰ علیہم السلام کو بادشاہ نے صرف اس لئے شہید کیا کہ وہ اپنی سوتیلی لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ ان حضرات [illegible] حرام فرمایا۔ اور اس کی مرضی

کے مطابق فتویٰ ہی نہ دیا۔ غرضکہ اِن انبیاء کرام کا قتل خود اِن کے نزدیک بھی ناحق ہوا۔ **ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا** شائد کسی کو شبہ ہوتا۔ کہ وہ تو اہل کتاب تھے اُنہوں نے اپنے ہی پیغمبروں کو شہید کیوں کیا۔ تو فرمایا گیا۔ کہ یہ جرأت اُن کو اس لئے ہوئی۔ کہ وہ پہلے سے نافرمان تھے اوّلاً معمولی گناہ کیئے پھر بڑے گناہ کرنے کی ہمّت کی آخر کار انبیاء کرام کو شہید کرنے کی جراءت کر بیٹھے **وَكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ** پہلے تو گناہ کرنے کا ذکر فرمایا۔ اور اب حد سے بڑھنے کا یعنی وہ شرعی حدود کو توڑ کر آگے بڑھ گئے تھے۔ کہ حرام کاموں کو حلال جاننے لگے تھے۔ اور واعظین و علماء کے دشمن بن گئے تھے۔ اور جو آیات کہ گناہوں کی برائیاں بتاتی تھیں۔ اُن کی بے جا تاویلیں کر کے اپنے جرموں کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے جس کی وجہ سے اعتقاد میں فتور آگیا۔ گناہ کرنا علیٰحدہ چیز ہے۔ اور حد سے بڑھنا علیٰحدہ وہ بدعملی ہے۔ اور یہ بداعتقادی اور چونکہ بدعملی کا انجام بداعتقادی ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے پہلے عصیان اور بعد میں حد سے بڑھنے کا ذکر فرمایا۔ **خلاصہ تفسیر** اوّلاً تو موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو بہت سمجھایا کہ تم اس ذلیل خیال سے باز آجاؤ۔ مگر جب وہ باز نہ آئے۔ تو اُن سے فرمایا۔ کہ یہ چیزیں یہاں تو ملینگی نہیں تم کسی آبادی میں چلو وہاں پا جاؤ گے۔ کیونکہ مقصود تو یہ تھا۔ کہ وہ کچھ آگے بڑھیں۔ اُن کی اِن نافرمانیوں اور بداعتقادیوں نتیجہ یہ نکلا۔ کہ اے محبوب اُن پر ذلت و خواری و مسکنت لازم کر دی گئی۔ کہ قیامت تک ذلیل و خوار رہیں یہ اس کا نتیجہ تھا۔ کہ وہ ناحق انبیاء کرام کو قتل کرتے تھے اور یہ قتل کرنے کی جرأت اُن میں اس لئے پیدا ہوئی۔ کہ وہ پہلے سے گناہ کرنے اور حد سے بڑھ جانے کے عادی ہو چکے تھے۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے پہلا فائدہ یہ کہ انبیاء کرام کو رب تعالیٰ کی طرف سے خصوصی اختیارات ملتے ہیں جن کی بنا پر وہ خلق پر حکومت کرتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے رب سے دعا نہ فرمائی بلکہ اپنے خصوصی اختیار سے فرما دیا۔ کہ کسی شہر میں چلے جاؤ۔ جیسا کہ ہم تفسیر عزیزی کے حوالہ سے تفسیر میں عرض کر چکے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ غذا کا اثر کھانے والے پر پڑتا ہے۔ دیکھو بنی اسرائیل نے من و سلویٰ سے گھبرا کر زمینی غذائیں طلب کیں تو فرمایا گیا۔ کہ تم پست حوصلہ اور کم ہمت ہو جاؤ گے۔ ایسا ہی ہوا۔ اسی لئے شریعتِ پاک نے خراب غذاؤں کو منع فرما دیا فقہا فرماتے ہیں۔ کہ گلی سڑی نقصان وہ چیزیں کھانا منع ہیں **تیسرا فائدہ** یہ کہ دنیاوی نعمتیں محنت سے ملتی ہیں۔ بغیر محنت طلب کرنا حماقت ہے۔ اسرائیلیوں نے یہی تو کہا تھا۔ کہ من و سلویٰ کی طرح یہ چیزیں بھی بغیر محنت ہی ہم کو مل جایا کریں۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ **چوتھا فائدہ** یہ کہ گناہ کی عادت بدعقیدگی کا ذریعہ ہے۔ علماء فرماتے ہیں۔ کہ جو مستحب کو ہلکا جانے گا وہ سنت سے محروم کر دیا جاویگا۔ اور جو سنت کو ہلکا جانے یا اُس میں سستی کرے۔ وہ فرائض سے محروم ہو جاویگا۔ اور جو فرائض سے محروم ہے وہ معرفت سے دور ہوگا۔ اور جب معرفت دل سے نکلی تب اہل معرفت سے محبت چھوٹی اور اس کے چھوٹنے سے بدعقیدگی پیدا ہوگی۔ اس لئے مستحبات کی عزت اور عادت کرنی چاہیئے دیکھو اسرائیلی اوّلاً گناہ کے عادی ہوئے۔ پھر معصیت کو ہلکا جاننے لگے۔ اور پھر انبیاء کرام کے دشمن بن کر اُن کے قتل کی ہمت کر بیٹھے۔ اگر تمہارا بچہ سوئی کی چوری کرے تب ہی سرزنش کر دو اگر اس سے چشم پوشی کی تو آئندہ بڑی چیزیں چرانے کی ہمت کر کے آخر کار ڈاکو بن جاوے گا۔ نفس ناسمجھ بچہ ہے۔ احکام شرعیہ ہمارا اسباب مستحب کو ہلکا جاننا سوئی کی چوری ہے۔ اگر ابھی سے اس کو نہ روکا گیا۔ تو آئندہ بڑا مجرم بن جاویگا تمہارے مکان کے چند دروازے ہیں اور کوٹھڑی میں مقفل صندوق ہے جس میں دولت محفوظ مگر آپ چور کو پہلے دروازے ہی سے روک سکتے ہیں۔ کہ اگر وہ پہلا قفل توڑ کر گھر میں آجانے میں کامیاب ہو گیا۔ تو اُس کو دوسرے قفل توڑنا آسان ہوگا۔ شیطان چور ہے تمہارا ایمان دولت احکام شرعی اُس کی حفاظت کے قفل مستحب پہلا قفل ہے۔ جب وہ توڑ کر چور گھر میں آگیا تو دوسرے قفل بھی توڑے گا۔ اُس کو یہاں ہی روک دو۔ داڑھی منڈانے والے اور دیگر گنہگار اس سے عبرت پکڑیں۔ رب تعالیٰ ہم سب کے قفل محفوظ رکھے آمین **پانچواں فائدہ** یہ کہ چند حلال غذائیں کھانا جائز ہیں کیونکہ بنی اسرائیل کو اس سے روکا نہ گیا حضور علیہ السلام کو اور دیگر تیسری چیزیں مرغوب تھیں مسور اور زیتون صالحین کی غذا ہے۔ مسور سے دل نرم بدن ہلکا ہوتا ہے۔ قوت شہوانی کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ (روح البیان) **چھٹا فائدہ** یہ کہ لہسن پیاز

دیگر بدبودار حلال چیزیں جیسے کہ گندنا وغیرہ کھانا مباح ہے کیونکہ رب نے اسرائیلیوں کا یہ مطالبہ ذکر فرما کر اس کی تردید نہ فرمائی۔ البتہ حدیث پاک میں وارد ہے۔ کہ اگر کوئی شخص کچی پیاز وغیرہ کھا کر مسجد میں نہ آوے جب تک کہ منہ سے بو آتی ہو۔ کیونکہ اس سے رحمت کے فرشتوں کو (جو کہ مسجد میں رہتے ہیں) تکلیف ہوتی ہے۔ اسی طرح کوئی بدبو کی چیز مٹی کا تیل کچا گوشت مچھلی وغیرہ مسجد میں نہ لائی جاوے جس کسی کے زخم یا منہ سے بدبو نکلتی ہو وہ بھی مسجد میں نہ آوے۔ خواہ وہاں کوئی ہو یا نہ ہو۔ کیونکہ فرشتوں کو بہر حال اس سے تکلیف ہوگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچی پیاز خود کبھی ملاحظہ نہ فرمائی۔ دوسروں کو اجازت دی کیونکہ آپ فرشتوں سے کلام فرماتے تھے ساتواں فائدہ یہ کہ اللہ والوں کی عداوت رب کی رحمت سے محروم کر دیتی ہے رب نہیں چاہتا کہ میرے محبوب کا دشمن میری جنت میں آنے پائے جیسا کہ اسرائیلیوں کا حشر ہوا۔ کہ پیغمبروں کی عداوت نے دونوں جہاں میں انکو ذلیل و خوار کر دیا۔ آٹھواں فائدہ یہ کہ بغیر ایمان پیغمبر زادگی بیکار ہے۔ دیکھو بنی اسرائیل اولاد انبیاء ہیں مگر بد عقیدگی کی وجہ سے غضب الٰہی میں گرفتار ہو گئے۔ آج بھی جو کوئی اپنے کو سید کہلوا کر رافضی خارجی مرزائی دیوبندی وہابی وغیرہ بن جاوے۔ وہ سید ہی نہیں جب مسلمان نہیں تو سید کیسا کنعان کے حال سے سبق لو۔ نواں فائدہ یہ کہ رب کا عذاب فوراً نہیں آتا بہت مہلت ملتی ہے۔ اور جب آتا ہے پھر ٹلتا نہیں اسرائیلی پیغمبروں کو قتل کرتے رہے۔ مگر مہلت میں رہے پھر ایسی سخت پکڑ ہوئی۔ کہ قیامت تک اس میں گرفتار ہو گئے۔ **پہلا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ اسرائیلیوں نے پیغمبروں کو قتل کیا۔ مگر دوسری جگہ رب فرما رہا ہے۔ اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا اور فرماتا ہے۔ وَلَقَدۡ سَبَقَتۡ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الۡمُرۡسَلِيۡنَ اِنَّهُمۡ لَهُمُ الۡمَنۡصُوۡرُوۡنَ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حق تعالیٰ اپنے پیغمبروں کی مدد ضرور فرماتا ہے۔ جب انکی مدد ہوئی تو وہ یہود سے مغلوب کیوں ہو گئے **جواب**۔ اسکے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ مدد اور نصرت کے وعدے مجاہدین انبیاء کے متعلق ہیں۔ اور غیر مجاہدین نبی شہید ہوئے۔ یعنی اگر پیغمبر کفار سے جہاد فرماویں تو انشاء اللہ کافروں سے مغلوب ہو کر شہید نہ ہوں گے جن پیغمبروں کو شہید کیا گیا۔ ان پر جہاد فرض ہی نہ تھا۔ دوسرا یہ کہ مدد کی آیتوں میں دلائل کی مدد مراد ہے۔ یعنی دلائل میں کوئی پیغمبر کافر سے مغلوب نہ ہونگے۔ (تفسیر روح البیان) تیسرے یہ کہ مدد کی آیتوں میں باطنی امداد مراد ہے۔ کہ اگرچہ بظاہر کفار غالب بھی آجاویں۔ اور پیغمبروں کو شہید بھی کر دیں۔ مگر دراصل یہ شہادت پیغمبروں کی ہی فتح ہے۔ اور کفار کی شکست کیونکہ اس سے انکے دین کا غلبہ ہی ہوتا ہے۔ کفار کا مقصد پورا نہیں ہوتا بظاہر امام حسین کے مقابلہ میں یزیدیوں کو فتح ہوئی۔ امام حسین شہید ہوئے۔ مگر درحقیقت امام حسین کی فتح اور یزیدیوں کی سخت شکست ہوئی کیونکہ یزید اس جنگ کا مقصد نہ پا سکا۔ **دوسرا اعتراض** اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تا قیامت یہود کی سلطنت نہ ہوگی۔ اور احادیث میں آتا ہے۔ کہ دجال یہود میں سے ہوگا۔ وہ تو تمام دنیا میں بادشاہت کریگا۔ نیز بعض یہود غالب ہو کر کعبہ معظمہ کی عمارت کو بھی شہید کر دیں گے۔ اور آج بھی بعض جگہ یہودی حاکم ہیں۔ ہندوستان کا وائیسرائے یہودی رہ چکا ہے **جواب**۔ دجال وغیرہ کی مستقل سلطنت نہ ہوگی۔ بلکہ ڈاکوؤں کا سا شورش ہڑبونگ چالیس روز تک رہیگا۔ جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری پر ختم ہو جاویگا۔ اس ہڑبونگ کو کوئی بھی عاقل سلطنت نہیں کہتا۔ کسی جگہ کی عارضی حکومت مل جانا بھی سلطنت نہیں۔ اگر ہندو یا کوئی مسلمان چند روز کے لئے وائیسرائے بنا یا جاوے۔ تو اس سے مسلمانوں یا ہندوؤں کی سلطنت نہ ہو جاویگی وائیسرائے بھی حکومت کا غلام ہوتا ہے۔ یہاں مستقل سلطنت کی نفی ہے۔ اور واقعی اب تک یہود کی سلطنت ایک چپہ زمین پر بھی نہیں۔ اور نہ انشاء اللہ ہوگی **تیسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ یہودیوں پر ذلت اور غریبی لازم کر دی گئی حالانکہ آج بھی یہود بڑی مالدار قوم ہے **جواب**۔ اس کا مفصل جواب تفسیر میں گزر گیا۔ کہ وہ مالدار ہو کر بھی غریب ہی رہیں گے۔ ان کا دل غریب ان کا چہرہ غریبوں کا سا ان کے ساتھ برتاؤ غریبوں سے بدتر ہوگا۔ ابھی جب جرمنی نے یہودیوں کو اپنے ملک سے نکالا۔ تو بہت سے قبیلوں کو زمین پر جگہ نہیں ملتی تھی ان کا جہاز سمندر میں پھرتا پھراتا تھا۔ کوئی ملک اپنے یہاں اترنے نہیں دیتا تھا۔ یہ مالداری کس مصرف کی ذلت تو بالکل ظاہر ہے۔ اس سے بڑھ کر کیا ذلت ہوگی۔ کہ ان ناخواندہ مہمانوں کا آنا ہی کوئی گوارا نہیں کرتا۔ **تفسیر صوفیانہ** جیسے کہ بنی اسرائیل نے خباثت نفس کی وجہ سے ایک کھانے پر صبر نہ کر کے موسیٰ علیہ السلام سے ادنیٰ کھانوں کی درخواست کی ایسے ہی نفس امارہ اس ایک غیبی کھانے پر صبر نہیں کرتا جس

کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے۔ يُطْعِمُنِىْ رَبِّىْ وَيَسْقِيْنِىْ میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔ بلکہ یہ نفس امّارہ موسیٰ قلب سے عرض کرتا ہے کہ رب سے دعا کرکے ہم کو وہ کھانے دلا جو کہ بشریّت کی زمین سے پیدا ہوتے ہیں حیوانیت کا ساگ پات اور لذّات جسمانیہ کی لگڑیاں وغیرہ موسیٰ قلب کی طرف سے ارشاد ہوتا ہے۔ کہ تم عالم ارواح کی تیہ سے عالم سفلی کے شہر میں چلے جاؤ۔ وہاں تم کو یہ ادنیٰ مطالب حاصل ہوں گے اس نفس پر ذلت اور مسکنت ڈالدی گئی۔ کہ فرمایا گیا۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ کیونکہ یہ نفس مکاشفات روحانیہ اور انوار غیبیہ کا جو کہ آیات الٰہیہ ہیں منکر تھا۔ اور انبیاء کرام کے اسرار غیبیہ کا انکار کرکے اُن کے دین کو باطل کرنا چاہتا تھا جو کہ مثل قتل نبی کے ہے۔ اور اُس کو یہ ہمت اس لئے ہوئی کہ وہ ماسوی اللہ کا طالب بن کر پہلے سے عادی مجرم بن چکا تھا اور طلب حق میں کوتاہی کرکے حد سے آگے بڑھ گیا تھا (روح البیان)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

تحقیق وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے اور عیسائی اور صابئی لوگ جو کہ ایمان لے آئے ساتھ اللہ اور دن

بے شک ایمان والے نیز یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے وہ جو کہ سچے دل سے اللہ اور

الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

پچھلے کے اور کئے اُس نے اچھے کام پس واسطے اُن کے ثواب ہے اُنکا نزدیک رب اُن کے کے اور نہیں ہے ڈر اوپر اُن کے اور نہ وہ لوگ غمگین ہوں گے

پچھلے دن پر ایمان لائیں اور نیک کام کریں۔ اُن کا ثواب اُن کے رب کے پاس ہے۔ اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم

تعلق۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ قرآن کریم کا قاعدہ ہے۔ کہ کفر کے بعد ایمان اور غضب وقہر کے بعد لطف ومہر کا ذکر فرماتا ہے۔ اب تک یہود کے کفر اور اُن پر غضب کا ذکر تھا۔ اب ایمان اور رحمت رب کا ذکر فرمایا کیونکہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ پہلے ہلاک کرنیوالے عیوب کا ذکر ہوا اب نجات دینے والے صفات کا تاکہ یہود وغیرہ اُن سے توبہ کرکے صفات اختیار کریں۔ طبیب کامل دوا اور پرہیز دونوں بتاتا ہے۔ اور وجہ مرض بھی جتاتا ہے۔ تاکہ اُس سے بیمار آئندہ دور رہے تیسرے یہ کہ پہلے بتایا گیا۔ کہ یہود غضب الٰہی کی آگ کے مستحق بن چکے ہیں۔ اب فرمایا جاتا ہے۔ اس آگ کا بجھانے والا رحمت کا پانی بھی ہے۔ اگر یہ لوگ اب بھی اس دریا میں غوطہ لگالیں۔ تو ہم اُن کے سارے گناہ معاف کردیں گے۔ اب بھی وقت ہے چوتھے یہ کہ اس سے پہلے غضب کے اسباب کا ذکر ہوا۔ کہ قتل انبیاء وغیرہ وہ جرم تھے جس سے کہ صدہا بیماریاں پیدا ہوگئیں۔ اب رحمت کے اسباب کا ذکر ہے۔ کہ ایمان اور نیک کام وہ تریاق ہے جس سے سخت زہریلے سانپ یعنی کفر کا بھی زہر اتر جاتا ہے بعض اعمال نیکیوں کو برباد کر دیتے ہیں۔ وہ پہلے ذکر ہوگئے بعض اعمال برائیوں کو مٹا دیتے ہیں وہ اب بیان ہو رہے ہیں شان نزول حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایمان کی تلاش میں بہت سرگرداں رہے۔ اور ملک ملک پھرے بہت عیسائی راہبوں اور یہودی عابدوں کے حالات دیکھے اِن کی بہت بڑی عمر تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض حواریوں سے بھی ملے ہیں اس لحاظ سے یہ اُن کے تابعی اور حضور علیہ السلام کے صحابی ہیں واللہ اعلم۔ جب تقدیر نے اِن کو بارگاہ مصطفےٰ علیہ السلام تک پہونچادیا۔ اور یہ اسلام سے مشرف ہوگئے۔ تو انہوں نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عیسائی عابدوں کی سخت عبادات اور اُن کے استدراج وکرامات کا ذکر کیا۔ جو انہوں نے خود دیکھی تھیں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ کہ وہ کتنی ہی عبادات کریں۔ ایمان کے بغیر کچھ قبول نہیں اُس مبارک فرمان کی تائید میں یہ آیت اُتری اس کے اُترنے پر حضور علیہ السلام نے حضرت سلمان سے فرمایا۔ کہ یہ آیت تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے بارے میں اتری جو شخص دین عیسوی پر مرے اور ہماری تشریف آوری سے بے خبر رہے وہ تو خیر پر ہے۔ اور جو ہمارا نام سن کر پھر ایمان نہ لائے وہ ہلاک ہوگا۔ (از تفسیر عزیزی وخزائن العرفان) تفسیر اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اس سے یا تو منافقین مراد ہیں۔ جو کہ صرف زبان سے ایمان لائے تھے

نہ کہ دل سے اور ان کو منافق اس لئے نہ کہا تاکہ معلوم ہو کہ نام کا ایمان کام نہیں دے گا۔ یا وہ یہودی اور عیسائی مراد ہیں جو کہ حضور علیہ السلام سے پیشتر عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ پر ایمان لائے اور خرافات سے بچے رہے جیسے کہ قیس ابن ساعدہ۔ بحیرہ راہب جبیب بخار۔ زید ابن عمر ابن نفیل۔ ورقہ ابن نوفل سلمان فارسی۔ ابوذر غفاری۔ وفد نجاشی وغیرہ یا اس سے مخلص مومنین اہل اسلام مراد ہیں۔ اس جگہ اُن کا گذشتہ ایمان مراد ہے۔ آئندہ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ میں مستقبل کا ایمان یعنی خاتمہ بالخیر حاصل ہونا یعنی جو فی الحال ایمان لے آئے اور ایمان پر وفات پا گئے وَالَّذِيْنَ هَادُوْا اور وہ جو یہودی ہوئے۔ یہ لفظ یا توھود سے بنا ہے جس کے معنی ہے۔ توبہ کرنا رجوع کرنا چونکہ انہوں نے بچھڑے کی پوجا سے بے مثل اور سخت توبہ کی تھی۔ اسلئے ان کو یہودی کہا گیا۔ کیونکہ اُنہوں نے عرض کیا تھا۔ هُدْنَا اِلَيْكَ یا یہ لفظ یہودا کی طرف نسبت ہے۔ یہودا یعقوب علیہ السلام کے بڑے فرزند کا نام تھا یعنی یہودا والے لوگ یا ھود کے معنی میں ہلنا حرکت کرنا چونکہ یہ لوگ توریت شریف بہت جوش سے ہل کر جھوم کر پڑھتے تھے۔ اس لئے یہودی نام ہوا۔ یا ھود کے معنی ہیں۔ رہبری کرنا مخبری کرنا یہ بادشاہ وقت کو انبیاء اکرام کی خبر دیکر اُنہیں قتل کراتے تھے۔ اس لئے یہ لقب غضب ملا (تفسیر کبیر و روح البیان) انکے عقائد نہائیت گندے ہو چکے تھے حق تعالیٰ کو جسم مانتے تھے۔ انبیاء کرام پر تہمت لگاتے تھے موسیٰ علیہ السلام پر ہارون علیہ السلام کے قتل کی تہمت حضرت مریم کو زنا کی تہمت حضرت داؤد علیہ السلام کو اوریا کے قتل کی تہمت۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جادوگری کی تہمت لگائی۔ انہوں نے توریت کو بدلا حضور علیہ السلام کی نعت کی آیتوں کو صاف بگاڑ دیا۔ یہ یہودی نبی کو محض ایلچی مانتے تھے۔ یعنی اُس کی قدر رب کے نزدیک زیادہ نہیں فقط قاصد اور چٹھی رساں کی سی ہے (تفسیر عزیزی) یہ ہی عقیدہ اس زمانہ کے دیوبندیوں کا ہے شائد یہ فرقہ بھی یہود کی ہی شاخ ہے دیکھو تقویۃ الایمان" وَالنَّصٰرٰى یہ نصران کی جمع ہے۔ جیسے کہ ندمان کی جمع ندامیٰ یہ لفظ نصر سے بنا ہے جس کے معنی ہیں مدد کرنا عیسائیوں کو یا تو اس لئے نصاریٰ کہتے ہیں۔ کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَى اللّٰهِ میرا مددگار کون ہے تو اُن کے ساتھیوں نے عرض کیا نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں۔ جیسے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت کا نام انصار ہے۔ یا ناصرہ ایک بستی کا نام تھا جہاں عیسیٰ علیہ السلام اکثر تشریف لایا کرتے تھے اُس کی طرف ان کو منسوب کیا گیا۔ ان کے نہائیت واہیات عقیدے ہیں۔ یہ عیسیٰ علیہ السلام میں خدائی کا حلول مانتے ہیں جیسے کہ پھول میں خوشبو ان کا عقیدہ ہے۔ کہ ہم کو نیک اعمال کی ضرورت نہیں عیسیٰ علیہ السلام ہم سب کی طرف سے سولی پا گئے اُن کی صلیب ہمارے گناہوں کا کفارہ بن گئی اور قیامت کے دن عیسیٰ علیہ السلام ہی سب کو نجات یا عذاب دیں گے۔ وَالصّٰبِئِيْنَ یہ لفظ صَبَاءٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں نکل جانا چونکہ یہ بھی ہودیت سے نکل کر ستارہ پرست بن گئے۔ اسلئے صابی کہلائے گئے۔ یا اسکے معنی ہیں اونڈیلنا۔ کوٹ دینا۔ گرانا۔ ان بدنصیبوں نے پہلے انبیاء کرام کو گرفتار کر کے اُن کے سروں پر کھولتا ہوا پانی اونڈیل کر شہید کیا۔ اسلئے ان کا یہ نام ہوا۔ ان کے بھی بہت بُرے عقیدے ہیں۔ ان کے مذہب کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ آدمی سعادت حاصل کرنے میں کسی پیغمبر یا مرشد کا حاجتمند نہیں اس کو چاہیئے کہ روحانیات سے مناسبت پیدا کرے۔ ان میں سے بعض لوگ ستاروں کی پوجا کرتے ہیں۔ اور بعضے ستاروں کے نام کے بت بنا کر انہیں سجدہ کرتے ہیں۔ ان میں ایک فرقہ ہے جس کا نام کلدائیین اسی کا ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں زور تھا۔ اور آپ انہیں کے مقابلے کیلئے بھیجے گئے بعض صائبین تین وقت کی نماز بھی پڑھتے ہیں۔ اور اُونٹ۔ کبوتر پیاز کو حرام جانتے ہیں۔ اور شراب کو جائیز بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ صائبین عراق کے علاقہ میں ہیں کسی پیغمبر کو نہیں مانتے بعض نے فرمایا۔ کہ ان کا مذہب عیسائیوں اور مجوسیوں کے درمیان ہے بعض نے کہا۔ کہ یہ اہل کتاب میں سے ہیں۔ زبور پڑھتے ہیں۔ بعض نے کہا۔ کہ یہ ملائکہ کی پرستش کرتے ہیں غرضکہ ان کے دین کی صحیح تحقیق نہ ہو سکی۔ کیونکہ یہ تقریباً مٹ چکے ہیں۔ (تفسیر عزیزی و کبیر) اسی واسطے ہمارے اماموں میں اختلاف ہے بعض نے ان کو اہل کتاب مان کر ان کی عورتوں سے نکاح اور ان کا ذبیحہ حلال مانا ہے۔ بعض نے فرمایا۔ کہ یہ مشرک ہیں۔ اور ان کا ذبیحہ وغیرہ حرام ہے۔ مَنْ اٰمَنَ یہاں صحیح اور سچا ایمان یا خاتمہ کے وقت کا ایمان مراد ہے۔ ورنہ ہر کافر اپنے کو مومن سمجھتا ہے۔ بِاللّٰهِ اللہ پر ایمان ماننے میں

اس کی ذات وصفات اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا بھی داخل ہے۔ اگر اس کی ایک صفت کا بھی انکار کیا گیا۔ یا اس کیلئے کوئی عیب مانا گیا یا اسکے کسی نبی کا انکار کیا گیا۔ تو اللہ پر ایمان حاصل نہ ہوا۔ لہٰذا یہودی عیسائی صابئی وغیرہ کوئی بھی اللہ پر ایمان نہیں رکھتے کیونکہ یہ اس کے بعض پیغمبروں کے منکر ہیں۔ اور اس کیلئے بیوی بیٹا جسم وغیرہ عیوب مانتے ہیں۔ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ اس سے قیامت کا دن مراد ہے۔ اور جنت دوزخ حساب کتاب اور سارے احکام شرعیہ پر ایمان لانا اس میں داخل ہے جو شخص ان میں سے ایک کا بھی انکار کر دے۔ وہ درحقیقت قیامت کا منکر ہے۔ مثلاً جو نماز کا منکر ہے۔ وہ قیامت کے دن اسکے حساب وکتاب کا قائل نہیں، لہٰذا وہ صحیح معنی میں قیامت کا قائل نہیں۔ ان دو لفظوں میں ساری ایمانی باتیں داخل ہوگئیں۔ وَعَمِلَ صَالِحًا ایمان کے بعد عمل کا ذکر فرما کر یہ بتایا گیا۔ کہ کوئی شخص ایمان پر کفایت کرکے اعمال سے بے پرواہ نہ ہو جائے۔ ایمان سے نجات ہوتی ہے۔ اور اعمال سے کامل نجات صالح عمل وہ ہے۔ جو اللہ کو پسند ہو منسوخ اعمال اب صالح نہیں رہے۔ اگرچہ ایک وقت میں صالح تھے۔ لہٰذا محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد یہودیت اور عیسائیت کے اعمال گناہ بن گئے۔ مندر کا پوجاری گرجے اور کنیسہ میں بیٹھنے والے لوگ اب نیک کار نہیں۔ فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ یعنی ان کو پورا اجر ملے گا۔ اس میں اشارۃً بتایا گیا۔ کہ اگر یہودی عیسائی اب بھی ایمان لے آئیں تو ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائینگے اور انہیں پورا ثواب دیا جائیگا۔ گویا کہ وہ پہلے سے ہی مومن تھے۔ سو برس کا ایمان دار اور ایک دن کا ایمان دار اجر میں برابر ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ یہ خیال نہ کریں۔ کہ اتنا عرصہ کفر کرنیکے بعد اب ایمان لانا بیکار ہے۔ خیال رہے کہ ایمان کا اجر سب کیلئے یکساں ہے۔ یعنی جنت۔ ہاں اعمال اور کیفیتِ ایمانی کے ثواب میں فرق اسی لئے جنت میں مختلف درجے ہیں۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ انکے رب کے پاس عِنْدَ سے نہ تو قرب مکانی مراد ہے اور نہ قرب حفاظت بلکہ قرب یقینی مراد ہے یعنی ان کا ثواب یقینی ہے جس میں کچھ تردد نہیں اسجگہ رب فرما کر یہ بتایا کہ جسطرح حق تعالیٰ تمہاری پرورش کرتا ہے ایسے ہی تمہارے اعمال اور ایمان کی بھی کہ ایک ساعت کے ایمان اور تھوڑے سے عمل کو صد سالہ ایمان اور اعمال کے برابر بنا دیتا ہے اور تھوڑی سی نیکی پر عمر کی نیکی کا ثواب عطا فرما دیتا ہے حق تعالیٰ ایمان اور اعمال بقبول عطا فرمائے۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ یا تو اس سے آخرت کا خوف مراد ہے یعنی وہاں کفار کو ڈر ہوگا۔ نہ کہ مومنین کو اور یا دنیا اور آخرت کا عام خوف یعنی اگر یہ ایمان لے آئیں۔ تو انہیں گذشتہ کفر اور بدکاریوں کا کوئی ڈر نہیں۔ کیونکہ وہ سارا میل کچیل ایمانی پانی اور رحمت ربانی سے دُھل گیا۔ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ اس میں بھی وہی دو احتمال ہیں۔ کہ یا تو وہ قیامت میں غمگین نہ ہوں گے اور یا دنیا میں بھی یعنی ان کو ایمان لانے کے بعد گذشتہ عمر کے برباد ہونے کا رنج وغم نہ ہوگا۔ بلکہ آئندہ کے راحت کے خیال سے دل کو خوشی حاصل ہوگی **خلاصہ تفسیر** پچھلی آیتوں میں یہود کی ذلت اور ان پر وقتاً فوقتاً عذاب الٰہی کا نزول بیان کیا گیا تھا۔ اور انکی انتہائی بدعملیوں کا ذکر ہوا تھا جس سے ان کو ایک طرح کی مایوسی ہو سکتی تھی۔ اس آیت میں ان کی مایوسی کو مٹایا گیا۔ اور فرمایا گیا۔ کہ ہمارے ہاں کسی شخص کی ذات سے عداوت نہیں صرف ایمان اور اعمال پر نجات کا دار ومدار ہے مسلمان ہو یا عیسائی یہودی ہو یا صابئی جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لاکر اچھے کام کریگا۔ اس کو خدا کے پاس ضرور ثواب ملے گا۔ نہ تو اسے خوف عذاب ہوگا۔ اور نہ یہ رنج کہ ہم نے بہت سی عمر برباد کیوں کر دی کیونکہ نئے اور پرانے مومن ہمارے ہاں برابر ہیں۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** یہ کہ بغیر ایمان کوئی عمل قبول نہیں۔ ایمان جڑ ہے۔ اور اعمال پانی جڑ کٹنے کے بعد پانی دینا بیکار ہے۔ **دوسرا فائدہ** یہ کہ ساری ایمانیات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ایک کا بھی انکار کفر ہے **تیسرا فائدہ** یہ کہ ایمان میں زیادتی کمی نہیں اور نہ اس میں نئے پرانے کا اعتبار **چوتھا فائدہ** یہ کہ کوئی اپنے بزرگوں کی عظمت پر گھمنڈ نہ کرے۔ پیر اور فقیر زادے۔ بادشاہ اور امیر زادے سب ایمان وعمل کے حاجتمند ہیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل اپنی پیغمبر زادگی پر ناز کرکے ایمان اور اعمال سے بے نیاز ہو گئے تھے۔ اس آیت میں ان کو یہ ہی بتایا گیا مسلمانوں کو بھی اس سے سبق لینا چاہیئے۔ **پانچواں فائدہ** یہ کہ حق تعالیٰ کو کسی سے ذاتی عناد نہیں ہر شخص ایمان واعمال اختیار کرکے اس کی رحمت پا سکتا ہے۔ یہود نے ایک وقت ایمان اور نیکوکاری کی بدولت دنیا پر فضیلت حاصل کی پھر وہ ہی قوم بے ایمان اور بدکار بن کر ذلیل وخوار ہوگئی۔ پچھلوں کی ترقی وتنزل سے اگلوں کو سبق لینا چاہیئے۔

**پہلا اعتراض** اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے ایمان سمجھا گیا تھا۔ پھر مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ کے کیا معنی **جواب** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ کبھی دوستوں کا ذکر کر کے دشمنوں کو سنایا جاتا ہے۔ جیسے کوئی بادشاہ کہے کہ ہمارا کوئی موافق ہو یا مخالف جو ہماری اطاعت کریگا۔ وہ ہم سے انعام لے گا۔ ظاہر ہے۔ کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے مخالف ہی کو سنانا منظور ہے جس کا منشا یہ ہے۔ کہ اے مخالفو ہمیں موافقین سے کوئی ذاتی خصوصیت نہیں۔ بلکہ انکی اطاعت ہماری مہربانی کا سبب ہے۔ اگر تم بھی اس زمرے میں آجاؤ۔ تو تم کو بھی انعام ملے گا۔ دوسرے یہ کہ یہ عطف تفسیری ہے۔ اہل کتاب اپنے کو مومن سمجھتے تھے۔ تو فرمایا گیا۔ کہ جو لوگ اپنے کو مومن جانتے ہیں یعنی یہود و نصاریٰ وغیرہ یہ حقیقتاً مومن نہیں اور مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ سے حقیقی ایمان مراد یعنی جو بھی ان میں سے حقیقی ایمان لے آئے۔ خدا سے اس کا اجر پائیگا اور باقی وہ ہی جواب ہیں جو ہم تفسیر میں بتا چکے یعنی اٰمَنُوْا سے منافقین مراد اور مَنْ اٰمَنَ سے مخلصین یا اٰمَنُوْا سے دنیوی مومن مراد اور مَنْ اٰمَنَ سے موت کے وقت کے مومن یا آمنو سے ایمان لانے والے مراد اور مَنْ اٰمَنَ سے ایمان پر قائم رہنے والے **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ فقط اللہ اور قیامت پر ایمان لانا کافی ہے۔ نہ کہ قرآن وغیرہ باقی چیزوں پر **جواب**۔ اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا کہ ان دو باتوں میں سارے ایمانیات داخل ہیں جب مبدا اور مبدی اور معاد اور منتہا کا ذکر کر دیا۔ تو درمیانی چیزیں خود بخود شامل ہو گئیں۔ کوئی کہتا ہے۔ کہ میں پشاور سے کلکتہ پہنچا۔ تو راستہ کے تمام شہر خود بخود اس میں آ گئے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا دعویٰ تھا۔ کہ ہم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہاں ان کے اس خیال کی تردید کر دی گئی **تیسرا اعتراض** فَلَھُمْ کی ف سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ثواب ایمان اور عمل دونوں پر مرتب ہے۔ لہٰذا بد عمل مومن اور نیک عمل کافر دونوں ہی ثواب سے محروم ہیں تو چاہیئے۔ کہ گنہگار مسلمان اور کافر برابر ہوں **جواب** اسکے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یقینی ثواب بلا عذاب نیک کار مومن ہی کیلئے ہے۔ کافر کیلئے ثواب ہی نہیں اور گنہگار مسلمان کیلئے ثواب تو ہے۔ مگر پہلے کچھ عذاب کا بھی اندیشہ ہے۔ دوسرے یہ کہ یہاں تین چیزوں کا ذکر ہے۔ ثواب کا ملنا اور خوف و غم سے محفوظ رہنا۔ اور یہ تینوں باتیں صرف نیک کار مسلمانوں کو ہی حاصل ہونگی۔ گنہگار مسلمانوں کو قیامت کے دن کچھ خوف و غم بھی ہوگا۔ خیال رہے۔ کہ بدکار سے وہ مراد ہے۔ جو اعمال کا موقعہ پائے اور نہ کرے جس کو موقعہ ہی نہ ملا اُس کیلئے صرف ایمان ہی نیک عمل بھی ہے۔ یہاں تک کہ متقی مسلمانوں کے نابالغ بچے بھی انشاء اللہ متقین میں ہی شمار ہوں گے **تفسیر صوفیانہ** ایمان کی چند نوعیتیں ہیں تقلیدی ایمان۔ رسمی ایمان عادی ایمان تحقیقی ایمان کسی کے دیکھا دیکھی محض باپ داداؤں کی پیروی پر بغیر تحقیق کئے مسلمان بن جانا تقلیدی ایمان ہے اور اگر عقیدہ درست نہ ہو فقط لوگوں کی شرم سے نماز وغیرہ پڑھ لینا اور ایمان کے مراسم ادا کر لینا رسمی ایمان ہے اور عادت سے مجبور ہو کر عبادت کرنا۔ عادی ایمان یہ تینوں ایمان ناقص ہیں۔ ہاں جس کا قلب نور معرفت سے منور ہو۔ اور وہ اس نور قلبی سے اللہ اور یوم آخر کو پہچانے اس پر انانیت کے حجاب کا خوف نہیں۔ اور نہ وہ دوئی کے بھنور سے غمگین ہو کیونکہ وہ توحید کے دریا میں غوطہ زن ہیں۔ اور لا الٰہ کی تلوار سے اپنا سب کچھ فنا کر کے اِلَّا اللّٰہ کی برکت سے باقی باللہ ہیں نیز ایک ایمان فطری ہے۔ جو میثاق کے دن بلیٰ کہہ کر سب کو حاصل ہوا مگر اس ایمان میں سعید و شقی میں فرق نہ تھا جب یہ اپنی ماؤں کے پیٹ میں آئے تب کاتب تقدیر نے عالم اقرار پر نظر نہ کی۔ بلکہ علم اللہ القہار پر نظر کر کے ہر ایک کی سعادت و شقاوت لکھی۔ اسی لئے ایک حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ دوسری حدیث میں ہے۔ کہ جس بچے کو حضرت خضر نے قتل کیا۔ وہ کافر پیدا ہوا تھا پہلی حدیث میں میثاقی ایمان مراد ہے۔ اور دوسری میں شکم مادر کا ایمان اسلئے صوفیاء کرام کے اس ایمان کے چار مقام ہیں۔ ایک بطن معنوی جسے صوفیاء کرام ام یا ام الکتاب کہتے ہیں۔ دوسرا مقام بلیٰ جسے مولود معنوی کہا جاتا ہے تیسرا بطن ام صوری اور چوتھا مولود صوری بطن اُم صوری یہ اللہ کا علم ہے جس میں سعید و شقی کا فرق موجود ہے۔ اس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے۔ اَلسَّعِیْدُ سَعِیْدٌ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ وَالشَّقِیُّ شَقِیٌّ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ دوسری روایت میں آیا اَلسَّعِیْدُ قَدْ یَشْقٰی وَالشَّقِیُّ قَدْ یَسْعَدُ غرضیکہ میثاقی سعادت بدل جاتی ہے۔ اور علم اللہ کی سعادت و شقاوت نہیں بدل سکتی تو اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں پہلی قسم کا ایمان مراد ہے۔ اور مَنْ اٰمَنَ میں آخری قسم معتبر

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا

اور جبکہ لیا ہم نے عہد تمہارا اور اٹھایا ہم نے اوپر تمہارے طور کو تو تم لوگ وہ چیز جو دی ہم نے تم کو ساتھ طاقت کے اور یاد کرو تم

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر طور کو اونچا کیا۔ لو جو کچھ ہم تم کو دیتے ہیں زور سے اور اس کے مضمون یاد کرو۔

مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ

وہ جو ہے بیچ اسکے شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ پھر پھر گئے تم لوگ پیچھے سے اس کے پس اگر نہ ہوتا فضل اللہ کا

اس امید پر کہ تمہیں پرہیزگاری ملے۔ پھر اس کے بعد تم پھر گئے تو اگر اللہ کا فضل

عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾

اوپر تمہارے اور رحمت اس کی البتہ ہو جاتے تم ٹوٹا پانے والوں میں سے

اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم ٹوٹے والوں میں ہو جاتے۔

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کی نو نعمتوں کا ذکر ہو چکا اب دسویں نعمت کا ذکر ہو رہا ہے۔ اِن نعمتوں کے درمیان ایمان اور اعمال کا ذکر جملہ معترضہ کے طریقہ پر تھا۔ تاکہ سننے والا مسلسل مضمون سے اکتا نہ جائے۔ خیال رہے۔ کہ قرآن کریم کی مثال اس بازار کی سی ہے جس میں مختلف دکانیں ایک ہی لائن میں ہوتی ہیں جہاں سے ہر حاجتمند اپنی ضروریات زندگی تھوڑے سے وقت میں حاصل کر سکتا ہے۔ اگر مختلف دکانیں مختلف بازاروں میں ہوں۔ مثلاً ایک بازار میں کھانے ہی کی دکانیں ہوں۔ اور دوسرے میں کپڑے ہی کی۔ تو خریدار کو بہت دشواری بھی ہوگی۔ اور اس کا بہت وقت بھی خرچ ہوگا۔ اسی طرح قرآن کریم میں قصے مثالیں احکام وغیرہ کے مضامین نہائت عمدہ ترتیب سے ہر جگہ جمع ہوتے ہیں۔ تاکہ خریدار عقیدت کی پونجی صرف کرکے نہائت آسانی سے ہر ضرورت پوری کرے وہی طریقہ یہاں ہے۔ **دوسرا تعلق** اس سے پہلے بنی اسرائیل کو نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور نیک اعمال کی رغبت دی گئی۔ اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اے اسرائیلیو شروع سے ہی تمہاری طبیعت عیش پسند اور تکلیفوں سے گھبرانے والی ہے۔ دیکھو تمہارے باپ داداؤں نے خود ہی توریت مانگی تھی اور خود اس کے احکام دیکھ کر پھر گئے تھے۔ تب ان کو مجبور کر کے منوایا گیا تھا۔ اب بھی تم نے دعائیں کر کر کے نبی آخر الزمان کو پایا۔ اور جب وہ تشریف لے آئے۔ تو اپنی رشوتوں اور آمدنیوں کے کم ہونے کے خوف سے تم ان سے پھر گئے بہت ممکن ہے۔ کہ پہلے کی طرح اب بھی تم کو قتل قید اور جلاوطنی اور جنیئے سے ڈرا کر ایمان کی رغبت دی جائے۔ اسلئے بہتر ہے۔ کہ تم خوشی خوشی ہی ایمان لے آؤ۔ تاکہ تمہیں یہ دن نہ دیکھنا پڑے۔ تو گویا پچھلی آیت میں ثواب وغیرہ کا لالچ دیکر اُن کو ایمان کی رغبت دی گئی۔ اور اب نہائت حکیمانہ انداز میں کسی قدر دھمکا کر اس شانِ کرم پر قربان ہر طرح ہمارا بھلا کرنا منظور ہے۔ **تفسیر وَاِذْ اَخَذْنَا** یہاں بھی وہ ہی فعل پوشیدہ ہے یعنی اے اسرائیلیو وہ واقعہ یاد کرو۔ یا اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو یاد دلادو۔ یہ واقعہ تیہ کے واقعہ سے پیشتر کا ہے جس وقت کہ نبی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بحرِ قلزم سے بخیر و عافیت نکل گئے۔ اور فرعون غرق ہو چکا یہ پورا واقعہ انشاءاللہ خلاصہ تفسیر میں عرض کیا جائیگا۔ **مِيْثَاقَكُمْ** یہ لفظ وثوق سے بنا ہے جس کے معنی ہیں مضبوطی پھر اور قرض کی تحریر کو بھی اسی لئے وثق یا وثیقہ کہتے ہیں۔ کہ اس سے ایک چیز کی مضبوطی کی جاتی ہے۔ اصطلاح میں نہائت مضبوط عہد کو میثاق کہا جاتا ہے۔ ہم وعدہ اور عہد اور میثاق کا فرق پہلے بیان کر چکے ہیں۔ جب بنی اسرائیل نے کتاب الٰہی مانگی تھی۔ تب ہی موسیٰ علیہ السلام نے اُن سے بہت مضبوط عہد و پیمان لے لیا تھا۔ کہ تم مانگ تو رہے ہو۔ بعد میں پھر نہ جانا۔ اگرچہ ہر شخص سے علیحدہ عہد لیا گیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ ایک ہی نوعیت کا عہد تھا۔ اسلئے میثاق واحد فرمایا گیا۔ اس کی جمع یعنی مواثیق نہ فرمائی گئی۔ جیسا کہ قرآن کریم

فرماتا ہے۔ ثُمَّ یُخْرِجُکُمْ طِفْلًا یہاں بھی اطفال نہ فرمایا اسی ہی وجہ سے وَرَفَعْنَا جب کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو توریت لاکر دی۔ یہ آزاد لوگ اس کی پابندیاں اور سخت احکام دیکھ کر گھبرا گئے۔ تب ان پر طور پہاڑ اکھیڑ کر مثل شامیانہ کے کھڑا کر دیا گیا۔ یہاں رفعنا کے معنی جڑ سے اُکھیڑ کر اوپر کو اٹھا دینا ہیں۔ اس سے یہ سمجھنا کہ یہودی پہاڑ کی جڑیں کھڑے تھے۔ اور اس کے گرنے سے ڈرتے تھے محض حماقت ہے۔ کیونکہ اس قسم کا اونچا ہونا تو پہلے ہی سے حاصل تھا۔ پھر رَفَعْنَا کے کیا معنی۔ یہ فعل تو حدوث کو چاہتا ہے۔ یعنی غیر موجود کو موجود کرنا نیز اس صورت میں موسیٰ علیہ السلام کا کوئی خاص معجزہ نہ ہوتا۔ نیز اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پورا طور اُٹھا کر اوپر لایا گیا۔ اور اس تاویل کی بنا پر اس کا بعض حصہ زمین کے نیچے بھی رہا۔

فَوْقَکُمْ روایت میں آتا ہے۔ کہ حضرت جبریل بحکم الٰہی اس پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھیڑ کر اور لپیٹ کر پر دل پر اٹھا کر لائے۔ اور قد آدم فاصلہ سے بنی اسرائیل کے سر پر کھڑا کر دیا۔ بنی اسرائیل چار فرسخ (کوس) میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ پہاڑ بھی اتنا لمبا چوڑا کر دیا گیا۔ اَلطُّوْرَ یہ سریانی لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں ابھرا پہاڑ۔ اور اب یہ لفظ اس پہاڑ کا نام بن گیا۔ جہاں موسیٰ علیہ السلام رب سے ہم کلام ہوتے تھے بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ یہاں اس سے عام پہاڑ مراد ہے۔ یعنی ایک پہاڑ کو ان کے سر پر کھڑا کر دیا گیا۔ کیونکہ اس وقت بنی اسرائیل طور پہاڑ سے بہت دور تھے۔ مگر صحیح یہ ہے۔ کہ اس سے خاص موسیٰ علیہ السلام کا طور ہی مراد ہے۔ کیونکہ اگر طور کے لغوی معنی بھی مراد لو۔ تب بھی الف لام عہدی کی وجہ سے وہ خاص ہی مراد ہوگا۔ اور جو رب کہ پہاڑ اکھیڑنے پر قادر ہے۔ وہ دور تک لیجانے پر بھی قادر ہے (تفسیر کبیر) خُذُوْا یہ لفظ اَخْذٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں پکڑنا اور لینا۔ یہاں توریت کی تختیوں کا ہاتھ سے پکڑنا مراد نہیں۔ بلکہ ماننا اور دل میں لینا مراد ہے۔ یعنی ہم نے ان سے کہا کہ تم قبول کرلو۔ مَآ اٰتَیْنٰکُمْ وہ احکام یا وہ کتاب جو ہم نے تم کو عطا فرمائی بِقُوَّۃٍ یعنی پوری کوشش سے لو جیسے کہ دنیوی تھوڑا نفع حاصل کرنے کیلئے بڑی مشقتیں برداشت کرلیتے ہو اسی طرح دینی نفع کیلئے توریت کے سخت احکام بھی برداشت کرو۔ رنج و راحت مصیبت و آرام کسی حالت میں اسکو نہ چھوڑنا اور اس پر دائم قائم رہنا۔ وَاذْکُرُوْا مَا فِیْہِ یہ لفظ یا ذکر سے بنا ہے یا ذِکر ہی سے یعنی اس کتاب کو بیکار طاق میں نہ رکھ دینا بلکہ اس کے احکام کو حفظ کرلینا۔ اس کی تلاوت کیا کرنا۔ مدرسوں میں اس کو پڑھایا کرنا۔ اس سے غافل نہ ہو جانا۔ اور یا اس کی آیات میں غور کرنا اور اس سے نصیحت حاصل کرنا۔ اور اس پر عمل کرنا۔ بلا عمل فقط پڑھنا کافی نہیں۔ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔ لَعَلَّ رب کی طرف سے یقین کے لئے ہے۔ اور بندوں کی طرف سے امید کیلئے یعنی تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ یا اس امید پر تم توریت کے عامل بنو کہ تم متقی ہو جاؤ نہ دنیوی لالچ پر۔ اتقاء سے مراد یا تو جہنم سے بچ جانا ہے۔ یا پرہیزگار بن جانا۔ کیونکہ توریت پر عمل کرنے سے دنیا میں پرہیزگاری اور آخرت میں جہنم سے دستگاری حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں اس کا ذکر فرمایا گیا۔

ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ یہ لفظ ولی سے بنا ہے جس کا معنیٰ ہے قریب ہونا۔ اس باب میں آکر سلب کے معنی پیدا ہوئے۔ تو معنی ہوئے قرب کو دور کر دینا اور پھر جانا۔ یعنی تم یہ عہد و پیمان کر کے اور مجبوراً توریت کو مان کر اس سے پھر گئے۔ کہ نہ تم نے توریت کے احکام پر عمل کیا۔ اور نہ اس پڑھنا پڑھانا باقی رکھا اور نہ اس کی حفاظت کی بلکہ اس کتاب کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنا لیا۔ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ۔ ذٰلِکَ کا اشارہ یا میثاق کی طرف ہے۔ یا طور کو اٹھانے کی طرف یا اس پورے واقعہ کی طرف یعنی تم نے اتنے اہم واقعات کے بعد بھی اپنے وعدہ کی وفا نہ کی۔ اور بے وفائی عقلاً نقلاً سخت بری چیز ہے۔ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ یا تو فضل رحمت ایک ہی معنی میں ہیں۔ اور یا فضل سے مراد قبول توریت کی توفیق دینا اور رحمت سے مراد بعد کی بے وفائیوں پر عذاب نہ بھیجنا ہے۔ یعنی اگر پہاڑ وغیرہ اٹھا کر تم سے توریت قبول نہ کرائی جاتی۔ اور بعد کی بدعملیوں پر تم کو مہلت نہ دی جاتی۔ تو لَکُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ تم خسارے والوں سے ہو جاتے خسارہ اصل پونجی کے ضائع ہو جانے کو کہتے ہیں۔ اس میں لطیف اشارہ اس جانب بھی ہے۔ کہ سختی سے احکام منوانا درحقیقت رحمت ہے۔ اور نبی آخر الزمان کے زمانہ کو بھی پالینا عین فضل الٰہی ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ اب بھی سنبھل جاؤ۔ اور اس پیغمبر علیہ السلام پر ایمان لے آؤ۔ **خلاصہ تفسیر**۔ قانون ہدایت بیان فرمانے کے بعد ارشاد ہو رہا ہے۔ کہ اے اسرائیلیو ہم نے تم پر یہاں تک مہربانی فرمائی۔ کہ جیسے احمق بیمار کو مہربان طبیب زبردستی دوا

پلاتا ہے۔ اسی طرح ہم نے تمہارے ساتھ کیا۔ تم خوشی اصلاح قبول نہ کرتے تھے۔ ہم نے تم پر کوہ طور اٹھا کر اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور فرما دیا۔ توریت قبول کرو۔ ورنہ پہاڑ گرتا ہے۔ تم بھی ایسے ضدی ثابت ہوئے۔ کہ اس وقت تو جبراً قہراً مان لیا۔ مگر بعد کو اس کو بھی توڑ دیا۔ اور طرح طرح کی بدکاری اور بت پرستی میں مشغول ہو گئے۔ توریت شریف کو بدل ڈالا ہم نے اپنے فضل کرم سے کبھی کبھی تم میں انبیاء بھیجے تاکہ تمہیں ہلاکت اور بربادی سے بچائیں مگر تم نے انہیں بھی ظلماً قتل کر ڈالا پھر بھی ہم نے درگزر کی۔ اگر ہمارا اتنا فضل وکرم نہ ہوتا۔ تو تم کبھی کے نیست ونابود ہو چکے ہوتے۔

**اصل واقعہ** اس میں اختلاف ہے۔ کہ پہاڑ اکھیڑنے کا واقعہ کن بنی اسرائیل پر پیش آیا۔ آیا اُن ستر پر جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ توریت لینے گئے تھے۔ یا اُن پر جو یہاں ہی رہ گئے تھے۔ ہم اس اختلاف کا لحاظ کرتے ہوئے۔ واقعہ عرض کرتے ہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیلیوں سے توریت ماننے کا عہد وپیمان لیکر ستر آدمیوں کے ساتھ توریت لینے کوہ طور پر تشریف لے گئے اور وہاں یہ ستر آدمی کلام الٰہی سن چکے اور مر کر زندہ ہو چکے۔ تب آپکو توریت شریف عطا ہوئی۔ جب آپ نے وہ کتاب ان ستر کو دکھائی۔ تو یہ لوگ سخت احکام اور کڑی پابندیاں دیکھ کر گھبرا گئے۔ اور کہنے لگے ہم سے اِن پر عمل نہ ہو سکے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی تب حضرت جبریل بحکم الٰہی کوہ طور اُکھیڑ کر ان کے سروں پر لیکر کھڑے ہو گئے۔ کہ یا تو توریت قبول کرو۔ ورنہ ابھی یہ تم پر گرتا ہے۔ یہ پہاڑ قد آدم ان کے سروں سے اُونچا تھا یہ لوگ ابھی اپنی موت دیکھ چکے تھے۔ اب گھبرا گئے اور فوراً سجدے میں گر گئے۔ مگر سجدہ پوری پیشانی پر نہ کیا۔ بلکہ ایک رخسارے پر تاکہ پہاڑ کو بھی دیکھتے رہیں کہیں گر نہ جاوے۔ چنانچہ اب تک یہودی صرف ایک رخسارے پر ہی سجدہ کرتے ہیں اور مسلمان پیشانی پر۔ اور سجدہ میں گر کر توبہ کی۔ اور پورا پورا عہد کیا۔ کہ ہم اس کو قبول کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ اس پر عامل رہیں گے۔ اس میثاق سے یا تو یہ ہی سجدے والا میثاق مراد ہے۔ یا پہلا میثاق جو اسرائیلیوں سے طور پر آتے وقت لیا گیا تھا۔ یا اس کا واقعہ یہ ہے۔ کہ جب موسیٰ علیہ السلام توریت لیکر اپنی قوم کے پاس آئے اور بچھڑے وغیرہ کو ہلاک فرما چکے۔ سب سے توبہ کرا چکے۔ تب آپ نے اُن کو توریت دکھائی۔ انہوں نے دیکھ کر قبول کرنے سے انکار کیا۔ اور اُن پر یہ ہی طور اٹھا کر یہاں ہی لایا گیا۔ اور انہوں نے سجدہ کر کے عہد وپیمان کیا۔ مگر بعد میں اس عہد کو توڑ دیا۔ اور بدکاریوں میں مشغول ہو گئے۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے پہلا فائدہ یہ کہ دُنیوی تکلیفیں جو ہدایت کا ذریعہ بن جائیں۔ وہ درحقیقت انعام الٰہی ہیں۔ اسی لئے اس واقعہ کو انعامات کے سلسلے میں ذکر فرمایا گیا۔ دوسرا فائدہ یہ کہ حق تعالےٰ امت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر بڑا مہربان ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل پر نہایت سخت احکام بھیجے اور سب ایک دم بھیجے جس سے وہ گھبرا گئے۔ اور اس امت نرم احکام بھیجے گئے اور وہ بھی یکے بعد دیگرے نہایت آہستگی سے اور اس عمدہ طریقہ سے کہ بوجھ نہ محسوس ہو۔ مثلاً روزہ فرض کیا گیا۔ تو پہلے سال بھر میں ایک عاشورہ کا پھر ہر مہینہ میں تین پھر ماہ رمضان کے روزے۔ مگر فدیہ دینے کا اختیار۔ شراب حرام کی گئی۔ تو نہایت آہستگی سے تیسرا فائدہ یہ کہ اس امت سے دینوی ظاہری عام عذاب اٹھا دیا گیا۔ اسرائیلیوں پر پہاڑ لا کر ان سے توریت منوائی مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوا۔ چوتھا فائدہ یہ کہ توریت کی حفاظت بنی اسرائیل کے ذمہ کی گئی۔ کہ فرمایا گیا خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ۔ جس سے وہ عاجز ہو گئے۔ مگر قرآن کریم کی حفاظت خود فرمائی ہمارے ذمہ نہ کی پانچواں فائدہ کلام اللہ کی تلاوت کرنا بھی ضروری ہے۔ اور اس میں غور کرنا بھی اور اس پر عمل کرنا بھی بغیر تلاوت اس کی بقا مشکل ہوگی۔ اور بغیر عمل محض اس کا پڑھ لینا غیر مفید طبیب کا نسخہ پڑھو بھی اسے سمجھو بھی اور عمل بھی کرو۔ اپنے حبیب کا خط بار بار پڑھ کے لطف حاصل کرو۔ اور اس کی فرمائشیں پوری کرو۔ مثنوی شریف میں ہے۔

ہست قرآں حالہائے انبیا ماہیان بحرِ پاکِ کبریا
ور بخوانی ونۂ قرآں پذیر انبیاء واولیاء را دیدہ گیر

**پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ اسرائیلیوں سے مجبوراً توریت منوائی گئی اور انہیں ایمان دیا گیا۔ مگر دوسری جگہ فرمایا گیا۔ لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ یعنی دین میں جبر نہیں حدیث پاک میں بھی ارشاد ہوا کہ دَعُوْهُمْ وَمَا يَدِيْنُوْنَ یعنی کفار کو ان کے دین پر چھوڑ دو۔ نیز جبری جبر یہ ثواب

نہیں ملتا۔ اس لئے جہاد میں کفار پر جزیہ یا اسلام پیش ہوتا ہے کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا جاتا۔ پھر اس آیت کا کیا مطلب **جواب**۔ اسکے چند جواب ہیں سب سے بہتر جواب تو وہ ہے۔ جو تفسیر خزائن العرفان میں دیا گیا۔ کہ یہ بظاہر جبر تھا مگر درحقیقت معجزہ دکھا کر اُن کو مطمئن کرنا تھا۔ کہ بیشک یہ کتاب رب کی طرف سے ہے جیسا کہ دیگر معجزات کا مقصود ہوتا ہے۔ دوسرا جواب یہ کہ بندوں کو جائز نہیں۔ کہ کسی کو دین پر مجبور کریں۔ اور یہ فعل رب کا تھا نہ کہ بندوں کا۔ تو لَا اِکْرَاہ کی آیت بندوں کیلئے ہے۔ اور یہ رب کا فعل تیسرا یہ کہ اس واقعہ میں اسرائیلیوں کو ایمان لانے پر مجبور نہ کیا گیا وہ ایمان تو پہلے ہی لا چکے تھے۔ اب اُن کو ارتداد سے روک کر ایمان پر قائم رکھا گیا۔ اب بھی مرتد کو ایمان لانے پر مجبور کرتے ہیں۔ ورنہ قتل کر دیتے ہیں چوتھے یہ کہ یہ عہد شکنی کی سزا تھی۔ اور بدعملی کی سزا دینا نقلاً عقلاً ہر طرح درست ہے۔ اب بھی زانی کو رجم کرنے اور چور کے ہاتھ کاٹتے ہیں۔ اُس وقت بدعملی کی سزا ہلاکت تجویز ہوئی۔ **دوسرا اعتراض** پہاڑ کا ہوا میں بغیر ستون کے معلق ہو جانا خلاف عقل ہے۔ ہلکی چیز بھی معلق نہیں رہ سکتی تو اتنا بھاری پہاڑ کیسے معلق رہ گیا۔ **جواب** یہ علی گڑھی عقل کے خلاف ہوگا۔ مسلمان کی عقل کے بالکل خلاف آسمان سورج چاند اور بھاری بادل برف کے پہاڑ (یعنی اولے اور برف) سب معلق ہی ہیں۔ اگر ایک وقت میں پتھر کا پہاڑ بھی معلق ہو گیا۔ تو کیا ہوا۔ آج مشین کے ذریعہ بھاری بھاری جہاز معہ ساز و سامان کے ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں۔ بلکہ جرمنی نے اڑن بم بنا کر بغیر مشین ہی بھاری چیز کو لٹکا کر دکھا دیا۔ تو کیا جرمنی معلق کر سکتا ہے اور رب نہیں کر سکتا۔

**تفسیر صوفیانہ** طور کو سب نے معلق دیکھا۔ مگر اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر بھی بعض نے شوق سے عہد کیا۔ اور بعض نے خوف سے جس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی خطاب اور ایک ہی معجزہ بعض کیلئے ہدایت اور بعض کیلئے گمراہی کا باعث ہوتا ہے۔ جب خوف والوں پر خذلان یعنی رسوائی آ گئی۔ تو برہان نے کام نہ دیا۔ دلائل کا علم عرفان نہیں بخشتا وہاں تو شوق و ذوق چاہیئے۔ پھر رب نے فرمایا۔ کہ ہمارے احکام قوت سے پکڑو جس سے معلوم ہوا۔ کہ احکام کیلئے قوت ربانی چاہیئے۔ نہ کہ طاقت جسمانی یہاں تائید الٰہی درکار ہے۔ اپنی کمائی بے کار پھر فرمایا۔ کہ توریت کے رموز اشارات دقائق اور حقائق یاد کرو۔ جو کہ اہل دل کی صحبت سے ملتے ہیں۔ تاکہ ماسوی اللہ سے بچ جاؤ۔ پھر تم لوگ خیالات نفسانی اور جذبات شہوانی کی وجہ سے طریقہ ربانی سے ہٹ گئے۔ وفاق کا راستہ چھوڑ کر نفاق کی طرف دوڑ گئے۔ اگر پہلے ہی سے عنایت ربانی اور توفیق یزدانی تمہاری نگرانی نہ کرتی اور انبیاء کرام تمہاری نگہبانی نہ فرماتے تو تم اصل پونجی یعنی فطری لیاقت کھو کر خسارہ میں پڑ جاتے۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ﴿۶۵﴾

اور البتہ تحقیق جانا تم نے اُن لوگوں کو جو حد سے بڑھے تم میں سے بیچ ہفتہ کے پس کہا ہم نے واسطے اُنکے ہو جاؤ تم بندر رحمت سے دور

اور بیشک ضرور تمہیں معلوم ہے تم میں کے وہ جنہوں نے ہفتہ میں سرکشی کی تو ہم نے اُن سے فرمایا کہ ہو جاؤ بندر دھتکارے ہوئے۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

پس کر دیا ہم نے اس کو عبرت واسطے اُسکے جو درمیان دونوں ہاتھوں اُسکے ہے اور وہ جو پیچھے اُسکے اور نصیحت واسطے پرہیزگاروں کے

تو ہم نے اُس بستی کا یہ واقعہ اُس کے آگے۔ اور پیچھے والوں کے لئے عبرت کر دیا اور پرہیزگاروں کیلئے نصیحت

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق**۔ اس سے پہلے اسرائیلیوں کی دس نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا۔ یہاں سے اُن سختیوں کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ جو ایک نافرمانی کی وجہ سے ان پر کی گئی۔ تاکہ ڈر کر اب مخالفت سے باز آ جائیں۔ کیونکہ انسان کو برائی سے بچانے کے دو ہی ذریعے ہیں۔ ایک نعمت دوسرے نقمت (یعنی عذاب) چونکہ رحمت الٰہی غضب پر غالب ہے۔ اس لئے رحمتوں کا ذکر پہلے ہوا۔ اور عذاب کا بعد میں **دوسرا تعلق** بنی اسرائیل کو پچھلی آیت سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا۔ کہ ساری کتاب کے انکار کرنے سے عذاب آتا ہے۔ جیسے کہ توریت کے انکار سے ہوا۔ اگر اس کے ایک حکم کی مخالفت کریں۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اور نبی آخر الزماں کی اطاعت نہ کرنا بھی توریت کے

ایک ہی حکم کی مخالفت ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس وہم کو دفع کرنے کیلئے فرمایا جارہا ہے۔ کہ تم کو تو معلوم ہے۔ کہ تمہارے بزرگوں نے صرف ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار کر لیا تھا جس سے ان پر عبرت ناک عذاب آگیا۔ وہ بھی تو ایک ہی حکم کی مخالفت تھی۔ اب اگر تم نے نبی آخرالزمان کی اطاعت نہ کی تو عذاب کے آنے کا ضرور اندیشہ ہے۔ **تفسیر وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ** پچھلی آیتوں کے واقعات زیادہ مشہور و معروف نہ تھے۔ بعض کو کچھ یاد تھے۔ اس لئے وہاں اذ فرما کر یاد دلایا گیا تھا۔ لیکن یہ واقعہ یہود کے بچہ بچہ کو یاد تھا۔ اس لئے یہاں لَقَدْ عَلِمْتُمْ فرمایا گیا یعنی اے اسرائیلیو یقیناً تم سب یہ قصہ جانتے ہو۔ مگر چونکہ تم اس سے عبرت نہیں پکڑتے۔ اس لئے ہم بھی بیان فرمائے دیتے ہیں۔ نیز اس بیان کرنے میں ہمارے اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غیب جاننے کا ثبوت ہے۔ کہ انہوں نے نہ تو تواریخ پڑھی اور نہ تاریخ جاننے والوں کی صحبت اٹھائی۔ اور پھر بے کم وکاست سچا سچا قصہ بیان فرمارہے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ غیب داں نبی ہیں۔ اَلَّذِیْنَ اعْتَدَوْا یا تو اس سے پہلے لفظ حال یا لفظ عذاب وغیرہ چھپا ہوا ہے۔ یا خود اَلَّذِیْن ہی عَلِمْتُمْ کا مفعول ہے۔ یعنی تم حد سے بڑھنے والوں کے قصہ یا عذاب کو جانتے ہو۔ یا خود ان لوگوں کو جانتے پہچانتے ہو کہ یہ لوگ داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں شہر ایلہ میں رہتے تھے جو کہ مدینہ منورہ اور شام کے درمیان دریا کے کنارا پر واقعہ تھا۔ اور یہ پورا قصہ انشاءاللہ خلاصہ تفسیر میں بیان ہوگا۔ مِنْکُمْ یہاں لفظ اسلاف چھپا ہوا ہے یعنی یہ مجرمین تمہارے بزرگوں میں سے تھے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں۔ کہ وہ تم ہی میں سے یعنی تمہارے ہم قوم اور ہم مذہب تھے۔ فِی السَّبْتِ۔ سبت کے لغوی معنی ہیں۔ قطع کرنا سنیچر کے دن کو اس لئے یوم السبت کہتے ہیں۔ کہ یہود پر اس دن عبادت کرنا اور دنیوی کاروبار سے الگ رہنا فرض تھا۔ نیند کو بھی اسی لئے سبات کہتے ہیں۔ کہ اس سے انسانی کام منقطع اور بند ہو جاتے ہیں۔ نیز سبت کے معنی تعظیم کے بھی ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ کہ یَوْمَ لَا یَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِیْهِمْ چونکہ سنیچر کے دن کی یہود تعظیم کرتے تھے۔ اس لئے اس کا نام یوم السبت ہوا انشاءاللہ ہم ہفتے کے سارے دنوں کے ناموں کی وجہ اور یہ کہ ان دنوں میں کون کون سے بڑے بڑے کام ہوئے۔ اور اب ان میں کیا کیا کرنا چاہیئے۔ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ کی تفسیر بیان کریں گے۔ اس جگہ لفظ یوم پوشیدہ ہے یعنی جو کہ زیادتی کرتے تھے۔ ہفتہ کے دن کے بارے میں فَقُلْنَا لَهُمْ یہاں قول سے مراد وحی بھیجنا یا بلا واسطہ کلام کرنا نہیں۔ بلکہ فقط توجہ ارادہ مراد ہے۔ یعنی ہم نے ان کی طرف ارادہ غضب کو متوجہ کر دیا اور چاہ لیا کہ وہ بندر بن جائیں۔ كُوْنُوْا قِرَدَةً۔ کُوْنُوْا۔ کون سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ ہو جانا اور بن جانا۔ یعنی تم بندر ہو جاؤ۔ یا بن جاؤ۔ یہ امر بھی شرعی امر نہیں ہے۔ بلکہ تکوینی امر ہے (پیدا کرنا) یعنی ہم نے ان کا بندر ہونا چاہ لیا جس سے وہ فوراً ہی بندر بن گئے۔ اس چاہنے کو اس طرح بیان کیا گیا۔ کہ ہم نے کہہ دیا تم بندر بن جاؤ یہی کن فیکون کا بھی مطلب ہے۔ قِرَدَةٌ جمع قرد کی ہے۔ جیسے کہ دیکہ جمع دیک کی (مرغ) ظاہر تو یہ ہی ہے۔ کہ ان کے بوڑھے جوان بچے مرد عورتیں سب چھوٹے بڑے بندر ہی بنائے گئے لیکن روح البیان نے اس جگہ فرمایا۔ کہ ان کے جوان تو بندر بنائے گئے تھے۔ اور بڈھے سؤر خَاسِئِیْنَ یہ خساءٌ سے بنا ہے۔ جسکے معنی ہیں ذلت اور دور کارنا چونکہ بندر خوبصورت جانور ہے۔ بعض لوگ اسے پال بھی لیتے ہیں۔ لہذا خاسئین فرما کر یہ بتایا۔ کہ وہ خوبصورت بندر نہ بنے تھے۔ کہ لوگ انہیں پالتے اور محبت کرتے بلکہ ان کے جسم سے ایسی بدبو آتی تھی۔ کہ کوئی ان کے قریب بھی نہ آتا تھا۔ اور وہ بندروں کی سی پیاری حرکتیں بھی نہ کرتے تھے بلکہ صرف سر ہلاتے اور آنسو بہاتے تھے۔ اور جو ان کو دیکھتا۔ وہ طعن کرتا تھا۔ لہذا وہ دھتکارے ہوئے نکلے ہوئے ذلیل بندر ہوئے **فَجَعَلْنٰهَا** جعل کے معنی کرنا بھی ہے۔ اور بنانا بھی اور ھا کا مرجع یا وہ امت ہے۔ یا اس کا عذاب اور یا یہ پورا واقعہ یعنی ہم نے اس قصے یا اس سزا یا اس امت کو عبرت بنادیا۔ نَكَالًا یہ لفظ نکل سے بنا ہے جس کے معنی ہیں روکنا اور منع کرنا۔ اسی لئے قسم سے باز رہنے کو نکول کہتے ہیں۔ اور بیڑی اور سخت لگام کو نکل کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں بھی قیدی اور جانور کو بھاگنے سے روکتی ہیں۔ اور یہاں عبرت والا عذاب مراد ہے جس کو سن کر لوگ نافرمانی سے بچیں جیسے قرآن کریم فرماتا ہے۔ اِنَّ لَدَیْنَآ اَنْكَالًا وَّجَحِیْمًا اور فرماتا ہے۔ وَاَشَدُّ تَنْكِیْلًا یعنی ہماری یہ سزا محض بدلا لینے کے لئے نہ تھی بلکہ

عبرت کیلئے لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا اس کے لفظی معنی ہیں. دو ہاتھوں کے درمیان اور مراد ہے. سامنے کیونکہ سامنے والی چیز ہاتھوں کے درمیان ہی ہوتی ہے. اور ھا سے مراد یا وہ امت ہے. یا شہر ایلہ. اور سامنے سے مراد یا تو ایلہ کے سامنے والے شہر ہیں جن کو اس واقعہ کی خبر لگی اور آ کر دیکھ گئے. اور یا اِن سے پہلی اُمتیں کیونکہ اِن کو یہ خبر دیدی گئی تھی. کہ آئندہ زمانہ میں ایسا واقعہ ہونے والا ہے. وَمَا خَلْفَهَا اس میں بھی وہ ہی دو احتمال ہیں. کہ یا تو اس سے دور کے شہر مراد ہیں جنہوں نے یہ واقعہ دیکھا تو نہیں مگر سن لیا. یا آنے والی اُمتیں کیونکہ یہ واقعہ قرآن پاک میں مذکور ہوا جس سے سب کو عبرت حاصل ہوئی. یعنی ہم نے یہ واقعہ اگلے پچھلوں کیواسطے عبرت بنا دیا. وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ موعظہ وعظ سے بنا ہے جسکے معنی ہیں نصیحت لینا یا کرنا یعنی اس واقعہ سے پرہیزگاروں نے نصیحت پکڑی یا قیامت تک اس سے واعظ نصیحت کریں گے. خیال رہے کہ عبرت دل کا فعل ہے. اور موعظہ زبان کا چونکہ عام لوگوں میں وعظ کہنے کی طاقت نہیں ہوتی. ہاں وعظ سن کر ڈر جاتے. اس لئے اِن کے لئے عبرت فرمایا گیا. اور پرہیزگاروں کیلئے موعظہ یعنی قیامت تک علماء واعظین اس کا وعظ کیا کرینگے. اور سامعین سن کر ڈرا اور رد کیا کرینگے **خلاصہ تفسیر** حق تعالیٰ اپنے انعام یاد دلا کر کچھ بنی اسرائیل کی نافرمانیاں بیان فرما رہا ہے. فرماتا ہے. کہ اے اسرائیلیو تمہیں اِن ایلہ والوں کا قصہ تو یاد ہی ہے. جو تمہارے ہی بزرگ تھے. انہوں نے ہفتہ کے دن میں ایک بے اعتدالی کر لی تھی یعنی مچھلی کا شکار کر لیا تھا. تو ہم نے اِن سب کو بندر بنا دیا. ان کا یہ واقعہ سارے اگلے پچھلوں کے لئے عبرت اور پرہیزگار علماء واعظین کیلئے نصیحت کر دیا گیا. تم اس کو سوچ کر عبرت کیوں نہیں پکڑتے اور نبی آخر الزماں پر ایمان کیوں نہیں لاتے جب مچھلی کے شکار سے عذاب آگیا تو کیا اتنے بڑے پیغمبر کی مخالفت سے عذاب نہ آئیگا.

**یہودیوں کا بندر بننا** جیسے کہ اسلام میں جمعہ عزت والا ہے. اور عیسائیوں کیلئے اتوار اور ہندوؤں کیلئے منگل اسی طرح یہودیوں کیلئے ہفتہ کا دن محترم تھا مگر فرق اتنا ہے. کہ اسلام میں صرف ان لوگوں پر جن پر جمعہ کی نماز فرض ہے جمعہ کی پہلی آذان سے ختم نماز تک وہ دنیوی کاروبار کرنا حرام ہیں. جو نماز میں خلل انداز ہوں عورتیں بچے مسافر دیہاتی اور بیمار لوگ اس حکم سے علیحدہ ہیں. کیونکہ اِن پر جمعہ فرض نہیں لیکن یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں ان سارے دنوں میں دنیوی کاروبار حرام تھے. اور خاص کر شکار کرنا سخت جرم موسےٰ علیہ السلام کئی سو برس کے بعد یہ واقعہ درپیش آیا. کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت بحر قلزم کے کنارے شہر ایلہ میں رہتی تھی. جو کہ مدینہ منورہ اور شام کے درمیان ہے. یہ لوگ مچھلی کے بہت شوقین تھے. رب کی شان کہ ہر ہفتہ کے دن اس دریا میں بے شمار مچھلیاں نمودار ہوتی تھیں. یا تو اِن کے امتحان کے لئے یا اس مچھلی کی زیارت کے لئے جس کے پیٹ میں یونس علیہ السلام رہے تھے. (تفسیر روح البیان) باقی دنوں میں سب غائب ہو جاتی تھیں. ان کے منہ میں پانی بھر آیا. اور سوچنے لگے. کہ کسی تدبیر سے ان کا شکار کرنا چاہیئے جس سے کہ شکار بھی ہو جائے اور ہفتہ کے دن کی بے حرمتی بھی نہ ہو. آخر اِن عقلمندوں نے یہ حیلہ سوچا. کہ دریا کے اردگرد بہت سے گہرے گہرے غار کھود دیئے. اور دریا سے اس غار تک نالیاں بنالیں جمعہ کی شام کو ان نالیوں کا منہ کھول دیتے. کہ پانی کے ساتھ مچھلیاں اِن گڑھوں میں آجاتیں اور اتوار کے دن ان گڑھوں سے پکڑ لیتے اور کہتے تھے. کہ ہم ہفتہ کو شکار نہیں کرتے. انہوں نے وہ مچھلیاں خوب کھائیں اور فروخت کیں جس سے کہ یہ بڑے مالدار ہو گئے. چالیس یا ستر سال تک ان کا یہ عمل رہا. یہ لوگ کل ستر ہزار تھے. ان کی تین جماعتیں بن گئیں. ایک تو شکار کرنیوالوں کی. دوسرے اس سے منع کرنیوالوں کی. تیسرے خاموش رہنے والوں کی یہ لوگ کل بارہ ہزار تھے. باقی سب شکاری جب شکاریوں نے ان کی نصیحت نہ مانی تو انہوں نے اپنے اور اِن کے درمیان ایک دیوار بنا کر شہر کے دو حصے کر دیئے. اور کہا. کہ ہم اِن کے ساتھ نہ رہیں گے. کہ کہیں ہم پر عذاب نہ آجائے. یہاں تک کہ داؤد علیہ السلام کا زمانہ آگیا. آپ نے ان کو شکار سے منع کیا. اور فرمایا. کہ اے بے وقوفو قید کرنا ہی تو شکار ہے. اس سے باز آجاؤ. ورنہ عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے. شکاریوں نے کہا. کہ ہم تو بہت عرصہ سے یہ کام کر رہے ہیں. اگر یہ بُرا ہوتا. تو اب تک ہم کو امن کیوں ملتی. تب داؤد علیہ السلام نے دعا فرمائی جس سے رب کا غضب آگیا. اور رات میں یہ سب کے سب بندر یا جوان لوگ بندر اور بوڑھے لوگ سور بنا دیئے گئے. انکے عقل و حواس تو باقی رہے. مگر قوت گویائی

جاتی رہی جسموں سے سخت بدبو نکلنے لگی۔ صبح کے وقت اس محلہ کے لوگوں نے دیکھا کہ نہ تو اس محلہ سے کوئی آدمی نہ آتا ہے نہ کوئی آواز نہ دھواں وغیرہ نکلتا ہے۔ تو یہ دیواروں پر چڑھ کر ان کے گھر میں داخل ہوئے۔ وہ بندر ان کو دیکھ کر ان کی طرف دوڑے اور ان کے قدموں سے لپٹنے لگے اور ان کے کپڑے سونگھتے اور روتے تھے۔ ان لوگوں نے کہا کہ کیا ہم نے تمہیں شکار سے منع نہ کیا تھا۔ وہ بندر سر ہلاتے تھے کہ ہاں اور آنسو ان کے رخساروں پر بہتے تھے۔ اس حال پر ان کو تین روز گزرے اور چوتھے روز سب ہلاک کر دیئے گئے۔ نہ کوئی باقی بچا اور نہ اُن کی نسل چلی۔ لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ موجودہ بندر انہیں کی اولاد ہیں غلط ہے۔ ان سے پہلے بھی بندر تھے۔ اور یہ موجودہ بندر ان پہلے بندروں کی اولاد سے ہی ہیں کیونکہ صحیح روایت میں آیا ہے۔ کہ کوئی مسخ شدہ قوم تین دن سے زیادہ نہیں جیتی نہ وہ کھاتی ہے۔ نہ پیتی ہے اور نہ اس کی نسل چلتی ہے (تفسیر عزیزی) اسی تفسیر عزیزی نے ایک حدیث نقل کی۔ کہ ایک دن حضرت عبداللہ ابن عباس سورۂ اعراف میں یہ واقعہ پڑھ کر بہت رو رہے تھے۔ اُن کے شاگرد خاص حضرت عکرمہ نے رونے کا سبب پوچھا۔ آپ نے فرمایا۔ کہ قرآن کریم سے یہ تو معلوم ہوا۔ کہ شکاریوں کو عذاب اور منع کرنے والوں کو نجات ہوئی مجھے خبر نہیں کہ خاموش رہنے والوں کا کیا حال ہوا ممکن ہے۔ کہ وہ بھی منع نہ کرنے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہو گئے ہوں۔ آج بھی بہت لوگ بُری باتوں سے روکنے میں سستی کرتے ہیں۔ عکرمہ نے عرض کیا۔ کہ نہیں۔ بلکہ یہ بھی نجات پا گئے۔ پوچھا کہ کیسے عکرمہ نے عرض کیا۔ کہ تبلیغ احکام فرض کفایہ ہے (جیسے نماز جنازہ) کہ بعض کے کر لینے سے کل سے ادا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ سب خاموش رہتے۔ تو سب گناہگار ہوتے جب بعض نے تبلیغ کر دی سب بری الذمہ ہو گئے۔ حضرت ابن عباس سُن کر بہت خوش ہوئے۔ اور اُٹھ کر عکرمہ کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ اور اُن کو گلے سے لگا لیا۔ اور اپنے پاس بٹھایا۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** گناہ صغیرہ ہمیشہ کرنے سے کبیرہ بن جاتا ہے جس پر عذاب بھی آ جاتا ہے۔ ہفتہ کے دن شکار کرنا اُن کیلئے گناہ صغیرہ تھا۔ مگر ہمیشہ کرنے سے عذاب میں مبتلا ہو گئے **دوسرا فائدہ** کسی گناہ پر عذاب نہ آنا اُس کے جائز ہو جانے کی دلیل نہیں۔ رب تعالیٰ کی پکڑ بہت مہلت سے ہوتی ہے۔ ستر سال تک یہ یہودی شکار کرتے رہے۔ مگر عذاب نہ آیا۔ اور جب آیا تو تباہ کر گیا۔ **تیسرا فائدہ** دوسروں کی مصیبتوں سے نصیحت حاصل کرنا چاہیئے اور اُن کے واقعات کی خبر رکھنا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم نے یہ ہی بتایا۔ کہ ہم نے اس قصّہ کو عبرت بنا دیا۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

نرود مرغ سوئے دانہ فراز ۔۔۔ چوں دگر مرغ بیند اندر بند

پند گیر از مصائب دگراں !! ۔۔۔ تا نہ گیرند دیگراں ز تو پند

**چوتھا فائدہ** خوشی کے وقت گلے ملنا معانقہ کرنا سنت صحابہ ہے۔ اس کے لئے سفر سے آنا یا غائب ہونے کے بعد ملنا شرط نہیں۔ دیکھو عبداللہ ابن عباس نے خوشی میں عکرمہ کو گلے لگا لیا رضی اللہ عنہما۔ لہٰذا عید کے دن گلے ملنا سنت سے ثابت ہے۔ کہ یہ بھی خوشی کا موقعہ ہے **پانچواں فائدہ** بدکاروں سے دُور رہنا چاہیئے۔ ورنہ اُن کے ساتھ نیک کاروں پر بھی عذاب آ جاویگا۔ دیکھو نیک کار ان شکاریوں سے علیحدہ ہو گئے۔ گیہوں کے ساتھ گھن پس جاتے ہیں۔ اور بیماریوں کے پاس کھڑے ہونیوالے تماشائی بھی گرفتار ہو جاتے ہیں **چھٹا فائدہ** تبلیغ صرف عالموں پر ہی فرض نہیں۔ بلکہ جس کو جو بھی مسئلہ معلوم ہو ناواقف کو ضرور بتا دے ورنہ گنہگار ہوگا۔ دیکھو یہ منع کرنیوالے سب علماء نہ تھے۔ مگر ان پر تبلیغ فرض ہوئی۔ اور تبلیغ ہی کی برکت سے عذاب سے بچے **ساتواں فائدہ** دوسرے کے گناہ سے راضی ہونا بھی گناہ ہے۔ اور کفر سے راضی ہونا کفر اور بلا وجہ اس کی تردید نہ کرنا جرم جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس اور عکرمہ کی تقریر سے ثابت ہوا۔ اگر کسی کو گناہ کرتے ہوئے دیکھے تو اگر طاقت ہو تو ہاتھ سے روکے ورنہ زبان سے منع کرے۔ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے ہی بُرا سمجھ کر وہاں سے علیحدہ ہو جائے۔ **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ حیلہ کرنا گناہ ہے۔ کیونکہ ان اسرائیلیوں نے شکار کا حیلہ ہی تو کیا تھا جس سے عذاب میں گرفتار ہو گئے۔ پھر علماء صدہا حیلے کیوں سکھاتے ہیں فقہ کی کتابیں حیلوں سے بھری ہوئی ہیں۔ عالمگیری میں تو حیلہ کا علیحدہ باب باندھا کتاب الحیل (عام نیچری) **جواب** حیلہ حرام ہونا بھی بنی اسرائیل پر

عذاب الٰہی تھا۔ جیسے کہ اُن پر بعض گوشت حرام تھے۔ ایسے ہی حیلہ شرعی بھی ورنہ خود قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں شرعی حیلہ کی تعلیم دی۔ ایوب علیہ السلام نے قسم کھائی تھی۔ کہ اپنی بیوی کو سو لکڑیاں ماروں گا جب قسم پورا فرمانے کا وقت آیا۔ تو رب نے اُن کو تعلیم دی خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِب بِّهِ وَلَا تَحْنَثْ اپنے ہاتھ میں جھاڑو لیکر مارو۔ قسم نہ توڑو اسی طرح احادیث میں بہت سی شرعی حیلوں کی تعلیم دیگئی۔ اس کی پوری بحث ہماری کتاب "جاء الحق" میں دیکھو۔ نیز کسی کا مال مارنے کسی کو دھوکہ دینے حرام کو حلال کرنے کیلئے حیلہ کرنا گناہ ہے۔ مگر شرعی ضرورت کو پورا کرنے گناہ سے بچنے کیلئے حیلہ کرنا بہتر۔ اُن اسرائیلیوں کا یہ حیلہ حرام کو حلال کرنے کا تھا لہذا گناہ ہوا مثلاً زکوٰۃ سے بچنے کا حیلہ کرنا گناہ ہے۔ اور اگر سید کو زکوٰۃ دینے یا مسجد میں لگانے کیلئے یہ حیلہ کیا جاوے۔ کہ کسی فقیر کو دیدی جاوے۔ اور وہ مالک بن کر اپنی طرف سے وہاں صرف کردے تو عین ثواب ہے۔ غرضکہ حیلہ کا مدار نیت پر ہے۔

**دوسرا اعتراض**۔ آپ کی تقریر سے معلوم ہوا۔ کہ مسخ کی ہوئی قوم کی نسل نہیں چلتی حالانکہ حضور نے فرمایا۔ کہ یہ موجودہ چوہے اونٹ کا دودھ نہیں پیتے شاید یہ مسخ کئے ہوئے اسرائیلی ہوں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسخ شدہ قوم کی نسل چل سکتی ہے۔ تب ہی تو شک فرمایا گیا **جواب**۔ یہ حدیث اُس وقت کی ہے۔ جب حضور علیہ السلام پر ظاہر نہ فرمایا گیا تھا۔ ظاہر فرمانے پر وہ فرمایا ہم پیش کر چکے لہذا یہ حدیث گویا منسوخ ہے **تیسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ انسان کا بندر وغیرہ بن جانا ممکن ہے۔ یہ ہی تناسخ یا آواگون یا یونی چکر ہے۔ اہل اسلام پھر اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ (آریہ) **جواب** یہاں صورتیں بدل گئی تھیں۔ نہ کہ روح اور نفس لہذا یہ مسخ ہوا۔ نہ کہ نسخ مسخ ممکن ہے۔ اور نسخ ناممکن اس کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً انسان فقط اس ظاہری شکل و صورت چہرے مہرے کا نام نہیں۔ ورنہ مردہ اور انسانی فوٹو کو بھی انسان کہا جاتا۔ بلکہ انسان جسم اور نفس ناطقہ کے مجموعہ کا نام ہے۔ پھر جسم میں بھی دو طرح کے اجزاء ہیں۔ ایک تو اصلی جو کہ کبھی نہیں بدلتے دوسرے عارضی جو بدلتے رہتے ہیں۔ روح اور نفس کا بدلنا ناممکن ہے۔ مگر جسم کی شکل ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ بچپن بڑھاپے بیماری تندرستی رنج و خوشی میں جسم کا رنگ و روپ لاغری فربہی وغیرہ بدلتی رہتی ہے مگر اصلی اجزاء برابر باقی رہتے ہیں جس کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ کہ یہ ہی وہ بچہ ہے۔ جو کہ جوان ہو گیا۔ اور پیدائش سے پہلے اور موت کے بعد یہ اصلی اجزاء بھی دوسرے جسم میں نمودار تھے۔ مثلاً پہلے نطفہ تھے۔ اور بعد میں مٹی ہو جائینگے یہاں ان اسرائیلیوں کے اصلی اجزاء اور نفس و روح وہ ہی رہے حتیٰ کہ ہوش و عقل وغیرہ سب قائم رہی صرف شکل و صورت بدل گئی اور زبان میں طاقت گویائی نہ رہی جیسے کہ حضرت موسیٰ کا عصا۔ آواگمان یہ ہے۔ کہ اصلی اجزاء ظاہری شکل اور نفس و روح وغیرہ سب ہی بدل جاوے۔ کہ انسان حقیقتہً کتا گدھا بن جاوے یہ محال ہے یوں سمجھو کہ مسخ تین قسم کا ہے۔ ۱ مسخ حقیقی جس سے حقیقت بدل جاوے ۔ ۲ مسخ صوری جس سے ظاہر شکل بدلے ۳ مسخ معنوی جس سے جسم کے اصلی اجزاء اور نفس کے صفات بدل جاویں مسخ حقیقی ناممکن اسی کا نام آواگون ہے۔ اور یہاں یہ نہ ہوا بلکہ صرف مسخ صوری ہوا۔ **تفسیر صوفیانہ** جو کوئی احسان کی قدر نہیں کرتا اور منعم کی نعمت کا کفران کرتا ہے۔ وہ اسی طرح بلا و خسران میں مبتلا ہوتا ہے۔ اور عزت و صال سے نکال کر ذلت ہجران میں ڈالدیا جاتا ہے۔ گذشتہ امتوں کا عذاب جسمانی خسف و مسخ تھا۔ لیکن اس امت کا عذاب روحانی اور نفسانی خسف و مسخ ہے یعنی پہلے جسم بدلتے تھے۔ اور اب دل۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ اور یہ اس سے زیادہ سخت ہے جو شکل میں خنزیر بن گیا۔ وہ پلیدی کھاتا ہے۔ اور قلباً خنزیر حرام کھاتا ہے قلب مسخ ہونے کی تین نشانیاں ہیں۔ ۱ طاعت میں لذت نہ پانا ۲ معصیت سے خوف نہ کرنا ۳ کسی کی موت سے عبرت نہ پکڑنا۔ عوف ابن عبداللہ فرماتے ہیں۔ کہ تین باتیں یاد رکھو۔ جو شخص آخرت کیلئے کام کرے گا حق تعالیٰ اس کے دنیوی کام خود بخود بنا دیگا۔ جو اپنا معاملہ اللہ کے ساتھ درست رکھے گا حق تعالیٰ لوگوں کے ساتھ اس کا معاملہ درست فرما دے گا۔ جو اپنا باطن درست کریگا۔ اللہ اُس کا ظاہر بھی درست فرما دے گا۔ محمد ابن علی ترمذی فرماتے ہیں۔ کہ چار شخصوں کی چار جگہوں میں اصلاح ہوتی ہے۔ بچوں کی کتاب میں بدمعاشوں کی جیل خانہ میں۔ عورتوں کی گھر میں۔ عمر رسیدہ مردوں کی مسجد میں (تفسیر روح البیان)

وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖۤ اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تَذۡبَحُوۡا بَقَرَۃً ؕ قَالُوۡۤا اَتَتَّخِذُنَا

اور جبکہ فرمایا موسیٰ نے واسطے قوم اپنی کے تحقیق اللہ حکم فرماتا ہے تم کو یہ کہ ذبح کرو تم ایک گائے انہوں نے کہا کیا بناتے ہیں آپ ہم کو

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا خدا تمہیں حکم دیتا ہے۔ کہ ایک گائے ذبح کرو۔ بولے آپ ہمیں

ہُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ اَنۡ اَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ ﴿۶۷﴾

مسخرہ فرمایا موسیٰ نے پناہ لیتا ہوں میں اللہ کی یہ کہ ہوؤں میں جاہلوں میں سے

مسخرہ بناتے ہیں۔ فرمایا خدا کی پناہ کہ میں جاہلوں سے ہوؤں۔

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ پہلا تعلق بنی اسرائیل کی سرکشیاں بیان ہو رہی ہیں۔ اس سے پہلے ایک سرکشی مذکور ہو چکی۔ اب دوسری کا ذکر ہے۔ دوسرا تعلق اس سے پہلے بنی اسرائیل کی حیلہ سازیوں کا ذکر تھا۔ جس سے کہ وہ حرام کو حلال بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اب ان کی کج بحثی اور حجت بازی کا تذکرہ ہے۔ تیسرا تعلق اس سے پہلے حیلہ سازی کے عذاب بیان ہوئے۔ اب حجت بازی کا نتیجہ بتایا جا رہا ہے۔ کہ زیادہ کج بحثی سے سختی بڑھتی ہے۔ چوتھا تعلق اس سے پہلے بنی اسرائیل کی داؤد علیہ السلام کی مخالفت کا ذکر تھا۔ جس کے متعلق کہا جا سکتا تھا۔ کہ زمانہ موسیٰ علیہ السلام سے دور ہونے کی وجہ سے یہ ہوا۔ اب خود موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا واقعہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہودی اصل سے ہی سرکش ہیں **تفسیر** وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی یہاں بھی وہی فعل پوشیدہ ہے۔ یعنی اے اسرائیلیو وہ واقعہ یاد کرو یا اے نبی علیہ السلام ان کو یاد دلاؤ۔ واقعہ یہ تھا۔ کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص عامیل نامی بڑا مالدار تھا۔ اور لاولد تھا۔ اس کے چچازاد بھائی نے میراث کے لالچ میں اس کو قتل کر کے دوسری بستی کے دروازہ پر ڈال دیا۔ اور صبح کے وقت خود اس کے خون کا مدعی بن کر موسیٰ علیہ السلام کی بارگاہ میں آیا۔ اور اس بستی والوں پر خون کا دعویٰ کر کے ان سے خون بہا (یعنی جان کا بدلہ مال لینا چاہا) موسیٰ علیہ السلام نے اس محلہ والوں سے پوچھا انہوں نے صاف انکار کیا۔ اور وہاں کے لوگوں نے درخواست کی کہ آپ دعا فرمائیے۔ کہ اللہ تعالیٰ حقیقت حال ظاہر فرمائے۔ آپ نے دعا فرمائی تب آپ پر وحی آئی جس کا مضمون آپ نے ان لوگوں کو سنایا۔ اسی کا یہاں ذکر ہے۔ لِقَوۡمِہٖ قوم کے لفظی معنی اور اس کے اقسام ہم پہلے بتا چکے یہاں بعض وہ قوم مراد ہے جنہوں نے دعا کی درخواست کی تھی نہ کہ سارے بنی اسرائیل اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ ظاہر یہ ہے۔ کہ یہ حکم وجوبی تھا۔ کیونکہ یا تو اس وقت تک قسامت (جن کے محلہ میں مقتول پایا جائے۔ ان سے پچاس قسمیں لینا) کے احکام نہ آئے تھے۔ اور یا آپ نے مصلحتاً قسم نہ لی۔ بہر حال یہ فعل قسامت کا قائم مقام تھا۔ اور قسامت واجب لہٰذا یہ بھی واجب کُمۡ میں یا تو وارث اور اس کے اہل قرابت سے خطاب ہے۔ کیونکہ وہ مدعی تھا۔ اور دعویٰ کا ثبوت اس کے ذمہ ہے یا محلہ والے مسلمین سے کیونکہ ان پر شبہ تھا جس سے بری ہونے کا ثبوت ان کے ذمے تھا۔ یا دعا کرانیوالوں سے یا ساری اس قوم سے اَنۡ تَذۡبَحُوۡا یہ ذبح سے بنا ہے جس کے معنی ہیں حلقوم اور اس کے اطراف کی رگیں چوڑائی میں کاٹ کر جان نکالنا ان کو لمبائی میں چیرنے کا نام نحر ہے گائے اور بکری وغیرہ کو ذبح کرنا بہتر ہے۔ اونٹ کو نحر فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ بَقَرَۃً بقر کے لفظی معنی ہیں چیرنا اور پھاڑنا گائے کو اس لئے بقر کہتے ہیں۔ کہ اس کا نر کھیتی باڑی کیلئے زمین کو پھاڑتا ہے۔ اسی لئے بڑے عالم کو باقر العلم کہتے ہیں۔ یا تو اس سے مادہ گائے مراد ہے۔ اور یا نر کو بھی شامل خلاصہ یہ ہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا۔ کہ رب کا حکم ہے۔ کہ کوئی سی گائے ذبح کر کے اس کا پارچہ گوشت مقتول پر مارو جس سے وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا نام بتا دے گا۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی وہ کہنے لگے۔ قَالُوۡۤا اَتَتَّخِذُنَا ہُزُوًا۔ یا تو ان سب نے کہا تھا۔ یا ان میں سے بعض نے ہُزُوًا مصدر ہے جسکے معنی ہیں دل لگی۔ اور مذاق کرنا یہاں اسم مفعول کے معنی میں ہے۔ یعنی مسخرہ یا بُت جیسے فَاتَّخَذۡتُمُوۡہُمۡ سِخۡرِیًّا وہ کہنے لگے۔ کہ آپ ہم کو مسخرہ بنا کر مذاق کرتے ہے

ہیں. کہ ہم تو کہتے ہیں. قاتل کا پتہ لگایئے اور آپ کہتے ہیں گائے ذبح کرو. اس جواب کو ہمارے سوال سے کیا تعلق **قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ** موسیٰ علیہ السلام کہنا یہ چاہتے تھے. کہ میں مذاق نہیں کرتا. لیکن اس کو اس عمدہ طریقہ سے بیان فرمایا جس سے اپنے منہ اپنی تعریف نہ ہو. بلکہ رب کے کرم کا ظہور ہو **اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ** یعنی بے ربط جواب دینا یا شرعی فیصلہ کیوقت مذاق و دل لگی کرنا یا کسی کو مسخرہ بنا کر اس کو ذلیل کرنا جاہلوں کا کام ہے. انبیاء کی شان اس سے بالا ہے میں رب کی پناہ مانگتا ہوں. کہ اس قسم کی حرکت کر کے جہلا کے زمرہ میں سے ہو جاؤں.

**خلاصہ تفسیر** یہ دوسری عدول حکمی و سرکشی اور اس کے نتیجہ کا ذکر ہو رہا ہے. کہ بنی اسرائیل خود موسیٰ علیہ السلام سے سرتابیاں اور معمولی حکم میں نکتہ چینیاں کر کے خود مشقت میں پڑتے تھے. اے اسرائیلیو اپنے باپ، داداؤں کا وہ قصہ بھی یاد کرو جبکہ وہ ایک قتل کا مقدمہ لیکر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تھے. اور چاہتے تھے. کہ قاتل کا پتہ لگ جائے موسیٰ علیہ السلام نے خود نہ بتایا. بلکہ ایک تدبیر پیش کر دی. کیونکہ اگر وہ خود قاتل کا پتہ دے دیتے تو یہ بیباک قوم اُن کو طرف داری کا بہتان لگا دیتی اسلئے آپ نے معجزہ سے مقتول کو زندہ فرمانا چاہا. تاکہ وہ اپنی زبان سے قاتل کا پتہ دے نیز قصاص کیلئے وارث کا دعویٰ ضروری ہے آپ نے چاہا. کہ مقتول خود زندہ ہو کر مدعی بنے تاکہ قاتل سے قصاص لیا جا سکے اور چونکہ بیل اور گائے کو زمین کے آباد کرنے اور درختوں کے جوتنے بونے اور پانی دینے میں بہت دخل ہے. اس لئے یہاں گائے کا انتخاب ہوا. اگرچہ یہ بھی ممکن تھا. کہ زندہ گائے مقتول کے جسم سے لگا کر اس کو زندہ کر دیا جاتا مگر یہاں تو عجیب معجزہ دکھانا منظور تھا کہ مردہ گائے مردہ کو زندہ کرے اسلئے یہ تجویز ہوئی چاہئے تو یہ تھا کہ یہ لوگ حکم پاتے ہی کوئی سی بھی گائے ذبح کروا لیتے اور تعمیل ارشاد میں دیر نہ لگاتے جس سے کہ نہایت آسانی سے چھوٹ جاتے اور مقدمہ اتنا طول نہ پکڑتا. مگر انہوں نے کج بحثی کر کے خود اپنے پر بہت سی پابندیاں لگا لیں ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند اسمٰعیل سے کہا تھا. کہ میں نے خواب میں تم کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا ہے. انہوں نے اپنے کو ذبح کرانے میں کوئی حجت نہ کی اور یہ نہ کہا کہ یہ تو خواب ہے. بلکہ اپنی قربانی فوراً پیش کر دی ان عقلمندوں نے ایک گائے ذبح کرنے کیلئے ہمارے پیغمبر سے اتنی حجت کی کہ کہہ دیا کہ آپ ہم کو مسخرہ بنا کر دل لگی کر رہے ہیں جس پر موسیٰ علیہ السلام نے ہمارے واسطے اپنی برأت ظاہر کی. کہ دل لگی کرنا جہلا کا کام ہے میں پیغمبر ہوں (تفسیر عزیزی) **گائے کا قصہ** بنی اسرائیل میں ایک نیک شخص تھا جس کا ایک چھوٹا بیٹا تھا. اس نے ایک بچھیا بڑی محبت سے پالی تھی. جب اس کے موت کا وقت قریب آیا. تو بچھڑی لے کر جنگل میں پہنچا. اور دعا کی. کہ اے مولا یہ گائے تیرے سپرد کرتا ہوں. جب میرا بیٹا جوان ہو تو اس کو دے دے. یہ تو مر گیا. مگر اسکی گائے جنگل میں اور اسکا بیٹا ماں کے پاس پرورش پاتے رہے یہ لڑکا نہایت سعادتمند اور اپنی ماں کا فرمانبردار تھا. ایک روز اس کی والدہ نے کہا. کہ تیرے باپ نے فلاں جنگل میں خدا کے نام پر ایک بچھڑی چھوڑ دی ہے. جو کہ اب جوان ہو گئی. اس میں فلاں فلاں علامتیں ہیں. تو جا اور اس کو پکڑ لا لڑکا گیا. اور ماں کی بتائی ہوئی علامتوں سے اس کو پکڑ لیا ماں نے کہا. کہ اسکو بازار میں لے جا کر تین اشرفیوں میں فروخت کر دے مگر جب سودا ہو تو پھر مجھ سے اجازت لے لینا. یہ شخص گائے کو بازار میں لایا. ایک فرشتہ بشکل خریدار آیا. اور اس نے قیمت پوچھی لڑکے نے کہا تین اشرفیاں مگر والدہ کی اجازت شرط ہے. فرشتہ بولا. کہ چھ اشرفیاں لے لے مگر ماں سے نہ پوچھ لڑکے نے کہا. کہ اگر تم اس کے برابر سونا بھی دو. تب بھی ماں کے بغیر پوچھے نہ بیچوں گا. غرض کہ لڑکا اپنی ماں کے پاس آیا. اور اسے سارا واقعہ سنایا. ماں نے کہا. کہ جا چھ میں بیچ دے. مگر سودا ہونے پر پھر مجھ سے پوچھ لینا لڑکا پھر بازار میں لایا وہی فرشتہ پھر ملا. اور کہنے لگا. کہ بارہ اشرفیاں لے لے مگر ماں سے نہ پوچھ لڑکا نہ مانا پھر آ کر اپنی والدہ کو یہ ماجرا سنایا. وہ بڑی عقلمند تھی کہنے لگی. کہ شاید یہ کوئی فرشتہ ہے. جو تیری آزمائش کیلئے آتا ہے. اگر اب تجھے ملے. تو اس سے پوچھ لینا. کہ ہم اپنی گائے فروخت کریں یا نہ کریں. لڑکے نے ایسا ہی کیا فرشتے نے جواب دیا کہ اپنی والدہ سے کہنا. کہ ابھی اس کو روکے رہو عنقریب بنی اسرائیل کو اس کی ضرورت پڑے گی. اور موسیٰ علیہ السلام اسے خریدیں گے اور اس سے ایک بڑا معجزہ ظاہر ہوگا. جب وہ لوگ خریدنے آئیں. تو اس کی قیمت یہ مقرر کرنا. کہ اس کی کھال سونے سے بھر دی جائے. لڑکا گائے کو گھر لایا. اور پھر وہ واقعہ درپیش آیا جس کا یہاں ذکر ہے. **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے. **پہلا فائدہ** یہ کہ بزرگوں کے فرمان پر اپنے عقلی ڈھکوسلے نہ چلائے بلکہ یاد رکھا جائے. ورنہ مشکل میں پڑ جائیگا. جیسا کہ یہاں ہوا چاہیئے یہ کہ ان کے فرمان پر اپنی عقل لگا کے اپنے

حواس سے بھی زیادہ اعتماد کرے دوسرا فائدہ اپنے حلال مقصد کیلئے جانوروں کو تکلیف دینا بلکہ ذبح کرنا بھی جائز ہے جیسا کہ اس موقعہ پر کیا گیا۔ تیسرا فائدہ یہ کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے اور شریعت میں جس چیز پر کوئی پابندی نہ ہو اس میں پابندی نہ لگانا چاہیئے۔ اگر یہ لوگ کوئی سی بھی گائے ذبح کر لیتے تو کام چل جاتا۔ چوتھا فائدہ یہ کہ بزرگوں سے زیادہ سوالات کرنا بھی خرابی میں ڈالدیتا ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ اسی لئے صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جب اپنا شیخ کوئی وظیفہ یا عمل بتائے تو اس میں پوچھ پوچھ کر پابندیاں مت لگاؤ۔ بلکہ آزادی سے کر ڈالو پانچواں فائدہ یہ کہ احکام الٰہی میں تبدیلی بھی ہوسکتی ہے اور تغییر بھی دیکھو انکو پہلے مطلق گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ پھر ان کے سوالات سے وہ گائے خاص کر دی گئی۔ چھٹا فائدہ یہ کہ جو اپنے بال بچوں کو اللہ کے سپرد کر دے تو اللہ اس کی عمدہ پرورش فرماتا ہے۔ ساتواں فائدہ جو اپنا مال اللہ کے بھروسے پر اس کی امانت میں دے اللہ اس میں برکت دیتا ہے۔ آٹھواں فائدہ ماں باپ کی فرمانبرداری حق تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ علماء فرماتے ہیں۔ کہ دوسرے نیک اعمال کا بدلہ آخرت میں ملے گا۔ لیکن والدین کی اطاعت کا بدلہ دنیا و آخرت دو جگہ ملتا ہے نواں فائدہ فیض ربانی خیرات و قربانی کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ دسواں فائدہ راہ خدا میں نفیس مال دینا چاہیئے۔ گیارھواں فائدہ گائے کی قربانی بہت افضل ہے۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو گائے کی قربانی کا حکم دیا نہ کہ دوسری چیز کا۔ نیز زمین گائے کے سینگ پر ہے۔ نیز ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کے سامنے گائے کا گوشت ہی پیش فرمایا۔ وَجَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ۔ نیز جنت کی پہلی غذا گائے کی کلیجی اور مچھلی کا گوشت ہوگا۔ نیز مشرکین گائے کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کو ذبح کر دینے میں شرک کی حقارت ہے۔ جیسے کہ قیامت میں چاند سورج جہنم میں بھیجے جائیں گے مشرکین کی ذلت کیلئے۔ بارھواں فائدہ کسی کو مذاق سے پریشان کرنا۔ یا مسائل شرعیہ میں دل لگی کرنا یا مقدمہ کے فیصلہ کے وقت مذاق کرنا جہالت ہے۔ انبیاء کرام اس سے معصوم ہیں

**پہلا اعتراض** اس مقصد کے لئے گائے کا گوشت ہی کیوں تجویز ہوا۔ دوسرے جانوروں سے بھی یہ کام نکل سکتا تھا۔ **جواب** اسکی بہت سی حکمتیں خلاصۂ تفسیر اور فوائد میں بیان ہوچکیں چند وجہ اور بھی ہیں[۱] بنی اسرائیل بچھڑے کی پرستش کر چکے تھے۔ اور اُن کے دل میں ابھی تک کسی قدر اُس کی عظمت تھی۔ وہ توڑنے کیلئے اسی کے ذبح کا حکم دیا گیا[۲] اس میں ایک سعادت مند اور والدہ کی اطاعت کرنیوالے بچہ کا بھلا بھی تھا۔ کہ اُس کی گائے بہت قیمت سے فروخت ہوگئی۔ **دوسرا اعتراض** اپنے نفع کیلئے بے قصور جانور کی جان لینا ظلم ہے۔ اور خدا تعالیٰ ظلم نہیں کرسکتا (آریہ) **جواب** جانور وغیرہ انسان ہی کے نفع کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ پنڈت جی بھی چمڑے کے جوتے اور گائے بھینس کا دودھ ہی استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ اب تو سائنس نے بتا دیا ہے۔ کہ ہوا اور پانی میں صدہا جانور ہیں۔ جو کہ ناک اور منہ کی راہ انسان کے پیٹ میں جاتے رہتے ہیں۔ پنڈت جی کو چاہیئے کہ پانی پینا اور سانس لینا چھوڑ دیں۔ نیز تمام سبزیوں میں بھی جان ہے۔ وہ بھی نہ کھانی چاہیئیں۔ پنڈت جی دنیا کا نظام ایسے ہی قائم ہے۔ کہ بعض جان بعض جان کو کھا کر زندگی گذارتی ہیں۔ بڑی مچھلی چھوٹی کو شکاری جانور دوسروں کو کھا کر ہی زندہ رہتے ہیں۔ دواؤں میں صدہا جانوروں کے گوشت و چربی کام آتے ہیں جنھیں پنڈت صاحبان بخوبی فروخت کرتے اور استعمال کرتے ہیں۔ اسلام فطری دین ہے اُس کے سارے احکام بھی فطرت کے موافق ہیں **تیسرا اعتراض** حدیث شریف میں ہے۔ کہ گائے کا گوشت بیماری ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ السلام نے کبھی نہ کھایا اور صوفیاء کرام حلیلین اور اطباء بیمار کو اس سے سخت منع کرتے ہیں۔ لہٰذا اس سے بچنا سخت ضروری ہے۔ (خون کے آنسو) **جواب** یہ حدیث تفسیر روح البیان پارہ ۸ سورۃ انعام میں زیر آیۃ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ہے۔ پوری حدیث یہ ہے۔ کہ گائے کا دودھ گھی استعمال کرو۔ اور اس کے گوشت سے بچو۔ کیونکہ اُس کے دودھ گھی میں شفا ہے۔ اور گوشت میں بیماری ہے۔ اس حدیث سے تو معلوم یہ ہو رہا ہے۔ کہ گائے کا گوشت گائے کے گھی کے ساتھ استعمال کرنا چاہیئے۔ کہ اُسکی اصلاح اس میں ہے یعنی گائے کا گوشت خوب کھاؤ۔ مگر اُس میں گائے کا گھی ڈال لیا کرو۔ اور کھا کر گائے کا دودھ بھی پی لیا کرو نیز ملک عرب کی آب و ہوا خشک ہے۔ اور یہ گوشت بھی خشک ہوسکتا ہے۔ کہ وہاں کیلئے مفید نہ ہو۔ ورنہ ہم پہلے بیان کر چکے۔ کہ جنت میں یہ ہی پہلی غذا ہوگی اور حضرت ابراہیم نے مہمان فرشتوں پر یہ ہی پیش فرمایا۔ نیز اس کی قربانی کا قرآن کریم نے بھی حکم دیا وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ اس کی

تحقیق اسی آیت کے ماتحت ان شاء اللہ ہوگی۔ حضور علیہ السلام نے حجۃ الوداع میں اپنی ازواج پاک کی طرف سے گائے کی قربانی فرمائی۔ اور اس کا شوربا استعمال فرمایا۔ تو کیا بیماری کی چیز سے قربانی فرمائی۔ صوفیاء کرام رحمہم اللہ بھی صرف گائے ہی نہیں بلکہ سارے گوشتوں سے پرہیز کرا کر ترک حیوانات کرا لیتے ہیں۔ بلکہ وہ دودھ گھی تیل وغیرہ سے بھی بچاتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ نفس دنیاوی لذتیں چھوڑ کر مردہ ہو جاوے۔ رہا اطباء کا اس گوشت سے منع فرمانا۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گوشت گائے نہایت مقوی اور عمدہ غذا ہے۔ اسے قوی معدہ والا تندرست ہی ہضم کر سکتا ہے۔ جیسے کہ سیب و دیگر مقویات بیمار برداشت نہ کر سکیگا۔ حکیم صاحب بیماروں کو تو اس سے بچاتے ہیں۔ اور خود روزانہ سیروں کھا جاتے ہیں۔ نیز اگر گائے ذبح نہ ہو تو ان کی کثرت سے آدمی کی زندگی دشوار ہو جاویگی۔ تمام زمین میں یہ ہی ہو جاوینگی اور تمام پیداوار یہی ہضم کر جائینگی اب صرف ہندوستان میں پچیس ہزار روزانہ ذبح ہوتی ہیں تب تو ان کی کثرت کا یہ حال ہے۔ اگر ان کا ذبیحہ بند ہو گیا۔ تو پنڈت جی کو بھی کھا جائینگی۔ ان شاء اللہ ذبیحہ گائے کی بحث سورۂ حج میں بھی کی جائیگی **چوتھا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ مذاق اور دل لگی کرنا جاہلوں کا کام ہے۔ حالانکہ قرآن فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ۔ رب بھی مذاق کرتا ہے۔ نیز احادیث سے ثابت ہے۔ کہ نبی علیہ السلام بھی خوش طبعی فرماتے تھے۔ مشکوٰۃ شریف میں حضور علیہ السلام کی خوش طبعی کا ایک باب مقرر کیا۔ باب المزاح

**جواب** ۔ اس آیت میں مشرکین کی سزا کو استہزا فرمایا گیا جس کی تفسیر وہاں ہی ہو چکی حضور علیہ السلام نے مزاح فرمایا ہے۔ نہ کہ استہزا۔ مزاح خوش طبعی اور دل خوش کرنے والی باتوں کو کہتے ہیں۔ اور استہزا کسی کو بے وقوف بنانے اور اس کو دل لگی کر کے پریشان کرنے کا نام ہے۔ استہزا منع ہے۔ اور کبھی کبھی مزاح (خوش طبعی) جائز بلکہ بہتر ہے۔ اس کی تفسیر صوفیانہ آخیر قصہ میں کی جائے گی

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَلَا

کہا انہوں نے دعا کرو واسطے ہمارے رب اپنے سے بیان کرے واسطے ہمارے کیا ہے وہ کہا تحقیق وہ فرماتا ہے تحقیق وہ ایک گائے ہے نہ تو عمر رسیدہ اور نہ

بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتادے گائے کیسی۔ کہا وہ فرماتا ہے۔ کہ وہ ایک گائے ہے۔ نہ بوڑھی ہے۔ اور نہ اوسر

بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿٦٨﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا

بچھیا نصف ہے درمیان اس کے پس کرو تم وہ جو حکم دیے جاتے ہو تم وہ بولے دعا کرو واسطے ہمارے رب اپنے سے بیان فرمائے واسطے ہمارے

بلکہ ان دونوں کے بیچ میں ہے۔ تو کرو جس کا تمہیں حکم ہوتا ہے بولے اپنے رب سے دعا کیجئے ہمیں بتادے

لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ﴿٦٩﴾

رنگ اس کا فرمایا تحقیق وہ رب فرماتا ہے تحقیق وہ ایک گائے ہے پیلی خالص ہے رنگ اس کا خوش کرتی ہے دیکھنے والوں کو

اس کا رنگ کیا ہے۔ کہا وہ فرماتا ہے۔ وہ ایک پیلی گائے ہے۔ جس کی رنگت ڈہڈہاتی ہے۔ دیکھنے والوں کو خوشی دیتی

**تعلق** ۔ اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** پہلے موسیٰ علیہ السلام کے فرمان کا ذکر ہوا تھا۔ اب ان اسرائیلیوں کے آمادگی عمل کا تذکرہ ہے۔ **دوسرا تعلق** پہلی آیت کے مضمون سے شبہ ہو سکتا تھا۔ کہ وہ اسرائیلی اطاعت حکم پر تیار نہ ہوئے۔ بلکہ سرکشی کرتے رہے اب وہ شبہ دور کیا جا رہا ہے۔ کہ وہ اطاعت تو کرنے پر راضی ہوئے۔ مگر بہت حیل و حجت کے بعد **تفسیر** قَالُوا چونکہ ان اسرائیلیوں کو اس سے بہت ہی حیرت تھی۔ اس لئے وہ سمجھے کہ ہر گائے میں مردہ زندہ کرنے کی تاثیر نہیں یہ تو کوئی خاص گائے ہی ہوگی۔ اس لئے وہ اس گائے کی نشانیاں پوچھ پوچھ کر مقرر کرانے لگے۔ یہ نہ سمجھے۔ کہ یہ گائے کا کام نہیں۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے یا قاتل اور اس کے ورثاء نے اپنی رسوائی کے خوف سے اس قسم کی حجت بازیاں شروع کر دیں۔ تاکہ بحث میں پڑ کر یہ معاملہ رفع دفع ہو جائے (تفسیر کبیر) لہذا یا تو ان سب لوگوں نے کہا یا قاتل اور اس کے ورثاء نے کہا اُدْعُ لَنَا ہمارے لئے دعا کرو۔ لَنَا سے یہ کہہ رہے ہیں کہ سوال ہماری تسلی کے لئے ہے۔ آپ کو تو پہلے ہی سے تشفی ہے۔ رَبَّكَ سے

رب کو موسیٰ علیہ السلام کی طرف اس لئے نسبت کیا۔ کہ وہ ان پر مہربان ہے۔ اور انکی سنتا ہے جس سے معلوم ہوا۔ کہ کسی مقبول بارگاہ سے دعا کرانا بہتر ہے۔ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ہمیں خوب واضح کر کے بتا دے۔ کہ وہ گائے کیا ہے۔ یا کیسی ہے خیال رہے کہ لفظ مَا هِيَ حقیقت دریافت کرنے کیلئے بولا جاتا ہے مگر یہاں صفات اور علامات پوچھنے کیلئے ہے جیسے کہ کہتے ہیں۔ کہ زید کیا ہے یعنی طبیب ہے۔ یا عالم یا شاعر اسی طرح فرمایا گیا۔ کہ وہ گائے کیا ہے یعنی چھوٹی ہے یا بڑی تفسیر عزیزی نے اس جگہ عجیب بات فرمائی وہ یہ کہ یہاں مَا هِيَ سوال حقیقت کیلئے ہے۔ گائے بہت سی قسم کی ہیں جنگلی گائے۔ جیسے نیل گائے کہتے ہیں۔ پہاڑی گائے۔ جیسے سوڑ گائے کہتے ہیں۔ دریائی گائے اور عام پالنے کی گائے۔ وہ یہ سمجھے کہ ان چار گایوں میں تو زندہ کرنیکی تاثیر نہیں شاید علم الٰہی میں انکے سوا اور کوئی گائے بھی ہوگی کہ جسمیں یہ تاثیر ہو چونکہ لفظ بقرہ چند قسم کی گائیوں کو شامل تھا جن میں سے ہر ایک کی نوعیت علیحدہ تھی اسلئے انہوں نے مَا هِيَ کہا مگر چونکہ یہی دودھ کی گائے مقصود تھی۔ اس لئے جواب میں اسکے صفات بتائے گئے نہ کہ حقیقت اس تفسیر سے منطقی اور نحوی سارے اعتراض اٹھ گئے قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ یہاں ایک عبارت پوشیدہ ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی اور رب نے وحی کی تب آپ نے قوم سے فرمایا کہ رب فرماتا ہے کہ گائے سے کوئی خاص قسم کی گائے مراد نہیں بلکہ إِنَّهَا بَقَرَةٌ یہی دودھ والی عرفی گائے مراد ہے حکم میں تو کوئی مقرر نہ تھی جو تم چاہتے ذبح کر دیتے مگر علم الٰہی میں معین ہے۔ کہ وہ گائے لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ نہ تو بڈھی ہے اور نہ بالکل نوجوان یعنی بیکار نہیں کام کاج کے قابل ہے۔ فَارِضٌ فرض سے بنا ہے جس کے معنی ہیں قطع کرنا اور انتہا تک پہنچ جانا نماز پنجگانہ کو اسی لئے فرض کہتے ہیں کہ انکا حکم قطعی اور انتہائی ہے جسمیں کوئی گنجائش نہیں لفظ بکر کے معنی ہیں شروع اور نئی اسی لئے کنواری عورت کو باکرہ اور پہلے پھل کو باکورہ اور صبح کیوقت کو بکرہ کہتے ہیں۔ بُكْرَةً وَّأَصِيلًا بکر عورت وہ ہے جس تک مرد نہ پہنچا ہو۔ اور بکر گائے وہ جس نے بچہ نہ دیا ہو۔ یا فقط ایک بار دیا ہو عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ اسکے درمیان ہے یعنی ادھیڑ اگرچہ پہلے کلام سے ادھیڑ ہونا ظاہر ہو گیا تھا مگر چونکہ وہ حجت باز کہتے کہ نہ معلوم بالکل بچی مراد ہے۔ یا قریب جوانی یا قریب بڑھاپے کے اسلئے فرما دیا گیا۔ کہ بڑھاپے اور جوانی کے بالکل درمیان ہونی چاہیئے ذَٰلِكَ کا اشارہ فَارِضٌ اور بِكْرٌ دونوں کی طرف ہے۔ اس لئے اس پر بَيْنَ داخل ہو گیا۔ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ یا تو یہ رب کا کلام ہے۔ یا موسیٰ علیہ السلام کا اس میں لطیف اشارہ اس جانب بھی ہے۔ کہ اے اللہ کے بندو بڑے محقق نہ بنو۔ ورنہ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ بلکہ جس کا حکم ملا ہے۔ فوراً کر ڈالو۔ اور عجائبات قدرت سے کچھ تعجب نہ کرو۔ جونسی گائے ذبح کرو گے۔ وہ اس میں یہ تاثیر پیدا کر دے گا۔ مگر اس پر بھی ان کی تشفی نہ ہوئی۔ اور پھر سوال کرنے لگے۔ کہ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ ہم یہ تو سمجھ گئے۔ لیکن اپنے رب سے یہ اور پوچھ لو۔ کہ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ہمیں بتا دے کہ اس کا رنگ کیسا ہے شاید اس کے رنگ میں یہ تاثیر ہو۔ تب قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ یہاں بھی وہی عبارت پوشیدہ ہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام نے رب سے دعا کی اور ادھر سے وحی آئی تب آپ نے قوم سے فرمایا۔ کہ رب فرماتا ہے إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ۔ کہ وہ پیلے رنگ کی ہے حضرت وھب فرماتے ہیں۔ کہ ایسی تیز پیلی ہے کہ گویا اس میں سے آفتاب کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔ اسی لئے اس گائے کا نام مذہبہ تھا۔ یعنی خوبصورت سنہری چونکہ صفراء کالی کو بھی کہہ دیا کرتے ہیں جیسے كَأَنَّهُ جِمَالَتٌ صُفْرٌ اس وہم کو دفع کرنے کیلئے فرمایا گیا فَاقِعٌ لَّوْنُهَا اسکی زردی خالص اور تیز ہے۔ فَاقِعٌ فقع سے بنا ہے جس کے معنی ہیں تیز ہونا اور خالص ہونا یعنی وہ گائے تیز پیلی اور خالص پیلی ہے کہا گیا ہے۔ کہ اس کے سینگ اور کھر بھی پیلے تھے (تفسیر روح البیان)، اس کے باوجود وہ ڈیل ڈول وغیرہ میں کم نہیں بلکہ تَسُرُّ النَّاظِرِينَ دیکھنے والوں کو پسند آتی ہے۔ اور اس کو دیکھ کر اپنے غم بھول جاتے ہیں۔

**خلاصہ تفسیر** جب موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو اطمینان دلایا کہ یہ تمسخر کی باتیں نہیں بلکہ حکم الٰہی ہے۔ تو وہ سمجھے کہ مردہ زندہ کرنے کی تاثیر کسی خاص گائے کے گوشت میں ہوگی۔ اسی کے ذبح کرنے کا حکم ہوگا۔ اس لئے انہوں نے عرض کیا۔ کہ اے موسیٰ علیہ السلام رب سے دعا کرو۔ کہ اس اجمال کی تفصیل فرمائے اور اس گائے کو مقرر کرے۔ کہ وہ کیسی ہے۔ تب آپ نے ارشاد فرمایا۔ کہ وہ گائے ادھیڑ عمر کی ہے نہ تو بڑھیا ہے۔ اور نہ بالکل چھوٹی بچھیا بلکہ اس کے درمیانی۔ اے قوم والو جو حکم ملا ہے۔ کر گزرو۔ زیادہ تحقیقات میں نہ پڑو۔ مگر وہ پھر بھی نہ سمجھے۔ کیونکہ معجزے کی طرف ان کا خیال نہ گیا۔ بلکہ یہی سمجھتے رہے۔ کہ کوئی عجیب ہی گائے ہوگی۔ کہ جس کے گوشت میں یہ تاثیر ہے۔ تو وہ بولے۔ کہ اب یہ دعا کرو۔ کہ ہمیں اس کا رنگ بتا دیا جاوے تو آپ نے فرمایا۔ کہ وہ پیلی گائے ہے۔ اس کا رنگ تیز ہے۔ دیکھنے والوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ غرضکہ ان کی جس قدر تفتیش بڑھتی گئی۔ اسی

قدر اس طرف سے زیادہ پابندی **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** یہ کہ اللہ کی راہ میں بہتر چیز خرچ کرنی چاہیئے۔ اور اچھی جانور کی قربانی کرنی چاہیئے کیونکہ جب انہوں نے اس گائے کے حالات دریافت کئے تو عمدہ گائے کی طرف اُن کو ہدایت کیگئی **دوسرا فائدہ** خالص پیلا رنگ خوشی پیدا کرتا ہے۔ اور غموں کو دور کرتا ہے تفسیر عزیزی اور روح البیان نے اس جگہ حضرت عبد اللہ ابن عباس اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کہ جو شخص پیلے رنگ کے جوتے پہنے انشاء اللہ اس کے غم دور ہوں گے۔ اور وہ خوش وخرم رہے گا۔ اور بعض روایتوں میں ہے کہ جو کوئی لگاتار پیلے جوتے کے سات جوڑے پہنے وہ انشاء اللہ رنج وغم سے نجات پائے۔ عبد اللہ ابن زبیر اور دیگر بزرگوں نے سیاہ رنگ کا جوتا منع فرمایا۔ کیونکہ اس سے رنج وغم پیدا ہوتا ہے۔ خیال رہے کہ سرخی اور زردی سیاہی سفیدی اور سبزی ان پانچ رنگوں کے جدا جدا خاصے ہیں۔ سرخی میں جمال ہے۔ زردی میں خوشی سبزی میں بزرگی سفیدی میں خوبی اور افضلیت اور سیاہی میں دہشت ورنج وغم (تفسیر عزیزی) اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر سیاہ چیز بری ہے بلکہ سیاہ جوتا بہتر نہیں موزہ اور پگڑی سیاہ ہی عمدہ ہے۔ فرعون کا موزہ سرخ تھا اور ہامان کا سفید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا موزہ مبارک سیاہ باقی لباس مردوں کیلئے سفید بہتر اور عورتوں کیلئے رنگین **پہلا اعتراض** اس میں کیا راز ہے کہ پہلے ہی سے پوری بات نہ بتائی گئی۔ بلکہ پہلے صرف گائے کا حکم دیا اور ان کے پوچھنے پر باقی قیدیں ارشاد ہوئیں۔ یہ طریقہ علم وحکمت کیخلاف معلوم ہوتا ہے **جواب** اولاً ان کو صرف گائے ذبح کرنے کا حکم تھا۔ ان کے پوچھنے پر قیدیں لگائی گئیں۔ اگر پہلے ہی سے خاص گائے مراد ہوتی تو یہ سوال ہو سکتا تھا۔

**دوسرا اعتراض** تو کیا ان کے پوچھنے سے رب کا علم اور ارادہ بدل گیا یہ تو ناممکن ہے **جواب** ارادہ اور علم تو نہ بدلا حکم میں فرق ہوگیا۔ رب کے علم وارادہ میں یہی بات تھی۔ کہ وہ بار بار سوال کریں۔ اور قیدیں بڑھیں۔ تاکہ اگلوں کو عبرت ہو اور وہ سوالات سے بچا کریں۔ اور حکم کی تبدیلی دن رات ہوتی رہتی ہے۔ امیر آدمی کو پانچ عبادتوں کا حکم ہے۔ مگر جب وہ غریب ہو جائے تو حج وزکوٰۃ معاف ہو کر اس کو صرف تین کا حکم رہ جاتا ہے درحقیقت یہ حکم کی تبدیلی نہیں بلکہ تعلق کی تبدیلی ہے **تیسرا اعتراض** اس کام کیلئے پیلی گائے کیوں منتخب ہوئی اور گایوں سے بھی یہ کام ہو سکتا تھا **جواب** اس لئے کہ سامری کا بچھڑا سونے کا تھا۔ اور پیلا جسکی عظمت ان کے دل میں قائم ہو چکی تھی۔ مناسب تھا۔ کہ اس رنگ کی گائے انہیں کے ہاتھ سے ذبح کرا کر ان کے دل سے یہ عظمت دور کی جائے۔ تفسیر صوفیانہ مضمون کے خاتمہ پر کی جائیگی۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ

وہ بولے دعا کرو واسطے ہمارے رب اپنے سے بیان کرے واسطے ہمارے کیسی ہے وہ گائے تحقیق گائے مشتبہ ہو گئی اوپر ہمارے اور تحقیق ہم اگر چاہا اللہ نے

بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ ہمارے لئے صاف بیان کردے وہ گائے کیسی ہے۔ بیشک گایوں میں ہم کو شبہ پڑ گیا اور اللہ چاہے تو

لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ

البتہ ہدایت پانے والے ہیں فرمایا تحقیق وہ رب فرماتا ہے تحقیق وہ ایسی گائے ہے کہ نہیں ذلیل کہ جوتتی ہو زمین کو اور نہ پانی دیتی ہے کھیتی کو

ہم راہ پا جائیں گے ۔ کہا وہ فرماتا ہے۔ کہ وہ ایک گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی کہ زمین جوتے اور نہ کھیتی کو پانی دے

مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾

سلامت ہے کہ نہیں ہے کوئی داغ بیچ اسکے کہا انہوں نے اب لائے آپ ٹھیک بات پس ذبح کیا انہوں نے اسکو اور نہ قریب تھے کہ کرتے

بے عیب ہے جس میں کوئی داغ نہیں بولے اب آپ ٹھیک بات لائے۔ تو اسے ذبح کیا اور ذبح کرتے معلوم نہ ہوتے تھے

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** یہ پہلے مضمون کا تتمہ ہے اور ان کے سوال وجواب کا بقیہ **دوسرا تعلق** پہلے سوالات سے شبہ ہو سکتا تھا۔ کہ شاید وہ لوگ اس بہانہ سے حکم ٹالنا چاہتے ہیں۔ اور ان کے یہ سوالات عناداً ہیں۔ نہ انقیاداً

(اطاعت کیلئے) اب اس شبہ کو دور کیا جا رہا ہے۔ کہ وہ اطاعت ہی کیلئے اتنی تحقیقات کر رہے تھے۔ چونکہ وہ وہمی قوم تھی۔ اس لئے اپنے سوالات کی بوچھاڑ کر ڈالی **تفسیر** قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ گائے کی عمر اور رنگت بیان کرنے کے بعد بھی ان کو تسلی نہ ہوئی۔ اب اسکے دیگر صفات معلوم کرنے کیلئے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا۔ کہ رب سے پھر دعا کرو۔ يُبَيِّن لَّنَا خوب ظاہر کر دے ہمارے لئے یعنی اس عمر اور رنگت اور جمال والی گائے بھی بہت سی ہیں۔ ان میں سے کسے ذبح کریں۔ لہٰذا صاف صاف بتایا جائے۔ کہ مَا هِيَ وہ کیسی یا کون سی گائے ہے بعض علماء نے فرمایا۔ کہ یہ پہلا ہی سوال ہے۔ یعنی ہماری سمجھ میں آ گیا ذرا اور صاف دوبارہ بیان کر دو بعض نے فرمایا کہ یہ مَا بھی کَیْفَ کی طرح صفات پوچھنے کیلئے ہے۔ یعنی اب یہ بتاؤ کہ وہ جنگل میں چرتی ہے۔ یا مالک کا کام کاج کرتی ہے بعض نے فرمایا کہ یہ حقیقت شخصیہ دریافت کرنے کیلئے ہے یعنی پہلے مَا هِيَ کا یہ مطلب تھا۔ کہ وہ کون سی قسم کی گائے ہے۔ دریائی یا خشکی کی جنگلی یا پہاڑی۔ اب یہ پوچھ رہے ہیں۔ کہ اس خاص قسم کی گائے میں سے کون سی گائے ہے۔ اسکی حقیقت شخصیہ کیا ہے لہٰذا اس سوال میں تکرار بھی نہیں ہے۔ اور دونوں جگہ مَا طلب حقیقت ہی کیلئے ہے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں۔ کہ اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا۔ کہ اس قسم کی گائے بھی ہم پر مشتبہ ہی ہے۔ کیونکہ ایسی گائے صدہا موجود ہیں۔ اور زندہ کرنے کی تاثیر ہر ایک میں نہیں ہو سکتی۔ اور اے موسیٰ علیہ السلام ہم ٹالنے کیلئے یہ سوالات نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ۔ اگر اللہ نے چاہا۔ تو اس گائے کا پتہ لگا لیں گے۔ اور اس پر عمل کریں گے۔ یا تو اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ ہم فی الحال ہدایت پائے ہوئے ہیں اور انشاء اللہ فقط برکت کیلئے کہا ہے۔ یعنی خدا کے فضل سے ان سوالات میں ہم حق بجانب اور ہدایت پر ہیں ہمارے یہ سوالات انکار اور گمراہی کی بنا پر نہیں۔ بلکہ اطاعت کے لئے ہیں۔ یا یہ مطلب ہے۔ کہ ہم ہدایت والے ہو جائیں گے۔ یعنی اگر آپ نے ہماری تسلی کر دی تو ہم اس گائے کو ضرور حاصل کر لیں گے۔ یا قاتل کو پا لیں گے۔ یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ یہاں بھی وہی عبارت پوشیدہ ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوال رب کے پیش کیا۔ اور جواب ملنے پر قوم سے فرمایا۔ کہ رب فرماتا ہے۔ کہ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ وہ گائے ذلول نہیں ہے یعنی خدمت انسان کی ذلت اٹھانے والی نہیں اور نہ وہ کام کاج کیلئے رکھی گئی ہے۔ ذلول بروزن فعول صفت کیلئے آیا اس میں بہت کمزوری نہیں بلکہ اس میں صعوبت ہے۔ ذُلٌّ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ذلت اور حقارت چونکہ شوقیہ پالے ہوئے جانور کی محبت۔ قدر۔ خدمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور کام کاج کے جانور کی اتنی قدر نہیں بلکہ معمولی غذاؤں سے فقط باقی رکھا جاتا ہے۔ تاکہ کام بند نہ ہو۔ ہم نے دیکھا ہے۔ کہ شوقیہ پلے ہوئے مرغ۔ کبوتر وغیرہ کو عمدہ عمدہ غذائیں کھلائی جاتی ہیں۔ دہلی وغیرہ میں قربانی کی گائے کو جلیبیاں اور مٹھائیاں کھلاتے ہیں۔ اسے عمدہ کپڑوں اور زیوروں سے آراستہ کرتے ہیں۔ معلوم ہوا۔ کہ کاروباری جانور ذلیل اور شوقیہ عزیز ہے۔ اسی لئے ذَلُوْلٌ کی تفسیر میں فرمایا تُثِيْرُ الْاَرْضَ۔ یہ لَا کے تحت میں ہے یعنی وہ ایسی ذلیل نہیں ہے۔ کہ زمین جوتے تُثِيْرُ ثَوْرٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں منقلب کرنا اور پلٹ دینا اس لئے جوش کو ثوران کہتے ہیں کہ اسمیں نفس کی حالت پلٹ جاتی ہے۔ جوتنے میں بھی مٹی اوپر نیچے ہو جاتی ہے۔ اسلئے اسکو اثارت کہتے ہیں۔ اور بیل کو بھی اس لئے ثور کہا جاتا ہے۔ کہ وہ یہ کام کرتا ہے۔ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ۔ یہ سقیٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پلانا اسی لئے بہشتی کو سقہ اور شراب پلانے والے کو ساقی اور پانی کی جگہ کو سقایا کہتے ہیں یعنی وہ چرسہ یا رہٹ وغیرہ چلا کر کھیت کو پانی بھی نہیں دیتی چونکہ زمین کی جتائی پہلے ہوتی ہے۔ اور پانی بعد میں اس لئے اس کا ذکر بعد میں ہوا نیز سادہ زمین جوتی جاتی ہے۔ اور جوتی بوئی ہوئی کو پانی دیا جاتا ہے۔ اس لئے پہلے ارض فرمایا تھا یہاں حرث فرمایا (یعنی کھیتی) بعض لوگوں نے سمجھا۔ کہ وہ بیل تھا کیونکہ کھیتی باڑی کا کام بیل ہی کرتا ہے۔ نہ کہ گائے مگر صحیح یہ ہے۔ کہ وہ گائے تھی کیونکہ ان آیات میں تمام ضمیریں مؤنث ہی ہیں۔ اور روایات بھی اس کی تائید کرتی ہیں غالباً اس ملک میں گائے سے کھیتی باڑی کا کام لیتے ہوں گے۔ جیسے کہ پنجاب میں بھینس سے۔ بلکہ سیالکوٹ میں تو بھینس سے ہل گاڑیاں وغیرہ بھی چلائی جاتی ہیں۔ اس لئے یہ فرمایا گیا۔ اس ذلول کا دور بھی انجح کرنیکیلئے ارشاد ہوا مُسَلَّمَةٌ یہ سلمٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں صحیح سلامت رہنا یعنی وہ گائے عیبوں سے یا کام کاج کے اثرات سے سلامت ہے۔ یا باندھنے سے محفوظ ہے۔ کہ وہ جنگل میں چھوٹی ہوئی یا وہ کانٹے سوراخ کرنے یا داغ دینے یا جوئے کے اثر اور چابک وغیرہ کے اثرات سے محفوظ ہے۔ کیونکہ یہ عیوب کام کاج کے جانوروں میں ہوتے ہیں دوسری

بات یہ ہے۔ کہ لَا شِيَةَ فِيهَا۔ شِيَةٌ وَشْيٌ سے بنا ہے۔ جیسے وعدٌ سے عِدَةٌ اور وَزْنٌ سے زِنَةٌ اس کے لغوی معنی ہیں۔ گودنا اور داغ دینا یعنی وہ گائے بالکل پیلی ہے جس میں کوئی داغ دھبہ نہیں جب انہوں نے یہ سارے صفات سن لئے تو خوش ہو کر بولے۔ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ۔ اب آپ ٹھیک ٹھیک بات لائے۔ آن تھوڑے سے وقت کو کہتے ہیں۔ جیسے کہ ایک آن میں چلا گیا۔ اور "الف لام" کی وجہ سے اس کے معنی ہوتے ہیں۔ اب یہ حق باطل کا مقابل نہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ اب تک جھوٹ کہا تھا۔ اب سچ۔ بلکہ اس سے پوری ٹھیک بات مراد ہے۔ یعنی اب آپ نے تسلی بخش بات کہی۔ تسلی ہو چکنے کے بعد انہوں نے اس گائے کو ڈھونڈ کر حاصل کیا اور فَذَبَحُوهَا۔ ذبح کے معنی ہم پہلے بتا چکے چونکہ گائے بکری کو ذبح کرنا ہی بہتر ہے۔ نہ کہ نحر اس لئے انہوں نے ذبح ہی کیا۔ بہت حیل و حجت کے بعد ذبح تو کر لیا۔ لیکن وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ۔ اس بڑے کام کے کرنے کے قریب بھی نہ تھے۔ اس لئے کہ انہوں نے سوالات کا ایسا سلسلہ قائم کیا تھا۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ نہ یہ سلسلہ ختم ہوگا۔ نہ یہ ذبح کریں گے۔ یا وہ گائے اس قدر قیمتی تھی۔ کہ بظاہر ان کی برداشت سے باہر یا ان کو رسوائی کا خوف تھا۔ کہ مقتول زندہ ہو کر قاتل کا پتہ دیگا جس سے راز کھل جاویگا۔ مگر ہم نے ان کو شافی جواب دیکر خاموش کر دیا جس سے ذبح کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس عبارت کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ وہ لوگ زیادہ سوال و جواب کی وجہ سے جلد ذبح نہ کر سکے۔ بلکہ بہت عرصہ کے بعد چنانچہ روح البیان نے فرمایا۔ کہ اس سارے واقعہ میں چالیس سال صرف ہوئے

**خلاصہ تفسیر** ان اسرائیلیوں کو عمر و رنگ معلوم ہونے پر بھی تسکین نہ ہوئی کہنے لگے۔ کہ اس عمر اور اس رنگت کی بہت سی گائیں ہیں۔ ابھی ہم پر مشتبہ ہی ہے۔ کہ کونسی گائے ذبح کریں۔ دعا فرمایئے۔ کہ رب تعالیٰ اور بھی زیادہ وضاحت فرما دے۔ کہ کونسی گائے ذبح کی جاوے۔ ہم انشاء اللہ اطاعت سے در گزر نہ کریں گے ضرور وہ گائے تلاش کر کے ذبح کر دیں گے۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ رب فرماتا ہے۔ کہ وہ نہ تو ایسی ذلیل و خوار گائے ہے۔ جو ہل جوتتی یا کھیتی کو پانی دیتی ہو۔ اور نہ اس میں کسی قسم کا کوئی عیب ہے۔ سارے عیبوں سے دور اور اس کا جسم بے داغ و دھبہ ہے۔ تب وہ بولے کہ ہاں اب آپ نے پوری اور صاف صاف بات بتائی پھر وہ تلاش کرتے ہوئے۔ اس لڑکے کے پاس پہنچے جس کے پاس ایسی گائے تھی حالانکہ اس زمانہ میں گائے کی قیمت تین دینار یعنی ساڑھے سات روپیہ تھی۔ مگر لڑکے نے فرشتہ کی ہدایت کے موافق قیمت یہ طے کی۔ کہ اس کا چمڑہ سونے سے بھر دیا جاوے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی ضمانت پر گائے بنی اسرائیل کے حوالہ کی ان ظاہری علامات سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہ لوگ یوں ہی وقت گزار کر معاملہ رفع دفع کر دیں گے۔ مگر تسلی بخش جوابات کے پا جانے پر ان کو یہ کرنا ہی پڑا **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** یہ کہ قربانی کے لئے بہتر سے بہتر جانور لینا چاہیئے۔ اس کا ناک کان دم وغیرہ سب دیکھ لیں عیب دار جانور ہرگز ذبح نہ کریں۔ **دوسرا فائدہ** یہ کہ ہر امید پر "انشاء اللہ" ضرور کہنا چاہیئے۔ ورنہ وہ امید پوری نہ ہوگی۔ حدیث پاک میں ہے۔ کہ اگر یہ لوگ انشاء اللہ نہ کہتے تو کبھی بھی یہ کام نہ کر سکتے۔ انشاء اللہ کہنے میں عقیدے اور عمل کی اصلاح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کہنے والا اپنی طاقت پر بھروسہ نہیں کرتا۔ بلکہ رب کی مدد پر قرآن کریم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا ہے۔ کہ آپ آئندہ بات پر انشاء اللہ ضرور فرمایا کریں۔ مگر خیال رہے۔ کہ جائز اور بہتر باتوں پر انشاء اللہ کہنی چاہیئے۔ نہ کہ حرام چیزوں اور برائیوں پر۔ آئندہ پر یہ کہو کہ انشاء اللہ میں نماز پڑھوں گا۔ یوں نہ کہو کہ انشاء اللہ میں چوری یا زنا کروں گا۔ شراب پیوں گا۔ ہم بسم اللہ کی تفسیر میں عرض کر چکے۔ کہ حرام چیزوں پر بسم اللہ پڑھنا کفر ہے۔ اسی طرح یوں کہو کہ انشاء اللہ بیمار کو آرام ہوگا۔ یوں نہ کہو۔ کہ انشاء اللہ عنقریب بیماری پھیلے گی کیونکہ بیماری بلا ہے۔ یہاں لفظ اندیشہ وغیرہ استعمال کرو۔ اسی طرح آئندہ کی بات پر انشاء اللہ کہو گزری ہوئی بات پر کہنا بیکار ہے ہاں برکت کیلئے اگر اس پر بھی کہہ لے تو جائز ہے۔ اس موقعہ پر انشاء اللہ "بفضلہ تعالیٰ" کے معنی میں ہوگا اور یہ ان شک کیلئے نہ ہوگا مثلاً کوئی کہے۔ کہ انشاء اللہ میں مسلمان ہوں۔ تو معنی یہ ہی ہیں۔ کہ خدا کے فضل سے میں مسلمان ہوں۔ اگر اپنے ایمان میں شک کرتے ہوئے۔ انشاء اللہ کہتا ہے۔ تو کافر ہے۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ انشاء اللہ کہنا بعض جگہ سنت ہے۔ اور بعض جگہ منع اور بعض موقع پر کفر بھی ہے **تیسرا فائدہ** رب کی اطاعت میں جلدی کرنا ضروری ہے۔ زیادہ تحقیقات کر کے دیر لگانا باعث وبال۔ نوکر کا فرض ہے۔ فرمانبرداری اور جان سپاری نہ کہ تحقیقات

میں وقت گزاری مولانا فرماتے ہیں ؎

تا خیالِ دوست در اسرارِ ماست　　چاکری وجان سپاری کارِ ماست

کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ عاشقاں را چہ کار با تحقیق　　ہر کجا نامِ اوست قربانیم

**چوتھا فائدہ** اپنی چیز جس قدر نفع سے بھی فروخت کرے۔ جائز ہے۔ اس میں حکومت یا قوم کی طرف سے پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ دیکھو تین دیناری گائے اتنی گراں قیمت میں بکی۔ ہاں غلہ یا چارہ قحط کے زمانہ میں گرانی کے انتظار میں روکنا منع ہے **پہلا اعتراض** اس گائے میں کام کاج نہ کرنے اور بے داغ ودھبہ ہونے کی قید کیوں لگائی گئی تھی۔ اسلام نے قربانی کے جانور میں یہ قیدیں نہیں لگائیں **جواب** سامری کا بچھڑا بے داغ دھبہ بھی تھا۔ اور کھیتی باڑی بھی نہیں کرتا تھا۔ ان قیود سے اس بچھڑے کی مشابہت مقصود تھی۔ جب اسلام نے شراب حرام فرمائی تو شروع میں شراب کے برتن استعمال کرنا بھی منع فرمادے۔ کہ اُس حالت سے مشابہت نہ ہوجاوے۔ اور برتن دیکھ کر شراب یاد نہ آجاوے۔ اس گائے کو دیکھ کر وہ بچھڑا ان کو یاد آویگا۔ اور پھر اس کو اپنے ہاتھ سے ذبح کریں گے۔ تو اُس کی الفت دور ہوگی۔ نیز ان پابندیوں سے اُس سعادتمند والدہ کی اطاعت کرنے والے جوان کا بھلا ہوگا۔ کہ ایسی گائے کسی اور جگہ نہ ملے گی۔ وہ منہ مانگی قیمت حاصل کرلیگا **دوسرا اعتراض** ایک سعادت مند جوان کا بھلائی کے لئے ساری قوم کو زیر بار کرنا خلاف عقل ہے۔ **جواب** ایک نیک بخت کی بھلائی کیلئے مجرم قوم کو کچھ مشقت میں ڈالنا بالکل حکمت کے مطابق ہے ہمیشہ اعلیٰ پر ادنےٰ قربان کیا جاتا ہے۔ ایک بادشاہ کی راحت کیلئے صدہا غرباء مشقتیں اُٹھاتے ہیں نیز اگر یہ قیمت ساری قوم نے چندہ کرکے ادا کی تو ان کو تو محسوس بھی نہ ہوا۔ اور اگر قاتل نے ادا کی تو یہ بھی اُس کو سزا تھی اور اگر مقتول کے بعض دوستوں نے دی تو اس قیمت کی وجہ سے اُن کو اُس کی میراث بچ رہی کیونکہ یہ سب مال قاتل کا تھا جب اُس کا قتل معلوم ہوگیا تو وہ ورثہ سے محروم رہا بہرحال زیادہ نفع کیلئے تھوڑا نقصان مضر نہیں۔

## تفسیر صوفیانہ

قلب انسان کی خواہشات نفسانی نے قتل کردیا۔ اب اس کے زندہ کرنے کی تدبیر یہ ہے۔ کہ گائے یعنی نفس کو شریعت کی چھری سے ذبح کردو کہ اس کی موت میں قلب کی حیات ہے۔ اس لئے مقاتلہ نفس کو جہاد اکبر فرمایا گیا۔ اور ارشاد ہوا۔ کہ مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا یعنی مرنے سے پہلے مرجاؤ۔ خواہشات نفس نے جب یہ حکم سنا۔ تو موسےٰ روح سے کہا۔ کہ کیا تو ہم سے دل لگی کرتا ہے۔ قتل نفس ہر کس وناکس کا کام نہیں روح نے جواب دیا۔ کہ خدا کی پناہ میں اُن جہلاء میں سے نہیں جو کہ قتل نفس کو آسان سمجھتے ہیں۔ یہ کام دنیا دار نفس کے پوجاری کا نہیں۔ تب انہوں نے عرض کیا کہ اچھا مقرر کرو۔ کہ کونسا نفس قتل کیا جاوے جس سے قلب زندہ ہو جواب دیا۔ کہ وہ نفس نہ تو بڈھا راہ قطع کرنے سے عاجز ہو اور نہ بالکل جوان نشہ شباب میں مست ہو۔ بلکہ اس کے درمیان جب کہ کمال عقل رکھتا ہو تب پوچھا۔ کہ اُس کا رنگ کیا ہو۔ جواب ملا۔ کہ پیلے رنگ کا ہو۔ یعنی ریاضت اور عبادت والوں کا نفس ہو جن کے چہرے پیلے ہوتے ہیں جن کی یہ زردی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ نہ کہ بُری جو بھی انہیں دیکھتا ہے۔ اُن کو صالح سمجھ کر خوش ہوتا ہے۔ اُن کا دلی تقویٰ چہرے کی رنگت سے ظاہر ہوتا ہے سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ پھر کہا گیا۔ کہ کچھ اور صفات بتاؤ۔ کیونکہ اس لباس میں بہت سے بطال فریبی بھی ہیں۔ ایسا نشان بتاؤ جس سے باطلین طالبین سے علیحدہ ہوجاویں۔ تب فرمایا گیا۔ کہ وہ ایسا نفس ہے جو کہ دنیا طلبی میں حرص وہوس کے ہل میں نہ جوڑا گیا ہو۔ اور دنیاوی مصنوعات پر فریفتہ نہ ہوا ہو۔ ذلت اُس نے برداشت نہ کی ہو۔ اور نہ اپنے آبرو کے پانی سے دنیا کو سیراب کیا ہو یعنی دنیا حاصل کرنے کیلئے ذلت حاصل نہ کی ہو اور وہ نفس یکرنگ ہو۔ دو رنگا نہ ہو یعنی اللہ اور ماسوی اللہ دونوں کا طالب نہ ہو۔ اس قسم کے عیوب سے سلم ہو۔ تب انہوں نے خنجر صدق سے رب کی توفیق سے نفس کو ذبح کرکے قلب کو زندہ کیا (تفسیر روح البیان) خیال رہے کہ ظاہری گائے ذبح کرکے ظاہری مقتول زندہ کرنیکا واقعہ صرف ایک بار ہی ہوچکا مگر اندرونی گائے ذبح کرکے اندرونی مقتول دل کو زندہ کرنا ہمیشہ ہوتا رہتا ہے [illegible] اللہ والے نفس مار کر قلب زندہ کرتے ہیں [illegible] کا کام ہے۔ نہ کہ ہر کس وناکس کا۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (۷۲) فَقُلْنَا

اور جبکہ قتل کیا تم نے ایک جان کو پس تم نے ایک دوسرے کا الزام لگایا بیچ اس کے اور اللہ ظاہر فرمانے والا ہے وہ جو کچھ تھے تم چھپاتے پس فرمایا ہم نے

اور جب تم نے ایک خون کیا تو ایک دوسرے پر اس کی تہمت ڈالنے لگے اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو تم چھپاتے تھے تو ہم نے فرمایا

اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۷۳)

مارو تم اس کو ساتھ ٹکڑے اس گائے کے اسی طرح زندہ فرماتا ہے اللہ مردہ کو اور دکھاتا ہے تم کو نشانیاں اپنی تاکہ تم عقل رکھو

اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو۔ اور اللہ یونہی مردے جلائے گا۔ اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ کہیں تمہیں عقل ہو۔

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے پہلا تعلق پچھلی آیت میں گائے ذبح کا واقعہ بیان ہوا۔ اب اس کی وجہ بیان ہو رہی ہے۔ کہ گائے ذبح کیوں کرائی گئی۔ دوسرا تعلق پہلے گائے کے ذبح کا ذکر ہوا تھا۔ اب قتل انسان کا واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ جو کہ بنی اسرائیل سے سرزد ہوا اگرچہ قتل انسان پہلے ہوا تھا اور ذبح گائے پیچھے۔ مگر چونکہ ذبح گائے کا واقعہ بتانا ہی اصل مقصود تھا۔ اس لئے پہلے وہ ارشاد فرمایا گیا۔ اور ایک واقعہ کو دو واقعہ کی طرح بیان فرمایا گیا۔ تیسرا تعلق پچھلی آیت کے مضمون پر شبہ پڑ سکتا تھا۔ کہ بنی اسرائیل کا ذبح گائے میں دیر لگانا اپنی سستی یا نافرمانی کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ محض اس لئے کہ اُن کو جواب شافی نہ ملا تھا۔ اور گائے کے ذبح اور مردہ زندہ ہونے میں کوئی تعلق نہ تھا۔ اس شبہ کو دفع فرمایا جا رہا ہے۔ کہ نہیں۔ بلکہ یہ سب کچھ اُن کے سرکشی سے تھا۔ اصل واقعہ ہی اُن کی سرکشی پر مبنی ہے جس میں انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو دھوکہ دینے اور قوم میں فساد پھیلانے کی کوشش کی یعنی ایک شخص کو ظلماً قتل کیا پھر دوسروں کو الزام لگایا پھر موسیٰ علیہ السلام کو دھوکہ دیا۔ لہٰذا یہ تاخیر ذبح بھی سرکشی کی وجہ سے ہوئی۔ **تفسیر وَاِذْ قَتَلْتُمْ** یہاں بھی وہی فعل پوشیدہ ہے یعنی اے اسرائیلیو وہ واقعہ بھی یاد کرو جبکہ تم نے ایک خون کیا تھا۔ یا اے نبی علیہ السلام انہیں وہ واقعہ یاد دلادو۔ اگرچہ ایک شخص نے ہی قتل کیا تھا، مگر پوری جماعت کی طرف اس کی نسبت کیگئی کیونکہ وہ اس سے راضی تھے۔ یا اس سازش میں شریک یا اس کے حامی تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمزمانہ اسرائیلیوں سے یہ خطاب اس لئے کیا گیا۔ کہ وہ انکی اولاد میں تھے۔ اور باپ داداؤں کا فعل اولاد کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ ہم ہندؤں سے کہتے ہیں۔ کہ ہم نے تم پر آٹھ سو برس تک حکومت کی۔ **نَفْسًا** نفس، سانس، دل، جان اور ذات وغیرہ کو کہتے ہیں۔ یہاں جان یا ذات مراد ہے۔ اگرچہ قتل جسم پر واقعہ ہوتا ہے۔ مگر چونکہ اس کا تعلق جان سے بھی ہے۔ کہ وہ اس سے نکل جاتی ہے۔ اس لئے جان کو اس کا مفعول بنایا گیا۔ وہ مقتول عامیل ابن شراحیل تھا۔ **فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا** یہ اصل میں تدارأتم تھا۔ باب تفاعل سے۔ ت کو "د" کر کے اس میں ادغام کر دیا گیا۔ اور اوّل میں ہمزہ زیادہ کیگئی۔ اس کی اصل درء ہے جس کے معنی ہیں دفع کرنا یعنی تم میں سے ہر ایک نے یہ الزام اپنے پر سے دفع کیا اور کہا۔ کہ یہ کام میں نے نہیں کیا فلاں نے کیا ہے۔ فیھا کی ضمیر یا تو نفس کی طرف لوٹتی ہے۔ یا قتل کی طرف یعنی اس قتل یا اس نفس کے بارے میں تم نے ایک دوسرے کو الزام لگایا۔ ناحق قتل ایک گناہ تھا پیغمبر کی بارگاہ میں جھوٹ بولنا دوسرا گناہ دوسرے کو تہمت لگانا تیسرا گناہ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تم کو موسیٰ علیہ السلام کی وحی پر یقین نہ تھا۔ ورنہ اُن کے پاس آکر جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرتے۔ **وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ** مخرج کے لفظی معنی ہیں نکالنے والا۔ مگر یہاں مراد ہے۔ ظاہر کرنیوالا کیونکہ اس میں بھی پوشیدگی سے نکالنا ہوتا ہے۔ اگرچہ خود مقتول نے زندہ ہو کر قاتل کو ظاہر کیا۔ مگر چونکہ یہ سب کچھ حکم الٰہی سے ہوا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا اس سے تعلق نہ رکھا گیا۔ اور اس عمدہ طریقہ سے ظاہر ہوا۔ کہ کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہ رہی اس لئے یہ اظہار خدا کی طرف منسوب ہوا یعنی اگر کوئی بندہ بتا دیتا تو تم چون و چرا کر سکتے تھے یہاں تو اللہ ظاہر فرمانے والا تھا۔ **مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ**۔ تمہارے اس فعل کو جو تم سب ملکر چھپاتے تھے۔ تکتمون کتم سے بنا ہے جس کے معنی ہیں چھپانا چونکہ ایک جماعت نے سازش کر کے یہ واقعہ چھپایا تھا اس لئے چھپانا سب ہی کی طرف منسوب کیا گیا۔ یعنی تم سب

چھپانا چاہتے تھے۔ اور رب ظاہر فرمانا۔ مگر تمہارا چاہا نہ ہوا۔ رب کا چاہا ہوا۔ فَقُلْنَا یہ یا تو فَادّٰرَءْتُمْ پر معطوف ہے۔ یعنی تم نے تدافع کیا۔ تو ہم نے یہ فرمایا۔ یا مخرج کی تفسیر یعنی اللہ نے اسے ظاہر فرمایا۔ کہ کہا۔ اگرچہ بظاہر فرمانے والے موسیٰ علیہ السلام تھے۔ مگر چونکہ زبان موسیٰ علیہ السلام کی تھی۔ اور کلام رب کا موسیٰ علیہ السلام ناقل تھے۔ اس لئے اس قول کو رب کی طرف منسوب کیا گیا۔ ہم مرزا غالب کا کوئی شعر پڑھ کر کہتے ہیں۔ کہ یہ مرزا غالب نے کہا ہے اِضْرِبُوْهُ فاعل کی ضمیر ساری جماعت اور ضمیر مفعول نفس کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی تم سب اس نفس کو مارو نفس لفظاً مؤنث اور معناً مذکر ہے اس لئے ضمیر مذکر لائی گئی کیونکہ مقتول مرد تھا نیز نفس یعنی روح کو مارنا ناممکن ہے۔ بدن ہی کو مارا جا سکتا ہے۔ اور بدن مذکر ہے۔ یعنی اس مقتول کے جسم کو مارو۔ اور مس کر دو خود موسیٰ علیہ السلام نے یہ کام نہ کیا۔ بلکہ ان سے ہی کرایا۔ تاکہ کوئی آپ کو جادو کی تہمت نہ لگا دے بِبَعْضِهَا۔ ھا ضمیر بقرہ یعنی گائے کی طرف لوٹتی ہے بعض آدھے سے کم کو کہتے ہیں یعنی مقتول کے بدن سے گائے کا کچھ حصہ مس کر دو۔ یا تو اس سے مطلق بعض مراد ہے۔ کوئی سا حصہ بھی ہو۔ یا اس کی زبان یا دُم وغیرہ۔ چنانچہ ایسا کیا گیا۔ اس گوشت کے مس ہوتے ہی بحکم الٰہی مقتول زندہ ہو گیا۔ اس کے حلق سے خون کے فوارے جاری تھے اس نے اپنے چچا زاد بھائی کو بتایا کہ اس نے مجھے قتل کیا ہے۔ یہ کہہ کر پھر مر گیا بعض روایت میں آیا ہے۔ کہ پھر قاتل نے خود بھی اقرار کر لیا تب موسیٰ علیہ السلام نے اس پر قصاص کا حکم فرمایا۔ اور اسے میراث سے محروم کر دیا۔ كَذٰلِكَ۔ یہاں پوری ایک عبارت پوشیدہ ہے یعنی تم نے گائے ذبح کر کے اس کا گوشت مقتول کو مارا جس سے زندہ ہو کر قاتل کا پتہ دیا تو ہم نے فرمایا۔ کہ اس ہی طرح يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى۔ اللہ قیامت میں مردے زندہ فرمائے گا اگرچہ وہ لوگ قیامت کے قائل تھے مگر اب تک سن کر قائل تھے۔ اب دیکھ بھی لیا۔ کہ جس طرح انصاف کیلئے اس مردہ کو رب نے محض اپنی قدرت سے زندہ فرما دیا۔ اسی طرح عدل و انصاف و حساب کتاب کیلئے قیامت میں بھی سب کو زندہ فرمائے گا۔ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ آیات آیۃ کی جمع ہے جس کا معنیٰ ہے نشانی اور دلیل یعنی رب تعالیٰ تم کو اپنی قدرت کی نشانیاں اور دلائل دکھاتا۔ اور سمجھاتا ہے۔ چونکہ یہ ایک واقعہ حق تعالیٰ کے علم اُس کی قدرت۔ اس کی حقانیت اور موسیٰ علیہ السلام کی حقانیت اور قاتل کی گرفتاری اور بے قصور لوگوں کے چھٹکارے کو بتا رہا تھا۔ اس لئے اس کو آیات یعنی بہت سی نشانیاں فرمایا گیا۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ یہ عقل سے بنا ہے جس کے لغوی معنی ہیں روکنا اور اصطلاحی معنی ہیں سمجھنا یعنی یہ واقعہ دیکھ کر تم اپنے نفسوں کو برائیوں سے روکو اور رب کی اطاعت کرو یا تم قیاس کر کے سمجھ لو۔ کہ جو ایک مردے کو زندہ فرما سکتا ہے۔ وہ تمام کو بھی۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی وہ اتنا سمجھتے تھے۔ لیکن اب اُن کے فہم میں ترقی ہو گئی

**خلاصہ تفسیر** یہ اُس پہلے قصے کا ایک حصہ ہے جس میں خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ایک معجزہ یعنی مردے کو زندہ کرنا ظاہر فرمایا یعنی اے اسرائیلیو تم وہ واقعہ بھی یاد کرو جبکہ تم نے آپس میں ایک خون کر کے دوسروں کو تہمت لگا دی تھی۔ اور اللہ چاہتا تھا۔ کہ اس اصل واقعہ کو ظاہر فرما دے جس کو تم چھپا رہے تھے۔ لہٰذا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی معرفت تم کو حکم دیا۔ کہ تم ایک گائے ذبح کرو جب تم نے بہت حیل و حجت کے بعد ذبح کر لی۔ تو ہم نے حکم فرمایا۔ کہ اس گائے کی زبان یا دم یا کوئی اور عضو اس میت پر دھر دو یہ جی اُٹھے گا۔ تم نے ایسا کیا۔ اور اس نے زندہ ہو کر اپنا قاتل بتا دیا۔ اور وہ قاتل میراث سے بھی محروم کر دیا گیا۔ اور قصاصاً قتل بھی ہوا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر یا سُن کر سمجھ لو۔ کہ اسی طرح حق تعالیٰ آئندہ بھی مردے زندہ فرمائے گا۔ وہ رب تعالیٰ تم کو اپنی اس قسم کی نشانیاں اس لئے دکھاتا ہے۔ تاکہ تم اس کو قادر مطلق سمجھو۔ اور اس پر ایمان لاؤ یا ایمان پر قائم رہو۔

**فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے پہلا فائدہ حق تعالیٰ عالم و قادر ہے۔ کوئی چیز اس کے علم و قدرت سے باہر نہیں۔ اگر چاہے تو خلاف عقل چیزیں ظاہر فرما دے جیسے کہ اس واقعہ میں مردہ گائے کے گوشت سے مردہ زندہ فرما دیا دوسرا فائدہ عالم غیب سے فیض لینے کے لئے قربانی نیکیاں اور خیرات کرنی چاہیئے تاکہ اس کی برکت سے اپنا مقصود حاصل ہو (تفسیر عزیزی) اس لئے بلاؤں کے دفعہ کرنے اور نعمتوں کے حاصل کرنے کیلئے ختم قرآن نمازیں۔ روزے خیرات محفل میلاد شریف اور نعت کی مجلسیں وغیرہ کرنی چاہیئے جیسے کہ اسرائیلیوں سے اس مصیبت پر قربانی کرائی گئی تیسرا فائدہ یہ کہ جہاں شریعت نے قید نہ لگائی ہو وہاں اپنی طرف سے قید لگانا برا ہے۔ خود اپنے پر سختی کرنے سے دین کی طرف سے بھی سختی ہو جاتی ہے۔ (تفسیر عزیزی) لہٰذا جن چیزوں کو شریعت نے حرام نہ کیا ہو انہیں اپنی رائے سے حرام نہ کہو اور نہ کسی کام میں اپنی طرف سے

قید لگاؤ جیسے کہ محفل میلاد شریف وغیرہ **چوتھا فائدہ** یتیموں پر مہربانی کرو ان کے مال کو حفاظت اور نافع تجارت کر کے بڑھاؤ کیونکہ رب تعالیٰ بھی ان پر کرم فرماتا ہے۔ جیسے کہ اس گائے والے یتیم کا واقعہ ہوا۔ **پانچواں فائدہ** قاتل، مقتول کی میراث سے محروم ہوگا جیسے کہ اس واقعہ میں ہوا۔ **مسئلہ** لیکن اگر عادل نے باغی کو قتل کیا یا حملہ آور سے اپنی جان بچانے کیلئے اس کو دفعہ کیا۔ اس میں وہ قتل ہو گیا۔ تو قاتل مقتول کی میراث سے محروم نہ ہوگا **چھٹا فائدہ** جب کوئی بندہ کسی کام پر ہمیشگی کرتا ہے۔ تو خواہ وہ کتنا ہی چھپائے مگر خدا تعالیٰ اس کو ظاہر فرما دیتا ہے۔ ہاں اگر ایک دفعہ کسی سے کوئی قصور ہو جائے۔ اور وہ اس سے شرمندہ ہو کر چھپانے کی کوشش کرے۔ تو رب تعالیٰ بھی اسے اپنی رحمت سے چھپا دیتا ہے۔ اور اس کی پردہ دری نہیں کرتا۔ ان اسرائیلیوں نے اپنے فعل بد کے چھپانے کی کوشش کی مگر رب نے ظاہر فرما ہی دیا۔ تفسیر عزیزی نے اس جگہ روایت نقل فرمائی۔ کہ اگر کوئی شخص سنسان جنگل یا بند تہ خانہ میں بیٹھ کر کوئی کام کرے۔ تب بھی رب اس کام مخلوق پر ظاہر فرما دیتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے صحابہ کرام سے دریافت فرمایا کہ مومن کون ہے۔ انہوں نے عرض کیا۔ کہ خدا اور رسول بہتر جانتا ہے۔ فرمایا مومن وہ ہے۔ کہ حق تعالیٰ اس کے کان اس کی ثنا و صفت سے مرنے سے پہلے بھر دے (یعنی لوگوں میں اس کے تقویٰ کی خود بخود شہرت ہو جائے) اگر کوئی بندہ ستر دروازوں کو قفل لگا کر نیک یا بد کام کرتے تو بھی اس کا عمل لوگوں میں مشہور ہو جاتا ہے۔ بلکہ تجربہ تو یہ ہے۔ کہ متقی کے چہرے کی نورانیت اور بدکار کے چہرے کی بے رونقی اس کے خفیہ اعمال اور دلی حالت کا پتہ دے دیتے ہیں۔ بارہا کا مشاہدہ ہے۔ کہ قاتل اور چور بدحواسی اور چہرے کے رنگ اڑ جانے سے پکڑے گئے۔ سبحان اللہ کیا لطف ہے۔ کہ ہم کو نیکیاں چھپانے کا حکم ہے۔ اور رب خود ظاہر فرما دیتا ہے۔ **ساتواں فائدہ** قیاس حق ہے۔ اس لئے کہ ایک مردہ زندہ کر کے دکھا کر باقی کو اس پر قیاس کرنے کا حکم فرمایا گیا۔ **پہلا اعتراض** مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ میں مُخْرِجٌ اسم فاعل بمعنی ماضی ہے۔ تو چاہیئے کہ عمل نہ کرے۔ حالانکہ یہاں یہ عمل کر رہا ہے (نحوی) **جواب** یہ اسم فاعل اس وقت تو بمعنی ماضی ہے۔ لیکن اس موقعہ پر بمعنی مستقبل تھا۔ لہٰذا اس کا عمل درست ہوا۔ یہاں اس واقعہ کی نقل ہے۔ **دوسرا اعتراض** اس واقعہ میں صرف مقتول کے زندہ ہو کر بتا دینے سے قاتل سے قصاص لے لیا۔ قاتل کے اقرار کی کوئی صحیح روایت نہیں ملتی۔ حالانکہ مقدمہ میں ملزم کا اقرار۔ یا دو گواہیاں ضروری ہیں **جواب** بعض مفسرین نے فرمایا۔ کہ اس واقعہ کے بعد قاتل نے اقرار بھی کر لیا تھا۔ اگر ایسا ہو پھر تو کوئی اعتراض نہیں۔ اور اگر یہ نہ ہوا۔ تو بھی صرف مقتول کا قول ہی صدہا گواہیوں سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ مرنے سے پہلے انسان جھوٹ بول سکتا ہے۔ اسی لئے اسکو گواہیوں کی ضرورت ہے۔ مگر مرنے کے بعد نہیں۔ کیونکہ وہ نزع برزخ اور آخرت دیکھ کر آیا ہے۔ اس لئے اب جھوٹ نہیں بول سکتا ہے۔ اب اسکی تصدیق کیلئے گواہیوں کی ضرورت بھی نہیں **تیسرا اعتراض** یہ جواب غلط ہے قرآن کریم فرماتا ہے۔ کہ کفار قیامت میں عرض کرینگے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ قسم رب کی ہم مشرک نہیں تھے۔ دیکھو یہ برزخ وغیرہ سب کچھ دیکھ کر جھوٹ بول رہے ہیں۔ نیز دوسری جگہ فرماتا ہے۔ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ جس سے معلوم ہوا کہ کفار اپنی بدکرداریوں کا انکار کریں گے۔ تب ان کے منہ پر مہر لگا کر ان کے ہاتھ پیروں سے گواہی لی جائے گی اس لئے علم کلام والے فرماتے ہیں۔ کہ اگر کسی پیغمبر کی گواہی پتھر یا جانور دیں تو معتبر لیکن اگر مردہ زندہ ہو کر دے تو معتبر نہیں۔ کیونکہ جب مردہ زندہ ہوا اس کو عقل و شعور و خیال و وہم سب دوبارہ حاصل ہو گئے۔ اور یہی خطا اور غلطی کا محل ہیں۔ نیز دجال مردے زندہ کر کے ان سے اپنی ربوبیت کی گواہی دلوائے گا جیسا کہ روایت میں آیا ہے۔ اگرچہ وہ جنات ہوں گے جو شکل انسانی میں آ کر اس کی گواہی دیں گے۔ مگر احتمال تو پیدا ہو گیا۔ غرض کہ زندہ مقتول کی گواہی مقبول نہ ہونی چاہیئے ممکن ہے۔ کہ وہ اب بھی جھوٹ بول رہا ہو۔ یا کوئی جن اس کے قالب میں داخل ہو کر غلط خبر دے گیا ہو۔ **جواب** اس کا قوی جواب یہ ہے۔ کہ یہاں حق تعالیٰ نے گائے ذبح کر کے مردہ کو زندہ کرایا۔ اور پہلے سے خبر دیدی تھی۔ کہ یہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا پتہ بتائیگا۔ لہٰذا قاتل کی گواہی مقتول نے دی اور مقتول کے سچے ہونے کی گواہی رب نے دی اب رب کی گواہی سے مقتول کا کلام قابل قبول ہوا جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو لوگوں نے تہمت لگائی رب نے ان کی پاک دامنی بیان فرمائی صرف رب کے فرمان پر تہمت لگانے والوں کو سزا دی گئی (ماخوذ از تفسیر عزیزی) **چوتھا اعتراض** اس جگہ گائے کو درمیان میں

آر کیوں بنایا گیا۔ بلاواسطہ ہی کیوں زندہ نہ فرما دیا گیا **جواب** اس میں بہت سی حکمتیں ہیں۔ جو ہم پچھلی آیتوں میں تفصیل وار بیان کر چکے۔

**تفسیر صوفیانہ** جو شخص کہ اپنے دل کی زندگی چاہتا ہے۔ اس کو چاہیئے کہ اپنے نفس کی گائے ذبح کر ڈالے جو نفس کو ریاضات سے مارے گا اللہ اس کے قلب کو انوار مشاہدات سے زندہ فرماویگا جو نفس کو شریعت کے ذریعہ سے مردہ کریگا۔ اللہ اس کے دل کو حقیقت و معرفت سے زندہ فرمائیگا۔ جس طرح کہ اس مقتول نے مردہ گائے سے زندہ ہو کر اپنے قاتل کا پتہ دیا۔ اس طرح جو اپنے نفس کو صدق کی چھری سے ذبح کرے۔ اور مذبوحہ نفس کی زبان اس قلب پر لگائے جو خدا کے ذکر میں مقتول ہو چکا ہے۔ تو اللہ اس کے قلب کو اپنے نور سے زندہ فرمائے گا۔ اور پھر کسی کا قلب پکارے گا۔ وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ اور کوئی زندہ ہو کر منصور کی طرح انا الحق اور کوئی سُبحانی ما اعظم شانی کے نعرے لگائے گا کیونکہ زندہ دل رب کے مظہر و منظر ہیں۔ حدیث میں آیا کہ اللہ فقط تمہاری صورتیں نہیں دیکھتا۔ بلکہ تمہارے قلبوں اور نیتوں کو بھی دیکھتا ہے۔ یہ قلب مظہر الٰہی ہیں۔ اسی لیئے ان کا کلام اللہ کا کلام اور اُن سے تقرب اللہ سے تقرب ہے مولانا فرماتے ہیں۔

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا ۔۔۔ او نشیند در حضورِ اولیاء

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ۔۔۔ گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

چوں روا باشد انا اللہ از درخت ۔۔۔ کے روانہ بود کہ گوید نیک بخت

سری سقطی فرماتے ہیں۔ کہ میرا نفس تیس چالیس سال سے گھی کی روٹی اور بادام مانگ رہا ہے۔ مگر میں نے اس کو نہ دیا۔ ایک شخص ہوا میں اُڑتا چلتا تھا۔ اس سے پوچھا گیا۔ کہ تو نے یہ درجہ کیسے پایا۔ اس نے جواب دیا۔ تَرَکْتُ الْھَوٰی فَسُخِّرَ لِی الْھَوَاءُ یعنی میں نے ہوا یعنی خواہش نفس چھوڑ دی تو یہ ہوا میرے تابع ہو گئی۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۚ وَاِنَّ

پھر سخت ہو گئے دل تمہارے پیچھے سے اس کے پس وہ مثل پتھروں کے ہیں۔ بلکہ زیادہ سخت اور تحقیق

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ تو وہ پتھروں کی مثل ہیں۔ بلکہ اُن سے بھی زیادہ کڑے اور

مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ۚ

پتھروں میں سے البتہ وہ ہیں کہ بہتی ہیں اُن میں سے نہریں اور تحقیق اُن میں سے البتہ وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں پس نکلتا ہے اس سے پانی

اور پتھروں میں تو کچھ وہ ہیں۔ کہ جن سے ندیاں بہ نکلتی ہیں۔ اور کچھ وہ ہیں۔ جو پھٹ جاتے ہیں۔ اور اُن سے پانی نکلتا ہے

وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

اور تحقیق اُن میں سے البتہ وہ ہیں جو گر جاتے ہیں خوف سے اللہ کے اور نہیں ہے اللہ بے خبر اُس سے جو کرتے ہو تم

اور کچھ وہ ہیں جو اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں

**تعلق** اس آیت کا تعلق پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے پہلا تعلق گذشتہ واقعات سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پہلے کبھی گناہ کرتے تھے کبھی توبہ کبھی عہد کرتے تھے کبھی عہد شکنی کبھی پیغمبر کی اطاعت کرتے تھے کبھی اُن کی مخالفت جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان کے دلوں میں قدرے نرمی اور نصیحت قبول کرنیکی کچھ قابلیت تھی۔ اب بتایا جا رہا ہے۔ کہ ان واقعات کے بعد اُن کے دلوں کی رہی سہی نرمی بھی جاتی رہی وہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ **دوسرا تعلق** اس سے پہلے اسرائیلیوں پر پے در پے مصیبتوں اور بلاؤں کے آنیکا ذکر تھا جس سے خیال تھا۔

کہ شاید اِن کے دِل بہت نرم ہوگئے ہوں گے کیونکہ مصیبتیں دِلوں کو نرم کر دیتی ہیں. اب اس خیال کو دفع کیا جا رہا ہے کہ نہیں اُن کے دِل تو اِن واقعات سے اور بھی زیادہ سخت ہوگئے. **تفسیر ثُمَّ قَسَتْ** اس جگہ ثُمَّ تراخی رتبہ کیلئے ہے. یعنی اس قدر واقعات کے بعد پھر بھی تمہارے دل سخت ہوگئے قَسَتْ قسوۃٌ اور قساوۃٌ سے بنا ہے. جسکے معنی ہیں درشتی اور سختی اور دل کی سختی یہ ہے. کہ اس میں وعظ نصیحت اثر نہ کرے. اُس کو مصیبت اور تکلیفوں کی پرواہ نہ ہو حق تعالیٰ کی نشانیاں دیکھ کر بھی اس کی اطاعت نہ کرے قُلُوْبُکُمْ یا تو حضور کے زمانہ کے اسرائیلیوں سے خطاب ہے یعنی اتنے واقعات سُن کر تمہارے دل اور سخت ہوگئے. کہ تم نبی آخر الزمان پر ایمان نہیں لاتے یا گذشتہ لوگوں سے یعنی اِن واقعات کو دیکھ کر تمہاری قوم کے دِل اور بھی سخت ہوگئے. مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ. ذٰلِکَ سے یا تو صرف گائے کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے یا سارے واقعات کی طرف یعنی اُس گائے کے واقعہ یا گئے اور طور کے اٹھانے اور بندر اور سور بنانے کے واقعات کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہو گئے. حالانکہ اِن واقعات سے پتھر بھی نرم پڑجاتا. تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا. کہ مقتول کے زندہ ہوکر گواہی دینے کے بعد بھی قاتل اور اس کی قوم نے جُرم کا انکار کیا. اور کہا کہ یہ مقتول جھوٹا ہے. اور بڑا فتنہ پھیلانا چاہا. **فَهِیَ کَالْحِجَارَةِ** یعنی یہ دل سختی میں پتھر کی مثل ہے. نہ لوہے اور فولاد کی طرح کیونکہ لوہا فولاد آگ اور معجزات سے پگل جاتا ہے. جیسے کہ داؤد علیہ السلام کیلئے ہُوا اور اُس سے کار آمد چیزیں بنائی جاتی ہیں. لیکن پتھر نہ آگ سے پگلے اور نہ پگل کر کار آمد چیز بنے اسی طرح تمہارے دل خوف اور ہیبت کی آگ سے بھی نرم نہیں ہوتے. اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً او یا بمعنی واؤ ہے جیسے اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ یا بمعنی بل یا اباحت کیلئے ہے. یا اختیار کے لئے یا تردید کیلئے (تفسیر کبیر) یعنی یا اور یا بلکہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے. یا اے سننے والے تجھے اختیار ہے. کہ اُن کے دِلوں کو پتھر کہے یا اس سے بھی زیادہ سخت. اگرچہ قسوۃ کی تفضیل اقسیٰ بھی سکتی تھی. لیکن اَشَدُّ قَسْوَةً کہنے میں زیادہ سختی بیان ہوئی. کیونکہ اس نے صورت اور مادہ دونوں کے ساتھ زیادتی بتائی. نیز اقسیٰ کہنے میں یہ نہ معلوم ہوتا. کہ کیفیت میں زیادہ سخت ہیں یا مقدار میں اَشَدُّ قَسْوَةً کہنے سے زیادتی کیفیت معلوم ہوگئی. کیونکہ اسم تفضیل کی زیادتی مبہم ہوتی ہے اور اَشَدُّ یا اقویٰ میں زیادتی کیفیت اور اکثر و ازید میں زیادتی مقدار معلوم ہوتی ہے. **وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ** یہ گویا ان کے دِلوں کے پتھر سے زیادہ سخت ہونے کا بیان ہے. یعنی پتھر بھی بعض وقت خوف الٰہی سے متاثر ہوجاتے ہیں. مگر تمہارے دِل کبھی اثر نہیں لیتے. اس لئے کہ بعض پتھر ایسے ہیں. کہ **لَمَا یَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ** کہ ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں یَتَفَجَّرُ فَجْرٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں خوب کھل جانا اور ظاہر ہوجانا اسی لئے صبح صادق کو فجر اور علانیہ گناہ کرنے کو فجور کہتے ہیں. کیونکہ یہ بھی خوب ظاہر ہوتے ہیں. اَنْهَار. نہر کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ہیں کھودنا. اصطلاح میں اس وسیع غار کو نہر کہتے جس میں پانی بہتا ہو یعنی بعض پتھر وہ ہیں جو خوب پھٹ جاتے ہیں اور ان کے شگافوں میں سے بہت پانی نکلتا ہے جس سے نہریں اور دریا جاری ہوجاتے ہیں. اور اُن سے لوگ نفع حاصل کرتے ہیں خیال رہے کہ یا تو اس پتھر سے موسیٰ علیہ السلام کا وہ پتھر مراد ہے جس میں سے عصیٰ کی برکت سے بارہ چشمے جاری ہوئے تھے یعنی عصاء موسوی سے پتھر سے پانی کے چشمے جاری ہوگئے. مگر تمہارے دلوں سے ایمان و حکمت کے چشمے جاری نہ ہوئے اور یا وہ عام پہاڑی پتھر مراد ہیں جن سے گنگا جمنا وغیرہ دریا اور نہریں جاری ہیں. فلاسفہ کہتے ہیں. کہ پہاڑ کے اجزاء دھواں بنکر پانی بنجاتے ہیں. اور اردگرد کی ہوا کو اپنی طرف کھینچ کر پانی بنا دیتے ہیں جس سے دریا اور نہریں جاری ہوجاتی ہیں. اور کبھی زمین کے اندر بخارات جمع ہوکر ٹھنڈک پاکر پانی بنتے ہیں. اور زور پاکر پہاڑ کو جگہ جگہ سے پھاڑ کر نکل جاتے ہیں جس سے کہ بڑے جھیل و تالاب یا نہریں بن جاتے ہیں (تفسیر کبیر وعزیزی) **وَاِنَّ مِنْهَا** بعض پتھر تو وہ تھے جن سے نہریں اور دریا جاری ہوئے. اور بعض وہ ہیں کہ **لَمَا یَشَّقَّقُ** کر پانی کے زور سے پھٹ جاتے ہیں. **فَیَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ**. اور ان میں سے رِس رِس کر تھوڑا تھوڑا پانی نکلتا ہے جس سے کہ نہریں تو جاری نہیں ہوتیں ہاں پانی کے چشمے بن جاتے ہیں. یعنی بعض پتھروں سے دریا اور نہریں نکلتی ہیں. اور بعض سے چشمے اِن دونوں صورتوں میں فرق یہ ہُوا کہ پہلی صورت میں پتھر میں جگہ جگہ چوڑے چوڑے شگاف پیدا ہوتے ہیں اور ان سے بہت پانی نکلتا ہے. اور دوسری صورت میں کسی قدر لمبے مگر کم چوڑے شگاف

پیدا ہوتے ہیں جس سے پانی ٹپک ٹپک کر نکلتا ہے۔ یَشَّقَّقُ۔ باب تفعل سے ہے۔ اصل میں یَتَشَقَّقُ تھا۔ ت کو ش کرکے اس میں ادغام کر دیا گیا۔ یہ شقٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ پھٹ جانا اور چر جانا اسی لئے مخالفت کو شقاق کہتے ہیں۔ کہ اس سے ایک جماعت پھٹ کر دو جماعتیں بن جاتی ہیں۔ وَاِنَّ مِنۡهَا بعض پتھر تو وہ تھے جن سے مخلوق نے کم وبیش فائدہ حاصل کیا۔ لیکن بعض وہ پتھر بھی ہیں۔ کہ مخلوق کو پانی سے نفع تو نہیں پہنچاتے مگر خود لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ خدا کے خوف کی وجہ سے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گر جاتے ہیں یعنی رب کا حکم پاتے ہی اس کی اطاعت کرتے ہیں اور حرکت میں آجاتے ہیں۔ مگر ان منکرین کے دل نہ تو نرم پڑتے ہیں۔ اور نہ رب کی اطاعت کرتے ہیں۔ باوجودیکہ پتھر بظاہر بے حس اور بے شعور ہیں یہ کفار حس وشعور و عقل و فہم سب کچھ رکھتے ہیں۔ لیکن ان کو غلط استعمال کرکے رب کی مخالفت کرتے ہیں۔ مگر خیال رہے وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ۔ اللہ تمہارے ظاہری اور باطنی اعمال سے بے خبر نہیں اس کے علم سے تم دھوکہ نہ کھاؤ۔ عذاب میں دیر تمہارے لئے خطرناک ہے **خلاصہ تفسیر** حق تعالیٰ موجودہ یا گذشتہ بنی اسرائیل کو فرمارہا ہے۔ کہ ان واقعات اور عجائبات قدرت دیکھنے کے بعد تمہارے دل اور بھی سخت ہو گئے۔ اور گناہ کرتے کرتے ان میں پتھروں کی سی سختی آگئی۔ کہ جن میں نہ آگ اثر کرے اور نہ مینخ وغیرہ گڑھے اسی طرح تمہارے دلوں میں نہ تو خوف الٰہی نرمی پیدا کرتا ہے۔ اور نہ انبیاء کرام کی نصیحت و وعظ اثر کرتی ہے۔ بلکہ تمہارے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ کیونکہ ان سے تو کچھ فائدہ بھی ہے۔ کہ وہ بخارات وغیرہ کا اثر قبول کرتے ہیں۔ کہ بعض سے تو پانی کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ جن سے ایک مخلوق فیض پاتی ہے۔ اور بعض سے پانی رس کر اور جھر کر نکلتا ہے جس سے چشمے اور تالاب بن جاتے ہیں۔ اور ان سے بھی لوگ کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اور بعض پتھر پہاڑ کی چوٹی سے زمین پر گر جاتے ہیں گویا۔ کہ ہیبت الٰہی سے کانپ کر اس کو سجدہ کرتے ہیں۔ مگر تمہارے دلوں کی سختی کا یہ حال ہے۔ کہ تم نبی آخر الزمان کے وعظ پر قہقہہ اڑاتے ہو۔ اس میں نبی کے فیض کا قصور نہیں بلکہ تمہارے دلوں کا فتور ہے۔ سبحان اللہ پتھروں کے بیان میں کیسی نفیس ترتیب ہے۔ کہ سب سے پہلے اعلیٰ فیض رساں پتھروں کا ذکر ہوا۔ پھر اس سے کم کا اور پھر اس پتھر کا جو بافیض تو نہیں۔ مگر خود ہیبت سے کانپتا ہے۔ **دوسری تفسیر** یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ان تینوں قسم کے پتھروں سے کفار کے دل مراد ہوں۔ کیونکہ جس طرح مسلمان کے دلوں کی صفائی مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح قلوب کفار کی سختی بھی یعنی اے علماء یہود تمہارے دل عام کفار کے دلوں کی طرح یا ان سے بھی زیادہ سخت ہیں چنانچہ تفسیر عزیزی نے اسجگہ فرمایا کہ کفار کے دل چند طرح ہیں بعض وہ ہیں۔ کہ جو مدت تک نفسانی خواہشیں اور نیک لذتیں چھوڑ دیتے ہیں جس سے کہ ان پر کسی قدر روحانیت غالب آجاتی ہے۔ اور ان سے کچھ عجیب باتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں جس کو استدراج کہا جاتا ہے جیسا کہ اکثر تارک الدنیا پنڈتوں اور پادریوں میں دیکھا گیا ہے۔ اور بعض وہ کفار ہیں۔ کہ جن کے دلوں پر علوم غیبیہ کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اور ان کے دل بشریت کے پردہ کو پھاڑ کر عالم ارواح۔ عالم ملکوت میں گھر جاتے ہیں جس سے کہ وہ اس عالم کی چیزیں معلوم کر لیتے ہیں جنہیں حکماء اشراقین کہا جاتا ہے۔ اور بعض کفار وہ ہیں۔ کہ جن کے دلوں میں پورا خدا کا خوف ہے۔ اور دوسری ارواح سے فیض لے لیتے ہیں۔ اس لئے ہر مذہب کے فاسق ان صفات سے محروم رہتے ہیں۔ اور ہر مذہب کے عابد ان صفات کو پا لیتے ہیں۔ غرضکہ کشف اور عجیب باتوں کا ظہور مسلمانوں کے لئے ہی خاص نہیں۔ بارہا کفار کو بھی حاصل ہو جاتا ہے البتہ مسلمانوں اور ان کفار میں فرق یہ ہے کہ مسلمان اس مرتبہ پر پہنچ کر مقبول بارگاہ ہو جاتا ہے۔ اور ترقی کرتا ہے۔ اور کافر کو یہ مقبولیت اور رضا حاصل نہیں ہوتی کسی نے کیا خوب کہا شعر

صفا با خبث باطن نیز گاہے جمع می گردد　　برو با لوعہ را چو در دبشینہ تماشا کن　　(تفسیر عزیزی و روح البیان)

لہذا پہلے قسم کے کافر نہروں والے پتھر کی طرح ہیں۔ دوسری قسم کے کفار چشمہ والے پتھر کی مانند تیسری قسم کے ہیبت سے گرنے والے پتھر کی مثل اے علماء یہود تم ان کفار سے بھی گئے گزرے ہوئے۔ اس تفسیر میں مشبہ اور مشبہ بہ ایک ہی جنس کے ہوں گے یعنی دلوں کو دلوں

سے تشبیہ ہو گئی۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** پتھروں میں احساس اور شعور ہے۔ اگرچہ ہم کو محسوس نہ ہو۔ اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا۔ کہ ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔ مگر تم نہیں سمجھتے۔ بلکہ ایک جگہ ارشاد ہوا کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر جانور وغیرہ اپنی نماز بھی ادا کرتے ہیں۔ بلکہ بعض اللہ والے ان کا کلام سُن بھی لیتے ہیں حضور علیہ السلام کے فراق میں لکڑی روئی جس کو صحابہ کرام نے بھی سنا۔ ابوجہل کے ہاتھ میں کنکروں نے کلمہ پڑھا جو کہ اس نے بھی سنا بکری کے زہر آلودہ گوشت نے حضور کو زہر کی خبر دی حضور کے بلانے پر دو درخت چلے آئے حضور علیہ السلام کو پتھروں نے سلام کیا ثبیر پہاڑ نے ایک دفعہ حضور سے عرض کیا۔ کہ یا حبیب اللہ آپ کو کفار ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اس لئے آپ میری پشت سے نیچے اتر آئیں۔ تاکہ آپ کو پکڑ نہ سکیں مسلم و بخاری میں ہے۔ کہ حضور نے اُحد کے بارے میں فرمایا۔ کہ یہ پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ بلکہ قرآن کریم فرما رہا ہے۔ کہ قیامت کے دن کفار کی کھالیں اور ہاتھ پاؤں بولیں گے حضرت شیخ اکبر فرماتے ہیں۔ کہ میں جاری پانی سے یا دائم کا ذکر سنتا ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

نطق آب و نطق خاک و نطق گل ہست محسوس حواس اہل دل

فلسفی گو منکر حنّانہ است از حواس اولیاء بیگانہ است

**دوسرا فائدہ**۔ انسانوں کی طرح پتھر اور جانور بھی مختلف درجے رکھتے ہیں۔ اگرچہ ہر مخلوق تسبیح پڑھتی ہے۔ مگر سبزہ کی تسبیح سے عذاب قبر میں کمی ہوتی ہے۔ نہ کہ پتھر کی تسبیح سے جیسے کہ مسلمان کا قرآن پڑھنا باعث ثواب ہے۔ نہ کہ کافر کا **تیسرا فائدہ** مسلمانوں کی طرح کفار کے بھی مختلف درجے ہیں۔ اس لئے جہنم کے درجے مختلف ہیں ابولہب اُمیّہ ابن خلف اور ابوطالب ایک درجہ کے کافر نہیں **چوتھا فائدہ** جو شخص اللہ کی اطاعت نہ کرے۔ وہ جانور تو کیا پتھر سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ شعر

آدمی ہست از برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی

**پانچواں فائدہ** انسانی دل اگر درست رہے تو فرشتوں سے افضل ہے۔ اور اگر بگڑ جائے۔ تو پتھروں سے بدتر اسی واسطے کہتے ہیں۔ کہ زبان اگر درست رہے تو زبان ہے اگر زیادہ چلے تو زیاں یعنی نقصان اور اگر ٹیڑھی جائے تو زبون یعنی فساد **پہلا اعتراض** اس تفسیر سے معلوم ہوا کہ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً میں اَو اختیار کیلئے بھی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اختیار انشاءات میں ہوتا ہے۔ نہ کہ خبر میں اور اس آیت میں خبر ہے **جواب** ہر خبر کے ضمن میں انشاء اور ہر انشاء کے ضمن میں خبر بھی ہوتی ہے بعض جگہ اس ضمنی چیز کا لحاظ کر لیا جاتا ہے (تفسیر عزیزی) یہ قاعدہ خوب خیال میں رکھو بہت فائدہ مند ہے۔ بعض جگہ خبریں منسوخ ہو جاتی ہیں۔ اس ضمنی انشاء کی وجہ سے جیسے وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ وغیرہ **دوسرا اعتراض** کفار کی سنگدلی بیان کرنے کیلئے صرف پتھر کا ذکر کافی تھا۔ اس قدر پتھر کیوں بیان کئے گئے۔ **جواب** اس لئے کہ اللہ والوں کے دل چار درجوں کے ہیں۔ ایک وہ دل جو بحر توحید میں ڈوبا ہو اور اس سے معرفت کی نہریں جاری ہوں جیسے کہ صوفیاء کرام کے دل۔ دوسرا وہ جو علم ظاہری کے سمندر سے سیراب ہو۔ اور خلقت اس سے نفع اٹھائے جیسے کہ علماء کاملین کا دل تیسرے وہ دل جو کہ رب کی فرمانبرداری میں مشغول رہے اور اس کے خوف سے بھرپور ہو۔ جیسے اہل اور عابدوں کا دل اور کفار کے دل سرکشی اور غرور کی وجہ سے بے خوف ہیں نہ فیض علمی قبول کریں نہ کوئی اور اثر **تفسیر صوفیانہ** ہر دل میں فطری طور سے خوف الٰہی اور شفقت خلق کے پانی موجود ہیں۔ گناہ اور بے دینوں کی صحبت اسکو خشک کرنیوالی دھوپ ہے۔ جب انسان گناہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ تو رفتہ رفتہ یہ دونوں پانی خشک ہو جاتے ہیں جس سے کہ اس کا دل خشک کنکر یا پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ سختی قلب کی تین علامتیں ہیں۔ آنکھ کا خشک ہونا یعنی آنسو نہ نکلنا۔ دنیوی امیدوں کی زیادتی اور حرص۔ زیادہ بولنا اور زیادہ ہنسنا قلب کو سخت کر دیتا ہے۔ خوف الٰہی میں آنسو اور زیادہ ذکر اللہ دل کو نرم کرنیوالی چیزیں ہیں صوفیاء کرام فرماتے ہیں۔ کہ اگر رحمت الٰہی امداد نہ کرے تو آیتیں اور نشانیاں دل کی سختی بڑھاتی ہیں۔ جیسے کہ ان یہود نے انبیاء کے معجزے دیکھے۔ مگر ان میں زیادہ سختی پیدا ہوئی ہدایت فضل رحمان سے ملتی ہے۔ نہ کہ دلائل و برہان سے سخت قلب میں قرآن

اور وعظ اُلٹا اثر کرتا ہے۔ جیسے کہ بیمار کو مقوی دوائیں زیادہ بیمار کرتی ہیں۔

أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ

کیا تو طمع رکھتے ہو تم اس کی کہ ایمان لائیں وہ واسطے تمہارے حالانکہ تحقیق تھا ایک گروہ اُن میں سے سنتے تھے وہ کلام اللہ کا

تو اے مسلمانو کیا تمہیں یہ طمع ہے۔ کہ یہ یہودی تمہارا یقین لائیں گے۔ اور ان میں کا ایک گروہ وہ تھا۔ کہ اللہ کا کلام۔

ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۷۵﴾

پھر بدل دیتے تھے اُس کو پیچھے سے اسکے کہ سمجھتے تھے وہ اُسکو حالانکہ وہ جانتے تھے

سنتے پھر سمجھنے کے بعد اُسے دانستہ بدل دیتے۔

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** اس سے پہلے گذشتہ یہودیوں کی سرکشی اور نافرمانی کا ذکر کیا گیا تھا۔ اب موجودہ یہودیوں کی حالت کا ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق** اس سے پہلے اسرائیلیوں سے خطاب تھا۔ اور اُن کو اسلام لانے کی رغبت دی گئی تھی۔ اب مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا۔ کہ یہ لوگ ایمان نہ لائینگے فقط حجت ختم کرنے کے لئے اُن کو دلائل سنا دیئے گئے **تیسرا تعلق** اس سے پہلے بتایا گیا۔ کہ اسرائیلیوں نے پیغمبروں کے اعلیٰ معجزات دیکھ کر بھی سرکشی کی اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اے مسلمانو ایسی قوم کیا صرف تمہارے دلائل سن کر ایمان لے آئیں گے۔ تم ان کی مخالفت پر رنج وغم نہ کرو۔ کیونکہ یہ ان حرکتوں کے عادی ہیں **تفسیر** **أَفَتَطْمَعُونَ** یہ استفہام تعجب کا ہے۔ اور خطاب صحابہ کرام سے ہے۔ اور ہو سکتا ہے۔ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہو اس لئے کہ حضور تبلیغ میں بہت کوشش فرماتے تھے۔ اور یہود کے انکار سے آپ کو رنج وغم ہوتا تھا۔ رب تعالیٰ نے ان کی گذشتہ سرکشیاں سنا کر اپنے محبوب علیہ السلام اور مسلمانوں کو تسکین دی۔ کہ کیا تم اب بھی ان کی سرکشی پر رنج و افسوس کرو گے۔ خیال رہے۔ کہ دنیوی طمع بُری ہے۔ لیکن دینی طمع مبارک اور محمود اس جگہ طمع سے نہیں روکا گیا۔ بلکہ رنج وغم سے جو کہ طمع کا سبب تھا۔ **أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ** اس سے وہ یہود مراد ہیں جن کا کافر رہنا اور ایمان قبول نہ کرنا اللہ کے علم میں آچکا تھا۔ کیونکہ بہت سے یہودی ایمان لے بھی آئے تھے ایمان کے لغوی معنی یقین کرنا ہے۔ اور اصطلاحی معنی ہیں دینی باتوں کی تصدیق کرنا اس جگہ اگر لغوی معنی مراد ہوں تو لکم صلہ ہوگا یعنی جب ان لوگوں نے انبیاء کرام کے اعلیٰ معجزات دیکھ کر یقین نہ کیا تو کیا تمہارا یقین لینگے اور اگر اصطلاحی معنی مراد ہوں تو یہ لام تعلیلیہ ہے یعنی کیا تم کو طمع ہے کہ تمہاری تبلیغ تمہارے دلائل کی وجہ سے یہ ایمان لے آئینگے **وَقَدْ كَانَ** واؤ حالیہ ہے یا عاطفہ کان یا بمعنی تھا ہے یا بمعنی ہے۔ یعنی ان میں ایک گروہ ایسا تھا۔ یا ایسا ہے۔ **فَرِيقٌ مِنْهُمْ**۔ فریق رہط اور جماعت کے معنی میں ہے۔ یہ فرق سے بنا ہے جس کے معنی ہیں جدا ہونا۔ فریق علیحدہ اور جدا جماعت ہے یا تو خود انکی یا اُن کے بزرگوں کی یا تو اس جماعت سے وہ ستر آدمی مراد ہیں۔ جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے۔ اور رب کا کلام سن کر آئے۔ اور اُن میں سے بعض نے قوم سے کہہ دیا۔ کہ رب نے ان تمام احکام کے کرنے اور نہ کرنے کا تم کو اختیار دیا ہے۔ اور یا دوسرے علماء یہود مراد ہیں جنہوں نے توریت میں سے رجم وغیرہ کی آیتیں کاٹ ڈالیں یا حضور کے زمانہ کے وہ علماء یہود مراد ہیں جنہوں نے توریت میں نبی آخر الزمان کے صفات بدل ڈالے **يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ** اس سے یا تو طور پر کلام الٰہی بلاواسطہ سننا مراد ہے۔ اور یا توریت کے احکام موسیٰ علیہ السلام سے بلاواسطہ یا بالواسطہ سننا **ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ** یہ تحریف سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ہٹا دینا اور مائل کر دینا۔ اس کا مادہ حرف ہے جس کے معنی ہیں علیحدہ ہونا۔ کنارے اور رشک اور حرف کو بھی اسی لئے حرف کہتے ہیں۔ کہ وہ اصل سے علیحدہ ہوتا ہے۔ اسی سے انحراف اور تحرف بنا تحریف کی چند صورتیں ہیں لفظ کا بدل ڈالنا معنی بدل دینا عبارت کا وہ مطلب بنانا جو اجماع امت کے خلاف ہو کلام الٰہی کی تحریف کفر ہے۔ جو شخص کہ عبارت قرآن دیدہ و دانستہ بدلے وہ کافر ہے۔ یہود توریت شریف میں ہر قسم کی تحریف کرتے تھے۔ نبی آخر الزمان کے صفات میں لفظ ابیض تھا۔ اسے کاٹ کر آدم بنا دیا ربعۃ تھا۔ اسکی جگہ طوال لکھ دیا۔ اور حضور کے فضائل اور معجزات بدل ڈالے احکام کی آیتیں

مثلاً اپنے خاطر خواہ عبارتیں بنا کر لکھ دیں مثلاً توریت میں تھا کہ زانی کو سنگسار کرو۔ اس جگہ لکھ دیا کہ اس کا منہ کالا کر کے اسکو گدھے پر سوار کرو۔ چونکہ قرآن کریم کی رب تعالیٰ نے حفاظت فرمائی ہے۔ اس لئے بحمدہٖ تعالیٰ اس میں کسی قسم کی تحریف نہ ہو سکی۔ اگرچہ قادیانی اور دیوبندیوں وغیرہ نے تحریف معنوی کی کوشش کی لیکن علماءِ ربانی نے اُن سب کو مٹا دیا۔ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ یعنی شبہ کی وجہ سے تحریف نہ کی۔ اور یہ نہ ہوا کہ لفظ یا معنی کے سننے یا سمجھنے میں ان سے غلطی ہو گئی ہو۔ بلکہ الفاظ خوب سن لئے اس کے معنی خوب سمجھ لئے اور پھر اس کو بدل ڈالا وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ۔ اور وہ تحریف کرتے وقت جانتے بھی تھے۔ کہ یہ لفظ توریت کے نہیں ہیں۔ اور یہ معنی خدا تعالیٰ کے مراد نہیں ہیں۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ تحریف کے دو عذر ہو سکتے تھے۔ ایک یہ کہ پہلے ہی سے سننے میں غلطی ہوئی ہوتی۔ دوسرے یہ کہ بعد میں بھول گئے۔ اُن کو یہ دونوں عذر نہ تھے۔ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ میں نہ سمجھنے کا عذر دور کیا گیا۔ اور وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ میں یاد نہ رہنے کا یعنی انہوں نے توریت کو سننے کے وقت صحیح سنا تھا۔ اور تحریف کرتے وقت اصل توریت یاد تھی۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ وہ جانتے تھے۔ کہ تحریف میں بڑا عذاب ہے **خلاصہ تفسیر** خدا تعالیٰ مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔ کہ کیا تم یہودیوں سے امید رکھتے ہو کہ تمہاری تبلیغ سے دین اسلام قبول کریں گے۔ ان سے یہ امید نہ رکھو۔ کیونکہ یہ سرکش قوم ہے۔ اس میں بعض لوگ ایسے بھی تھے یا ہیں۔ کہ جو کلام الٰہی سن کر اور خوب سمجھ کر پھر اپنی خواہش نفسانی سے بدل ڈالتے تھے۔ اور اے مسلمانو اب تو ان کو تم سے اور تمہارے پیغمبر سے حسد و بغض بھی ہے۔ کیونکہ انہیں تمہاری وجہ سے اپنی ریاست جانے کا اندیشہ ہے۔ جبکہ نبی آخر الزماں تشریف بھی نہ لائے تھے۔ اور انہیں ان سے کوئی خطرہ بھی نہ تھا جب ہی یہ ان کے صفات احوال بدل چکے تھے۔ اور یہ جانتے بھی تھے۔ کہ یہ سخت گناہ ہے۔ تو اب جبکہ انہیں تم سے خطرہ بھی پیدا ہو چکا یہ تمہاری بات کیسے مان لیں گے جس کلام کو یہ حق سمجھتے تھے۔ اور جس نبی پر یہ ایمان لا چکے تھے جب اس پر انہوں نے یہ کارروائی کر لی تو قرآن اور صاحب قرآن کو تو یہ مانتے بھی نہیں۔ اگر اس کی مخالفت کریں۔ تو تم کیوں رنج کرتے ہو بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ ہی میں توریت کو سن کر سمجھ کر اس کے خلاف عمل کرنا موسیٰ علیہ السلام کا فرمان جان کر بچھڑے کی پرستش کرنا عملی تحریف تھی غرضکہ انہوں نے توریت کی لفظی معنوی حکمی عملی ہر قسم کی تحریف کر ڈالی **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** ضدی عالم منصف جاہل سے بدرجہا بدتر ہے۔ کیونکہ اس جاہل کے ایمان کی امید ہے۔ مگر اس عالم کے ایمان کی اُمید نہیں اسی لئے فی زمانہ مناظرے فائدے مند نہیں ہوتے کیونکہ وہاں آبرو اور ضد کا سوال ہوتا ہے۔ **دوسرا فائدہ** کوئی شخص اپنے علم و معرفت اور یقین بلکہ رب کی ہم کلامی کے باوجود ایمان نہیں پا سکتا جب تک رحمت الٰہی شامل حال نہ ہو۔ ابلیس نے رب سے کلام بارہا کیا تھا مگر مردود ہو گیا بلکہ عالم الآثار دیکھ کر ملائکہ میں رہ کر مومن نہ رہا۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں جبکہ ایمان بعد العیان جاتا رہا۔ تو ایمان بالبرہان کا کیا اعتبار مولانا فرماتے ہیں۔

جز عنایت کہ کشاید چشم را  جز محبت کہ نشاند خشم را

جہد بے توفیق خود کس را مباد  در جہاں واللہ اعلم بالسداد

بے توفیق والی عبادت کھوٹے روپے کی طرح ہے۔ دیکھنے میں عمدہ مگر بازار میں بے کار۔ شعر

مفلساں گر خوش شوند از زرِ قلب  لیک آں رسوا شود در دار ضرب

**تیسرا فائدہ** دین کو بدلنا اس میں بری بدعتیں ایجاد کرنا بھی اس وعید میں داخل ہے۔ کیونکہ یہ بھی دین کی معنوی تحریف ہے **چوتھا فائدہ** تبلیغ احکام ہمیشہ اور ہر شخص کو کرنی چاہیئے۔ اور لوگوں کے انکار پر رنج و غم نہ کرنا چاہیئے۔ دیکھو رب نے یہود کے ایمان سے مسلمانوں کو مایوس تو کر دیا۔ مگر تبلیغ سے نہ روکا **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ بعض یہودیوں نے توریت کی تحریف کی پھر اس سے سب جماعت کے ایمان سے کیوں مایوس کیا گیا۔ نیز گذشتہ یہودیوں نے تحریف کی تھی۔ اس کی بنا پر موجودہ یہودیوں کے ایمان سے کیوں مایوسی کوئی **جواب** اس لئے کہ یہ بعض لوگ اُن تحریف کرنے والوں کے اندھے مقلد تھے۔ اور بے دین ضدی عالم اور اُس کا اندھا مقلد بے ایمانی میں دونوں برابر ہیں۔ کہ ان کے ایمان کی اُمید

نہیں. **دوسرا اعتراض** پھر انکی تبلیغ سے کیا فائدہ کیونکہ تبلیغ تو دعوت حق کیلئے ہوتی ہے **جواب**. اگر تبلیغ سے کافر مسلمان ہوجائے تو مبلغ کو دو ثواب ملتے ہیں. اور اگر کوئی مسلمان نہ ہو تو صرف احکام پہنچانے کا ایک ثواب ضرور مل جاتا ہے **تیسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جان بوجھ کر تحریف کرنا جرم ہے. نہ کہ غلطی سے تو جو شخص غلطی سے بے دین بن جائے چاہیئے کہ وہ گناہ گار بھی نہ ہو. **جواب** بیشک اگر حافظ بھول کر آیت غلط پڑھ جائے یا عالم خطاءً معنی میں غلطی کر جائے یا مجتہد اجتہاد میں خطا کرے تو یہ گنہگار نہیں. بشرطیکہ اس پر ضد نہ کریں مگر کوئی عالم غلطی سے بے دین نہیں ہوتا. بلکہ دیدہ دانستہ ہی بنتا ہے رہے جہلا ان کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے **چوتھا اعتراض** جب کلام الٰہی کے الفاظ معنی اور حکم بدلنا تحریف ہے تو چاہیئے. کہ قرآن کا ترجمہ بھی نہ کیا جائے. اس لئے اس میں کلام کے الفاظ بدل جاتے ہیں. اور انہیں کو رب کی طرف نسبت دی جاتی ہے مثلاً کوئی کہتا ہے. کہ خدا نے فرمایا ہے. کہ نماز پڑھو حالانکہ یہ عبارت خدا کی نہیں **جواب** یہ تحریف نہیں بلکہ تعبیر ہے. تاکہ عربی نہ جاننے والے قرآن کا مطلب سمجھ جائیں. اس میں ضروری ہے. کہ مضمون نہ بگڑے یہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ یہ الفاظ خدا کے ہیں. تبدیلی الفاظ قرآن پاک میں بھی ہے فرماتا ہے. وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ یہ قرآن اگلوں کے صحیفوں میں تھا. حالانکہ وہ صحیفے زبان عبرانی میں تھے. اور قرآن عربی میں ہے.

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا

اور جب ملیں وہ اُن سے جو ایمان لائے تو کہیں ایمان لائے ہم اور جبکہ تنہا ہو بعض اُن کا طرف بعض کے تو کہیں

اور جب مسلمانوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب آپس میں اکیلے ہوں. تو کہیں وہ

اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاۗجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا

کیا خبر دیتے ہو تم اُن کو ساتھ اُسکے جو کھولی اللہ نے اوپر تمہارے تاکہ حجت کریں وہ تم سے ساتھ اسکے نزدیک رب تمہارے کے کیا پس نہیں

وہ علم جو اللہ نے تم پر کھولا مسلمانوں سے بیان کئے دیتے ہو کہ اس سے تمہارے رب کے یہاں تمہیں پر حجت لائیں کیا

تَعْقِلُوْنَ ﴿٧٦﴾ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿٧٧﴾

عقل رکھتے تم کیا اور نہیں جانتے وہ تحقیق اللہ جانتا ہے وہ جو چھپاتے ہیں وہ لوگ اور وہ جو ظاہر کرتے ہیں وہ

تمہیں عقل نہیں. کیا نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں.

**تعلق**. اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق** اس سے پہلے حضور علیہ السلام کے زمانہ کے یہودیوں کا ایک عیب بیان کر دیا گیا اب اُن کا دوسرا عیب بیان کیا جا رہا ہے. **دوسرا تعلق** اس سے پہلے بتایا گیا تھا. کہ علماء یہود بذریعہ قلم لوگوں کو ایمان سے روکتے ہیں. اب فرمایا جا رہا ہے. کہ وہ زبانی بھی بہت روک تھام کر رہے ہیں **تیسرا تعلق** اس سے پہلے ایک دلیل سے مسلمانوں کو یہودیوں کے ایمان سے مایوس کیا گیا. اب اسی مایوسی کی دوسری دلیل بیان ہو رہی ہے. کہ اے مسلمانو یہ خود تو کیا ایمان لائیں گے. ان کو تو یہ بھی گوارا نہیں. کہ ان کی جماعت کا کوئی آدمی حضور علیہ السلام کی زبانی تعریف بھی کر دے. **چوتھا تعلق** پچھلی آیت سے شبہ پڑتا تھا. کہ تحریف وغیرہ صرف علماء یہود کا کام ہے. ان کی جماعت کے عام لوگ ایسے خبیث نہیں. یہ تو ہمارے نبی کی تعریفیں بھی کرتے ہیں اب اس شبہ کو دور فرمایا جا رہا ہے. کہ اے مسلمانو ان کی ظاہری تعریف کو مت دیکھو یہ تقیہ کرتے ہیں. نیز ان کی باگ ڈور ان کے علماء کے ہی ہاتھ میں ہے. وہ ان کو تنہائی میں خوب ڈانٹتے ہیں.

**شانِ نزول** حضور علیہ السلام کے زمانہ میں کچھ یہودی صحابہ کرام سے ملتے تو کہتے تھے. کہ ہم بھی اس پر ایمان لائے ہیں جس پر تمہارا ایمان ہے. اور تمہارے نبی سچے ہیں ان کا فرمان حق ہے. ان کی صفتیں توریت شریف میں موجود ہیں. ان لوگوں پر علماء یہود ملامت کرتے تھے.

اُن کے متعلق یہ آیت کریمہ آئی (تفسیر خزائن العرفان و کبیر) **تفسیر** وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا اس جگہ محرفین یہود مراد نہیں بلکہ منافق جماعت یعنی جب منافق یہودی مخلص مسلمانوں سے ملتے ہیں تو قَالُوا آمَنَّا کہتے ہیں کہ ہم تمہاری طرح دل سے ایمان لے آئے۔ لیکن اپنے اہل قرابت اور بزرگوں کے ڈر سے اپنے باپ داداؤں کا دین نہیں چھوڑ سکتے۔ بظاہر تو ہم توریت کے عامل ہیں۔ مگر درحقیقت تمہارے ساتھی (تفسیر عزیزی)" وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ خَلَا کی تحقیق سورۂ بقر کے شروع میں ہو چکی پہلے بعض سے منافقین اور دوسرے بعض سے محرفین یا کھلے کافر مراد ہیں یعنی جب بعضے منافقین ایسی باتیں بنا کر اپنے علماء کیساتھ تنہائی میں جمع ہوتے ہیں۔ جہاں کوئی مسلمان نہ ہو تو قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُمْ۔ قَالُوا کا فاعل دوسرے بعض ہیں یعنی یہ علماء یا کھلے کافر ان منافقین سے کہتے ہیں۔ کہ کیا تم مسلمانوں کو ایسی باتیں بتا دیتے ہو۔ تُحَدِّثُونَ تحدیث سے بنا ہے جسکے معنی ہیں بات کرنا یا خبر دینا خیال رہے۔ کہ یہ کفار تنہائی میں ہی ملامت کرتے تھے کیونکہ علانیہ ملامت کرنے میں انہیں دو خطرے تھے۔ ایک یہ کہ کہیں یہ منافقین ہم سے کٹ کر مسلمانوں سے نہ جا ملیں دوسرے یہ کہ مسلمان ہمارے اس ڈر اور خوف سے خبردار نہ ہو جائیں۔ اسلئے خیر خواہانہ طریقے پر چھپ کر ان سے کہتے تھے۔ اس چھپے راز کا اظہار حضور علیہ السلام کے نبوت کی کھلی دلیل ہے۔ بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ فتح کے لفظی معنی ہیں کھولنا یہاں ظاہر کرنا اور بیان کرنا مراد ہے یعنی اے منافقو نبی آخر الزمان کے فضائل اور اُن کی اُمت کی بزرگیاں اور بنی اسرائیل سے اُن کی اطاعت کا عہد و پیمان جو توریت میں مذکور ہے۔ یہ توریت و زبور کے خزانوں کے قیمتی علمی موتی ہیں جن کو ہم نے اب تک مصلحتاً بمشکل چھپایا ہے۔ تم کیا غضب کر رہے ہو کہ مسلمانوں پر ظاہر کئے دیتے ہو لِيُحَاجُّوكُمْ بِهِ یہ لام انجام کا ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے۔ کہ اُس نے چوری کی جیل خانہ کیلئے یعنی تمہاری اس خبر دینے کا انجام یہ ہوگا۔ يُحَاجُّوا مُحَاجَّة سے بنا ہے جسکے معنی ہیں۔ مناظرہ کرنا یا غالب ہو جانا یعنی مسلمان اس ذریعہ سے تم سے مناظرہ و مقابلہ کریں گے۔ یا تم پر غالب آجائیں گے۔ کیونکہ تمہاری یہ باتیں اُن کے لئے دستاویز کا کام دیں گی جس سے وہ تم کو الزام دیکر خاموش کر دیں گے۔ عِنْدَ رَبِّكُمْ اس کے معنی میں علماء نے بہت تردد کیا ہے۔ کسی نے عِنْدَ کو فی کے معنی میں لیا کسی نے رَبِّكُمْ سے پہلے لفظ کتاب یا حکم پوشیدہ مانا کسی نے عِنْدَ کو اعتقاد کے معنی میں لیا۔ مگر صحیح توجیہ یہ ہے۔ کہ عِنْدَ اپنے ہی معنی میں ہے۔ اور کوئی لفظ پوشیدہ نہیں یعنی قیامت کے دن رب تعالیٰ کے سامنے مسلمان تم کو رسوا کریں گے۔ کہ کہیں گے۔ کہ مولیٰ انہوں نے ہمارے سامنے اسلام کی حقانیت کا اقرار کیا اور پھر اس کی مخالفت کی جس سے تم اقبالی مجرم اور اقراری ملزم بنو گے جس کی سزا بھی زیادہ ہوتی ہے! اور رسوائی بھی کافی۔ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ظاہر یہ ہے۔ کہ یہ ان علماء کا ہی کلام ہے۔ اور اس میں منافقین سے خطاب ہے یعنی اے منافقو تم یہ بات سمجھتے کیوں نہیں۔ اور اس خطا سے بچتے کیوں نہیں۔ یہ بھی احتمال ہے۔ کہ یہ کلام رب کا ہو اور مسلمانوں سے خطاب ہو کہ اے مسلمانو تم یہ واقعات سُن کر سمجھتے کیوں نہیں۔ اور ان کے ایمان سے مایوس کیوں نہیں ہوتے أَوَلَا يَعْلَمُونَ رب تعالیٰ اُن کی تردید فرما رہا ہے۔ یہ استفہام انکاری ہے یعنی کیا یہ علماء یہود اتنا نہیں جانتے۔ کہ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ کہ اللہ ان کی چھپی اور علانیہ سب باتوں کو جانتا ہے۔ یا تو اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ منافقین کے ظاہر کرنے اور علماء کے درپردہ منع کرنے کو رب جانتا ہے۔ قیامت میں ان پر الزام تو قائم ہو چکا یا مسلمانوں کو اس مشورہ سے آگاہ فرما دیگا جس سے وہ دنیا اور آخرت میں ان پر الزام قائم کریں گے۔ یا حق تعالیٰ ان کی چھپائی ہوئی اور ظاہر کردہ توریت کی آیتیں جانتا ہے۔ مسلمانوں کو اس سے مطلع فرما دیگا جس سے اُن کی یہ کوشش بیکار جائیگی چنانچہ عبد اللہ ابن سلام اور حضرت کعب احبار جیسے علماء یہود کو رب تعالیٰ نے اسلام کی توفیق دی جنہوں نے توریت شریف کی چھپائی ہوئی آیتیں ظاہر فرمائیں اور حضور کی نعت شریف کے گیت گائے۔

**خلاصہ تفسیر** حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہود کی دوسری بُری خصلت سے مطلع کر رہا ہے۔ اور فرماتا ہے۔ کہ ان کی بیدینی یہاں تک پہنچ چکی کہ ان کی ایک جماعت نے کفر و ایمان کو معمولی بات سمجھ رکھا ہے۔ کہ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں۔ تو اپنے ایمان کا اظہار اور حضور علیہ السلام کے فضائل کا اقرار کرتے ہیں۔ اور جب اکیلے جمع ہوتے ہیں۔ تو ایک دوسرے پر ملامت اور انکار کرتے ہیں۔ اور ان میں دوسری جماعت وہ ہے۔ جو منافقین کی کے زبانی اقرار کو بھی گوارا نہیں کرتی وہ انکو تنہائی میں سمجھاتی ہے۔ کہ تم مسلمانوں کے سامنے توریت وغیرہ کی وہ باتیں کیوں بیان کرتے ہو جن سے اسلام کی حقانیت

ثابت ہوا اس کا انجام یہ ہوگا۔ کہ جس طرح وہ تم کو اور دلائل سے الزام دیتے ہیں۔ اسی طرح ان آیتوں اور تمہارے اقرار سے بھی تم کو الزام دیں گے نیز بارگاہ الٰہی میں ابھی تو تم بے علمی کا بہانہ کر سکتے ہو۔ مگر پھر نہ کر سکو گے۔ بلکہ اقبالی مجرم کی حیثیت سے سخت سزا کے مستحق ہو گے حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ کیا یہ بیوقوف ہم کو بے علم جانتے ہیں۔ یہ مسلمانوں سے کچھ کہیں یا نہ کہیں ہمیں سب کچھ روشن ہے۔ نیز ہم نے ہی تو توریت اتاری ہے ہم اپنے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو اور مسلمانوں کو انکی چھپائی ہوئی آئتیں بتا دینگے۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** مناظرہ کرنا۔ مقابل کی کتابوں کی خبر رکھنا اُن کو الزامی جواب دینا سنت انبیاء ہے۔ اسی لئے تو علماء یہود توریت کی آئتیں چھپاتے تھے۔ کہ مسلمان ہم کو الزامی جواب نہ دیں۔ **دوسرا فائدہ** دنیا کی ہوس اور یہاں کی عزت و آبرو کا طمع انسان کے دین کو برباد کر دیتی ہے۔ دیکھو علماء یہود کو خدا سے خوف بھی تھا۔ اور آخرت کے اقبالی جرم سے ڈرتے بھی تھے مگر پھر دنیوی لالچ میں اپنی ضد پر قائم تھے **تیسرا فائدہ** حق بات اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف چھپانا اور حضور کے کمالات کا انکار کرنا خبیث یہودیوں کا طریقہ ہے۔ اس زمانہ کے عام دیوبندی اور وہابیوں کا یہی طریقہ ہے۔ کہ فضائل کی آیات و حدیث نہ پڑھیں نہ کسی کو بتائیں اگر ان کا بس چلے تو ان آیتوں اور حدیثوں کو مٹا ہی دیں۔ اور جن آیتوں سے ان کے خیال میں حضور کی اہانت نکلے اُن کا ہر جگہ اعلان کریں۔ یہ بالکل اُن محرفین یہودیوں کے قدم بقدم ہیں۔ اسمٰعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان میں صاف لکھ دیا۔ کہ حضور کی بندوں کی سی تعریف کرو۔ اور اسمیں بھی کمی کرو۔ مگر میرے رب کا حکم یہ ہے۔ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ اس شہنشاہ کی خوب تعظیم کرو۔ لہٰذا رب ہی کی بات مانی جائیگی نہ کہ کسی ملحد خبیث کی **چوتھا فائدہ** بُری نیت سے کتاب اللہ پڑھنا بھی حرام بلکہ کفر ہے دیکھو علماء بنی اسرائیل حضور علیہ السلام کے اوصاف چھپانے کی نیت سے توریت پڑھتے تھے۔ ان کا یہ فعل کفر تھا۔ ہم سورۃ عَبَسَ کی تفسیر میں انشاء اللہ ذکر کریں گے۔ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس امام کو قتل کرا دیا تھا جو حضور کی اہانت کی نیت سے ہر نماز میں عَبَسَ پڑھا کرتا تھا۔ آج دیوبندی وہابی اور دیگر بے دینوں کا یہی دستور ہے۔ کہ ان کا قرآن و حدیث پڑھنا پڑھانا اس نیت سے ہے ہم نے تو دیکھا کہ یہ نماز میں بھی وہی آئتیں پڑھتے ہیں جن میں حضور کی توہین سمجھتے ہیں۔ انہیں سورہ حجرات۔ طٰہٰ اور سورہ فتح وغیرہ یاد ہی نہیں ہوتی ایسے ہی لوگوں کے متعلق حدیث شریف میں آیا۔ کہ وہ قرآن پڑھیں گے۔ قرآن ان پر لعنت کریگا۔ جب قرآن لانے والے کی عظمت دل میں نہ ہو۔ تو قرآن پڑھنا بے کار ہے۔ **پانچواں فائدہ** کوئی شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا راز چھپا نہیں سکتا۔ دیکھو کفار بنی اسرائیل نے چھپ کر جو مشورے کئے تھے۔ وہ رب نے حضور پر ظاہر فرما دیئے **اعتراض**۔ آیا اس جگہ وہ ہی منافقین مراد ہیں جن کا ذکر سورہ بقرہ کے شروع میں آچکا ہے۔ یا دوسرے اگر وہی مراد ہیں۔ تو اس تکرار سے کیا فائدہ نیز وہاں کچھ اور مشورہ بنایا گیا تھا یہاں اس کے خلاف **جواب** یہاں منافقین مراد ہیں خواہ وہ ہی ہوں۔ یا کوئی دوسرے اُس جگہ منافقین کا مسلمانوں کے ساتھ برتاو ابتانا منظور تھا۔ اور یہاں اُن کے ایمان سے مایوس کرنا منظور ہے۔ لہٰذا تکرار نہ ہوئی نیز تاکید کیلئے تکرار بری نہیں اور وہاں منافقین کا کلام ارشاد ہوا تھا۔ کہ وہ کہتے تھے۔ اِنَّا مَعَكُمْ اور یہاں کھلے کافروں کی فہمایش کا ذکر ہے۔ خیال رہے۔ کہ بعض یہود وہ بھی تھے۔ جو دل سے حضور کی تعظیم کرتے تھے۔ مگر خوف سے اقرار نہ کر سکتے تھے مسلمانوں سے علیحدگی میں ڈرتے ڈرتے کچھ کہہ دیتے تھے ممکن ہے۔ کہ اس جگہ وہ مراد ہوں۔

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ نصف

اور اُن میں سے بے پڑھے ہیں نہیں جانتے وہ کتاب کو مگر خواہشات کو اور نہیں ہیں وہ مگر گمان کرتے

اور اُن میں کچھ اَن پڑھ ہیں کہ جو کتاب کو نہیں جانتے مگر زبانی پڑھ لینا یا کچھ اپنی من گھڑت اور نرے گمان میں ہیں۔

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے کئی طرح تعلق ہے **پہلا تعلق** جن یہودیوں کے ایمان سے مایوسی تھی۔ ان کے چار فرقے تھے۔ ایک گمراہ کن علماء دوسرے منافقین تیسرے منافقین کو ڈانٹنے والے یہودی چوتھے عام جہلا اس سے پہلے تین فرقوں کا ذکر ہو چکا۔ اب چوتھے

ترقی کا ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق** اس سے پہلے ان یہود کے ایمان سے ناامید کیا گیا۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے۔ کہ انکی بے ایمانی کی ایک وجہ نہیں علماء تحریف سے منافقین نفاق سے اور جہلا ان کی اندھی پیروی سے کفر پر اڑے ہوئے ہیں۔ **تیسرا تعلق** اس سے پہلے علماء یہود کے دو عیب بیان ہو چکے۔ اب تیسرا عیب بیان ہو رہا ہے۔ کہ انہوں نے اپنے جہلا کو اپنے پھندے میں ایسا جکڑ رکھا ہے۔ کہ جس سے اُن کو نکلنے ہی نہیں دیتے **تفسیر** وَمِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ ہم کا مرجع وہ یہودی ہیں جن کے ایمان سے مایوسی ہے۔ اُمِّیُّوْنَ اُمِّیٌّ کی جمع ہے۔ یہ اُمٌّ سے بنا ہے۔ جسکے معنی ہیں۔ اصل ماں کو اُم۔ مکہ مکرمہ اُمُّ القریٰ سورہ فاتحہ کو ام الکتاب۔ حضور علیہ السلام کو اُمِّیّ اسی لئے کہتے ہیں۔ کہ ماں بچے کی مکہ مکرمہ ساری زمین کی سورہ فاتحہ سارے قرآن کی حضور علیہ السلام سارے عالم کی اصل ہیں حضور علیہ السلام کے لقب ہونیکے اور بھی معنی ہیں۔ جو انشاء اللہ النبی الامی کی تفسیر بیان کیئے جائینگے اب بے پڑھے آدمی کو یا کتاب رسول کے منکر کو امی کہا جاتا ہے یہاں پہلے معنی یعنی بے پڑھے لکھے آدمی مراد ہیں یعنی جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ایسے ہی رہے یا یہ ہی ماں والے ہیں۔ باپ ان پر سایہ نہ تھا جو انہیں تعلیم تربیت دیتا یعنی ان یہودیوں میں بعضے ان پڑھ جہلا ہیں جنکا حال یہ ہے کہ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اس کتاب سے توریت شریف مراد ہے اور علم سے جاننا مراد ہے یا سمجھنا یعنی پڑھ تو لیتے ہیں۔ سمجھتے نہیں یا نہ پڑھ سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں بلکہ ان کے علماء جو کچھ انہیں پڑھ کر سنا دیتے ہیں۔ اس پر اندھا دھند ایمان لے آتے ہیں اور ان کے سوا کسی کی نہیں سنتے لطف یہ ہے۔

کہ اہل کتاب کہلاتے ہیں۔ مگر کتاب سے بالکل ناواقف جیسے کہ آجکل کے عام اہلحدیث کہ حدیث کی کتابوں کے صحیح نام بھی نہیں لے سکتے۔ مگر کہلاتے ہیں۔ اہل حدیث لکھے پڑھے نام محمد فاضل اسی نکتے کیلئے اُمِّیُّوْنَ کی قرآن کریم نے یہ تفسیر فرما دی اِلَّآ اَمَانِیَّ یہ یا تو کتاب کا مستثنیٰ متصل ہے۔ یا منقطع۔ اَمَانِیَّ۔ امنیۃ کی جمع ہے۔ اور اس کے چند معنی ہیں۔ دل خوش کن بات۔ جھوٹے خیالات گھڑی ہوئی باتیں۔ پڑھی ہوئی چیز۔ قرآن کریم فرماتا ہے اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّیْطٰنُ فِیْۤ اُمْنِیَّتِهٖ۔ اور قرآن کریم میں یہ لفظ ہر معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اگر آخر معنی مراد لئے جائیں تو یہ مطلب ہے۔ کہ یہ جہلا توریت شریف کے مضامین نہیں جانتے۔ اور نہ اسے پڑھ سکتے ہیں۔ بلکہ جو ان کے علماء پڑھ کر سنا دیتے ہیں۔ اسی پر ایمان لے آتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں۔ کہ اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ توریت نہیں جانتے۔ مگر صرف بغیر معنی سمجھے زبانی پڑھ لینا (تفسیر خازن وخزائن العرفان) ان دونوں صورتوں میں یہ مستثنیٰ متصل ہے۔ بعض مفسرین نے یہ معنی کئے۔ کہ اَمَانِیَّ سے وہ جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں مراد ہیں۔ جو یہودیوں نے اپنے علماء سے سُن کر بے تحقیق مان لی تھیں مثلاً یہ کہ ہم اللہ کے محبوب اور اس کے بیٹے ہیں۔ جو چاہیں کریں۔ ہماری پکڑ نہیں یا یہ کہ ہمارے باپ دادا خدا کی مرضی بدل سکتے ہیں۔ کہ خدا ہم کو پکڑے گا۔ تو وہ چھڑا دیں گے۔ یا یہ کہ یہود کو سات یا چالیس دن سے زیادہ عذاب نہ ہوگا۔ یا یہ کہ یہود کی شریعت قیامت تک باقی ہے کبھی منسوخ نہیں ہو سکتی۔ یا یہ کہ نبوت و رسالت بنی اسرائیل کے ساتھ خاص ہے۔ غیر اسرائیلی نبی نہیں ہو سکتا۔ وغیرہ وغیرہ اس صورت میں یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ یعنی وہ کتاب سے بالکل دور ہیں۔ صرف انہوں نے اپنے علماء کی گھڑی ہوئی باتیں یاد کر رکھی ہیں۔ پھر لطف یہ ہے۔ کہ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ یعنی ان کے پاس ان باتوں کی کوئی دلیل نہیں محض خوش اعتقادی سے مانے ہوئے ہیں۔ یا انہیں خود بھی ان باتوں کا یقین نہیں محض بے بنیادی خیالات پکالئے ہیں الحمدللہ کہ اپنے دین پر اطمینان اور یقین تو مسلمان ہی کو حاصل ہے۔ آج بھی دیکھا جا رہا ہے۔ کہ پڑھے لکھے ہندو اور سکھ وغیرہ اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضری دیتے ہیں۔ اپنے بیماروں پر مسلمانوں سے قرآن پاک پڑھا کر دم کراتے ہیں مسجدوں کے دروازے کی خاک اپنے بیماروں پر ملتے ہیں۔ بلکہ اب تو آریہ اور عیسائی سوسائیٹیاں بھی عملی طور پر قرآن کریم کی طرف آ رہی ہیں۔ اور اس کو اپنے لئے دستور العمل بنا رہی ہیں۔ ہم نے تو یہ دیکھا ہے۔ کہ بعض ہندوؤں کو جب جانکنی کی تکلیف ہوتی ہے۔ تو اس کے ورثاء کہتے ہیں۔ کہ اب ان کو کلمہ پڑھواؤ یعنی اسلامی کلمہ پڑھواؤ کشتی میں سوار ہوتے وقت بعض جگہ ہندو ملاح کہتے ہیں۔ کہ نبی جی کا کلمہ پڑھنا کہ بیڑا پار لگے۔ بعض ہندو ہر مصیبت میں حضور غوث پاک کی گیارھویں دیتے ہیں۔ الحمدللہ کہ مسلمان ہر مصیبت اور آرام میں اپنے اسلام پر ہی قائم رہتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب بھی کفار کو اپنے دین پر یقین نہیں **خلاصہ تفسیر** اہل کتاب میں بعض وہ جہلا اور بے پڑھے بھی ہیں۔ کہ جو کتاب اللہ کو بالکل نہیں جانتے جو ان کے گمراہ کن علماء نے اپنے مرضی کے موافق میٹھی میٹھی باتیں گھڑ رکھی ہیں۔ انہوں نے ان باتوں کو اپنی رائے کے مطابق پاکر یاد کر لیا ہے۔ اور اپنے خیال میں ان کو توریت کے مضامین اور خلاصہ سمجھ کر خوش ہوتے ہیں۔ کہ ہم نے کتاب کا لب لباب

نکال لیا۔ یا وہ جہلا توریت کی عبارت بے سوچے سمجھے طوطے کی طرح پڑھ لیتے ہیں۔ اس کے مضامین تک نہیں پہنچتے مگر لطف یہ ہے۔ کہ انہیں خود بھی ان باتوں پر یقین نہیں تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا۔ کہ اسی قسم کے لوگ مسلمانوں میں بھی موجود ہیں۔ ان میں بعض گمراہ کن علماء ہیں۔ جو کہ قرآن کریم اور حدیث شریف کی تحریف معنوی میں دن رات مشغول ہیں بعض مسلم نما کفار وہ ہیں جو غیروں کی مرضی پر اپنا دین مذہب قوم قربان کرنے پر تیار ہیں بعض وہ جہلا بھی ہیں جنہوں نے قرآن کریم کے اُردو ترجمے دیکھ کر کچھ نوٹ لگا رکھے ہیں۔ اور اپنے کو بڑا عالم مفسر محدث جانتے ہیں۔ اس زمانہ کی اکثر اُردو تفسیروں کا یہ ہی حال ہے۔ کوئی جاہل روح القرآن کوئی دُرِ قرآن کوئی ترجمان القرآن ناموں سے اسی قسم کی تفاسیر چھاپ رہے ہیں **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** دینی معارف نظری ہیں۔ نہ کہ بدیہی جن کو بہت غور اور فکر سے معلوم کرنا ضروری ہے۔ **دوسرا فائدہ** دینیات میں یقین ضروری ہے ظن اور گمان ناکافی ہے **تیسرا فائدہ** عقائد میں تقلید حرام ہے۔ ہم مقلدین صرف فروعات میں مقلد ہیں نہ کہ عقائد میں یعنی ہم توحید و رسالت حشر نشر وغیرہ کو صرف امام اعظم کے قیاس سے نہیں جانتے بلکہ دلائل یقینیہ سے **چوتھا فائدہ** گمراہ کن عالم اور اسکا پیرو جاہل دونوں برابر کے گمراہ ہیں۔ اگرچہ عالم کا عذاب دگنا ہے۔ کیونکہ وہ گمراہ بھی ہے۔ اور گمراہ کن بھی **پانچواں فائدہ** جیسے عالم پر فرض ہے کہ صحیح مسائل لوگوں کو بتائے۔ اور خود بھی عمل کرے اسی طرح جاہل کا فرض ہے۔ کہ سچے علماء کی صحبت اختیار کرے۔ ہر چمکیلی چیز کو سونا نہ سمجھے ورنہ وہ رب کے ہاں گرفتار ہوگا۔ **پہلا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ ظن یعنی گمان بُری چیز ہے۔ اور قیاس بھی ظنی ہی ہے۔ لہٰذا صرف قرآن و حدیث کو ماننا چاہیئے (غیر مقلد) **جواب** بے شک اصول دین میں ظن بُرا ہے۔ وہاں یقینات چاہییں فروعی اعمال میں ظن معتبر اگر یہاں بھی یقینیات کی ضرورت ہو تو بہت ہو تو بہت دشواری ہوگی۔ کیونکہ اکثر حدیثیں اور قرآن پاک سے نکالے ہوئے بہت سے مسائل ظنی ہیں **دوسرا اعتراض** عوام کو علماء کی تقلید نہ چاہیئے عام یہودی اپنے علماء کی تقلید سے ہی کافر ہوئے۔ اور تم بھی اماموں کی تقلید کرتے ہو (غیر مقلد) **جواب**۔ اللہ رسول کے فرمان کے مقابلہ میں کسی کی تقلید کرنا حرام ہی نہیں بلکہ کفر ہے۔ عام یہودی قرآن اور حضور کے فرمان کے مقابل اپنے علماء کی پیروی کرتے تھے۔ ہم حضور کی اطاعت کیلئے اماموں کی پیروی کرتے ہیں۔ کہ ان کے ذریعہ ہم کو حضور کی سچی اطاعت نصیب ہو جائے۔ اس تقلید کا قرآن و حدیث میں سخت حکم ہے۔ دیکھو ہماری کتاب "جاء الحق" علم صرف و نحو اور اسماء رجال اور علم تجوید وغیرہ میں اس فن کے اماموں کی تقلید کرنا ہی پڑتی ہے جس حدیث کو تم ضعیف یا صحیح کہتے ہو وہ محدثین کی تقلید سے ہی کہتے ہو۔ یہ قوت و ضعف قرآن و حدیث سے ثابت نہیں **تیسرا اعتراض** اَمَانِیَّ کے پہلے معنی سے معلوم ہوا۔ کہ بغیر ترجمہ جانے قرآن نہیں پڑھنا چاہیئے کیونکہ عوام یہود میں یہ ہی عیب تھا (عام نیچری) **جواب** عقائد درست کرنے کیلئے قرآن کے توحید و رسالت کے مضامین جاننا ضروری ہیں۔ پورا ترجمہ سیکھنا ہر مسلمان پر فرض نہیں۔ الحمدللہ کہ اب بھی ہر مسلمان توحید و رسالت کا عقیدہ رکھتا ہے۔ اور وہ اتنا سمجھتا ہے۔ کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا یہی مطلب ہے۔ عام یہودی توریت کے ان مضامین سے بھی بے خبر ہو چکے تھے۔ اس کی برائی کیگئی۔ ورنہ خود قرآن پاک سے ثابت ہے۔ کہ پورا علم دین سیکھنا ہر مسلمان پر فرض نہیں بعض کا سیکھ لینا کافی ہے۔ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ طَائِفَةٌ نیز قرآن کا بغیر مطلب سمجھے ہوئے۔ ترجمہ سیکھنا بے کار بلکہ گمراہی کی جڑ ہے **چوتھا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جہلا کو صحیح عالم کی پیروی کرنا ضروری ہے۔ گمراہ کن عالم کی پیروی سے وہ خود گمراہ ہو جاتے ہیں مگر صحیح عالم کا پتہ لگانا ناممکن ہے۔ اس میں طاقت سے زیادہ تکلیف ہے۔ **جواب** جس طرح بیمار کامل اور ناقص طبیب میں فرق کر لیتا ہے۔ کہ جس کی دوا سے تندرستی ملے وہ کامل ہے ورنہ ناقص اسی طرح ہر شخص کو چاہیئے کہ صحیح اور جھوٹے عالم میں فرق کرے جس کی صحبت سے اللہ و رسول کی محبت اور سنت کی اتباع کا جذبہ پیدا ہو۔ وہ سچا عالم ہے۔ ورنہ جھوٹا یہ اصلی و نقلی عالم کیلئے کسوٹی ہے۔ **تفسیر صوفیانہ** بعض نام نہاد صوفی شکل و صورت میں صوفی ہیں۔ اور لباس صوفیانہ پہن لیتے ہیں کلام بھی صوفیوں کا سا کرتے ہیں لیکن ارادہ میں پکے اور عقیدے میں سچے نہیں، ہر غافل کی طرف مائل ہوتے۔ اور ہر آواز پر کان لگا دیتے ہیں اُن کے ظاہری افعال کی نقل تو اتار تے ہیں لیکن اُن کے اصلی حقیقت سے بے خبر نہ اُن کی صحبت میں اخلاص اور نہ اُن کو حق و باطل میں تمیز کرنیکا مادہ۔ وہ ان بے پڑھے یہودیوں کی طرح ہیں جو

اصل کتاب سے بے خبرہ کر دوسروں کی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں. سالک پر لازم ہے. کہ اس راستہ میں نہایت احتیاط سے قدم رکھے وہمیات سے دُور بھاگے ظاہر حالت سے دھوکہ نہ کھائے. یہ راستہ نہایت باریک ہے. اور یہ کنواں نہایت عمیق اس راستہ میں صد ہا شکاری قسم قسم کے جال لگائے اور طرح طرح کے دانہ ڈالے بیٹھے ہیں. مولانا فرماتے ہیں.

صد ہزاراں دام و دانہ است اے خدا ما چو مرغانِ حریص بے نوا

دم بدم ما بستۂ دامِ نوئیم ہر یکے گر بازو سیمرغ شویم

اسی کو صوفیاء کی اصطلاح میں بوالہوس کہتے ہیں. **حکایت**. ایک شخص نے کسی بزرگ کو دیکھا. کہ وہ ہر خوبصورت چیز کو چوم لیتے ہیں. یہ بھی اُن کے ساتھ اس نیت سے لگ گیا. کہ بہت خوبصورتوں کے بوسہ ملینگے. ایک دن کسی لوہار نے بھٹی سے گرم اور سُرخ لوہا نکالا ان بزرگ نے اُس کو سینہ سے لگالیا. اور خوب چوما یہ بوالہوس پیچھے ہٹنے لگا تب اُن بزرگ نے ایک چپت رسید کی اور فرمایا. کہ اس کو کیوں نہیں چومتا. ہم نے بعض حضرات کو دیکھا. کہ بزرگوں کے نذرانہ دیکھ کر اُن کے منہ میں پانی آگیا اور اسی کی نیت سے پیر بن گئے یہ سب لوگ اس آیت کے مصداق ہیں

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ

پس خرابی ہے واسطے اُن لوگوں کے جو لکھتے ہیں کتاب کو ساتھ ہاتھوں اپنے کے پھر کہتے ہیں وہ یہ طرف سے اللہ کے ہے

تو خرابی ہے اُن کے لئے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھیں پھر کہدیں یہ خدا کے پاس سے ہے

لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ ﴿٧٩﴾

تاکہ خریدیں وہ ساتھ اسکے قیمت تھوڑی پس خرابی ہے واسطے انکے اُس سے جو لکھا ہاتھوں نے اُن کے اور خرابی ہے واسطے اُنکے اُس سے جو کماتے ہیں وہ

کہ اس کے عوض تھوڑے دام حاصل کریں تو خرابی ہے اُن کیلئے اُن کے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ہے اُن کیلئے اس کمائی سے

**تعلق**. اس آیت کا پچھلی آیت سے چندطرح تعلق ہے. پہلا تعلق اس سے پہلے یہود کی مختلف جماعتوں اور اُن کی بدکرداریوں کا ذکر ہُوا. اب ان میں سے بدترین جماعت یعنی محرفین کی سزا کا ذکر ہو رہا ہے. دوسرا تعلق پچھلی آیتوں سے شبہ ہوتا تھا. کہ شاید ان سب گروہوں کی سزا یکساں ہو گی. کیونکہ ان سب کے ایمان سے مایوسی ہے. اس آیت میں اس شبہ کو دفع فرمایا جا رہا ہے. کہ نہیں بلکہ سزا بقدر جرم ہے. چونکہ ان میں بڑے مجرم علماء یہود ہیں. کیونکہ وہ کافر اور کافرگر ہیں. لہذا ان کی سزا بھی سخت تر ہے. **شانِ نزول** جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو علماء یہود کو قوی اندیشہ ہُوا. کہ ہماری سرداری چھن جائیگی اور روزی بند ہو جائے گی کیونکہ توریت شریف میں حضور علیہ السلام کا حلیہ شریف اور اُن کے اوصاف مذکور ہیں جب لوگ حضور علیہ السلام کو اس کے مطابق پائینگے تو فوراً ایمان لے آئیں گے. اور ہم کو چھوڑ دیں گے. اس اندیشہ سے انہوں نے توریت شریف میں تحریف کروائی. اور آپ کا حلیہ بدل دیا مثلاً توریت شریف میں تھا. کہ "نبی آخر الزمان خوبصورت گھونگھریلے بال سرگیں آنکھ والے اور میانہ قد ہیں". انہوں نے اس کو مٹا کر یوں لکھ دیا. کہ بہت دراز قد ہیں. اُن کی آنکھیں کنجی اور بال اُلجھے ہوئے ہیں". جب عوام یہودی ان سے پوچھتے کہ کیا حضور علیہ السلام میں نبی آخر الزمان کے صفات ہیں. تو وہ یہی بدلی ہوئی توریت لاکر انہیں یہی بگڑا ہُوا مضمون سنا دیتے اور کہتے کہ رب نے توریت میں اُن کے یہ اوصاف بیان کئے حضور علیہ السلام میں ان میں سے کوئی صفت موجود نہیں. اس پر یہ آیت کریمہ اتری. **تفسیر فَوَیْلٌ**. ویل اور ویح. اور ویس. اور ویب. عرب میں وہ کلمات ہیں. جو مصیبت زدہ کو دیکھ کر بولے جاتے ہیں. لیکن ویح اور ویس تو ترس کھا کر بولتے ہیں جس کے معنی ہوتے ہیں افسوس. اور ویل اور ویب. بددُعا کیلئے استعمال کرتے ہیں. جس کے معنی ہیں خرابی اور خواری یعنی تو اس مصیبت سے کبھی نہ نکلے. اس لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں. کہ ویح رحمت کا اور

ویل عذاب کا دروازہ ہے۔ ایک بار حضور علیہ السلام نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا۔ وَیحَكِ اُمّ المؤمنین اس لفظ سے پریشان ہوئیں۔ تو حضور نے فرمایا کہ اے عائشہ یہ کلمہ رحمت کا ہے۔ اس سے پریشان نہ ہو۔ ہاں ویل سے پریشانی چاہیئے (تفسیر عزیزی) خیال رہے۔ کہ قرآن کریم نے یہودی علماء اور نماز میں سستی کرنیوالوں اور کم تولنے والوں کیلئے ویل فرمایا۔ اور احادیث شریفہ میں مسائل چھپانے والے علماء اور بے علم فتویٰ دینے والے جہلاء کیلئے اور رب کی قدرتوں میں غور نہ کرنیوالے عوام کیلئے ویل فرمایا۔ غرضکہ قرآن حدیث میں مختلف مجرموں کیلئے یہ لفظ بولا گیا ہے نیز ویل کی تفسیریں بھی مختلف آئی ہیں چنانچہ بعض روایات میں ہے کہ ویل جہنم میں ایک آگ کا پہاڑ ہے جو مجرموں پر گرا کر ان کا جسم پاش پاش کر دیگا۔ اور بعض میں ہے کہ ویل جہنم میں ایک گہرا غار ہے جس میں مجرمین ڈالے جائینگے بعض روایت میں ہے کہ ویل جہنم میں ایک نہایت گرم پتھر ہے جس پر مجرموں کو چڑھایا اتارا جائیگا۔ بعض میں ہے کہ ویل ایک ندی ہے جس میں کہ دوزخیوں کا خون اور پیپ بہتا ہوگا۔ اور مجرموں کو وہی پلایا جائیگا۔ بعض روایات میں ہے۔ کہ ویل جہنم میں ایک کوئیں کا نام ہے جس میں کافر ڈالے جائیں گے۔ اور چالیس برس تک اسکی تہ تک نہ پہنچیں گے۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ ویل ایک دردناک عذاب کا نام ہے۔ (تفسیر کبیر و عزیزی) ان سب روایتوں کو اس طرح کردو۔ کہ ویل کے معنی ہیں خواری اور سخت عذاب لیکن قیامت میں اس کا ظہور مختلف طرح سے ہوگا جیسا کہ مجرم کا جرم ویسا اس کیلئے ویل محرفین علماء کا ویل آگ کا پہاڑ متکبروں کا ویل غار ظالم چوہدریوں کا ویل گرم پتھر شراب خواروں کا ویل خون و پیپ کی ندی عام کافروں کا ویل جہنم کا کوآں (تفسیر عزیزی) لہذا قرآن و حدیث میں مختلف ویل معنی میں ہیں۔ کم تولنے والوں کا علیحدہ ویل نماز میں سستی کرنیوالوں کا علیحدہ لِلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ۔ یا تو کتاب سے بدلی ہوئی کتاب مراد ہے۔ اور یہی یَكْتُبُوْنَ کا مفعول ہے۔ یعنی ان علماء کے لئے ویل ہے۔ جو بدلی ہوئی کتاب لکھتے ہیں صحیح نہیں لکھتے یا یَكْتُبُوْنَ کا مفعول اور کتاب کے پہلے فی چھپا ہوا ہے جسکی وجہ سے کتاب منسوب ہے یعنی اپنی طرف سے گھڑے ہوئے مضامین کتاب میں لکھتے ہیں۔ بِاَيْدِيْهِمْ اپنے ہاتھوں سے یعنی نہ تو بگڑی ہوئی کتاب نقل کرتے ہیں۔ اور نہ کسی سے کہہ کر بگڑواتے ہیں۔ اور نہ بے خبری اور نادانی سے بگاڑتے ہیں۔ بلکہ جان بوجھ کر اپنے ہاتھوں سے بگاڑتے ہیں۔ پھر یہی نہیں کہ چپکے سے بگاڑ کر رکھ دیں۔ بلکہ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لوگوں کو وہ بدلی ہوئی عبارت دکھا کر کہتے ہیں۔ کہ یہ رب کی طرف سے آئی ہوئی آیت ہے۔ هٰذَا سے بگڑی عبارت کی طرف اشارہ ہے۔ غرضکہ وہ پے در پے تین جرم کرتے ہیں۔ ایک کتاب الٰہی کو بگاڑنا دوسرے اس بگڑے ہوئے کو رب کی طرف نسبت کرنا تیسرے رب پر اتنا بڑا جھوٹ باندھنا جس سے کہ یہود کی موجودہ اور آیندہ نسلیں گمراہ ہوتی رہیں۔ لطف یہ کہ انہوں نے اتنے بڑے بڑے جرم کیوں کئے محض اس لئے کہ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا تاکہ ان بڑے گناہوں سے تھوڑے سے دام وصول کرلیں۔ یا تو اس طرح کہ لوگ ایمان نہ لائیں۔ بلکہ ہمارے پھندے میں پھنسے رہیں جس سے ہماری آمدنی برقرار رہے۔ یا مالدار یہودیوں سے رشوت لیکر توریت کے سخت احکام نرم کر دیتے تھے۔ تھوڑے سے فنا ہونیوالے نفع کیلئے ایمان جیسی دولت چھوڑ دینا بڑی بدبختی ہے خیال رہے کہ بِہٖ کا مرجع یا تحریف شدہ کتاب ہے۔ یا ان کا تحریف کرنا یعنی تحریف کردہ کتاب کے عوض یا تحریف کرنے کے عوض تھوڑی سی قیمت لے لیتے ہیں۔ دنیا آخرت کی قیمت ہے۔ اور یہ کتنی بھی زیادہ ہو آخرت کے مقابلہ میں تھوڑی ہے۔ اس لئے اس کو ثمن قلیل فرمایا گیا۔ ثمن قلیل کے بہت نکات ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ خیال رہے۔ کہ ان کے سب جرموں کا بدلہ ایک ہی ویل نہیں۔ بلکہ فَوَيْلٌ لَّهُمْ ان کو چند قسم کی خواریاں اور ویل ملیں گے جن میں سے ایک قسم کی بڑی خواری اور سخت ویل تو مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ ان کے اس لکھنے اور کتاب الٰہی بگاڑنے کی وجہ سے ہوگا۔ وَوَيْلٌ لَّهُمْ اور دوسری قسم کا سخت ویل اور سخت رسوائی مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ان کی حرام کمائی اور رشوت ستانی کی وجہ سے ہوگا۔ يَكْسِبُوْنَ كَسْبٌ سے بنا ہے۔ کسب فاعل کو نفع دینے والے یا نقصان دور کرنے والے کام کو کہتے ہیں۔ اسی لئے خدا کے کام کو کسب نہیں کہتے۔ اور اس کو فاعل کہتے ہیں کاسب نہیں کہتے۔ کیونکہ وہ اپنے ذاتی نفع اور نقصان سے پاک ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ يَكْسِبُوْنَ سے علماء یہود کی ساری بدعملیاں مراد ہوں۔ نکتہ اس جگہ كَتَبَتْ ماضی اور يَكْسِبُوْنَ مضارع فرمایا گیا۔

کیونکہ اُنہوں نے کتاب کی تحریف تو ایک بار کر لی تھی۔ مگر اس تحریف شدہ کتاب سے روٹیاں عمر بھر کھاتے رہے۔ جیسے کوئی جعل ساز جھوٹی سرکاری مہر بنا کر رکھ لے اور اس سے ہمیشہ غلط پروانے بنا کر روپیہ کمایا کرے۔ **خلاصہ تفسیر** ان علماء یہود کا یہ حال ہے۔ کہ امیروں کو راضی کرنے اور اپنی سرداری قائم رکھنے کیلئے غلط مسائل اور جھوٹی روائتیں توریت شریف میں لکھ کر لوگوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ اور نہائت دلیری سے کہہ دیتے ہیں۔ کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے یعنی توریت کی اصلی عبارت ہے۔ اگر یہ کسی پرانی لکھی ہوئی کتاب کو اپنی خوش عقیدگی سے من اللہ کہہ دیتے تو بھی ایک بات تھی غضب تو یہ ہے۔ کہ خاص اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے کو من اللہ کہہ دیتے ہیں۔ یہ دین فروشی بے ایمانی خدا پر جھوٹ باندھنا اُسکی کتاب کو بگاڑنا ایسے ایسے سنگین جرم کس لئے ہیں صرف چند پیسے کمانے کیلئے لُف ہے ان کے اس لکھنے پر اور لعنت ہے اُنکی اس کمائی پر۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** گمراہ کن کتابیں اور جھوٹے مضامین گمراہ کرنے کیلئے لکھنا اور چھاپنا حرام ہے۔ ہاں کسی کے غلط مضامین کو معہ تردید شائع کرنا جائز بلکہ سنت الٰہی ہے۔ **دوسرا فائدہ** حرام کام پر اُجرت لینا حرام اور اس کا استعمال کرنا سخت گناہ لہٰذا ناچ گانا وغیرہ کی اجرت حرام ہے **تیسرا فائدہ** جانبین کی رضامندی سے حرام مال حلال نہیں ہوتا۔ دیکھو علماء یہود کو اُن کے جہلا تحریف کے عوض رضامندی سے مال دیتے تھے۔ مگر وہ حرام رہا اسی طرح رشوت و سود وغیرہ اگرچہ رضامندی سے دیا جائے۔ مگر اس کا لینا حرام ہے۔ **چوتھا فائدہ** قرآن پاک کا ترجمہ اس کی تفسیر سورتوں کے نام وقف اور ربع اور نصف اور ثلث کی علامتیں اس طرح لکھنا کہ جس سے قرآن میں اور ان میں فرق نہ رہے حرام ہے۔ کیونکہ اس سے اصل قرآن مشتبہ ہو جائیگا۔ اور یہ تحریف ہے۔ اسی لئے نصف اور ربع اور رکوع کی علامتیں حاشیہ پر لکھی جاتی ہیں۔ اور سورتوں کے نام اور ترجمہ اگرچہ قرآن کے ساتھ ہی لکھے جاتے ہیں۔ مگر خطوط کھینچ کر اور تحریر وغیرہ بدل کر بہت طرح فرق کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ رب کا کلام ہمارے کلام سے مل نہ جائے۔ بلکہ فقہا فرماتے ہیں۔ کہ کلام الٰہی کو نستعلیق (اُردو خط) میں لکھنا منع ہے۔ نسخ (یعنی عربی عبارت تحریر) میں لکھنا ضروری ہے بلکہ چاہیئے۔ کہ قرآن کی تحریر میں مصحف عثمانی کی پیروی کی جائے۔ اس طرح پڑھنے میں بھی فرق ضروری ہے۔ **پانچواں فائدہ** حرام روپے سے جو چیز خریدی جائے وہ بھی حرام ہے۔ رشوت یا سود کے روپے سے غلہ کپڑا وغیرہ جو خریدا جائے۔ سب حرام حرام مال کو راہ خدا میں خیرات کرنا حرام ہے۔ اور اس پر ثواب کی امید رکھنا کفر ہے جیسے کہ یکسبون کے عموم سے معلوم ہوا۔ **پہلا اعتراض**۔ اس آیت میں تین جگہ ویل کیوں فرمایا گیا۔ ایک ہی جگہ کافی تھا **جواب** پہلے ویل میں اجمال تھا۔ اس سے شبہ پیدا ہوتا تھا۔ کہ شاید تحریف کرنے اور جھوٹ بولنے اور حرام کمائی کرنے پر ویل ہے۔ فقط ایک کام کرنے میں کوئی خرابی نہیں اس کو دفع کرنے کیلئے آگے ہر فعل پر علیحدہ ویل فرمایا۔ **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن لکھ کر فروخت کرنا حرام ہے۔ لہٰذا اُن پریسوں اور کاتبوں کی کمائی حرام ہے۔ جو یہ کاروبار کرتے ہیں۔ کیونکہ اس آیت میں کتاب الٰہی لکھ کر اُجرت لینے پر ویل فرمایا گیا ہے نیز ابراہیم نخعی اور عمش نے قرآن لکھنے کی اُجرت سے منع فرمایا۔ اور اس پر یہی آیت پیش کی عبداللہ ابن یزید ختمی اور قاضی شریح نے فرمایا کہ کتاب اللہ کی قیمت مت لو حضرت مطرف فرماتے ہیں۔ کہ ہم ایک جنگ میں ابو موسیٰ اشعری کے ساتھ تھے۔ مال غنیمت میں دو کتابوں کے صندوق بھی آئے۔ جن میں سے ایک میں توریت یا انجیل تھی۔ لشکر میں ایک عیسائی مزدور تھا۔ اس نے یہ کتاب خریدنا چاہی مسلمانوں نے کتاب اللہ کا بیچنا مکروہ جانا۔ اُس کو کتاب تو مفت دیدی اور صندوق دو درم میں فروخت کر دیا۔ بہت سے بزرگان دین حتی کہ امام اعظم کے استاد حضرت حماد بھی قرآن کریم کی تجارت مکروہ جانتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر جب بازار میں کسی کو قرآن شریف بیچتے ہوئے دیکھتے تو فرماتے کہ کاش میری زندگی میں کوئی حاکم پیدا ہو۔ جو قرآن بیچنے والے کے ہاتھ کٹوائے حضرت عمر، عبداللہ ابن مسعود۔ اور دیگر صحابہ کرام بھی قرآن کی تجارت بُری جانتے تھے۔ امام زین العابدین فرماتے ہیں۔ کہ صحابہ کرام کے زمانہ میں قرآن بیچنے کا رواج نہ تھا۔ بلکہ لوگ سادہ کاغذ اور قلم دوات لیکر منبر کے پاس بیٹھ جاتے اور ہر پڑھے لکھے مسلمان سے ایک دو ورق لکھوا لیتے تھے۔ اس آیت اور ان روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن کی لکھوائی چھپائی کی اجرت

حرام ہے **جواب** اس آیت کا ترجمہ غلط سمجھا علماء یہود صحیح توریت لکھ کر فروخت نہ کرتے تھے بلکہ اس میں اپنی طرف سے خلط کرتے تھے۔ اور یہ فعل بغیر اُجرت بھی حرام ہے۔ اس لئے فرمایا گیا۔ کہ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ نیز اُن کے لکھنے پر ویل علیحدہ فرمایا گیا۔ اور کمائی پر علیحدہ بیشک چاروں خلفاء کے زمانہ میں قرآن پاک کے فروخت کرنے کا رواج نہ تھا۔ یہ بدعت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آخیر زمانہ میں مروج ہوئی۔ لیکن یہ بدعت حسنہ ہے۔ سیئہ نہیں شروع شروع میں علماء نے اس آیت کی وجہ سے اس کو منع کیا بعد میں غور سے معلوم ہوا۔ کہ اس کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ یہ روشنائی کاغذ کی قیمت ہے۔ اور لکھنے کی اجرت اسی لئے عبد اللہ ابن عباس محمد ابن حنفیہ امام جعفر صادق۔ امام محمد باقر یہاں تک کہ حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی اس کے جواز کا فتویٰ دیا اور بعد میں اس کے جواز پر علماء کا اجماع ہوگیا۔ (تفسیر عزیزی) **تیسرا اعتراض** اس آیت میں پہلے علماء یہود کے تین عیب بیان کئے گئے۔ توریت کی تحریف کرنا اس کو رب کی طرف نسبت دینا۔ اور اس پر روپیہ لینا۔ لیکن عذاب فقط تحریف اور کمائی پر بیان کیا گیا۔ کیا جھوٹ نسبت کرنے پر ویل نہ ہوگا **جواب** لکھنے میں یہ داخل ہو گیا تھا کیونکہ لکھنا اسی لئے تھا۔ لہٰذا اس کے علیحدہ ذکر کرنیکی ضرورت نہ تھی۔ **تفسیر صوفیانہ** گناہ نفس کی بیماری ہے۔ اس کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے۔ کہ گنہگار گناہ کو بُرا جان کر کرے اور اپنے کو اس پر ملامت بھی کرتا رہے۔ یہ حالت قابل علاج ہے۔ دوسرا درجہ یہ کہ گناہ کا احساس جاتا رہے یہ حالت بھی قابل علاج تو ہے۔ مگر بمشکل تیسرا درجہ یہ کہ گناہ کا احساس بھی نہ رہے اور نصیحت کرنیوالے کو دشمن جانے اس کا علاج بہت مشکل ہے۔ اگر تقدیر سے کوئی کامل طبیب روحانی مل گیا۔ تب تو خیر ورنہ اس کا انجام ہلاکت روح ہے چوتھا درجہ یہ کہ گناہ کو اچھا سمجھے اور اس پر فخر کرے اس کی اشاعت کرے۔ اور چاہے۔ کہ لوگ اس کی اس گناہ پر تعریف کریں۔ اس کا علاج قریباً غیر ممکن ہے علماء یہود کی بیماری اس ہی درجہ کی تھی جس کے متعلق رب نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کی شفا یعنی ایمان سے مایوس کر دیا جو شخص اپنے گناہ پر تعریف کرائے۔ اور اس تعریف سے خوش ہو۔ وہ اس بیوقوف کی طرح ہے جس سے کوئی مسخرہ کہے کہ آپکی پاخانہ کی خوشبو مشک و عنبر کی طرح ہے۔ اور وہ اس پر خوش ہو صوفیائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ ویل ہے۔ اسی متکبر واعظ کے لئے جو لوگوں کی دست بوسی پر فخر کرے اور اپنے ہر کلام کی سامعین سے تعریف چاہے حضرت جنید بغدادی نے ایک بار وعظ میں فرمایا۔ کہ میں وعظ کہنے کی اسلئے ہمت کرتا ہوں۔ کہ حضور نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فاسق فاجر آدمی سے بھی اس دین کو قوت دیگا۔ میں فاجر و فاسق ہوں شائد اللہ میرے وعظ سے دین کو قوت دیدے اس آیت سے ہم سبکو عبرت پکڑنی چاہیئے (از روح البیان)

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ

اور کہا انہوں نے ہرگز نہیں چھوئے گی ہمکو آگ مگر دن گنے ہوئے فرمادو کیا لے لیا تم نے نزدیک اللہ کے

اور بولے ہمیں تو آگ نہ چھوئے گی۔ مگر گنتی کے دن تم فرمادو کیا خدا سے تم نے کوئی

عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى

وعدہ پس ہرگز نہ خلاف کرے گا اللہ وعدہ اپنا یا کہتے ہو تم اوپر اللہ کے وہ جو نہیں جانتے تم ہاں

عہد لے رکھا ہے جب تو اللہ ہرگز اپنا عہد خلاف نہ کریگا یا خدا پر وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں۔ ہاں

مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾

وہ جو کمائے گناہ اور گھیرے اُس کو خطا اُس کی پس یہ لوگ آگ والے ہیں وہ لوگ بیچ اسکے ہمیشہ رہنے والے ہیں

کیوں نہیں جو گناہ کمائے اور اُسکی خطا اُسے گھیرے وہ دوزخ والوں میں ہے انہیں ہمیشہ اس میں رہنا

**تعلق:-** اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے. پہلا تعلق اس سے پہلے موجودہ یہودیوں کے دو عیب بیان ہو چکے اب اُن کا تیسرا عیب بیان ہو رہا ہے. فرق یہ ہے. کہ وہ اُن کے فعلی عیب تھے. اور یہ قولی یعنی پہلے فرمایا گیا تھا. کہ وہ یہ کرتے ہیں. اور اب ارشاد ہو رہا ہے. کہ وہ یہ کہتے ہیں. **دوسرا تعلق** اس سے پہلے موجودہ یہود کی بدعملیوں کا ذکر تھا. اب اسکی وجہ بتائی جا رہی ہے یعنی اُن کو اِن بدکاریوں کی اس لئے ہمت پڑی کہ انہوں نے یہ سمجھ رکھا ہے. کہ ہم جو چاہیں کریں ہم کو چند روز سے زیادہ عذاب نہ ہوگا. یا وہ سمجھ چکے ہیں. کہ ہم کو چند روز عذاب ضروری ہوگا. خواہ نیکوکاری کریں یا بدکاری جب یہ ہونا ہی ہے. تو ہم دنیا میں مزے کیوں نہ اُڑا لیں. خلاصہ یہ کہ اُن کی آس یا یاس نے انہیں گناہ پر دلیر کر دیا **شانِ نزول**، حضرت ابن عباس فرماتے ہیں. کہ یہود کہتے تھے. کہ ہم دوزخ میں صرف اتنی مدت رہیں گے جتنی کہ ہمارے باپ دادوں نے بچھڑے کی پوجا کی ہے. یعنی چالیس دن اس کے بعد عذاب سے چھوٹ جائیں گے اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر خزائن العرفان)

**تفسیر وَقَالُوْا** یہ سارے یہودیوں کا قول ہے علماء تو اپنی طرف سے بنا کر کہتے تھے. اور جاہل اُن کی پیروی سے یعنی کہا اُن سب یہودیوں نے کہ **لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ** ہم کو آگ چھوئے گی بھی نہیں خواہ کتنی ہی بدکاریاں اور کفریات کریں. یعنی آگ میں رہنا تو کیا. ہم کو اس کے شعلے بھی نہ پہنچینگے. **اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً** مگر گنتی کے دن اس اِلّا سے معلوم ہوتا ہے. کہ اِن کا عقیدہ یہ تھا. کہ ہم جہنم میں کبھی نہیں رہیں گے. ہاں کچھ دن ہم کو آگ کے شعلے پہنچ جائیں گے. اس میں علما کا اختلاف ہے. کہ گنتی کے دن سے کیا مراد بعض نے فرمایا. کہ تھوڑے دن خواہ کتنے بھی ہوں جیسے کہا جاتا ہے. وہاں گنتی کے آدمی تھے بعض نے فرمایا. کہ سات دن کیونکہ ایام جمع قلت ہے. جو دس تک بولی جا سکتی ہے. اور وہ سات دن اس لئے کہتے تھے. کہ بنی آدم کی زندگی کل سات ہزار سال ہے. اور قیامت کا ایک دن ایک ہزار برس کے مقابلہ میں ہے. قرآن کریم بھی فرماتا ہے. وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ اس حساب سے ہم کو سات دن آگ پہنچے گی بعض نے کہا. کہ اس سے چالیس دن مراد ہیں. کیونکہ اسی قدر انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی. اور ایام اگرچہ جمع قلت ہے. مگر مجازاً. دس سے زیادہ پر بھی بولا جاتا ہے جیسے کہ قرآن کریم نے ماہ رمضان کے بارے میں فرمایا. اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ بعض نے فرمایا. چالیس سال جسقدر کہ وہ میدان تیہ میں پریشان رہے بعض یہودی کہتے تھے. کہ جہنم کے دو کناروں میں چالیس سال کا فاصلہ ہے جب ہم جہنم میں جائیں گے. تو وہاں ٹھہریں گے نہیں بلکہ اپنے باپ دادوں کی شفاعت کے زور سے گزرتے رہیں گے. اور چالیس برس میں اس فاصلہ کو طے کریں گے بعض یہودی کہتے تھے. کہ ہر شخص کو بقدر گناہ عذاب ہوگا یعنی بلوغ کے بعد جتنے دن اس نے گناہ یا کفر کیا اتنے ہی دن اسے عذاب رہیگا. کیونکہ گناہ سے زیادہ عذاب دینا ظلم ہے. اور خدا اس سے پاک ہے. بعض کہتے تھے. کہ روح اصل میں پاک صاف نورانی ہے برے کاموں سے کچھ مکدر ہو جاتی ہے. مرنے کے بعد اس پر کچھ روز گناہوں کا غبار رہتا ہے اسی کا نام عذاب ہے. اور پھر وہ صاف ہو کر اپنی اصلی حالت پر آجاتی ہے جیسے کہ پانی اصل میں ٹھنڈا ہے. مگر آگ پر رکھنے سے گرم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد بھی کچھ دیر گرم رہتا ہے. پھر خود بخود ٹھنڈا ہو جاتا ہے بعض کہتے تھے کہ ہم خدا کے پیارے اور اس کے بیٹے ہیں. ہم کو وہ ہرگز عذاب نہ دیگا. بلکہ پیارے باپ کی طرح کچھ وقت بطور تنبیہ سزا دے دیگا. بعض کہتے تھے. کہ گناہوں کی طرح کفر کا عذاب بھی دائمی نہیں. بلکہ کافر کی بھی آخر میں نجات ہے. سبحان اللہ قرآن کریم نے اُن کی اتنی بکواس کو ایک لفظ میں بیان فرما دیا یہ تو اِن کا عقیدہ تھا. اب اُن کی کیا ہی نفیس تردید فرمائی جاتی ہے. **قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا.** اے محبوب ان سے پوچھو تو کہ کیا تم نے اس کا خدا سے کوئی وعدہ یا پروانہ لے رکھا ہے. یعنی آخرت کی باتیں عقل وقیاس سے معلوم نہیں ہو سکتیں اس کیلئے نقل اور سننے کی ضرورت ہے. جو کہ انبیاء کرام سے ہی حاصل ہو سکتا ہے. تو کیا تم نے توریت وغیرہ میں کہیں یہ ہمارا عہد پڑھا ہے. لاؤ کتاب دکھاؤ. اور یقیناً کسی آسمانی کتاب میں تو یہ نہیں خیال رہے. کہ اَتَّخَذْتُمْ میں دو ہمزہ تھے. ایک استفہامیہ اور دوسرا باب افتعال کا مگر پہلے کی وجہ سے دوسرا گر گیا. اور یہ استفہام انکاری ہے نیز یہاں عہد سے مراد فقط خبر ہے. کیونکہ رب کی خبر بھی عہد کی طرح پختہ ہوتی ہے. اور عِنْدَ اللّٰهِ ثابت کا ظرف بن کر عہد کا حال ہے. یعنی کیا تم نے کوئی عہد لیا ہے. جو اللہ کے

نزدیک ثابت ہو۔ فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ۔ یہ یا تو چھپی شرط کی جزاء ہے۔ اور یا عہد کا نتیجہ یعنی اگر تم نے عہد لیا ہے۔ تو خدا ہرگز
اس کے خلاف نہ کرے لیکن یہ شرط تو غلط ہی تو جزا بھی ختم یا یہ مطلب ہے کہ کیا تم نے خدا سے عہد لے لیا ہے کہ اس کے خلاف نہ کرے یعنی نہ وہ ہے نہ یہ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ یا اللہ پر تم وہ بات کہتے ہو جس کو تم جانتے نہیں اس جگہ کی دو تفسیریں ہیں۔ ایک یہ کہ آخرت کی باتیں نبی کے فرمان سے معلوم ہوتی ہیں نہ کہ اپنی رائے سے
اور تم نے یہ باتیں رائے سے کہی ہیں۔ لہٰذا اسکا اعتبار نہیں کیونکہ ان چیزوں میں عقل علم کا ذریعہ نہیں دوسری تفسیر یہ ہے کہ انکا خیال یہ ہوتا کہ حق تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام
سے عہد کیا ہے۔ کہ میں تمہارے بیٹوں کو عذاب نہ کرونگا۔ مگر قسم پوری کرنے کیلئے اس بناء پر یہودی کہتے تھے۔ چونکہ ہم بھی اُن کی اولاد ہیں۔ لہٰذا ہم کو بھی
ایسا ہی عارضی عذاب ہوگا۔ اوّل تو اس واقعہ کی معتبر سند تمہارے پاس موجود نہیں پھر تم نے اس پر یقین کیسے کر لیا۔ دوسرے اگر یہ صحیح بھی ہو۔ تو
یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں سے مراد اُن کے اپنے صلبی بیٹے ہیں۔ نہ کہ سارے بنی اسرائیل تیسرے اُن بیٹوں کو عذاب نہ کرنیکی یہ وجہ ہے۔ کہ
انہوں نے خطا کر کے اپنے والد اور خود یوسف علیہ السلام سے معافی چاہ لی۔ اور ان صاحبوں نے ان سب کیلئے دعاء مغفرت بھی کر دی جس سے کہ حق اللّٰہ
اور حق العباد دونوں اِن سے معاف ہو گئے۔ اور وہ بخش دیئے گئے۔ اے اسرائیلیو تم کفر و گناہ پر تو قائم ہو۔ اور اللہ اور بندوں کے حق مار رہے ہو۔
اور پھر بھی اپنے کو اس بشارت میں داخل سمجھتے ہو۔ ہاں اُن کی طرح توبہ کر لو۔ تو تم بھی بخش دیئے جاؤ گے۔ اے اسرائیلیو کیا تم اللہ پر وہ بات کہتے
ہو جس کی تم نے تحقیق بھی نہیں کی اور جس کا تم نے مطلب بھی صحیح نہ سمجھا۔ بَلٰی یہ حرف نفی کے جواب کا ہے یعنی نفی کے بعد آتا ہے۔ اور نفی کا ثبوت
کرتا ہے۔ اور نعم یا تو ایجاب کے بعد آتا ہے۔ یا نفی کو ثابت کرتا ہے یعنی ہاں تم کو عذاب دائمی ہوگا جیسے کہ رب نے ارشاد فرمایا تھا کہ اَلَسْتُ
بِرَبِّكُمْ۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ جب سب نے عرض کیا تھا۔ بَلٰی یعنی ہاں تو رب ہے۔ اگر وہ جواب میں نعم کہتے تو معنی ہوتے کہ ہاں تو رب نہیں
مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً۔ جو کوئی بھی گناہ کرے یا تو سیئۃ سے مراد مطلق گناہ ہے۔ یا گناہ کبیرہ اور یا کفر (روح البیان وعزیزی) اور اس کے
نکرہ ہونے سے عموم کا فائدہ ہوا یعنی جو بھی کسی قسم کا کفر کرے یا کوئی سا گناہ۔ یا کوئی سا گناہ کبیرہ کرے مگر حال یہ ہو کہ وَاَحَاطَتْ بِهٖ
خَطِيْٓئَتُهٗ۔ اس کا گناہ اُس کو گھیرے اور احاطہ کرے۔ اگر سیئۃ سے مراد کفر تھا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ وہ کفر اس کے دل اور دماغ اور
زبان کو گھیر لے یعنی وہ دل میں کفر کا عقیدہ رکھے اور زبان سے اس کا اظہار کرے لہٰذا مجبوراً منہ سے کلمہ کفر نکالنے والا، وہ اس سے خارج
ہے۔ یا یہ کہ وہ کفر اس کی زندگی کو گھیر لے اور اس کا خاتمہ اس کفر پر ہو جو کافر مرنے سے پہلے مسلمان ہو گیا۔ وہ اس میں داخل نہیں کیونکہ کفر نے
اس کی زندگی نہ گھیری اور اگر سیئۃ سے مراد گناہ ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ گناہ اس کے دل دماغ اور ظاہری اعضا کو گھیرے اس طرح
کہ ہاتھ پاؤں سے گناہ کرے اور دل سے اسے حلال جانے لہٰذا گنہگار مسلمان اس میں داخل نہیں کیونکہ اس کا دل گناہ سے بچا ہوا ہے۔ یا وہ
گناہ اس کی ساری نیکیوں کو گھیرے اور اُن کو ضائع کر دے یعنی گناہ حد کفر تک پہنچ جائے جس سے نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ
وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ بہرحال اس سے کفر مراد ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ پس یہی لوگ آگ والے ہیں۔ اگرچہ کچھ روز گنہگار بھی دوزخ
میں رہیں گے لیکن وہ آگ والے نہیں۔ آگ والا تو وہ ہے جس کی خاطر آگ بنی اور آگ اس کو لازم ہو جائے۔ اگرچہ بعض کفار جہنم کے ٹھنڈے
طبقے میں بھی رہیں گے۔ لیکن چونکہ وہاں کی ٹھنڈک آگ کی وجہ سے ہی پیدا ہوگی۔ اس لئے وہ بھی آگ والے ہی ہیں۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ حقیقت
میں اصحاب النار کا ترجمہ ہے۔ یعنی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ چونکہ گناہ نے اُن کو گھیر لیا تھا۔ اس لئے عذاب اُن کے سارے وقتوں کو گھیر
لے گا۔ خلاصہ تفسیر۔ ان یہود کے تمام بے عملیوں کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہمیں چند روز ہی تو عذاب ہوگا۔ اور اس کے بعد آگ ہم کو
چھوئے گی بھی نہیں۔ لہٰذا ہم جو چاہیں سو کر لیں اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے اتنا تو پوچھیں کہ تم نے کوئی خدا سے اس قسم کا معاہدہ کر لیا
ہے جس کے وہ خلاف نہ کرے یا ویسے ہی اس کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کی تمہارے پاس کوئی علمی سند نہیں آخرت کے معاملہ میں
محض قیاس کو دخل نہیں۔ ہاں یقیناً تم جہنم میں ہمیشہ رہو گے۔ کیونکہ ہمارا یہ قانون ہے کہ جو شخص قصداً گناہ کرے۔ اور وہ گناہ اس کے ظاہر و

باطن کو گھیرے یا جو شخص کفر کرے۔ اور اس پر ہی اس کا خاتمہ ہو جائے۔ وہ دوزخی ہے۔ اور وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ یہاں عہد سے مراد کلمہ طیبہ ہے جو شخص صدق دل سے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے۔ اور اسی پر اس کا خاتمہ ہو۔ رب تعالیٰ کا اس سے بخشش کا وعدہ ہے۔ اب آیت کی تفسیر یہ ہوئی کہ اے یہودیو تم جو کہتے ہو کہ ہم کو چند روز عذاب ہو کر ختم ہو جاوے گا۔ تو کیا تم کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے ہو۔ کیونکہ عذاب کے بعد بخشش ہونا گنہگار مسلمانوں کیلئے ہے۔ جب تم نے اسلام قبول نہ کیا۔ تو یہ غلط امید کیوں رکھتے ہو۔ تم تو ہمیشہ ہی دوزخ میں رہو گے۔ کیونکہ تم کافر ہو (تفسیر عزیزی) **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** رب سے بے خوفی یا ناامیدی انسان کو گناہ پر دلیر کرتی ہے۔ جیسا کہ ان یہود کی حالت سے معلوم ہوا۔ مسلمان کیلئے رب کا خوف اور اس سے امید ضروری ہے۔ **دوسرا فائدہ** وعدہ خلافی عیب ہے۔ اور رب تعالیٰ ہر عیب سے پاک لہٰذا وہ وعدہ خلافی اور جھوٹ سے پاک ہے علماء کرام فرماتے ہیں۔ کہ جھوٹ شان خدائی کے خلاف ہے۔ دیوبندی رب کا جھوٹ بولنا وعدہ خلافی کرنا ممکن مانتے ہیں جس کے معنی یہ ہوئے۔ کہ اس سے سلب الوہیت ممکن ہے۔ ہم اس مسئلہ کی تحقیق اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کی تفسیر میں کر چکے وہاں دیکھو **تیسرا فائدہ** بے دلیل بات قابل قبول نہیں حق تعالیٰ نے یہود کی بے دلیل بات رد فرما دی **چوتھا فائدہ** ممکن چیز کے ہونے یا نہ ہونے کیلئے نقلی دلیل چاہیے محض قیاس سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا (تفسیر کبیر)

**پانچواں فائدہ** جو کفر پر مر اوہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا اس کی بخشش ناممکن ہے اسی لئے اس کیلئے دعاء مغفرت کرنا اسے مرحوم وغیرہ کہنا سخت منع ہے۔ اور مسلمان خواہ کیسا ہی مجرم ہو آخر کار اس کی بخشش ضرور ہو گی۔ وہ دوزخ میں ہمیشہ نہ رہے گا **چھٹا فائدہ** قطعی گناہ کو جائز جاننا کفر ہے۔ جیسا کہ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ کی تفسیر سے معلوم ہوا **مسئلہ** گنہگار مسلم کے متعلق بہت سے قول ہیں۔ خارجی اس کو کافر جانتے ہیں معتزلی کہتے ہیں۔ کہ وہ نہ مومن ہے۔ نہ کافر بعض کے نزدیک کفار کی طرح وہ بھی ہمیشہ دوزخ میں رہیگا۔ اور بعض نے بہت تفریط کی وہ کہتے ہیں۔ کہ آخر کار کافر کی بھی بخشش ہو جائے گی۔ فرقہ مرجیہ کہتا ہے۔ کہ ایمان کے ہوتے گناہ مضر نہیں۔ انسان ایمان درست کر کے جو چاہے عمل کرے یہ تمام اقوال باطل ہیں۔ مذہب اہل سنت یہ ہے۔ کہ گنہگار مسلمان ہے۔ اس کی نماز جنازہ پڑھی جاوے۔ اس کی تجہیز و تکفین کیجاوے۔ اور وہ جہنم میں ہمیشہ نہ رہیگا۔ بعض بغیر سزا اور بعض کچھ سزا پا کر آخر نجات پا جاوینگے۔ نیز ایمان کے ساتھ اعمال کی بھی سخت ضرورت ہے۔ کوئی بھی اعمال سے بے پرواہ نہیں۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ اس سے خارجی و معتزلہ مذہبوں کی تردید ہو گئی۔ نیز فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا اس میں مذہب مرجیہ کا ابطال ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ مذہب مرجیہ ختم ہو چکا ہے۔ یہ مذہب موجود ہے۔ مگر اب اس کا نام دوسرا ہے چنانچہ پنجاب میں "دتہ شاہی" مذہب پھیل رہا ہے۔ عام ملنگ فقیر بھنگی چرسی اس عقیدے میں گرفتار ہیں۔ کہ ایمان کے ساتھ اعمال کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ دن رات بھنگ چرس میں مست ہیں بعض بے دین پیر لوگوں کو اس شرط پر مرید کرتے ہیں۔ کہ وہ نماز چھوڑ دیں۔ یہ سب درحقیقت مرجیہ ہی ہیں۔ حدیث پاک میں ان کے متعلق ارشاد ہوا۔ کہ میری امت کے دو گروہ ایسے ہوں گے جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔ ایک مرجیہ دوسرا قدریہ حق تعالیٰ ان سب فرقوں سے محفوظ رکھے اور مذہب اہل سنت پر خاتمہ نصیب فرما دے آمین۔ **پہلا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ قیاس کرنا سخت گناہ بلکہ کفر ہے۔ کیونکہ یہود نے قیاس سے اپنا چند روزہ عذاب مانا اور آیت نے ان کی سخت تردید کر دی اور حنفی شافعی وغیرہ تمام مقلدین قیاس کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ سب گمراہ ہیں (غیر مقلد) **جواب** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہودیوں نے عقائد میں قیاس کیا یہ واقعی ناجائز ہے مقلدین فروعی اعمال میں قیاس کرتے ہیں۔ نہ کہ عقائد میں دوسرے یہ کہ یہود نے خبر میں قیاس کیا۔ کہ قیامت میں ہماری بخشش ہو جاوے گی۔ اور خبر میں قیاس نہیں ہو سکتا اس کے لئے نقلی دلیل ضروری ہے۔ ہم لوگ احکام شرعیہ میں قیاس کرتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ انہوں نے نص کے مقابل قیاس کیا توریت نے کفار کی بخشش کا انکار کیا۔ انہوں نے قیاس سے اس کو ثابت کیا اور نص کے مقابل قیاس کرنا حرام ہے۔ ان کا حال شیطان کا سا ہوا۔ ہم ایسا قیاس نہیں کرتے۔ جہاں نص نہ ہو وہاں مجبوراً قیاس ہوتا ہے۔ چوتھے یہ کہ ان کا [illegible] فلسفی قیاس آرائی تھی کسی آیت سے اس کی تائید نہیں تھی ہمارا قیاس شرعی ہوتا ہے جس کی آیت

یا حدیث سے تائید ہوتی ہے۔ پانچواں یہ کہ اُن کا قیاس بلا ضرورت تھا۔ ہمارا قیاس شرعی ضرورت پوری کرنے کیلئے ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ قیاس طبعی دنیوی تھا۔ یہ قیاس دینی۔ کوئی غیر مقلد بغیر قیاس زندہ نہیں رہ سکتا۔ فرق اتنا ہے۔ کہ ہم مجتہدین کا قیاس لیتے ہیں۔ اور وہ جہلا اور گمراہوں کا گویا ہم لوگ اماموں کے مقلد ہیں وہ نفس اور شیطان کے۔ **دوسرا اعتراض**۔ واقعی کافر کو ہمیشہ دوزخ میں رکھنا ظلم ہے۔ سزا گناہ کے مطابق چاہیئے نہ کہ ہمیشہ۔ **جواب** اس کے بھی چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ قانون سے زیادہ سزا دینا واقعی ظلم ہے۔ اور قانونی سزا عین انصاف۔ رب کا قانون یہ ہے۔ کہ حکومت الٰہیہ کے باغی یعنی کافر کی سزا ہمیشہ جہنم ہے۔ لہٰذا یہ ہمیشگی ظلم نہیں۔ چور آدھے گھنٹے میں چوری کرتا ہے۔ اور دو چار دن میں چوری کا مال کھا پی لیتا ہے۔ مگر اُس کو سات یا دس سال کی جیل ہوتی ہے۔ ڈاکو کو عمر قید ہوتی ہے۔ وہاں کوئی نہیں کہتا۔ کہ اُس نے ایک گھنٹے میں جرم کیا۔ اُس کو ایک گھنٹہ ہی جیل میں رکھو بلکہ قانون نے چونکہ اُس کی سزا یہی رکھی ہے۔ لہٰذا یہ عین انصاف ہے۔ ہاں جو حاکم قانون سے زیادہ سزا دے وہ ظالم ہے۔ اُس کی اپیل وغیرہ ہو سکتی ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کافر نے رب کی بے انتہا نعمتیں کھا کر بے انتہا نافرمانی یعنی بغاوت کی۔ چاہیئے کہ اُس کو بے انتہا سزا دی جاوے آج بھی باغی کی سزا عمر قید یا پھانسی ہے۔ مگر چونکہ وہاں موت نہیں اسلئے اُس سزا کی انتہا نہیں۔ اور یہاں موت اس زندگی کی انتہا ہے اسلئے اس سزا کی انتہا

تیسرے یہ کہ کافر اگر ہمیشہ زندہ رہتا تو ہمیشہ ہی کفر کرتا۔ اور اگر دوبارہ بھی واپس کیا جاوے۔ تو بھی کفر ہی کرے۔ چونکہ اُس کی سرکشی بے حد ہے۔ لہٰذا سزا بھی بے حد۔ قرآن کریم فرما رہا ہے۔ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ عادی ڈاکو کی سزا پھانسی یا عمر قید ہے۔ بولو پنڈت جی تمہارے دھرم کا قانون ہے۔ کہ جو چوری کرے وہ ۷ بار ہاتھی کی جون میں آوے کہو اُس نے جرم تو صرف ایک گھنٹہ کیا۔ اور اُس کی سزا میں کم از کم سات سو سال تک ہاتھی بنا یہ جرم سے زیادہ سزا ہوئی یا نہیں اور یہ ظلم ہوا کہ نہیں۔

**تیسرا اعتراض**۔ روح ایک پاک چیز ہے جسم کے گناہ سے عارضی ناپاکی اُس میں آگئی۔ تو چاہیئے۔ کہ مرنے کے بعد جب یہ ناپاکی جاتی رہے تب اُس کو نجات ہو جاوے (علی گڈھی)۔ **جواب**۔ کفر و شرک ایسی گندگی ہے جس سے روح اصلاً گندی ہو کر ناقابل اصلاح ہو جاتی ہے جیسے کہ لوہا اور صاف شیشہ زنگ سے ناقابل اصلاح ہو جاتا ہے۔ اب بھی بعض عادات و اخلاق سے انسان قابل اصلاح نہیں رہتا۔ لہٰذا ایسی گندہ روح کو عذاب دائمی ہی ضروری ہے۔ کفر کے سمیت نے اس کی اصل بگاڑ دی **چوتھا اعتراض** چاہیئے کہ روح کو سزا نہ ملے۔ کیونکہ جرم جسم نے کیا ہے گناہ اعضاء سے ہوتے ہیں۔ صرف جسم ہی کو سزا ہونا چاہیئے (جہلاء)۔ **جواب**۔ ایک اندھا لنگڑے کو کندھے پر لیکر باغ میں چوری کرنے گیا۔ لنگڑے نے پھل توڑے اندھے نے وہاں تک پہنچایا۔ مالک نے ان دونوں کو پکڑ لیا تو دونوں ہی کی جوتہ کاری کریگا۔ کیونکہ دونوں مجرم ہیں جسم لنگڑا ہے۔ اور روح اندھی ان دونوں نے مل کر رب کے احکام کے باغ کی چوری کی ہے۔ لہٰذا دونوں عذاب کے مستحق ہیں جسم بغیر روح کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اور روح بغیر جسم مجبور تھی۔ (اعلیٰحضرت قدس سرہٗ) نیز جسم بغیر روح عذاب نہیں پا سکتا۔ کیونکہ تکلیف کا احساس روح سے ہوتا ہے۔ اسلئے روح کو عذاب ضروری ہے۔

**تفسیر صوفیانہ** روح کا تعلق جسم سے بھی ہے۔ اور دل سے بھی۔ مگر بمقابلہ جسم دل سے قوی تعلق ہے۔ لہٰذا جسمانی گناہ سے روح پر عارضی غبار آ جاتا ہے جو کہ دنیا میں نیک اعمال اور آخرت میں شفاعت یا کچھ سزا سے صاف ہو جاتا ہے لیکن قلبی گناہ یعنی کفر اور شرک سے روح کی اصلی صفائی جاتی رہتی ہے۔ اور اس سے روحانی اخلاق حلم و کرم مروت غیرت شکر و صبر وغیرہ نکل کر اس میں حیوانی بلکہ شیطانی صفات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کی صیقل صرف کلمہ طیبہ اور درستگی عقائد ہیں۔ اگر دنیا ہی میں یہ صیقل کر لی گئی تو خیر ورنہ آخرت میں اس کی اصلاح ناممکن ہے۔ اور اُس کی سزا دائمی عذاب ہے۔ علماء بنی اسرائیل ان دو مرتبوں میں فرق نہ کر سکے۔ اور دونوں کو یکساں سمجھ بیٹھے۔ دیکھو روح کا تعلق بال ناخن ہاتھ پاؤں اور دماغ و دل سبھی سے ہے مگر مختلف کہ ناخن اور بال کاٹنے سے روح کو تکلیف بھی نہیں ہوتی۔ اور دوسرے اعضاء کے بیکار ہو جانے سے اس کو تکلیف تو ضرور ہوتی ہے مگر موت نہیں واقع ہوتی۔ لیکن دل و دماغ پر آفت آجانے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ روح ایک ہے۔ مگر اس کے تعلقات مختلف ان یہودیوں نے دل و دماغ (عقائد) کو بال وغیرہ (اعمال) پر قیاس کر لیا۔ اسی کی تردید فرما دی گئی بادشاہ کا تعلق چوکیدار سے بھی ہے۔ اور وزیر اعظم سے بھی لیکن وزیر کے

بگڑنے سے سلطنت جاتی رہے گی نہ کہ چوکیدار کے بگڑنے سے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۸۲)

ع ۹ | ۱۱

اور وہ جو ایمان لائے اور کیا انہوں نے نیکیوں کو یہ لوگ جنت والے ہیں۔ وہ لوگ بیچ اسکے ہمیشہ رہنے والے ہیں

اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے وہ جنت والے ہیں۔ انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے۔

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ پہلا تعلق اس سے پہلے دائمی جہنمیوں کا ذکر ہوا تھا۔ اب دائمی جنتیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ کیونکہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ دوسرا تعلق اس سے پہلے جہنم میں پہنچانیوالے عیوب بتائے گئے تھے۔ اب جہنم سے بچانے والے صفات کا ذکر ہے۔ تاکہ لوگ اُن سے بچیں اور یہ صفتیں اختیار کریں۔ تیسرا تعلق اس سے پہلے علماء یہود کی غلط بیانی بتا کر اس کی تردید کیگئی۔ اب اس غلط بیانی کی وجہ بتائی جارہی ہے۔ اور فرمایا جارہا ہے۔ کہ توریت وغیرہ میں مومنین کیلئے وعدہ مغفرت کیا گیا تھا۔ نہ کہ کفار کیلئے اِن بے وقوفوں نے کفار کو بھی اس میں داخل سمجھ لیا۔ یہ آیت بھی بَلٰی کی تحت میں ہے۔ چوتھا تعلق اس سے پہلے رب کے قہر کا ذکر ہوا تھا۔ اب اس کی رحمت کا ذکر ہے۔ تاکہ سننے والوں کو خوف و امید حاصل ہو جس پر ایمان کا دارومدار ہے۔ **تفسیر** وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا جو لوگ کہ علم الٰہی میں مومن ہیں۔ یا وہ جو کہ خاتمہ کے وقت ایمان پر رہے۔ یا وہ جن کو ایمان معتبر نصیب ہوا۔ اور اُس کے ساتھ ہی وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ انہوں نے شائستہ اعمال بھی کئے یعنی بقدر طاقت عبادات معاملات میں درست رہے بقدر طاقت کی۔ اس لئے قید لگائی کہ بعض مومنین کو اعمال کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ جیسے کہ دیوانے اور نابالغ بچے اور وہ جو کہ ایمان لاتے ہی مرجائیں اور موقعہ پانے والوں میں بھی مختلف لوگ ہیں مساکین صرف نماز روزہ کا ہی موقعہ پاتے ہیں۔ مالدار حج اور زکوٰۃ کا بھی وغیرہ وغیرہ یہ لفظ اِن سب کو شامل ہے۔ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یہی لوگ جن کے دل نور ایمانی سے روشن اور بدن گناہوں کی گندگی سے پاک ہیں وہ جنت والے ہیں یعنی جنت اُنکو لازم ہے۔ اور وہ دوزخ میں کبھی جائیں گے ہی نہیں خیال رہے کہ نیک اعمال کی قید جنت والا ہونے کیلئے ہے کیونکہ گنہگار مسلمان اگرچہ جنت میں پہنچ تو جائیں گے۔ لیکن اُن کا جنت والا ہونا یقینی نہیں۔ جنت والا وہ ہے۔ جو شروع سے جنت میں جائے۔ سزا بالکل نہ پائے۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے یعنی جیسے کہ پہلے فرقہ کی سزا دائمی ہے۔ کیونکہ اس کے پاس نہ ایمان ہے۔ نہ نیک عمل ایسے ہی اس فرقہ کی جزا دائمی کیونکہ اس کے پاس ایمان بھی ہے۔ اور نیک عمل بھی **خلاصہ تفسیر** لوگ چار قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو ایمان اور اعمال دونوں سے خالی ہیں۔ اُن کا ذکر پہلی آیت میں ہوا۔ کہ وہ ہمیشہ کے جہنمی ہیں۔ دوسرے وہ جو کہ ایمان اور نیک اعمال دونوں رکھتے ہیں۔ اُن کا ذکر اس آیت میں ہوا۔ کہ وہ ہمیشہ کے جنتی ہیں۔ دو فریق باقی بچے ایک وہ جن کا ایمان درست اور اعمال خراب یعنی فاسق مسلمان چونکہ یہ اگلے دونوں فریقوں سے ملے ہوئے ہیں۔ کہ عقیدہ میں مسلمانوں کے اور اعمال میں کفار کے مشابہ ہیں۔ لہٰذا ان کی جزا بھی دونوں فریقوں کی جزا سے ملی ہوگی۔ یعنی کچھ دن جہنم میں رہیں گے۔ پھر جنت میں یہ نہ ہوگا۔ کہ جنت میں رہ کر پھر دوزخ میں آئیں۔ کیونکہ وہاں کس کو سربلند کرکے گرانا رب کی حکمت کے خلاف ہے۔ ہاں گرے کو اٹھانا عین کرم ہے۔ نیز وہ قلب سے مسلمان تھے اور قالب سے کفار کے مشابہ اور قلب قالب سے اعلیٰ ہے۔ لہٰذا قالب کے جرم پر عارضی سزا پائیں گے۔ اور قلب کی درستی کیوجہ سے بعد کو دائمی بہشت خیال رہے۔ کہ یہ قانونی سزا ہے۔ لیکن اگر رب کرم خسروانہ یا بزرگوں کی شفاعت سے اُس کو بالکل بخش دے تو اُس کی رحمت ہے۔ چوتھا وہ گروہ جو عقیدہ میں کافر مگر اُن کے بعض اعمال اچھے جیسے صدقہ و خیرات کرنیوالے کفار۔ اُن کے متعلق خواہ تو یہ کہہ لو۔ کہ جو کچھ انہوں نے دنیا میں کھا پی لیا۔ اور آرام پالیا۔ وہ اُن کے اعمال کا بدلہ ہوگیا۔ آخرت میں اُن کیلئے دائمی جہنم کیونکہ وہ قالب سے نیک تھے۔ جو کہ عارضی چیز ہے۔ اور قلب سے بد اور قلب اصلی اسی طرح دنیا میں جو

کہ عارضی مقام ہے۔ ان کو جزا دے دی گئی۔ اور آخرت میں جو کہ اصلی مقام ہے۔ سزا پائی یا یوں کہو۔ کہ کافر کا کوئی عمل نیک ہوتا ہی نہیں کیونکہ نیک اعمال کیلئے ایمان شرط ہے۔ لہٰذا ان کے صدقہ اور خیرات کو عمل صالح نہیں کہہ سکتے اگرچہ بظاہر صالح معلوم ہوتے ہیں جیسے لکڑی کا گھوڑا اور قالین کا شیر کہ یہ اصلی گھوڑے اور شیر کے ہم شکل تو ہیں۔ مگر حقیقتاً نہ گھوڑا ہیں۔ نہ شیر اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا۔ کہ کفار کے اعمال اس سفید چمکدار ریتے کی طرح ہیں جس کو پیاسا دور سے دیکھ کر پانی سمجھتا ہے۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ پہلا فائدہ یہ کہ ایمان نیک اعمال پر مقدم ہے کیونکہ یہ شرط ہے۔ دوسرا فائدہ یہ کہ ایمان کے بغیر جنت نہیں مل سکتی۔ لیکن نیک اعمال کے بغیر جنت تو ملے گی۔ مگر اس کا عذاب سے بچ جانا یقین نہیں ممکن ہے۔ کہ پہلے کچھ عذاب ہو جائے لہٰذا اعمال سزا سے بچنے کے لئے ضروری ہے نیز ایمان سے جنت ملیگی اور اعمال سے وہاں کے درجات تیسرا فائدہ جنت میں پہنچ کر کوئی نہ نکلیگا۔ مگر جہنم سے بہت مخلوق نکلے گی۔ **پہلا اعتراض** جس طرح بدکار مسلمان کو کچھ روز جہنم میں رکھ کر جنت میں بھیجا جائیگا۔ اسی طرح چاہیئے تھا۔ کہ نیک کافر کو کچھ روز جنت میں رکھ کر جہنم میں بھیجا جاتا **جواب** اس کا نہایت نفیس جواب خلاصہ تفسیر میں گذر چکا۔ آپ اپنے عمدہ قالین پر گندے پاؤں والے کو نہیں آنے دیتے رب تعالیٰ بھی اپنے جنت کے قالین پر کافر کی گندی روح کو کیوں آنے دے۔ **دوسرا اعتراض** اس کی کیا وجہ ہے۔ کہ بعضے مسلمان تو سزا پا کر جنت میں جائیں گے۔ مگر بعض کی ویسے ہی بخشش ہو جائیگی **جواب** مقصود تو یہ ہے۔ کہ کوئی میلی روح جنت میں نہ پہنچے پہلے ہی اس کو پاک کر دیا جائے جس طرح دنیا میں ہم کسی چیز کو پانی سے پاک کرتے ہیں کسی کو آگ میں رکھ کر اسی طرح پروردگار کسی گناہ گار مسلمان کو رحمت کے پانی سے اور کسی کو دوزخ کی آگ سے پاک کر کے جنت میں بھیجے گا۔ یہ وہ خود جانتا ہے۔ کہ کون کس لائق ہے **تیسرا اعتراض** پھر گندا شیطان آدم علیہ السلام کو بہکانے کیلئے جنت میں کیوں پہنچا۔ **جواب**۔ اس کا جنت میں پہنچنا یقینی نہیں جیسا کہ ہم آدم علیہ السلام کے قصے میں بتا چکے۔ کہ اس نے باہر رہ کر ہی اپنا کام کیا۔ اور اگر گیا بھی ہو تو وہ خدا کا بلایا ہوا نہ گیا۔ بلکہ خود چور کی طرح وہاں گھس پڑا۔ پھر وہاں سے نکالدیا گیا بلائے جانے میں اور خود گھس جانے میں بڑا فرق ہے۔ **چوتھا اعتراض** جب جنت ہمیشگی کی جگہ ہے تو آدم علیہ السلام وہاں سے کیوں باہر بھیجے گئے **جواب**۔ جب اعمال کی جزاء کے لئے جائیں گے تب وہاں ہمیشگی ہوگی آدم علیہ السلام کی وہ سکونت جزا کی نہ تھی۔ **تفسیر صوفیانہ** جو طالبین کہ مومن ہوں۔ اور شیخ طریقت کے اشارہ سے شریعت کے قانون کے مطابق ایسے نیک اعمال کریں جو حقیقت تک پہنچانے والے ہیں۔ وہ ان اصول پر عمل کر کے جنت وصول کے حصول میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور دیدار یار سے فیض یاب اور پھر وہ ہمیشہ اس میں سیر کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ اس راستہ کے منازل اور مقاصد کی اگرچہ انتہا ہے۔ لیکن ان کے سیر کی کوئی حد نہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا

اور جبکہ لیا ہم نے عہد اولاد سے یعقوب کی نہ پوجنا تم مگر اللہ کو اور ساتھ ماں باپ کے احسان کا

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ کیساتھ بھلائی کرو۔

وَّذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ

اور صاحب قرابت کیساتھ اور یتیموں کیساتھ اور غریبوں سے اور کہو تم واسطے لوگوں کے اچھی بات اور قائم کرو تم نماز کو

اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔ اور نماز قائم رکھو

وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۸۳)

اور دو تم زکوٰۃ پھر پھر گئے تم مگر تھوڑے تم میں سے اور تم منہ پھیرنے والے ہو

اور زکوٰۃ دو پھر تم پھر گئے مگر تم میں کے تھوڑے اور تم روگرداں ہو۔

**تعلق** ۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ پہلا تعلق اس سے پہلے بنی اسرائیل کے ایمان سے مایوسی کی چند وجہیں بیان ہو چکیں توریت کو بدل ڈالنا تھوڑی قیمت پر خدا کے احکام بیچ ڈالنا اور پھر بھی اپنے کو جنت کا حقدار جاننا۔ اب اس مایوسی کی ایک اور بڑی وجہ بیان فرمائی جارہی ہے۔ دوسرا تعلق پچھلی آیت میں علماء یہود سے مطالبہ تھا۔ کہ تم اپنے جنتی ہونے کا توریت سے ثبوت دو۔ وہ نہ دے سکے اب اسی توریت سے اُن کے جہنمی ہونے کا ثبوت دیا جارہا ہے۔ کہ تم نے توریت کے فلاں فلاں عہد توڑے اور حق تعالیٰ سے بدعہدی کرنے والا ہمیشہ کے عذاب کا مستحق ہے تیسرا تعلق پچھلی آیتوں میں جنتی اور جہنمی کی پہچانیں بتائی گئی تھیں۔ کہ کفار بدکار جہنمی اور مسلمان نیک کار جنتی ہیں اب فرمایا جارہا ہے۔ کہ اے یہود تم اپنے کو دیکھو کہ تم میں کون سی علامت ہے۔ تم میں جہنمیوں کی فلاں فلاں علامتیں ہیں۔ لہٰذا تم کبھی جنتی نہیں ہو سکتے۔ **تفسیر** وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۔ بنی اسرائیل سے پوری توریت شریف پر عمل کرنے کا عہد لیا گیا تھا۔ جسمیں یہ احکام بھی موجود تھے۔ لہٰذا ان کا بھی عہد ہو گیا۔ میثاق مضبوط عہد کو کہتے ہیں یعنی ہم نے بنی اسرائیل سے حسب ذیل چیزوں کا مضبوط عہد لیا۔ پہلے یہ کہ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ غیر خدا کی عبادت نہ کرو۔ یہ خبر بمعنی نہی ہے جس سے کہ اس میں بہت اہمیت پیدا ہو گئی جیسے ہم اپنے کسی فرمانبردار غلام سے کہیں۔ کہ تم فلاں جگہ جاؤ گے یعنی اس حکم کی مخالفت کرنی چاہیے ہی نہیں اور تم سے اس کا اندیشہ بھی نہیں۔ اسلئے بجائے حکم کے خبر دے رہا ہوں۔ خیال رہے کہ اس عبارت میں دو عہد ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کی عبادت کرو۔ دوسرے یہ کہ غیر کی نہ کرو اور ظاہر ہے۔ کہ رب کی عبادت درستی عقائد پر موقوف ہے۔ کہ اس کی ذات وصفات۔ اس کے پیغمبروں۔ اسکی کتابوں کو مان کر عبادت کی جائے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ عبادت وہ چاہیے۔ جو اس کے ہاں مقبول ہو۔ اور یہ انبیاء کرام کی تعلیم سے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس مختصر سی عبارت میں توحید رسالت کتاب ملائکہ اور ساری اعتقادیات پر ایمان لانے کا ذکر بھی آگیا۔ کیونکہ یہ چیزیں عبادت کی شرطیں ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ عبادت صرف نماز ہی کا نام نہیں بلکہ جو جائز کام رب کی رضا کے لئے کیا جائے۔ وہ عبادت ہے لہٰذا اس میں سارے عبادات بھی داخل ہو گئے۔ غرضکہ یہ دو لفظ سارے عقائد اور عبادات کا مجموعہ ہیں۔ بلکہ یوں کہو۔ کہ سارے علم کلام اور علم فقہ و احکام کو شامل ہیں چونکہ عقائد سارے اعمال پر مقدم ہیں۔ اس لئے پہلے اسکا ذکر فرمایا گیا۔ دوسرا عہد یہ کہ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا معاملات میں سے یہ پہلا عہد ہے۔ یہاں ایک فعل اَحْسِنُوْا یا تُحْسِنُوْنَ پوشیدہ ہے یعنی ماں باپ کیساتھ احسان کرو۔ یا کرو گے۔ رب تعالیٰ نے اپنی عبادت کیساتھ والدین کی اطاعت کا ذکر فرمایا۔ اس کی چند وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ ماں باپ اولاد کی پیدائش اور اس کی پرورش کا سبب ہیں۔ اور حق تعالیٰ کے فیض کا پہلا واسطہ جو نعمت بھی کسی کو ملے گی۔ پیدائش کے بعد ہی ملے گی۔ لہٰذا خدا کے بعد ماں باپ کا ہی احسان ہے۔ دوسرے یہ کہ ماں باپ کا انعام خدا کے انعام سے مشابہت رکھتا ہے۔ جیسے حق تعالیٰ بلا طمع بندوں کو پالتا ہے۔ ایسے ہی ماں باپ بغیر لالچ بچے کو پالتے ہیں۔ اور دوسرے محسن بدلے کی امید پر احسان کرتے ہیں۔ کفار ماں باپ جو قیامت جنت دوزخ کے منکر ہیں۔ انہیں ثواب کی بھی امید نہیں۔ مگر بچہ پالتے ہیں۔ لڑکیاں اور بے دست و پا لڑکے کے پالنے میں دنیوی لالچ بھی کوئی نہیں ہوتا۔ تیسرے یہ کہ حق تعالیٰ انسان کی پیدائش میں حقیقی مؤثر ہے۔ اور ماں باپ ظاہری مؤثر چوتھے یہ کہ حق تعالیٰ اپنے نافرمان بندے پر انعام کرنے سے ملول نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ماں باپ ناخلف اولاد کی خیر خواہی اور شفقت سے ملول نہیں ہوتے۔ پانچویں یہ کہ جس طرح مخلوق کے دو خالق نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح بچے کے دو ماں یا دو باپ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ سوتیلے ماں باپ حقیقت میں ماں باپ ہی نہیں۔ چھٹے یہ کہ ماں باپ کبھی بھی اولاد کی ترقی میں کمی نہیں کرتے اور کبھی ان پر حسد نہیں کرتے یہ انہیں کی خصوصیت ہے۔ ساتویں یہ کہ ماں باپ کی اطاعت سارے دینوں میں ضروری ہے۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ بلکہ ان سے محبت انسانوں کے علاوہ بے عقل حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ آٹھویں یہ کہ ہمیشہ ماں باپ اولاد کے ماں کو بڑھاتے ہیں۔ اور نقصان سے بچاتے ہیں۔ جیسے کہ رب تعالیٰ اپنے

بندے کے نیک اعمال کو بڑھاتا ہے۔ (تفسیر کبیر و عزیزی) ماں باپ کی اطاعت میں چند ہدائیتوں کا خیال رکھو۔ **پہلی ہدائیت** اگرچہ ماں اور باپ دونوں کی اطاعت لازم ہے۔ لیکن چونکہ ماں نے بچے کو اپنا خون پلا کر پالا ہے۔ اور باپ نے زر پلا کر اس لئے ماں کا حق الخدمت باپ سے سات گنا زیادہ ہے حدیث پاک میں ارشاد ہے۔ کہ تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے۔ دوسری روایت میں ہے۔ کہ جنت تمہاری ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ **دوسری ہدائیت**۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کافر ماں باپ کی بھی اطاعت اور تعظیم کرے۔ اس لئے کہ یہاں الوالدین میں ایمان کی قید نہیں لگائی گئی نیز اُن کی اطاعت حق پرورش کی وجہ سے ہے۔ اور یہ حق تو کافر ماں باپ میں بھی ہے۔ **تیسری ہدائیت** والدین کے ساتھ احسان تین قسم کا ہے۔ ایک یہ کہ اپنے قول و فعل سے اُن کو ایذا نہ پہنچائے۔ دوسرے یہ کہ اپنے بدن و مال سے اُن کی خدمت کرے تیسرے یہ کہ جب وہ بلائیں تو فوراً حاضر ہو جائے۔ پہلی اطاعت ہر حال واجب ہے۔ کہ ماں باپ کو ایذا دینے والا عاق اور نافرمان کہلاتا ہے۔ دوسری اطاعت جب واجب ہے کہ ماں باپ حاجتمند ہوں اور اولاد میں اطاعت کی قدرت ہو اگر انہیں حاجت نہیں یا اولاد میں طاقت نہیں۔ تو اس قسم کی اطاعت واجب بھی نہیں تیسری قسم کی اطاعت کی یہ شرط ہے۔ کہ اُن کی خدمت میں حاضر ہونے سے کوئی شرعی خرابی پیدا نہ ہو اگر نماز کا وقت جا رہا ہے۔ ادھر ماں باپ بلا رہے ہیں۔ تو اُن کے پاس نہ جائے۔ بلکہ پہلے نماز پڑھے **چوتھی ہدائیت** ماں باپ کیساتھ احسان کرنیکا طریقہ جو حدیث میں آیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ اُن سے دلی محبت رکھے بات چیت اور اُٹھنے بیٹھنے میں اُن کا ادب کرے۔ کہ راستہ میں اُن سے آگے نہ چلے۔ اور اُن کو نام لے کر نہ پکارے بلکہ ادب سے بلائے جہاں تک ہو سکے اپنا مال و جان اُن پر خرچ کرے۔ ہر کام اور ہر بات میں اُن کی رضا مندی کا خیال رکھے۔ اُن کے مرنے کے بعد اُن کی وصیت پوری کرے اور اُن کیلئے دعائے مغفرت کرے اور اُن کیلئے کبھی کبھی صدقہ و خیرات کرتا رہے ہر ہفتہ میں اُن کے قبر کی زیارت کرے۔ اور اگر ہو سکے تو سورۂ یٰسٓ پڑھ کر اُن کو بخشے۔ اُن کے دوستوں اور قرابت داروں سے محبت رکھے۔ بلکہ اُن کے ساتھ سلوک کرے۔ سعادتمند بچے اپنے ماں باپ کے دوستوں کو اُن کے بعد ماں باپ کی جگہ سمجھتے ہیں (تفسیر عزیزی) **پانچویں ہدایت** اگر ماں باپ گناہ کرنے کے عادی ہوں۔ یا کسی بدمذہبی میں گرفتار ہوں۔ تو اُن کو نرمی کیساتھ راہ راست پر لانے کی کوشش کرے **چھٹی ہدائیت** اگر ماں باپ کافر یا منافق بھی ہوں۔ تب بھی اُن کا حق مادری ادا کرے۔ اور اُن کے ساتھ نرمی سے برتاؤ کرے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے چچا آزر کی جو کہ سخت کافر تھا سختی کو برداشت کیا۔ اور اس سے نرم کلام بھی فرمایا۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا باپ ابو عامر سخت کافر تھا۔ آپ نے حضور علیہ السلام سے اُس کے قتل کی اجازت چاہی حضور علیہ السلام نے اجازت نہ دی (تفسیر کبیر و عزیزی) **ساتویں ہدائیت** جب ماں باپ کا اللہ رسول سے مقابلہ ہو جائے۔ تو اسوقت نہ ماں باپ کا لحاظ ہوگا۔ نہ اور قرابت دار کا مثلاً ایک جنگ میں بیٹا غازی بن کر اور باپ کافروں کی طرف سے آیا ہے۔ تو اب اس کے حق پدری کا لحاظ نہیں۔ کیونکہ اللہ رسول کا حق سب سے مقدم ہے۔ اسی لئے جنگ احد میں حضرت ابو عبیدہ ابن جراح نے اپنے باپ جراح کو قتل کیا اور جنگ بدر میں حضرت ابو بکر صدیق نے اپنے بیٹے عبدالرحمان کو جو اسوقت کافر تھے۔ اپنے مقابلہ کے لئے بلایا۔ اور حضرت علی اور حمزہ اور ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اپنے اہل قرابت عتبہ اور شیبہ اور ولید کو قتل کیا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جنگ بدر میں اپنے ماموں عاص ابن ہشام کو قتل کیا (تفسیر خزائن العرفان آخیر سورہ مجادلہ) جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے تھی کہ ہر مسلمان اپنے قرابت دار قیدی کو قتل کرے۔ اس کی قرآن کریم نے تائید فرمائی دیکھو سورہ انفال۔ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ کافر ماں باپ کی بھی اطاعت ضروری ہے۔ مگر جبکہ ان کا حق اللہ و رسول کے حق کے مقابل ہو جائے۔ تو اللہ رسول کا حق مقدم ہوگا صحابہ کرام کا اپنے کافر ماں باپ کی اطاعت کرنا یا انہیں قتل کرنا مختلف موقعوں کے لحاظ سے ہے۔ **وَذِي الْقُرْبٰى** اس کا والدین پر عطف ہے۔ اور قربیٰ بمعنی قرابت ہے۔ جیسے حسنیٰ بمعنی یعنی اپنے اہل قرابت کیساتھ احسان کرو۔ چونکہ اہل قرابت کا رشتہ ماں باپ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ اور ان کا احسان بھی ماں باپ کے مقابلہ میں کم ہے۔ اس لئے ان کا حق بھی ماں باپ کے بعد ہے۔ اسکے

بھی چند ہدائتیں ہیں. پہلی ہدائت. ذِی الْقُرْبٰی وہ لوگ ہیں جن کا رشتہ بذریعہ ماں باپ کے ہو. جسے ذی رحم بھی کہتے ہیں. یہ تین طرح کے ہیں. ایک باپ کے قرابت دار جیسے دادا. دادی چچا پھوپھی وغیرہ دوسرے ماں کے جیسے نانا. نانی. ماموں. خالہ. اخیافی بھائی وغیرہ تیسرے دونوں کے قرابت دار جیسے حقیقی بھائی بہن ان میں سے جس کا رشتہ قوی ہوگا. اسی کا حق مقدم لہذا اگر بھائی اور چچا حاجتمند ہوں تو پہلے بھائی کی خدمت کرے. اور اگر چچا اور ماموں حاجتمند ہوں تو پہلے چچا کی وغیرہ دوسری ہدایت اہل قرابت دو قسم کے ہیں. ایک وہ جن سے نکاح حرام ہے. انہیں کو ذی رحم محرم کہتے ہیں جیسے کہ چچا پھوپھی. یا ماموں خالہ وغیرہ. ضرورت کیوقت ان کی خدمت کرنا فرض ہے. کہ نہ کرنیوالا گناہگار ہوگا. دوسرے وہ جن سے نکاح حلال جیسے خالہ ماموں چچا کی اولاد. ان کے ساتھ احسان وسلوک کرنا سنت مؤکدہ ہے. اور بہت ثواب لیکن ہر قرابت دار بلکہ سارے مسلمانوں سے اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آنا ضروری از ان کہ ایذا پہنچانی حرام (تفسیر عزیزی) تیسری ہدائت سسرالی اور دودھ کے رشتہ دار ذی رحم نہیں ہاں ان میں سے بعضے محرم ہیں جیسے کہ ساس اور دودھ کی ماں اور بعض محرم بھی نہیں. اُن کے بھی حقوق ہیں. یہاں تک کہ پڑوسی کے بھی حق ہیں. مگر یہ لوگ اس آیت میں داخل نہیں. کیونکہ یہاں رحمی اور نسبی رشتہ والے مراد ہیں. وَالْیَتٰمٰی یہ جمع یتیم کی ہے. جیسے ندیم اور ندامٰی انسانوں میں یتیم وہ نابالغ بچہ ہے جس کا باپ مرجائے. اور جانوروں میں وہ چھوٹا بچہ جس کی ماں نہ ہو. اور جواہرات میں یتیم وہ موتی ہے جس کی مثل نہ ہو. اور سیپ میں اکیلا پیدا ہو یتیم کی جمع قاعدے سے یتمیٰ نہیں آنی چاہئے تھی. لیکن چونکہ یہ آفت زدہ ہے. اس لئے دوسرے آفت زدوں کی طرح اس کی جمع بھی لائی گئی. جیسے وجعٰی. حُباطٰی. خیال رہے کہ یتیم پر احسان دو طرح کا ہے. ایک یہ کہ اس کے مال کی حفاظت کریں. اس کے خوراک پوشاک کی خبر گیری رکھیں. اس کو علم و ادب سکھائیں. یہ اس کے اہل قرابت پر واجب ہے دوسرے یہ کہ اسے ایذا نہ دیں. اس کے ساتھ نرمی اور مہربانی کریں اس کو مجلسوں اور محفلوں میں اپنے پاس بٹھالیں. اس کے سر پر ہاتھ پھیریں اس کو اپنے بچوں کی طرح گود میں لیں اور محبت ظاہر کریں. یہ سب مسلمانوں پر لازم ہیں. کیونکہ جس بچے کا باپ مرگیا. سب مسلمان اس کے باپ ہیں **حکائیت** انجمن حمایت اسلام کے یتیم خانہ کی ایک یتیم لڑکی کا کسی سے نکاح کیا گیا. جس میں ڈاکٹر اقبال بھی بلائے گئے کسی نے مذاق سے دولہا سے کہہ دیا کہ آپ انجمن حمایت اسلام کے داماد. ڈاکٹر اقبال نے کہا. کہ نہیں. بلکہ مسلم قوم کے داماد. کیونکہ یہ بچی سارے مسلمانوں کی شرعی بیٹی ہے

**وَالْمَسٰکِیْنَ**. یہ مسکین کی جمع ہے. اور مسکین سکون سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ٹھہر جانا گویا کہ غریبی نے اس کو نقل و حرکت سے روک دیا فقیر وہ ہے جس کے پاس نصاب سے کم مال ہو. اور مسکین وہ ہے جس کی آمدنی خرچ سے کم ہو لہذا فقیر سے یہ بدتر ہے. اگر کسی کے پاس تھوڑا مال بھی ہو اور کچھ پیشہ بھی کرتا ہو مگر اس کے ضروریات نہ پورے ہوتے ہوں. تو بھی وہ مسکین ہے. سورہ کہف میں حضرت خضر کے قصہ میں ہے. کَانَتْ لِمَسٰکِیْنَ یَعْمَلُوْنَ فِی الْبَحْرِ دیکھو کشتی کو مسکین کہا گیا. حالانکہ اُن کے پاس کشتی تھی جس سے وہ کمائی کرتے تھے. **وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا**. یہ وَاِذْ اَخَذْنَا پر معطوف ہے یعنی ہم نے بنی اسرائیل سے کہا تھا. کہ تم لوگوں سے اچھی باتیں کہنا چونکہ ہر شخص کی بدنی اور مالی خدمت نہیں کی جاسکتی. لہذا ماں باپ وغیرہ کی تو مالی اور بدنی خدمت لازم کیگئی اور باقی لوگوں کی صرف قولی یعنی ان سے اچھا برتاؤ کرے. اس عبارت کی دو تفسیریں ہیں. پہلی تفسیر سیدنا عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے. کہ یہاں لوگوں سے عام لوگ مراد ہیں. اور اچھی بات سے نیکیوں کی رغبت اور بدیوں سے روکنا اور مطلب یہ ہے. کہ اے اسرائیلیو حضور علیہ السلام کی ثنا میں اچھی اور سچی بات کہو. اُن کے کمالات اور اوصاف بالکل نہ چھپاؤ. بلکہ ایمانداری سے سچ سچ کہہ دو (تفسیر خزائن العرفان) دوسری تفسیر یہ کہ ناس سے عام لوگ مراد ہیں. اور حُسْنًا سے عام سچی باتیں. یہاں بھی چند ہدائتیں ہیں. پہلی ہدائت جیسا آدمی ویسے ہی اس کے ساتھ اچھی بات. متقی مسلمان سے ادب و احترام کے ساتھ پیش آئے. ملاقات کے وقت سلام و مصافحہ کرے. نرم اور شیریں گفتگو کرے ناواقف مسلمان کو نرمی سے احکام شرعیہ بتلائے اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہ کرے.

**حکایت** ایک بزرگ نے کسی کو غلط وضو کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا. کہ بھائی میرا وضو دیکھ لے اگر کچھ غلطی ہو تو بتادینا. یہ کہہ کر اپنا وضو [illegible]

سمجھ گیا۔ ۳ عام مسلمانوں سے ملاقات میں دوستی ظاہر کرے۔ اُن کی مزاج پُرسی کرے۔ اُن کے رنج وغم میں شریک رہے۔ اُن کی دعوت میں شرکت کرے۔ اُن کو اچھے لقب اور اچھے نام سے پکارے۔ اُن کے پیچھے بھلائی سے یاد کرے ضرورت کیوقت اچھا مشورہ دے مصیبت کیوقت اُن کے کام آئے مثلاً بھولے ہوئے کو راستہ بتائے۔ گرتے ہوئے کو سنبھال لے۔ جو کچھ خریدنا چاہتا ہو بازار سے خرید وادے۔ جو کوئی مسئلہ پوچھے تو بتادے وغیرہ وغیرہ ۴ فاسق فاجر بدکار فسادی مسلمان کو اگر ہو سکے تو ملامت کرو اُن کو بُرا بھلا کہو۔ بلکہ حاکم وقت اُن کو سزا دے اسی میں اُن کی اصلاح ہے۔ اور اُن کے حق میں یہی قول حسنا ہے حضور علیہ السلام نے مجرموں کو سزائیں دیں۔ **دوسری ہدائیت** اس آیت میں کافر بھی داخل ہیں۔ کفار سے بھی اچھی بات کہو جس کافر کے ایمان کی امید ہو۔ اس سے نرم گوئی اور دلجوئی سے پیش آؤ۔ نہائیت اخلاق سے دعوت اسلام دو دیکھو فرعون سخت کافر تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام بڑے پیغمبر مگر جب انہیں فرعون کی ہدایت کیلئے بھیجا گیا۔ تو حکم دیا گیا کہ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى یعنی اس سے نرم بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے اور خدا سے ڈر جائے چونکہ ابھی تک اس سے ایمان کی بظاہر ناامیدی نہ ہوئی تھی۔ اس لئے اس سے نرم کلام کا حکم دیا گیا نیز قرآن کریم ہمارے حضور علیہ السلام کی تعریف فرماتا ہے۔ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ اللہ کی رحمت سے اُن کیلئے نرم ہو گئے۔ اگر سخت گو اور سخت دل ہوتے تو البتہ آپ کے پاس سے یہ لوگ بھاگ جاتے تفسیر کبیر وعزیزی شرع اسلام میں ایسے کفار کو زکوٰۃ دینا بھی جائز تھی جن کو مولفۃ القلوب کہتے ہیں وہ حکم اب جاتا رہا لیکن اُن کیساتھ اخلاق کا برتاوا۔ اور اُن کی دلجوئی کرنیکا حکم اب بھی باقی ہے حضور علیہ السلام نے ایسے کفار کیساتھ بہت پاکیزہ اخلاق سے برتاو فرمایا۔ اور انہیں اخلاق نے انہیں گرویدہ کر لیا۔ اور وہ مسلمان ہو گئے۔ اس کے صدہا واقعات ہیں۔ درحقیقت اسلام اخلاق ہی سے پھیلا ہے ہندی ہٹ دھرم کفار جن کے ایمان کی کوئی امید نہیں جو ہر وقت اسلام کے مٹانے میں لگے رہتے ہوں اُن کیساتھ بقدر طاقت نہائیت سختی کی جائے۔ خدا نصیب فرمائے تو اُن سے جہاد کیا جائے۔ اُن پر تلوار چلائی جائے اُن کے حق میں یہ برتاو ہی قول حسن ہے۔ اور اُن کا فتنہ اس طرح رک سکتا ہے۔ تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا۔ کہ کفار کو لعنت ملامت کرنا ہی اُن کیلئے قول حسن ہے۔ کیونکہ قول حسن سے نفع والی بات مراد ہے۔ نہ کہ دلپسند بات نالائق بچے کو مارنا ڈاکو کو سولی دینا۔ اس کیلئے قول حسن ہے۔ دیکھو جب موسیٰ علیہ السلام فرعون کے ایمان سے ناامید ہوئے تب آپ نے اس کیلئے بددعا فرمائی۔ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ نرم کلام فرمانے کا اور وقت حکم تھا۔ اور یہ بددعا دوسرے وقت کیگئی۔ رب تعالیٰ نے اپنے محبوب علیہ السلام سے فرمایا يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ مسلمانوں کے صفات یوں بیان فرماتا ہے۔ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ وغیرہ وغیرہ وغیرہ غرضکہ اخلاق اور قسم کے کفار کے لئے ہیں۔ اور سختی وجہاد دوسرے کفار کیلئے میٹھی اور لذیذ دوائیں اور بیماروں کیلئے ہیں۔ اور کڑوی دوائیں اور پرہیز دوسرے بیماروں کیلئے۔ ۵ کفار مرتدین کسی نرمی اور رعائیت کے مستحق نہیں بلکہ اگر اُن کے لوٹ آنے کی امید ہو تو اُن کو ہدائیت کی جائے۔ اسلامی بادشاہ اُن کو کچھ سوچنے کی مہلت دے۔ پھر بھی باز نہ آئیں تو قتل کرا دے اُن کے حق میں یہی قول حسن ہے۔ اب جبکہ اسلامی حکومت نہیں۔ تو مسلمانوں پر لازم ہے۔ کہ اُن کی صحبت سے دور بھاگیں قرآن وحدیث نے اُن سے بچنے کا سخت حکم دیا ہر کافر اور بدمذہب سے دور رہنا ضروری ہے۔ یہی حکم اس زمانہ میں دیوبندی وہابیوں اور تمام باطل فرقوں کا ہے **تیسری ہدائیت** اخلاق مدارت اور مداہنت اور خوشامد میں فرق ہے۔ اخلاق اچھی چیز ہے۔ اور مداہنت بری اخلاق یہ ہیں۔ کہ اپنے نفس کے حق میں نرمی کی جائے۔ ذاتی قصور کو معاف کیا جائے۔ جو اپنے سے بدسلوکی کرے۔ اس کا بدلہ بھلائی سے دیا جائے۔ یہ نہائیت پاکیزہ صفت ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا۔ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ حضور علیہ السلام کے اخلاق نہائیت پاکیزہ تھے۔ لیکن دین میں سست اور پلپلا ہونا مداہنت ہے۔ کہ کسی سے ناجائز باتیں سنے یا اُس کو حرام کام کرتے ہوئے دیکھے اور اس پر سختی نہ کرے یہ نہائیت بُری صفت ہے جو کبھی کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ جو شخص اپنی بیوی کے پاس کسی غیر شخص کو دیکھے اور غصے میں نہ آئے۔ بلکہ اس کی خاطر کرے وہ خلیق نہیں۔ بلکہ دَیُّوث ہے۔ ایسے ہی جو کسی کو اللہ اور رسول کی توہین کرتے ہوئے دیکھے اور غصہ نہ کرے

وہ خلیق نہیں بلکہ بے غیرت بد دین ہے۔

دشمن احمد پہ شدت کیجئے ملحدوں کی کیا مروت کیجئے

**چوتھی ہدایت** اس آیت میں حُسنا فرمایا نہ کہ مُستحسن۔ حسنا وہ بات ہے جو درحقیقت اچھی اور نافع ہو۔ اور مستحسن وہ جس کو لوگ اچھا سمجھیں۔ کفار پر سختی اُن کے نزدیک مستحسن نہیں۔ مگر حسنا ہے۔ اور اُن کی خوشامد اُن کے نزدیک مستحسن ہے مگر حسنا نہیں۔ ہم کو کلام حسنا کا حکم ہے۔ نہ کہ مستحسن کا یہ مضمون بہت خیال میں رہے۔ یہاں اکثر لوگ دھوکہ کھا کر اخلاق اور خوشامد میں فرق نہیں کرتے **پانچویں ہدایت** اگرچہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ احکام بنی اسرائیل کو دیئے گئے تھے۔ لیکن ہم سب مسلمانوں پر بھی لازم ہیں (اصول فقہ) جب بندوں کے حقوق سے فراغت ہوئی۔ تو فرمایا گیا **وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ**۔ کہ نماز قائم رکھو۔ اور زکوٰۃ دو چونکہ نماز میں فقط رب سے ہی تعلق ہے۔ اور زکوٰۃ میں بندوں سے بھی اس لئے نماز کو زکوٰۃ پر مقدم کیا معلوم ہوتا ہے۔ کہ بنی اسرائیل پر بھی نماز و زکوٰۃ فرض تھی۔ لیکن ہماری نماز زکوٰۃ سے مختلف چنانچہ اُن پر چوتھائی مال زکوٰۃ فرض ہم پر چالیسواں حصہ اگرچہ **لَا تَعْبُدُوْنَ** میں یہ بھی آگئی تھی۔ مگر اس کی افضلیت کی وجہ سے اس کو علیحدہ بھی بیان کر دیا۔ **ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ** یا تو یہ موجودہ بنی اسرائیل سے خطاب ہے۔ یا گذرے ہوؤں سے یعنی پھر تم یا تمہارے بزرگ ان تمام احکام سے منہ موڑ گئے۔ اور ان کی پابندی نہ کی **اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْکُمْ** سوا تم میں سے تھوڑوں کے یعنی تم میں بہت تھوڑے ایسے لوگ ہیں جو نبی آخرالزمان پر ایمان لے آئے۔ اور انہوں نے سارے احکام کی پابندی کی جیسے عبداللہ ابن سلام اور کعب احبار وغیرہ رضی اللہ عنہم یا تمہارے بزرگوں میں سے بہت تھوڑوں نے ان کی پابندی کی پھر تم نے یہ بھی نہ کیا کہ توبہ کر کے اس عہد شکنی کا بدلہ کر دیتے۔ بلکہ **وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ** تم روگرداں ہی رہے۔ اور دن بدن اس عہد شکنی میں ترقی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بدمزاجی بدخلقی خدا کے احکام سے منہ موڑنا تمہاری عادت بن گئی۔ پھر تم کیسے کہتے ہو۔ کہ ہم عارضی عذاب پا کر چھوٹ جائیں گے ان عیوب سے دائمی عذاب آتا ہے۔ **خلاصہ تفسیر** یہ مختصر سی آیت انسانی زندگی کا مکمل دستور العمل ہے۔ اس میں عقائد عبادات معاملات مکمل طور پر بیان کئے گئے اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر پوری روشنی ڈالدی گئی۔ اس میں آٹھ احکام بیان ہوئے۔ لیکن اگر تفصیل کی جائے تو آٹھ کروڑ سے بھی زیادہ ہیں۔ پھر ترتیب ایسی نفیس کہ سبحان اللہ چونکہ عقائد اعمال پر مقدم اور اللہ کا حق سارے حقوق سے اعلیٰ ہے۔ اس لئے پہلے اس کو بیان فرمایا گیا۔ کہ تم غیر خدا کی عبادت نہ کرو پھر مخلوق میں سب سے بڑا ماں باپ کا حق اس لئے اس کے بعد فرمایا گیا۔ کہ والدین کے ساتھ بھلائی کرو پھر ماں باپ کے رشتہ داروں کا حق اس لئے حکم ہوا کہ اہل قرابت سے سلوک کرو۔ پھر اُن کا حق تھا جن سے اسلامی رشتہ ہے خواہ بدنی رشتہ ہو یا نہ ہو یتیم بچے اور مسکین مسلمان مگر یتیم زیادہ حاجتمند تھے۔ اس لئے اُن کو مسکینوں پر مقدم کر کے فرمایا۔ کہ یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی احسان کرو۔ پھر سارے انسانوں کے تمامی حقوق کو ان دو لفظوں میں بیان فرمادیا۔ کہ لوگوں سے اچھی بات کہو۔ معاملات سے فراغت کے بعد ساری بدنی اور مالی عبادتوں کو ان دو لفظوں میں بیان فرمایا۔ کہ نماز قائم کرو۔ اور زکوٰۃ دو۔ کیونکہ جہاد وغیرہ بھی نماز قائم کرنے کیلئے ہی ہیں۔ پھر ان تمام احکام کی پابندی کرانے کیلئے فرمادیا۔ کہ ان احکام کو چھوڑ کر نجات کی امید کرنا خیال خام ہے۔ اگر اپنا چھٹکارا چاہتے ہو تو ان عقائد اور اعمال کی پابندی کرو۔ ان کی کچھ تفصیل ہم نے تفسیر میں عرض کر دی۔ اگر پوری تفصیل کی جائے۔ تو اس کیلئے دفتر درکار ہیں۔ **فائدے**۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** نجات دائمی کیلئے عقائد عبادات معاملات سب ضروری ہیں عقائد بنیاد جیسی اور عبادات دیواریں اور معاملات چھت جیسے مکان کیلئے تینوں چیزیں ضروری ہیں ایسے ہی نجات دائمی کیلئے یہ تینوں ضروری یا یوں سمجھو کہ عقائد و اعمال اور اعمال پرندے کے دو پر ہیں۔ اگر ایک بھی ٹوٹ گیا۔ تو اڑنا ناممکن۔ قیامت کے دن بدعمل مسلمان کو بڑی الجھنیں پیش آئیں گی۔ **دوسرا فائدہ** یہ حق بقدر احسان ہے اسی لئے ماں باپ کا حق ساری مخلوق سے اعلیٰ **تیسرا فائدہ** یتیموں سے بھلائی کرنا علامت ایمان ہے جس دسترخوان پر یتیم ہو اس پر شیطان نہیں ہوتا جو یتیم کو پال کر جوان کر دے اسکے سارے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ بلکہ روایت میں یہ بھی ہے۔ کہ جو تین بیٹیوں یا بہنوں کو بلکہ دو کو بھی پال کر جوان کر لے تو وہ اُس کے لئے جہنم سے آڑ بن جائیں۔ ایک بار حضور علیہ السلام نے اپنی دو انگلیوں کو ملا کر فرمایا۔ کہ ہم اور یتیم کا پالنے والا جنت میں ایسے رہیں گے۔ خیال رہے کہ دونوں مبارک انگلیاں چھوٹی بڑی تھیں جس سے درجات

کا فرق معلوم ہوا۔ روح البیان چوتھا فائدہ اچھے اخلاق اور لوگوں سے اچھا کلام کرنا بھی علامت ایمان ہے۔ امام محمد باقر رحمت اللہ علیہ نے اچھے اخلاق کی نہایت عمدہ تفسیر فرمائی جس کا ترجمہ یہ ہے۔ شعر

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو کلام ایسا ۔۔۔ کہ جو کوئی تم سے کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

جو بات کسی سے کہو اچھی ہو بھلی ہو ۔۔۔ کڑوی نہ ہو کھٹی نہ ہو مصری کی ڈلی ہو

**پانچواں فائدہ** تارک الدنیا بننا کمال نہیں بلکہ کامل وہ شخص ہے۔ کہ جو خالق و مخلوق کے حقوق ادا کر کے دنیا سے جائے۔ **پہلا اعتراض** اس آیت میں نبی کا ذکر نہ آیا۔ کیا نبی کا کوئی حق نہیں ہے۔ **جواب** تفسیر میں بتایا گیا۔ کہ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ میں خدا کے حق کے ساتھ پیغمبر کا بھی حق آگیا در حقیقت ان کے حق کے بغیر خدا کے حق ادا ہو سکتے ہی نہیں ساری عبادات۔ بلکہ معاملات بھی نبی کا حق ہیں۔ کیونکہ وہ نبی کے فرمانے سے ہی واجب ہوئے۔ اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا۔ کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی **دوسرا اعتراض** اس آیت میں عالم دین اور دینی استاد اور پیر کا ذکر نہ آیا۔ کیا ان کا کوئی حق نہیں **جواب** یہ حضرات یا تو والدین میں داخل ہیں۔ کیونکہ یہ روحانی ماں باپ ہیں بلکہ ان کا حق اطاعت ماں باپ پر بھی مقدم ہے۔ کیونکہ ماں باپ تو ہم کو اوپر سے نیچے لائے۔ اور انہوں نے ہمیں پھر نیچے سے اوپر پہنچایا۔ یا یوں کہو۔ کہ ماں باپ نے حیوان بنایا اور انہوں نے ناطق یا انہوں نے جسم۔ جان کی پرورش کی اور انہوں روح ایمان کی اور یا یہ حضرات قُوۡلُوۡا لِلنَّاسِ حُسۡنًا میں داخل ہیں۔ کیونکہ جیسا ناس ویسا ان کے ساتھ کلام **تیسرا اعتراض** اس میں بیوی اور رضاعی ماں پڑوس وغیرہ کا حق نہیں آیا۔ **جواب** یہ بھی الناس میں داخل ہو کر آگئے۔ **چوتھا اعتراض**۔ اس آیت میں پہلے عبادت کا ذکر ہے اور پھر معاملات کا اور پھر نماز و زکوٰۃ کا ایسی ترتیب کیوں رکھی گئی **جواب** یہاں معاملات کا عبادات پر مقدم رکھنا منظور ہے۔ کیونکہ بندے اپنے حقوق کے محتاج ہیں۔ اور رب حقوق سے بے نیاز مگر چونکہ ان سب کیلئے ایمان شرط ہے۔ اس لئے لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ پہلے فرما دیا گیا۔ **تفسیر صوفیانہ**۔ رب تعالیٰ محسن حقیقی ہے۔ اور ماں باپ وغیرہ محسن مجازی لیکن محسن مجازی کا حق ادا کئے بغیر محسن حقیقی کا حق ادا نہیں ہو سکتا اسی لئے یہ قاعدہ مقرر ہے۔ کہ مجاز حقیقت کا پل ہے تین چیز بغیر تین چیزوں کے قبول نہیں ہوتیں۔ اسی لئے قرآنی آیات نے ان کو ملا دیا ہے۔ خدا کی اطاعت بغیر اطاعت رسول اَطِيۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ خدا کا شکر ماں باپ کا شکر کے بغیر اَنِ اشۡكُرۡ لِىۡ وَلِـوَالِدَيۡكَ نماز بغیر زکوٰۃ اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ جو شخص بغیر وسیلہ مجاز حقیقت کو پانا چاہے وہ ناکام رہیگا۔ مجاز کی کشتی میں بیٹھ کر حقیقت کا دریا عبور کرو۔ بلکہ حق تو یہ کہ مجاز حقیقت کا مظہر ہے۔ چاہیئے کہ مجازی آئینہ میں محبوب حقیقی کو دیکھے مولانا فرماتے ہیں۔

اصل صد یوسف جمال ذوالجلال ۔۔۔ اے کم از زن شو فدائے آں جمال

اصل بیند دیدہ چوں اکمل بود ۔۔۔ فرع بیند چونکہ مرد احول بود

سرمۂ توحید از کحال حال ۔۔۔ یافتہ رستہ ز علت اعتلال

عبادت دو قسم کی ہے۔ بلا واسطہ اور بالواسطہ جن افعال سے براہ راست رب کی رضا منظور ہو وہ بلا واسطہ عبادت ہے اس کو شریعت میں عبادت کہا جاتا ہے۔ جیسے کہ روزہ نماز حج و زکوٰۃ اور جن افعال سے خلق کو راضی کرنا منظور ہو مگر یہ مخلوق کی رضا رضاء الٰہی کے لئے ہی ہو۔ وہ بالواسطہ عبادت ہے۔ اسی کو معاملات کہا جاتا ہے۔ جیسے خدمت والدین اور ادائیگی حقوق یہی فرق ہے۔ صدقہ اور نذر میں جو کوئی معاملات سے رب کی رضا جوئی نہ کرے۔ وہ اپنا وقت بیکار گنواتا ہے۔ ان تمام بندوں میں رب کا نظارہ کرو۔ اور سمجھو۔

حاصل نہ شود رضاء سلطان ۔۔۔ تا خاطر بندگاں نہ جوئی!!

ورنہ تم ان زنانِ مصری سے بھی کم ہو جنہوں نے حسنِ یوسف میں خالق یوسف کا جمال دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور درد تک محسوس نہ کیا بلکہ بجائے ہائے وائے کے جمال یوسفی کی تعریف کرتی رہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ

اور جبکہ لیا ہم نے عہد تمہارا کہ نہ بہاؤ گے تم خون اپنوں کو اور نہ نکالو گے تم نفسوں اپنی کو

اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ کرنا اور اپنوں کو اپنی بستیوں سے

دِیَارِکُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ (۸۴)

شہروں سے اپنے پھر اقرار کیا تم نے اور تم لوگ گواہ ہو

نہ نکالنا پھر تم نے اس کا اقرار کیا اور تم گواہ ہو۔

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیت سے کئی طرح تعلق ہے۔ پہلا تعلق اس سے پہلے تہذیب اخلاق اور تدبیر منزل کے احکام کا ذکر تھا جن پر عمل کرنے سے انسان کے اخلاق درست ہوجائیں اور خانگی زندگی سنبھل جائے۔ اب سیاست مدنی کے احکام کا ذکر ہے جس سے قومی اصلاح ہو۔ اور ملک میں امن وامان کا دور دورہ ہو **دوسرا تعلق** اس سے پہلے اختیار کرنے کیلئے اچھے صفات کا ذکر کیا تھا۔ اب اُن عیوب کا ذکر فرمایا جارہا ہے جن سے بچنا ضروری ہے۔ اسی لئے پہلی آیت میں حکم تھا۔ اور اس میں نہی **تیسرا تعلق** پہلی آیت میں اسرائیلیوں کی نافرمانیوں کا دعویٰ کیا گیا تھا کہ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ الخ اَب اس میں اُن کے اعمال سے ثبوت دیا جارہا ہے **چوتھا تعلق** موجودہ بنی اسرائیل پچھلی آیت کے مضمون کا انکار کرسکتے تھے۔ کہ ہمارے بزرگوں نے یہ بدعہدیاں نہ کیں۔ اور ہم بھی توحید الٰہی پر قائم اور ادائے حقوق میں ثابت قدم ہیں۔ اور اگر انہوں نے یہ بدعہدیاں کی بھی ہوں۔ تو اس سے ہم پر کیا الزام اس کے جواب میں اس آیت میں دوسرا عہد یاد دلایا جارہا ہے جس کی یہ لوگ ظاہر ظہور مخالفت کررہے ہیں۔ **پانچواں تعلق** اس سے پہلے یہود کے ایمان کی مایوسی کی چند وجہیں بتائی گئی تھیں۔ اس آیت میں بھی اُسی کی ایک وجہ بیان ہورہی ہے۔ کہ جب یہ لوگ توریت شریف کے نہائت ظاہر اور پختہ احکام کو نہیں مانتے تو نبی آخر الزمان پر ان کے ایمان لانے کی کیا امید ہے۔ **تفسیر** وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ یہاں وہی اُذْکُرُوْا فعل چھپا ہوا ہے۔ یعنی اے یہودیو اس وقت کو یاد کرو۔ جبکہ ہم نے تم سے عہد لیا یہاں موجودہ بنی اسرائیل ہی سے خطاب ہے۔ کیونکہ آئندہ انہیں کی بدعہدی کا ذکر ہورہا ہے۔ اسی لئے یہاں مِیْثَاقَکُمْ فرمایا گیا اور پچھلی آیت میں مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ دراصل یہ عہد بھی ان کے باپ داداؤں سے ہی لیا گیا تھا۔ مگر چونکہ باپ داداؤں کا فعل اولاد کا فعل ہوتا ہے۔ اسلئے اس کا ان سے خطاب ہوا یہاں وعدہ کی نوعیت مراد ہے۔ ورنہ حقیقت میں اُن سے تین عہد لئے گئے تھے۔ پہلا یہ کہ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ اپنا خون نہ بہانا۔ یہ سَفْکٌ سے بنا ہے اور سفکٌ وسکبٌ کے معنی ہیں انڈیلنا اور بہانا۔ اس عبارت کے چند مطلب ہوسکتے ہیں۔ دنیوی مصیبت[۱] سے گھبرا کر یا روحانی ترقی کی امید میں خودکشی نہ کرنا۔ اپنی ہم[۲] قوم یا ہم مذہب کو قتل نہ کرنا یعنی آپس میں جنگ وجدال نہ کرنا۔ کیونکہ اپنی قوم کو مارنا در پردہ اپنے ہی کو مارنا ہے کسی[۳] کو قتل نہ کرنا۔ کہ اس کے قصاص میں تم قتل کردیئے جاؤ۔ کیونکہ دوسرے کو ہلاک کرنا اپنے کو موت کے منہ میں دینا ہے[۴] جنگجو اور مفسد قوموں کا ساتھ نہ دینا ورنہ تم تباہ ہوجاؤ گے۔ (تفسیر کبیر) خیال رہے کہ یہاں بھی نفی نہی کے معنی میں ہے۔ اور چونکہ ایک دوسرے کا قتل وخون سخت گناہ ہے۔ کہ شرک وکفر کے بعد اسی کا درجہ ہے۔ اس لئے اسی عہد کو بھی توحید کے عہد کی طرح نہائت اہتمام سے خبر کی صورت میں بیان کیا دوسرا عہد یہ تھا۔ کہ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اپنے کو اپنے گھروں سے نہ نکالنا یعنی اپنی قوم یا اپنے اہل قرابت یا اپنے پڑوسی کو اتنا تنگ نہ کرنا۔ کہ وہ مجبور ہوکر اپنا گھر یا وطن چھوڑنے پر آمادہ ہوجائے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں۔ کہ تم ایسی بدعملیاں نہ کرنا جس سے تم کو جلاوطن کردیا جائے۔ یعنی حکومت تم کو ملک سے نکال دے۔ یا یہ کہ تم خود تارک الدنیا ہوکر اپنا گھر بار چھوڑ کر جنگل میں آوارہ نہ پھرو بہرحال یہاں بھی یا تو اَنْفُسٌ سے اپنی جانیں مراد ہیں۔ یا اپنے ہم قوم چونکہ جلاوطن کرنا قتل کے

بعد سب سے بڑا ظلم ہے۔ چنانچہ اب بھی پھانسی کے بعد کالے پانی کی سزا ہے نیز جلا وطن قوم کبھی سلطنت نہیں کر سکتی جب اس کی اجتماعی قوت جاتی رہی اور لوگ بکھر گئے۔ تو مخالف کو حملہ کرنے کی جرأت ہو جائے گی۔ اور وہ اس کو غلام بنا لیگا۔ اس لئے خونریزی کے بعد جلا وطنی کا ذکر کیا گیا اور اے اسرائیلیو یہی نہ ہوا کہ تمہیں ان احکام کی خبر دیدی جاتی بلکہ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ تم نے اس کا اقرار بھی کر لیا۔ کہ ہم اس پر عمل کریں گے پھر یہ اقرار خفیہ طریقہ پر یا ضمنی طور پر نہ تھا بلکہ اتنا صاف اور صریح تھا۔ کہ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۔ تم اب بھی اس گذشتہ اقرار کی گواہی دے رہے ہو۔ خیال رہے کہ اقرار اور گواہی ایک شخص کی نہیں ہو سکتی مُقِر کوئی اور ہوتا ہے۔ اور گواہ دوسرا اس لئے اس آیت کے یا تو یہ معنی ہیں۔ کہ تمہارے بزرگوں نے اقرار کیا تھا۔ اور تم اس کے گواہ ہو یا یہ کہ تم سب نے اقرار کیا تھا۔ اور بعض لوگ بعض پر گواہ تھے۔ یا تم نے پہلے اقرار کیا تھا۔ اور اب گواہ ہو کہ ہاں ہم اقرار کر چکے ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہے۔ کہ تم وہ اقرار اب تک بھولے نہیں ہو سب کچھ تمہیں یاد ہے۔ اور جان بوجھ کر اس کی مخالفت کر رہے ہو۔ **خلاصہ تفسیر** اے اسرائیلیو تم اس وقت کو بھی یاد کرو۔ جب ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا۔ کہ تم آپس میں خونریزی نہ کرنا۔ اور اپنی قوم کو ناحق جلا وطن نہ کرنا کیونکہ اس سے تمہاری قومی قوت ٹوٹ جائیگی۔ اور قومی شیرازہ بکھر جائیگا۔ جو تمہاری ہلاکت کا باعث ہوگا۔ تم نے اس کا پورا اقرار بھی کیا تھا۔ اور تم اب تک اس پر گواہ ہو۔ مگر تم نے کیا کیا۔ اور اسی اقرار پر کتنے قائم رہے۔ اس کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے

**فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** اپنے دینی بھائی کو مارنا درحقیقت اپنے کو مارنا ہے۔ کیونکہ اس سے قوم میں کمزوری پیدا ہو گی جس کا وبال سبھی بھگتیں گے۔ **دوسرا فائدہ** اپنے دینی بھائی کو ذلیل کرنا درحقیقت اپنے کو ذلیل کرنا ہے۔ کیونکہ اس سے غیر قوم کی نگاہ میں اپنی قوم کا وقار جاتا رہتا ہے۔ اور جب اپنی قوم کا وقار گیا تو خود اپنا بھی گیا۔ کاش کہ موجودہ مسلمان بھی یہ راز سمجھ جائیں اگر ہم اپنی مسلم قوم کی عزت کریں تو کوئی قوم ہم کو ذلیل نہیں کر سکتی۔ دوسری قوموں کو مسلمانوں کے مقابلہ کی اس لئے ہمت ہوئی۔ کہ خود مسلمان ہی اپنی قوم کے دشمن بن گئے۔ **تیسرا فائدہ** قوم کی عزت سے دین کی **عزت** ہے۔ مومن کی عزت سے ایمان کی مسلم سے اسلام کی عالم دین کی عزت سے قرآن کی عزت ہے۔ دین کی عزت کیلئے دینداروں کی عزت کرو۔ اللہ پاک عمل کی توفیق عطا فرمائے **چوتھا فائدہ** مسلمانوں کو لازم ہے کہ اپنے گھر نہ چھوڑیں اور اپنی زمین فروخت نہ کریں۔ بلکہ زمین خریدنا اور اپنی آبادیاں بڑھانا اور محلّے قائم کرنا ضروری ہے۔ اگر ہندوستان سے مسلمان چلے جائیں تو یقیناً یہاں کی مسجدیں مندر اور مسلمانوں کے قبرستان گوسالے بنا لئے جائیں گے۔ اور ان کی ساری وقف زمینوں پر غیر قبضہ کر لیں گے۔ **پانچواں فائدہ** بعض جگہ سن کر یا شہرت پر یا علامتیں دیکھ کر بھی گواہی دی جا سکتی ہے۔ ہر گواہی میں دیکھنا ضروری نہیں۔ دیکھو موجودہ یہودیوں نے اپنے بزرگوں کے عہد میثاق کا واقعہ خود نہ دیکھا تھا محض قرینہ دیکھ کر یا سُن کر گواہی دی اور وہ معتبر ہوئی۔ اسی طرح آج بھی وقف نسب۔ نکاح تبرکات کی گواہی فقط سن کر یا علامتیں دیکھ کر دی جا سکتی ہے۔ لہٰذا دیوبندیوں وہابیوں کا تبرکات کے ثبوت کے لئے حدیث بخاری کا مطالبہ کرنا محض غلطی ہے۔ **اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ بنی اسرائیل کو اپنے قتل نہ کرنیکا مکلف کیا گیا۔ انسان اپنے قتل سے تو خود ہی بچتا ہے۔ اسے مکلف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ **جواب** اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا۔ کہ بعض وقت انسان خودکشی کرتا ہے بعض قومیں خودکشی کو ذریعہ نجات سمجھتی ہیں۔ اس لئے اس سے اُن کو رد کا گیا۔ یا یہ مراد ہے۔ کہ اپنی قوم کو قتل نہ کریں۔

**تفسیر صوفیانہ** نفس کی پرورش کرنے میں روح کی ہلاکت ہے۔ اور دنیا سے محبت کرنے میں اپنے اصلی وطن یعنی جنت سے محرومی ہر انسان سے عہد لیا گیا ہے۔ کہ وہ شیطان کی اطاعت اور نفس کی پیروی کر کے اپنی جان یا اپنی روح کو ہلاک نہ کرے۔ نیز اپنے کو دنیا میں پھنسا کر اپنے کو اصلی وطن جنت سے نہ نکالے۔ یا یوں سمجھو۔ کہ ہمارا دین فطری اسلام ہے۔ ہم دنیا میں رہ کر بھی اپنے اصلی وطن یعنی اسلام میں موجود ہیں۔ ہم کو چاہیئے۔ کہ اسلامی حدود سے نکل کر بے وطن نہ بنیں نیز صوفیائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ ترقی روح کا ذریعہ شریعت کی پابندی ہے۔ یہ ہرگز جائز نہیں کہ روحانی ترقی کیلئے خودکشی کی جائے۔ یا اپنے کو دنیوی بلاؤں میں پھنسایا جائے یا آبادی چھوڑ کر اپنے کو صحرا نشین بنایا جائے۔ الیٰ آخرہٖ

فقیری نہیں ملتی۔ یہ طریقہ سادھوؤں اور جوگیوں اور راہبوں کا ہے۔ بعض صحابہ کرام نے دین کی خاطر دنیوی لذتیں چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ کسی نے کہا۔ کہ میں نکاح نہ کرونگا۔ کسی نے کہا۔ کہ میں ہمیشہ روزہ رکھونگا۔ وغیرہ۔ حضور علیہ السلام نے اُن سب کو اس ارادے سے روک دیا۔ اور فرمایا۔ کہ ہمارے دل میں بہت زیادہ خوف الٰہی ہے لیکن ہم نماز بھی پڑھتے ہیں اور سوتے بھی ہیں۔ روزہ بھی رکھتے ہیں۔ افطار بھی کرتے ہیں۔ نکاح بھی کرتے ہیں۔ نکاح میری سنت ہے جس نے اس سے منہ پھیرا وہ میرے گروہ سے نہیں لطف یہ ہے۔ کہ شرعی قیود میں رہ کر عالم شہود تک پہنچے عارف کی آنکھ دنیا کے ہر آئینہ میں رب کا جمال دیکھتی ہے۔ جب یہ حال ہوجائیگا۔ تو پھر یہ لطف ہوگا۔ کہ انسان جہاں جائیگا رب کو پائیگا مسجد میں آئیگا تو اسی کو دیکھے گا۔ اور گھر میں پہنچے گا۔ تو اسی تک پہنچے گا۔ اور دل میں داخل ہوگا۔ تو اسی کے قرب میں داخل ہوگا۔ اور پھر یہ آیت ظاہر ہوگی۔ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ جہاں جاؤ رب کو پاؤ پھر قلب کی حالت یہ ہوگی۔ کہ نہ دنیوی غم سے غمگین ہوگا۔ اور نہ یہاں کی راحت سے خوش اسی کا ظہور کربلا کے میدان میں ہوا۔ کہ امام حسین ؑ نے بزبان حال فرمایا۔ شعر

میں تیرا غیر نہیں عین ہوں لے عین کرم  توہی آتا ہے نظر مجھکو بچشم پُرنم

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِیَارِهِمْ

پھر تم یہ ہو کہ قتل کرتے ہو جانوں اپنی کو اور نکالتے ہو تم ایک گروہ کو اپنے سے اُن کے گھروں سے

پھر یہ جو تم ہو اپنوں کو قتل کرنے لگے۔ اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان کے وطن سے نکالتے ہو۔

تَظٰهَرُوْنَ عَلَیْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِؕ وَ اِنْ یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ

اوروں کو مدد دیتے ہو بمقابلہ اُن کے ساتھ گناہ اور زیادتی کے اور اگر آئیں وہ تمہارے پاس قیدی ہوکر تو فدیہ دیتے ہو تم اُن کا

اِن پر مدد دیتے ہو (یعنی انکے مخالف کو) گناہ اور زیادتی میں اور اگر وہ قیدی ہوکر تمہارے پاس آئیں تو بدلہ دیکر چھڑا لیتے ہیں

وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْكُمْ اِخْرَاجُهُمْؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ

اور شان یہ ہی کہ حرام ہے اوپر تمہارے نکالنا اُن کا کیا تو ایمان لاتے ہو تم ساتھ بعض کتاب کے اور کفر کرتے ہو

اور اِن کا نکالنا تم پر حرام ہے۔ تو کیا خدا کے کچھ حکموں پر ایمان لاتے ہو۔ اور کچھ سے انکار کرتے ہو

بِبَعْضٍۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَاۚ

ساتھ بعض کے پس کیا ہے بدلہ اسکا جو کرے یہ تم میں سے مگر رسوائی بیچ زندگی دنیا کے

تو جو تم میں ایسا کرے اُس کا بدلہ کیا ہے۔ مگر یہ کہ دنیا میں رسواء ہو۔

وَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۸۵)

اور دن قیامت کے لوٹائے جائینگے وہ طرف سخت عذاب کے اور نہیں ہے اللہ بےخبر اُس سے جو تم کرتے ہو۔

اور قیامت میں سخت تر عذاب کی طرف پھیرے جائینگے اور اللہ تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں

**تعلق۔** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** یہ آیت پچھلی آیت کا تتمہ ہے۔ **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں بنی اسرائیل پر احکام بھیجنے کا ذکر تھا۔ اب اُن کے اعمال کا تذکرہ ہے۔ **تیسرا تعلق** پچھلی آیت میں بنی اسرائیل کے اقرار اور

عہد و پیمان کا ذکر تھا۔ اب اُس کے توڑنے کا تذکرہ ہے۔ **شانِ نزول** توریت میں بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا تھا۔ کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کریں۔ اور وطن سے نہ نکالیں۔ اور جو بنی اسرائیل کسی کی قید میں ہو۔ اس کو مال دیکر چھڑالیں۔ اس پر انہوں نے اقرار بھی کیا اور گواہ بھی ہوئے لیکن قائم نہ رہے اور اس سے پھر گئے جس کا ذکر خلاصہ تفسیر میں آتا ہے۔ تب یہ آیت کریمہ اُتری (تفسیر خزائن العرفان) **تفسیر** ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ۔ ثُمَّ یا تو رتبی تراخی کیلئے ہے۔ یا زمانی یعنی باوجودیکہ یہ احکام عقلاً نقلاً نہایت اعلیٰ تھے جن پر ملکی اور قومی انتظام موقوف تھا مگر تعجب ہے۔ کہ پھر بھی تم اس کی مخالفت کرتے ہو جس سے دین دنیا میں تمہاری رسوائی ہے۔ یا یہ کہ بہت عرصہ تک تو تم ان احکام کے پابند رہے اتنے عرصہ کے بعد اب تم نے اُن کی مخالفت شروع کر دی۔ یا تو اَنْتُمْ مبتدا ہے اور تَقْتُلُوْنَ اُس کی خبر اور هٰٓؤُلَآءِ سے اوّل لفظ یا پوشیدہ ہے۔ یعنی اے وہ عہد کے توڑنے والو تم اپنے کو قتل کرتے ہو یا اَنْتُمْ مبتدا ہے اور هٰٓؤُلَآءِ اس کی خبر اور تقتلون سے آخر تک اس کا بیان یعنی یا تو هٰٓؤُلَآءِ الذین کے معنی میں ہے۔ اور اگلا جملہ اس کا صلہ اور یا یہ اپنے ہی معنی میں ہے مگر اَنْتُمْ سے اُن کی ذات مراد اور هٰٓؤُلَآءِ سے اُن کی صفات یعنی پھر تم وہ بدعہد لوگ ہو جو اپنے کو قتل کرتے (تفسیر کبیر و روح البیان) اس تقریر سے انشاء اللہ سارے وہ اعتراض اٹھ جائیں گے جو اس عبارت پر پڑتے ہیں۔ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ کے یا تو یہ معنی ہیں۔ کہ تم تارک الدنیا راھب بن کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے ہو یا یہ کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو۔ دوسرے معنی ہی زیادہ صحیح ہیں (تفسیر کبیر) وَتُخْرِجُوْنَ یعنی یا تو تم غلبہ پا کر اپنی ایک جماعت کو جلا وطن کر دیتے ہو۔ اور یا اُن کو اتنا پریشان کرتے ہو۔ کہ وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ غرضکہ بالواسطہ یا بلاواسطہ تم انہیں نکال دیتے ہو۔ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ۔ فریقاً فرقٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں جدا ہو۔ چونکہ ہر قبیلہ دوسرے قبیلوں سے ممتاز اور جدا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو فریق کہتے ہیں۔ خیال رہے۔ کہ جہاں دنیوی وجہ سے جدائی ہو وہاں فریق بولا جائیگا۔ اور جہاں دینی وجہ سے ہو۔ وہاں فرقہ اور کبھی اس کا عکس بھی ہوتا ہے۔ مِنْ دِيَارِهِمْ۔ دیار جمع دار کی ہے جس کے معنی ہیں گھر وطن اور ملک کو اس لئے دیار کہتے ہیں۔ کہ وہاں بہت سے گھر ہوتے ہیں۔ ھم کا مرجع فریق ہے۔ جو کہ لفظاً واحد اور معناً جمع ہے۔ یعنی تم اپنی ایک جماعت کو اُن کے وطن سے نکال دیتے ہو۔ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ یہ قتل کرنے اور نکالنے کا بیان ہے۔ یعنی تم براہ راست خود تو یہ حرکت نہیں کرتے۔ مگر اُن کے دشمنوں کو اُن کے مقابلہ میں امداد دیتے ہو۔ تَظٰهَرُوْنَ۔ ظہر سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پشت مدد دینے کو اس لئے تظہر کہتے ہیں۔ کہ اس سے جنگ میں دوسرے کی پشت قوی ہوتی ہے۔ اسی لئے اپنے مددگار کو پشت و پناہ کہتے ہیں۔ غضب تو یہ ہے۔ کہ تمہاری یہ امداد کسی نیک کام کیلئے نہیں بلکہ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ گناہ اور زیادتی میں ہے۔ یعنی دشمن ظلماً تمہاری ایک جماعت پر حملہ کرتا ہے۔ اور تم اس دشمن کی امداد کرتے ہو۔ لہٰذا تم بھی اس گناہ میں شریک ہوئے۔ پھر لطف یہ ہے۔ کہ تم اس مظلوم جماعت سے پوری دشمنی بھی نہیں کرتے۔ بلکہ اوّلاً تو انہیں دیس نکالا دیتے ہو جس سے وہ قید ہو جاتے ہیں۔ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى۔ اُسارٰی جمع اسیر کی ہے۔ اسیر وہ جسکو جبراً پکڑ لیا جائے۔ خیال رہے۔ کہ جو قیدی ہتھکڑی بیڑی میں ہوں وہ اُسرٰی کہلاتے ہیں۔ اور جو فقط دوسرے کے قبضہ میں ہوں وہ اُسارٰی یعنی جب یہ مظلوم لوگ تمہارے پاس قیدی ہو کر پابجولاں آتے ہیں تو تُفٰدُوْهُمْ تم فدیہ دیکر انہیں چھڑا لیتے ہو۔ تفدو افداءٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں چیز کا معاوضہ خیال رہے۔ کہ قیدی کو چھڑانا عیب نہیں۔ بلکہ خوبی ہے۔ یہاں اس فعل کی برائی کرنا منظور نہیں۔ بلکہ یہ بتانا منظور ہے۔ کہ تم پوری کتاب پر عامل نہیں۔ یا یہ کہ تم خود ہی قید کرا کر خود ہی چھوڑاتے ہو۔ یہ تمہاری حماقت ہے۔ تفسیر کبیر نے تفدو کے ایک یہ معنی بھی کئے۔ کہ تم اُن کا فدیہ لے لیتے ہو یعنی اوّلاً اپنی قوم کو قید کرتے ہو۔ اور جب اُن کا قرابت دار چھوڑانے آئے تو تم مال لیکر چھوڑتے ہو۔ اس صورت میں یہ بھی ایک عیب ہی ہؤا۔ مگر پہلے معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اگلی عبارت کا تقاضا ہے وَهُوَ یہ ضمیر شان ہے یعنی تمہارا عمل تو یہ ہے۔ اور تمہارا دین یہ۔ کہ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ۔ کہ تم پر اُن کا نکالنا ہی حرام تھا۔ نکال کر چھوڑانا تو ایسا ہے۔ جیسے کسی کے گھر میں آگ لگا کر پانی کے لئے دوڑنا۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ یہ استفہام انکار کیلئے ہے۔ یا جھڑکنے کیلئے۔ یا تو ایمان سے ماننا مراد ہے۔ اور یا عمل کرنا۔ یعنی تو کیا تم عمل کرتے ہو

یا مانتے ہو۔ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ بعض توریت کو یعنی تم نے توریت کے حکم فدیہ پر تو عمل کیا۔ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ اور بعض توریت کا انکار کرتے
یا چھوڑتے ہو کیونکہ اس میں تو آپس میں جنگ کرنا اور ایک دوسرے کو وطن سے نکالنا بھی حرام کیا گیا تھا یا یہ کہ موسے علیہ السلام پر تو ایمان لاتے ہو۔ یہ
بعض توریت پر ایمان ہوا۔ اور نبی آخر الزمان کا انکار کرتے ہو یہ بعض توریت کا انکار یا اپنے خاطر خواہ اور دلپسند مسائل کو مان لیتے ہو۔ اور آپس میں قتال وطن نکالا۔
اور اپنی قوم کا فدیہ لینا اس کو چھوڑتے نہیں، وہ بعض پر عمل تھا۔ یہ بعض کا ترک اب تم خود فیصلہ کرو۔ کہ فَمَا جَزَآءُ یہ ما۔ استفہامیہ ہے۔ یا نافیہ یعنی
ایسے شخص کی کیا سزا ہو سکتی ہے۔ یا کوئی بدلا نہیں ہے۔ مَنْ يَّفْعَلُ جو ایسی حرکت کرے۔ کہ بعض کو مانے اور بعض کو نہ مانے یا بعض کو چھوڑے
اور بعض پر عمل کرے۔ باوجودیکہ مِنْكُمْ ہو تم میں سے یعنی اپنے کو یہودی بھی کہتا ہو۔ اور توریت کو ماننے کا مدعی بھی ہو۔ اِلَّا خِزْيٌ فِي
الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ خزی کے لفظی معنی ذلت ناراضی یا شرمندہ کرنا ہے۔ یہاں یا تو اس سے جزیہ مراد ہے۔ یا قتل یا جلاوطنی یعنی اے
اسرائیلیو ان حرکتوں کی وجہ سے تم پر بارہا دنیا میں ٹیکس لگے تمہیں دوسری قوموں کی طرف سے قتل اور جلاوطن کیا گیا۔ اور آئندہ بھی ایسا ہوگا۔ کہ
مسلمان تمہارے حاکم بنیں گے۔ جو تم میں سے بعض کو قتل کریں گے۔ اور بعض کو جلاوطن اور بعض پر ٹیکس لگائیں گے۔ کیونکہ بگڑی ہوئی۔ اور
بگڑی قوم کا یہی انجام ہوتا ہے۔ قرآن پاک کی اس خبر کا آج تک ظہور ہو رہا ہے۔ کہ اب تک یہود دوسروں کے غلام ہی ہیں۔ اور ہمیشہ نکالے
جاتے ہیں۔ اور پھر اسی سزا پر ہی نہیں بلکہ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ قیامت کے دن۔ قیامت کے لفظی معنی ہیں۔ کھڑا ہونا۔ چونکہ اس دن
ساری مخلوق کھڑی ہوتی ہوگی۔ یا تمام جہاں کے سارے اولین و آخرین ایک میدان میں کھڑے ہوں گے۔ ایسے دن میں يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ
الْعَذَابِ لوٹائے جائینگے سخت عذاب کی طرف۔ رد کے لفظی معنی ہیں پکڑ کر واپس کرنا یا پہلی حالت کی طرف لوٹانا۔ یعنی اولاً پکڑے جائینگے پھر سخت عذاب میں ڈالے
جائینگے۔ یا جس طرح پہلے دنیا میں ذلیل و رسوا تھے پھر اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے مگر یہ رسوائی پہلی سے سخت ہوگی۔ اور یہ عذاب یقینی ہے کیونکہ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ
اللہ تمہارے کسی عمل سے غافل نہیں۔ جب اس کی قدرت بھی پوری اور علم بھی کامل تمہارے جرم بھی حد سے آگے رب تعالیٰ کا انصاف بھی اعلیٰ پھر کیا وجہ ہے کہ تم کو بڑے
جرم کی بڑی سزا نہ دی جائے۔ **خلاصہ تفسیر** مدینہ منورہ کے آس پاس یہود کے دو فرقے رہتے تھے۔ بنی قریظہ اور بنی نضیر اور خاص
مدینہ منورہ میں مشرکین کے دو فرقے تھے۔ اوس خزرج بنی قریظہ اوس کے حلیف تھے اور بنی نضیر قبیلہ خزرج کے یعنی ہر ایک قبیلہ نے
اپنے حلیف کے ساتھ قسمیہ معاہدہ کر لیا تھا۔ کہ اگر ہم میں سے کسی پر کوئی بھی حملہ کرے۔ تو دوسرا اس کی مدد کرے گا۔ یہ اوس خزرج تقریباً سو برس
سے آپس میں جنگ کرتے رہتے تھے۔ جس میں بنی قریظہ تو اوس کی اور بنی نضیر خزرج کی مدد کیلئے آتے تھے۔ اب جنگ اس طرح ہوتی تھی
کہ اوس اور بنی قریظہ ایک طرف اور خزرج اور بنی نضیر دوسری طرف ہو کر آپس میں خوب کشت و خون کرتے تھے جس کی وجہ سے بنی قریظہ
کو بنی نضیر اور بنی نصیر کو بنی قریظہ قتل کرتے تھے۔ اور ان کے گھر ویران کرتے اور ان کو جلاوطن کر دیتے تھے لیکن جب بنی نضیر اوس
کے ہاتھوں یا بنی قریظہ خزرج کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے۔ تو وہ ان کو مال دیکر چھوڑا لیتے۔ یعنی بنی قریظہ کو بنی نضیر اور بنی نضیر کو بنی قریظہ چھوڑاتا
باوجودیکہ اگر وہی شخص جنگ کیوقت ان کے موقعہ پر آجاتا۔ تو اسے قتل کرنے میں ہرگز تامل نہ کرتے جب لوگ ان سے کہتے۔ کہ تم خود ہی تو
انہیں قتل اور جلاوطن کرتے ہو۔ اور پھر خود ہی قید سے آزاد کراتے ہو۔ یہ کیا حرکت ہے۔ تو وہ کہتے۔ کہ ہمیں توریت میں اپنے قوم کے قیدیوں کو
چھوڑانے کا حکم دیا گیا ہے۔ جب ان سے سوال ہوتا۔ کہ پھر تم ان سے جنگ کیوں کرتے ہو تو کہتے۔ کہ اپنے حلیف کو ذلت سے
بچانے کے لئے اس آیت میں ان کے اس فعل پر ملامت کی جا رہی ہے۔ کہ اے یہودیو تم سے تو چار عہد لئے گئے تھے۔ آپس میں قتال
نہ کرنا کسی کو جلاوطن نہ کرنا اپنی قوم کے مقابل دشمن کو امداد نہ دینا اور قیدیوں کو چھوڑانا اس کے کیا معنی کہ تم نے تین حکموں کو تو نہ مانا اور ایک پر عمل
کیا گیا بعض کتاب ماننے کے قابل ہے۔ اور بعض انکار کے لائق جو قوم ایسی حرکتیں کرے گی۔ وہ دنیا میں رسوا اور آخرت میں سخت عذاب
کے مستحق ہوگی چنانچہ دنیا میں تو ان کی رسوائی یہ ہوئی۔ کہ سنہ ۳ ہجری میں بنی قریظہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کر دیئے گئے۔ کہ ایک دن میں ان

کے سات سو آدمی مارے گئے۔ اور بنی نضیر مدینہ منورہ سے نکال کر خیبر میں رکھے گئے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں وہاں سے بھی نکال دیئے گئے۔ یہ لوگ بارگاہ مصطفوی سے ایسے نکلے کہ اب تک ان کا کہیں ٹکانا نہیں ہے۔ اب بھی جرمنی وغیرہ کے نکالے ہوئے یہود دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اور انشاء اللہ قیامت تک ایسے ہی پھریں گے۔ ان کے قتل اور جلاوطنی کی وجہ آئندہ بیان ہوگی حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اوس اور خزرج قبیلوں کو دولت ایمان دے کر آپکے آپس کی صد سالہ جنگ کو ختم فرما دیا۔ اور انہیں آپس میں شیر وشکر بنا دیا۔ اب انہیں جماعتوں کا نام انصار ہے جن کے بہت فضائل قرآن پاک میں بیان ہوئے۔ اور جن کی جانی اور مالی قربانیوں کی قیامت تک یادگار رہیگی بلکہ یوں سمجھو کہ یہ قوم ہی اشاعت اسلام کا ذریعہ بنی۔ واہ ارے تیری بے پروائیاں جس سے چاہے اپنا کام لے لے۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** ظلم اور حرام پر مدد دینا بھی حرام ہے۔ سود لینا دینا دلوانا لکھنا گواہی بننا وغیرہ وغیرہ سب حرام ہے **دوسرا فائدہ** حرام قطعی کو حلال جاننا کفر ہے۔ بنی اسرائیل نے قتل و غارت کو حلال جانا انہیں کافر کہا گیا۔ **تیسرا فائدہ** کتاب الٰہی کے ایک حکم کا انکار بھی کفر ہے۔ جیسے کہ ساری کتاب کا انکار اسی طرح ایک پیغمبر کا انکار بھی کفر ہے جیسے کہ سب کا انکار **چوتھا فائدہ** کفر کے ہوتے نیک کام بیکار ہے جیسے یہود کا قیدیوں کو چھڑانا بے کار ہوا **پانچواں فائدہ** کسی کی طرفداری میں دین کی مخالفت کرنے سے علاوہ اخروی عذاب کے کبھی دنیا میں بھی رسوائی آجاتی ہے **چھٹا فائدہ** جو دوسروں کی دوستی میں اپنی قوم کو ذلیل کرے گا۔ وہ خود ذلیل ہو جائیگا جوڑنے کے رشتوں کو جوڑو اور توڑنے کے رشتوں کو توڑو **تنبیہ** کاش کہ اس زمانہ کے عام دیوبندی اور وہابی اس راز کو سمجھ جاتے انہوں نے ہمیشہ مشرکین اور کفار سے محبت رکھی اور مسلم قوم کو ان پر قربان کیا نجدیوں نے حرمین شریفین کی زمین سے صحابہ کرام کی قبروں کو بھی اکھڑوا دیا۔ لیکن اسی زمین پاک میں عیسائیوں کو پہنچایا اور جدہ شریف میں عیسائیوں کی پختہ قبریں بننے کی اجازت دی۔ بلکہ زمین حرم امریکہ کمپنی کے ہاتھ کان کنی کے ٹھیکے کے بہانہ فروخت کر ڈالی ہندوستان کے دیوبندیوں نے جمیعت علماء احرار حکومت الٰہیہ وغیرہ کے ناموں سے ہمیشہ ہندوؤں کی ہمنوائی کی اور مسلم قوم کو پائمال کیا یہود قتال کرکے اپنے قیدیوں کو چھوڑ لیتے تھے۔ ان سے یہ بھی نہ ہو سکا۔ یہ یہودیوں سے بھی قومی دشمن ہیں چار نمبر آگے ہیں۔ **ساتواں فائدہ** جائز وعدوں کا پورا کرنا اور ناجائز وعدوں کا توڑ دینا ضروری ہے۔ بنی اسرائیل نے اوس اور خزرج سے ناجائز وعدے کئے۔ اور پھر ان پر قائم رہے۔ اس پر رسوائی اور عذاب کے مستحق ہوئے کیونکہ سب سے بڑھ کر وہ وعدہ ہے۔ جو ہم نے رب سے کیا اس کے مقابل سارے وعدے باطل اور توڑنے کے قابل ہیں کسی نے اپنے دوست سے وعدہ کیا کہ آج شام کو ہم دونوں شراب پئیں گے۔ اس کا توڑنا ضروری ہے کیونکہ ہم نے مسلمان ہو کر رب سے وعدہ کیا ہے۔ کہ شراب نہ پئیں گے۔ اسی لئے ناجائز کام کی قسم توڑنا اور کفارہ ادا کرنا واجب ہے۔ **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ ظلم پر مدد کرنا بھی ظلم ہے۔ تو حق تعالیٰ نے ظالم کو ظلم پر قدرت کیوں دی یہ بھی ظلم پر مدد ہے۔ **جواب**۔ رب نے ظلم پر قدرت دیکر اس سے منع بھی فرمایا۔ اور بہت ڈرایا ہے۔ مگر انسان جب ظالم کی مدد کرتا ہے۔ تو اسے ظلم کی رغبت دیتا اور اس سے ظلم کرواتا ہے۔ لہذا رب کا قدرت دینا ظلم پر امداد نہیں۔ قدرت محض اس لئے دی گئی ہے۔ کہ بندہ اس پر قدرت پاکر اس سے بچے اور ثواب کا مستحق ہو **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ ان یہود کا آپس میں جنگ کرنا دنیوی وجہ سے تھا۔ تو زیادہ سے زیادہ یہ حرام ہونا چاہیئے۔ اسے کفر کیوں کہا گیا۔ آج بھی مسلمان بہت سی ناجائز حرکتیں کرتے ہیں۔ انہیں کافر نہیں کہا جاتا۔ **جواب** یا تو وہ لوگ یہ حرکتیں حلال سمجھ کر کرتے تھے لہذا کافر ہوئے۔ اور یا اس لئے کہ شریعت میں بعض بڑے گناہ کو بھی کفر کہہ دیا جاتا ہے۔ کہ وہ کافروں کا سا کام ہے جس طرح ہم کسی ذلیل حرکت کرنیوالے کو کہدیں کہ تو بھنگی ہے یعنی تو بھنگیوں کے سے کام کرتا ہے۔ اور اس سے مقصود یہ ہے۔ کہ وہ اس کام کو نفرت کرکے چھوڑ دے۔ جیسے کہ حدیث شریف میں ہے۔ کہ جس نے قصداً نماز چھوڑ دی وہ کافر ہو گیا۔ خیال رہے۔ کہ یہ دوسرا جواب مولوی اشرف علی صاحب کا ہے۔ اور یہ سخت ضعیف ہے۔ کیونکہ اس آیت اور اگلی آیت سے

معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں حقیقی کفر ہی مراد ہے۔ لہٰذا جواب اوّل جو حضرت صدر الافاضل دام ظلہم نے اپنی تفسیر خزائن العرفان میں دیا نہایت قوی ہے **تیسرا اعتراض** یہاں فرمایا گیا۔ کہ یہ یہودی سخت عذاب میں لوٹائے جائیں گے۔ چاہیئے یہ کہ سخت عذاب دہریوں کو ہو جو کہ خالق کے ہی منکر ہیں کیونکہ ان کا کفر بھی سخت ہے **جواب** اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ جس عذاب میں وہ جائیں گے۔ وہ دنیا کے عذاب سے سخت ہوگا۔ اگرچہ بعض دیگر کفار کے عذاب سے نرم ہو تفسیر کبیر **چوتھا اعتراض** اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ میں اگر هٰٓؤُلَآءِ اَنْتُمْ کی خبر ہو تو ترکیب صحیح نہیں ہوتی۔ کیونکہ مبتدا خبر میں فرق چاہیئے یہاں دونوں ایک ہی ہیں۔ نیز اَنْتُمْ حاضر ہے۔ اور هٰٓؤُلَآءِ غائب **جواب** اس کے جوابات تفسیر میں گذر گئے۔ کہ اَنْتُمْ سے ان کی ذات مراد ہے۔ اور هٰٓؤُلَآءِ سے ذات مع صفت وغیرہ **تفسیر صوفیانہ**۔ قیدی چھوڑانا بہت اچھا کام ہے۔ اسی لئے اس آیت میں جنگ کرنے جلاوطن کرنے کو حرام فرمایا۔ نہ کہ چھوڑانے کو قیدی دو قسم کے ہیں۔ ایک جسم کے قیدی دوسرے کے قلب کے جسم کے قیدی مال وغیرہ سے چھوٹتے ہیں۔ اور قلب کے قیدی دیگر چیزوں سے کمند ہوا کے قیدی کی رہائی صدق (ہدایت) سے ہے۔ محبت دنیا کے قیدی کی خلاصی ذکر موت سے ہے۔ وسواس شیاطین کے قیدی کا فدیہ دلائل براہین اور یقین ہے۔ تاکہ وہ شکوک اور تخمین سے بچ جاوے تکبر کے قیدی کی نجات پیری حق اکبر ہے۔ لیکن بعض عشق کے قیدی ہیں۔ ان کا نہ کوئی فدیہ ہے۔ اور نہ کوئی چھٹکارے کا راستہ کیونکہ عشق کے قیدی کی دیت اس کے مقتول کا قصاص اس کے مربوط کا خلاصی نہیں بلکہ اس تک ہر ایک کی رسائی بھی نہیں۔ کیونکہ یہ مقام اولیاء کاملین کا ہے۔ طالب صادق کو ضروری ہے۔ کہ اپنے کو گذشتہ قیدوں سے نکال کر محبوب کے اس جال میں پھنسائے۔ تاکہ دنیوی رسوائی سے نجات پائے۔ کیونکہ اس جگہ بہت جانچ پرکھ کر قبولیت ہوتی ہے۔

| |
|---|
| اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ |
| یہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے خرید لیا زندگی دنیاوی کو بعوض آخرت کے پس نہ ہلکا کیا جاویگا ان سے |
| یہ ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے آخرت کے بدلہ دنیا کی زندگی مول لی۔ تو نہ ان پر سے |
| الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ |
| عذاب اور نہ وہ لوگ مدد کئے جاویں گے |
| عذاب ہلکا ہو اور نہ اُن کی مدد کی جاوے۔ |

ع ۱۰

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق** پہلے یہود کے بعض عیوب اور کچھ خوبیاں (قیدی چھوڑانا) بیان کی گئی تھیں جس سے وہم ہوتا تھا کہ شاید ان کے جزا بھی ملی جلی ہوگی کچھ عذاب اور کچھ انعام۔ اس آیت میں اس وہم کو دفع کیا گیا۔ کہ چونکہ وہ اپنی آخرت دنیا کے عوض بیچ چکے یعنی کافر ہو چکے۔ اس لئے وہ صرف عذاب ہی پائیں گے۔ **دوسرا تعلق** پچھلی آیت سے شبہ ہوتا تھا۔ کہ وہ یہودی مومن تو نہیں۔ اسی لئے وہ قیدیوں کو چھڑاتے ہیں۔ ہاں کبھی دنیا میں پھنس کر گناہ بھی کر بیٹھتے ہیں یہاں فرمایا گیا کہ نہیں وہ جو نیک کام کرتے ہیں۔ وہ بھی دنیوی عزت کے لئے انہیں آخرت کا کوئی خوف نہیں۔ لہٰذا ان کی کوئی نیکی نیکی ہی نہیں **تیسرا تعلق** اس سے پہلے فرمایا گیا تھا کہ یہودی دنیا میں خوار اور آخرت میں عذاب میں گرفتار ہوں گے۔ اب اس کی وجہ بتائی جا رہی ہے۔ کہ انہوں نے آخرت کے نفع کیلئے اپنے پاس کوئی چیز رکھی ہی نہیں۔ یہ تو اس تاجر کی طرح ہیں جس نے اپنی پونجی بھی ضائع کر دی ہو۔ لہٰذا ان کی یہی سزا چاہیئے **چوتھا تعلق** پہلے یہود کی جہالتوں کا ذکر تھا۔ اب ان کی خباثت اور شرارت کا بیان [illegible] ان کے [illegible] بیان [illegible]۔ اور [illegible]

ہیں **تفسیر** **اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ** یہ مسلمانوں سے خطاب ہے کہ اے مسلمانو تم نے جن کے اوصاف قبیحہ سن لیئے جانتے ہو کون ہیں یہ وہ ہیں جنہوں نے **اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ** آخرت کے عوض دنیوی زندگی خرید لی یعنی آخرت کے مقابل اسے اختیار کر لیا مثلاً اگر اُن کے سامنے کوئی ایسی چیز آئی جو دنیا کے واسطے نافع اور آخرت کیلئے مضر ہے۔ تو انہوں نے آخرت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے۔ اسے بے تامّل لے لیا۔ اور جب کوئی ایسی چیز پائی جو آخرت کیلئے نافع ہے۔ اور ان کی دنیا کے لئے مضر تو اسے بے کھٹک چھوڑ دیا۔ نیز رب کو چھوڑ کر دنیا والوں کی خوشامد میں مشغول رہے۔ تو اب یہ لوگ آخرت کے کس نفع کے امیدوار ہیں۔ ان کی سزا یہ ہے۔ کہ **فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ** کہ رب کی طرف سے ان کا عذاب کبھی ہلکا نہ کیا جائے گا کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا اخروی نفع ہے اور رب کا کرم جس سے وہ بالکل محروم ہیں۔ **وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ** اور نہ اُن کی بیرونی امداد کی جائیگی یعنی جیسے کہ دنیوی مصیبت کے وقت اپنے حمائیتیوں کی مدد کی امید رکھتے ہیں۔ وہاں ایسا نہ ہوگا۔ نہ تو کوئی اُن کی شفاعت کریگا۔ اور نہ کوئی رب کے مقابلہ میں زور ور سے ان کی حمائیت **خلاصۂ تفسیر** یہ یہودی جن کے یہ کرتب ہیں۔ کہ ہر کام دنیا کیلئے کرتے ہیں۔ آخرت کا کبھی دل میں خیال بھی نہیں لاتے اور آخرت کے عوض دنیا قبول کر چکے۔ یہ کس منہ سے کہتے ہیں کہ ہمیں کچھ روز عارضی عذاب ہو کر چھٹکارا ہو جائیگا۔ غلط ہے۔ بلکہ اُن کے عذاب میں کسی قسم کی تخفیف نہ ہوگی۔ نہ تو موقوف کر کے اور نہ ہلکا کر کے اور نہ انہیں کوئی بیرونی امداد پہنچے **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** جو شخص دنیا کی خاطر کوئی نیک کام کرے یا برائی سے بچے وہ کچھ نفع نہ پائیگا۔ مثلاً ایک شخص شراب سے اسلئے بچتا ہے۔ کہ وہ اسے نقصان دیتی ہے۔ چوری اس لئے نہیں کرتا۔ کہ اس سے بدنامی اور جیل ہوگی۔ وہ اس کا کوئی ثواب نہ پائے گا۔ کیونکہ اتباع شریعت سے نہ چھوڑا۔ جیسے کہ ان یہودیوں کا قیدی چھوڑانا تھا۔ بلکہ ریاکاری کی عبادت بھی بے فائدہ ہے۔ اگرچہ اس سے شرعی فرض ادا ہو جاتا ہے۔ **دوسرا فائدہ** عذاب میں کمی نہ ہونا اور بیرونی امداد کا نہ پہنچنا صرف کفار کے لئے ہے۔ الحمدللہ کہ گنہگار مسلمان کے لئے عذاب قبر و حشر میں بھی کمی ہوگی۔ اور بیرونی مدد بھی پہنچیگی چنانچہ جمعہ اور ماہ رمضان میں مومن کے عذاب قبر میں کمی ہوتی ہے۔ اور انشاءاللہ آخرت میں بھی عذاب منقطع ہو جائے گا۔ اور ویسے بھی کمی ہوتی رہے گی۔ اس طرح مومن کے نیچے علماء۔ اولیاء اللہ انبیاء کرام شفاعت اور ایصال ثواب سے اس کی امداد کرتے ہیں۔ اور کریں گے۔ اسی لئے زندوں کو حکم ہے۔ کہ اپنے مردوں کے صدقہ و خیرات وغیرہ سے امداد کریں۔ **تیسرا فائدہ** مسلمان کیسا بھی گناہگار ہو۔ مگر وہ آخرت کے عوض دنیا نہیں خریدتا گناہ کر کے شرمندہ ہوتا ہے۔ اور دل میں خوف رکھتا ہے بلکہ اگر اچھی صحبت پائے تو برائیوں سے بچنے بھی لگتا ہے لہذا یہ آیت اُس پر ہرگز چسپاں نہیں ہو سکتی **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ کفار کے عذاب میں کبھی تخفیف نہ ہوگی۔ حالانکہ بخاری[1] کی روایت میں ہے کہ ابولہب کے عذاب میں اس لئے تخفیف ہو جاتی ہے کہ اس نے حضور کی ولادت کی خوشی منائی تھی۔ اب اس آیت اور حدیث میں کس طرح مطابقت کی جائے **جواب** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یہ حکم خاص ان کافروں کے لئے ہے جن میں مذکورہ عیوب ہوں۔ نہ کہ ہر کافر کے لئے بعض کفار پر اُن کے اعمال کی وجہ سے عذاب ہلکا ہو جاتا ہے۔ جیسے حاتم طائی وغیرہ دوسرے یہ کہ ایسے کافروں کیلئے اوّل سے ہی ہلکا عذاب مقرر ہوتا ہے۔ نہ یہ کہ پہلے عذاب سخت ہو۔ اور بعد میں ہلکا کیا جائے جس کی اس آیت میں نفی ہو رہی ہے۔ مثلاً ابولہب کے لئے اوّل ہی سے یہ مقرر ہے۔ کہ جب وہ جہنم میں اپنی انگلی چوسے تو اس کی پیاس بجھ جائے **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ کفار کی امداد بھی نہ کی جائے گی۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے اپنے چچا ابوطالب کی اُن کے وفات کے بعد بہت بڑی امداد فرمائی۔ کہ انہیں جہنم میں پایا تو وہاں سے نکال کر آگ کے چھچھرے میں رکھ دیا۔ لہذا اب وہ عین جہنم میں نہیں۔ بلکہ اس سے علیحدہ ہیں۔ جہاں اُس کی تپش پہنچ رہی ہے۔ یہ بھی کافر کی امداد ہے **جواب** اس کے بھی دو جواب ہیں ایک یہ کہ کفار کے لئے عذاب ختم کرنے کی امداد نہ ہوگی تخفیف کی امداد ہو سکتی ہے دوسرے

[1] بخاری جلد دوم ص کتاب النکاح

یہ اُن کی دھونس کی امداد نہ ہوگی۔ کہ کوئی رب تعالیٰ پہ جبر کرکے اُن کو چھوڑ لے۔ ہم انشاء اللہ آیت الکرسی کی تفسیر میں عرض کریں گے۔ کہ حضور کی شفاعت سات قسم کی ہے۔ اور بعض شفاعتوں سے کفار بھی فائدہ حاصل کریں گے **تفسیر صوفیانہ** دنیا اور آخرت اُن سوکنوں کی طرح ہیں جن کا اجتماع ناممکن جو چاہے۔ کہ میں دنیا کی لذتوں میں پھنسا رہوں۔ اور آخرت بھی ہاتھ سے نہ جائے وہ بے وقوف ہے۔ حق تعالیٰ نے ہر شخص کو موقعہ دیا ہے۔ کہ ان میں سے جو چاہے اختیار کرلے جو شخص کہ ان میں سے ایک کے حاصل کرنے میں مشغول ہوگا۔ وہ دوسری کھو بیٹھے گا یہود کے پاس توریت اور دامن نبی تھا۔ انہوں نے اس کو چھوڑ کر دنیوی لذات کو اختیار کیا۔ اور اس تجارت میں نفع نہ پایا۔ یا یوں سمجھو کہ دنیا اور آخرت ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں۔ کہ ایک کے بھاری ہونے سے دوسرا ہلکا ہو جاتا ہے۔ خیال رہے۔ کہ صوفیاء کے نزدیک دنیا وہ ہے۔ جو رب سے غافل کردے۔ بال بچوں کا پالنا سنت سمجھ کر حلال روزی تلاش کرنا عین دین ہے۔ چاہیئے تو یہ کہ دل کے پلڑے میں دین رہے۔ اور ظاہر اعضاء دنیوی کاروبار کریں اور زبان مثل ترازو کی ڈنڈی کے استعمال ہو۔ اسی لئے اس کو بھی لسان کہتے ہیں۔ اور ترازو کی ڈنڈی کو بھی۔

**وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى**

اور البتہ تحقیق عطا کی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور پیچھے بھیجا ہم نے اُن کے بعد رسولوں کو اور عطا کیں ہم نے عیسیٰ

اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ

**ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا**

بیٹے مریم کو کھلی نشانیاں اور قوت دی ہم نے اُنکو ساتھ روح پاک کے کیا پس جب کبھی لائے تمہارے پاس کوئی رسول اُس کو جو کہ

ابن مریم کو کھلی نشانیاں عطا فرمائیں اور پاک روح سے اُس کی مدد کی تو کیا جب تمہارے پاس کوئی رسول وہ حکم لیکر آئے

**لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾**

نہیں خواہش کرتے نفس تمہارے تو غرور کیا تم نے پس ایک گروہ کو جھٹلایا تم نے اور ایک گروہ کو قتل کرتے ہو تم۔

جو تمہارے نفس کی خواہش نہیں تکبر کرتے ہو تو ان (انبیاء) میں ایک گروہ کو تم جھٹلاتے ہو۔ اور ایک گروہ کو شہید کرتے ہو۔

**تعلق** ۔اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق** اس سے پہلے موجودہ بنی اسرائیل کے ایمان سے مایوسی کی چند وجہیں کی گئیں۔ اب بھی اسی کی ایک بہت بڑی وجہ بیان کی جارہی ہے۔ کہ یہ لوگ تو ایسے نفس پرست اور دنیادار ہیں۔ کہ انہوں نے نفسانی خواہش کی ماتحتی بہت سے پیغمبروں کو شہید کر دیا۔ ان کے ایمان کی کیا امید **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں یہود کا آپس میں قتال کرنے کا ذکر تھا۔ اب انبیاء کرام کو شہید کرنے کا تذکرہ ہے۔ جو کہ اس سے کہیں بدتر گناہ ہے **تیسرا تعلق** پچھلی آیت کے مضمون کا یہی سرپا انکار کر سکتے تھے۔ کہ ہم ان حرکات کی وجہ سے بے شک گنہگار ہیں۔ مگر کافر نہیں۔ کیونکہ آپس کی جنگ فسق ہے کفر نہیں اور فاسق عارضی عذاب پاکر نجات پائیگا۔ اس آیت میں اس کا جواب دیا جارہا ہے۔ کہ بعض گناہ انکار کی علامت ہیں۔ ان کا کرنے والا کافر ہوتا ہے۔ تم منکر ہو کر جنگ کرتے ہو۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ تم اس سے پہلے ہمارے پیغمبروں کو شہید کر چکے ہو۔ کہو وہاں کیا بہانہ کرو گے **تفسیر وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ** ۔لفظ موسیٰ کی تحقیق وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰى کی تفسیر میں ہو چکی۔ الکتاب سے خاص کتاب توریت مراد ہے جس میں

رب تعالیٰ کے سارے عہد و پیمان موجود تھے۔ اور سب سے بڑا عہد یہ تھا کہ ہر وقت کے پیغمبروں کی اطاعت کرو۔ ان پر ایمان لاؤ ان کی تعظیم و توقیر کرو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو توریت کی تختیاں ملیں۔ تو وہ اٹھا نہ سکے۔ حق تعالیٰ نے ایک ایک آیت اٹھانے کے لئے ایک ایک فرشتہ مقرر کیا۔ وہ بھی نہ اٹھا سکا۔ پھر ایک ایک حرف کے لئے ایک فرشتہ بھیجا۔ اس سے بھی نہ اٹھ سکا۔ جب اس کتاب کی عظمت ظاہر ہوگئی تب اس کو موسیٰ علیہ السلام کے لئے ہلکا کر دیا گیا۔ اور وہ اٹھا کر بنی اسرائیل کے پاس لائے چونکہ پوری توریت لکھی ہوئی ایک دم عطا ہوئی تھی۔ اور غالباً بغیر فرشتہ کے ذریعہ براہ راست رب کی طرف سے ملی تھی اس لئے یہاں آتینا فرمایا گیا۔ یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بڑی کتاب ایک دم عطا فرمائی اور اس کتاب کی حمایت کے لئے **وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ** ان کے بعد ہم نے بہت سے پیغمبر بھیجے لفظ قَفَّيْنَا۔ قفاءٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پشت یا قدم کے نشان رُسل رسول کی جمع ہے۔ معنی ہیں بھیجے ہوئے پیغمبر نبی اور رسول میں یا تو محض اعتباری فرق ہے یعنی چونکہ وہ غیب کی خبریں دیتے ہیں۔ اس لئے وہ نبی ہیں۔ اور چونکہ انہیں خدا نے تبلیغ کے لئے بھیجا ہے۔ اس لئے وہ رسول یا یوں کہو۔ کہ جو تبلیغ احکام کے لئے آئے وہ نبی۔ اور جو اس کے ساتھ ساتھ نئی یا پرانی کتاب بھی رکھتے ہوں۔ وہ رسول اور جو پیغمبر کہ نئی کتاب اور نئی شریعت لے کر آئیں۔ وہ مرسل اسی لئے کہا جاتا ہے۔ کہ نبی ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش ہیں۔ اور رسول تین سو تیرہ کم و بیش۔ مرسل چار ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام۔ داؤد علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی آخر الزمان صلے اللہ علیہ وسلم پہلے معنی سے موسیٰ علیہ السلام کے پہلے پیغمبر بھی رسول کہلائیں گے۔ دوسرے معنی سے ان حضرات کو نبی ہی کہا جائیگا نہ کہ رسول اور رسولوں کا سلسلہ موسےٰ علیہ السلام سے شروع ہوگا کیونکہ آپ ہی پہلے صاحب کتاب پیغمبر ہیں۔ اس جملہ کے معنی یہ ہوئے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور پیغمبروں کو بھی ان کے قدم بقدم چلایا یا ان کے پیچھے ہم نے اور رسول بھیجے مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت موسےٰ و عیسیٰ علیہم السلام کے درمیان چار ہزار پیغمبر گذرے جن میں سے بڑے بڑے پیغمبر حضرت یوشع۔ الیاس۔ یسع۔ شموئیل۔ داؤد سلیمان۔ شعیا۔ ارمیا۔ یونس۔ عزیر۔ حزقیل۔ زکریا۔ یحییٰ۔ شمعون علیہم السلام ہیں۔ یہ سب حضرات توریت شریف کے احکام کی تبلیغ فرماتے تھے۔ اور ان کی ایک ہی شریعت تھی (تفسیر کبیر و عزیزی) اور بنی اسرائیل سے احکام الٰہی ادا کرنے میں جو سستی ہو جاتی اس کو دور کرتے تھے اور اسی طرح بے عمل عالم جو توریت کو بگاڑ دیتے تھے یہ انبیاء کرام اس کی اصلاح فرماتے تھے۔ ہمارے حضور علیہ السلام پر چونکہ سلسلہ نبوت ختم ہوگیا۔ لہٰذا اس دین کی حفاظت کے لئے علماء ربانی مجددین اور اولیاء پیدا فرمائے گئے جن کا سلسلہ قیامت تک ان شاء اللہ رہیگا۔ اسی لئے روایت میں آیا کہ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہوں گے۔ یعنی ان کی طرح دین مصطفےٰ علیہ السلام کی حفاظت اور اشاعت کریں گے۔ ابو داؤد شریف کی روایت میں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر سو برس پر ایک مجدد بھیجے گا جو ان کے دین کی تجدید یعنی درستی اور تازگی کرے گا۔ اور واسطے اسرائیلیو۔ اگر تم یہ بہانہ کرو کہ چونکہ ان پیغمبروں کے پاس موسیٰ علیہ السلام کی طرح بڑے بڑے معجزے نہ تھے جس سے ہمارے بزرگوں کو ان کی نبوت میں شبہ ہوا اور غلطی سے انہیں شہید کر ڈالا۔ تو بھی تم [illegible] کیونکہ **وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ** ہم نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو کھلے ہوئے معجزے عطا فرمائے۔ چونکہ عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے پیغمبر شریعت موسوی کے مبلغ تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے شریعت موسوی کے اکثر احکام منسوخ فرمائے اس لئے آپ کا ذکر مستقل طور پر علیحدہ کیا گیا۔ آپ کا اسم شریف یسوع ہے جس کے معنی ہیں مبارک اسی سے لفظ عیسیٰ بنا لفظ عیسیٰ بھی عبرانی ہے۔ اور ان دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ آپ نے پیدا ہوتے ہی فرمایا تھا۔ کہ **وَجَعَلَنِىْ مُبٰرَكًا** رب نے مجھے برکت والا بنایا آپ کی ذات سے بہت سی [illegible] برکتیں ظاہر ہوئیں اور قیامت کے قریب نازل ہو کر [illegible] برکتیں ظاہر ہوں گی چونکہ آپ کی پیدائش بغیر باپ کے ہے اس لئے قرآن کریم نے ہر جگہ انہیں ان کی والدہ کی طرف نسبت کرکے ابن مریم فرمایا۔ باقی کسی پیغمبر کی ولدیت

نہ لیا۔ مریم کے لفظی معنی ہیں خادمہ اور عابدہ چونکہ ان کی والدہ نے انہیں بیت المقدس کی خدمت کیلئے وقف کر دیا تھا۔ اور یہ بچپن ہی سے
نہایت عبادت گزار تھیں۔ اس لئے اسکا نام مریم ہوا۔ انکی یہ خصوصیت ہے کہ قرآن کریم نے سات جگہ انبیاء کرام کے ساتھ ان کا ذکر فرمایا
ہے۔ اور انبیاء کرام کی طرح ہی خطاب بھی فرمایا۔ یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ آپ اپنے زمانہ میں سارے جہان کی عورتوں سے افضل تھیں
رب فرماتا ہے وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ۔ الْبَیِّنٰتِ بینۃ کی جمع ہے جسکے معنی ہیں روشن معجزہ عیسیٰ علیہ السلام کو بہت
بڑے بڑے معجزے عطا ہوئے۔ اولاً تو آپ بذات خود معجزہ تھے۔ پھر مردوں کو زندہ کرنا۔ مادر زاد اندھے اور کوڑھیوں کو تندرست کرنا مٹی
کا پرندہ بنا کر پھونک مار کر اصلی پرندہ بنا دینا۔ غیب کی خبریں دینا۔ توریت پاک کا خود بخود سیکھ لینا وغیرہ۔ یہ وہ معجزات ہیں۔ جو موسیٰ علیہ السلام کے
معجزوں سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کے علاوہ۔ ایک خاص چیز ان کو عطا فرمائی گئی جو موسےٰ علیہ السلام کو بھی نہ ملی وہ یہ کہ وَاَیَّدْنٰہُ
بِرُوْحِ الْقُدُسِ ہم نے انہیں پاک روح سے قوت دی اَیَّدْنَا اَیْدٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں قوت اور مضبوطی تائید قوی کرنا روح
القدس صفت موصوف ہیں جسکے معنی ہیں پاک روح۔ روح ریح سے ریح کے معنی ہیں ہوا۔ روح وہ ہوا کہلاتی ہے۔ جو جاندار کے مسامات
میں پھر کر اس کو زندہ رکھتی ہے (تفسیر کبیر) قدس بمعنی مقدس یہاں اس سے یا تو حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں کیونکہ آپ خود روحانی ہیں۔
اور آپ میں روح بخشی کی تاثیر ہے حضرت مریم کو پھونک سے فرزند دے دیا۔ اور آپ کے گھوڑے کے سم کی خاک سے سامری کا
بچھڑا زندہ ہو گیا۔ یا اس لئے کہ آپ وحی لاتے ہیں جو کہ دلوں کی زندگی ہے عیسیٰ علیہ السلام تینتیس سال کی عمر شریف میں آسمان پر
اٹھائے گئے اس عرصہ میں ہر وقت جبریل آپ کے ساتھ رہے۔ بلکہ یوں سمجھو۔ کہ حضرت مریم کو بچپن شریف میں جنت سے میوے لا کر
انہیں نے کھلائے عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت انہیں نے ان کو شیطان سے محفوظ رکھا۔ ساری عمر یہودیوں کے فریب سے
انہیں نے ان کو بچایا اور آخر کار یہی ان کو آسمان پر لیگئے۔ غرضکہ حضرت جبریل عیسیٰ علیہ السلام کے خادم خاص ہیں۔ یا روح القدس وہ اسم
الٰہی ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ اور بیماروں کو تندرست کرتے تھے۔ یا روح القدس سے خود آپ کی ہی روح مراد ہے
تفسیر عزیزی نے اس جگہ فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح ملکی تھی۔ اور آپ بہت سے بشری عوارض سے پاک تھے۔ تفسیر روح البیان
شریف نے ایک جگہ فرمایا کہ آپ نصف بشر اور نصف ملک ہیں کیونکہ آپ کی پیدائش بھی بشر اور ملک سے ہی ہے۔ کچھ بھی ہو۔ یہ آپکی
بڑی خصوصیت ہے۔ اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ یہ موجودہ یہودیوں سے خطاب ہے۔ اگرچہ یہ حرکات انکے اگلوں نے کی تھیں؛
لیکن چونکہ یہ ان کے حمائتی یا طرفدار و مددگار تھے۔ اس لئے ان سے ہی فرمایا گیا۔ کہ جب کبھی ان پیغمبروں میں سے کوئی پیغمبر تمہارے
پاس وہ احکام لے کر آئے۔ کہ بِمَا لَا تَهْوٰٓی اَنْفُسُکُمُ جو تمہارے دل نہ چاہتے تھے۔ اور تمہاری نفسانی خواہشوں کیخلاف
تھے۔ تو تم نے بجائے اطاعت کرنے کے اور توریت کے عہد کو پورا کرنے کے اِسْتَکْبَرْتُمْ تکبر کیا اور اس کے قبول
کرنے سے انکار کیا۔ اور صرف اسی پر تم نے صبر نہ کیا۔ بلکہ فَفَرِیْقًا کَذَّبْتُمْ ان میں سے ایک جماعت کو تم نے جھوٹا کیا۔ یعنی خود تو
اطاعت سے باز رہے۔ اور دوسروں کو بھی باز رکھا۔ بلکہ جس پر تمہارا بس چلا وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ۔ اس فریق کو تم قتل بھی کر دیتے تھے چونکہ
جھٹلانا ایک بار ہی ہوتا ہے۔ اور قتل کی تدبیریں اور سازشیں بار بار ہوتیں ہیں۔ اور عرصہ تک رہتی ہیں۔ اور قسم قسم کی ہوتی ہیں۔ اس لئے
جھٹلانے کو ماضی کے صیغہ سے کَذَّبْتُمْ فرمایا گیا اور قتل کرنے کو مضارع کے صیغہ سے **خلاصہ تفسیر** اے بنی اسرائیل تمہارا یہ آپس کا
کشت و خون یا نبی آخر الزمان کی مخالفت غلطی اور خبط سے نہیں۔ بلکہ سرکشی اور عناد سے ہے جس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے۔ کہ ہم نے
موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو توریت جیسی عظیم الشان کتاب عطا فرمائی اور اسی پر کفایت نہ کی۔ بلکہ ان کے بعد ہزارہا پیغمبر
بھیجے جو موسیٰ علیہ السلام کی حمایت اور توریت شریف کی اشاعت اور تم کو ہدایت کرتے رہے۔ اور سب سے آخر میں تمہارے پاس

کنواری بتول مریم کا وہ پاک ستھرا بیٹا عیسیٰ ابن مریم بھی تشریف لایا علیہ السلام جو اولاً تو سر سے پاؤں تک خود معجزہ تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی معجزات اُس کے دست شریف میں تھے۔ اُس کی مبارک پھونک سے بیجان جاندار ہوتے تھے۔ کیونکہ اُن کی پیدائش شریف بھی روح الامین کی پھونک سے ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ لگنے سے مریض لادوا صحت پاتے تھے۔ وہ تمہارے کھائی غذا اور گھر میں چھپائی ہوئی اشیا کی خبر دیتے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روح الامین جبریل جیسے عظیم الشان فرشتہ اُن کے خاص خدمتگار۔ اور حاضر دربار تھے۔ یہ باتیں تمہارے ایمان پر رہنے کیلئے بہت کافی تھیں۔ لیکن بدنصیبو تم نے ہمیشہ یہ کیا کہ جب رسولوں نے تمہارے خواہشات کے خلاف احکام سنائے تو تم نے اُن کو جھوٹا کہا اُن کی مخالفت کی اسی پر صبر نہ کیا۔ بلکہ ایک جماعت انبیاء کو تم قتل کرنے میں مشغول رہے۔ چنانچہ حضرت شعیا حضرت ذکریا حضرت یحییٰ علیہم السلام تمہارے ہاتھوں ہی شہید ہوئے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی تم نے اپنی دانست میں دار پر کھینچ ہی دیا وہ تو ہماری حمایت سے بچ گئے۔ اور اس نبیوں کے سرتاج صاحب معراج نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ السلام کے شہید کرنے میں تم نے کوئی کسر نہ چھوڑی کبھی تم نے اُن پر جادو کیا۔ کبھی تم نے انہیں دیوار کے نیچے بٹھا کر باتوں میں لگا کر قتل کے ارادہ سے دھوکہ سے ایک بھاری پتھر اوپر سے پھینکا۔ کبھی اُن کو زہر کھلایا۔ بلکہ حق تو یہ ہے۔ کہ ان کی وفات بھی تمہارے ہاتھوں ہے۔ کیونکہ تمہارے زہر کا اثر ہر سال اُن پر لوٹتا ہے جس سے کہ اُن کے گلے میں درد خناق پیدا ہوتا ہے۔ اور بر وقت وفات اسی اثر کا ظہور ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔ لہٰذا تمہارا قتل انبیاء کرنا۔ ابھی جاری ہے۔ کیا تم اپنے انہیں کرتوت پر اپنے کو خدا کو پیارا سمجھتے ہو۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** مومن کی مخالفت بلکہ اس کو قتل کر دینا بھی کفر نہیں جب تک کہ قاتل کا عقیدہ خراب نہ ہو۔ کہ یا تو اس کو جائز سمجھے یا اس کو ایمان کی وجہ سے قتل کرے۔ اسی لئے امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے یزید پلید جیسے ظالم کو بھی کافر کہنے میں تامل کیا کیونکہ اس کا یہ ظلم اپنی باطل حکومت کی خاطر تھا نہ کہ دینی وجہ سے نیز حجاج وغیرہ ظالموں کو کسی نے کافر نہ کہا۔ مگر نبی کی مخالفت یا اُن کی ایذا کیسی ہی کیوں نہ ہو کفر ہے کیونکہ سب مومن ہیں۔ اور وہ ایمان یہاں تک کہ پیغمبر کے کسی فعل کی حقارت کرنی بھی کفر ہے **دوسرا فائدہ** امت مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے علماء اور مشائخ بڑے درجہ والے ہیں۔ کہ اُن سے وہ ہی کام لیا جا رہا ہے۔ جو اگلے بعض نبیوں سے لیا گیا **تیسرا فائدہ** بعض نبی بعض نبیوں کی اطاعت کرتے ہیں۔ جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کی اُن کے بعد والے پیغمبروں نے کی اسی طرح سارے پیغمبر اور رسول ہمارے حضور علیہ السلام کے اُمتی ہیں۔ اس کی تحقیق ہماری کتاب شان حبیب الرحمان میں دیکھو **چوتھا فائدہ** تکبر و غرور نبوت سے دور اور خدا کی رحمت سے مہجور رکھتا ہے۔ **پہلا اعتراض** کسی نبی کا دوسرے نبی کی اطاعت کرنا خلاف عقل ہے۔ کہ اس صورت میں اُسکا دنیا میں آنا بیکار ہے **جواب**۔ ان انبیاء کرام کے بھیجنے سے اگلی شریعت کو محفوظ رکھنا اور امت کو دین پر قائم رکھنا ہے۔ تو گویا یہ مٹے ہوئے دین کو زندہ کرنے کیلئے آتے ہیں (تفسیر کبیر) **دوسرا اعتراض** پھر ان پیغمبروں میں اور موجودہ علماء میں کیا فرق رہا **جواب**۔ بہت فرق ہے۔ اُن کا تقرر رب کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہ خود محنت کر کے عالم بنتے ہیں۔ اُن پر وحی ہوتی ہے۔ ان پر نہیں وہ معصوم ہوتے ہیں یہ نہیں وغیرہ وغیرہ **تیسرا اعتراض** پھر یہ اُمت کس کی اُمت کہلائیگی آیا۔ اس صاحب شریعت پیغمبر کی یا ان مبلغین کی **جواب**۔ یہ لوگ اس صاحب شریعت کی ہی امت کہلائیگی۔ مگر نسبت ان انبیاء کی طرف بھی ہوگی۔ جیسے کہ ہندوستانی لوگ بادشاہ کی بھی رعایا کہلاتے ہیں اور وائسرائے اور گورنر کی بھی **چوتھا اعتراض**۔ داؤد علیہ السلام خود صاحب کتاب تھے انہیں اس جگہ علیحدہ بیان کیوں نہ کیا گیا **جواب** اُن کی کتاب زبور شریف اکثر احکام میں توریت شریف کے موافق تھی۔ نہ کہ مخالف اس لئے اس پر عمل گویا توریت پر ہی عمل تھا۔ اور انجیل شریف توریت شریف کی ناسخ لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر علیحدہ **پانچواں اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام حضور نبی آخر الزمان علیہ السلام سے بھی افضل ہیں۔ کیونکہ اُن کے معجزات نہایت اعلیٰ جبریل امین سے اُن کو خاص امداد اُن کی پیدائش بغیر باپ کے مردوں

کو زندہ کرنا۔ وغیرہ اس کے علاوہ جواب اس کا تفصیلی جواب تو ہماری کتاب شان حبیب الرحمٰن میں دیکھو اور انشاء اللہ اس میں بھی وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ کی تفسیر میں بھی عرض کر دیا جائیگا۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لو کہ سارے انبیاء کرام کے معجزات حضور علیہ السلام میں جمع ہیں مگر اُن کے ظہور کا طریقہ جداگانہ حضور کی طفیل حضور کے بعض غلاموں کو جبریل امین کی تائید حاصل ہوئی حضور کے نعت خواں حضرت حسان رضی اللہ عنہ جب نعت شریف پڑھنے حاضر ہوتے تو ان کیلئے مسجد نبوی شریف میں منبر بچھایا جاتا۔ جب وہ نعت شریف پڑھتے۔ تو حضور علیہ السلام فرماتے اَللّٰهُمَّ اَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اے اللہ تو میرے احسان کو روح القدس سے امداد فرما جنگ بدر میں پانچ ہزار ملائکہ صحابہ کرام کی امداد کے لئے حاضر ہوئے اب بھی طالب علم کے نیچے فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں حضرت ابوبکر صدیق کے غلام اور بعض دیگر صحابہ کرام کی نعشیں آسمان پر پہنچا دی گئیں حضرت خبیب کی نعش زمین میں غائب کر دی گئی۔ یہ تو اس سلطانی چاکروں کی عزت افزائی ہے۔ سلطان کونین کے درجات تک تو کسی کا وہم و گمان بھی نہیں پہنچ سکتا۔ **تفسیر صوفیانہ** جس طرح معدہ اسہال کی گرمی غذا قبول نہیں کرتی اسی طرح نفس کی محبت دنیا عیش پسندی سرداری کی طمع ایمان قبول نہیں کرتی کیونکہ اسلام میں جھکنا ہے۔ اور اس نفس کی خواہش ہے اٹھنا بنی اسرائیل کے کفر کی اصل وجہ یہی تھی جو شخص کامل ایمان چاہتا ہے۔ وہ ان عیوب سے نفس کو پاک کرے اپنے وجود کو خاموشی کے گوشہ میں دفن کر دو۔ تاکہ اس سے پھل دار درخت پیدا ہو شہرت کی خواہش دل سے نکال دو۔ کیونکہ شہرت نے بڑے بڑوں کو گرا دیا۔ شعر

خود کو ایسا مٹا کہ تو نہ رہے ۔۔۔ تجھ میں اپنی خودی کی بو نہ رہے

اس کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ تمہیں جب اپنے اوصاف و کمالات نظر آئیں تو فوراً اپنے گناہوں پر بھی نظر کر لو۔ دوسرے یہ کہ اپنی اصل پر نظر رکھو۔ کہ ہم ناپاک قطرے سے بنے حیض کا گندہ خون پی کر ماں کے پیٹ میں نو ماہ گزارے۔ اب کس چیز پر فخر کرتے ہیں تیسرے یہ کہ دینی معاملات میں اپنے سے اعلیٰ کو دیکھو۔ خیال رہے کہ نفس میں سات عیب ہیں۔ خود پسندی[1] غرور[2]۔ ریاکاری[3]۔ غصہ[4]۔ حسد[5]۔ مال کی محبت[6]۔ اور عزت کی چاہت[7]۔ اور دوزخ کے دروازے بھی سات ہیں۔ جو ان سات عیبوں کو نکالے اس پر انشاء اللہ یہ دروازے بند ہوں گے۔ حضرت ابراہیم ابن ادھم نے اپنے بعض دوستوں کو وصیت فرمائی۔ کہ تم دُم بننا سر نہ بننا کیونکہ سزا کے وقت سر پہ آفت آتی ہے۔ اور دُم بچ جاتی ہے سردار کی بڑی مصیبت ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ شعر

تا توانی بندہ شو سلطان مباش ۔۔۔ زخم کش چوں گوئے شو چوگاں مباش

یعنی بادشاہ بننے کی خواہش نہ کرو۔ بندے بن کر رہو۔ گیند بنو بلا نہ بنو۔ تسبیح کے ہر دانہ میں ایک ڈورا ہوتا ہے۔ اور امام میں دو کیونکہ وہ بڑا ہے۔ شعر

بڑوں کو دکھ بہت ہے چھوٹوں سے دکھ دور ۔۔۔ تارے سب نیارے رہیں گہن چاند اور سور

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ (۸۸)

| اور کہا انہوں نے | دل ہمارے | غلافوں والے ہیں | بلکہ | لعنت کی اُن پر | اللہ نے | بوجہ کفر اُن کے کے | پس بہت کم | ایمان لاتے ہیں یہ |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|

اور یہودی بولے ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہیں۔ بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ان کے کفر کے سبب تو ان میں تھوڑے ایمان لاتے ہیں

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ پہلا تعلق اس سے پہلے موجودہ بنی اسرائیل کے ایمان کی مایوسی کی چند وجہیں بیان ہو چکیں۔ یہاں بھی اسی کی ایک بڑی وجہ کا ذکر ہے کہ اے مسلمانو تمہاری باتیں اُن کے دل میں اترتی ہی نہیں۔ پھر اُن کے دل کا کفر کیسے نکلے۔ دوسرا تعلق پچھلی آیتوں میں گزشتہ انبیاء کے ساتھ یہود کی بدسلوکیوں کا ذکر تھا۔ اب خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برتاؤ کا ذکر ہو رہا ہے تیسرا تعلق یہود قتل انبیاء کے عذر میں فخریہ کہتے تھے کہ اُن کو قتل کرنا ہماری پختگی ایمان کی دلیل ہے۔ کہ جاہلوں کی عجیب باتیں دیکھ کر فریب

کھا جاتے۔ اور اُن کے معتقد بن جاتے تھے۔ لیکن ہم اپنے دین میں اس قدر پختہ ہیں۔ کہ کسی کی کرامات اور معجزات سے دھوکہ نہیں کھاتے اور جو ہمارے مذہب اور قاعدے کے خلاف ہو اسے ہرگز نہیں مانتے کیونکہ ہمارے دل نور کے غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اس آیت میں اس بکواس کی تردید کی جا رہی ہے۔ چونکہ تعلق گذشتہ آیتوں کے مضامین سے مسلمانوں کو امید ہو سکتی تھی۔ کہ شاید موجودہ بنی اسرائیل اپنی ان حرکتوں کو سُن کر نادم ہو جائیں۔ اور ایمان لے آئیں۔ اس آیت میں رب تعالیٰ نے اُن کی ایک بکواس نقل فرما کر مسلمانوں کی اس امید کو ختم فرما دیا۔

**تفسیر** وَقَالُوْا۔ یہ ان یہودیوں کا قول ہے جو حضور علیہ السلام کے زمانہ میں موجود تھے۔ یعنی ان یہودیوں نے حضور علیہ السلام سے مبارک وعظ وغیرہ اور اپنے گذشتہ عیوب سُن کر یہ نامعقول بات کہی۔ کہ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ہمارے دل پردوں میں ہیں۔ غُلْفٌ۔ اغلف کی جمع ہے جس کے معنی ہیں غلاف والا۔ اس عبارت کے چند مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے دل ایسے غلافوں سے ڈھکے ہوئے ہیں جو آپ کی وعظ نصیحت وہاں تک نہیں پہنچنے دیتے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے دل تو خود ہی علم کے غلافوں میں ہیں۔ اور حکمت پر قائم۔ اب ہمیں شریعت محمدیہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ اپنی باتیں جہلا کو سنائیے۔ تیسرے یہ کہ آپ کے اتنے وعظ نصیحت سُن کر بھی ہمارے دل خالی غلافوں کی طرح ہیں وہاں تک کوئی بات نہ پہنچی (تفسیر کبیر) اُن کا مطلب یہ تھا۔ کہ ہمارے دل پیدائش سے ہی پردوں میں ہیں۔ وہاں تک کسی کے وعظ و نصیحت کی رسائی ہی نہیں۔ ایک احتمال یہ بھی ہے۔ کہ اس کلام میں استفہام انکاری ہو کہ کیا ہمارے دل پردوں میں ہیں۔ جو آپ کی بات مان لیں نہیں۔ بلکہ بالکل صاف ہیں۔ ہم نے نہایت صفائی اور دیانت داری سے آپ کے دلائل میں غور کیا۔ مگر قابل قبول نہ پایا۔ رب تعالیٰ نے ان کی تردید میں فرمایا۔ کہ وہ جھوٹے ہیں۔ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ۔ بلکہ اُن کے کفر کی وجہ سے اُن پر خدا نے لعنت فرمادی ہے۔ لعنت کے لفظی معنی ہیں دور کرنا۔ اللہ کی لعنت کے معنی ہیں رحمت سے دور کرنا اور بندوں کی لعنت کے معنی ہیں دوریِ رحمت کی دعا کرنا یعنی اُن کے کفر کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ گذشتہ کفریات سے رحمت سے دور کر دیئے گئے اور انہوں نے اپنی لیاقت کو بگاڑ لیا مثلاً جب انہوں نے ایک معجزے یا ایک پیغمبر یا ایک حکم الٰہی کا انکار کیا۔ تو اُن کے دلوں میں سختی اور سیاہی پیدا ہوئی۔ جب دوسرے پیغمبر یا حکم کا انکار کیا۔ تو وہ سختی اور بڑھ گئی۔ آخر کار انکار کرتے کرتے۔ اب وہ سختی اس حد تک پہنچ گئی۔ کہ اس میں کوئی وعظ وغیرہ اثر نہیں کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ان میں بہت کم لوگ ایمان لاتے ہیں۔ یا یہ لوگ بہت تھوڑی باتوں کو مانتے ہیں۔ یا یہ لوگ بہت کم یقین کرتے ہیں۔ یہ قلیل یا تو مومن کی صفت ہے یا ایمان کی یا ایمانی چیزوں کی آخری دو صورتوں میں ایمان کے لغوی معنی یعنی یقین مراد ہیں۔ کیونکہ تھوڑا یا تھوڑی چیز پر تو ایمان ہو سکتا ہی نہیں۔ ایمان تو پورا اور پوری چیزوں پر ہو گا۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ یہ لوگ بالکل ایمان نہ لائیں گے۔ عربی میں کبھی بالکل نفی کرنے کے لئے بھی قلیلا ما بولتے ہیں۔ قَلِيْلًا مَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے۔ کہ یہ موسیٰ علیہ السلام پر بھی بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

**خلاصہ تفسیر** جب مسلمان ان یہود کو وعظ نصیحت کرتے۔ اور ان کے گذشتہ عیوب سناتے تھے۔ تو وہ عذر یا مذاق کے لئے کہتے تھے کہ ہمارے دل نور یا رحمت کے پردوں میں لپٹے ہوئے ہیں جس طرح غلاف اپنے اندر کی چیز کو گرد و غبار سے محفوظ رکھتا ہے۔ ایسے ہی تمہاری باتیں جو گرد و غبار کی طرح ہیں ہمارے دلوں کے اندر تو کیا اُن کے قریب تک پہنچ سکتیں۔ تم سے پہلے بھی جن انبیاء کو ہم نے شہید کیا۔ اُن کی نصیحتیں بھی ہمارے دلوں میں نہ پہنچی تھیں کیونکہ ہم نہایت متصلب دین دار ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ ہاں تمہارے دلوں پر غلاف تو ہیں۔ مگر نور یا رحمت کے نہیں۔ بلکہ ظلمت اور لعنت کے اور یہ غلاف پیدائشی نہیں۔ تاکہ تم معذور ہو۔ بلکہ تمہارے خود پیدا کیے ہوئے ہیں۔ کہ تم کفر پر کفر کرتے رہے اور تمہارے دلوں پر لعنت کی تہ پر تہ جمتی رہی جیسے کہ پانی اصل میں پتلی چیز ہے۔ مگر سردی کے موسم میں ٹھنڈک سے جمنے لگتا ہے۔ اور جب بار بار ٹھنڈک پہنچتی رہے تو پھر وہ پانی پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ کہ اس میں کیل بھی نہیں گڑ سکتی۔ اور جو لعنت اپنی پیدا کی ہوئی ہو۔ اس میں کوئی عذر نہیں سنا جاتا۔ لہٰذا یہ لوگ اپنے نبی پر بھی کم ایمان لاتے ہیں۔ تفسیر عزیزی نے یہاں ایک حدیث نقل کی۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ دل چار قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو صاف ہو۔ اور اس میں چراغ چمکتا ہو۔ دوسرے وہ جو غلافوں میں لپٹا ہوا ہو۔ تیسرے وہ جو اوندھا

ہو۔ چوتھے وہ جن کا ایک حصہ سفید اور ایک حصہ سیاہ ہو پہلا قلب تو مومن کا ہے جس میں چراغ ایمان روشن ہے۔ دوسرا قلب کافر کا جو کفر کے
غلافوں میں لپٹا ہوا ہے۔ اور تیسرا قلب منافق کا ہے کہ جس میں سے ایمان آ کر نکل گیا۔ دو رنگا دل اس کا ہے جس میں ایمان اور نفاق جمع ہوں عقیدہ
میں مومن ہو۔ اور اعمال میں منافق ایمان قلب میں سبزے کی طرح ہے۔ جو وعظ و نصیحت کے پانی سے بڑھتا ہے۔ اور نفاق اس ناسور کی مثل ہے
جس میں پیپ پڑ جائے۔ تو پیپ دخل بن جاتا ہے۔ اور اسے زیادہ خراب کر دیتا ہے **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔
پہلا فائدہ تعصب اور تصلب میں فرق ہے تصلب نہایت عمدہ خوبی ہے۔ اور تعصب سخت عیب تصلب کے معنی ہیں۔ دین پر پختگی کہ
دین حق پر اس طرح مضبوط ہو کہ شیطان کے دھوکے بازیاں اور کفار کے فریب میں نہ آئے۔ اور دنیوی مصیبتوں اور پریشانیوں میں بھی دین پر قائم
رہے تعصب یہ ہے۔ کہ اپنی جھوٹی بات پر ضد کرے اور یاروں اور دوستوں کی جھوٹی بات میں بھی حمایت کرے۔ اور اپنے مخالف کی حقانیت
ظاہر ہونے پر بھی اس کا انکار ہی کئے جائے۔ اور اپنے کو نیک اور دوسروں کو بد سمجھے خلاصہ یہ کہ حق بات پر ثابت قدم رہنے کا نام تصلب ہے
اور باطل پر ضد کرنے کا نام تعصب۔ ان یہودیوں نے اپنے تعصب کو تصلب سمجھا اور اس پر فخر کیا۔ دوسرا فائدہ چھوٹا عیب بڑے عیب کا
ذریعہ ہے۔ اور معمولی کفر سخت کفر کا راستہ۔ ان یہودیوں کے عارضی کفر کا انجام لعنت ابدی ہوا۔ تیسرا فائدہ نفس کے فریب سے بچنے کیلئے
کسی بزرگ کی پناہ میں آ جانا ضروری ہے۔ ورنہ انسان لعنت کو رحمت۔ کفر کو ایمان اور عیب کو خوبی سمجھ کر اس پر فخر کرتا ہے۔

**پہلا اعتراض**۔ اس آیت میں ان کے دلوں پر پردے ہونے کا انکار کیا گیا دوسری جگہ اس کا اقرار بھی ہے اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً
دوسری جگہ ارشاد ہے۔ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْۤ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا ایک جگہ ارشاد ہے۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ایک جگہ فرمایا گیا۔ وَجَعَلْنَا مِنْ
بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ کفار کے دلوں پر پردے بھی ہیں۔ ان کی گردنوں میں طوق بھی۔ ان کے دلوں پر مہر بھی
کر دی گئی ہے۔ ان کے سامنے دیوار بھی قائم کر دی گئی ہے۔ اب ان دونوں قسم کی آیتوں میں مطابقت کیونکر ہو **جواب**۔ اس کے دو جواب
ہیں۔ ایک یہ کہ وہ لوگ پیدائشی پردوں کا دعویٰ کرتے تھے یہاں اس کا انکار ہے۔ اور ان آیتوں میں عارضی پردوں کا ثبوت یعنی کفر کی وجہ سے
پردے پڑ گئے مہر لگ گئی سامنے دیوار قائم ہو گئی دوسرے یہ کہ یہود نے کہا تھا۔ کہ ہمارے قلوب پر رحمت کے پردے ہیں۔ یہاں اس کا انکار
ہے۔ لعنت کے پردوں کا ثبوت **دوسرا اعتراض** اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ان پر کفر کی وجہ سے لعنت ہوئی۔ اور لعنت کی وجہ سے
کفر یہ دور ہے۔ اور دور باطل **جواب**۔ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ ہلکے کفر سے لعنت اور لعنت سے سخت کفر دوسرے یہ کہ کفر
کرنے سے لعنت اور لعنت سے کفر پر جمنا یعنی آئندہ ایمان کے قابل نہ رہنا۔ لہٰذا کوئی دور نہیں **تیسرا اعتراض** اگر قلیلاً ایمان کی صفت ہو۔
اور عبارت یوں بنے فَاِيْمَانًا قَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ تو لازم آئے گا۔ کہ ایمان بھی زیادہ اور کم ہو۔ حالانکہ زیادتی کمی مقداری چیز میں ہوتی ہے۔
**جواب**۔ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ ایمان معنی یقین ہے یعنی بہت کم یقین کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ کمی صفت کی ہے نہ
مقدار کی یعنی ان کے دل میں آپ کی حقانیت کا ہلکا سا خیال آ جاتا ہے۔ اور پھر نکل جاتا ہے **تفسیر صوفیانہ** ایمان قیمتی سامان ہے۔ اور
عقیدت اس کی قیمت علماء اور صوفیاء کی مجلسیں ایمان کا بازار جس طرح کہ بے نقد بازار سے بیزار اور نامراد لوٹتا ہے۔ ایسے ہی بے عقیدت
اس بازار ایمانی سے یعنی صحبت علماء مشائخ سے محروم واپس پھرتا ہے۔ اور پھر اپنے کو بڑا اور ان کو برا سمجھتا ہے۔ اور اپنی محرومی کو معصومی خیال
کرتا ہے۔ اس بازار میں عقیدت کی قیمت لاؤ۔ اور متاع ایمانی لے جاؤ۔ اس باغ میں دامن اعتقاد لے کر آؤ۔ اور ایمان و عرفان کے تازہ پھول
بھر لے جاؤ۔ بہرحال عقیدت سے عقائد اور عقائد سے عرفان ملتا ہے۔ یہ یہودی عقیدت سے خالی تھے ایمان نہ لے سکے ہم
کو بھی ان کی حالت سے عبرت پکڑنی چاہیئے جس ننگے کے پاس دامن نہ ہو۔ اور پھر چمن سے محروم لوٹنے پر فخر کرے تو وہ اندھا
بھی ہے ⁂

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا

اور جبکہ آئی اُن کے پاس کتاب پاس سے اللہ کے تصدیق کرنے والی واسطے اُسکے جو اُنکے ساتھ ہے اور تھے وہ

اور جب اُن کے پاس اللہ کی وہ کتاب (یعنی قرآن) آئی جو اُن کے ساتھ والی کتاب (یعنی توریت) کی تصدیق فرماتی ہے

مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا

پہلے سے فتح مانگتے اوپر اُن کے جنہوں نے کفر کیا پس جبکہ آیا اُن کے پاس وہ جو پہچانا اُنہوں نے

اور اس سے پہلے وہ اسی نبی کے وسیلہ سے کافروں پر فتح مانگتے تھے۔ تو جب تشریف لایا اُن کے پاس وہ جانا پہچانا

كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

کفر کیا اُنہوں نے ساتھ اُس کے پس لعنت اللہ کی اوپر کافروں کے

اس سے منکر ہو بیٹھے تو اللہ کی لعنت منکروں پر

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چندطرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** اس سے پہلے یہود کے مایوسی ایمان کی چندوجہیں بیان ہو چکیں اب بھی اسی کی ایک وجہ بیان ہو رہی ہے۔ **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں موجودہ یہودیوں کے وعظ ونصیحت نہ سننے کا ذکر تھا۔ اب فرمایا جارہا ہے۔ کہ وہ تو اپنی کتاب کی بھی نہیں سنتے تمہاری کیا سُنیں **تیسرا تعلق** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا۔ کہ یہودی متصلب اور دین پر پختہ نہیں۔ اور اُن کے دِلوں پر نور کے پردے نہیں۔ بلکہ متعصب۔ ضدی ہیں۔ اور اُن کے دِلوں پر لعنت کے پردے ہیں۔ اس آیت میں اس کی دلیل دی جارہی ہے۔ کہ وہ اس پیغمبر کو جان پہچان کر انکار کر رہے ہیں۔ اور اسی کا نام ضد ہے۔ **پانچواں تعلق** پہلے فرمایا گیا۔ کہ اُن کا اپنی کتاب پر بھی ایمان کم ہے۔ اُسی کا ثبوت دیا جارہا ہے **شانِ نزول** حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری اور قرآن کے نازل ہونے سے پہلے یہودی اپنی حاجات کے لئے حضور کے نام پاک کے وسیلہ سے دعا کرتے اور کامیاب ہوتے تھے۔ اور جنگ کے وقت بھی یہ الفاظ کہتے تھے اَللّٰهُمَّ افْتَحْ عَلَيْنَا وَانْصُرْنَا بِالنَّبِيِّ الْاُمِّيِّ۔ یارب ہمیں نبی اُمّی کے صدقہ میں فتح ونصرت عطا فرما۔ مگر جب حضور تشریف لائے۔ تو یہی دعا مانگنے والے صاف منکر ہو گئے۔ اس پر یہ آیت کریمہ اُتری **تفسیر وَلَمَّا جَآءَهُمْ** اس سے موجودہ بنی اسرائیل مراد ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم اور نبی آخرالزمان کو انہوں نے ہی پایا۔ یعنی جب اِن موجودہ یہودیوں کے پاس آئی **كِتٰبٌ** ایک کتاب۔ اس کتاب سے قرآن کریم مراد ہے۔ اس لئے کہ توریت وغیرہ کی تصدیق اس نے ہی فرمائی جس کا آگے ذکر ہے۔ اسے کتاب اس لئے فرمایا گیا۔ کہ وہ پہلے بھی لوح محفوظ وغیرہ میں لکھی ہوئی تھی۔ اور آئندہ بھی قیامت تک بکثرت لکھی جائے گی۔ اگرچہ اُتری ہے پڑھی ہوئی۔ **مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ**۔ اللہ کے پاس سے یہ قرب تشریفی ہے۔ نہ کہ قرب مکانی کیونکہ رب تعالیٰ مکان اور جگہ سے پاک ہے۔ اور اس کا خدائی کتاب ہونے پر اُن کو بھی یقین تھا کیونکہ اس کے مقابلہ سے اُن کے سامنے علماء عاجز رہ گئے تھے۔ اور نیز وہ کتاب **مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ** اسی توریت کی تصدیق کرنیوالی ہے۔ جو اُن کے پاس ہے حالانکہ نبی آخرالزماں نہ عبرانی خط پڑھتے تھے اور نہ عربی اور ایسے بے پڑھے نبی کا توریت کے احکام کی تصدیق فرمانا اس کی کھلی دلیل ہے۔ کہ وہ عالِم علم لدنی ہیں۔ تصدیق کرنے کی چند صورتیں ہیں۔ یا توریت کی حقانیت کا اقرار کرنا اور اُسے خدائی کتاب ماننا یا لوگوں سے اُس کی حقانیت کا اقرار کرا دینا قرآن کریم نے اگرچہ توریت کے احکام منسوخ کر دیئے۔ مگر یہ سب سے منوالیا۔ کہ وہ حق ہے۔ اگر توریت اور موسیٰ علیہ السلام کا ذکر قرآن کریم میں نہ ہوتا۔ تو دیگر انبیاء اور صحیفوں کی طرح دنیا اسے بھی بھول جاتی

یا یہ کہ یہ قرآن توریت کو سچا کرنے والا ہے۔ کہ اس نے آخری کتاب کے آنے کی خبر دی تھی۔ جو کہ اس قرآن کے آنے سے پوری ہوئی۔ اگر یہ قرآن حق نہیں۔ تو یہودی بتائیں۔ کہ آخری نبی اور آخری کتاب کب اور کہاں آئی۔ اور یہ لوگ پہلے بے خبر بھی نہ تھے۔ بلکہ وَكَانُوا مِن قَبْلُ یہ یہودی اس کتاب کے اترنے سے پیشتر اس نبی کی عظمت کے قائل اور اس کتاب کی حقانیت کے ماننے والے تھے کیونکہ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا۔ کفار یعنی مشرکین عرب کے مقابلہ میں انہیں کے نام پاک کے وسیلہ سے رب سے فتح مندی اور نصرت مانگتے تھے۔ تفسیر عزیزی نے اس جگہ فرمایا۔ کہ انہیں یقین تھا کہ نبی آخر الزمان کا نام پاک تمام پیغمبروں کا مددگار ہے۔ اور ان کا نام بھی کفر کو مٹانے اور باطل کو گھٹانے میں لشکر جرار ہے (دیوبندیت فنا) مدینہ اور خیبر کے یہودی مشرکین عرب یعنی بنی اسد اور بنی غطفان کے مقابلہ میں شکست کھا جاتے تھے۔ آخر کار انہوں نے اپنے علماء کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے یہودی سپاہیوں کو یہ دعا یاد کرائی۔ اور کہا۔ کہ جنگ کے وقت پڑھ لیا کرو۔ انہوں نے اس پر عمل کیا۔ اور پھر ہمیشہ فتح پائی۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اِنَّا نَسْئَلُكَ بِحَقِّ اَحْمَدَ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِي وَعَدْتَّنَا اَنْ تُخْرِجَهٗ لَنَا فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ وَبِكِتَابِكَ الَّذِي تُنَزِّلُ عَلَيْهِ اٰخِرَ مَا يُنَزَّلُ اَنْ تَنْصُرَنَا عَلٰى اَعْدَائِنَا۔ یعنی اے رب ہمارے ہم تجھ سے اس نبی و امی احمد کے حق سے سوال کرتے ہیں جن کے بھیجنے کا تو نے وعدہ کیا۔ اور اس کتاب کی برکت سے کہ جو تو ان پر اتارے گا سب کتابوں سے پیچھے کہ تو ہم کو ہمارے دشمنوں پر فتح دے اسی تفسیر عزیزی میں اس جگہ یہ بھی ہے۔ کہ سلمہ ابن قیس فرماتے ہیں۔ کہ ہمارے محلہ میں ایک یہودی رہتا تھا۔ میں اس زمانہ میں کمسن تھا۔ ایک دن ہمارے یہاں ایک محفل تھی۔ وہاں وہ یہودی بھی آگیا۔ اور پکار کر کہا اے بت پرستو کیا نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا ہم سب نے کہا تو ہی بتا وہ بولا پھر سب کو زندگی ملے گی۔ اعمال کا حساب ہوگا میزان ہوگی۔ دوزخ ظاہر ہوگی۔ ہر ایک کو اعمال کے موافق سزا اور جزا ملے گی۔ ہم سب نے کہا۔ کہ یہ تو بڑی بعید بات ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتی۔ وہ بولا خدا کی قسم ضرور ہوگی۔ سب نے پوچھا تیری دلیل کیا ہے۔ اس نے کہا۔ کہ میری دلیل۔ وہ آخر الزمان پیغمبر ہے جو مکہ اور یمن سے ظاہر ہوگا۔ وہ میرے کلام کی تصدیق کرے گا۔ ہم نے کہا وہ کب ہوگا۔ اس نے مجلس کے دائیں بائیں دیکھا۔ اور میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ کہ اگر اس نوجوان کی عمر بڑی تو یہ اس پیغمبر کو پالے گا۔ سلمہ کہتے ہیں۔ کہ چند روز گزرے تھے۔ کہ حضور کی نبوت کی خبر مشہور ہوئی اور جب حضور علیہ السلام مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو ہم سب مسلمان ہو گئے ہم نے اس یہودی کو دیکھا وہ کافر رہا اور حسد کرتا تھا۔ ہم نے اس سے کہا۔ کہ تجھے کیا ہو گیا۔ کہ تو ان کا منکر ہے۔ کیا تجھے اپنی وہ بات یاد نہ رہی۔ جو تو نے ہم سے کہی تھی۔ وہ بولا یاد تو ہے لیکن یہ وہ نبی نہیں ہیں۔ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہودی صرف جنگ میں ہی نہیں۔ بلکہ مناظرہ اور دیگر مصیبتوں میں بھی حضور کے نام پاک کو اپنا پشت پناہ بناتے تھے۔ اور آپ کے نام پاک آپ کے صفات آپ کی جائے پیدائش اور وقت پیدائش سے بھی واقف تھے اس قدر جان پہچان کے باوجود فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا جب ان کے پاس جانی پہچانی چیز آئی۔ اس مَا سے یا تو کتاب مراد ہے۔ اور یا صاحب کتاب صلی اللہ علیہ وسلم مگر دوسرے معنی زیادہ قوی ہیں۔ کیونکہ کتاب کا ذکر دور ہے۔ اور نبی علیہ السلام کا ذکر يَسْتَفْتِحُونَ میں قریب ہی گزرا نیز کتاب کے آنے کا ذکر تو پہلے بھی ہو چکا لہٰذا بہتر یہی ہے۔ کہ یہاں نبی کا آنا مراد ہوتا۔ کہ کلام میں تکرار نہ ہو۔ چونکہ اس جگہ اوصاف والی ذات مراد ہے۔ اس لئے مَا فرمایا گیا۔ یعنی جبکہ ان کے پاس وہ چیز یا وہ ذات آئی جس کو وہ پہچانتے ہیں عَرَفُوْا میں دو احتمال ہیں۔ یا یہ کہ ان اوصاف کی وجہ سے ان کو اب دیکھ کر پہچان لیا۔ کیونکہ ان میں وہ ساری توریت کی علامتیں موجود تھیں۔ یا جس کو وہ توریت سے پہچان چکے تھے۔ لہٰذا چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ وہ سب فوراً ایمان لے آتے۔ مگر ہوا یہ کہ كَفَرُوْا بِهٖ وہ صاف انکار کر گئے۔ اور ان کی نعت اور صفات کو بدل ڈالا۔ یا تو یہ جملہ دونوں لَمَّا کا جواب ہے۔ یعنی جب وہ جانی ہوئی کتاب اور جانا ہوا نبی ان کے پاس پہنچے تو انہوں نے ان میں سے ہر ایک کا انکار کر دیا۔ یا یہ تو دوسرے لَمَّا کا جواب ہے۔ اور پہلے لَمَّا کا جواب وہاں ہی پوشیدہ ہے۔

یعنی جب اُن کے پاس کتاب آئی تو اس کا انکار کر دیا۔ اور یہ کیوں نہ کرتے۔ ان کا تو یہ حال ہے کہ جس نبی کے نام سے ان کی مشکلیں حل ہوتی تھیں جب وہ نبی تشریف لائے۔ تو اُن کا بھی انکار کر بیٹھے۔ اس انکار کا انجام یہ ہوا کہ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ جان بوجھ کر حق چھپانے والے کافروں پر اللہ کی لعنت ہے کیونکہ ان پر لازم تھا کہ یہ اس نبی کی خدمت اور مدد کرتے۔ اگرچہ یہاں عَلَيْهِمْ کہہ دینا کافی تھا لیکن سبب لعنت بتانے کے لیے کافرین فرمایا۔ تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وسیلہ پکڑنے سے ان پر لعنت ہوئی۔ اب معلوم ہوا کہ اُن کا وسیلہ چھوڑنے سے ملعون ہوئے۔

**خلاصہ تفسیر** اے مسلمانو تم ان کے ایمان کی کب تک امید رکھو گے۔ یہ تو بڑے ضدی کافر ہیں۔ ان کی ضد کی تو یہ حالت ہے کہ اس قرآن کے آنے پر اُن کی توریت کی سچائی موقوف تھی۔ ان کو چاہیئے تھا کہ اس کو آنکھوں سے لگاتے۔ اور اس کے آنے پر خوشیاں مناتے اور کفار سے کہتے کہ دیکھو ہماری توریت کی خبر کا ظہور ہوگیا۔ نیز یہ نبی آخرالزمان وہ ہیں جن کے نام سے ان کے بگڑے کام بنے۔ انہیں کے نام کے وسیلہ سے ان لوگوں نے رب سے دعائیں مانگی۔ اسی نام کی برکت سے انہوں نے مشرکین پر فتح پائی۔ اسی کی برکت سے انہوں نے مناظرہ وغیرہ میں سُرخروئی حاصل کی۔ انہیں کے بل بوتے پر مشرکین سے کہتے تھے کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔ نبی آخرالزمان آنے والے ہیں۔ ہم اُن کی مدد سے تم پر غالب آئیں گے۔ انہیں کا انتظار تھا۔ انہیں کی دعا مانگیں جا رہی تھیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ ان کے قدم دھو دھو کر پیتے اور اپنی خوش نصیبی پر فخر کرتے۔ مگر انہوں نے کیا یہ کہ منکر ہو کر ان کے پیچھے پڑ گئے۔ ایسے کافروں پر خدا کی لعنت ان ضدیوں کے ایمان کی کیا امید **فائدے**

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** اللہ والوں کے وسیلہ سے دعا قبول ہوتی ہے۔ کیونکہ رب نے اُن یہودیوں کے وسیلہ پکڑنے کا انکار نہ کیا۔ بلکہ اُن کے کفر پر لعنت کی اس واسطے عَلَى الْكٰفِرِيْنَ فرمایا نہ کہ عَلَيْهِمْ تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ وسیلہ پکڑنے والوں پر لعنت کی گئی۔ **دوسرا فائدہ** حضور علیہ السلام سے پہلے آپ کی تشریف آوری کی دھوم دھام ہو چکی تھی۔ اور اس وقت بھی حضور کے وسیلہ سے خلق کی حاجت روائی ہوتی تھی جس سے معلوم ہوا کہ دیوبندی وہابی اُس وقت کے یہودیوں سے بھی بدتر ہیں۔ کہ وہ تو حضور کے نام کی مدد لیتے تھے اور یہ اسے شرک کہتے ہیں۔ اور کلمہ گو ہو کر اُن کے وسیلہ سے منکر ہیں۔ دیکھو ان کی کتاب تقویت الایمان **تیسرا فائدہ** کافروں پر لعنت کرنا جائز ہے۔ لعنت کافروں کے حق میں رحمت سے دوری ہے۔ اور گنہگار مسلمانوں کے حق میں عزت سے دوری لعنت کے اسباب تین ہیں۔ کفر۔ بدعت فسق۔ جیسے کہہ دیتے ہیں جھوٹے پر خدا کی لعنت۔ لعنت کے درجے بھی تین ہیں۔ عام وصف سے لعنت کرنا۔ جیسے کافر بدعتی یا فاسق پر لعنت۔ خاص وصف سے لعنت کرنا جیسے یہودی یا عیسائی یا خارجی یا زانی یا سود خوار پر لعنت یہ دو قسم کی لعنتیں بہرحال جائز ہیں۔ کسی کا نام لے کر لعنت کرنا۔ یہ صرف اسی کے حق میں جائز ہے جس کے کفر کا شرعاً ثبوت ہو۔ جیسے کہ فرعون یا ابوجہل پر لعنت لہٰذا اب موجودہ نام لیکر کسی کافر کو بھی لعنت جائز نہیں کیونکہ اس کا کفر پر مرنا دلیل شرعی سے معلوم نہیں ممکن ہے۔ کہ مرتے وقت ایمان لے آیا ہو جس کی ہمیں خبر نہیں ہاں یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ رام لعل یا مرزا غلام احمد زندگی میں کافر ملعون تھے۔ اسی لئے یہ کہنا بالاتفاق جائز ہے۔ کہ قاتل حسین پر لعنت۔ مگر یوں نہ کہے کہ یزید پر لعنت کیونکہ وہ وصف پر لعنت ہے۔ اور یہ نام پر اور نام کی لعنت میں خدشہ ہے۔ بہرحال کسی پر بلاوجہ لعنت کرنا کوئی اچھی چیز نہیں۔ سب سے بڑا مردود شیطان ہے۔ مگر اس پر بھی لعنت کرنا عبادت نہیں۔ بہت سے لوگ اپنے جانور اور اپنے مال پر لعنت کرتے ہیں۔ خیال رہے غیر مستحق کو لعنت کرنے میں وہ لعنت خود اپنے پر لوٹتی ہے۔ مسلمان تبرائی اور لعنتی نہیں ہوتا۔ یہ روافض کی خصوصیت ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ عورتیں اکثر جہنمی ہیں کیونکہ وہ لعنت زیادہ کرتی ہیں خیال رہے۔ کہ لعنت اور چیز ہے۔ اور کفار پر سختی دوسری چیز سختی کا ذکر ہم پہلے کر چکے **چوتھا فائدہ** جاہل کافر سے عالم کافر کا عذاب سخت ہے۔ کیونکہ وہ نادانی سے کافر ہے اور یہ جان بوجھ کر اسی لئے اس آیت میں مَا عَرَفُوْا فرمایا۔ **پانچواں فائدہ** ہر ایک کا نام اس کے ماں باپ رکھتے ہیں۔ مگر حضور کا نام رب نے رکھا۔ کہ اُن کی ولادت سے صدیوں پہلے ہی عرش و فرش میں اُسے چمکا دیا **چھٹا فائدہ** بعض دیوبندی وہابی مجبور ہو کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ حضور کی زندگی میں آپ کے وسیلہ سے

دعا کرنی جائز تھی۔ لیکن بعد وفات ناجائز کیونکہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں حضرت عباس کے ذریعہ سے دعا مانگی نہ کہ حضور کی طفیل وہ اس آیت سے عبرت پکڑیں جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضور کی ولادت پاک سے پہلے ہی آپ کے وسیلہ سے دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ یہ حدیث تو ان کے واسطے زہر قاتل ہے۔ اس لئے کہ حضرت عباس کا اس لئے وسیلہ اختیار کیا گیا۔ کہ وہ حضور کے چچا ہیں۔ یہ تو حضور کی نسبت کا وسیلہ ہے۔ اور پھر اس وسیلہ سے حضور کے وسیلہ کی نفی کیونکر ہو گئی۔ پھر وہ تو اب بھی زندہ ہیں کیونکہ ہم پڑھتے ہیں۔ محمد رسول اللہ۔ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ نہ یہ کہ تھے وہ زندہ نہیں ہیں۔ تو وصف رسالت کس کے لئے ثابت ہو رہا ہے۔ مجمول کا ثبوت موضوع کا وجود ظرف اتصاف میں چاہتا ہے۔ **لطیفہ** چونکہ اس آیت کے لفظ یَسْتَفْتِحُوْنَ سے حضور علیہ السلام کا وسیلہ پکڑنا حضور کے نام سے مدد حاصل کرنا ثابت ہوتا تھا جو کہ دیوبندیہ کے لئے موت ہے۔ اور ان کی توحید کے خلاف اس لئے دیوبندیوں کے پیشوا مولوی اشرف علی صاحب نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں اس لفظ کے معنی یہ کئے کہ یہودی کفار سے بیان کیا کرتے تھے یعنی خود کفار عرب کو حضور کی آمد کی خبر دیا کرتے تھے۔ اپنے نامعقول مذہب کی پاسداری کے لئے آیۃ کی تحریف معنوی کر ڈالی۔ نہ تو یہ معنی کسی مفسر نے کئے اور نہ ہی عربی قواعد سے درست ہیں۔ کیونکہ استفتاح فتح سے بنا اور استفعال میں اگر اس میں طلب یا وصول کے معنی پیدا ہوئے اور علی نقصان و ضرر کے لئے آتا ہے۔ تو صاف معنی یہ ہوئے۔ کہ کافروں کے مقابل فتح مانگتے یا فتح حاصل کرتے تھے۔ خواہ مناظرہ وغیرہ میں یا جنگ میں خبر دیتے۔ اور بیان کرنے کے معنی کیسے ہو گئے۔ اور لطف یہ ہے۔ کہ اس معنی سے مولوی صاحب پر دوسری قیامت آ گئی کہ یہود کا علم غیب ثابت ہو گیا۔ یہود نے حضور کی ولادت پاک سے پہلے آپ کی خبر دیدی۔ مگر وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے مصطفےٰ علیہ السلام کے علم کا انکار کیا ہے۔ نہ کہ کفار کے علم کا ہم تو شیطان کو بھی علم غیب مانتے ہیں ہاں حضور کے لئے علم غیب ماننا شرک ہے۔ دیوبندیوں نے اس قسم کی بہت سی تحریفیں صرف تقویت الایمان کی درستی کے لئے کی ہیں۔ **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ قرآن یہودیوں کے پاس جو توریت تھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ حالانکہ وہ کتاب تو بدلی ہوئی اور محرف تھی۔ اور قرآن نے اس کی سخت تردید کی ہے **جواب**۔ اس کے چند جوابات ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں فرمایا گیا۔ مَعَهُمْ نہ کہ عِنْدَهُمْ یعنی ان کی ساتھ والی توریت کی تصدیق کرتا ہے۔ نہ کہ پاس والی توریت کی بدلی ہوئی توریت ان کے پاس تھی۔ اور اصلی ان کے ساتھ پاس وہ جو لکھی رکھی تھی اور ساتھ وہ جس پر ان کا ایمان تھا۔ اس بدلی ہوئی کو وہ بھی غلط سمجھتے تھے۔ صرف کھانے کمانے کے لئے اس کو رکھ چھوڑا تھا۔ اس پر ان کا بھی ایمان نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ قرآن اصل توریت کی تصدیق کرتا ہے۔ نہ کہ اس کے ہر لفظ کی اور بدلی ہوئی کتاب میں کچھ تو اصل بھی تھی۔ اس ہی کی تصدیق کی یہاں ساری کتاب کی تصدیق کا ذکر نہیں۔ تیسرے یہ کہ مصدق کے معنی ہیں۔ صدق کو ظاہر فرمانے والا یعنی قرآن سے پہلے سچی اور جھوٹی توریت میں فرق ظاہر نہ تھا۔ اس نے آ کر ان کی تحریفات کو ظاہر فرمایا۔ اور توریت کی سچائی کو شائع کیا۔ چنانچہ رجم وغیرہ بہت سے توریت کے اصلی احکام قرآن سے کھلے اور یہودیوں کو اپنی تحریف کا اقرار کرنا پڑا۔

**دوسرا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ یہودی قرآن اور صاحب قرآن کی حقانیت جانتے تھے۔ پھر انہیں کافر کیوں کہا گیا۔ وہ تو مومن ہوئے۔ کیونکہ دل سے جاننے کا نام ہی ایمان ہے **جواب**۔ وہ جانتے تھے۔ مانتے نہ تھے۔ اور ایمان ماننے کا نام ہے۔ نہ کہ صرف جان لینے کا جاننا غیر اختیاری ہوتا ہے۔ اور ماننا اختیاری ثواب اختیاری خیر پر ہی ملتا ہے۔ اگر جاننے کا نام ایمان ہوتا۔ تو اس کا ثواب نہ ہونا چاہیئے تھا۔ یا یوں کہو۔ کہ ایمان جاننے اور اقرار کرنے کا نام ہے یعنی اقرار ایمان کی شرط ہے جب انہوں نے انکار کیا۔ تو ایمان صحیح نہ ہوا جیسے کہ بغیر وضو نماز **تیسرا اعتراض** قرآن نے پہلے فرمایا تھا۔ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا لوگوں سے اچھی بات کہو۔ اور یہاں کافروں پر لعنت فرما رہا ہے۔ کیا لعنت بھی اچھی بات ہے **جواب**۔ اس آیت میں گذر چکا کہ کفار کو برا کہنا درحقیقت اچھا ہے۔ اور ان پر لعنت ہی ان کے لئے قول حسن ہے (تفسیر کبیر) **چوتھا اعتراض** تم ان کو کافر کہہ کر لعنت کرتے ہو۔ اور وہ تمکو۔ معلوم اس میں سچا کون ہے۔ اور جھوٹا کون

رستیا تھ پر کاش جواب. چور پولیس کو بُرا کہتی ہے. اور پولیس چور کو پنڈت جی اللہ نے عقل اور بدھی اسی لئے دی ہے. کہ نقل و اصل میں فرق کرے. دنیا میں نقل اور اصل رلی ملی بازار میں فروخت ہوتا ہے. مگر آنکھ والے کو چاہیئے کہ دیکھ کر چیز خریدے. اچھا بتاؤ تم کو اپنے مذہب کی سچائی کیسے معلوم ہوئی. یہ اعتراض تو تم پر بھی پڑتا ہے. **تفسیر صوفیانہ** بصارت سے صورت اور بصیرت سے سیرت معلوم ہوتی ہے. اور جیسے کہ بعض دوائیں بصارت کو قوت دیتی ہیں. اور بعض بیماریاں بصارت مٹا دیتی ہیں. اس طرح عشق و کحل الجواہر (عمدہ سرمہ) ہے. یا وہ دوربین یا خوردبین ہے جس سے بصیرت قوی ہو جاتی ہے. اور عاشق اپنے محبوب کے ہر خوبی کو معلوم کر لیتا ہے. مگر کفر و بے دینی بغض و حسد بصیرت کو پھوڑنے والی بیماریاں ہیں. یہود کی بصیرت پر بغض و حسد کا جالا آ چکا تھا. انہیں عشق کا سرمہ نصیب نہ ہوا جس سے مصطفٰے صلے اللہ علیہ وسلم کی ظاہری صورت کو تو دیکھ سکے. مگر سیرت پاک تک نظر نہ گئی. مسلمانوں کو چاہیئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق پیدا کرے. تاکہ اس پر حقیقت حال ظاہر ہو.

| بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ |
|---|
| بُری ہے وہ چیز کہ خریدا انہوں نے بدلے اس کے جانوں اپنی کو یہ کہ کفر کریں وہ ساتھ اس کے کہ اتاری اللہ نے حسد سے اس کے کہ اتارے اللہ |
| کس بُرے مول انہوں نے اپنی جانوں کو خریدا. کہ اللہ کے اتارے سے منکر ہوں. اس کی جلن سے کہ اللہ |
| مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ |
| اپنے فضل سے اوپر اس کے کہ. چاہے بندوں میں سے اپنے پس لوٹے وہ ساتھ غضب کے اوپر غضب کے اور واسطے کافروں کے |
| اپنے فضل سے اپنے جس بندے پر چاہے وحی اتارے تو غضب پر غضب کے سزاوار ہوئے اور کافروں |
| عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾ |
| عذاب ہے اہانت والا |
| کے لئے ذلت کا عذاب ہے۔ |

**تعلق**. اس آیت کا پچھلی آیت سے کئی طرح تعلق ہے. پہلا تعلق موجودہ بنی اسرائیلوں کے ایمان سے مایوسی کی یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے. دوسرا تعلق گویا یہ آیت پچھلی آیت کا تتمہ ہے. یعنی اسرائیلیوں نے قرآن کا اس ضد سے انکار کیا کہ وحی ہمارے سوا پر کیوں ہوئی- تیسرا تعلق پچھلی آیت میں ان کے انکار کا ذکر تھا. اب اس کی وجہ اور برائی بیان ہو رہی ہے. چوتھا تعلق پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا. کہ منکرین یہودیوں نے انکار نبوت کو اپنے خلاصی اور بقاء سرداری کا ذریعہ بنایا. اب فرمایا جا رہا ہے کہ ان بیوقوفوں نے اس میں بڑی ہی غلطی کی.

**تفسیر** بِئْسَمَا. بئس فعل ذم (برائی بتانے والا فعل) ہے. اور ما شیئًا کے معنی میں ہے. یعنی وہ چیز بُری ہی بُری ہے جو کہ اِشْتَرَوْا بِهٖ یہ لفظ شریٰ سے بنا ہے. اور شریٰ جب ضَرَبَ یَضْرِبُ سے آتا ہے. تو بیچنے اور فروخت کرنے کے معنی دیتا ہے. جیسے وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ یعنی انہوں نے یوسف علیہ السلام کو کھوٹی قیمت میں بیچا. مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ اور باب افتعال میں آکر خریدنے کے معنی دیتا ہے. بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ اشترو یا شروا کے معنی میں ہے یعنی وہ چیز بُری ہے جس کے عوض انہوں نے اپنی جان اور ایمان کو بیچ دیا. بعض نے فرمایا کہ یہ خرید کے معنی میں ہی ہے یعنی وہ شے بُری ہے جس کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو خریدا. اب اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر شخص کی جان گویا گروی ہے بمال ہے. اور اس پر اعمال کا قرض ضروری ہے کہ نیک اعمال کر کے اپنی جانوں کو گرو سے چھوڑائے!

لیں گویا خرید لیں۔ ان بے وقوفوں نے بجائے چھڑانے کے اس کو سخت قیدی بنا دیا۔ رب فرماتا ہے۔ کُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ اِلَّاۤ اَصْحٰبَ الْیَمِیْنِ ہر نفس اپنے اعمال میں گروی ہے سوا دہنی طرف والوں کے ان کی مثال اس بیوقوف غلام کی سی ہے۔ جو کسی کے ہاتھوں کچھ مال میں گرو ہو۔ وہ بجائے اس کے کہ مال ادا کر کے اپنے کو چھڑا لے۔ اسی مال کا انکار کرتا پھرے کہ مجھ پر کچھ نہیں اور یہ مالک دعویٰ میں جھوٹا ہے۔ یہ غلام اپنی اس حرکت سے قید سے آزاد نہ ہوگا۔ بلکہ زیادہ گرفتار اور مستحق مار ہوگا۔ ایسے ہی یہ لوگ ہیں۔ اَنْفُسَهُمْ تفسیر روح البیان نے اس جگہ فرمایا کہ یہاں نفس سے مراد ایمان ہے چونکہ ایمان نفس میں رہتا ہے۔ اس لئے محل بول کر حال مراد لیا۔ اور آیت کے معنی یہ ہیں۔ کہ جس کے عوض انہوں نے اپنا ایمان بیچ دیا۔ وہ بہت بری چیز ہے۔ اور دیگر مفسرین نے فرمایا کہ انفس سے جانیں ہی مراد ہیں۔ اور اس کے معنی وہ کئے جا اوپر بیان ہو چکے اَنْ یَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ یہ جملہ بِئْسَ کا مخصوص بالذم ہے جس سے مَا کی مراد ظاہر ہو رہی ہے یعنی وہ چیز بڑی بری ہے کہ کتاب اللہ کا انکار اور یہ انکار بھی نادانی سے نہیں۔ بلکہ بَغْیًا حسد سے ہے۔ یہ یَكْفُرُوْا کا مفعول لہٗ ہے اور اس کے لفظی معنی بغاوت ہیں چونکہ اکثر بغاوت حسد سے ہوتی ہے۔ اور حاسد آخر کار باغی بن جاتا ہے۔ اس لئے یہاں یہ معنی کئے گئے (تفسیر روح البیان) اور یہ حسد بھی کوئی دینی غبطہ نہ تھا بلکہ اس بات کی تھی کہ اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ اللہ اتارتا ہے۔ یہاں عَلٰی پوشیدہ ہے۔ کیونکہ حسد علی کو چاہتا ہے۔ مِنْ فَضْلِهٖ اپنا فضل یہاں فضل سے مراد وحی ہے۔ کیونکہ وحی اپنی محنت یا استحقاق وغیرہ سے نہیں صرف اللہ کے فضل و کرم سے ملتی ہے۔ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے واقعہ یہ ہے۔ کہ یہود سمجھتے تھے۔ کہ پہلے کی طرح نبی آخر الزمان بھی ہم بنی اسرائیل میں سے ہی ہوں گے۔ اب جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ درجہ عنایت ہوا اور آپ بنی اسمٰعیل سے تھے۔ اس پر یہ اسرائیلی جل گئے۔ کہ یہ عہدہ ہماری قوم کو کیوں نہ ملا۔ اور اس جلن کا انجام یہ ہوا۔ کہ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ خدا کا غضب پر غضب لیکر لوٹے۔ گویا یہ لوگ بازار عمل میں خریداری کرنے گئے۔ لیکن اپنی حماقت سے اصلی رقم بھی ہاتھ سے کھو آئے۔ اور بجائے سامان کے غضب الٰہی لیکر آئے خیال رہے کہ اس سے دو غضب مراد نہیں۔ بلکہ قسم قسم کے بے شمار غضب جیسے کہا جاتا ہے۔ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یا اردو میں بولتے ہیں۔ کہ فلاں کے پاس مال پر مال آ رہا ہے۔ یعنی بے شمار مال۔ بات یہ ہے کہ ان یہودیوں نے چار قسم کے کفر کئے۔ اپنی کتاب کو بدل دیا۔ اور کیول صرف اسی حسد سے۔ قرآن کا پہچان کر انکار کیا۔ اللہ کے انتخاب سے ناراض ہوئے۔ کہ فلاں کو نبی کیوں بنایا ہمیں کیوں نہ بنایا۔ نااہل کو اہل اور اہل کو نااہل سمجھا یعنی ہم خواہ کتنے ہی نالائق ہیں مگر نبوت کے ٹھیکیدار اور بنی اسمٰعیل میں خواہ کتنے ہی علمی اور عملی کمالات ہوں مگر نبوت کے لائق نہیں۔ کیونکہ وہ ہم سے نہیں اور ان میں سے ہر کفر صدہا غضبوں کا ذریعہ ہے لہٰذا وہ بے شمار غضب لیکر لوٹے اب جبکہ وہ غضب الٰہی کی گٹھریاں اٹھائے ہوئے ہیں۔ پھر کس منہ سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے پیارے ہیں۔ اور ہمیں چند روز عذاب ہوگا۔ حق یہ ہے۔ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ۔ عام کافروں کے لئے یا خاص ان کافروں کیلئے اہانت اور ذلت والا عذاب ہے۔ مُهِیْنٌ هَوْنٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں ہلکا پن آسان کام کو اسی لئے هَیِّن کہتے ہیں۔ کہ اس کا کرنا آسان ہے۔ ذلت اور رسوائی کو اسی لئے اہانت یا توہین کہتے ہیں۔ کہ اس سے آدمی ہلکا ہو جاتا ہے۔ یعنی کافروں کو ذلیل اور ہلکا کرنے والا عذاب ہے

**خلاصہ تفسیر** یہود نے قرآن اور صاحب قرآن کا انکار کیا۔ کہ کیوں خدا تعالےٰ جس پر چاہے اپنے فضل سے وحی اتار دیتا ہے۔ اور ہمارے خاندان کے لئے نبوت کو خاص کیوں نہیں فرمایا۔ ان بے وقوفوں نے وہ تجارت کی جس میں بجائے نفع کے غضب الٰہی کمایا یہ تاجر ہیں ان کی جان اصل پونجی ہے۔ اور ان کی بدعملیاں وہ مال کہ جو اپنی قیمتی عمریں خرچ کر کے حاصل کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی جانیں دے کر جو کچھ خریدا وہ یہ تھا۔ کہ خدا کے پیغمبر کا ضد اور عناد سے انکار کیا۔ لہٰذا ان کا یہ سودا بڑا ہی برا ہے۔ یا یوں سمجھو۔ کہ ان کی جانیں رب تعالیٰ کے ہاں رہن اور قید تھیں۔ اور ان سے کہا گیا تھا۔ کہ تم نے ہماری نعمتوں کے عوض اپنی جانیں گروی کر دی ہیں۔ اب نیک اعمال کر کے چھڑا لینا انہوں نے یہ تو نہ کیا۔ بلکہ اس کے لئے اوندھی چال چلے۔ کہ کفر پر کفر کئے جس سے کہ یہ بجائے چھوٹنے کے اور زیادہ گرفتار اور مستحق غضب قہار ہو گئے۔

اور اپنے اس معاملہ میں بڑے بڑے رہے یا یوں سمجھو کہ انہیں نبی آخر الزمان کے تشریف لانے سے پیشتر ایمان حاصل تھا کہ اُن کو مانتے تھے لیکن اُن کے تشریف لانے پر انہوں نے الٹا بیوپار کیا کہ کفر کے عوض ایمان فروخت کر ڈالا۔ لہٰذا اس بازار سے بجائے نفع کے غضب اور قہر کے پشتارے اپنی پیٹھ پر باندھے ہوئے واپس آئے۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** حسد ایسی بری بلا ہے۔ جو خود حاسد کو کھاتی ہے محسود کا کچھ نہیں بگاڑتی۔ اس سے حاسد کی تندرستی خراب ایمان برباد اور دل سیاہ ہو جاتا ہے کیونکہ محسود تو آرام سے سوتا ہے مگر یہ بے چارہ حسد کی آگ میں جل کر اپنا عیش و آرام کھوتا ہے۔ اور جوان کے آنسو نہیں دھوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ شعر

چوں کنی بر بے حسد مکر و حسد  زاں حسد دل را سیاہی ہا رسد

خاک شو مردان حق را زیر پا  خاک بر سر کن حسد را ہم چو ما

یعنی حسد پر خاک ڈالو اور اللہ والوں کے پیروں کی خاک بن جاؤ۔ ورنہ خیال رکھو۔ کہ حسد تمہارے قلب کو بہت سیاہ کر دے گی۔ حاسد کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کو جلن سے فرصت نہیں وہ ترقی کے ذریعے کب سوچے **مسئلہ** حسد اور غبطہ میں فرق ہے۔ دوسرے کا زوال چاہنا حسد ہے۔ اور دوسرے کی طرح اپنے لئے بھی کمال چاہنا غبطہ ہے۔ حسد بہر حال حرام ہے۔ اور غبطہ دینی باتوں میں جائز و دنیاوی باتوں میں حرام ہم کسی کو نیک کام کرتے ہوئے دیکھ کر خود نیک کام کرنے لگیں یا اُس کی تمنا کریں۔ یہ عین ثواب ہے صحابہ کرام نیکیوں میں ایک دوسرے پر بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ **دوسرا فائدہ** نبوت بلکہ ولایت محض اللہ کے فضل سے ملتی ہے نہ کہ اپنے کمال سے کیونکہ یہاں وحی کو فضل فرمایا گیا۔ آدم و عیسیٰ علیہم السلام پیدا ہوتے ہی نبی تھے۔ ہمارے نبی علیہ السلام سب سے پہلے ہی نبی تھے معلوم ہوا۔ نبوت اعمال پر موقوف نہیں **تیسرا فائدہ** اللہ کا کرم کسی قوم کے ساتھ خاص نہیں وہ فاعل مختار ہے جس کو چاہے اپنے فضل سے نوازے اسی قوم پرستی سے یہودی تباہ ہوئے۔ اور اسی خاندان پرستی نے بہت سے مسلمانوں کو برباد کر دیا۔ **چوتھا فائدہ** رافضی بھی انہی یہودیوں کی طرح ہیں۔ کہ انہوں نے نبوت کو بنی اسرائیل سے خاص مانا اور انہوں نے خلافت کو بارہ اماموں میں منحصر کر دیا **پانچواں فائدہ** اہانت کا عذاب صرف کفار ہی کو ہوگا گنہگار مسلمانوں کے لئے درحقیقت وہ عذاب پاک کرنے کا ذریعہ ہوگا۔ جیسے کہ مہربان باپ اپنے بیٹے کو سزا دے یا اس کا ختنہ حجامت اور حمام کرائے اور یہ کیوں نہ ہو رب کا فیصلہ ہے وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ گنہگار بھی مومن ہی ہے۔ دوزخ میں جلنا اس کے لئے عزت ہے کہ یہ پاکی کا ذریعہ ہے۔ **پہلا اعتراض** غضب ایک مغلوبی حالت کا نام ہے جو بری چیز دیکھ کر خون کے جوش کھا جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا کی ذات اس سے پاک ہونی چاہیئے **جواب** حق تعالیٰ کے لئے یہ معنی محال ہیں۔ یہاں ارادہ عذاب مراد ہے۔ **دوسرا اعتراض** نبوت کی خواہش عبادت ہے۔ یہود نے یہی تو کیا تھا۔ وہ عذاب کے مستحق کیوں ہو گئے۔ ہر شخص فضل الٰہی حاصل کرنا چاہتا ہے **جواب** بے شک فضل نبوت بہتر لیکن نبی سے حسد بدترین گناہ مال سے محبت کرنا جائز مگر مالدار کی چوری یا اسے قتل کرنا حرام **تفسیر صوفیانہ** تجربہ سے ثابت ہے۔ کہ کسی پر رحمت دوسرے کے واسطے زحمت بن جاتی ہے۔ بارش بعض درختوں کے واسطے رحمت ہے۔ اور بعض کے لئے زحمت۔ نبوت اور ولایت کا بھی یہی حال ہے۔ کہ یہ نبی اور اُن کے امتیوں کے واسطے رحمت ہے۔ اور حاسدین کے واسطے زحمت بلکہ حق یہ ہے۔ کہ حسد بھی حاسد کے لئے زحمت اور محسود کے واسطے رحمت ہے۔ کہ اس سے اس کے درجے بڑھتے ہیں۔ بغیر حاسد اور دشمنوں کے کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ رب تعالیٰ نے جمال کا جلال کے ساتھ اور نور کا ظلمت کے ساتھ اور رحمت کا زحمت کے ساتھ جوڑا بنایا ہے۔ گلزار مصطفےٰ کے ساتھ بوجہلی بھی ہے۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

دریں چمن گل بے خار کس نچید آرے  چراغ مصطفوی با شرار بولہبیست

مولانا روم کے استاذ شیخ صلاح الدین زرکوب فرماتے ہیں۔ کہ مجھے رب نے آسمان گرانے کی قدرت دی ہے اگر میں چاہوں تو اللہ کے

سے باقی کا انکار ہوتا ہے جیسے کہ بادشاہ کہے کہ سب کو یہ چیز تقسیم کردو۔ دوسرا جواب دے کہ میں تو پٹھانوں کو دوں گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہی ہوگا۔ کہ پٹھان کے سوا اوروں کو نہ دوں گا۔ **وَهُوَ الْحَقُّ** یہ اُن کی نہایت نفیس تردید ہے۔ کہ وہ تو اس کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ حق ہے۔ اور حق کا انکار باطل ہی ہوتا ہے۔ لہذا وہ باطل پر ہیں۔ لطف یہ ہے۔ کہ قرآن وغیرہ **مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ** اُن کی کتاب کو سچا کرنیوالا ہے۔ کہ اگر یہ نہ آتا تو توریت غلط ثابت ہوتی۔ کہ اس نے اس کے آنے کی خبر دی تھی۔ لہذا توریت کو ماننا قرآن کے ماننے پر موقوف ہے۔ اور اس کا انکار توریت شریف کا انکار ہے۔ یہاں تک تو نہایت لطیف طریقہ سے سمجھایا گیا۔ کہ یہ لوگ توریت کے بھی منکر ہیں۔ اب نہایت واضح طریقہ پر یہی بات ثابت کی جارہی ہے۔ کہ **قُلْ** اے نبی علیہ السلام ان کی سرزنش یا ان کے قول و فعل میں فرق دکھانے کے لئے اِن سے یہ تو فرما دو۔ کہ اگر تم واقعی توریت کے ماننے والے ہو۔ تو **فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ** تم نے اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو کیوں قتل کیا جیسے حضرت شعیا۔ ذکریا و یحیٰی علیہم السلام توریت میں تمام انبیاء کی اطاعت کا حکم دیا گیا تھا۔ نہ کہ اُن کے قتل کا خیال رہے۔ کہ **تَقْتُلُوْنَ** ماضی کی حکایت ہے۔ جو صیغہ حال سے کردی گئی۔ اس کی حکمت انشاءاللہ اعتراض و جواب میں بتائی جائے گی۔ **اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ** اس شرط کی جزا محذوف ہے۔ یعنی اگر تم توریت کے مومن تھے۔ تو تم نے یہ حرکتیں کیوں کیں۔ اس الزام کے جواب میں شاید وہ کہہ دیتے کہ چونکہ موسےٰ علیہ السلام کا زمانہ گزرچکا تھا۔ اور ہم اُن کی تعلیم بھول چکے تھے اس لئے ایسی خطا ہوگئی۔ لہذا اب دوسرا واقعہ سناکر بتایا جارہا ہے۔ کہ تم نے خاص موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی کفر و عناد میں کونسی کمی کی۔ اس زمانہ میں تو تم نے اس سے بھی بڑھ چڑھ کے کفر کئے۔ کہ **وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ** تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام ایک نہیں بلکہ بہت سے کھلے ہوئے معجزات لائے۔ عصا تم نے دیکھا۔ ید بیضا کی تم نے زیارت کی۔ دریا چیرتے فرعون کو ڈوبتے اپنے کو ترتے تم نے دیکھا۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود **ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ** پھر بھی تم نے اس بے عقل بچھڑے کو معبود بنایا جو تمہارے ہاتھوں ڈھلا اور بنا حالانکہ ابھی موسیٰ علیہ السلام نے وفات نہ پائی تھی بلکہ **مِنْۢ بَعْدِهٖ** صرف انہوں نے تم سے پیٹھ ہی پھیری تھی کہ توریت لینے طور پر گئے تھے اور تم نے یہ غضب ڈھادیا۔ خیال رہے۔ کہ یہاں **ثُمَّ** صرف رتبے کی تراخی کے لئے ہے۔ نہ کہ تراخی زمانی کے لئے کیونکہ انہوں کی گائے پرستی اسی وقت ہوئی نہ کہ کچھ دنوں بعد اور پھر اس کفر کی یہ وجہ نہ تھی کہ شریعت موسوی منسوخ ہوچکی تھی یا موسیٰ علیہ السلام وفات پاگئے تھے بلکہ صرف اس لئے کہ **وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ** تم جنم کے عادی ظالم ہو۔ کہ تمہاری خمیر اور تخم میں ظلم اور کفر ہے۔ **خلاصہ تفسیر** مسلمانوں کی طرف سے یہود مدینہ سے نہایت معتدل طریقہ پر کہا گیا۔ اور اُن کو نہایت نفیس طریقہ سے دعوت ایمان دی گئی۔ کہ اے یہود جس طرح تم نے توریت کو مانا ہے۔ اسی طرح انجیل و قرآن کو بھی مانو کیونکہ وجہ ایمان ان سب میں ایک ہی ہے۔ انہوں نے بے باکی سے کہا۔ کہ ہم تو اس کو مانیں گے جو ہم بنی اسرائیل پر اتری سب نے ان کے کلام کی شرح فرمائی۔ کہ اے مسلمانوں ان کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس کے ماسوا کسی کتاب کو نہ مانیں گے۔ پھر اُن کی چار طریقہ سے تردید فرمائی گئی۔ اولا یہ کہ قرآن حق ہے جس کا یہ بھی اقرار کرتے ہیں۔ لہذا ان کا انکار کرنا باطل دوسرے یہ کہ قرآن توریت کو سچا کرنے والا ہے۔ کیونکہ توریت میں اس کے آنے کی خبر تھی لہذا اس کا انکار توریت کا ہی انکار ہے۔ تیسرے یہ کہ تمہارے گذشتہ اعمال تمہارے دعوے کو توڑتے ہیں۔ کہ توریت میں انبیاء کرام کی اطاعت کا حکم تھا۔ تم نے انہیں قتل کیا۔ اب بتاؤ تمہارا ایمان کہاں رہا۔ نیز تم نے صاحب توریت علیہ السلام کی موجودگی ہیں اُن کے کچھ غائب ہوتے ہی بدتر شرک کرڈالا معلوم ہوا۔ کہ تم ہمیشہ سے ہی ظالم ہو یہ انکار بھی اسی وجہ سے ہے۔ **دوسری تفسیر** جب یہود سے کہا جاتا۔ کہ تم ساری کتابوں پر ایمان لاؤ۔ تو وہ کہتے ہیں۔ کہ چونکہ ہم توریت کے ماننے والے ہیں۔ اس لئے قرآن کے صرف اس حصہ کو مانیں گے جو اس کے موافق ہے یعنی اس کے خلاف مضمون کو ہرگز نہ مانیں گے۔ اس کی تردید میں ارشاد ہوا کہ یہ مضمون بھی حق ہے۔ اور اس نسخ میں بھی توریت کی تصدیق ہے۔ کہ توریت نے اس نسخ کی خبر دی تھی۔ اور اگر تم توریت کی حمایت میں اس کے ناسخ قرآن کو نہیں مانتے

اور اس نبی آخر الزمان میں یہ عیب نکالتے ہو کہ یہ توریت کے منسوخ کرنے والے ہیں۔ اس لئے ہم ان کو نہیں مانتے تو بتاؤ۔ کہ ان سے پہلے جو پیغمبر توریت کی اشاعت و حمایت کرنے کے لئے آئے۔ انہیں تم نے کیوں قتل کیا وہ تو ناسخ نہ تھے۔ بلکہ حامی تھے۔ نیز موسیٰ علیہ السلام تو خود توریت لانے والے ہیں۔ تم نے اُن کی موجودگی میں بت پرستی کیوں کی یہ تمہارے صرف بہانے ہیں۔ انکار کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم ضدی اور موروثی ظالم ہو۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** کفار سے مناظرہ کرنا سنت قرآنی ہے **دوسرا فائدہ** بے دینوں سے دین میں جھگڑا کرنا اور مناظرہ میں نقض وارد کرنا مقابل کو الزامی جواب دینا طریقہ انبیاء ہے **تیسرا فائدہ** بعض انبیاء پر ایمان اور بعض کا انکار بالکل غلط بلکہ محال ہے۔ کیونکہ ہر نبی سب کی تصدیق فرماتے ہیں۔ ایک کا بھی انکار اس تصدیق کا انکار ہے مثلاً موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ کہ نبی آخر الزمان سچے اور اُن کا قرآن حق ہے۔ اب جو قرآن کا انکار کرتا ہے۔ وہ موسیٰ علیہ السلام کے اس فرمان کا منکر ہے۔ **مسئلہ** یہی حال صحابۂ کرام اور اہل بیت کا ہے۔ کہ ان میں سے ایک کا دوسرے کا انکار ہے مثلاً صدیق اکبر کا اگر انکار کر دیا جائے۔ تو قرآن شریف غلط ٹھہرا۔ کیونکہ اس کے جمع کرنے والے وہی ہیں۔ اور پھر اہل بیت کے فضائل کی حدیثیں بھی غلط ہوئیں۔ کیونکہ یا تو وہ صدیق سے مروی ہیں۔ یا اُن کے معتقدین سے جب دونوں راستے بند ہوگئے۔ تو اہل بیت کے ماننے کا اور پہچاننے کا کون سا ذریعہ رہا۔ نیز سیدنا علی نے اپنے تقریر اور تحریر میں ان کے فضائل بیان کئے۔ دیکھو نہج البلاغ (خطبات علی المرتضیٰ) لہٰذا صدیق اکبر کا انکار سیدنا علی کے ان فرمانوں کا انکار ہے۔

سارے اصحاب نبی کا ہے جو دل سے معتقد ماننے والا وہی ہے حیدر کرار کا

سی لئے رافضیوں نے مولا علی میں تقیہ (منافقت) مانا۔ کہ جو کچھ انہوں نے ابوبکر و عمر کے فضائل فرمائے یا اُن کے خلافت کا اقرار کیا اُن سے بیعت کی یہ دل سے نہ تھا محض منافقانہ چال تھی۔ معاذ اللہ۔ امام حسین رضی اللہ عنہ نے میدان کربلا میں سخت تکلیف کے باوجود تقیہ نہ کیا **چوتھا** انبیاء کرام کی مخالفت انہیں قتل کرنا یا ایذا پہنچانا کفر ہے۔ دیکھو بنی اسرائیل نے دعویٰ ایمان کیا تھا۔ قرآن کریم نے اُن کا یہ جرم (قتل انبیاء) دکھا کر انہیں جھٹلایا۔ اور ان کا کفر ثابت کیا۔ **پانچواں فائدہ** کفر سے راضی ہونا بھی کفر ہے۔ دیکھو موجودہ بنی اسرائیل نے انبیاء کرام کو قتل نہ کیا تھا محض اس سے راضی تھے قرآن کریم نے اُن سے فرمایا۔ تَقْتُلُوْنَ تم قتل کرتے ہو **مسئلہ** دیوبندیوں کے چند سردار حضور علیہ السلام کی توہین کر کے کافر ہوئے۔ اب جو بھی اُن توہینوں کی حمایت کرے۔ وہ اسی قاعدے سے اُن جیسا کافر ہے۔ **چھٹا فائدہ** ایمانیات میں اپنی طرف سے قید لگانا خدا کا انکار اور اپنے خدا ہونے کا اقرار ہے۔ اُس کا ایمان رب پر نہیں اپنے پر ہے۔ کہ رب کی بات صحیح نہیں میری بات صحیح ہے۔ یہودیوں کو حکم تھا۔ کہ جو اللہ نے اُتارا اس پر ایمان لاؤ۔ انہوں نے کہا نہیں بلکہ جو اللہ نے ہم پر اُتارا اس پر ایمان لائیں گے۔ انہوں نے (ہم پر) یہ قید اپنی طرف سے لگائی جس سے وہ رب کے منکر ہو کر کافر ہوئے۔ **مسئلہ** روافض حضور علیہ السلام یا اہل بیت کو نہیں مانتے۔ بلکہ صرف اپنے اس فہرست بنانے والے کو مانتے ہیں جس نے انہیں بارہ اماموں کی فہرست بنا کر دیدی۔ کہ ان کو ماننا باقی کو گالیاں دینا۔ ورنہ کیا وجہ ہے۔ کہ پیغمبر علیہ السلام کی ایک بیٹی حضرت فاطمہ کو تو مانیں باقی بیٹیوں رقیہ کلثوم اور زینب کو گالیاں دیں پھر حضور کے ایک داماد حضرت علی کو تو مانیں اور دو دامادوں حضرت عثمان اور ابوالعاص کو گالیاں دیں۔ پھر سیدنا علی کے دو بیٹوں امام حسن و حسین کو تو مانیں اور باقی بیٹوں یعنی محمد ابن حنفیہ اور ابوبکر و عمر و (سیدنا علی کے بیٹے) کو گالیاں دیں۔ پھر حضرت فاطمہ کے دو بیٹوں یعنی امام حسن حسین کو تو مانیں اور اُن کی بیٹی حضرت ام کلثوم کو گالیاں دیں۔ اس لئے کہ وہ حضرت عمر کے نکاح میں تھیں۔ اگر نبی یا اہل بیت پر ایمان ہوتا۔ تو اُن کی اولاد تو کیا اُن کے غلاموں بلکہ گلی کے کتوں سے بھی محبت ہوتی۔ **پہلا اعتراض** تَقْتُلُوْنَ سے زمانہ حال معلوم ہوتا ہے۔ اور مِنْ قَبْلُ سے ماضی یہاں چاہیے تھا۔ قَتَلْتُمْ کیونکہ یہ واقعہ پہلے ہو چکا تھا **جواب**۔ لازمی صفت صیغہ حال سے

بیان کر دی جاتی ہے (تفسیر کبیر) نیز یہاں تقتلون سے مراد ترضون ہے یعنی تم اپنے بڑوں کے قتل سے راضی ہوتے ہو۔ چونکہ رضا جرم اور جرم ایک ہی حکم میں ہیں۔ اس لئے رضا کو قتل فرما دیا گیا۔ **دوسرا اعتراض** بچھڑے کی پوجا توریت ملنے سے پہلے ہوئی تھی۔ پھر اس کو توریت کے انکار کی دلیل کیوں بنایا گیا **جواب**۔ چونکہ توحید کا اقرار توریت ملنے سے پہلے کر چکے تھے۔ اور توریت میں بھی اس کا حکم تھا۔ لہٰذا بت پرستی توریت کی بھی مخالفت ہے۔ نیز پیغمبر اور کتاب کی مخالفت یکساں ہے۔ **تفسیر صوفیانہ** صورت سے سیرت قالب سے قلب۔ قال سے حال اور اعمال سے کمال کا پتہ چلتا ہے۔ جن کا قلب درست ہوگا۔ انشاء اللہ اس کی ساری چیزیں درست ہوں گی جس شخص کے اعمال اس کے دعوے کے مطابق نہ ہوں۔ وہ دعوے میں جھوٹا ہے۔ اس آیت کریمہ میں یہودیوں کے قول فعل سے ان کی بے ایمانی کا ثبوت دیا گیا نیز جو شخص کہ بارگاہ مصطفےٰ علیہ السلام کو ٹھکرایا ہوا ہو وہ کہیں بھی سرسبز نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ ان یہودیوں کا حال ہوا۔ اس کا حال ہوا اسی طرح جو شخص کسی ولی اللہ کے عتاب میں آ جائے وہ ... سے در کار ہی جاتا ہے۔ بعض بدقسمت مرید یہ سمجھتے ہیں۔ کہ اپنے سلسلے کے مشائخ کرام و باقی سے کوئی تعلق نہ رکھو۔ وہ بے عقل مشرب تصوف میں ان یہودیوں کی طرح ہی ہیں جنہوں نے کہا تھا کہ ہم اپنے پر اتری ہوئی کتاب کے مومن ہیں۔ وہ تو ایمان سے محروم رہے۔ اور یہ ... مرید عرفان سے معرفت حاصل کرنے کے لئے ہر ولی کے زیر سایہ رہنا ضروری ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے۔ کہ جہاں سے فیض ملے تو ... سمجھے کہ یہ میرے مرشد کا فیض ہے۔ جو اس دروازے سے مل رہا ہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَ

اور جبکہ لیا ہم نے عہد تمہارا اور اٹھایا ہم نے اوپر تمہارے طور کو پکڑو وہ جو دیا ہم نے تم کو ساتھ طاقت کے اور

اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پیمان لیا اور طور کو تمہارے سروں پر بلند کیا۔ لو جو ہم تمہیں دیتے ہیں زور سے اور

اسْمَعُوا قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ

سنو کہا انہوں نے سنا ہم نے اور نافرمانی کی ہم نے اور پلا دیئے گئے وہ بیچ دلوں اپنے کے بچھڑا بوجہ کفر کے ان کے

اور سنو بولے ہم نے سنا اور نہ مانا۔ اور ان کے دلوں میں بچھڑا رچ رہا تھا۔ ان کے کفر کے سبب

قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۹۳)

تم فرما دو بری ہے وہ چیز کہ حکم کرتا ہے تم کو ساتھ اس کے ایمان تمہارا اگر ہو تم ایمان والے

تم فرما دو کیا برا حکم دیتا ہے تم کو تمہارا ایمان اگر ایمان رکھتے ہو

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے کئی طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** پچھلی آیت میں بنی اسرائیل کی بدکرداریوں سے ثابت کیا گیا تھا کہ وہ توریت کے منکر ہیں۔ اب اس سے ترقی کر کے خود توریت قبول کرتے وقت کی حالت سے ان کی بے ایمانی ثابت کی جا رہی ہے کہ توریت بھی انہوں نے بخوشی نہیں کی بلکہ خوف کی وجہ سے چار و ناچار صرف زبانی قبول کر لی تھی **دوسرا تعلق** اس سے پہلے یہودیوں کے اس دعوے کی تردید تھی کہ ہم اپنے دین پر مضبوطی سے قائم ہیں۔ اور ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ رب تعالیٰ نے فرمایا بلکہ ان پر لعنت کر دی ہے۔ اس دعوے کے ترتیب وار تین ثبوت دیئے جو کہ ایک دوسرے سے علٰی ہیں۔ ایک یہ کہ تم نبی آخر الزماں کی تشریف آوری سے پہلے ان کی دعائیں مانگتے تھے۔ اور ان کے وسیلہ کرتے تھے۔ اور جب وہ بنی اسمٰعیل میں سے تشریف لائے۔ تو تم حسد سے ان کے منکر ہو گئے۔ یہ تعصب ہے۔ دوسرے یہ کہ تمہارا یہ خیال ہے۔ کہ توریت کے سوا

کسی اور سچی بات کو بھی نہ مانیں گے۔ یہ بھی تعصب ہے۔ اس وجہ سے تم نے توریت کے حامی نبیوں کو بھی قتل کر ڈالا۔ اب اس آیت میں تیسرا ثبوت دیا جارہا ہے۔ کہ تم نے موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی اس توریت کو صحیح معنی میں نہ اختیار کیا۔ اور یہی طریقہ مناظرہ ہے کہ کلمت کہ دعویٰ کے چند ثبوت دیئے جائیں کہ ہر اگلا ثبوت پچھلے سے اعلیٰ ہو۔ تیسرا تعلق اس سے پہلے فرمایا گیا تھا کہ تم اس قرآن کا انکار کرتے ہو۔ جو توریت کو سچا کرنیوالا ہے۔ اس سے توریت کا انکار لازم آئیگا۔ اب فرمایا جارہا ہے۔ کہ تم توریت کے صراحتاً منکر ہو یعنی پہلے توریت کے انکار کا الزامی ثبوت دیا گیا تھا۔ اور اب صریحی **تفسیر وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ** یہاں بھی وہی اُذکروا فعل محذوف ہے۔ یعنی اے اسرائیلیو تم اس واقعہ کو بھی یاد کرو جبکہ ہم نے تم سے توریت پر عمل کرنیکا عہد لیا تھا۔ اور تم نے اس سے صاف انکار کر دیا تھا کہ ہم سے ان بھاری احکام پر عمل نہ ہوسکے گا۔ اس لئے **وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ** ہم نے تم پر شامیانہ کی طرح طور پہاڑ اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ اگر تم بالکل پہلے ہی سے مان لیتے تو تم پر طور کیوں آتا۔ اس کا آنا ہی تمہارے انکار کی کھلی دلیل ہے۔ اور طور اٹھا کر ہم نے کہا۔ **خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ** جو کچھ ہم نے تم کو دیا پورے زور سے لے لو یعنی اس کے سخت احکام پر عمل کرو۔ اور تکلیفیں برداشت کرو۔ **وَاسْمَعُوْا** اور تم ساری توریت کو پوری توجہ سے سنو تاکہ کوئی حکم سننے سے رہ نہ جائے خیال رہے کہ یا تو توریت کے لینے سے اُس پر عمل کرنا مراد ہے اور سننے سے قبول کرنا اور چونکہ عمل مقصود ہے اور قبول کی شرط اس لئے سننے کا ذکر لینے کے بعد کیا گیا یا لینے سے اُس کا ماننا مراد ہے اور سننے سے اطاعت کرنا۔ ماننا اطاعت سے پہلے ہے۔ لہٰذا پہلے لینے کا ذکر کیا گیا اور بعد میں سننے کا یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ لینے سے مراد ہو اُس پر قبضہ کرنا اور پکڑنا اور سننے سے مراد ہو عمل کے لئے پڑھوا کر سننا جیسا کہ کوئی کتاب پہلے حاصل کرتے ہیں۔ پھر پڑھوا کر سنتے ہیں۔ یا لینے سے مراد ہو۔ توریت پر عمل کرنا اور سننے سے موسیٰ علیہ السلام کے دوسرے فرمانوں کا ماننا چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ اسی خوشی کی بات میں دل سے اطاعت کرتے مگر **قَالُوْا** انہوں نے صرف منہ سے کہہ دیا **سَمِعْنَا** ہم نے سن تو لیا۔ یہاں قالوا اور سمعنا فرمانے میں بڑا باریک اشارہ ہے۔ کہ اُن کی یہ ساری باتیں فقط ظاہری تھیں پہاڑ کے خوف سے کہہ رہے تھے۔ کہ غیر مرتا کیا نہ کرتا اُن کے دل میں یہ تھا کہ **عَصَيْنَا** جب چھوٹیں گے تب لوٹیں گے جب اس خوف سے امن ملے گی۔ تو مولیٰ کریں گے تیری نافرمانی یہ معلوم ہوا کہ اُن کے دل نہایت سخت تھے۔ کہ ایسی خطرناک حالت میں بھی نرم نہ ہوئے۔ اس لئے کہ **وَاُشْرِبُوْا** وہ پلا دیئے گئے پلانے سے یا تو پلانے کے ظاہری معنی مراد ہیں۔ یعنی جیسے کہ شراب معدہ میں پہنچ کر مست اور مخمور کر دیتی ہے۔ ایسے ہی بچھڑے کی محبت کی شراب نے انہیں مخمور بنا دیا تھا جس سے کہ وہ برے بھلے میں تمیز نہ کرسکے۔ یا اس سے غوطہ دینا مراد ہے۔ جیسے کہ کپڑے کو رنگ میں غوطہ دیتے ہیں۔ جس سے اُس کا تار تار رنگین ہوجاتا ہے۔ اور رنگت اُس کے ریشے ریشے میں سرایت کر جاتی ایسے ہی اُن کے دلوں کو محبت بچھڑے کے رنگ میں ڈبو دیا گیا جس سے کہ اُن کے دل رنگ گئے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ اشراب سے رنگوں کی آپس کی آمیزش مراد ہو جیسے کہ عرب کہتے ہیں۔ ثَوْبٌ مُشْرَبٌ بِحُمْرَةٍ کپڑا مائل بہ سرخی ہے۔ یعنی اُن کے دلوں میں بچھڑے کی محبت کی جھلک تھی۔ غرضکہ اس کے تین معنے ہیں۔ اور دوسرے معنی میں نہایت لطف **فِیْ قُلُوْبِهِمْ** یہ اشراب کا ظرف ہے یعنی اور شرابیں تو معدہ میں پہنچکر دل دماغ کو خراب کرتی ہیں۔ اور یہ خراب خاص اُن کے دل میں پہنچی جیسے کہ جب زمین پانی پیتی ہے۔ تو اس سے قسم قسم کی سبزیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح بچھڑے کی محبت کی شراب سے قسم قسم کی خراب حرکتیں اُن سے ظاہر ہوتیں **الْعِجْلَ** یہاں حب محذوف ہے یعنی گائے کی محبت سبحان اللہ کیا لطیف عبارت ہے کہ بچھڑے کی محبت کو شراب قرار دیا۔ اور یہودیوں کے دل کو اس کا جائے قیام۔ اور اُن کی ذات کو مظہر آثار یعنی یہ شراب اُن کے دلوں میں پہنچی جس سے وہ سر تا پا مخمور ہوگئے۔ یا بچھڑے کی محبت کو گہرا رنگ قرار دیا۔ اور یہودیوں کے دلوں کو اس کا ظرف اور اُن کی ذات کو اس کا مظہر یعنی بچھڑے کی محبت کے گہرے رنگ نے اُن کے دلوں میں ایسا اثر کیا کہ وہ سر تا پا اس میں رنگ گئے۔ باب جو کچھ اُن کی حرکتیں تھیں یہ اس رنگ یا خام کا اثر تھا۔ اصل عبارت یوں تھی۔ وَاُشْرِبَ الْعِجْلُ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مگر اس طرح بیان کرنے میں عجیب ہی نکات پیدا ہوگئے۔ یہ رنگ کیوں چڑھا **بِكُفْرِهِمْ** اُن کے پچھلے کفر کی وجہ سے یعنی اُن کے دلوں پر اللہ کا رنگ نہ تھا۔ صحبت نبی سے اگرچہ بہت حد تک صفائی ہوئی

گئی تھی لیکن پھر بھی کفر کی ایک تہ باقی تھی۔ وہ کیا کفر کی طرف میلان اسی لئے انہوں نے دریا سے نکلتے ہی موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا تھا کہ ہمارے لئے بھی ایک جسم والا خدا بنا دو۔ اس میلان کفر کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ موقعہ پاتے ہی وہ بچھڑے کے پجاری بن گئے۔ جیسے کہ بیمار میں کمزوری باقی ہو۔ اور معمولی سردی گرمی پا کر پھر بیمار ہو جائے تفسیر روح البیان نے یہ بھی فرمایا۔ کہ موسےٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کی راکھ نہر میں پھینکوا دی اور ان لوگوں نے جوش محبت میں وہ پانی پی لیا جس کے اثر سے اُن کے دل میں اس کی محبت باقی رہ گئی۔ اس صورت میں پلانے کے معنی بالکل ظاہر ہیں **قُلْ** اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم موجودہ یہودیوں کو یہ قصہ سنا کر اُن سے یہ فرما دو کہ **بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِیْمَانُكُمْ** تمہارا دعوی کا ایمان تم سے بڑے بڑے بڑے کام کرا لیتا ہے۔ کہنا تو یہ تھا کہ تمہارا ایمان بڑا برا ہے۔ مگر فرمایا۔ یہ کہ تمہارے ایمان نے جو تم سے کام کرائے وہ بڑے برے ہیں۔ تاکہ اُن کے اعمال اور عقائد دونوں کی برائی بطور کنایہ بیان ہو جائے۔ کہ بے ایمانو کیا ایمان وار کا ایمان اُس سے ایسی ناشائستہ حرکتیں کراتا ہے۔ سب نے اُن کی بے ایمانی کو ایمان فرمایا۔ اُن کو ذلیل کرنے کے لئے جیسے کہ تھانیدار کسی چور سے کہے۔ کہ تو تو بڑا شریف ہے تیری شرافت تجھ سے چوریاں کراتی ہے۔ **اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ** اس شرط کی جزا محذوف ہے یعنی اگر تم توریت کے ماننے والے تھے۔ تو تم سے یہ حرکتیں کیوں صادر ہوئیں معلوم ہوا۔ کہ تم پہلے ہی سے توریت کے منکر ہو اب اپنے اس نئے کفر کے لئے توریت کو آڑ بنا رہے ہو **خلاصہ تفسیر** پہلے یہود کی بے دینی کے چند عملی ثبوت دیئے گئے۔ اب توریت کے قبول کرنے کا قصہ سنایا جا رہا ہے جس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ لوگ توریت کے اوّل ہی سے منکر تھے فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اے یہودیو تم توریت ملنے کا وقت تو یاد کرو کہ جب تم نے توریت کو دیکھتے ہی انکار کر دیا۔ اور اسکے منوانے کیلئے طور پہاڑ اکھیڑ کر تمہارے سروں پر شامیانے کی طرح کھڑا کر دیا گیا۔ اور اس حالت میں تم سے کہا گیا۔ کہ قبول کرو اور سنو ورنہ پہاڑ گرتا ہے۔ تم نے یہ خطرہ دیکھ کر منہ سے تو کہہ دیا۔ کہ سن لیا۔ مگر دل تمہارے اسوقت یہ ہی کہتے رہے کہ نافرمانی کریں گے چونکہ شریعت کا حکم ظاہر پر ہے۔ اسلئے تمہارے اس کہہ دینے سے ہی پہاڑ ہٹا دیا گیا۔ اور یہ کیوں نہ ہوتا۔ تمہارے دل تو پہلے ہی سے بچھڑے کی محبت میں رنگے ہوئے تھے اور اس شراب سے مست و سرشار تھے یہ سب حرکتیں اس نشے کی تھیں۔ اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے فرما دو۔ کہ اگر اسی کا نام ایمان ہے جو تم سے ایسی بری حرکتیں کرا لیتا ہے۔ تو اس ایمان کو دور سے سلام اگر تم مومن تھے تو تم سے یہ حرکتیں کیوں صادر ہوئیں۔ اور جب تم نے توریت کو ہی اس مصیبت سے صرف زبانی مانا نہ کہ دل سے تو اگر آج قرآن کا انکار کر دو تو کیا بعید ہے۔ تمہارا یہ کفر و انکار توریت ماننے کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ اصل وجہ وہی ہے۔ کہ تمہارے دلوں میں کفر کی محبت اب بھی موجود ہے۔ اور اس محبت نے اسلئے زیادہ اثر کیا۔ کہ پچھلے کفر کی وجہ سے تمہارے قلب کی زمین پہلے ہی ہموار ہو چکی تھی۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** ڈر سے ایمان نہیں ملتا۔ بلکہ فیضان الٰہی سے یہ یہودی اتنا بڑا خوف دیکھ کر بھی صحیح مومن نہ ہوئے **دوسرا فائدہ** شریعت کے احکام ظاہر پر ہیں نہ کہ فقط دل پر اسی لئے جب اسرائیلیوں نے منہ سے سَمِعْنَا کہہ دیا تو ان سے پہاڑ ہٹا لیا گیا **تیسرا فائدہ** دنیوی ڈر اور خوف کا ایمان اللہ کے نزدیک معتبر نہیں۔ اور اخروی ڈر و خوف کا ایمان معتبر ہے۔ جو دوزخ کے ڈر یا جنت کے لالچ سے ایمان قبول کرے عند اللہ معتبر اور جو دنیوی خوف سے ایمان لائے وہ غیر معتبر **چوتھا فائدہ** کفر کی طرف میلان کفر تک پہنچا دیتا ہے جیسے کہ ان یہودیوں کا حال ہوا۔ **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل سے جبراً توریت منوائی گئی حالانکہ دوسری جگہ فرمایا جا رہا ہے۔ **لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ** دین میں جبر نہیں **جواب**۔ اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے۔ کہ وہ لوگ ایمان تو پہلے لا چکے تھے۔ اب توریت کو دیکھ کر مرتد ہو رہے تھے اور ارتداد سے جبراً روکنا جائز ہے یا اب وہ عمل سے انکار کر رہے تھے اُن سے جبراً عمل کرایا گیا۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں جیسے کہ کسی مسلمان سے جبراً نماز پڑھائیں یا اسے گناہ سے روکیں **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس مصیبت میں دونوں باتیں ہی کہیں سَمِعْنَا بھی اور عَصَیْنَا بھی کیونکہ یہ دونوں قَالُوْا کے مفعول ہیں۔ اور یہ عقل میں نہیں آتا۔ کہ ایسی مصیبت میں بھی وہ یہ کہنے کی ہمت کرتے اور

اگر ایسا انہوں نے کیا بھی تو چاہیئے تھا۔ کہ پہاڑ گر جاتا کیونکہ انہوں نے ایمان قبول کیا ہی نہیں **جواب** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں قَالُوا مطلق ہے۔ یعنی انہوں نے منہ سے کہا سَمِعْنَا اور دل سے کہا عَصَیْنَا جیسے کہ منافقین یہود حضور علیہ السلام سے عرض کرتے تھے وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ یعنی آپ سنیئے اور خدا کرے سننے کے قابل نہ رہیں۔ یہ لوگ وَاسْمَعْ زبان سے کہتے تھے۔ اور غَیْرَ مُسْمَعٍ دل سے اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ اب بھی بعض سرکش ڈاکو پٹتے میں حاکموں کو گالیاں دیتے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہاں ترتیب میں فرق ہے۔ یعنی جب اُن پر پہاڑ آیا۔ تو سمجھے کہ یونہی ڈرانے کے لئے آیا ہے۔ تو کہتے رہے عَصَیْنَا۔ عَصَیْنَا مگر جب دیکھا کہ پہاڑ تو اور بھی نیچے آ رہا ہے۔ اور قریب ہے۔ کہ گر جائے۔ تو سمجھے کہ یہ نخرے کرنیکا وقت نہیں ہے تب کہا سَمِعْنَا اسکی تفصیل دوسری آیت میں کر دی گئی ہے۔ کہ وَظَنُّوْا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ تیسرے یہ کہ اُسی وقت بعض نے سَمِعْنَا کہا تھا۔ اور بعض نے عَصَیْنَا چوتھے یہ کہ اُن سب نے سَمِعْنَا کہا تھا۔ مگر اُن کی اولاد نے عَصَیْنَا۔ پانچویں یہ کہ اُن سب نے کہا تو تھا سَمِعْنَا مگر عمل سے ثابت کیا عَصَیْنَا **تیسرا اعتراض** یہی واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اب دوبارہ کیوں بیان ہوا اس تکرار سے کیا فائدہ **جواب**۔ اولاً تو بیان میں فرق ہے۔ کہ وہاں سمعنا اور عصینا کا ذکر نہ تھا۔ اور یہاں ہے۔ لہٰذا تکرار نہ ہوئی اور پھر مقصد میں فرق ہے ـــــــــــــــ کہ وہاں اُن کے قبول کرنے کا طریقہ بتایا گیا تھا۔ اور یہاں اُس کی نوعیت کہ انہوں نے ظاہراً قبول کیا نہ کہ حقیقتاً نیز ایک بات چند جگہ بیان کرنے میں تاکید کا فائدہ دیتی ہے **چوتھا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ کفر کی وجہ سے اُن کے دلوں میں بچھڑے کی محبت آئی۔ اُن کا پہلا کفر کونسا تھا جس سے یہ محبت پیدا ہوئی **جواب**۔ اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا۔ کہ انہوں نے پہلے ایک بُت پرست قوم کو دیکھ کر بُت پرستی کی تمنا کی پھر اگرچہ توبہ کر لی۔ مگر اس کا اثر باقی رہا۔ **پانچواں اعتراض** بچھڑا پوجنے والے سب قتل کر دیئے گئے تھے۔ اور توبہ کر کے شہید مرے تھے اُن کے دلوں میں محبت باقی کیسے رہی **جواب**۔ یا تو اس لئے کہ سب پُجاری قتل نہ ہوئے تھے اور توبہ کے چند درجے ہوتے ہیں۔ اُن کی توبہ ہلکے درجے کی تھی جس کی وجہ سے قلب میں کچھ ظلمت باقی رہ گئی تھی وہی کبھی کبھی اپنا رنگ دکھاتی تھی۔ اسی لئے قرآن نے فرمایا۔ وَاُشْرِبُوْا جیسے کہ جب ایک رنگ میں دوسرے رنگ کی آمیزش کر دی جائے تو اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایسے ہی اُن کی توبہ میں بچھڑے کی محبت کی جھلک تھی۔ روح البیان نے اس جگہ فرمایا۔ کہ جب اِن لوگوں نے اس نہر کا پانی پیا کہ جس میں بچھڑے کی راکھ پھینکی گئی تھی۔ تو اُن میں سے بہت سوں کے ہونٹ نیلے پڑ گئے جو کہ اس محبت کا اثر تھا۔ یا یہ کہ جو بچھڑے کی پوجا سے محفوظ رہے تھے۔ وہ پوجاریوں سے پورے متنفر نہ تھے جس کا اثر اُن میں یہ پیدا ہو گیا۔

**تفسیر صوفیانہ** وہی بیج پھل دیتا ہے۔ جو اچھی زمین میں صحیح وقت پر بو دیا جائے۔ پھر اسے مناسب ہوا۔ اور پانی بھی ملتا رہے۔ اور پھر زمینی آسمانی آفات سے محفوظ رہے برسات میں چھت اور دیواروں میں بعض دانے اُگ جاتے ہیں۔ مگر وہ پھل نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اُن کی زمین درست نہیں۔ اسی طرح کلمہ توحید جب ہی پھل دیگا۔ جبکہ دل کی زمین میں بویا جائے۔ محبت الٰہی کا پانی پائے۔ رحمت الٰہی کی اُس کو ہوائیں لگیں مخالفتِ انبیاء و اولیاء کی آفات سے محفوظ رہے بنی اسرائیل کا تخم ایمان صرف زبان پر اُگا۔ کہ انہوں نے سمعنا کہہ دیا۔ اور اسے بچھڑے کی محبت کا پانی ملا مخالفت نبی کی آفتیں اس پر آتی رہیں۔ اُس کا اُلٹا نتیجہ نکلا جس سے وہ اور زیادہ مردود ہو گئے۔ اگر کلمہ توحید کی صحیح کاشت ہو جائے۔ تو ایسے پھل دیتا ہے۔ کہ سبحان اللہ ایک آن میں مردود کو مقبول بنا دیتا ہے خطاؤں کو مٹاتا ہے۔ رب کی عطائیں دلاتا ہے۔ اس جگہ تفسیر روح البیان میں ہے کہ جب دحیہ کلبی اسلام سے مشرف ہوئے تو رونے لگے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تو خوشی کا وقت ہے۔ روتے کیوں ہو۔ انہوں نے عرض کیا۔ کہ میں نے زمانہ کفر میں اپنے قبیلہ کی ستر لڑکیاں اپنے ہاتھ سے ذبح کی ہیں۔ میرا یہ گناہ کیونکر معاف ہوگا حضور علیہ السلام حیران ہوئے فوراً جبریل امین حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا۔ کہ یا حبیب اللہ دحیہ کو رب کا پیغام پہنچا دو۔ کہ جب میں نے اس کلمہ برکت سے تمہارے ساٹھ سال کی کفر و خطائیں معاف کر دیں۔ تو ستر لڑکیوں کا خون کیوں نہ معاف کر دوں گا حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ مولیٰ جب تو نے

ایک بار کلمہ پڑھنے سے ستر خون معاف کر دیئے تو جو دن رات کلمہ پڑھے اُس کو تو کیا کچھ نہ دے گا۔ مگر خیال رہے کہ یہ صحیح کلمے کی برکتیں ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔ شعر

اذکروا اللہ کار ہر اوباش نیست ارجعی بر پائے ہر قلاشش نیست

کلمہ ایمان اور قرآن یا تو ہمارے گواہ ہیں۔ یا ہم پر گواہ۔ ہمیشہ رب کا فضل مانگنا چاہیئے۔

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ

فرما دو تم اگر ہو واسطے تمہارے گھر پچھلا نزدیک اللہ کے بڑا سوا سے لوگوں کے

تم فرما دو اگر پچھلا گھر اللہ کے نزدیک خالص تمہارے لئے ہو نہ اور دل کے لئے

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿٩٤﴾ وَلَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ

پس تمنا کرو تم موت کی اگر ہو تم سچے اور ہرگز نہیں تمنا کریں گے وہ اسکی کبھی بھی بوجہ اسکے آگے بھیجے

تو بھلا موت کی آرزو تو کرو اگر سچے ہو۔ اور ہرگز کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے۔ ان بد اعمالیوں

أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٩٥﴾

ہاتھوں نے اُن کے اور اللہ خوب جاننے والا ہے ظالموں کو

کی جو آگے کر چکے اور اللہ خوب جانتا ہے۔ ظالموں کو۔

**تعلّق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ پہلا تعلق اب تک یہودیوں کی بے ایمانی اُن کے گذشتہ بدعملیوں سے ثابت کی گئی۔ اب اُن موجودہ حالات سے اُن کی بے دینی ثابت کی جا رہی ہے۔ کہ اے یہودیو تم تو اب بھی توریت کو نہیں مانتے۔ دوسرا **تعلق** اب تک مناظرانہ رنگ میں گفتگو تھی جس کو شاید جہلاء نہ سمجھتے۔ اب ایک نہایت ظاہر بات سے فیصلہ کرایا جا رہا ہے جسکو بچہ بھی سمجھ جائے۔ کہ اے بے دینو اگر تم توریت کے ماننے والے ہو تو صرف زبان سے ایک بار ہی اپنی موت مانگ لو اگر تم نے موت مانگ لی تو تم جیتے اور اگر تمہارے منہ سے یہ لفظ نہ نکلا تو ہم سچے اور تم جھوٹے تیسرا **تعلق** اب تک یہود کے صرف دعویٰ ایمان کی تردید تھی۔ اب ایک دم اُن کے چار دعوے باطل کئے جا رہے ہیں (۱) ہم توریت کے مومن ہیں (۲) ہم اللہ کے بیٹے اور اُسکے پیارے ہیں (۳) جنت ہمارے ہی لئے ہے (۴) ہم کچھ بھی کریں ہمارے باپ دادا ہمیں بخشوالیں گے چوتھا **تعلق** یہود سے کہا گیا تھا۔ کہ تم ساری آسمانی کتابوں پر ایمان لاؤ اس کے جواب میں وہ کہہ سکتے تھے۔ کہ بے شک ہم ساری کتابوں پر ہی لائے ہیں۔ انجیل اور قرآن آسمانی کتابیں ہی نہیں اور توریت قیامت تک کے لئے باقی ہے۔ اس آیت میں اس شبہ کا جواب دیا جا رہا ہے۔ کہ پھر اس کے معنی تو یہ ہوئے۔ کہ تم ہی سچے ہو۔ اور باقی سب جھوٹے تو اچھا اپنے سچ کا یہ ثبوت پیش کرو۔

**تفسیر** قُلْ یا تو یہ ہر مسلمان سے اسوقت خطاب تھا۔ کہ اے قرآن پڑھنے والے تو ان سے یہ تو کہو یا خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مگر یہ حکم اسوقت کے لئے خاص ہے۔ آج اُن سے یہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ معجزہ کا ظہور اسی وقت ہوتا۔ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ یہ لام خصوصیت کا ہے۔ اور کُم سے وہ سارے یہودی مراد ہیں یعنی اگر خاص تمہارے ہی واسطے ہو کیا چیز الدَّارُ الْآخِرَةُ آخری گھر اگرچہ جہنم اور اعراف بھی آخری گھر ہیں مگر یہاں اس سے جنت ہی مراد ہے۔ کیونکہ وہ اسی کے دعویدار تھے۔ نیز اعراف تو عارضی جگہ ہے۔ اور جہنم جیل خانہ اور دار آخرت سے ہمیشہ کا اور آرام دہ گھر مراد ہے۔ عِنْدَ اللَّهِ یہ ثابتۃً کا ظرف ہے۔ یعنی تمہارا جنت کا حقدار ہونا۔ اگر اللہ کے نزدیک ثابت ہو خَالِصَةً

دار کا حال ہے۔ یہ خلوص سے بنا ہے جس کے معنی ہیں غیر کی شرکت سے خالی ہونا) اس میں دو احتمال ہیں یا تو عذاب سے خالص یا لوگوں سے یعنی تمہارے جنت ہی ہو نہ کہ عذاب یا جنت تمہارے ہی لئے ہو مِنْ دُوْنِ النَّاسِ نہ کہ اوروں کے لئے یہاں النَّاسِ سے یہود کے علاوہ دیگر لوگ مراد ہیں۔ اور یہ یا تو خَالِصَۃً کی تفسیر ہے۔ اور یا اُس کی ایک نوعیت کا بیان اگر واقعی تمہارا یہ عقیدہ ہے۔ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ تم ایک بار ہی موت کی تمنا تو کر لو۔ اور یوں کہہ دو کہ اے اللہ ہمیں موت دیدے۔ کیونکہ اپنے خیال میں تم جنتی ہو۔ اور خدا کے پیارے اور اُن دونوں کو حاصل کرنے کا ذریعہ موت ہے۔ تمنی مُنیٰ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں خواہش باب تفعل میں آکر اس کے معنی ہوئے اظہار خواہش یعنی خواہش کا زبان سے ظاہر کرنا لہذا اس جگہ منہ سے موت مانگنا مراد ہے۔ نہ کہ فقط دلی رغبت اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم دعویٰ ایمان یا اُن چاروں دعووں میں سچے ہو جو تعلق میں بیان کئے جا چکے وہ لوگ یہ سُن کر آرزو نہ کر سکے۔ رب نے آئندہ کی خبر دیتے ہوئے فرمایا۔ کہ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا۔ جیسے قط زمانہ ماضی کے گھیرنے کے لئے ہے۔ ایسے ہی ابداً زمانہ مستقبل گھیرنے کے لئے یعنی یہ لوگ جب تک زندہ ہیں کبھی بھی موت کی تمنا نہ کریں گے۔ خیال رہے۔ کہ یہ ابد اس دنیوی زندگی کے لئے ہے ورنہ دوزخ میں تو یہ لوگ بارہا موت مانگیں گے کبھی کہیں گے۔ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا اور کبھی کہیں گے يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ اور یہ تمنا کریں بھی کیسے انہیں تو اپنے اعمال کی خبر ہے۔ کہ ہمیں پوری سزا ملیگی۔ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اپنے اُن اعمال کی وجہ سے جو پہلے کر چکے تھے۔ خیال رہے کہ چونکہ اکثر کام ہاتھ سے ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے کبھی تو ید سے ذات اور کبھی قدرت اور رحمت مراد لیتے ہیں۔ یہاں ذات مراد ہے۔ اور یَدُ اللہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ وغیرہ میں رحمت وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ۔ اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے لہذا انہیں سزا بھی خوب دیگا **خلاصہ تفسیر** یہود اپنی مقبولیت اور محبوبیت کے گیت گایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جنت ہمارے ہی لئے ہے یا ہمارے لئے جنت ہی ہے ہم اللہ کے بیٹے اور اسکے پیارے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ رب تعالیٰ نے ان خرافات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرما دیجئے۔ کہ اگر تمہیں اپنے جنتی ہونے کا یقین ہے۔ تو ذرا موت کی التجا تو کرو۔ کیونکہ دنیا تو مصیبتوں کا گھر ہے۔ اور خاص کر اِن نبی آخر الزمان کے تشریف لانے اور اسلام کی اشاعت ہونے سے تمہارا ناک میں دم آگیا ہے۔ تو چاہیئے کہ تم دار المحن سے چھوٹنے اور دار الامن میں جانے کی دعا مانگو تفسیر عزیزی نے بیہقی کی روایت نقل کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے یہودیوں کو جمع فرما کر فرمایا کہ اگر تم ان دعاوی میں سچے ہو تو ایک بار کہہ دو اَللّٰهُمَّ اَمِتْنَا قسم رب کی جو بھی کہیگا۔ وہیں گلا گھٹ کر مر جائیگا۔ یہودی گھبرا کر انکار کر گئے تب دوسری آیت آئی کہ اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم یہ اب تو کیا جیتے جی بھی دعا نہ کریں گے۔ الحمد للہ یہ غیب کی خبر سچی ہوئی۔ کہ انہوں نے کبھی تمنائے موت نہ کی تفسیر روح البیان نے حضرت نافع سے روایت کی۔ کہ ایک دن ایک یہودی ہم سے کہنے لگا۔ کہ میں تو تمنائے موت کرتا ہوں میں کیوں نہیں مرتا۔ عبد اللہ ابن عمر نے سنا تو فرمایا۔ اے جاہل یہ اُن علماء یہود کے لئے تھا جو جان بوجھ کر نبوت مصطفیٰ کا انکار کرتے تھے۔ اور جن کو اُس وقت بارگاہ نبوت میں بلا کر کہا گیا تھا۔ انہوں نے کبھی تمنائے موت نہ کی۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** کفار کو اپنے دین کی حقانیت کا یقین نہیں۔ اسی لئے اس کے بھروسے پر کوئی بات نہیں کہتے۔ بلکہ انہیں اپنے جھوٹے ہونے کا یقین ہے۔ اسی لئے وہ دنیا کو جنت اور آخرت کو قید سمجھتے ہیں۔ اب بھی ہندو وغیرہ دنیوی زندگانی کے بہت حریص ہیں۔ **دوسرا فائدہ** رب کی ملاقات اور حضور کے دیدار یا اپنے ایمان کی سلامتی کے لئے موت کی تمنا کرنا جائز ہے۔ حدیث پاک میں ہے۔ کہ سعد ابن ابی وقاص نے خوف سے اپنی موت کی دعا کی حضور نے فرمایا۔ کہ کیا تم میرے جیتے ہوئے موت مانگتے ہو۔ اس کے حاشیہ لمعات میں ہے۔ کہ حضور کی زندگی پاک میں دعائے موت کرنا منع تھا۔ کیونکہ اُس وقت زندگی دیدار مصطفیٰ کا ذریعہ تھا۔ لیکن حضور کے وفات شریف کے بعد دیدار کے لئے تمنائے موت جائز ہے۔ کیونکہ اب موت ذریعہ دیدار ہے۔ دیکھو مشکوٰۃ کتاب الجنائز باب تمنی الموت **تیسرا فائدہ** مناظرہ میں دلائل کے علاوہ دیگر علامات سے بھی مقابل کو خاموش کرنا جائز ہے **چوتھا فائدہ**

جھوٹے کا جھوٹ ظاہر کرنا ضروری ہے۔ تاکہ لوگ اس سے بچیں **پہلا اعتراض** مسلمان بھی سمجھتے ہیں۔ کہ سوا مومن کے کوئی جنت میں نہ جائیگا۔ لہٰذا وہ یہود بھی مسلمانوں سے یہی کہہ سکتے تھے۔ کہ ہم تمہیں قتل کردیں۔ تاکہ تم جنت میں جلدی پہنچ جاؤ **جواب** مسلمان یہود کی طرح اپنے جنتی ہونے کا یقین نہیں کرتے۔ کہ ہم کچھ بھی کریں۔ بہر حال جنتی ہیں۔ بلکہ رب کی رحمت کی امیدوار اور اپنے گناہوں سے خوف کرتے ہیں۔ اور زندگی کی اس لئے تمنا کرتے ہیں۔ کہ نیک اعمال کرکے اپنی آخرت کا تحفہ تیار کرلیں۔ اور گذشتہ گناہوں سے توبہ کرلیں۔ اور دوسروں کو تبلیغ ایمان کرکے اپنے ساتھ ملالیں **دوسرا اعتراض** شاید وہ یہود بھی اپنے گناہوں سے ڈر کر دعا نہ کرتے ہوں **جواب** یہ غلط ہے۔ اُن کا دعویٰ یہ تھا۔ کہ ہمیں خالص جنت ملیگی۔ یعنی بغیر عذاب اور اگر کسی کو عذاب ہوگا بھی تو صرف چالیس دن تو اُن سے فرمایا جارہا ہے۔ کہ اگر تم زندہ رہے تو بہت دنوں میں جنت میں پہنچو گے اور مر گیا تو فوراً یا کچھ تکلیف پاکر جنتی ہوجاؤ گے۔ تو تم جلدی مرتے کیوں نہیں **تیسرا اعتراض** شاید وہ موت کے خوف سے اُسکی تمنا نہ کرتے ہوں **جواب**۔ انسان بڑی راحت کیلئے تھوڑی تکلیف برداشت کرلیتا ہے جیسے کہ تندرستی کے لئے کڑوی دوائیں پی لیتا ہے۔ آپریشن کرالیتا ہے۔ گلے ہوئے اعضا کٹوا لیتا ہے۔ دیکھا تو یہ گیا ہے۔ کہ عیرت مند آدمی طعنہ کے وقت جان دے دیتا ہے۔ اسوقت تو اُن کو طعنہ دے کر شرمندہ کیا جارہا تھا انہیں چاہیئے تھا۔ کہ جان دے کر آبرو بچاتے پھر انہیں یہ بھی یقین کیسے تھا۔ کہ ہم اسوقت تمنا موت کرتے ہی جائیں گے۔ اس سے ظاہر ہوا۔ کہ وہ اپنے کو جھوٹا اور جہنمی سمجھتے تھے۔ اور حضور کو سچا۔ **چوتھا اعتراض** شاید انہوں نے دل سے تمنا کرلی ہو۔ اور ممکن ہے۔ کہ زبان سے بھی کرلی ہو جسکی ہمیں خبر نہ ملی ہو **جواب**۔ ہم تفسیر میں بحوالہ روح البیان و عزیزی وکبیر بتا چکے۔ کہ تمنا زبانی آرزو کو کہتے ہیں۔ اور اگر انہوں نے ایک بار بھی تمنا کی ہوتی تو مخالفین اسلام اُسے بہت اچھالتے **پانچواں اعتراض** قرآن وحدیث نے موت کی تمنا سے منع فرمایا قرآن تو فرماتا ہے۔ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهَا وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا۔ یعنی بے ایمان تو قیامت میں جلدی کرتے ہیں۔ اور مسلمان اُس سے ڈرتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے۔ کہ کوئی شخص موت کی آرزو نہ کرے اور یہاں اس آیت میں معاملہ اُلٹا ہورہا ہے **جواب**۔ یہ پیش کردہ آیت مشرکین کے حق میں آئی ہے۔ جو قیامت سے منکر اور اس سے بے خوف تھے مسلمان قیامت کے مقر اور اپنے اعمال سے خوف میں ہیں۔ مگر یہود قیامت کمان کہ اس کی مصیبتوں سے اپنے کو محفوظ سمجھتے تھے لہٰذا وہ آیت اس کے خلاف نہیں حدیث پاک میں یہ ہے۔ کہ کوئی بھی دنیوی مصیبت کی وجہ سے تمناء موت نہ کرے۔ بلکہ نیک اعمال کی خاطر زیادہ جینا بہتر ہے۔ بقاء حبیب کیلئے تمنا موت جائیز بلکہ صحابہ کرام سے ثابت ہے۔ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر نماز کے بعد دعا کرتے تھے۔ کہ اے اللہ مجھے اپنے محبوب کے شہر میں شہادت نصیب فرما شہداء بدر واحد تمنا موت میں بے تاب تھے۔ صحابہ کرام بے دریغ اپنی جان ومال جہاد میں خرچ کرتے تھے۔ حذیفہ ابن یمان پر نزع کی حالت میں خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔ اور چیخ کر فرمایا۔ کہ میری پیاری موت عین انتظار کی حالت میں آگئی حضرت عمار جنگ صفین میں خوشی کے نعرے مارتے تھے۔ کہ اب میں عنقریب اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے دوستوں سے ملوں گا حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک باریک کرتہ پہنے ہوئے جنگ کی صفوں میں اپنا گھوڑا کُداتے پھرتے تھے۔ آپ کے فرزند امام حسن نے عرض کیا۔ کہ باوا جان غازی کا یہ لباس نہیں زرہ پہن کر آنا چاہیئے تھا۔ تو فرمایا بیٹا مجھے پرواہ نہیں۔ کہ موت مجھ پر گرے یا میں موت پر گروں ایک بار حضرت سعد ابن ابی وقاص نے رستم ابن فرخ زاد کو خط لکھا۔ کہ میرے ساتھ وہ قوم ہے۔ جو موت کو اتنا ہی چاہتے ہیں۔ جتنا تم لوگ شراب کو (تفسیر عزیزی) ان تمام باتوں سے معلوم ہوا۔ کہ دنیوی تکلیف سے تمنائے موت کرنا منع ہے۔ اور دینی راحت حاصل کرنے کے لئے جائیز اور یہاں یہود سے دینی راحت کیلئے ہی تمنا کرائی گئی تھی **نکتہ** بعض مفسرین نے اس آیت کا ایسا نفیس مطلب بیان کیا ہے جس سے یہ اعتراض پڑتے ہی نہیں وہ یہ کہ اُن سے اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے بطور قسم تمنا موت کرائی گئی۔ جیسے کوئی قاضی مدعیٰ علیہ سے کہے کہ تو اپنے بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہدے۔ کہ میں سچا ہوں۔ اگر وہ یہ نہ

کرے. تو جھوٹا ایسے ہی کیا گیا. کہ یہود یا اگر تم سچے ہو قسم سے کہدو کہ اگر ہم جھوٹے ہوں تو مر جائیں. اس صورت میں تمام تکلفات دور ہو گئے.
**تفسیر صوفیانہ** تین شخص موت کی تمنا کرتے ہیں. موت کی مصیبت سے ناواقف. دوسرے بے صبر جو موت کو خدا کی پکڑ سے بچنے کا ذریعہ سمجھے تیسرے وہ عاشق جانباز جو اللہ و رسول کی ملاقات چاہے. مولانا فرماتے ہیں شعر

شد ہوائے مرگ طوق صادقاں — کہ جہوداں را بداں دم امتحاں!

مثنوی کے مصنف جلال الدین رومی رحمت اللہ علیہ کی جب موت کا وقت آیا. تو ملک الموت بشکل انسان میں دروازہ میں آ کھڑے ہوئے. مولانا نے کمال شوق سے فرمایا. پیشتر آ پیشتر آ جان من — پیک باب حضرت سلطان من (تفسیر روح البیان)
اے میری جان اے میرے سلطان کے دربان تو کہاں تھا جلدی آ وہ یہودی چونکہ ان تینوں جماعتوں سے خارج تھے. تمنا موت نہ کر سکے. ابو حازم فرماتے ہیں. کہ مطیع کا رب کے پاس جانا ایسا ہے. جیسے غائب عاشق کا محبوب کے پاس حاضری دینا بدکار کی موت ایسی ہے. جیسے بھاگے ہوئے مجرم کی گرفتاری کا وارنٹ مولانا فرماتے ہیں شعر

انبیاء را تنگ آمد ایں جہاں — چوں شہاں رفتند اندر لامکاں
چوں مرا سوئے اجل عشق و ہواست — نہی لا تلقوا باید یکم مرا است
زانکہ نہی از دانہ شیریں بود — تلخ را خود نہی حاجت کے شود

کافر موت کو کڑوا سمجھتا ہے. اس لئے اس کو خواہش کا حکم ہے. مومن موت کو نہایت میٹھا اور لذیذ محسوس کرتا ہے. اسکو خواہش موت منع ہے انبیاء کرام کی موت عجیب پر لطف چیز ہے. ان کی تو یہ شان ہے. شعر

یہ دونوں گھر انہیں کے ہیں جہاں جی چاہا جا بیٹھے — کبھی اس گھر میں جا بیٹھے کبھی اس گھر میں آ بیٹھے

اضطراری موت سے پہلے اختیاری موت اختیار کرو. اور موتوا قبل ان تموتوا کے عامل بن جاؤ. تاکہ موت اضطراری آسان ہو

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ

اور البتہ ضرور پاویں گے آپ انکو زیادہ حریص لوگوں سے اوپر زندگی کے. اور ان لوگوں سے جنہوں نے شرک کیا تمنا کرتا ہے

اور بے شک تم ضرور انہیں پاؤ گے کہ سب لوگوں سے زیادہ جینے کی ہوس رکھتے ہیں. اور مشرکوں سے

اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ

ایک ان کا کاش کہ عمر دیا جاوے وہ ہزار سال اور نہیں ہے وہ دور کرنیوالا اس کو عذاب سے

ایک کو تمنا ہے. کہ کہیں ہزار برس جئے اور وہ اسے عذاب سے دور نہ کرے گا

اَنْ يُّعَمَّرَ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

یہ کہ عمر دیا جاوے اور اللہ دیکھنے والا ہے اس کو جو وہ کرتے ہیں.

اتنی عمر دیا جانا اور اللہ ان کے کوتک دیکھ رہا ہے.

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح سے ہے. **پہلا تعلق** اس سے پہلے یہود کے موت کے گھبرانے کا ذکر کیا گیا. اب ان کا دنیوی زندگی کی محبت کا ذکر ہو رہا ہے. **دوسرا تعلق** گذشتہ آیت کا مضمون بھی اس ہی بات کی علامت تھا کہ وہ اپنے

گمراہ سمجھتے ہیں اور اس جملے کا مضمون بھی یہی بتا رہا ہے۔ کہ وہ دنیوی زندگی کو غنیمت جانتے ہیں تاکہ انہیں کچھ آرام کی سانسیں میسر ہو جائیں۔ آخرت کا تو خیر جاننا تو ہے ہی **تیسرا تعلق** پہلی آیت کے مضمون سے شبہ پیدا ہوتا تھا۔ کہ شاید یہودی موت کی تمنا کرتے ہوں۔ نہ زندگی کی بلکہ راہ حق پر شہادت کے آرزو مند ہوں۔ جو کہ انسان کی بہترین صفت ہے۔ یا اعمال کے لئے زندگی کے خواہش مند ہوں۔ اس آیت اس شبہ کو دور کیا جا رہا ہے۔

**تفسیر وَلَتَجِدَنَّهُمْ۔** یہ بھی حضور علیہ السلام سے خطاب ہے۔ اور یا قیامت تک کے قرآن پڑھنے والے مسلمان سے۔ تجد۔ وجدان سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ پانا یہاں عقلی اور تجربہ کا پانا مراد ہے۔ جیسے میں نے زید کو عالم پایا۔ ھُمْ سے مراد عام یہودی ہیں۔ یعنی اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم یا اے قرآن کے پڑھنے والے تم ان عام یہودیوں کو پاؤ گے **اَحْرَصَ النَّاسِ** لوگوں سے زیادہ حریص یہاں ناس سے یہود کے سوا باقی سب لوگ مراد ہیں۔ کہ افضلیت اپنے پر لازم نہ آجائے۔ **عَلٰی حَیٰوۃٍ** یہاں حیوٰۃ سے خاص کسی قسم کی زندگی مراد ہے لمبی اور آرام وہ علیٰ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کو خود دراز اور آرام دہ زندگی کی ہی حرص ہے۔ اعمال کے لئے زندگی نہیں مانگتے **وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا** ظاہر یہ ہے۔ کہ واؤ عاطفہ ہے۔ اور اس کا ناس پر عطف ہے۔ یعنی یہودیوں کو عام لوگوں اور مشرکین سے بھی زیادہ حریص پاؤ گے۔ اگرچہ مشرکین ناس میں داخل تھے۔ مگر چونکہ یہ لوگ حرص زندگی میں مشہور ہیں۔ اس لئے ان کا ذکر خاص کیا گیا۔ اسی صورت میں **یَوَدُّ اَحَدُھُمْ** علیحدہ جملہ ہے جس میں اسکا بیان ہے۔ بعض لوگوں نے فرمایا ہے۔ کہ یہ واؤ استینافیہ ہے۔ اور یہ مبتدا ہے۔ یود اس کی خبر یعنی مشرکین میں سے بعض تمنا کرتے ہیں۔ بعض لوگوں نے فرمایا کہ اس کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ آپ یہود کو اور مشرکین کی ایک جماعت کو زندگی کا زیادہ حریص پائیں گے۔ اس صورت میں مِنَ الَّذِیْنَ ھُمْ پر معطوف ہو کر تجد کا مفعول ہوگا۔ بہرحال اس آیت کے تین معنی ہیں۔ اور ہر معنی میں بالطف مشرکین سے عام مشرکین مراد ہیں۔ یا خاص مجوسی سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں۔ کہ مجوسی آپس میں ایک دوسرے کو سلام میں کہتے تھے۔ زہی ہزار سال۔ یعنی تم ہزار سال جیئے بعض کہتے تھے عش الف نیروز۔ بعض کہتے تھے عش الف مہرجان یعنی نو ہزار نیروز یا ہزار مہرجان جیئے گویا ان کے سلام وجواب سے ہی حرص دنیا ظاہر ہوتی تھی۔ چونکہ مجوس کا عقیدہ ہے۔ کہ خدا دو ہیں۔ ایک یزدان دوسرا اہرمن۔ یزدان بھلائیوں کا خالق ہے۔ اور اہرمن برائیوں کا اس لئے انکو مشرکین کہا گیا بعض نے کہا۔ کہ اس سے مشرکین عرب مراد ہیں۔ **یَوَدُّ اَحَدُھُمْ۔** یود ودّ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں دلی خواہش احد سے ہر ایک مراد ہے نہ کہ کوئی خاص ایک ھم کا مرجع یا یہود ہیں یا مشرکین یعنی اُن میں سے ہر ایک خواہش رکھتا ہے۔ کہ **لَوْ یُعَمَّرُ** لو شرطیہ نہیں۔ بلکہ تمنا کا ہے یعمر کے واحد لانے میں یہ بتایا گیا۔ کہ ان میں ہر شخص صرف اپنی ہی دراز زندگی چاہتا ہے۔ کہ دوسرے مریں یا جئیں مجھے عمر مل جائے یعنی کاش کہ عمر دیا جاوے وہ **اَلْفَ سَنَۃٍ** ہزار سال یا تو یہ مجوسیوں کے قول زہی ہزار سال کی نقل ہے اور یا اس سے لمبی مدت مراد ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ میں تو ہزار سال تک تیری بات مانوں گا۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

رب فرمایا ہے۔ **وَمَا ھُوَ** ھو کا مرجع احد ہے۔ اور ما کا اسم ہے یعنی نہیں ہے۔ وہ شخص **بِمُزَحْزِحِہٖ**۔ مزحزح۔ زحزحۃ کا اسم فاعل ہے جس کے معنی ہیں۔ دور رکھنا۔ اسی لئے کوئیں کی چکنٹ اور آگ کے جھیرے کو زحزاح کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی پانی اور آگ سے دور ہوتا ہے ضمیر اس کا مفعول ہے۔ اور اَنْ یُّعَمَّرَ اس کا فاعل یعنی کو بھی ایسا نہیں۔ کہ جس کو اس کی دراز عمر عذاب سے دور کرنے والی ہو یعنی لمبی عمر کے بعد بھی عذاب ہی ہوگا۔ اس کی خواہش بے کار چاہیئے۔ کہ ایمان و اعمال کی کوشش کرو۔ **وَاللّٰہُ بَصِیْرٌ بِمَا یَعْمَلُوْنَ۔** عرب میں بصیر حقیقت حال جاننے والے کو کہتے ہیں یعنی اللہ اُن کے اعمال کی حقیقت سے خبردار ہے۔ یہ جتنی زیادہ عمر پائیں گے اتنے ہی زیادہ گناہ کمائیں گے **خلاصہ تفسیر** اے مسلمانو یہودیوں کا موت سے گھبرانا کسی نیک ارادہ سے نہیں۔ بلکہ تم تجربہ اور امتحان کر کے دیکھ لو۔ تو اُن کو زندگی کا بڑا ہی حریص پاؤ گے۔ کہ دنیا میں زندگی کے زیادہ خواہش مند مشرکین ہیں۔ کیونکہ وہ قیامت اور سزا جزا کو مانتے

نہیں وہ سمجھتے ہیں۔ کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگانی نہیں۔ بلکہ محض فنا ہے۔ اُن کے لئے یہ دنیا ہی بہشت ہے۔ اگر وہ اس زندگی پر حرص کریں۔ تو بجا ہے۔ لیکن یہ یہودی جو اپنے کو اہل کتاب کہیں سزا جزا کا اقرار کریں۔ جنت کو اپنی جاگیر مانیں۔ اپنے کو خدا کا بیٹا جانیں۔ ان مشرکین سے بھی زیادہ حریص ہیں جس سے صاف معلوم ہو رہا ہے۔ کہ انہیں آئندہ دوزخ نظر آ رہا ہے۔ اور ان کو اپنے کرتوت کی سزا کا پورا یقین ہے۔ ان کے حریص ہونے کی چند دلیلیں ہیں۔ ہر وقت زیادتی عمر کی فکر میں رہتے ہیں شفا حاصل کرنے کیلئے حرام حلال چیزیں استعمال کر لیتے ہیں۔ بیماری میں ہر طبیب پر منتر پڑھنے والے ہر جادوگر کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ دنیوی زندگی کے لئے اپنا دین و ایمان برباد کر دیتے ہیں۔ دنیوی عیش کے لئے حرام و حلال مال لے لیتے ہیں۔ بڈھے ہو کر دانت گر جانے بال سفید ہو جانے پر بھی آئندہ کی فکر نہیں کرتے۔ بلکہ دنیا میں پورے مشغول رہتے ہیں۔ اور زیادتی عمر کی تجویزیں کرتے رہتے ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک اپنی زندگی کا خواہشمند ہے اپنے پر دوسروں کو قربان کرنے کیلئے تیار۔ ہزار سال تک کی عمر چاہتے ہیں۔ حالانکہ ساٹھ ستر برس میں ہی انسان کے اعضا بیکار ہو جاتے ہیں۔ اور اسکی زندگی وبال جان ہوتی ہے۔ مگر ان کی حرص کی یہ حالت ہے۔ کہ خواہ کتنی ہی مصیبت میں رہیں۔ مگر جیتے رہیں۔ ان بیوقوفوں کو یہ خبر نہیں۔ کہ لمبی عمر انہیں عذاب سے بچا نہیں سکتی۔ اور جب موت یقینی ہے۔ تو کیا دس برس اور کیا ہزار سال اللہ ان کے اعمال سے خبردار ہے۔ اور جانتا ہے۔ کہ یہ جی کر گناہ ہی کرینگے۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** فساد پھیلانے یا عذاب سے بچے رہنے کیلئے لمبی عمر مانگنا علامت کفار ہے۔ **دوسرا فائدہ** زندگی کے لالچ میں دین کا لحاظ نہ رکھنا بڑی بدنصیبی ہے۔ **تیسرا فائدہ** جو چیز یقینی آنے والی ہے۔ وہ قریب ہے۔ **چوتھا فائدہ** مجرم کا بہت بھاگا پھرنا سخت سزا کا باعث ہے۔ ایسے ہی کافر کی دراز عمر زیادہ گرفتاری کا سبب **پانچواں فائدہ**۔ اسلامی سلام تمام دینوں کے سلام سے افضل ہے۔ ہندو کہتے ہیں رام رام جواب دیتے ہیں سیتارام پنڈت کہتے ہیں۔ پائیں لاگن جواب دیتے ہیں۔ سکھی رہو۔ مجوسی کہتے ہیں زی ہزار سال۔ عیسائی کہتے ہیں گڈ مارننگ مسلمانوں کی جاہل عورتیں کہتی ہیں سلام جواب ملتا ہے جیتے رہو۔ بڑی عمر ہو۔ دنیا میں عیش سے رہو یہ سب سلام و جواب بیہودہ ہیں۔ کیونکہ ان میں سے بعض میں تو شرک کی بو ہے۔ اور بعض میں دنیا کی ہوس کا اظہار سب سے بہتر ہے السلام علیکم جس کا مطلب ہے تم سلامت رہو یعنی دینی دنیوی ہر مصیبت سے سلامتی کا ذکر آ گیا۔ اسی لئے رب تعالیٰ نے اُن کے سلام کی برائی فرمائی۔ اور انشاء اللہ سلام کا مسئلہ سلام کی ہی آیتوں میں آئے گا۔ **نصیحت** ہم کو چاہیئے۔ کہ اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں حق یہ ہے کہ ہم لوگوں میں بھی اس قسم کی بہت سی بیماریاں پیدا ہو چکی ہیں۔ ہم میں سے بعض تو محبت دنیا میں یہود سے بھی چار ہاتھ آگے ہیں۔ اُن کا یہ حال ہے۔ کہ بچپن کی زندگی کالج میں گذاری جوانی دنیا کمانے میں ختم کی بڑھاپے میں جب پنشن ہو گئی۔ تو قدرت نے اِن کو اللہ اللہ کرنے کا بہت اچھا موقعہ دیا تھا۔ مگر اب انہیں ممبری اور مجسٹریٹی کی دھن لگی۔ ممبری کے زمانہ میں لوگ تو صبح شام اللہ اللہ کر رہے ہیں۔ مگر یہ پنشن یافتہ قریب المرگ بزرگ رائے دہندوں کے دروازوں کے طواف میں مشغول نہ نماز کی فکر نہ روزے کا ذکر نہ زکوٰۃ کا دھیان نہ حج کا خیال۔ سوچو جب یہ تینوں زمانے اس طرح گنوا دیئے تو اللہ اللہ کرنے کا وقت کب آئیگا یہودیوں کی اس حالت سے عبرت پکڑو۔ **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ درازی عمر کی خواہش جرم ہے حالانکہ ہر مسلمان لمبی عمر چاہتا ہے حدیث شریف میں بھی ہے۔ کہ مبارک ہے وہ شخص جسکی عمر لمبی اور اعمال اچھے ہوں **جواب** فساد کرنے یا عیش آرام کیلئے یا زندگی کو اصل مقصود سمجھ کر اُس کی تمنا کرنا بے شک بُرا ہے لیکن نیک اعمال کے لئے زندگی چاہنا بہتر ہے سرکاری ملازم کی جتنی زیادہ سروس ہوگی اتنی زیادہ پنشن مسلمان کی زندگی نوکری کی مدت ہے۔ **دوسرا اعتراض** اس تفسیر سے معلوم ہوا۔ کہ زندگی بڑھانے کے اسباب اختیار کرنا بُرا ہے حالانکہ حدیث شریف میں ہے۔ کہ نیک اعمال سے زندگی بڑھتی ہے۔ تو چاہیئے کہ جو کوئی اس نیت سے نیکیاں کرے وہ گنہگار ہو **جواب** عمر بڑھانے کے جائز اسباب ضرور اختیار کرے ناجائز اسباب سے بچے

**تیسرا اعتراض**۔ اسلام میں بھی شفا حاصل کرنے اور جان رکھنے کیلئے حرام چیزوں کا استعمال جائز ہے۔ تو اگر یہودی بھی اپنی زندگی کے لئے حرام اسباب پر عمل کریں۔ تو کیوں گنہگار ہوں **جواب**۔ اسلامی حکم یہ ہے۔ کہ جو بیماری وغیرہ سخت مصیبت میں پھنس جائے۔ اس کیلئے حرام دوائیں وغیرہ حلال ہیں شریعت نے مصیبت سے بچنے کیلئے اس کے حق میں حرام کو حلال ہی کر دیا۔ یہ بالکل جائز ہے لیکن نفسانی خواہشوں کیلئے حرام چیزوں کا استعمال کرنا عقلاً بھی برا ایک شخص قوت باہ زیادہ کرنے کیلئے مینڈک کا تیل یا سانپ کا گوشت یا شراب استعمال کرتا ہے۔ وہ مجرم ہے۔ دوسرا شخص پیاس سے مر رہا ہے۔ جان بچانے کیلئے شراب کا گھونٹ پیتا ہے۔ وہ مجرم نہیں۔ کیونکہ پہلے شخص کا مقصد شہوت ہے اور اس کا مقصد مصیبت سے بچنا۔ **تفسیر صوفیانہ** تمام گناہوں کی اصل دو چیزیں ہیں محبت عمر محبت مال وجاہ اگلی آسمانی کتابوں کی تحریف جھوٹے نبیوں کی پیداوار اب بعض علماء اور مشائخ کی گمراہی روزانہ نئے مذہبوں کا نکلنا انہیں دو سببوں سے ہے۔ اس بیماری کے تین علاج ہیں۔ ایک تو علماء ربانی کی وعظ و نصیحت کی مجلسوں میں حاضری صالحین کے واقعات کا مطالعہ کرنا جس سے کہ دل نرم پڑ جائے۔ دوسرے اکثر موت کو یاد کرنا اور یہ خیال رکھنا۔ کہ دنیا کی ساری چیزیں فانی ہیں تیسرے لوگوں کی جان نکلتے ہوئے دیکھنا میت کے ساتھ قبرستان جانا زیارت قبور کرنا حضرت کعب احبار سے کسی نے پوچھا۔ کہ بتائیے موت کیا چیز ہے فرمایا یوں سمجھو۔ کہ درخت خار دار کسی انسان کے پیٹ میں ہو جسکا ہر کانٹا اس کی رگ رگ میں چبھ چکا ہو پھر اسے کوئی شخص نہایت طاقت سے کھینچے جس سے کہ وہ درخت رگوں کو چیرتا ہوا۔ گوشت کو نوچتا ہوا باہر نکلے یہ وہ چیزیں ہیں۔ کہ جن کے خیال سے انسان دنیا سے بے رغبت ہو جاتا ہے (تفسیر روح البیان)

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا

فرمادو وہ جو کہ ہو دشمن واسطے جبریل کے پس تحقیق اس نے اتارا اسکو اوپر دل تمہارے کے ساتھ حکم اللہ کے سچا کرنیوالا واسطے اسکے

تم فرمادو جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو اس (جبریل) نے تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے یہ قرآن اتارا۔ اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتا

بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَ

درمیان دو ہاتھوں اسکے اور ہدایت اور خوشخبری واسطے ایمان والوں کے وہ جو کہ ہو دشمن واسطے اللہ کے اور فرشتوں اسکے اور

اور ہدایت و بشارت مسلمانوں کو جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور

رُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ ﴿۹۸﴾

رسولوں اسکے اور جبریل کے اور میکال کے پس تحقیق اللہ دشمن ہے واسطے کافروں کے۔

اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے کافروں کا

**تعلق**۔ اس آیت کا گزری آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** یہ بھی ایمان یہود سے مایوسی کی ایک وجہ ہے۔ کہ وہ قرآن تو کیا قرآن لانے والے جبریل کے بھی دشمن ہیں۔ تو تمہارے دوست کیونکر بن سکتے ہیں **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا۔ کہ وہ زندگانی اور عیش و آرام کے بڑے ہی خواہش مند ہیں۔ اب فرمایا گیا کہ ان کی خواہشمندی اس حد تک ہے۔ کہ جو ان کے آرام کیخلاف احکام لائے۔ جبریل اس کے بھی دشمن ہیں **تیسرا تعلق** پچھلی آیت میں یہود کی ایک حماقت کا ذکر تھا۔ کہ وہ عذاب سے بچنے کے لئے دراز عمر چاہتے ہیں۔ حالانکہ درازی عمر عذاب سے بچا نہیں سکتی۔ بلکہ ان کیلئے یہ چیز اور زیادہ باعث عذاب ہے۔ کیونکہ وہ زیادہ عمر میں زیادہ گناہ کریں گے اب ان کی دوسری حماقت کا ذکر ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ عذاب سے بچنے کے لئے عذاب لانیوالے فرشتے حضرت جبریل کے دشمن ہیں

ان بے وقوفوں کو یہ خبر نہیں۔ کہ اس دشمنی سے عذاب گھٹے گا نہیں، اور زیادہ بڑھیگا کیونکہ اللہ والوں کی مخالفت عذاب کا باعث ہے
چوتھا تعلق پچھلی آیتوں میں یہود سے کہا گیا تھا کہ توریت کے علاوہ اور باقی آسمانی کتابوں پر بھی ایمان لاؤ۔ وہ جواب دے سکتے تھے کہ ہم توریت
اس لئے مانتے ہیں۔ کہ وہ بلا واسطہ رب کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو ملی اور یہ قرآن جبریل کے واسطہ سے نازل ہوتا ہے اور یہ جبریل ہمارے
سخت دشمن ہیں، ہم نہیں چاہتے۔ کہ دشمن کا احسان اٹھائیں۔ کہ اس کے لائے ہوئے قرآن کو مانیں **شانِ نزول** تفسیر کبیر و عزیزی روح
البیان وغیرہ نے طبرانی اور بیہقی مسند امام احمد وغیرہ سے روایت کی کہ جب حضور علیہ السلام ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے۔ تو فدک
کے یہود کی ایک جماعت اپنے سردار عبداللہ ابن صوریا کو لیکر امتحان کی غرض سے آپکی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے ابن صوریا بولا کہ ہماری
کتابوں میں نبی آخر الزمان کی چند علامتیں لکھی ہیں، ہم چاہتے ہیں۔ کہ وہ علامات دیکھیں۔ فرمایا تحقیق کر لو۔ وہ بولا کہ بتائیے آپکے سونے کا کیا حال ہے
فرمایا ہماری آنکھیں سوتی ہیں۔ دل بیدار رہتا ہے۔ بولا آپ نے سچ کہا۔ آخری نبی کی یہی علامت ہے۔ پھر بولا۔ کہ اچھا چند باتیں دریافت کرتا
ہوں جن کو نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا فرمایا۔ پوچھو۔ پوچھا کیا وجہ ہے۔ کہ بچہ کبھی ماں کے ہم شکل ہوتا ہے اور کبھی باپ کی۔ فرمایا۔ کہ بچہ ماں اور
باپ دونوں کی منی سے بنتا ہے۔ تو ان میں سے جس کی منی اوپر رہے۔ یا جسکی منی رحم میں پہلے داخل ہو۔ یا جس کی منی زیادہ اور غالب ہو بچہ
اس کی شکل پر پیدا ہوتا ہے۔ بولا بالکل ٹھیک اچھا بتائیے۔ کہ بچے کا کونسا عضو ماں کی منی سے بنتا ہے اور کونسا عضو باپ کی منی سے۔ فرمایا
ہڈی اور پٹھے باپ کی منی سے اور گوشت خون بال اور ناخن ماں کی منی سے بولا بالکل سچ ہے۔ اچھا بتائیے۔ کہ جنتیوں کو جنت میں پہلے
کونسی غذا دی جائیگی فرمایا مچھلی اور بیل کا گوشت بعض روایت میں ہے۔ کہ اور زمین کی روٹی بولا ٹھیک ہے۔ بتائیے۔ کہ یعقوب علیہ السلام
نے اپنے پر کونسی غذا حرام کی تھی۔ اور کیوں کی تھی۔ فرمایا۔ ان کو عرق النسا کی بیماری تھی۔ آپ نے نذر مانی کہ خداوندا اگر مجھے اس بیماری سے نجات
ملے تو میں اپنی مرغوب غذا یعنی اونٹ کا گوشت اور دودھ اپنے پر حرام کروں گا۔ بولا آپ کی تمام باتیں بالکل سچی ہیں، بس ایک بات اور بتا
دیجئے۔ تو میں اپنی جماعت کے ساتھ آپ پر ایمان لے آؤں گا۔ آپ پر وحی کون لاتا ہے۔ اور آپکا رفیق اور غمگسار کون فرشتہ ہے۔ فرمایا حضرت
جبریل یہ ہی سارے پیغمبروں پر وحی لاتے تھے۔ اور یہی اُن کے بھی رفیق تھے۔ بولا بس ہم تو ایمان نہ لائیں گے۔ فرمایا کیوں بولا کہ جبریل تو یہود کا
پرانا دشمن ہے۔ اگر میکائیل قرآن لاتے ہوتے تو ہم ایمان لے آتے فرمایا اس نے تم سے کیا دشمنی کی، بولا ایک دشمنی بیسیوں رسالت ہمارے
خاندان میں تھی۔ اب انہیں نے یہ عہدہ بنی اسمٰعیل کو دے دیا۔ ہمارے بزرگوں پر قسم قسم کے عذاب لانیوالے یہ ہی حضرت ہیں۔ ہمارے پیغمبروں نے
خبر دی تھی۔ کہ ایک لڑکا بخت نصر عراق میں فلاں تاریخ پیدا ہوگا۔ اور فلاں جگہ رہیگا۔ وہ بیت المقدس کو ویران اور بنی اسرائیل کو تباہ اور غارت
کرے گا۔ ہمارے بزرگوں نے چند قاتل وہاں بھیجے تاکہ اسے کسی ترکیب سے قتل کر دیں انہوں نے اس بچہ پر قابو بھی پا لیا۔ مگر انہی جبریل نے
آکر اُسے بچایا جس پر اسی بخت نصر نے ہماری قوم کو ہلاک کر ڈالا بتائیے ان سے بڑھ کر ہمارا دشمن کون ہے۔ اس کے جواب میں یہ آیت
کریمہ اتری۔ تفسیر کبیر نے فرمایا۔ کہ ایک روایت یہ بھی ہے۔ کہ عمر رضی اللہ عنہ کی زمین مدینہ سے باہر تھی۔ آپ اکثر اُس کی دیکھ بھال کے لئے
جاتے تھے۔ وہاں سے قریب ہی یہودیوں کا ایک مدرسہ تھا۔ آپ جب بھی اپنی زمین پر جاتے تو اُس مدرسہ میں ضرور تشریف لیجاتے
اور وہاں یہودیوں کے وعظ نصیحت سنتے۔ اتفاقاً ایک دن اسی مدرسہ میں اسوقت پہنچے جبکہ وہاں سارے علماء یہود جمع تھے۔ سب نے
کہا مرحبا ہم آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اور غالباً آپ بھی ہم سے محبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ آپ کے سوا اور کوئی صحابی ہمارے مدرسہ
میں نہیں آتا فرمایا۔ کہ اے یہودیو میں اس لئے نہیں آتا ہوں۔ کہ مجھے تم سے کوئی محبت ہے۔ یا اپنے دین میں کوئی شک یا تمہارے دین
کی طرف کچھ میلان ہے۔ میں تو صرف اس لئے آتا ہوں۔ کہ تمہاری کتابوں سے اپنے قرآن کی حقانیت اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے
فضائل معلوم کر کے اپنا ایمان اور قوی کر لوں۔ الحمد للہ اتنے روز کی آمد و رفت میں اپنے دین پر میرا یقین اور بڑھ گیا اور تمہاری بدنصیبی پر

افسوس کرتا ہوں۔ کہ تم توریت میں اس نبی کے ایسے فضائل دیکھ کر بھی ان پر ایمان نہیں لاتے تب اُن یہود نے یہ تقریر کی۔ کہ جبریل ہمارے دشمن ہیں۔ کہ ہمارے راز تمہارے نبی تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور ہم پر ساری مصیبتیں انہوں کے ہاتھوں آئیں میکائیل ہمارے دوست ہیں کیونکہ وہ بارش اور رحمت لاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ کہ جبریل اور میکائیل کا بارگاہ الہی میں کیا درجہ ہے۔ وہ بولے کہ دونوں بہت ہی مقرب بارگاہ ہیں۔ دونوں پر تجلی الہی ہوتی ہے۔ جبریل داہنی طرف اور میکائیل بائیں طرف رہتے ہیں حضرت عمر نے فرمایا۔ کہ تم گدھوں سے زیادہ بے عقل کون ہوگا۔ جب وہ دونوں مقبول درگاہ ہیں۔ پھر جو ایک کا دشمن وہ دونوں کا دشمن اور جوان کا دشمن وہ رب کا دشمن یہ کہہ کر آپ حضور کی خدمت میں روانہ ہوئے۔ ابھی راستہ ہی میں تھے۔ کہ حضور پر اسی مضمون کی یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ جب حاضر بارگاہ ہوئے تو حضور نے فرمایا کہ اے عمر رب نے تمہارے کلام کی موافقت فرمائی۔ ہو سکتا ہے۔ کہ دونوں واقع متصل ہوئے ہوں۔ اور یہ دونوں ہی اس آیت کے شان نزول ہوں۔ **تفسیر قُلْ مَنْ كَانَ**۔ یہ نہایت پر لطف کلام ہے۔ کہنا تو یہ تھا۔ کہ اے یہودیو تم خدا کے دشمن ہو۔ مگر اس طرح کہا۔ کہ جو دشمن جبریل کا ہے۔ وہ ایسا کیونکہ در پردہ بات صاف بات سے بہتر ہے۔ جیسے ہمیں کوئی گالی دے تو ہم جواب میں کہیں۔ کہ جو مجھے گالی دیگا۔ میں اسے ماروں گا **عَدُوًّا** یہ لفظ عدوٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں حد سے بڑھ جانا۔ بروزن فعول اس میں دو واؤ جمع ہوئے ان میں ادغام ہو گیا۔ چونکہ دشمن بھی حد سے بڑھ کر مخالفت کرتا ہے۔ اس لئے اُسے عدو کہتے ہیں۔ **لِّجِبْرِيلَ**۔ جبریل لفظ عبرانی ہے۔ یہ جبر اور ئیل سے بنا ہے۔ جبر کے معنی بندہ اور ئیل اللہ کا نام جسکے معنی ہوئے اللہ کا بندہ بعض نے فرمایا۔ کہ ان کا نام عبد اللہ ہے۔ اور جبریل لقب ہے۔ یہ لفظ سات طرح پڑھا جاتا ہے۔ جَبْرَئِلُ جِبْرِيلُ جَبرِيل۔ جبرائیل جبرائیل اور جبرائیل جبرین۔ تفسیر عزیزی نے فرمایا۔ کہ جبریل اور میکائیل کا نام تو عبد اللہ ہے۔ اور اسرافیل کا نام عبد الرحمان **فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ**۔ بعض مفسرین نے فرمایا۔ کہ اس شرط کی جزا پوشیدہ ہے۔ اور فاءؔ سے جزا کی علت ہے۔ اور یہ ف تعلیلیہ ہے۔ آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ جو جبریل سے دشمنی کرے وہ بڑا ہی بیوقوف ہے۔ کیونکہ جبریل تو خدا کے حکم سے قرآن لاتے ہیں۔ نہ کہ اپنی رائے سے بعض نے فرمایا۔ کہ فاءؔ ہی جزا ہے۔ اور کبھی جزا شرط کی علت ہوتی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ اگر آج اس نے مجھے مارا تو تو نے بھی کل اسے مارا تھا۔ اب آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ جو جبرائیل سے دشمنی کرتا ہے۔ وہ اس لئے کرتا ہے۔ کہ انہوں نے آپ پر قرآن بحکم الہی اتارا ہے۔ گویا قرآن اُتارنا دشمنی کی وجہ ہے **عَلٰى قَلْبِكَ** اگرچہ نزول قرآن آپ کی ذات پر ہوتا تھا۔ مگر چونکہ مضمون قرآن قلب سمجھتا ہے۔ اس لئے اُس کا ذکر کیا گیا۔ اس کی زیادہ تحقیق انشاء اللہ اعتراض و جواب میں آئے گی۔ **بِاِذْنِ اللّٰهِ** یہ نزّل کے متعلق ہے۔ یعنی جبریل خود نہ لائے بلکہ اللہ کے حکم سے لائے۔ ان سے عداوت دراصل رب سے عداوت ہے۔ ان بیوقوفوں کو یہ خبر نہیں۔ کہ قرآن تو اُن کے لئے بھی باعث رحمت ہے۔ انہیں چاہیئے تھا۔ کہ اس سے خوش ہوتے۔ کیونکہ اس میں تین صفتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ **مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ** ساری اگلی کتابوں کو سچا فرماتا ہے۔ اگر یہ نہ آتا۔ تو وہ سب غلط ہو جاتیں کیوں کہ اُن سب میں اس کی آمد کی خبر تھی۔ دوسرے یہ کہ **وَهُدًى** بمقابلہ اگلی کتب کے یہ زیادہ کامل ہدایت دینے والا ہے۔ کیونکہ اس کے احکام قیامت تک باقی ہیں۔ تیسرے یہ کہ **بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ** مسلمانوں کو خوشخبری دینے والا۔ اگر یہ بھی ایمان لے آئیں تو انہیں بھی بشارت دے ان کو چاہیئے کہ جبریل امین کا احسان مانیں کہ وہ اُن کے لئے ایسی کتاب لے آئے۔ تفسیر خزائن عرفان نے اس جگہ فرمایا کہ اس میں اشارتاً یہ بھی فرمایا گیا۔ کہ وہ زمانہ گیا۔ جب جبریل عذاب لاتے تھے۔ اب تو بشارتیں لا رہے ہیں۔ تم پھر بھی اُن کی عداوت سے باز نہیں آتے یعنی پہلے حضرت جبریل کے دو کام تھے مسلمانوں کیلئے خوشخبریاں لانا اور کفار کے لئے عذاب مگر اب سلطنت مصطفےٰ کا دور دورہ ہے۔ اب اُن کا کام صرف بشارت لانا ہی ہے۔ عذاب لانا بند ہو گیا۔ یہاں تک اُن کی حماقتوں کا ذکر ہوا۔ اب اس عداوت کا نتیجہ بیان ہو رہا ہے۔ کہ فرمایا جا رہا ہے **مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ** جو اللہ کا دشمن ہو یا تو اس طرح کہ اُس کی

اطاعت نہ کرے یا یوں کہ اُس کی رضا سے راضی نہ رہے۔ یا اس طرح کہ اُس کے کسی فرشتہ کا مخالف ہو۔ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ یا اُس کے سارے فرشتوں اور سارے پیغمبروں کا دشمن ہو معلوم ہوا کہ ایک جبریل کی مخالفت ان سب کی دشمنی ہے۔ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ۔ اور جبریل میکائیل کا دشمن ہو۔ اگرچہ یہ دونوں بھی ملائکہ میں آ گئے تھے مگر چونکہ یہ دونوں سب فرشتوں میں افضل ہیں۔ یا انہیں کا اس وقت تذکرہ تھا یا دشمنی یا دوستی انہیں سے ہو بھی سکتی ہے۔ کیونکہ اسرافیل کا تعلق اسوقت دنیا سے ہے ہی نہیں اور عزرائیل سے کسی کو دشمنی نہیں۔ بلکہ اُن کا ڈر اور خوف ہے۔ اور وہ بھی وحی کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ جان نکالنے کی وجہ سے اس لیئے اِن دونوں کا علیحدہ ذکر کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جبریل کی دشمنی کے ساتھ میکائیل سے دوستی کبھی نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ اِن دونوں کی ذمہ داریاں مشترک ہیں۔ خیال رہے۔ کہ میکائیل کی بھی چند قرأتیں ہیں۔ میکال۔ میکائل۔ میکائیل۔ میکئیل۔ میکئیل۔ ان سب کے معنی ہیں۔ عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ۔ میک کا معنی بندہ اور ئیل اللہ۔ ان عداوتوں کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ۔ کہ اللہ کافروں کا دشمن ہے۔ یہ لوگ تو عداوت کر کے رب کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مگر خود یہ دشمنوں کے گروہ میں آ کر اپنے دین و دنیا تباہ کریں گے۔ **خلاصہ تفسیر** اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم ان بیوقوف یہودیوں کا ایک نامعقول عذر یہ بھی ہے کہ ہم قرآن کیسے مانیں اُس کو تو جبریل لیکر آتے ہیں۔ درحقیقت یہ عذر نہیں۔ بلکہ نہ ماننے کا ایک بہانہ ہے۔ مگر ان کا منہ بند کرنے کیلئے آپ ان سے کہدو۔ کہ جو جبریل کا دشمن ہے۔ وہ درحقیقت رب کا دشمن۔ کیونکہ جبریل اپنی طرف سے نہیں۔ بلکہ رب کے حکم سے آپ پر قرآن لاتے ہیں۔ ان سے ناراضی رب کے حکم سے ناراضی ہے۔ ان کو چاہیئے تھا۔ کہ اب جبریل کا احسان مانتے۔ کیونکہ وہ ایسی کتاب لائے ہیں۔ کہ جو اگلی کتابوں کو سچا کرتی اور سب کو ہر طرح کی ہدایت دیتی ہے۔ اور مسلمانوں کو خوشخبریاں سناتی ہے۔ اُن کی مثال تو اُس اندھے کی سی ہے۔ کہ جو کوئیں میں گر رہا تھا کسی آنکھ والے نے اس پر ترس کھا کر اسے وہاں سے ہٹا دیا۔ وہ اندھا بجائے شکر گزار ہونے کے اُلٹی گالیاں دیکر تو نے میرا ہاتھ کیوں چھوڑا اور ضد میں آ کر کوئیں میں چھلانگ لگا دے اس نے اپنا ہی نقصان کیا بچانے والے کا کچھ نہ بگاڑا اعلان عام فرما دو۔ کہ جو کوئی اللہ اور اُس کے فرشتوں اور اُسکے پیغمبروں کا جبریل ومیکائیل کا دشمن ہوگا۔ تو وہ کافر ہے۔ اور اللہ کافروں کا دشمن ہے۔ انہوں نے بہت سے کفر کر ڈالے خدا کے فعل پر اعتراض کیا اس کے خاص بندوں کو دشمن جانا جبریل جو کہ فرشتوں کے سردار اور حاضر باش دربار ہیں۔ ان سے مقابلہ کی ٹھانی تو اپنے مصیبت میں گرفتار ہوئے۔ کہ خدا کے دشمنوں کی فہرست میں ان کا نام آ گیا۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** ایک اللہ والے سے عداوت سارے محکمہ ربانی بلکہ خود رب تعالیٰ سے عداوت ہے جس کا نتیجہ خود اپنی ہلاکت ہے۔ **دوسرا فائدہ** نبی کیلئے علم غیب ضروری ہے۔ دیکھو ابن صوریہ نے علوم غیبیہ سے آپ کی نبوت آزمائی۔ اور وہ باتیں پوچھیں جن تک ماہر طبیب اور کامل عقلمند کے ذہن کی رسائی نہیں۔ اس پر حضور علیہ السلام نے یہ نہ فرمایا۔ کہ میں تو مسئلے بتانے آیا ہوں۔ مجھے غیبی خبروں سے کیا تعلق بلکہ ایسے نفیس جواب دیئے جس سے اُس کا منہ بند ہو گیا۔ **چوتھا فائدہ** علماء کاملین کو جائز ہے۔ کہ مناظرہ وغیرہ کیلئے مندروں یا گرجوں یا یہودیوں کے کنیسوں میں جائیں اور اسلام کی حقانیت ثابت کرنے یا کفار کی تردید کیلئے اُن کی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ مگر یہ انہیں علماء کیواسطے ہے۔ جو حضرت فاروق جیسا قوی ایمان رکھتے ہوں عام لوگوں بلکہ عام علماء کو بھی بدمذہبوں کی کتابیں دیکھنا جائز نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ خود شبہ میں پڑ جائیں۔ خاص علماء کو بھی مذکورہ صورتوں میں ہی جائز ہوگا۔ بلاضرورت اُن کو بھی ایسی کتابیں پڑھنا حرام ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار عمر رضی اللہ عنہ کو بھی توریت کے دیکھنے سے منع فرمایا دیکھو کتب احادیث **پانچواں فائدہ** حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وہ شان ہے۔ کہ کبھی اُن کی رائے کے موافق قرآنی آئتیں اترتی تھیں۔ بلکہ بہت سے قرآنی احکام بھی اُن کے حسب منشا آئے جن کا مختلف موقعوں پہ ذکر کیا جائیگا۔ **چھٹا فائدہ** حضرت جبریل باقی ملائکہ سے افضل ہیں۔ اسی لئے اس آیت میں اُن کا ذکر میکائیل سے پہلے ہوا۔ نیز یہ قرآن وحی اور علم لائے۔ جو کہ غذائے روح ہیں۔ حضرت میکائیل بارش وغیرہ لاتے ہیں جس سے بدن کا بقا ہے۔ اور روح بدن سے افضل ہے۔ اس لئے اُس کی غذا بھی بدن کی غذا سے افضل اور پھر حضرت

جبریل بھی حضرت میکائیل سے افضل نیز قرآن کریم نے حضرت جبریل کی صفت میں فرمایا مُطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ جس سے معلوم ہوا کہ حضرت جبریل مطاع اور باقی سارے فرشتے ان کے مطیع اور فرمانبردار نیز حضرت جبریل کے ذمہ انبیاء کرام کی خدمت رہی اور دوسرے انتظام کرنیوالے فرشتوں کے ذمہ عام مخلوق کی خدمت اور بڑے مخدوم کا خادم بھی بڑا ہوتا ہے. تفسیر عزیزی نے طبرانی کی ایک روایت بیان فرمائی. کہ فرشتوں میں افضل حضرت جبریل ہیں اور پیغمبروں میں افضل حضرت آدم دِنوں میں افضل جمعہ. مہینوں میں افضل ماہ رمضان راتوں میں افضل شب قدر اور عورتوں میں افضل حضرت مریم ہیں پیغمبروں میں حضرت آدم علیہ السلام اس لئے افضل ہیں. کہ وہ تمام پیغمبروں کی اصل ہیں جیسے کہ روئی کپڑوں کی اصل اس لئے سب سے افضل یا جڑ پھل و پھول کی اصل اس لئے اُن سے افضل مگر درجہ اور قیمت میں پھول پھل جڑ سے اعلیٰ ہے. اور قیمتی کپڑے روئی سے بڑھ کر ایسے ہی حضور علیہ السلام درجات اور تقرب میں آدم علیہ السلام سے کہیں افضل ہیں. **ساتواں فائدہ** رافضی بہت سی باتوں میں یہود سے ملتے جلتے ہیں. یہود نے نبوت بنی اسرائیل سے خاص سمجھی انہوں نے خلافت بارہ اماموں سے یہود نے بعض پیغمبروں کو خدا کا بیٹا مان لیا. اور بعض کو گالیاں دیں. اور ایذائیں پہنچائیں رافضی نے بھی ایک خلیفہ یعنی حضرت علی کو خدا و رسول سے بڑھ کر سمجھا اور باقی خلفاء پر تبرے کئے عام رافضی حضرت علی کو حضور سے افضل جتنے. کہ کہتے ہیں بمصرعہ مگر اپنے سے بڑھ کر ڈھونڈ کر داماد کرتے ہیں ؎ نصیری فرقہ نے انہیں خدا مانا. عام رافضی یہ شعر پڑھا کرتے ہیں.

دکھا دو یا علی جلوہ نصیری کے خدا تم ہو　　یہ آنکھیں طالب دیدار ہیں حاجت روا تم ہو

یہود نے کہا. کہ حضرت جبریل نے نبوت بنی اسمٰعیل کو دے دی. رافضی بھی کہتے ہیں. کہ حضرت علی وحی کے اصل مقصود تھے نظاہر حضور پر آ گئی. یہودی بھی دعویٰ کرتے تھے. کہ فرشتے آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں. رافضی بھی دعویٰ کرتے ہیں. کہ خلفاء راشدین ایکدوسرے کے دشمن تھے. اور جیسے کہ ایک جبریل علیہ السلام سے دشمنی سارے ملائکہ بلکہ رب سے دشمنی ہے. ایسے ہی ایک صحابی سے عداوت رب سے عداوت ہے. تعجب ہے. کہ خلفاء ثلاثہ کے مقابلہ میں خود جناب امیر علی مرتضےٰ دعویٰ خلافت نہ فرمائیں. مگر یہ خیر خواہ سر پھوڑے مرے جاتے ہیں. **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن حضور کے قلب پاک پر آتا تھا نہ کہ تمام ذات پر جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کا صرف مضمون ہی رب کی طرف سے ہے. نہ کہ الفاظ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خود اپنے ہیں کیونکہ الفاظ کان سے اور مضمون دل سے محسوس ہوتا ہے. تو گویا بطور کشف قرآن کا القا ہوتا تھا (بعض موجودہ بددین) **جواب** قرآن کے الفاظ مضامین سب ہی رب کی طرف سے ہیں. رب فرماتا ہے. اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا کہیں فرماتا ہے. وَھٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ وغیرہ الفاظ ہی عربی فارسی ہوتے ہیں. نیز زبان سے الفاظ ہی ادا ہوتے ہیں. نہ کہ مضمون اس اعتراض کے چند جواب جواب ہیں. ایک یہ کہ دل معنی کی طرح الفاظ کو بھی سمجھتا ہے. اور کان تو محض آلہ ہیں. جیسے آنکھ کے سامنے ایک عینک قرآن کے نزول کے وقت کان سنتے تھے. اور دل سمجھتا تھا. دوسرے یہ کہ احادیث سے ثابت ہے. کہ نزول وحی کیوقت حضور علیہ السلام پر غشی کی سی حالت طاری ہو جاتی تھی. اس وقت بلا واسطہ کان الفاظ قلب پر ہی وارد ہوتے ہوں گے تیسرے یہ کہ عام لوگ تو قرآن پاک اولاً کان سے سنتے ہیں. اور بعد میں دل سے گویا کان دل کا راستہ ہیں. لیکن حضور علیہ السلام اولاً دل سے اور بعدہٗ کان سے محسوس فرماتے تھے. جو کہ بڑا کمال ہے (تفسیر عزیزی) سبحان اللہ یہ عجیب فرق ہے. قرآن کریم بواسطہ جبریل حضور تک پہنچا اور دو واسطوں سے (حضرت جبریل اور نبی علیہ السلام) مسلمانوں تک تو گویا قرآن نبی پر بھی اترا اور اُمّت پر بھی فرق یہ ہی ہوا کہ اُمّت کے دلوں نے بذریعہ کان قرآن سمجھا اور حضور علیہ السلام کے کان شریف نے دل کے ذریعہ سنا ہم نے اپنی کتاب جاء الحق میں یہ ثابت کیا ہے. کہ حضور علیہ السلام نزول قرآن سے پہلے ہی عارف باللہ بلکہ اجمالاً قرآن سے آگاہ تھے. اس کی نفیس تحقیق وہاں ہی دیکھو **دوسرا اعتراض** اس آیت میں قرآن کی تین صفتیں بیان ہوئیں اگلی کتابوں کی تصدیق ہدایت اور خوشخبری ان صفات میں یہ ترتیب

کیوں رکھی گئی **جواب** اس میں بڑا نکتہ ہے. کلام سننے والے تین طریق سے اس کو سچا جانتے ہیں عام لوگ تو اس طرح کہ وہ اُن کے بزرگوں کے کلام کے موافق ہو محققین دلائل سے وہمی لوگ لالچ سے چونکہ یہود میں تینوں قسم کے لوگ موجود تھے اس لئے یہ تینوں صفتیں اس ترتیب سے بیان کی گئیں **تیسرا اعتراض** حضرت جبریل سے دشمنی کرنا خلاف عقل ہے. اور موجودہ یہودی بھی اس کا انکار کرتے ہیں.

**جواب.** اُن بے وقوفوں سے یہ حماقت کچھ بعید نہیں. انہوں نے تو موسیٰ علیہ السلام سے نیا خدا بھی مانگا تھا. موجودہ یہودی اپنے اس عیب کو چھپاتے ہیں. جو بیوقوف قوم کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مان سکتی ہے. وہ حضرت جبریل سے دشمنی بھی کر سکتی ہے **تفسیر صوفیانہ** تمام گناہوں سے بدتر گناہ اللہ والوں کی عداوت ہے. اور تمام کفر میں بدترین کفر وہ جو محبوبان خدا کی عداوت کے سبب ہو. اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قلب قابل فیصلہ نہیں رہتا. اور ایسے بے دین کا رب بھی دشمن ہے. صرف دو مجرموں کو حق تعالیٰ نے اعلان جنگ دیا ہے. ایک سود خوار اور دوسرے محبوبان الٰہی کا دشمن اس لئے چاہیئے. کہ ان دو بیماریوں سے خاص طور پر ڈریں محب گنہگار کی بخشش ہو جائیگی. مگر دشمن عابد کی بخشش ناممکن ہے. بلکہ حق یہ ہے. کہ محبت کا کافر کچھ فائدے میں رہتا ہے. مگر عداوت کا کافر ہر طرح خسارے میں ہے. عیسائی کافر محبت ہیں. دنیا میں سلطنت کر رہے ہیں یہودی عداوت کے کافر ایک چپہ زمین کے مالک نہیں.

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ۚ وَمَا یَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ (۹۹)

اور البتہ تحقیق اُتاری ہم نے طرف تمہاری نشانیاں ظاہر اور نہیں کفر کرینگے ساتھ اُنکے مگر فاسق لوگ.

اور بے شک ہم نے تمہاری طرف روشن آیتیں اُتاریں اور اُن کے منکر نہ ہوں گے مگر فاسق لوگ.

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق** اس سے پہلے یہود کا قلبی اندھا ہونا بیان ہوا تھا. کہ وہ عداوت جبریل میں ایسے اندھے ہوئے. کہ اُن کی وجہ سے قرآن جیسی فائدے مند کتاب کے منکر ہو گئے. اب اُن کا آنکھ کا اندھا ہونا بتایا جا رہا ہے. کہ قرآنی آیتیں ایسی ظاہر ہیں کہ اندھوں کو بھی نظر آجائیں. مگر ان کو نظر نہیں آتیں **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا. کہ حضرت جبریل نے آپ پر قرآن ہمارے حکم سے اُتارا. اب فرمایا جاتا ہے. کہ بلکہ ہم نے ہی اتارا وہ تو فقط ایک قاصد ہیں. یہود کو ہم سے کیا عداوت ہے. جو ہماری کتاب نہیں مانتے **تیسرا تعلق** پچھلی آیت سے معلوم ہوا. کہ یہود عداوت جبریل کے سبب قرآن کے منکر ہیں. اب فرمایا جا رہا ہے. کہ ہم نے تو قرآن کے سوا اور صدہا آیات یعنی معجزات بلا واسطہ جبریل آپ پر اتارے ہیں. یہ لوگ اُن کے کیوں منکر ہیں. اُن میں تو جبریل کا واسطہ بھی نہیں **چوتھا تعلق** یہود نے اپنے انکار کی وجہ عداوت جبریل بتائی. اس آیت میں ان کی تردید ہے. کہ نہیں بلکہ اس کی وجہ اُن کا دائمی فسق اور بے دینی ہے. **شانِ نزول** اسی ابن صوریہ نے ایک دفعہ عرض کیا تھا. کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہ لائے جسے ہم پہچانتے اور نہ آپ پر کوئی ظاہری آیت اُتری جسے ہم مانتے اُس کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تفسیر کبیر نے فرمایا. کہ ایک دفعہ معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا. کہ اے یہودیو پہلے تو تم اہل کتاب تھے. اور ہم مشرک تم نے ان نبی آخر الزمان کی تعریفیں سنا سنا کر ہمیں ان کا شیدائی بنا دیا. رب کی شان کہ ہم نے اور تم نے ان کو پا بھی لیا ہم تو تمہاری بتائی ہوئی صفتوں سے ان پر ایمان لے آئے تم کیوں محروم رہ گئے. اس پر یہود نے کہا. کہ یہ توریت کی بتائی ہوئی کوئی نشانی لے کر نہ آئے جس سے ہم اُن کو نبی مانیں تب یہ آیت اُتری. ہو سکتا ہے. کہ یہ دونوں واقعے ہوئے ہوں. کہ ادھر تو ابن صوریہ نے حضور سے عرض کیا ہو. اور ادھر دوسرے یہود نے معاذ ابن جبل سے اور تب یہ آیت اُتری ہو **تفسیر** وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ. انزال کے معنی ہیں. ایک دم اُتارنا سارا قرآن تو ترتیب وار اُترا لیکن اُس کے بعض رکوع ایک دم اُترے ہیں. اس لئے یہاں اَنْزَلْنَا فرمایا گیا. نیز ہر رمضان میں جبریل امین پورا

قرآن سنا جاتے تھے۔ اس لحاظ سے اَنْزَلْنَا فرمایا گیا یا رب تعالیٰ نے آپ پر اُتارنے کیلئے سارا قرآن ایک دم پہلے آسمان کی طرف اُتار دیا۔ پھر وہاں سے فرشتے کے ذریعہ ترتیب وار آتار ہا۔ تو گویا بلاواسطہ تو ایک دم اُترا اور بالواسطہ آہستہ یا آیات سے مراد معجزات ہیں۔ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ۔ آیات آیت کی جمع ہے جس کے معنی ہیں نشانی یا علامت چونکہ قرآن کا ہر جملہ رب تعالیٰ کی نشانی ہے۔ اس لئے اسے آیت کہتے ہیں۔ اور قرآن میں بہت سی آیتیں ہیں۔ اس لئے آیات فرمایا گیا یا قرآن کی ہر آیت صدہا طریق سے حضور کی نبوت ثابت کر رہی ہے اس لئے ہر آیت کو آیات کہا گیا۔ فصاحت بلاغت غیب کی خبر توحید و نبوت کے دلائل احکامی مسائل قریب قریب ہر آیت میں موجود ہیں۔ یا آیات سے مراد معجزات ہیں بَیِّنٰت کے معنی ہیں ظاہر اور کھلے ہوئے۔ کیونکہ اس کا معجزہ ہونا عام لوگ معلوم کر چکے تھے۔ اس لئے اسے بیّنات کہا گیا یعنی ہم نے آپ پر کھلی ہوئی نشانیاں اتاریں وَمَا يَكْفُرُ بِهَا کسی میں جرأت اور ہمت نہیں۔ کہ ان کا انکار کرے۔ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ سوا اُن کے جو حد انسانیت سے نکل چکے ہیں۔ فاسق فسق سے بنا جس کے معنی ہیں نکل جانا جیسے کہ وہ مسلمان فاسق کہلائے گا۔ جو گناہ کبیرہ کر کے تقویٰ کی حد سے نکل جائے۔ ایسے ہی کافر بھی اس لئے فاسق کہلاتا ہے۔ کہ وہ حد ایمانی یا انسانی سے نکلا ہوا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ جہاں قرآن کریم فسق کو کفر کے ساتھ جمع فرماتا ہے۔ تو اس سے بدترین کفار مراد ہوتے ہیں **خلاصہ تفسیر**۔ اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ پر وہ قرآن اُتارا جو ہماری توحدانیت اور آپکی نبوت پر کھلے ہوئے دلائل ہے ان کا کوئی بھی بے علمی اور نادانی یا کسی شبہ سے انکار نہ کریگا۔ بلکہ محض خباثت نفس سے یا یوں کہو کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہود جبریل کی وجہ سے قرآن کو نہیں مانتے تو ہم نے تو ہم نے تو قرآن کے علاوہ اور بہت سے معجزات بھی اتارے ہیں۔ آپ کے فراق میں ستون رویا آپ سے درختوں نے کلام و سلام کیا آپ سے اُونٹوں نے شکایت اور ہرنوں نے اپنے دکھ کی حکایت کی آپ کے اشارہ انگشت سے چاند پھٹا سورج لوٹا انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہوئے تھوڑے کھانے سے بڑی خلقت سیر ہوئی ان باتوں کو دیکھتے ہوئے پھر یہ آپ کے کیوں منکر ہیں معلوم ہوا کہ جبریل کا فقط بہانہ ہے۔ ان کا نفس ہی خبیث ہے۔ **تفسیر صوفیانہ** قرآن و کفار کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کہ اندھیری کوٹھری میں خوبصورت اور بدشکل لوگ جمع تھے۔ بدصورت اپنے حسن کی تعریفیں کر رہا تھا وہ سمجھتا تھا۔ کہ اس اندھیرے میں مجھے کون دیکھ رہا ہے۔ جو چاہوں اپنی نوک زبان سے متوالوں کہ اچانک وہاں شمع آگئی یہ تیز زبان بدصورت اٹھ کر اُس کو پھونکیں مارنے اور اس میں عیب نکالنے لگا۔ اس کی وجہ یہ نہیں۔ کہ وہ شمع بُری وجہ یہ ہی ہے۔ کہ اس عیبی کو اپنے عیب کھلنے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح سعید و شقی روحیں تاریک دنیا میں جمع تھیں۔ مگر شقی اپنی تیز زبانی سے اپنی سعادت کے خطبے پڑھ رہے تھے۔ کہ اچانک اللہ کا نور محمد صلے اللہ علیہ وسلم ایک روشن شمع (قرآن) لے کر دنیا میں تشریف لائے جس روشنی میں ہر چیز صاف نظر آنے لگی کفار نے اپنا کفر و فسق چھپانے کیلئے کہ اس میں صدہا قسم کے عیب نکالنے شروع کر دیئے۔ اور چاہا۔ کہ اس شمع کو بجھا دیں مگر رحمانی شمع انسانی پھونک سے کبھی نہیں بجھ سکتی۔ آج تک قرآن کے ہزاروں دشمن ہیں۔ مگر قرآن دن بدن ترقی کر رہا ہے کسی صوفی نے کیا خوب کہا شعر

شمع رخشندہ دراں جمع نہ خواہند کہ تا — عیب شاں در شب تاریک بماند مستور

وائے آں وقت کہ روشن شود ایں راز چوں روز — پردہ برخیزد وایں حال بیاید بظہور

چمگادڑ کی آنکھ چاہتی ہے۔ کہ آفتاب نہ نکلے مگر آفتاب نکل کر ہی رہتا ہے۔

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰۰)

کیا اور جب کبھی عہد کیا اُنہوں نے کوئی عہد پھینک دیا اُسکو ایک گروہ نے اُن میں سے بلکہ بہت سے اُن کے نہیں ایمان لاتے

اور کیا جب کبھی کوئی عہد کرتے ہیں۔ ان میں ایک فریق اُسے پھینک دیتا ہے۔ بلکہ ان میں بہتیروں کو ایمان نہیں

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ

اور جبکہ آیا اُن کے پاس پیغمبر پاس سے اللہ کے سچا کرنیوالا واسطے اسکے جو ساتھ ہے اُنکے تو پھینک دیا ایک گروہ نے سے

اور جب اُن کے پاس تشریف لایا۔ اللہ کے یہاں سے ایک رسول اُن کی کتابوں کی تصدیق فرماتا تو کتاب والوں

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۱)

اُن میں سے جو دیئے گئے کتاب کتاب اللہ کی پیچھے پیٹھوں اپنی کے گویا وہ نہیں جانتے

میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب اپنی پیٹھ پیچھے پھینک دی۔ گویا وہ کچھ علم ہی نہیں رکھتے۔

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ یہود عداوت جبریل کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی خباثت کی وجہ سے آیات کا انکار کرتے ہیں۔ اب اس دعویٰ کا نہایت قوی ثبوت دیا جارہا ہے۔ کہ عہد شکنی ان کا عام دستور ہے بتاؤ۔ یہ عہدوں کا کیوں انکار کرتے ہیں۔ ان میں تو حضرت جبریل کا واسطہ نہیں ہے معلوم ہوا۔ کہ ان کے نفس ہی خبیث ہیں **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں یہود کا آیات الہٰیہ کے انکار کا ذکر ہوا تھا۔ اللہ کی آیتوں میں کفار شک بھی کرتے مگر اب اُن کی عہد شکنی کا ذکر ہے جو کہ ہر مذہب و ملت میں بُرا ہے۔ تو گویا اس میں اعلیٰ کی طرف ترقی ہے **تیسرا تعلق** پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا۔ کہ وہ یہود توریت کو اس لئے مانتے ہیں کہ بغیر واسطہ جبریل آئی۔ اب بتایا جارہا ہے۔ کہ یہ تو خود توریت کو بھی پس پشت ڈال چکے۔ اُس کے بھی عامل نہ رہے معلوم ہوا۔ کہ حضرت جبریل کا بہانہ ہے۔ اصل وجہ فسق و فجور ہے۔ **شان نزول** ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کے بڑے عالم مالک ابن سیف اور اس کی جماعت کو حق تعالیٰ کے وہ عہد و پیمان یاد دلائے۔ جو کہ توریت میں نبی آخر الزمان پہ ایمان لانے کے متعلق لئے گئے تھے۔ تو ابن سیف نے اُن کا صاف انکار کر دیا۔ کہ ہم سے اسکے متعلق کوئی عہد نہیں لیا گیا۔ اُس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر خزائن العرفان) **تفسیر اَوَكُلَّمَا** یہاں ایک فعل پوشیدہ ہے۔ یا تو اَوْ کے بعد یا ہمزہ کے بعد اور واؤ سے پہلے یعنی اَوَلَمْ يَكُنْ ذٰلِكَ كُلَّمَا اور کیا یہ نہیں ہوا کہ جب بھی انہوں نے عہد کیا تو توڑ دیا۔ اور اگر ہمزہ اور واؤ کے درمیان فعل پوشیدہ ہو تو یا تو یہ واؤ حالیہ ہے یا عاطفہ یعنی۔ اَيُنْكِرُوْنَ ذٰلِكَ وَكُلَّمَا الخ کیا یہود اپنے فسق کا انکار کر سکتے ہیں۔ حالانکہ ہر عہد توڑتے رہے یا اَكَفَرُوْا بِالْاٰيٰتِ وَكُلَّمَا کیا انہوں نے واضح آیتوں کا ہی انکار کیا اور ہر عہد بھی توڑا غرضکہ یہ سوال تو تعجب کا ہے یا انکاری عٰهَدُوْا عَهْدًا عہدٌ و معاہدہ سے بنا جسکے معنی آپس میں عہد و پیمان کرنا عہدًا یا تو مفعول مطلق ہے۔ یا مفعول بہ اور اس عہد سے یا تو رب کا عہد مراد ہے۔ کہ اُس نے یہود سے توریت پر عمل کرنے انبیاء کی اطاعت کرنے آپس میں خون ریزی نہ کرنے نبی آخر الزماں پر ایمان لانے کا عہد لیا تھا۔ مگر انہوں نے وہ سارے عہد توڑ ڈالے یا نبی علیہ السلام کا عہد یہود مدینہ بنی قریظہ اور بنی نضیر نے حضور سے عہد کیا تھا۔ کہ ہم آپ کے دشمنوں کی آپ کے مقابل کبھی مدد نہ کریں گے مگر خندق وغیرہ کے موقعہ پر عہد شکنی کر کے مشرکین مکہ کی خوب مدد کی اس کے علاوہ بھی مسلمانوں کی خفیہ خبریں کفار قریش کو بھیجتے رہے۔ یا موسیٰ علیہ السلام کا عہد مراد ہے۔ کہ یہود نے اُن سے صدہا عہد کیئے اور توڑ دیئے یا مسلمانوں کا عہد یا خود اُن کے آپس کا عہد کہ یہود اپنے کسی وعدے کے پابند نہ تھے۔ عہد شکنی اُن کی عادت ہو چکی تھی۔ حالانکہ اس کو ہر دین و ملت بُرا کہتا ہے۔ **نَبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ** اُن میں سے ایک گروہ اُس عہد کو پس پشت پھینک دیتا ہے۔ نَبَذَ سے یہ بتایا۔ کہ یہود اپنے عہدوں کا ذرا بھی پاس و لحاظ نہیں کرتے۔ پیٹھ پیچھے کی چیز بالکل نظر نہیں آتی دائیں بائیں کی کچھ نظر تو آتی ہے۔ تو انہوں نے عہد دائیں بائیں نہ پھینکا۔ کہ کچھ دکھائی بھی دے۔ بلکہ پیچھے پھینکا۔ کہ بالکل نظر ہی نہ پڑے فریق سے

یہ بتایا۔ کہ عہد شکنی سارے یہود کا طریقہ نہیں۔ ان میں سے بعض نہایت وفادار ہیں۔ جیسے کہ سیدنا عبداللہ ابن سلام وغیرہ فریق چھوٹی پارٹی
جماعت کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ فرقۃ سے بنا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ لفظ فریق
سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید بدعہد بہت تھوڑے یہودی ہوں گے لہٰذا بَلْ ذکر فرمایا۔ اَکْثَرُھُمْ نہیں۔ اُن میں بدعہد بہت ہیں پھر بھی شبہ تھا۔
کہ شاید بدعہدی کو جرم اور اپنے کو مجرم سمجھتے ہوں گے فرمایا نہیں۔ بلکہ لَا یُؤْمِنُوْنَ وہ پابندی عہد پر ایمان ہی نہیں لاتے یعنی اس عیب کو عیب
نہیں بلکہ ہنر سمجھتے ہیں۔ یا توریت کی اُن آیات ہی کو نہیں مانتے جن میں وفاء عہد کا حکم ہے۔ یا توریت ہی پر ایمان نہیں رکھتے۔ پھر پابندیٔ عہد
کا کیا ذکر ہے۔ وَلَمَّا جَآءَھُمْ رَسُوْلٌ منجملہ اور وعدہ خلافیوں کے ایک بڑی وعدہ خلافی یہ ہے۔ کہ جبکہ اُن کے پاس وہ بڑے
رسول تشریف لائے۔ جن میں چند خاص صفات تھیں۔ ایک یہ کہ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ وہ رب کے پاس سے آئے۔ اور بادشاہ کے
پاس سے آئے ہوئے حاکم کا بہت ادب ولحاظ چاہیئے۔ کہ اُس کی مخالفت دراصل بادشاہ کی توہین ہے۔ مگر انہوں نے اسکی کوئی پرواہ
نہ کی دوسری صفت یہ ہے۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَھُمْ وہ پیغمبر خود اُن کی کتابوں اُن کے پیغمبروں کو سچا کرتے ہیں۔ کہ انہوں نے
ان کی آمد کی پیشینگوئی کی تھی۔ اگر یہ نہ آتے تو خبر جھوٹی ہو جاتی۔ ان کے آنے سے وہ سچے ہوئے یا یہ پیغمبر اُن کو سچا کہتے ہیں۔ یا ان پیغمبر کی
برکت سے تمام دنیا میں اگلی کتابوں اگلے پیغمبروں کی صداقت کے قیامت تک خطبے پڑھے جائیں گے۔ مگر ان بدنصیبوں نے اُن سے
یہ سلوک کیا۔ کہ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مشرکین کفار کی کیا شکایت خود وہ لوگ جنہیں کتاب الٰہی ملی اور جن کو اِن
کی خبر تھی اُن میں سے ایک گروہ نے پھینک دیا کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ اللہ کی کتاب پیٹھوں کے پیچھے کہ اُس پر کوئی توجہ ہی نہ کی خیال رہے کہ اُوْتُوا الْکِتٰبَ سے یا تو علماء یہود مراد
ہیں جنہیں توریت کا علم تھا یا عام یہود اور کتاب اللہ سے یا تو قرآن کریم مراد ہے۔ کیونکہ اس کا کتاب الٰہی ہونیکا اُن کو بھی یقین تھا یا توریت شریف امام سدی فرماتے ہیں کہ یہود نے توریت
قرآن سے مقابلہ کیا تو مطابق پایا۔ قرآن کریم کی جلن میں توریت کو بھی چھوڑ دیا۔ کہ ہم وہ کام نہ کریں گے۔ جو قرآنی احکام کے موافق ہوں (تفسیر خزائن العرفان)
پیٹھ کے پیچھے کی کتاب بالکل نظر نہیں آتی۔ انہوں نے بھی توریت پر بالکل نظر نہ کی۔ اور ایسے انجان بنے۔ کہ کَاَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ گویا
وہ قرآن یا توریت کو جانتے ہی نہیں سفیان ثوری فرماتے ہیں۔ کہ یہود توریت شریف کو حریر وریشم کے غلاف میں لپیٹتے اور اُس کو سنہری
روپہلی رنگوں سے زینت دیتے تھے۔ مگر اُسکے احکام پر عمل نہیں کرتے تھے اس لئے رب نے فرمایا کہ انہوں نے توریت کو پھینک دیا

**خلاصہ تفسیر** یہود کے چار فرقے تھے ایک تو صحیح معنی میں توریت پر عامل جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے جیسے ابن سلام
اور کعب احبار رضی اللہ عنہم اسی لئے قرآن نے فریق فرمادیا۔ کہ منکر سب نہیں ہیں بلکہ ایک گروہ ہے۔ مگر یہ بہت تھوڑے اس لئے فرمایا گیا
بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ دوسری وہ جماعت جنہوں نے علانیہ عہد شکنی اور سرکشی بغاوت کی اُن کے لئے فرمایا۔ نَبَذَہٗ فَرِیْقٌ مِّنْھُمْ
تیسرے وہ جہلا جنہوں نے بے علمی اور علماء سوء کے بہکانے سے توریت سے منہ موڑا اُن کے لئے فرمایا۔ بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ چوتھے
وہ جو دیدہ دانستہ جاہل بن گئے اور نبی آخر الزمان کو پہچان کر بے خبری ظاہر کرنے لگے۔ اُن کیلئے فرمایا گیا۔ کَاَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ان میں سے
پہلا فرقہ تو ناجی ہے۔ باقی تینوں ناری مگر جسکا جیسا جرم ویسی ہی سزا فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم یہ حضرت جبریل کا بہانہ
کر رہے ہیں۔ انکی تو یہ حالت ہے۔ کہ سوا چند مخلص لوگوں کے باقی سب نے اپنے عہد وپیمان توڑ دیئے کسی نے کھلے بندوں کسی نے خفیہ
کسی نے جہالت سے کسی نے جاہل بن کر یہ لوگ ایسے گندے عذر کہاں کہاں کریں گے۔ آپ اِن کی بکواس پر دھیان نہ دیں۔ اللہ کے
عہد انہوں نے توڑے رسولوں کے عہدوں کا انہوں نے خیال نہ کیا آپس کے عہد وپیمان توڑنے میں یہ بڑے ماہر کتاب الٰہی کو پس پشت
انہوں نے ڈال دیا۔ قرآن کریم کی جلن میں توریت کو انہوں نے پھینک دیا۔ پھر ایسی ہٹ دھرم قوم کا کیا ٹھکانہ ہے۔ **فائدے** اس آیت
سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ پہلا فائدہ وعدہ خلافی کرنا سخت جرم ہے۔ اور نبی سے وعدہ خلافی کرنا اور بھی سخت اور رب سے بے وفائی

کرنا بڑا ہی سخت جرم ہے جس کی بات کا ٹھیک نہیں اُس کے باپ کا ٹھیک نہیں **دوسرا فائدہ** عالم بے عمل اور جاہل برابر ہیں۔ بلکہ ایسے عالم
کی سزا سخت ہے کیونکہ جاہل تو کسی قدر معذور بھی ہے۔ اسی لئے بزرگانِ دین فرماتے ہیں۔ کہ زبانی وعظ صرف کان تک اور دل کا وعظ دل تک
پہونچتا ہے یعنی بے عمل عالم کا وعظ اثر نہیں کرتا لوگ سُن کر بھول جاتے ہیں **تیسرا فائدہ** اگر کتاب اللہ پر عمل نہ ہو۔ تو اُس کا چومنا چاٹنا ظاہری
طور پر اُس کو پڑھنا بیکار ہے جیسا کہ اِن یہودیوں کے حال سے معلوم ہوا کہ بغیر عمل توریت کی تعظیم اُن کیلئے کچھ کام نہ آئی۔ اگر طبیب کا نسخہ
ستھرے غلاف میں لپیٹ کر رکھا جاوے روزانہ اُسکو پڑھ لیا جاوے۔ مگر اُس پر عمل نہ ہو کبھی فائدہ نہ دیگا۔ مگر خیال رہے۔ کہ یہ حکم اُن لوگوں کیلئے
ہے۔ جو کہ کتاب اللہ کو حق نہ جانیں یا بے دھڑک اُس پر عامل نہ رہیں جیسے کہ یہود کا حال ہے جو گنہگار مسلمان نادانی سے قرآن پاک پر
پورا عمل نہیں کرتا پھر اپنے کو قصور مند مجرم جانتا ہے۔ اُس کیلئے قرآن پاک کی تعظیم اُس کی تلاوت اُسکو دیکھنا ضرور باعث ثواب ہے۔ قرآن
کریم کے ایک حرف پڑھنے میں دس نیکیاں ہیں۔ محبوب کا نام لینے سے بیماری ہلکی پڑ جاتی ہے پیارے کا دیدار شفا بیمار ہے بعض دواؤں کے
نام سے مرض دور ہو جاتا ہے جس کی تحقیق ہم پہلے کر چکے ہیں لہٰذا قرآن دیکھنا اُس کا پڑھنا اُسکی تعظیم سے فائدہ مند ہے یہ نہیں کہ جو عمل نہ
کر سکے وہ تلاوت اور تعظیم بھی چھوڑ دے **چوتھا فائدہ** حضور علیہ السلام اپنے ظہور سے پہلے رب کے حضورِ خاص میں حاضر تھے کیونکہ فرمایا گیا
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ یہ رسول اللہ کے حضور سے آئے حضور سے آئے حضورِ الٰہی سے وہ آئیگا جو پہلے وہاں حاضر ہو گا تفسیر روح البیان نے
لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ کی تفسیر میں ایک حدیث نقل فرمائی کہ ایک بار حضور علیہ السلام نے جبریل امین سے پوچھا کہ تمہاری عمر کتنی ہے عرض
کیا کہ یہ تو مجھے خبر نہیں ہاں اتنا جانتا ہوں۔ کہ ایک تارا ستر ہزار سال کے بعد طلوع کرتا تھا میں نے اُس کو ۷۲ ہزار بار نکلتے دیکھا ہے
فرمایا۔ کہ وہ تارا ہمارا ہی نور تھا **پانچواں فائدہ** ایک شب پھول کی صحبت میں وہ کر تیل بھی مہک جاتے ہیں۔ کہ اُن کا تیل جس دماغ پر پہنچے اُسکو
ہی معطر کر دے۔ جو ذاتِ کریم کہ کروڑوں سال رب کی حضور حاضر رہے اُسکو کیا کچھ فیض نہ ملے ہوں گے۔ اور پھر وہ صحابہ جنہوں نے اُس
ذاتِ کریم کی صحبت پائی وہ کیونکر نہ چمکے ہوں گے۔ رافضی صحابہ کرام کے کمالات کا انکار کر کے درحقیقت حضور علیہ السلام کی توہین کرتے ہیں اور
دیوبندی حضور کے کمالات کے منکر ہو کر رب کے کمال کے منکر ہیں۔ عالم کے پاس جاہل کچھ سال رہے تو عالم بن جاوے مگر حضور علیہ السلام
کی صحبت میں رہ کر صحابہ کرام بے فیض رہیں۔ اور رب کے پاس رہ حضور علیہ السلام کو فیض حاصل نہ ہو **چھٹا فائدہ** حضور علیہ السلام رب کا ہدیہ
ہیں جو کہ مسلمانوں کو عطا ہوا کیونکہ فرمایا گیا۔ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اور بادشاہ اپنی حیثیت کے موافق ہدیہ دیتا ہے۔ تو حق تعالیٰ کا ہدیہ تمام ہدیوں کا
بادشاہ ہے حضور علیہ السلام تمام نعمتوں سے اعلیٰ نعمت ہیں۔ **پہلا اعتراض** یہود توریت کو مانتے تھے۔ پھر کیوں فرمایا گیا۔ کہ انہوں نے توریت
پھینک دی **جواب** صرف زبانی مانتے تھے عملاً مخالف تھے۔ اور عمل کا لحاظ ہوتا ہے۔ نہ کہ صرف زبانی شیخی کا۔ **دوسرا اعتراض** جاہل
معذور ہے چاہیئے کہ وہ قرآن کا انکار کرنے پر سزا نہ پائے **جواب**۔ جاہل پر لازم ہے۔ کہ علم حاصل کرے وہ اس سے لاپرواہی کر کے
گنہگار اور ملزم ہوا۔ **تفسیر صوفیانہ** مشہور تو یہ ہے۔ کہ علم ظاہری علم باطنی پر مقدم ہے۔ اور بصارت یعنی آنکھ کی روشنی بصیرت یعنی قلبی روشنی
سے پہلے مگر علم ظاہری کا فیض علم باطنی کے بعد ہے۔ اور بصارت کا فائدہ بصیرت سے حاصل ہوتا ہے۔ دیکھو یہودی کے پاس علم ظاہری اور
بصارت کی کمی نہ تھی۔ مگر علم باطنی اور بصیرت نہ ہونے کی وجہ سے اُنہوں نے کتاب الٰہی کو اُسی طرح پس پشت ڈال دیا جیسے کہ مجنون دیوانہ
قیمتی موتی کو کھلونا یا لعل کو ٹھیکری سمجھ کر اور اُن کا یہ علم ظاہری و بصارت اُن کیلئے اور زیادہ وبال جان بن گیا۔ لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ سینے
میں علم باطنی پیدا کرے اور اللہ والوں کی صحبت سے بصیرت حاصل کرے اور رب کی پکڑ سے ڈر کر توبہ و استغفار میں جلدی کرے۔ ندامت
ہر قسم کی ہے ایک تو دن بھر کی ندامت جیسے کہ کوئی شخص بغیر ناشتہ کے گھر سے نکل جاوے تو دن بھر اپنے اس کئے پر نادم رہیگا دوسرے سال بھر کی ندامت جیسے کہ کوئی وقت کے بعد بیج بوئے
وہ سال بھر تک نادم رہیگا کہ میں نے یہ سال برباد کر دیا تیسرے عمر بھر کی ندامت جیسے کہ کوئی خاندانی بے نکاح کرے وہ عمر بھر شرمندہ اور پریشان رہے چوتھے ہمیشہ کی

ندامت اللہ و رسول کا باغی آخیری قسم کا نادم ہے۔ کہ ہمیشہ ہی مردود رہیگا جیسے کہ تریاق کا دیکھنا زہر کو دور نہیں کر سکتا۔ بلکہ اُس کا استعمال شرط ہے۔ ایسے ہی کتاب اللہ اور رسول اللہ کو معمولی طرح دیکھ لینا۔ زہر کفر کو نہیں مٹاتا بلکہ اُن کی اطاعت و فرمانبرداری اس زہر کا علاج ہے۔
**حکایت** نصیر الدین طوسی جو کہ علم ریاضی کا بڑا ماہر گزرا ہے۔ ایک ولی کی ملاقات کرنے گیا۔ کسی نے اُن بزرگ سے عرض کیا کہ یہ دنیا کا اس وقت بڑا عالم ہے۔ انہوں نے پوچھا۔ کہ اس میں کیا کمال ہے۔ کہا کہ علم نجوم میں کامل ماہر ہے۔ فرمایا کہ سفید گدھا اس سے زیادہ نجوم جانتا ہے طوسی کو بہت ناگوار گزرا اور وہاں سے اُٹھ گیا اتفاق سے رات کو ایک چکی والے کے گھر پہنچا جس کے یہاں بہت سے گدھے پلے ہوئے تھے۔ گدھے والا بولا۔ کہ حضرت آج رات کو سخت بارش ہوگی۔ اندر آرام کرو طوسی نے پوچھا کہ تجھے کیا خبر اُس نے کہا۔ کہ جب میرا گدھا اپنی دم تین بار ہلاتا ہے تو سخت بارش ہوتی ہے۔ آج اس نے دم ہلائی ہے چنانچہ کچھ دیر بعد تیز بارش آگئی۔ تب یہ نادم ہوا کہ واقعی گدھے ہی علم نجوم والے سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔ ہوا میں اُڑنا دریا پر چلنا بڑا عالم ہو جانا کوئی کمال نہیں مکھی بھی اُڑتی ہے مچھلی بھی تیرتی ہے چیل آندھی اور مینڈک بارش کو پہلے ہی سے معلوم کر لیتے ہیں یہ اوصاف جانوروں میں بھی ہیں۔ بڑا علم شیطان کو بھی تھا تصوف اور فقیری اطاعت مصطفٰے علیہ السلام ہوتی ہے۔

ریاضت نام ہے تیری گلی میں آنے جانے کا ۔ تصور میں ترے رہنا عبادت اسکو کہتے ہیں
تجھی کو دیکھنا تیری ہی سننا تجھ میں گم ہونا ۔ حقیقت معرفت اہل طریقت اسکو کہتے ہیں

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ

اور پیروی کی انہوں نے اسکی جو پڑھتے ہیں شیطان اوپر سلطنت سلیمان کے اور نہیں کفر کیا سلیمان نے اور لیکن

اور اُس کے پیرو ہوئے جو شیطان پڑھا کرتے تھے سلطنت سلیمان کے زمانہ میں اور سلیمان نے کفر نہ کیا ہاں

الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ

شیطانوں نے کفر کیا سکھاتے ہیں لوگوں کو جادو

شیطان کافر ہوئے لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں

**تعلق** - اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق** پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ یہود نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔ اب اُس کی ایک بڑی وجہ بتائی جا رہی کہ یہ لوگ جادو سیکھنے سکھانے میں مشغول ہو گئے اس لئے کتاب الٰہی کو پھینک بیٹھے۔ **دوسرا تعلق** پہلے کہا گیا تھا۔ کہ یہود حضرت جبریل کے مخالف ہیں۔ اب فرمایا گیا۔ کہ کیوں نہ ہوں۔ یہ تو اُن شیاطین کے دوست ہیں جنہوں نے علم جادو کا رواج دیا۔ رب کے دشمنوں سے دوستی کرنیوالا رب کے پیاروں سے عداوت کرتا ہے **تیسرا تعلق** پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ یہ رسول صلے اللہ علیہ وسلم اگلے پیغمبروں اور اُن کی کتابوں کو سچا فرماتے ہیں۔ اب اُسکی زندہ مثال پیش فرمائی جا رہی ہے۔ کہ دیکھو حضرت سلیمان کو عام یہودیوں نے جادوگر کہا۔ اُن کی نبوت کا انکار کیا سلیمان پر بھی اسی نبی کا کرم ہے۔ کہ انہوں نے اُن سے یہ الزام دور کیا اور دنیا میں اُن کی نبوت کا اعلان فرمایا **چوتھا تعلق** یہود نے کہا تھا۔ کہ اگر میکائیل قرآن لاتے۔ تو ہم اس پر ایمان لے آتے اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اسے یہود یوں نہ کہو۔ بلکہ یوں کہو۔ کہ اگر یہ علم جادو ہوتا اور شیاطین اس کے لانیوالے ہوتے تو ہم اس پر ایمان لے آتے کیونکہ تم جادو کے متوالے ہو۔ **شان نزول** تفسیر کبیر نے فرمایا۔ کہ علماء یہود کہا کرتے تھے۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تعجب ہے۔ کہ سلیمان کو نبی کہتے ہیں وہ تو صرف جادوگر تھے اُن کی تردید میں یہ آیت کریمہ اُتری تفسیر خزائن العرفان میں فرمایا۔ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد سے

حضور صلی اللہ علیہ السلام کے زمانۂ پاک تک یہ ہی مشہور رہا۔ کہ سلیمان علیہ السلام جادوگر تھے۔ جادو ہی کے زور سے انہوں نے اتنی بڑی سلطنت حاصل کر لی حق تعالیٰ نے یہود کی تردید اور حضرت سلیمان کی تائید کے لئے یہ آیت اتاری اِن دونوں قولوں کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔ اِن میں کچھ اختلاف نہیں **تفسیر وَاتَّبَعُوْا** یہ لفظ اتباعٌ سے بنا ہے۔ جسکے معنی ہیں کسی کے پیچھے چلنا یہاں پیروی کرنا مراد ہے۔ یا اس سے وہ یہود مراد ہیں۔ جو کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں موجود تھے کیونکہ یہ بھی جادو کے بہت دلدادہ تھے۔ یا اُن کے پچھلے لوگ یا عام یہودی کیونکہ یہ سب ہی حضرت سلیمان کی نبوّت کے منکر تھے۔ **مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ** ما سے مراد جادو کی کتابیں یا جادو کے منتر ہیں۔ تَتْلُوْا تلاوت سے بنا جس کا مادّہ تلوٌ ہے۔ اسکے معنی ہیں پیچھے ہونا یا پیچھے چھوڑنا۔ اسی لئے منطق میں شرط کی جزاء کو تالی کہتے ہیں۔ کہ وہ مقدم سے پیچھے ہوتی ہے۔ چونکہ پڑھنے والا بھی کتاب کی عبارت کو پیچھے چھوڑتا اور آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس لئے پڑھنے اور خبر دینے کو تلاوت کہا جاتا ہے۔ اگر اس کے بعد لام آئے تو سچی خبر دینے کے معنی ہوں گے۔ اور اگر علیٰ آوے تو جھوٹی خبر کے معنی تلوتُ لَہٗ اور تلوتُ علیہ چونکہ یہاں علیٰ آ رہا ہے۔ لہٰذا اس کے معنی جھوٹی خبر کے ہوئے (تفسیر کبیر) شیاطین سے یا تو خبیث جن مراد ہیں۔ جیسا کہ روایات میں ہے۔ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد شیطان شکل انسانی میں یہود کے پاس جا کر بولا کہ حضرت سلیمان کی سلطنت جادو کے زور سے تھی۔ آؤ میں تمہیں جادو کی کتابیں دکھاؤں یہ کہہ کر اُن کے تخت کے نیچے کی زمین کھدوائی اور وہاں سے جادو کی کتابیں نکلوائیں۔ اس کا پورا قصہ انشاء اللہ تفسیر میں آوے گا۔ اور یا خبیث انسان مراد ہیں۔ جیسا کہ روایت میں ہے۔ کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے علوم کتابوں میں جمع فرما کر اپنے تخت کے نیچے داب دیئے اُن کی وفات کے کچھ عرصہ بعد منافقین نے چپکے سے وہ کتب نکال کر اُن میں جادو شامل کر دیا اور لوگوں سے کہا کہ ان ہی علوم کی وجہ سے وہ اتنے بڑے بادشاہ بن گئے تھے (تفسیر کبیر) شیطان شَطْنٌ سے بنا جسکے معنی ہیں فساد اور فریب۔ بر فسادی اور فریبی کار لغۃً شیطان ہے۔ شریعت میں ابلیس کو شیطان کہتے ہیں۔ یہ تمام جنات کا باپ ہے۔ اسکی پیدائش آگ سے ہے خرپوتی شرح قصیدہ بردہ میں ہے۔ کہ شیطان کے ایک ران میں مذکّر کی علامت ہے اور دوسری میں مؤنث کی۔ خود اپنے سے جماع کرتا ہے۔ اور خود حاملہ ہوتا ہے۔ اور خود بچہ جنتا ہے۔ اسکے علاوہ انکی پیدائش کے بہت سے طریقے ہیں ہر انسان کے ساتھ ہی شیطان پیدا ہوتا ہے۔ جسے ہمزاد کہتے ہیں۔ اسی کو لوگ بھوت وغیرہ بھی کہا کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے۔ کہ اگر انسان جماع کے وقت بسم اللہ نہ پڑھے تو اُس جماع میں شیطان شریک ہو جاتا ہے۔ اور بچہ میں شیطانی صفات ہوتے ہیں **عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ** یا تو علیٰ فی کے معنی میں ہے اور ملک سے پہلے عہد پوشیدہ ہے یعنی یہود نے اُس جادو کی پیروی کی جو شیاطین سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کے زمانہ میں لوگوں کو بتاتے تھے یا معنی یہ ہیں۔ کہ حضرت سلیمان کی سلطنت میں شیاطین جادو سکھاتے تھے تفسیر کبیر نے اسکے بہت نفیس معنی یہ بھی کئے۔ کہ شیاطین حضرت سلیمان کی سلطنت پر بہتان باندھتے تھے۔ کہ یہ سب کچھ اس جادو کی وجہ سے ہوا۔ اب علیٰ اپنے ہی معنی میں رہا اور کسی لفظ کے پوشیدہ ماننے کی بھی ضرورت نہ رہی۔ ملک سلیمان سے یا اُن کی ظاہری بادشاہت مراد ہے۔ یا باطنی یا نبوت یا اُن کی وحی اور شریعت (تفسیر کبیر) رب تعالیٰ اُن کی برائت فرماتا ہے۔ کہ **وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ** حضرت سلیمان نے کبھی کفر نہ کیا۔ یعنی اکثر جادو میں کفر ہوتا ہے۔ یا اُس میں کفریہ شرائط پائی جاتی ہیں۔ یا عملاً کفر ہے یعنی جادو کرنا کفار کا کام ہے۔ اور چونکہ سلیمان علیہ السلام پیغمبر تھے۔ اس لئے وہ جادو کر سکتے ہی نہیں۔ جب جادو اور ایمان جمع نہیں ہو سکتے تو جادو اور نبوت میں کیونکر اجتماع ہوگا۔ بلکہ بات یہ ہے۔ **وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا** کہ دراصل انسانی یا جنّی شیطانوں نے کفر کیا۔ کہ **يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ** کہ لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں۔ یا تو یہ گذشتہ واقعہ کی حکایت حال سے کر دی گئی ہے۔ یعنی پہلے سکھاتے تھے۔ یا اب بھی سکھاتے ہیں سحر کے لفظی معنی ہیں چھپی چیز صبح صادق کو اسی لئے سحر کہتے ہیں۔ کہ وہ رات کی اندھیری میں کچھ چھپی ہوتی ہے سینہ کو بھی اسی لئے سحر کہا جاتا ہے۔ کہ وہ کرتے یا قمیص سے چھپا رہتا ہے حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ کہ حضور علیہ السلام کی وفات بَیْنَ سَحْرِیْ وَنَحْرِیْ یعنی

میرے سینے اور گلے کے درمیان ہوئی۔ جادو کو بھی اسی لئے سحر کہتے ہیں کہ اُس کا سبب چھپا ہوتا ہے شریعت میں سحر کے معنی ہیں خفیہ طور کسی چیز کو خلاف اصل ظاہر کرنا یہ بُرا بھی ہے۔ اور اچھا بھی کسی کو فریب دینے کیلئے یہ حرکت کرنا بُرا ہے۔ اپنے زور بیان سے غلط بات کو بھی ثابت کر دینا کمال ہے حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔ اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا بعض وعظ جادو ہوتے ہیں یعنی بعض واعظ اپنے زور بیان سے مشکل بات کو واضح ہیں۔ اور اُن کے کلام کا جادو کی طرح دلوں پر اثر ہوتا ہے۔ آیت میں بُرا جادو ہی مراد ہے۔ جادو کی قسمیں اور اُن کے احکام انشاءاللہ فوائد میں بیان ہوں گے **خلاصہ تفسیر** حضور علیہ السلام کے تشریف آوری سے پہلے شیاطین جنات آسمان پر جاتے اور فرشتوں کے کلام سنا کرتے تھے۔ جو آئندہ واقعات کی بابت آپس میں گفتگو کرتے ہوتے تھے۔ یہ گفتگو سن کر کاہنوں کو سناتے تھے۔ مگر اُس میں بہت جھوٹ ملا کر پھر وہ کاہن (پنڈت نجومی) لوگوں کو یہ خبریں پہنچاتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں چونکہ جنات سے عمارات بنوائے کنویں اور نہریں کھدوائے۔ عمدہ عمدہ حوض وقلعہ بنوانے کا کام لیا جاتا تھا۔ جس سے کہ شیاطین کا انسانوں سے خلط ملط رہتا تھا۔ چونکہ جنات کی طاقت انسان سے زیادہ ہے۔ اس لئے وہ انسانوں کو عجیب عجیب کرتب دکھا کر انہیں حیران کر دیتے تھے۔ انسان اُن سے پوچھتے کہ تم یہ عجیب کام کیسے کر لیتے ہو۔ تو وہ کہتے۔ کہ فلاں منتر فلاں ٹوٹکے کے ذریعہ سے وہ لوگ ان منتروں اور ٹوٹکوں کو جن میں صدہا کفریہ اور شرکیہ باتیں ہوتی تھیں سیکھ لیتے بلکہ لکھ لیتے۔ اور جب انسان بھی یہ منتر پڑھتے تو در پردہ شیطان کوئی عجیب کام کر دیتے جس سے انسانوں کو یقین ہو گیا۔ کہ یہ منتر بہت تاثیر والے ہیں۔ یہاں تک کہ ان منتروں کی کتابیں جلیا ہو گئیں ہوتے ہوتے سلیمان علیہ السلام کو خبر لگی آپ نے اپنے وزیر آصف ابن برخیا کو حکم دیا کہ شیطانوں کو جمع فرما کر انہیں انسانوں سے ملاقات کرنے سے روک دو۔ اور وہ تمام کتابیں جمع فرما کر صندوق میں بھر کر اپنے تخت کے نیچے دفن کرا دیں اور حکم دیا۔ کہ جو کوئی منتر پڑھا کریگا۔ سخت سزا پائیگا۔ آپ کی وفات کے کچھ عرصہ کے بعد شیطان یہود کے پاس انسانی شکل میں آیا۔ اور بولا۔ کہ تمہیں خبر ہے۔ کہ حضرت سلیمان کو اتنی بڑی بادشاہت کیونکر ملی۔ صرف اُس جادو سے ملی جس کی کتابیں اُن کے تخت کے نیچے جمع ہیں۔ اگر تم بھی ان کتابوں پر عمل کرو۔ تو اُن کی ہی طرح بادشاہ بن جاؤ گے۔ پھر کیا تھا۔ یہود دوڑے اور زمین کھود کر کتابوں کا صندوق نکالا اُن میں لکھے ہوئے جنتر منتروں پر عمل شروع کیا۔ چونکہ شیاطین چاہتے تھے۔ کہ انسان ہماری پوجا کریں۔ اُن منتروں میں بت پرستی کی شرائط تھیں شیاطین سے مدد مانگنے کے الفاظ جب یہود یہ منتر پڑھتے شیطان چپکے سے اُن کا کام کر دیتے رفتہ رفتہ تقریباً ساری قوم یہود نے توریت کو چھوڑ دیا۔ اور ان واہیات میں پھنس گئے اور اُن میں یہ مشہور ہو گیا۔ کہ سلیمان علیہ السلام بادشاہ نہ تھے صرف جادوگر حضور علیہ السلام کے زمانہ پاک تک یہی مشہور رہا۔ اس آیت نے اصلی بات بتائی اور حضرت سلیمان سے یہ اتہام دُور کیا۔ فرمایا۔ کہ اے بے دین یہود یو حضرت سلیمان پیغمبر ہیں۔ اور جادو یا تو خود کفر ہے یا اُس میں بُت پرستی جنات پر بھینٹ قربانی اُن کی نذر و نیاز وغیرہ کفریات کی شرطیں ہیں۔ یا یہ کفار کا کام ہے۔ اتنا بڑا پیغمبر کفر کیسے کر سکتا ہے انہوں کبھی بھی کفر نہ کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا کہ اُن کے زمانہ میں موقعہ پا کر لوگوں کو جادو سکھا دیا اور اُلٹا حضرت سلیمان علیہ السلام کو الزام لگا دیا وہ اس الزام سے بری ہیں اللہ کے مقبول پیغمبر ہیں۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** جادو کے دجد دراصل شیاطین ہیں۔ نہ حضرت سلیمان اور نہ ہاروت و ماروت جب جادو پھیل گیا۔ تو لوگوں کو بچانے کے لئے ہاروت و ماروت آئے جیسا کہ اگلی آیت میں معلوم ہوگا۔ اسی لئے قرآن کریم نے پہلے شیاطین کا ذکر فرمایا پھر ہاروت و ماروت کا اور ساتھ ہی فرما دیا۔ کہ ہاروت و ماروت اس سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ **دوسرا فائدہ** جادو اکثر کفر ہی ہوتا ہے۔ یا تو خود اُس میں کفریہ الفاظ ہوتے ہیں۔ یا کفریہ شرائط یا یہ کفار کا فن ہے اور کفر **تیسرا فائدہ** کفر سکھانا کفر ہے۔ جبکہ عمل کے لئے ہو۔ اگر بچنے کیلئے سکھایا تو کفر نہیں شیطانوں نے عمل کے لئے جادو سکھایا اور وہ کافر ہو گئے۔ ہاروت و ماروت نے بچنے کیلئے جادو سکھایا وہ کافر نہ ہوئے علماء کرام کفریہ الفاظ بچنے کے لئے بتلاتے اور کتب فقہ میں

لکھتے ہیں یہ بہت ثواب ہے۔ لیکن اگر یہی الفاظ عمل کے لئے سکھائے جاویں تو سیکھنے سکھانے والے دونوں کافر چوتھا فائدہ انبیاء کرام کفر اور گناہ کبیرہ سے معصوم ہوتے ہیں دیکھو حضرت سلیمان علیہ السلام کو لوگوں نے جادو گری کی تہمت لگائی۔ تو قرآن کریم نے اُنکی سخت تردید فرمادی۔ جو اُن کو جادوگر یا ایک منٹ کیلئے کافر مانے وہ خود بے دین ہے۔ پانچواں فائدہ حضور علیہ السلام کی ذات سے گذشتہ پیغمبروں کو بھی فائدے پہنچے حضور سے ہی حضرت عیسیٰ کی والدہ حضرت مریم کی پاکدامنی کے خطبے پڑھے گئے حضور سے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام سے جادو گری کا الزام دور ہوا۔ اور دنیا نے اُن کو پیغمبر مانا۔ اسی لئے انبیاء کرام حضور کی بشارتیں سناتے اور خوشیاں مناتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے۔ کہ اُن کے دم قدم سے ہماری بگڑی بنے گی۔ رب تعالیٰ حضور کے طفیل ہمارے عیب چھپالے اور ہماری بھی بگڑی بنائے۔ چھٹا فائدہ بعض جادو خود کفر ہیں۔ اور بعض میں کفریہ شرطیں ہیں۔ بعض کفر تو نہیں مگر حرام ہیں۔ اور بعض جادو حلال جادو خواہ کیسا ہی ہو مگر اُس کا سیکھنا کفر نہیں ہر علم سیکھنا اچھا ہے (تفسیر کبیر) ہاں عمل کے لئے سیکھنا کفر ہے۔ اگر بعض جادو سیکھنا یا سکھانا کفر ہوتا تو ہاروت وماروت معصوم فرشتے اُسکی تعلیم کیلئے رب کی طرف سے نہ آتے نیز اس آیت سے حضرت سلیمان کے جادو کرنیکی نفی ہے۔ نہ کہ ماننے کی حضرت خود جانتے تھے مگر کبھی کیا نہیں۔ اس کی تحقیق ہماری کتاب جاء الحق میں دیکھو۔ ساتواں فائدہ تفسیر کبیر و عزیزی نے جادو کی آٹھ قسمیں بتائیں اور ہر ایک کے علیحدہ علیحدہ احکام فرمائے[1] جادو کلدائیں یعنی بابل جادو یہ ہی جادو ہاروت وماروت سے نکلا ہے۔ یہ جادو تمام جادوں سے مشکل ہے اور اس سے عجیب عجیب کام ہوتے ہیں۔ اسکی حقیقت یہ ہے۔ کہ سارے اجسام میں ایک قدرتی روح ہے۔ چاند سورج تارے چاروں عناصر (پانی ہوا آگ مٹی) اس جادو میں تمام روح کو اپنے تابع کر لیا جاتا ہے جن سے جو چاہیں کام لیتے ہیں۔ اسی جادو کا بابل میں بہت زور تھا۔ اور اسی کی تردید کرنے حضرت ابراہیم علیہ السلام بھیجے گئے چونکہ اس قسم کا جادوگر عالم کی تمام چیزوں پر حکومت کرتا ہے۔ اسی لئے ابراہیم علیہ السلام کو رب نے سارے عالم کی چیزیں دکھادیں۔ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ تاکہ وہ ان تمام چیزوں کو ملاحظہ فرما کر معلوم فرمالیں۔ کہ سب رب کے حکم کے تابع ہیں۔ اور آپ نے سیر کرکے فرمایا اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اے قوم تم ان چاند سورج میں مستقل تاثیر مان بیٹھے ہو۔ تو ان کے خالق کو مانتا ہوں۔ نمرود کے زمانہ میں اس جادو سے بہت سی عجیب چیزیں بنائی گئیں تھیں حکایت نمرود[1] کے زمانہ میں تانبے کی ایک بطخ تھی جس وقت کوئی جاسوس یا چور اُس شہر میں آتا تو اُس بطخ سے آواز نکلتی جس سے وہ پکڑا جاتا۔ ایک[2] نقارہ تھا۔ کہ جب کسی کی کوئی چیز گم ہو جاتی اُس میں چوب مارتا نقارہ اُس چیز کا پتہ دیتا۔ ایک[3] آئینہ تھا جس سے غائب شخص کا حال معلوم ہوتا تھا۔ جب اُس آئینہ میں نظر کی وہ غائب آدمی اُس کا شہر اور قیام گاہ اُس میں نمودار ہوگئی نمرود[4] کے دروازے پر ایک درخت تھا جس کے سایہ میں درباری لوگ بیٹھتے تھے۔ جوں جوں آدمی بڑھتے جاتے اُس کا سایہ بھی پھیلتا جاتا تھا۔ ایک لاکھ آدمی تک سایہ پھیلتا رہتا تھا۔ اگر لاکھ سے ایک بھی زیادہ ہو جاتا سارے دھوپ میں آجاتے۔ ایک[5] حوض تھا جس سے مقدمات کا فیصلہ ہوتا تھا مدعی اور مدعی علیہ باری باری سے اُس میں گھستے جو سچا ہوتا اُس کے ناف کے نیچے پانی رہتا تھا۔ اور جو جھوٹا ہوتا اُس میں غوطہ کھاتا۔ اگر فوراً توبہ کر لیتا تو بچ جاتا ورنہ ہلاک ہو جاتا۔ اس قسم کی طلسمات پر اُس نے دعویٰ خدائی کر دیا تھا۔ جادو خالص کفر و شرک ہے۔ کیونکہ اس میں جادوگر تمام چیزوں کی روحوں کو مستقل مؤثر مانتا ہے۔ اور اُن کی قربانی نذر و نیاز استمداد وغیرہ کرتا ہے۔ دوسری[2] قسم یہ ہے۔ کہ جنات و شیاطین کو تابع کر لیا جاوے۔ اور ان سے حسب منشا کام لیا جاوے۔ اس کا اب بھی بہت رواج ہے۔ اور یہ آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ بھی صریح کفر ہے۔ کو اس میں بتوں کی پرستش اُن کے نام کی بھینٹ و قربانی وغیرہ کرنا ہوتی ہے۔ تیسری[3] قسم یہ ہے۔ کہ مردہ انسانوں کی روحوں کو منتر وغیرہ سے قبضہ میں کیا جاوے۔ اور اُس سے کام لئے جاویں۔ انکو عمل ہمزاد یا عمل بیر بھی کہتے ہیں یہ بھی کفر ہے۔ کہ اس میں شیاطین کی پرستش اور اُن سے استمداد وغیرہ ہوتی ہے۔ کہ ہمزاد کو ہمارے قابو میں کردو۔ اس قسم کا جادو شہوت پرستی اور غصہ وغیرہ میں کام آتا ہے۔ اس لئے عیاش جوگی وغیرہ اس کے عامل ہوتے ہیں

چوتھی قسم یہ ہے۔ کہ کسی ذریعہ انسان کے خیالات اور حواس خراب کر دیئے جاتے ہیں جس سے اُسکو کچھ کا کچھ نظر آنے لگتا ہے۔ اس کو نظر بندی کہتے ہیں۔ اسی جادو کا فرعون کے زمانہ میں بہت زور تھا قرآن کریم فرماتا ہے۔ یُخَیَّلُ اِلَیْہِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی وہ رسیوں کو سانپ کیطرح چلتا پھرتا دکھا دیتے تھے۔ آج بھی بعض بازیگر مٹی کا روپیہ بنا کر لوگوں کو دکھاتے ہیں۔ اور پھر پیسہ پیسہ بھیک مانگتے ہیں۔ اگر وہ مٹی واقعی روپیہ ہو جاتی تو یہ بھیک کیوں مانگتے اس قسم کا جادو کفر نہیں۔ ہاں اولیاء اللہ کے مقابلہ میں کیا جاوے تو گناہ کبیرہ ہے۔ انبیاء کے مقابلہ میں ہو تو کفر کہ مقابلہ نبی بھی کفر ہے۔ پانچویں قسم خیالی جادو ہے۔ کہ مطلوب کی صورت کو سامنے رکھ کر اُس پر نظر اور خیال خوب جمایا یہاں تک مقصد حاصل ہو گیا۔ اس کو مسمریزم بھی کہتے ہیں۔ کہ انسان کی نظر سے چیز کھچ آتی ہے اور معلق ہو جاتی ہے وغیرہ وغیرہ یہ جادو اگر حلال کام کے لئے کیا جاوے تو حلال ہے۔ اور حرام کے لئے ہو تو حرام چھٹی قسم نیرنج ہے جس میں بعض بعض دواؤں وغیرہ کے ذریعہ عجیب کام کئے جاتے ہیں مثلاً کوئی شخص اپنی اُنگلی پر پورا کابلی سرکہ میں ترکر کے سمندر جھاگ میں ملا کر مالش کرے تو اُنگلیاں آگ میں نہ جلینگی وغیرہ وغیرہ بعض گھڑیوں کے حروف رات میں چمکتے ہیں۔ ان میں بھی کوئی مصالحہ ہی ہوتا ہے۔ ساتویں قسم سحر حیل ہے جس میں سائنس آلات کے ذریعہ عجیب کام ہوتے ہیں۔ جیسے ریڈیو فونوگراف وغیرہ آٹھویں قسم شعبدہ ہے جس کو ہاتھ کی صفائی بھی کہتے ہیں۔ اس میں اس چالاکی سے چیز بدلی جاتی ہے۔ کہ دیکھنے والوں کو اُس کا پتہ نہیں چلتا۔ اور وہ سمجھتے ہیں۔ کہ اس نے یہ چیز ہی بدل دی یہ تینوں قسمیں نہ کفر ہیں نہ حرام۔ صوفیاء عظام نے آیات قرآنیہ اور اعمال جائز اور اسماء الہیہ سے وہ وہ عجیب باتیں دکھائی جن سے ساحر بھی حیران رہ گئے۔ **مسئلہ** تعویذ لکھ کر گلے میں ڈالنا نظر بد وغیرہ کے لئے جائز اور دعائیں پڑھنا جائز ہیں۔ خود حضور علیہ السلام نے ایسی دعاؤں کی تعلیم دی اور صحابہ کرام نے عمل کئے **مسئلہ** جس دعا یا منتر کے معنی کی خبر نہ ہو اُن سے پرہیز چاہیئے۔ ممکن ہے۔ کہ ان میں کفریہ الفاظ ہوں۔ **مسئلہ** کفریہ الفاظ سے منتر کرنا نجاست سے آیات قرآنیہ لکھنا (جیسے کہ خون یا پیشاب وغیرہ) اُلٹی آیات پڑھنا یا لکھنا حرام ہیں۔ اس سے بچنا ضروری ہے۔

**پہلا اعتراض** سحر وغیرہ خلاف عقل ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ انسانی الفاظ یا آوازیں ایسی عجیب تاثیریں ہوں یہ لوگوں کے وہم ہیں۔ (نیچری) **جواب** الفاظ اور آوازیں بہت تاثیریں ہیں۔ گالی سے رنج صدمہ کی خبر سے موت خوشی کی خبر سے فرحت حاصل ہوتی ہے یہ الفاظ ہی تو ہیں۔ فوجی حاکم کی سیٹی (بگل) سے فوج کا حملہ اور گارڈ کی سیٹی سے گاڑی کی روانگی ہو جاتی ہے جس ساحر کے قبضہ میں جنات ہوں وہ اس کا اشارہ پا کر کچھ حرکات کر ڈالتے ہوں تو کیا تعجب ہے۔ سانپ کی پھونک میں زہر بیچھو کی پھونک میں تریاق ہے۔ لیسے قرآن خواں کی پھونک میں شفا اور جادوگر کی پھونک میں بیماری ہونا کوئی مشکل نہیں **دوسرا اعتراض** رب تعالیٰ نے ایسی نقصان دہ چیزیں پیدا ہی کیوں فرمائیں۔ **جواب**۔ دنیا کا انتظام مضر اور مفید چیزوں سے ہی قائم ہے۔ اُس نے سانپ بچھو وغیرہ زہریلے جانور کیوں پیدا کئے۔ آپ کو کیوں پیدا کیا آپ کی ذات سے بجز زمین گندا کرنے کے اور کیا حاصل ہے **تیسرا اعتراض** حضرت سلیمان علیہ السلام نے وہ جادو کی کتابیں دفن کیوں کرائیں جلوا کیوں نہ دیں۔ تاکہ یہ چیز مٹ جاتی **جواب**۔ وہ رب کی مرضی سے واقف تھے اُن کا ہر کام اُدھر کے اشارے پر ہوا۔ یہ ایسا ہی سوال ہے۔ کہ کہا جاوے۔ کہ انہوں نے سانپ وغیرہ مروا کیوں نہ دیئے۔ شیاطین کو زندہ ہی کیوں چھوڑا خود رب نے شیطان کو ہلاک ہی کیوں نہ کیا۔ اُس کو قیامت تک مہلت کیوں دیدی۔ تفسیر صوفیانہ پوری آیت کے بعد بیان ہوگی۔

# وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَیْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ

| اور وہ جو اُتارا گیا | اوپر | دو فرشتوں کے | بیچ بابل کے | ہاروت | اور | ماروت | اور نہیں سکھاتے | کسی کو |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|

اور وہ جادو جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اُترا اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہ سکھاتے

حَتّٰی یَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَۃٌ فَلَا تَکْفُرْ فَیَتَعَلَّمُوْنَ مِنْھُمَا مَا یُفَرِّقُوْنَ بِہٖ بَیْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِہٖ

یہاں تک کہ کہتے ہیں بجز اسکے نہیں کہ ہم آزمائش ہیں پس نہ کفر کر تو پس سیکھتے ہیں وہ وہ جو جدائی ڈالیں ساتھ اُسکے درمیان مرد اور بیوی اُسکی کے

جب تک یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو نری آزمائش ہیں تو اپنا ایمان نہ کھو تو ان سے سیکھتے وہ جس سے جدائی ڈالیں مرد اور اُسکی عورت میں

**تعلق**. یہ جملہ پچھلے جملہ کا تتمہ ہے. پہلے مطلق سحر کا ذکر ہوا. اب خاص کا ذکر ہو رہا ہے پہلے بتایا گیا تھا. کہ شیاطین سے سحر حاصل کیا گیا اب بتایا جا رہا ہے. کہ فرشتوں سے بھی حاصل کیا گیا. **تفسیر** وَمَآ اُنْزِلَ یہ مَا موصولہ ہے. اسکا عطف یا تو سحر پر ہے یا وَاتَّبَعُوْا مَا کے مَا پر یعنی سکھاتے ہیں شیاطین جادو اور وہ چیز جو ہاروت و ماروت پر آتاری گئی یا پیروی کی یہودنے شیطانوں کے بتائے جادو کی اور اُس کی جو ہاروت ماروت پر اُتاری گئی. یا مُلک سلیمان پر عطف ہے. یعنی شیاطین نے حضرت سلیمان پر بھی تہمت باندھی اور ہاروت و ماروت کے اُتارے ہوئے پر بھی نہ تو سلیمان علیہ السلام نے جادو کیا اور نہ ہاروت و ماروت نے بعض نے فرمایا. کہ یہ مَا نافیہ ہے. اور اس کا عطف مَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ کے مَا پر ہے. یعنی نہ تو حضرت سلیمان نے کفر کیا اور نہ ہاروت و ماروت پر کچھ اُترا. اس مَا نے اس سارے جملہ کی نفی کر دی. ان آخر کی دو صورتوں میں ہاروت و ماروت کے قصّہ کی بالکل نفی ہی ہو جاویگی مگر پہلے دو معنی زیادہ صحیح ہیں کیونکہ احادیث سے پتہ چلتا ہے. کہ ہاروت و ماروت کا واقعہ بالکل صحیح ہے. اور ان ہی پہلے معنی میں آیت کی عبارت بھی بے جوڑ نہیں ہوتی اُنْزِلَ اُلْھِمَ یا عُلِّمَ کے معنی میں ہے. کہ یعنی وہ جادو جو ہاروت ماروت کو سکھایا گیا. یا اُن کو الہام کیا گیا. کیونکہ جادو بذریعہ وحی نہیں آیا بلکہ قدرتی طور پر اُن کے دل پر ڈالا گیا عَلَی الْمَلَکَیْنِ مشہور قرأت ہے. ملکین لام کے زبر سے یعنی دو فرشتوں پر اور ایک قرأت میں مَلِکَیْنِ ہے. لام کے کسرہ سے یعنی دو بادشاہوں پر تفسیر حقانی وغیرہ نے کہا کہ ہاروت و ماروت دو نیک سیرت فرشتہ صفت بادشاہ تھے. لہٰذا ملکین کی قرأت میں اُن کی صفت مراد ہے. اور ملکین کی قرأت میں اُن کی ذات مگر صحیح یہ ہے. کہ یہ دونوں فرشتہ ہی تھے مگر چونکہ اپنی عبادت و ریاضت کی وجہ سے فرشتوں کے سردار تھے. اس لئے بعض قرأتوں میں ملکین (یعنی فرشتوں کی جماعت کے بادشاہ) آیا جیسے بعض ملائکہ کو مَلَکُ الْجِبَال وغیرہ کہا جاتا ہے. یعنی جادو اُتارا گیا. دو اُن فرشتوں پر جو دیگر فرشتوں کے بادشاہ ہیں. لہٰذا دونوں قرأتیں مطابق ہو گئیں. ان دونوں کا فرشتہ ہونا صحیح احادیث سے ثابت ہے. اور ملکین کی قرأت بھی متواتر ہے محض عقلی دلائل سے احادیث کو رد نہیں کیا جا سکتا اور متواتر قرأت کی مخالفت نہیں ہو سکتی. نیز ایک شہر بابل میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے. اگر یہ بادشاہ ہوتے تو دو ملکوں میں رہتے. بِبَابِلَ یا تو یہ اُنْزِلَ کے متعلق ہے. یا پوشیدہ لفظ موجودین کے یعنی جادو دو فرشتوں پر بابل میں اُتارا گیا. یا اُن دو فرشتوں پر اُتارا گیا جو کہ بابل میں اب موجود ہیں. دوسرے معنی کی احادیث سے تائید ہوتی ہے. نیز وہ دونوں جادو جانتے ہوئے آسمان سے اُترے تھے. بابل میں نہیں سیکھا. بابل کوفہ اور عراق کا ایک بڑا شہر ہے. غالب یہ ہے. کہ یہاں کوفہ کا بابل مراد ہو اُس کو بابل اس لئے کہتے ہیں. کہ حضرت نوح علیہ السلام کشتی سے اُتر کر پہلے اسی جگہ پہونچے اور یہ ہی شہر بنایا اس کا نام ثمانین رکھا رب کی شان کہ ایک دن میں یہاں اَسّی زبانیں جاری ہو گئیں کسی کی عربی کسی کی فارسی وغیرہ تو آپ نے فرمایا قَدْ تَبَلْبَلَتْ اَلْسِنَتُھُمْ انکی زبانیں مختلف ہو گئیں بلبلہ کے معنی ہیں. مختلف ہونا تب سے اس شہر کا نام بابل ہوا یعنی اختلاف کی جگہ (تفسیر روح البیان) ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ یہ ملکین کا بیان ہے. یعنی وہ دو فرشتہ ہاروت و ماروت ہیں. وَمَا یُعَلِّمَانِ مِنْ اَحَدٍ اس میں اُن کے طریقہ تعلیم کا ذکر ہے. کہ وہ فرشتے شیاطین کی طرح جادو کی رغبت نہیں دیتے کسی سے جادو نہیں کہلاتے. بلکہ جو خود بخود اُن سے سیکھنے جاوے تو اُسکو بھی فوراً نہیں سکھا دیتے بلکہ حَتّٰی یَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَۃٌ اُس سے کہدیتے ہیں. کہ ہم رب کی طرف سے بندوں کیلئے آزمائش ہیں. کہ ظاہر ہو جاوے کون سحر سے بچتا ہے اور کون اس کو اختیار کرتا ہے. خیال رہے. کہ اس جگہ اِنَّمَا حصر اضافی کیلئے ہے یعنی ہمارا سکھانا جواز کی علامت نہیں

ہم جائز کرنیوالے نہیں بلکہ صرف ذریعہ آزمائش ہیں فتنہ کے لفظی معنی ہیں جانچ یا پڑتال عرب کہتے ہیں فَتَنْتُ الذَّهَبَ عَلَى النَّارِ میں نے سونے کو آگ پر آزمایا یعنی گلا کر معلوم کیا۔ کہ کھرا ہے یا کھوٹا فَلَا تَكْفُرْ لہٰذا تُو اس کو حق جان کر یا اس پر عمل کرکے یا اس کے شرائط ادا کرکے کفر اختیار نہ کر ہماری ان قیدوں کا فائدہ آئندہ معلوم ہوگا۔ اگر وہ جاننے والا یہ سنکر باز رہ جاوے تو نہیں بتاتے ورنہ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا لوگ ان دونوں سے وہ جادو سیکھ لیتے ہیں یہ ف جزائیہ ہے جس کی شرط پوشیدہ ہے یعنی اگر یہ لوگ اُن کی نصیحت نہیں مانتے تو اُن سے سیکھ لیتے ہیں مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وہ بُری تاثیر جادو کہ جس سے عورت و مرد میں جدائی ڈالدیتے ہیں۔ یا تو اُن میں دشمنی اور عداوت ڈال کر یا مرد کو عورت کے قابل نہیں رکھتے جس سے وہ اپنی بیوی سے علیٰحدہ رہتا ہے یعنی اُس میں قوت مردمی تو باقی رہتی ہے مگر اس جادو کے اثر سے عورت پر قابو نہیں پاتا دوسری پر قادر ہو جاتا ہے۔ **جادو کے علاج** جو شخص جادو کے باعث عورت پر قادر نہ ہو۔ وہ بانس کی آگ میں جوڑ والا بسولا گرم کرے۔ یہاں تک کہ وہ سرخ ہو جاوے پھر آگ سے نکال کر اُس پر پیشاب کرے (روح البیان) یہ بہت مجرب عمل ہے۔[2] شامی نے باب العنین میں فرمایا۔ کہ ایسے شخص کو چاہیئے۔ کہ بیری کے سات سبز پتے پیس کر پانی میں گھول لے۔ وہ پانی کچھ تو پی لے اور باقی پانی سے غسل کرے۔[3] جو شخص روزانہ صبح کو سات عجوہ چھوارے کھالیا کرے اُس پر جادو اثر نہ کریگا۔[4] جو شخص روزانہ صبح و شام آیت الکرسی پڑھ کر ہاتھوں پر دم کرے اور سارے جسم پر ہاتھ پھیرے وہ بھی انشاء اللہ جادو سے محفوظ رہے گا۔ جو شخص روزانہ ۱۵ شعبان کی رات یعنی شب برات کو بعد مغرب غسل کرے۔ انشاء اللہ سال بھر تک جادو سے محفوظ رہے۔[5] جس شخص کو جادو ہو گیا ہو۔ وہ دریا کی بیچ دھار کے پانی سے گھڑا بھر لائے اور اُس پر سورۂ فلق اور سورۂ ناس ۱۱-۱۱ بار پڑھ کر دم کرکے اُس سے غسل کرے انشاء اللہ صحت ہوگی مگر یہ پانی بہنے نہ دے۔ بلکہ کسی گڈھے میں کھڑے ہو کر غسل کرے جس سے پانی وہاں ہی جمع ہو جاوے بعد میں دفن کر دے **خلاصہ تفسیر** ان یہود نے اللہ کی کتابیں چھوڑدیں اور شیاطین کے سکھائے ہوئے جادو پر عمل کیا اور جو ہاروت و ماروت فرشتوں سے سیکھا اُس کے پیچھے لگ گئے حالانکہ یہ فرشتے جادو سکھانے میں اتنی احتیاط کرتے ہیں۔ کہ کسی کو فوراً نہیں بتادیتے بلکہ اولاً اُس کو منع کرتے کہ ہم رب کی طرف سے آزمائش ہیں۔ تو جادو سیکھ کر کفر نہ کر جب وہ باز نہیں آتا۔ تب کہیں تعلیم دیتے ہیں۔ انکو چاہیئے تھا۔ کہ اس نصیحت سے ہی سبق لے لیتے۔ اور اس کام میں مشغول نہ ہوتے۔ اور پھر جادو سے کرتے بھی کیا ہیں۔ ایذا رسانی تکلیف پہنچانی زوجین کو آپس سے جدا کرنا یا مرد کو عورت کے قابل نہ رکھنا یہ سب باتیں محض ضرر ہیں۔ **ہاروت و ماروت کا قصہ** تفسیر عزیزی وغیرہ نے بحوالہ ابن جریر و ابن ابی حاتم اور حاکم و دیگر تفاسیر حضرت ابن عباس و علی مرتضےٰ و عبداللہ ابن عمر و مجاہد رضی اللہ عنہم اجمعین سے بیان کیا۔ کہ حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانہ میں انسان بہت بدعمل ہو گئے۔ فرشتوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ مولیٰ انسان بہت بدکار ہے۔ رب کا ارشاد ہوا کہ اُس کو غصہ اور شہوت دیا گیا ہے جس سے گناہ زیادہ کرتا ہے۔ اگر یہ چیزیں تم کو ملیں تو تم بھی گناہ کرنے لگو فرشتے بولے کہ مولیٰ کریم ہم تو گناہ کے پاس بھی نہ جاویں گے۔ خواہ کتنا ہی غصہ و شہوت ہو۔ حکم ربی ہوا کہ اچھا تم اپنی جماعت میں سے اعلیٰ درجہ کے پرہیزگار فرشتے چھانٹ لو۔ اُن کو یہ غصہ شہوت عطا کرتے ہیں پھر امتحان ہو جاویگا چنانچہ ہاروت و ماروت جو کہ بڑے ہی عبادت گذار فرشتے تھے۔ انتخاب میں آگئے حق تعالیٰ نے اُن کو یہ چیزیں یعنی غصہ اور شہوت دیکر شہر بابل اُتار دیا اور فرمایا۔ کہ تم قاضی بن کر لوگوں کا فیصلہ کیا کرو اور روزانہ اسم اعظم کے ذریعہ شام کو آسمان پر آجایا کرو۔ یہ دونوں ایک مہینہ تک ایسے ہی آتے جاتے رہے۔ اتنے عرصہ میں ان کے عدل و انصاف کا عام چرچہ ہو گیا۔ اور بہت مقدمہ ان کے پاس آنے لگے۔ ایک روز نہایت حسین و جمیل عورت نے جسکا نام زہرہ تھا یہ ملک فارس کی رہنے والی تھی۔ حضرت علی کی روایت میں ہے۔ کہ اس کا نام بیدخت تھا زہرہ لقب تھا۔ اپنے خاوند کے خلاف مقدمہ دائر کیا یہ دونوں اُسے دیکھتے ہی عاشق زار ہو گئے۔ اور اُس سے بُرے کام کی خواہش کی اُس نے کہا کہ میرا دین اور تمہارا دین کچھ اور اختلاف مذہب ہوتے ہوئے

یہ نہیں ہو سکتا نیز میرا شوہر بہت غیرت مند ہے۔ اگر اُسے خبر لگ گئی تو مجھے قتل کر دیگا۔ لہٰذا پہلے تو آپ میرے بُت کو سجدہ کرو اور پھر میرے شوہر کو قتل پھر میں تمہاری اور تم میرے۔ اُنہوں نے انکار کیا وہ چلی گئی۔ مگر اِن کے دل میں اُس کے عشق کی آگ بھڑک گئی آخر اُسے پیغام بھیجا کہ ہم تیرے گھر آنا چاہتے ہیں۔ وہ بولی کہ سر اور آنکھوں پر یہ دونوں اُس کے گھر پہونچے اُس نے اپنے کو نہایت آراستہ کیا اور اُن سے بولی کہ یا تو آپ لوگ مجھے اسم اعظم سکھا دیں یا بت کو سجدہ کریں یا شوہر کو قتل کریں یا شراب پی لیں انہوں نے سوچا کہ اسم اعظم اسرار الٰہی ہے اس کو ظاہر کرنا بہت ظلم ہے بت پرستی کرنا شرک ہے اور قتل حق العباد ولاؤ شراب پی لیں چنانچہ شراب پی لی جب شراب پی کر مست ہو گئے تو اُس نے ان سے بت کو سجدہ بھی کرا لیا اپنے شوہر کو قتل بھی اور اسم اعظم پوچھ لیا وہ تو اسم اعظم پڑھ کر صورت بدل کر آسمان پر پہنچ گئی حقتعالیٰ نے اُسکی روح کو زہرہ ستارہ سے منتقل کیا اور شکل اُسکی زہرہ کی ستارے کی طرح ہو گئی۔ جب انکا نشہ اُترا تو یہ اسم اعظم بھول چکے تھے اور اپنے کئے پر نادم شرمندہ تھے حقتعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ انسان میری تجلی سے دور رہتا ہے یہ دو نوں روزانہ شام کو حاضر بارگاہ ہوتے تھے پھر بھی شہوت سے مغلوب ہو کر اگر انسانوں سے گناہ سرزد ہوں تو کیا تعجب ہے۔ تمام فرشتوں نے اپنی خطا کا اقرار کیا اور زمین والوں پر بجائے لعن طعن کرنے کے اُن کیلئے دعائے مغفرت کرنے لگی۔ قرآن فرماتا ہے۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ۔ پھر یہ دونوں حضرت ادریس علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہو کر شفاعت کے طالب ہوئے اپنے ان کے حق میں دعاء مغفرت کی بہت روز کے بعد حکم الٰہی آیا کہ ان کو اختیار دیجئے کہ یا تو دنیا کی عذاب قبول کریں یا آخرت کا حضرت ادریس نے انہیں پیغام الٰہی پہونچایا انہوں نے عرض کیا۔ کہ یا نبی اللہ دنیا کا عذاب فانی اور آخرت کا ابد الآباد تک باقی ہے ہم کو دنیاوی عذاب منظور ہے چنانچہ حق تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم فرمایا۔ کہ ان دونوں کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر بابل کے کنوئیں میں اوندھا لٹکا دیں۔ اس کنوئیں میں آگ بھڑک رہی ہے۔ اور یہ لٹکے ہوئے ہیں۔ اور فرشتے باری باری سے ہر وقت انکو کوڑے مارتے ہیں سخت پیاس سے انکی زبانیں باہر لٹکی ہوئی ہیں۔ یہ قصہ مسند بیہقی مسند امام احمد و دیگر کتب احادیث میں یہ اسناد صحیح مروی ہے۔ اور بعض لوگوں نے ہاروت و ماروت کو اس حالت میں دیکھا بھی ہے۔ چنانچہ **حکایت** حاکم نے اپنی مسند میں اور بیہقی نے اپنی سنن میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی۔ کہ آپ فرماتے ہیں۔ کہ حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد میرے پاس دومۃ الجندل کی ایک عورت آئی جو کہ حضور علیہ السلام کو تلاش کرتی تھی۔ میں نے کہا۔ کہ سرکار کی وفات ہو چکی۔ تو مجھ سے کہہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ وہ بولی کہ میں اپنے شوہر کی سختیوں سے تنگ آگئی۔ میں نے ایک عورت سے اپنی مصیبت بیان کی اُس نے مجھے ایک کتے پر سوار کرکے آن کی آن میں بابل پہونچا دیا۔ میں نے وہاں ایک کنوئیں میں ہاروت و ماروت کو لٹکا ہوا دیکھا۔ انہوں نے مجھ سے آنے کا بہت پوچھا میں نے اپنا سارا دکھ سنا کر اُن سے جادو سیکھنے کی خواہش کی تاکہ میرا شوہر میرے قبضہ میں ہو جاوے۔ اوّلاً انہوں نے بہت سمجھایا کہ یہ کفر ہے۔ نہ سیکھ مگر میں نہ مانی تو لاچار انہوں نے مجھ کو فرمایا۔ کہ اُس تنور میں پیشاب کر کے آ۔ میں نے جب اُس میں پیشاب کیا تو دیکھا۔ کہ ایک نورانی سوار میرے بدن سے نکلا اور آسمان کی طرف اُڑ کر غائب ہو گیا۔ میں نے اُن سے آکر یہ ماجرا بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ یہ تیرا ایمان تھا جو تجھ سے چھن چکا۔ اب جا تو جادو میں خوب ماہر ہو گئی۔ جب سے میں فن جادو میں بہت اُستاد ہوں۔ گیہوں کا دانہ زمین میں داب کر اُس کو حکم کرتی ہوں۔ تو وہ اُگ آتا ہے اور فوراً اُس میں خوشہ لگ جاتا ہے۔ پھر فوراً خشک ہو جاتا ہے۔ اور میرے کہنے سے فوراً آٹا بن کر روٹی ہو جاتا ہے۔ مگر میں اپنے دل میں ایمان جانے پر شرمندہ ہوں میں پوچھنے آئی تھی۔ کہ کیا میری توبہ اب قبول ہو سکتی ہے میں نے کہا۔ کہ تو حضور کے صحابہ کرام سے مل تو اُن کی خدمت میں حاضر ہوئی کسی نے اُس کے ایمان کی امید نہ دلائی۔ ہاں حضرت عبد اللہ ابن عباس نے فرمایا۔ کہ تیری ماں یا باپ ہوں تو اُن کی خدمت کر اُن کی دعا سے تیرا ایمان واپس ہوگا (تفسیر کبیر وعزیزی) اسی طرح ابن منذر نے اوزاعی سے نقل کیا۔ کہ ہارون ابن رباب فرماتے ہیں۔ کہ میں عبد الملک ابن مروان بادشاہ کے دربار میں بیٹھا تھا۔ کہ اُن کے پاس ایک شخص آیا جو کہ کسی جادوگر کا بیٹا تھا۔ اُس نے بھی اپنا قصہ اسی طرح بیان کیا۔ کہ میں جادو کے شوق میں ہاروت و ماروت کے پاس پہونچا۔ مگر اُن کے سمجھانے بجھانے پر بغیر جادو سیکھے واپس آیا۔ ان روایات سے معلوم ہوا۔ کہ ہاروت و ماروت ابھی چاہ بابل میں لٹکے ہوئے ہیں۔ اور جو وہاں پہنچ جائے اُس کو جادو سکھاتے ہیں۔ **فائدے** اس آیت اور تفسیر

سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** کوئی شخص اپنے زہد و تقویٰ عبادت و ریاضت پر بھروسہ نہ کرے رب کا فضل طلب کرتا رہے دیکھو معصوم فرشتے بھی غصہ اور شہوت سے گناہ کر بیٹھے مولانا فرماتے ہیں۔

ہمچو ہاروت ہمچو ماروت شہیر — از بطر خوردند زہر آلودہ تیر
اعتمادی بود شاں بر قدس خویش — چیست بر شیر اعتماد گاؤمیش
گرچہ او باشاخ صد چارہ کند — شاخ ساخش شیر نر پارہ کند

یعنی ہاروت و ماروت جیسے مقدس فرشتے اپنی تقدیس پر اعتماد کر کے گھائل ہو گئے۔ بیل شیر کے مقابل اپنے سینگ وغیرہ پر اعتماد نہیں کر سکتا **دوسرا فائدہ** علم سحر بھی خدائی علموں میں سے ایک علم ہے جس کا بقا خدا کو منظور ہے (تفسیر عزیزی) اسی لئے اسکی تعلیم بذریعہ فرشتہ کرائی **تیسرا فائدہ** ہاروت و ماروت کا جادو کفر ہی ہے۔ یعنی اس میں شرکیہ الفاظ و کفریہ شرائط ہیں **چوتھا فائدہ** کفر سیکھنا سکھانا کفر نہیں بلکہ اس کو ماننا یا اس پر عمل کرنا کفر ہے دیکھو فرشتے سحر سکھاتے ہیں۔ جو کہ کفر ہے۔ مگر کافر نہیں اور سیکھنے والا بھی اگر فقط علم حاصل کرنے کیلئے سیکھے تو وہ کافر نہیں۔ اسی لئے وہ پہلے فرما دیتے ہیں۔ کہ لَا تَكْفُرْ تو اسکو سیکھ کر کفر نہ کرنا یعنی اس پر اعتقاد یا عمل نہ کرنا۔ **مسئلہ** جو سحر کفر ہے۔ اس کا عامل مرتد ہے۔ اگر مرد ہے۔ تو قتل کیا جاوے۔ اگر عورت ہے۔ تو قید کی جاویگی۔ **مسئلہ** جو سحر کفر نہیں مگر اس سے جانیں ہلاک کی جاتی ہیں۔ اس کا عامل ڈاکو کے حکم میں ہے۔ کہ اسکو گرفتار کر کے قتل کیا جاوے۔ اور اگر گرفتاری سے پہلے توبہ کر کے نیک صالح بن جاوے اور جادو چھوڑ دے تو معاف کیا جاویگا۔ **مسئلہ** جادوگر کی توبہ قبول ہے۔ **مسئلہ** کسی کو تکلیف پہونچانے یا حرام غرض سے جادو کرنا یا کفر ہے یا حرام مگر جادو سے بچنے یا اس کو باطل کرنے کیلئے جادو کرنا جائز ہے۔ بشرطیکہ اس میں کلمات کفریہ نہ ہوں۔

**قصہ ہاروت و ماروت پر اعتراضات و جوابات**۔ اس قصہ پر لوگوں نے بہت بڑے بڑے اعتراضات پیش آئے ہیں۔ یہاں تک حضرت امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے قصہ زہرہ وغیرہ کا انکار کیا اور فرمایا۔ کہ یہ احادیث اصول اسلام کے خلاف ہیں۔ لہٰذا قابل قبول نہیں بعض مفسرین نے ہاروت و ماروت کے فرشتہ ہونے ہی کا انکار کر دیا۔ مگر یہ حق ہے۔ کہ یہ تمام واقعہ بالکل صحیح ہے عقلی دلائل سے احادیث کا رد نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ ضروری ہے۔ کہ شبہات دور کئے جاویں ورنہ بظاہر حضرت یوسف و حضرت داؤد کا قصہ بھی خلاف اسلام معلوم ہوتا ہے۔ تو جیسے ان قصوں سے اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں۔ اسی طرح اس سے بھی اٹھائے جاویں۔ اب ہم ان مفسرین وغیرہم کے سوالات معہ جوابات عرض کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر جوابات تفسیر عزیزی سے حاصل ہوئے اور بعض ہمارے اپنے ہیں۔ رب تعالیٰ قبول فرماوے آمین **پہلا اعتراض**۔ رب نے جادو کی تعلیم کیوں دلائی۔ اس میں حکمت کیا ہے۔ خراب چیز کا روکنا ضروری ہے نہ کہ شائع کرنا **جواب** اسوقت بابل میں پہلے ہی سے جادو کا بہت چرچا تھا۔ جہلا جادو اور معجزے میں فرق نہ کر سکتے تھے۔ انبیاء و جادوگر کو یکساں سمجھتے تھے۔ رب تعالیٰ نے دو فرشتے بھیج کر جادو دکھا کر اس میں اور معجزے میں فرق کر دکھایا۔ جیسے کہ فقہاء کرام کفریہ الفاظ بتا کر مسلمانوں کو ان سے بچنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ اسی طرح ہاروت و ماروت نے کیا۔ **دوسرا اعتراض** یہ کام انبیاء سے ہی کیوں نہ لیا وہ ہی جادو بھی بتا کر فرق کر دکھاتے **جواب**۔ وجہ یہ ہے۔ کہ خود ان انبیاء کو ہی تو جادوگروں سے جدا کرنا منظور تھا وہ گویا اس معاملہ میں ایک فریق تھے۔ لہٰذا چاہئے تھا۔ کہ حکم اور پنچ کوئی اور ہو۔ نیز اس سکھلانے کیلئے الفاظ کفریہ جو جادو میں ہوتے ہیں۔ انبیاء کو بولنا پڑتے اور یہ انکی شان نبوت کے خلاف تھا کیونکہ وہ احکام شرعیہ کی تبلیغ کیلئے آتے ہیں۔ اور یہ الفاظ شرعاً کفریہ ہیں۔ مگر فرشتے خیر و شر ہر کام کرتے ہیں ظالم کی پرورش موذی جانوروں کی تربیت وغیرہ ان سے ہی کرائی جاتی ہے۔ لہٰذا اس کیلئے بھی وہ ہی موزوں تھے نیز تعلیم سحر اشاعت جادو کا ذریعہ بھی تھی رب کو منظور نہ ہوا۔ کہ یہ اشاعت حضرات انبیاء کرام کی طرف منسوب ہو کیوں کہ ان سے شرعی احکام کا کام لیا جاتا ہے۔ اسی لئے حضرات انبیاء نے

فلسفہ سائنس منطق وغیرہ کی تعلیم نہ دی ہاں ان حضرات نے جادو کے اجمالاً احکام بتا دیئے۔ کہ حرام ہے یہ نہ بتایا کہ جادو ایسے کرتے ہیں۔ یہ اُن فرشتوں نے بتایا **تیسرا اعتراض** شیاطین نے جادو سکھایا تو وہ تو کافر ہوئے اور ہاروت و ماروت فرشتوں نے سکھایا تو وہ کافر کیوں نہ ہوئے **جواب** شیطان نے عمل کرنے کیلئے رغبت دیتے ہوئے سکھایا۔ اور انہوں نے بچنے کیلئے ہدایت کرتے ہوئے سکھایا۔ ایک شخص کسی کو کافر بنانے کیلئے الفاظ کفریہ سکھائے وہ کافر ہے عالم دین بچنے کیلئے وہی الفاظ بتا دیں وہ مومن **چوتھا اعتراض** اس قصہ سے معلوم ہوا کہ فرشتوں نے رب تعالیٰ کا مقابلہ کیا۔ کہ اس نے فرمایا کہ تم بھی غصہ و شہوت پاکر گناہ کر بیٹھو گے۔ انہوں نے کہا کہ ہرگز نہیں اور رب کا مقابلہ کفر ہے۔ اور ملائکہ معصوم **جواب** یہ مقابلہ نہیں بلکہ اپنے اطاعت اور نیازمندی کا اظہار ہے۔ اور اپنے مصمم ارادہ کا تذکرہ کہ مولیٰ ہم نے تیری اطاعت اور فرمانبرداری کا پورا ارادہ کر لیا ہے کہ بڑی مصیبت میں نافرمانی نہ کریں گے جیسے کوئی وفادار نوکر اپنے آقا سے اپنی مضبوطی ارادہ ظاہر کرے۔ **پانچواں اعتراض** فرشتے معصوم ہیں۔ رب فرماتا ہے لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ پھر ہاروت و ماروت یہ تین سخت گناہ کیوں کر بیٹھے یہ تو قرآن کے خلاف ہے **جواب** جب یہ دونوں شکل انسانی میں آ گئے۔ اور ان میں غصہ و شہوت پیدا کر دیا گیا۔ تو ان میں فرشتوں کے صفات نہ رہے فرشتہ فرشتہ رہ کر معصوم ہے۔ نہ کہ انسانی خواص پاکر بھی دیکھو حضرات انبیاء بشر ہیں۔ اور بشر طبعاً معصوم نہیں مگر جب رب تعالیٰ ان کے غصہ اور شہوت کی اصلاح فرما دیتا ہے۔ تو یہ معصوم بن جاتے ہیں۔ غرضکہ غصہ والا اصلاح سے معصوم اور معصوم غصہ پاکر غیر معصوم ہو سکتا ہے **چھٹا اعتراض** اگر یہ دونوں انسان بن گئے تھے تو آواگون درست ہوا (آریہ) **جواب** ان کی فقط شکل بدلی تھی نہ کہ روح اور گناہ کرنا شکل و صورت و جسم سے ہوتا ہے۔ روح جسم پاکر اعمال کرتی ہے۔ آواگون میں روح کی تبدیلی ہوتی ہے **ساتواں اعتراض** جب ہاروت و ماروت اپنی ہی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ تو لوگوں کو تعلیم سحر کیوں کر دیتے ہیں **جواب**۔ کامل اور تجربہ کار ماہر آدمی بیماری اور پریشانی میں بھی علمی مسائل بے تکلف بیان کر دیتا ہے۔ یہ حضرات چونکہ اس فن میں بہت کامل ہیں۔ لہٰذا بہت آسانی سے سکھا دیتے ہیں۔ **آٹھواں اعتراض** جب ان تک کوئی پہنچتا ہی نہیں تو ان سے جادو کیسے سیکھتے ہیں **جواب**۔ اولاً تو ان تک عام مخلوق پہنچ جاتی تھی۔ کیونکہ وہ اشاعت سحر کا وقت تھا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ کام بند ہوتا رہا صحابہ کرام کے زمانہ میں بھی بعض لوگ وہاں پہنچے مگر اب شیاطین تو وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ مگر انسان نہیں پہنچتے جیسا کہ روایت میں آیا ہے۔ کہ ہر سال بعض جن ان سے جادو سیکھنے اور انسانوں کو سکھاتے ہیں (عزیزی) **نواں اعتراض** یہ کیونکر ممکن ہے۔ کہ ایک عورت تارہ بن کر آسمان پر چڑھ جاوے **جواب**۔ آدمی کا بدن مر کر مٹی بن جاتا ہے۔ انسانی روح مر کر آسمانوں میں جاتی ہے جب بدن مٹی بن سکتا ہے۔ تو تارہ کی شکل بھی بن سکتا ہے۔ اس میں شکل کی تبدیلی ہے۔ کوئی تعجب نہیں **دسواں اعتراض** زہرہ تارہ تو پہلے ہی سے موجود ہے۔ اگر یہ عورت تارہ بن کر وہاں پہنچی تو چاہیئے تھا۔ کہ ادریس علیہ السلام سے پہلے یہ تارہ نہ ہوتا **جواب** اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ زہرہ تارا وہ عورت ہی ہے بلکہ یہ تارا تو پہلے سے موجود تھا۔ اس وقت اس عورت کا تعلق اس تارے سے ہو گیا۔ بعض روحیں جنت میں اور بعض روحیں دوزخ میں اور بعض چاہ زمزم میں رہتی ہیں۔ اس عورت کی روح زہرہ تارے میں رہتی ہے۔ شہداء سبز پرندے کی شکل میں جنت کی سیر کرتے ہیں یہ اس تارے کی شکل میں آسمان کی سیر کرتی ہے۔ **گیارھواں اعتراض** رب نے ہاروت و ماروت کو دو عذابوں کا کیوں اختیار دیا چاہیئے تھا۔ کہ توبہ کا حکم دیتا توبہ گناہ کا کفارہ ہے **جواب** یہ دنیاوی عذاب ہی ان کے لئے توبہ ہے۔ جیسے کہ چھرے کے پجاری یہودیوں کیلئے قتل۔ ہر جرم کی توبہ علیحدہ ہے۔ گویا ان سے کہا گیا۔ کہ یا تو یہ تکلیف برداشت کر کے توبہ کر لو۔ ورنہ عذاب آخرت میں گرفتار ہو گے۔ انہوں نے توبہ اختیار کی **بارھواں اعتراض** زہرہ عورت کافرہ فاجرہ تھی۔ اسکو اُس کو تارے میں رہنے کی عزت کیوں ملی۔ کافر کی جگہ جہنم ہے۔ نہ کہ تارا **جواب**۔ اسم اعظم پڑھ کر مومنہ ہو گئی۔ اور اس کے سارے گناہ معاف ہو گئے۔ جیسے کہ سو برس کا کافر بدکار کلمہ طیبہ پڑھ کر مومن بن جاتا ہے۔ پھر اسی اسم اعظم کے طفیل یہ دعا کی جو کہ قبول ہوئی۔ اور وہ تارے میں رہنے

**تیرھواں اعتراض** ہاروت و ماروت اسم اعظم کیسے بھول گئے **جواب**. گناہ یا کفر سے کبھی حافظہ کمزور ہو جاتا ہے اور علم بھول جاتا ہے. دماغ سے خون نکل جانے پر نسیان کی بیماری ہو جاتی ہے. اگر ایمان نکل جانے پر یہ مرض ہو جاوے تو کیا عجب **خاتمہ مضمون** زبیر ابن بکار اور ابن مردویہ اور دیلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی. کہ میں نے حضور علیہ السلام سے پوچھا. کہ انسان کتنی صورتوں میں مسخ ہوا. فرمایا تیرہ میں ہاتھی[1]. ریچھ[2]. سور[3]. بندر[4]. مارماہی[5]. گوہ[6]. چمگادڑ[7]. بچھو[8]. عموص[9] (دریائی چھوٹا جانور) مکڑی[10] خرگوش[11] سہیل[12] (تارہ) زہرہ تارہ[13] یعنی بعض قومیں ہاتھی بنادی گئیں بعض بندر بعض سور وغیرہ (تفسیر عزیزی) **تفسیر صوفیانہ** انسان میں سارا عالم ہے. ہاروت و ماروت اُس کی قوت نظری و قوت عملی ہے. اور اُس کا نفس گویا زہرہ ہے. اس نفس نے اِن دونوں قوتوں سے وہ صفات سیکھے جن کے برکت سے یہ نفس عالم اجسام سے ترقی کر کے عالم ارواح سے مل سکے. اور ملاء اعلیٰ میں اُس کا شمار ہو. مگر یہ نفس اِن دونوں قوتوں کو گناہوں پر رغبت دیتا رہا جس سے کہ یہ عالم سفلیات میں ہی رہ جائیں. جب یہ دونوں قوتیں نفس کی اطاعت کر کے نادم ہوں. تو شریعت پیغمبر کے حضور حاضر ہو کر اپنی شفاعت چاہیں اُدھر سے حکم ملے. کہ اِن دونوں کو چاہ دنیا میں عمر بھر کے لئے قید کردو جہاں کہ ان کو مصائب و آلام کی تکلیف برداشت کرنا پڑے. یہ قوت عملی و نظری دیگر انسانی قوتوں کو دنیاوی امور سکھاتی ہیں. مگر ساتھ ہی فرما دیتی ہیں. کہ یہ دنیا جال ہے. اس سے بچے رہنا. اس پر عمل نہ کرنا. یہ تمام چیزیں تم کو بچنے کیلئے بتائی گئی ہیں. نہ کہ عمل کے لئے جو اُن کی مخالفت کر کے دنیا میں پھنس جاتا ہے وہ طریقت کا کافر ہے. اور جو اُن کی مان جاتا ہے. وہ کامل مومن

اہل دُنیا کافراں مطلق اند — روز و شب در زق زق و در بک بک اند

چیست دنیا از خدا غافل بدن — نے قماش و روزی و فرزند و زن

وَمَا هُم بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ

اور نہیں ہیں وہ لوگ نقصان پہنچانے والے ساتھ اسکے کسی کو مگر ساتھ حکم خدا کے اور سیکھتے ہیں وہ جو نقصان دے گا اُن کو

اور اُس سے ضرر نہیں پہنچا سکتے کسی کو مگر خدا کے حکم سے اور وہ سیکھتے ہیں. جو اُنہیں نقصان دے گا.

وَلَا يَنفَعُهُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَلَبِئْسَ

اور نہ نفع دے گا انہیں اور البتہ تحقیق جان گئے البتہ وہ جو خریدے اُسکو نہیں ہے واسطے اُسکے بیچ آخرت کے کوئی حصہ اور البتہ برا ہے

نفع نہ دے گا. اور بیشک ضرور انہیں معلوم ہے. کہ جس نے یہ سودا لیا. آخرت میں اُسکا کچھ حصہ نہیں اور بیشک کیا بری چیز ہے

مَا شَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ

وہ جو خریدا اُنہوں نے ساتھ اُسکے جانوں کو اپنی اگر ہوتے وہ جانتے اور اگر تحقیق وہ لوگ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے البتہ ثواب

جس کے بدلے اونہوں نے اپنی جانیں بیچیں کسی طرح اُنہیں علم ہوتا. اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے رہیں

مِّنْ عِندِ اللَّهِ خَيْرٌ ۖ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿١٠٣﴾

نزدیک اللہ کے اچھے ہے اگر ہوتے وہ جانتے

اللہ کے یہاں کا ثواب بہت اچھا ہے. کسی طرح اُنہیں علم ہوتا

ع ۱۲ ۱۲

**تعلق** یہ جملہ پچھلے جملہ کا تتمہ ہے۔ اس میں کہا تھا کہ جادوگر جادو سے زوجین میں جدائی ڈالدیتے ہیں۔ تو شاید کسی کو وہم ہوتا کہ وہ اس اثر میں مستقل ہیں۔ وہم کو دفع کرنے کیلئے فرمادیا کہ بغیر اذن الٰہی کچھ نہیں کر سکتے یہ سب رب کے حکم سے ہوتا ہے۔ نیز پچھلے جملہ سے سمجھایا گیا کہ جادوگر دوسروں کو کافی نقصان پہونچا سکتا ہے۔ اس جملہ میں بتایا گیا۔ کہ وہ سب سے بڑا اپنا نقصان کرتا ہے **تفسیر وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ** یہ جادوگر اس جادو سے کسی کو بھی نقصان نہیں پہونچا سکتے ضَآرِّیْنَ جمع فرماکر اشارہ فرمایا کہ تمام دنیا کے جادوگر مل کر سارا زور جادو خرچ کر کے بھی کسی معمولی شخص کو ادنیٰ نقصان بھی نہیں پہونچا سکتے۔ تو ایک دو جادوگروں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ **اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ** یہاں اذن سے یا تو ارادہ مراد ہے یعنی اذن تکوینی نہ کہ اذن تشریعی یا تخلیہ یعنی خدا نے اس جادو میں تاثیر رکھ دی ہے جس سے وہ نقصان پہونچا دیتے ہیں۔ جیسے چھری میں کاٹنے کی تاثیر دی جس سے زخم لگایا جا سکتا ہے۔ وہ اس میں مستقل نہیں۔ یا یہ مطلب ہے۔ کہ جادو رب کی اجازت سے اثر کرتا ہے۔ اسی لئے کبھی اثر کرتا ہے اور کبھی نہیں۔ اور کسی پر کرتا ہے اور کسی پر نہیں۔ اگر ہر جادو ہمیشہ اثر کیا کرتا تو ماہر جادوگر تمام بادشاہوں کو فنا کر کے انکی فوجوں کو جادو سے ہلاک کر کے دنیا پر راج کرتے۔ مگر ایسا نہیں۔ نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادو بہت ترقی پر تھا چاہیئے کہ انہیں ہلاک کر ڈالتے۔ مگر نہ کر سکے معلوم ہوا کہ جادو کبھی اثر کرتا ہے۔ اور کبھی نہیں اور کسی پر اثر کرتا ہے کسی پر نہیں۔ پھر اثر بھی مختلف کرتا ہے۔ حضور علیہ السلام پر سخت جادو کیا گیا۔ مگر صرف خیال مبارک پر اثر ہوا۔ کہ کسی قدر نسیان بڑھ گیا لہٰذا مومن کو چاہیئے۔ کہ ہمیشہ رب ہی سے ڈرے۔ کہ سب اس ہی کے تابع فرمان ہیں۔ **وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ** ہاں خود جادوگر اپنے جادو سے ضرور نقصان پا جاتا ہے۔ دوسرے کو نقصان ہو یا نہ ہو کیونکہ وہ یا تو اس پر عقیدہ رکھ کر یا الفاظ کفریہ بول کر یا شرائط کفریہ ادا کر کے کافر ہو جاتے ہیں یا ستاروں اور شیاطین میں اثر دیکھ کر ان کو مستقل مؤثر مان جاتے ہیں۔ جو کہ کفر ہے۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے۔ کہ جادوگر گرفتار کر کے قتل بھی کر دیئے جاتے ہیں کبھی ایک دوسرے کے مقابلہ میں ہلاک بھی ہو جاتے ہیں۔ غرضکہ ان کو دینی یا دنیاوی نقصان بہت ہے۔ **وَلَا يَنْفَعُهُمْ** یہ لَا یَضُرُّ کی تاکید ہے یعنی جادو خود جادوگر کو بہت نقصان دیتا ہے جس میں نفع کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ دوسروں کو اگر نقصان دیا۔ مگر نفع کے ساتھ مثلاً اگر کسی کو جادو سے نقصان پہونچا تو یا تو وہ شہید ہو کر مرا یا اسے صبر کا ثواب ملا۔ مگر جادوگر کا دین و ایمان تباہ ہوا جسمیں محض نقصان ہی ہے۔ نفع بالکل نہیں پھر یہ بھی خیال رہے۔ کہ خود جادوگر اس نقصان سے بے خبر نہیں۔ بلکہ **وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ** ویقیناً جانتے ہیں۔ کہ جو کوئی جادو خریدے یعنی ایمان چھوڑ کر کفر یا آسمانی کتابیں چھوڑ کر شیطانی باتیں یا قرآن کریم کو چھوڑ کر جادو وغیرہ اختیار کرے۔ **مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ** اس کیلئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں یعنی اس سے کچھ دنیا کمائے تو کمالے۔ مگر آخرت میں اسے کچھ نہ ملے گا۔ خیال رہے۔ کہ یہود کے پاس توریت موجود تھی جس پر عمل کر کے وہ دین و دنیا کماتے۔ یا ان کو قرآن پاک حاصل کرنے کا موقع تھا۔ مگر ان بدنصیبوں نے توریت چھوڑی قرآن سے منہ موڑا اور جادو کے شیدائی ہوئے۔ اس چھوڑنے اور اختیار کرنے کو رب نے خرید و فروخت فرمایا کیونکہ خریدار قیمت دیکر مال لیتا ہے۔ مگر ان کا یہ سودا گھاٹے کا ہوا۔ کہ نافع چیز ہاتھ سے کھو بیٹھے اور نقصان دہ چیز لے بیٹھے۔ **وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ** یہ اس تجارت کا انجام ہے۔ کبھی تو تجارت نفع دیتی ہے۔ اور کبھی حساب برابر رہتا ہے کہ نہ نفع نہ نقصان اور کبھی کچھ نقصان دیتی ہے۔ اور کبھی تاجر کو بالکل تباہ کر ڈالتی ہے۔ کہ اس کی اصل پونجی برباد مکان جائداد نیلام ہو جاتی ہے اور تاجر دیوالیہ ہو کر قید اور ذلیل و خوار ہوتا ہے۔ ان جادوگر یہود کی تجارت آخری قسم کی ہے۔ کہ جادو سے ان کے گذشتہ اعمال برباد ایمان ختم۔ جنت کا استحقاق زائل ہو گیا۔ اور جہنم کے حقدار بن گئے۔ روح البیان نے فرمایا کہ یہاں اَنْفُس سے ایمان مراد ہے۔ کیونکہ وہ اصل مقصود ہے اور شرا سے فروخت کرنا یعنی جس جادو کی عوض انہوں نے ایمان فروشی کی وہ جادو نہایت برا ہے بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ یہ دونوں لفظ اپنی اصل معنی پر ہی ہیں۔ یعنی ان کو چاہیئے تھا۔ کہ نیک اعمال کے ذریعہ رب سے اپنی جانیں چھڑاتے مگر انہوں نے اس کے برعکس

اسکی پوری تحقیق پہلے گذر گئی۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔ کاش کہ وہ یہ برائی بھی جانتے ہوتے یعنی یہ تو وہ جانتے ہیں۔ کہ جادو میں ثواب نہیں کاش وہ یہ بھی جانتے کہ اس میں عذاب ہے۔ اور اس سے آخرت برباد ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ کہ جادو ایک مباح چیز ہے۔ کہ جس کا نہ ثواب نہ عذاب اب رب فرماتا ہے۔ کہ اگرچہ یہ یہود بڑے بڑے جرم کر چکے لیکن ابھی بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اگر یہ چاہیں۔ کہ جنت میں ہمیں بھی جگہ مل جاوے۔ تو وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا۔ اگر یہ اب بھی ایمان لے آویں اور جادو کو حرام جان لیں۔ توریت پر پورا عمل کریں اور نبی آخر الزمان کے پیروکار بن جاویں تو اُن کو بڑا ہی ثواب ملیگا۔ اور لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ۔ تھوڑا سا ثواب بھی جو اللہ کے پاس ہے دنیا کے بڑے بھاری نفع سے بہت اچھا ہے ہماری اس تفسیر سے معلوم ہوا کہ لَوْ کی جزاء پوشیدہ ہے۔ اور یہ جملہ ایک پُر لطف معنی دے رہا ہے خلاصہ یہ ہے۔ کہ اگر یہ اب بھی ایمان لے آویں تو ہم ان کو بڑا ہی ثواب دیں۔ اور اے اللہ کے بندو رب کا تھوڑا ثواب بھی دنیا سے بہتر ہے تو بڑے ثواب کا کیا پوچھنا عند اللہ سے معلوم ہوا کہ تمام مزدوریوں کی اُجرت دنیا والے دیتے ہیں مگر انبیاء کی اطاعت کی اُجرت رب دیتا ہے اور رب کی اُجرت تمام اُجرتوں سے بڑی ہے۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ کاش یہ اس راز کو جانتے یعنی انہیں یہ تو خبر ہے۔ کہ فلاں منتر میں یہ اثر ہے۔ فلاں جادو سے یہ تبدیلی ہو جاتی ہے۔ مگر انہیں یہ خبر نہیں کہ کلمۂ پاک میں کیا اثر ہے۔ اور اس کے پڑھنے سے انسان کی کیسی کایا پلٹ جاتی ہے۔ کہ سو برس کا مجرم بدکار ایک منٹ میں صالح پرہیزگار بن جاتا ہے۔ کیا وہ جادو اور وہ منتر بہتر ہیں یا یہ تدبیر کارآمد اور یہ عمل مفید ہے۔ ان کے آنکھوں پر پردے ہیں **خلاصہ تفسیر** اے مسلمانو بیشک جادو میں تاثیر ہے۔ مگر یہ نہ سمجھنا۔ کہ مستقل تاثیر ہے نہیں۔ بلکہ جو کچھ ہے رب کے اذن اور اس کے ارادے سے ہے۔ جادوگر کے جادو سے دوسرے کو نقصان ہو یا نہ ہو۔ اور اگر ہو۔ تو پورا ہو یا تھوڑا۔ مگر خود جادوگر یہ سیکھ کر اپنا پورا نقصان کر لیتا ہے۔ کہ اُس کے اوقات بجائے ذکر اللہ کے فکر شیاطین میں گزرتے ہیں۔ اور وہ بجائے آسمانی کتابوں کے شیطانی وسواس میں پھنسا رہتا ہے۔ ایمان چھوڑ کر بے ایمان بن جاتا ہے۔ اور اتنا تو خود جادوگر بھی جانتے ہیں۔ کہ جادو کا آخرت میں کوئی ثواب نہیں کاش وہ یہ ہی جانتے کہ یہ بہت ہی بُری چیز ہے جس کی عوض وہ اپنے جان و ایمان کو فروخت کر چکے لیکن اُن سے کہدو۔ کہ ہم بڑے غفور رحیم ہیں جس طرح کہ انہوں نے پہلے ہمیشہ خطائیں کیں۔ اور ہم نے عطائیں۔ اگر یہ اس قدر جرم کر کے اب بھی ایمان لے آئیں تو ہماری رحمت انہیں آغوش میں لینے کو طیار ہے۔ ہم تو دیتے ہیں کوئی لینے والا نہیں۔ ان کے ایک کلمہ پڑھ لینے سے ہم انہیں بہت بڑا ثواب دیں گے۔ حالانکہ ہمارا تھوڑا ثواب بھی ساری دنیا کی نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ کاش کہ یہ اس ثواب کی قدر جانتے تو ایسی حرکتیں نہ کرتے۔ اے مولیٰ تیرے کرم کے قربان کس طرح اپنے مجرم بندوں کو رحمت کی طرف بلا رہا ہے۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ پہلا فائدہ جادو میں اثر ہے۔ جو اس کے اثر کا منکر ہے۔ وہ اس آیت پر غور نہیں کرتا۔ کہ يُفَرِّقُوْنَ سے سحر کے اثر کا ثبوت ہے۔ اور اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ میں بھی نفی ٹوٹ کر اثر کا ثبوت ہو گیا نیز اسکے اثرات کا بارہا تجربہ بھی ہوا۔ اور ہو رہا ہے۔ اس کا انکار بالکل ظاہر بات کا انکار ہے۔ دوسرا فائدہ مؤثر حقیقی اللہ ہے۔ باقی ساری چیزیں محض اسباب اسی لئے جادو کبھی بہت تیز اثر کرتا ہے۔ کبھی نہایت معمولی اور کبھی بالکل نہیں بلکہ تجربہ تو یہ ہے۔ کہ ہر عمل اور دعا وغیرہ کا یہ ہی حال ہے کبھی دعا یا تعویذ سے بہت جلد فائدہ ہوتا ہے کبھی بہت دیر میں کبھی بالکل نہیں کبھی ایک ہی جماع سے حمل قرار پا جاتا ہے۔ اور کبھی بہت سے جماع سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پھر کبھی جماع سے ایک بچہ ہو کبھی دو کبھی لڑکی کبھی لڑکا کبھی خوبصورت کبھی بدصورت۔ غرضکہ اثر مسبب الاسباب کے ہاتھ ہے۔ چاہیئے کہ اسباب پر ضرور عمل کرے مگر نظر و اعتماد خالق پر رکھے۔ تیسرا فائدہ بغیر عمل علم بیکار بلکہ کبھی نقصان دہ ہے۔ کہ یہود جادو کو بیکار جانتے تو تھے مگر عمل اس کے خلاف کرتے تھے لہذا مردود ہوئے۔ چوتھا فائدہ دنیاوی فائدے کے مقابلہ میں آخرت کا تھوڑا فائدہ بھی زیادہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جنت میں ایک کمان رکھنے کی جگہ دنیا سے بہتر ہے۔ پانچواں فائدہ جادوگر کی توبہ قبول ہے۔ کیونکہ یہاں جادوگر یہودیوں کو ایمان اور توبہ

کی دعوت دی گئی ہے۔ چھٹا فائدہ ایمان و تقویٰ انسان کی کایا پلٹ دیتے ہیں۔ یہ جادو سے بڑھ کر مؤثر ہیں۔ آدمی کو چاہیئے۔ کہ بجائے کیمیا ریمیا سیمیا جادو منتر کے ایمان کی کیمیا اور تقوے کا منتر سیکھے اولیاء اللہ کی نظر سے مٹی سونا بن جاتی ہے۔

کیمیا و ریمیا و سیمیا کس نداند جز بذات اولیاء

ساتواں فائدہ کوئی علم بذات خود برا نہیں۔ بلکہ اس کی برائی تین وجہ سے ہے۔ ایک یہ کہ اس میں نقصان زیادہ اور نفع کم ہو۔ جیسے کہ علم سحر و نجوم و طلسمات وغیرہ دوسرے یہ کہ وہ علم خود تو مضر نہ ہو۔ لیکن سیکھنے والے میں اس کی باریکیاں سمجھنے کی قابلیت نہیں جس سے اندیشہ ہو کہ یہ غلط سمجھ کر گمراہ ہو جائے۔ جیسے علم فلسفہ مسئلہ تقدیر مسئلہ وحدت الوجود صحابہ کرام کے اختلاف اور جنگوں کے اسباب اولیاء کے بولے ہوئے معمّے جیسے کہ اَنَا الْحَقّ طریقت کے اسرار قرآن مجید کی صوفیانہ تاویلات کہ عام لوگ اس کے اہل نہیں۔ تیسرے شرعی علموں میں بے جا تاویلات اور شرعی اعمال میں افراط و تفریط جیسے کہ علم عقائد اور توحید میں فلسفہ کو دخل دینا اور علم فقہ میں غلط حیلے اور بے اصل روائتیں لینا۔ اور علم سلوک میں جوگیوں کے مشغلوں کو دخل دینا آٹھواں فائدہ جادو معجزے اور کرامت کے مقابلہ میں اثر نہیں کر سکتا۔ لیکن بغیر مقابلہ نبی یا ولی پر ضرور اثر کر دیتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے جادوگر عصا کے مقابل فیل ہوئے۔ مگر حضور علیہ السلام پر یہود کا جادو کسی قدر چل گیا۔ کیونکہ وہاں معجزے کا مقابلہ تھا۔ اور یہاں حقیقۃً بغیر مقابلہ ایسا ہوا۔ نواں فائدہ اگر جادوگر دعویٰ خدائی کر دے۔ تو اس کا جادو باقی رہتا ہے۔ لیکن اگر دعویٰ نبوت کر بیٹھے تو وہ ہی جادو بیکار ہوگا۔ کہ یا تو اثر کریگا ہی نہیں اور اگر کریگا۔ تو الٹا دیکھو دجال دعویٰ خدائی کر کے عجیب باتیں دکھائیگا۔ لیکن مسیلمہ کذاب دعویٰ نبوت کر کے اپنے جادو سے کوئی کام نہ لے سکا۔ کیونکہ خدائی میں دھوکہ نہیں پڑ سکتا۔ کہ انسان کا کھانا پینا اور سونا جاگنا ہی بتا رہا ہے۔ کہ وہ خدا نہیں مگر نبوت کا شبہ پڑ سکتا ہے۔ کیونکہ انبیاء کرام بشر ہی ہوتے ہیں۔ اس لئے قدرت اس کا جادو بے کار کر دیتی ہے۔ یہ آخری تین فائدے اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہ سے حاصل ہوئے۔ **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ جادوگر خدا کے حکم سے لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ تو کیا خدا بری باتوں کا بھی حکم دیتا ہے۔ اور اگر حکم دیتا ہے۔ تو پھر جادوگر برا کیوں ہے **جواب**۔ اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں اذن کے معنی نہ تو اجازت ہیں اور نہ امر و حکم، بلکہ اس کے معنی ہیں خلق یا ایجاد یعنی اذن شرعی مراد نہیں بلکہ اذن تخلیقی یا تکوینی مراد ہے یعنی جادو خود اثر نہیں کرتا۔ بلکہ اصل مؤثر پروردگار ہے۔ دوسرے یہ کہ یہاں اذن سے مراد اجازت ہی ہے۔ مگر جادوگر کو جادو کرنے کی نہیں۔ بلکہ جادو کو اثر کرنے کی یعنی جادو خدا کی اجازت سے اثر کرتا ہے۔ جیسے کہ چھری خدا کی اجازت سے کاٹتی ہے۔ لہذا جادو برا نہیں ہاں جادوگر برا ہے۔ کہ اس نے بغیر اجازت جادو کیا تلوار بری نہیں قاتل برا ہے۔ تیسرے یہ کہ اذن سے مراد موقعہ دینا ہے یعنی رب نے جادوگر کو موقعہ دے دیا جیسے کہ اس نے ساری برائیاں کرنے کا موقعہ دے دیا ہے۔ چوتھے یہ کہ اذن سے مراد علم اور اطلاع ہے چنانچہ نماز کی اطلاع کو اذان کہتے ہیں قرآن کریم نے فرمایا۔ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ اور فرمایا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ اطلاع کو اذن اسی لئے کہتے ہیں۔ کہ وہ اُذُن یعنی کان سے سنی جاتی ہے یعنی جادوگر اللہ کے علم کے بغیر ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ **دوسرا اعتراض** اس آیت میں اول تو فرمایا گیا۔ وَلَقَدْ عَلِمُوْا یعنی وہ یقیناً جانتے ہیں۔ اور آخر میں فرمایا گیا۔ لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ کاش کہ وہ جانتے ہوتے یعنی نہیں جانتے تو جاننا نہ جاننا جمع کیسے ہو گیا **جواب**۔ اس کے بھی چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں سے بعض جادو کی برائی جانتے تھے۔ اور بعض نہ جانتے تھے لہذا جاننے والے اور ہیں۔ اور نہ جاننے والے دیگر دوسرے یہ کہ وہ جانتے تھے مگر عمل نہ کرتے تھے۔ لہذا پہلے علم بے عمل کا ثبوت ہے۔ اور پھر علم باعمل کی نفی تیسرے یہ کہ وہ یہ جانتے تھے۔ کہ جادو پر ثواب نہیں مگر یہ نہ جانتے تھے۔ کہ اس پر عذاب بھی ہے۔ یعنی لَقَدْ عَلِمُوْا کا مفعول لَمَنِ اشْتَرٰہُ ہے۔ اور لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ کا وَلَبِئْسَ **تیسرا اعتراض** اس آیت میں لَوْ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا شرط ہے۔ اور لَمَثُوْبَۃٌ اس کی جزا اور جزا شرط پر موقوف ہوتی ہے۔ تو مطلب یہ ہوا۔ کہ خدا کے ثواب کا اچھا ہونا ان کے ایمان لانے پر موقوف ہے۔ یعنی اگر وہ ایمان نے آئیں۔ تو

تو ثواب اچھا ہو۔ ورنہ نہیں۔ حالانکہ رب کا ثواب بہت بہتر چیز ہے۔ خواہ یہودی ایمان لائیں یا نہ لائیں **جواب** یہاں جزا شرط پر حکم میں موقوف ہے۔ نہ کہ واقعہ میں جیسے کہ قرآن میں ہے کہ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ یعنی انکے لئے ثواب اچھے ہونیکا حکم جب ہوگا جبکہ وہ ایمان لائیں یا یوں کہو کہ اس کی جزاء پوشیدہ ہے۔ اور لَمَثُوْبَةٌ علیحدہ جملہ ہے۔ **تفسیر صوفیانہ** علم درحقیقت اچھی چیز ہے لیکن اُس کا اثر مختلف جس علم کیساتھ نیک اعمال کتاب وسنت کی پیروی اللہ و رسول کا عشق ومحبت ہو وہ علم نافع ہے۔ اور جس کے ساتھ یہ اوصاف نہ ہوں وہ علم بیکار۔ اور جو شخص علم سے غلط فائدہ حاصل کرے۔ کہ اُس کو دنیا کمانے اور اپنی آبرو بڑھانیکا ذریعہ بنائے وہ علم مضر ہے شیخ ابو الحسن فرماتے ہیں۔ کہ اگرچہ سارے علم حق ہیں۔ لیکن جس علم کی طرف نفس مائل ہو۔ اور طبیعت کو اُس سے لذت حاصل ہو اسے اختیار نہ کرو۔ انسان کیلئے وحدانیت کا علم اور اللہ رسول کی محبت کامل کافی ہے بعض صوفیا فرماتے ہیں۔ کہ بُرے آدمی کیلئے علم کی زیادتی ایسی ہے جیسے کہ اندرائن اور خاردار درختوں کی جڑوں میں زیادہ پانی۔ جیسے کہ وہاں پانی سے کانٹے اور کڑوے پھل بڑھیں گے۔ ایسے ہی یہاں علم سے بدعملی اور بیدینی پھیلیگی جو شخص کہ دنیا کمانے اور اپنی آبرو بڑھانے کیلئے علم سیکھتا ہے۔ وہ اُس شخص کی طرح ہے جو کہ سونے کے چمچے سے گوبر کھاتا ہے۔ اے علماء اگر تم چاہتے ہو۔ کہ اپنا درجہ اللہ کے نزدیک معلوم کرو۔ تو غور کر لو کہ تمہارے دل میں اللہ کا کیا درجہ ہے۔ سمجھ لو۔ کہ انسان کا نصف اسفل مثل ملک کے ہے۔ اور نصف اعلیٰ مثل ملکوت کے یوں کہو۔ کہ طبیعت اور نفس ملک ہے اور روح اور سر ملکوت تم اپنے ملک وملکوت پر قادر رہو۔ یہود نے ملک وملکوت والے علوم چھوڑ کر علم سحر جیسے مضر علوم اختیار کئے۔ وہ وبال میں پھنس گئے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ

اے وہ لوگو جو کہ ایمان لائے نہ کہو تم لوگ راعنا اور کہو تم نظر کیجئے ہم پر اور سنو تم اور واسطے کافروں کے

اے ایمان والو راعنا نہ کہو۔ اور یوں عرض کرو۔ کہ حضور ہم پر نظر رکھیں اور پہلے ہی سے بغور سنو۔ اور کافروں کے لئے

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

عذاب ہے دردناک ۞

دردناک عذاب ہے ۞

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** اب تک یہود کے اُن بدکاریوں کا ذکر تھا۔ جو حضور علیہ السلام کی تشریف آوری سے پہلے کر چکے تھے۔ اب اُن کے وہ عیوب بیان ہو رہے ہیں۔ جو حضور علیہ السلام کے زمانہ میں اُن میں پیدا ہوئے یعنی صاحب قرآن میں عیب جوئی کرنا اور اُن کے دین میں طعنے لگانا اس سلسلے میں پہلا عیب اس آیت میں بیان ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں یہود کے جادو سیکھنے کا ذکر تھا۔ اور جادوگر کچھ الفاظ ہی کے ذریعہ لوگوں کو ایذا پہنچاتا ہے۔ اب اس آیت میں اُنکے وہ تکلیف دینے والی باتیں بیان ہو رہی ہیں۔ جو جادو کی طرح حضور علیہ السلام کو ایذا پہنچاتی تھیں **تیسرا تعلق** پچھلی آیت میں یہود کا جادوگر ہونا بتایا گیا۔ اور جادوگر اپنے کو کراماتی ولی ظاہر کرتا ہے۔ اور اپنے جادو کو کرامت بتاتا ہے۔ مگر درحقیقت وہ فاسق اور فاجر ہے۔ اور اُس کا جادو فسق وفجور اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ یہود راعنا کہہ کر اپنے کو حضور کا محب ظاہر کرتے ہیں مگر درحقیقت وہ موذی ہیں۔ اور اُن کا یہ لفظ محبت نہیں۔ بلکہ کلمہ ایذا ہے۔ ان کے اس لفظ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے۔ **چوتھا تعلق** پچھلی آیت میں جادو کا ذکر ہوا اور جادو کا موجد اور سکھانے والا تو اُس کی حقیقت سے واقف ہے۔ مگر سیکھنے والا شاگرد اس سے بے خبر رہ کر اندھا دھند منتر پڑھتا ہے۔ اس آیت میں لفظ

راعنا سے بے ادبی کرنیوالے اس لفظ کی حقیقت سے واقف تھے مسلمان بے خبری میں یہی لفظ بولتے تھے۔ انہیں اس سے روک
دیا گیا۔ کہ جیسے جادو کا موجد اور اس کا عامل دونوں گنہگار ہیں۔ ایسے ہی راعنا سے بے ادبی کرنیوالے اور بے خبری میں اس کو استعمال کرنے
والے دونوں مجرم ہیں گے۔ **پانچواں تعلق** اس سے پہلے ایمان اور تقویٰ کا ذکر ہوا۔ اور تقوے یہ ہے۔ کہ انسان شبہ کی چیز سے بھی بچے۔ اب
فرمایا جارہا ہے۔ کہ اے مسلمانو متقی بنو کہ لفظ راعنا میں فاسد معنی کا شبہ ہے۔ اس سے بھی بچ جاؤ۔ **شانِ نزول** حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب
صحابہ کرام کو کچھ تعلیم فرماتے تو وہ حضرات درمیان کلام میں عرض کر دیتے تھے۔ کہ راعنا یا رسول اللہ یعنی یا حبیب اللہ ہماری رعایت فرمایئے
یعنی یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی۔ دوبارہ ارشاد فرمادیجئے یا ہمیں سمجھ لینے کا موقعہ دیجئے۔ مگر اس لفظ راعنا کے ایک برے معنی بھی ہیں۔ جیسا کہ
ہم اس کی تفسیر میں عرض کریں گے۔ یہود نے اس برے معنی کی نیت سے یہ لفظ عرض کرنا شروع کر دیا۔ اور دل میں خوش ہوئے۔ کہ ہمیں بارگاہ
عالی میں نہایت چالاکی سے گستاخی کرنیکا موقعہ مل گیا۔ ایک دن حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ نے ان کی زبان سے یہ لفظ سن کر فرمایا کہ اے
دشمنانِ خدا تم پر اللہ کی لعنت ہو۔ اگر میں نے اب کسی کی زبان سے یہ لفظ سنا تو اس کی گردن ماردونگا یہود نے کہا۔ کہ ہم پر تو آپ ناراض ہوتے
ہیں مسلمان بھی تو یہی کہتے ہیں۔ اس پر آپ غمگین ہو کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آئے ہی تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی جس میں
راعنا کہنے کی ممانعت فرمادی گئی۔ اور اسی معنی کا دوسرا لفظ اُنْظُرْنَا کہنے کا حکم دیا گیا (خزائن عرفان وعزیزی وکبیر) **تفسیر یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا** یہ خطاب قرآن کریم میں اٹھاسی ۸۸ جگہ ہے۔ ان میں سے یہ پہلا موقعہ ہے پچھلی کتابوں صرف پیغمبروں سے خطاب ہوتا تھا۔ امت
مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ عزت ہے۔ کہ رب تعالیٰ نے براہ راست ان سے کلام فرمایا۔ دنیا میں تو مسلمانوں کو اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا خطاب دیا۔
یعنی اے ایمان والو انشاء اللہ آخرت میں یہی خطاب ہوگا۔ مگر وہاں اس کے معنی ہوں گے۔ اے امن میں رہنے والو کیونکہ ابتدا انتہا کو
بتاتی ہے۔ اور خطاب سے ثواب یا عتاب کا پتہ لگ جاتا ہے کسی کو پکارا او گدھے معلوم ہوا عتاب کسی کو پکارا او میرے بچے معلوم ہوا
کہ کرم ہوگا۔ بعض روایات میں ہے۔ کہ توریت و انجیل میں خطاب یٰٓاَیُّهَا الْمَسَاكِیْن تھا جس کا انجام یہ ہوا۔ کہ ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَ
الْمَسْكَنَةُ کہ ان پر ذلت اور خواری ڈالدی گئی ہمیں خطاب ہوا۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا جس کا انجام ہوا کہ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ
اللّٰهِ فَضْلًا كَبِیْرًا۔ **لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا** ہمارے نبی سے آئندہ راعنا نہ کہنا یہ لفظ مراعاۃ کا امر ہے جس کے معنی ہیں۔ رعایت
کرنا صحابہ کرام عرض کرتے تھے رَاعِ رعایت فرمایئے۔ نا ہماری۔ مگر یہود کی زبان میں یہ گالی تھی۔ یا وہ کسی قدر کھینچ کر بولتے تھے جو کہ راعینا
بن جاتا تھا۔ یعنی ہمارا چرواہا (راعی چرواہے کو کہتے ہیں) یا وہ رعونت سے بناتے تھے جس کے معنی ہیں حماقت۔ تو راعنا کے معنی ہوئے
احمق اور دل میں خوش ہوتے تھے۔ نیز ویسے بھی اس لفظ میں بے ادبی کا احتمال سا تھا کیونکہ یہ باب مفاعلۃ سے ہے جس کے معنی ہوئے
آپ ہماری رعایت کریں۔ اور ہم آپ کی اس میں نبی علیہ السلام کے ساتھ برابری کا شائبہ پایا جاتا تھا۔ یا یہ خودسری کا حکم معلوم ہوتا تھا۔ کہ یا حبیب
اللہ میرے کلام کی رعایت کیجئے۔ اس سے بے پرواہی نہ کیجئے کسی اور کیساتھ مشغول نہ ہو جیئے۔ ان وجہوں کی بنا پر مسلمانوں کو اس سے روک
دیا گیا۔ کہ تم اگرچہ سادگی سے کہتے ہو۔ مگر اس لفظ کے دوسرے خلاف معنی بھی ہیں۔ یا اوروں کو اس سے بے ادبی کرنیکا موقعہ مل جاتا ہے۔
لہٰذا تم اچھی نیت سے بھی نہ بولو۔ بلکہ **وَقُوْلُوا انْظُرْنَا** اگر یہ کہنا ہی ہو تو یہ لفظ بولا کرو۔ یا تو اُنْظُرْ اِنْتَظِرْ کے معنی میں ہے۔ یعنی ہمیں مہلت
دیجئے (نظر بمعنی مہلت) اور یا یہاں اِلٰی پوشیدہ ہے۔ اُنْظُرْ اِلَیْنَا یعنی ہماری طرف نظر کرم فرمایئے۔ (نظر بمعنی کرم) اس لفظ میں کسی فاسد
معنی کا احتمال نہیں۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے۔ کہ **وَاسْمَعُوْا** پہلے سے فرمانِ عالی غور سے سن لیا کرو۔ تاکہ تمہیں یہ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے
یا یہ مطلب ہے۔ کہ یہ حکم بگوش ہوش سن لو خبردار اب کبھی رَاعِنَا نہ کہنا یا یہ مطلب کہ اطاعت کی غرض سے سنو یہود کی طرح سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا نہ کہنا۔
اس لئے کہ **وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ** ان کافروں کیلئے دردناک عذاب ہے۔ جو راعنا کہہ کر محبوب پاک کے قلب کو ایذا پہنچاتے

ہیں۔ انہوں نے زبان سے تکلیف دی ہم انہیں تکلیف وہ عذاب میں مبتلا کریں گے **خلاصہ تفسیر** اے ایمان والو تم ہمارے نبی علیہ السلام سے نیک نیتی اور صفائی دل کے ساتھ لفظ راعنا بول دیتے ہو جسکا مطلب ہوتا ہے۔ کہ حضور ہم نے یہ بات نہ سنی ہم پر نظر کرم فرمایئں اور دوبارہ فرماویں۔ مگر تمہارے اس لفظ کے خراب معنی بھی ہیں۔ اور اس سے دشمنوں کو بے ادبی اور گستاخی کرنیکا موقعہ مل جاتا ہے۔ لہذا تم یہ لفظ اچھی نیت سے بھی بولنا چھوڑ دو تاکہ گستاخی کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ اور بجائے اس کے اُنظُرنا کہدیا کرو۔ کہ اس سے تمہارا مقصد پورا ہو جائیگا۔ اور بے ادبی کا بھی شائبہ نہ رہے گا۔ اور سب سے بہتر تو یہ ہے۔ کہ نبی علیہ السلام کا کلام شریف پہلے ہی سے بغور سن لیا کرو تا کہ اس عرض و معروض کی ضرورت ہی نہ پڑے یا ہمارا یہ حکم کان کھول کر سن لو۔ اب اسکے خلاف ورزی نہ ہو۔ اب جو کوئی راعنا کہیگا۔ وہ کافر ہو گا۔ اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** بارگاہ الٰہی میں حضور علیہ السلام کی بے حد عزت ہے۔ کہ اس نے اپنے بندوں کو عرض معروض کرنیکا طریقہ بھی سکھایا اور عرضی دینے کے الفاظ بھی بتائے قرآن کریم نے دربار مصطفائی کی حاضری کے آداب بیٹھے اٹھنے کے طریقے کھانے پینے کے آداب گفتگو کرنے کے ڈھنگ بھی سکھائے اس کی تحقیق کے لئے ہماری کتاب سلطنت مصطفٰے در مملکت کبریا کا مطالعہ کرو۔ **دوسرا فائدہ** تعظیم مصطفٰے علیہ السلام تمام عبادات سے مقدم ہے۔ اور سب سے بڑھ کر اہم فرض۔ کیونکہ قرآن کریم نے نماز روزے کے احکام میں اتنی سختی نہ فرمائی جتنی کہ یہاں فرمائی۔ کہ حکم کے بعد اسْمَعُوْا بھی کہا۔ یعنی خوب سن لو۔ اور خلاف ورزی کرنیوالوں کو کافر فرمایا۔ **تیسرا فائدہ** لِلْکٰفِرِیْنَ سے اشارۃً معلوم ہوا۔ کہ حضور علیہ السلام کی شان میں بے ادبی کا لفظ بولنا کفر ہے۔ اگرچہ اس قصد سے نہ ہو۔ لہذا حضور علیہ السلام کی شان میں گستاخی کرنیوالے دیوبندی کافر ہیں اگرچہ وہ یہی کہیں کہ ہماری یہ نیت نہ تھی۔ گستاخی میں عرف کا لحاظ ہے۔ نہ کہ نیت کا۔ نیک نیتی سے گالی دینے والا مجرم ہے۔ **چوتھا فائدہ** برائیوں کے ذریعوں کو بند کرنا ضروری ہے۔ لہذا وہ جائز کام بھی حرام ہے جس سے محرمات کا دروازہ کھلے رب نے مشرکین کے بتوں کو گالیاں دینے سے منع فرمایا تھا کیونکہ اس سے مشرکین رب کو گالیاں دیتے ہو دیر ہفتہ کے دن شکار کرنا حرام تھا لیکن جنہوں نے حیلتہً پہلے سے تیاری کی وہ بھی عذاب الٰہی میں گرفتار ہو گئے۔ کیونکہ یہ حرام کا ذریعہ تھا۔ تصویر بنانا اور شوقیہ استعمال کرنا حرام کر دیا گیا۔ کہ یہ بت پرستی کا ذریعہ ہے۔ قبر کے سامنے نماز حرام ہے۔ کیونکہ اس میں قبر پرستی کا دروازہ کھلنے کا اندیشہ ہے۔ کسی کے باپ کو گالی مت دو ورنہ وہ تمہارے باپ کو گالی دیگا۔ مگر افسوس اس راز کو دیوبندی نہ سمجھے۔ انہوں نے تقویت الایمان اور براہین قاطعہ جیسی گندی کتابیں شائع کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آریوں نے رنگیلا رسول جیسی ملعون کتاب چھاپی اور اپنی اس گستاخی کے لئے تقویت الایمان کو آڑ بنایا **پانچواں فائدہ** اللہ تعالٰی اور حضور علیہ السلام کی شان میں ایسے لفظ بولنا حرام ہیں جن میں بے ادبی کا ادنٰی شائبہ بھی ہو۔ اور جو ان کی شان کے خلاف ہوں۔ اور اسی لئے اللہ کو میاں اور حضور علیہ السلام کو بھائی اور بشر کہنا حرام ہے۔ کہ میاں شوہر کو اور بھائی بشر برابر والے کو بھی بولا کرتے ہیں۔ **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ تعریض کرنا حرام ہے (دو معنی والے لفظ کے بعیدی معنی مراد لینا) حالانکہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی کو ایک بہن کہا تھا۔ یعنی دینی بہن۔ نیز فقہا فرماتے ہیں کہ تعریض جائز ہے **جواب** مجبوری کی حالت میں تعریض بے شک جائز ہے۔ بلا ضرورت نہ چاہیئے۔ نیز کفر کی تعریض کے احکام کچھ اور ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ضرورتاً بیوی کو بہن فرمایا اور اس میں کفر کے معنی بھی نہ تھے۔ **دوسرا اعتراض** شافعی لوگ کہتے ہیں۔ کہ منقولہ الفاظ میں تبدیلی جائز نہیں۔ لہذا نماز میں بجائے اللہ اکبر کے الرحمٰن اکبر وغیرہ کہنا منع ہے۔ جیسے کہ بجائے اُنظرنا کے راعنا کہنا حرام ہے **جواب** اس مسئلہ کو اس آیت سے کوئی تعلق نہیں راعنا کے فاسد معنی ہیں۔ اس لئے وہ حرام ہے۔ الرحمٰن اکبر میں کون سی خرابی ہے۔ **تفسیر صوفیانہ** ۔ اے وہ لوگو جو قَالُوْا بَلٰی کہہ کر ازل میں مومن ہو چکے ہو۔ تم دربار یار میں اغیار کے سامنے راعنا وغیرہ ایسے لفظ محبت سے بھی نہ بولو۔ کہ جس سے اغیار کو دشمنی کرنیکا موقعہ ملے

تمہارے۔ اور احکام ہیں۔ اور دوسروں کے لئے دوسرے احکام ایسا نہ ہو کہ تمہارے مقصد سے بے خبر ہو کر لوگ یہ باتیں بولیں اور کفر میں پھنسیں شعر

ہندیاں را اصطلاح ہند مدح — سندھیاں را اصطلاح سندھ مدح
موسیا آداب دانا دیگر اند — سوختہ جان و روانان دیگر اند

ضروری ہے۔ کہ اہل شریعت صوفیائے کرام کی اصطلاح اور ان کی باتوں سے علیحدہ رہیں دانا کو چاہیئے۔ کہ سوختہ جان روانان سے دور رہے اَنَا الحق اور سبحانی ما اعظم شانی نہ تو ہر کوئی کہہ سکے۔ نہ سمجھ سکے نیز دربار الٰہی مقام ناز ہے اور دربار مصطفائی مقام نیاز۔ مصرع "باخدا دیوانہ و با مصطفےٰ ہشیار باش" وہاں انا اللہ کہنے پر بھی کچھ نہیں بگڑتا۔ اور یہاں راعنا کہنے پر ایمان جاتا ہے۔ لہٰذا اس گلی ہوش سنبھال کر قدم رکھو۔

مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْكُمْ

نہیں چاہتے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کتاب والوں میں سے اور نہ مشرکوں میں سے یہ کہ اُتاری جاوے اوپر تمہارے

وہ جو کافر ہیں کتابی یا مشرک وہ نہیں چاہتے۔ کہ تم پر کوئی بھلائی اُترے تمہارے رب کے پاس سے

مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْؕ وَاللّٰهُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ (۱۰۵)

کوئی بھلائی طرف سے رب تمہارے کے۔ اور اللہ تعالیٰ خاص فرماتا ہے ساتھ رحمت اپنی کے جسکو چاہتا ہے۔ اور اللہ بڑے فضل والا ہے

اور اللہ اپنی رحمت سے خاص کرتا ہے۔ جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

**تعلق۔** اس آیت کا پچھلی آیت سے کئی طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** پچھلی آیت میں یہود کی عداوت اور بغض کا ذکر تھا کہ وہ نبی علیہ السلام کی دشمنی کرنے کیلئے موقعہ ہی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ اب مسلمانوں کو اُن سے ڈرایا جارہا ہے۔ کہ یہ تمہارے سخت دشمن ہیں تمہاری بھلائی انہیں گوارا نہیں **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں بتایا گیا۔ کہ یہود نبی علیہ السلام کے ایسے دشمن ہیں۔ کہ اُن کے ساتھ کسی معاملہ میں گستاخی نہیں کرتے۔ اب فرمایا جارہا ہے مسلمانو وہ تمہارے کیونکر خیر خواہ ہو سکتے ہیں یعنی پہلے مخالفت نبی کا ذکر تھا۔ اب عداوت مومنین کا تذکرہ ہے۔ **تیسرا تعلق** پہلے بتایا گیا تھا۔ کہ یہود بُرے ارادے سے راعنا کہتے ہیں۔ اب اُسکی وجہ ارشاد ہورہی ہے۔ کہ وہ اس لئے ایسی حرکت کرتے ہیں۔ کہ مسلمان بھی عام طور پر یہ بولنے لگیں۔ اور فیضانِ نبوت سے محروم ہو جائیں۔ اور اُن پر کوئی خدا کی رحمت نازل نہ ہو۔ نیز انہیں لوگوں میں یہ کہنے کا موقعہ ملے کہ جب مسلمان اور اُن کے نبی ہماری بات نہیں سمجھ سکتے۔ تو رب کا فرمان کیا سمجھتے ہوں گے۔ اور رب تعالیٰ ایسے سیدھے لوگوں پر اپنا کلام کیونکر اتارتا ہوگا۔ **شانِ نزول** یہود کی ایک جماعت مسلمانوں سے دوستی اور خیر خواہی ظاہر کرتی تھی اور میٹھی باتوں سے اُن کا دل لبھانا چاہتی تھی۔ اُن کے جھٹلانے اور مسلمانوں کو بروقت خبردار کرنے کیلئے یہ آیت کریمہ اتری (جمل خزائن عرفان) **تفسیر** مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا۔ یَوَدُّ۔ وُدٌّ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ دل سے چاہنا اور پسند کرنا یا تمنی کرا اس کی نفی سے کراہت لازم آئی یعنی کفار نہیں چاہتے۔ بلکہ برا سمجھتے ہیں۔ کَفَرُوْا سے عام کافر مراد ہیں۔ خواہ منافق ہوں یا ظاہری اور ظاہر کفار میں بھی اہل کتاب ہوں۔ یا بُت پرست اسی لئے فرمایا گیا۔ کہ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِیْنَ یعنی عام کفار مراد ہیں۔ خواہ وہ یہود و نصاریٰ ہوں۔ یا مشرکین اُن میں کوئی بھی کبھی نہیں چاہتا۔ کہ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ خَیْرٍ کہ اے مسلمانو تم پر کوئی بھلائی اُترے۔ یا تو خیر سے مراد وحی ہے۔ اور عَلَیْكُمْ سے مراد نبیکم ہے۔ اور یا خیر سے عام بھلائی مراد ہے۔ اور علیکم اپنے ظاہری معنی پر یعنی کفار چاہتے

کہ تم پر کوئی بھلائی یا تمہارے نبی پر وحی آئے مِّنْ رَّبِّكُمْ تمہارے رب کی طرف سے یہ مِنْ ابتداء یہ ہے یعنی وہ خود تو تمہارے ساتھ بھلائی کیا کرتے یا اور کسی ذریعہ سے تم تک بھلائی کیا پہنچنے دیتے۔ وہ تو یہ بھی نہیں چاہتے۔ کہ حق تعالیٰ بھی تم پر فضل فرمائے کیونکہ یہود تو اپنے کو نبوت اور وحی کا ٹھیکیدار سمجھے ہوئے ہیں۔ اور مشرکین اپنے مال اور عزت کے گھمنڈ میں ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ نبوت کسی بڑے مالدار کو ملنی چاہیئے تھی۔ یا تو نعیم ابن مسعود طائفی کو ملتی یا ولید ابن مغیرہ مکی کو مگر انہیں ان باتوں سے کچھ فائدہ نہیں کیونکہ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ رب تعالیٰ جس کو چاہتا ہے۔ اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے۔ اُس کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں رحمت سے مراد نبوت وحی حکمت نصرت اور فتح مندی ہے۔ پھر یہ نہیں کہ نااہل کو اپنی رحمت دیدے۔ بلکہ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ اللہ بڑے فضل والا ہے۔ کہ جس پر رحمت کرنا چاہتا ہے۔ پہلے اُس میں لیاقت اور قابلیت بھی عطا فرماتا ہے۔ تو جس ذات کریم پر اُس نے وحی بھیجی۔ اور جس قوم پر قرآن اتارا اُسے پہلے ہی اُس کی لیاقت اور قابلیت بھی عطا فرمادی۔ فضل کے معنی ہیں محض کرم سے بغیر کسی کے استحقاق سے کچھ عطا فرمانا۔ **خلاصہ تفسیر** اے مسلمانو کفار کی چکنی چپڑی باتوں پر فریفتہ نہ ہو جانا۔ ہم تمہیں ان کا دلی حال بتاتے ہیں کہ کوئی کافر خواہ کتابی ہو یا مشرک کبھی چاہتا ہی نہیں۔ کہ تم پر خدا کا کوئی فضل بھی ہو۔ اہل کتاب تو اپنے کو ہر فضل کا حقدار جانتے ہیں اور مشرکین آخرت کی نعمتوں کو دنیوی نعمتوں پر قیاس کر کے کہتے ہیں۔ کہ جس طرح ہمیں مال اور عزت ملی ہے۔ ایسے ہی نبوت بھی ملنی چاہیئے تھی۔ مگر اُن بیوقوفوں کو یہ خبر نہیں کہ اللہ جسکو چاہتا ہے اپنی رحمت دیتا اور جس پر چاہتا ہے۔ اپنا فضل فرماتا ہے۔ یہ تو اُن بگڑے ہوئے خاندانی نوابوں کی طرح ہیں۔ جو کہ نئے دولتمند اور صاحب کمال لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور اپنے کو خاندانی اور موروثی نواب سمجھے بیٹھے ہیں۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** اللہ پر کچھ واجب نہیں اور نہ کسی کا اُس پر ذاتی حق ہاں اُس نے خود اپنے فضل سے جو حق جسکو دیدیا ہے وہ درست ہے۔ **دوسرا فائدہ** اللہ کی نعمت محض اُس کے فضل سے ملتی ہے۔ ہاں بعض نعمتوں میں بعض ظاہری اسباب کو بظاہر دخل ہوتا ہے **تیسرا فائدہ** نبوت محض وہبی ہے۔ اس میں کسب کو دخل نہیں **چوتھا فائدہ** حق تعالیٰ نااہل پر فضل نہیں کرتا بلکہ پہلے اُسے اہل بناتا ہے۔ پھر رحمت دیتا ہے مصرع بجائے خویش بود آنچہ کردگار دہد **پانچواں فائدہ** حسد بڑی بُری بیماری ہے اس میں حاسد خود اپنا ہی نقصان کر لیتا ہے محسود کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ **پہلا اعتراض** جب اللہ جس کو چاہے رحمت سے خاص کرے۔ تو تم نے نبوت اولاد ابراہیم کے ساتھ کیوں خاص مان لی۔ اور حضور علیہ السلام پر اُسکی انتہا کیوں مان بیٹھے ممکن ہے۔ کہ مرزا جی پر اس نے رحمت کر دی ہو یہ ختم یہود کا عقیدہ ہے **جواب**۔ یہ آیت ہی اعتراض کا جواب ہے جب اس نے نبوت اولاد ابراہیم کے ساتھ ختم نبوت حضور علیہ کے ساتھ خاص فرمادی تو ہمیں اس اعتراض کا کیا حق ہے یہ تو رب سے کہو یا قرآن سے پوچھو۔ **دوسرا اعتراض** تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ نااہل کو نعمت نہیں ملتی اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قیامت کے قریب نااہلوں کو سلطنت اور مال ملیگا۔ اب بھی کفار اور ظالم لوگ بادشاہ بنے بیٹھے ہیں **جواب** یہ سلطنت اور مال اور دولت نعمت نہیں بلکہ لعنت ہے۔ اس سے مجرموں کو سزا دینا منظور ہے۔ شعر

جو خواہد کہ ویراں کند عالمے  نہد ملک در پنجۂ ظالمے

**تفسیر صوفیانہ** اللہ کا فضل بہت وسیع ہے۔ جو اس سے محروم رہا وہ فضل کی تنگی سے نہیں بلکہ خود اپنی کوتاہی کی وجہ سے ہے۔ اس فضل کے لینے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو اہل اعمال جو کہ عبادت و زہد سے حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے اہل محبت جو کہ اپنے قرب اور و لی محبت کی وجہ سے فضل پاتے ہیں۔ اور بدنصیب جب اس سے محروم رہتے ہیں۔ تو وہ بیٹھے ہوئے ان پر حسد کیا کرتے تھے۔ درحقیقت حاسد پانچ طرح رب کا مقابلہ کرتا ہے۔ ایک یہ کہ اس نعمت سے بغض رکھتا ہے جو اُسکے غیر کو ملی۔ دوسرے یہ کہ وہ رب کی تقسیم سے راضی نہیں۔ بلکہ اُسے رائے دیتا ہے۔ کہ اس طرح تقسیم فرما۔ تیسرے یہ کہ رب کریم اپنے کرم سے دیتا ہے۔ اور یہ بخیل اُس پر بخل کرتا ہے

چوتھے یہ کہ اللہ کے ولی سے دشمنی رکھتا ہے۔ اور اسکی نعمت کا زوال چاہتا ہے۔ پانچویں یہ کہ وہ ابلیس کی امداد کرتا ہے۔ حاسد کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دوسرے کو پتھر مارے مگر وہ لوٹ کر اسکی کھوپڑی پر پڑے۔ اور اس کو زخمی کرے۔ سب سے پہلا حاسد شیطان تھا۔ انسانوں میں پہلا حاسد قابیل ہوا۔ ان دونوں کے انجام سے دنیا خبردار ہے۔ حسد تپ دق یا دمہ کی سی بیماری ہے جو دم کے ساتھ جاتی ہے۔ یہ یہود حسد کے ہی مارے ہوئے تھے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ

وہ جو منسوخ کردیں ہم کوئی آیت یا بھلادیں ہم اسکو لائیں گے ہم اچھی کو اس سے یا مثل اس کی کیا نہ جانا تو نے تحقیق اللہ

جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلادیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ

اوپر ہر چیز کے قادر ہے کیا نہ جانا تو نے تحقیق اللہ واسطے اسکے ہے ملک آسمانوں اور زمین کا اور نہیں ہے واسطے تمہارے

سب کچھ کرسکتا ہے۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے آسمان و زمین کی بادشاہی اور اللہ

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

سوا اللہ کے کوئی حمایتی اور نہ مددگار

کے سوا نہ تمہارا کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق** اس سے پہلے یہود کی دشمنی حضور علیہ السلام اور مسلمانوں کے ساتھ بیان کی گئی اب ان کی کتاب اللہ سے عداوت کا ذکر ہے۔ کہ وہ اس کتاب سے لوگوں کو ہٹانے کیلئے نسخ وغیرہ کے بیہودہ اعتراضات کرتے رہتے ہیں۔ اور ان اعتراضوں کا منہ توڑ جواب دیا جارہا ہے۔ **دوسرا تعلق** پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا۔ کہ وحی اللہ کا فضل ہے وہ جسکو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔ اس پر شبہ ہوسکتا تھا۔ کہ جب وحی خدا کا فضل ہے۔ تو کبھی منسوخ کیوں ہوتی ہے۔ اور جب قرآن کی ہر آیت خیر ہے۔ تو اس کے منسوخ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کے بجائے شر آجائے اس آیت میں اس شبہ کو دور فرمایا جارہا ہے۔ **شان نزول** مشرکین اور یہود مسلمانوں سے کہتے تھے۔ کہ کیا تم تعجب نہیں کرتے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو آج ایک کام کا حکم دیتے ہیں۔ اور کل اس سے منع کرکے دوسرا حکم دیتے ہیں۔ دیکھو پہلے زانی کے لئے فرمایا فَاٰذُوْهُمَا کہ انہیں زبان ایذا دو پھر اس کے خلاف حکم دیا کہ انہیں گھروں میں تادم مرگ قید کرو۔ پھر اسکو بھی بدلا اور کہا کہ انہیں سو کوڑے مارو وغیرہ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ خود ان کا کلام ہے کہ کبھی بے خبری میں کچھ کہدیتے ہیں۔ اور پھر نادم ہوکر اسے بدلتے ہیں اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ آئی (تفسیر روح البیان و احمدی)

**تفسیر مَا نَنْسَخْ** یہ مَا شرطیہ ہے جس کے معنی ہیں جو کچھ نَنْسَخْ نسخٌ سے نا ہے جسکے معنی ہیں زائل کرنا باطل کرنا فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ اللہ شیطانی وسوسے کو باطل فرماتا ہے۔ اور نقل کرتا ہے۔ كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ہم تمہارے اعمال کو نامہ اعمال میں نقل فرماتے تھے اسی لئے کتاب کی نقل کو نسخ اور ناقل کو ناسخ اور کتاب کو نسخہ کہتے ہیں۔ اور زمانہ کے تبدیلی اور احوال کے بدلنے کو تناسخ کہا جاتا ہے۔ شریعت میں کسی حکم یا آیت کی انتہا بیان کرنے کو نسخ کہتے ہیں۔ کیونکہ اس سے وہ حکم زائل یا منتقل ہوجاتا ہے۔

انشاءاللہ نسخ کی پوری تحقیق اور اقسام خلاصہ تفسیر میں بیان ہوں گے مِنْ اٰیَةٍ نسخ آیت کا بھی ہوتا ہے۔ اور حدیث کا بھی اور پوری شریعت
اور دین کا بھی بعض احکام کا بھی مگر چونکہ یہاں نسخ آیت پر ہی اعتراض تھا۔ اس لئے اسی کا ذکر ہوا۔ اور ممکن ہے۔ کہ آیت سے نشانی مراد ہو۔
جسمیں دین حکم، شریعت سب داخل ہوں خیال رہے کہ یہاں نسخ سے مراد نسخ حکم ہے نہ کہ نسخ تلاوت کیونکہ اُس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ اَوْ
نُنْسِهَا ایک قرات میں نَنْسَاهَا ہے۔ نون کے فتح اور ہمزہ سے یہ نَسَاءٌ سے بنا ہے جسکے معنی ہیں دیر لگانا اِنَّمَا النَّسِیٓءُ زِيَادَةٌ فِی
الْكُفْرِ اسی لئے اُدھار کو نسیہ کہتے ہیں یعنی جس آیت کے اُتارنے میں ہم دیر لگاتے ہیں لیکن مشہور قرات نُنْسِهَا ہے یہ نسیان سے بنا ہے
جس کے معنی ہیں بھول جانا جیسے فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا یا چھوڑ دینا جیسے فَالْيَوْمَ نَنْسَاهُمْ یعنی جس آیت کو ہم بھلا دیتے ہیں۔ کہ اسکی
تلاوت منسوخ فرمادیتے ہیں۔ یا جس آیت کو ہم چھوڑ دیتے ہیں یعنی قرآن میں باقی نہیں رکھتے نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اس سے اچھی ہم
لے آتے ہیں اس سے آسان تر یا ثواب میں زیادہ یا موجودہ حالت کے مناسب مراد ہے اَوْ مِثْلِهَا یا اس منسوخ آیت کی مثل کہ یہ
آیت ثواب اور آسانی اور مناسبت حالت میں منسوخ کی طرح ہوتی ہے۔ اگرچہ نسخ آیت کا حدیث سے بھی ہوتا ہے۔ جیساکہ ہم خلاصہ تفسیر میں
عرض کریں گے۔ لیکن چونکہ حدیث بھی رب ہی کا فرمان ہے۔ اس لئے وہاں بھی ناسخ رب تعالیٰ ہی ہے۔ اَلَمْ تَعْلَمْ یا تو کفار سے خطاب ہے
اور یا مسلمانوں سے یعنی اے منکر کافر یا اے قرآن پڑھنے والے مسلمان کیا تو نہیں جانتا اور ممکن ہے۔ کہ حضور علیہ السلام سے خطاب ہو
اور استفہام انکاری یعنی بیشک آپ جانتے ہیں۔ کہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کہ کائنات عالم کو ہر لحظ
اور ہر آن بدلتا ہے۔ تو کیا وہ احکام بدلنے پر قادر نہیں اور جو مالک الملک دنیوی حالتوں کو بدلتا رہتا ہے۔ کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ احکام بھی بدل
دے اور کیا وہ اس پر قادر نہیں، کہ مختلف احکام سے دین و دنیا کا نظام قائم رکھے اچھا ہم پوچھتے ہیں۔ کہ اَلَمْ تَعْلَمْ یہاں بھی یا تو ہر عقلمند
سے خطاب ہے یا خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ کیا تم نہیں جانتے کہ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ سارے آسمان
وزمین اللہ ہی کا ملک ہے۔ اور ان میں تو دن رات تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ دن و رات موسم وغیرہ بدلتے رہتے ہیں اور زمین میں مختلف ملک
اور مختلف قومیں ہیں جن کے علیحدہ قوانین ہیں۔ اور مختلف طریقہ زندگانی تو اگر آیتوں کے تبادلہ سے قرآن خدائی کتاب نہیں رہتا تو چاہیئے۔ کہ
ان حالات کے تبادلہ سے زمین آسمان خدا کے ملک نہ رہیں اور یہ تو خدا کے ملک ہیں تو قرآن بھی خدا کی کتاب ہے۔ وَمَا لَكُمْ مِّنْ
دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ رب کے سوا تمہارا کوئی حمایتی دوست نہیں تاکہ تم نسخ فرمانے والے رب کو چھوڑ کر اسکی پناہ میں آجاؤ
اور نہ کوئی مددگار ہے۔ کہ جب تم ناسخ احکام چھوڑ کر عذاب پاؤ تو تمہیں بچا سکے۔ یا یوں کہو۔ کہ تمہارے حالات میں تبدیلی فرمانے والا رب ہی ہے
اُس کے سوا کوئی دوسرا مالک نہیں تو آیات قرآن میں تبدیلی فرمانے والا بھی رب ہی ہے نہ کہ کوئی اور خلاصہ تفسیر۔ کفار اہل کتاب اور
مشرکین جو کہ نسخ پر اعتراض کرتے ہیں۔ اُن کو جواب دے دو۔ کہ ہم جو بھی آیت یا جو حکم یا جو شریعت یا جو دین منسوخ فرمادیتے ہیں۔ کہ یا تو اُس
کے صرف احکام بدل دیں مگر اُس کا چرچا باقی رکھیں یا بالکل اُس کو بھلا ہی دیں اور اُس کا چرچا بھی ختم فرمادیں تو اس سے اچھی آیت یا اچھا
حکم یا اچھا دین بھیجدیتے ہیں۔ یا اسی کی مثل کیا تم نے نہ دیکھا کہ دین موسوی منسوخ ہوکر دین عیسوی آیا جو اُس سے آسان تر تھا۔ پھر اسکے بعد دین
محمدی بھیجا گیا جو سب سے بہتر ہے۔ کیا تم نے خدا کی قدرت کو محدود سمجھ رکھا ہے۔ کہ وہ ایک حکم کے سوا دوسرے سے کام نہ چلا سکے نہیں۔
بلکہ وہ رنگ برنگے احکام بھیجکر اپنی قدرت کا اظہار فرماتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ زمین و آسمان میں اللہ ہی کی بادشاہت ہے اور ایسی مستقل
بادشاہت کہ اُس کے سوا کوئی دوسرا بادشاہ تو کیا بندوں کا حمایتی اور مددگار بھی نہیں۔ مگر اس کے باوجود زمین و آسمان میں ہر وقت انقلاب
اور حالات کی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ہر دن ایک نئے حال کا ظہور ہوتا ہے اور نئی شان کی جلوہ گری کونسی چیز ہے جس کو قرار ہے۔ اے یہودیو!
اگر تم آیات کی تبدیلی سے قرآن کے کتاب اللہ ہونے کا انکار کرتے ہو۔ تو کیا حالات کے بدلنے سے جہان کے ملک اللہ ہونے کا بھی انکار

کر دو گے. کیا تم قرآن کی مخالفت میں ایسے اندھے ہوئے. کہ اپنا اصل دین ایمان کھوئے دیتے ہو **نسخ اور اُسکے اقسام اور احکام** نسخ کے لغوی اور اصطلاحی معنی تفسیر میں معلوم ہو چکے یہ ضرور خیال رہے کہ نسخ ہمارے لئے تبدیل ہے. اور رب تعالیٰ کے علم میں انتہاءِ مدت کا بیان نسخ نقلاً اور عقلاً ہر طرح جائز بلکہ واقع ہے. **عقلاً** تو اس لئے کہ احکام دو قسم کے ہیں تکوینی اور تشریعی. تکوینی احکام کا تعلق عالم کی پیدائش سے ہے اور تشریعی احکام قابل عمل قوانین کا نام ہے ہم دیکھتے ہیں. کہ تکوینی احکام میں ہمیشہ انقلاب رہتا ہے خود ہم پر بچپن سے بڑھاپے تک صدہا انقلاب آتے ہیں. زمین و آسمان کون و مکان میں ہر وقت تغیر اور انقلاب رہتا ہے نہ زمین و آسمان کو ایک حال پر قرار ہے. نہ ان کی کسی چیز کو جب تکوینی احکام دن رات بدل رہے ہیں. تو تشریعی احکام کے بدلنے میں کیا مضائقہ ہے. بلکہ حق یہ ہے. کہ تشریعی احکام کو تکوینی احکام کے ساتھ خاص تعلق ہے. جیسے مخلوق کی حالت ویسے اُسکے احکام بچے پر جسم ڈھانکنا فرض نہیں غریب پر زکواۃ واجب نہیں مالدار کو زکواۃ کھانا جائز نہیں. حضرت آدم کے زمانہ میں بہن سے نکاح حلال تھا. اور اُسکے بعد حرام یہ تبدیلی احکام کیوں ہے. تکوین بدلنے سے اگر انسان کی حالت تو بدلتی رہے مگر اس کے احکام نہ بدلیں تو زندگی دشوار ہو جائے بڑھاپے تک ماں کا دودھ ہی پینا پڑے. اسی لئے اس آیت کریمہ میں تکوین کے اختلاف سے نسخ احکام ثابت کیا گیا **نقلاً** اسواسطے کہ آدم علیہ السلام سے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک صدہا پیغمبر تشریف لائے. مگر اُن کے احکام میں سخت اختلاف رہا. آدم علیہ السلام کے دین میں اپنی بہن سے نکاح حلال تھا. جو کہ شریعت نوح علیہ السلام سے منسوخ ہوا. پھر نوح علیہ السلام کی شریعت میں سارے چوپائے حلال تھے. دین موسوی میں بہت سے حرام کر دیئے گئے. خود ہمارے اسلام میں اوّلاً شراب حلال رہی بعد میں حرام ہوئی پہلے وفات کی عدت ایک سال تھی. اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ پھر چار ماہ دس دن ہوئی پہلے حضور علیہ السلام سے عرض معروض کرنے کے لئے خیرات کرنا واجب تھی. فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً پھر یہ حکم ءَاَشْفَقْتُمْ کی آیت سے منسوخ ہوا. پہلے پچاس نمازیں فرض تھیں بعد میں پانچ رہیں پہلے بیت المقدس قبلہ تھا بعد میں کعبہ ہوا غرضکہ جیسے دن رات سے گرمی سردی سے بچپن جوانی سے تندرستی بیماری سے بہار خزاں سے منسوخ ہوتی ہے. ویسے ہی آیت آیت سے ایک حکم دوسرے حکم سے ایک دین دوسرے دین سے منسوخ ہوتے ہیں. افسوس ہے. کہ اتنی ظاہر بات کو عیسائی. پادری اور ہندو وغیرہ نہ سمجھ سکے جن کی کیا شکایت ہمارے علی گڑھی تہذیب کے مسلمان اور جاہل مفسر اس کا انکار کر رہے ہیں. **نسخ کی قسمیں** نسخ کی تین قسمیں ہیں. نسخ تلاوت[1] نسخ حکم[2] اور نسخ تلاوت و حکم[3]. نسخ تلاوت یہ ہے. کہ آیت کے الفاظ قرآن میں نہ رہیں اور نماز وغیرہ میں اُسکی تلاوت جائز نہ ہو مگر اُسکے احکام باقی ہوں. جیسے کہ یہ آیت اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ یعنی جب بڈھا اور بڈھی زنا کر بیٹھیں تو اُن کو سنگسار کر دو. اللہ سے ڈرانے کیلئے. یہ آیت تلاوۃً منسوخ لیکن اُس کا حکم باقی تفسیر عزیزی نے اس قسم کی بہت سی منسوخ آیتیں بیان فرمائی ہیں. منسوخ فی الحکم یہ کہ آیت قرآن میں موجود رہے اُسکی تلاوت بھی ہوتی ہو. مگر اُس کا حکم باقی نہ ہو. جیسے مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ سے عدت وفات ایک سال معلوم ہوتی ہے بمگر اب یہ حکم منسوخ ہو چکا. مگر آیت کی تلاوت باقی ہے. منسوخ التلاوت والحکم یہ ہے. کہ نہ تو آیت کا حکم باقی رہے اور نہ اُس کی تلاوت جیسے ایک آیت تھی عَشْرُ رَضَعَاتٍ مَعْلُوْمَاتٍ جس سے معلوم ہوتا تھا. کہ عورت کا دودھ دس گھونٹ پینے سے رضاعت ثابت ہوگی. مگر اب نہ اس آیت کی تلاوت رہی اور نہ اس کا حکم بلکہ ایک گھونٹ سے بھی رضاعت ثابت ہو جاتی ہے. ان تینوں قسموں کو مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا میں بیان فرمایا **نسخ کی دوسری قسمیں** پھر نسخ کی تین قسمیں ہیں. آسان حکم[1] سے مشکل حکم کا نسخ جیسے کہ وفات کی ایک سال کی عدت ۴ ماہ دس دن سے منسوخ ہوئی[2] مشکل حکم سے آسان حکم کا نسخ مگر اس مشکل میں زیادہ جیسے کہ ترک جہاد کا حکم جہاد کی آیات سے منسوخ ہوا کہ اگرچہ جہاد ہے. تو مشکل مگر اس کا ثواب بہت[3] مساوی کا مساوی سے نسخ یعنی منسوخ اور ناسخ آسانی اور ثواب میں برابر ہوں. جیسے تبدیل قبلہ کہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا منسوخ ہوا اور کعبہ اللہ قبلہ بنا مگر ان دونوں

قبولوں میں ثواب اور آسانی برابر اسی تقسیم کی طرف اس عبادت میں اشارہ ہے۔ نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا خیر سے مراد یا آسان یا زیادہ باعثِ ثواب ہے اور مثل سے مراد برابر ہے۔ **محل نسخ** قیاس اور اجماع نہ تو منسوخ ہو سکتے ہیں۔ نہ ناسخ صرف قرآنی آیات اور احادیث میں نسخ ہوتا ہے۔ ان میں بھی صرف قابل نسخ احکام کی آیتیں اور حدیثیں منسوخ ہو سکتی ہیں یعنی مستقل واجب اور مستقل حرام کی آیتیں منسوخ نہیں ہو سکتیں جیسے ایمان کے وجوب اور کفر کے حرمت کی آیتیں اس طرح حق تعالٰی کی ذات وصفات کی آیات واحادیث نسخ کے قابل نہیں نیز قرآن وحدیث کی خبریں بھی منسوخ نہیں ہو سکتیں۔ ہاں وہ قوانین جو خبری شکل میں بیان ہوئے وہ یقیناً نسخ کے قابل ہیں۔ جیسے کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ (تم پر روزے فرض کئے گئے) یا وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ (لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے) یہ بظاہر خبریں ہیں۔ مگر درحقیقت شرعی قانون لہذا ان کا نسخ جائز ہے۔ اس لئے آیت وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ (تم دل کی باتیں ظاہر کرو یا چھپاؤ رب سب کا حساب لیگا) بظاہر خبر اور درحقیقت قانون ہے۔ اس لئے آیت لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا سے منسوخ ہو گیا۔ نیز لَاۤ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ کی آیت لِیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ سے منسوخ ہے۔ غرضکہ جہاں خبر کے نسخ سے جھوٹ لازم آجائے۔ وہ نسخ منع ہوگا۔ اس کے علاوہ جائز یہ قاعدہ خیال میں رکھنا چاہیئے۔ ہر خبر کا منسوخ التلاوۃ ہونا جائز ہے جس کی بہت سی مثالیں ہیں دیکھو تفسیر عزیزی، اسی طرح جن احکام کو قرآن کریم نے دائمی فرمادیا وہ بھی منسوخ نہیں ہو سکتی جیسے خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا **نسخ کی صورتیں** نسخ کی چار صورتیں ہیں۔ نسخ آیت کا آیت سے جیسے لَكُمْ دِیْنُكُمْ کی آیت قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کی آیت سے منسوخ ہے یا مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ کی آیت اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا کی آیت سے منسوخ دوسرے[۲] نسخ حدیث کا حدیث سے۔ جیسے مثلہ کرنے کی حدیث اس کی ممانعت کی حدیث سے منسوخ ہے۔ (مثلہ مقتول کے اعضا کاٹنے کو کہتے ہیں) یا جیسے کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے یا رفع یدین کرنے کی حدیثیں دوسری احادیث سے منسوخ تیسرے[۳] آیت کا نسخ حدیث سے جیسے غیر اللہ کو سجدہ تعظیمی کا جواز قرآن سے ثابت اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ وغیرہ مگر حدیث سے منسوخ یا جیسے ماں باپ اور اہل قرابت کو وصیت کرنا قرآن سے ثابت اَلْوَصِیَّةُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ۔ مگر یہ حکم حدیث لَا وَصِیَّةَ لِلْوَارِثِ سے منسوخ یا اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ کی آیت سے ثابت تھا۔ کہ ماں بہن وغیرہ چند عورتوں کے سوا تمام عورتیں حلال ہیں۔ مگر یہ آیت اس حدیث منسوخ ہے۔ کہ لَا تُنْكَحُ الْمَرْاَةُ عَلٰى عَمَّتِهَا وَلَا عَلٰى خَالَتِهَا جس سے معلوم ہوا کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ بھانجی کو نکاح میں جمع کر سکتے۔ اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں۔ جو حدیث سے منسوخ ہیں۔ چوتھے[۴] نسخ حدیث کا قرآن سے جیسے کہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا حدیث سے ثابت تھا۔ اور وہ اس آیت سے منسوخ ہوا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ایسے ہی رمضان کی راتوں میں بیوی سے جماع کی حرمت حدیث سے ثابت تھی۔ مگر وہ اس آیت سے منسوخ ہوئی اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اس قسم کی بہت سی احادیث جو آیات سے منسوخ ہیں۔ اس کی پوری تحقیق کتاب الاعتبار مصنفہ علامہ حازمی شافعی میں دیکھو۔ خیال رہے کہ قرآن یا حدیث میں جس قدر نسخ ہونا تھا وہ حضور کی زندگی پاک میں ہو گیا۔ اب حضور کی وفات شریف کے بعد کسی قسم کا نسخ ممکن نہیں۔ کیونکہ نہ اب وحی آسکتی ہے اور نہ نئی حدیث لہذا اب سارا قرآن اور ساری احادیث محکم ہیں **نسخ کی وجوہات** نسخ کی چند وجہیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ پہلا عارضی طور پر ضرورۃً جاری کیا گیا تھا۔ بعد کو ختم کر دیا گیا۔ جیسے شریعت آدم علیہ السلام میں بہن سے نکاح اس لئے جائز تھا۔ کہ دوسری عورتیں ملتی نہ تھیں۔ بعد کو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ دوسرے یہ کہ پہلے حکم کے لوگ عادی ہو چکے تھے۔ اس کا ایک دم چھوڑنا مشکل تھا۔ لہذا آہستگی سے بند کیا گیا جیسے کہ اہل عرب شراب کے عادی تھے۔ اس لئے پہلے شراب سے نفرت دلائی گئی پھر نشے کی حالت میں نماز سے روکا گیا۔ پھر بالکل حرام کر دی گئی۔ اسی طرح اہل عرب روزے کی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے پہلے تو سال میں صرف عاشورہ کا ایک روزہ فرض کیا گیا۔ پھر ہر مہینہ

میں تین روزے پھر ماہ رمضان کے روزے فرض ہوئے تیسرے یہ کہ نسخ سے محبوب کی عظمت کا اظہار ہو جیسے کہ معراج میں پچاس نمازیں فرض ہوئیں پھر پانچ پانچ کٹ کر آخر کار پانچ رہیں تاکہ موسیٰ علیہ السلام کو عظمت مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کا پتہ لگ جائے۔ کہ انہیں بارگاہ الٰہی میں بہت باریابی ہے۔ اعلیٰحضرت نے فرمایا۔

قصر دنیٰ تک کس کی رسائی جاتے یہ ہیں آتے یہ ہیں

اسی طرح تبدیلی قبلہ کا حکم جس سے حضور علیہ السلام کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ چوتھے یہ کہ اس سے خود ناسخ کی عظمت معلوم ہو جیسے کہ اسلام سے دوسرے ادیان کا نسخ ہونا۔ اگر اول ہی سے دنیا میں اسلام آجاتا تو اس کے قوانین کی برتری ظاہر نہ ہوتی۔ پانچواں یہ کہ ہر شے اپنے اصل پر پہنچ کر ختم اور منسوخ ہو جاتی ہے۔ اور اس سے الگ رہ کر مضطرب رہتی ہے۔ جیسے کہ تمام دریا سمندر کی طرف اس تیزی سے بھاگتے ہیں۔ کہ جو درخت یا پُل اُن کو روکے اسے بھی اکھیڑ ڈالتے ہیں۔ اور شور مچاتے ہوئے دوڑے چلے جاتے ہیں کیونکہ سمندر ان سب کی اصل ہے۔ کہ سمندر ہی سے بادل اٹھ کر پہاڑوں پر برسا یا برف بن کے گرا۔ اور اس سے دریا بنا اب یہ اپنے اصل کی طرف دوڑے مگر جب سمندر کے قریب پہنچے تو اُن کا وہ شور بھی جاتا رہا۔ اور زور بھی گھٹ گیا روانی میں بھی کمی آگئی اور سمندر میں پہنچ کر ایسے گم ہو گئے۔ کہ گویا تھے ہی نہیں اور بزبان حال یوں کہنے لگے۔ من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی ٭ تاکس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

حضور علیہ السلام نبوت کا سمندر ہیں سارے انبیاء دریا تمام ہوئیں اس طرف دوڑی آرہی تھیں۔ جو بھی فرعونی یا نمرودی طاقت ان سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو گئی مگر نبوت مصطفےٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سب گم ہو گئے۔ شعر

یہ انبیاء مرسلین تارے ہیں تم مہر مبیں سب جگمگائے رات بھر چمکے جو تم کوئی نہیں

**نسخ پر اعتراضات وجوابات + پہلا اعتراض** قرآن کریم فرماتا ہے۔ لَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ یعنی ہمارے قول میں تبدیلی نہیں اور نسخ میں تبدیلی ہی ہوتی ہے۔ لہذا نسخ ناجائز ہے **جواب**۔ نسخ کو بندے اپنی بے علمی سے تبدیلی سمجھتے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ تو ایک حکم کی انتہا کا بیان ہے نہ کہ تبدیلی مثلاً ایک سال کی عدت کچھ روز کے لئے تھی جب وہ مدت گزر گئی۔ وہ حکم بھی ختم ہو گیا۔ لہذا یہ تبدیلی قول نہیں۔ نیز تمہاری پیش کردہ آیت بھی تبدیلی قول سے مراد وعدہ خلافی ہے۔ اسی لئے وہاں ہے۔ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ یعنی ہمارا وعدہ خلاف نہیں ہوتا۔ اور ہم بندوں پر ظالم نہیں اور نسخ میں خبریں اور وعدے نہیں بدلتے صرف احکام بدلتے ہیں۔ **دوسرا اعتراض** قرآن فرماتا ہے وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا یعنی اگر قرآن غیر خدا کی کتاب ہوتی تو وہ اس میں اختلاف پاتے معلوم ہوا قرآن میں اختلاف نہیں اور نسخ اختلاف ہے چاہیئے کہ قرآن میں نہ ہو **جواب**۔ نسخ اختلاف نہیں۔ بلکہ ایک حکم کی انتہا کا بیان ہے۔ اختلاف سے مراد یہ ہے کہ خبریں واقعات کے مخالف ہوں یا کلام فصاحت و بلاغت میں یکساں نہ ہو جیسے کہ شعراء کے قصیدوں میں بعضے اشعار اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں اور بعضے ادنیٰ قرآن از اول تا آخر یکساں فصیح بلیغ ہے۔ یا اختلاف سے مراد تعارض ہے۔ کہ خبروں میں آپس میں مخالفت ہو نسخ کو اس سے کوئی تعلق نہیں **تیسرا اعتراض** نسخ قرآن کی کسی آیت سے ثابت نہیں مَا نَنْسَخْ والی آیت کا ترجمہ یہ ہے۔ کہ جو آیتیں ہم لوح محفوظ سے فرشتوں کے روزنامچوں میں نقل کرتے ہیں۔ یا اُن میں دیر لگاتے ہیں یہاں نسخ کے معنی نقل کرنا ہے نہ کہ بدلنا (مرزائی وغیرہ) **جواب**۔ معاذ اللہ یہ آیت کا ترجمہ نہیں۔ بلکہ تحریف ہوئی۔ اگر آیت کے یہ معنی ہیں۔ تو نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا کے کیا معنی ہوں گے۔ اس کے معنی وہ ہی ہیں جو ہم تفسیر میں عرض کر چکے اور رب فرماتا ہے۔ وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ اِلٰی اٰخِرِہٖ (جب ہم کسی آیت کو دوسری آیت کی جگہ بدلتے ہیں) یہاں صاف لفظ تبدیلی موجود ہے اور رب فرماتا سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اس سے معلوم ہوا۔ کہ بعض آیتیں بتا کر بھلا دی جائیں گی یعنی اُن کی تلاوت منسوخ ہو جائیگی۔ غرضکہ نسخ کا انکار

پوری جہالت ہے۔ **چوتھا اعتراض** نسخ کلام والے کی جہالت یا اُس کے عجز سے ہوتا ہے۔ اگر اُس کو خبر ہوتی۔ کہ یہ حکم ہمیشہ کام نہ دیگا۔ تو پہلے ہی سے کارآمد حکم بھیجتا۔ جو حکم پیچھے بھیجا ہے۔ وہ پہلے ہی کیوں نہ بھیجا (آریہ) **جواب**۔ نسخ کی بہت سی وجہیں ہوتی ہیں۔ انسانوں کے حالات کے اختلاف سے بھی احکام بدل جاتے ہیں طبیب اپنے بیمار کیلئے اُس کی حالت کے موافق دوائیں اور غذائیں تجویز کرتا ہے۔ جوں جوں مریض کی حالت بدلے گی طبیب کی تجویز بھی بدلے گی یہ تبدیلی طبیب کی جہالت کی نہیں۔ بلکہ کمال کی دلیل ہے۔ رب کو معلوم تھا کہ انسان اوّلاً بچہ پھر جوان پھر ادھیڑ اور آخر کار بڈھا ہوگا۔ اُس نے پہلے ہی سے کیوں نہ بڈھا کر دیا پنڈت جی اگر آپ بڈھے پیدا ہوتے تو آپ کا تو کچھ نہ بگڑتا آپ کی والدہ صاحبہ دنیا سے بے ٹکٹ روانہ ہو جاتیں۔ **پانچواں اعتراض** تو چاہیے کہ اب بھی اسلام اور قرآن میں نسخ جاری رہے کیونکہ دنیا کے حالات اب بھی بدل رہے ہیں **جواب**۔ ہر چیز کمال پہ پہنچنے سے پہلے بدلتی ہے۔ اور کمال پہ پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے۔ بچہ پہلے گھٹی پھر ماں کا دودھ پھر چاول وغیرہ استعمال کرتا ہے پھر روٹی پہ پہنچ کر ٹھہر جاتا ہے۔ کہ اُس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ بیمار کی دوائیں بدلتی رہتی ہیں مگر آخر میں کوئی پیٹنٹ مقوی دوا تجویز کر دی جاتی ہے۔ کہ اسے ہمیشہ استعمال کیا کرے۔ جوانی سے پہلے جسم انسانی میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ مگر جوانی پہ پہنچ کر تبدیلی بند ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اب آدمی کمال پہ پہنچ گیا اسی طرح ادیان میں تبدیلی ہوتی رہی اور مسائل میں نسخ کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ بشارت الٰہی آگئی کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ اب کمال کے بعد نسخ اور تبدیلی کیسی **چھٹا اعتراض** جب اسلام مکمل دین ہے۔ تو عیسیٰ علیہ السلام اس کے جزیہ وغیرہ کے احکام کیوں منسوخ فرمائیں گے۔ نیز حضرت عمر نے اپنی خلافت کے زمانہ میں قرآن کی بعض آیتیں کیوں منسوخ کیں۔ کہ زکوٰۃ کے مصرف قرآن نے آٹھ بیان فرمائے۔ مگر انہوں نے مؤلفۃ القلوب (مائل باسلام کفار) کو اس سے نکال کر صرف سات مصرف رکھے **جواب** عیسیٰ علیہ السلام جزیہ وغیرہ ہرگز منسوخ نہ فرمائیں بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی اس کی حد بیان فرما دی کہ جزیہ وغیرہ کا حکم عیسیٰ علیہ السلام کی آمد تک ہے۔ اس کے ناسخ حضور علیہ السلام ہی ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام تو اسے جاری فرمائیں گے۔ نیز عمر رضی اللہ عنہ نے کوئی حکم منسوخ نہیں کیا۔ بلکہ حکم کی علت اٹھ جانے کی وجہ سے حکم خود اُٹھ گیا۔ ضعف اسلام کی وجہ سے مؤلفۃ القلوب زکوٰۃ کے مصرف تھے۔ جب خلافت فاروقی میں اسلام قوی ہو گیا تو یہ نکل گئے جب زید مالدار تھا۔ اس پر زکوٰۃ فرض تھی جب غریب ہو گیا تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ رہی۔ درحقیقت حکم زکوٰۃ منسوخ نہیں ہو گیا۔ بلکہ علت بدل جانے سے بدل گیا **ساتواں اعتراض** قرآن کریم فرماتا ہے۔ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ یعنی قرآن اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتا ہے۔ اگر یہ انہیں منسوخ کر دے۔ تو تصدیق کہاں رہی **جواب** اس کا جواب بارہا گزر گیا۔ کہ اُن کتابوں نے قرآن کے آنے کی خبر دی تھی۔ اس کی آمد سے وہ سچی ہو گئیں۔ نسخ تبدیلی کے خلاف نہیں حکیم اپنا نسخہ بدلتا ہے جس سے اُس کا پہلا نسخہ غلط نہیں ہو جاتا بلکہ اپنے وقت پر وہ صحیح تھا۔ اس وقت یہ صحیح ہے۔ **آٹھواں اعتراض** حدیث میں ہے۔ کہ کَلَامِیْ لَا یَنْسَخُ کَلَامَ اللّٰہِ میرا کلام خدا کے کلام کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ اور تم کہتے ہو کہ حدیث سے۔ قرآن منسوخ ہوتا ہے (شافعی) **جواب**۔ اس حدیث کا یہ مطلب ہے۔ کہ جو کلام میں اپنی رائے سے فرما دوں۔ وہ کلام الٰہی کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ لیکن جو کلام رب کے الہام سے ہو وہ یقیناً منسوخ کر سکیگا۔ کیونکہ حدیث و قرآن ایک ہی ہیں۔

**نکتہ**: حکم اُٹھ جانا نسخ ہے۔ اور کسی وجہ سے حکم جاری نہ ہونا نسخ نہیں۔ غریب آدمی پر زکوٰۃ واجب نہ ہونا مجبور پر جہاد فرض نہ ہونا نسخ نہیں کہ یہ حکم تو باقی ہے ضرورۃً اس کا اجراء نہ ہوا اور رمضان کی راتوں میں جماع کی حرمت منسوخ ہے کیونکہ یہ حکم ہی اُٹھ گیا۔

**تفسیر صوفیانہ** جس طرح طبیب جسمانی مریض کی مزاج کے موافق نسخہ تجویز کرتا ہے۔ اور پھر اُس کی حالات کے لحاظ سے اپنے نسخہ میں تبدیلی کرتا رہتا ہے۔ یوں ہی طبیب روحانی یعنی مرشد کامل اپنے مرید کی حالت کا خیال رکھتا ہے بعض اعمال کسی وقت اُس کو مفید پھر وہ ہی اعمال دوسری وقت مضر ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی تعلیم میں اس کا لحاظ رکھتا ہے اور جیسے کہ راستہ طے کرنیوالے مختلف

ہوتے ہیں بعض موٹر کار سے بعض سائیکل سے بعض دوڑ کر بعض آہستہ چل کر ایک ہی راستہ مختلف مدت میں طے کرتے ہیں۔ یہ ہی حال راہ طریقت کا ہے۔ کہ اس کے مسافر مختلف حال رکھتے ہیں۔ لیکن بحمدہٖ تعالیٰ طالب جس منزل سے گزرتا ہے۔ قرب الٰہی میں ترقی کرتا ہے اُس کی ہر اگلی حالت پچھلی حالت بہتر ہوتی ہے۔ ایک وقت ذکر جہری اُس کا شعلہ تھا۔ یہ حالت منسوخ ہو کر ذکر خفی کی حالت پیدا ہوئی۔ پھر وہ یہ منزل بھی طے کر کے ذکر اخفی کے درجہ میں قدم رکھتا ہے۔ غرضکہ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا کی وہاں ہر وقت جلوہ گری ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

رمز ننسخ آیة او ننسها — نأت خیراً در عقب می دال ہا

آنکہ داند دوخت او داند درید !! — ہر چہ را بفروخت نیکو تر خرید

لہٰذا چاہیئے کہ طالب صادق اپنے کو شیخ کامل کے حوالہ کر دے اُس کی تعلیم میں نکتہ چینی نہ کرے ورنہ الطاف ربانی سے محروم رہے حضرت موسےٰ و خضر علیہ السلام کے قصہ سے سبق لے۔

أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ ۗ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ

کیا ارادہ کرتے ہو تم یہ کہ سوال کرو پیغمبر اپنے سے مثل اُسکے کہ سوال کیا گیا موسیٰ سے پہلے سے اور وہ جو کہ بدل لے

کیا یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے ویسا سوال کرو جو موسےٰ سے پہلے ہوا تھا اور جو ایمان کے بدلے

الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ﴿١٠٨﴾

کفر کو بعوض ایمان کے پس بیشک گمراہ ہو گیا وہ سیدھے راستہ سے

کفر لے وہ ٹھیک راستہ بہک گیا ۔

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے کئی طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** پہلے معلوم ہوا تھا۔ کہ یہود غیر منسوخ کتاب چاہتے ہیں جسکی بعض آئتیں منسوخ ہوں۔ اس کے ماننے سے انکاری ہیں۔ اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اِن کا یہ مطالبہ ایسا ہی نامعقول ہے جیسا کہ موسےٰ علیہ السلام سے انہوں نے اپنا من بھاتا خدا مانگا تھا۔ **دوسرا تعلق** پہلے معلوم ہوا تھا۔ کہ ناسخ حکم یا تو منسوخ سے بہتر ہوتا ہے۔ یا اُس کی مثل اس پر غالباً انہوں نے تفصیل کا مطالبہ کیا ہوگا۔ کہ ہمیں ہر ناسخ کی ہر منسوخ سے افضلیت بتائیے۔ لہٰذا فرمایا گیا۔ کہ اُن کا یہ سوال ایسا ہی لغو ہے جیسا کہ اس سے پہلے موسےٰ علیہ السلام سے کرتے تھے **تیسرا تعلق** پہلے معلوم ہوا کہ بعض احکام الٰہی بعض سے منسوخ ہوں گے۔ اب پوچھا جا رہا ہے۔ کہ کیا تم اطاعت کر کے مقبول بنو گے یا یہود کی سی کج بحثی کر کے مردود **چوتھا تعلق** پہلے معلوم ہوا تھا۔ کہ بعض احکام بعض سے منسوخ ہوں گے اب فرمایا جا رہا ہے کہ یہ نسخ ہماری مرضی کے مطابق ہوگا۔ اے مسلمانو تم یہود کی طرح اپنی رائے کے مطابق ہوگا۔ اے مسلمانو تم یہود کی طرح اپنی رائے کے مطابق خود ہی نسخ کا مطالبہ نہ کرنا کہ اُن کا جو دل چاہتا تھا وہ تو مان لیتے تھے اور سخت احکام کے بدلنے کا پُر زور مطالبہ کیا کرتے تھے بلکہ ہم موقعہ کے مطابق خود ہی نسخ فرماتے رہیں گے۔ **پانچواں تعلق** پہلے معلوم ہوا تھا۔ کہ احکام میں نسخ ہوگا۔ اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اے مسلمانو اگر تم اُن احکام کو قبول نہ کرو گے۔ تو اُن ہی سرکش یہود کی طرح ہو گے جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے نہ کرنے کے سوال کئے تھے **شان نزول** بعض مفسرین نے فرمایا۔ کہ ایک بار یہود نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔ کہ آپ ایسی کتاب لائے جو آسمان سے ایک بارگی نازل ہوئی ہو۔ ہم ایسی کتاب نہ مانیں گے جس میں ردّ و بدل ہوتا ہو۔ (تفسیر

خزائن عرفان) بعض نے فرمایا کہ عبداللہ ابن امیہ مخزومی ایک قریش جماعت کو لے کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا. اور عرض کیا کہ میں تو جب ایمان لاؤں کہ آپ زمین سے پانی کے چشمے جاری کردیں. یا آپ کے کھجور اور انگور کے باغات ہوں یا آپ کے پاس سونے کا گھر ہو. یا آپ آسمان پر چڑھ کر دکھادیں یا میرے نام رب کی کوئی چٹھی آجائے جس میں لکھا ہو. کہ اے عبداللہ ابن امیہ بیشک محمد صلے اللہ علیہ وسلم، میرے رسول ہیں. تو ان کی پیروی کر جماعت قریش بولی کہ یہ تو بڑی باتیں ہیں. انہیں جانے دیجئے. بلکہ موسیٰ علیہ السلام کیطرح کمل کتاب ایکدم لادیجئے تب یہ آیت کریمہ اُتری. مجاہد سے روایت ہے. کہ قریش نے ایک بار کہا تھا کہ صفا و مروہ پہاڑ کو سونے اور چاندی کا بنادو تب یہ آیت کریمہ اُتری (تفسیر کبیر) بعض یہ بھی کہا. کہ بعض نومسلموں نے حضور سے مطالبہ کیا تھا کہ مشرکین کی طرح ہمارے بھی چند معبود ہونے چاہیے اور بعض لوگ محض امتحان کے لئے معجزات کا مطالبہ کیا کرتے اُن کے حق میں یہ آیت کریمہ آئی لیکن یا تو پہلی روایت صحیح ہے. یا آخری کیونکہ سورہ بقر مدنی ہے. اور عبداللہ ابن امیہ مخزومی وغیرہ مکے کے باشندے تھے. اُن کے سارے مطالبے ہجرت سے پہلے ہی ہوا کرتے تھے. نیز بہت دور سے یہود سے گفتگو چلی آرہی ہے. اور آئندہ بھی انہیں کا ذکر ہے لہذا بہتر ہے کہ اب بھی انہیں کا تذکرہ ہو پچھلی روایت کی خود آیت کی عبارت تائید کرتی ہے اگر اس میں مسلمانوں سے خطاب ہو تو آیت میں کوئی تکلف نہیں کرنا پڑتا.

جیساکہ تفسیر سے معلوم ہوگا **تفسیر اَمْ تُرِیْدُوْنَ** ام یا تو او کے معنی میں ہے اور اس سے پہلے ایک عبارت پوشیدہ یعنی کیا تم ناسخ احکام کی اطاعت کروگے. یا تم اسی قسم کی کج بحثی کا ارادہ کررہے ہو. جو یہود کیا کرتے تھے. اس صورت میں یہ مسلمانوں سے خطاب ہے. یا اَمْ بل کے معنی میں ہے. اور مطلب یہ ہے. کہ تم نسخ وغیرہ کا بہانہ کرتے ہو. بلکہ تم انہیں بیہودہ سوالوں کا ارادہ کرتے ہو جو تمہارے بزرگوں نے موسےٰ علیہ السلام سے کیئے تھے اس صورت میں یہ یہود سے خطاب ہے. **اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ** کہ اپنے رسول سے وہ سوال کرو. اگر ہو مسلمانوں سے خطاب ہے. تو مطلب یہ ہے. کہ تم جس رسول کی امت میں ہو اُس عالی شان پیغمبر سے ایسا سوال کرنا چاہتے ہو. اور اگر یہود سے خطاب ہے. تو مطلب یہ ہوا. کہ جو رسول تمہاری ہدائت کیلئے بھیجے گئے. اُن سے یہ سوال کرنا چاہتے ہو. **كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ** جیساکہ اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا گیا تھا. کہ یہود نے اُن سے رب تعالیٰ کے دیکھنے یا مشکل احکام کے بدلوانے یا نیا خدا بنانے کا مطالبہ کیا تھا جس سے اُن پر بہت مصیبتیں آپڑیں کیا تم بھی ایسے لغو مطالبے کر کے مصیبت مانگتے ہو حالانکہ **وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ** جو ایمان کی عوض کفر لے لے. کہ رب کی اتاری آیتوں پر تو بھروسہ نہ کرے اور اپنی دل پسند باتوں کا مطالبہ کرے یا ایمان قبول کر کے شبہات میں پڑ جائے یا نبی کی اطاعت تو نہ کرے اور اُن کی آزمائش میں مشغول رہے. **فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ** یقیناً وہ سیدھے راستے سے بہک گیا. سواء کے معنی ہیں متوسط اور درمیانی چونکہ درمیانی سڑک سیدھی اور آس پاس کی گلیاں ٹیڑھی ہوتی ہیں اس لئے سواء سے سیدھا راستہ مراد ہے. انبیاء کی اطاعت اور اُن کی پیروی سیدھا راستہ ہے جس کو اختیار کرکے بے کھٹکے جنت تک پہونچنا ہوتا ہے. اُن کی مخالفت اور خواہشات نفس کی پیروی وہ ٹیڑھا راستہ ہے جو جہنم میں لے جائیگا. **خلاصۂ تفسیر** اے مسلمانو کیا تم بھی نسخ وغیرہ پر اعتراض یا نبی علیہ السلام سے غلط مطالبات یا اُن سے امتحاناً معجزات طلب کر کے اُسی قسم کے سوالات کرنا چاہتے ہو. جیسے کہ اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے کئے جاتے تھے تم اُن یہود کا انجام سن چکے جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ایسے سوالات سے پریشان کیا. اور تم کو یہ بھی معلوم ہے. کہ جو ایمان لاکر کفر میں پھنسے وہ گویا سیدھے راستے پر پڑکر بہک گیا اور ایسا آدمی بہت ہی بدنصیب ہے. یا اے یہودیو کیا تم چاہتے ہو کہ اس نبی آخر الزمان صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی ویسے ہی بیہودہ سوالات کرو جیسے کہ تمہارے باپ دادے موسیٰ علیہ السلام سے کیا کرتے تھے خیال رہے کہ وہ اور وقت تھا. یہ دوسرا زمانہ ہے. اب سخت سزا پاؤگے. تم نے ایمان و ایمانیات کو پہچان لیا. قرآن آتے دیکھ لیا صاحب قرآن کی زیارت کرلی. اُن کے

فرمان سن لئے اب جو کوئی بجائے ایمان لانے کے کفر کرے وہ سیدھے راستے سے بری طرح بہک گیا۔ **خیال رہے** کہ مسلمانوں کے تبدیلی کفر تو یہ ہے۔ کہ ایمان چھوڑ کر کفر قبول کرلیں یعنی مرتد ہو جائیں اور یہود وغیرہ کفار کے لئے یہ ہے۔ کہ ایمان اختیار نہ کریں اور کفر میں پھنسے رہیں اسی طرح سیدھے راستہ سے بہکنا مسلمانوں کیلئے تو یہ ہے۔ کہ وہ یہ راستہ چھوڑ کر اور طرف چل دیں اور کفار کے لئے یہ کہ سیدھا راستہ دیکھ کر اُسے اختیار نہ کریں اور غلط راستوں پر ہی چلتے رہیں۔ لہٰذا یہ آیت مومنین اور کفار دونوں کے حق میں ہو سکتی ہے۔ اور اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** بزرگوں سے ایسا سوال نہ کرنا چاہیئے جس سے نافرمانی ظاہر ہوتی ہو۔ یا جس سے فساد کا دروازہ کھلتا ہو۔ **دوسرا فائدہ** اللہ والوں کو اپنی رائے کا پابند نہ بنانا چاہیئے۔ بلکہ اُن کے فرمان کی خود پابندی کرنی چاہیئے **تیسرا فائدہ** انبیاء علیہ السلام کے فرمان میں کسی قسم کا شک کرنا یا عناد کے طریقہ پر سوالات کرنا یا اُن کے احکام سے ناراض ہونا یا اُن کا مذاق سے امتحان لینا کفر ہے۔ کیونکہ اس آیت میں اس قسم کے سوالات کو کفر قرار دیا **چوتھا فائدہ** حضور صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے بھی رسول ہیں۔ اور کفار حضور کے امتی کیونکہ رَسُوْلَکُمْ میں یہود سے خطاب ہے اور اُن کی طرف رسول کی نسبت **خیال رہے**۔ کہ اُمت دو قسم کی ہے۔ اُمت دعوت اور اُمت اجابت امت دعوت وہ جسکو رسول علیہ السلام تبلیغ احکام کریں۔ اور جس پر اُن پیغمبروں کی اطاعت واجب ہو امت اجابت وہ جو اُن کے احکام قبول کرے مومنین حضور کی امت اجابت ہیں اور کفار بلکہ سارا عالم امت دعوت لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا حق تعالیٰ تو عالمین یعنی تمام جہانوں کا رب ہے اور حضور علیہ السلام عالمین کے نبی انبیاء کرام ملائکہ عظام تمام حیوانات نباتات سمٰوات چاند سورج وغیرہ حضور کے امت اجابت ہیں۔ مگر ہر مخلوق کے جداگانہ احکام ہیں جن پر وہ پابند ہیں۔

**پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی سے سوال نہ کیا جائے تو ہدایت کیسے حاصل ہو **جواب**۔ سوال کے دو معنی ہیں پوچھنا اور مطالبہ کرنا نہ تو ہر طرح کا پوچھنا کفر ہے۔ اور نہ ہر مطالبہ بلکہ عناد یا مذاق کے لئے پوچھنا کفر ہدایت حاصل کرنے کیلئے پوچھنا ضروری بیکار سوالات منع ابوجہل تمسخر سے باتیں پوچھتا تھا۔ یہ کفر ہوا مسلمان عمل کیلئے احکام الٰہی پوچھتے تھے۔ یہ ثواب بعض ضعیف الاعتقاد بلا وجہ پوچھا کرتے تھے۔ کہ میری عورت حاملہ ہے۔ اس کے لڑکا ہوگا یا لڑکی یا کہ میرا باپ کون تھا۔ یہ منع اسی طرح معجزات کا مطالبہ کرنا اگر پیغمبر کو عاجز کرنے کی نیت سے ہو تو کفر ہے۔ جیسے کہ کفار کہتے تھے۔ کہ اگر آپ زمین سے چشمے نکال دیں یا باغات اُگا دیں۔ تو ہم ایمان لے آئیں۔ اس سے ایمان لانا منظور نہ تھا بلکہ فقط عاجز کرنا یا مذاق اڑانا اور اگر ایمان لانے سے پیشتر سچائی معلوم کرنے کیلئے معجزہ طلب کیا جائے تو جائز ہے۔ جیسے کہ بعض حضرات نے ایمان لانے سے پہلے معجزہ مانگا۔ اور دیکھ کر ایمان لے آئے۔ جیسے ابوبکر صدیق یا عبداللہ ابن سلام رضی اللہ عنہما نیز اگر مسلمان کفار کو دکھانے کیلئے معجزے کی خواہش کریں تو جائز ہے۔ اس آیت میں انہیں سوالات اور انہیں مطالبوں کا ذکر ہے۔ جو عناداً ہوں۔ اس لئے فرمایا گیا۔ کَمَا سُئِلَ مُوْسٰی مِنْ قَبْلُ **دوسرا اعتراض**۔ اگر اس میں یہود سے خطاب ہو تو اُن کے پاس ایمان تھا ہی کہاں جسے وہ کفر سے بدلتے اور وہ سیدھے راستہ پر تھے ہی کب جس سے وہ بہکتے **جواب**۔ اس کا تفصیلی جواب تفسیر میں گزر گیا۔ کہ اُن کا ایمان قبول نہ کرنا تبدیلی کفر ہے۔ یعنی اُن کے سامنے کفر ایمان دونوں موجود تھے۔ ایمان چھوڑ کر کفر اختیار کر لیا اسی طرح راہ ہدایت دیکھ کر اس پر نہ چلنا یہ ہی اُن کا بہکنا ہے۔ **تفسیر صوفیانہ** شریعت احکام ہیں۔ اور طریقت ادب۔ بے ادب مردود ہے۔ اگرچہ بظاہر احکام کا پابند ہو جیسے ابلیس وغیرہ اس آیت میں فرمایا گیا۔ کہ اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب ایمان کی روح ہے۔ بارگاہ نبوت میں بے دھڑک سوالات کر دینا ادب بے خوف ہر قسم کی بات کر ڈالنا یہ بے ادبی ہے۔ اور بے ادب یا تو فوراً ہی کافر ہو جاتا ہے۔ یا کبھی نہ کبھی کفر کر بیٹھتا ہے۔ ادب نفس کی قید ہے۔ جب نفس اس قید سے نکل گیا تو اسے کفر میں جانے سے کون روک سکے گا۔ ایمان اُس قلعے کی طرح ہے جس کے آگے پیچھے پانچ دیواریں ہوں۔ پہلی سونے کی دوسری چاندی کی تیسری لوہے کی چوتھی پتھر کی پانچویں کچی اینٹ کی

ایمان کی بھی پانچ دیواریں ہیں پہلی یقین کی دوسری اخلاص کی تیسری اداء فرائض کی چوتھی سنتوں کی پابندی کی پانچویں ادب کی اگر قلعے والے اپنے قلعے کی حفاظت چاہتے ہیں، تو سب سے پہلے اُس پانچویں دیوار کا بچاؤ کریں۔ جو کچی اینٹ کی ہے۔ اگر چور اُس کو پار کر آیا یا اُسے توڑ دیا۔ تو اب اگلی دیواروں کی بھی خیر نہیں اس طرح اگر شیطان نے ادب کی نازک دیوار کو توڑ دیا اور تمہیں بے ادب بنا دیا تو سمجھ لو کہ ایمان کی اگلی دیواروں کی بھی خیر نہیں ہے۔ پھر وہ آگے پیچھے سبھی کو توڑ دے گا۔ اس آیت میں اس پانچویں دیوار کی حفاظت کی ہی تاکید ہے۔ کہ دیکھو بارگاہ مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے بے ادب نہ بننا ورنہ پھر تمہارے ایمان کی خیر نہیں۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ

چاہا بہتوں نے کتاب والوں میں سے یہ کہ واپس کردیں تم کو پیچھے سے ایمان تمہارے کے کافر حسد سے

بہت کتابیوں نے چاہا کاش تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں اپنے دلوں کی جلن سے

عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ

نزدیک سے نفسوں اپنی کے پیچھے سے اُس کے کہ ظاہر ہوگیا واسطے اُن کے حق پس معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ لائے

بعد اس کے کہ حق ان پر خوب ظاہر ہو چکا ہے۔ تو تم چھوڑدو اور درگزر کرو یہاں تک کہ

اللَّهُ بِأَمْرِهِ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱۰۹)

اللہ حکم اپنا تحقیق اللہ اوپر ہر چیز کے قادر ہے۔

اللہ اپنا حکم لائے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

الثلثة

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق** پہلے نسخ وغیرہ پر یہود کے اعتراضات کا ذکر فرمایا گیا اب اُن کے اعتراضات کے مقصود کا ذکر ہو رہا ہے۔ کہ اے مسلمانو درحقیقت انہیں خود کوئی شبہ نہیں وہ تو محض تمہارے دلوں میں شبہات پیدا کرنے کے لئے اعتراضات کرتے ہیں۔ تاکہ تم ایمان چھوڑ کر پہلے کی طرح کافر بن جاؤ۔ **دوسرا تعلق** پہلے یہود کی گذشتہ فریب کاریوں کا ذکر کیا گیا۔ کہ وہ ان طریقوں سے مسلمانوں کو ایمان سے پھیرنا چاہتے ہیں۔ اب آئندہ کا تذکرہ ہے۔ کہ مسلمانو ہشیار رہنا یہود آئندہ بھی تمہارے شکار کیلئے بہت سے جال پھینکیں گے۔ کیونکہ وہ تو تمہارے ایمان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں **تیسرا تعلق** پہلے یہود کے اعتراضات بیان فرما کر اُن کے جوابات دیئے اور مسلمانوں کو ایسے واہیات سوالوں سے روکا گیا اب فرمایا جارہا ہے۔ کہ اے مسلمانو یہ تمہاری خاطر جواب دیئے جارہے ہیں۔ کہ تم ایمان پر قائم رہو انہیں تو ہدایت حاصل کرنا منظور ہی نہیں آئندہ اُن کے ہر سوال کا جواب نہ دیا جائیگا کیونکہ وہ تمام سوالات تمہیں گمراہ کرنے کیلئے ہوں گے خیال رکھنا اور ہشیار رہنا۔ **شانِ نزول** جنگ احد کے بعد فنحاص ابن عاذوراء اور زید ابن قیس اور دیگر یہود نے حضرت حذیفہ ابن یمان اور عمار ابن یاسر سے کہا۔ کہ اگر تم سچے ہوتے تو تمہیں جنگ میں شکست نہ ہوتی۔ لہٰذا تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ حضرت عمار نے فرمایا۔ کہ بتاؤ۔ کہ عہد شکنی اور بے وفائی کیسی ہے۔ انہوں نے کہا بہت بُری آپ نے فرمایا کہ میں عہد کرچکا ہوں۔ کہ اپنی آخری سانس تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ پھروں گا اور کفر اختیار نہ کرونگا۔ یہود بولے کہ عمار تو ہمارے ہاتھوں سے نکل ہی گئے۔ اب اُن کے لوٹنے کی کوئی امید نہیں۔ حذیفہ تم بولو۔ کیا ہم سے ملو گے حضرت حذیفہ نے فرمایا۔ کہ میں اللہ کے رب ہونے اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے اسلام کے دین ہونے قرآن کے ایمان کعبہ کے قبلہ ہونے اور مسلمانوں کے بھائی ہونے سے

راضی ہوں۔ یہود بولے قسم رب موسیٰ کی تمہارے دلوں نے حبیب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا جام پی لیا اس کے بعد یہ دونوں صحابی حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اس واقعہ کی خبر دی۔ آپ نے فرمایا کہ تم نے ٹھیک کیا اور کامیابی پائی۔

**تفسیر وَدَّ كَثِيْرٌ**۔ ودّ۔ وُدٌّ سے بنا جس کے معنی ہیں۔ چاہنا محبت کرنا پسند کرنا کثیر سے معلوم ہوا کہ سارے اہل کتاب یہ نہ چاہتے تھے۔ بلکہ ان میں سے اہل علم اور شیاطین کیونکہ عام کفار کو نہ تو کسی کو بہکانا آتا ہے اور نہ ان میں اپنے دین کی تبلیغ کا جذبہ ہوتا ہے مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ یعنی مشرکین کو یہ خواہش نہیں۔ یہ ارادہ تو ان کا ہے جو اپنے کو اہل کتاب کہتے ہیں۔ اور جو پچھلی کتابوں اور پچھلے نبیوں پر ایمان لانے کے دعوےدار ہیں اور نسخ وغیرہ کی حکمتوں سے خوب واقف ہیں۔ وہ جان بوجھ کر چاہتے ہیں۔ کہ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ کہ تم کو پھیر دیں۔ تفسیر روح البیان نے فرمایا کہ یہ لو حرف مصدریہ ہے بمعنی اَنْ کیونکہ جب لو ایسے فعل کے بعد آئے جس میں تمنّا کے معنی ہوں تو ان کے معنے میں ہوتا ہے۔ جیسے وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ یعنی بہت سے اہل کتاب تم کو پھیرنا چاہتے ہیں مگر کب مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ تمہارے ایمان لانے ایمان کی لذت چکھنے اور قرآن پاک کا لطف حاصل کرنے کے بعد۔ كُفَّارًا۔ یا تو یہ یَرُدُّوْنَكُمْ کی ضمیر سے حال ہے۔ یا اس کا مفعول دوم یعنی تم کو پھیر لیں کافر کرکے یا تمہیں کافر بنادیں حَسَدًا اودّ کی علت ہے۔ یعنی تمہاری خیر خواہی کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ محض کی بنا پر کہ ہم تو کافر رہے اور یہ مومن کیوں ہو گئے۔ ہم تو ڈوبے ہیں۔ ہم یار کو لے ڈوبیں گے۔ مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ یا تو یہ وَدَّ کے متعلق ہے۔ یا حَسَدًا کے یعنی انہوں نے تم کو مرتد کرنا محض نفسانی خواہش سے چاہا ہے۔ نہ کہ اپنی دین داری سے یا اپنے نفسانی حسد سے تم کو مرتد کرنا چاہا۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ مسلمان تو دینداری اور خلق کی خیر خواہی کے لئے دوسروں کو مسلمان کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن کفار اس لئے نہیں فقط نفسانی خواہش اور عداوت سے مسلمانوں کے مرتد ہونے کی تمنّا کرتے ہیں۔ اسکی دلیل یہ ہے۔ کہ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ کہ ان کی یہ ساری حرکتیں حق ظاہر ہو چکنے کے بعد ہیں۔ وہ خود سمجھتے ہیں۔ کہ حضور علیہ السلام سچے ان کا دین برحق ان کے معجزات نہایت کامل ان کی صفات توریت شریف میں مذکور اگرچہ اس شرارت بد ذاتی کا تقاضا تو یہ تھا۔ کہ تم ان کو اس کی سزا دیتے اور ان سے اس کا بدلہ لیتے مگر تم رب کی مرضی کے تابع رہو ابھی ہم تم کو اس کی اجازت نہیں دیتے بلکہ حکم دیتے ہیں فَاعْفُوْا۔ انہیں چھوڑ دو۔ یہ لفظ عفوٌ سے بنا ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں مٹا دینا اہل عرب کہتے ہیں عَفَتِ الرِّيْحُ الْمَنْزِلَ۔ ہوا نے گھر کے آثار مٹا دیئے۔ اصطلاح میں اس کے معنی ہیں۔ جرم کی سزا نہ دینا یعنی معاف کر دینا اور چھوڑ دینا وَاصْفَحُوْا اور ان سے درگزر کرو۔ یہ صفحٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کروٹ یعنی ان کی طرف سے کروٹ پھیر لو۔ ادھر توجّہ نہ کرو۔ خیال رہے کہ اس معافی دینے اور درگزر کرنے سے مراد رضامندی نہیں۔ کیونکہ کفر سے راضی ہونا بھی کفر ہے۔ بلکہ ان سے جنگ نہ کرنا اور ان کی بدکلامی کا جواب نہ دینا مقصود ہے جیسا کہ روایت میں آیا ہے۔ کہ بعض صحابہ کرام نے حضور علیہ السلام سے ان بہکانے والے یہود کے قتل کی اجازت چاہی اس پر یہ عبارت نازل ہوئی (روح البیان) اور اے مسلمانو یہ تحمّل اور بردباری اور صبر کا حکم ہمیشہ نہ رہیگا صرف اسی وقت تک برداشت کرلو۔ کہ حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ کہ اللہ جہاد کا حکم دے امر سے یا تو اجازت جہاد مراد ہے یا حکم جہاد پہلے تو مسلمانوں کو جہاد کرنا منع تھا پھر مباح کیا گیا کہ فرمایا گیا اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ پھر واجب فرمایا گیا۔ کہ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ اور اے مسلمانو یہ بھی نہ سمجھنا کہ تم کمزور ہی رہو گے اور وہ قوی بلکہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اس میں قدرت ہے۔ کہ کمزوروں کو زور دے کر انہیں زورمندوں پر غالب کردے **خلاصہ تفسیر** اے مسلمانو ان تمام اعتراضات سے یہود کا مقصود صرف یہ ہے۔ کہ تمہارے دل میں اسلام کی طرف سے شبہات پڑ جائیں جس سے تم مومن ہونے کے بعد کافر اور ایمان دار ہونے کے بعد بے ایمان بن جاؤ اور ان کی یہ حرکتیں صرف اس جلن سے ہیں کہ تم کو ایمان جیسی دولت کیوں مل گئی اور وہ اس سے کیوں محروم رہ گئے ورنہ وہ خود جانتے ہیں کہ

اسلام سچا ہے۔ اور وہ جھوٹے۔ مگر تم اُن کی اِن بیہودہ حرکتوں سے طیش میں نہ آجانا۔ اور اُن سے جنگ نہ کر بیٹھنا بلکہ اس وقت تک
درگزر اور چشم پوشی کیئے جانا جب تک کہ جہاد کی اجازت یا اُس کا حکم رب کی طرف سے نہ آجائے۔ اور اس تاخیر سے یہ مت سمجھ بیٹھنا کہ
ہم فی الحال تمہاری مدد سے عاجز ہیں نہیں اللہ تو ہر وقت ہر چیز پر ہر طرح قادر ہے۔ وہ ابابیل سے فیل مروا دیتا ہے۔ بلکہ اس تاخیر میں یہ
حکمت ہے۔ کہ اگر تم ابھی سے جہاد شروع کر دوگے تو لوگ بدگمانی کریں گے۔ کہ اسلام خونی دین ہے اور مسلمان بداخلاق اور خونخوار۔ کہ
ہر ایک سے لڑتے رہتے ہیں محبت اور صلح سے کسی کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکتے۔ جب اُن کے ظلم اور تمہاری برداشت حد کو پہنچیں گے۔
تب تمہیں پہلے تو ظلم دفع کرنے کی اجازت ملے گی۔ اور پھر کفار پر حملہ کرنے کا حکم دیا جائیگا اور جب تم اُٹھو گے تو انشاء اللہ دنیا بھر کے
کفار سو جائیں گے۔ اور پھر کسی کو تم پر اعتراض کا بھی موقعہ نہ ملے گا۔ دنیا دیکھ لے گی۔ کہ تم نے بہت برداشت کی خیال رہے کہ معافی اور درگزر
کی ساری آتیں آیات جہاد سے منسوخ ہیں۔ تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا۔ کہ بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ یہ آیت قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ
سے منسوخ ہے۔ اور امام باقر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے اس وقت تک جہاد کا حکم نہ دیا۔ جب تک حضرت
جبریل یہ آیت لے کر نہ آئے اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ اِلٰى آخِرِهٖ اس آیت پر حضرت جبریل نے حضور علیہ السلام کو تلوار پہنائی اور سب
سے پہلے عبداللہ ابن جحش اور اُن کے ساتھیوں نے بطن نخلہ میں جہاد کیا پھر بخاری کی روایت پر حضور علیہ السلام نے پہلا جہاد ابوا پھر بواط
پھر اُشیرہ پھر جنگ بدر فرمائی اور تفسیر کبیر و دیگر کتب سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ حضور کا پہلا جہاد جنگ بدر ہے۔ اور یہ دونوں روائتیں صحیح ہیں
یعنی باقاعدہ پہلی جنگ۔ جنگِ بدر ہوئی اس سے پہلے ابوا۔ بواط وغیرہ معمولی جھڑپیں تھیں۔ حضور علیہ السلام نے کل اُنیس[19] غزوہ فرمائے۔
**فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ پہلا فائدہ کفار مسلمانوں سے کبھی بھی راضی نہیں ہو سکتے اُن کے اتفاق کی
صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو وہ مومن ہو جائیں یا معاذ اللہ مسلمان مرتد کیونکہ ایمان نور ہے اور کفر تاریکی ایمان دن ہے۔ اور کفر رات جو مومن
اور کفار میں اتفاق کی کوشش کرتا ہے۔ وہ فطرت اور قدرت سے مقابلہ کرتا ہے۔ اسے کبھی کامیابی حاصل نہ ہو گی۔ اس کا بارہا تجربہ
ہو چکا مسلمانو رواداری کا گیت نہ گاؤ اپنے میں خودداری پیدا کرو۔ دوسرا فائدہ حسد بہت بُرا عیب ہے۔ حدیث پاک میں ارشاد ہوا کہ حسد
نیکیوں کو اس طرح کھا ڈالتی ہے۔ جیسے آگ خشک لکڑی کو دوسری روایت میں ہے۔ کہ حاسد درحقیقت حق تعالیٰ کی نعمتوں کے دشمن
ہیں (تفسیر عزیزی) اسی تفسیر عزیزی میں یہ بھی ہے۔ کہ چھ گروہ دوزخ میں بہت جائیں گے [1] امیر لوگ ظلم کی وجہ سے [2] اہل عرب تعصب
اور حمیت کے سبب [3] گاؤں والے تکبر اور غرور کی وجہ سے [4] بیوپاری خیانت کی وجہ سے [5] جنگی لوگ جہالت کی وجہ سے [6] عالم لوگ
حسد کی وجہ سے روایت میں ہے۔ کہ موسیٰ علیہ السلام نے کسی ایک شخص کو عرش کے سایہ میں دیکھا عرض کیا۔ کہ مولیٰ اس کو یہ درجہ کسی
عمل سے حاصل ہوا۔ ارشاد الٰہی ہوا۔ کہ تین عملوں سے ایک یہ کہ یہ کسی پر حسد نہ کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اپنے ماں باپ کا فرمانبردار تھا تیسرے
یہ کہ یہ چغل خوری سے محفوظ تھا فضل ابن مہلب فرماتے ہیں۔ کہ تکبر سے بچو کہ شیطان اسی گناہ سے ہمیشہ کا لعنتی ہوا۔ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ
حرص اور طمع سے بچو۔ کہ اسی نے آدم علیہ السلام کو جنت سے باہر کیا حسد سے دور ہو کہ حسد ہی سے قابیل نے ہابیل کو قتل کیا اور حسد ہی
سے برادرانِ یوسف نے یوسف علیہ السلام پر اتنی زیادتی کر ڈالی **حسد کے درجے** حسد کے چار درجے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ حاسد
دوسروں کی نعمت کا زوال چاہے کہ خواہ مجھے نہ ملے۔ مگر اس کے پاس سے جاتی رہے اس قسم کی حسد مسلمانوں پر گناہ کبیرہ ہے۔ اور
کافر و فاسق کے حق میں جائز مثلاً کوئی مالدار اپنے مال سے کفر یا ظلم کر رہا ہے۔ اس کے مال کی اس لئے بربادی چاہنا کہ دنیا کفر و ظلم
سے بچے جائز ہے۔ دوسرا درجہ یہ کہ حاسد دوسرے کی نعمت خود لینا چاہے کہ فلاں کا باغ یا اُس کی جائداد میرے پاس آجائے
یا اُس کی ریاست کا میں مالک ہو جاؤں یہ حسد بھی مسلمانوں کے حق میں حرام ہے۔ تیسرا درجہ یہ ہے۔ کہ حاسد اس نعمت کے حاصل

کرنے سے خود تو عاجز ہے اس لئے آرزو کرتا ہے. کہ دوسروں کے پاس بھی نہ رہے تاکہ وہ مجھ سے بڑھ نہ جائے یہ بھی منع ہے. چوتھا مرتبہ یہ ہے. کہ وہ تمنا کرے. کہ یہ نعمت اوروں کے پاس بھی رہے مجھے بھی مل جائے یعنی اوروں کا زوال نہیں چاہتا. اپنی ترقی کا خواہشمند ہے اسے غبطہ یا تنافس کہتے ہیں. یہ دنیوی باتوں میں منع اور دینی باتوں میں اچھا اور کبھی واجب بھی ہے. رب فرماتا ہے. وَفِي ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنٰفِسُوْنَ حدیث شریف میں ہے. کہ دو شخصوں پر حسد یعنی غبطہ جائز ہے. ایک وہ عالم دین جو اپنے علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہو دوسرا وہ سخی مالدار جس کے مال سے فیض جاری ہو **حسد کے اسباب** حسد کے کل سات سبب ہیں. پہلا سبب عداوت اور بغض ہے. جس سے کسی کو ایذا پہنچ جائے پہلے تو وہ بدلہ لینے کی کوشش کرتا ہے. اور مجبور ہو کر چاہتا ہے. کہ اس پر غیبی مار پڑے اس کی مصیبت سے خوش اور آرام سے ناخوش ہوتا ہے. اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ الخ دوسرا سبب تکبر کہ حاسد اپنی بڑائی کا خواہشمند ہے. لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ یہ اسی قسم کا حسد تھا. تیسرا سبب. سرداری کی خواہش ہے. کہ حاسد چاہتا ہے. کہ سب میرے حاجتمند ہوں اور میں سب کا آقا کہلاؤں اس لئے وہ سب کو غریب دیکھنا چاہتا ہے. چوتھا سبب عجب اور بڑائی ہے. حاسد دوسروں کو نعمت کا نااہل سمجھتا ہے. اس لئے چاہتا ہے. کہ اس کے پاس نہ رہے رب فرماتا ہے. اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ الخ پانچواں سبب یہ ہے. کہ حاسد دوسروں کے کمال میں اپنا زوال سمجھے کہ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو میں ناکام ہو جاؤں گا جیسے کہ ہر پیشہ ور اپنے ہم پیشہ سے اسی قسم کا حسد رکھتے ہیں. تاجر طبیب واعظ اپنے ہم جنس کی ترقی سے ناراض ہوتے ہیں. چھٹا سبب حب حکومت کہ حاسد چاہے کہ میں اپنے کمال میں بے نظیر رہوں. کہ میرے برابر دوسرا نہ نکلے ساتواں سبب حاسد کی کم ظرفی اور کمینہ پن ہے. کہ اس سے کسی کا عیش دیکھا نہیں جاتا اور یہ حسد سب حسدوں سے بدتر ہے. اللہ پاک ہر قسم کے حسد سے محفوظ رکھے یہود کو مسلمانوں سے کئی قسم کے حسد تھے. **حسد کا علاج** خیال رہے کہ حسد ایک عالمگیر مرض ہے جس سے بہت کم لوگ خالی ہیں. اس لئے اس کا علاج بہت ضروری ہے. اس کے صرف دو ہی علاج ہیں. ایک علمی علاج دوسرا عملی. علمی علاج تو یہ ہے. کہ حاسد یہ عقیدہ رکھے کہ ہر ایک تقدیر سے ہی ہوتی ہے. اور میں حسد کر کے اپنی بدنصیبی اور دوسروں کی نیک بختی کو بدل نہیں سکتا اور یہ بھی جانے کہ حسد ایمان کی آنکھ کا تنکا اور خاک ہے. جیسے کہ دماغ کی آنکھ ان چیزوں سے گدلی ہو جاتی ہے. ایسے ہی حاسد کا ایمان بلکہ اس کی دین دنیا حسد سے مکدر ہو جاتا ہے. کہ دنیا میں رنج اور آخرت میں عذاب کے سوا کچھ نہیں ملتا. دوسرا عملی علاج یہ ہے. کہ حاسد محسود کے ساتھ طبیعت کے خلاف برتاؤ کرے مثلاً اگر دل چاہتا ہے. کہ محسود کی غیبت کروں. تو فوراً اس کی تعریف کرنے لگ جائے. یا اگر نفس کہتا ہے. کہ محسود کے سامنے اکڑ کر بیٹھوں تو فوراً اس کے سامنے عاجزی اور نرمی کرے. یا اگر دل کہتا ہے. کہ اس سے نفرت رکھوں تو بہ تکلف اس سے محبت کرے ان شاء اللہ ان دو علاجوں سے بہت فائدہ ہوگا. اور یہ بھی خیال رہے کہ بے اختیاری نفرت یا محبت کی اللہ کے ہاں پکڑ نہیں. (تفسیر کبیر وعزیزی) نیز حسد کے علاج کیلئے کتب تصوف خصوصاً امام غزالی کی کتابیں جیسے کہ احیاء العلوم وغیرہ کا مطالعہ کرو. **تیسرا فائدہ** رب کے کام نہایت آہستگی سے ہوتے ہیں ہم کو بھی چاہیئے کہ ہر کام میں جلدی نہ کیا کریں. **پہلا اعتراض**. اس آیت کو منسوخ کہنا غلط ہے. کیونکہ یہاں خود معافی اور درگزر کی حد بتادی گئی کہ حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ جیسے کہ روزے کی حد ہے. اِلَى الَّيْلِ نہ روزہ رات سے منسوخ ہے اور نہ یہ احکام آیت جہاد سے **جواب**. غیر معین حد ناسخ ہوتی ہے اور معین حد ناسخ نہیں بلکہ انتہا روزے کی حد رات ہے جو سب کو معلوم ہے مگر معافی اور درگزر کی حد حکم جہاد ہے جسکی خبر نہیں کہ کب آئیگا. (تفسیر کبیر) لہذا روزہ غیر منسوخ اور یہ احکام منسوخ یہ فرق خیال میں رکھو. **دوسرا اعتراض** اس آیت کے نزول کے وقت مسلمان کمزور اور کفار طاقت ور تھے. اور کمزور کا بدلہ نہ لے سکنا معافی نہیں کہلاتا معافی تو یہ ہے. کہ انسان بدلہ لینے پر قادر ہو پھر چھوڑ دے. لہذا یہاں فاعفو کیوں فرمایا گیا. **جواب**. اگرچہ اس وقت مسلمان اجتماعی حملہ یعنی لشکر کشی پر قادر نہ تھے

مگر انفرادی حملہ کا بہت موقعہ تھا۔ کہ گلی کوچوں میں جہاں کافر کو پاتے ٹھکانے لگا دیتے اس آیت میں اس سے بھی روکا گیا۔

**تفسیر صوفیانہ** مشہور یہ ہے۔ کہ دنیا میں گوشت کے بہت سے دشمن ہیں۔ پرندے درندے چرندے دریائی جانور سب ہی اس کے تاک میں رہتے ہیں۔ گوشت کی بوٹی پر ہوا سے چیل کوے گدھ وغیرہ گرتے ہیں۔ اور زمین کے کتے بلی شیر چیتا حملہ کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کی بہت حفاظت کی جائے۔ ورنہ بعد میں کف افسوس ملنا ہوگا۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ ایمان کے بیرونی اور اندرونی بہت دشمن ہیں شیطان ہمزاد شیطان، شیطان نما انسان یعنی کفار اور حاسدین نفس امّارہ دنیا کے دلکش چیزیں سبھی ایمان کی تاک میں ہیں بگر ایمان کی حفاظت کی ایک بیمہ کمپنی بھی ہے جو اللہ کے فضل سے اس دولت کو منزل مقصود تک پہنچانے کا ٹھیکہ لیتی ہے۔ اس کمپنی کا ہیڈ کوارٹر مدینہ منورہ میں ہے۔ اور اُسکی شاخیں بغداد اور اجمیر اور پیران کلیر وغیرہ میں کھلی ہوئی ہیں۔ اور اُس کی برانچ شاخیں تقریباً ہر جگہ ہیں۔ اور اُس کے دلال ہر جگہ پھر رہے ہیں۔ کہ حدیث شریف میں ہے۔ کہ ہر چالیس متقی مسلمانوں میں ایک ولی اللہ ہوتا ہے مسلمانوں کو چاہیئے۔ کہ نقد عقیدت دے کر اپنے ایمانوں کا بیمہ کرالیں۔ قلب کا پتہ ہر وقت ہواؤں کے خطرہ میں ہے چاہیئے کہ کسی پتھر کے نیچے آجائے۔ شعر

دِل پہ کندہ ہو تیرا نام کہ وہ دزد رجیم  اُلٹے ہی پاؤں پھرے دیکھ کے طغرا تیرا

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْہُ

اور قائم رکھو تم نماز کو اور دو تم زکوٰۃ اور جو کچھ آگے بھیجو گے واسطے جانوں اپنی کے کوئی بھلائی پاؤ گے تم اُس کو

اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور اپنی جانوں کے لئے جو بھلائی آگے بھیجو گے اُسے

عِنْدَ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۱۰﴾

نزدیک اللہ کے تحقیق اللہ اُس کو جو تم کرتے ہو۔ دیکھنے والا ہے۔

اللہ کے یہاں پاؤ گے بے شک اللہ تمہارے کام دیکھ رہا ہے۔

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح سے تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو بتایا گیا۔ کہ تمہارے ایمان کے چھیننے والے بہت سے دشمن ہیں۔ اب اُن کو حفاظت ایمان کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ کہ تم نماز زکوٰۃ وغیرہ نیک اعمال سے اُس کی حفاظت کرو۔ **دوسرا تعلق** پہلے مسلمانوں کو ضبط اور تحمل کا حکم دیا گیا۔ جو کہ اُن پر بہت شاق تھا۔ اب نماز روزہ کا حکم دیا جا رہا ہے۔ جس سے اُن کے دلوں میں برداشت کی طاقت پیدا ہو **تیسرا تعلق** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو جہاد کفار سے روکا گیا اب انہیں جہاد نفس کا حکم دیا گیا۔ کہ ابھی اُسی جہاد کا تو حکم نہیں اپنے نفس سے نماز روزے کے ہتھیار سے جہاد کرو۔ **چوتھا تعلق** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو کفار کی اصلاح کا طریقہ بتایا گیا۔ کہ معافی اور درگزر سے ان کی اصلاح کرو۔ اب اپنے نفس کی اصلاح کا طریقہ سکھایا جا رہا ہے۔ کہ نماز روزہ سے اس کو درست کرو۔ **پانچواں تعلق** پہلے کفار کی سختیاں جھیلنے کا حکم تھا۔ اب نماز و زکوٰۃ کی پابندیاں برداشت کرنے کا فرمان ہے۔

**تفسیر وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ**۔ یہ فاعفوا پر معطوف ہے یعنی اُن بیدینوں سے منہ پھیر لو۔ اور نماز کی طرف متوجہ ہو کر اسے ہمیشہ قائم رکھو قائم رکھنے کے معنی بارہا بیان کئے جا چکے۔ کہ اسے اچھی طرح پڑھو یا ہمیشہ پڑھو یا اُس کے مستحبات وغیرہ کا لحاظ کر کے پڑھو۔ اور صلوٰۃ سے مراد غالباً فرض واجب نمازیں ہیں۔ کہ انہیں کے قائم رکھنے کا حکم ہوتا ہے۔ **وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ** چونکہ نماز عبادت بدنی ہے۔ اور زکوٰۃ عبادت مالی اور مالی عبادت بدنی کے بعد ہے۔ اس لئے زکوٰۃ کا ذکر نماز کے بعد ہوا۔ اور اے مسلمانو صرف فرائض و واجبات پر ہی قناعت

نہ کرنا۔ بلکہ نوافل اور مستحبات بھی ادا کرتے رہنا۔ کیونکہ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ اپنے لئے جو بھلائی آگے بھیج لوگے خیر ہر بھلائی کو شامل ہے۔ یعنی نماز روزہ زکوٰۃ اچھے معاملات تلاوتِ قرآن درود پاک اور کلمہ طیبہ وغیرہ مگر چونکہ نماز و زکوٰۃ سب میں بہتر تھی۔ اس لئے اُن کو علیحدہ ذکر کیا۔ یعنی اے مسلمانو تم اپنے نفع کے لئے جو بھلائی بھی کرو گے۔ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ اسے اللہ کے نزدیک محفوظ پاؤ گے۔ یا تو اس کا ثواب پانا مراد ہے یا خود اُن اعمال کا ہی پانا جیسے کہ روایت میں ہے۔ کہ قیامت میں اچھے اعمال اچھی ہیں سامنے آئیں گے۔ عند اللہ فرما کر یہ بتا دیا۔ دنیا میں جزا پانے کی طمع نہ رکھو۔ اگر دنیوی مصیبت آجائے تو اس سے بددل نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ جزا کی جگہ تو آخرت ہے۔ نیز جو یہاں کچھ آرام اور عیش پالے اُس کے اُخروی جزا میں کوئی کمی نہ ہو گی یہ تو اللہ کے فضل سے تنخواہ کے علاوہ راستہ کا بھتہ ہے۔ یہ بھی خیال رہے۔ کہ تجدوہُ سے یہ مراد نہیں ہے۔ کہ جتنا کرو گے اتنا ہی پاؤ گے۔ روایت میں تو یہ آتا ہے۔ کہ معمولی صدقات پہاڑ کے برابر ہو کر ملیں گے۔ جب دنیوی بادشاہ اپنے نوکروں کے فنڈ کا روپیہ بڑھا کر دیتے ہیں۔ تو وہ اَحْكَمُ الْحَاكِمِيْن نہ معلوم کتنا بڑھا کر دیگا۔ اور یہ مت سمجھنا کہ معمولی نیکیاں حقیر سی چیز ہیں نہ معلوم وہ اتنے بڑے دربار میں شمار میں آئیں یا نہ آئیں نہیں وہاں تو ذرہ ذرہ کی جزا ملے گی۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ حق تعالیٰ تمہارے سارے چھوٹے بڑے ادنیٰ اعلیٰ اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ اور اُن سے خبردار ہے یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے۔ کہ مسلمانو یہ نہ سمجھنا کہ نیکیاں تو وہاں ملیں گی، اور بدیاں ضائع ہو جائیں گی۔ نہیں حق تعالیٰ تمہارے ہر قسم کے نیک و بد اعمال دیکھ رہا ہے۔ ہر ایک کی سزا و جزا دیگا۔ اس صورت میں یہ آیت ترغیب کی بھی ہے۔ اور ترہیب یعنی ڈرانے کی بھی۔

**خلاصہ تفسیر** اے مسلمانو تم بہکانے والوں کی طرف توجہ نہ کرو۔ اور فی الحال اُن سے بدلہ لینے کی کوشش نہ کرو کسی کے بہکانے میں نہ آؤ۔ بلکہ ابھی خود ایمان پر ثابت قدم رہ کر عالم آخرت کے لئے جہاں تم کو ہمیشہ رہنا ہے۔ تیاری کرو۔ بدنی عبادتوں میں سب سے اعلیٰ نماز ہے۔ اُس کو پابندی سے ادا کرتے رہو۔ اور مالی عبادت یعنی زکوٰۃ وغیرہ سے بھی غافل نہ رہو۔ نماز زکوٰۃ کے علاوہ بھی جو ہو سکے نیکی کر لو خلق خدا سے بھلائی اپنے اور بیگانوں کے ساتھ نیک سلوک سے پیش آؤ یقین رکھو کہ تمہارا کوئی کام بھی ضائع نہ جائیگا۔ تم اپنے سارے اعمال کا بدلہ مع نفع کے رب تعالیٰ کے پاس پاؤ گے۔ یا خود اعمال ہی کو وہاں دیکھو گے۔ کیونکہ سارے اعمال عالم مثال میں موجود رہتے ہیں۔ جن کو مرنے کے بعد ہر شخص ضرور پالے گا۔ اور یہ بھی یقین رکھو کہ خدا تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ کسی کے عمل اور اُس کی سزا و جزا سے غافل نہیں۔

**فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** نماز زکوٰۃ سے افضل ہے۔ اسی لئے نماز کو اُس سے پہلے بیان فرمایا۔ اور نماز کے لئے اَقِيْمُوْا یعنی ہمیشہ قائم رکھو اور زکوٰۃ کیلئے آتُوْا یعنی دیدو کہا۔ [۱] نماز بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی اور بدنی مال سے افضل ہے۔ تو اسکی عبادت بھی افضل [۲] نماز امیر غریب سب پر فرض اور زکوٰۃ صرف امیروں پر لہٰذا اس کا نفع عام [۳] نماز میں ہر عضو کام کرتا ہے زکوٰۃ دینے میں صرف ہاتھ۔ [۴] نماز روزانہ پانچ بار ادا ہوتی ہے اور زکوٰۃ سال بھر میں ایک بار [۵] نماز براہ راست حق تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہے اور زکوٰۃ بذریعہ فقیر [۶] نماز معراج میں حضور علیہ السلام کو عرش پر بلا کر دی گئی زکوٰۃ کے احکام یہاں ہی بھیج دیئے گئے [۷] نماز میں رب تعالیٰ سے ہم کلامی ہے۔ اور زکوٰۃ میں فقیر سے وغیرہ وغیرہ **دوسرا فائدہ** انسان صرف روزہ پر ہی قناعت نہ کریں۔ بلکہ جس بھلائی کا موقعہ مل جائے اسے کر گزرے معمولی نیکی اُس ایک گھونٹ پانی کی طرح ہے جو کبھی پیاسے کی جان بچا لیتا ہے۔ اور معمولی گناہ اس چنگاری کی طرح ہے۔ جو کبھی گھر جلا دیتی ہے **تیسرا فائدہ** اس عالم اجساد کے سوا ایک دوسرا عالم بھی ہے۔ جسے عالم امثال کہتے ہیں۔ یہاں تو اعمال اور اعراض کی کوئی شکل نہیں۔ لیکن وہاں ہر چیز کی شکل اور اُس کا وزن ہے۔ وہاں بخیل کا مال گنج سانپ کی شکل میں اور قرآن و رمضان وغیرہ اچھی شکل میں سامنے آئیں گے **چوتھا فائدہ** دنیا میں حکام اور بادشاہ بڑے لوگوں سے باخبر اور چھوٹوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ نیز اپنے رعایا کے بڑے اعمال کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ اور چھوٹے اعمال سے بے پرواہ مگر رب تعالیٰ کی نظر کرم ہر چھوٹی بڑی مخلوق پر اور اُن کے ہر اعلیٰ ادنیٰ

ادنے اعمال پر ہے۔ **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان اپنی ہر نیکی کو وہاں پائیگا۔ اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بعض گناہوں سے نیکیاں برباد بھی ہوجاتی ہیں۔ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ ان دونوں آیتوں میں مطابقت کیونکر ہو **جواب**۔ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں فرمایا گیا وَمَا تُقَدِّمُوْا تم جو بھلائی آگے بھیجو گے اسے پاؤ گے اور وہ ہی بھلائی آگے جاتی ہے۔ جو شرائط ادا اور شرائط قبول کے ساتھ ہو اور پھر اس پر کوئی برباد کرنے والی آفت بھی نہ پہنچ جائے لہذا جو نیکیاں خلاف قاعدہ کی گئیں۔ یا جو یہاں ہی برباد ہوگئیں وہ آگے گئی ہی نہیں۔ انہیں پائیں کیسے دوسرے یہ کہ انسان اپنی ہر بھلائی کو وہاں دیکھ تو لے گا۔ مگر ثواب اس ہی کا پائیگا جو بربادی سے بچ رہی۔ کافر مردہ بھی قبر میں جنت دیکھتا ہے۔ مگر اس سے محروم یہاں فرمایا گیا تَجِدُوْهُ جو سب کو شامل ہے۔ **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ ہمارے انہیں کاموں کو دیکھتا ہے جو ہم کرتے ہوتے ہیں۔ یعنی ہمارے کرنے سے پہلے وہ بے خبر ہوتا ہے۔ کیونکہ فرمایا گیا بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ اور یہ عیب ہے۔ ادھر صوفیائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ اللہ والے تو لوگوں کی پیدائش سے صدہا سال پہلے اُن کو اور اُن کے احوال کو دیکھتے ہیں مولانا فرماتے ہیں شعر

بلکہ قبل از زادنِ تو سالہا — مر ترا بینند بچندیں حال رہا

تو کیا اولیاء اللہ کا علم خدا کے علم سے زائد ہے **جواب** حق تعالیٰ ہمیشہ سے سننے اور دیکھنے والا ہے۔ مگر دنیا کی ہستی سے پہلے اُس کا دیکھنا اور قسم کا تھا اور اُس کی ہستی کے بعد دوسری قسم کا بلا تشبیہ یوں سمجھو کہ ہم عمارت بنانے سے پہلے اُس کا سارا نقشہ اپنے ذہن میں لے لیتے ہیں اور پھر اسے کاغذ پر مکمل طور پر کھینچ کر معمار کو بتا دیتے ہیں جسکے مطابق عمارت بنتی ہے۔ تو ہم کو اس عمارت کا تین طرح علم حاصل ہوا۔ ایک خیالی خاکہ کا دوسرے کاغذ پر نقشہ کا تیسرے بن چکنے کے بعد خود اس عمارت کا علم ظہور تو بن چکنے کے بعد ہوا مگر دوسری قسم کا علم اس سے پہلے بھی تھا۔ رب تعالیٰ ہر چیز کو ہمیشہ سے جانتا اور دیکھتا ہے۔ پھر اُس نے علم کے مطابق لوح محفوظ میں عالم اور اس کے واقعات کا نقشہ کھینچا فرشتوں نے اسی کے مطابق دنیاوی انتظامات کئے اور پھر عالم بن جانے کے بعد بھی اُس کو جانا اور دیکھا مگر یہ علم ظہور ہے۔ اور وہ قبل ظہور یہاں ظہور کا جاننا دیکھنا مراد ہے **تیسرا اعتراض** جب حق تعالیٰ ہمارے اعمال کو خود ہی دیکھتا اور جانتا ہے۔ تو فرشتوں سے کیوں لکھواتا ہے (آریہ) **جواب** فیصلے کیلئے کیونکہ فیصلہ حاکم کے ذاتی علم پر نہیں بلکہ قانون کے مطابق ہوتا ہے قدرت یہ ہے کہ بندوں کا فیصلہ خفیہ پولیس کی رپورٹ اور خود ملزم کے اعضاء کی گواہی پر ہو۔ یہ سب کچھ اسی لئے ہے۔ **تفسیر صوفیانہ** دنیا انسان کیلئے کمانے کی جگہ ہے جو کچھ یہاں کما کر اپنے وطن میں بھیجدیگا۔ وہ وہاں پہنچ کر اُس کے کام آئیگا۔ البتہ یہاں تو بھیجا ہوا روپیہ کبھی مارا بھی جاتا ہے۔ اور کبھی وطن پہنچکر برباد ہو جاتا ہے۔ لیکن وہاں کے متعلق فیصلہ ربانی ہے۔ کہ نہ مارا جائے اور نہ برباد ہو جب انسان مرتا ہے تو لوگ تو کہتے ہیں۔ کہ فلاں نے کیا چھوڑا۔ اور ملائکہ پوچھتے ہیں وہاں سے کیا لایا۔ ایک دن عمر رضی اللہ عنہ بقیع یعنی مدینہ پاک کے قبرستان میں تشریف لیگئے اور فرمایا۔ کہ اے قبر والو ہماری خبریں سُن لو۔ تمہاری بیبیوں نے دوسروں سے نکاح کر لیا اور تمہارے گھر اوروں سے آباد ہو گئے۔ اور تمہارے مال تقسیم ہو چکے ایک غیبی آواز آئی کہ اے ابن خطاب ہماری خبر بھی سن لو۔ جو ہم نے آگے بھیجا تھا وہ پا لیا جو کچھ راہ مولیٰ میں خرچ کر آئے تھے مع نفع کے وصول کر لیا جو کچھ چھوڑ آئے۔ اس پر ندامت ہے (روح البیان) اے اللہ کے بندو۔ جب یہ بات طے ہے۔ کہ جو کماؤ گے سو پاؤ گے۔ اور جو کچھ بھیجو گے۔ اس میں سے کچھ مارا نہ جائیگا۔ لہذا اپنا یہ موقعہ کیوں کھوتے ہو۔ اس آیت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو کچھ اپنے لئے اگلی بھلائی کر جاؤ گے۔ یعنی ایسا عمل کر جاؤ گے۔ کہ تمہارے بعد صدقہ جاریہ ہو کر باقی رہے۔ تو اس کا اجر مرنے بعد بھی اللہ کے ہاں پاتے رہو گے صوفیائے کرام حدیث کے مطابق فرماتے ہیں۔ کہ انسان کے مرتے ہی اُس کے سارے عمل بند ہو جاتے ہیں سوا اس کے چار اولادوں کے ایک تو اُس کی مالی اولاد جیسے مسجدیں اور پل دوسرے اُس کی علمی اولاد جیسے دینی کتاب اور شاگرد

تیسرے اس کی بدنی اولاد جیسے وہ نیک بچہ جو اس کے لئے دعائے خیر کرتا رہے اور چوتھے اس کی روحانی اولاد جیسے نیک مریدین شیخ سعدی بوستان میں فرماتے ہیں۔ اشعار

ازاں کس کہ خیرے بماند رواں ۔۔۔ دمادم رسد رحمتش بر رواں
نمرد آنکہ ماند پس ازوے بجائے ۔۔۔ پل و مسجد و خان و مہماں سرائے
دگر رفت و آثار خیرش نماند ۔۔۔ نہ شاید پس مرگ الحمد خواند

بندہ گنہگار احمد یار بارگاہِ کردگار میں عرض گزار ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس تفسیر میں اخلاص نصیب فرمائے اور اپنے فضل و کرم سے قبول فرمائے اور مصنفین مقبولین کے صدقہ میں اس کو میرے واسطے صدقہ جاریہ بنائے۔ اور جو حضرات میرے الفاظ سے فائدہ اٹھائیں وہ میرے واسطے مغفرت و رحمت کی دعا مانگیں۔ کہ میں نے اس لالچ میں یہ مشقت اٹھائی ہے۔ اور کبھی مجھ کو اپنی دعاؤں میں یاد کرلیا کریں۔

اے کہ بر ما میروی دامن کشاں ۔۔۔ از سرے اخلاص الحمدے بخواں

وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ

اور کہا انہوں نے ہرگز نہیں داخل ہوگا جنت میں مگر وہ جو ہو یہودی یا عیسائی یہ خواہشات ہیں ان کی

اور اہل کتاب بولے ہرگز جنت میں نہ جائیگا۔ مگر وہ جو یہودی یا نصرانی ہو۔ یہ ان کی خیال بندیاں ہیں۔

قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۱۱۱) بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ

فرمادو لاؤ تم دلیل اپنی اگر ہو تم سچے ہاں جو جھکادے چہرا اپنا واسطے اللہ کے

تم فرماؤ لاؤ اپنی دلیل اگر سچے ہو۔ ہاں کیوں نہیں جس نے اپنا منہ جھکایا اللہ کیلئے

وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِندَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۱۱۲)

اور وہ بھلائی کرنیوالا ہو پس واسطے اسکے ثواب ہے اسکا پاس رب اسکے کے اور نہیں ہے ڈر اوپر ان کے اور نہ وہ غمگین ہونگے

اور وہ نیکو کار ہے تو اس کا نیگ اس کے رب کے پاس ہے اور انہیں نہ کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** پہلے بتایا گیا تھا۔ کہ یہود مسلمانوں کو شبہات ڈالکر اسلام سے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں اب بتایا جارہا ہے۔ کہ وہ جنت کا لالچ دیکر بھی مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کی کوششیں کی ہیں۔ کہ وہ کہتے ہیں کہ تم کتنے بھی اعمال کرو بغیر یہودی بنے ہوئے جنت کی بو نہیں پا سکتے **دوسرا تعلق** پہلے مسلمانوں کو نیک اعمال کی رغبت دی گئی تھی۔ اب فرمایا جارہا ہے۔ کہ تم عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح نہ ہوجانا جو کہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ کہ ہمیں اعمال کی ضرورت نہیں **تیسرا تعلق** پہلے فرمایا گیا تھا کہ جو کرو گے وہ رب کے نزدیک پاؤ گے اب یہودی بیہودگی کا ذکر ہے کہ وہ بغیر کئے بھی پانیکے امیدوار بیٹھے ہیں۔ **شانِ نزول** ایک بار نجران کے عیسائی اور مدینہ کے یہودی حضور علیہ السلام کی خدمت میں جمع ہوکر آپس میں مناظرہ کرنے لگے۔ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کو جھوٹا کہا یہودی بولے کہ جنت میں یہود کے سوا کسی کا داخلہ نہیں ہوسکتا عیسائیوں نے جواب دیا۔ کہ عیسائیوں کے سوا کسی کو بھی جنت نہیں مل سکتی۔ تب یہ آیت کریمہ اتری (تفسیر روح البیان) **تفسیر وَقَالُوا**۔ اس کے فاعل یہود اور عیسائی دونوں ہیں۔ اگرچہ پہلے سے یہود کا ہی ذکر آرہا ہے۔ لیکن یہاں ضمیر میں عیسائیوں کو بھی شامل کرلیا گیا۔ کیونکہ وہ دونوں کفر اور شیخی اور مسلمانوں کو بہکانے میں یکساں

تھے. لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ. کہ جنت میں رہنا تو بہت بڑی بات ہے. کوئی وہاں داخل بھی نہ ہوگا. بلکہ وہاں تک پہنچے گا بھی نہیں اگرچہ سارے پیغمبروں پر ایمان لائے اور اپنی ساری عمر عبادت الٰہی میں خرچ کرے اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا سوا اُس کے جو یہودی ہو یہ یہود کا قول ہے. اس لئے کہ عیسائی یہ نہ کہہ سکتے تھے. یہود کا عقیدہ یہ تھا. کہ ہم نیک اعمال کریں یا نہ کریں. بہر حال جنتی ہیں. کیونکہ ہم بذریعہ اسحاق ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں. اور ہمارے متعلق رب نے ابراہیم علیہ السلام سے جنت دینے کا وعدہ کر لیا رب تعالیٰ پر اپنے وعدہ کا پورا کرنا لازم ہے. هُوْد جمع هائد کی ہے جسکے معنی ہیں توبہ کرنیوالا قرآن فرماتا ہے. اِنَّا هُدْنَا اِلَیْكَ چونکہ انہوں نے بہت سخت توبہ کی تھی. اس لئے ان کا یہ نام ہوا. اَوْ نَصٰرٰی یہ عیسائیوں کا قول ہے کیونکہ یہودی یہ نہ کہہ سکتے تھے. عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے. کہ ہم بہر حال جنتی ہیں. کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی سُولی ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو چکی. نصاریٰ جمع نصران کی ہے جیسے سکاریٰ جمع سکران کی. اس کے معنی ہیں مددگار چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں یعنی ساتھیوں نے اُن سے مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا. اس لئے ان کا نام نصاریٰ ہوا یہود و نصاریٰ دونوں بڑے اچھے نام تھے. لیکن اب اُن کا علم بن کے رہ گئے جیسے کالے آدمی کو کہدیتے ہیں. بھورے خاں یہ آیت درحقیقت دو جملوں کا مختصر ہے یعنی یہود تو کہتے تھے. کہ یہود کے سوا جنت میں کوئی نہیں جائیگا. اور عیسائی کہتے تھے. کہ عیسائیوں کے سوا بہشت میں کوئی داخل نہ ہوگا. ان کی تردید میں ارشاد ہوتا ہے. کہ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ یہ اُن کی فقط خیالی باتیں ہیں. امانی اُمْنِیَّةٌ کی جمع ہے. اور امنیۃ اصل میں اُمْنُوْیَةٌ تھا. اس کا مادہ ہے مُنْیٌ جس کے معنی ہیں خواہش جیسے اُعْجُوْبَةٌ کی جمع اعاجیب. اہل عرب ہر بے دلیل بات کو تمنیٌ اُمنیۃ. غرور اور ضلال اور احلام کہدیتے ہیں (تفسیر روح البیان) چونکہ اس کے قائل دو جماعتیں تھیں. اس لئے امانی جمع بولا گیا. یہ بھی ہو سکتا ہے. کہ تِلْكَ سے اُن کی تمام بکواس اور بُرے ارادے مراد ہوں یعنی مسلمانوں کو مرتد بنانا اور ان پر کسی بھلائی کا نہ اترنا اور اُن کا جنت سے محروم رہنا یہود و نصاریٰ کے غلط خیالات اور جھوٹی خواہشات ہیں. اس کی تردید کیلئے فرمایا جاتا ہے. کہ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اے نبی صلے اللہ علیہ وسلم یا اے مسلمانو ان دونوں قوموں سے فرما دو. کہ اپنے اس دعویٰ پر دلیل لاؤ. هَاتُوْا. دراصل آتُوْا تھا. اِیْتَاءٌ کا امر جس کے معنی ہیں لانا ہمزہ ھ سے بدلی یہ امر بالتعجب کا ہے. یا عاجز کرنے کا کیونکہ اُن کے پاس کوئی دلیل تھی ہی نہیں بُرْهَان. بَرْهٌ سے بنا ہے جسکے معنی ہیں روشن ہونا یا برھۃ سے بنا جسکے معنی ہیں مضبوطی اصطلاح میں سچی اور قوی دلیل کو برھان کہتے ہیں. کیونکہ اس سے دعویٰ مضبوط یا روشن ہوتا ہے. اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ. اگر تم سچے ہو کیونکہ کوئی دعویٰ بغیر دلیل قابل قبول نہیں. اس مختصر سے جملے میں اُن دونوں قوموں کا اجمالی اور تفصیلی رد کر دیا گیا. اور جب وہ دونوں قوی تو کیا ضعیف سی دلیل نہ پیش کر سکے. تو فرمایا گیا. بَلٰی یہ حرف ایجاب ہے جس سے منفی کا ثبوت ہوتا ہے. بلکہ اس جگہ تو اس میں ثبوت اور نفی دونوں ہیں. انہوں نے کہا تھا کہ ہم جنت میں جائیں گے. اور ہمارے سوا کوئی نہیں جائیگا. اُن کو جواب دیا گیا. کہ ہاں ہاں تم نہ جاؤ گے. بلکہ تمہارے سوا وہ لوگ جائیں گے. کہ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ جنہوں نے اپنا منہ رب کے سامنے جھکا دیا. اَسْلَمَ اسلام سے بنا ہے جس کا مادہ ہے سَلْمٌ اس کے معنی ہیں ظاہری اور باطنی آفات سے بچ جانا. اسلام سلامتی میں داخل ہونا یا کوئی چیز بلا شرکت دوسرے کو سونپ دینا شریعت میں اسلام کی دو صورتیں ہیں ایک تو زبان سے دینی باتوں کا اقرار کرنا دوسرے دل سے اعتقاد اور زبان سے اقرار کرنا چونکہ ایسا شخص اپنے کو عذاب سے بچا لیتا ہے. اور اپنی ذات اور اپنی عبادات اور اعمال کو خالص رب کے لئے قرار دیتا ہے. اس لئے اُس کو مسلم اور اُس کے عقیدے اسلام کہتے ہیں یہاں اسلام کے دوسرے ہی معنی مراد ہیں. یعنی عقائد اور اقرار میں درست وجہ کے لفظی معنی ہیں سامنے والی چیز اور چہرہ بھی سامنے ہی ہوتا ہے. اس لئے اسے وجہ کہتے ہیں. اور کبھی ذات اور کبھی توجہ کو بھی وجہ کہہ دیتے ہیں. یہاں تینوں معنی بن سکتے ہیں. یعنی جس نے اپنی ذات یا اپنے چہرے یا اپنی توجہ کو اللہ کیلئے خالص کر دیا یا جھکا دیا. اور اپنے کو آفات سے بچا لیا.

پھر فقط اسی پر قناعت نہ کی بلکہ وَهُوَ مُحْسِنٌ اور نیکوکار بھی رہا یعنی درستی عقائد اور اقرار کے ساتھ اپنے اعمال بھی سنبھالے وہ حکمت نظری تھی۔ اور یہ حکمت عملی چونکہ اسلام ایک بار ہی قبول کیا جاتا ہے۔ اور اعمال بار بار اس لئے وہاں ماضی فرمایا اور یہاں جملہ اسمیہ جس نے یہ سب کچھ کر لیا فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ اُس کا اُسکا ثواب ملیگا۔ عمل کے اُس معاوضہ کو کہتے ہیں جس کا پہلے سے وعدہ کر لیا جائے۔ جیسے اُجرت اور مزدوری یہاں اس سے جنت کا داخلہ مراد ہے۔ اور اسے اجر اس لئے فرمایا۔ کہ اُس کا عمل سے قوی تعلق ہے۔ اسکے بغیر جنت کی امید کرنا باطل خیال ہے۔ عِنْدَ رَبِّهٖ اس اجر کے ضائع ہونیکا انشاء اللہ اندیشہ نہیں۔ بلکہ وہ رب کے نزدیک ثابت ہو چکا۔ اور عادل بادشاہ مزدور کی اُجرت نہیں روکتے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اُس کے ساتھ ساتھ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ قیامت کے دن یا جنت میں جاتے وقت نہ تو انہیں آئندہ کا ڈر ہوگا۔ اور نہ پچھلی باتوں پر غم۔ یا دنیا میں بھی انہیں غیر خدا کا وہ خوف اور غم نہیں ہوتا۔ جو انہیں ایمان و عمل سے روک دے اور انہیں مضر ہو رب کا خوف جہنم کا ڈر خرابی خاتمہ کا اندیشہ جو اُن کے لئے مفید ہے۔ وہ ضرور ہوگا۔ **خلاصہ تفسیر** اے مسلمانو اہل کتاب تمہیں بہکانے کے لئے بہت تدبیریں کرتے ہیں۔ اسلام پر اعتراضات کرنے اور تمہارے دلوں میں شکوک ڈالنے کے علاوہ تمہیں غلط لالچ بھی دیتے ہیں۔ کہ یہود تو یہ کہتے ہیں۔ کہ ہمارے سوا جنت میں کوئی نہ جائیگا۔ کیونکہ ہم پیغمبروں کی اولاد ہیں اور عیسائی کہتے ہیں۔ کہ ہم اکیلے ہی جنت کے ٹھیکیدار ہیں۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام ہم سب کی طرف سے سُولی پا کر ہمارے گناہوں کا کفارا ادا کر گئے ہم کچھ بھی نہ کریں تو بھی جنتی ہیں۔ اور تم سب کچھ کرو تو بھی جنتی نہیں مگر مسلمانو یہ اُن کے فاسد خیالات اور محض نفسانی خواہشات ہیں جس کا اُن کے پاس کوئی ثبوت نہیں تم اس کی یوں آزمائش کرو۔ کہ اُن سے کوئی قوی دلیل مانگو اور کہو اگر سچے ہو تو اپنی کتابوں سے ہی دلیل لاؤ۔ نہ وہ دلیل دے سکے ہیں اور نہ وہ دے سکیں گے۔ نہ توریت میں یہ ہے اور نہ انجیل میں نیز یہ عقیدہ عقل کے بھی خلاف ہے۔ کہ خداوند تعالیٰ تمام انسانوں کا رب ہے۔ ہر قوم ہر ملک سے اُس کی یکساں نسبت ہے کوئی خاص قوم یا ملک اُس کی رحمت کے حقدار نہیں۔ بلکہ جو بھی عجمی عربی حبشی چینی وغیرہ اُس کے آگے اپنا سر جھکا دے اور اُس کے ہر حکم کو بے چون و چرا مان لے۔ اور نیک کار بھی ہو۔ اُس کا بدلہ ضرور ملے گا۔ کہاں ملے گا خدا کے پاس جہاں اسے ہمیشہ رہنا ہے۔ اور وہاں پہنچ کر نہ تو انہیں اپنے مرنے اور قبر بند ہونے سے چھوٹنے یا بڑھاپا آنے یا بیماریوں کے ستانے یا تنگدستی کے غالب آنے یا جنت سے باہر نکلے جانے یا دشمن یا کسی بادشاہ کے ایذا دینے یا خدا کے ناراض ہونے کا ڈر ہوگا۔ اور نہ اپنی گذشتہ عمر برباد کرنیکا غم کہ ہائے میں دن رات دولت جمع کرنے عمدہ مکان و باغ بنانے دنیوی عزت حاصل کرنے میں سرگرداں رہا اور غلط مذہب کی پابندی سے بڑی بڑی محنت اٹھاتا رہا۔ رب کی نعمتیں چھوڑیں۔ گنگا جمنا میں غوطے لگائے گرجوں میں صلیب کو پوجا اور سال میں سے کوئی چیز ہمارے کام نہ آئی۔ بلکہ انہیں دائمی آرام خوشی میسر ہوگی۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** عقائد اور اعمال سے کوئی بھی مستغنی نہیں نبی زادہ پیرزادہ سید زادہ شاہ زادہ۔ مولوی زادہ جو بھی بے ایمان ہو جہنمی ہے۔ اسی طرح ان میں سے کسی کیلئے نماز روزہ معاف نہیں۔ ایسے عقیدے تو یہود اور نصاریٰ کے تھے۔ جن کی یہاں تردید کر دی گئی **دوسرا فائدہ** اسلام کے عقائد اور احکام پر قوی دلائل قائم ہیں دیگر مذاہب بے دلیلے ہیں۔ اگر ہمیں اپنی کسی دلیل کی خبر نہ ہو تو ہمارا قصور ہے **تیسرا فائدہ** ہر مدعی کو دلیل دینا ضروری ہے خواہ وہ نفی کا کرے یا ثبوت کا یہود و نصاریٰ نے یہاں نفی کا ہی دعویٰ کیا تھا جس پر دلیل کا مطالبہ ہوا **چوتھا فائدہ** عقائد میں دلیل ضروری ہے کسی کے کشف یا الہام یا تقلید کا اعتبار نہیں۔ یہاں صرف دلیل مانگی گئی ہاں انبیاء کرام کے دیگر احکام ہیں۔ کہ اُن کا فرمان ہی قوی دلیل ہے۔ **پانچواں فائدہ** اعمال پر ایمان مقدم ہے کہ بعض صورتوں میں بغیر عمل نجات ہو سکتی ہے۔ لیکن بغیر ایمان نجات ناممکن اور بغیر ایمان عمل بے کار لیکن بغیر عمل ایمان بے کار نہیں اس لئے یہاں اسلام کا ذکر پہلے ہوا اور احسان کا بعد میں **چھٹا فائدہ** تمام اعضاء میں چہرہ اشرف اور افضل ہے۔ اور ساری عبادات میں سجدہ

اعلیٰ (تفسیر کبیر) **ساتواں فائدہ** نیک اعمال جب ہی مفید ہوں گے جب شریعت کے مطابق ہوں. اس واسطے فرمایا گیا. **وَهُوَ مُحْسِنٌ**

پہلا **اعتراض** مسلمان بھی یہ کہتے ہیں. کہ ہمارے سوا کوئی جنتی نہیں پھر یہود و نصاریٰ میں اور ان میں کیا فرق ہوا **جواب**. اس کے تین تین جواب ہیں. ایک یہ کہ یہود نصاریٰ اپنے کو اعمال اور صحیح عقائد سے بے نیاز مانتے تھے مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں دوسرے یہ کہ اُن کا یہ قول بلا دلیل تھا جس کا اُن کی کتابوں میں بھی ثبوت نہ تھا. بلکہ اُن کی کتابوں سے نبی آخر الزمان کی تشریف آوری اور اُن کی اُمت کی نجات ثابت تھی اور مسلمانوں کے دعویٰ کا قرآن پاک سے ثبوت ہے. ایک تو یہی آیت مَنْ اَسْلَمَ پکار رہی ہے دوسرے آیت وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ الخ صاف بتا رہی ہے تیسرے یہ کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے اصلی عقائد بدل دیئے. اور گھڑے ہوئے مشرکانہ عقائد کو مدار نجات سمجھ بیٹھے مسلمان اصل قرآنی عقائد کو مدار نجات سمجھتا ہے. اب بھی اگر کوئی مدعی اسلام جیسے قادیانی دیوبندی وغیرہ غلط عقائد پر نجات ماننے جھوٹا ہے. **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اجر کیلئے ایمان و عمل دونوں ضروری ہیں. تو چاہیئے کہ گنہگار مسلمان کبھی نجات نہ پائے **جواب**. خالص اور یقینی اجر کیلئے بیشک اعمال بھی ضروری ہیں. گنہگار مسلمان کا اجر خالص ہونا یقینی نہیں ممکن ہے. کہ شفاعت وغیرہ سے معافی ہو جائے اور ممکن ہے. کہ عذاب پا کر اجر ملے نیز قیامت کے خوف غم سے آزاد ہونے کیلئے بھی اعمال ضروری ہیں. گنہگاروں کو وہاں خوف بھی ہوگا. اور غم بھی **تفسیر صوفیانہ** یہود کہتے ہیں کہ اُن کی جنت یعنی جنت افعال اور جنت نفس اور عالم ملک میں وہی جائیگا جو یہودی ہو اور عیسائی کہتے ہیں. کہ جنت باطن یعنی جنت صفات اور جنت قلب اور عالم ملکوت میں وہی جائیگا جو عیسائی ہو. یہ سب اُن کی خواہشات اور اُن کی حدود ہیں. کہ یہ ملک و ملکوت اور نفس و قلب میں پھنس کر رب سے محجوب رہ گئے اور اس پر بھی اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں اگر سچے ہیں تو پیش کریں حق یہ ہے. کہ جو اپنی ذات و صفات اور عوارضات کو بالکل محو کر کے ذات خالق میں فنا کر دے اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ بقا بعد فنا میں صحیح رہے کہ اپنے اعمال میں اپنے رب کا مشاہدہ کرے اور اپنے وجود حقانی سے اُس کو ہر غیب شہود ہو جائے تو اُس کو ملک ملکوت بلکہ اس سے بھی اعلیٰ اجر جس سے کہ یہود و نصاریٰ محروم رہ گئے ملے گا اور اس کے سوا نہ تو انہیں ذات کے حجاب اور نفس کے بقا کا خوف ہوگا. اور نہ انہیں جمال یار کے غائب ہونے کا اندیشہ احسان کے تین درجے ہیں. ایک احسان شرعی کہ ایسے اعمال کرنا جن پر شرعاً کوئی الزام نہ آئے دوسرے احسان وصفی جس کی تفسیر یہ حدیث کرتی ہے. کہ تو اللہ کی ایسے عبادت کر گویا کہ تو اُسے دیکھتا ہے. اگر اس پر قادر نہ ہو تو ایسی کہ وہ تجھے دیکھتا ہے تیسرے احسان ذاتی یا احسان باطنی جس کی حقیقت اس حدیث قدسی میں بیان ہوئی. کہ میں اپنے ذاکر شاغل بندے کا کان نگاہ ہاتھ پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا دیکھتا چھوتا چلتا ہے. اس کی حقیقت یہ ہے. کہ اس بندے کا جسم صفات الٰہی کا آئینہ بن جاتا ہے. اب ان کیلئے خوف ہو. تو کس سے اور غم ہو تو کس کا وہ تو غم خوف کی چیزوں کو پہلے ہی سے اس آگ میں جلا چکے مولانا فرماتے ہیں.

| | |
|---|---|
| ہر کہ ترسد مر ورا ایمن کنند | مر دلے ترسند را ساکن کنند |
| آنکہ خوفش نیست چوں گوئی مترس | درس چہ دہی نیست او محتاج درس |

(تفسیر روح البیان و ابن عربی) خدایا ہم کو اُن حضرات کے غلاموں میں سے بنا دے جو مشاہدہ ذات میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکے.

## وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ

| | | | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| اور کہا | یہود نے | نہیں ہیں | عیسائی | اوپر | کسی چیز کے | اور | کہا | عیسائیوں نے | نہیں ہیں | یہود |

اور یہودی بولے نصرانی کچھ نہیں اور نصرانی بولے یہودی کچھ نہیں

عَلٰی شَیۡءٍ ۙ وَّ ہُمۡ یَتۡلُوۡنَ الۡکِتٰبَ ؕ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ

اوپر کسی چیز کے حالانکہ وہ لوگ تلاوت کرتے ہیں کتاب کو اسی طرح کہا انہوں نے جو کہ نہیں جانتے مثل

حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں اسی طرح جاہلوں نے ان کی سی

قَوۡلِہِمۡ ۚ فَاللّٰہُ یَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾

قول اُن کے کے پس اللہ فیصلہ فرمائیگا درمیان اُنکے دن قیامت کے بیچ اُس کے کہ تھے وہ بیچ اُس کے اختلاف کرتے

بات کہی تو اللہ قیامت کے دن ان میں فیصلہ کر دے گا جس بات میں جھگڑ رہے ہیں

**تعلّق**۔ اس آیت کا پچھلی سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** پہلے عیسائیوں اور یہودیوں کا متفقہ دعویٰ بیان کیا گیا۔ کہ ہر ایک صرف اپنے ہی جنتی ہونے کا دعویدار ہے۔ اب اُن کے آپس کا اختلاف بیان ہو رہا ہے۔ کہ اُن میں سے ہر ایک بھی دوسرے کو جہنّمی سمجھتے ہیں۔ **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں یہود و نصاریٰ کے جھوٹے ہونے کی چند وجہیں بیان کی گئیں۔ کہ اُن کے یہ دعوے بلا دلیل ہیں وغیرہ اب اُن پر الزامی دلیل قائم کی جارہی ہے۔ کہ وہ تو خود ایک دوسرے کو بے دین سمجھتے ہیں۔ کس منہ سے مسلمانوں کے سامنے تنتے ہیں۔ چونکہ جواب الزامی جواب تحقیقی کے بعد ہوتا ہے اس لئے اس مضمون کو پیچھے بیان کیا گیا **تیسرا تعلق** پچھلی آیتوں سے معلوم ہوا تھا۔ کہ اہل کتاب قرآن و اسلام کو جھٹلاتے تھے جس سے مسلمانوں کو دلی صدمہ اور روحی رنج ہوتا تھا۔ اب رب تعالیٰ نے مسلمانوں کی تسلی کیلئے فرمایا۔ کہ تم اُن کی بکواس سے غم نہ کرو۔ ان کی تو یہ عادت ہی ہے۔ اگر یہ تمہیں جھٹلاتے ہیں۔ تو آپس میں ایک دوسرے کی کب رعایت کرتے ہیں۔ **چوتھا تعلق** پچھلی آیت میں رب نے فرمایا تھا۔ کہ جو مسلمان اور نیک کار ہو وہ جنتی ہے یعنی اے اہل کتاب چونکہ تم میں یہ دونوں وصف نہیں لہٰذا تم جنتی نہیں اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ وہ تو ہم نے کہا تھا۔ دیکھو یہ خود اپنے منہ سے ایک دوسرے کے جہنّمی ہونے کا اقرار کر کے ہماری تائید کر رہے ہیں۔ **شانِ نزول**۔ تفسیر عزیزی و خزائن عرفان وغیرہ نے اس جگہ وہ مناظرہ بیان کیا جس کا تذکرہ ہم پہلی آیت میں کر چکے۔ کہ نجران کے عیسائی حضور علیہ السلام کے ملاقات کیلئے حاضر ہوئے مدینہ منوّرہ کے یہودی بھی انہیں دیکھنے آگئے رافع ابن حرملہ یہودی عالم نے عیسائیوں سے کہا۔ کہ تم بے دین ہو عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر اور انجیل کو کلام الٰہی سمجھے بیٹھے ہو۔ حالانکہ نہ عیسیٰ (علیہ السلام) پیغمبر اور نہ انجیل کتاب اللہ تمہارا دین اصل سے ہی غلط ہے۔ نجرانیوں میں سے ایک نصرانی بولا کہ تم بے دین ہو کہ موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر اور توریت کو کتاب الٰہی مانے ہوئے ہو۔ حالانکہ نہ موسیٰ (علیہ السلام) پیغمبر تھے۔ اور نہ توریت آسمانی کتاب اسی پر خوب شور مچا انہوں نے ایک کو کافر اور بے دین بتایا حضور علیہ السلام ناخوش ہوئے اور فرمایا۔ کہ تعجب ہے کہ توریت و انجیل تو ایک دوسرے کی تصدیق کریں اور تم تکذیب۔ حضور علیہ السلام کی تائید میں یہ آیت کریمہ اُتری ممکن ہے۔ کہ اس واقعہ پر یہ دونوں ہی آیتیں آئی ہوں اور پہلی آیت میں تو اُن کے دعوے کا اجمالی ذکر کیا گیا ہو اور اس آیت میں تفصیلی **تفسیر** وَ قَالَتِ الۡیَہُوۡدُ اس سے یا تو وہ علماء یہود مراد ہیں۔ جو اس مجلس میں موجود تھے۔ اور قول سے زبانی قول اور یا یہود سے عام یہودی اور قول سے اعتقاد مراد یعنی اُن علماء یہود نے دعویٰ کیا یا عام یہود نے یہ اعتقاد رکھا۔ کہ لَیۡسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی شَیۡءٍ ۪ کہ عیسائی کسی چیز پر نہیں یا تو شی سے مراد سچا دین ہے۔ یا عام چیز یعنی عیسائی سچے دین پر نہیں یا اُن کی کوئی بات صحیح نہیں۔ اُس کے جواب میں وَ قَالَتِ النَّصٰرٰی۔ عیسائی بولے یہاں بھی وہی دو احتمال ہیں۔ کہ اُن نصرانی عالموں نے یہ دعویٰ کیا یا عام عیسائیوں نے یہ عقیدہ رکھا۔ کہ لَیۡسَتِ الۡیَہُوۡدُ عَلٰی شَیۡءٍ۔ یہود سچے دین پر نہیں یا یہود کی کوئی بات سچی نہیں خیال

رہے کہ یہودی نہ عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر مانتے ہیں۔ اور نہ انجیل کو آسمانی کتاب اور عیسائی موسیٰ علیہ السلام کو نبی اور توریت کو صحیح تو مانتے ہیں۔ مگر کہتے ہیں۔ کہ انجیل سے اُن کی نبوت اور توریت دونو منسوخ ہو چکیں۔ لہٰذا یہود کا تو یہ مطلب تھا۔ کہ عیسائیوں کی اصل بنیاد ہی غلط ہے۔ اور عیسائی یہ دعویٰ کرتے تھے۔ کہ یہودی کی کتاب کبھی قابل عمل تھی۔ لیکن اب اُس کو ماننا حماقت ہے۔ ان دونوں کا کلام تو یکساں ہے۔ مگر مطلب جداگانہ اور ان میں سے ایک کو غلط اور دوسرے کو صحیح نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ وہ سب ہی آسمانی کتاب پڑھتے ہیں۔ یا تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ دونوں اپنی اپنی کتابوں کے ماہر ہیں کیسے غلط کہا جائے۔ یا یہ کہ وہ دونوں اس وقت اپنی کتاب پڑھ کر ایک دوسرے کو کافر کہہ رہے ہیں۔ اور ہر ایک اپنی کتاب سے دلیل دے رہا ہے۔ لہٰذا چاہیئے۔ یہ کہ اُن دونوں کو سچا مان کر سب سے الگ ہو جاؤ۔ سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اس آیت کو پڑھ کر فرماتے تھے۔ کہ صدقوا واللہ خدا کی قسم یہ سب اس بات میں سچے ہیں۔ کہ ان میں سے کوئی بھی ہدایت پر نہیں۔ ہدایت تو تیسرے دین یعنی اسلام میں ہے۔ یہ بدنصیب پڑھ کر لکھ کر بھی جاہل بن گئے کیونکہ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ ایسے ہی تو اُن جاہلوں نے بھی کہا تھا۔ جو کتاب الٰہی کے جاننے والے نہیں یعنی مشرکین و دیگر کفار تو ان علما اُن جہلا میں فرق کیا رہا۔ مِثْلَ قَوْلِهِمْ یا تو كَذٰلِكَ کا بدل ہے اور یا قال کا مفعول یعنی اُن جہلا نے انہیں کی طرح اور انہیں کی سی بات کہی ان بے وقوف عالموں نے اپنی علمی شان گما دی اور اپنے کو اُن جہلا میں داخل کر دیا۔ بلکہ حق تو یہ ہے۔ کہ اُن میں سے ہر ایک خود اپنے ہی قول سے جھوٹا ہے۔ کیونکہ یہود بھی عیسائیوں کی بعض باتوں کو سچا جانتے ہیں اور عیسائی یہودیوں کی مگر ایک دوسرے کو کہتے یہ ہیں۔ کہ اُس کی کوئی بات سچی نہیں۔ اسی صورت میں ان دونوں کے درمیان کو تیسرا حاکم چاہیئے فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ان کا قطعی فیصلہ قیامت میں رب تعالیٰ فرمائیگا یعنی اگرچہ حضور علیہ السلام نے دنیا میں ہی صحیح فیصلہ فرما دیا مگر انہوں نے وہ قبول نہ کیا۔ اب پروردگار آخرت میں ان کا ایسا فیصلہ فرمائیگا جو انہیں ماننا ہی پڑیگا۔ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ اُن ساری باتوں کا فیصلہ ہوگا جس کے اندر یہ دنیا میں جھگڑتے تھے۔ کہ ہر ایک کو بقدر کفر اور بحد گناہ سزا دی جائیگی **خلاصہ تفسیر** اس سے پہلے یہود و نصاریٰ کے اقوال بہت قوی دلائل سے باطل کئے گئے تھے۔ اب ایک عجیب دلیل سے اور زیادہ باطل کیا جارہا ہے۔ کہ اے مسلمانو تم تو اس کو روتے ہو کہ اہل کتاب ہمیں بُرا کہتے ہیں ذرا اُن کی آپس کی جوتے بازی تو دیکھو کہ اہل کتاب کے بڑے بھائی تو کہتے ہیں۔ کہ عیسائیوں کا کوئی دین مذہب ہی نہیں۔ ان کے چند ڈھکوسلے ہیں جو اُن کے پیشواؤں نے گھڑ لیے ہیں۔ بھلا اندھیر تو دیکھو کہ توریت میں خدا کو ایک کہا گیا۔ اور انہوں نے اُس کے تین حصے کر ڈالے باپ بیٹا اور روح القدس نہ اس سے پہلے کسی پیغمبر نے یہ کہا تھا۔ اور نہ کسی کے وہم گمان میں یہ بات آئی تھی اور پھر اُس کو خدا کا بیٹا مانا جو بقول ان کے ہمارے ہاتھوں صلیب پر چڑھا دیا گیا ستم تو دیکھو کہ گناہ تو یہ کریں اور اُن کے عوض خدا کا بیٹا صلیب کی تکلیف برداشت کرے۔ اور انہیں جرم و گناہ کرنے کی عام اجازت دے جائے کہ آئندہ ان کے گناہ پوپ صاحب معاف کر دیا کریں بھلا یہ بھی کوئی مذہب ہے۔ عیسائی یہ کہتے ہیں۔ کہ یہود نے پچھلے نبی کو نہ مانا اور توریت میں دس احکام اور کچھ رسمی قاعدوں کے سوا دھرا ہی کیا ہے۔ پولوس مقدس فرماتے ہیں۔ کہ توریت ظلمت کا پردہ ہے۔ اور موسیٰ (معاذ اللہ) جلادوں کے استاد تھے ہم کو اُن سے کوئی تعلق نہیں وہ رسمی مذہب بھی مسیح کے آنے سے بیکار ہو گیا (تفسیر حقانی) رب فرماتا ہے۔ کہ یہ بے باکیاں اور گستاخیاں انہیں پر کیا موقوف ہیں ہر جاہل مذہب والے کیا کرتے ہیں۔ ہندو بھی اپنے سوا سب کو ملکش اور ناپاک کہتے ہیں۔ آریہ وغیرہ بھی ایسی ہی بے سری باتیں ہانکتے ہیں۔ جب یہ بھی تعصب میں اس طرح دھول جوتی کرنے لگے تو ان علماء اور اُن جہلا میں فرق کیا ہے۔ اچھا ٹھہر جاؤ اب ان کے جھگڑے کو ہم ہی چکائیں گے اور ان کا فیصلہ جہنم کی آگ ہی کریگی۔ مگر مسلمانوں یہ باتیں سُن کر اب تم کو ان کی بکواس سے بُرا نہ ماننا چاہیئے۔ کیونکہ ان میں نفسانیت ہے حقانیت سے ان کو کوئی واسطہ نہیں۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ پہلا فائدہ کفار سے صحیح نیت

سے مناظرہ کرنا باعث ثواب ہے۔ اور جھگڑے کے ارادے اور ایک دوسرے کو ہرانے کے لئے مناظرہ برا اور طریقہ یہود و نصاریٰ
کا ہے۔ پچھلی آیت میں تو مسلمانوں کو کفار سے مناظرہ کرنے کا حکم دیا گیا اور اس آیت میں اُن کے آپس کے مناظرہ کی برائی بیان ہوئی۔ بلکہ
اس مناظرہ کی برائی بیان ہوئی بلکہ اس مناظرہ کو مسلمانوں کیلئے جواب الزامی بنا دیا گیا۔ لہٰذا اس زمانہ کے عام مناظروں سے پرہیز چاہیئے۔ کہ ان میں ضد اور ہٹ دھرمی کے
سوا کچھ نہیں ہوتا دوسرا فائدہ بدنیت مناظر کبھی ایسی بات کہہ جاتا ہے جو خود اس کے بھی خلاف ہوتی ہے جیسے یہاں عیسائیوں اور یہودیوں نے ایک دوسرے سے کہہ ڈالا کہ تمہاری کوئی بات سچی نہیں حالانکہ ان کے
عقیدے کے بھی خلاف ہے مناظرہ میں بہت سوچ سمجھ کے منہ سے بات نکالو۔ اگر رافضی مناظر حضرات شیخین کا انکار کر دے تو تم اس کے مقابلہ میں
اہل بیت اطہار کا انکار نہ کر بیٹھو تیسرا فائدہ مناظرہ کے لئے حکم ہونا چاہیئے۔ کہ یہاں رب تعالیٰ نے اہل کتاب کا مناظرہ بیان فرما کر
اپنی حکومت کا ذکر فرمایا۔ چوتھا فائدہ مناظر کو چاہیئے کہ مقابل کی کتابوں پر نظر رکھے۔ اور اُن کے دین وغیرہ سے واقف ہو دیکھو رب تعالیٰ
نے مسلمانوں کو کفار کی بکواس سنا کر یاد کرائی تاکہ انہیں مناظرہ میں کام آئے پانچواں فائدہ متعصب عالم جاہل کی مثل بلکہ اس سے بدتر
ہے۔ کہ اُس کے کسی قول کا اعتبار نہیں۔ **پہلا اعتراض** مسلمانوں کے فرقے بھی ایک دوسرے کو گمراہ اور کافر کہتے ہیں تو چاہیئے۔ کہ عیسائیوں
اور یہودیوں کی طرح یہ سب گمراہ ہوں اور ان میں سے کسی کا اعتبار نہ رہے یا ان سب کو سچا مان کر سب کو بے دین مانا جائے۔
(عام مرتدین) **جواب** یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کی کتاب کے منکر اور اُن کے انبیاء کے انکاری تھے۔ کہ یہود تو عیسائیوں کو انجیل اور
عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کی وجہ سے کافر کہتے تھے۔ اور عیسائی یہود کو توریت اور موسیٰ علیہ السلام کے ماننے کی وجہ سے بے دین کہتے تھے
ایسی باتیں کہنے والے سب بے دین ہیں۔ لیکن ہم جو دیوبندیوں مرزائیوں رافضیوں وغیرہ کو گمراہ اور کافر کہتے ہیں۔ اس لئے نہیں۔ کہ وہ
قرآن کو مانتے ہیں، یا اُن کے پاس جو قرآن وہ کتاب اللہ نہیں بلکہ اس لئے کہ انہوں نے کما حقہٗ مانا نہیں۔ اور اس کی بعض آیتوں کا در پردہ
انکار کیا یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کو توریت انجیل ماننے پر کافر کہتے تھے اور ہم نہ ماننے پر لہٰذا بڑا فرق ہو گیا۔ اگر ہر مناظر گمراہ ہو
تو ان آیتوں میں بلکہ سارے قرآن میں مناظرہ ہی ہے۔ ہم تو یہود و نصاریٰ کو بھی اس لئے کافر نہیں کہتے کہ وہ توریت و انجیل مانتے ہیں۔ بلکہ
اس لئے کہ اُن کو نہیں مانتے اور ہمارے نبی پر ایمان نہیں لاتے **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ دنیا کے سارے مذہب
سچے ہیں دیکھو یہود و نصاریٰ نے ایک دوسرے کو کافر کہا۔ تو رب نے اُن دونوں پر ناراضی فرمائی معلوم ہوا کسی کو کافر نہیں کہنا چاہیئے (عام
نیچری اور بعض مرزائی) **جواب**۔ یہاں ناراضی کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہر ایک نے جوش میں آ کر دوسرے دین کے سچے پیغمبر کا انکار کر دیا۔ اور
اُن کی اصل کتاب کا انکار کر ڈالا یا اُن کی ہر بات کو (علیٰ شیئ) کہہ کے غلط کہہ دیا حالانکہ اُن میں کوئی نہ کوئی بات تو اب بھی اچھی ہے۔ اسی لئے
ہم کو حکم ہے۔ کہ موجودہ توریت و انجیل کا بے دھڑک انکار نہ کر دیں۔ بلکہ یوں کہیں کہ جو اللہ نے اتاری اسی پر ہمارا ایمان اگر سارے دین
سچے ہیں۔ تو ان آیتوں کے کیا معنی ہوں گے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ۔ وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ
دِیْنًا۔ قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ وغیرہ بلکہ قرآن کی تعلیم ہی غلط ہو جائیگی۔ کیونکہ اُس نے اوّل سے آخر تک کفار کی برائی اور مسلمانوں کی
تعریف فرمائی۔ بلکہ پھر تو خنزیر حلال بھی ہوگا حرام بھی ماں بہن سے نکاح کرنا جائز بھی ہوگا۔ اور ناجائز بھی کیونکہ ان چیزوں کو بعض دین حلال
کہتے ہیں۔ اور بعضے حرام اور تمام دین سچے **تیسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ اللہ ہی فیصلہ فرمائیگا۔ دوسری جگہ فرمایا گیا حَتّٰی
یُحَکِّمُوْکَ وہ آپ کو اپنا حکم مانیں نیز یہاں معلوم ہوا کہ قیامت کے دن فیصلہ ہوگا۔ دوسری جگہ فرمایا گیا۔ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ کہ آپ
اُن کا دنیا میں ہی فیصلہ فرما دیں۔ ان آیتوں میں مطابقت کیونکر ہو۔ **جواب**۔ زبانی فیصلہ تو قرآن اور نبی علیہ السلام نے دنیا میں فرما دیا
لیکن سزا اور جزا دے کر عملی فیصلہ قیامت میں رب فرمائیگا۔ **چوتھا اعتراض** کَذٰلِکَ اور مِثْلَ قَوْلِہِمْ کے ایک معنی ہیں پھر اس آیت میں دونوں لفظ کیوں لائے گئے ایک ہی تشبیہ
کافی تھی **جواب** کذٰلک سے طریقہ گفتگو اور مثل قولہم سے کلام میں تشبیہ دی گئی یعنی ایسی ہی ضد اور ہٹ دھرمی سے ایسی قسم کی بیہودہ باتیں اُن جہلاء نے بھی کہی تھیں **تفسیر صوفیانہ** ظاہر باطن کا حجاب ہے ظاہر میں

پہنچتا تھا۔ آدمی باطن تک نہیں پہنچ سکتا یہ عیسائی اور یہودی دوئی کی جھنجھٹ میں پڑ کر ایک دوسرے کا انکار بیٹھے حالانکہ اُن کے پاس حجاب پھاڑنے والی اور اصل دکھانے والی کتاب موجود تھی لہٰذا ان کتاب کے الفاظ دیکھنے والوں اور عقلی ڈھکوسلوں ماننے والے مشرکین میں کوئی فرق نہ رہا۔ حق تعالیٰ قیامت کبریٰ کے وقت وحدت ذاتیہ کی تجلی فرما کر اس کا فیصلہ فرمائیگا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اوّلاً اپنے بندوں پر اُن کے اعتقاد کے موافق صورت میں تجلّی فرمائیگا جس سے کہ وہ اسے پہچان لیں گے۔ پھر دوسری صورت میں تجلّی ذات ہوگی جس کے وہ منکر ہو کر گمراہ اور محجوب ہو جاویں گے۔ قیامت میں وہی موحد کامیاب رہیگا جس نے رب کی ذات کو اپنے کسی عقیدہ کی صورت میں مقید نہ مانا (تفسیر ابن عربی) روح البیان نے فرمایا کہ ایک دوسرے کی مخالفت کرنا گمراہوں میں ہی خاص نہیں بلکہ علماء صوفیا اور مشائخ میں بھی جاری ہے۔ بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ جو بغیر نفس کو صاف کئے ہوئے مرشد بننے کا دعویٰ کرے اور اس خرقہ کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنائے اُس کا عذاب زانیہ عورت سے سخت تر ہوگا۔ کیونکہ زانیہ ناجائز بچہ پیدا کر کے اُس کی زندگی برباد کرتی ہے۔ مگر یہ مدعی غلط مرید بنا کر اُن کی آخرت تباہ کرتے ہیں اسی قسم کے حجاب والے لوگوں میں ہی اختلاف ہوتا ہے۔ یہ سارے جھگڑے اس حجاب کے ہیں۔ اگر یہ حجاب اُٹھ جائے تو نہ اختلاف رہے نہ اختلاف والے۔ شعر

کفر و اسلام کے جھگڑے تیرے چھپنے سے ہیں ۔ تو اگر پردہ اُٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے

مولانا فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ اصل چھوڑ کر سایہ کے شکار میں اپنی قیمتی عمر خرچ کرتے ہیں فرماتے ہیں۔

مرغ بر بالا پران و سایہ اش ۔ مے دود بر خاک پراں مرغ وش
ابلہے صیاد آں سایہ شود ۔ مے دود چنداں کہ بے مایہ شود
بے خبر اندازد بسوئے سایہ او ۔ ترکشش خالی شود از جستن و جو
ترکش عمرش تہی شد عمر رفت ۔ از دویدن در شکار سایہ تفت
سایہ یزداں چو باشد دایہ اش ۔ وارہاند از خیال و سایہ اش

طالب دنیا اپنے ترکش عمر کے سارے تیرے دربیں جسم اور جسمانیات کے شکار میں صرف کر دیتا ہے۔ اگر یہی محنت روح کے شکار پر کرتا تو بہت کامیاب رہتا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا

اور کون ہے بڑا ظالم اُس سے جو روکے ۔ مسجدوں اللہ کی ۔ یہ کہ ذکر کیا جاوے بیچ اُسکے نام اُس کا ۔ اور کوشش کرے بیچ ویرانی اُسکی کے

اور اُس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں کو روکے ان میں نام خدا لئے جانے سے اور ان کی ویرانی میں کوشش کرے

اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ

یہ لوگ ہیں ۔ نہیں تھا واسطے اُن کے یہ کہ داخل ہوں اُن میں ۔ مگر خوف کرتے ۔ واسطے اُن کے بیچ دنیا کے رسوائی ہے

ان کو نہ پہونچتا تھا۔ کہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے۔

وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۱۴)

اور واسطے اُنکے بیچ آخرت کے ۔ عذاب ۔ بڑا

اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ پہلا تعلق پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا۔ کہ یہود و عیسائیوں نے اللہ کی کتابوں اور اس کے نبیوں سے دشمنی کی۔ اب فرمایا جاتا ہے۔ کہ انہوں نے تو اللہ سے بھی دشمنی کی کہ اُس کے ذکر کی مسجدوں کو ویران کرنیکی کوشش کی تو اے مسلمانو تم کسی شمار میں ہو۔ دوسرا تعلق آیتوں میں فرمایا گیا تھا کہ اے اہل کتاب جنتی وہ جس کے عقائد اور اعمال درست ہوں تمہارے تو اعمال بھی خراب ہیں۔ اور عقائد بھی پھر تم اُس کے دعویدار کیسے اُس کے بعد اُن کے عقائد کی خرابی بتائی گئی۔ کہ تم انبیاء کے منکر ہو اور اب اُن کے اعمال کی خرابی بتائی جا رہی ہے۔ کہ تم مسجدیں گرانے والے ہو۔ تیسرا تعلق پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا۔ کہ اہل کتاب کے یہ اقوال مشرکین سے ملتے جلتے ہیں۔ اب فرمایا جا رہا۔ کہ ان کے اعمال بھی انہیں جیسے ہیں۔ کہ وہ مشرکین بھی مسجدوں کے دشمن اور یہ بھی چوتھا تعلق پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا۔ کہ ان اہل کتاب نے جوش عداوت میں ایک دوسرے کے دین کی حقانیت کا بالکل انکار کر دیا۔ اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ ان کی عداوت اس حد تک پہنچی کہ ایک دوسرے کے عبادت خانے گرانے کے بھی درپے ہو گئے پانچواں تعلق پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ بیدینوں کا فیصلہ قیامت میں ہوگا۔ اب بتایا جا رہا ہے۔ کہ جن کی شرارت حد سے بڑھ جاتی اُن کو آخرت علاوہ دنیا میں بھی کچھ سزا دی جاتی ہے

**شان نزول**۔ اس کے شان نزول میں بہت سے قول ہیں۔ روح البیان نے فرمایا۔ کہ عیسائیوں کے بادشاہ طیطوس نے ایک بار بنی اسرائیل (یہود) سے جنگ کی اُن کے جوانوں کو قتل اور اُن کے بچوں کو قید کیا توریت شریف کو جلا دیا۔ بیت المقدس کو ویران کیا اُس میں مردار ڈالے اور سؤر ذبح کئے۔ خلافت فاروقی تک بیت المقدس اسی حال میں رہا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتح کسریٰ کے بعد اس کو آباد کیا اور وہاں آذان و نمازیں شروع کرائیں۔ اس کے بارے میں یہ آیت کریمہ اُتری پھر بیت المقدس انگریزوں نے فتح کر لیا اور تقریباً سو (۱۲۵) برس ان کے قبضہ میں رہا۔ یہاں تک کہ سلطان صلاح الدین نے سن ۵۸۳ھ ہجری میں فتح فرمایا۔ تفسیر کبیر نے فرمایا۔ کہ یہ آیت بخت نصر کے بارے میں اُتری جس نے یہود کو تباہ کر کے بیت المقدس میں یہ حرکتیں کیں۔ بعض نے فرمایا۔ کہ یہ آیت مشرکین مکہ کے بارے میں اُتری جبکہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو مسجد حرام میں نماز سے روکا اور حدیبیہ میں مسلمانوں کو عمرہ سے روکا یہاں تک کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنے دروازے پر نماز پڑھنے سے بھی منع کر دیا۔ آخر کار اُن کو وہاں سے ہجرت کرنی پڑی۔ مگر ابوبکر رازی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب احکام القرآن میں اول دو واقعات کا انکار کیا۔ کیونکہ بخت نصر عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے گزرا ہے۔ اُس وقت عیسائی تھے ہی کہاں۔ نیز یہ کیونکر ممکن ہے۔ کہ عیسائی بیت المقدس کو تباہ کریں۔ جبکہ وہ خود بھی اُس کی تعظیم کرتے ہیں۔ تیسرے قول پر امام رازی نے اعتراض کیا۔ کہ اس صورت میں آیتوں کا ربط ٹوٹتا ہے۔ کہ اب تک تو یہود کی برائیاں ہو رہی تھیں۔ اور اب مشرکین کا ذکر شروع ہو گیا۔ اور خود انہوں نے شان نزول یہ بتائی کہ تحویل قبلہ کے بعد یہود مدینہ کعبہ معظمہ کے دشمن ہو گئے اور مسلمانوں کو ادھر منہ کر کے نماز پڑھنے سے روکنے لگے۔ اور ممکن ہے۔ کہ انہوں نے کعبۃ اللہ یا مسجد نبوی کو ویران کرنیکی در پردہ کوشش کی ہو۔ مگر شان نزول کیلئے نقل کی ضرورت ہے۔ اس میں شاید کافی نہیں امام رازی نے اس پر کوئی روایت پیش نہ فرمائی۔ اگر یہ آیت مشرکین مکہ کے بارے میں آئی ہو تو بھی اس کا ربط نہایت درست ہے۔ جیسا کہ ہم بیان تعلق میں بتا چکے۔ کہ پچھلی آیت میں مشرکین کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور اگر یہود و نصاریٰ کے بارے میں ہو تو بھی ٹھیک ہے نیز ابوبکر رازی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فرمانا کہ عیسائی تو خود بیت المقدس کی تعظیم کرتے ہیں۔ وہ اسے ویران کیوں کریں گے۔ یہ بھی قوی نہیں اہل دنیا دشمن کو مغلوب کرنے میں ہر جائز ناجائز کوشش کرتے ہیں۔ ابھی جرمنی نے لندن پر حملے کئے تو صدہا گرجے گرا دیئے۔ حالانکہ وہ خود عیسائی ہے۔ اسی طرح ممکن ہے۔ کہ عیسائیوں نے یہود کی مخالفت میں بیت المقدس کو ویران کیا ہو۔ بہر حال یہ آیت کریمہ یا تو یہود کے بارے میں آئی یا مشرکین کے۔

**تفسیر** وَمَنْ اَظْلَمُ۔ مَنْ سوال کے لئے آتا ہے۔ لیکن یہاں استفہام انکاری نفی کے لئے ہے۔ یعنی اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ جو اللہ کی مسجدوں کو روکے مساجد جمع مسجد کی ہے جس کے معنی ہیں

سجدہ گاہ لیکن اصطلاح میں اسلامی عبادت خانہ کو مسجد کہتے ہیں جیسے قرآن کریم فرماتا ہے۔ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ اگرچہ عیسائیوں کے گرجوں اور یہودیوں کے کنیسوں میں بھی سجدے ہوتے ہیں۔ مگر انہیں قرآن نے مسجد نہ فرمایا۔ اتنا فرق ہے کہ خاص سجدہ گاہ کو مسجد جیم کے فتح سے اور پوری عبادت خانہ کو مسجد جیم کے کسرہ سے کہتے ہیں۔ اگرچہ عیسائیوں نے صرف ایک مسجد یعنی بیت المقدس کو اور مشرکین نے صرف بیت الحرام کو ہی ویران کیا۔ مگر چونکہ ایک مسجد کو ویران کرنا گویا کہ کل کو ویران کرنا ہے۔ اس لئے یہاں مَسَاجِدَ اللّٰهِ کہا گیا ہے جیسے کہ ایک پیغمبر کا انکار کل کا انکار اور ایک فرشتہ کی دشمنی کل کی دشمنی یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ پہلے تو بیت المقدس اور اب بیت الحرام تمام مسجدوں کی اصل ہے۔ کیونکہ سب مسجدوں کا رُخ اسی طرف ہوتا ہے۔ لہٰذا انہیں مساجد فرمایا گیا۔ مساجد کو اللہ کی طرف نسبت کیا کہ مسجد ضرار وغیرہ نکل جائیں کیونکہ مسجد اللہ وہ جس پر رسول اللہ کی رجسٹری ہو جائے اسی طرح جو مسجد خلاف شرع ہو اس کے یہ احکام نہیں وہ مسجد اللہ ہی نہیں۔ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ یا تو یہ مساجد کا بدل ہے۔ اور یا یہاں مِن پوشیدہ ہے۔ اور یا مَنَعَ کا دوسرا مفعول جیسے وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اور وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا یعنی جو اللہ کی مسجدوں کو وہاں خدا کا نام لینے سے روکے یا مسجدوں کو اس سے روکے کہ خدا کا ذکر کیا جائے۔ خیال رہے کہ یہاں بجائے نماز کے ذکر خدا کا ہوا۔ کیونکہ ذکر اللہ میں بہت چیزیں داخل ہیں نماز درود شریف تلاوت قرآن مجید مجلس وعظ محفل میلاد شریف نعت خوانی دینی تعلیم وغیرہ جو شخص ان میں سے کسی چیز کو بند کرتا ہے۔ وہ اس میں داخل ہے خیال رہے کہ ذکر اللہ دو طرح کا ہے۔ ایک بلاواسطہ اور ایک بالواسطہ اللہ کے پیاروں کا ذکر بالواسطہ خدا ہی کا ذکر ہے۔ بلکہ اُس کے دشمنوں کا ذکر بھی بعض دفعہ ذکر اللہ بن جاتا ہے سورۃ تبت یدا میں ایک کافر ہی کا ذکر ہے۔ مگر اُس کا پڑھنے والا ذاکر کہلاتا ہے۔ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا خراب خَرِبٌ سے بنا جسکے معنی ہیں ویرانی اس کا مقابل ہے عمارۃ یعنی آبادی یعنی جو کہ مسجدوں کے ویران کرنے کی کوشش کرے کوشش یا تو زبان ہو یا ہاتھ سے یا قلم سے یا غلط فتووں سے ایسے ہی ویرانی عام ہے مسجد کو گرا دینا۔ اذان باجماعت کو روکنا نماز کے وقت اس میں قفل لگا دینا مسلمانوں کو وہاں سے روکنا مسجد کے برابر دوسری مسجد بنا دینا تاکہ پہلی مسجد ویران ہو جائے وہاں کی زیب زینت دور کر دینا یہ سب اس میں داخل ہیں اُولٰٓئِكَ یہ دونوں قسم کے لوگ جو کہ ذکر اللہ سے روکیں یا مسجد کی کسی قسم کی بھی ویرانی کی کوشش کریں۔ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ یا تو کان ماضی کے معنی میں ہے۔ یعنی ان اہل کتاب کو خود اپنے دین کے اعتبار سے وہاں آنا جائز نہ تھا۔ مگر اللہ سے خوف اور عاجزی کرتے ہوئے۔ کیونکہ یہ اُن کے بھی دینی مقامات ہیں۔ یا مستقبل کے معنی میں اور آئندہ کی خبر دی جا رہی ہے۔ کہ اے مسلمانو کچھ غم نہ کرو عنقریب وہ وقت آ رہا ہے۔ جبکہ ان مشرکین کو مسجد حرام میں آنے کی اجازت بھی نہ ہو گی۔ مگر ڈر کر چھپ کر رب تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا۔ کہ ۹ سنہ ہجری میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام کے حکم سے اعلان فرمایا۔ کہ آئندہ کوئی مشرک اس مسجد پاک میں داخل نہ ہو اور فاروق اعظم اور عثمان غنی کے زمانہ میں ملک شام بھی عیسائیوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اور بنی اُمیہ بنی عباس کے زمانہ میں قسطنطنیہ اور رومیہ وغیرہ بھی اُن کے ہاتھ سے جاتے رہے۔ اور یہ جزائر فرنچ میں آوارہ اور پریشان رہے۔ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ مسجدیں ویران کرنیکا وبال یہ پڑے گا۔ کہ اُن کے لئے دنیا میں رسوائی ہو گی۔ خزی کے لفظی معنی ہیں شکست کا پہنچنا خواہ اپنی طرف سے ہو یا کسی اور کی طرف سے اہل کتاب اور مشرکین کو چند طریقوں سے رسوائی ہوئی جنگوں میں انہوں نے شکست پائی جزیے ان پر قائم ہوئے حجاز سے نکالے گئے۔ اپنی دینوں سے بیدخل ہوئے۔ اور اس پر بس نہیں۔ بلکہ وَلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ اُن کے لئے آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے چونکہ دنیوی مصیبت آخرت کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ اسی لئے اُسے خزی کہا اور اسے عذاب **خلاصہ تفسیر** اے مسلمانو تم ان کی کہاں تک شکایتیں کرو گے۔ ان کی گمراہی کا تو یہ حال ہے۔ کہ باوجودیکہ ان کے دین میں بھی مسجدوں کی عزت ہے۔ مگر انہوں نے جوشِ تعصب میں اُس کا بھی لحاظ نہ کیا اور انہیں

ویران کیا بتاؤ تو اُس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا. جو خدا کی مسجدوں کو خدا کے ذکر سے روکے اور اُن کے ویران کرنے کی کوشش کرے جیسا کہ عیسائیوں نے بیت المقدس میں کیا اور مشرکین نے بیت الحرام میں واقعی یہ بہت بڑا ظلم ہے. کیونکہ بعض تو مالی ظلم کرتے ہیں بعضے جانی بعضے آبرو کا مگر اس میں بڑا ظلم وہ کسی کا گھر چھین لے انہوں نے گھر پر قبضہ کیا دوسرا یہ کہ کوئی تو چیز کا غاصب ہوتا ہے. اور کوئی اُس کے نفع کا مگر بدتر وہ شخص ہے. جو مالک کا ذکر بھی نہ ہونے دے تیسرے یہ کہ بعض غاصب مغصوب پر اصل ملکیت کا دعویٰ کرتے ہیں. اور بعضے اُس کے خریدنے کا مگر خبیث غاصب وہ ہے. کہ جو اصل چیز کو ہی تباہ کردے اور مالک کا نام بھی نہ لینے دے ان کم بختوں کو چاہیئے تھا. کہ خود بھی ان مسجدوں میں ڈرتے جھجکتے آتے. اب اس کا انجام یہ ہوگا. کہ ان کے واسطے دنیا میں بھی رسوائی ہوگی اور آخرت میں بھی سخت عذاب ملیگا. یا یہ کہ اس جرم کا انجام یہ ہوگا. کہ مسجدیں تو پھر آباد ہو جائیں گی. لیکن یہ خود وہاں سے ایسے نکلیں گے. کہ پھر ان کا داخلہ بھی دشوار ہوگا. **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے. **پہلا فائدہ** جو شخص مسجد کو کسی طرح ویران کرے وہ بڑا ظالم ہے. اور جو اُسے آباد کرے وہ بڑا ہی ثواب کا مستحق آبادی کی چند صورتیں ہیں مسجد بنانا اس میں چٹائیوں اور وہاں تیل بتی کا انتظام کرنا وہاں عمدہ امام مقرر کرنا جس سے جماعت بڑھ جائے وہاں اللہ کا ذکر کرنا اُس کی اعلیٰ سے اعلیٰ زینت کرنا اس کی پوری تحقیق انشاء اللہ اِنَّمَا یَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ کی بحث میں آئے گی. حدیث شریف میں جو مسجدوں کے زینت کی ممانعت آئی اس سے یا تو فخریہ زینت مراد ہے. یا ناجائز زینت. جاندار کی تصویروں اور فوٹوں سے مسجد کو آراستہ کرنا یا محض دوسری مسجدوں کے مقابلہ کی غرض سے نہ کہ اللہ کو راضی کرنے کیلئے سجانا منع ہے. اس کی تحقیق ہماری کتاب جاء الحق میں دیکھو. وہ دیوبندی وہابی وغیرہ جو وہاں نعت خوانی اور چراغاں وغیرہ کو منع کریں اس میں داخل ہیں **دوسرا فائدہ** مسجد میں ہر طرح کا ذکر الٰہی جائز ہے خواہ بلند آواز سے ہو یا آہستہ نعت خوانی ہو یا درود خوانی ذکر کے حلقے کیونکہ اس آیت میں اَنۡ یُّذۡکَرَ مطلق ہے. جماعت اولیٰ کے وقت بلند آواز سے ذکر کرنا صرف نمازیوں کے نماز کے خلل کے اندیشہ سے منع ہے. جماعت اولیٰ کے بعد ہر طرح کا ذکر جائز صحابہ کرام نے مسجدوں میں نعت خوانی کی ہے. اور خود حضور علیہ السلام نے ہر نماز کے بعد ذکر بالجہر فرمایا. اس کی بھی پوری بحث ہماری کتاب جاء الحق میں دیکھو **تیسرا فائدہ** جس چیز سے مسجد کی جماعت گھٹے وہ منع ہے. کیونکہ یہ ویرانی کی کوشش ہے. لہٰذا وہاں بدمذہب یا سخت مزاج نرا جاہل امام رکھنا منع بدبودار چیزیں لے جانا حرام کچا لہسن پیاز کھا کر حقہ پی کر بدبودار زخم لے کر وہاں جانا ناجائز کیونکہ اس سے مسلمانوں کو ایذا ہوگی. اور وہ آنا چھوڑ دیں گے. **چوتھا فائدہ** کوشش کی جائے کہ مسجد کی عمارت ہمارے اپنے مکانوں سے اعلیٰ اور بلند و بالا ہو عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ میں مسجد نبوی شریف نہایت اعلیٰ اور نفیس بنوائی **پانچواں فائدہ** مسجد کو ویران کرنیوالا انشاء اللہ دنیا میں خوار و خستہ ہوگا. اور اُس پر غم اور خوف طاری رہیگا. اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے. اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے. بلکہ جن لوگوں نے مسجد کی چیزیں غصب کر کے گھر میں استعمال کیں وہ بھی آخر تباہ و برباد ہی ہوئے **مسئلہ** سب مسجدیں اللہ ہی کی ہیں. لیکن اُن کے درجے مختلف سب سے افضل مسجد بیت اللہ پھر مسجد نبوی پھر بیت المقدس پھر ہر شہر کی جامع مسجد پھر محلہ کی مسجد پھر بازار کی مسجد پھر گھروں کی مسجدیں یعنی گھر میں جگہ جو نماز کے لئے صاف کر لی جاتی ہے (تفسیر روح البیان) درمختار وغیرہ نے ترتیب یوں بیان کی کہ سب سے افضل مسجد مکہ معظمہ پھر مسجد مدینہ پھر بیت المقدس پھر قبا. پھر ہر شہر کی پرانی مسجد پھر وہاں کی بڑی مسجد پھر اپنے گھر سے قریبی مسجد پھر اپنے استاد کی مسجد. شامی نے اس کے علاوہ اور بھی مسجدوں کا ذکر کیا. **مسئلہ** تفسیر عزیزی نے فرمایا. کہ مسجدوں میں جھاڑو جھاڑ دینا انہیں تھوک وغیرہ سے صاف کرنا انہیں معطر کرنا بہت بہتر ہے. بلکہ مسجد کی جھاڑو حوران بہشتی کا مہر ہے. اور باقی مسائل کے لئے کتاب بہار شریعت کا مطالعہ کرو. **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا. کہ مسجد کو ویران کرنیوالا بڑا ظالم ہے. دوسری جگہ ارشاد ہوا. اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ جس سے معلوم ہوا. کہ مشرک اور کافر بڑا ظالم ان دونوں آیتوں

میں مطابقت کیونکر ہو **جواب**۔ ایک لحاظ سے مشرک بڑا ظالم ہے۔ دوسرے لحاظ سے مسجد کو ویران کرنے والا۔ مشرک تو اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتا ہے۔ کہ اُسے آخرت کی نعمتوں سے محروم کرتا ہے۔ اور مسجد کا ویران کرنے والا دوسروں کے لئے ظالم۔ کہ انہیں جماعت سے محروم کرتا ہے۔ لہٰذا دونوں آیتیں مطابق ہیں۔ **دوسرا اعتراض** اسلام کا قانون ہے۔ کہ دنیا تو عمل کی جگہ ہے۔ اور آخرت جزا کی تو مسجد کے ویران کرنیوالے کو دنیا میں رسوائی کی سزا کیوں ملی۔ **جواب**۔ دنیا کی رسوائی اُس کی حقیقی سزا نہیں یہ تو صرف لوگوں کی عبرت کے لئے سزا حقیقی تو آخرت میں ہی ہوگی۔ جیسے کہ چور کی سزا جیل خانہ ہے۔ حالانکہ تو اس کی ابتدا ہے۔ **تیسرا اعتراض** مسجدوں کو اللہ کی طرف نسبت کیوں کیا گیا۔ کیا اور ساری چیزیں اللہ کی نہیں ہیں۔ نیز اسے اللہ کا گھر کیوں کہتے ہیں۔ کیا وہ اس میں رہتا ہے (آریہ) **جواب**۔ اس لئے کہ مسجدوں پر کسی بندے کی ظاہری ملکیت بھی نہیں دیگر گھروں پر بندوں کی ظاہری ملکیت ہے جس سے وہ فروخت کر سکتے ہیں۔ نیز اور گھروں میں تو دنیوی کام بھی ہوتے ہیں۔ مگر مسجدوں میں صرف اللہ کے ہی کام۔ نماز۔ تلاوت قرآن۔ نعت خوانی وغیرہ دیکھو سارا ملک بادشاہ کا ہے لیکن صرف کچہریوں ڈاکخانوں شفا خانوں کو ہی سرکاری عمارتیں کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں صرف سرکاری ہی کام ہوتے ہیں۔ اور اُن پر کسی رعایا کا ظاہری دخل و قبضہ بھی نہیں **چوتھا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ مشرکین کو مسجد میں آنے کی اجازت نہیں کیونکہ فرمایا گیا۔ کہ یہ لوگ نہ آئیں مگر ڈرتے چھپتے پھر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کفار کا مسجد میں آنا کیوں جائز رکھا **جواب**۔ اس کی پوری بحث تو انشاء اللہ۔ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ الخ کی تفسیر میں آئیگی یہاں سرسری طور پر چند جواب دیئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ مَا كَانَ لَهُمْ ممانعت نہیں۔ بلکہ خبر ہے۔ یعنی آئندہ مشرکین کو مسجد حرام میں داخلہ تو کیا آنا بھی مشکل ہوگا۔ دوسرے یہ کہ خائفین کے معنی ہیں۔ اللہ سے خوف کرتے ہوئے یعنی چاہیئے تو یہ تھا۔ کہ یہ کفار بھی مسجدیں ڈرتے ہوئے آتے لیکن یہ شرک کرتے ہوئے آئے۔ تیسرے یہ کہ خائفین سے مخلوق سے ڈر مراد ہے۔ اور یہ یعنی یہ کفار مسجد میں نہ آئیں گے۔ مگر مقدمہ لے کر کیونکہ مسلمان قاضی مسجدوں میں ہی فیصلے کیا کریں گے جہاں یہ مظلوم بن کر آیا کریں گے چوتھے یہ کہ جب مشرک مسلمان کی اجازت سے مسجد میں آیا کہ مسلمان جب چاہے نکالدے تو یہ بھی خوف سے ہی آنا ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کفار مہمانوں اور دیگر سلطنت کے کافر ایلچیوں کو مسجد نبوی شریف میں ہی ٹھہراتے تھے۔ یہاں تک کہ ثمامہ ابن اثال کو حالت کفر میں ہی مسجد کے ستون سے باندھا تھا۔ لہٰذا اس آیت کی یہ توجیہ کرنا ضروری ہے **تفسیر صوفیانہ** مسلمانوں کے دل اللہ کی مسجدیں ہیں۔ بڑا مبارک وہ شخص ہے۔ جو ان مسجدوں کو اُس کے ذکر سے آباد رکھے۔ اور بڑا ظالم وہ ہے۔ جو ان میں دنیوی وسوسے پیدا کر کے انہیں اللہ کے ذکر سے خالی کر دے اور مختلف قسم کی تمناؤں سے اُنکو ویران کرنے کی کوشش کرے۔ لہٰذا نفس اور شیطان بڑے ظالم ہیں۔ کہ یہ تجلی گاہ رحمان یعنی قلوب انسان کو اُس مسجد کے نمازیوں یعنی رب کے ذکر فکر وغیرہ کو وہاں سے روکتے ہیں مگر یاد رہے کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جب رب اِن دلوں پر کسی شیخ کی برکت سے تجلی ڈالے گا۔ تو ان چیزوں کا وہاں داخلہ بھی مشکل ہو جائیگا۔ کہ وہاں نہ جائیں گے۔ مگر ڈرتے ہوئے ان کے لئے دنیا میں رسوائی اور مغلوبیت ہے۔ اور آخرت میں حق سے محجوب رہنے کا بڑا عذاب (تفسیر ابن عربی) حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ تین باتیں تو وطن میں ضروری ہیں۔ اور تین چیزیں سفر میں لازم وطن میں تو تلاوت قرآن آبادی مسجد اور مسلمانوں سے محبت کرے۔ سفر میں خرچ میں فراخی اخلاق کی درستی اور ساتھیوں سے جائز خوش طبعی کرے۔ مسجدیں وطن ارواح ہیں۔ وہ بڑا ظالم ہے۔ جو روحانی وطن کو برباد کرے ؛

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور واسطے اللہ کے ہے پورب اور پچھم پس جہاں کہیں پھرو تم پس وہاں ہے وجہ اللہ کا تحقیق اللہ وسعت والا علم والا ہے

اور پورب پچھم سب اللہ ہی کا ہے۔ تو تم جدھر منہ کرو ادھر وجہ اللہ (خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ ہے) بے شک اللہ وسعت والا علم والا ہے

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** پہلے فرمایا گیا تھا کہ مسجدوں کو ویران کرنے والا اور وہاں عبادت کو روکنے والا بڑا ظالم ہے۔ اب فرمایا جارہا ہے۔ کہ وہ ظالم خیال رکھے۔ کہ مسجدیں ویران کرنے سے خدا کا ذکر بند نہ ہوجائیگا۔ اللہ کی سلطنت تو مشرق و مغرب میں ہے۔ جدھر نظر اٹھا کہ دیکھو وہاں اُس کی عبادت ہو رہی ہے۔ یہ بیدین کہاں کہاں سے اُس کا ذکر روکیں گے۔ **دوسرا تعلق** پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ کفار مسلمانوں کو مسجدوں میں اللہ اللہ کرنے سے روکتے ہیں۔ اب فرمایا جارہا ہے۔ کہ اے مسلمانو اگر تم مسجدوں میں نہ جاسکو تو خدا کا ذکر نہ چھوڑو۔ پورب پچھم اللہ کا ہے۔ جہاں بھی بیٹھ کر اللہ اللہ کروگے وہاں اُسکو پالوگے۔ مسجد ہی پر عبادت موقوف نہیں **تیسرا تعلق** پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ یہ کفار آئندہ مسجدوں میں ڈرتے ہوئے آئیں گے یعنی مسلمانوں کا غلبہ ہوگا۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ اے مسلمانو صرف مسجدوں پر ہی تمہارا قبضہ نہ ہوگا۔ بلکہ سارا مشرق و مغرب اللہ کا ہے۔ تم جدھر بھی جہاد کرتے ہوئے پہنچ جاؤگے ادھر ہی رب کی نصرت پاؤگے اور مشرق و مغرب کے بادشاہ کہلاؤگے۔ گویا پہلے کفار کی مغلوبیت کا ذکر تھا۔ اور اب مسلمانوں کے غلبہ کا **چوتھا تعلق** پہلے تو کفار کے جرم کا ذکر ہوا اب اُن کی سزا کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ کہ اے کافرو ابھی ہم نے تم کو مہلت دے رکھی ہے۔ جب ہماری پکڑ میں آؤگے تو کہیں پناہ نہ پاؤگے کیونکہ مشرق و مغرب اللہ کا ہے۔ جدھر جاؤگے اللہ کا عذاب پاؤگے۔ **شان نزول** اس آیت کے شان نزول میں بہت سے قول ہیں۔ ایک[۱] یہ ہے کہ ایک بار صحابہ کرام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اندھیری رات میں سفر کر رہے تھے قبلہ کا رخ معلوم نہ ہوسکا جس کا جدھر دل جما اس نے اُدھر ہی نماز پڑھ لی صبح کو یہ واقعہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا گیا تب یہ آیت کریمہ اُتری جس نے بتایا کہ سب کی نمازیں ہوگئیں۔ دوسرا[۲] یہ کہ یہ آیت مسافر کے بارے میں اُتری کہ وہ بحالت سفر سواری پر نفل ادا کرسکتا ہے۔ خواہ اُس کی سواری کا رخ کدھر ہی ہوجائے۔ اُس کے نفل درست ہیں۔ تیسرا[۳] قول یہ ہے۔ کہ ایک بار حضور علیہ السلام سے عرض کیا گیا۔ کہ دعا کدھر منہ کرکے مانگیں کیا نماز کی طرح اُس کا بھی کوئی قبلہ ہے۔ تب یہ آیت اُتری جسمیں بتایا گیا۔ کہ دعا کے لئے کوئی جہت لازم نہیں اللہ کی رحمت ہر طرف ہے چوتھا[۴] قول یہ ہے۔ کہ یہ آیت نماز خوف کے بارے میں آئی کہ جنگ کی حالت میں سخت خوف کے وقت جس طرف بھی نماز پڑھ لیں ہوجائیگی پانچواں[۵] قول یہ ہے۔ کہ قبلہ بدلنے پر یہود نے مسلمانوں پر طعنہ کیا۔ کہ تمہارا عجیب دین ہے جس کا کوئی قبلہ ہی مقرر نہیں کبھی بیت المقدس اور کبھی کعبہ معظمہ اس پر یہ آیت اُتری جسمیں فرمایا گیا۔ کہ اہل کتاب حکمت سے ناواقف ہیں اور اے مسلمانو تم اللہ کے حکم کے تابع ہو۔ چھٹا[۶] قول یہ ہے۔ کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں کو اختیار تھا۔ کہ جدھر چاہیں ادھر منہ کرکے نماز پڑھیں بیت المقدس یا خانہ کعبہ اسی وقت کی یہ آیت ہے۔ (تفسیر کبیر و احکام القرآن و خزائن عرفان) لہذا یہ آیت یا منسوخ ہے یا ناسخ یا اپنے حال پر باقی **تفسیر وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ**۔ لِلّٰہ میں لام ملکیت کا ہے۔ یعنی اللہ کی ملک ہیں مشرق شرق کا ظرف ہے جس کے معنی ہیں چمکنا وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔ پورب کو اس لئے مشرق کہتے ہیں کہ اس طرف سے سورج اور تمام تارے چمکنے اور طلوع کرتے ہیں۔ مغرب غرب کا ظرف ہے جس کے معنی ہیں۔ ڈوب جانا اس لئے بڑے ڈول کو غرب کہتے ہیں۔ کہ اسے پانی میں ڈبویا جاتا ہے۔ اور بہت ممکن ہے۔ کہ مسافر اور الوکھی چیز کو بھی اسی لئے غریب کہا جاتا ہو کہ وہ ڈوبنے کی طرح لوگوں کی نظر وغیرہ سے چھپے رہتے ہیں خیال رہے۔ کہ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ صرف پورب پچھم تو اللہ کا ہے اور جنوب

شمال کسی اور کا بلکہ اس سے سارا عالم اجسام مراد ہے۔ کیونکہ مشرق و مغرب اُس کے دو کنارے ہیں۔ اور کنارے بول کر پوری چیز مراد لی جاتی ہے۔ جیسے کہ فلاں کو سر سے پاؤں تک پسینہ آگیا یعنی سارے جسم پر مطلب یہ ہوا کہ پورب پچھم یعنی سارا عالم اللہ ہی کا ہے۔ لہذا اگر کفار تم کو مسجدوں میں اللہ کا ذکر نہ کرنے دیں۔ تو فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا۔ جدھر بھی تم رُخ کرلو۔ اَیْنَمَا۔ اَیْنَ ظرفیہ اور مَا تنکیر یہ سے بنا ہے۔ اَیْنَ کے معنی ہیں جگہ اور مَا کے معنی جونسی یا جس۔ تُوَلُّوْا۔ وَلْیٌ سے بنا جسکے معنی ہیں۔ قرب کے تولّی کے معنی منہ کرنا بھی ہے۔ اور پیٹھ پھیرنا بھی یعنی قرب اور سلب قرب یہاں تو معنی بن سکتے ہیں بمعنی یعنی جدھر منہ کرلو یا مسجد سے پیٹھ پھیر کر جدھر ہی جاکر نماز پڑھو یعنی تم دعا یا نماز میں جدھر منہ کرلو۔ فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اودھر ہی اللہ کی توجہ ہے۔ ثَمَّ اور ھنا دونوں ظرف مکان ہیں۔ ھنا قریب جگہ کو بولتے ہیں اور ثَمَّ دور کو جیسے اردو میں یہاں اور وہاں مگر اس جگہ ھنا کے معنی میں ہے۔ (روح البیان) وجہ کے چند معنی ہیں چہرا ذات جیسے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ اور رضی جیسے اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ اور كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ان دونوں آیتوں میں وجہ رضا کے معنی میں ہے۔ اور جہت سمت یہاں چاروں معنی بن سکتے ہیں۔ اگر چہرا مراد ہو تو اُس کی اضافت اللہ کی طرف تشریفی ہوگی جیسے ناقۃ اللہ بیت اللہ یعنی اودھر ہی اللہ کا پیدا کیا ہوا چہرا ہے (تفسیر کبیر) تو گویا کہ اللہ کے مقبول بندوں کے چہروں کو وجہ اللہ کہا گیا یعنی جدھر بھی تم منہ کروگے اودھر ہی مقبولان خدا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ پاک بھی پھرتا ہے۔ تم ہر طرف اُن کی سنت کو پاؤگے۔ کیونکہ انہوں نے سفر اور خوف کی حالت میں ہر طرف ہی نماز پڑھی ہے اور اگر ذات مراد ہو تو اس سے رب کا علم اور رحمت مقصود ہوگا یعنی جدھر بھی منہ کرلوگے اودھر ہی اُس کی رحمت کو پاؤگے۔ اور اگر رضا مراد ہو تو معنی ظاہر ہیں۔ کہ ہر طرف اللہ کی رضا ہے اور اگر جہت اور سمت مراد ہو۔ تو یہ معنی ہوں گے۔ کہ تم جدھر بھی منہ کروگے وہی اللہ کی پسندیدہ جہت ہے۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ وجہ کے معنی قصد اور نیت کے بھی ہیں چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ ذَنْبًا لَسْتُ اُحْصِيْهِ رَبَّ الْعِبَادِ اِلَيْهِ الْوَجْهُ وَالْعَمَلُ

وجہ بمعنی قصد اب معنی یہ ہوئے کہ تم جدھر منہ کروگے اودھر ہی اللہ کا ارادہ ہے۔ غرضکہ ہر طرف اللہ ہی اللہ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ لفظ واسع وُسْعٌ یا سعۃ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں لامحدود فراخی خواہ مکان کے لحاظ سے ہو یا حالت کے یا فعل کے حق تعالیٰ کا نام واسع بھی ہے جس کے معنی ہیں۔ کہ اُس کا علم اُس کی ملکیت اُس کی قدرت اُس کا خلق تمام عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ مگر خود لامحدود جیسے کہ فرمایا وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ اور فرمایا وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا عَلِیْمٌ یہ گویا واسع ہی کا بیان ہے یعنی اُسکی سلطنت سب کو گھیرے ہے۔ اور پھر وہ کسی سے بے خبر نہیں۔ بلکہ سب کو جانتا ہے علیم میں بشارت بھی ہے۔ اور ڈرانا بھی کہ مسلمان یقین رکھیں کہ وہ جہاں کہیں نماز پڑھیں گے۔ ہمارے علم سے باہر نہ رہیگی اور کفار بھی خیال رکھیں۔ کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔ اس سے رب بے خبر نہیں لہذا کفار کو چاہیئے۔ کہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ بقدر طاقت نیکیاں کے لئے جائیں **خلاصہ تفسیر** اس آیت کی تفسیریں شان نزول اور تعلقات کے لحاظ سے بہت ہیں جن میں سے ہم صرف ایک تفسیر کئے دیتے ہیں۔ ناظرین گزشتہ تقریریں میں نظر کر کے باقی تفسیریں خود سمجھ لیں۔ اے مسلمانو اگر مشرکین تم کو مسجدوں میں اللہ کے ذکر سے منع کرتے ہیں تو تم اس کی پرواہ نہ کرو نہ تو اس سے اللہ کا ذکر رک سکتا ہے۔ اور نہ تمہاری نمازیں کیونکہ اُس کی عبادت صرف مسجدوں کی چہار دیواری میں ہی محدود نہیں۔ بلکہ سارا مشرق و مغرب اسی کا ہے اور سارے عالم میں اُسی کی سلطنت ہے۔ تم جہاں کہیں بھی مونھ پاکر نماز پڑھ لوگے۔ اودھر ہی اللہ کی رحمت اور اُس کی قبولیت ہوگی۔ کیونکہ اللہ بڑے وسیع مملکت والا اور بڑے علم والا ہے۔ خیال رہے کہ وسعتیں بہت سی ہیں وسعت علمی وسعت احسانی کہ اُس کا علم اور اُس کی نعمتیں ہر چیز پر حاوی ہیں۔ بعض مخلوقات کو کچھ خاص وسعتیں ملی ہیں۔ لیکن مطلق وسعت

والا رب ہی سب ہے۔ اگر اُس کے علم کو دیکھو۔ تو وہ ایک دریا ناپید کنارہ ہے۔ اگر اُس احسانات پر نظر کرو۔ تو وہ بے حد بے شمار۔ اگر اُس کی قدرتوں میں غور کرو۔ تو وہ اندازہ سے باہر لہٰذا کہنا پڑے گا۔ کہ وہ ہی حقیقی واسع ہے اور وہی حقیقی علم والا **فائدے** اس آیت اور اُس کی تفاسیر سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** پہلی امتوں کی نمازیں عبادت خانوں کے سوا کہیں نہ ہو سکتی تھیں۔ اسلام میں مسلمانوں کے لئے ساری زمین مسجد ہے۔ اگر کسی جگہ نماز کی ممانعت ہو گی۔ تو کسی عارضے کی وجہ سے جیسے کہ قبرستان۔ نیز بت خانہ اور حمام وغیرہ **دوسرا فائدہ** اگر کبھی سمت قبلہ نہ معلوم ہو سکے تو جدھر دل گواہی دے۔ ادھر ہی نماز پڑھ لے **تیسرا فائدہ** سفر میں تو نوافل اور خوف میں ہر نماز اور خانہ کعبہ میں اور مکہ معظمہ کے نظر والے ملک پر جس طرف رخ کر کے نماز پڑھی جائے جائز ہے۔ **چوتھا فائدہ** دعا کے واسطے کوئی سمت لازم نہیں امام کو بھی چاہیئے کہ اکثر داہنی طرف منہ کر کے دعا مانگے۔ کیونکہ سنت ہے۔ مگر کبھی کبھی ادھر سمت بھی دعا مانگا کرے **پانچواں فائدہ** نیکی سے روکنا سخت گناہ ہے۔ کسی کے روکنے سے نیک کام تو نہ رکے گا مگر خود روکنے والے پر وبال پڑے گا **چھٹا فائدہ** اگر مسلمان ایمان کا ہتھیار لے کر جہاد کریں تو ہر جگہ فتح ونصرت اُن کے ساتھ ہو۔ **پہلا اعتراض** اگر ہر طرف اللہ کی رحمت ہے۔ تو مسلمان نمازیں کعبہ کی طرف کیوں منہ کرتے ہیں۔ چاہیئے کہ ہر طرف نماز پڑھ لیا کریں دستیاریت پر کاش **جواب**۔ تاکہ مسلم قوم میں اجتماع شان پیدا ہو اسی لئے نماز روزہ حج وغیرہ کے لئے وقت بھی مقرر کر دیئے گئے اور مسجدوں میں حاضری کا حکم دیا گیا۔ نیز سمت مقرر ہونے سے دل میں سکون رہتا ہے اسی لئے نمازی کی نظر بھی ایک جگہ رہنی چاہیئے ہر طرف دیکھنے سے دل بٹتا ہے نیز اس میں رب کی شان قہاری نظر آتی ہے۔ کہ اس نے کروڑوں انسانوں کو ایک رخ پر جمع فرما دیا اور چونکہ خود کعبہ کو سجدہ کرنا مقصود نہیں۔ لہٰذا بعض صورتوں میں ہر طرف نماز جائز کر دی گئی۔

**دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ نماز میں کعبہ کو منہ کرنا فرض نہیں زیادہ سے زیادہ مستحب ہوگا **جواب**۔ شان نزول اور تعلق میں اس کے جوابات تفصیل وار گزر گئے۔ کہ یا تو یہ آیت دعا کے لئے ہے۔ اور یا مسافر اور خائف کیلئے اور یا کفار کو ڈرانے یا مسلمانوں کو خوش کرنے کیلئے ہے۔ اور اگر اختیار دینے کیلئے ہے۔ تو اس آیت سے منسوخ ہے۔ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ وغیرہ

**تیسرا اعتراض** جب دعا کیلئے کوئی سمت مقرر نہیں تو مسلمان آسمان کی طرف ہاتھ کیوں اُٹھاتے ہیں۔ کیا وہاں خدا رہتا ہے **جواب**۔ چند وجہ سے ایک یہ کہ یہ سنت انبیاء ہے اُن کی اطاعت سے دعا زیادہ قبول ہوگی۔ دوسرے یہ کہ آسمان تمام نعمتوں کا خزانہ وَفِي السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ تو اُس طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ مولیٰ ہم کو یہاں سے نعمتیں دے جیسے کہ شاہی لوگ خزانہ پر جمع ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں سے ہاتھ پھیلا کر تنخواہیں لیتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ہم کو بڑی بڑی نعمتیں آسمان ہی سے ملتی ہیں بارش دھوپ موسموں کا تبادلہ تندرستی اور بیماری آسمانی اثرات سے ہوتی ہیں۔ تو چونکہ اُس طرف سے نعمتیں لینے کی عادت پڑ چکی اس لئے ادھر ہی سے مانگتے ہیں۔ **نکتہ** کعبہ قبلہ نماز ہے اور آسمان قبلہ دعا اور بیت المعمور قبلہ ملائکہ اور کرسی قبلہ کروبین اور عرش قبلہ حاملین عرش اور ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم قبلہ قلب اور کعبہ روح جس کی طفیل یہ سارے قبلے پیدا ہوئے اس لئے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عین نماز پڑھانے کی حالت میں جب سرکار کو تشریف لاتے ہوئے دیکھا۔ تو خود مقتدی بن گئے۔ اور اُسی وقت سے حضور امام کیونکہ قبلہ کو پیٹھ کر کے نماز نہیں ہوتی اور اسی لئے مسجد نبوی شریف میں صف کی بائیں جانب دائیں طرف سے افضل ہے۔ کیونکہ ادھر روضہ مطہرہ ہے۔ جیسے کہ دل سے جسم کی بقا ہے۔ اور دل بائیں پہلو میں ہے۔ ایسے ہی حضور سے نماز کا بقا ہے۔ اسی لئے وہ مسجد کے بائیں طرف آرام فرما رہے ہیں۔ شعر

اے جوش دل کہ اُن کو یہ سجدہ روا نہیں — اچھا وہ سجدہ کیجئے کہ سر کو خبر نہ ہو

نماز قبول ہے جس میں سر کعبہ کی طرف ہو اور دل مصطفےٰ علیہ السلام کی طرف **چوتھا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ کا بھی جسم ہے۔ کیونکہ اُس کے لئے چہرہ بھی ثابت کیا گیا اور وسعت بھی **جواب** اس کا جواب اِن دو لفظوں کی تفسیر میں گزر گیا۔ ایک

بزرگ فرماتے ہیں۔ کہ خدا کے جسم سے پاک ہونے کی دلیل یہ ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش پر پہنچ کر بھی فرمایا اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ اور یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں رہ کر فرمایا لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ نیز ہر مخلوق دریا خشکی ہوا وغیرہ ہر جگہ سے اُسے اَنْتَ سے ہی خطاب کرتے ہیں۔ اگر جسم ہوتا تو کسی خاص جگہ میں ہوتا۔ اور ہر جگہ سے اُس کو خطاب نہ ہوتا (روح البیان)۔ **تفسیر صوفیانہ** شریعت مشرق ہے اور طریقت مغرب ظاہر مشرق ہے اور باطن مغرب نور مشرق ہے۔ اور ظہور مغرب شریعت میں رہ کر ظاہری عبادت کہو۔ سر سے سجدے کرو۔ یا طریقت میں آ کر قلبی سجدے گذارو غرض کسی طرف جاؤ رب کو پاؤ گے شریعت اور نور اور ظاہر بھی رب کے لئے ہے اور طریقت اور ظلمت اور ظہور بھی اُس کے لئے ہیں زاہدین حرم کے میدان میں کعبہ کی دیوار کے سایہ میں نماز شریعت پڑھتے ہیں۔ یا عاشقین کربلا کے میدان میں تلواروں کے سایہ کے نیچے نماز عشق ادا کرتے ہیں مگر جہاں جاؤ رب کو پاؤ لیکن خیال رہے کہ جب عشق کی وادی سینا میں قدم رکھو تو طبیعت اور نفس کے جوتے اتار دو تاکہ اَنَا اخْتَرْتُکَ کا خطاب پاؤ۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ

اور کہا انہوں نے بنایا اللہ نے بچہ پاکی ہے اُس کو بلکہ واسطے اُسکے ہے وہ جو بیچ آسمانوں اور زمین کے ہے سب واسطے اُسکے

اور بولے خدا نے اپنے لئے اولاد رکھی پاکی ہے اُسے بلکہ اُسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ سب اُس کے حضور

قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

اطاعت کرنیوالے ہیں ایجاد کرنیوالا آسمانوں اور زمین کا اور جبکہ فیصلہ کرے کسی بات کا پس اُسکے سوا کچھ نہیں کہتا ہے واسطے اُسکے ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے

گردن ڈالے ہیں نیا پیدا کرنیوالے آسمانوں اور زمین کا اور جب کسی بات کا حکم فرمائے تو اُس سے یہی فرماتا ہے کہ ہو جا وہ فوراً ہو جاتی ہے

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے پہلا تعلق پچھلی آیت میں بتایا گیا کہ کفار مسلمانوں کو مسجدوں میں اللہ کے ذکر کرنے سے روکتے ہیں۔ اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ خود بھی اُس کا ذکر نہیں کرتے بلکہ اُسے گالیاں دیتے ہیں یعنی اُن کا مسلمانوں کو روکنا اپنی عبادت کیلئے نہیں ہے۔ بلکہ خباثت نفس سے ہے۔ دوسرا تعلق پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ کفار مسجدوں کے دشمن ہیں اب بتایا جا رہا ہے۔ کہ وہ خود خدا کے بھی دشمن ہیں۔ کہ اُس میں عیب نکالتے ہیں۔ تیسرا تعلق پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا۔ کہ سارے جہان کا اللہ ہی مالک ہے۔ اور یہ ایسی کھلی ہوئی بات تھی جس کا کوئی بے وقوف بھی انکار نہیں کر سکتا اب فرمایا جا رہا ہے۔ ان بے وقوفوں نے اس قدر صاف مسئلہ کا بھی انکار کر دیا۔ کہ رب کیلئے اولاد مانی اور ظاہر ہے کہ اولاد والا ساری چیزوں کا مالک نہیں ہو سکتا جیسا کہ ان شاء اللہ تفسیر میں معلوم ہوگا۔ **شان نزول** یہود نے عزیز علیہ السلام کو اور عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانا اور مشرکین عرب نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بتایا کیونکہ یہ سب خدائی کام کرتے ہیں۔ اور کسی کو نظر نہیں آتے لہٰذا وہ اُس کے بیٹیاں ہیں۔ اُن سب کی تردید میں یہ آیت کریمہ اتری **تفسیر** وَقَالُوْا۔ اس کا فاعل یہود نصاریٰ مشرکین سب ہیں چونکہ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ میں ان سب کی طرف اشارہ ہو چکا تھا لہٰذا اُن سب کی طرف ضمیر کا لوٹنا صحیح ہو گیا اِتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا۔ اِتِّخَاذٌ کے دو معنی ہیں ایک صنعت یعنی اختیار کرنا دوسرے تصییر یعنی بنانا پہلے معنی میں اس کا ایک ہی مفعول ہوتا ہے۔ اور دوسرے معنی میں دو۔ اگر یہاں پہلے معنی مراد ہوں تو مطلب یہ ہوگا۔ کہ اللہ نے اپنے لئے بچہ اختیار کیا۔ اور اگر دوسرے معنی مراد ہوں تو اس کا پہلا مفعول پوشیدہ ہوگا۔ یعنی اللہ نے اپنے بعض مخلوقات کو اپنا متبنّیٰ یعنی منہ بولا بیٹا بنایا۔ اور یہ دونوں باتیں رب کے حق میں گالی ہیں۔ اگرچہ ہمارے واسطے درست جیسے کہ مفعول ہونا عورتوں کے

لئے عیب نہیں۔ مگر مردوں کے حق میں گالی ہے۔ اہل کتاب نے تو اس کیلئے بیٹا مانا تھا۔ اور مشرکین نے بیٹی اس لئے وَلَد فرمایا جو کہ دونو
کو شامل ہے۔ یعنی بچہ۔ وَلَد مصدر ہے جس کے معنی ہیں جننا۔ مگر یہاں مولود کے معنی میں ہے اپنے متبنّیٰ کو بھی مجازاً ولد کہہ دیتے ہیں جیسے
اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا مجازاً پیداوار کو بھی ولد کہہ دیا جاتا ہے جیسے کہ اَلْاَرْضُ تَلِدُ الزَّعْفَرَانَ زمین جنتی ہے نیز تربیت دینے اور پرورش کرنے
کو بھی تولید کہہ دیتے ہیں۔ اسی معنی سے رب نے عیسیٰ علیہ السلام کو فرمایا تھا کہ اَنَا وَلَدْتُكَ میں تمہاری پرورش کی۔ بے وقوف عیسائیوں نے
انہیں ولد یعنی خدا کا بیٹا سمجھ لیا۔ نیز اس زمانہ میں رب کو باپ اور اپنی مخلوق کو اولاد کہا کرتے تھے۔ یہودیوں نے ان لفظوں کو غلط معنی میں استعمال
کرنا شروع کر دیا اور کہا کہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ رب تعالیٰ نے ان سب کی چند طرح تردید فرمائی اوّل یہ کہ سُبْحٰنَهٗ اس کے
لئے پاکی ہے۔ سبحان سبحٌ سے بنا جسکے لغوی معنی تیرنا اور دور ہونا كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ اصطلاح میں ہر عیب سے پاک ہونے کو
بولتے ہیں کیونکہ پاک ذات ہم جیسوں کے وہم و گمان سے دور ہے اسی سے تسبیح بنا جسکے معنی ہیں رب کو پاک جاننا خیال رہے۔ کہ چونکہ سبحٰن
میں ہر عیب سے کامل پاکی مراد ہے۔ اس لئے کسی مخلوق کیواسطے یہ لفظ نہیں بولا جا سکتا۔ بخلاف حمد تکبیر کے کہ یہ مخلوقات بھی آپس میں استعمال
کر لیتے ہیں (تفسیر عزیزی) سبحان میں یہ فرمایا کہ الوہیت باپ ہونے کے خلاف اور رب اب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بیٹا باپ کی جنس سے ہوتا ہے
اور رب جنسیت سے پاک ہے نیز بیٹا مجبوراً اختیار کیا جاتا ہے۔ اور رب مجبوری سے بھی پاک ہے۔ نیز بیٹا باپ کا جز ہوتا ہے رب
اسی سے بھی پاک نیز بیٹے میں ماں کی امداد ضروری ہے رب دوسرے کی امداد سے بھی پاک نیز بیٹے کے لئے رب کی بیوی ماننا پڑے
گی اور بیوی سے پاک ہے۔ نیز ضروری ہے کہ بیوی شوہر کی کفو یعنی مثل ہو رب مثلیت سے پاک اسی لئے فرمایا گیا۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا
اَحَدٌ غرضکہ الوہیت اور باپ کبھی جمع ہو سکتے ہی نہیں یہ سب دلائل سبحان میں بتائے گئے یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ تعجب کیلئے سبحان کہا گیا ہو
ہم لوگ بھی ایسے موقعہ پر سبحان اللہ معاذ اللہ وغیرہ بولدیتے ہیں۔ دوسری دلیل بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ درحقیقت دو دلیلیں ہیں اس آیت کے دو
مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ کفار کا رب کے لئے اولاد ماننا غلط ہے۔ بلکہ آسمان و زمین کی تمام چیزیں اس کی ملکیت ہیں۔ اور ظاہر ہے
کہ باپ بیٹے کا مالک نہیں ہو سکتا۔ تو اگر اس کے لئے اولاد ہوتی تو رب تعالیٰ بعض کا تو مالک ہوتا۔ اور بعض کا
باپ یا یہ کہ سب چیزیں رب کی مخلوق ہے۔ اور بیٹا مخلوق نہیں۔ بلکہ مولود ہوتا ہے۔ لہذا لازم آئیگا۔ کہ بعض چیزیں رب کی مخلوق ہوں اور
بعض مولود دوسرے یہ کہ اولاد باپ کے مال کی ایک طرح مالک و قابض ہوتی ہے۔ فرمایا گیا اللہ ہی کی ہیں۔ آسمان و زمین کی چیزیں اگر اس کی
اولاد ہوتی تو یہ چیزیں رب کی بھی ہوتیں اور اولاد کی بھی تیسری دلیل یہ ہے کہ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ہر چیز اس کی مطیع ہے قٰنِتُوْنَ۔ قنوت
سے بنا جس کے چار معنی ہیں۔ اطاعت و فرمانبرداری جیسے اُقْنُتِیْ لِرَبِّكِ۔ کھڑا ہونا جیسے طول القنوت۔ چپ رہنا جیسے قُوْمُوْا لِلّٰهِ
قٰنِتِيْنَ ہمیشہ رہنا۔ یہاں چاروں معنی بن سکتے ہیں یعنی ہر چیز رب کی فرمانبردار ہے۔ اس کے سامنے کھڑے ہو کر عبادت گزار ہے۔
اس کے احکام پر خاموش ہے اور ہمیشہ اسکی محتاج ہے یہ نہیں کہ صرف پیدا ہوتے وقت تو اس کی محتاج تھی بعد میں غنی ہو گئی۔ اولاد اوّلاً
ماں باپ کی محتاج ہوتی ہے۔ پھر ان سے بے پرواہ بلکہ آخر میں خود ماں باپ اولاد کے محتاج اگر رب کے بھی اولاد ہوتی تو معاذ اللہ یا تو
وہ اس کو محتاج ہوتا اور یا کم از کم وہ اولاد اس سے غنی ہوتی۔ نیز خدا کے اولاد بھی خدا ہی ہونے چاہئے تھی اور خدا دوسرے کی عبادت نہیں
کر سکتا۔ لہذا اس کی بعض چیزیں تو اس کی مطیع ہوتیں بعض نہ ہوتیں تیسری دلیل یہ ہے کہ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وہ آسمان و زمین کو
ایجاد فرمانے والا ہے۔ بدیع بدعٌ سے بنا جسکے معنی ہیں بغیر نمونہ کے بنانا اور واجب رب کیلئے اس کا استعمال ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ
بغیر آلہ اور مادہ اور زمانہ اور مکان کے کسی چیز کو وجود دینا (ابداع) اسی سے بنا ہے۔ بدعت یعنی دین میں نیا عقیدہ داخل کرنا۔ یہ بھی درحقیقت اولاد نہ
ہونے کی دو دلیلیں ہیں۔ اور اس کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ بدیع بمعنی مبدع ہو اور سموات و ارض اوسکا مفعول یعنی رب تعالیٰ آسمان
زمین جیسی بڑی چیزوں کو بغیر نمونہ بغیر مثال بغیر مادہ اور بغیر آلہ کے پیدا فرمانے والا ہے۔ تو انسان و فرشتے بھی ایسے ہی پیدا فرمائے اور باپ

وہ جن سے اُسکی نسل اُسکے مادہ سے اور آلہ سے بچہ بنے لہٰذا رب کسی کا باپ نہیں. دوسرے یہ کہ بدیع اپنے معنی میں ہو اور سَمٰوٰت والارض اُس کا فاعل یعنی رب تعالیٰ انوکھے آسمان وزمین والا ہے (روح البیان) اور لائق بیٹا وہ ہوتا ہے. جو باپ سے بڑھ چڑھ کر کام کرے یا کم از کم اُس کے برابر رہے. اگر اُس کی کوئی اولاد ہے تو بتاؤ. اُس کے آسمان زمین کہاں ہیں. چوتھی دلیل یہ ہے. کہ وَاِذَا قَضٰی اَمْرًا قضٰی. قضآءٌ سے بنا اور قضاءٌ قرآن کریم میں چند معنوں میں استعمال ہوا. ۱ پیدا کرنا فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ السَّمٰوٰتِ ۲ حکم دینا وَقَضٰی رَبُّكَ ۳ فیصلہ کرنا اسی سے لئے حاکم کو قاضی کہتے ہیں. ۴ خبر دینا وَقَضَیْنَاۤ اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اسی معنی کیلئے اِلٰی ضروری ہے. ۵ فارغ ہونا فَلَمَّا قَضٰی وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِهِمْ اور فرمایا گیا وَقُضِیَ الْاَمْرُ ۶ پورا کرلینا جیسے کہ فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ ۷ ارادہ کرنا یہاں یا تو فیصلہ کرنے کے معنی ہیں یا ارادہ کرنے کے یا حکم دینے کے خیال رہے کہ قضا اور قدر میں یہ فرق ہے. کہ قدر کے معنی ہیں. اندازہ کرنا اور قضا کے معنی ہیں حکم یا فیصلہ دینا (رغ) لہٰذا قدر اندازہ ہے اور قضا اُس کا نافذ کرنا پس قدر قضا سے پہلے ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نَفِرُّ مِنْ قَضَآءِ اللّٰهِ اِلٰی قَدَرِ اللّٰهِ یعنی ہم اللہ کے حکم سے اُس کی قدر کی طرف بھاگتے ہیں قدر سے ہی تقدیر بنی فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ یعنی وہ اپنے پیدا فرمانے میں کسی مادہ وغیرہ کا حاجت مند نہیں. بلکہ صرف کن فرمانا اور ارادہ کا تعلق کافی ہوتا ہے. اور بیٹے میں یہ بات نہیں لہٰذا وہ اولاد وغیرہ سے پاک ہے.

**خلاصہ تفسیر** اے مسلمانو یہ مسجدوں سے تم کو اس لئے نہیں روکتے کہ خود وہاں رب کی عبادت کریں گے. یہ بدنصیب اُس کی عبادت تو کیا کرتے اُسے گالیاں دیتے ہیں. اُس کیلئے نہ ہونی بات مانتے ہیں. خیال تو کرو. کہ کیسی گندی بات اُس کے لئے مان بیٹھے کہ کہتے ہیں. کہ اس نے بھی ہماری طرح اپنے لئے اولاد اختیار فرمائی یا اُس نے بعض مخلوق کو اپنا منہ بولا بچہ بنایا سبحان اللہ یہ کیونکر ممکن ہے رب تو پاک ہے. آسمانی اور زمینی چیزوں کا واحد مالک ہے. آسمان اور زمین جیسی زبردست مخلوقات کو بغیر نمونہ بغیر مادہ بغیر آلات و اسباب ایجاد فرمانے والا ہے. اُس کی شان تو یہ ہے. کہ جب کسی بات کا فیصلہ فرمالے تو اس سے کُن فرما دیتا ہے اور اُس کا ارادہ اس چیز کے متعلق ہو جاتا ہے جس سے کہ وہ چیز فوراً پیدا ہو جاتی ہے. جس کی ایسی اعلیٰ صفتیں ہوں. وہ اولاد والا ہونے سے بلند و بالا ہے.

**رب کے اولاد سے پاک ہونیکے دلائل** حق تعالیٰ کے اولاد سے پاک ہونے کی بہت سی دلیلیں ہیں جن میں سے کچھ تو یہاں بیان ہوئیں اور کچھ سورہ اخلاص شریف میں اور کچھ دیگر آیتوں میں آئینگی ہم قدرے تفصیل سے بطور اختصار کچھ بیان کرتے ہیں. **دلیل اوّل** اولاد کی ضرورت مغلوب کو ہوتی ہے کبھی تو شہوت سے مغلوب ہو کر جماع کرتا ہے جس سے اولاد ہو جاتی ہے کبھی دشمنوں کی قوت سے مجبور ہو کر اولاد کی خواہش کرتا ہے. جو کہ اپنا قوت بازو ہو اور اُس کے ذریعہ رشتہ داریاں بڑھیں اور یہ مجبور ہو کر نہ رہے رب تعالیٰ ہر قسم کی مغلوبی سے پاک ہے. لہٰذا اولاد سے پاک. **دوسری دلیل** بدلنے والی چیز اولاد کی خواہش مند ہو سکتی ہے. غیر متبدل کی اولاد نہیں انسان سمجھتا ہے. کہ مجھ کو بڑھاپا بھی آنے والا ہے اُس وقت عصاء پیری یعنی فرزند چاہیئے. چاند تارے سورج وغیرہ چونکہ بدلتے نہیں اسی لئے اُن کی اولاد بھی نہیں رب تعالیٰ بھی تبدیلی سے پاک اس لئے اولاد سے بھی پاک **تیسری دلیل** فانی کو اولاد درکار تاکہ اُس کی نسل باقی رہے. انسان اپنی نسل کی بقا اپنے بعد اپنے گھر کی آبادی اور اپنے نام کو زندہ رکھنے کے لئے اولاد چاہتا ہے. جانوروں کی نسل کا بقا بھی اولاد ہی سے ہے. بعض علم طبیعیات والے فرماتے ہیں. کہ درختوں بلکہ پتھروں میں بھی توالد و تناسل ہے بعض درخت نر بعض مادہ ہیں نر کی ہوا مادہ کو لگتی ہے جس سے وہ پھلوں سے حاملہ ہو جاتی ہے. بعض درختوں میں تماس کا مشاہدہ بھی ہوتا ہے. جیسے انڈا خربوزہ وغیرہ یہی حدیث تابیر نخل کا مطلب ہے جس کو ہم نے اپنی کتاب جاء الحق میں بیان کیا چونکہ آسمانی چیزیں قیامت تک فانی نہیں اسی لئے اُن کی اولاد بھی نہیں اور رب تو واجب الوجود ہے اس لئے اولاد سے پاک **چوتھی دلیل** اولاد باپ کی ہم جنس چاہیئے آپ کے جسم کے کیڑے جوئیں وغیرہ آپ کی اولاد نہیں بعض عورتوں کے سانپ پیدا ہو جاتے ہیں. وہ اُن کے بچے نہیں کہلاتے اسی لئے اُن پر نماز جنازہ نہیں. اور وہ خون

نفاس نہیں۔ اگر رب کے اولاد ہوتی تو اُس کے ہم جنس ہوتی اور جنس کے لئے فصل ضروری اور جنس فصل کے لئے مادۃ ضروری اسی لئے رب کا مادی ہونا لازم آتا ہے۔ اور وہ تو مادہ سے پاک لہٰذا اولاد سے بھی پاک **پانچواں دلیل** اولاد میں ماں باپ کے سے ذاتی صفات چاہیئے انسان کا بچہ انسان کی طرح ضاحک متعجب وغیرہ ہونا چاہیئے۔ اگر رب کے اولاد ہوتی تو وہ اُس کی طرح واجب قدیم خالق وغیرہ ہوتی اور پھر اولاد ہونے کی وجہ سے اس سے پیچھے ہوتی واجب و قدیم ہونا پیچھے ہونے کے خلاف ہے۔ لہٰذا رب اولاد سے پاک ہے۔ **چھٹی دلیل** اولاد وہ جو اپنے جز یعنی نطفے سے پیدا ہو عیسیٰ علیہ السلام حضرت جبریل کے بیٹے نہیں سیدنا آدم مٹی کے بیٹے نہیں۔ آپ کے سر کی جوں وغیرہ آپ کی اولاد نہیں کیونکہ وہ آپ کے نطفے سے نہیں اور رب تعالیٰ نطفے وغیرہ سے پاک لہٰذا وہ اولاد سے پاک ہے۔ **ساتویں دلیل** اولاد میں ماں کی شرکت ہوتی ہے۔ کہ اُس کے کچھ اعضاء باپ کے نطفے سے بنتے ہیں کچھ ماں کے اگر رب کی اولاد ہوتی تو اس میں ماں کی شرکت ہو جاتی اور وہ اُس کا مستقل خالق نہ ہوتا اور یہ تو بڑا عیب ہے۔ لہٰذا وہ اولاد سے پاک ہے **آٹھویں دلیل** اولاد ایک وقت تک ماں باپ کی محتاج پھر اُن سے بے پرواہ اور پھر معاملہ برعکس کہ ماں باپ بعض کاموں میں اولاد کے محتاج اور رب تعالیٰ احتیاج سے پاک لہٰذا وہ اولاد سے بھی پاک **نویں دلیل** اکثر اولاد والا خود بھی کسی سے نکلتا ہے۔ جب رب کسی سے بنا نہیں تو اُس کی بھی کوئی اولاد نہیں اسی لئے فرمایا گیا۔ لَمۡ يَلِدۡ وَلَمۡ يُولَدۡ آدم و حوا علیہ السلام حکما مٹی سے بنائے گئے (تفسیر عزیزی) **دسویں دلیل** باپ کی تربیت ناقص ہوتی ہے۔ کہ وہ بچے کو پال کر اُستاد اور شیخ کے حوالے کرتا ہے۔ اور اگر خود ہی علم و معرفت کا اُسے درس دے تو بھی باپ ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ اُستاد اور شیخ ہونے کی حیثیت سے دیگا۔ اور رب کی پرورش کامل ہے۔ کہ بندوں کے جسم اور روح قلب اور قالب کو پالتا ہے۔ لہٰذا وہ کسی کا باپ نہیں **گیارھویں دلیل** بیٹا باپ کا خادم ہوتا ہے۔ نہ کہ عابد اسی طرح اُس کا شریک ہوتا ہے نہ کہ اُسکی مخلوق تو اگر رب کی کوئی اولاد ہوتی تو خادم تو ہوتی اُس کی عابد نہ ہوتی لہٰذا رب کی معبودیت ناقص رہ جاتی **بارھویں دلیل** بیٹا اپنے باپ کا شریک ہوتا ہے۔ نہ کہ بندہ اور مملوک شہزادہ اپنے باپ کا رعایا نہیں کہلاتا بلکہ اُس کی سلطنت کا حصہ دار اگر باپ اپنے بیٹے کو خرید لے تو وہ فوراً آزاد ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر رب کا بھی بیٹا ہوتا تو وہ اُس کا بندہ نہ ہوتا بلکہ اُس کا برابر حصہ دار **تیرھویں دلیل** باپ بہت آہستگی سے بیٹا حاصل کر سکتا ہے نہ کہ ایک دم کہ اُس نطفہ عورت کے پیٹ میں نو ماہ تک پرورش پاتا ہے۔ رب اپنے پیدا فرمانے میں آہستگی پر مجبور نہیں لہٰذا وہ اولاد سے پاک **چودھویں دلیل** بیٹا اپنے باپ کا نمونہ اور ہم شکل ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ ہم شکل اور کسی کا نمونہ بننے سے پاک ہے۔ لہٰذا وہ اولاد سے بھی پاک **پندرھویں دلیل** بیٹے تین قسم کے ہیں پوت سپوت اور کپوت پوت وہ ہے جو باپ کے برابر کمال دکھلائے سپوت وہ جو باپ سے بڑھ جائے کپوت وہ جو باپ سے گھٹا ہوا ہے بلکہ اُس کے نام کو ڈبو دے اگر رب کے بیٹا ہوتا تو سوال ہوتا کہ وہ کس قسم کا ہے۔ اگر سپوت ہے تو چاہیئے۔ اُسکی مخلوق رب کی مخلوق سے بڑھی ہوئی ہو کہ رب کے سات آسمان ہیں۔ تو اُس کے کم از کم آٹھ تو ہوں اور اگر پوت ہے۔ خالقیت اور مالکیت وغیرہ میں برابر ہونا چاہیئے تھا۔ اور کپوت ہونا بیٹے کے عیب اور باپ کی مجبوری پر دلالت کرتا ہے۔ کہ بیٹا تو نالائق رہا اور باپ اُسے درست نہ کر سکا یہ پندرہ دلیلیں ہوئیں۔ یہ تمام اور اُن کے علاوہ اور بہت سے دلائل اسی آیت سے نکل سکتے ہیں۔ **پہلا اعتراض** مسلمان بھی کہتے ہیں۔ کہ رب کے بعض بندے محبوب اور بعض خلیل اُسکے حبیب ہیں جبکہ رب بیٹے سے پاک ہے چاہیئے کہ دوست بنانے سے بھی پاک ہو۔ **جواب** محبوبیت خلت اصطفائی عبدیت کیخلاف نہیں ہو سکتا ہے۔ کہ بادشاہ اپنے بعض غلاموں اور کنیزوں کو اپنا مقبول بارگاہ کرے۔ اسی سے وہ غلام ہی رہیں گے۔ مگر ہونا بندے ہونے کے خلاف ہے جیسا کہ ہم دلائل میں بیان کر چکے لہٰذا رب اولاد سے پاک ہے ہاں اُس کے بعض بندے اُس کے پیارے محبوب ہیں کہ اُسکا حق بندگی خوب ادا کرتے ہیں۔ **دوسرا اعتراض** قَانِتُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے رب کے سارے بندے

اُس کے مطیع اور فرمانبرداری ہیں حالانکہ بہت بندے کافر اور نافرمان بھی ہیں **جواب**۔ یہاں فرمایا گیا ہے۔ کہ کُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ یہ نہ کہا گیا۔ لِاَحْكَامِهٖ قَانِتُوْنَ کفار اور شیاطین رب کے شرعی احکام کے منکر ہیں۔ نہ کہ اُس کے ارادے کے جب چاہے جسکو چاہے فنا کر دے بیمار بنا دے غنی یا فقیر کر دے ان احکام سے کوئی باہر نہیں نیز ساری مخلوق تسبیح اضطراری کر رہی ہے کہ اُس کی ہستی اپنے بنانے والے کی قدوسیت اور قادریت پر گواہی دے رہی ہے تسبیح اختیاری کرے یا نہ کرے **تیسرا اعتراض** یہاں فرمایا گیا لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ مَا بے عقل چیزوں کے لئے آتا ہے۔ تو کیا بے عقل چیزیں رب کی ہیں۔ اور عقل والی کسی اور کی **جواب** ہر بے عقل اور عقل والی اللہ کی مخلوق ہونے میں مثل بے عقل کے ہے۔ کیونکہ بمقابلہ عاقل کے بے عقل پر مالک کا زیادہ قبضہ ہوتا ہے۔ غلام کے مقابل جانور وغیرہ بے عذر خدام ہیں۔ تو یہاں فرمایا گیا۔ کہ ساری مخلوق بے عقل چیز کی طرح اُس کی بے عذر مملوک ہے **چوتھا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہؤا۔ کہ رب تعالیٰ ہر چیز کُنْ (ہو جا تو) کہہ کر پیدا فرماتا ہے۔ بتاؤ یہ حکم کس نے سنا اور کس کو سنایا گیا (ستیارتھ پرکاش) نیز کُنْ بھی تو ایک چیز ہے بتاؤ یہ کس کن سے پیدا ہوئی نیز کُن خود حادث چیز ہے۔ کہ کاف اور نون سے بنا اور یہ عربی زبان کا ایک لفظ ہے۔ جس کے لئے مصنوع اور مادہ ضروری تو کیا رب تعالیٰ اپنے خالق ہونے میں حادث چیز کا محتاج ہے نیز اگر کُن میں موجود کرنے کی تاثیر ہے تو ہمارے ہزار کن سے کچھ نہیں بنتا **جواب**۔ تفسیر عزیزی میں اس کا نہایت نفیس جواب یہ دیا گیا۔ کہ کن سے مراد ہے پیدا کرنا اور ارادہ کا متعلق کرنا اور فیکون سے مراد ہے فوراً چیز کا پیدا ہو جانا۔ نہ تو کن کہنا مقصود ہے اور نہ کسی کو سنانا مراد تو مطلب یہ ہؤا کہ باپ بیٹے کے حاصل کرنے میں بہت محنت کرتا ہے اور کاریگر چیز کے بنانے میں بہت سامان جمع کرتا ہے رب تعالیٰ کو مخلوق کے پیدا کرنے نہ صورت مادہ وغیرہ سامان کی ضرورت نہ محنت کی حاجت بلکہ اُس کی شان یہ ہے۔ کہ جس چیز کے کرنے کا فیصلہ کیا۔ کہ وہ فوراً پیدا ہو گئی **پانچواں اعتراض** عقلاً اور علماً کی اتنی بڑی جماعت نے ایسی غلط بات کیسے کہہ دی یہ تو کوئی بے وقوف بچہ بھی نہیں کہہ سکتا **جواب**۔ اس کی وجہ ہم تفسیر میں بتا چکے کہ پہلے رب کو باپ کہکر پکارتے تھے اور اپنے کو اُس کا بیٹا کہتے تھے۔ نیز رب نے عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ وَلَدْتُكَ وَاَنْتَ نَبِیِّیْ جس کے معنی تھے کہ ہم نے تم کو نبی بنا کر پیدا فرمایا عیسائیوں نے نبیّ کو بنیّ بنایا اور ولدتُ کو جننے کے معنے میں لیا اور ترجمہ یہ کیا کہ میں نے تم کو جنا ہے۔ اور تم میرے بیٹے ہو نیز رب نے بنی اسرائیل کو خطاب کرکے فرمایا تھا۔ یا احباری ویا ابناء رسلی یعنی اے میرے دین کے عالمو اور اے میرے پیغمبروں کی اولاد جس کو یہود نے یوں بنایا کہ یا احبّائی ویا ابنائی یعنی اے میرے پیارے بیٹو (تفسیر روح البیان) اور حق تو یہ ہے۔ کہ خدا جب دین لیتا ہے، تو عقل بھی چھین لیتا ہے جب بیدین پیپل اور گائے کو خدا مان سکتے ہیں۔ تو ان کے لئے خدا کا بیٹا ماننا کیا مشکل ہے **تفسیر صوفیانہ** ایک ہی پھول کا رس بھڑ کے پیٹ میں پہنچ کر زہر اور شہد کی مکھی پیٹ میں پہنچ کر شہد بن جاتا ہے، ایسے ہی رب کا کلام اور اُس کے احکام مومنین کے دماغ میں پہنچ کر باعث شفا بنتا ہے۔ اور کفار کی بیماری بڑھا دیتا ہے۔ اسی توریت انجیل سے بعض حضرات مومن کامل بن گئے اور انہیں کتابوں سے بے ڈھنگے لوگ بیدین بنے کہ خدا کے لئے اولاد وغیرہ مان بیٹھے اور جیسے کہ خدا کے لئے اولاد ماننا کفر ہے۔ ایسے ہی کسی مخلوق کو موجود مستقل ماننا بے دینی مَا سِوَى اللّٰهِ بِذَاتِهٖ تو معدوم ہے رب کے ارادہ سے موجود اور اُس کی ذات سے قائم وہی وجود مطلق ہے۔ باقی تمام اس کے تعینات جب تک کہ انسان اپنے کو دوئی کی بھنور سے نکال کر بحر توحید میں غرق نہ کر دے اور اپنا دامن قلب شرک جلی و خفی سے پاک نہ کرلے اُس کی کوئی عبادت قبول نہیں مسلمان کے لئے تین قلعے ہیں۔ ایک ذکر اللہ دوسرے تلاوت قرآن تیسرے اُس کی ظاہری اور باطنی مسجد ظاہر مسجد تو معلوم ہے اور باطنی مسجد صدق اور اخلاص خیال رہے کہ تسبیح گویا گولی ہے۔ اور اخلاص بارود اور الفاظ کارتوس اور زبان بندوق بے شک گولی ہی شکار کرتی ہے۔ مگر بارود اور رائفل کی مدد سے قلب میں اخلاص نہ ہو۔ عقیدہ درست نہ ہو زبان جھوٹ وغیرہ سے پاک نہ ہو تو فقط الفاظ کیا کام کریں مولانا فرماتے ہیں۔

ہست تسبیحت بخنار آب و گل ۞ مرغ جنت شد ز نفخ صدق دل (ماخوذ از تفسیر ابن عربی و روح البیان)

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْلَا یُکَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ

اور کہا انہوں نے جو نہیں جانتے ہیں کیوں نہیں کلام کرتا ہم سے اللہ یا آتی ہمارے پاس نشانی مثل اس کے کہا انہوں نے

اور جاہل بولے اللہ ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا یا ہمیں کوئی نشانی ملے اس سے اگلوں نے

مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

جو ان کے پہلے سے تھے مثل کلام ان کے مشابہ ہو گئے دل ان کے بیشک ظاہر فرما دیں ہم نے نشانیاں واسطے اس قوم کے جو یقین رکھتی ہے۔

بھی ایسی ہی کہی ان کی سی بات ان کے ان کے دل ایک سے ہیں بیشک ہم نے نشانیاں کھول دیں یقین والوں کے لئے

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے پہلا تعلق اب تک اہل کتاب کی بکواس کا ذکر تھا۔ اب خالص مشرکین کے بیہودہ گفتار کا تذکرہ ہے۔ یا اس سے پہلے عام اہل کتاب اور خاص مشرکین کی مشترکہ باتیں بیان کی گئیں اب خاص جہلائے مشرکین کے اقوال کا ذکر ہے **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں کفار کی ان باتوں کا ذکر کیا گیا۔ جو توحید کے خلاف ہیں۔ اب انکی اس گفتار کا تذکرہ ہے جو نبوت کے مخالف **تیسرا تعلق** پہلے فرمایا گیا تھا کہ کفار نے رب کی بعض مخلوق کو اتنا بڑھایا۔ کہ اسے خدا کا بیٹا مان لیا اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ انہوں نے خود اپنے کو اتنا اونچا سمجھا کہ ہم رب سے کلام کرنے کے لائق ہیں۔ **شان نزول** ایک دفعہ رافع ابن خزیمہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو اللہ سے فرما دیجئے کہ وہ ہم سے کلام کرے اور ہم سنیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں ہم آپ ایمان لے آئیں گے اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ اتری (تفسیر خزائن عرفان) **تفسیر وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ**۔ جاہلوں نے کہا ظاہر یہ ہے۔ کہ اس سے مشرکین عرب مراد ہیں۔ جو حقیقتاً آسمانی کتابوں سے جاہل تھے۔ اور ممکن ہے کہ اہل کتاب بھی مراد ہوں جو دیدہ دانستہ جاہل بنتے تھے۔ اور رب نے بھی ان کو جاہل اس واسطے فرمایا کہ یہ لوگ عالم بے عمل تھے جو کہ مثل جاہل کے ہوتا ہے یا بعض احکام کو غلط جانے بیٹھے تھے اور غلط جاننا نہ جاننے سے بدتر ہے (روح وکبیر) **لَوْلَا یُکَلِّمُنَا اللّٰهُ** لفظ لولا جب ماضی پر آتا ہے تو نہ کرنے پر ملامت کے معنی دیتا ہے۔ جیسے تو کل کیوں نہ آیا اور مضارع پر آکر فاعل کو راغب کرتا ہے جیسے کہ تو میرے پاس کیوں نہ آئیگا یعنی ضرور آنا یہاں کفار بظاہر رغبت کا کلمہ بول رہے تھے۔ لیکن حقیقتاً مذاق اڑاتے تھے یا تو یہ کہتے تھے۔ کہ جب رب تعالیٰ بعض فرشتوں اور پیغمبروں سے بلا واسطہ کلام کرتا ہے تو ہم بھی تو اس کے بندے ہیں۔ ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا اور یا یہ کہ کہ جب رب تعالیٰ آپ سے فرشتوں کے ذریعہ کلام فرماتا ہے۔ تو ہم پر فرشتے کیوں نہیں آتے غرضکہ وہ اپنے کو یا تو فرشتوں کی مثل سمجھتے ہیں یا پیغمبروں کی **اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَةٌ** یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی یعنی قرآن کریم و دیگر معجزات ان کے نزدیک نشانیاں ہی نہیں۔ اپنی خاطر خواہ نشانی چاہتے تھے۔ اور کہتے یہ تھے۔ کہ قریب کا راستہ اختیار کرنا چاہیئے رب تعالیٰ نے ہماری ہدایت کے لئے اتنا بعید راستہ کیوں اختیار کیا کہ وہ فرشتہ سے کلام کرے اور فرشتہ آپ سے اور آپ ہم سے یا معمولی معجزات ہم کو دکھائے آسان طریقہ یہ تھا کہ یا تو براہ راست ہم سے کلام فرما لیتا اور یا کوئی ایسی نشانی بھیجتا جس سے ہم مجبوراً آپ کو مان لیتے مثلاً یہ کہ مکہ مکرمہ کی بے آب و دانہ زمین میں چشمے جاری ہو جاتے یا آسمان پھٹ کر ہم پر گر پڑتا یا فرشتے صف باندھ کر ہمارے سامنے آجاتے یا آپ کا گھر سونے چاندی کا ہو جاتا یا آپ ہمارے سامنے آسمان پر جا کر ساری کتاب ایک دم لے آتے ان بے وقوفوں کو اب تک ایمان تو میسر نہیں اور ملائکہ اور انبیاء

بروقت وفات بھی توحید پر قایم رہے۔ اور اب وہ دین اسلام پر ہیں۔ یہ اخیر قول ہی صحیح ہے جمہور علماء کا یہی عقیدہ ہے بسکوت کرنے والے کہتے ہیں۔ کہ اُن کے ایمان و کفر دونوں کے دلائل ملتے ہیں۔ لہٰذا اس مسئلہ میں زبان نہ کھولنی چاہیئے اور اُن کے متعلق نیک گمان ہی لازم ہے۔ جو لوگ کہ انہیں زندگی میں کافر اور اب مومن مانتے ہیں وہ کہتے ہیں۔ کہ بعض روایتوں سے اُن کا مشرک ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے انہیں حج وداع کے موقعہ پر زندہ کر کے کلمہ پڑھایا۔ جیسے کہ شامی نے امام قرطبی اور ابن ناصر الدین وغیرہم سے روایت کی جو لوگ کہتے ہیں۔ کہ وہ پہلے بھی ایمان پر نہ تھے۔ اور اب بھی نہیں وہ کچھ آیتیں کچھ احادیث کچھ بزرگان دین کے اقوال اور دلائل عقلی پیش کرتے ہیں۔ اُن کی پہلی دلیل یہی آیت ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے اپنے والدین کا حال دریافت کرنا چاہا تو فرما دیا گیا۔ کہ آپ جہنمیوں کا حال نہ پوچھیئے معلوم ہوا۔ کہ وہ دونوں حضرات اس وقت بھی جہنمی ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ اُن کی دوسری دلیل ایک بار حضور علیہ السلام نے اپنے اپنے والدہ کیلئے دعاء مغفرت کی اجازت چاہی۔ تب آیت اُتری مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ جس میں فرما دیا گیا۔ کہ آپ مشرکین کے لئے دعائے مغفرت نہ کریں جس سے معلوم ہوا۔ کہ معاذ اللہ وہ اب بھی مشرک ہیں۔ اُن کی تیسری دلیل مشکوٰۃ باب زیارۃ القبور میں مسلم کی روائت ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے اپنے والدہ کی قبر کی زیارت کی خود بھی روئے دوسروں کو بھی رُلایا۔ اور فرمایا کہ میں نے ان کی مغفرت کے لئے رب سے اجازت چاہی تھی نہ ملی اور ان کی زیارت قبر کی اجازت چاہی مل گئی۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آمنہ خاتون مومنہ نہیں ہیں معاذ اللہ۔ اُن کی چوتھی دلیل حضور علیہ السلام نے ایک بدوی سے فرمایا۔ کہ میرے اور تمہارے والد دوزخ میں ہیں۔ نیز دوسری روایت میں آتا ہے۔ کہ دو صاحبوں نے پوچھا کہ ہماری مائیں کہاں ہیں۔ تو فرمایا دوزخ میں اُنہوں نے پوچھا آپ کی والدہ کہاں ہیں۔ تو فرمایا کہ میری والدہ بھی تمہاری ماں کے ساتھ ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ دوزخ میں ہیں۔ اُن کی پانچویں دلیل امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فقہ اکبر میں فرماتے ہیں۔ کہ حضور کے والدین ماجدین نے کفر پر وفات پائی امام کے قول کے ہوتے ہوئے حنفیوں کو حق نہیں کہ ان کو مومن مانیں اُن کی چھٹی دلیل والدین کریمین کو زندہ کر کے ایمان دینا عقل و نقل کے خلاف ہے نقلاً تو اس لئے کہ حدیث ضعیف ہے۔ عقلاً اس واسطے کہ نزع سے پہلے کا ایمان معتبر ہے۔ وقت موت اور بعد موت کا ایمان ناقابل قبول بلکہ عذاب الٰہی دیکھ کر زندگی میں بھی ایمان معتبر نہیں ہوتا۔ دیکھو فرعون ڈوبتے وقت ایمان لایا تو فرما دیا گیا آلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ مِنْ قَبْلُ پہلے نافرمانی کر کے اب ایمان لاتا ہے۔ تو ان دونوں حضرات کا وفات کے بعد والا ایمان کیسے معتبر ہوگا۔ رب فرماتا ہے وَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ۔ نیز فرماتا ہے۔ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ۔ نیز قیامت سے پہلے مردوں کا اُٹھنا بھی خلاف عقل ہے۔ ہم لوگ یہ کہتے ہیں۔ کہ وہ دونوں حضرات اپنی زندگی اور وفات میں موحد مومن تھے۔ اور اب مسلمان بلکہ مسلمانوں کے سردار ہیں۔ وہ جہنم کے قریب بھی نہیں ہمارے دلائل حسب ذیل ہیں۔ ہماری پہلی دلیل یہ ہی آیت کریمہ اس کے متعلق جو شان نزول بیان کی جاتی ہے۔ وہ ضعیف ہے دیکھو کتاب التعظیم والمنہ مصنفہ شیخ جلال الدین سیوطی رحمت اللہ علیہ بلکہ اس کے معنی تو وہ ہیں۔ جو کہ ہم تفسیر میں عرض کر چکے۔ کہ آپ سے جہنمیوں کے بارے میں سوال ہی نہ ہوگا۔ کیونکہ آپ کے والدین جنتی ہیں سوال کیسا دوسری دلیل رب فرماتا ہے۔ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ ایک قرأت میں ف کے فتح سے ہے یعنی تمہارے پاس یہ عظمت والے رسول نفیس ترین جماعت میں سے تشریف لائے۔ اور کافر نفیس نہیں۔ بلکہ خسیس ہے معلوم ہوا کہ حضور کے والدین بلکہ سارے اباؤ اجداد اعلیٰ مومن ہیں۔ ہماری تیسری دلیل۔ رب فرماتا ہے۔ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ اے نبی علیہ السلام ہم آپ کو مومنین کے پشتوں اور شکموں میں دورے کو دیکھ رہے ہیں۔ یعنی از آدم تا عبد اللہ آپ کے سارے آباء اجداد مومن اور عابد رہے دیکھو تفسیر مدارک وجمل وغیرہ ہماری چوتھی دلیل مشکوٰۃ باب فضائل سید المرسلین میں

بروایت بخاری ہے کہ حضور فرماتے ہیں۔ بُعِثْتُ مِنْ خَیْرِ قُرُوْنِ بَنِیْ آدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا حَتّٰی کُنْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِیْ کُنْتُ مِنْهُ جس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام ہمیشہ انسانوں کی بہتر جماعت میں منتقل ہوتے رہے یعنی آپ کے نور کی گردش بھی پاک پیٹھوں اور پیٹوں میں رہی اور پیدائش شریف بھی بہترین پشت و شکم سے ہوئی۔ اور مشرک خیر نہیں بلکہ شر ہے۔ ہماری پانچویں دلیل وہی مشکوٰۃ زیارۃ قبور کی حدیث کہ حضور علیہ السلام کو آمنہ خاتون کے قبر کی زیارت کی اجازت ملی نہ کہ استغفار کی اگر وہ کافرہ ہوتیں تو زیارت قبر کی بھی اجازت نہ ملتی قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ اِنَّهُمْ کَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فَاسِقُوْنَ جس سے معلوم ہوا کہ کفار کی قبر کی زیارت منع ہے۔ رہا استغفار کی اجازت نہ ملنا۔ وہ اس لئے نہیں کہ وہ کافرہ تھیں۔ بلکہ اس لئے کہ وہ بے گناہ ہیں۔ گنہگار تو وہ ہو جسکو شرعی احکام پہنچیں۔ اور وہ اُن کی مخالفت کرے اُن تک شریعت کے احکام پہنچے ہی نہیں۔ اسی لئے بچے کی نماز جنازہ میں دعا مغفرت نہیں ہوتی۔ رہا حضور کا گریہ فرمانا وہ محبت فرزندی کے جوش سے ہے۔ کہ آج وہ زندہ ہوتیں تو ہماری اس شان کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی فرماتیں ہماری چھٹی دلیل آج تک دلیل قوی تو کیا کسی ضعیف دلیل سے بھی اُن دونوں صاحبوں کی بُت پرستی یا عقیدہ کفر ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ اُن کے اقوال سے اُن کے ایمان کا پتہ لگتا ہے چنانچہ علامہ سیوطی نے اپنی کتاب التعظیم والمنہ میں بروایت دلائل النبوت مصنفہ ابو نعیم بیان کیا کہ آمنہ خاتون نے اپنے وفات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ پاک پر حسرت سے نظر کی اور اُن کی یتیمی پر خیال کر کے یہ اشعار پڑھے۔

| | |
|---|---|
| بارک اللہ فیک من غلامی | یا ابن الذی من حومة الحمام |
| فانت مبعوث الی الانام | من عند ذی الجلال والاکرام |
| تبعث فی الحل والحرام | تبعث بالتحقیق والاسلام |
| دین ابیک البر ابراهام | فالله انهاک عن الاصنام |

یعنی اے بیٹے اللہ تجھے برکت دے۔ مجھے یقین ہے کہ تم رب کی طرف سے ساری مخلوق کے نبی ہو گے۔ اور حل وحرم عرب و عجم میں اسلام پھیلاؤ گے۔ اللہ تمہیں بُت پرستی سے بچائے گا۔ اور دین ابراہیمی تم سے پھیلائے گا پھر فرمایا

وَکل کثیر یفنی وَانا میتة وذکری باقٍ وقد ترکت خیرا ولدت طهرا

یعنی میں تو مر جاؤں گی۔ مگر میرا ذکر قیامت تک رہے گا۔ کیونکہ میں نے بہترین پاک فرزند یعنی چھوڑا ہے۔ اس سے اُن کے دین ابراہیمی پر قائم ہونے کا پتہ لگتا ہے۔ ہماری ساتویں دلیل حضور کی پیدائش سے پہلے آپ کی تشریف آوری کی دھوم مچ گئی تھی لوگ آپ کی نبوت آپ کے بُت شکنی اور دیگر صفات کے خطبے پڑھ رہے تھے۔ حضرت عبداللہ نے بہت سے عجائب خود دیکھے تھے۔ آمنہ خاتون نے حمل شریف اور ولادت پاک میں بہت معجزات مشاہدہ کئے حتّٰی کہ اصحاب فیل کا عجیب وغریب واقعہ دیکھا کہ اس حمل پاک کی برکت سے جماعت فیل کو ابابیل نے مار دیا۔ زمانہ حمل میں ہر ماہ ایک پیغمبر خواب میں حضرت آمنہ کو حضور کی بشارت اُن کے اوصاف کی خبر دیتے رہے۔ ایک دفعہ حلیمہ دائی نے آپ سے عرض کیا کہ تمہارے فرزند کا سینہ چاک کیا گیا ہے۔ میں ڈرتی ہوں۔ تو آپ نے فرمایا مت ڈر۔ یہ سچے نبی ہیں۔ انہیں شیطان وغیرہ نقصان نہیں پہنچا سکتے وغیرہ وغیرہ تو کیونکر ممکن ہے۔ کہ یہ باتیں دیکھ کر بھی وہ بت پرست ہی رہیں ہماری آٹھویں دلیل ابولہب نے حضور کی پیدائش کی تھوڑی سی خوشی کی تو اُسے عذاب میں تخفیف ہو گئی۔ آپ کی قبر انور عرش اعظم سے افضل جس مچھلی کے پیٹ میں یونس علیہ السلام رہے وہ عرش سے اعلیٰ جس سیپ میں موتی رہے وہ قیمتی تو جو والدہ پاک کہ نو مہینہ اُس دُرِ یتیم کو اپنے صدف شکم میں رکھے اور اُن کے پیدا ہونے کی خوشیاں منائے۔ کیونکر ممکن ہے۔ کہ وہ جہنمی رہے۔

إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ أَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ (۱۱۹)

| | | | | | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| تحقیق ہم نے بھیجا آپ کو | ساتھ حق کے | خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا | اور | نہ | سوال کیے جائینگے | آپ | بابتہ | میں دوزخ والوں کے |
| بے شک ہم نے تمہیں | حق کے ساتھ | بھیجا خوشخبری اور ڈر سناتا | اور تم سے | | دوزخ والوں کا | سوال | نہ | ہوگا |

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ کفار نے عناداً معجزات مانگے۔ اور رب نے اُن کے جوابات بھی دیئے تھے۔ اب فرمایا جارہا ہے۔ کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ کو ان سے مناظرہ کرنے کیلئے بھیجا ہی نہیں۔ آپ ان کے بکواس سے دل تنگ نہ ہوں۔ آپ نے اپنا مقصد رسالت پورا فرمادیا گویا پہلے کلام کا رُخ کفار کے جواب کی طرف تھا۔ اور اب اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے تسکین خاطر کی طرف **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا۔ کہ ہم نے بہت سی آیتیں ظاہر فرمائی ہیں۔ اب اُن آیات کی تفصیل فرمائی جارہی ہے۔ کہ مجموعہ آیات آپ کی ذات اور صفات ہیں **تیسرا تعلق** پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ کفار رب سے ہم کلامی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اب فرمایا جارہا ہے۔ کہ یہ لوگ اگر ایمان لے آئیں۔ تو اُن کو یہ ہم کلامی کا درجہ حاصل ہے۔ کیونکہ ہم نے آپ سے کلام کیا۔ اور یہ لوگ بھی آپ سے کلام کریں تو گویا یہ ہم سے ہی کلام کریں گے **شانِ نزول** تفسیر روح البیان وعزیزی نے صراحتاً اور تفسیر مدارک نے اشارتاً فرمایا۔ کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔ کہ کاش میں اپنے والدین کا انجام معلوم کرلوں تب یہ آیت کریمہ اُتری اس کے بعد حضور نے کبھی اپنے والدین کا ذکر نہیں فرمایا۔ لیکن شیخ جلال الدین سیوطی نے اس روایت کو ضعیف فرمایا۔ اور کہا۔ کہ اس صورت میں آیت گذشتہ سے بے ربط بھی ہو جائیگی۔

**تفسیر** إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے آپ کو بھیجا ہے۔ یعنی آپ مخلوق کی طرف ہمارا عزیز ہدیہ ہیں۔ اور جو شخص کہ شاہی ہدیہ کی قدر نہ کرے وہ یقیناً بادشاہ کے عتاب میں آتا ہے نیز آپ پہلے ہی سے ہماری بارگاہ میں حاضر تھے۔ آپ کی تکمیل کرکے اور نبوت کا تاج آپ کے سر پہ رکھ کر آپ کو بھیجا۔ اب جو آپ میں عیب نکالے وہ درحقیقت ہم میں عیب نکالتا ہے۔ کیونکہ سند یافتہ شاگرد میں عیب نکالنا درحقیقت سند دینے والے کا انکار ہے۔ **بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا** حق سے یا تقاضا حکمت مراد ہے یا صداقت وحقانیت یا معجزات وآیات یا دلائل قدرت یا سچا دین اور یا قرآن کریم اور بالحق کا تعلق یا تو ارسلنا سے ہے۔ یا مؤیداً یا ملتبساً پوشیدہ سے اور یا بشیر نذیر سے یعنی ہم نے آپ کو بتقاضاء حکمت یا صداقت وحقانیت دے کر یا دلائل ومعجزات سے مضبوط کرکے یا دین قویم اور قرآن عطا فرماکے بھیجا یا آپ کو سچا بشیر ونذیر بناکر بھیجا۔ مبشر تو تبشیر سے بنا جس کے معنی ہیں۔ خوشخبری دینا چونکہ خوشخبری کا اثر چہرہ پر محسوس ہوتا ہے۔ اس لئے اُسے بشارت کہتے ہیں۔ نذیر نذر سے بنا جس کے معنی ہیں ڈرانا غالباً منت کو بھی اسی لئے نذر کہا جاتا ہے کہ اُسکے پورا نہ کرنے میں عذاب کا ڈر ہے۔ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بشیر بھی ہیں۔ اور نذیر بھی مگر اطاعت کرنیوالوں کے لئے بشیر اور نافرمانوں کے لئے نذیر نیز اور انبیاء بھی بشیر نذیر تھے۔ لیکن وہ سُن کر اور حضور دیکھ کر کیونکہ حضور نے معراج میں بچشم سر رب کو بھی دیکھا۔ اور جنت کی وہ نعمتیں بھی ملاحظہ فرمائیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں نہ کسی کان نے سنیں اور نہ کسی کے وہم وگمان میں آئیں جہنم کی ساری چیزوں کو بھی دیکھا لہٰذا دیگر انبیاء کرام کی بشارت کامل ہے۔ اور آپ کی کامل تر **وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ أَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ** اس کی دو قراتیں ہیں۔ ایک وَلَا تُسْئَلُ نفی مجہول اور ایک لَا تَسْئَلْ نہی معروف جحیم جحمۃ سے بنا جسکے معنی ہیں شعلہ نار کی تیزی پہلی قرأت پر اس عبارت کے تین معنی ہیں۔ ایک یہ کہ جہنمی کفار کے متعلق آپ سے بازپرس نہ ہوگی۔ کہ یہ ایمان کیوں نہ لائے۔ کیونکہ آپ نے اپنا فرض تبلیغ پورا انجام دے دیا۔ نیز تبلیغ آپ کا کام تھا۔ ہدایت ہمارا کام ہم اپنے کام کا آپ سے سوال نہ کریں گے۔ کہ انہیں ہدایت کیوں نہ دی دوسرے یہ کہ حدیث

پاک میں آتا ہے۔ کہ اگلی امتوں کے کفار اپنے انبیاء کی تبلیغ کا انکار کریں گے۔ امت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن انبیاء کے حق میں گواہی دے گی۔ اس گواہی پر وہ کفار جرح کریں گے۔ کہ تم نے وہ زمانہ نہ پایا بغیر دیکھے گواہی کیوں دے رہے ہو جسکی توثیق کے لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے۔ اور آپ کی گواہی پر انبیاء کرام کے حق میں ڈگری ہوگی۔ اور کفار کو بھی جرح کرنے کی اب جرأت نہ ہوگی رب فرماتا ہے لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا یہی واقعہ اس آیت میں بتایا جارہا ہے۔ کہ اے محبوب تم کلیم اللہ یا روح اللہ نہیں ہو۔ کہ قیامت کے میدان میں آپ کا کفار سے مقدمہ ہو۔ بلکہ آپ حبیب اللہ ہیں۔ کسی کافر کو آپ کے تبلیغ کے انکار کی جرأت نہ ہوگی اور کسی کو آپ کی گواہی پر جرح کرنیکی جرأت نہ ہوگی تیسرے یہ کہ حضور کو اپنے والدین ماجدین کے متعلق فکر تھی۔ کہ اُن کا انجام کیا ہؤا۔ اور اگر وہ جہنمی ہوئے تو لوگ سوال کرسکیں گے۔ کہ آپ کے والدین کو آپ سے فائدہ کیوں نہ ہؤا تو تسکین دی گئی۔ کہ اے محبوب کوئی شخص آپ سے یہ سوال نہیں کرسکتا۔ کیونکہ وہ جہنمی ہیں ہی نہیں۔ سوال تو جب ہو کہ وہ جہنمی ہوں بخیال رہے کہ قضیہ سالبہ موضوع کے نہ ہونے پر بھی صادق آجاتا ہے۔ یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں۔ کہ اوروں سے تو اپنے ذات اور اپنی اولاد وغیرہ کے متعلق بھی سوال ہوگا۔ کہ تمہارے اہل عیال گمراہ یا گنہگار کیوں ہوئے۔ مگر اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے اس قسم کا نہ حساب کتاب ہو نہ سوال و جواب کیونکہ آپ تو خود معصوم ہیں۔ اور آپ کے سارے اہل و عیال مومن اور گناہوں سے محفوظ اور کیوں نہ ہوں آسمان کا سورج ہزار ہا میل سے گندی زمین کو سکھا کر پاک کردیتا ہے۔ تو دونوں جہان کا سچا سورج صلے اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو کیونکر پاک نہ فرما دے آپ کے اہل قرابت میں سے جو لوگ ایمان نہ لائے۔ اس میں اُن کا اپنا قصور ہے۔ آپ نے تبلیغ میں پوری کوشش فرمادی چمگادڑ کے بے نور رہنے میں آفتاب بے قصور ہے۔ لہٰذا آپ سے اس قسم کا کوئی سوال نہ ہوگا۔ دوسری قرأت یعنی لَا تَسْئَلْ بصیغہ نہی کے یہ معنی ہیں۔ کہ اے محبوب علیہ السلام آپ دوزخیوں کا حال کچھ مت پوچھو اُن کی ذلت و خواری قابل بیان نہیں بعض لوگوں نے یہ معنی کئے ہیں۔ کہ اے نبی علیہ السلام دوزخیوں یعنی اپنے ماں باپ کا حال کچھ نہ پوچھو۔ کیونکہ یہ آیت انہیں کے بارے میں آئی ہے۔ انشاء اللہ یہ بحث خلاصہ تفسیر میں آئے گی۔ غرضکہ اس جملہ کے پانچ معنی ہوئے۔

**خلاصہ تفسیر** کفار کے جوابات ارشاد فرماکر اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو تسکین دی جاتی ہے۔ کہ آپ ان کے بیہودہ سوالات سے ناخوش نہ ہوں۔ بخود ہم نے نہ کہ کسی اور نے آپ کو دین حق یا قرآن کریم یا معجزات دے کر بھیجا ہے۔ تاکہ آپ ماننے والوں کو بشارت دیں اور منکروں کو آنیوالی مصیبت سے ڈرائیں۔ جو اس بشارت اور خوف سے ایمان لائیگا وہ سچا مومن ہے۔ کسی کو جبراً ایمان دینا ہمارا کام نہیں۔ کیونکہ جبری ایمان پر کوئی ثواب نہیں ملتا جو آپ پر اعتبار نہ کرے۔ اپنے دلائل کا بیہودہ وہ ثواب کس چیز کا مانگتا ہے اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم اگر کوئی بدنصیب آپ کی بات نہ مانے تو آپ سے کوئی پرسش نہ ہوگی۔ کیونکہ آپ نے تبلیغ میں کوتاہی نہیں فرمائی یا جو آپ کی بات نہ مانے وہ جہنمی ہے۔ اور اُن کی ذلت و خواری و رسوائی اور سختی عذاب کا حال کچھ مت پوچھو وہ بیان کے قابل نہیں۔

## حضور کے والدین کے ایمان کی بحث

حضرت آمنہ خاتون اور عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ایمان میں بہت گفتگو کی گئی ہے۔ بعض ظاہر بین علماء نے اس آیت کریمہ سے اُن کا جہنمی ہونا سمجھا ہم اس بارے میں نہایت منصفانہ تحقیقات کرتے ہیں۔ ناظرین سے امید انصاف ہے۔ اور حضور سید المرسلین علیہ السلام اور ان کے پروردگار رب العالمین تبارک و تعالیٰ سے امید قبول خیال رہے۔ کہ اس مسئلہ میں چار قول ہیں۔ ایک[1] یہ کہ یہ دونوں حضرات نہ زندگی میں مومن تھے۔ نہ موت کے وقت اور نہ اب۔ یہ قول مُلّا علی قاری وغیرہم کا ہے۔ دوسرے[2] یہ کہ اس میں خاموشی چاہیئے۔ اُن کا حال رب جانے تیسرے یہ کہ وہ دونوں حضرات بروقت موت تو ایمان پر نہ تھے لیکن اب مومن ہیں۔ چوتھے یہ کہ وہ زندگی میں موحد مومن تھے۔

کی ہمسری کا دعویٰ کر رہے ہیں ان کا یہ مطالبہ کرنا گویا اپنے لئے نبوت یا ملکیت کا مانگنا ہے۔ رب فرماتا ہے کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کی اس بکواس سے غمگین نہ ہوں کیونکہ یہ آپ پر ہی پہلا سوال نہیں ہوا۔ بلکہ کَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اسی طرح اُنکے اگلے کفار نے بھی اپنے پیغمبروں سے مطالبے کئے یعنی جیسے کہ محض ضد سے نہ کہ طلب حق کے لئے یہ لوگ مطالبے کر رہے ہیں۔ ایسے ہی ان سے پہلوں نے بھی کئے تھے۔ مِثْلَ قَوْلِهِمْ اور جو مطالبے اُنہوں نے کئے تھے وہ ہی یہ کر رہے ہیں خیال رہے کہ کَذٰلِكَ تو تشبیہ تکلّم کے لئے ہے اور مثل قولہم تشبیہ کلام کیلئے یعنی یہ لوگ اگلے کفار کی طرح بدنیتی سے اُسی قسم کے سوالات کرتے ہیں۔ جو انہوں نے کئے چنانچہ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ رب دکھاؤ مشرکین کی طرح ہمارے لئے بھی چند خدا بنادو یا عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا۔ کہ کیا آپ کا رب آسمان سے دسترخوان اُتار سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ یہ اور وہ زمانہ جگہ زبان جسم قوت عمر وغیرہ میں مختلف ہیں۔ مگر تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ دل ان سب کے ایک رنگ ہیں یعنی عناد سختی ضد اور اندھے پن میں یہ اور وہ یکساں ہیں کیونکہ زبان ترجمان قلب ہی جب ان کے کلام یکساں تو یقیناً دل بھی یکساں خیال رہے کہ تشابہ اور تشبیہ میں فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں مشبہ بمشبہ سے اکثر اعلیٰ ہوتا ہے مگر تشابہ میں دونوں بالکل یکساں اسی لئے یہاں تشابہت فرمایا گیا جس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ کفر میں اپنے اگلوں سے کچھ کم نہیں بلکہ بالکل برابر ہیں اور یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں محض عناد سے ہے نہ کہ ایمان لانے کی نیت سے رہا ان کا یہ اعتراض کہ ہم پر نشانی کیوں نہیں آتی۔ اُس کا جواب یہ ہے۔ کہ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ ہم نے ایک نہیں دو نہیں بلکہ صدہا نشانیاں ظاہر فرمادیں اوّل تو سر سے پاؤں تک خود آپ ہی رب کی کھلی نشانی ہیں۔ پھر آپ کے حالات قرآن پاک کی آیات اور صاحب قرآن کے معجزات اسلام کی حقانیت پر گواہی دے رہے ہیں۔ کیا انہوں نے نہ دیکھا۔ کہ آپ کے اشارے سے چاند پھٹ گیا۔ آپ کو پتھروں نے سلام کیا آپ کے حکم سے کنکروں نے کلمہ پڑھا آپ کے اشارے پر درخت چلے آپکے فراق میں لکڑی کا ستون رویا آپ کے انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہوئے آپ سے قیدی ہرنی نے شکایت اور بے زبان اونٹنی نے درد دل کی حکایت کی آپ کے صدق کی بھیڑیوں نے گواہی دی آپ کی برکت سے تھوڑے کھانے پر لشکر سیر ہوا آپ کے ہاتھ لگنے سے سخت بیماریاں دور ہوئیں اور باوجودیکہ اپنے کسی انسان سے علم نہ سیکھا مگر عرب کے فصحاء اور بلغاء نے زانوئے ادب طے کیا۔ کیا یہ معجزات ناکافی ہیں ان کے ہوتے ہوئے اور کیا چاہتے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے۔ کہ یہ تمام علامتیں لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ اُس قوم کے لئے ہیں جس میں یقین کرنے کا مادہ ہو یا جو یقین حاصل کرنے کے لئے ان پر نظر کرے یا جن کا ایمان اور یقین ازل میں مقدر ہوچکا ہو ضدی اور جھگڑالو جو کہ اپنے غالب اور دوسرے کو عاجز کرنے کی نیت سے مطالبہ کرتے ہیں وہ کسی چیز سے بھی فائدہ حاصل نہیں کرسکتے **خلاصہ تفسیر** اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے عالم و جاہل حماقت اور بدبینی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ ان کے علماء نے تو رب کیلئے اولاد مانی اور ان کے جہلا نے تو حد ہی کردی کہ کہنے لگے۔ کہ اگر آپ سچے رسول ہیں۔ تو خدا تعالیٰ ہم سے منہ در منہ کیوں نہیں کہہ دیتا کہ آپ نبی ہیں اتنے واسطے درمیان میں کیوں رکھے اگر یہ نہیں تو ہمارے پاس ایسی نشانی کیوں نہیں آجاتی جس سے ہم آپ کو مجبوراً مان لیں اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ نیا سوال نہیں ہے۔ بلکہ گذشتہ انبیاء سے بھی کفار نے ایسی ہی خرافات بکی تھیں اگر ہر شخص میں رب سے کلام کرنے کی قابلیت ہوتی تو دنیا میں انبیاء کے بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی ہر شخص رب سے پوچھ کر حرام و حلال عبادات و ریاضات کے مسائل طے کر لیا کرتا رب نور ہے اور مادہ ظلمت کیونکر ممکن ہے کہ ظلمت نور تک پہنچ سکے رب جسکو چاہتا ہے۔ اُسے ظلمت مادہ سے نکال کر عالم انوار میں لاتا ہے۔ اور اُس کے سر پر نبوت کا تاج رکھتا ہے پھر اُس سے بلاواسطہ یا بواسطہ ملائکہ کلام فرماتا ہے۔ یہ بے وقوف ظلمت مادہ تو کیا تاریکی کفر سے تو نکلے نہیں اور رب سے کلام کرنیکا حوصلہ کر رہے ہیں کیا کوئی ... کہتا ہے کہ مجھے حکیم کی کیا ضرورت یا حاکم و بادشاہ کی کیا حاجت ہر شخص حاکم اور حکیم کیوں نہیں بن جاتا یہ نادانی اور جہالت ہے۔ ایک ملحد کسی ... سے بولا کہ مجھ کو خدا دکھادو۔ انہوں نے کہا۔ کہ یہ کیا مشکل ہے۔ ابھی سے اُسے دھوپ میں کھڑا کر کے

اُس کا منہ سورج کی طرف کر دیا وہ آنکھیں بند کرنے لگا۔ تو اُن بزرگ نے چپت لگا کر فرمایا۔ کہ آنکھ کھول وہ بولا کہ کیسے کھولوں کھلتی نہیں۔ تو فرمایا آفتاب کو رب کے نور سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ وہ تو نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے سورج تو اُس کا پَرتو بھی نہیں جب تیری آنکھ میں اس کی تاب نہیں تو اُسکی تاب کیسے لائیگی جب کو دیکھنے والی آنکھ تو بتلا دکھاؤں دوں گا۔ اے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اگرچہ ان کفار کی زبانیں اور زمانہ مختلف ہیں۔ مگر دل سب کے یکساں ہیں۔ کہ سب پر کفر کا یکساں غلاف چڑھا ہوا ہے۔ رہا اُن کا دوسرا اعتراض اُس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے آپ کے سچے ہونے کی صدہا کھلی نشانیاں بھیجدیں مگر کس کے لئے یقین والوں کے لئے جن میں یقین کا مادہ ہی نہیں اُن کے لئے سب بیکار بہرے کے سامنے دلکش نغمے اندھے کے سامنے حسن جمال بیکار اور اُن کے من مانے معجزات اور مجبور کرنیوالے نشانات نہ بھیجے جائیں گے۔ کیوں کہ ایمان اختیاری پر ثواب ملتا ہے۔ نہ کہ اضطراری کا اور نبوت ایمان لانے کے لئے ہے نہ کہ تماشے دکھانے کیلئے **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** اپنے کو بڑا سمجھنا جہالت ہے عقلمند وہ ہے جو سب سے پہلے اپنا درجہ پہچانے دیکھو رب تعالیٰ نے ہم کلامی رب کے مطالبہ کو جہالت فرمایا **دوسرا فائدہ** بیدار دل کیلئے معمولی اشارہ کافی ہے۔ اور قلب غافل کے لئے کھلے ہوئے معجزات بھی ناکافی چونکہ اُن کفار کے قلب غافل تھے۔ انہوں نے اتنی نشانیوں کو نشانی ہی نہ مانا۔ لیکن خوش قسمت والوں نے صرف سُن کر ایمان قبول کر لیا **تیسرا فائدہ** یقین اور ایمان محض اپنی کوشش سے نہیں ملتا یہ عطاء الٰہی ہے **چوتھا فائدہ** وسیلہ انبیا کا انکار کفر ہے۔ بلا وسیلہ اچھی چیز مانگنا بھی بے دینی۔ ان کفار نے رب سے بلاواسطہ ہم کلامی چاہی تھی جس پر عتاب فرمایا گیا۔ اور فرمایا گیا کیا اتنے بڑھ گئے کہ آپ سے مستغنی ہو گئے۔ **پانچواں فائدہ** جو وسیلہ انبیاء کا منکر ہے وہ نہ اپنے کو پہچانتا ہے نہ رب کو انسان اگر اپنی مجبوری اور رب کی قہاری کو جانتا ہو تو ایسی غلط خواہش کر سکتا ہی نہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا لَا يَعْلَمُوْنَ **پہلا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآنی آیتیں یقین والوں کے لئے ہیں جن کو پہلے ہی سے یقین ہے۔ ان کو آیتوں کی ضرورت کیا **جواب**۔ اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ اہل یقین سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں یقین کی لیاقت و استعداد ہے نہ وہ کہ جنہیں بالفعل یقین حاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ اہل یقین سے وہ مراد ہیں کہ جو یقین حاصل کرنے کی کوشش کریں ضدی اور ہٹ دھرم نہ ہوں۔ تیسرے یہ کہ اہل یقین سے اعلیٰ یقین والے مراد ہیں یعنی جن کا یقین علم الٰہی میں آچکا ہے۔ چوتھے یہ کہ اسی یقین سے فطری یقین مراد ہے۔ یعنی جو کہ یوم میثاق کے یقین پر قائم رہے دنیا کی بُری صحبتوں نے اُس کو وہم و شک کی ظلمتوں میں پھنسا نہ دیا ہو **دوسرا اعتراض** رب نے کفار کو جواب دیتے ہوئے اگلے کافروں کا ذکر کیوں کیا۔

——— **جواب** تاکہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے قلب پاک کو ان اعتراضات سے تکلیف نہ پہنچے اور وہ خیال فرمالیں کہ اور انبیاء کرام سے بھی ایسی کج بحثیاں کیگئی تھیں **تفسیر صوفیانہ** علم توحید تمام علوم کی اصل ہے جو توحید سے جاہل رہا وہ رب کی آیات اور اُس کے کلام سے بھی ناواقف ہے چونکہ اگلے پچھلے کفار اس علم سے محروم رہنے میں یکساں تھے۔ اس لئے اُن کی کج بحثیاں بھی یکساں خیال رہے کہ علم اور ایمان ہر قوم کو یکساں فائدہ پہنچاتے ہیں ایسی ہی جہالت اور بے دینی ہر ایک کیلئے یکساں مضر دیکھو اگلے اور پچھلے کفار اگرچہ زمانہ اور زبان وغیرہ میں مختلف تھے مگر چونکہ کفر میں شریک تو اُن سے کلام بھی یکساں ہی صادر ہوئے اسی طرح حضرت صدیق اکبر اور حسن بصری وغیرہ بعد والے حضرات زمانہ وغیرہ میں مختلف تھے۔ مگر چونکہ سلسلہ ایمانی میں سب جکڑے ہوئے تھے۔ اور ہر قریب بعید پر ایک ہی آفتاب نے تجلی فرمائی تھی۔ لہٰذا وہ چمکنے میں یکساں رہے اگرچہ درجات میں فرق ہو اسی لئے آخرت میں جہنم سب اگلے پچھلے کفار کو اپنے میں جمع کریگی اور جنت سارے مومنین کو کیونکہ یہ دو قومیں دنیا میں بھی کفر یا ایمان میں جمع تھے نیز ایمان ہر چیز کو صحیح دکھاتا ہے اور کفر غلط۔ کفار خود حقیر تھے مگر ان کے کفر نے انہیں عظیم دکھایا اور اللہ کی آیتیں عظیم تھیں۔ مگر انہیں حقیر معلوم ہوئیں۔ حق تعالیٰ ہمیں حق کو حق اور باطل کو باطل دکھائے۔

ہماری نویں دلیل. رب فرماتا ہے. وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا یعنی ہم کسی قوم کو بغیر اُن میں رسول بھیجے ہوئے عذاب نہیں دیتے تو اِن دونوں صاحبوں کی طرف دعوت تبلیغ پہنچی ہی نہیں. تو عذاب کیسا ہماری دسویں دلیل شیخ سیوطی فرماتے ہیں. کہ کسی پیغمبر کی ماں کافرہ نہ ہوئیں. تو حضور کی والدہ کا کافر ہونا کیونکر ممکن ہے. ہماری گیارھویں دلیل اصحاب فترت یعنی عیسٰی علیہ السلام اور حضور کے درمیانی لوگوں کے لئے فقط عقیدہ توحید کافی ہے. اور اسی سے اُن کی نجات ہے. یہ دونوں صاحب بھی انہیں میں سے ہیں. کیونکہ اِن کا شرک کہیں ثابت نہیں. نیز یہ دونوں صاحب عین جوانی میں وفات پا گئے. چنانچہ حضرت عبداللہ کی عمر پچیس سال ہوئی اور آمنہ خاتون کی اس سے بھی کم لہذا انہیں صحبت کفار کم ملی. ہماری بارھویں دلیل ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ بنا کر دعا کی تھی وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ مولٰی ہماری اولاد میں ایک مسلمان جماعت رکھنا پھر فرمایا تھا. وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اور اسی مسلمان جماعت میں آخری نبی بھیجنا وہ دعا حضور سے پوری ہوئی تو اس سے معلوم ہوا. کہ حضور مسلم جماعت سے پیدا ہوئے. اس کی تحقیق ان آیات کی تفسیر میں دیکھو. ہمارے جوابات قائلین کفر نے جو دلائل دیئے تھے. وہ سب کمزور ہیں. اوّل اس لئے کہ اس آیت کا نزول حضور کے والدین کے بارے میں ہے ہی نہیں دیکھو شامی اور کتاب التعظیم والمنہ اور تفسیر کبیر و عزیزی وغیرہ لیکن دوسری دلیل وہ اسی لئے کہ آیت مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ الخ حق یہ ہے. کہ ابو طالب کے بارے میں آئی یا اُن مسلمانوں کے بارے میں جنہوں نے اپنے مشرک ماں باپوں کے لئے دعاء مغفرت کا ارادہ کیا تھا. بخاری نے بھی اس کا نزول ابو طالب کے حق میں مانا. جو روایت تم نے پیش کی ہے. اس کو ناقدین حدیث نے سخت ضعیف کہا اور ضعیف حدیث سے کفر جیسا اہم مسئلہ ثابت نہیں ہوتا. دیکھو تفسیر خزائن عرفان یہی آیت اُن کی تیسری دلیل زیارت قبر والی اس کا جواب ہم اپنے دلائل میں دے چکے ہی چوتھی دلیل وہ اس لئے کہ محدثین نے فرمایا ہے. کہ یہ حدیث منسوخ ہے حضور علیہ السلام نے اُن کی نجات کے علم سے قبل فرمایا تھا. دیکھو شامی باب المرتدین یا یہ حدیث سخت ضعیف ہے. اگرچہ مسلم نے روایت کی دیکھو کتاب التعظیم یا یہاں ابی سے مراد چچا ابو طالب ہیں. اہل عرب چچا کو باپ کہہ دیا کرتے ہیں. قرآن فرماتا ہے. لِاَبِيْهِ اٰزَرَ. آزر چچا کو باپ فرمایا گیا. نیز فرماتا ہے. اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ رہی اُن کی پانچویں دلیل اُس کا جواب یہ ہے. کہ فقہ اکبر کے نسخوں میں بہت اختلاف ہے بعض میں ہے. کہ مَاتَا عَلَى الْكُفْرِ اور بعض میں ہے مَا مَاتَا عَلَى الْكُفْرِ یعنی اُن کا انتقال کفر پر نہ ہوا اور بعض نسخوں میں یہ مسئلہ بالکل ہے ہی نہیں چنانچہ مولوی وکیل احمد صاحب سکندر پوری نے فقہ اکبر کا نہایت صحیح نسخہ حیدر آباد سے حاصل کر کے چھپوایا اور ثابت کیا. کہ یہی صحیح ہے. اور باقی غلط اُس میں اس مسئلہ کا پتہ بھی نہیں اتنے اختلاف کے ہوتے ہوئے ایک نسخہ پر کیسے یقین کیا جائے اور اگر صحیح مان بھی لو تو یہ مسئلہ اجتہادی یا تقلیدی نہیں تاکہ اس میں امام کی پیروی واجب ہو. بلکہ یہ تاریخی واقعہ ہے. اگر اُس کے خلاف ثبوت ہو جائے. تو اُسی کو مانا جائے مسئلہ بعض یزید و اطفال مشرکین وغیرہ رہی اُن کی چھٹی دلیل اُس کا جواب یہ ہے. کہ والدین کریمین کو زندہ کرنے کی حدیث بالکل صحیح ہے. شامی نے باب المرتدین میں فرمایا. کہ امام قرطبی اور حافظ شام ابن ناصر الدین وغیرہ نے اسے صحیح بتایا شیخ جلال الدین نے کتاب الفضل میں انہی حافظ شمس الدین کے یہ اشعار نقل فرمائے.

حَبَا اللّٰهُ النَّبِيَّ مَزِيْدَ فَضْلٍ ۔۔۔ عَلٰى فَضْلٍ وَكَانَ بِهٖ رَءُوْفًا

فَاَحْيَا اُمَّهٗ وَكَذَا اَبَاهُ ۔۔۔ لِاِيْمَانٍ بِهٖ فَضْلًا لَطِيْفًا

اور قاعدہ ہے کہ جرح پر تعدیل مقدم اور فضائل اعمال میں حدیث ضعیف بھی معتبر اور یہ بھی والدین کریمین کی فضائل ہی کی حدیث ہے نیز مردوں کو زندہ کرنا ممکن ہی نہیں بلکہ واقعہ ہے حضرت عیسٰی و موسٰی و حزقیل علیہ السلام وغیرہم انبیاء نے مردے زندہ کئے ہیں حتٰی کہ قریب قیامت دجال کافر بھی لوگوں کو مار کر زندہ کرے گا حضور علیہ السلام نے بھی حضرت جابر کے بچوں اور ایک جماعت کو زندہ فرمایا دیکھو شرح

قصیدہ بردہ خرپوتی. مدارج النبوۃ. شامی باب المرتدین وکتاب الفضل وغیرہ اگر اپنے والدین کریمین کو بھی زندہ فرمایا ہو تو کونسی قباحت ہے اسی طرح بعد موت یا عذاب الٰہی دیکھ کر ایمان قبول ہونا بھی تعجب کی بات نہیں اصحاب کہف زندہ ہو کر حضرت امام مہدی کے ساتھ رہیں گے اور اُمت مصطفےٰ میں داخل ہو کر حج بھی کریں گے (روح البیان یہی آیت وکتاب التعظیم) یونس علیہ السلام کی قوم عذاب دیکھ کر ایمان لائی جو کہ قبول ہو گیا. قرآن کریم فرماتا ہے. فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ آمَنَتْ فَنَفَعَهَا إِيمَانُهَا إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ جس سے معلوم ہوا کہ یونس علیہ السلام کی یہ خصوصیت تھی. کہ اُن کی قوم کا ایمان یاس بھی قبول کر لیا گیا. اسی طرح یہ بھی حضور کی حضور کی خصوصیت ہے. کہ آپ کے والدین ماجدین کا ایمان بعد وفات قبول کر لیا گیا خصوصیات قوانین کو خاص کر دیتی ہیں. دیکھو حضور علیہ السلام نے ڈوبا ہوا سورج واپس فرما کر حضرت علی کو گئی ہوئی نماز عصر پڑھا دی. جو شہنشاہ کہ قضا نماز کو سورج لوٹا کر ادا کرا دیں وہ اپنے والدین کو زندہ فرما کر کلمہ بھی پڑھا سکتے ہیں رہا قرآن پاک کا یہ فرمانا وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ یا یہ فرمانا کہ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ اُن کے بارے میں ہے. جو مشرک کافر ہو کر مرے ہوں. جب وہ دونوں حضرات موحد ہو کر وفات پائیں تو اس آیت میں کیونکر داخل ہوں گے. اگر یہ حضرات مشرک ہوتے تو ان کا اسم شریف عبداللہ اور آمنہ نہ ہوتا. بلکہ کفار کا سا نام ہوتا عبداللہ کے معنی ہیں. اللہ کا بندہ اور آمنہ کے معنی ہیں. اللہ کی امانت رکھنے والی یا دنیا کو امن دینے والی بی بی جو اُن کو آمنہ کہہ کر کافرہ کہتا ہے. وہ اپنے منہ سے ہی غلط کہتا ہے. جیسے کہ جو حضور کو محمد کہہ اُن کی گستاخی کرے اور اگر معاذاللہ وہ دونوں کفر میں وفات پاتے جب بھی حضور کی خصوصیت اُن کے ایمان کو درست کرا کر انہیں جہنم سے بچا لیتی. اور کیوں نہ ہو. رب فرماتا ہے. وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ رب آپ کو اتنا دے گا. کہ آپ راضی ہو جائیں گے. وہ کون سعادت مند بیٹا ہے. جو اپنے والدین کے جہنمی ہونے پر راضی ہو جائے حضور علیہ السلام نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے دسترخوان سے ہاتھ پونچھ لئے تھے تو وہ تنور کی آگ میں نہیں جلتا تھا. تو کیا جن پیٹوں کو حضور نے چوسا ہو وہ جہنم میں جل سکتے ہیں. کیا آمنہ خاتون حضرت مریم اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ سے بھی کم رہیں گی کیا یہ رب کو پسند ہو گا. کہ عیسیٰ و موسےٰ علیہما السلام اپنی والداؤں کو جنت میں دیکھیں اور اُس محبوب کی والدہ ماجدہ وہاں نظر نہ آئے بلکہ جہنم میں جائے قسم اُن کے رب کی یہ کبھی نہ ہو گا. لہٰذا حق یہ ہے. کہ وہ دونوں حضرات اپنی زندگی پاک میں موحد مومن تھے. اور انہیں حجۃ الوداع میں حضور نے زندہ فرما کر کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا اور اب وہ اُمت مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کے اولیاء کاملین میں سے ہیں. **حکایت** ضلع سیالکوٹ میں ایک دیوبندی مولوی نے وعظ میں کہا. کہ تم لوگ حضور کی شفاعت کی آس لگائے بیٹھے ہو وہ تو اپنے ماں باپ کی بھی شفاعت نہ کر سکیں گے. کہ وہ دونوں جہنم میں جائیں گے. وعظ ختم ہونے پر ایک جاہل کسان نے پوچھا کہ مولوی صاحب مولوی اور حافظ کا کیا درجہ ہے. دیوبندی بولا. کہ عالم تو اپنی سات پشت کو اور حافظ اپنی تین پشت کو بخشوائیگا. کسان بولا کہ مولوی تو سات پشت کو بخشوا لے اور معراج میں جانے والا قرآن لانے والا سرکار صلے اللہ علیہ وسلم اپنی ماں کو بھی نہ بخشوا سکے. اس کے بعد دیوبندی مولوی ذلیل کر کے نکالا گیا یہاں تک تو دلائل تھے. لیکن مقام عقیدت میں اُن دلائل سے میری آنکھیں اندھی اور میرے کان بہرے اور میری زبان گونگی ہے جو حضور کے والدین کریمین کا کفر ثابت کریں. وہ احادیث ضعیف ہیں. اور وہ دلائل باطل ہیں. درحقیقت انہیں کے گھر کا یہ سارا باغ ہے. وہ ہی اس کے مالی اور خود اُس سے محروم رہیں. یہ کیونکر ہو سکتا ہے وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولینا محمد والہ وبارك وسلم اس مسئلہ کی زیادہ تحقیق کے لئے شمول الاسلام مصنفہ اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی قدس سرہ اور ہماری کتاب "شان حبیب الرحمٰن" کا مطالعہ کرو

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ

اور ہرگز نہیں راضی ہونگے تم سے یہودی اور نہ عیسائی یہاں تک کہ پیروی کرو تم دین اُنکے کی تم فرما دو۔ تحقیق

اور ہرگز تم سے یہود اور نصارٰی راضی نہ ہوں گے جب تک تم اُن کے دین کی پیروی نہ کرو۔ تم فرماؤ۔

هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ

ہدایت اللہ کی وہی ہدایت ہے اور البتہ اگر پیروی کرے تو نفسانی خواہشات کی اُن کے پیچھے اُسکے کہ آگیا تیرے پاس

اللہ ہی کی ہدایت ہدایت ہے اور (اے سننے والے کسے باشد) اگر تو اُن کی خواہشوں کا پیرو ہوا بعد اس کے کہ تجھے

الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

علم نہیں ہے واسطے تیرے اللہ سے کوئی دوست بچانیوالا اور نہ مددگار

علم آچکا تو اللہ سے تیرا کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور نہ مددگار ٭

**تعلق:۔** اس آیت کا گذشتہ آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق** پچھلی آیت میں کفار کی کج روی کا ذکر تھا۔ اور نبی علیہ السلام کو اُن کے ایمان سے مایوس کیا گیا تھا۔ اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ وہ تو اتنے سخت ہیں۔ کہ اس پر بھی راضی نہیں کہ تم علیحدہ رہو اور وہ علیحدہ بلکہ وہ تو اس پر راضی ہیں۔ کہ تم اُن کے جھوٹے دین میں چلے جاؤ اس صورت میں اُن کے ایمان کی کیا امید ہے۔ **دوسرا تعلق** پچھلی آیتوں سے شبہ ہو سکتا تھا۔ کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ کہ ان یہود نصارٰی نے گذشتہ پیغمبروں کے معجزات پسند کرکے اُن کا دین قبول کر لیا۔ اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات سے منہ پھیر گئے۔ اب جواب دیا جا رہا ہے۔ کہ اس کی وجہ محض حسد اور خود پسندی ہے۔ کہ وہ اپنا پیشوا رہنا اور دوسروں کا اپنے تابع ہونا پسند کرتے ہیں چونکہ پہلے نبی اُن کی قوم کے تھے اس لئے انہیں مان لیا اور یہ پیغمبر اُن کی قوم کے نہیں اس لئے انکار کر دیا۔ **تیسرا تعلق** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا۔ کہ رب نے آپ کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ اس بشارت اور ڈرانے میں کفار کی رضامندی کا لحاظ نہ کریں کیونکہ وہ تمہیں اپنے میں ملائے بغیر راضی نہیں ہو سکتے۔

**تفسیر۔ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى۔** یہ غیب کی خبر ہے۔ اور سارے کفار کا یہی حال ہے۔ کہ وہ مسلمانوں سے مسلمان رہتے ہوئے کبھی راضی نہیں ہو سکتے۔ مگر چونکہ وہاں یہودیوں عیسائیوں سے ہی سابقہ تھا۔ نیز عرب میں یہی لوگ اہل علم مشہور تھے۔ اور وہ چاہتے تھے کہ سارا جہان ہمارا تابعدار ہے۔ اور ہم سب کے سردار اس لئے یہاں انہیں دو قوموں کا ذکر فرمایا گیا۔

**حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ۔** یہ حضور علیہ السلام سے خطاب ہے۔ اور اشارۃً بتایا جا رہا ہے۔ کہ اُن کا آپ سے راضی ہونا محال ہے۔ کیونکہ محال پر موقوف بھی محال ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام پیغمبر ہیں پیغمبر سے گناہ بھی ناممکن ہے۔ چہ جائیکہ کفر تو فرمایا گیا۔ کہ اُن کی رضا اس پر موقوف ہے۔ کہ آپ اُن کا دین اختیار کریں۔ اور یہ تو مطلقاً محال لہذا وہ بھی محال خیال رہے۔ کہ ملّت کے لفظی معنی ہیں لکھوانا۔ رب فرماتا ہے۔ وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ چونکہ انبیاء کرام بھی شرعی قوانین اپنی اُمت کو لکھوا کر دیتے ہیں۔ اس لئے انہیں ملت کہا جاتا ہے اور چونکہ اُمت اُن قوانین کی اطاعت کرتی ہے۔ اس لئے وہ دین بھی کہلاتے ہیں (دین بمعنی اطاعت) اور چونکہ وہی قوانین رب کے پانے کا راستہ بھی ہیں۔ اس لئے انہیں شریعت بھی کہتے ہیں۔ شریعت بمعنی کھلا راستہ رب فرماتا ہے۔ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا۔ ملت اور دین میں فرق یہ ہے۔ کہ دین تو رب نبی اور مجموعہ اُمت اور ہر اُمتی کی طرف مضاف ہو سکتا ہے۔ مگر ملت کی نسبت ہر اُمتی کی طرف نہیں

ہوتی. صرف رب پیغمبر اور ساری امت کی طرف ہو سکتی ہے. خیال رہے کہ یہاں یہودی اور عیسائی دو قوموں کے لئے ایک ملت فرمایا کیونکہ وہ ساری ملتیں کفر میں ایک ہی ہیں۔ اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ نیز اس میں پُر لطف اشارہ یہ بھی ہے. کہ ان دونوں کا راضی ہونا اجتماع ضدین پر موقوف ہے۔ لہذا محال. کیونکہ دین عیسوی و موسوی ضدین ہی تھے اور ایک شخص ایک وقت میں عیسائی یہودی نہیں بن سکتا.

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى اس میں ان دونوں کو اپنی کامیابی سے مایوس کیا گیا ہے. یعنی آپ اعلان عام فرما دو کہ اللہ کی ہدایت یعنی اسلام ہی سچی ہدایت ہے پیغمبر سے یہ کیونکر ممکن ہے. کہ وہ حق کو چھوڑ کر باطل اختیار کرے. اگرچہ وہ دونوں دین بھی ایک وقت میں اللہ کی ہدایت تھے. لیکن ان کے منسوخ ہو چکنے کے بعد ان کی پیروی کرنا گمراہی ہے. نیز تم نے ان میں بہت ملاوٹ کر دی جس سے وہ اللہ کے دین نہ رہے. بلکہ وہ تمہارے خود ساختہ خواہشات بن گئے خیال رہے. کہ اس جگہ یا تو پہلی ہدایت سے اسلام اور دوسری ہدایت سے ہدایت حقیقی مراد ہے. یا اس کے برعکس یعنی اسلام ہی ہدایت حقیقی ہے یا ہدایت حقیقی اسلام ہی ہے اور تمہارے ادیان ھدیٰ نہیں. بلکہ ھویٰ میں دخواہشات نفسانی وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بعض مفسرین نے فرمایا. کہ یہ حضور علیہ السلام سے ہی خطاب ہے یعنی اگر بفرض محال آپ ان کی خواہشات کی پیروی کریں جیسے لَوْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ نہ خدا کا بیٹا ہونا ممکن اور نہ حضور علیہ السلام کا ان بے دینوں کی طرف مائل ہونا قضیہ شرطیہ محض تعلیق بتاتا ہے. اُسے مقدموں کے امکان سے کوئی تعلق نہیں مگر تفسیر خازن اور تفسیر خزائن عرفان میں فرمایا کہ یہ امت سے خطاب ہے یعنی اے مسلمان اگر تو نے یہ حرکت کی اس صورت میں کوئی اعتراض ہی نہیں پڑتا. خیال رہے کہ اھواء ھویٰ کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ہیں. اوپر سے نیچے گرنا. یا اوڑتا پھرنا رب فرماتا ہے. اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ اصطلاح میں نفسانی خواہش کو ھویٰ کہتے ہیں. کیونکہ وہ بھی انسان کو نیچے گراتی ہے. شریعت میں گمراہ کن خیالات کو ھویٰ کہتے ہیں. اسی لئے گمراہوں کو اہل ھویٰ بھی کہا جاتا ہے. چونکہ ان دونوں دینوں سے حقانیت نکل کر ان میں نفسانیت شامل ہو گئی تھی. اس لئے انہیں اھواء فرمایا گیا یا تو اس خیال کو کہ حضور علیہ السلام ان کی پیروی کریں اھواء کہا اور چونکہ ان میں سے ہر ایک شخص کی یہ خواہش تھی. اس لئے جمع بولا گیا. بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ علم کے معنی ہیں کسی چیز کا صحیح جاننا یہاں یا تو اس سے قرآن مراد ہے. یا اسلامی قوانین یا ان دینوں کا منسوخ ہو جانا. یعنی اے مسلمان اگر تو نے قرآن یا احکام اسلام یا یہودی نصرانیت کا بطلان جان کر پھر ان کی پیروی کی تو مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ تمہارے لئے خدا کی طرف سے نہ سفارشی دوست مقرر ہے اور نہ کوئی مددگار جو کہ تمہیں عذاب الٰہی سے بچا سکے خیال رہے. کہ ولی اور نصیر میں یہ فرق ہے. کہ ولی وہ جو دوستی اور آشنائی کی وجہ سے مدد کرے. مگر اس کی کامیابی یقینی نہ ہو. نصیر وہ جس کی کامیابی یقینی ہو. اگرچہ وہ اجنبی ہو لہذا ان دونوں میں عموم خصوص من وجہ ہے (روح).

**خلاصہ تفسیر** اگرچہ اس دین حق کی اندرونی اور بیرونی خوبیاں اس کی حقانیت کی کھلی ہوئی دلیل ہیں جن سے دل میں تو مخالفین بھی قائل ہیں. مگر یہود و نصاریٰ کی ضد اور تعصب کا یہ حال ہے. کہ جب تک آپ خود ان کی جہالت اور گمراہی کے جس کو انہوں نے اپنا دین و ملت بنا رکھا ہے. تابع نہ ہو جائیں وہ آپ سے خوش بھی نہ ہوں گے. آپ ان ازلی بدنصیبوں کے ہدایت پر آنے کی امید نہ رکھیں. بلکہ انہیں علانیہ فرما دیں کہ حقیقی ہدایت تو وہ ہی ہے جو اللہ کی طرف سے ہے. یعنی دین اسلام پیغمبر تو لوگوں کو ہدایت دینے کے لئے آتے ہیں. یہ کیونکر ممکن ہے. کہ وہ خود کسی کے خیالات کی پیروی کریں اور اے قرآن کے پڑھنے والے مسلمان تو بھی خیال رکھنا. کہ اگر تو نے حقانیت اسلام معلوم کر کے اور ہدایت تک پہنچ کر پھر ان کی خواہشات نفسانیہ کی پیروی کی تو تجھ سے سایہ فضل خداوندی اٹھ جائیگا. اور تجھ میں بھی وہی زہر سرایت کر جائیگا. اور پھر تیرے لئے غیبی رحمت باقی نہ رہے گی. اور نہ کوئی تیرا دوست و مددگار رہیگا. جو تجھے اللہ کے عذاب سے بچائے. تفسیر حقانی نے کہا. کہ اہل کتاب حسد علیہ

السلام سے درخواستیں کرتے تھے۔ کہ اگر آپ اپنا قبلہ بدل دیں اور جانوروں کے حلال وحرام ہونے میں ہم سے اتفاق کرلیں۔ تو باقی تمام باتوں میں ہم آپ کی بات مان لیں گے۔ اس آیت میں حضور علیہ السلام سے ارشاد فرمایا گیا۔ کہ آپ کسی مصلحت وقت سے بھی کسی کی نفسانی خواہش قبول نہ فرمائیں اور ان کے مسلمان ہوجانے کی امید پر فرعی مسائل میں بھی اُن کا کہا نہ مانیں کیونکہ آپ پر حقیقت حال ظاہر ہوچکی ہے۔ اور اُن پر آپ کی اطاعت ضروری ہے نہ کہ آپ پر اُن کی **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** کافر مسلمان سے کبھی راضی نہیں ہوسکتے کیونکہ انہیں تو اسلام سے چڑ ہے نہ کہ مسلمان کی ذات سے ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کا تجربہ بھی کرلیا۔ نئی روشنی کے مسلمان ہندوؤں کو راضی کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے۔ انہوں نے اپنی مسلمان قوم کو ہی کچلا کبھی خلافت کے بہانہ سے صدہا نہ کرنیوالے کام کرلئے گاندھی کی جے انہوں نے لگائی قربانی گائے کو انہوں نے روکا اپنی پیشانیوں پر قشقے انہوں نے لگائے مسلمانوں سے سرکاری نوکری چھڑا کر ہندوؤں کو دلوائیں ہجرت کرا کر بے گھر انہیں بنایا۔ اب بھی احرار جمیعت علماء اور دیوبند کا مدرسہ ہندوؤں کے اشارہ ابرو پر چل رہے ہیں۔ مگر کفار اب تک اِن سے راضی نہ ہوئے۔ کاش کہ وہ لوگ اس آیت کریمہ پر غور کریں اور اس کفار پرستی اور گاندھی کی پوجا چھوڑ کر بجائے رعاداری کے میں۔ خودداری پیدا کریں اور سمجھ لیں کہ مسلمان اپنی ہی قوم سے عزت پاسکتے ہیں۔ نہ کہ دوسری قوموں سے کفار کو راضی کرنے کے بجائے اللہ ستار غفار کو راضی کرنیکی کوشش کریں۔ **دوسرا فائدہ** مسلمانوں کیلئے باذن اللہ تعالیٰ رب کی طرف سے ولی بھی ہیں اور مددگار بھی کیونکہ یہاں بتایا گیا۔ کہ کافروں کے لئے کوئی ولی مددگار نہیں جو لوگ کہتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار نہیں وہ اپنے آپ کو کافر سمجھتے ہوں گے ہمارے لئے تو انبیاء اولیاء قرآن رمضان بلکہ چھوٹے بچے بھی باذن الٰہی مددگار ہیں **تیسرا فائدہ** دلائل ظاہر ہونے کے بعد تقلید حرام ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے۔ کہ عالم مجتہد کو غیر کی تقلید ناجائز (تفسیر کبیر وعزیزی) اس کی زیادہ تحقیق کے لئے ہماری کتاب الحق کا مطالعہ کرو۔ **چوتھا فائدہ** دوسری تفسیر سے معلوم ہوا کہ احکام محال پر بھی معلق ہوجاتے ہیں کافر قطعی کو ایمان کی رغبت دینا اور مومن قطعی کو بے ایمانی سے ڈرانا جائز ہے تاکہ دوسرے لوگ سن کر عبرت پکڑیں (عزیزی) **پانچواں فائدہ** علم الٰہی سے اسباب باطل نہیں ہوتے رب کو خبر ہے کہ زید قتل ہوگا۔ مگر اس کے قاتل کو پھر بھی پھانسی دی جائیگی۔ اور قانون یہ بنایا جائیگا۔ کہ قتل کا بدلہ قتل ہے۔ دیکھو نبی علیہ السلام بلکہ صدیق اکبر وفاروق اعظم وغیرہم کا کفار کی پیروی کرنا قریباً ناممکن تھا لیکن پھر بھی اس پر عذاب کو معلق کردیا (تفسیر عزیزی) **چھٹا فائدہ** مجذوب لوگ علم الٰہی پر نظر کرتے ہوئے اسباب چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر سالکین اس آیت کو دیکھ کر اسباب پر عمل کرتے ہیں۔ یعنی مجذوب رب کی قدرت کو دیکھتے ہیں۔ اور سالکین اُس کی حکمت کو اسی لئے سالک مجذوب سے افضل ہیں۔ انبیاء کرام اور بعض اولیاء اللہ جانتے ہیں۔ کہ فلاں بیمار کو شفا ہوجائیگی مگر پھر بھی اُسے دوا پلاتے ہیں۔ مگر مجذوب دوا اور حکیم کے احسان سے سبکدوش رہتے ہیں۔ **ساتواں فائدہ** رب تعالیٰ بے خبر پر عذاب نہیں بھیجتا ہاں جو عمداً بے خبر رہے اُس کو عذاب ہوسکتا ہے۔ رب نے حق کے دلائل قائم فرمادیئے۔ اب جو باطل پر رہے وہ مجرم ہے اسی لئے اس آیت میں علم آچکنے کی قید لگائی گئی **پہلا اعتراض** جن مفسرین نے وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ میں حضور سے خطاب مانا ہے اُن کے قول پر یہاں اِنْ نہ آنا چاہیئے تھا۔ بلکہ لَوْ آنا ضروری تھا کیونکہ ناممکنات کے نہ ہونے کا یقین ہے اور اِنْ شک کے لئے ہے قرآن کریم نے فرمایا۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ۔ یا لَوْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ **جواب**۔ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ ان مفسرین کے نزدیک ہیں لظاہر نبی علیہ السلام سے خطاب ہے۔ مگر درحقیقت دوسروں کو سنانا منظور اس لئے اِنْ لایا گیا۔ دوسرے یہ کہ جہاں ناممکن واقع فرض کیا جائے تو وہاں اِنْ بولا جاتا ہے۔ جیسے اِنْ كَانَ زَيْدٌ حِمَارًا فَهُوَ نَاهِقٌ یعنی اگر زید کو گدھا فرض کرلو۔ تو وہ رینگنے والا ہے۔ اس آیت میں فرض محال ہے۔ اور لَوْ كَانَ میں یہ فرض نہیں اس لئے یہاں اِنْ لایا گیا۔ اور وہاں لَوْ۔ **دوسرا اعتراض** اس

آیت سے معلوم ہؤا۔ کہ کفار مومن سے کبھی راضی نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ کافر نہ ہو جائے۔ حالانکہ بہت سے کفار مسلمانوں سے دوستی کرتے ہیں۔ حضور غوث پاک کی گیارھویں کرتے ہیں۔ نبی علیہ السلام کی نعتیں لکھتے ہیں۔ ابو طالب ایمان پر نہ تھے۔ مگر حضور سے راضی تھے **جواب** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ آیت فقط خاص متعصب یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں ہے۔ اسی لئے انہیں کا نام بھی لیا گیا ہے۔ مگر یہ جواب ضعیف ہے۔ کیونکہ یہاں یہود و نصاریٰ ہیں کوئی قید نہیں نیز اور دوسری آیت میں مشرکین کو بمقابلہ عیسائیوں کے مسلمانوں کا زیادہ سخت دشمن بتایا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہؤا وَلَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا دوسرے یہ کہ اس قسم کے کفار صرف نام کے کافر رہ جاتے ہیں حقیقۃً تادل میں خود اپنے دین سے بیزار ہوتے ہیں۔ چنانچہ ابو طالب صرف نام ہی کے کافر رہ گئے تھے۔ ابو طالب کے متعلق کچھ گفتگو ہم کر بھی چکے ہیں۔ اور مکمل بحث اُن آیتوں کی تفسیر میں کریں گے۔ جہاں ان کا ذکر آئیگا۔ امام احمد ابن دحلان مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب اسنیٰ المطالب فی ایمان ابی طالب میں فرماتے ہیں۔ کہ ابو طالب نے اپنے نعتیہ اشعار میں ساری ایمانیات کا اقرار کر لیا۔ صرف حضور کے آرام کی خاطر صراحۃً ایمان ظاہر کیا۔ کہ میرے بظاہر کافر رہنے پر میری زندگی میں اور بعد موت کفار حضور علیہ السلام کا لحاظ کریں گے۔ اور انہیں ایذا نہ پہنچائیں گے۔ یعنی انہوں نے نار بھی اختیار کی تو حضور کے آرام کی خاطر اسی لئے حضور علیہ السلام نے اُن کو جہنم سے نکال کر اُس کے جھیرے میں رکھ دیا۔ دیکھو مشکوٰۃ باب صفت النار بحوالۂ بخاری تیسرا جواب یہ ہے۔ کہ اس قسم کے عام کفار در حقیقت اسلام اور مسلمانوں سے راضی نہیں۔ بلکہ بعض کفار تو محض دنیوی نفع کی خاطر گیارھویں کرتے ہیں اور عام شعراء داد لینے کے لئے نعت لکھ لیتے ہیں۔ اگر دل سے راضی ہوتے تو مسلمان ہو جاتے **چوتھا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہؤا۔ کہ مسائل میں کفار کی بالکل رعائت نہ کی جائے حالانکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تالیف قلوب کے لئے بہت موقعوں پر اُن کی رعائت فرمائی شروع اسلام میں اُن کو زکوٰۃ دینا جائز رہا۔ اُنہیں کی خاطر سترہ ۱۷ مہینے تک بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ رہا وغیرہ وغیرہ لہذا اگر ہم بھی ہندؤں کو راضی کرنے کیلئے قربانی گائے چھوڑ دیں تو کیا حرج ہے۔ جائز باتوں میں اُن کو راضی کر لیا کریں **جواب** کفار کے راضی کرنے کیلئے دین کے جائز کام بھی چھوڑنا گناہ ہے۔ عبد اللہ ابن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہودیت کی خاطر اونٹ کے گوشت سے پرہیز کیا تھا۔ تو آیت آئی اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اسلام میں پورے آجاؤ شیطان کے قدم بقدم نہ چلو حضور علیہ السلام نے زکوٰۃ اور قبلہ وغیرہ میں کسی کافر کی خواہش پر عمل نہ کیا بلکہ رب کے حکم پر۔ رب نے خواہ اسی لئے فرمایا ہو لیکن ہم تو اُس کے فرمان پر عمل کریں گے اُنکی کوئی مثال نہ ملے گی۔ کہ جہاں کفار کی خواہش پر آپ نے احکام اسلامیہ میں فرق کیا ہو اسلام کا ہر قانون اپنی جگہ قائم رہیگا ہندوں کی خاطر اذان و قربانی گائے وغیرہ نہیں بند کی جا سکتی **تفسیر صوفیانہ** نفس امارہ کافر ہے اور روح مومن۔ شیطان نفس کا مددگار اور فرشتہ روح کا وزیر ضروری ہے۔ کہ نفس کو مغلوب رکھنے کے لئے اُس کی ہر خواہش پامال کی جائے اور اُس کی پوری پوری مخالفت کی جائے۔ اگر کوئی چاہے کہ نفس و روح میں اس طرح صلح کرادے کہ روح تو نفس کی بعض خواہشات پوری کرے اور نفس بعض چیزوں میں روح کی اطاعت کرے یہ ناممکن ہے۔ نفس امارہ روح سے اُس وقت تک راضی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اُسے بالکل اپنے ہم رنگ نہ کرلے نفس اُس شیر خوار بچے کی طرح ہے۔ کہ اگر اُس کی بعض ضدیں پوری کی جائیں تو اور زیادہ ضدی بنتا ہے۔ اور اگر مہربان دایا جبراً اُس کا دودھ نہ چھڑا دے تو وہ کبھی اس پر راضی نہ ہو لہذا اے روح اگر تو نے علم حاصل ہونے کے بعد نفس کی تھوڑی بھی پیروی کی تو رب کی طرف سے جو تیرا معاون اور مددگار فرشتہ مقرر ہے۔ وہ تجھ سے جاتا رہیگا۔ اور پھر تو اس پردیس میں بے یار و مددگار ٹھوکریں کھاتی پھرے گی پس چاہیئے کہ۔ بائیں رستے نہ جا مسافر سُن ⁂ راہ ہے راہ مار پھرتے ہیں

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ

وہ جو کہ دی ہم نے انہیں یہ کتاب تلاوت کرتے ہیں وہ اُس کی حق تلاوت اُس کی کا یہ لوگ ایمان لاتے ہیں ساتھ اُس کے

جنہیں ہم نے کتاب دی ہے۔ وہ جیسے چاہئے اُس کی تلاوت کرتے ہیں وہ ہی اُس پر ایمان رکھتے ہیں۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۲۱)

اور جو انکار کرے اُس کا پس یہ لوگ وہ ٹوٹا پانے والے ہیں۔

اور جو اس کے منکر ہوں۔ تو وہ ہی زیاں کار ہیں۔

ع ۱۴ / ۹ / ۱۴

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** پچھلی آیت میں یہود و نصاریٰ کی ہٹ دھرمی اور اُن کے سخت عناد کا ذکر کیا گیا۔ اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ سارے اہل کتاب کا یہ حال نہیں ان میں سے بعض حق پرست بھی ہیں۔ **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں یہود و نصاریٰ کے دین کو اھوا یعنی نفسانی خواہشات فرمایا گیا تھا۔ اب اُس کی وجہ بتائی جا رہی ہے۔ کہ انہوں نے درحقیقت اُس کتاب کو پڑھا ہی نہیں جنہوں نے صحیح پڑھا وہ مسلمان بھی ہو گئے **تیسرا تعلق** پہلے فرمایا گیا تھا کہ اسلام حقیقی ہدایت ہے۔ اب اُس کی دلیل دی جا رہی ہے۔ کہ توریت و انجیل کو صحیح پڑھنے والوں نے بھی اسے قبول کر لیا **شانِ نزول** بعض صحابہ کرام نے حضور کی ہجرت سے پیشتر حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی وغیرہ کو قرآن سنا کر اسلام کا دلدادہ کر لیا تھا۔ جب حضور علیہ السلام نے مدینہ پاک کی طرف ہجرت کی تو یہ لوگ بھی بذریعہ کشتی وہاں آ گئے کیونکہ انہوں سے بحبور اتنے روز تک حضور کا فراق گوارا کیا۔ انکے ہمراہ ۴۰ اہل کتاب بھی تھے جنمیں سے بتیس ۳۲ اہل حبشہ اور آٹھ شامی راہب تھے۔ انہیں میں بحیرہ راہب بھی شامل تھے ان سب کے سردار حضرت جعفر ابن ابی طالب تھے (از تفسیر خزائن عرفان) خیال رہے کہ چالیس تو حبشہ و شام کے عیسائیوں اور یہودیوں کی تعداد تھی مکہ کے مہاجرین کی تعداد اِن کے علاوہ ہے۔ ان حبشی اور شامی اہل کتاب کے بارے میں یہ آیت کریمہ اُتری جو قرآن پاک سن کر اور اپنی کتابوں میں حضور کی نعت دیکھ کر ایمان لا کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے **تفسیر** اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ پہلی آیت میں فرمایا تھا مِلَّتَهُمْ۔ اور یہاں فرمایا۔ اٰتَيْنٰهُمُ جس سے معلوم ہوا۔ کہ مفسدین اہل کتاب کا دین اپنا خود ساختہ ہے۔ اور مومنین اہل کتاب کا علم و عرفان رب کا عطا فرمایا ہوا اسی لئے وہ کافر رہے اور یہ نور ایمانی سے چمک گئے۔ اَلْكِتٰبَ۔ یا تو اس سے قرآن کریم مراد ہے۔ کیونکہ آئندہ تلاوت کی رغبت اور ایمان کا ذکر ہو رہا ہے۔ اور یہ صفات قرآن ہی کے ہیں۔ توریت و انجیل کی نہ تو کوئی باقاعدہ تلاوت ہوئی اور نہ اب وہ ذریعہ ہدایت ہے۔ یا اس سے توریت ہی مراد ہے۔ اس لئے کہ اس آیت کے آگے پیچھے بنی اسرائیل کا ہی ذکر ہے اور یہ کشتی والے لوگ توریت وغیرہ پڑھ کر اُسی کی رہبری سے حضور پر ایمان لائے تھے۔ يَتْلُوْنَهٗ اگر کتاب سے قرآن مراد ہو تو تلاوت کے معنی ہیں پڑھنا اور اگر اُس سے توریت انجیل مراد ہے۔ تو تلاوت کے معنی ہیں پیروی کرنا۔ رب فرماتا ہے۔ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا یہاں تلاوت بمعنی اتباع ہے۔ نہ کہ پڑھنا۔ بلکہ پڑھنے کو بھی تلاوت اسی لئے کہتے ہیں۔ کہ اُس میں لکھے ہوئے کی اتباع ہوتی ہے (تفسیر کبیر) حَقَّ تِلَاوَتِهٖ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے۔ یعنی وہ تلاوت ایسی کرتے ہیں جیسی کہ چاہئے اور جیسے اُس کا حق ہے۔ اگر یہاں اہل کتاب مراد ہیں۔ تو حق تلاوت سے مقصود ہے صحیح پڑھنا اُن کتابوں میں تحریف و تبدیل نہ کرنا اُس کے احکام پر عمل کر کے نبی آخر الزمان پر ایمان لے آنا اور اگر کتاب سے قرآن اور ان لوگوں سے مسلمان مراد ہیں۔ تو حق تلاوت سے اُس کا صحیح پڑھنا اُس کے معانی پر غور کرنا خشوع و خضوع سے پڑھنا مراد ہے۔ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ یہی لوگ جن کی یہ صفتیں ہیں۔ وہی درحقیقت اُس کتاب

کے مومن ہیں. نہ کہ اُس کو بدلنے والے اور اُس کو چھوڑنے والے خیال رہے. کہ فعل کو جب مبتدا پر مسند کیا جائے. تو حصر کا فائدہ دیتا ہے. جیسے کہ اللہ یستھزئ بھم (روح) وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ اور جو کوئی اُس کتاب کا انکار کرے یا تو اس طرح کہ اُسے بدل دے یا اس طرح کہ اُس قرآن یا نبی آخرالزمان کا انکار کر دے جسکی اس کتاب میں بشارت ہے فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ. پس وہ لوگ بہت ٹوٹا پانے والے ہیں. کہ قرآن پر ایمان بھی اُن کو حاصل نہ ہوا اور اپنی کتاب سے بھی بے بہرہ ہو گئے اور دنیا میں مقتول قید جلا وطن ہوئے اور آخرت میں دوزخی بنے اگر اس قسم کے لوگ آپ کی نبوت کا انکار کریں تو آپ اس سے رنجیدہ نہ ہوں. کیونکہ یہ درحقیقت اہل کتاب ہی نہیں. اگرچہ بظاہر گدھے کی طرح کتاب اٹھائے ہوئے ہیں. خیال رہے کہ یہ آیت اگر قرآن اور مسلمانوں کے حق میں ہو تو اس اخیر جملہ کا مطلب یہ ہوگا. کہ جو قرآن کریم میں معنوی تحریف کرکے منکر ہو جاتے وہ بہت نقصان میں ہے. کہ اس کے قریب آکر نکل گیا. اور اس کے ماننے کا کوئی فائدہ نہ حاصل کر سکا. **خلاصہ تفسیر** اے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اگرچہ سب ہی بنی اسرائیل اپنے کو اہل کتاب کہتے ہیں. اور بظاہر سب ہی کتاب پڑھتے ہیں مگر درحقیقت کتاب انہیں کو ملی جنہیں ہم نے دی اور جنہوں نے اُس کو صحیح طور پر پڑھا اور اُس کی تلاوت کا حق ادا کیا اُس کے احکام پر عمل کیا اُس کے بتائے ہوئے راستے پر چلا جن میں یہ صفتیں ہیں. وہی اس کے سچے ماننے والے ہیں. اور انہیں کا اس پر صحیح ایمان ہے اور جو کہ زبان سے تو کتاب پڑھتا رہا اور عملاً اُس کا منکر ہوا وہ بڑا خسارہ والا تاجر ہے. کہ اُس نے بجائے نفع حاصل کرنے کے اپنی اصل پونجی بھی کھو دی. **دوسری تفسیر** جنہیں ہم نے قرآن کریم عطا فرمایا وہ اُس کی ایسی ہی تلاوت کرتے ہیں. جیسا کہ اُس کا حق ہے اور یہی حق تلاوت ادا کرنیوالے صحیح معنی میں اُس کے ماننے والے ہیں اور جو قرآن کریم کے ماننے کا دعوی کرے اور اپنے کو قرآنی یا اہل قرآن کہتا رہے اور درپردہ اُس کے احکام کا منکر ہو وہ سخت نقصان میں ہے. **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے. **پہلا فائدہ** قرآن پاک کا صحیح پڑھنا بھی باعث ثواب ہے جو لوگ کہتے ہیں. کہ اس کے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے عمل چاہیئے وہ سخت غلطی پر ہیں. **دوسرا فائدہ** قرآن پاک کا صحیح طور پر با ادب خشوع خضوع سے پڑھنا ایمان کی علامت ہے **تیسرا فائدہ** اُسی تلاوت سے فائدہ ہوگا جو نیک نیتی سے ایمان کیساتھ ہو. ایمان چھوڑ کر صرف تلاوت کرنا قرآن کریم کو اپنے خلاف گواہ بنانا ہے **چوتھا فائدہ** حق تلاوت میں بہت گفتگو ہے عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں. کہ حق تلاوت یہ ہے. کہ قرآن کریم کے حلال کو حلال جانے اُس کے محرمات کو حرام سمجھے اور اُس کے حروف کو صحیح ادا کرے غفلت سے غلط پڑھنا حرام ہے. اور عمداً غلط پڑھنا کفر ہے. کیونکہ یہ بھی قرآن کریم کی تحریف ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حق تلاوت یہ ہے. کہ جب جنت کا ذکر آئے تو رب سے مانگ لے اور جہنم کے ذکر میں اُس سے پناہ مانگے عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور علیہ السلام سے روایت کی کہ حق تلاوت یہ ہے. کہ اُس کے حلال کو حلال جانے اُس کے حرام کئے ہوئے کو حرام مانے اور جس طرح اُترا ہے. ویسے ہی پڑھے اُس کے کلمات میں تحریف نہ کرے اور اُس کے معنی کی غلط تاویل نہ کرے دنیا اور دل کی خاطر اُس کے احکام نہ چھپائے حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں. کہ حق تلاوت یہ ہے کہ قرآن کی ظاہر آیتوں پر عمل کرے متشابہات پر ایمان لائے اور جو آیت سمجھ میں نہ آئے وہ علماء سے پوچھ لے. اپنی عقل کو اُس میں دخل نہ دے (تفسیر عزیزی) **مسئلہ** تلاوت قرآن کے آداب یہ ہیں. کہ پڑھنے والا باوضو قبلہ رو ہو کر پڑھے سننے والے ادب اور تعظیم سے خاموش ہو کر سنیں جہاں لوگ کام کاج میں مشغول ہوں وہاں بلند آواز سے تلاوت نہ کی جائے پڑھنے والا ایک سو ہو کر اطمینان قلب سے پڑھے پڑھتے وقت حضور قلب اور خشوع خضوع ضروری ہے. اگر معانی جانتا ہو. تو اُن پر غور کرتا جائے ورنہ فقط عبارت قرآن پر ہی دھیان رکھے. کہ اُس کی عبارت بھی بہت لذیذ اور پُر لطف ہے. **مسئلہ** چند آدمی مل کر قرآن پاک بلند آواز سے نہ پڑھیں یا تو سب آہستہ پڑھیں اور یا ایک

بلند آواز سے پڑھے باقی سب سنیں۔ **مسئلہ** قرآن یاد کرنے والے بچوں پر یہ پابندیاں نہیں وہ سب مل کر بلند آواز سے پڑھ سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ تلاوت قرآن نہیں۔ بلکہ تعلیم قرآن ہے۔ اسی لئے شامی نے فرمایا کہ تلاوت کرتے وقت اعوذ پڑھے مگر استاد کو سنتے وقت نہ پڑھے کیونکہ اعوذ باللہ سنت تلاوت ہے نہ کہ سنت تعلیم (شامی باب صفت الصلوٰۃ) **پہلا اعتراض** اگر اس آیت میں کتاب سے قرآن شریف مراد ہو تو یہ آیت شان نزول کے مطابق نہ رہے گی۔ کیونکہ یہ حبشہ کے یہودیوں عیسائیوں کے بارے میں آئی **جواب**۔ چونکہ یہ یہود اور عیسائی قرآن کریم پر ایمان لا کر یا ایمان لانے کے لئے حاضر دربار ہوئے تھے اس لئے انہیں قرآن کریم مل چکا تھا۔ اور یہ اس کے صحیح معنی میں تلاوت کرنیوالے تھے۔ لہٰذا شان نزول سے اس کی کوئی مخالفت نہیں روایات میں تو یہ آیا ہے۔ کہ حضرت جعفر طیار نے جب نجاشی بادشاہ کے دربار میں سورۂ مریم اور سورہ طٰہٰ کی تلاوت کی تو خود بادشاہ اور اس کے درباری زار قطار رونے لگے۔ اسی طرح نجاشی کے قوم کے سترہ آدمی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور سے سورہ یٰسین سنکر بہت روئے جسکا ذکر اس آیت میں ہے۔ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ الخ۔ نیز یہ لوگ ادب اور تعظیم سے تلاوت قرآن کرنے لگے تھے **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو قرآن کریم کو بحق تلاوت پڑھے وہی مسلمان ہے۔ تو کیا قرآن پاک کو نہ پڑھنے والا کافر ہے **جواب**۔ اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ تلاوت قرآن اہل ایمان کی علامت ہے۔ اور شیٔ کے لئے علامت لازم نہیں دوسرے یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ تلاوت قرآن کرنیوالا کامل مومن ہے۔ اور یقیناً جو اس نعمت سے محروم ہے وہ ایمان کے کمال سے محروم تیسرے یہ کہ بیشک بغیر قرآن کریم پڑھے کوئی مومن ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ ایمان کے لئے کم از کم کلمہ پڑھنا ضروری ہے اور کلمہ طیبہ قرآن کی ہی آیتیں ہیں **تیسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ جو قرآن کا منکر ہو وہی کافر ہے۔ حالانکہ تم کہتے ہو کہ حدیث متواتر اور اجماع کا منکر بھی کافر ہے۔ جیسے کہ تعداد رکعات اور نصاب زکوٰۃ **جواب**۔ حدیث یقینی کا انکار بھی قرآن کریم کا ہی انکار ہے بلکہ اجماع مسلمین کا انکار بھی ایسا ہی ہے کیونکہ قرآن کریم میں اطاعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اطاعت اجماع مسلمین کا حکم دیا اُن میں سے ایک کا انکار ان آیتوں کا انکار ہے۔ قرآن نے فرمایا وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ الخ **تفسیر صوفیانہ** فرق ہے کتاب الٰہی کے خود حاصل کرنے میں اور رب کے عطا فرمانے میں اس آیت میں اُن قسمت والوں کا ذکر ہے جنہیں کتاب خود رب نے عطا فرمائی یعنی اولیاء کرام اُن کی صفت یہ ہے۔ کہ حق تلاوت وہی ادا کر سکتے ہیں قرآن کا حق تلاوت یہ ہے۔ کہ اُس کے پڑھتے وقت دل دنیا سے سرد ہو آواز میں درد ہو آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہو دنیا اور دنیاوی چیزوں سے ایک دم غافل ہو جائے فنا فی اللہ اور بقا باللہ کے مزے لے ایسا مردِ میدان اپنی تلاوت ہی سے اوروں پر بھی رنگ جما دیتا ہے۔ اور اس تلاوت کی برکت سے اوروں کو ایمان بخش دیتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہجرت سے پہلے اپنے دروازہ پر قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے تو مشرکین کی عورتیں اور بچے آپ کے گرد جمع ہو جاتے آپ روتے بھی تھے اور اُن سب کو رُلاتے بھی تھے۔ بہت لوگ اُن درد والی آوازوں سے قرآن پاک سن کر ایمان لے آتے تھے۔ اُن کی ہی یہ صفت ہے۔ کہ اُولٰٓئِكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ کہ وہ اس تلاوت کے ذریعہ لوگوں کو ایمان بخش دیتے ہیں۔ اور سب کو امن میں لے لیتے ہیں۔ لیکن وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ جو ایسے پاک بازوں سے قرآن پاک سن کر بھی کافر ہی رہے یا اُن کے ورد کا انکار کرے وہ بہت ٹوٹے والا ہے۔ اُن لوگوں نے تو اس تلاوت ہی کے ذریعہ روحانی بیماروں کے سوا جسمانی بیماروں کو بھی شفا بخشی۔ وہی قرآن کریم صحابہ کرام بھی پڑھتے تھے۔ کہ اُن کی ایک آیت سے سانپ کاٹے ہوئے کو بھی شفا مل جاتی تھی۔ اور وہی قرآن کریم ہم بھی پڑھتے ہیں۔ مگر اس میں یہ تاثیر نہیں۔ کیونکہ وہ تلاوت کا حق ادا کرتے تھے۔ اور ہم میں یہ نہیں رب تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم کو وہ دل و زبان عطا فرمائے جس سے حق تلاوت ادا ہو

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي

اے اولاد یعقوب کی یاد کرو تم نعمت میری جو کہ کی میں نے اوپر تمہارے اور تحقیق میں نے بزرگی دی تم کو اوپر

اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا احسان جو میں نے تم پر کیا اور وہ جو میں نے اُس زمانہ کے سب لوگوں پر تمہیں

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ

جہانوں کے اور ڈرو تم اُس دن سے نہ بدلہ دے گی کوئی جان کسی جان سے کسی چیز کا اور نہ قبول کیا جاوےگا

بڑائی دی اور ڈرو اُس دن سے کہ کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہوگی۔ اور نہ اُس کو کچھ لے کر چھوڑیں

مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اُس جان سے فدیہ اور نہ نفع دے گی اُسکو سفارش اور نہ وہ لوگ مدد کئے جائیں گے۔

اور نہ کافر کو کوئی سفارش نفع دے اور نہ اُن کی مدد ہو

**تعلّق** ۔اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** شروع سیپارہ میں بنی اسرائیل کو ندا دے کر اُن سے خطاب شروع فرمایا گیا تھا۔ اب بہت کچھ کلام فرما کر قریباً اُن سے خطاب ختم ہو رہا ہے۔ لہٰذا پھر بھی وہ ہی خطاب ہوا جیسے کہ ایک حسابدان اولاً اجمالی حساب بتا کر اُس کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ اور پھر تفصیل کے آخر میں دوبارہ اجمالی حساب کا ذکر کر دیتا ہے۔ یا منطقی دعویٰ قائم کر کے دلائل قائم کرتا ہے۔ اور پھر بطور نتیجہ اُس دعویٰ کو دھراتا ہے۔ تاکہ یاد رہے یہاں بھی پہلے فرمایا۔ کہ اے اسرائیلیو میری نعمت کو یاد کرو پھر اپنی نعمتیں اور اُن کی نافرمانیوں کی تفصیل وغیرہ بتا کر فرمایا۔ کہ اِن نعمتوں کو یاد رکھنا **دوسرا تعلق** پہلے کی آیتوں میں بتایا گیا تھا۔ کہ بنی اسرائیل نبی علیہ السلام کو اپنا تابع کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ سب سرداری کرنے کے عادی ہیں۔ اب اُن سے خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے۔ کہ تم کو جو کچھ نعمتیں اور بزرگیاں گذشتہ زمانہ میں ملی تھیں وہ انبیاء کرام کی غلامی کی برکت سے تھیں۔ اگر ان نعمتوں کو بقا چاہتے ہو تو اس نبی آخر الزمان کی اطاعت کرو **تیسرا تعلق** پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا۔ کہ یہود و نصاریٰ نے کتاب اللہ کو نخوت اور غرور اور نفسانیت و تعصّب کا ذریعہ بنا لیا جس سے وہ کتاب اُن کے لئے حجاب بن گئی اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اے اسرائیلیو تم اِنہیں انعامات کو یاد کر کے پھر اختیار کرو جسکی وجہ سے تمہیں پہلے بزرگی ملی تھی **تفسیر** يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ کہ کبھی خطاب عتاب کیلئے ہوتا ہے اور کبھی رحمت کے لئے یہاں بظاہر عتاب کا خطاب ہے۔ ممکن ہے۔ کہ رحمت کا خطاب ہو اسی لئے اُن کو برگزیدہ نبی یعقوب علیہ السلام کی طرف نسبت کر کے پکارا گیا یعنی اے اسرائیلیو اگرچہ تم بڑے مجرم اور خطا کار مگر چونکہ ہم ستار و غفار ہیں اور تم ہمارے ایک بندہ خاص کی اولاد ہو اگر اب بھی ہماری طرف رجوع کرو۔ تو ہماری رحمت تمہیں لینے کو تیار ہے اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ میری نعمت یاد کرو۔ ذکر سے یا تو اُن نعمتوں پر غور کرنا مراد ہے۔ یا اُن کا شکریہ ادا کرنا نعمت سے جنس نعمت مراد ہے۔ جو ساری نعمتوں کو شامل ہے الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ جو خاص تم پر ہم نے کیں۔ بنی اسرائیل کو کچھ تو عام نعمتیں ملی تھیں جن میں سارے انسان شریک ہیں۔ جیسے ہوا پانی روشنی وغیرہ اور کچھ خاص نعمتیں جیسے توریت اور اولاد انبیاء ہونا من سلویٰ کا اُترنا بحر قلزم کا ان کے لئے پھٹنا وغیرہ وغیرہ اور اُن سب سے اعلیٰ نعمت یہ تھی کہ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۔ کہ میں نے تم کو تمام جہانوں پر بزرگی عطا فرمائی تھی۔ اور بزرگوں کو چاہیئے کہ اپنی بزرگی قائم رکھنے کے لئے رب کی اطاعت زیادہ کریں۔ کیونکہ فرمانبرداری بقدر تنخواہ ہونی چاہیئے۔

اولاً تو اس احسان کے شکریہ میں تمہیں انسان بن کر رہنا چاہیئے اور اگر تم میں اتنی انسانیت باقی نہ رہی کہ منعم کا احسان مانو تو کم از کم
وَاتَّقُوْا یَوْمًا قیامت کے دن سے ہی خوف کر کے ایمان لے آؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تم دنیا میں عالمین کے سردار رہے اور وہاں سب کے
سامنے ذلیل و خوار ہو اور تمہاری رسوائی بر سر بازار ہو اور یہ نہ خیال کرنا کہ دنیا کی طرح کوئی کسی کو بچالے وہاں کے حالات ہی اور ہیں۔ اس دن میں
چار خصوصیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا لَا تَجْزِیْ میں دو احتمال ہیں۔ لازم ہو یا متعدی یعنی کوئی جان کسی کا بالکل
بدلہ نہ ہوگی۔ کہ اس کے عوض سزا بھگت لے یا کوئی کسی کی طرف سے کچھ بدلہ نہ دے گا۔ کہ اس کے حقوق اپنے اعمال وغیرہ سے ادا کر
دے کیونکہ اپنی اپنی پڑی ہوگی وَلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ اور نہ یہ ہو سکیگا۔ کہ مجرم سے کچھ فدیہ قبول کر لیا جائے جسسے وہ چھوٹ جائے
عدل کے لغوی معنی ہیں برابری اسی لئے انصاف کو عدل کہتے ہیں کہ اس میں ظالم مظلوم برابر کر دیا جاتا ہے دو طرفہ برابر وزن کو عدل کہتے ہیں فدیہ
کو اس لئے عدل کہتے ہیں کہ مال جرم کے برابر قرار دیا جاتا ہے فدیہ نہ قبول کرنیکی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ مجرم مال پیش کرے۔ مگر حاکم قبول نہ کرے
دوسرے یہ کہ مجرم کے پاس مال ہی نہ ہو قبول کیا جائے یہاں دوسری صورت مراد ہے کیونکہ وہاں کسی کے پاس مال نہ ہوگا خیال رہے کہ جزا اور عدل
میں اسجگہ فرق یہ ہے کہ جزا تو وہ جو دوسرا کسی کیطرف سے دے۔ عدل یہ کہ خود مجرم اپنا بدلہ ادا کرے وَلَا یَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ اور نہ یہ ہی ممکن ہو کہ کوئی کسی کافر کی سفارش
کر کے چھوڑائے ہم شفاعت کے معنی اور اسکے اقسام اس سے پہلی شفاعت کی آیت میں بتا چکے۔ شفاعت اور جزا میں یہ فرق ہے۔ کہ جزا کچھ دیکر چھوڑانے
کو کہتے ہیں۔ اور شفاعت صرف سفارش کر کے چھوڑانے کو وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ اور نہ کفار کی مدد کی جائے کہ کوئی شخص بزور انہیں
عذاب سے بچالے غرضکہ دنیا میں کسی کو چھوڑانے کے جو اسباب ہیں۔ کفار کیواسطے وہاں کام نہ آئیں گے۔ لہذا صرف اپنے اولاد نبی ہونے
پر بھروسہ کر کے ایمان اور اعمال سے بے نیاز ہو جانا بڑی ہی بے وقوفی ہے۔ **خلاصہ تفسیر** اے ہمارے بندہ خاص حضرت یعقوب
علیہ السلام کی ناسمجھ اولاد بنی اسرائیل اُن گذشتہ نعمتوں کو یاد رکھو۔ اور اُن کا شکریہ ادا کرو۔ جو ہم نے تم پر پہلے کی تھیں، کہ مصر سے فرعون
کو نکال کر تمہیں وہاں کا بادشاہ بنایا اُسے ڈبویا تمہیں بچایا تم پر من سلوی برسایا تم میں انبیاء اور اولیاء پیدا فرمائے وغیرہ وغیرہ اور سب سے
بڑھ کر یہ کہ ایک زمانہ میں تم کو تمام جہانوں پر بزرگی دے دی۔ کہ تمہارے پائے کا دنیا میں کوئی نہ پایا گیا۔ ذرا عقل سے کام لو تم نبی زادے
ہو۔ تم پر اطاعت الٰہی زیادہ لازم ہے۔ تاکہ تم دوسروں کیواسطے نمونہ بنو اور تم سے تمہارے باپ داداؤں کے نام روشن ہوں۔ کہ لوگ تمہیں
دیکھ کر کہیں کہ جن کی اولاد ایسی نیک ہے اُن کے باپ دادا کیسے نیک ہوں گے۔ تم اپنے ان فضائل سے غلط فائدے حاصل کرنے
کی کوشش نہ کرو یہ نہ سمجھو کہ نبی زادہ ہونے سے ایمان و اعمال کی ضرورت نہیں رہتی خیال رکھو کہ تمہارے سامنے قیامت کا دن ہے جس
دن نہ تو کوئی نفس کسی کافر نفس کا فدیہ بنے نہ اس کی طرف سے کوئی فدیہ ادا کرے اور نہ خود اس کافر سے کوئی فدیہ وغیرہ لے کر چھوڑا
جائے۔ نہ اس کافر کو کسی کی سفارش اور شفاعت نفع دے اور نہ اُن کی کسی او رقسم کی امداد کی جائے۔ لہذا اپنی پیغمبر زادگی کے دھوکے
میں نہ رہنا۔ بلکہ ہماری بارگاہ میں ایمان و اعمال لے کر آنا دنیا میں نالائق بیٹے کو ماں باپ منہ نہیں لگاتے اسی طرح آخرت میں انبیاء اور
اولیاء بے ایمان اولاد کو نہ پوچھیں گے۔ خیال رہے کہ دنیا میں مجرم چار صورتوں سے ہی حاکم کے عذاب سے چھوٹ سکتے ہیں۔ ایک
یہ کہ اس کے ولی وارث ضمانت دیکر چھوڑالیں یا اُس کی طرف سے جرمانہ وغیرہ بھگت دیں اس کی نفی لَا تَجْزِیْ کہہ کر فرمادی۔ دوسرے
یہ کہ خود مجرم اپنے مال سے جرمانہ یا فدیہ یا دیت دیکر چھوٹ جائے لَا یُقْبَلُ الخ کہہ کر اُس کی بھی نفی کر دی گئی۔ تیسرے یہ کہ مجرم کے
قرابت دار عزت و وقار والے ہوں وہ سفارش کر کے چھوڑا لائیں۔ لَا یَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ فرما کر اس سے بھی مایوس کر دیا۔ کہ اللہ کے پیارے کفار
کی شفاعت کرینگے ہی نہیں چوتھے یہ کہ مجرم کے جرگے اور قبیلے والے بڑے بہادر لوگ ہوں، وہ حکومت کی بغاوت کر کے اس پر غالب
آجائیں۔ اور مجرم کو بزور چھوڑالیں وَلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ فرما کر یہ امید بھی باقی نہ رکھی۔ اب چھٹکارے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں۔ کہ بندہ وفادار

بن کر رب کی بارگاہ میں حاضری دے اور اُس سے رحم کی درخواست کرے وہ بڑا غفورٌ الرحیم ہے مومن کے بڑے بڑے گناہ معاف فرما دیتا ہے۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** اولادِ نبی ہونا خدا کی بڑی نعمت ہے۔ سادات کرام دوسروں سے افضل ہیں بشرطیکہ مومن ہوں کیونکہ رب نے بنی اسرائیل کو اسی نسبت سے یاد فرمایا۔ کہ اے یعقوب علیہ السلام کی اولاد نیز ان بنی اسرائیل کو جو تمام جہاں پر افضلیت ملی تھی وہ محض اپنے اعمال سے نہ تھی۔ نیک اعمال تو بعض قبطیوں اور دوسری قوموں نے بھی کئے تھے بلکہ انکی افضلیت اولادِ انبیاء ہونے کی وجہ سے تھی دنیا میں حاکم کی اولاد کو دوسروں پر عزت حاصل ہوتی ہے۔ تو کیا انبیاء کی اولاد کو اوروں پر بزرگی حاصل نہ ہوگی۔ مگر خیال رہے کہ اس عظمت کے لئے ایمان ضروری ہے۔ **دوسرا فائدہ** اللہ کی نعمت کو یاد کرنا اُس کا چرچا کرنا بہت بہتر کام ہے بنی اسرائیل سے فرمایا گیا۔ کہ ہماری گذشتہ نعمتیں یاد کرو۔ اور اُن پر غور کرو۔ لہٰذا محفل میلاد شریف بہت بہتر کام ہے۔ کہ اس میں حضور کی آمد کا ذکر ہوتا ہے۔ جو کہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے **تیسرا فائدہ** بطور شکریہ اپنے اوصاف بتانا جائز ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ آدَمَ وغیرہ میں سارے انسانوں کا سردار ہوں یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر سے کہا تھا۔ کہ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ میں بڑا محافظ اور علم والا ہوں۔ یہاں بھی بنی اسرائیل کو اپنے اُن فضائل اور بزرگیوں کے ذکر کرنے کا حکم دیا گیا۔ جو رب نے انہیں عطا فرمائی تھیں ہاں فخریہ طور پر شیخی مارنے کیلئے بیان کرنا منع **چوتھا فائدہ** بڑوں کی اولاد کو چاہیئے۔ کہ بڑوں کے سے کام کرے علماء مشائخ سادات کو نیک اعمال نہایت ضروری ہیں۔ قانون داں اور سلطنت کے اراکین اگر قانون توڑیں تو بڑے مجرم ہیں۔ کیونکہ دوسرے انکی پیروی کریں گے۔ **پانچواں فائدہ** بغیر ایمان پیغمبر زادگی اور کوئی نیکی کام نہیں آسکتی مردے کو مقوی دوائیں بیکار ہیں۔ ایمان جان ہے۔ اور یہ چیزیں مقوی دوائیں اور غذائیں **پہلا اعتراض**۔ احسان جتانا عیب ہے۔ پھر رب نے احسان کیوں جتائے (آریہ) **جواب** طعنہ دینے دوسروں کو شرمندہ کرنے کے احسان جتانا واقعی عیب ہے۔ مگر اپنا حق احسانی ثابت کرنے اور دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنے کیلئے احسان جتانا بڑا وصف ہے جس سے دوسروں کی اصلاح ہے باپ نالائق بیٹے کو اپنی گذشتہ مہربانیاں یاد دلائے تاکہ وہ لائق ہو جائے عیب نہیں بلکہ کرم ہے یہاں بھی ایسا ہی ہے۔ نیز خالق و مخلوق کے احکام یکساں نہیں بندے کیلئے احسان جتانا اس لئے منع ہے۔ کہ وہ حقیقی محسن نہیں چونکہ حق تعالیٰ حقیقی محسن ہے۔ اس لئے اپنے احسان جتانا اُس کا حق ہے۔ **دوسرا اعتراض** کیا بنی اسرائیل پہلے زمانہ میں انبیاء کرام اور فرشتوں سے بھی افضل تھے کیونکہ یہاں فرمایا گیا ہے۔ کہ تم کو عالمین پر بزرگی دی اور عالمین میں یہ سب حضرات داخل ہیں **جواب** بعض بنی اسرائیل یعنی اُن کے انبیاء اور خاص اولیاء بیشک فرشتوں سے افضل تھے آیت کے یہ معنی نہیں ہیں۔ کہ سارے بنی اسرائیل سب سے افضل تھے۔ اور عالمین سے انبیاء کرام باستثناء عقلی علیحدہ ہیں۔ تو م بنی اسرائیل کو اسی لئے تو بزرگی ملی کہ وہ انبیاء کی اولاد ہیں پھر وہ انبیاء سے کیونکر افضل ہوں گے کہا جاتا ہے کہ ہر کام بسم اللہ سے شروع کرو۔ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ خود بسم اللہ کو بھی بسم اللہ سے شروع کر دیا کرتے ہیں۔ کہ حضور کے نام پر درود شریف پڑھو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خود درود شریف میں جو نام پاک آجائے اُس پر بھی درود شریف پڑھو۔ یا حضور علیہ السلام سارے انسانوں کے سردار ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ اپنے بھی سردار بھی ہیں۔ ایسے ہی ایسے ہی یہاں بھی ہے **تیسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ کوئی نفس کسی کا فدیہ نہ بنے گا۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار مسلمانوں کے فدیہ بنیں گے کہ مسلمان کے جہنم کی جگہ کافر سنبھالیں گے اور کافر کے جنتی مقام پر مسلمان قابض ہوگا۔ کیوں کہ ہر انسان کیلئے دو مقام تیار کئے گئے ہیں **جواب**۔ یہ چاروں حالتیں کفار کی ہیں مسلمان کیلئے فدیہ بھی شفاعت بھی اور باذن الٰہی بعض کی بعض کو مدد بھی ہے۔ **چوتھا اعتراض**۔ لَاتَجْزِیْ نَفْسٌ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا کہ کوئی نفس دوسرے کی طرف سے کچھ فدیہ ادا نہ کریگا۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے۔ کہ مقروض کی نیکیاں قرض خواہ کو دی جائینگی اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوں تو قرض خواہ کے گناہ اسے دیئے جائینگے

**جواب.** اس آیت کے معنی یہ ہیں. کہ کوئی کسی کی طرف سے بخوشی فدیہ نہ دیگا قرضخواہ اور مقروض کا معاملہ رب کے قانون سے ہوگا. نہ کہ اُس کی اپنی خوشی سے (روح البیان) **پانچواں اعتراض** اگر کافر کا مسلمان پر قرض رہ گیا تو کیا اُس کی نیکیاں بھی کافر کو دی جائینگی **جواب** نہیں بلکہ بقدر قرض کافر کے عذاب میں کچھ تخفیف کر دی جائے گی. اور اگر مسلمان کا کافر پر قرض رہ گیا تو کافر کا عذاب اور مسلمان کا ثواب بڑھا دیا جاویگا. **چھٹا اعتراض** یہاں فرمایا گیا. وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ اور کہیں فرمایا گیا. لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ کہیں فرمایا گیا وَلَا شَفَاعَةٌ اگلی دو آیتوں سے معلوم ہوا کہ کفار کیلئے شفاعت ہوگی مگر غیر مقبول اور غیر نافع اور پچھلی آیت سے معلوم ہوا کہ کفار کیلئے شفاعت ہوگی ہی نہیں ان میں مطابقت کیونکر ہو. اور اگر تینوں آیتوں کے یہ معنی ہیں کہ شفاعت ہوگی ہی نہیں تو مختلف عبارتوں سے اسکا کیوں ذکر کیا گیا **جواب** انبیاء کرام کی شفاعت دو قسم کی ہے ایک شفاعت عامہ دوسری خاصہ شفاعت عامہ میں بظاہر کفار بھی داخل ہونگے. مگر ان کے حق میں قبول نہ ہوگی اور نہ ان کیلئے نافع مثلاً وہ عرض کرینگے کہ اے اللہ مومنوں کو یا میری اطاعت کرنیوالوں کو بخش دے بعض کفار جو اپنے کو مومن اور انبیاء کرام کا مطیع سمجھے ہوئے تھے. وہ سمجھیں گے. کہ ہم بھی اس شفاعت میں داخل ہیں. لیکن اس کا اثر یہ ہوگا. کہ مومن بخشے جائیں گے. اور یہ لوگ محروم یہ شفاعت تو ہوئی. مگر ان کے حق میں غیر نافع اس کے لئے فرمایا گیا ہے. لَا يُقْبَلُ مِنْهَا. یا لَا تَنْفَعُهَا. رہی شفاعت خاصہ یعنی کسی خاص شخص کی شفاعت وہ کفار کے لئے ہوگی ہی نہیں اس کیلئے فرمایا گیا. وَلَا شَفَاعَةٌ بعض روایات میں آیا ہے. کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے چچا آذر کی شفاعت کریں گے. لیکن اُن کو نہایت بہترین طریقہ سے سمجھا کر آذر کو جہنم میں پہنچا دیا جائیگا. اس سمجھانے میں ابراہیم علیہ السلام کی اظہار شان ہوگی نہ کہ توہین اس روایت کی بنا پر لَا تُقْبَلُ مِنْهَا اور لَا تَنْفَعُهَا بھی شفاعت خاصہ کے متعلق ہیں غرضکہ شفاعت کا نہ ہونا اور حیثیت سے ہے اور قبول نہ ہونا دوسری حیثیت سے ہوگا. اس جواب پر نہایت غور کیا جائے بہت دقیق ہے. **تفسیر صوفیانہ** انسان کو دو چیزیں حاصل ہیں ایک نفس اور دوسری روح روح اور اسکے صفات گویا بنی اسرائیل ہیں. کیونکہ ان پر انبیاء کرام کی توجہ ہے اور نفس امارہ اور اُس کے صفات گویا کفار و مشرکین ہیں روح سے خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے. کہ اے روح و صفات روح تو ہماری گذشتہ نعمتوں کو یاد کر کہ تجھ کو عالم ارواح میں طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا گیا اور تجھ کو عالم مادیات عالم ظلمات وغیرہ بہت سے جہانوں پر بزرگی دی. اب تو صحبت اغیار میں اپنے کو خراب نہ کر لینا یہ نفس جو تجھے سبز باغ دکھا کر بہکانا چاہتا ہے. اس کے دھوکے میں نہ آنا. اگر تو اس کی اطاعت کر کے گمراہ ہو گئی تو نہ تو قیامت میں یہ تیری فدیہ بنے گی نہ تیری سفارش کر سکے. اور نہ اس سے تجھے کسی قسم کی مدد پہنچے اے پردیسی مسافر تیرے پاس دولت ایمانی ہے کہیں لٹ نہ جائے شعر

سونا پاس ہے سونا بن ہے سوتا زہر ہے اُٹھ پیارے — تو کہتا ہے میٹھی نیند ہے مت ہی تیری نرالی ہے

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ

اور جب آزمایا ابراہیم کو رب اُن کے نے ساتھ چند باتوں کے پس پورا کر دیا اُنہیں فرمایا تحقیق میں بنانے والا ہوں تم کو واسطے لوگوں کے پیشوا

اور جب ابراہیم کو اُسکے رب نے کچھ باتوں سے آزمایا. تو اُس نے وہ پوری کر دکھائیں فرمایا میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔

قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۲۴﴾

عرض کیا اور اولاد میری سے فرمایا نہ پائے گا عہد میرا ظالموں کو

عرض کی اور میری اولاد سے فرمایا میرا عہد ظالموں کو نہیں پہونچتا.

**تعلق.** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے. **پہلا تعلق** پہلے بنی اسرائیل کو رب سے ڈرنے اور نیک اعمال کرنے کی رغبت دی گئی. اور بتایا گیا. کہ نجات کے لئے فقط پیغمبر زادگی کافی نہیں. اب فرمایا جا رہا ہے. کہ تم سب کے جد امجد ابراہیم علیہ

السلام جن کی اولاد ہونے پر تم فخر کرتے ہو اُن کو بھی رب نے اتنی بزرگیاں اسی لئے دیں۔ کہ وہ اُس کے مطیع و فرمانبردار تھے۔ تم طاعت الٰہی سے کیونکر بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں بنی اسرائیل کو تقویٰ اور طہارت کا حکم دیا گیا۔ اب بتایا جا رہا ہے۔ کہ تم کو یہ صفات اسلام لانے پر حاصل ہوں گے کیونکہ اسلام میں وہ چیزیں موجود ہیں جو دین ابراہیمی میں تھیں جیسے حج۔ ختنہ اور خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا وغیرہ **تیسرا تعلق** بنی اسرائیل اپنے اولاد ابراہیمی ہونے کو نجات کیلئے کافی سمجھتے تھے۔ اس آیت میں بتایا گیا۔ کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا۔ کہ آپکی بعض اولاد ظالم بھی ہوگی۔ اور وہ دینی پیشوا نہ بن سکے گی۔ لہٰذا چونکہ تم ظالم ہو۔ تم لوگوں کے سردار تو کیا عذاب سے نجات بھی نہیں پا سکتے لہٰذا تمہیں چاہیئے کہ نبی آخر الزمان پر ایمان لاؤ۔ تاکہ تمہاری عظمت برقرار رہے **تفسیر وَاِذِ ابْتَلٰٓى** یہ لفظ بَلْوٌ یا بلاءٌ سے بنا ہے۔ اسکے لفظی معنی ہیں آفت یا جانچ۔ ابتلیٰ کے معنی ہیں مشقت میں ڈالا یا جانچا اور امتحان لیا۔ کبھی تو خود اپنی واقفیت کیلئے کس چیز کو جانچا جاتا ہے اور کبھی دوسروں پر اُس کی بُرائی بھلائی ظاہر کرنے کیلئے حق تعالیٰ کا امتحان یا جانچ دوسرے فائدے کیلئے ہے کیونکہ وہ خود تو ہر ایک کے سارے حال کا جاننے والا ہے۔ یہ جانچ صرف اسی لئے ہوتی ہے کہ جب اُس کو بزرگیاں دی جائیں تو دوسرا اعتراض نہ کر سکے لہٰذا پہلے جانچتے ہیں پھر انعامات سے نوازتے ہیں۔ **اِبْرٰهٖمَ** یہ لفظ سریانی ہے اس کے معنی ہیں۔ اب رحیم یعنی مہربان باپ چونکہ آپ بچوں پر بہت مہربان تھے نیز مہمان نوازی اور رحم و کرم میں آپ مشہور ہیں اس لئے آپ کو ابراہیم کہا جاتا ہے بعض روایت میں آیا ہے۔ کہ مسلمانوں کے جو چھوٹے بچے مر جاتے ہیں۔ اُن کی پرورش آپ اور آپکی بیوی حضرت سارہ بھی فرماتی ہیں۔ (تفسیر روح البیان) بعض لوگوں نے کہا ہے۔ کہ ابراہیم اصل میں ابرم تھا۔ جسکے معنی ہیں بزرگ چونکہ آپ بہت سے انبیاء کرام کے والد ہیں اور سارے دینوں میں آپکی عزت حتّٰی کہ مشرکین عرب بھی آپکی عظمت کرتے تھے۔ اس لئے آپ کا نام نامی ابراہیم ہوا **رَبُّهٗ** عام قرات میں رب کا ضمہ اور ابراہیم کا فتح ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام کی اُن کے رب نے آزمائش کی یا تو امامت عطا فرمانے سے پیشتر جیسا کہ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ سے معلوم ہوتا ہے اور یا اس کے بعد جیسا کہ بِكَلِمٰتٍ سے ظاہر ہے۔ مگر حضرت ابن عباس اور ابوحیوہ رضی اللہ عنہما کی قرأت میں ابراہیم کا رفع اور رب کا نصب ہے یعنی ابراہیم علیہ السلام نے چند دعائیں مانگ کر اپنے رب کی رحمت کا اندازہ کیا کہ وہ مجھ پر کتنا مہربان ہے رب نے اُن کی ساری دعائیں پوری فرمالیں (تفسیر کبیر) **بِكَلِمٰتٍ** یہ جمع کَلِمَةٌ کی ہے جس کے لفظی معنی ہیں۔ ایک بات اور کلمات بہت سی باتیں لیکن یہاں مضمون و احکام وغیرہ مراد ہیں جیسے وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ یا مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ نیز اس سے یا تو دعائیں مراد ہیں۔ یا چند مصیبتیں یا چند احکام یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کی رحمت کو چند دعاؤں سے آزمایا۔ یا رب نے ابراہیم علیہ السلام کو چند مصیبتوں سے آزمایا یا اُن کو سخت احکام سے آزمایا ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں تو یہ تھیں۔ کہ مولیٰ جنگل حرم کو شہر بنا دے وہاں کے باشندوں کو قسم قسم کے پھل دے یا نبی آخر الزماں کو ان میں پیدا فرما وغیرہ وغیرہ آپ پر بڑی مصیبتیں سات آئیں ۱۔ آفتاب اور چاند سے آزمائش ۲۔ سلطنت نمرودی کا مقابلہ ۳۔ بڑی عمر میں ختنہ ۴۔ آگ میں ڈالا جانا ۵۔ لاڈلے فرزند کا ذبح کرنا ۶۔ اللہ کی راہ میں ترک وطن کرنا ۷۔ اپنی پیاری بیوی اور اکلوتے فرزند کو بحکم الٰہی جنگل میں چھوڑ آنا جن میں سے اکثر عطاء امامت سے پہلے ہوئے احکام میں اختلاف ہے بعض نے فرمایا۔ کہ وہ ارکان حج تھے۔ بعض نے کہا دس اور بعض نے فرمایا تیس ۳۰ دس کی تفصیل یہ ہے۔ کہ اُن میں سے پانچ سر کے متعلق تھے کلی کرنا ناک میں پانی ڈالنا سر کی مانگ نکالنا مونچھیں کٹوانا اور مسواک کرنا پانچ باقی بدن میں ختنہ زیر ناف کے بال صاف کرنا بغل کے بال اکھیڑنا ناخن کٹوانا اور ڈھیلوں کے بعد پانی سے استنجا کرنا تیس ۳۰ کی تفصیل یہ ہے۔ کہ دس تو وہ جن کا ذکر سورہ براءت میں ہوا۔ توبہ ۱۔ عبادت ۲۔ حمد الٰہی ۳۔ سیاحت ۴۔ رکوع ۵۔ سجدہ ۶۔ اچھی باتوں کا حکم کرنا ۷۔ بُری باتوں سے روکنا ۸۔ اور حدود الٰہی کی نگہبانی کرنا ۹۔ اور خدا کو ہر وقت حاضر ناظر جاننا ۱۰۔ اور دس سورہ احزاب میں مذکور ہیں۔ اسلام ۱۔ ایمان ۲۔ اطاعت ۳۔ صبر ۴۔ عاجزی ۵۔ صدقہ ۶۔ روزہ ۷۔ شرمگاہ کی حفاظت ۸۔ اور ذکر کی حفاظت ۹۔

وقت[10] زبان سے ذکر الٰہی۔ اور دس سورہ مومنین اور سَأَلَ سَائِلٌ میں مذکور ہیں۔[1] قیامت کی تصدیق۔[2] نماز میں حضور قلبی[3] مستحبات کی پابندی بیکار باتوں سے پرہیز[5] زکوٰۃ بخوشی ادا کرنا[6] بیوی اور لونڈی کے سوا اوروں سے شرمگاہ کی حفاظت کرنا۔ وعدہ[7] پورا کرنا۔ امانت[8] کا پورا کرنا۔ مذاق[9] دل لگی سے پرہیز کرنا۔ سچی گواہی نہ چھپانا فَاَتَمَّهُنَّ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے ان سب مصیبتوں پر صبر کیا یا سارے احکام بخوشی ادا کیے اس لئے رب نے فرمایا۔ وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤى۔ یارب نے اُن کی ساری دعائیں پوری فرمائیں قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ رب نے فرمایا کہ ہم تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والے ہیں یا تو امامت سے نبوّت مراد ہے یا تمام لوگوں کا دینی پیشوا ہونا کہ تمام دنیا میں آپ کی عزت وعظمت ہو اور آپ کے بعد تمام شریعتوں میں آپ کے قوانین پر عمل رہے اور ہزارہا انبیاء کے آپ والد ماجد ہوں خیال رہے کہ امام اَمٌّ سے بنا جس کے معنی ہیں قصد کرنا۔ لغت میں ہر پیشوا کو امام کہہ دیتے ہیں خواہ وہ انسان ہو۔ یا اُس کا کوئی قول فعل یا کتاب اور خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر قرآن شریف میں آیا ہے۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ مگر اصطلاح میں دینی پیشوا کو امام کہتے ہیں۔ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا۔ کہ یہ کرم میری بعض اولاد پر بھی فرمانا ذرّیت یا ذرءٌ سے بنا جس کے معنی ہیں پیدا کرنا یا ذرٌّ سے جس کے معنی ہیں پھیلانا چھوٹی چیونٹی اور ریت کے ذرّوں کو بھی ذرّہ اس لئے کہتے ہیں۔ کہ وہ زمین میں پھیلے ہوتے ہیں۔ اصطلاح میں چھوٹی اولاد کو ذرّیت کہا جاتا ہے۔ اور کبھی چھوٹوں بڑوں سب پر بھی بولا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول کرتے ہوئے۔ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ فرمایا کہ ہمارا یہ وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچتا عہد سے وعدہ امامت مراد ہے۔ اگر امامت سے نبوّت مقصود ہو تو معنی یہ ہیں۔ کہ ہماری نبوّت فاسقوں کو نہ ملے گی۔ اور اگر دینی پیشوائی مراد ہو تو معنی یہ ہیں۔ کہ کفار دینی پیشوائی کے مستحق نہیں۔

**خلاصہ تفسیر**۔ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان یہود و نصاریٰ بلکہ سارے اُن کفار کو جو ابراہیم علیہ السلام کو اپنا آقا اور پیشوا سمجھتے ہیں فرما دو کہ تم طریقہ ابراہیمی پر نہیں وہ ہمارے نہایت فرمانبردار بندے تھے ہم نے انہیں کئی باتوں میں آزمایا وہ سچے نکلے بیٹے کی قربانی کا حکم دیا وہ تیار ہو گئے۔ ستارہ پرستوں کی محبت توڑنے بلکہ وطن چھوڑنے کو فرمایا انہوں نے ویسا ہی کر دکھایا کہ سب کو چھوڑ کر ملک شام میں آ بسے ریگستانِ عرب کو بسانے اور خانہ کعبہ بنانے کا حکم دیا فوراً اپنی بیوی ہاجرہ اور بیٹے اسمٰعیل کو وہاں بسا دیا اور خانہ کعبہ بنایا ایمان پر رہ کر نمرود کی آگ میں پڑنا منظور کیا اس کے علاوہ بہت سے ہمارے احکام نماز۔ زکوٰۃ ظاہری باطنی طہارت ختنہ وغیرہ بجالائے اس کے صلہ میں ہم نے اُن سے کہا کہ ہم تم کو تمام لوگوں کا پیشوا بنانا چاہتے ہیں۔ کہ تمام دینوں میں تمہارا چرچا رہے انبیاء تمہاری اولاد میں ہوں۔ قیامت تک تمہارے کعبہ کا حج ہوتا رہے دور و قریب سے اُس کی طرف گردنیں جھکتی رہیں لوگ تمہاری اور تمہارے بیٹے اسمٰعیل کی اور حضرت ہاجرہ کی نقل کر کے حاجی بنا کریں نبی آخر الزمان کی اُمّت اپنی نمازوں اور خطبوں میں اُس محبوب کے ساتھ تم پر بھی درود بھیجا کرے قیامت میں بھی تمہاری پیشوائی ظاہر ہو تو انہوں نے عرض کیا کہ مولیٰ میری اولاد میں بھی بابرکت لوگ پیدا کرنا تاکہ تیری فرمانبرداری ہمیشہ میرے خاندان میں رہے۔ ہم نے اُن کی دعا قبول فرماتے ہوئے کہا۔ کہ اچھا ہم سے اس کا وعدہ کرتے ہیں۔ لیکن اس اقرار و وعدہ میں تمہاری وہ اولاد شامل نہیں جو بدکار ہو اُن کو یہ برکت نصیب نہ ہو گی لہٰذا اے اسرائیلیو تم کو لازم ہے۔ کہ اپنے جدامجد کی پیروی کرو اور ان نبی آخر الزمان پر ایمان لاؤ جن کے لئے انہوں نے دعائیں مانگیں اور یہ مت سمجھو کہ نبوّت بنی اسحاق کے لئے ہی خاص ہے۔ بنی اسمٰعیل بھی انہیں کی اولاد میں ہیں اور وہ بھی اس وعدہ میں داخل ہیں۔

**ابراہیم علیہ السلام کے حالات**:۔ ابراہیم علیہ السلام تارخ ابن ناخور کے فرزند ہیں۔ آپکا نام ابراہیم اور آپ لقب ابوالضیفان ہے آپ کا نسب یہ ہے۔ ابراہیم ابن تارخ ابن ناخور ابن ساروغ ابن رعو ابن فالغ ابن عابر ابن شالح ابن ارفخشذ ابن سام ابن نوح (تفسیر حقانی)، آپ کی پیدائش طوفان نوحی سے ستره سو سال بعد اور عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً دو ہزار تین سو (۲۳۰۰) سال پیشتر شہر بابل سے قریب

قصبہ کوثی میں ہوئی (عزیزی) خزائن عرفان میں فرمایا۔ کہ آپ کی پیدائش اہواز کے علاقہ مقام سوس میں ہوئی۔ آپ بچپن ہی سے بہت عقلمند اور ہونہار تھے۔ اپنی قوم سے توحید الٰہی پر مناظرہ کرتے تھے یہاں تک کہ ایک بار آپ نے بتوں کو بھی توڑ دیا نمرود نے آپ کو آگ میں ڈالا مگر رب نے آپ کو صحیح سلامت رکھا۔ تب آپ بحکم الٰہی اپنا وطن ترک کر کے حران وہاں سے شام اور فلسطین میں ہجرت کر گئے۔ اور فلسطین ہی کو اپنا جائے قیام بنایا اور آپ نے جانی اور مالی بہت سی قربانیاں کیں۔ چار ہی چیزوں سے امتحان ہو سکتا ہے۔ جان۔ مال۔ فرزند اور وطن اپنے جان کو آگ میں ڈالا مال و وطن کو خیر باد کہی پیارے بچے اور بیوی کو ایک دفعہ تو جنگل میں چھوڑا اور ایک بار اُن کی قربانی کرنے کو تیار ہو گئے (۸۰) اسّی برس کی عمر میں ختنہ کا حکم ملا اُسی وقت گھر سے تیشہ لے کر خود اپنا ختنہ کر لیا۔ وحی آئی۔ کہ اے ابراہیم تم نے اس کام میں جلدی کی۔ عرض کیا۔ کہ مولے تیری اطاعت میں شتابی منظور تھی۔

**ابراہیم علیہ السلام کے اوّلیات۔** سب سے پہلے آپ[1] ہی نے اپنا اور اپنی اولاد کا ختنہ کیا۔ آپ سے پہلے بغیر ختنہ شدہ پیدا ہوتے تھے۔ ہمارے حضور علیہ السلام بھی ختنہ شدہ پیدا ہوئے۔ سب سے پہلے آپ[2] ہی کے بال سفید ہوئے۔ پہلے آپ[3] ہی نے ناخن اور مونچھ کٹوانے اور زیر ناف کے بال دُور کرنے کو رواج دیا۔ کہ آپ کے دین میں یہ باتیں فرض تھیں اور ہمارے ہاں سنّت پہلے آپ[4] ہی نے سلا ہُوا پاجامہ پہنا پہلے آپ[5] ہی نے بالوں میں خضاب لگایا۔ پہلے آپ[6] ہی نے منبر بنایا۔ اور اُس پر خطبہ پڑھا۔ پہلے آپ[7] ہی نے ہاتھ میں عصا لیا۔ پہلے آپ[8] ہی نے راہ خدا میں جہاد کیا۔ جب کہ رومی کافر آپ کے بھتیجے لوط علیہ السلام کو قید کر کے لے گئے۔ آپ نے اُن پر جہاد کر کے انہیں چھوڑایا۔ پہلے[9] آپ ہی نے مہمان نوازی کی۔ کہ بغیر مہمان کبھی ناشتہ بھی نہ کیا اور مہمان کی تلاش میں چار چار کوس نکل جاتے تھے۔ پہلے[10] آپ ہی کو بہت مال اور خدام دیئے گئے۔ پہلے[11] آپ ہی نے ثرید پکایا۔ (شوربے میں پکی ہوئی روٹی) پہلے[12] آپ ہی نے شیرمال پار اٹھے پکوا کر مہمانوں کو کھلائے۔ پہلے[13] آپ ہی نے معانقہ کیا (گلے ملنا) آپ سے پہلے سجدہ تحیتہ کا رواج تھا۔

**ابراہیم علیہ السلام کے فضائل** آپ[1] ہی اپنے مابعد سارے پیغمبروں کے والد ہیں۔ ہر آسمانی[2] دین میں آپ ہی کی پیروی اور اطاعت ہے۔ ہر دین[3] والے آپ ہی کی تعظیم کرتے ہیں آپ[4] ہی کی یادگار قربانی ہے۔ آپ[5] ہی کی یادگار حج کے ارکان ہیں۔ آپ[6] ہی خانہ کعبہ کی پہلی تعمیر کرنیوالے ہیں۔ یعنی اُسے گھر کی شکل میں بنانے والے جس کا ذکر اگلی آیت میں آنیوالا ہے جس[7] پتھر پر کھڑے ہو کر آپ نے خانہ کعبہ بنایا اُس کی طرف قیام اور سجدے ہونے لگے۔ یعنی مقام ابراہیم جس کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے۔ قیامت[8] میں سب سے پہلے آپ ہی کو لباس فاخرہ عطا ہو گا۔ اُس کے فوراً بعد ہمارے حضور علیہ السلام کو ایک[9] دفعہ آپ کے زمانہ میں قحط سالی ہوئی غلہ[10] کہیں میسر نہ ہوتا تھا۔ آپ نے بوریوں میں سرخ ریت بھروا کر منگوا لیا۔ جب کھولا گیا تو سُرخ گیہوں تھے۔ جب اُسے بویا گیا تو اُسکے درختوں میں جڑ سے اوپر تک بالیاں لگیں۔ ایک[11] دفعہ کفار نے آپ پر دو شیر چھوڑے۔ شیروں نے آپ کو سجدہ کیا اور آپ کے قدم پاک چاٹنا شروع کر دیئے۔ امام[12] احمد نے اپنی مسند میں اور حاکم اور بیہقی وغیرہ محدثین نے نقل کیا۔ کہ مسلمانوں کے مُردہ بچوں کی آپ اور حضرت سارہ جنت میں پرورش کرتے ہیں (تفسیر عزیزی)

**ابراہیمی سنتوں کے فائدے اور احکام۔** ہم تفسیر میں عرض کر چکے ہیں۔ کہ بعض مفسرین نے فرمایا کہ کلمات سے دس چیزیں مراد ہیں۔ جو آپ پر واجب تھیں اور ہمارے لئے سنت کلی کرنا۔ ناک میں پانی ڈالنا۔ سر میں مانگ نکالنا مونچھیں کٹوانا مسواک کرنا ختنہ کرنا۔ ناف کے نیچے کے بال صاف کرنا بغل کے بال اکھیڑنا۔ ناخن کٹوانا اور پانی سے استنجا کرنا۔ اِن کے فائدوں کی پوری تفصیل ہماری کتاب اسلامی زندگی میں دیکھو۔ یہاں اجمالاً کچھ عرض کئے جاتے ہیں۔ اولاً تو سمجھنا چاہئیے کہ سرکاری چیز پر سرکاری نشان ہوتے ہیں۔ فوجیوں پر سرکاری وردی اور سرکاری گھوڑوں پر شاہی مہر ہوتی ہے مومن سلطنت الٰہیہ کا نوکر ہے۔ چاہیئے کہ اُس کی یہی وردی علیحدہ ہو۔ یہ دس باتیں شاہی

پیٹی ورد ی ہیں۔ ان کے فوائد حسب ذیل ہیں۔ **کُلّی** کھانے سے پہلے اور اُس کے بعد اور اُس کے علاوہ بھی کلی کرنا نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ اگر کھانے میں دانت کا میل شامل ہو جائے۔ تو تندرستی کو مضر ہے۔ نیز اس میل سے منہ میں بو بھی آتی ہے جس سے لوگ نفرت کرتے ہیں۔ ان سب کا علاج کلی ہے **مسواک** دانتوں کی ریخوں میں میل جمع ہو کر زہریلا مادہ بن جاتا ہے۔ اگر وہ دور نہ کیا جائے تو مسوڑھوں سے خون یا پیپ بہنے لگتا ہے۔ اس کے لئے مسواک بڑی مفید چیز ہے مسواک بہت سی بیماریوں کو مفید ہے۔ اس سے ہاضمہ درست رہتا ہے۔ آنکھیں خراب نہیں ہوتیں گندہ وہنی اور منہ کے امراض کو دور کرتی ہے۔ جانکنی میں آسانی ہوتی ہے وغیرہ مگر چاہیئے کہ مسواک پیلو یا کسی کڑوے درخت کی ہو پھل پھول والے درخت کی نہ ہو۔ ایک بالشت سے زیادہ نہ ہو **ناک میں پانی لینا** دماغ کو صاف کرتا ہے۔ اسی لئے وضو کرنیوالے لوگ دیوانے کم ہوتے ہیں۔ مگر چاہیئے یہ کہ اگر روزہ نہ ہو۔ تو بالسنہ تک چڑھائے **مونچھ کٹوانا** اس قدر مونچھ کٹوانا سنت ہے جس سے ہونٹ کا پورا کنارہ کھل جائے کہ کھانے اور پانی میں اس کے بال نہ ڈوبیں ان باتوں میں زہریلا اثر ہوتا ہے۔ اگر کھانا یا پانی ان سے لگ کر جائیگا۔ تو بیماری پیدا ہوگی۔ مونچھ منڈوانا منع ہے کیونکہ اس سے ضعف باہ پیدا ہوتا ہے مونچھوں کے کنارے کاٹنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ نہ تو اس سے منہ ڈھکتا ہے۔ اور نہ وہ کھانے میں ڈوبتی ہیں۔ لمبی مونچھ والوں کو سگریٹ پینا ناک صاف کرنا کچھ کھانا پینا وبال ہوتا ہے۔ **داڑھی** ایک مشت رکھنا سنت ہے اور مشت سے زیادہ کاٹنا بہتر ہے مرد کی داڑھی عورت کے سر کے بال کی طرح چہرے کی زینت ہے۔ داڑھی مقوی باہ بھی ہے چھوٹے بچوں اور عورتوں اور خصی انسان کی داڑھی نہیں ہوتی اچھے بھلے آدمی کے خصیے نکال لئے جائیں داڑھی جھڑ جاتی ہے۔ داڑھی والوں کی اولاد بمقابلہ داڑھی منڈوں کے زیادہ ہوتی ہے۔ اور قوی بھی۔

**ناخن کٹوانا** بھی سنت ہے۔ کیونکہ ناخن کا میل بھی زہریلا اثر رکھتا ہے۔ اگر کھانے میں مل کر جائیگا۔ بیمار کردے گا۔ جو شخص کہ جمعرات کے دن عصر کے بعد ناخن اس طرح کاٹے کہ داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے شروع کر کے چھنگلیا پر ختم کرے پھر بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے شروع کر کے انگوٹھے پر ختم کرے پھر داہنا انگوٹھا بھی کاٹ لے اُسکے بعد داہنے پاؤں کی چھنگلیہ سے شروع کر کے ترتیب وار بائیں پاؤں کی چھنگلیہ پر ختم کردے تو انشاء اللہ تنگدستی دینوی پریشانی اور آنکھ کی خرابی سے محفوظ رہیگا (از روح البیان و شامی) **ختنہ** بھی پیشاب وغیرہ کی بہت سی بیماریوں کا علاج ہے قوت باہ کیلئے مفید ہے مختنوں کی اولاد قوی اور اُسکی بیوی پاکدامن رہیگی روح البیان وغیرہ میں ہے کہ بہتر یہ ہے۔ کہ پیدائش سے ساتویں روز عقیقہ کیساتھ ختنہ بھی کرا دیا جائے۔ اور ۷ اور ۱۰ سال کے درمیانی عمر میں تو ضروری کرا دیا جائے امام حسنؓ فرماتے ہیں۔ کہ بڈھے نو مسلم کا ختنہ ضروری نہیں دیگر علماء نے فرمایا۔ کہ بہتر یہ ہے۔ کہ اُس کا نکاح کسی ایسی عورت سے کرا دیا جائے جو ختنہ کر سکے اور بعد نکاح وہ اُس کا ختنہ کردے۔ تفسیر عزیزی نے فرمایا۔ کہ بیہقی میں ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے اسحاق علیہ السلام کا ختنہ پیدائش سے ساتویں دن اور حضرت اسماعیل کا ختنہ تیرھویں سال کرایا اور حضور علیہ السلام نے امام حسن و حسین کا ختنہ ساتویں روز کرایا **موئے زیر ناف** کا صاف کرنا آٹھویں دن یا پندرھویں دن یا زیادہ سے زیادہ چالیسویں روز ضروری ہے۔ اس جگہ بال رہنے سے خارش پیدا ہوتی ہے۔ اور باہ کمزور پڑتی ہے **مانگ نکالنا** یا تو مرد سر کے کل بال رکھے یا کل کٹوائے بعض کا کٹوانا اور بعض رکھنا منع ہے۔ جیسے انگریزی بال اور پان پتے حضور علیہ السلام کے بال شریف اکثر تا بگوش اور کبھی تا بدوش ہوتے تھے جس کے بال ہوں وہ انہیں پراگندہ نہ رکھے۔ کہ اس سے نیستی آتی ہے۔ بلکہ اُن کو درست رکھے۔ اور بیچ سر کے مانگ نکالنا سنت ہے بعض عورتیں جو دائیں بائیں مانگ نکالتی ہیں وہ سنت کے خلاف ہے **بغل کے بال** مونڈنا بھی جائز مگر اکھیڑنا سنت ہے۔ اور ناک کے بالوں کا کٹوانا بہتر اور اکھیڑنا منع کیونکہ اس سے بیماری پیدا ہوتی ہے۔ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** انبیاء کرام نبوت سے پہلے اور اس کے بعد گناہ کبیرہ اور حقیر حرکات سے معصوم ہیں۔ کیونکہ فاسق ظالم ہے اور ظالم کو نبوت نہیں مل سکتی **دوسرا فائدہ** کافر مسلمانوں کا دینی پیشوا نہیں بن سکتا۔ کیونکہ کافر ظالم ہے اور ظالم امامت کا حقدار نہیں خیال رہے

کہ چونکہ نبوت بڑا درجہ ہے۔ اس لئے وہاں فسق سے معصوم ہونا بھی ضروری دیگر امامتوں میں یہ پابندی نہیں **تیسرا فائدہ** رب تعالیٰ کی اکثر نعمتیں محنتوں کے بعد ملتی ہیں۔ **چوتھا فائدہ** ابراہیم علیہ السلام امتوں بلکہ پیغمبروں کے بھی امام ہیں۔ کہ سارے پیغمبر اپنے ابراہیمی ہونے پر فخر کرتے رہے **پہلا اعتراض** اگر ظالم نبی نہیں ہوسکتا تو خود انبیاء نے اپنے کو ظالم کیوں کہا۔ یونس علیہ السلام نے عرض کیا۔ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ آدم علیہ السلام نے عرض کیا۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا۔ اگر انہوں نے صحیح کہا تو اُن کا گناہ ثابت ہوا۔ اور اگر غلط کہا تو جھوٹ ہوا۔ اور یہ بھی گناہ **جواب**۔ یہاں ظلم سے مراد لغزشیں اور خطائیں ہیں بڑے لوگ عاجزی اور استغفار کے موقعہ پا اپنی بھول چوک کو بھی ظلم کہہ دیتے ہیں۔ اس کی پوری بحث ہم آدم علیہ السلام کے واقعہ میں عصمت انبیاء کے موقعہ پر کر چکے۔

**دوسرا اعتراض** اگر ابراہیم علیہ السلام سارے جہان کے امام ہیں۔ تو وہ حضور علیہ السلام کے برابر بلکہ اُن سے بڑھ گئے کیونکہ اُن کی دعوت بھی عام ہوگئی۔ پھر تم حضور علیہ السلام کو سید المرسلین کیوں کہتے ہو۔ **جواب**۔ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا لِلنَّاسِ اِمَامًا حضور علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا۔ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا جس سے معلوم ہوا۔ کہ وہ تو لوگوں کے اور حضور علیہ السلام ملائکہ اور جنات وغیرہ ساری خلق کے وہ تو امام یعنی پیشوا ہیں۔ اور حضور نذیر یعنی نبی ہیں لہذا حضور کی دعوت بہت عام ہے۔ دوسرے یہ کہ ابراہیم سارے لوگوں کے امام ہیں نہ کہ نبی اور حضور علیہ السلام تمام جہانوں کے نبی یعنی سارے جہان پر حضور کا کلمہ پڑھنا لازم ہے۔ اور تمام دینوں کا دین ابراہیمی کے موافق ہونا اُس کے حقانیت کی دلیل ہے اسی لئے بعد کے تمام پیغمبر کا دین دینِ ابراہیمی کے موافق ہوا۔ بلا تشبیہ یوں سمجھو۔ کہ ہم جس کو نماز کا امام بنائیں اُس کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کہ ہم اُس کی سی اور اُس کے ساتھ نماز پڑھیں گے نہ یہ کہ اُس کے اُمتی بن جائیں **تیسرا اعتراض** جب سارے آسمانی دین ملت ابراہیمی کے موافق ہیں تو اُن میں اختلاف کیوں ہے **جواب**۔ کلی قوانین میں اُس کے موافق ہیں جزئیات میں اختلاف جیسے صاحبین حنفی ہیں۔ مگر کبھی مسائل میں امام ابوحنیفہ کی مخالفت بھی کرتے ہیں یا جیسے سارے یونانی طبیب بوعلی سینا کے پیرو ہیں۔ مگر اُن کے آپس کے طریقہ علاج مختلف۔ اس کے یہی معنی ہیں۔ کہ قواعد اور قوانین میں سب اُن کے تابع اور جزئیات میں اختلاف اور پھر اُن کے جزئیات بھی قوانین کے موافق رہتے ہیں۔ **چوتھا اعتراض** اگر ابراہیم علیہ السلام نبیوں کے بھی امام ہیں۔ تو سب نبی اُن کے اُمتی بن گئے۔ حالانکہ تم کہتے ہو۔ کہ حضور علیہ السلام نبی الانبیاء ہیں۔ نیز قرآن کریم فرماتا ہے۔ کہ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا یعنی اے نبی فرما دو۔ کہ ہم ملت ابراہیمی کی پیروی کرتے ہیں **جواب**۔ اس کا جواب دوسرے اعتراض کے جواب میں گذر گیا۔ یہاں اتباع کے صرف یہ معنی ہیں۔ کہ ہمارے احکام اُن کے موافق ہوں خلاف نہ ہوں جیسے کہ آخری بادشاہ اگلے بادشاہوں کے قوانین سلطنت باقی رکھتا ہے۔ اس سے یہ آخری بادشاہ اگلوں کا رعایا نہ بن گیا۔ بلکہ اس نے طریقہ حکومت میں اُن کی موافقت کی **پانچواں اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کی خلافت صحیح نہیں۔ کیونکہ یہ حضرات اولاً شرک میں مبتلا تھے۔ بعد میں مومن ہوئے۔ اور شرک بڑا ظلم ہے۔ اور مشرک بڑا ظالم جو کبھی بھی ظالم رہ چکا ہو امام نہ بننا چاہیئے **جواب**۔ اس کے دو جواب ہیں ایک الزامی دوسرا تحقیقی۔ الزامی یہ ہے کہ پھر خلافت مرتضوی کی بھی خیر نہیں۔ کیونکہ وہ بھی پیدائشی مسلم نہ تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں مصرع سبقتکم الی الاسلام طراً۔ یعنی میں تم سب سے پہلے اسلام لایا اور اسلام وہ لاتا ہے۔ جو پہلے سے مسلمان نہ ہو جواب تحقیقی یہ ہے۔ کہ نبوت کے لئے معصوم ہونا ضروری ہے۔ کہ کبھی بھی نبی سے شرک کفر اور گناہ وغیرہ صادر نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ نبی کی اطاعت اور اسکی تعظیم بہر حال لازم ہے۔ مگر خلافت و امامت وغیرہ کے لئے فی الحال فاسق نہ ہونا کافی۔ لہذا جو شخص پہلے فاسق یا کافر ہو اور پھر مسلمان متقی پرہیزگار بن جائے تو خلیفہ بن سکتا ہے۔ کیونکہ خلیفہ کی اطاعت بہر حال لازم نہیں۔ بلکہ اگر خلاف شرع حکم

دے۔ تو اُس کی مخالفت ضروری روافض کی معتبر کتاب نہج البلاغۃ میں سیدنا مولیٰ علی کا فرمان موجود ہے۔ کہ لَابُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِيْرٍ بَرٍّ اَوْ فَاجِرٍ لوگوں کے لئے ایک امیر ضروری ہے۔ چاہے نیک ہو یا فاجر فاسق اس قول کے مطابق تو فاسق فاجر بھی امیر بن سکتا ہے۔ افسوس ہے۔ کہ شیعہ مخالفت شیخین میں قرآن کریم سے بھی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ کہ یہ تو توبہ کرنیوالے کو فاجر و فاسق ہی کہتے ہیں۔ مگر قرآن فرماتا ہے۔ اُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ یعنی رب تعالیٰ توبہ کرنیوالوں کے گناہوں کو نیکیاں بنا دیتا ہے۔ **تفسیر صوفیانہ** رب تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا روحانی درجات طے کرنے کا امتحان لیا۔ کہ انہیں فرمایا۔ کہ تم صبر تسلیم توکل اور رضا وغیرہ پر سوار ہو کر قلب سِرّ۔ روح خفا وحدت احوال اور مقامات کے درجات طے کرو۔ الی اللہ اور فی اللہ کے راستہ کو طے کر کے منزل فنا تک پہنچے تب الطاف ربانی نے اُن پر توجہ فرمائی اور فرمایا۔ کہ ہم تم کو فنا کے بعد بقا اور حق سے خلق کی طرف رجوع عطا فرمائیں گے۔ تاکہ آپ خلق کے امام بنیں اور ان کو اسی راستہ پر چلنا سکھائیں۔ اور وہ سب آپکی پیروی کر کے ہم تک پہنچیں تب آپ نے عرض کیا۔ کہ مولا میری اولاد سے بھی بعض کو درجہ امامت عطا فرمانا فرمان الٰہی ہوا کہ اُن میں سے بعض تمہاری اقتدا چھوڑ کر ظالم ہو جائیں گے۔ اور ہماری خلافت اور امامت ظالموں کو نہیں ملتی (ابن عربی) راہ تصوف میں ابراہیم علیہ السلام امام الائمہ ہیں۔ اور یہ راستہ بغیر امام طے ہونا محال مولانا فرماتے ہیں۔

چوں گرفتی پیر ہیں تسلیم شو ہم چو موسےٰ زیر حکم خضر رو

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ

اور جبکہ بنایا ہم نے اس گھر کو جائے رجوع واسطے لوگوں کے اور امن اور بناؤ تم جائے قیام سے ابراھیم کی

اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کیلئے مرجع اور امان بنایا اور ابراھیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو

مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ

جائے نماز اور عہد لیا ہم نے طرف ابراہیم اور اسمٰعیل کی اس کا کہ پاک رکھو تم میرا گھر واسطے طواف والوں اور

نماز کا مقام بناؤ۔ اور ہم نے تاکید فرمائی۔ ابراہیم و اسمٰعیل کو کہ میرا گھر خوب ستھرا کرو۔ طواف والوں اور

الْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

اعتکاف والوں اور رکوع والوں اور سجدہ والوں کے

اعتکاف والوں اور رکوع سجود والوں کے لئے

**تعلق۔** اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے پہلا تعلق پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا۔ کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بہت سے احکام کا مکلف کیا جن پر انہوں نے بخوشی عمل کیا اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اُن کو بیت اللہ شریف کے خدمت جیسے اہم کام کی بھی تکلیف دی گئی جو انہوں نے برداشت کر لی۔ **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں ابراہیم علیہ السلام کی امامت کا ذکر تھا۔ اب اُس کا ثبوت دیا جا رہا ہے۔ کہ اُن کی امامت عامہ کا ظہور اس طرح ہو رہا ہے۔ کہ اُن کے بنائے ہوئے گھر کی طرف سب کا رجوع ہے۔ اور جس پتھر پر انہوں نے قدم رکھ دیا ہے یعنی مقام ابراہیم وہ بھی قیامت تک کے لئے معظم ہے **تیسرا تعلق** پہلے فرمایا گیا تھا۔ کہ ہم نے ابراہیم کو کئی باتوں میں آزمایا۔ تو انہیں پورا پایا دیگر باتوں کو تو اہل

کتاب بھی مانتے تھے مگر تعمیر کعبہ اور اُس کا حج ہونا اس کے وہ منکر تھے اور کہتے تھے کہ نہ تو حج طریقہ ابراہیمی ہے اور نہ کعبہ اُن کی تعمیر بلکہ حج مشرکانہ رسم ہے جس کو محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے ملک وقوم کی محبت میں باقی رکھا ہے۔ اس آیت میں اُن کے اس خیال باطل کی تردید ہے۔ کہ ہم ہی نے ابراہیم سے کعبہ بنوایا اور ہم ہی نے حج کے احکام مقرر فرمائے **شان نزول** اس آیت کا ایک جملہ یعنی وَاتَّخِذُوْا سے مُصَلًّی تک کا شان نزول یہ ہے۔ کہ بار حضور علیہ السلام نے عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر وہ پتھر دکھایا جس کا نام مقام ابراہیم ہے۔ حضرت عمر نے عرض کیا۔ کہ جب یہ اتنا معظم پتھر ہے تو ہم اسے مصلی کیوں نہ بنالیں یعنی اس کے سامنے کھڑے ہو کر کعبہ کو رخ کر کے نماز کیوں نہ پڑھیں حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ مجھے اس کا حکم نہیں دیا گیا۔ تب آفتاب ڈوبنے سے پیشتر ہی یہ آیت کریمہ آگئی (تفسیر مدارک واحمدی) لہٰذا یہ آیت اُن آیتوں میں سے ہے جو کہ حضرت عمر کی رائے کے موافق اُتریں۔

**تفسیر وَاِذْ جَعَلْنَا**۔ یہاں ایک فعل پوشیدہ ہے۔ یعنی اے نبی علیہ السلام یہ واقعہ یاد کرو یا ان لوگوں کو بتاؤ یا اے لوگو یہ واقعہ یاد کرو۔ جبکہ ہم نے بنایا خیال رہے کہ بیت اللہ کا زیارت گاہ ہونا۔ آدم علیہ السلام کے وقت سے ہے۔ جیسے کہ خلاصہ تفسیر میں انشاء اللہ معلوم ہوگا۔ مگر چونکہ اس مقام پر گھر کی شکل میں عمارت بنانے والے ابراہیم علیہ السلام ہی ہیں۔ اس لئے اس کا بیت کی شکل میں مرجع خلائق ہونا اُن کے وقت سے ہوا۔ لہٰذا قصۂ ابراہیمی میں یہ واقعہ بیان کیا گیا اَلْبَیْتَ یہ بَیْتُوْتَۃٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ رات گزارنا بیت وہ کوٹھڑی یا عمارت جس میں رات گزاری جائے۔ اب بیت ہر کوٹھری یا عمارت کو کہنے لگے اسی معنی میں کعبہ کو بیت کہا جاتا ہے۔ بلکہ مطلق البیت سے خانہ کعبہ ہی مراد ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ سب سے پرانا گھر ہے۔ نیز اس کے بنانے والے بڑے معظم ہستیاں ہیں۔ لہٰذا اس وصف میں یہ کامل مَثَابَۃً یہ ثَوْبٌ سے بنا جس کے معنی ہیں رجوع کرنا جزاء خیر کو بھی اسی لئے ثواب کہتے ہیں۔ کہ وہ کرنے والے کی طرف لوٹتی ہے۔ غالباً کپڑے کو بھی ثوب اس لئے کہتے ہیں۔ کہ وہ انسان کے جسم پر لوٹ لوٹ کر آتا ہے مثابۃ اسم ظرف ہے جس کے معنی ہیں لوٹ کر آنے یا متفرق ہو کر ملنے کی جگہ چونکہ اس مقام پر سارے جہان کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ یا جو ایک بار وہاں آتا ہے۔ وہ پھر لوٹ کر جانا چاہتا ہے۔ راستہ کی مصیبتوں کی پرواہ نہیں کرتا یا جو دنیوی مشاغل سے فارغ ہو جاتا ہے۔ اور اپنی اخیر عمر میں قدم رکھتا ہے۔ تو اللہ اللہ کرنے کے لئے کعبہ معظمہ جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یا جن انبیاء کرام کی امتیں ہلاک ہوئیں۔ وہ عموماً یہاں آکر رہے جیسے صالح علیہ السلام وغیرہ اس لئے اسے مثابہ کہا یوں سمجھو کہ کعبہ معظمہ وہ آشیانہ ہے جس کی طرف پرندے شام کے وقت لوٹتے ہیں (تفسیر عزیزی وغیرہ) لِلنَّاسِ اس میں الف لام عہدی ہے یعنی حاجیوں یا عمرہ کرنیوالوں یا سارے مومنوں کا ملجا ماویٰ وَاَمْنًا یہ مصدر بمعنی اسم فاعل یا اسم ظرف ہے۔ یعنی امن پانے کی جگہ یا امن دینے والا یعنی یہاں جنون جذام اور برص سے لوگوں کو امن ہے یا حاجی کو عذاب آخرت سے امن ہے۔ یا اُس مجرم کو جو وہاں داخل ہو جائے۔ قانونی سزا سے امن ہے۔ یا خود یہ مقام ظالموں کے قبضہ سے محفوظ ہے۔ کہ جو بے دین اسے ویران کرنا چاہے وہ تباہ ہو جائے جیسے اصحاب فیل وغیرہ یا یہ جگہ شکار کو شکاری جانوروں اور انسانوں سے امن دینے والی ہے۔ کہ اس مقام میں بھیڑیا اور شیر بھی ہرن پر حملہ نہیں کرتا۔ خیال رہے۔ کہ یہاں بیت سے سارا حرم مراد ہے یعنی مکہ مکرمہ کی وہ حدود جہاں شکار کرنا حرام ہے۔ مگر چونکہ اس رقبہ کی یہ حرمت بیت اللہ کی وجہ سے ہے اس لئے اُس کا ذکر ہوا۔ دوسری جگہ فرمایا گیا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَاتَّخِذُوْا اس کی دو قرائتیں ہیں۔ خ کے فتح سے یعنی لوگوں نے ہمارے الہام سے مقام ابراہیم کو مصلے بنالیا اس صورت میں اس کا جَعَلْنَا پر عطف بلا تکلف صحیح ہے۔ دوسرے خ کے کسرہ سے تو یہاں قُلْنَا پوشیدہ ہے یعنی ہم نے کہا۔ کہ تم اُسے مصلیٰ بنالو۔ کیونکہ انشاء کا عطف خبر پر جائز نہیں مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھٖمَ

مقام قیام کا ظرف ہے یعنی کھڑے ہونے کی جگہ اس کے شان نزول اور دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر آپ نے کھڑے ہو کر عمارت کعبہ بنائی اور پھر اسی پر کھڑے ہو کر سارے جہان کو حج کیلئے پکارا ایک بار اس پہ قدم رکھ کر اپنی بہو یعنی اسمٰعیل علیہ السلام کی بیوی سے اپنا سر دھلوایا۔ جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں معلوم ہوگا مُصَلًّی اس کے لفظی معنے ہیں جانماز مگر یہاں مجازاً قبلہ مراد ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے۔ کہ میری مسجد آخر مساجد ہے مسجد یعنی قبلہ کیونکہ کوئی بھی اس پہ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھتا بلکہ امام کی طرح اس کو سامنے رکھ کر نماز پڑھتے ہیں۔ یا مقام ابراہیم کے مصلی بنانے کے یہ معنی ہیں۔ کہ اس کی متصل زمین کو جانماز بناؤ اس لئے یہاں مِنْ فرمایا گیا وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ عہد کے لفظی معنی وعدہ کے ہیں یہاں تاکیدی حکم مراد ہے یعنی ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل علیہ السلام دونوں کو تاکیدی حکم دیا۔ اسمٰعیل حضرت ابراہیم کے بڑے فرزند کا نام ہے۔ جو حضرت ہاجرہ کے شکم سے پیدا ہوئے حضرت ہاجرہ کسی شاہی خاندان سے تھیں اور شاہ مصر کے ہاں قید تھیں جن روایتوں میں اُن کو لونڈی یا خادمہ فرمایا گیا وہ اس لحاظ سے ہے۔ کہ ان کو شاہ مصر نے ظلماً لونڈی بنا رکھا تھا۔ کیونکہ پہلے قیدیوں کو لونڈی ہی بنا لیا کرتے تھے (تاریخ ابن خلدون) ابراہیم علیہ السلام اخیر عمر تک لا ولد تھے۔ بیٹے کی دعائیں مانگ کر کہتے تھے اِسْمَعْ اِيْلُ۔ اسمع لفظ عربی ہے۔ اور ایل عبرانی میں خدا کا نام جس کے معنی ہوئے۔ اے خدا میری سن لے جب آپ پیدا ہوئے تو اس دعا کی یادگار میں آپ کا نام اسمٰعیل رکھا گیا (روح البیان وغیرہ) اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ یہ لفظ تطہیر سے بنا جسکے معنی ہیں پاک کرنا اور پاک رکھنا یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔ یعنی میرے اس گھر کو نجاستوں اور گھنونی چیزوں سے پاک وصاف رکھو۔ یہ نہیں کہ اب تک ناپاک تھا۔ اب پاک کر دینا۔ چونکہ کعبۃ اللہ ہی کی عبادت کیلئے ہے۔ اور اسی کے حکم سے بنایا گیا۔ اور کسی انسان کا اس پر قبضہ اور ملکیت نہیں اس لئے رب نے اسے اپنی طرف نسبت فرمایا۔ کہ بَيْتِيَ یعنی میرا گھر یہ مطلب نہیں کہ رب تعالیٰ وہاں رہتا ہے۔ جیسے ناقۃ اللہ اور روح اللہ لِلطَّآئِفِيْنَ یہ طواف سے بنا جس کے معنی ہیں کسی کے آس پاس گھومنا شہر طائف کو بھی اسی لئے طائف کہتے ہیں۔ کہ اس کا راستہ حرم کے اردگرد گھومتا ہوا گیا ہے۔ اس سے مراد یا تو وہ پردیسی لوگ ہیں۔ جو خانہ کعبہ کی زیارت کیلئے یہاں پھیرا مار جاتے ہیں۔ یہ عام طواف کرنیوالے خواہ دیسی ہوں یا پردیسی وَالْعٰكِفِيْنَ یہ عکوف سے بنا ہے جس کے معنی ہیں متوجہ ہونا یا کسی کے ساتھ تعظیماً تعلق پیدا کرنا یا ٹھہرنا اسی سے اعتکاف بنا جو رمضان کے آخیری عشرہ میں سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے۔ اس عاکفین سے یا تو مکہ کے باشندے مراد ہیں یا وہاں اعتکاف کرنیوالے۔

وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ رکع تو راکع کی اور سجود ساجد کی جمع ہے۔ اس سے مراد ہیں نمازی لوگ یعنی ہمارے گھر کو طواف کرنیوالوں اور اعتکاف کرنیوالوں اور نمازیوں کے لئے پاک صاف رکھو جس سے معلوم ہوا کہ وہاں عبادات کے سوا کوئی دنیوی کام جائز نہیں

**خلاصہ تفسیر** اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کو یہ بھی یاد دلادو۔ کہ ہم نے اس مبارک گھر کو ہمیشہ سے لوگوں کی زیارت گاہ اور مقام ثواب بنایا۔ کہ ہمیشہ سے لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں اور بھکاری ثواب سے اپنا دامن مراد بھرے جاتے ہیں۔ اور ہر مصیبت میں اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ چونکہ یہ لوگوں کے اجتماع کی جگہ تھی اس لئے ہم نے یہاں ہر قسم کی امن رکھی۔ کہ نہ تو کوئی مسافر یہاں لوٹا مارا جائے۔ اور نہ یہاں عام وبائی امراض پھیلے اور نہ جانوروں کو تکلیف وایذا پہنچے۔ اور نہ اسے کوئی ویران و برباد کر سکے کیونکہ یہ چیزیں اجتماع کی توڑنے والی ہیں۔ اور چونکہ یہاں وہ پتھر بھی ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت خلیل نے کعبہ جلیل بنایا۔ اور اس پتھر کو حضرت خلیل کی پابوسی کا شرف حاصل ہوا۔ لہٰذا ہم نے اس کی اتنی عظمت بڑھائی کہ اس کو لوگوں کا قبلہ گاہ قرار دے دیا۔ اور حکم دے دیا کہ اس گھر کا طواف کرکے گھر بنانے والے کے قیام گاہ کے سامنے سر جھکا کر نفلیں پڑھنا اور یہ آج کی بات نہیں بلکہ ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام کو بھی حکم دیا گیا تھا۔ کہ میرے اس گھر کو گندگیوں یعنی پیشاب پاخانے وغیرہ اور گھنونی چیزوں تھوک

و بیٹ کوڑا وغیرہ سے پاک صاف رکھنا تاکہ اس میں طواف کرنیوالے اور اعتکاف کرنیوالے اور نماز پڑھنے والے آسانی سے بے تکلف عبادات ادا کرسکیں کیونکہ یہ جگہ ان ہی لوگوں کے واسطے ہے۔

**خانہ کعبہ کی تاریخ** ۔ تاریخ ابن عساکر اور تاریخ ازرقی سے تفسیر عزیزی وغیرہ نے نقل کیا کہ جب آدم علیہ السلام بہشت سے زمین پر تشریف لائے تو بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ خدایا میں یہاں نہ تو ملائکہ کی تسبیح و تکبیر سنتا ہوں اور نہ کوئی عبادت گاہ دیکھتا ہوں جیسے کہ آسمان میں بیت المعمور دیکھتا تھا جس کے ارد گرد ملائکہ طواف کرتے تھے۔ جواب الٰہی آیا کہ جاؤ جہاں ہم نشان بتائیں وہاں کعبہ بنا کر اُس کے ارد گرد طواف بھی کرو۔ اور اُس کی طرف نماز بھی ادا کرو حضرت جبریل آدم علیہ السلام کی رہبری کے لئے ان کے ساتھ چلے اور انہیں وہاں لائے جہاں سے زمین بنی تھی۔ یعنی جس جگہ پانی پر جھاگ پیدا ہوئے۔ اور پھر وہی جھاگ پھیل کر زمین بنے اس کا پورا واقعہ انشاء اللہ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ کی تفسیر میں آئیگا حضرت جبریل نے وہاں اپنا پر مار کر ساتویں زمین تک بنیاد ڈال دی جسکو ملائکہ نے پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے بھرا کوہ لبنان۔ کوہ طور۔ کوہ جودی اور حرا اور طور زیتا بنیاد بھر کر نشان کے لئے ہر چار طرف کو دیوار سی اُٹھادی اس طرف آدم علیہ السلام نماز پڑھتے رہے اور اس کا طواف بھی کرتے رہے بعض روایات میں آیا ہے۔ کہ خود بیت المعمور اتار کر اس بنیاد پر رکھ دیا گیا۔ تو گویا بنیاد دنیوی پتھروں کی رہی اور عمارت بیت المعمور کی طوفان نوح تک کعبہ اسی حال میں رہا۔ اس طوفان کے وقت وہ عمارت تو آسمان پہ اٹھالی گئی۔ اور یہ کعبہ کی جگہ اُونچے ٹیلے کی طرح رہ گئی۔ مگر لوگ برابر برکت کے لئے یہاں آتے تھے۔ اور آکر دعائیں مانگتے تھے پھر ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک کعبہ اسی حال میں رہا جب حضرت اسمٰعیل و ہاجرہ اس میدان میں آکر ٹھہرے اور اُن کی وجہ سے یہاں کچھ آبادی ہوگئی جس کا ذکر اگلی آیت میں آتا ہے۔ انشاء اللہ تب حضرت ہاجرہ کے انتقال کے بعد حضرت ابراہیم کو حکم ہوا۔ کہ آپ اسمٰعیل کو ساتھ لے کر یہاں عمارت کعبہ بنائیں۔ اور اس کی نشانی اس طرح قائم فرمائی۔ کہ ایک بادل کا ٹکڑا بھیجا گیا۔ کہ اُس کے سایہ سے کعبہ کی حد مقرر کرلی جائے۔ حضرت جبریل نے اُس سایہ کی مقدار خط کھینچا اور ابراہیم علیہ السلام نے اُس خط پر یہاں تک زمین کھودی۔ کہ بنیاد حضرت آدم نمودار ہوگئی۔ اور اُس بنیاد پر عمارت بنائی اس عمارت کی مقدار یہ ہے اُس کی بلندی نو ہاتھ اور رکن اسود سے رکن شامی تک کی دیوار ۳۲ ہاتھ اور رکن شامی سے رکن غربی تک کی دیوار ۲۲ ہاتھ اور رکن غربی سے رکن یمانی تک ۳۱ ہاتھ اور رکن یمانی سے پھر رکن اسود تک ۲۰ ہاتھ لہذا اُس وقت یہ کعبہ مستطیل کی شکل تھا جس کا طول عرض سے زیادہ اور خود طول کی شرقی غربی دیواروں میں ایک غیر محسوس سا فرق اُس کا دروازہ زمین سے ملا ہوا جس میں کواڑ وغیرہ نہ تھے جس کی شکل یہ ہے کچھ دنوں بعد تبع حمیری نے اس دروازہ میں کواڑ زنجیر اور قفل لگائے۔ یہ بھی خیال رہے
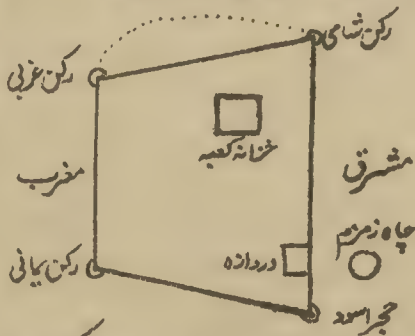
رکن شامی
رکن غربی
خانہ کعبہ
مغرب
مشرق
چاہ زمزم
دروازہ
رکن یمانی
حجر اسود

کہ ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کے اندر داہنی جانب ایک تغار سا بنایا تھا۔ جو مثل خزانہ کے تھا۔ کہ کعبہ کے لئے جو کچھ نذر تحفے آئیں۔ اُس میں رکھے جائیں۔ اس کے دروازے دو تھے۔ ایک داخل ہونے کا دوسرا نکلنے کا اور کعبہ کے بنانیوالے خلیل اللہ تھے۔ اور اُن کو گارا اور پتھر اٹھا کر دینے والے اسمٰعیل علیہ السلام اور اس عمارت میں تین پہاڑوں کے پتھر لگائے گئے کوہ ابوقبیس کوہ حرا اور کوہ ورقان ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کسی نے یہاں عمارت نہ بنائی تھی۔ مگر آپ کے بعد کئی بار اس کی تعمیر و مرمت ہوئی۔ چنانچہ ایک دفعہ قبیلہ عمالقہ اور جرہم نے اسے بنایا پھر دوبارہ قصی ابن کلاب نے اس کی تعمیر کی جس میں چھت درخت مقل کی لکڑی کی بنائی جس پر بجائے تختوں کے خرمے کی لکڑی ڈالی۔ جب حضور علیہ السلام کی عمر شریف

۲۵ سال کی تھی۔ تو بھی قریش کو اس کی تعمیر کرنی پڑی۔ وجہ اس کی یہ ہوئی کہ ایک عورت وہاں خوشبو سلگاتی تھی۔ ایک بار اچانک اُس سے شعلہ اُٹھا جس سے چھت جل گئی۔ اس سے پہلے سیلاب وغیرہ سے کعبہ کی دیواریں بھی پھٹ چکی تھیں۔ لہٰذا سرداران قریش نے جمع ہو کر ولید ابن مغیرہ کو میر عمارت مقرر کیا اور کعبہ کو منہدم کر کے دوبارہ بنایا۔ مگر آپس میں یہ طے کیا۔ کہ اس میں مال حلال ہی خرچ ہو۔ چونکہ اُس وقت اکثر مالدار سود خوار تھے۔ اس لئے مال حلال بہت کم جمع ہوا۔ اس کمی مال کی وجہ سے انہوں نے عمارت چھوٹی کر دی اور چند فرق بھی کر دیئے **اوّل** یہ کہ تعمیر ابراہیمی سے چند گز زمین چھوڑ کر اُسے حطیم قرار دیا (جس میں اب بھی کعبہ کا پرنالہ گرتا ہے) دوسرے یہ کہ بجائے دو کے ایک ہی دروازہ رکھا۔ اور وہ بھی زمین سے خوب اُونچا تاکہ جسے چاہیں جانے دیں۔ اور جسے چاہیں نہ جانے دیں تیسرے یہ کہ خانہ کعبہ کے اندر لکڑی کے ستونوں کی دو صفیں بنائیں ہر صف میں تین تین ستون چوتھے یہ کہ اُس کی بلندی دگنی کر دی یعنی پہلے نو ہاتھ تھی اب ۱۸ ہاتھ پانچویں یہ کہ خانہ کعبہ کے اندر رکن شامی کے قریب ایک زینہ بنایا۔ جس سے چھت پر چڑھ سکیں۔ اور اب کعبہ کی شکل یہ ہو گئی۔
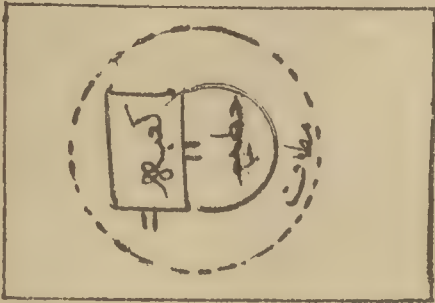
عائیشہ صدیقہ فرماتی ہیں۔ کہ ایک بار مجھے خود حضور علیہ السلام نے کعبہ کے متصل زمین میں بنیاد ابراہیمی کھول کر دکھائی جس میں اُونٹ کی کوہان کی شکل کے پتھر لگے ہوئے تھے۔ اور فرمایا۔ کہ اے عائیشہ قریش نے روپے کی کمی کی وجہ سے بنیاد ابراہیمی کچھ حصہ چھوڑ دیا۔ ابھی لوگ نومسلم ہیں۔ اگر ان کے بھڑک جانے کا اندیشہ نہ ہوتا۔ تو ہم موجودہ کعبہ کو منہدم کر کے بنیاد ابراہیمی پر مکمل بناتے پھر اسلام میں عائیشہ صدیقہ کی روایت کی وجہ سے حضرت عبداللہ ابن زبیر نے کعبہ معظمہ دوبارہ بنایا جس کو بنیاد ابراہیمی پر مکمل کیا۔ قریش کے فرقوں کو دور کیا حطیم کو خانہ کعبہ میں داخل کیا۔ اور اُس میں زمین سے متصل شرقاً غرباً دو دروازے رکھے یمن سے خوشبودار مٹی منگوا کر جسکو ارس کہتے ہیں چونہ میں مخلوط کر کے بجائے گارے کے استعمال کی اور اُس کے دیواروں پر اندر باہر مشک وعنبر سے کہگل کی اور دیواروں پر نہائیت قیمتی ریشمی غلاف چڑھایا۔ جسے غلاف کعبہ کہتے ہیں۔ اور جس کا اب تک رواج ہے۔ شاید یہ انہیں عبداللہ ابن زبیر کی ہی ایجاد ہے۔ ۲۷ رجب سنہ ۶۴ھ ہجری کو اس کام سے فراغت حاصل ہوئی پھر سنہ ۷۴ھ ہجری میں حجاج ابن یوسف نے جو کہ عبدالملک ابن مروان کا نائب تھا یہ عمارت گرا کر قریش کی طرح ہی بنا دیا پھر ہارون رشید بادشاہ نے چاہا۔ کہ عبداللہ ابن زبیر کے طریقہ پر بنائے۔ مگر علماء نے منع کیا۔ کہ بار بار بنانا اور گرانا کھیل ہو جائیگا۔ پھر اسلامی بادشاہ اس کی مرمت تو کرتے رہے مگر کسی نے دوبارہ نہ بنایا پھر سنہ ۱۰۴۰ھ ہجری میں سلطان مراد ابن احمد خان شاہ قسطنطنیہ نے جب دیکھا۔ کہ اس کی عمارت بہت کہنہ ہو گئی۔ تو سوا اُس رکن کے (گوشہ یا کونہ) جس میں سنگ اسود لگا ہوا ہے۔ سب کو گرا کر پھر نئے سرے سے بنیاد حجاج کے موافق کعبہ بنایا جس کے اندر سنگ مرمر کا فرش بچھایا اور اندر چھت پر نہائیت نفیس مخملی چھت گیری لگائی اور باہر کی دیواریں سنگ خارا سے چونہ میں چنیں نہائیت نفیس ریشمی سیاہ پردہ تمام خانہ کعبہ پر ڈالا جس پر کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ بنا اور طولی دیواریں کئی بالشت سنہرا پٹکا لگایا جس میں کارچوبی حروف سے سلطان کا نام لکھا گیا۔

اب موجودہ کعبہ سلطان مراد کا بنایا ہوا ہی ہے۔ اور مصر سے ہر سال غلاف کعبہ تیار ہو کر بڑے جشن اور دھوم دھام سے آتا رہا۔ اور دستور یہ رہا کہ ہمیشہ حج کے موقعہ پر پرانا غلاف اُتار کر خدام کعبہ کو دے دیا جاتا جسکو حاجی لوگ تبرکاً ٹکڑے ٹکڑے خرید لیتے نیا غلاف چڑھا دیا جاتا۔ میں نے سنہ ۱۳۵۰ھ ہجری میں وہاں یہ دیکھا۔ کہ نجدیوں کی حکومت ہے۔ ملک عبدالعزیز ابن سعود وہاں کا بادشاہ ہے۔ اس کے ظلم وستم کی وجہ سے مصر سے غلاف آنا بند ہو گیا۔ اب خود نجد میں ہی تیار ہوتا ہے جس کے اوپر حصہ میں ابن سعود کا نام لکھا ہوتا ہے ہماری اس تحقیق سے

معلوم ہو گیا ہو گا کہ کعبہ معظمہ کو عمارتی شکل میں سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام نے بنایا۔ اور پھر پانچ بار کعبہ بنتا رہا۔ اور کعبہ کی موجودہ عمارت ۳۲۳ سال کی ہے۔ کیونکہ سنہ ۱۰۴۰ ہجری میں بنی اور اب سنہ ۱۳۶۳ ہجری ہے۔

**مقام ابراہیم و سنگ اسود۔** اس لفظ کی تحقیق ہم ابھی تفسیر میں کر چکے۔ حدیث شریف میں ہے کہ رکن اور مقام دو جنتی یاقوت ہیں یہ پہلے بہت نورانی تھے۔ اللہ نے اُن کا نور محو کر دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو یہ مشرق و مغرب کو چمکاتے مقام ایک پتھر ہے۔ جس پر تین بار حضرت خلیل کھڑے ہوئے اولاً تو جب جبکہ ان کی بہو حضرت اسمٰعیل کی بیوی نے ان سے عرض کیا۔ کہ میں آپ کا سر دھلا دوں تب آپ نے گھوڑے سے اُترے کے اُس پتھر پر قدم رکھا اور اُن سے یہ خدمت لی جس کا پورا قصہ انشاء اللہ اگلی آیت میں آئے گا۔ دوسرے جب جبکہ کعبہ کی دیواریں اونچی ہوئیں۔ تب آپ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے کہا۔ کہ ہمارے واسطے کوئی پتھر لاؤ جس پر ہم کھڑے ہو کر دیوار بنائیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پتھر کی تلاش میں بو قبیس پہاڑ پر تشریف لے گئے۔ راہ میں حضرت جبریل ملے۔ اور کہا کہ آیئے میں آپ کو ایک پتھر بتاؤں جو آدم علیہ السلام کے ساتھ دنیا میں آیا۔ اور اُسے ادریس علیہ السلام نے طوفان نوحی کے خوف سے اُس پہاڑ میں دفن کر دیا ہے۔ اس جگہ چھوٹے بڑے دو پتھر مدفون ہیں چھوٹے کو تو کعبہ کی دیوار میں دروازہ کے قریب لگا دو۔ کہ ہر طواف کرنیوالا اس کو چوما کرے۔ یعنی (سنگ اسود) اور بڑے پر ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہو کر عمارت بنائیں چنانچہ آپ وہ دونوں پتھر لے آئے اور یہ پیغام الٰہی بھی پہنچایا۔ ابراہیم علیہ السلام نے حکم الٰہی کے مطابق سنگ اسود کو تو ایک گوشہ میں لگا دیا۔ اور بڑے پر کھڑے ہو کر تعمیر کا کام جاری کیا جس قدر عمارت بلند ہوتی جاتی تھی یہ پتھر بھی اونچا ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ آپ تعمیر سے فارغ ہوئے اور دوسرے پتھر کی ضرورت نہ پڑی روایت میں ہے۔ کہ جب سنگ اسود دیوار کعبہ میں قائم کیا گیا۔ تو اُس کی روشنی چاروں طرف دور تک جاتی تھی جہاں تک اُس کی روشنی پہنچی وہاں تک حرم کے حدود مقرر ہوئے جس میں شکار کرنا منع ہے۔ اور سنگ اسود کا رنگ بالکل سفید تھا۔ گنہگاروں کے ہاتھوں سے سیاہ ہو گیا۔ تیسرے جب جبکہ آپ تعمیر کعبہ سے فارغ ہوئے۔ تب بحکم الٰہی کوہ ابو قبیس پر یہی مقام ابراہیم رکھا۔ اور اُس پر چڑھ کر چوطرفہ آواز دی۔ کہ اے اللہ کے بندو حج کے لئے آؤ جس کا ذکر خود قرآن کریم نے فرمایا۔ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ یہ آواز قیامت تک پیدا ہونیوالی روحوں نے سُنی جو خاموش رہی اُسے حج نصیب نہ ہو گا۔ اور جس نے جتنی بار لبیک کہا۔ اتنے ہی حج کرے گی (حدیث و عام تفاسیر) اُسوقت اسی پتھر میں حضرت خلیل کی انگلیوں کا نشان نمودار ہو گیا۔ بہت عرصہ تک لوگوں نے یہ نشان دیکھا۔ مگر چومنے والوں کی کثرت سے کچھ محو ہو گیا۔ اب کچھ خفیف سا نشان باقی ہے۔ پہلے یہ پتھر خانہ کعبہ کے متصل رکھا ہوا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک عظیم الشان سیلاب آیا جس کا نام ہے سیل ام نہشل اس سیلاب سے یہ پتھر اپنی جگہ سے ہٹ کر دور جا پڑا حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود تشریف لائے اور مطاف کے کنارے چاہ زمزم کے پاس اس کو رکھا۔ اور اس پر ایک پتھر کی عمارت بنا دی۔ اب تک وہی عمارت ہے۔ اور اسی جگہ یہ پتھر موجود ہے۔ اُس کے سامنے کچھ تھوڑی جگہ اور پاٹ دی گئی ہے جس میں آگے پیچھے کل بارہ آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اس کی پوری تفصیل تفسیر عزیزی وغیرہ بڑی اور معتبر تفاسیر میں دیکھو۔ **تنبیہ۔** مکہ مکرمہ میں پندرہ جگہ دعا بہت قبول ہوتی ہے۔ ملتزم[1] یعنی سنگ اسود اور دروازہ کعبہ کے درمیان۔ میزاب[2] یعنی کعبہ معظمہ کے پرنالہ کے نیچے۔ رکن یمانی[3] کے پاس۔ صفا مروہ[4] کے درمیان۔ سنگ[5] اسود اور مقام[6] ابراہیمی کے پاس خانہ کعبہ[7] کے اندر منا[8] شریف میں اور مزدلفہ[9] میں عرفات[10] میں تین جمرول[11، 12، 13] کے پاس اور چاہ زمزم[14] پر زمزم پیتے[15] وقت (عزیزی) جس کو وہاں کی حاضری نصیب ہو۔ دعائیں مانگے اور فقیر کے لئے بھی دعا کرے۔ **دوسری تنبیہ** کعبہ کو کعبہ کہنے کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ کعب کے لفظی معنی ہیں اُٹھا ہوا ہونا یا اونچا ہونا۔ ٹخنہ کو کعب اور کنواری لڑکی کو کاعبہ

اسی لئے کہتے ہیں۔ وَكَوَاعِبَ اَتْرَابًا چونکہ کعبہ کی سطح سمندر سے بہت اونچی ہے۔ اس لئے اسے کعبہ کہا جاتا ہے۔ یا مکعب بقاعدہ اقلیدس وہ ہے جس کو چھ برابر کی سطح گھیریں۔ اگرچہ بناء ابراہیمی میں کعبہ بشکل مستطیل تھا لیکن نزول قرآن کے وقت بشکل مکعب تھا یعنی اس کی لمبائی چوڑائی بلندی برابر ہے۔ اس لئے اسے کعبہ کہا گیا **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے پہلا فائدہ بزرگوں کی چیزوں کی تعظیم کرنا۔ اور اس سے برکت لینا قرآن کریم سے ثابت ہے۔ اور ساری امت کا اس پر عمل مقام ابراہیم ایک پتھر ہے اس کی یہ تعظیم صرف اسی لئے نہیں ہے۔ کہ وہ جنتی ہے۔ بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ اس پر قدم خلیل علیہ الصلوٰۃ والسلام پڑے ہیں۔ اسی لئے زمانہ ابراہیمی سے پہلے اس کی وہ تعظیم نہ ہوتی تھی جواب ہے کہ تمام لوگوں کے سر اس کے طرف جھکتے ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے اس پتھر کو مقام ابراہیم کہا نہ کہ جنت کا پتھر تاکہ معلوم ہو کہ اس پتھر کی تعظیم و توقیر اس لئے ہے۔ کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کا جائے قیام ہے۔ تبرکات کی تعظیم بہت سی آیتوں اور احادیث سے ثابت ہے۔ اس کے لئے ہماری کتاب جاء الحق کا مطالعہ کرو۔ **دوسرا فائدہ** مسجدوں کو گندگی اور کوڑے سے پاک رکھنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ مسجد کی تعظیم کعبہ معظمہ کی طرح ہے اسی لئے کعبہ کی طرح مسجد کی چھت پر بھی بلاضرورت چڑھنا منع اور کعبہ کی صفائی کا تو اس آیت میں حکم دیا گیا۔ لہٰذا تمام مسجدوں کے لئے بھی یہ حکم ثابت ہوا **تیسرا فائدہ** مسجد اور کعبہ معظمہ کا کوئی متولی بھی چاہیئے جس کے ذمہ وہاں کے سارے خدمات ہوں۔ کیونکہ رب نے کعبہ کو پاک رکھنے کا حکم ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کو دیا۔ کہ وہ اپنے اہتمام سے کریں **چوتھا فائدہ** مسجدوں میں اعتکاف نماز وغیرہ دینی کام ہی ہوا کریں۔ کیونکہ اس آیت میں بتایا گیا۔ کہ یہ صفائی اعتکاف کرنیوالوں اور نمازیوں کے لئے ہے **پانچواں فائدہ** مسافروں کو ہر مسجد اور مسجد حرم میں ٹھہرنا اور سونا وغیرہ جائز ہے کیونکہ عاكفين کے معنی مسافرین بھی کئے گئے ہیں **چھٹا فائدہ** تمام مسجدیں بلکہ سارے سجدے کعبہ معظمہ کی طرف ہونے چاہیئے۔ کیونکہ اس آیت میں بتایا گیا۔ کہ ہم نے کعبہ معظمہ کو لوگوں کا جائے رجوع بنایا۔ لوگوں کے رجوع کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہاں جاکر حج کریں۔ دوسرے یہ کہ ہر جگہ سے ادھر رخ کر کے سجدہ کریں۔ **ساتواں فائدہ** جو مجرم کہ حرم شریف میں جاکر امن لے لے اسے نہ تو وہاں گرفتار کر سکتے ہیں۔ اور نہ وہاں سزا دے سکتے ہیں۔ بلکہ اس تک رزق وغیرہ نہ پہنچنے دیں تاکہ وہ خود مجبور ہو کر نکلے۔ کیونکہ اسے مقام امن فرمایا گیا (مدارک۔ خزائن عرفان)

**پہلا اعتراض**۔ حج کی کیا ضرورت ہے۔ اور دنیا بھر کو وہاں جمع کرنے سے کیا فائدہ کہ لوگ اپنے کام کا نقصان کر کے اور پیسہ برباد کر کے وہاں کا چکر لگائیں **جواب**۔ اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ قدرت نے انسان میں دو قوتیں رکھی ہیں ایک عقل دوسرے عشق جو کہ اس کے لئے دو پاؤں کی طرح ہیں۔ نہ تو فقط عقل کافی نہ صرف عشق سے کامیابی اسی لئے عبادات دو قسم کے ہیں۔ بعض میں اطاعت غالب اور بعض میں عشق کامل لیکن ہر عبادت میں یہ دونوں موجود ضرور ہیں۔ نماز زکوٰۃ وغیرہ میں اطاعت کا غلبہ ہے۔ اور روزہ اور حج وغیرہ میں عشق کا اظہار چنانچہ حج میں دعا و استغفار کا تعلق عقل سے ہے۔ مگر احرام باندھ کر عاشقانہ حالت پیدا کرنا بیت اللہ کے آس پاس گھومنا عرفات وغیرہ میں لبیک پکارنا وغیرہ یہ سب حضرت عشق کی جلوہ گری ہے۔ دوسرے یہ کہ انسان کے علوم و کمالات آپس کے اجتماع سے بڑھتے ہیں۔ اسی لئے جنگلی لوگ اکثر جاہل اور بے تہذیب اور شہری لوگ عام طور سے مہذب ہوتے ہیں۔ کیونکہ شہر میں ہر قسم کے لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے ضرورت تھی۔ کہ دنیا بھر کے مسلمان کبھی ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے کے حالات سے خبردار ہوں جس سے کہ ہر ایک کی عقل اور علم ترقی کرے۔ اور عالم کے مسلمانوں میں اجتماعی شان پیدا ہو۔ اس کے لئے دنیا کے آباد حصہ کا درمیانی مکان یعنی مکہ معظمہ منتخب کیا گیا۔ کہ وہاں ہر سال اسلامی کانفرنس ہو جایا کرے۔ آج دوسری قومیں اپنی کانفرنسیں کرنے میں بہت دشواریاں برداشت کرتی ہے مسلمانوں کی یہ کانفرنس بہت آسانی

سے ہو جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ انسانی روح شیشے کی طرح صاف ہے جس میں ایک دوسرے کا عکس پڑتا ہے جب بہت سی روحیں ایک جگہ جمع ہوں گی تو اُن سے قوی نورانیت پیدا ہوگی جیسا کہ چراغوں کے اجتماع سے ہوتی ہے۔ اسی لئے اسلام میں جمعہ اور جماعتیں مشروع ہیں۔ **دوسرا اعتراض**۔ تو اس اجتماع کے لئے عرب کا خشک ریگستان ہی کیوں منتخب کیا گیا۔ کوئی اور جگہ ہونی چاہیئے تھی **جواب**۔ چند وجہ سے ایک یہ کہ یہ جگہ آبادی عالم کے تقریباً بیچ میں واقعہ ہوئی ہے۔ تو گویا کہ یہ حکومت الٰہیہ کا دار الخلافہ ہے۔ دوسرے یہ کہ عبادت میں اپنی اصل کی طرف رجوع کرنا بہتر ہے۔ نماز میں زمین پر سر رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ زمین ہی ہماری اصل ہے۔ ایسے ہی کعبہ معظمہ زمین کی اصل ہے۔ ضروری تھا کہ مسلمان اپنی اصل پہ پہنچ کر حج کے ارکان ادا کریں۔ اسی لئے نماز میں ادھر منہ کر لیتے ہیں۔ اور حج میں وہاں پہنچ جاتے ہیں تیسرے یہ کہ عرب کے اس مقام میں جو بھی آئیگا۔ حاس عبادت ہی کی نیت سے آئیگا۔ دنیاوی اغراض کا بالکل دخل نہ ہوگا۔ کیونکہ وہاں دنیاوی کاروبار ہوتے ہی نہیں۔ پہاڑی علاقہ یا تفریحی مقامات یا زرخیز خطہ میں لوگ سیر و تفریح وغیرہ کی نیت سے بھی جا سکتے تھے۔ مگر اس خشک بیابان میں سوائے عبادت دوسرا مقصد ہو سکتا ہی نہیں **تیسرا اعتراض** حج میں بُت پرستی سے مشابہت ہے۔ کہ بزرگوں کے تبرکات کی تعظیم کرنا پتھریلی عمارت کے آس پاس گھومنا کہیں پتھر پھینکنا کہیں دوڑنا ان باتوں سے فائدہ کیا ہے۔ (آریہ) **جواب**۔ اس میں چند حکمتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان کاموں سے گذشتہ مقبول بندوں کی یادگار تازہ ہوتی ہے جس سے اُن کی اتباع کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً صفا مروہ کے درمیان دوڑنے میں حضرت ہاجرہ کی بے کسی یاد آتی ہے جمروں پہ کنکر مارنے میں اسمٰعیل علیہ السلام کی شیطان سے نفرت اور قربانی کا جذبہ یاد آتا ہے۔ قربانی کرنے میں حضرت خلیل کا راہ مولیٰ میں اکلوتے فرزند کو ذبح کرنا یاد آتا ہے جس سے ہر شخص میں شوق عبادت کی آگ بھڑکتی ہے۔ کہ ہم بھی انہیں کی طرح نفس کشی اور اطاعت الٰہی کریں۔ دوسرے یہ کہ ہر زمین کی علیحدہ تاثیر ہے جہاں نافرمان رہتے ہیں۔ وہاں مدتوں تک قہر کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ اور فرمانبرداروں کی جگہ میں آثار رحمت نمایاں رہتے ہیں حکومتیں باغیوں کے شہروں کو بم برسا کر تباہ کرتی ہیں۔ اور اس تباہ شدہ بستی سے عرصہ تک لوگ عبرت پکڑتے ہیں۔ وفادار سلطنت کے مکانات کو اچھی حالت میں رکھا جاتا ہے۔ ملک عرب میں حکومت الٰہیہ کی وفادار جماعت گزری ہے۔ جہاں جگہ جگہ اُن کے نشانات موجود ہیں ہم بھی وہاں پہنچ کر اُن کے سے کام کر کے اپنی وفاداری کا اظہار کرتے ہیں **چوتھا اعتراض** کعبہ سے پہلے رب نے کوئی پاک مکان بنایا تھا۔ یا نہیں اگر بنایا تھا تو کعبہ کی کیا ضرورت تھی اور اگر نہیں تو اگلے لوگ اس پاکی سے محروم رہے (ستیارتھ پرکاش) **جواب**۔ کعبہ انسان کی پیدائش کے وقت سے ہی بلکہ زمین کے بننے کے وقت سے پاک اور مقدس جگہ ہے۔ کہ ہمیشہ انسانوں نے وہاں سے برکت حاصل کی۔ ابراہیم علیہ السلام نے تو اُس پہ عمارت بنائی تاکہ اُس کی پہچان رہے لہذا یہ سوال ہی حماقت ہے۔ اور نیز اگر کعبہ بعد میں بھی بنتا تو بھی اس میں کوئی خرابی نہ تھی۔ ہو سکتا تھا۔ کہ اگلوں کے لئے پاک جگہ دوسری ہو اور پچھلوں کے لئے یہ کعبہ **پانچواں اعتراض** کسی خاص جگہ کو عزت دینے میں خدا بعضوں کا طرفدار ٹھیرتا ہے۔ کہ وہاں کے رہنے والے تو بے تکلف فائدہ اُٹھائیں گے۔ مگر دور کے لوگ بہت دشواری سے رب کو تو سب بندوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا چاہیئے (ہندو)

**جواب**۔ پنڈت جی تمہارا خدا بھی غیر جانبدار نہیں اُس نے بھی متھرا، اجودھیا بندرابن وغیرہ تیرتھ کے مقام بنا کر اپنی طرف داری کا ثبوت دے دیا۔ کہ گنگا باشی تو بے تکلف روز وہاں غوطے لگایا کریں۔ مگر دور والوں کو دشواری ہو پنڈت جی دنیا کا نظام ایسے ہی قائم رہے کوئی امیر کوئی فقیر کہیں جنگل بیابان اور کہیں کھیتی باڑی سے آباد ان **تفسیر صوفیانہ** قلب کعبہ ہے جس کو ماسوا اللہ کی گندگی سے پاک رکھنے کا حکم ہے۔ اُس کے آباد کرنے والے کو حکم ہے۔ کہ اس کعبہ کو تمام غیروں سے پاک کرو تاکہ

یہاں انوار الٰہی اعتکاف کریں اور اسرار رحمانی یہاں تک پہنچیں۔ جو بندہ اس درجہ کو پہنچ گیا۔ وہی درحقیقت رب کا ساجد ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔ شعر

دل بدست آور کہ حج اکبر است — از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ تعمیر خلیل اطہر است — دل نظرگاہ جلیل اکبر است

صوفیہ کے ہاں کعبہ میں جانے کا وہی حقدار ہے جس کا دل سلامت زبان سچی ہاتھ صاف اور فرج پاک ہو گندے دل جھوٹی زبانیں گناہوں میں لتھڑے ہوئے ہاتھ زانی شرمگاہیں پلید گی اور گندگیاں ہیں جس سے کعبہ کو پاک صاف رکھو (روح البیان) دوسری تفسیر ہم نے بیت اللہ یعنی قلب کو لوگوں کا جائے رجوع اور مقام امن بنایا۔ کہ جہاں پہنچ کر نفس کے دھوکوں شیطان کے وسوسوں خیال اور وہم کے فریبوں سے امن ملتی ہے۔ اسی کعبہ قلب کے پاس ایک مقام ابراہیم یعنی روح کی تجلی گاہ بھی ہے۔ اے طالبان حق تم اس پر مشاہدہ انوار الٰہیہ اور ذوق و شوق کی حقیقی نماز ادا کرو اور ہم نے حکم دیا ہے۔ کہ اس کعبہ قلب کو شیطانی وسوسوں اور شہوانی خیالات سے پاک صاف رکھو۔ تاکہ سالکین اپنی سیر میں اس قلب کا طواف کریں۔ اور واصلین یہاں توکل کے ساتھ اعتکاف کریں۔ اور خاشعین یہاں رکوع رضا اور سجود فنا ادا کریں (ابن عربی)

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ

اور جبکہ عرض کیا ابراہیم نے اے رب میرے بنادے تو اس کو شہر امن والا اور روزی دی رہنے والوں کو اسکے بعض پھل

اور جب عرض کی ابراہیم نے کہ اے میرے رب اس شہر کو امان والا کر دے اور اس کے رہنے والوں کو طرح طرح کے پھلوں سے

مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا

وہ جو ایمان لادے ان میں سے ساتھ اللہ کے اور دن پچھلے کے فرمایا اور وہ جو کفر کریگا پس سامان دونگا اس کو تھوڑا

روزی دے جو ان میں سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں فرمایا اور جو کافر ہوا تھوڑا برتنے کو اسے بھی دوں گا

ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ (۱۲۶)

پھر مجبور کر دوں گا اسکو طرف عذاب آگ کے اور برا ہے جاء رجوع

پھر اسے عذاب دوزخ کی طرف مجبور کر دوں گا۔ اور وہ بہت بری جگہ ہے پلٹنے کی۔

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق** پچھلی آیتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے دو حال بیان ہو چکے انہیں امامت کا ملنا اور بیت اللہ کی تولیت کا سپرد ہونا اب ان کا تیسرا حال یعنی مکہ مکرمہ کو بسانا بیان ہو رہا ہے۔ اگرچہ آبادی مکہ ان دونوں واقعات سے پہلے ہوئی۔ مگر چونکہ وہ دونوں اس سے افضل و اعلیٰ تھے۔ نیز وہ اصل مقصود تھے۔ اور یہ ان کا ذریعہ لہٰذا خلاف ترتیب پہلے انہیں بیان کیا اور بعد میں اسے یوں سمجھو کہ ان واقعات کے ذکر میں ترتیب رتبی کا لحاظ ہے۔ نہ کہ ترتیب وقوعی کا **دوسرا تعلق** اہل کتاب کے مسلمانوں پر دو اعتراض تھے۔ ایک بیت اللہ کی تعظیم کرنا دوسرے شہر مکہ کو معظم جاننا اگلی آیتوں میں پہلے اعتراض کا جواب دیا گیا۔ اب دوسرے کا جواب دیا جا رہا ہے۔ کہ یہ دونوں کام ابراہیم علیہ السلام نے کئے انہیں باقی رکھا۔ تم کیسے اہل کتاب ہو جو ابراہیمی سنتوں کا انکار کر رہے ہو۔ **تفسیر وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ** یہاں بھی ایک

فعل پوشیدہ ہے۔ یعنی اے نبی علیہ السلام انہیں یہ واقعہ بھی یاد دلادو۔ کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی۔ کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا یہاں لہٰذا سے اُس بے آب ودانہ جنگل کی طرف اشارہ ہے۔ جہاں حضرت خلیل اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے فرزند اسمٰعیل کو چھوڑ چلے ہیں یعنی اے مولا بنادے تو اس جنگل کو بَلَدًا اٰمِنًا امن والا شہر اس میں دو باتیں عرض کیں ایک یہ کہ یہاں بڑا شہر آباد ہوجائے۔ دوسرے یہ کہ وہ شہر قحط خشک سالی دھسنے زلزلوں جنون۔ جذام۔ برص وغیرہ دنیوی مصیبتوں اور دجّال ظالم سلاطین وغیرہ دینی مصیبتوں سے امن میں رہے خیال رہے کہ یہاں آمِنَ کے معنی ہیں امن والا جیسے لابن کے معنی دودھ والا اور تامر کھجور والا اور بلد وہ محدود جگہ ہے۔ جس کے رہنے والوں میں اجتماعی شان اور اُنس ہو اور جیسے کہ فقط بیت سے خانہ کعبہ مراد ہوتا ہے۔ ایسے ہی بلد سے مکہ مکرمہ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ۔ یہ آپ کی تیسری عرض ہے۔ پہلی دونوں دعائیں اُس خطّہ کے لئے تھیں اور یہ وہاں کے رہنے والوں کے لئے یعنی وہاں کے رہنے والوں کو مختلف قسم کے پھل اور میوے دے اگر غور کیا جائے تو یہ تینوں معروضات درحقیقت ایک ہی ہیں۔ یعنی اس جگہ کو معظم بنا اور تعظیم کے لئے اس کا شہر ہونا بھی ضروری ہے۔ ورنہ اس کی حفاظت کون کریگا۔ پھر یہاں امن بھی چاہیئے ورنہ لوگ آباد کیسے رہیں گے۔ اور پھر یہاں غلّے اور دانے بھی چاہئیں۔ کہ اس کے بغیر زندگی ناممکن اور یہاں ہر ملک کے پھل بھی چاہئیں۔ تاکہ یہاں کے باشندے میوہ کھانے کے شوق میں میوہ دار ملکوں میں نہ جائیں۔ بلکہ میوے خود ان کے پاس آئیں جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لئے امامت مانگی تھی۔ تو اُس میں رب کی طرف سے ایمان کی قید لگائی گئی تھی۔ آپ نے خیال فرمایا۔ کہ شاید رب کی روزی کے بھی مومنین ہی مستحق ہوں۔ اس لئے عرض کیا کہ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ خدایا یہاں روزی انہیں دینا جو تجھ پر اور قیامت پر ایمان لائیں اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ خداوندا یہاں مومنین ہی آباد ہوں۔ کفار نہ ہیں تاکہ تیرے گھر کی پوری پوری عظمت ہو اس مطلب کو اس طرح ادا کیا کیونکہ بغیر روزی انسان کا رہنا محال ہے۔ رب نے اُن کی دعا قبول فرماتے ہوئے وسعت دے کر فرمایا۔ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ یا تو یہاں ایک فعل پوشیدہ ہے۔ یعنی میں کفار کو بھی کچھ رزق دوں گا۔ اور یا یہ مبتدا ہے جس کی خبر آگے آرہی ہے۔ یعنی اے ابراہیم تمہاری دعا بالکل قبول لیکن یہ امامت نہیں بلکہ رزق ہے۔ امامت میں ہماری نیابت ہے۔ جیسے پاک صاف لوگ ہی پاسکتے ہیں۔ اور رزق میں ہماری پرورش ہم رب العٰلمین ہیں۔ غفار وگلزار بدکار وایماندار دونوں کو رزق دیتے ہیں۔ لہٰذا جو کفر بھی کریگا۔ اُس کو بھی فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا کچھ تھوڑا دنیوی سامان ہم دیں گے۔ اس کلام کے دو معنی بن سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ مومن کو روحانی جسمانی باقی اور فانی ہر قسم کے رزق ملیں گے۔ مگر کفار کو جسمانی اور فانی رزق ہی ملے گا جو باقی اور روحانی رزق کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ یا یہ کہ کچھ روز تو اس مکہ میں بت پرست بھی رہیں گے۔ اور خانہ کعبہ میں بت پرستی بھی ہوگی۔ مگر پھر تمہاری دعا کا ظہور اس طرح ہوگا۔ کہ وہاں محمدی نور چمکے گا۔ جو قیامت تک کے لئے اس جگہ کو بت پرستی اور شرک سے پاک کردیگا۔ لہٰذا یہ اُن کی دعا کی قبولیت ہے۔ نہ کہ تردید (تفسیر کبیر) ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ۔ ثمّ فاصلہ کے لئے آتا ہے۔ چونکہ کافر کے سامان پانے اور جہنم میں جانے کے درمیان کچھ مدّت کا فاصلہ ہے۔ اس لئے ثمّ فرمایا گیا اضطرار سے یا تو مجبور کرنا مراد ہے۔ اور یا ادھر جبراً کھینچنا چنانچہ قرآن کریم نے ایک جگہ فرمایا يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا دوسری جگہ فرمایا۔ وَيَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ۔ یہ دونوں آیتیں اس جملہ کی تفسیر ہیں۔ یعنی میں اُسے جہنّم میں جانے پر مجبور کرونگا یا کھینچ کر پھینکوں گا یہ بھی ہوسکتا ہے۔ کہ یہ لفظ ضرّ سے بنا ہو جس کے معنی ہیں مصیبت کا قریب کرنا اسی لئے عورت کی سوکن کو ضرہ کہتے ہیں۔ کہ وہ اُس کے لئے مصیبت بن کر قریب رہتی ہے (تفسیر کبیر)

یعنی میں اُسے عذاب نار کے قریب کر دونگا. دوزخ میں اگرچہ ٹھنڈا عذاب بھی ہوگا مگر چونکہ وہ ٹھنڈک بھی آگ ہی کی وجہ سے ہوگی یعنی آگ سے قریب طبقے گرم ہوں گے. اور اُس سے دور طبقہ ٹھنڈا لہٰذا وہ بھی آگ کا ہی عذاب ہوگا. **وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ** مصیر صَیر سے بنا جس کے لغوی معنی ہیں پھاڑنا اور اصطلاح میں اس کے معنی ہیں. ایک حالت سے دوسری حالت کیطرف منتقل ہو جانا مصیر وہ حالت یا وہ جگہ جس کی طرف آخر کار انسان پہنچے. بِئْسَ فرما کر یہ بتایا کہ دنیا میں بدتر سے بدتر جگہ میں بھی کچھ نہ کچھ خوبی ہوتی ہے. مگر دوزخ وہ جگہ ہے کہ جہاں مصیبت ہی مصیبت اور برائی ہی برائی ہے. یعنی وہ حالت اور وہ جگہ ہر طرح بُری ہے.

**خلاصہ تفسیر** اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم انہیں وہ واقعہ بھی یاد دلاؤ جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے اُس جنگل میں جہاں آج کعبہ ہے اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر دعا کی تھی. کہ اے مولا اسی جنگل کو امن والا شہر بنا دے. اور یہاں کے رہنے والوں کو جو کہ مومن ہوں قسم قسم کے دانے میوے عطا فرما. یا اس جگہ کو مومنین سے آباد کر. حق تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرماتے ہوئے فرمایا. کہ اے ابراہیم. کافروں کو بھی اُن کی زندگی میں کچھ رزق دونگا. پھر بعد موت عذاب جہنم کی طرف مجبور کروں گا. اور وہ بہت بُری جگہ ہے. رہے مسلمان انہیں مرنے سے پہلے دنیوی سامان ملے گا. اور مرنے کے بعد لازوال نعمتیں عطا ہوں گی یعنی کافر کی موت تو اُس کی نعمتوں کو ختم کر دے گی مگر مسلمان کی موت اُسے بڑھائیگی. یا یہ کہ اس شہر میں کچھ روز تو کافر رہیں گے. مگر آخر کار یہاں اسلام کا آفتاب چمکے گا جس سے شرک کفر کی تاریکی ہمیشہ کیلئے دور ہو جائیگی اس دعا کی قبولیت کا اثر اس طرح ظاہر ہوا. کہ کچھ دنوں بعد ہی یہاں شہر بن گیا. اور ہمیشہ یہاں کا ادب اور احترام ہوتا رہا. انسان تو کیا یہاں کے جانور بھی محفوظ ہو گئے. جس طرح بیت المقدس پر بادشاہوں کے ہاتھ سے مصیبتیں پیش آئیں اور صلیبی جنگ اور چنگیز خانیوں کے حملوں کی آگ ہر جگہ پھیلی. الحمد للہ کہ یہاں نہ پھیلی اور حضرت جبریل کو حکم ہوا وہ اپنے پروں پر شام فلسطین سے کچھ زمین اُٹھا کر لائے. اولاً تو اس کو خانہ کعبہ کے گرد سات بار طواف کرایا اور پھر اُسے مکہ معظمہ سے چند میل دور پہاڑ پر رکھ دیا. اسی لئے اُس کا نام طائف ہوا (تفسیر عزیزی وغیرہ) قدرت کا تماشا تو دیکھو کہ عرب جیسے گرم و خشک ملک میں مکہ معظمہ سے بالکل قریب ہی وہ جگہ بھی رکھ دی ہے جہاں کی ہوا خوب سرد رہتی ہے. اور قسم قسم کے نفیس میوے بکثرت پیدا ہوتے ہیں جس سے مکہ مکرمہ کی منڈی میووں سے بھری رہتی ہے. نیز قریباً ہر ملک کے غلّے اور میوے خلاف موسم بھی وہاں پہنچ جاتے ہیں. میں نے وہاں بے موسم میٹھے انار اور خشک پان کھائے. مکہ مکرمہ کی آبادی اور تعمیر خانہ کا قصہ اگلی آیت میں آرہا ہے انشاء اللہ تعالیٰ

**فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** مکان کی عزت مکین سے ہے. مکہ مکرمہ چونکہ بزرگوں کی دعا سے آباد ہوا. اور وہاں نبیوں نے قیام فرمایا. اس لئے سارے شہروں سے افضل ہوا سیدنا امام مالک کے نزدیک شہر مدینہ شہر مکہ سے افضل ہے کیونکہ مکہ مکرمہ کیلئے خلیل نے دعائیں فرمائیں اور مدینہ منورہ کے لئے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکہ مکرمہ میں اجسام کا کعبہ ہے. اور مدینہ منورہ میں عرفان کا کعبہ اس کی نہایت نفیس اور مکمل بحث ہماری کتاب شانِ حبیب الرحمان میں دیکھو نیز انشاء اللہ اس تفسیر میں بھی لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ کی آیت میں آئیگی. **دوسرا فائدہ** اللہ والوں کی جگہ کو متبرک سمجھنا جائز ہے. مکہ مکرمہ کے متبرک ہونے کی ایک یہ وجہ بھی ہے. کہ وہ بزرگوں کا جائے قیام رہا **تیسرا فائدہ** اپنے بال بچوں اور وطن والوں کے لئے رب سے عمدہ رزق اور اچھے پھل مانگنا جائز بلکہ سنت انبیاء ہے. دیکھو ابراہیم علیہ السلام نے سارے مکہ والوں کے لئے یہ چیزیں طلب کیں **چوتھا فائدہ** دعا کا اثر کبھی دیر میں بھی ظاہر ہوتا ہے. ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا کہ مکہ مکرمہ میں ایمان و مومن ہی رہیں. ہمارے حضور کے زمانہ میں ظاہر ہوئی

**پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ مقام امن ہے. کوئی ظالم بادشاہ اس پہ قابو نہ پائیگا. اور جو ظالم یہاں آنا چاہیگا. تباہ ہو جائیگا. تو حجاج ابن یوسف یہاں کا حاکم کیوں بن گیا جس نے کہ اسی شہر میں عبداللہ ابن زبیر سے جنگ کی

وہاں کے باشندوں کو تکلیفیں پہنچائیں۔ اور خانہ کعبہ کو ویران کیا۔ یزید پلید نے بھی یہاں بڑے ظلم ڈھائے یہاں تک کہ اُس کے حملے سے غلاف کعبہ بھی جل گیا یہ لوگ اصحاب فیل کی طرح تباہ کیوں نہ ہو گئے **جواب**۔ اس شہر کے امن والا ہونے کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں جنگ وغیرہ کرنا حرام ہے۔ نیز قدرتی طور پر عام دلوں میں اس کا ادب و احترام ہے۔ دوسرے یہ کہ جو ظالم خانہ کعبہ کی ہلاکت کا قصد کرے۔ وہ برباد ہو جائے۔ اصحاب فیل نے خود کعبہ گرانے کا قصد کیا تھا۔ برباد ہو گئے۔ حجاج اور یزید کا مقصود خود کعبہ کی ویرانی نہ تھی بلکہ اپنے مخالفوں کو مغلوب کرنا ان کی جنگ تو مخالفوں سے تھی اتفاقاً کعبہ معظمہ کی بے حرمتی بھی ہو گئی۔ یزید کو تو اُس کی اصلاح کا موقعہ ہی نہ ملا وہ جلد مر گیا مگر حجاج نے اس پر افسوس بھی کیا اور دوبارہ پہلے سے بڑھ کر اُسے آراستہ کر دیا۔ **دوسرا اعتراض** ابراہیم علیہ السلام نے مکہ والوں کیلئے امن رزق اور پھلوں کی دعا کی یہ تمام چیزیں دنیوی ہیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ طالب دنیا تھے (بعض بے دین) **جواب** دین کیلئے دنیا حاصل کرنا عین دین ہے۔ نماز کے لئے روٹی کھانا جہاد کی نیت سے اپنے جسم کو فربہ کرنا علم دین کیلئے مقوی دماغ غذائیں اور دوائیں کھانا دین ہی ہے۔ حضرت خلیل نے یہ چیزیں اس لئے طلب کیں۔ تاکہ یہاں آبادی اور رونق رہے جس سے کعبہ معظمہ کی حرمت قائم ہو **تیسرا اعتراض** قرآن نے یہاں دعا خلیل ان الفاظ میں نقل کی۔ کہ ہٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس وقت یہ جگہ جنگل تھی اور سورہ ابراہیم میں اس طرح فرمایا کہ ھٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا یعنی اس شہر کو امن والا بنادے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس وقت یہاں شہر تھا۔ یہ اختلاف کیوں ہے **جواب** آپ نے دو بار دعا فرمائی ہے۔ ایک حضرت ہاجرہ و اسمٰعیل علیہ السلام کو یہاں چھوڑتے وقت جبکہ یہ جنگل تھا۔ اُس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ دوسرے خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد جبکہ وہاں شہر بس چکا تھا۔ اُس کا ذکر سورہ ابراہیم میں ہے۔ لہٰذا آیتوں میں کوئی اختلاف نہیں **چوتھا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ جگہ دعاء ابراہیمی سے امن والی ہوئی۔ اس سے پہلے نہ تھی۔ نیز حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے دعا فرمائی کہ اے اللہ میں مدینہ کو حرم بناتا ہوں جیسے ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا۔ (تفسیر کبیر و مشکوٰۃ بروایت مسلم) نیز دوسری روایت میں آیا ہے۔ کہ حضور نے فتح مکہ کے دن فرمایا۔ کہ اس شہر کو اللہ نے اُسی دن سے حرم بنایا ہے جب زمین آسمان پیدا فرمائے (مشکوٰۃ) اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ جگہ ہمیشہ ہی سے حرم ہے۔ ان میں مطابقت کیسے ہو۔ اور یہ جگہ حرم کب سے ہے **جواب**۔ یہ جگہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے اور معنی سے حرم تھی۔ کہ یہاں قدرتی طور پر ظلم و جبر نہ ہوتے تھے۔ اور حضرت خلیل سے شرعی طور پر حرم بنی کہ یہاں ظلم وغیرہ شرعاً حرام کئے گئے یعنی اس کی پہلے قدرتی حرمت تھی۔ اور آپ کی دعا سے شرعی حرمت ہوئی۔ کہ اس کا قانون بن گیا۔ لہٰذا دونوں روائتیں مطابق ہیں **تفسیر صوفیانہ**۔ قلب کعبہ ہے اور سینہ اُس کا حرم اور بدنی قوتیں وہاں کے باشندے اور نفسانی صفات اور شیطانی وسوسے چور و دشمن دعا یہ کی گئی۔ کہ مولیٰ کعبۂ قلب کے حرم یعنی سینہ کو امن والا مدینہ بنادے جہاں کی رہنے والی قوتیں شیطان اور نفس سے محفوظ رہیں اور ان میں سے جو اللہ کی توحید اور معاش و معاد کا قائل ہو کر مومن بن جائے۔ اُسے روحانی معارف اور حکمت کے پھل عطا فرما جواب میں ارشاد ہوا۔ کہ مدینۂ سینہ کے رہنے والے جو ایک حد میں محدود رہ کر محبوب کے دیدار سے محجوب ہونگے اور شریعت عشق کے کافر ہوں گے۔ انہیں بھی کچھ علوم عقلیہ کا سامان دیا جائیگا۔ مگر آخر کار محرومی اور حجاب کی آگ کی طرف ڈھکیلے جائیں گے۔ اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ کیونکہ اس میں ہمیشہ نار فراق میں جلنا ہے۔ (ابن عربی) نیز صورت جسمانی گویا مکہ ہے۔ اور قلب اُس کا ظاہری کعبہ مگر حقیقی کعبہ بارگاہ الٰہی ہے جس کا قلب مومن ہمیشہ طواف حقیقی کرتا ہے۔ جو شخص اس کعبہ حقیقی کا حقیقی طواف کر سکے۔ تو یہ کعبہ اُس کی زیارت کرتا ہے۔ بیت کا طالب بیت اللہ جاتا ہے۔ اور رب البیت کے طالب

کے پاس بیت اللہ آتا ہے حق اس کا قبلہ ہے۔ اور وہ تمام کا قبلہ جیسے کہ آدم علیہ السلام قبلہ ملائکہ قرار پائے تھے اس میں یہی راز تھا حضرت شیخ عطار منطق الطیر میں فرماتے ہیں۔

حق تعالیٰ گفت آدم غیر نیست — کور چشمی ورتا ایں سیر نیست
شد نفخت فیہ من روح آشکار — سرّ جاناں گشت بر خاک استوار

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

از دم حق آمدی آدم توئی — اصل کرمنا بنی آدم توئی
قبلۂ کل آفرینش آمدی — پائے تا سر عین بینش آمدی

نگاہ ابلیس نے سیدنا آدم کا خاکی بدن دیکھا۔ لہٰذا اُدھر جھکنے سے انکار کر دیا نگاہ ملائکہ نے اس خاک پر یار کے اسرار آشکار دیکھے۔ اور فوراً جھک گئے۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے۔

اور پروانے ہیں جو ہوتے ہیں کعبہ پہ نثار — شمع اک تو ہے کہ پروانہ ہے کعبہ تیرا

آنکھ والے کہتے ہیں۔ کہ یہ کعبہ تمام عالم کا کعبہ ہے اور حضور علیہ السلام اس کے بھی کعبہ۔ اسی لئے ولادت سرکار کے وقت کعبہ معظمہ نے آمنہ خاتون کے گھر کی طرف سجدہ کیا۔ (مدارج وغیرہ)

وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا

اور جبکہ اُٹھاتے تھے ابراہیم بنیادیں اس گھر کی اور اسمٰعیل اے رب ہمارے قبول فرما ہم سے

اور جب اُٹھاتا تھا ابراہیم اس گھر کی نیویں اور اسمٰعیل یہ کہتے ہوئے اے رب ہمارے ہم سے

اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾

تحقیق تو ہی سننے والا جاننے والا ہے

قبول فرما بے شک تو ہی ہے سنتا جانتا

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے پہلا تعلق پچھلی آیتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے تین واقعات بیان ہو چکے۔ اب چوتھا واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ مگر یہاں ترتیب وقوعی ہے نہ کہ ذہنی دوسرا تعلق پچھلی آیت میں شہر مکہ بسانے کا واقعہ بیان ہوا۔ اب بیت اللہ بنانے کا واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ جو کہ اس شہر کا اصل مقصود ہے۔ گویا پہلے درخت کا ذکر ہوا اب اس کے پھل کا تیسرا تعلق پچھلی آیت میں ابراہیم علیہ السلام کی چند دعاؤں کا ذکر تھا۔ اب اس کے ذریعہ قبولیت اور ظہور اثر کا ذکر ہو رہا ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے وہ گھر بنا دیا جس کی برکت سے اس شہر میں امن بھی رہے اور رزق و پھل کی بہتات بھی ہو۔ **تفسیر** وَاِذْ یَرْفَعُ یہاں بھی وہاں فعل پوشیدہ ہے یعنی اے نبی علیہ السلام انہیں وہ واقعہ بھی یاد دلا دو جبکہ ابراہیم و اسمٰعیل علیہ السلام تعمیر کعبہ کر رہے ہیں اس میں گذشتہ واقعہ حال سے بیان کیا جا رہا ہے۔ گویا کہ اب ایسا ہو رہا ہے۔ جیسے کہ خواب دیکھنے والا بیان کرتے وقت کہتا ہے۔ کہ میں نے دیکھا کہ وہاں جا رہا ہوں وغیرہ خیال رہے۔ کہ رفع کے معنی اٹھا لینا بھی ہیں اور بلند کرنا بھی یہاں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی بلند کرتے تھے۔ اِبْرٰهٖمُ علیہ السلام خود اپنے ہاتھ سے کسی دوسرے معمار اور مستری کو اس میں شامل نہ کیا تاکہ یہ ثواب صرف مجھے ہی حاصل ہو اور کعبہ بیت المقدس سے

افضل رہے کیونکہ اُسے حضرت سلیمان جنات سے بنوائیں گے گویا اس کو تو نبی نے بنوایا اور اُسے پیغمبر نے اپنے ہاتھ سے بنایا۔ **الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ** قواعد جمع قاعدہ کی ہے جس کے لفظی معنی ہیں ثابت رہنے والی چیز اسی لئے بیٹھنے والی کو قاعدہ اور قانون کو قاعدہ کہتے ہیں۔ کہ وہ اپنے حال پر ثابت رہتے ہیں یہاں بنیادیں یا دیواریں مراد ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ بنیاد پہلے ہی سے موجود تھی حضرت خلیل نے اُس پر عمارت چن دی۔ جیسا کہ ہم خانہ کعبہ کے قصہ میں بیان کر چکے اور ممکن ہے۔ کہ قواعد سے وہ پتھر مراد ہوں جن سے دیواریں چنیں یعنی ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کے پتھر چنتے تھے **وَاِسْمٰعِيْلُ** یا تو یہ ابراہیم پر معطوف ہے یعنی ابراہیم اور اسمٰعیل دونوں چن رہے تھے چونکہ حضرت اسمٰعیل چننے میں حقیقتاً شریک نہ تھے۔ بلکہ پتھر و گارا دے کر امداد کر رہے تھے۔ اسی لئے کچھ فاصلہ سے۔ ان کا ذکر کیا گیا اور امداد کی وجہ سے انہیں بھی چننے والا مانا گیا۔ اور یہ بھی احتمال ہے۔ کہ یہ پوشیدہ فعل کا فاعل ہو یعنی امداد کرتے تھے۔ اول کی اسمٰعیل اور یہ بھی احتمال ہے۔ کہ یہ مبتدا ہو اور اگلی عبارت اس کی خبر یعنی حضرت ابراہیم تو دیواریں چن رہے تھے۔ اور اسمٰعیل علیہ السلام یہ دعا کر رہے تھے (تفسیر کبیر) مگر پہلی توجیہ قوی ہے۔ کیونکہ حدیث سے ثابت ہے روح البیان نے یہاں فرمایا۔ کہ اس وقت حضرت ابراہیم کے چار بیٹے تھے۔ اسمٰعیل۔ اسحٰق۔ مدین اور مداین مگر یہ شرف صرف اسمٰعیل علیہ السلام کو حاصل ہوا۔ **رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا** یہاں ایک فعل پوشیدہ ہے یعنی وہ دونوں عرض کرتے تھے۔ کہ اے ہمارے پروردگار ہماری اس خدمت کو قبول فرما۔ یا تو بنانے کی حالت میں یہ کہتے جاتے تھے یا اُس سے فارغ ہو کر خیال رہے کہ قبول اور تقبل میں یہ فرق ہے کہ قبول اعلیٰ چیز کے منظور کرنے کو کہتے ہیں اور تقبل حقیر ہدیہ کو محض اپنے کرم و مہربانی سے منظور فرما لینے کو یعنی بتکلف اپنے کرم سے قبول فرمالینا (تفسیر کبیر و عزیزی و روح) مطلب یہ ہوا۔ کہ اے مولیٰ ہماری یہ حقیر محنت تیری بارگاہ میں گو قابل قبول نہ ہو مگر مولیٰ ہماری کوتاہیوں پر نظر نہ فرما محض اپنے کرم سے قبول فرمالے نیز یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہم اس کا ثواب نہیں مانگتے صرف تیری منظوری مانگتے ہیں۔ کہ ثواب تو تیرے کرم سے ملے گا عقلمند خادم کو مولیٰ کی خوشنودی ثواب سے زیادہ پیاری ہے (کبیر) اس میں انتہائی انکسار ہے اس لئے دعاؤں میں تقبل ہی کہا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ ان محبوبوں کے صدقہ سے اس تفسیر اور فقیر کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو بھی اپنے کرم سے قبول فرمائے اور اسے میرے لئے صدقہ جاریہ اور گناہوں کا کفارہ بنائے **اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ** اے مولیٰ تو ہی ہماری دعا سننے والا اور ہماری نیت کا جاننے والا ہے۔ تمام کی سننا اور سب کو جاننا خدا ہی کی صفت ہے اسی لئے حصر کے طریقہ پر فرمایا گیا حضور علیہ السلام روزہ افطار کے وقت یہی دعا پڑھتے تھے (عزیزی) **خلاصہ تفسیر** اے نبی علیہ السلام انہیں یہ واقعہ بھی سناؤ کہ جب حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کعبہ کی دیواریں بناتے تھے۔ اس طرح کہ ابراہیم علیہ السلام تو بنفس نفیس چن رہے تھے اور حضرت اسمٰعیل گارا اور پتھر دے رہے تھے اور نہایت عجز و انکسار سے یہ دعا کرتے جاتے تھے۔ کہ الٰہی ہماری اس حقیر کوشش کو قبول فرما ہم جو کچھ زبان سے دعا کرتے ہیں۔ تو خوب سنتا ہے اور ہمارے دل کی حالت سے تو خوب واقف ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنیاد کعبہ پہلے سے موجود تھی۔ یہاں روح البیان اور عزیزی نے فرمایا۔ کہ زمین سے پہلے پانی ہی پانی تھا۔ قدرتی طور پر دو ہزار سال پہلے کعبہ کی جگہ اُس پر سفید جھاگ پیدا ہوا کچھ روز میں اُسی کو پھیلا کر زمین کر دیا گیا۔ پھر جب فرشتوں کو رب نے آدم علیہ السلام کی پیدائش کی خبر دی تو انہوں نے اپنا خلافت کا استحقاق پیش کیا اور آدم علیہ السلام کی پیدائش کی حکمت پوچھی مگر اس جرأت کی معذرت میں توبہ کی نیت سے سات بار عرش اعظم کا طواف کیا حکم الٰہی

ہوا کہ زمین میں بھی اُسی جھاگ کی جگہ نشان لگادو جہاں میرے بندے خطا کر کے اُس کے طواف سے مجھے راضی کیا کریں
پھر آدم علیہ السلام کا خمیر اسی کعبہ کی جگہ ہوا۔ اور چالیس سال تک اُن کا جسم پاک یہاں ہی رہ کر خشک ہوا اور آپ یہاں سے ہی جنت
میں گئے۔ اور جنت سے ہندوستان میں اُترے اور آپ نے پاپیادہ چالیس حج کئے کعبہ کے باقی حالات ہم اس سے پہلے
بیان کر چکے ہیں۔ **آبادی مکہ مکرمہ** تفسیر عزیزی میں ہے۔ کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے ہاتھ سے نجات پائی اور
بابل والوں کے ایمان سے مایوس ہوئے تو وہاں سے ہجرت کر کے اپنے چچا ہاران کے گھر مقام حرّان میں آگئے ہاران کی
کی ایک نہایت خوبصورت بیٹی تھی سارا انہوں نے حضرت ابراہیم کی سعادت مندی دیکھ کر حضرت سارا کا آپ سے نکاح کر دیا۔
ابراہیم علیہ السلام کچھ روز وہاں تبلیغ فرماتے رہے۔ مگر سوا حضرت سارا اور لوط علیہ السلام کے اور کوئی ایمان نہ لایا۔ بلکہ ہاران نے
غصے ہو کر اپنی بیٹی اور داماد دونوں کو گھر سے نکالدیا آپ نے حضرت سارا سے معاہدہ کیا کہ تم ہمیشہ میری فرمانبرداری کرنا اور
میں بھی تمہاری بات مانوں گا اور یہ تینوں حضرات حرّان سے مصر روانہ ہو گئے۔ مصر کا بادشاہ بڑا ظالم اور سرکش تھا جب کبھی کسی
خوبصورت عورت کو دیکھتا تو اُس کے شوہر کو قتل کر کے عورت پر قبضہ کر لیتا تھا جب یہ چھوٹا سا قافلہ مصر پہنچا تو شاہی پولیس نے
بادشاہ کو خبر دی کہ مصر میں بے مثل حسینہ جمیلہ عورت آئی ہے خیال رہے کہ مردوں میں حضرت یوسف اور عورتوں میں حضرت
سارا بے مثل حسین ہوئے بلکہ حضرت یوسف کا حُسن حضرت سارا کی ہی میراث تھا ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارا کو سمجھا دیا
کہ اگر تمہیں پولیس گرفتار کر کے بادشاہ کے پاس لے جائے تو تم یہ نہ کہنا کہ ابراہیم میرے شوہر ہیں۔ بلکہ یہ کہنا کہ وہ میرے بھائی
ہیں۔ کیونکہ میں تمہارا دینی بھائی ہوں حق تعالیٰ تمہیں اُس ظالم سے محفوظ رکھے گا۔ یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی۔ کہ ان دونوں کو پولیس نے
گھیر لیا۔ اور حضرت سارا کو بادشاہ کے پاس لے گئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے یہ حال دیکھ کر نماز شروع کر دی اور دعا میں
مشغول ہو گئے بادشاہ حضرت سارا کو دیکھتے ہی ان پر عاشق ہو گیا۔ چاہا کہ کچھ بے ادبی کرے۔ حضرت سارا نے فرمایا۔ کہ مجھے
اتنی مہلت دے کہ میں غسل کر کے کچھ عبادت کر لوں ظالم نے فوراً غسل کا انتظام کر دیا۔ آپ نے وضو کر کے نماز کی نیّت
باندھی اور بدرگاہ قاضی الحاجات میں دعائیں مشغول ہوئیں جب ظالم نے دیکھا کہ دیر لگی تو وہ آپ کے حجرہ میں پہنچا اور چاہا۔ کہ
عین نماز کی حالت میں آپ پر دست درازی کرے اچانک اُس کے دونوں ہاتھ خشک ہو گئے۔ اور بے ہوش ہو کر گر پڑا اس کا منہ
پھول گیا اور منہ سے جھاگ ڈالنے لگا حضرت سارا نے دعا کی اے مولا اگر یہ مر گیا تو مجھ پر اس کے قتل کا الزام آئیگا۔ تو پھر میری
خیر نہیں یہ دعا کرنی تھی۔ کہ اُسے ہوش آگیا پھر وہی ارادہ کیا پھر ویسا ہی حال ہوا غرضکہ تین بار یہ معاملہ پیش آیا تب وہ بولا کہ یہ انسان
نہیں یا تو جن ہے یا جادوگرنی میرے پاس ایسی ہی ایک عورت اور بھی ہے جس کو میں نے قبطیوں سے حاصل کیا تھا۔ اور میں
اُس پر بھی قابو نہ پاسکا (حضرت ہاجرہ) اُسے بھی اس کے حوالہ کرو اور ان دونوں عورتوں کو مصر سے نکال دو غرضکہ حضرت سارا مع
ہاجرہ کو لے کر حضرت ابراہیم کے پاس آئیں آپ اُس وقت تک نماز میں ہی مشغول تھے حضرت سارا سے پوچھا کہ مہیم یعنی
کیا حال ہے۔ سارا نے عرض کیا کہ خیر ہے رب نے ظالم کو ذلیل کیا اور مجھے خادمہ دی جس کا نام ہاجرہ ہے ابراہیم علیہ السلام
بہت خوش ہوئے اور یہاں سے یہ چاروں صاحب روانہ ہو کر فلسطین پہنچے وہاں کے لوگوں نے ان بزرگوں کو غنیمت جانا۔
اور بہت زمین نذر کی رب نے اس زمین میں اتنی برکت دی کہ کچھ دنوں میں آپ کے پاس کھیتی باڑی جانور غلام وغیرہ بے شمار
ہو گئے۔ آپ نے مسافر خانے اور لنگر جاری کئے اور لوط علیہ السلام کو تبلیغ دین کے روم کی طرف روانہ کیا ایک دن حضرت
سارا عرض کرنے لگیں کہ ہمارے گھر میں اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ مگر فرزند نہیں تم ہاجرہ سے نکاح کر لو شاید ان سے ہی کوئی بچہ

پیدا ہو. آپ نے نکاح کرلیا حضرت ہاجرہ کے شکم سے اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے حضرت سارا نہایت محبت سے انہیں پالتی تھیں اور حضرت ہاجرہ صرف دودھ پلاتی تھیں. مگر ابراہیم علیہ السلام حضرت سارا کی تکلیف کے خیال سے فرزند کو گود میں بھی نہ لیتے تھے. اللہ کی شان کہ ایک دن اسمٰعیل علیہ السلام کو تنہا حجرے میں لیٹا ہوا دیکھ کر محبت پدری سے گود میں لے لیا. اُنکے رخسارہ اور پیشانی کو بوسے دے رہے تھے. کہ حضرت سارا آگئیں اور اُن پر غیرت نے اتنا غلبہ کیا. کہ فرمایا اسی وقت اس کو اور اسکی ماں کو میرے گھر سے نکال کر بے آب ودانہ جنگل میں چھوڑ آؤ. آپ نے بہت کچھ سمجھایا مگر کچھ پیش نہ گئی. ادھر تو آپ حرّان والے معاہدہ کے پابند تھے. اُدھر وحی آئی. کہ سارا کی ہر بات مانو اس میں ایک راز ہے. سچ ہے بڑوں کی لڑائی میں بھی راز الٰہی ہوتا ہے مولینا فرماتے ہیں.

ہر چہ گیرد علتی علت شود ∴ کفر گیرد کاملے ملت شود

ابراہیم علیہ السلام ان دونوں کو سواریوں پر لے کر روانہ ہوئے. اور منزل بمنزل وہاں پہنچے جہاں آج خانہ کعبہ ہے حکم الٰہی پہنچا کہ ان دونوں کو یہاں ہی چھوڑ دو اور ہمارے سپرد کر جاؤ. زمزم کے مقام پر ایک درخت تھا. اور باقی سب جنگل بیابان تھا. نہ وہاں سایہ نہ دانہ پانی نہ آدمی آپ ایک ٹوکری خرما اور کچھ روٹی کے ٹکڑے ایک مشکیزہ پانی حضرت ہاجرہ کے حوالے کر کے لوٹ پڑے حضرت ہاجرہ پیچھے دوڑیں اور کہنے لگیں. کہ مجھ کو اس بے آب ودانہ جنگل میں کہاں چھوڑے جاتے ہو. جہاں کوئی غمخوار ہے نہ کوئی مکان سایہ دار آپ نے کوئی جواب نہ دیا. آخر کار حضرت ہاجرہ بولیں کہ کیا تمہیں خدا نے یہ حکم دیا ہے. سر کے اشارہ سے فرمایا. کہ ہاں تب آپ نے کہا. کہ پھر مجھے کچھ پرواہ نہیں میرا رب مجھے ضائع نہ کریگا. واپس لوٹیں اور اپنے بچے کو گود میں لے کر اکیلی بیٹھ گئیں اور دودھ پلانے لگیں. ابراہیم علیہ السلام پہاڑ کی آڑ میں آکر رُکے اور کعبہ کی طرف منہ کر کے دعا کیلئے ہاتھ اُٹھائے اور عرض کیا رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسْکَنْتُ الخ مولیٰ میں نے اپنے بال بچے بے آب ودانہ جنگل میں چھوڑ دیئے جب تک خرما اور پانی رہا حضرت ہاجرہ اطمینان سے گزر کرتی اور فرزند کو دودھ پلاتی رہیں. مگر پانی ختم ہونے پر پیاس نے ستایا لخت جگر نے بے اختیار رونا شروع کیا اپنی تو اتنی فکر نہ ہوئی مگر نور نظر کی بے قراری دیکھی نہ گئی اُٹھیں اور صفا پہاڑ پر چڑھیں کہ شاید کہیں پانی کا نشان ملے مگر نہ ملا مایوس ہو کر نیچے اُتریں مروہ پہاڑ کی طرف روانہ ہوئیں. مگر نظر فرزند پر تھی. راہ کے کچھ حصہ میں فرزند سے آڑ ہوگئی. تو آپ اُسے جلد طے کرنے کیلئے دوڑ کر چلیں اُس آڑ سے نکل جانے پر پھر آہستہ چلیں. یہاں تک کہ مروہ پر پہنچ گئیں وہاں چڑھ کر بھی پانی کہیں نہ دیکھا. پھر صفا کی طرف روانہ ہوئیں. اسی طرح سات چکر کئے ہر دفعہ درمیان میں دوڑتی تھیں (صفا مروہ کی سعی اسی کی یادگار ہے) جب اخیر بار مروہ پر چڑھیں تو ایک ہیبت ناک آواز کان میں پڑی. دوڑ کر فرزند کے پاس آئیں. دیکھا. کہ وہ روتے میں اپنی ایڑیاں زمین پر رگڑ رہے ہیں جس سے شیریں پانی کا چشمہ جاری ہے. بہت خوش ہوئیں اور اُس کے گرد خاک جمع کر کے فرمانے لگیں یاما زم زم اے پانی ٹھہر ٹھہر اس لئے اس کا نام آب زمزم ہوا بعض علماء نے فرمایا ہے کہ آپ فرماتی تھیں ماءٌ زمٌ زمٌ پانی میٹھا ہے میٹھا ہے. بعض نے فرمایا ماءٌ زمزمٌ پانی بہت کافی ہے. بعض نے فرمایا. کہ زمزمۃ اور رمزمۃ اور ہمہمۃ گن گنا کر گانے کو کہتے ہیں چونکہ آپ خوش ہو کر کچھ گنگناتی جاتی تھیں. اس لئے اس کا نام زمزم ہوا واللہ اعلم بالصواب (من بعض اساتذتنا) حدیث شریف میں ہے. کہ اگر حضرت ہاجرہ اُس پانی کو گھیر نہ دیتیں. تو یہ چشمہ جاری ہوتا آخر کار آپ وہ پانی خود پیتیں. اور اپنے پسر کو بھی پلاتی تھیں اسی پر بہت روز تک گزر اوقات کرتی رہیں. کیونکہ اس پانی میں غذائیت بھی ہے. اتفاقاً یمن کی ایک قوم جرہم کسی طرح اُس طرف پہنچی اور مقام کدا میں اُتری اُس نے دیکھا. کہ کچھ فاصلہ پر پرندے بہت اڑ رہے ہیں کہنے لگے. کہ یہاں پانی ضرور ہے. کیونکہ ہم یہاں بارہا آئے کبھی پرندے نہ دیکھے انہوں نے

تحقیق کیلئے اپنے میں سے ایک شخص بھیجا اُس نے آکر خبر دی کہ یہاں پانی کا غیبی چشمہ ہے جس کے پاس ایک بی بی اپنے فرزند کو لئے بیٹھی ہے۔ یہ سن کر وہ سارے لوگ حضرت ہاجرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بولے کہ اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم یہاں ہی رہنے سہنے لگیں۔ چونکہ حضرت ہاجرہ بھی تنہائی سے گھبرا گئی تھیں۔ اس شرط پر اجازت دے دی کہ اس پانی پر کسی کا حق نہ ہو یعنی سب استعمال تو کریں۔ مگر حق میرا ہو۔ ان سب نے یہ شرط قبول کر کے وہاں خود بھی رہائش اختیار کر لی اور اپنے دوسرے اہالی موالی کو بھی بلا لیا جس سے کہ یہاں ایک اچھی خاصی بستی بس گئی کچھ دنوں میں اسمٰعیل علیہ السلام بھی سمجھ دار ہو گئے آپ نے اس قوم جرہم سے زبان عربی سیکھی نہائت ذکی قابل اور ہونہار جوان ہوئے اور جماعت جرہم کے سردار نے آپ سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا۔

ادھر حضرت ہاجرہ نے وفات پائی جب حضرت اسمٰعیل کی عمر ۱۴ سال کی ہوئی۔ تو حضرت سارا کے شکم سے بھی ایک فرزند ہوئے جن کا نام حضرت اسحاق رکھا گیا حضرت سارا اُن کی پرورش میں مشغول ہوئیں اور اتنے عرصہ میں کچھ جوش غیرت بھی کم ہو گیا تب ابراہیم علیہ السلام نے اُن سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں اسمٰعیل کو دیکھ آؤں انہوں نے اس شرط سے اجازت دی۔ کہ وہاں زمین پر قدم نہ رکھیں اور بہت نہ ٹھہریں آپ روانہ ہوئے۔ یہاں آکر معلوم ہوا۔ کہ فرزند جوان اور خانہ دار ہے۔ اور اُن کی والدہ وفات پا چکیں۔ تلاش کرتے کرتے حضرت اسمٰعیل کے دروازہ پر آئے آپ اُس وقت شکار کے لئے جنگل گئے تھے۔ کیونکہ آپ کی گزر اوقات شکار کے گوشت اور زمزم کے پانی پر تھی ابراہیم علیہ السلام نے اُن کی بیوی کو دروازہ پر بلا کر اُن کی زندگانی کے حالات دریافت کئے بیوی نے کہا۔ کہ ہم بہت غریب مسکین ہیں۔ بہت تنگی اور مشقت سے گزران کرتے ہیں۔ اور کچھ تواضع خاطر نہ کی آپ نے فرمایا۔ کہ تم اپنے شوہر سے ہمارا اسلام کہنا اور کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ بدل دو۔ کہ ایسی چوکھٹ اس گھر کے لائق نہیں۔

شام کیوقت جب حضرت اسمٰعیل شکار سے لوٹے تو مکہ کی گلی کوچوں میں نبوت کے برکات و انوار دیکھے سمجھ گئے کہ میرے والد ماجد تشریف لائے ہوں گے۔ اپنی بیوی سے پوچھا کہ کیا آج کوئی آیا تھا۔ اُس نے سارا واقعہ عرض کیا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ بزرگ میرے والد تھے۔ اور تو میرے گھر کی چوکھٹ ہے۔ مجھے تجھ کو طلاق دینے کا حکم دے گئے ہیں اُسے طلاق دے کر اس کے میکے پہنچا دیا۔ اور قبیلہ جرہم کی دوسری لڑکی سے نکاح کر لیا۔ پھر ایک مدت بعد ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارا سے کہا۔ کہ میں نے پہلی بار اسمٰعیل کو نہ دیکھا تھا۔ میری تسلی نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے اُسی پچھلی شرط پر دوبارہ جانے کی اجازت دی جب حضرت اسمٰعیل کے دروازہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ شکار کے لئے گئے ہیں۔ اُن کی نئی بیوی نے آپ کو دیکھ کر کہا۔ کہ حضرت تشریف لایئے۔ ہمارے غریب خانہ میں کچھ قیام کیجئے۔ آپ کے سر مبارک میں گرد و غبار ہے۔ مجھے اجازت دیں۔ کہ میں دھو دوں۔ حضرت نے فرمایا۔ کہ مجھے اُترنے کا حکم نہیں۔ وہ نیک بی بی ایک بڑا اونچا پتھر اٹھا کر لائیں (یہ وہی مقام ابراہیم تھا) اور اُن کی رکاب کے پاس رکھ کر عرض کیا۔ کہ اس پتھر پر قدم پاک رکھ کر اپنا سر شریف کچھ جھکا دیجئے جس سے کہ آپ اپنے معاہدہ پر بھی قائم رہیں اور مجھے خدمت کا موقعہ بھی مل جائے حضرت اس ذکاوت سے بہت خوش ہوئے اور ایسا ہی کیا۔ اُن بی بی نے آپ کا سر خوب دھو کر کنگھی کر دی۔ اس درمیان میں آپ نے اپنی بہو سے گھر کے سارے حالات پوچھے اُس نیک بی بی نے عرض کیا۔ کہ الحمد للہ ہم بہت آرام سے ہیں حق تعالیٰ نے ہمیں کسی مخلوق کا محتاج نہیں کیا ہمارے شوہر جنگل سے شکار لاتے ہیں۔ اور آب زمزم ہمارے پاس ہے۔ اُس گوشت اور اس پانی سے ہماری بخوبی گزر ہوتی ہے۔ آپ نے اُن کے حق میں دعائے خیر کی۔ اور فرمایا۔ کہ حق تعالیٰ تمہارے گوشت اور پانی میں برکت دے اس دعا کا یہ اثر ہے۔ کہ اب بھی وہاں گوشت بکثرت ہے۔ میں نے خود قربانی کے لئے ڈیڑھ روپیہ بکری خریدی اور دیکھا کہ پانچ روپے میں گائے چھ روپے دنبہ اور پچیس روپے قربانی کا اُونٹ فروخت ہوتا تھا

جبکہ ہندوستان میں چھ روپے کی بکری آتی تھی۔ القصہ آپ نے فرمایا کہ اپنے شوہر کو ہمارا سلام کہنا اور کہدینا کہ تمہارے دروازے کی چوکھٹ بہت اچھی ہے اسے غنیمت جانو۔ اور بخوبی محفوظ رکھو شام کو جب حضرت اسمٰعیل آئے تو انہوں نے پھر وہی انوار تجلیات دیکھے۔ بیوی سے پوچھا کہ کیا آج کوئی بزرگ تشریف لائے تھے۔ اُس نے کہا ہاں اور سارا واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا کہ وہ میرے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے تمہارے متعلق سفارش فرما گئے ہیں۔ کہ تمہیں اپنے ساتھ رکھوں اور تم سے اچھا برتاؤ کروں پھر کچھ مدّت بعد ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارا سے فرمایا کہ میں دوبار فرزند کو دیکھنے گیا۔ مگر نہ دیکھ سکا۔ اب تم اجازت دو۔ کہ میں اُسے دیکھوں اور اُس کے پاس چند روز رہوں حضرت سارا نے بخوشی بلاشرط اجازت دی حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں پہنچے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو دیکھا۔ کہ زمزم کے پاس ایک درخت کے نیچے تیروں کو درست کر رہے ہیں۔ باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو پہچانا فرزند بے اختیار اُٹھے پدر نے گلے سے لگایا پیشانی پر بوسے دیئے اور اس قدر روئے کہ پرندے ہوا میں رونے لگے اور وہاں کچھ قیام فرمایا۔ ایک دن فرمایا کہ اے اسمٰعیل رب نے مجھے حکم دیا ہے۔ کہ میں اس جگہ خانہ کعبہ کی تعمیر کروں چاہتا ہوں۔ کہ یہ کام صرف اپنے ہاتھ سے کروں اور تم اُس میں میری مدد کرو۔ اپنے فرمایا بسر وچشم ابراہیم علیہ السلام نے پہلی ذیقعد کو تعمیر کعبہ شروع فرمائی اور اسی مہینہ کی پچیسویں تاریخ کو ختم فرما دی۔ پھر آٹھویں ذی الحجہ آپ کو خواب میں فرزند کے ذبح کا حکم ہوا اور دسویں کو ذبحہ اسمٰعیل کا واقعہ درپیش آیا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ اس سال یا اس سے بعد روح البیان نے ۲۳ سیپارہ میں فرمایا کہ ذبح کے وقت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ<sup>۱۳</sup> سال کی تھی۔ مگر تفسیر عزیزی کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس وقت عمر کہیں زیادہ تھی۔ کیونکہ ان کی چودہ سال کی عمر میں اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اور اس کے بعد کچھ فاصلے سے ابراہیم علیہ السلام تین بار مکہ معظمہ تشریف لائے تیسری بار میں حضرت اسمٰعیل سے آپکی پہلی ملاقات ہوئی نیز یہ جو مشہور ہے۔ کہ حضرت ہاجرہ کی موجودگی میں ذبح کا واقعہ درپیش آیا۔ اس روایت کے رو سے غلط ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوا۔ کہ آپ حضرت ہاجرہ کی زندگی میں مکہ شریف تشریف لائے ہی نہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ ذبح کا واقعہ تعمیر کعبہ کے بعد ہوا کیونکہ پہلی ملاقات میں ۲۵ ذیقعد تک تعمیر ہوئی اور دسؔ ذی الحجہ کو واقعہ ذبح ہوا واللہ اعلم بالصّواب۔

**فائدے** اس آیت اور تفسیر سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** بیت اللہ قبول دعا کی جگہ ہے۔ اس لئے کہ حضرت خلیل نے اس جگہ یہ دعائے قبولیت اور اگلی دعائیں مانگیں **دوسرا فائدہ** عمل خواہ کتنا ہی نیک ہو اور کیسے ہی اخلاص سے ہو اُس کی قبولیت کی دعا کرنی چاہیئے۔ اس سے ہرگز غفلت نہ کی جائے تعمیر کعبہ بہت اچھا کام اور رب کے حکم سے ہوا تھا۔ مگر آپ نے پھر بھی اُس کی قبولیت کی دعا کی **تیسرا فائدہ** اپنے معاہدہ کی پابندی کرنا لازم ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارا کے سارے عہدوں کو بہت پابندی سے نباہا۔ کہ اُن کے بغیر اجازت اپنے ان بیوی بچوں کو دیکھنے بھی نہ آئے **چوتھا فائدہ** آب زمزم کا متبرک ہونا اسی لئے ہے۔ کہ یہ ایک نبی کی ایڑی سے جاری ہوا۔ اب اُس میں دوسری بزرگی یہ بھی ہے۔ کہ حضور سید الانبیاء کا لعاب دہن بھی اس میں مل گیا بعض علماء فرماتے ہیں۔ کہ تمام دنیا کے پانیوں میں زمزم افضل ہے۔ مگر زمزم سے بھی وہ پانی افضل جو ایک موقعہ پر حضور علیہ السلام کی انگلیوں سے جاری ہوا۔ کیونکہ یہ تو ایک نبی کے تلووں سے جاری ہوا۔ اور وہ سیدالانبیاء کی انگلیوں سے علیہم السلام

**پہلا اعتراض** ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارا کے کہنے پر اپنی دوسری بیوی اور بچے پر ظلم کیوں کیا۔ کہ ان کو ہلاکت کی جگہ میں چھوڑ دیا۔ اور اُن سے اتنے عرصہ تک تعلق نہ رکھا۔ اور حقوق زوجیت ادا نہ کئے ناجائز معاہدہ کی پابندی نہ کرنی چاہیئے تھی **جواب** گناہ وہ ہے۔ جو مرضی رب کے خلاف ہو یہ سارے کام جب رب کی مرضی سے اور اُس کے حکم سے ہو رہے تھے۔ تو گناہ کیسے حضرت ابراہیم تو رب کی مرضی پا کر بے قصور فرزند کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے یہ معاملات تو اُس سے کہیں ہلکے ہیں جناب

اس میں حضرت ہاجرہ کا سخت امتحان اور مکہ مکرمہ کی آبادی کا انتظام اور خانہ کعبہ کی تعمیر کا اہتمام اور سید الانبیاء علیہ السلام کی تشریف آوری کی دھوم دھام تھی بھول پھل کیلئے درخت لگاتے وقت باغ والے کو بلکہ خود زمین اور بیج کو تکلیف ہی ہوتی ہے۔ یہ چمن خلیلی کے آخری بیج کے کاشت کرنیکا وقت تھا۔ ان سب کو تکلیف ہونی ہی چاہیئے تھی **دوسرا اعتراض** حضرت سارا جیسی پاک ہستی نے ایسے ظلم کا کیوں حکم دیا۔ **جواب**۔ اس کا جواب پہلے سوال کے جواب میں گزر گیا۔ کہ یہ بھی الہام ربانی سے ہوا اور اس میں بھی وہی راز تھے جو ہم بیان کر چکے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ایک بار تو موسیٰ علیہ السلام کو جلتے ہوئے تنور میں ڈالدیا۔ اور دوبارہ دریا میں بہادیا یہ بھی بالہام الٰہی تھا۔ اس میں کوئی گناہ نہیں **تفسیر صوفیانہ** قلبی اور روحانی بنیادیں ہر انسان میں فطرتاً موجود ہیں۔ یہ قلب بیت اللہ ہے۔ اس کو بنانے والا شیخ طریقت اور تعمیر میں مدد دینے والا عالم شریعت ہے عالم تو شریعت کے پتھر شیخ کے حوالہ کرتا ہے جس کو شیخ طریقت کے چونہ سے جوڑ کر اُس پر تصوف کی عمارت قائم کرتے ہیں جس پر تجلی ربانی پڑتی ہے اور یہی قلب نفس اور سارے اعضاء کا قبلہ اور سجدہ گاہ قرار پاتا ہے یہ حضرات اس محنت کے وقت رب سے دعاء قبولیت کرتے ہیں۔ کہ مولیٰ تیرے بندوں کو تیری بارگاہ تک لانا ہمارا کام تھا۔ اور انہیں قبول فرمانا تیرا کام جیسے کہ بغیر معمار ظاہری گھر کی تعمیر نہیں ہوسکتی ویسے ہی بغیر شیخ اور عالم دین کے روحانی گھر کا بننا ناممکن ہے۔

| |
|---|
| رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَا |
| اے رب ہمارے اور بنا ہم کو مطیع واسطے اپنے اور اولاد سے ہماری جماعت مطیعہ واسطے اپنے اور دکھا ہمیں |
| اے رب ہمارے اور کر ہمیں تیرے حضور گردن رکھنے والا اور ہماری اولاد میں سے ایک امت تیری فرمانبردار ہمیں ہماری عبادت |
| سِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ |
| ارکان حج ہمارے اور توبہ ڈال اوپر ہمارے تحقیق تو ہی توبہ قبول فرمانے والا مہربان ہے۔ |
| کے قاعدے بتا۔ اور ہم پر اپنی رحمت کے ساتھ رجوع فرما بے شک تو ہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان |

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق** پچھلی آیت میں تعمیر کعبہ کا ذکر فرمایا گیا۔ اب عظمت کعبہ کا ذکر ہے۔ کہ بیت اللہ نگاہ خلیلی میں کوئی معمولی چیز نہ تھی۔ بلکہ نہایت اہم عظیم الشان جس کی وجہ سے انہوں نے اس کے مقبول ہونے اور ہمیشہ باقی رہنے کی دعا فرمائی **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں کعبہ کا ذکر کیا گیا۔ اور اب یہ بتایا جارہا ہے۔ کہ مقبول الٰہی وہی ہے جو اس گھر کا خدمتگار ہو اور حج کا پابند کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں تعظیم بیت اللہ اور طریقہ حج سکھانے کی دعا فرمائی **تیسرا تعلق** پچھلی آیت میں کعبہ کے حق ہونیکا ذکر تھا۔ اور اب دین اسلام کے سچے ہونیکا تذکرہ ہے۔ کہ حضرت ابراہیم نے زمین حرم میں ایک جماعت مسلمہ رہنے کی دعا کی اور وہ جماعت سوا مسلمانوں کے کوئی نہیں **تفسیر رَبَّنَا** یہاں یا پوشیدہ ہے یعنی اے ہمارے پالنے والے اور اللہ سے جب کچھ مانگنا ہو۔ تو اُسے رب کہہ کر پکارتے ہیں۔ کہ تو ہمارا پالنے والا ہے ہم تیرے بندے اور بندے اپنے پالنے والے ہی سے مانگا کرتے ہیں۔ ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ کہ جیسی چیز مانگنا ہو ویسے ہی نام سے پکارا جائے رزق کے لئے یا رزّاق شفاء کے لئے یا شافی الامراض دشمن کو مغلوب کرنے کے لئے یا قہار وغیرہ **وَاجْعَلْنَا** یہ جعل سے بنا جس کے چند معنی ہیں کرنا۔ بنانا۔ دینا۔ وصف کرنا حکم کرنا تعلیم دینا۔ بیان کرنا۔ رہبری کرنا (کبیر)

**مُسْلِمَیْنِ لَکَ** یہ لفظ مسلمٌ کا تثنیہ ہے جو کہ اسلام سے بنا جس کے معنی ہیں سپرد کرنا فرمانبرداری کرنا محفوظ ہو جانا مومن کو مسلم اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے کو رب کے سپرد کرتا ہے۔ اور اس کا فرمانبردار ہو جاتا ہے اور شیطان اور جہنم وغیرہ سے بچ جاتا ہے اصطلاح میں جب اسلام مطلق آتا ہے۔ تو ایمان اور درستی اعتقاد کے معنی دیتا ہے۔ اور لام کے ساتھ اطاعت شعاری اور فرمانبرداری کے معنی رکھتا ہے (کبیر روح البیان) لہٰذا یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔ یعنی اے اللہ ہمیں اپنا فرمانبردار رکھ یا بنا **وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا**۔ ذریّت کے معنی ہم پہلے عرض کر چکے مِنْ سے معلوم ہو رہا ہے۔ کہ آپ نے اپنی بعض اولاد کیلئے ہدایت کی دعا فرمائی۔ کیونکہ آپ کو معلوم ہو چکا تھا۔ کہ اُن میں بعض کفار بھی ہوں گے۔ اور ارادہ الٰہی کے خلاف دعا کرنا منع ہے۔ لفظ نا سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں وہ لوگ مراد ہیں۔ جو حضرت ابراہیم و اسمٰعیل دونوں کی اولاد میں ہوں یعنی بنی اسمٰعیل لہٰذا یہ دعا بنی اسرائیل کے لئے مخصوص نہیں **اُمَّۃً مُّسْلِمَۃً لَّکَ** اُمّۃٌ۔ اُمٌّ سے بنا بمعنے اصل ماں کو بھی امّ اس لئے کہتے ہیں۔ کہ وہ بچے کی اصل ہے۔ اور اصطلاح میں اُمّت وہ جماعت ہے جو کسی ایک چیز میں باختیار یا بلا اختیار جمع ہو شریعت میں وہ جماعت امّت کہلاتی ہے جو ایک دین میں متفق ہو۔ لہٰذا ایک باپ کی اولاد ایک پیر کے مریدین ایک گھر کے لوگ لغتاً امّت ہیں۔ شرعاً نہیں۔ کیونکہ یہاں دین میں جمع ہونا ملحوظ نہیں۔ **وَاَرِنَا**۔ یہ اراءۃٌ سے بنا جسکے معنی آنکھ سے دکھانا بھی ہیں۔ اور عقل و خیال سے ادراک کرانا بھی اور یہاں مناسک کے معنی کے لحاظ سے دونوں ہی بن سکتے ہیں یعنی دکھا یا بتا ہم کو **مَنَاسِکَنَا**۔ یہ منسکٌ بفتح سین کی جمع ہے۔ یا منسِکٌ بکسر سین کی نسک سے بنا ہے جس کے معنی ہیں عبادت کرنا اسی لئے عابد کو ناسک اور قربانی کو نسیکہ کہتے ہیں۔ منسکٌ بفتح سین عبادت کی جگہ اور بکسر سین عبادت کے اعمال عرف میں زیادہ تر حج کے افعال و مقامات کو مناسک کہتے ہیں یعنی خدایا ہمیں حج کے مقامات یعنی عرفات منٰی مزدلفہ وغیرہ دکھا دے یا حج میں کرنے کے کام احرام تلبیہ رمی وغیرہ بتا دے اور میرے مولیٰ چونکہ حج بڑی مشکل چیز ہے لہٰذا اگر آئندہ ہم حاجیوں سے کوئی خطا ہو جایا کرے تو **وَتُبْ عَلَیْنَا** تو ہماری توبہ قبول فرما لینا یا ہمیں توبہ کی توفیق دینا یا ہم پر کرم سے رجوع فرمانا خیال رہے کہ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت یہ ہے **وَاَرِھِمْ مَنَاسِکَھُمْ وَتُبْ عَلَیْھِمْ** (تفسیر کبیر) یہ قرأت مشہور قرأت کی گویا تفسیر ہے لہٰذا اس پر کوئی اعتراض نہیں **اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ**۔ تو ہی بار بار اور بہت توبہ قبول فرمانے والا ہے۔ خیال رہے کہ توبہ کے معنی ہیں رجوع کرنا بندے کی توبہ گناہوں سے اور رب کی توبہ غضب سے رجوع کرنا ہے۔ اس لئے توّاب رب کی بھی صفت ہے۔ اور بندے کی بھی **خلاصہ تفسیر** ابراہیم علیہ السلام نے فراست سے معلوم کر لیا۔ کہ اس تقریب اور تعمیر کعبہ کے رنگ میں کوئی دوسری دنیا ظاہر ہوگی اور عشق اپنے نئے کرشمے دکھائیگا۔ اس بیت اللہ کے ذریعہ باطن ظاہر کا لباس پہنے گا۔ اور آدمی ملائکہ کی طرح خلاف عقل اطاعت الٰہی کریں گے۔ اور اس میدان میں لبیک کا شور مچا کرے گا۔ چونکہ تعمیر کعبہ ہم سے کرائی گئی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کا سہرا ہمارے سر رہیگا۔ پس آپ نے خوش ہو کر سب سے اوّل اپنے لئے اور پھر اپنی مسلم اولاد کے لئے چند دعائیں کیں کہ عرض کیا کہ مولیٰ ہم دونوں کو ہمیشہ اپنا مطیع اور فرمانبردار رکھنا۔ کہ تیرے احکام کے قبول کرنے میں کبھی حیل حجّت نہ کیا کریں اور میری مسلمان اولاد کو بھی اسی طرح اپنا مطیع اور فرمانبردار بنانا۔ تاکہ حج کے ارکان ادا کرنے میں عقلی اعتراضات نہ کیا کریں۔ اس لئے کہ حج میں عقل کی مخالفت اور عشق کی پیروی ہے۔ مجنونوں کی سی وضع قطع بنانا کہ ننگے سر کفنی پہنے بال بکھیرے شور مچاتے پھرنا اس گھر کے گرد پروانہ کی طرح گھومنا کہیں پتھروں کو چومنا کہیں بلا وجہ بھاگنا کہیں دشمن کو بغیر دیکھے محض خیال پر پتھر مارنا کہیں جانوروں کا خون بہانا ہے مولیٰ انہیں ایسی توفیق دینا کہ بلا حیل و حجت ہر سال یہ کام کیا کریں۔ اور چونکہ یہ ارکان حج عقل سے سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ اس لئے تو خود ہمیں یہ کام بھی سکھا اور ہر کام

کی جگہ بھی بتا کہ کونسا کام کہاں ہوگا۔ احرام کہاں سے بندھے گا۔ قربانی کہاں ہوگی۔ اور پتھر کہاں پھینکے جائیں گے۔ اور چونکہ یہ سارے کام بہت دشوار بھی ہیں۔ اور اکثر لوگوں کو عمر میں ایک بار ہی نصیب ہوا کریں گے۔ اس لئے جو کوتاہیاں ہو جایا کریں انہیں معاف فرما دیا کرنا۔ رب نے اُن کی یہ ساری دعائیں حرف بحرف قبول فرمائیں کہ وہ دونوں حضرات زبردست احکام پر بلاتکلف عمل کر گزرے حضرت اسمٰعیل نے اپنے کو ذبح کے لئے پیش کر دیا اور خلیل اللہ بلا تامل بیٹے پر چھری لے کر کھڑے ہو گئے اور اُن کی ذریت میں ہمیشہ مومن رہے۔ اور خانہ کعبہ کا ہمیشہ حج بھی ہوتا رہیگا سیدنا علی وابن عباس سے روایت ہے۔ کہ اس دعا کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ ہمارے خلیل کو حج دکھا دو بلکہ کرا دو چنانچہ آپ حاضر ہوئے۔ اور آٹھویں ذی الحجہ سے تیرھویں تک کے سارے اعمال حج کرائے۔ اسی حالت میں تین دن دسویں گیارھویں بارھویں تین جگہ شیطان ملا۔ آپ نے اُسے دفع کرنے کے لئے سات سات کنکر مارے حضرت جبریل نے عرض کیا۔ کہ آئندہ آپ کی اولاد بھی اسی جگہ کنکر بھی مارا کرے (عزیزی) اللہ کی شان کہ آپ کی ایک جماعت کا نام مسلمان ہی رکھا گیا۔ لفظ مسلمۃً سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ دعا خاص امت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھی کیونکہ ہم سے پہلے کسی امت کا نام مسلمان نہ ہوا رب فرماتا ہے۔ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ **فائدے** اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ** دعا کیوقت رب کو پکارنا طریقہ انبیاء ہے۔ **دوسرا فائدہ** پہلے اپنے لئے پھر اپنی اولاد اور پھر سب مسلمانوں کے لئے دعا کرنی چاہیئے **تیسرا فائدہ** عقائد اور دین کی دعاء اعمال اور دنیوی حاجات سے پہلے چاہئے۔ جیساکہ اس آیت میں ہے۔ **چوتھا فائدہ** اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہمیشہ موحدین صالحین رہے کوئی وقت ایسا نہ آیا۔ کہ سارے مشرک ہو جاتے چنانچہ زمانہ جاہلیت میں بھی زید ابن عمر اور قس ابن ساعد اور عبد المطلب ابن ہاشم حضور علیہ السلام کے جد امجد اور عامر ابن ضرب وغیرہ اسلام پر تھے۔ کہ خدا کو ایک جانتے تھے ثواب وعذاب حشر و نشر کے قائل تھے۔ نہ تو مردار کھاتے تھے اور نہ بت پرستی کرتے تھے (تفسیر کبیر وعزیزی) **نوٹ** حضور علیہ السلام کے والدین یا جدین کو کافر کہنے والے اس آیت اور تفسیر کبیر کی اس عبارت پر غور کریں۔ اگر حضور علیہ السلام کے پہلے سارے بنی اسمٰعیل مشرک ہو گئے تھے۔ تو لازم آتا ہے۔ کہ حضرت خلیل کی یہ دعا قبول نہ ہوئی یقیناً ایک جماعت ایمان پر رہی اور اُسی جماعت میں حضور کے آباواجداد تھے نیز قیامت تک سارے سید قریش کبھی گمراہ نہ ہوں گے۔ کیونکہ یہ لوگ ابراہیمی ہیں۔ کہ اُن میں مومن رہنا ضروری **پانچواں فائدہ** بیت اللہ کے پاس دعا مانگنا سنت ابراہیمی ہے۔ **پہلا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام ہمیشہ سے مسلمان نہ تھے ورنہ آپ اپنے ایمان کی دعا نہ کرتے **جواب**۔ اس کے چند جواب ہیں۔ ایک تو وہ جو تفسیر میں معلوم ہو چکا۔ کہ مسلمین سے مطیع فرمانبردار مراد ہے۔ اِجْعَلْنَا کے معنی ہیں رکھ ہمیں۔ یعنی ہمیں ہمیشہ مطیع رکھ تو یہ دعاء استقامت ہے۔ نہ کہ دعاء ایمان دوسرے یہ کہ یہاں زیادتی کی درخواست ہے۔ یعنی ہمیں طاعت کی زائد توفیق عطا فرما انبیاء کرام اگرچہ معصوم ہیں۔ مگر رب سے مستغنی نہیں تیسرے یہ کہ یہ دعا تعلیم کے لئے ہے۔ تاکہ مسلمان بھی ایسے ہی دعا کیا کریں **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ یہ دونوں حضرات معصوم نہ تھے ورنہ توبہ نہ کرتے توبہ تو گنہگار کرتے ہیں **جواب**۔ اس کے بھی چند جواب ہیں۔ ایک وہ جو تفسیر میں معلوم ہوا کہ اس کے معنی ہیں۔ کہ ہم حاجیوں کی توبہ قبول اور ہماری اولاد سے جو حج کی ادائیگی میں کچھ کوتاہی ہو جائے اُس سے درگزر فرما دوسرے یہ کہ یہاں بھول چوک سے توبہ مراد ہے۔ انبیاء کرام سے بغیر قصد خطائیں ہو جاتی ہیں۔ جس سے وہ توبہ کرتے رہتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ یہ بھی تعلیم اُمت کیلئے ہے۔ کہ کعبہ معظمہ میں آکر توبہ کر لیا کریں یہ قبولیت کی جگہ ہے۔ **تیسرا اعتراض** ابراہیم علیہ السلام نے صرف اپنی اولاد کے لئے کیوں دعا کی چاہیئے تھا۔ کہ سارے بندوں کیلئے دعا

کرتے **جواب**:۔ اس کے بھی چند جواب ہیں. ایک یہ کہ اولاد ماں باپ کی دعا کی زیادہ حقدار ہے. رب فرماتا ہے قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا دوسرے یہ کہ جب پیغمبروں کی اولاد درست ہو جائے. تو اُن کی وجہ سے دیگر لوگ بھی درست ہو جائیں گے. بڑوں کی اصلاح سے چھوٹوں کی اصلاح خود بخود ہو جاتی ہے. **چوتھا اعتراض** ابراہیم علیہ السلام پہلے اپنی اولاد کے لئے امامت مانگ چکے. اب ان کے لئے ہدایت کیوں مانگی. امامت میں ہدایت آگئی تھی **جواب** امامت تو ایک وقت میں ایک ہی کو ملتی ہے مگر ہدایت جماعت کو ہو گی. وہ دعا افراد کے لئے تھی اور یہ جماعتوں کے لئے **تفسیر صوفیانہ** ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا میں دو لطیف اشارے ہیں. ایک یہ کہ اپنی طرف سے قبول کیا ہوا ایمان معتبر نہیں. بلکہ رب کا دیا ہوا چاہیئے. اس لئے عرض کیا کہ مولیٰ ہمیں اپنی نفوس کے حوالے نہ کر کہ ہم خود ایمان لائیں. بلکہ توفیق دے. کہ تجھ ہی سے تیرے ہی بتانے سے تجھ ہی پر ایمان لائیں. بلکہ یوں کہو کہ تیری ہی دی ہوئی توفیق [illegible] سے تیـ [illegible] ری ہی با [illegible] مانیں اپنا ایمان شیطان کا تھا. جو مفید نہ ہوا دوسرے یہ کہ دینداروں سے آخرت قائم ہے اور دنیاداروں سے یہ جہان آباد دنیا کی آبادی تین چیزوں سے ہے. ایک کھیتی اور باغ دوسرے جنگ و جدال تیسرے تجارتی سامان کی نقل و حرکت اور یہ تینوں ہی چیزیں موت و حساب کو بھلانے والی ہیں. صوفیائے کرام فرماتے ہیں. کہ اگر بے وقوف نہ رہیں تو دنیا برباد ہو جائے. لہٰذا حکمت یہ ہے. کہ نہ یہاں سب بدکار ہوں اور نہ سب نیک کار اس لئے حضرت خلیلہ نے بعض کے لئے دعا کی مشائخ عظام کو بھی چاہیئے کہ اپنے سارے مریدین کی ہدایت کا یقین نہ کریں مولانا فرماتے ہیں.

استن ایں عالم اے جاں غفلت است　　　ہوشیاری ایں جہاں را آفت است

ہوشیاری زاں جہاں است و چو آں　　　غالب آید پست گردد ایں جہاں

ہوشیاری آفتاب و حرص یخ !!!　　　ہوشیاری آب و ایں عالم وسخ !

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ

اے رب ہمارے اور بھیج ہم اُن کے　ایک رسول　اُن میں سے جو تلاوت کرے　اوپر اُن کے آئتیں تیری　اور سکھائے انہیں

اے رب ہمارے اور بھیج اُن میں ایک رسول انہی میں سے کہ اُن پر تیری آیتیں تلاوت فرمادے اور انہیں تیری کتاب اور پختہ علم سکھائے

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۲۹)

کتاب　اور　حکمت　اور پاک فرمائے انہیں　تحقیق تو ہی　غالب　حکمت والا ہے

اور انہیں خوب ستھرا فرمادے بے شک تو ہی ہے غالب حکمت والا

**تعلق**. اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے. **پہلا تعلق** اہل کتاب بیت اللہ کی عزت اور مکہ معظمہ کی حرمت اور حضور علیہ السلام کی نبوت کی سے کے منکر تھے. گذشتہ آیتوں میں پچھلی دو باتیں ثابت فرمائی گئیں. کہ کعبہ معظمہ اور مکہ مکرمہ وہ مقامات ہیں جنہیں حضرت خلیل اللہ نے بڑی محنت اور جانفشانی سے بنایا اور بسایا. اب حضور علیہ السلام کی نبوت کا ثبوت دیا جا رہا ہے. کہ یہ وہ نازنین پیغمبر ہیں جن کی حضرت خلیل نے دعائیں مانگیں اور نبیوں نے اِن کے گن گائے. شعر

گن گائیں جن کے انبیاء مانگیں رُسل جن کی دعا　　　وہ دو جہاں کے مدعا صل علیٰ یہ ہی تو ہیں

بے دتوفو تم کیسے بدنصیب ہو کہ اِن تینوں کی برکتوں سے محروم **دوسرا تعلق** پچھلی آیتوں میں ابراہیم علیہ السلام کی پانچ چھ دعاؤں کا ذکر ہوا جن میں سے بعض دنیاوی نقطہ نگاہ سے تھیں اور بعض دینی نقطہ نگاہ سے اب اُن کی اس جامع دعا کا ذکر ہے جس میں

دین و دنیا دونوں ہیں یعنی حضور علیہ السلام کا بھیجنا **تیسرا تعلق** پچھلی آیتوں میں بتایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام نے ارکان حج بتانے کی دعا کی اب بتایا جارہا ہے کہ انہوں نے اُس معلم کی بھی دعا مانگی جو تمام عالم کو یہ باتیں سکھائے یعنی پہلے علم کا ذکر تھا۔ اور اب معلم کا **چوتھا تعلق** پچھلی آیت میں بتایا گیا کہ خلیل اللہ نے امت مسلمہ کی دعا کی۔ اب بتایا جارہا ہے کہ انہوں نے اُس کی بھی دعا فرمائی جس سے یہ جماعت قائم رہے یعنی پہلے مقتدیوں کا ذکر تھا۔ اب مقتدیٰ کا **تفسیر رَبَّنَا** اگر یہ دعائیں علیحدہ وقتوں میں مانگی گئی ہیں۔ تب تو ہر دعا کے اوّل میں ربّنا عرض کیا گیا اور اگر ایک ہی وقت میں کی گئیں۔ تو ایک ہی دعا میں ربّنا بار بار عرض کیا گیا۔ تاکہ معلوم ہو کہ دعا میں بار بار رب کو پکارنا بہتر ہے **وَابْعَثْ فِيْهِمْ** یہ بَعْثٌ سے بنا جس کے معنی ہیں اُٹھانا یا بھیجنا یہاں دونوں ہی بن سکتے ہیں۔ فیھم کی ضمیر یا تو مکہ والوں کی طرف لوٹتی ہے اور یا امت مسلمہ کی طرف مگر روح البیان اور تفسیر مدارک نے دوسری بات اختیار کی یعنی اے مولیٰ میری اولاد میں جو مسلمان جماعت ہو اس میں بھیجنا **رَسُوْلًا** ایک رسول نبی اور رسول میں بعض علماء اعتباری فرق کرتے ہیں یعنی ایک ہی ذات کو رسول تو اس لئے کہتے ہیں کہ رب کا بھیجا ہوا ہے۔ اور نبی اس لئے کہ وہ مخلوق کو خالق کی خبر دیتا ہے۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ رسول کتاب والا پیغمبر اور نبی اُس سے عام بعض کہتے ہیں کہ رسول نئی کتاب والا پیغمبر اور نبی اس سے عام اور بعضوں نے نئی کتاب والے کو مرسل اور مطلق کتاب والے کو رسول اور مطلق پیغمبر کو نبی کہا اس لئے کہا جاتا ہے کہ نبی تو ایک لاکھ چوبیس ہزار (۱۲۴۰۰۰) ہیں اور رسول تین سو تیرہ (۳۱۳) اور مرسل چار (۴)، یہاں رسول سے صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہیں۔ اور یہ دعا خاص انہیں کے لئے ہے چند وجہ سے ایک یہ کہ اس سے بنی اسمٰعیل یا مکہ کا پیغمبر مراد ہے۔ اور وہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ کیونکہ بنی اسمٰعیل اور مکہ میں صرف آپ ہی نبی آئے دوسرے اسی لئے کہ یہاں رسول واحد فرمایا یعنی صرف ایک رسول بھیج اور بنی اسرائیل میں صدہا رسول تشریف لائے۔ مگر بنی اسمٰعیل میں صرف حضور ہی۔ تیسرے اس لئے کہ اس رسول کی یہ صفتیں بیان کی کہ جو لوگوں کو آیتیں پڑھ کر سنائے اور اُن کا تزکیہ کرے جس سے معلوم ہوا۔ کہ اس نبی کی کتاب باقاعدہ پڑھی جائے اور اُس کے بعد سلسلہ نبوت ختم ہو کر ولایت باقی رہ جائے اور یہ دونوں صفتیں حضور ہی کی ہیں کہ تلاوت اور قرأت دھوم دھام سے انہیں کی کتاب کی ہوئی۔ اور آپ ہی خاتم النبیین ہوئے۔ چوتھی اس لئے کہ رب تعالیٰ نے دوسری آیت میں حضور کی یہ ہی صفات بیان فرمائیں کہ فرمایا اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ الخ معلوم ہوا۔ کہ جو حضرت ابراہیم نے عرض کیا وہی رب نے کیا۔ پانچویں اس لئے کہ مشکوٰۃ باب فضائل سید المرسلین میں ہے۔ کہ حضور فرماتے ہیں۔ میں دعاء ابراہیم اور بشارت عیسیٰ ہوں اور اپنی والدہ کا وہ خواب ہوں۔ جو انہوں نے میری پیدائش پاک کے وقت دیکھا۔ کہ اُن کو ایک نور ظاہر ہوا جس سے شام کے محل نظر آگئے چھٹے اس لئے کہ اسی پر تمام اُمت کا اجماع ہے۔ کہ آپ ہی دعاء خلیلی ہیں۔ کیونکہ آپ ہی سے خلیل اللہ علیہ السلام کا دین اور نام پھیلا پھر عرض کیا۔ کہ **مِنْهُمْ** یعنی اے مولا وہ شاندار رسول اُس ذریت ہی میں سے ہو فیھم اور منھم کہہ کر یہ بتایا کہ یہاں ہی پیدا ہوں اور میری ہی اولاد میں ہوں۔ تاکہ اُن کی طفیل اس مکان اور مجھ کو اور میرے سارے خاندان کو شرف حاصل ہو اور میری ذریت ان سے فیض لینے میں عار نہ کرے۔ کیونکہ اعلیٰ خاندان والوں کو غیر کی سرداری برداشت نہیں ہوتی اپنے کی سرداری بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔ آج بھی سادات کرام سید عالم کی بات جلد مان لیتے ہیں۔ نیز وہ لوگ اسی صورت میں اُس پیغمبر کے حسب و نسب صدق و امانت سے بخوبی واقف ہوا کرے۔ نیز ہر شخص اپنی اولاد کی خیریت کا حریص ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے بھی تمنا کی کہ نبی آخر الزمان کا فخر مجھ کو اور میری اولاد کو حاصل ہو۔ اور یہ پھول میرے ہی چمن میں کھلے پھر عرض کیا۔ کہ **يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ** ظاہر یہ ہے۔ کہ آیات سے مراد قرآنی آیتیں ہیں۔

کیونکہ تلاوت انہیں کی ہوتی ہے۔ مگر روح البیان نے فرمایا۔ کہ اس سے توحید و رسالت کے دلائل مراد ہو سکتے ہیں یعنی وہ رسول پہلا کام تو یہ کرے کہ تیرے بندوں کو خاص کر میری ذریت کو قرآنی آیتیں اور اُن کا پڑھنا سکھائے۔ اور صرف پڑھا کر ہی نہ چھوڑ دے۔ بلکہ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ انہیں اُس کتاب کے معنی اور علم ظاہر یعنی شریعت بھی سکھائے کیونکہ بغیر مضامین کے صرف الفاظ یاد کرنا کافی نہیں خیال رہے۔ کہ یعلّم تعلیم سے بنا جس کے معنی ہیں آہستہ آہستہ اور اچھی طرح سکھانا اور الکتاب میں الف لام عہدی ہے یعنی وہ خاص کتاب قرآن آہستگی سے اُن کے خوب ذہن نشین کرا دے اور حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہ السلام کی طرح ساری کتاب ایکدم نہ لے آئے۔ اور اس کے بعد وَالْحِكْمَةَ انہیں علم باطن اور قرآن کریم کے اسرار بھی سکھائے کیونکہ علم ظاہر کے بغیر علم باطن بے دینی ہے۔ اور علم باطن کے بغیر علم ظاہر جعلسازی (تفسیر عزیزی) خیال رہے۔ کہ حکمت حکمٌ سے بنا جس کے لغوی ہیں پھیر دینا۔ روک لینا۔ پالینا۔ علم کو اس لئے حکمت کہا جاتا ہے۔ کہ اُس سے نفس جہالت سے پھر جاتا ہے۔ بری باتوں سے رک جاتا ہے۔ اور حق کو پالیتا ہے۔ بعض نے فرمایا۔ کہ یہاں حکمت سے مراد فقہ ہے بعض نے کہا۔ کہ حدیث وسنت۔ بعض نے کہا۔ کہ قرآن پاک کے اسرار بعض نے کہا۔ کہ حق باطل میں فیصلہ کرنیوالی چیز بعض نے کہا۔ کہ کتاب سے مراد صحیح قول و عمل اسی لئے عالم باعمل کو حکیم کہتے ہیں (تفسیر کبیر) اور ممکن ہے کہ ساری ہی چیزیں مراد ہوں۔ کیونکہ حضور علیہ السلام سب ہی کچھ سکھایا۔ اور اے مولیٰ انہیں فقط علم ہی نہ سکھائے بلکہ وَيُزَكِّيهِمْ اُن سے اچھے اعمال کرا کر اُن کے جسموں اور دلوں اور سینوں اور خیالات اور وہم وغیرہ کو پاک بھی فرما دے۔ خیال رہے۔ کہ یزکی زکوٰۃ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں صاف کرنا اور بڑھانا اسی لئے فرضی صدقہ کو زکوٰۃ کہتے ہیں۔ کہ اُس سے باقی مال صاف بھی ہو جاتا ہے اور بڑھتا بھی ہے۔ یہاں اس کے چند معنی ہیں۔ ایک یہ کہ انہیں اعمال صالحہ کرا کر اور اچھے عقیدے بنا کر کفر اور گناہوں کے میل سے پاک کرے (روح البیان) دوسرے یہ کہ اُن کے لوح دل کو دنیوی کدورات سے ایسا صاف کر دے جس سے کہ سارے حجاب اُٹھ جائیں پھر اُس آئینۂ قلبی میں غیبی چیزیں نقش ہوں۔ اور بغیر سیکھے سکھائے انہیں علم حاصل ہو۔ اور حقائق خود بخود اُن میں جلوہ گر ہو جائیں (عزیزی) تیسرے یہ کہ قیامت کے دن وہ رسول تیری بارگاہ میں اُن کے گواہ صفائی ہوں۔ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (تفسیر کبیر) خیال رہے کہ سارے پیغمبر اپنی نافرمان اُمّتوں کے خلاف گواہی دیں گے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطا پوش ہیں۔ کہ اپنی اُمّت کی نیکیاں ظاہر فرمائیں گے۔ اور گناہوں پر پردہ ڈالیں گے۔ اور اے مولیٰ ہم یہ دعا تجھ سے اسی لئے مانگتے ہیں۔ کہ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ تو ہی عزّت و حکمت والا ہے۔ تیری عزّت کا یہ تقاضی نہیں کہ کسی کو بغیر علم کے چھوڑ دے۔ لہٰذا عزّت و حکمت کا یہ تقاضا ہوا کہ وہ نبی آخر الزمان دنیا میں ضرور بھیجے جائیں۔ خیال رہے۔ کہ عزیز عزت سے سے بنا جس کے معنی ہیں غلبہ اور انوکھا۔ اور بے مثل ہونا عزیز یعنی غالب اور بے مثل **خلاصہ تفسیر** ابراہیم علیہ السلام جب یہ سارے کام کر چکے اور کعبہ اور مکہ بنا اور بسا چکے تو آخیر میں اُن کا ذکر کیا۔ کہ جن کی طفیل دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اور جن کے دم کی یہ ساری بہار ہے جن کے طفیل خلیل اور کعبہ مقام و منا دنیا میں جلوہ گر ہوئے عرض کیا۔ کہ اے مولیٰ ان لوگوں میں ایک ایسا جلیل القدر پیغمبر بھیج دے جن میں یہ سات صفتیں ہوں۔ اہلیت مکہ والوں میں سے ہو (فیھم) ابراہیمی ہو (منھم) یعنی مکی مدنی ابراہیمی ہاشمی مطلبی ہو۔ اپنی شان رسالت میں اکیلا ہو یعنی خاتم النبیین اور امام المرسلین ہو (رسولاً) سب کو اور خصوصاً میری اولاد کو آیتیں سنائے بتائے اور پڑھنا سکھائے یعنی انہیں حفظ بھی کرائے اور علم قرأت بھی سکھائے (یتلوا الخ) انہیں تیری کتاب کے مضامین سکھا کر عالم فقیہہ اور مجتہد بنا دے (ویعلمھم الخ) اور انہیں قرآنی اسرار سکھا کر اسرار دار بنا دے اور طریقت کے

مدارج انہیں طے کرادے (والحکمۃ) یعنی انہیں صاحب حال وقال کردے۔ اُن کے دل اور روح پاک وصاف کرکے محبوب سے خبردار کردے۔ اور اُن بے پڑھوں کو اپنے فیض سے غوث وقطب کا سردار بنادے کہ اُن کے دروازوں سے ولایت تقسیم ہو کہ اے میرے مولیٰ اُس نبی کو اپنی ساری صفات کا مظہر بناکر بھیج کہ اُسے دیکھ کر تو یاد آجایا کرے (آنَا مِنْ اَنْتَ الخ) خلاصہ دعا یہ ہوا کہ لوگ حافظ سے قرآن مجید پڑھتے ہیں۔ اور قاری سے اُس کے الفاظ سیکھتے ہیں۔ اور مولوی سے اس کے معنی معلوم کرتے ہیں۔ پیر کامل سے اُس کے اسرار تک پہنچتے ہیں۔ غرض صرف قرآن کریم کے سیکھنے کے لئے چند آستانوں پر حاضری دینی پڑتی ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی۔ کہ اے مولیٰ وہ نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم تنہا یہ سارے فیوض دے اُس کی بارگاہ کا بیٹھنے والا کسی کے دروازہ پہ نہ جائے۔ بلکہ سارا جہاں اُس کے غلاموں کے پاس آئے وہ اپنے غلاموں کو حافظ عالم قاری مجتہد صوفی فقیر بادشاہ قاضی سب کچھ بنادے۔ بلکہ خرپوتی شرح قصیدہ بردہ میں ہے۔ کہ بعض صحابہ وہ بھی ہیں۔ جو اسلام لاتے ہی آن کی آن میں قاضی عالم حافظ اور قاری بناکر بھیج دیئے گئے۔ شعر

جو فلسفیوں سے حل نہ ہوئے اور نکتہ وروں سے کھل نہ سکے ۔ وہ راز اک کملی والے نے سمجھا دیئے چند اشاروں میں

**پہلا فائدہ** اپنی قوم اور اہل قرابت کی خیر خواہی کرنا سنت انبیاء ہے حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ ہم پہلے اپنے اہل بیت کی پھر بنی ہاشم کی پھر اہل قرابت قریش کی پھر ساری امت کی شفاعت کریں گے حضرت عثمان فرماتے ہیں۔ کہ خدا کی قسم اگر جنت کی کنجی میرے ہاتھ میں ہو تو کسی بنی امیہ کو جنت سے باہر نہ چھوڑوں (تفسیر عزیزی) **دوسرا فائدہ** حضور علیہ السلام کا میلاد شریف کرنا سنت الٰہیہ اور سنت انبیاء ہے۔ کہ اس آیت میں حضور کی تشریف آوری کی ہی تو دعا ہے۔ اور تشریف آوری کا ذکر ہی میلاد ہے۔ بلکہ نماز وکلمہ میں بھی میلاد شریف ہے۔ اس کے لئے ہماری کتاب جاء الحق کا مطالعہ کرو **تیسرا فائدہ** حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں کے سردار ہیں۔ کیونکہ آپ خلیل اللہ علیہ السلام کی دعا اور اُن کے سارے اعمال کا اصلی مقصود ہیں **چوتھا فائدہ** قرآن کے ساتھ حدیث کی بھی ضرورت ہے۔ اور قرآن کے ظاہری معنی کے ساتھ کچھ باطنی معنی بھی ہیں۔ کیونکہ یہاں کتاب کے ساتھ حکمت کا بھی ذکر ہے۔ اور صفائی قلبی کا بھی **پانچواں فائدہ** کوئی شخص قرآن پاک فقط اپنے علم سے نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے کہ اس دعا سے معلوم ہوا کہ وہ نبی اُس قرآن کو سکھائیں گے فلسفہ۔ منطق اور ریاضی آسان ہے کہ وہ انسان کے بنائے ہوئے علوم ہیں اور دنیوی ماسٹروں سے پڑھے جاتے ہیں۔ مگر قرآن مشکل کہ وہ خدا کا کلام ہے۔ اور اُس کے لئے رب نے خود معلم بھیجا **چھٹا فائدہ** یہ کہنا جائز ہے۔ کہ حضور علیہ السلام تمام عالم کو پاک فرماتے ہیں۔ انہیں علم حکمت اور خدا کی ساری نعمتیں دیتے ہیں۔ جیسے کہ اس آیت سے معلوم ہوا **ساتواں فائدہ** دعا کے آخیر میں رب کی حمد اور حضور پر درود پڑھنا چاہیئے جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہاں کیا **پہلا اعتراض** اگر حضور علیہ السلام سید الانبیاء ہیں۔ تو درود ابراہیمی میں ابراہیم علیہ السلام کا نام کیوں حضور کے ساتھ ہے معلوم ہوتا کہ درجہ میں وہ حضور کے برابر ہیں **جواب** چند وجہ سے ایک یہ کہ اُنہوں نے اللہ کے حبیب کے لئے دعا کی رب نے فرمایا۔ کہ اے مسلمانو چونکہ انہوں نے میرے حبیب کیلئے دعا کی ہے۔ تم اُن کے لئے قیامت تک دعا کرتے رہو اُن کا درجہ اسی لئے ہے کہ حضور کے دعا گو ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ابراہیم علیہ السلام نبی سالدہیں۔ مِلَّةَ اَبِیْکُمْ اِبْرَاهِیْمَ اور حضور علیہ السلام رحم والے والد جیسے کہ ابن مسعود کی قراءت میں اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ کے ساتھ ہے وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ یعنی حضور علیہ السلام مسلمانوں کے والد ہیں۔ لہٰذا والد کا ذکر والد ہی کے ساتھ چاہیئے تیسرے یہ کہ ابراہیم علیہ السلام حج کی ندا دینے والے ہیں۔ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ اور حضور علیہ السلام دین کے منادی مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ

رب نے دونوں مناد یوں کو درود میں جمع فرمایا چوتھے یہ کہ حضرت ابراہیم نے عرض کیا تھا۔ وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ یعنی اے رب میرا اچھا ذکر آئندہ لوگوں میں باقی رکھ حق تعالیٰ نے ان کی یہ دعا اس طرح قبول فرمائی۔ کہ اُن کا نام حبیب کے نام کے ساتھ درود میں ملا دیا۔ کہ اُس کی برکت سے اُن کا ذکر خیر باقی ہے ان وجوہ سے حضور علیہ السلام کی افضلیت کا صاف پتہ لگتا ہے۔ **دوسرا اعتراض** درود ابراہیمی سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدا کی رحمت ابراہیم علیہ السلام پر حضور علیہ السلام سے بھی زیادہ پتہ ہے۔ کیونکہ اُس میں صلوٰۃ ابراہیمی کو مشبہ بہ بنایا گیا۔ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاهِیْمَ اور مشبہ بہ مشبہ سے بڑھ کر ہوتا ہے جیسے کہ زید شیر کی طرح ہے یقیناً شیر زید سے زیادہ بہادر ہے **جواب** بیشک ایک رحمت میں ابراہیم علیہ السلام واقعی بڑھ چڑھ کر ہیں۔ کہ انہیں محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا فرزند ملا جس سے ان کی شہرت اور عزت حرمت کو چار چاند لگ اور اس درود میں یہ ہی رحمت مراد ہے۔ کہ اب ابراہیم علیہ السلام بڑھ کر ہیں یا نہیں بے شک افضل ہیں۔ مگر حضور ہی کی طفیل بھی اس کے بہت جواب ہو سکتے ہیں۔ عام علماء یہ فرماتے ہیں۔ کہ یہاں محض شہرت کی وجہ سے تشبیہ دی گئی۔ واللہ اعلم بالصواب **تفسیر صوفیانہ** اگر گھر میں سب کچھ ہو۔ مگر روشنی نہ ہو تو کوئی بھی اُس گھر سے نفع حاصل نہیں کر سکتا سارے متاع ابراہیمی اُن کے بھرے گھر کا سامان ہے۔ اور حضور علیہ السلام اُس گھر کے نور اسی لئے کعبہ کو بیت اللہ اور حضور علیہ السلام کو نور اللہ کہتے ہیں حضرت خلیل نے سب کچھ بنا کر اُس نور کی دعا کی جس سے ظاہر و باطن چمکے اور عالم شریعت طریقت کا نظام قائم رہے اب بھی وہی نور بذریعہ اولیاء کاملین ہر دل تک پہنچ رہا ہے۔ اگر انسان عبادات اور ریاضات کا سارا سامان جمع کر لے اور شیخ کا ہاتھ نہ پکڑے تو وہ اُس سے فائدہ نہیں پا سکتا۔ اس بیابان دنیا میں ایسے محافظ رہبر کی ضرورت ہے جو ہماری دولت ایمانی کو شیطان ڈاکو سے بچا کر اصل مقصود تک پہنچا دے۔ شیخ کامل ہی سالک کے نفس کو التفات ماسوا اللہ کے میل سے پاک صاف کرتا ہے۔ اور اُس پر اندرونی اور بیرونی آیات قدرت تلاوت کرتا ہے جس سے کہ یہ زمرہ صدیقین میں داخل ہو جاتا ہے حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

بکوی عشق منہ بے دلیل راہ قدم     کہ من بخویش نمودم صد اہتمام نشد

بارگاہ الٰہی عزیز ہے اُس تک ہر بے تمیز نہیں پہنچ سکتا چاہیئے کہ کسی صاحب تمیز کا پیچھا پکڑ لیا جائے۔

وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ

اور کون ہے رغبتی کرے گا دین ابراہیم سے سوا اوس کے جو جاہل کرے جان اپنی کو اور البتہ تحقیق چن لیا ہم نے ان کو

اور ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیرے اُس کے کہ جو دل کا احمق ہے۔ اور بے شک ضرور ہم نے دنیا میں

فِی الدُّنْیَا ۚ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ

بیچ دنیا کے اور تحقیق وہ بیچ آخرت کے البتہ نیکوں میں سے ہیں جب کہا واسطے ان کے رب اون کے نے اسلام والا

اُسے چن لیا اور بیشک وہ آخرت میں ہمارے خاص قرب کی قابلیت والوں میں ہے جبکہ اُس سے اُس کے رب نے

قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۳۱﴾

کہا اونہوں نے اسلام لایا میں واسطے پالنے والے جہانوں کے

فرمایا گردن رکھ عرض کی میں نے گردن رکھی اُس کے لئے جو رب ہے سارے جہان کا

**تعلق** اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق** پہلے کعبہ معظمہ مکہ مکرمہ کی عظمت اور حضور علیہ السلام کی نبوت جن کے اہل کتاب منکر تھے اُن کو ملت ابراہیمی کی اصل ثابت کیا گیا۔ اب اُس کا نتیجہ بتایا جا رہا ہے۔ کہ یہ تینوں چیزیں دین ابراہیمی میں اصل الاصول ہیں۔ جو اُن کا منکر ہے وہ دین ابراہیمی سے علیحدہ ہے۔ اہل کتاب اِن تینوں کا انکار کر کے کس منہ سے اپنے ملت ابراہیمی ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ **دوسرا تعلق** اس سے پہلے دین ابراہیمی کا نمونہ دکھا دیا گیا۔ اب فیصلہ فرمایا جا رہا ہے۔ کہ جو اس نمونہ کے مطابق ہو وہ دین ابراہیمی پر ہے اور اُس کا مخالف اس ملت سے کوسوں دور ہے اور اے اہل کتاب تم تو ہر بات میں ابراہیم علیہ السلام کے خلاف ہو اور مسلمان ساری باتوں میں اُن کے مطابق حج طواف قربانی نبی علیہ السلام کی پیروی وہ ہی کرتے ہیں۔ نہ کہ تم لہٰذا وہ ہی ابراہیم علیہ السلام کے سچے متبع ہیں تم دعویٰ اتباع میں جھوٹے ہو۔ **تیسرا تعلق** پچھلی آیت سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں ایسے نبی کی تشریف آوری کی درخواست کی۔ کہ جو لوگوں کو قرآن کی آیتیں پڑھائے۔ اور اُن کے دلوں کو پاک و صاف کرے۔ اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اس نبی میں ہی وہ ساری صفتیں موجود ہیں۔ اے اسرائیلیو نہ تمہارے پاس روحانی صفائی ہے۔ اور نہ تلاوت لہٰذا دین ابراہیمی پر وہ ہیں نہ کہ تم۔ **شان نزول** حضرت عبداللہ ابن سلام نے جو کہ یہود کے بہت بڑے عالم تھے مسلمان ہو کر اپنے دو بھتیجوں مہاجر اور سلمہ کو دعوت اسلام دی اور اُن سے فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے۔ کہ حق تعالیٰ نے توریت میں فرمایا ہے۔ کہ میں اولاد اسمٰعیل سے ایک نبی پیدا کروں گا۔ جن کا نام احمد ہو گا۔ جو اُن پر ایمان لائیگا ہدایت پائیگا۔ اور جو اُن پر ایمان نہ لائے گا وہ ملعون ہو گا۔ یہ سن کر سلمہ تو ایمان لے آئے مگر مہاجر نے اسلام سے انکار کر دیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (خزائن عرفان و روح البیان)

**تفسیر** وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ۔ مَن استفہامیہ ہے جس سے اس دعویٰ کا بہت ظاہر ہونا بتایا جا رہا ہے۔ یَرْغَبُ۔ رغبٌ سے بنا جس کے لغوی معنی ہیں۔ وسعت و گنجائش چونکہ خواہش اور آرزو میں ارادہ کو وسعت ہوتی ہے۔ اس لئے اصطلاح میں اسے رغبت کہا جاتا ہے۔ جب اسکے بعد عَنْ آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں۔ نفرت و کراہت اور جب اس کے بعد فِیْ یا اِلیٰ آتا ہے تو اُسکے معنی آرزو یا خواہش ہوتے ہیں۔ جیسے اِلیٰ رَبِّنَا رَاغِبُوْنَ۔ چونکہ یہاں عن آ رہا ہے۔ اس لئے اس سے خواہش اور ارادہ کا پھر جانا مراد ہے۔ یعنی دین ابراہیمی سے کون بے رغبتی کر سکتا ہے تفسیر عزیزی سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہاں بھی یرغب کے بعد فِیْ والی عبارت اور عن ملتہ سے پہلے ایک اور عبارت پوشیدہ ہے یعنی کون ہے جو رغبت کرے دوسرے دین میں دین ابراہیمی سے عدول کر کے دونوں کا مطلب ایک ہی ہے یعنی وہ ابراہیم علیہ السلام جن پر سارے نبی اسرائیل و بنی اسمٰعیل فخر کرتے۔ اُن سے کون منہ پھیرے گا۔ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ سوا اُسکے جو ولی احمق ہو سَفِہٗ سَفَہٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ہلکا پن بے وقوف اور جاہل کو اس لئے سفیہ کہتے ہیں کہ وہ عقل کا ہلکا ہوتا ہے۔ یہ لازم بھی آتا ہے متعدی بھی یعنی ہلکا ہونا اور ہلکا کرنا نَفْسَہٗ کے زبر میں چند احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں سَفِہَ متعدی ہے۔ اور یہ اس کا مفعول بہ۔ دوسرے یہ کہ سَفِہَ کے معنی جہل اور خسر ہیں۔ تیسرے یہ کہ اس کے معنی اہلک ہیں۔ چوتھے یہ کہ اس کے معنی اَضَلَّ ہیں۔ یعنی جو اپنے کو ہلکا کر دے یا اپنے کو نقصان میں ڈال دے یا ہلاک کر دے یا گمراہ کر دے۔ بعض نے فرمایا۔ کہ یہ سَفِہَ لازم ہے اور نَفْسَہٗ کا زبر فِی کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ ایک قرأت میں سَفَّہَ ف کی تشدید سے ہے تب تو بالکل ظاہر ہے (تفسیر کبیر) وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا۔ اصطفینا صفوٌ سے بنا جس کے معنی ہیں کسی چیز کا ملاوٹ سے پاک ہونا۔ اور کسی کو اپنے لئے خالص کر کے چن لینا ہمارے حضور علیہ السلام کا نام پاک مصطفےٰ ہے

کیونکہ آپ عیبوں سے پاک ہیں۔ اور رب نے آپ ہی کو اپنے لئے چن لیا۔ یعنی حضرت ابراہیم کی شان اور اُن کا حال تو یہ ہے۔ کہ رب تعالےٰ نے اُن کو دنیا ہی میں بہت سی صفات میں چُن لیا ہے۔ آپ ہی نبوت۔ رسالت۔ امامت۔ ولایت۔ ابوّتِ انبیاء کے جامع ہیں۔ آپ کے متبعین قیامت تک رہیں گے۔ خلیل آپ ہی کا لقب ہے۔ افعالِ حج آپ ہی پر ظاہر ہوئے۔ آپ ہی کا بنایا ہوا کعبہ ہمیشہ کے لئے باقی رکھا گیا۔ آپ ہی کا بسایا ہوا مکہ مکرمہ جائے امن بنا۔ آپ ہی کی تمام آسمانی دین والے تعریف کرتے ہیں۔ اور پھر یہ ہی نہیں کہ فقط دنیا میں آپ کا یہ چناؤ ہو بلکہ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ وہ آخرت میں بھی خاص صالحین میں سے ہوں گے یعنی اگرچہ اُس دن اُن کی نبوت اور رسالت اور امامت ظاہر نہ ہوگی۔ کیونکہ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و جلالت سامنے ہوگی۔ مگر پھر بھی خاص ولایت کا تاج اُن کے سر پر ہوگا (تفسیر عزیزی) کہ تمام لوگ قبروں سے ننگے اُٹھیں گے۔ اور سب سے پہلے آپ ہی کو خلعت ربانی ملے گی۔ سب بے داڑھی والے ہوں گے۔ آپ کے چہرہ انور پر داڑھی پاک ہوگی وغیرہ۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ۔ یہ اِذْ یا تو ظرفیہ ہے اور پوشیدہ فعل کا مفعول یا اصطفینا کا ظرف یا تعلیلیہ اور اصطفینا کی علت یعنی وہ وقت بھی یاد کرو۔ جب اُن سے رب نے یہ کہا۔ یا رب نے اُنہیں جبھی چُن لیا تھا جب اُن سے یہ فرمایا تھا۔ یا اُنہیں رب نے اس لئے چُنا کہ اُن سے یہ فرمایا + خیال رہے کہ یہاں قال سے وحی خفی یعنی الہام مراد ہے کیونکہ اس واقعہ کے وقت آپ کی نبوت ظاہر نہ تھی (تفسیر عزیزی) یعنی اُن کے رب نے اُن کے قلب میں اشارۃً فرمایا کہ اَسْلِمْ اسلام لاؤ۔ یہاں اسلام کے عرفی معنی مراد نہیں۔ کیونکہ انبیاء کرام ہمیشہ ہی سے مومن ہوتے ہیں۔ بلکہ لغوی معنی مراد ہیں یعنی اپنے کو رب کے سپرد کرو۔ اور اُس کے حضور سر جھکا دو + عزیزی نے فرمایا کہ رب نے یہ فرما کر انہیں اپنے میں ایسا جذب کر لیا کہ وہ فنا فی اللہ ہو گئے۔ اور بے اختیار پکار اُٹھے کہ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ میں نے اپنے کو رب کے سپرد کر دیا + عزیزی نے فرمایا۔ کہ رب نے اُن میں سارے کمالات کی قابلیت پیدا کر کے کمالات عطا فرمائے۔ اور اُنہوں نے اپنے جان و اولاد۔ اہل قرابت اور زن و فرزند سب کچھ راہِ مولیٰ میں قربان کر کے اپنے جذب کا عملی ثبوت دے دیا + روح البیان نے فرمایا کہ یہاں اسلام سے عرفی اسلام ہی مراد ہے۔ اور اس کے معنی ہیں کہ اسلام پر ثابت قدم رہو۔ آپ نے اس کا اقرار کیا اور ثابت کر دکھایا۔ اور یہ واقعہ جب ہوا۔ جب کہ آپ ایک غار میں پرورش پا رہے تھے۔ اور سات سال کی عمر شریف میں ہی چاند۔ تارے اور سورج کی ربوبیت کا انکار اور حق تعالےٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا۔ جس کا ذکر انشاء اللہ ساتویں پارہ میں اس آیت کی تفسیر میں آئے گا فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً الخ

**خلاصہ تفسیر**:۔ اے اہل کتاب تم جو کعبہ کی عظمت مکہ مکرمہ کی عزت نبی آخر الزمان کی نبوت کا انکار کرتے ہو۔ تو در حقیقت ملّتِ ابراہیمی کے منکر ہو۔ کیونکہ یہ چیزیں جو اسلام کے اصول ہیں۔ ملّت ابراہیمی کی بھی اصل ہیں اور دین ابراہیمی کا اُس کے سوا کون انکار کرے گا۔ جو ازخود نادان اور بڑا احمق ہو۔ کیونکہ ابراہیم السلام وہ ہیں کہ جنہیں خدا تعالےٰ نے دنیا میں بھی برگزیدہ کیا کہ سارے موحد اُن کو اپنا پیشوا جانتے ہیں۔ اور ہر جگہ اُن کا ذکر خیر جاری ہے۔ اور عرب و عجم میں اُن کے نام کے ڈنکے بج رہے ہیں۔ اور آخرت میں بھی اُن کے مرتبے بڑے بلند ہیں۔ اور وہ خاص درجہ والوں سے ہیں۔ اور یہ بزرگیاں اُنہیں کیوں نہ ملتیں۔ جب اُن کی فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کا یہ عالم ہے۔ کہ جب ہم نے اُن سے فرمایا کہ تم ہر طرح ہمارے مطیع ہو جاؤ۔ اور ہمارے حضور اپنا سر نیاز جھکا دو۔ تو اگرچہ اُن کو بہت سی دنیوی رکاوٹیں در پیش تھیں اور بڑی مصیبتوں کا سامنا تھا۔ مگر بلا تامّل فرما دیا۔ کہ میں دل و جان سے اپنے رب کا تابعدار ہوں۔ اور اس پر ایسا عمل کیا کہ باید و شاید۔ جب اُنہیں آگ میں ڈالا گیا۔ تو حضرت جبریل نے عرض کیا۔ کہ کیا آپ کو کچھ حاجت ہے۔ فرمایا تم سے کچھ نہیں۔ عرض کیا رب سے ہے۔ فرمایا وہ خود جانتا ہے عرض کرنے کی ضرورت نہیں (روح البیان یہ ہی مقام) ہمارا اشارہ پاکر فرزند کی قربانی کے لئے تیار ہو گئے۔ ہماری رضا کے لئے گھر دبار چھوڑ دیا۔ غرضکہ جو کہا تھا وہ کر کے دکھا دیا۔

**فائدے**:۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے:۔ **پہلا فائدہ**۔ صحیح مذہب کی پہچان یہ ہے۔ کہ وہ سلف صالحین کے مطابق ہو۔ کیونکہ وہ ہدایت کا نمونہ ہیں۔ دیکھو رب نے اسلام کی حقانیت کا یہاں یہ ثبوت دیا۔ کہ دین ابراہیمی کا ذکر فرما

کہ اسلام کی اس سے مطابقت فرمادی۔ آج بے تیدی کا یہ حال ہے۔ کہ ہر کس وناکس نیا دین نکال لیتا ہے۔ اور بے دھڑک گذشتہ بزرگوں کو کافر کہدیتا ہے۔ جیسے دیوبندی۔ نیچری وغیرہ کہ ان بے دینوں کے ہاں وہ کام شرک ہیں جنہیں بزرگان دین متبرک سمجھ کر کرتے آئے۔ **دوسرا فائدہ** ہم کو چاہیئے۔ کہ اگرچہ خود اچھے نہ ہوں مگر کسی اچھے کے پیچھے لگ جائیں۔ دیکھو اس آیت میں یہ ہی تو بتایا کہ اس ہستی ابراہیم کی پیروی کا نرا بیوقوف ہی انکار کرے گا۔ کیونکہ عقلمند تو سمجھتا ہے۔ کہ انجن اپنے پیچھے والے ہر قسم کے ڈبوں کو کھینچ لے جاتا ہے۔ خواہ وہ سیکنڈ۔ فسٹ ہو یا تھرڈ۔ یا مال گاڑی کا ڈبہ۔ مگر چاہیئے یہ کہ اس سے کڑی مضبوط ملی ہوئی ہو ۔ **تیسرا فائدہ**۔ کبھی بالواسطہ بھی کسی کی پیروی کی جاتی ہے۔ دیکھو اس آیت نے حضور کی پیروی کو ابراہیم علیہ السلام کی پیروی قرار دیا۔ ہم کو بھی چاہیئے۔ کہ حضور کی پیروی کے لئے موجودہ علمائے ربانی اور کامل مشائخ کی غلامی کریں **چوتھا فائدہ**۔ حضرات انبیائے کرام ظہور نبوت سے پہلے بھی رب کے سچے مطیع فرمانبردار ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہاں اَسۡلِمۡ اور اَسۡلَمۡتُ کی گفتگو ابراہیم علیہ السلام کی نبوت سے پہلے کی ہے۔ جو ان کو کسی وقت بے دین مانے وہ خود بے دین ہے ۔ **پہلا اعتراض**۔ اگر اِذۡ قَالَ اصطفا کا ظرف ہو۔ تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ ابراہیم علیہ السلام کو رب نے خاص اس وقت چُنا۔ نہ کہ اس سے پہلے۔ تو کیا پہلے وہ برگزیدہ نہ تھے؟

**جواب**۔ آپ کی برگزیدگی ہمیشہ سے ہے۔ مگر بعض وقت اس کے آثار لوگوں پر بھی ظاہر ہوتے رہے۔ یہ وقتوں کی قید آثار کے ظہور کے لحاظ سے ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے۔ کہ زید میدان جنگ میں بہادر ہے۔ یا بکر مدرسہ میں پہنچکر علم کا دریا ہے۔ ظاہر ہے کہ زید میں شجاعت تو ہر وقت ہے مگر اس کا ظہور میدان جنگ میں۔ **دوسرا اعتراض**۔ اس آیت میں کہا گیا۔ کہ ابراہیم علیہ السلام کو رب نے چُنا۔ تو چاہیئے کہ انہیں بھی مصطفےٰ کہا جائے حالانکہ حضور علیہ السلام کے سوا کسی کا یہ لقب نہیں۔ **جواب**۔ بے شک رب نے انہیں برگزیدہ فرمایا۔ مگر یہ لقب حضور ہی کا ہے۔ وصف ہونا اور بات ہے لقب ملنا دوسری بات۔ حق تعالٰے سارے مسلمانوں سے فرماتا ہے هُوَ الَّذِيۡ يُصَلِّيۡ عَلَيۡكُمۡ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ مگر انبیائے کرام کے سوا کسی بھی مسلمان کو صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہتے۔ انسان سُنتا بھی ہے۔ دیکھتا بھی ہے۔ قدرت بھی رکھتا ہے۔ مگر سمیع و بصیر و قدیر رب ہی کو کہا جاتا ہے۔ **تیسرا اعتراض**۔ یہاں اَسۡلِمۡ فرمانے سے معلوم ہوا کہ کبھی ابراہیم علیہ السلام اسلام سے خالی بھی تھے حالانکہ انبیاء کفر سے ہمیشہ پاک ہوتے ہیں۔ **جواب**۔ اس کا جواب تفسیر میں گذر گیا۔ کہ اس سے یا تو اطاعت کرنا مراد ہے۔ یا اسلام پر قائم رہنا۔ یا اپنے کو رب کے سپرد کر دینا۔ یا خلائق سے منہ موڑ کر رب کی طرف جذب ہو جانا۔ اور اگر ظاہری معنی اسلام ہی مراد ہوں تو یہ واقعہ عالم ارواح کا ہے۔ نہ کہ اس دنیا کا۔ اس عالم میں تمام روحیں صفات سے خالی پیدا ہوئیں۔ پھر نوری چھینٹے سے ان کے مختلف حالات ہوئے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

**چوتھا اعتراض**۔ کیا وجہ ہے کہ خدا نے ابراہیم ہی کو پسند کیا۔ اگر پارسا ہونے سے کیا۔ تو پارسا تو اور بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اس کی کیا وجہ کہ جو دین ابراہیمی کو نہ مانے۔ وہ بے عقل ہو؟ (ستیارتھ پرکاش) **جواب**۔ شاید پنڈت جی کی آنکھیں دکھتی ہیں جس سے وہ پوری آیت دیکھ نہ سکے۔ رب تعالٰے سارے پارساؤں کو پسند فرماتا ہے۔ چونکہ ابراہیم علیہ السلام اعلیٰ درجہ کے پارسا ہیں۔ اس لئے وہ اعلیٰ درجہ کے مقبول اور ان کا دین رب کا سیدھا راستہ ہے۔ جو سیدھا راستہ چھوڑ کر ٹیڑھا راستہ اختیار کرے۔ اس سے بڑھ کر بے وقوف کون ہے!؟

**تفسیر صوفیانہ**:۔ اس آیت میں نہایت نفیس دو اشارے ہیں۔ ایک یہ کہ جو اپنے نفس کو پہچان لے گا۔ وہ رب کو ضرور پہچانے گا بُت پرست اور دنیا پرست دراصل اپنے سے ناواقف ہے۔ اگر اپنے کو جانتا۔ تو رب سے کبھی بے خبر نہ رہتا۔ اپنے ضعف سے رب کی قوت کا اپنے عجز سے رب کی قدرت کا۔ اپنے فنا سے رب کی بقا کا پتہ لگتا ہے۔ نفس پردہ ہے۔ جس کے ورا جلوہ محبوب ہے۔ مولانا اس کو خوب حل فرماتے ہیں ؎

جملہ معشوق است عاشق پردۂ  زندہ معشوق است و عاشق مردۂ

چیست توحید خدا آموختن  خویش را پیش واحد سوختن

ہستیت درہستِ آں ہستی نواز　　ہچو مس در کیمیا اندر گداز

رب نے بھی اپنا پتہ اس طرح دیا وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ہمارے جلوے تمہارے نفسوں میں ہیں۔ تم دیکھتے کیوں نہیں + دوسرا اشارہ یہ ہے کہ رب کے راستہ میں ایک عظیم الشان دریا ہے۔ جس کا نام ہے شریعت۔ اُس کی کشتی ہے طریقت۔ یوں سمجھو کہ شریعت اسلام ہے اور طریقت استسلام۔ جو بہادر اس کشتی کے ذریعہ یہ دریا پار کر گیا۔ تو پھر وہ رب کا ہے اور رب اُس کا۔ دیکھو رب نے ابراہیم علیہ السلام کو اصطفٰی کا تمغہ کب دیا جب اُن سے اَسْلِمْ فرما کر یہ دریا عبور کرا لیا۔ محبوب بننے کے لئے ضروری ہے کہ محجوبیت کے پردے پھاڑ دیئے جائیں۔ اور رب جانے کہ اَسْلِمْ فرما کر اُن کے کتنے حجاب اٹھا دیئے۔ اور اُنہوں نے اَسْلَمْتُ کہکر کتنے پردے پھاڑ ڈالے۔ معراج میں اپنے حبیب کو اُدْنُ کہکر قریب کیا۔ یہاں خلیل کو اسلم فرما کر صحیح وسلامت اپنے سے واصل کر لیا۔ اللہ ہمیں واصلین میں سے فرمائے۔

وَوَصّٰی بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ

اور وصیت کی ساتھ اوس کے ابراہیم نے بیٹوں اپنے کو اور یعقوب نے کہ اے بچو میرے تحقیق اللہ نے چن لیا واسطے تمہارے یہ دین

اور اسی دین کی وصیت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے کہ اے میرے بیٹو بیشک اللہ نے یہ دین تمہارے لئے چن لیا

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ ﴿۱۳۲﴾

پس ہرگز نہ مرو تم مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو

تو نہ مرنا　مگر　مسلمان

**تعلق**:۔ اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**۔ پچھلی آیت میں ابراہیم علیہ السلام کے ذاتی کمال کا ذکر فرمایا گیا۔ کہ وہ خود کامل بلکہ کامل تر ہیں۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ وہ کامل گر بھی ہیں یعنی اوروں کو بھی اپنے فیوض سے کامل فرماتے ہیں۔ گویا پہلے اُن کے کمال کا ذکر تھا اور اب اُن کے اکمال کا۔ **دوسرا تعلق**۔ کمالات ابراہیمی کو سن کر کوئی کہہ سکتا تھا کہ اُن کی ملت اُنہیں کے ساتھ تھی۔ کہ اس پر یا تو وہ خود عامل ہوں۔ یا بڑے بڑے پیغمبر ہم عوام کو یہ حق نہیں کہ اُن کے دین کی پیروی کریں۔ کیونکہ یہ ہمارے استعداد سے بڑھ کر ہے۔ اب اس وہم کی تردید فرمائی جا رہی ہے۔ کہ اُن کا دین بہت آسان اور واضح ہے۔ جس کی اُنہوں نے اپنی ساری اولاد کو وصیت فرمائی۔ اگر وہ اُن کی خصوصیات سے ہوتا۔ تو اُس کا دوسروں کو حکم نہ فرماتے۔ **تیسرا تعلق**۔ پہلے فرمایا گیا تھا کہ دین ابراہیمی سے بے وقوف ہی علیحدہ رہے گا۔ اس کی ایک وجہ تو اسی آیت میں بیان کر دی گئی۔ کہ وہ نہایت کامل دین ہے۔ دوسری وجہ اب بتائی جا رہی ہے۔ کہ اس پر قائم رہنے کی اُنہوں نے وصیت بھی کی تھی۔ اور جو اپنے بزرگوں کی وصیت نہ مانے وہ بڑا بے وقوف ہے۔

**تفسیر**:۔ وَوَصّٰی یہ وصیّۃ سے بنا۔ جس کے لغوی معنی ہیں کسی پر کوئی نیک بات پیش کرنا۔ اصطلاح میں تاکیدی حکم کو وصیت کہا جاتا ہے۔ اسی لئے مرنے والے کے آخری پیغاموں کو وصیت کہتے ہیں۔ کہ اُن کے پورا کرنے کی بہت تاکید ہے نیز رب فرماتا ہے یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ فِیْٓ اَوْلَادِكُمْ۔ لہذا وصّٰی کا یہ مطلب نہیں کہ اُنہوں نے اپنی زندگی پاک میں تو اپنے فرزندوں کو تبلیغ اسلام نہ فرمائی صرف وصال کے وقت فرمائی۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے بتاکید حکم دیا۔ یا وفات کے وقت بھی حکم فرما گئے۔ بِهَا۔ اُس اسلام کا یا اُس ملت کا چونکہ اسلمت میں تو اسلام کا ذکر آگیا تھا۔ اور عَنْ مِّلَّةِ میں ملت کا۔ لہذا دونوں طرف ضمیر لوٹ سکتی ہے اگرچہ ضمیر مؤنث ہے۔ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ۔ بنی ابن کی جمع ہے یعنی بیٹے اگرچہ آپ کی وصیت سب کے لئے ہی تھی۔ مگر بیٹوں کا ذکر خصوصیت سے اس لئے کیا۔ کہ وہ آپ کا نمونہ بنیں۔ اور دنیا میں تبلیغ کریں۔ خیال رہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے تین بیویوں سے آٹھ بیٹے تھے۔ حضرت ہاجرہ کے شکم سے اسمٰعیل علیہ السلام جو سب سے بڑے تھے۔ اور حضرت سارا کے شکم سے اسحاق علیہ السلام۔ جو حضرت اسمٰعیل سے چودہ سال عمر میں چھوٹے تھے۔ اور قنطورا بنت یقطن کنعانیہ

کے شکم سے چھ بیٹے مدین[1]۔ مداین[2]۔ زمران[3]۔ یقشان[4]۔ یشبق[5] اور نوخ[6] (تفسیر روح البیان۔ عزیزی۔ حقانی قدرے اختلاف) خیال رہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے چچا ہاران کی بیٹی سارا سے نکاح کیا۔ پھر حضرت ہاجرہ سے۔ حضرت سارا کی وفات کے بعد قنطورا سے آپ کے دو بیٹے یعنی اسمٰعیل اور اسحاق علیہم السلام تو پیغمبر ہوئے۔ باقی چھ متقی مسلمان۔ اسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ معظمہ میں بسایا۔ اور اسحاق علیہ السلام کو اپنے ساتھ کنعان میں رکھا۔ اور مدین کو وہاں رکھا جہاں اُنہیں کے نام سے شہر مدین بسا۔ شعیب علیہ السلام انہیں کی اولاد سے تھے۔ مداین وغیرہ کو شام وروم وغیرہ میں بحکم الٰہی آباد کیا۔ پھر اسمٰعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے ہوئے۔ جن میں سے منجلے بیٹے (چھوٹے سے بڑے) قیدار تھے۔ جن کی نسل سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں (از عزیزی وحقانی) وَیَعْقُوْبُ ہماری قرأت میں یعقوب ب کے پیش سے ہے۔ یعنی یعقوب علیہ السلام نے بھی اپنی اولاد کو یہی وصیت کی۔ اور ایک قرأت میں یعقوب کا نصب بھی ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنے سارے بیٹوں اور اپنے پوتے یعقوب علیہ السلام کو وصیت کی (تفسیر کبیر) یعقوب عقب سے بنا جس کے معنی ہیں پاؤں کی ایڑی۔ چونکہ آپ اپنے بھائی عیصو کے ساتھ ہی اس طرح پیدا ہوئے۔ کہ آپ کے ہاتھ اُن کی ایڑی سے لگے ہوئے تھے۔ اس لئے آپ کا لقب یعقوب ہوا۔ خیال رہے کہ اسحاق علیہ السلام کا نکاح لوط علیہ السلام کی دختر سے ہوا۔ اُن کے شکم سے یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے۔ لہٰذا آپ ابراہیم کے پوتے اور حضرت لوط کے نواسے ہیں۔ آپ کے دو بیبیوں اور چند لونڈیوں کے بطن سے بارہ بیٹے تھے۔ آپ نے اپنے ماموں لایان کی بیٹی لیّا سے نکاح کیا۔ جن سے روبیل۔ شمعون اور لاوا اور یہودا ہوئے۔ لیّا کے انتقال کے بعد اُن کی ہمشیرہ یعنی اپنی چھوٹی سالی راحیل سے نکاح کیا۔ جن سے یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے باقی چھ بیٹے یعنی زبتون[1]۔ یشاخر[2]۔ دان[3]۔ نفتالی[4]۔ اور کاد[5]۔ اور اشترکہ۔ بلّہ۔ زلفہ وغیرہ لونڈیوں سے پیدا ہوئے۔ (عزیزی وحقانی) یعقوب علیہ السلام کی عمر ۱۴۷ سال کی ہوئی۔ اور ایک روایت میں ہے۔ کہ آپ نے مصر میں وفات پائی۔ اور آپ کی وصیت کے مطابق بیت المقدس میں اسحٰق علیہ السلام کی قبر کے پاس دفن کیا گیا۔ یٰبَنِیَّ۔ اے میرے بچو۔ یہاں بنیں کو ی متکلم کی طرف مضاف کیا گیا۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ اللہ نے تمہارے واسطے یہ دین یعنی اسلام جو کہ تمام دینوں سے چھٹا ہوا دین ہے پسند کیا اور چن لیا۔ الدِّین میں یا تو الف لام عہدی ہے یا جنسی یعنی اس خاص دین کو یا مطلق دین کو چن لیا۔ گویا اسلام ہی دین ہے۔ اس کے سوا اور ادیان دین ہی نہیں اور جو بھی اعتقاد وعمل اس کے خلاف ہو رب کے ہاں مقبول نہیں۔ لہٰذا خبردار فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ تم اسلام کے سوا کسی اور دین پر نہ مرنا۔ یہاں مرنے سے ممانعت نہیں۔ اور نہ اس کا یہ مطلب ہے۔ کہ تم زندگی میں تو کفر کرتے رہنا۔ اور موت کے وقت ایمان لے آنا۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ ہر وقت اسلام پر قائم رہنا کیونکہ موت کا ہر وقت ہی اندیشہ ہے۔ لہٰذا کوشش کرنا۔ کہ موت تمہیں اسلام پہ پائے۔ ایک روایت میں ہے۔ کہ یعقوب علیہ السلام جب مصر تشریف لائے۔ تو وہاں بعض لوگوں کو بُت پرستی کرتے دیکھا۔ تو آپ نے اپنے سب فرزندوں کو جمع فرما کر یہ وصیت فرمائی۔

**خلاصہ تفسیر**۔ اے لوگو ابراہیم علیہ السلام خود تو کامل اور کامل تر تھے۔ مگر انہوں نے چاہا کہ میرے جانشین بھی میرے ہی قدم بقدم چل کر میرا نمونہ بنیں۔ تاکہ لوگ اُنہیں دیکھ کر میرے راستہ پر چل سکیں۔ اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے تو اپنے بیٹوں کو اور یعقوب علیہ السلام نے اپنے فرزندوں کو بتاکید حکم دیا تھا۔ کہ اے بچو جھوٹے دین تو لوگوں کے اپنے بنائے ہوئے ہیں مگر اپنے بندوں کے لئے جو رب نے دین بھیجا ہے وہ یہ دین اسلام ہے۔ لہٰذا تم ہمیشہ اسی دین پہ قائم رہنا۔ اور کوشش کرنا کہ دنیا سے اسی دین پہ جاؤ۔ اور چونکہ موت کا ہر وقت اندیشہ ہے۔ لہٰذا ہر وقت ہی اسلام پہ جمے رہنا۔ یہاں وصیّت فرمانے میں چند خوبیاں ہیں۔ ایک یہ کہ وصیت عام طور پر خوف یا موت کے وقت پر ہوتی ہے۔ اور ان وقتوں میں انسان بہت احتیاط سے کام لیتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اُن حضرات نے بہت احتیاط فرماتے ہوئے تاکیداً یہ حکم فرمایا۔ دوسرے یہ کہ اپنے بچوں کو خاص طور پر یہ وصیّت فرمائی۔ اور ظاہر ہے کہ ماں باپ اولاد پر زیادہ مہربان ہوتے ہیں۔ تو اگر اسلام سے زیادہ اُن کی نگاہ میں کوئی اور چیز پیاری ہوتی۔ تو اس کی وصیت فرماتے لہٰذا اسلام ہی بڑی لذیذ اور افضل چیز ہے۔ تیسرے یہ کہ اُن حضرات نے یہ وصیت عام طور پر اپنے سب فرزندوں کو کی۔ چوتھے یہ کہ اس وصیت میں

کسی جگہ اور وقت کی قید نہ لگائی۔ پانچویں یہ کہ اس کے سوا اور کوئی وصیت نہ کی۔ ان تمام وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی نگاہ میں دین بڑی ضروری چیز تھی۔ جو بدنصیب کہ ان کی وصیت پوری نہ کرے۔ وہ ان کی روح کو تکلیف دیتا ہے۔ اور وہ اپنے کو ابراہیمی کہنے کا حقدار نہیں۔

**فائدے**:۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ**۔ بزرگوں کو چاہیئے۔ کہ سب سے پہلے اپنی اولاد کو سنبھالیں پھر دیگر لوگوں کو جیساکہ اس آیت سے معلوم ہوا۔ اور حضور علیہ السلام کو بھی یہی حکم دیا گیا کہ وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ۔ جس پر عمل کرتے ہوئے آپ نے پہلے اپنے اہل قرابت ہی کو تبلیغ فرمائی۔ یہاں تک کہ اپنی لختِ جگر فاطمہ زہرا سے فرمایا۔ کہ اگر تم نے اسلام اختیار نہ کیا اور غضب الٰہی جوش میں آگیا۔ تو میں دور نہ کروں گا **دوسرا فائدہ**۔ اپنی اولاد اور اہل قرابت کو آہستگی سے بار بار سمجھانا چاہیئے۔ جیساکہ وصّٰی کی تشدید سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان حضرات نے عمدہ طریقہ سے ہمیشہ تبلیغ فرمائی۔ **تیسرا فائدہ**۔ اسلام اور ایمان کا فائدہ جب ہی ہے کہ جب اس پر موت ہو۔ اسی لئے ان حضرات نے موت تک اسلام پر قائم رہنے کا حکم دیا۔ **چوتھا فائدہ**۔ انبیائے کرام کی نگاہ میں اہم چیز دین ہے نہ کہ دنیوی مال۔ اسی لئے وہ حضرات وصیت بھی دین ہی کی فرماتے ہیں۔ نہ کہ دنیا کی۔ حضور علیہ السلام نے بھی فرمایا۔ کہ ہماری میراث علم ہے۔ ہم جو کچھ مال چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔ روافض کہتے ہیں۔ کہ حضور علیہ السلام کو اپنے آخیر وقت میں بھی فدک وغیرہ مال کی فکر تھی۔ اور آپ اس ہی کی حضرت علی اور فاطمہ زہرہ کو وصیت فرما گئے۔ اس سے لازم آتا ہے۔ کہ ابراہیم اور یعقوب علیہم السلام حضور سے بڑھ جائیں۔ کہ وہ تو دین کی وصیت کریں اور آپ چند کھجوروں کی۔ **پانچواں فائدہ**۔ بغیر ایمان پیغمبرزادگی بیکار ہے بلکہ بڑوں کی اولاد کو زیادہ کامل الایمان ہونا چاہیئے۔ تاکہ ان سے ان کے بزرگوں کا نام روشن ہو۔ اور لوگ راہ ہدایت پائیں۔ **پہلا اعتراض**۔ موت غیر اختیاری چیز ہے۔ تو لَا تَمُوْتُنَّ فرما کر اس سے منع کرنے کے کیا معنی۔ حکم اور ممانعت اختیاری چیز کی ہوتی ہے **جواب**۔ اس کا جواب تفسیر میں گذر گیا۔ کہ یہاں موت سے ممانعت نہیں۔ بلکہ غیر مسلم ہو کر مرنے سے ہے۔ اور درحقیقت یہ اسلام پر رہنے کا حکم ہے۔ جیسے کہ کوئی کہے کہ نماز مت پڑھو بغیر حضور قلب۔ اس میں نماز سے منع نہیں۔ بلکہ دل حاضر رکھنے کا حکم ہے۔ **دوسرا اعتراض**۔ ابراہیم اور یعقوب علیہم السلام کے دین کا نام اسلام نہ تھا۔ تو انہوں نے اسلام پر قائم رہنے کی کیوں وصیت کی۔ **جواب**۔ یہاں اسلام کے لغوی معنی مراد ہیں نہ کہ اصطلاحی۔ ہر پیغمبر کی اُمت لغتاً مسلمان یعنی رب کی فرمانبردار تھی۔ اس وصیت میں لطیف اشارہ یہ بھی ہے۔ کہ میری اولاد میں جو بھی جس پیغمبر کا زمانہ پائے۔ اس کی اطاعت کرے۔ کیونکہ یہ ہی رب کی اطاعت اور یہ ہی اسلام ہے۔ یہ ضد نہ کرے۔ کہ ہم تو دین یعقوبی ہی مانیں گے۔ یہ دین نسخ سے پہلے اسلام ہے نہ کہ اس کے بعد۔ **تیسرا اعتراض**۔ ابراہیم اور یعقوب علیہم السلام کا زمانہ ایک نہیں۔ تو ان کو اس آیت میں جمع کیوں کیا گیا۔ **جواب**۔ اہل کتاب ان دونوں حضرات کو بڑا بزرگ مانتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے دین کو ابراہیمی دین اور اپنے کو یعقوب علیہ السلام کی اولاد کہتے ہیں۔ اس لئے ان دونوں کا ذکر فرما کر یہ بتایا گیا کہ تم عملاً نہ ابراہیمی ہو اور نہ اسرائیلی۔ اور فرق زمانہ کے لحاظ سے ایسی عبارت فرمائی گئی۔ ورنہ عبارت یوں ہوتی۔ وَصّٰی بِھَا اِبْرٰھِیْمُ وَیَعْقُوْبُ بَنِیْھِمَا۔

**تفسیر صوفیانہ**:۔ ہوائے نفس ہاویہ کا راستہ ہے۔ اور نفس کی شرارت کی اصل یہ ہے کہ وہ اپنی بڑائی دیکھتی ہے۔ برائیوں پر نظر نہیں کرتی۔ اہل کتاب کی نظر اس پر تھی۔ کہ ہم پیغمبروں کی اولاد ہیں۔ اس پر نہ تھی کہ ہم عملاً ان سے دور ہیں۔ اس بیماری سے بچانے کے لئے ان دونوں پیغمبروں نے اپنی اولاد کو حکم دیا۔ کہ تم مرتے دم تک اپنی ایمانی اور عملی حالت پر نظر کرنا۔ یہ نہ خیال کرنا کہ ہم ابراہیمی اور اسرائیلی ہیں۔ ٹھنڈے لوہے کو کوٹنا بے کار ہے۔ اس کا گرم کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح نفس کو اعمال کی بھٹی میں گرم کرو۔ پھر تصوف کے ہتھوڑے سے کوٹو۔ تاکہ وہ کچھ کام کا بن جائے۔ صوفیا فرماتے ہیں کہ بعض بدعمل یہ سمجھتے ہیں۔ کہ رب غفور الرحیم ہے۔ ہمیں اس سے بخشش کی امید ہے۔ مگر وہ جھوٹے ہیں۔ اگر انہیں امید ہوتی تو اس کی اطاعت بھی کرتے۔ رب سے امید عین ایمان ہے اور اس پر امن کفر (روح البیان) **دوسری تفسیر**۔ ابراہیم و یعقوب علیہم السلام نے اپنی اولاد کو کلمہ توحید کی وصیت کی۔ اور فرمایا۔ کہ یہی دین وہ ہے۔ جسے موحد اختیار کرے۔ اس کے سوا نہ کوئی دین ہے اور نہ کوئی ذات۔ ذات۔ دین اللہ کا دین ہے اور ذات اس کی ذات۔ لہٰذا تم جہالت کی موت نہ مرنا۔ بلکہ اپنے کو رب میں فنا کر کے ایسے مرنا۔ کہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاؤ۔ بدن کی موت اس حال میں

ہے۔ کہ تمہارا قلب قابلِ موت نہ رہا ہو۔ لوگ تمہیں مُردہ کہیں۔ اور رب بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ فرما کر تمہاری زندگی کا اعلان فرمائے۔ یہی اسلام و استسلام توحید اور تصوّف کی حقیقت ہے ؏

أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ

کیا تھے تم موجود جبکہ حاضر ہوئی یعقوب کو موت جبکہ کہا انہوں نے واسطے بیٹوں اپنے کے کیا پوجو گے تم

بلکہ تم میں کے خود موجود تھے جب یعقوب کو موت آئی جبکہ اس نے اپنے بیٹوں سے فرمایا میرے بعد کس کی

مِن بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا

پیچھے میرے بولے وہ پوجیں گے ہم معبود تمہارا اور معبود باپ دادوں تمہارے ابراہیم اور اسمٰعیل واسحاق کا معبود

پوجا کرو گے بولے ہم پوجیں گے اُسے جو خدا ہے آپ کا اور آپ کے آباء ابراہیم و اسمٰعیل اور اسحاق کا ایک خدا

وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٣﴾

ایک اور ہم اوسی کیلئے اسلام لانے والے ہیں

اور ہم اُس کے حضور گردن رکھے ہیں۔

**تعلّق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**۔ اب تک ابراہیم و یعقوب علیہم السلام کی عظمت اور اطاعت الٰہی کا ذکر فرمایا۔ اب اُن پر سے وہ تہمت دُور کی جارہی ہے۔ جو بنی اسرائیل نے اُنہیں لگائی یعنی پہلے اُن کے فضائل کا اثبات تھا۔ اب اُن کی تہمت کا دفعیہ۔ **دوسرا تعلق** اب تک اُن حضرات کی دینی استقامت کا رب نے ذکر فرمایا۔ اب خود مخالفین کی گواہی سے اس کا ثبوت دیا جارہا ہے۔ **تیسرا تعلق**۔ پچھلی آیت میں یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا ایک حصہ بیان کیا گیا۔ اب اُس کا دوسرا حصہ بیان ہو رہا ہے۔ یعنی پہلے بتایا گیا۔ کہ اُنہوں نے اپنی اولاد کو دینی استقامت کا حکم دیا۔ اور اب فرمایا جارہا ہے کہ اس کا اُن سے اقرار بھی لیا۔ **شانِ نزول**۔ یہود کہتے تھے۔ کہ ہم کو وصیت ابراہیمی کی تو خبر نہیں پر ہم جانتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے دن اپنی اولاد کو وصیت کی تھی۔ کہ تم ہمیشہ دین یہودیت پر قائم رہنا۔ اُن کے اس بہتان کے رد میں یہ آیت نازل ہوئی۔ (خازن وخزائن عرفان) **تفسیر**۔ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ۔ بعض نے اَم متصلہ مانا ہے۔ بعض نے منقطعہ بمعنی استفہام انکاری یعنی آیا تم اس وصیت کے وقت موجود تھے یعنی نہ تھے۔ اور تم بغیر دیکھے غلط گواہی دے رہے ہو۔ لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں (روح البیان) یا یہ مطلب ہے۔ کہ بلکہ تم اُس وصیت کے وقت موجود تھے یعنی تمہارے بڑے یعقوب علیہ السلام کی وفات کے وقت اُن کے پاس تھے۔ اُن کو علم ہے کہ اُنھوں نے وہی وصیت کی جو ہم نے بیان کی۔ پھر تم دیدہ دانستہ اُن پر کیوں اتہام باندھتے ہو (تفسیر کبیر) بہرحال اس میں یا تو اُن کے موجود ہونے کا انکار ہے۔ یا اثبات۔ دوسری تفسیر زیادہ قوی ہے۔ کیونکہ اس میں الزام زیادہ سخت + شہدا جمع شہید کی ہے۔ جیسے رُحَمَا جمع رحیم کی۔ جس کے معنی حاضر بھی ہیں۔ اور گواہ بھی۔ بلکہ گواہ کو بھی اسی لئے شہید کہتے ہیں کہ وہ موقعہ واردات پر حاضر ہوتا ہے۔ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ۔ یہ اِذْ یا كُنْتُمْ کا ظرف ہے یا شُهَدَا کا۔ اور موت کے حاضر ہونے سے اسباب و علاماتِ موت کا موجود ہونا مراد ہے۔ کیونکہ وصیت موت آنے پر نہیں کی جاتی۔ بلکہ موت کے قریب یعنی اے اسرائیلیو تمہارے بڑے تو سب موجود تھے۔ جب یعقوب علیہ السلام پر موت کے آثار نمودار ہوئے۔ اِذْ قَالَ لِبَنِيهِ۔ یہ پہلے اِذْ کا بدل ہے۔ اور اُسی كُنْتُمْ یا شُهَدَا کا ظرف یعنی جبکہ اُنھوں نے اپنے سارے بیٹوں کو جمع فرما کر ایک عجیب طریقہ سے استقامت دین کی وصیت فرمائی۔ کہ خود حکم نہ دیا۔ بلکہ اُن سے یہ پوچھا کہ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ اب تک تو تم رب کی عبادت کرتے رہے۔ مگر یہ بتاؤ کہ میری وفات کے بعد کس کی عبادت کرو گے۔ لفظِ مَا۔ اگرچہ بے عقل چیزوں کے لئے آتا ہے۔ مگر ابہام کے موقعہ پر یہ سب کو شامل ہوتا ہے (روح) اور بَعْدِيْ سے مراد

بَعْدِیْ ہوتی ہے۔ یعنی تم اُس خدا ہی کی عبادت کرو گے۔ جس کی اب تک کرتے رہے۔ یا اُن بتوں وغیرہ کی جن کی مصر والے کرتے ہیں۔ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ۔ وہ بولے کہ ہم اُس رب کی اطاعت کریں گے جو آپ کا اور آپ کے باپ دادوں کا رب ہے۔ اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ جس کی آپ نے اور آپ کے باپ دادوں نے عبادت کی ہے یا جیسے ہم نے آپ کے اور آپ کے باپ دادوں کے ذریعے پہچانا ہے۔ یعنی ان بتوں کو تو کفار نے بتایا۔ اور سچے رب کو آپ نے پہچنوایا۔ ہم آپ کے بتائے ہوئے رب کے عابد ہوں گے نہ کہ اُن کے بتائے ہوئے کے۔ اٰبَاءٌ۔ اب کی جمع ہے۔ جس کے حقیقی معنیٰ ہیں باپ۔ مگر مجازاً دادا، چچا بلکہ استاد وغیرہ کو بھی اب کہہ دیتے ہیں۔ اور یہاں اس سے باپ دادے مراد ہیں۔ اسمٰعیل علیہ السلام یعقوب علیہ السلام کے چچا ہیں چونکہ چچا بھی باپ ہی کی طرح ہوتا ہے۔ اس لئے آپ کا ذکر بھی آباء کے سلسلہ میں کیا گیا۔ اور چونکہ آپ اسحٰق علیہ السلام سے عمر میں چودہ سال بڑے بھی ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد۔ اس لئے اسحاق علیہ السلام سے پہلے آپ کا ذکر کیا۔ اس جملہ میں دو جگہ الٰہ سے شاید کوئی وہم کرتا۔ کہ اس سے دو معبود مراد ہیں۔ آپ کا اور معبود۔ اور باپ دادوں کا دوسرا۔ اس وہم کو دور کرنے کے لئے عرض کیا کہ اِلٰهًا وَّاحِدًا۔ ایک ہی معبود کی جو کہ ذات و صفات میں اکیلا ہے۔ اور پھر یہ بھی نہیں۔ کہ عبادت ایک ہی طریقہ کی کریں۔ اور اسی پہ ڈٹے رہیں۔ بلکہ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ ہم تو اُسکے حکم کے تابع ہیں۔ جس زمانہ میں جس پیغمبر کے ذریعہ جو بھی احکام آئیں گے اور ہمیں جو بھی طریقہ عبادت بتایا جائے گا۔ اُس پہ کاربند رہیں گے (تفسیر عزیزی) غرضکہ گذشتہ جملوں میں توحید کا ذکر تھا۔ اور اس میں نبوت کا تذکرہ ؎

**خلاصہ تفسیر**:۔ اے بنی اسرائیل تم ہماری بیان کی ہوئی وصیت کا انکار کیسے کرتے ہو۔ یعقوب علیہ السلام نے تو یہ وصیت تنہائی میں نہ کی تھی بلکہ علانیہ اور سب کے سامنے۔ تاکہ اُن کی اولاد اپنی اطاعت شعاری کا اقرار کرے۔ اور دوسرے لوگ سُنکر عبرت پکڑیں۔ چنانچہ خود تمہارے بڑے بھی اُس مجلس میں موجود تھے۔ جبکہ یعقوب علیہ السلام پر آثارِ موت نمودار تھے۔ اس موت کی کشمکش میں بھی اُنہوں نے اپنی اولاد کو جمع کر کے یہی پوچھا تھا کہ میرے بچو تم میری وفات کے بعد عبادت کس کی کرو گے۔ اُن سب نے عرض کیا تھا۔ کہ والد مہربان آپ مطمئن رہیں۔ ہم اُس ایک واحد قہار کے عابد رہیں گے۔ جسے آپ کے اور آپ کے باپ دادا دیگر انبیاء کے ذریعہ پہچانا اور جس کی آپ نے اور اُنہوں نے عبادت کی ہے۔ اور ہم اب بھی اُس کے فرمانبردار ہیں۔ اور آئندہ بھی رہیں گے۔ کہ جس پیغمبر کے ذریعہ جو حکم ملے۔ ہمیں اُس کے ماننے میں عذر نہ ہوگا۔ جب تمہارے بڑے یہ وصیت اپنے کانوں سے سُن چکے اور آنکھوں سے دیکھ چکے اور وہاں اُن کی موجودگی گویا تمہاری ہی موجودگی ہے۔ تو تم جان بوجھ کر یعقوب علیہ السلام کو تہمت کیوں لگاتے ہو۔ کہ اُنہوں نے یہودیت پہ رہنے کی وصیت کی تھی ؎ **فائدے**:۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** یہ کہ یعقوب علیہ السلام کے سارے بیٹے متقی مومن ہیں۔ جن سے یوسف علیہ السلام کو جدا کرنے کا قصور ہوا تھا۔ اُن کی معافی ہو چکی۔ قرآن کریم نے اُن کی اطاعت شعاری اور ایمان کی گواہی دی۔ بلکہ بعض علماء نے اُن سب کو نبی مانا ہے۔ اور اُنہیں ولی اور صحابی نبی تو سب ہی مانتے ہیں۔ اس کی نہایت نفیس اور لذیذ تحقیق ہماری کتاب قہر کبریا بر منکرین عصمتِ انبیاء میں دیکھو جس میں برادران یوسف علیہ السلام اور قابیل میں عمدہ فرق کر کے دکھایا ہے۔ کہ اُن کی اس خطا میں بھی صدہا راز تھے۔ جو اُنہیں اب بے دین یا گنہگار کہے۔ وہ خود بے دین ہے۔ **دوسرا فائدہ**۔ قرآن کریم چچا کو باپ فرما دیتا ہے۔ جیسے کہ یہاں ہوا۔ لہٰذا جن علماء نے آزر کو ابراہیم علیہ السلام کا چچا مانا اور لِاَبِیْهِ آزَرَ میں اور حدیث اِنَّ اَبِیْ وَاَبَاكَ فِی النَّارِ میں اب کے معنی چچا کئے صحیح کئے۔ اور اُن کی دلیل یہ ہی آیت ہے۔ کہ اسمٰعیل علیہ السلام کو جو کہ یعقوب علیہ السلام کے چچا تھے آباء میں داخل کیا گیا۔ **تیسرا فائدہ**۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دادا کو باپ کہنا حقیقتاً ہے نہ کہ مجازاً۔ اس لئے اُن کے نزدیک حقیقی بہن بھائیوں کو باپ کی طرح دادا بھی میراث سے محروم کر دیتا ہے۔ بعض حنفیوں نے یہ مسئلہ اس آیت سے نکالا ہے۔ مگر یہ دلیل ضعیف ہے۔ (تفسیر عزیزی و کبیر) بلکہ اس کی اصل حضرت ابوبکر صدیق و حضرت عائشہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔ **چوتھا فائدہ**۔ رب کی حقیقی پہچان پیغمبروں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ کیونکہ فرزندان یعقوب علیہ السلام نے یہ نہ کہا کہ ہم اپنے عقل سے پہچانے ہوئے رب کی عبادت کریں گے۔ بلکہ یہ کہا کہ

اور تمہارے باپ دادوں کے رب کی عبادت کریں گے۔ **پہلا اعتراض**۔ ایک لفظ سے حقیقی اور مجازی معنی مراد لینا منع ہے۔ پھر یہاں لفظ آباء سے چچا اور والد دونوں کیوں مراد ہو گئے۔ **جواب**۔ یا تو یہاں عموم مجاز کے طریقہ پر آباء سے بزرگ مراد ہیں۔ جن میں باپ اور چچا دونوں داخل ہیں۔ اور یا یہاں تغلیب ہے۔ جیسے کہ تغلیباً ماں باپ کو ابوین۔ اور چاند سورج کو قمرین اور حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کو عمرین کہدیتے ہیں۔ **دوسرا اعتراض**۔ آبائک کے بعد تین پیغمبروں کے نام کیوں لئے گئے وہ تو اس میں آ گئے تھے۔ **جواب**۔ تاکہ اس میں سارے باپ دادے شامل نہ ہو جائیں۔ بلکہ صرف انبیائے کرام ہی داخل رہیں۔ کیونکہ ان کے بزرگوں میں تو آزر بھی تھے۔ **تیسرا اعتراض**۔ یہاں جواب میں اتنی دراز عبارت کیوں بولی۔ صرف یہ کہدیتے کہ ہم اللہ کی یا اپنے خالق و مالک کی عبادت کریں گے۔ **جواب**۔ اس لئے کہ مصر کے لوگ ستاروں اور بتوں کو خالق مالک اور الٰہ جانتے تھے۔ یہ الفاظ بولنے میں پتہ نہ چلتا کہ کون مراد ہے۔ **چوتھا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ معرفت الٰہی میں تقلید جائز ہے۔ کیونکہ ان صاحبوں نے اللہ کو نبیوں کے کہنے سے جانا۔ حالانکہ عقائد کا مسئلہ ہے۔ کہ معرفت الٰہی دلائل سے چاہیئے نہ کہ محض کسی کے بتانے سے۔ اسی لئے جو نور نبوت سے دور ہو اُسے بھی یہ لازم ہے۔ **جواب**۔ اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ انبیائے کرام کے ذات و معجزات رب کی دلیل ہیں۔ بلکہ سارے عالم کی ہستی اُسے بتا رہی ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے حضور علیہ السلام کو رب کی دلیل بتایا۔ کہ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ انہوں نے ان پیغمبروں کے کمالات سے رب کو پہچانا۔ نہ کہ محض اُن کے فرمانے سے۔ دوسرے یہ کہ عقل سے صرف اتنا معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ عالم کا کوئی خالق ہے اور وہ اکیلا ہے۔ باقی اس کی ذات و صفات کی پوری تحقیق انبیاء کے بتانے سے ہی ہو گی۔ اور یہاں یہی ہے۔ (از عزیزی و تفسیر کبیر) **تفسیر صوفیانہ**۔ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ میں فقط شرعی عبادت ہی مراد نہیں بلکہ ہر قسم کی اطاعت مراد ہے۔ جو جھوٹے معبودوں کو پوجے۔ وہ شرعاً مومن نہیں۔ اور جو نفسانی خواہشات میں پھنس کر رب کو بھولے۔ وہ صوفیاء کے نزدیک مومن ہوتن نہیں۔ نفس بھی ایک بت ہے۔ جس کے اہل دنیا پجاری۔ اور جس کام میں رب کی رضا ملحوظ نہ ہو۔ وہ بت پرستی ہے جو اللہ سے دور کرے وہ طاغوت ہے۔ کوئی درم کا بندہ ہے کوئی دینار کا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے یعقوب علیہ السلام نے دنیا اور یہاں کی دلفریب چیزوں کو دیکھ کر اپنے بچوں پر غفلت کا اندیشہ کیا۔ تب اُن سے اقرار کرا لیا۔ کہ تم ہوا کی پرستش نہ کرنا۔ ورنہ اُن پر بت پرستی کا اندیشہ نہ تھا (روح البیان) مولانا فرماتے ہیں ؎

اہلِ دنیا کافرانِ مطلق اند ۔۔۔ روز و شب در زق زق و در بک بک اند

چیست دنیا از خدا غافل بودن ۔۔۔ نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا

یہ گروہ ہے کہ بے شک گزر گیا واسطے اوس کے ہے وہ جو کمائے اور واسطے تمہارے ہے وہ جو کماؤ تم اور نہ سوال کئے جاؤ گے تم اوس سے

یہ ایک اُمت ہے کہ گذر چکی اُن کے لئے ہے جو اُنہوں نے کمایا اور تمہارے لئے ہے جو تم کماؤ اور اُن کے کاموں کی تم سے

كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

کہ تھے وہ کرتے ○

پرستش نہ ہو گی ○

**تعلق**:۔ اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**۔ پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو ایمان اور اعمال کی وصیت کی جس سے سمجھا گیا۔ کہ کوئی اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر نہ پھولے۔ بلکہ خود بھی پرہیزگار بنے۔ اب اس وصیت کو موجودہ بنی اسرائیل پر چسپاں کیا جا رہا ہے۔ کہ جب اُن کی خاص اولاد کو پرہیزگاری کی ضرورت تھی۔ تو تم تو کہیں دور ہو۔ تم پر یہ وصیت جاری کیوں نہ ہو۔ **دوسرا تعلق**

پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا۔ کہ فرزندانِ یعقوب علیہ السلام نے وعدہ کیا۔ کہ ہم ہر پیغمبر کی اطاعت کریں گے۔ شریعت یعقوبی پر رہنے کی ضد نہ کریں گے۔ جیساکہ ہم مسلمون کی تفسیر میں بتا چکے۔ اب فرمایا جارہا ہے۔ کہ جب انہوں نے ہی یہ اقرار کر لیا تھا۔ تو تم پر بھی لازم ہے۔ کہ موجودہ پیغمبر کی اطاعت کرو۔ اسی شریعت کی غلط پابندی کی ضد نہ کرو۔ **تیسرا تعلق**۔ بنی اسرائیل جب دلائل سے ہار جاتے تھے۔ تو آخر کار یہ کہتے تھے۔ کہ یعقوب علیہ السلام ہمارے دادا ہیں۔ اگر ہمارے یہ اعمال غلط بھی ہوئے۔ تو ہم اُن کے اعمال پیش کر کے آخرت میں نجات پالیں گے۔ اِس آیت میں اُن کے اس وہم کی تردید کر دی گئی (روح البیان) **تفسیر**۔ تِلْكَ اُمَّةٌ۔ تلک سے اُن انبیاء کرام اور اُن کی اولاد کی طرف اشارہ ہے۔ جن کا ذکر پچھلی آیت میں تھا۔ اُمَّةٌ یا تو اُمٌّ سے بنا (بمعنی اصل) یا اَمٌّ سے (بمعنی قصد) چونکہ جماعت بھی ایک اصل کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اور اُس کا ایک مشترک مقصد ہوتا ہے۔ اس لئے اُسے امت کہا جاتا ہے (روح) خیال رہے کہ یہاں امۃ سے صرف لغوی جماعت مراد ہے نہ کہ کسی پیغمبر کی امت کیونکہ ان مذکورہ حضرات میں ابراہیم و یعقوب علیہم السلام امت والے نبی ہیں۔ کسی اور نبی کی امت نہیں۔ چونکہ یہ سارے حضرات توحید اور اطاعت الٰہی اور نسب میں شریک تھے۔ اس لئے ان سب کو ایک امت کہا گیا۔ قَدْ خَلَتْ۔ یہ خلوٌ سے بنا۔ جس کے معنی ہیں خالی یا اکیلا ہونا۔ اسی لئے تنہائی کو خلوت اور تنہائی کی جگہ کو بیت الخلا۔ اور فضائے آسمانی کو خلا کہا جاتا ہے۔ اور جب یہ زمانہ کے لحاظ سے بولا جائے۔ تو اس کے معنی ہوتے ہیں گذر جانا۔ یہاں یہ ہی مراد ہے۔ گویا دنیا سے اُن کا تعلق جاتا رہا۔ اور وہ خدا سے جا ملے۔ یعنی تمہارے بزرگوں کی یہ جماعت تو گذر چکی۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ۔ لَہَا کے مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ ہوا۔ اور لام نفع کے لئے آتا ہے۔ لہذا اس مَا سے نیک اعمال مراد ہیں۔ یعنی اُس گذشتہ جماعت کے نیک اعمال خود اسی کو ملیں گے۔ تم اُن سے فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ یہاں بھی وہ ہی نفع کا لام ہے۔ اور مَا سے نیکیاں مراد۔ اور لَکُمْ کی تقدیم سے حصر کا فائدہ یعنی تمہاری نیکیاں صرف تمہاری ذات کے لئے ہوں گی۔ اس سے وہ فائدہ حاصل نہ کریں گے۔ خلاصہ یہ کہ باپ دادوں کے اعمال اولاد کے کام نہیں آتے۔ اور اولاد کی نیکیاں باپ دادوں کو نہیں مل جاتیں۔ اور تم اس خیال میں نہ رہو۔ کہ ہم اُن کے اعمال پیش کر کے نجات حاصل کر لیں گے۔ کیونکہ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ تم سے اُن کے اعمال کا سوال ہی نہ ہوگا۔ تم پیش تو جب کرو۔ جب تم سے اُن کی پرسش ہو۔ بغیر پرسش پیشی کیسی۔ **خلاصہ تفسیر** اے نافرمان اسرائیلیو تم اس بات پر ناحق مغرور نہ ہو کہ ہم اُن بزرگوں کی اولاد ہیں۔ اگر ہمارے اعمال سے باز پرس ہوئی۔ تو اُن کے اعمال پیش کر دیں گے۔ تم کو اُن سے کیا تعلق۔ وہ پاکباز لوگ تھے۔ جو گذر گئے۔ اُن کے اعمال سے اُن ہی کو نفع ہوگا۔ تم کو اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ تم کو چاہئے کہ اُن کی وصیت سنو۔ اور نیک اعمال میں جلدی کرو۔ جب وہ اپنی خاص اولاد کو آخر دم تک ایمان و اعمال کی وصیت کرتے رہے۔ تو تم اُن سے کیونکر بے نیاز ہو گئے۔ **فائدے**۔ اِس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ**۔ آخرت میں اپنا کسب کام آئے گا نہ کہ نسب۔ اسی لئے روایت میں آتا ہے کہ جس کو عمل نے پیچھے کر دیا۔ اُسے نسب آگے نہ بڑھا سکے گا۔ دوسری روایت میں ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ اے بنی ہاشم ایسا نہ ہو۔ کہ لوگ تو نیکیاں لائیں اور تم صرف نسب (روح) **دوسرا فائدہ**۔ جیسے کہ باپ دادوں کے اعمال اولاد کے کام نہیں آتے۔ ایسے ہی اولاد کے اعمال باپ دادوں کے لئے بے کار۔ **تیسرا فائدہ**۔ باپ دادوں کے کفر سے اولاد کو عذاب نہ ہوگا۔ جب تک کہ وہ اُس سے راضی نہ ہوں۔ یہ یہود کا عقیدہ تھا کہ ہمیں اتنے روز جہنم میں رہنا ہوگا۔ جتنے دن ہمارے بزرگوں نے بچھڑا پوجا (کبیر) **چوتھا فائدہ**۔ بندہ اپنے اعمال کا خالق نہیں کاسب ضرور ہے۔ اسی پر اُس کو ثواب و عذاب ہے۔ کسب کے معنی ہیں وجود کے اسباب کو ارادۃً جمع کر دینا۔ اور خلق کے معنی ہیں غیر موجود کو وجود بخش دینا۔ مثلاً چھری کا کسی کے گلے پر چلا دینا کسب ہے۔ اور جان نکالنا خلق۔ موت پہلا کام بندے کا تھا اور یہ رب کا۔ بندے کے غیر اختیاری کام کسب نہیں کہلاتے۔ اور نہ اُن پر ثواب و عذاب (از تفسیر کبیر) اسی لئے اس آیت میں كَسَبَتْ فرمایا گیا نہ کہ صدرت۔ کام کرنا اور ہے اور صادر ہونا کچھ اور۔ **پہلا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کی نیکیاں دوسرے کو کار آمد نہیں۔ حالانکہ احادیث سے ثابت ہے کہ اولاد کی نیکیوں سے

ماں باپ کی رہائی ہوتی ہے۔ حافظ کی تین پشت اور عالم کی سات پشت کی بخشش ہوگی۔ عام مسلمان ایصال ثواب بھی کرتے ہیں۔ کہ نیک کام کرکے اُس کا ثواب مردوں کو بخش دیتے ہیں۔ یہ ساری باتیں اس آیت کے خلاف ہیں۔ نیز روایت میں آیا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے اپنے غریب اُمتیوں کی طرف سے قربانی فرمادی۔ دیکھو یہاں بزرگوں کے عمل غلاموں کے کام آرہے ہیں۔ **جواب**۔ اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ آیت کفار کے حق میں ہے۔ کیونکہ یہاں اُن اسرائیلیوں سے خطاب ہے۔ جو اپنے اولادِ پیغمبر ہونے کی وجہ سے ایمان کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس سے بدنی اعمال مراد ہیں۔ اسی لئے یہاں کسبت فرمایا گیا نہ کہ ثواب یعنی کوئی شخص دوسرے کی طرف سے بدنی اعمال نہیں کر سکتا۔ کہ باپ کی طرف سے بیٹا نمازیں پڑھ دے یا روزے رکھ دے۔ زکوٰۃ مالی عبادت ہے اور حج مشترکہ عبادت لہٰذا وہ ایک دوسرے کی طرف سے ادا ہو سکتے ہیں۔ ثواب بخشنے میں میّت کو محض ثواب ملتا ہے۔ اس کے ذمہ سے فرائض ادا نہیں ہوجاتے تیسرے یہ کہ اسکی مراد یہ ہے کہ عمل کرنیوالا اپنے اعمال سے کبھی محروم نہ ہوگا یعنی اسکا ثواب بخشنے کے بعد بھی ثواب پائیگا۔ **دوسرا اعتراض** اس آیت سے معلوم ہوا کہ کوئی دوسرے کی بدعملی سے نہ پکڑا جائے گا۔ حالانکہ روایت میں آتا ہے۔ کہ ہر شخص سے سوال اپنے متعلق بھی ہوگا۔ اور اپنی بیوی اولاد کے متعلق بھی کہ وہ گمراہ یا بے دین کیوں ہوئے۔ تو اس آیت اور حدیث میں مطابقت کیوں کر ہو۔ **جواب**۔ بے شک اولاد کی بدعملی کا حساب ماں باپ سے ہوگا۔ مگر کب۔ جب انہوں نے اُسکی تعلیم میں کوتاہی کی ہو۔ اور یہ حقیقت میں اس کوتاہی کی پکڑ ہے۔ جو کہ خود اس کا فعل ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا۔ **تیسرا اعتراض**۔ قَدْ خَلَتْ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وفات یافتہ حضرات کو دنیا سے تعلق نہیں رہتا۔ پھر تم اُن سے استمداد وغیرہ کیوں کرتے ہو۔ **جواب**۔ یہاں تعلق ظاہری کا ٹوٹ جانا مراد ہے۔ یعنی اب وہ تم سے بات چیت نہیں کرتے۔ رہا تعلق باطنی۔ وہ کبھی نہیں ختم ہو سکتا۔ اسی لئے ہم اپنے بزرگوں کی میراث پاتے ہیں۔ اُن کی اولاد کہلاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ **تفسیر صوفیانہ**:۔ نفس اور ظاہری اعضا کو چاہیئے۔ کہ خود عمل کریں۔ روح کی طہارت اور صفائی پر نہ پھولے رہیں۔ نیز میثاق کے دن جو ایمان لاچکے ہیں۔ اُس پر مغرور نہ ہوں۔ سزا اور جزا کے لئے یہاں کے اپنے عمل معتبر ہیں۔ اسی طرح ہر عضو اپنے کام میں مشغول رہے۔ دوسرے اعضاء کے عمل سے دھوکا کھا کر خود معطل نہ ہوجائے۔ قلب کا عمل ہے ایمان۔ پاؤں کا عمل ہے۔ نیک مجلسوں کی طرف چلنا آنکھ کا عمل آیات الٰہی کو دیکھنا اور خوف وشوق میں رونا زبان کا عمل حق بولنا۔ ہاتھ کا عمل قرآن کریم چھونا اور نمازیں رب کے سامنے بندھا رہنا وغیرہ چاہیئے۔ کہ ہر عضو سے اُس کا عمل کرائے جاؤ۔ فقط ایمان لاکر نماز سے غافل نہ ہو۔ اور فقط نماز پڑھ کر ایمان سے بے پرواہ مت ہوجاؤ۔ اور یہ نہ سمجھو۔ کہ اچھے اصل کی شاخیں بھی اچھی ہوتی ہیں۔ بسا اوقات اچھے سے بُرے اور بُروں سے اچھے ظاہر ہوجاتے ہیں۔ انگور سے شراب۔ اور گنے سے شکر۔ شہد کی مکھی کی قے سے شہد۔ ختنی ہرن کے خون سے مشک بنتا ہے۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کی پشت سے قابیل اور ابوجہل کی پشت سے حضرت عکرمہ پیدا ہوئے۔ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ۔ رب کی بے نیازی سے ڈرتے رہو۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَ

اور کہا انہوں نے ہو جاؤ تم یہودی یا عیسائی ہدایت پا جاؤ گے فرما دو بلکہ پیروی کریں گے ہم دین کی ابراہیم کے مائل اور

اور کتابی بولے یہودی یا نصرانی ہو جاؤ راہ پاؤ گے تم فرماؤ بلکہ ہم تو ابراہیم کا دین لیتے ہیں جو ہر باطل سے جدا تھے اور

مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾

نہ تھے وہ مشرکین سے

مشرکوں سے نہ تھے۔

**تعلق**:۔ اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**۔ پچھلی آیت میں بتایا گیا۔ کہ کسی کو دوسرے کے اعمال کافی نہیں۔ اس سے وہم

ہو سکتا تھا۔ کہ ہر شخص کو اپنا مذہب بھی علیحدہ اختیار کرنا چاہیئے۔ کہ ہر ایک کے اعمال بھی علیحدہ ہوں اور مذہب بھی علیحدہ۔ اس وہم کو رفع فرمانے کے لئے اب بتایا گیا۔ کہ دین میں ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت اور اعمال میں اُن کی موافقت چاہیئے۔ اعمال نہ کرنا اور چیز ہے۔ اور موافقت کرنا کچھ اور چیز۔ **دوسرا تعلق**۔ اب تک اہل کتاب کی غلطی پہ نہایت قوی دلائل قائم کئے گئے۔ اب خود اُن کے ہی قول سے اُنہیں الزام دیا جا رہا ہے۔ کہ یہ لوگ ابراہیم علیہ السلام کے کمالات کے تو قائل ہیں۔ مگر یہودیت یا نصرانیت میں ہدایت کو محدود مانتے ہیں۔ اگر ہدایت خاص ان دو دینوں میں ہوتی۔ تو خود ابراہیم علیہ السلام ہدایت پر نہ ہوتے۔ کیونکہ یہ دونوں دین اُن کے وقت میں تھے ہی نہیں۔ **تیسرا تعلق**۔ پچھلی آیتوں میں اہل کتاب کے شبہات کے تحقیقی جوابات دیئے گئے تھے۔ اور دلائل سے اسلام کی حقانیت ثابت کی گئی تھی۔ اب اُنہیں الزامی جواب دیا جا رہا ہے کہ اگر تم دین کے قبول کرنے میں اپنے بڑوں کی پیروی ہی کرتے ہو۔ اور دلائل سے کام نہیں لیتے۔ تو تمہیں چاہیئے کہ ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرو۔ کیونکہ وہ سب کے مانے ہوئے بزرگ ہیں۔ اور اُن کے دین کی حقانیت میں کسی کا اختلاف نہیں۔ اور یہودیت اور نصرانیت میں تم آپس میں بھی متفق نہیں۔ لہٰذا اس کا ماننا بہتر (کبیر) **شانِ نزول**:۔ حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں۔ کہ ایک بار یہود کے سرداروں نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام سب نبیوں سے افضل ہیں۔ اور اُن کی کتاب توریت تمام کتابوں سے اعلیٰ اور یہودی دین تمام دینوں سے بڑھ کر اور قرآن شریف و انجیل کا انکار کرتے ہوئے اُنہیں یہودی بننے کی رغبت دی۔ اسی طرح نجران کے عیسائیوں نے اپنے دین اور اپنی کتاب کی افضلیت بتاتے ہوئے مسلمانوں کو عیسائیت کی دعوت دی ان دونوں کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (خزائن العرفان) **تفسیر**۔ وَقَالُوْا۔ اس کا فاعل یہودی اور عیسائی دونوں ہی ہیں۔ کیونکہ ایک جماعت دو دین کی دعوت نہیں دے سکتی۔ كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى۔ پہلا قول یہود کا ہے۔ دوسرا قول عیسائیوں کا یعنی یہود نے تو کہا۔ کہ تم یہودی بن جاؤ۔ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام پہلے صاحب کتاب نبی ہیں۔ اور اُن کی بڑی شان ہے۔ اُن سے رب نے کلام فرمایا اور عیسائیوں نے کہا۔ کہ عیسائی ہو جاؤ۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر ہیں۔ اور بغیر والد کے پیدا ہوئے۔ اور چونکہ اُنہوں نے مُردوں کو زندہ کیا۔ اس لئے وہ مُردہ دلوں کو بھی زندگی بخش سکتے ہیں۔ اگر تم یہ دین اختیار کر لو گے۔ تو تَهْتَدُوْا ہدایت پا جاؤ گے۔ کیونکہ ہدایت ہمارے ہی دین میں ہے۔ قُلْ۔ یا تو یہ ہر مسلمان سے خطاب ہے۔ اور یا خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اور یہ ہی ظاہر ہے۔ کیونکہ مسلمانوں سے خطاب آئندہ آیت میں ہو رہا ہے۔ یعنی اے نبی علیہ السلام آپ اِن اہل کتاب سے فرما دو۔ یا مسلمانوں کو یہ جواب سکھا دو۔ کہ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ ایک لفظ قول سے پہلے پوشیدہ ہے۔ اور ایک عبارت ملت سے پہلے یعنی ہم تمہاری بات نہ مانیں گے۔ بلکہ ملت ابراہیمی پہ رہیں گے۔ اور اُسی کی اتباع کریں گے۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ اے اہل کتاب ہم تو اُس دین پر نہ آئیں گے۔ بلکہ تم کو چاہیئے۔ کہ ملت ابراہیمی کو قبول کر لو۔ (تفسیر کبیر) اور اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اسلام میں آجاؤ۔ کیونکہ یہ دین ملت ابراہیمی کے موافق ہے۔ حَنِيْفًا۔ یہ لفظ حنفٌ سے بنا۔ اور حَنَفٌ و جَنَفٌ دونوں کے معنی ہیں پھرنا۔ اور مائل ہونا۔ مگر حنفٌ میں گمراہی سے ہدایت کی طرف پھرنا ہے۔ اور جنفٌ میں ہدایت سے گمراہی کی طرف لوٹنا۔ لہٰذا حنیف کے معنی ہیں افراط تفریط سے علیحدہ اور تمام باطل دینوں سے دُور اور حق پہ قائم۔ اور یہ یا تو ملّۃ کا حال ہے بتاویل دین اور یا ابراہیم کا یعنی ہم اُس دین ابراہیمی کی یا اُن ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرتے ہیں۔ جو خدا کی طرف مائل اور تمام باطل چیزوں سے علیحدہ ہیں۔ تم لوگ رب کو چھوڑ کر غیروں کی طرف جُھک گئے۔ کہ عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کو اور یہودیوں نے عزیز علیہ السلام کو خدا کا بیٹا یا خدا مان لیا۔ جس سے وہ مشرک ہو گئے۔ اور ابراہیم علیہ السلام کا یہ حال ہے کہ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کہ وہ خود تو مشرک کیا ہوتے۔ مشرکین میں سے تھے بھی نہیں۔ کہ ہر قسم کے شرک اور مشرک سے سخت بیزار تھے؛ **خلاصہ تفسیر**:۔ یہود و نصارٰی نے اپنے دینوں میں کاٹ چھانٹ کر کے ایک نیا دین بنا رکھا تھا۔ جس پہ اُن کو بڑا ناز تھا۔ اسی کو ذریعہ نجات سمجھ کر یہود تو کہتے تھے۔ کہ ہمارا دین پُرانا ہے۔ اِس کے بغیر ہدایت ناممکن۔ تم سب یہودی بن جاؤ۔ اور عیسائی کہتے تھے۔ کہ ہمارا دین بنی اسرائیل میں آخری ہے اور سب کا ناسخ۔ نجات اسی میں ہے۔ عیسائی بن جاؤ۔ ان سب کے جواب میں فرمایا جا رہا ہے۔ کہ تم

کہتے کہ تمہارے مذہبوں میں شرک کی آمیزش ہے۔ اور ابراہیم علیہ السلام کا دین اس سے بالکل پاک صاف۔ کہ نہ تو وہ مشرک تھے۔ اور نہ اب تک اُن کے دین میں شرک ملا۔ اور اُن بزرگ کا طریقہ۔ طریقہ اسلام تھا۔ ہم اُس ملت کے پیرو ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ ہی دین اسلام پُرانا دین ہے۔ تمہاری یہ کیفیت ہے کہ عبادت میں حرام حلال کے احکام میں عالم کی خلقت میں اپنے بزرگوں کو خدا کا شریک جانتے ہو۔ کہ خدا کے حرام کئے ہوؤں کو ان کی طرف نسبت کر کے حلال جانتے ہو۔ اور رب کے ساتھ اپنے پیغمبروں کی بھی عبادت کرتے ہو۔ اور تمہارا یہ بھی عقیدہ ہے۔ کہ ہمارے پیغمبر رب کی مرضی کے خلاف ہم کو فتح و نصرت دیتے ہیں۔ ہمیں روزی پہنچاتے ہیں۔ ہمیں اولاد دیتے ہیں۔ اور ہمیں آخرت میں بجبر خدا کے عذاب سے بچالیں گے۔ لہٰذا تم در حقیقت مشرک ہو (تفسیر عزیزی) **فائدے** ۔ اِس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ**۔ ہر شخص اپنے دین کو اچھا کہتا ہے۔ مگر اچھائی کی بہت سی پہچانیں ہیں۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے۔ کہ وہ بزرگوں کے مطابق ہو۔ اس آیت میں اہل کتاب کی اس طرح تردید کی گئی۔ کہ تمہارا دین ملت ابراہیمی کے خلاف ہے۔ آج جس مذہب کی طرف ہمیں دیوبندی یا قادیانی بلاتے ہیں۔ وہ بھی اسی قاعدہ سے جھوٹے ہیں۔ کہ ان کے عقائد بزرگانِ دین کے خلاف ہیں۔ **دوسرا فائدہ**۔ اختلاف مٹانے کے لئے مسلمہ بزرگوں کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ دیکھو یہاں تین مذہبوں یعنی یہودیت۔ نصرانیت اور اسلام کے اختلاف پر ابراہیم علیہ السلام کی طرف رجوع کیا گیا۔ اسی لئے فقہاء کے اختلاف کے وقت صحابہ کرام کی طرف اور احادیث کے ظاہری تعارض کے وقت قرآن پاک کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ **تیسرا فائدہ**۔ دین کی عظمت دکھانے کے لئے بانیانِ دین کی تعریف کرنا ضروری ہے۔ دیکھو یہاں ملت ابراہیمی کی عزت کا اظہار ابراہیم علیہ السلام کے مناقب بتا کر کیا گیا۔ یہ ہی محفل میلاد شریف وغیرہ کا مقصود ہے۔ اور یہ ہی اہل سنت کا دین و ایمان۔ کہ اسلام کی عظمت دکھانے کے لئے مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے گیت گاتے ہیں دیوبندی وغیرہ حضور علیہ السلام کی توہین کر کے در پردہ اسلام کی بیخ کنی کرتے ہیں۔ طبیب کی عزت سے اس کے نسخہ کی قدر ہوتی ہے۔ اور بولنے والے کے دبدبہ سے کلام کا وقار۔ **پہلا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ اسلام ملتِ ابراہیمی کے بالکل مطابق ہے۔ نہ کہ یہودیت اور عیسائیت اگر اسلام سارے عقائد و اعمال میں اُس کے موافق ہے۔ تو نبی آخر الزمان کی تشریف آوری بیکار رہی۔ اور اسلام کا آنا بے فائدہ۔ کیونکہ ان کا مقصد ابراہیم علیہ السلام سے پورا ہو چکا۔ اور اگر اسلام عقائد میں اُس کے موافق اور اعمال میں اُس کے خلاف ہے۔ تو یہ بات تو یہودیت اور عیسائیت میں بھی تھی۔ بلکہ سارے آسمانی دین عقائد میں متفق ہیں۔ رب فرماتا ہے شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى الخ پھر اسلام کو اُس ملت کے موافق کہنا اور دیگر دینوں کو خلاف کیونکر صحیح ہوا۔ خیال رہے۔ کہ الوہیت مسیح یا سیدنا عزیر کے ابن اللہ ہونے کا عقیدہ ان لوگوں کی اپنی ایجاد ہے۔ ہمارا سوال اصلی یہودیت اور عیسائیت سے ہے۔ **پہلا جواب** اسلام اور ملتِ ابراہیمی سارے عقائد اور اعمال کے اصول میں متفق ہیں۔ اسی لئے اسلام ملت ابراہیمی کے موافق ہے نہ کہ شریعت ابراہیمی کے کیونکہ ملت میں صرف اصول کا لحاظ ہوتا ہے۔ اور شریعت میں جزئیات کا بھی۔ لہٰذا اسلام ملت ابراہیمی اور شریعت محمدی ہے۔ باقی دیگر دین صرف عقائد میں دین ابراہیمی کے موافق تھے۔ اور قوانین اعمال میں خلاف۔ لہٰذا وہ ادیان ملت ابراہیمی نہ کہلائے۔ جیسے کہ صاحبین فروعات میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی مخالفت کر کے بھی حنفی کہلاتے ہیں۔ نہ کہ شافعی۔ کیونکہ یہ حضرات امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے اصول میں بھی مخالفت ہیں لہٰذا تمام دینوں کا عقائد میں ایسا اتفاق ہے۔ جیسے مجتہدین کا قرآن حدیث کے ماننے میں یا تمام طبیبوں کا اصل علاج میں اور پھر ان کا آپس میں ایسا اختلاف ہے۔ جیسے کہ مجتہدین کا آپس میں اصولی اختلاف یا یونانی اور ڈاکٹری طبیبوں کی اصول علاج میں مخالفت مگر اسلام کی ملت ابراہیمی سے ایسی موافقت ہے۔ جیسے صاحبین کی امام ابو حنیفہ سے۔ اس لئے قرآن کریم نے فرمایا اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ۔ **دوسرا جواب**۔ یہ ہے کہ شریعت محمدیہ اپنے میں شریعت ابراہیمی کو پورا پورا لئے ہوئے ہے۔ یعنی عقائد اصول اعمال اور سارے جزئیات میں اُس سے متفق ہے۔ ہاں تکمیل کے لئے ہزارہا جزئیات اُس پر زائد ہیں۔ لہٰذا ملت ابراہیمی گویا متن ہے

اور شریعت مصطفوی اُس کی شرح۔ کہ شرح کرنے والا اگرچہ ہزارہا باتیں زیادہ بتاجاتا ہے۔ مگر پھر بھی متن کا تابعدار کہلاتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم فرماتا ہے مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰہِیۡمَ۔ نیز فرماتا ہے ثُمَّ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا۔ چنانچہ کفار سے جہاد۔ بتوں کو توڑنا۔ ختنہ۔ عقیقہ۔ مہمانوں کی دعوت اچھا لباس پہننا۔ نماز میں ہاتھ اٹھانا۔ نمازِ چاشت پڑھنا۔ نکاح میں گواہ و مہر کا ہونا۔ نماز میں سجدہ سے پہلے رکوع کرنا۔ مال کی زکوٰۃ دینا۔ ستر ڈھانپنا۔ کعبہ کو قبلہ بنانا۔ حج اور قربانی کرنا۔ نجوم کا معتقد نہ ہونا۔ کاہنوں سے دُور بھاگنا۔ کسی تاریخ یا دن کو منحوس نہ ماننا۔ مصیبت میں صبر کرنا۔ کھیل کود سے بچنا۔ تصویر و فوٹو سے دُور رہنا۔ تارک الدنیا ہونے اور جوگی بننے سے بچنا۔ گھر بار اور بال بچے رکھنا اور روزی کمانا وغیرہ۔ یہ سب ملت ابراہیمی کے مسائل ہیں۔ جو ہمارے ہاں ویسے ہی محفوظ۔ دیگر دینوں میں یہ بات نہیں۔ لہذا اسلام ملت ابراہیمی ہے نہ کہ دیگر ادیان (از تفسیر عزیزی) اگر کوئی کہے۔ کہ پھر تمہارے پیغمبر ابراہیم علیہ السلام کے اُمتی ہوئے نہ کہ افضل نبی۔ اس کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں۔ کہ یہ اتباع ایسی ہے جیسے کہ پچھلا بادشاہ اگلے سلاطین کے قانون باقی رکھتا ہے۔ **دوسرا اعتراض**۔ ابراہیم علیہ السلام کو حنیف کہکر یہ کیوں کہا گیا۔ کہ وہ مشرکین میں سے نہ تھے یہ بات تو حنیف میں آچکی تھی۔ **جواب**۔ اس میں موجودہ یہودیوں اور عیسائیوں پر چوٹ ہے۔ کہ تم تو اپنے اصلی دین پر بھی قائم نہ رہے بلکہ مشرک ہوگئے۔ پھر کس منہ سے اپنے کو ابراہیمی کہتے ہو۔ وہ شرک سے بہت دُور اور تم اس نشہ میں مخمور۔ **تفسیر صوفیانہ**:۔ دنیا ایک خطرناک جنگل ہے اور ہم لوگ یہاں کے نووارد مسافر۔ ہمارا ایمان اصل پونجی۔ اس جنگل میں قزاقی۔ ڈکیتی۔ راہ ماری بہت ہوتی ہے۔ ہر ڈاکو مسافروں کو اپنے گھات کی طرف بلاتا ہے۔ مگر قدرت نے اصل مقصود پر ایک شمع روشن کردی ہے۔ جو ہر شخص کو دُور سے نظر آرہی ہے۔ اور اس راستہ میں بھی جگہ جگہ پولیس کی چوکیاں اور راہبر موجود ہیں۔ اور کامیاب مسافروں کے نشان قدم بھی نظر آرہے ہیں۔ مسافر کو چاہیئے۔ کہ اُس شمعِ مقصود کی سیدھ پر جائے۔ ان رہبروں کی حفاظت میں رہے۔ ان قدموں کے نشانوں کو اپنا رہنما بنائے۔ اِدھر اُدھر دھیان نہ کرے ورنہ مارا جائے گا۔ اور یہ مجوبوں کی آوازیں محبوب سے روک دیں گی۔ بارگاہِ الٰہی سب کا اصل مقصود شمع نبوّت۔ اُس کا نشان اور شیخ طریقت اس راستہ کے رہبر اہل اللہ کے مزارات وغیرہ اس راستہ کی حفاظت کی چوکیاں۔ گذشتہ نیک بندوں کے حالات یہاں کے آثار قدم۔ اگر مقصود پر پہنچنا ہے۔ تو شیخ کامل کے پیچھے جاؤ۔ جماعت مومنین کے ساتھ رہو۔ اور شمع نبوت پر نظر رکھو۔ قُلۡ بَلۡ مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا پر غور کرتے رہو۔ ہر مذہب کی آواز پہ نہ چل پڑو ؎

یہ جو تجھ کو بلاتا ہے یہ ٹھگ ہے مار ہی رکھیگا
ہائے مسافر دم میں نہ آنا مت کیسی متوالی ہے

قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ وَاِسۡمٰعِیۡلَ وَاِسۡحٰقَ

کہو تم ایمان لاتے ہم ساتھ اللہ کے اور اوس کے جو اتارا گیا طرف ہمارے اور اوس کے جو اتارا گیا طرف ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق

یوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اوس پر جو ہماری طرف اوترا اور جو اتارا گیا اسمٰعیل اور اسحاق

وَیَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَمَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی وَعِیۡسٰی وَمَاۤ اُوۡتِیَ النَّبِیُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۚ

اور یعقوب اور اولاد کے اور جو دیا گیا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو دئے گئے نبی طرف سے رب اون کے سے

و یعقوب اور اون کی اولاد پر اور جو عطا کئے گئے موسیٰ و عیسیٰ اور جو عطا کئے گئے باقی انبیاء اپنے رب کے پاس سے

لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ مِّنۡہُمۡ ۫ۖ وَنَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۶﴾

نہیں فرق کرتے ہم درمیان کسی کے اون میں سے اور ہم واسطے اوسی کے اسلام والے ہیں

ہم اون میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے حضور گردن رکھے ہیں

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**۔ پچھلی آیت میں حضور علیہ السلام سے جواب دلوایا گیا۔ اب کسی قدر تفصیل کے

ساتھ مسلمانوں سے جواب دلوایا جارہا ہے۔ اِسی لئے وہاں قُلْ تھا۔ اور یہاں قُوْلُوْٓا۔ **دوسرا تعلق** ۔ یہ آیت پچھلی آیت کی گویا تفسیر ہے۔ کہ وہاں فرمایا گیا تھا۔ کہ ہم دینِ ابراہیمی کی پیروی کرتے ہیں۔ اب بتایا جارہا ہے کہ اس پیروی کے معنی یہ ہیں۔ کہ سب پیغمبروں کو مانتے ہیں۔ **تیسرا تعلق** ۔ پچھلی پر اہل کتاب اعتراض کر سکتے تھے۔ کہ تم نے یہودیت اور عیسائیت کو دائرہ ہدایت سے خارج کیا۔ اور اِن دونوں کو اشارۃً مشرک کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم شریعت موسوی اور عیسوی کے منکر ہو۔ لہٰذا تم کافر۔ اس آیت میں جواب دیا گیا۔ کہ ہم اُن کے اصلی دین کے منکر نہیں۔ اسُی کو حق مانتے ہیں تمہاری ایجادات کے منکر ہیں۔ اور اسی کو شرک کہتے ہیں۔ **چوتھا تعلق** ۔ پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا۔ کہ یہود یہودیت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اب فرمایا جارہا ہے۔ کہ کہدو۔ کہ ہم سارے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں یعنی تم تو اپنے پیغمبروں کو قومیت کے لحاظ سے مانتے ہو۔ کہ وہ اسرائیلی تھے۔ اور غیر اسرائیلی پیغمبروں کا انکار کرتے ہو۔ لہٰذا تمہارے ایمان میں نفسانیت کو دخل ہے۔ ہم جس پیغمبر کو بھی مانتے ہیں۔ اس لئے مانتے ہیں۔ کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے اور صاحبِ معجزات ہیں۔ خواہ اسرائیلی ہوں یا اسمٰعیلی یا کوئی اور۔ لہٰذا یہ ماننا اللہ کے لئے ہے۔ **تفسیر** ۔ قُوْلُوْٓا یہ تمام مسلمانوں سے خطاب ہے۔ اس کا مفعول یا تو اگلی عبارت ہے اور یا پوشیدہ یعنی کہدو کہ ہم اللہ پر ایمان للئے الخ۔ یا کہدو کہ ہم کفر نہیں کر سکتے۔ اور تمہاری باتوں میں نہیں آسکتے۔ کیونکہ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ۔ ہم تو اللہ پر ایمان لائے۔ نہ کہ اپنے نفس اور خواہشات پر لہٰذا اُس کی ساری کتابوں اور سارے پیغمبروں کو مانیں گے۔ مگر ہاں اُن میں بعض بعض سے افضل ہیں۔ اور ہماری کتاب ساروں کی جامع۔ لہٰذا پہلے وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا اُس پر ایمان لائے۔ جو ہم پر اُتارا گیا۔ اگرچہ قرآن کا نزول آہستگی سے ہوا۔ مگر چونکہ رمضان یا شب قدر میں ایک دم بھی اُترا ہے۔ اس لئے یہاں اُنْزِلَ فرمایا گیا یعنی ایکدم اُتارا گیا۔ اور اگرچہ قرآن حضور علیہ السلام پر آیا۔ مگر چونکہ وہ ہمارے مولیٰ ہیں اور ہم اُن کے غلام۔ اور محض ہماری ہی ہدایت کے لئے آیا۔ نہ کہ اُن کی۔ کہ وہ تو پہلے ہی سے ہدایت پر تھے۔ اس لئے فرمایا گیا اِلَیْنَا کہ ہم سب کی طرف۔ پھر وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ اُس پر بھی ایمان لائے جو کہ ابراہیم علیہ السلام پر اُتارا گیا۔ کیونکہ اُن کا دین ہمارے دین کے بہت مشابہ ہے + خیال رہے کہ ابراہیم علیہ السلام پر کتاب نہ اُتری۔ بلکہ دس صحیفے آئے (روح البیان) اسی لئے یہاں دوبارہ اُنْزِلَ فرمایا گیا۔ کہ مُنَزَّل میں فرق ہے یعنی اُتارنے والا ایک۔ مگر اُس نے نبی آخر الزمان پر کتاب اُتاری اور اُن پر صحیفے۔ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ان حضرات پر علیحدہ کتاب یا صحیفے نہ آئے۔ بلکہ یہ ابراہیمی صحیفوں کے تابع تھے۔ اور اُن پر جو وحی آتی تھی۔ وہ شریعت ابراہیمی کی کامل کرنے والی تھی۔ اسی لئے یہاں علیحدہ اُنْزِلَ نہ فرمایا گیا۔ اور اس آیت کے معنی یہ ہوئے۔ کہ اُس پر بھی ایمان لائے۔ جو ابراہیم و اسمٰعیل وغیرہم علیہم السلام پر نازل ہوئے (تفسیر عزیزی) نیز ان کے ناموں میں ترتیب زمانی بھی ہے اور رتبی بھی۔ وَالْاَسْبَاطِ۔ یہ جمع سِبْطٌ کی ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں شاخوں والا درخت۔ اصطلاح میں خاندان۔ اور قبیلہ کو سبط اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی ایک شخص سے پھیلتا ہے۔ پھر اُس کو سبط کہنے لگے۔ جو قبیلہ کا اصل ہو اور قبیلہ اُس کی نسل سے۔ اسی لئے امام حسن و حسین علیہ السلام کو سبطین کہتے ہیں۔ کہ وہ حسنی اور حسینی سیّدوں کے اصل ہیں (کبیر و حقانی) قرآن کریم میں اسباط یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک ایک قبیلہ کا جدامجد بنا۔ وہ ہی یہاں بھی مراد ہے۔ ان بارہ میں سے یوسف علیہ السلام کی نبوت قطعی اور یقینی ہے۔ دوسروں کی نبوت میں اختلاف۔ اور صحیح یہ ہے۔ کہ وہ پیغمبر نہ تھے (عزیزی) اور اُس کی زیادہ تحقیق ہماری کتاب قہر کبریا میں دیکھو۔ اور انشاء اللہ سورہ یوسف کی تفسیر میں بھی کی جائے گی۔ لہٰذا ان پر صحیفوں کا اُترنا ایسا ہے۔ جیساکہ ہم مسلمانوں پر قرآن کریم کا اُترنا اگرچہ ان میں سارے اسرائیلی پیغمبر آگئے تھے۔ مگر چونکہ کلام یہود و نصاریٰ سے ہو رہا ہے۔ نیز موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام ان میں عظیم الشان پیغمبر ہیں۔ اس لئے فرمایا گیا۔ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی۔ کہ ہم اس پر بھی ایمان لائے۔ جو ان پیغمبروں کو دیا گیا۔ چونکہ انہیں توریت۔ انجیل کتابی شکل میں دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے بڑے بڑے معجزات بھی عطا ہوئے تھے۔ اس لئے یہاں بجائے اُنْزِلَ کے اُوْتِیَ فرمایا گیا۔ وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّہِمْ۔ ہمارا ایمان فقط ان مذکورہ پیغمبروں میں ہی محدود نہیں۔ اور نہ صرف ان کی کتابوں پر بلکہ از آدم تا ایندم مذکور اور غیر مذکور جس قدر بھی پیغمبر ہوئے۔ انہیں کتاب صحیفے۔ وحی۔ معجزات جو

کچھ ملے۔ اُن سب پر ہم ایمان لائے۔ یعنی ہمارا ایمان اُن پر کچھ تفصیلی بھی ہے۔ اور اجمالی بھی۔ اے اسرائیلیو تم تو ایمان لانے میں اسرائیلی اور غیر اسرائیلی پیغمبروں میں فرق کرتے ہو۔ لیکن ہمارا یہ حال ہے۔ کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ۔ ہم ایمان میں کسی میں فرق نہیں کرتے۔ کہ تمہاری طرح بعض پر ایمان لائیں۔ اور بعض پر نہ لائیں۔ بلکہ سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور یہاں اَحَد کے معنی ہیں کسی نہ کہ ایک کیونکہ لفظ بَیْن کثرت کو چاہتا ہے یعنی اُن میں سے کسی کے درمیان۔ اور یہ کیوں نہ ہو کہ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ہم تو رب کے فرمانبردار ہیں نہ کہ اپنے نفس کے اس کا جو حکم جس وقت بھی جس پیغمبر پر جس زبان میں آوے۔ ہماری سروں آنکھوں پر۔ **خلاصہ تفسیر**۔ اے مسلمانو تمہیں یہود نصاریٰ نفسانیت سے اپنے اپنے دینوں کی طرف بلاتے ہیں۔ جن دینوں میں اُن کی نفس کو دخل ہے۔ تم اُنہیں جواب دے دو۔ کہ ہمارا ایمان تو اللہ پر ہے اور اُس قرآن کریم پر جو تمام شریعتوں کا جامع اور تمام دینوں کا اصل ہے۔ کہ جس کا ماننا سب کا ماننا ہے۔ ہم اللہ پر اور اپنی کتاب پر بھی ایمان لائے۔ اور اُن کے بتانے سے اس پر بھی ایمان لائے۔ جو نبیوں کے جد امجد ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے فرزند ارشد اسمٰعیل علیہ السلام اور اسرائیلی پیغمبروں کے والد ماجد اسحاق علیہ السلام اور اُن کے فرزند یعقوب علیہ السلام اور اُن یعقوب علیہ السلام کے سارے فرزندوں پر اُترا۔ اور اُن کتب۔ معجزات وغیرہ کو بھی دل سے مانتے ہیں۔ جو موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو دی گئیں۔ اور انہیں میں کیا منحصر ہے۔ ہم تو اُن ساری کتابوں اور نعمتوں کو حق جانتے ہیں۔ جو سارے پیغمبروں کو اُن کے رب سے ملیں۔ ہم تمہاری طرح اپنی طرف سے پیغمبروں میں فرق نہیں کرتے۔ کہ جس کو چاہا مان لیا۔ اور جس کو چاہا نہ مانا۔ کیونکہ ہم تو رب کے مطیع ہیں نہ کہ اپنے نفسوں کے جیسے وہ بڑا بنا دے ہم اُسی کے ماننے کو تیار ہیں۔ **فائدے**۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ** رب کا ماننا آسمانی کتاب کے ماننے پر موقوف نہیں۔ بلکہ ایمان باللہ سارے پیغمبروں اور کتابوں کے ماننے کی اصل ہے۔ دیکھو یہاں ایمان باللہ کو ساری کتابوں کے ماننے سے پہلے بیان کیا گیا (تفسیر کبیر) یعنی ہم نے پیغمبروں اور کتابوں کو خدا کے لئے مانا۔ اور اس لئے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے ہیں۔ خدا کو اس لئے نہ مانا۔ کہ نبی نے فرمایا۔ اسی لئے نبوت سے بے خبر رہنے والے پر بھی خدا کا ماننا ضروری ہے۔ یہ درست ہے۔ کہ نبی خدا کی ذات و صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔ تو پیغمبروں سے خدا کا پہچاننا ایسا ہے۔ جیسا کہ دھوپ سے آفتاب کا۔ یہ بہت باریک فرق ہے خیال میں رہے۔ جیسے کہ حضور علیہ السلام سے اور اُن کے بتلائے ہوئے قاعدوں سے مشائخ کو پہچانا۔ پھر بذریعہ مشائخ بارگاہ نبوت تک پہنچے۔ جن صوفیاء نے فرمایا۔ کہ میں خدا کو بھی اس لئے مانتا ہوں۔ کہ وہ رب محمد ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ یا جنہوں نے کہا۔ کہ اگر پروردگار بشکل مصطفےٰ تجلی فرمائے تو میں اُسے پہچانوں۔ ان سب کا یہ ہی مطلب ہے۔ اسی طرح جو قرآن پاک میں فرمایا گیا۔ کہ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ۔ پھر فرمایا گیا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ۔ اس میں بھی یہ ہی اشارہ ہے۔ کہ رب نے بندوں کو اپنی پہچان یوں کرائی۔ کہ ہم رب محمد ہیں۔ اور پھر اُن سے اپنی ربوبیت کا عہد لیا۔ تو اس عہد میں رب کی ربوبیت کے ساتھ حضور کی نبوت کا بھی ذکر ہے۔ **دوسرا فائدہ**۔ جیسے کہ سَو کے عدد میں ساری اکائیاں اور دھائیاں داخل ہیں۔ ایسے ہی حضور کی پہچان میں سارے انبیاء کی پہچان اور قرآنی عرفان میں ساری کتابوں کا عرفان شامل ہے۔ دیکھو اس آیت میں پہلے۔ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا فرمایا گیا۔ اور پھر کچھ تفصیل۔ اسی لئے صوفیائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ حضور علیہ السلام کی زیارت سارے پیغمبروں اور سارے اولیاء کی زیارت ہے۔ بلکہ مدینہ منورہ کی حاضری سارے آستانوں کی حاضری ہے۔ **تیسرا فائدہ**۔ ضروری ہے۔ کہ ایمان میں پیغمبروں کی تعداد کا لحاظ نہ کرے بلکہ اجمالاً سارے پیغمبروں کو مانے کیونکہ اُن کی صحیح تعداد ہم کو یقین سے معلوم نہیں۔ اسی لئے یہاں اخیر میں سارے پیغمبروں کا اجمالی ذکر بھی کیا گیا۔ **چوتھا فائدہ**۔ جس طرح کہ ایمان لانے میں پیغمبروں میں فرق نہیں۔ ایسے ہی اُن کی نبوتوں میں بھی فرق نہیں یعنی یہ نہیں۔ کہ بعض کی نبوت اصلی ہو۔ اور بعض کی عارضی۔ جیسے کہ اصلی حاکم کی غیر موجودگی میں دوسرا عارضی حاکم چند روز کے لئے کام کرتا ہے۔ اس لحاظ سے سارے پیغمبر اصلی ہی نبی ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے۔ کہ سب کی نبوت حضور علیہ السلام کے طفیل ہے۔ مگر ہے اصلی جیسے کہ چاند تاروں کا نور آفتاب کی کی طفیل قصیدہ بردہ شریف میں ہے

فَاِنَّکَ شَمْسٌ فَضْلٍ ھُمْ کَوَاکِبُھَا یُظْھِرْنَ اَنْوَارَھَا لِلنَّاسِ فِی الظُّلَمِ

لہٰذا مولوی قاسم صاحب کا دیگر پیغمبروں کو عارضی نبی ماننا غلط ہے۔ اور آیت لَانُفَرِّقُ کے خلاف **پہلا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ ساری کتابوں پر ایمان ضروری ہے۔ پھر تم انہیں منسوخ کیوں مانتے ہو۔ **جواب**۔ اس کا جواب ہم نسخ کی بحث میں دے چکے۔ ایمان اسی پر ہے کہ وہ ساری کتابیں رب کی ہیں۔ نسخ کے یہ معنی کہ وہ اپنے زمانہ میں قابل عمل تھیں۔ اب نہیں۔ جیسے کہ طبیب کے سارے نسخے سچے ہیں۔ مگر پچھلے اب استعمال نہ ہوں گے۔ **دوسرا اعتراض**۔ اس جگہ فرمایا گیا۔ کہ لَانُفَرِّقُ۔ دوسری آیت میں ہے تِلْکَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ۔ اور مسلمان انبیاء کے درجات میں فرق بھی کرتے ہیں۔ اور اپنے پیغمبر کو سید الانبیاء بھی کہتے ہیں۔ ان آیتوں میں مطابقت کیونکر ہو۔ **جواب**۔ اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ ایمان میں فرق نہیں۔ کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں۔ درجات میں فرق ہے۔ دوسرے یہ کہ نبوت میں فرق نہیں۔ کہ بعض کی اصل اور بعض کی عارضی ہو۔ دیگر درجات میں فرق۔ تیسرے۔ یہ کہ ہم اپنی طرف سے فرق نہیں کرتے۔ جو خود رب نے فرق بتا دیا ہے اُسے مانتے ہیں۔ اسی لئے یہاں فرمایا گیا کہ لَانُفَرِّقُ۔ کہ ہم بندے فرق نہیں کرتے۔ وہاں ہے کہ فَضَّلْنَا رب نے بزرگی دی۔ چوتھے یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہم ایسا فرق نہیں کرتے جس سے دیگر انبیاء کی توہین ہو جائے۔ جیسے کہ مولوی قاسم صاحب دیوبندی نے "تحذیر الناس" میں لکھا۔ کہ دوسرے پیغمبر ہمارے حضور علیہ السلام کے دریوزہ گر یعنی بھکاری ہیں۔ یہ حرام ہے۔ ہاں ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے فرق کرتے ہیں۔ اسی لئے ایک حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ ہم سارے انسانوں کے سردار ہیں۔ دوسری روایت میں ہے۔ کہ ہم کو یونس علیہ السلام پر بھی بزرگی مت دو۔ اس کا یہی مطلب ہے۔ کہ ایسی بزرگی نہ دو۔ کہ جس میں اُن کی توہین ہو۔ **لطیفہ** ایک نعت خواں نے اعلیٰ حضرت کے سامنے یہ شعر پڑھا۔ کہ۔ شانِ یوسف جو دبی وہ بھی یہیں آکے دبی ۔ آپ نے فرمایا۔ یوں نہ کہو۔ بلکہ کہو ؎

شانِ یوسف جو بڑھی وہ بھی اسی گھر سے بڑھی ۔ حضور علیہ السلام سب کو بڑھانے والے ہیں۔ کسی کو گھٹاتے نہیں۔ اُنہوں نے سارے پیغمبروں کو چمکا دیا۔ اور سب کی شانیں دوبالا کر دیں ۔ **تفسیر صوفیانہ**:۔ ایمان گویا کہ جال ہے اور اعمال شکار۔ اُسی جال سے شکار ہو سکتا ہے۔ جس کے سارے پھندے مضبوط ہوں۔ اگر ایک پھندا بھی کھل گیا۔ تو جال شکار کے قابل نہ رہا۔ اور پھر دوسرے پھندے بھی کھل جائیں گے۔ سارے انبیائے کرام کو ماننا۔ ساری کتابوں کو حق جاننا اس جال کے پھندے ہیں۔ ایک پیغمبر کے بھی انکار سے ایمان بے کار ہے۔ اور اس سے دوسرے پیغمبروں کا بھی انکار۔ یہ ہی حال اولیاء و علماء کا ہے۔ کہ تم خواہ کسی سلسلہ میں ہو۔ اور کوئی مذہب رکھتے ہو۔ سارے اولیاء اور سارے آئمہ مجتہدین کو حق جانو۔ اور اُن کی عظمت کرو۔ ایک ولی کا نکالا ہوا سارے اولیاء اللہ کے ہاں سے پھٹکارا جاتا ہے۔ بھیک اپنے ہی شیخ سے لو۔ مگر تعظیم سب کی کرو ۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اھْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا ھُمْ فِیْ

پس اگر ایمان لاویں وہ ساتھ مثل اوس کے کہ ایمان لائے تم ساتھ اوس کے تو بیشک ہدایت پا گئے اور اگر منہ پھیریں پس اس کے سوا نہیں کہ وہ بیچ

پھر اگر وہ بھی یوں ہی ایمان لائے جیسا تم لائے جب تو وہ ہدایت پا گئے ۔۔۔ اور اگر منہ پھیریں تو وہ نری ضد میں ہیں

شِقَاقٍ ۚ فَسَیَکْفِیْکَھُمُ اللّٰهُ ۚ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَ

مخالفت کے ہیں پس عنقریب کفایت کریگا تمہیں اون کے مقابلہ میں اللہ اور وہ سننے والا جاننے والا ہے رنگ اللہ کا اور

تو اے محبوب عنقریب اللہ اون کی طرف سے تمہیں کفایت کریگا اور وہ ہی ہے سننا جانتا ہم نے اللہ کی

مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

کون ہے زیادہ اچھا اللہ کے رنگ سے اور کہ واسطے اس کے عبادت کرنے والے ہیں

دینی لی اور اللہ سے بہتر کس کی دینی اور ہم اوسی کو پوجتے ہیں

**تعلق**:۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ پہلا تعلق۔ پچھلی آیت میں یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو اسباط فرما کر ان کی بہت عزت افزائی کی گئی تھی۔ شائد موجودہ بنی اسرائیل اس پہ فخر کرتے۔ اس لئے اب بتایا جارہا ہے۔ کہ اگر تم صحیح ایمان لے آؤ۔ تو تم بھی اس بزرگی میں داخل ہو ورنہ نہیں۔ دوسرا تعلق۔ پچھلی آیتوں سے معلوم ہوا تھا۔ کہ مسلمانوں اور اہل کتاب میں فرق یہ ہے۔ کہ مسلمان تو سارے پیغمبروں پہ ایمان لاتے ہیں اور وہ بعض پہ جس سے شائد مسلمان دھوکہ کھاتے۔ کہ اہل کتاب میں اور ہم میں بہت تھوڑا فرق ہے۔ اور وہ بھی قریباً ہدایت ہی پر ہیں۔ اور ہمارے بھائی کیونکہ صرف ایک دو پیغمبروں کے ماننے ہی میں تو اختلاف ہے۔ اس وہم کو دفع کرنے کے لئے اب فرمایا جارہا ہے۔ کہ جب تک کہ وہ بالکل تمہاری طرف ایمان نہ لے آئیں تب تک وہ ہدایت پر نہیں۔ اور نہ تم سے قریب بلکہ بالکل بے دین اور تمہارے دشمن ہیں۔ تیسرا تعلق۔ پچھلی آیت میں مسلمانوں کو تبلیغ کا حکم تھا۔ کہ تم اہل کتاب کے سامنے اپنا ایمان پیش کردو۔ اب اس کا نتیجہ بیان فرمایا جارہا ہے۔ کہ اگر وہ تمہاری بات سن کر تم جیسے بن جائیں۔ تو فبہا۔ ورنہ وہ گمراہ ہیں ۞

**تفسیر**:۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا۔ اس کا فاعل وہ ہی یہود و نصاریٰ ہیں۔ جو ہدایت کو اپنے میں محدود سمجھے ہوئے تھے۔ اور جن پر ایمانی باتیں پیش کی گئی تھیں یعنی اگر یہ لوگ ایمان لے آئیں بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ۔ یا تو ما سے ایمان مراد ہے یا دین۔ یعنی اگر یہ تمہارے ایمان کی طرح ایمان قبول کرلیں۔ یا ان چیزوں پر ایمان لے آئیں۔ جن پر تم لے آئے ہو۔ اس کی زیادہ تحقیق انشاء اللہ اعتراض و جواب میں آئے گی۔ فَقَدِ اهْتَدَوْا۔ تو یہ بھی تمہاری طرح ہدایت پا جائیں گے۔ اِهْتَدَوْا۔ افتعال میں آکر یا تو شرکت کے معنی دے رہا ہے یا کمال کے یعنی تمہارے ساتھ ہدایت میں شریک ہو جائیں گے۔ یا کامل ہدایت پالیں گے۔ اس میں ادھر اشارہ ہے۔ کہ ہدایت ان میں محدود تو کیا ہوتی۔ سرے سے ہے ہی نہیں۔ اگر ایمان قبول کریں تو وہ بھی تمہارے ساتھ ہدایت میں شریک ہوں گے۔ نیز یہ نہ ہوگا۔ کہ تم پرانے مومن ہونے کی وجہ سے ان سے افضل رہو۔ اور یہ نو مسلم ہونے سے تم سے گھٹیا۔ بلکہ کلمہ پڑھتے ہی تمہاری طرح کامل مومن ہوں گے۔ وَاِنْ تَوَلَّوْا۔ یہ وَلْیٌ سے بنا۔ جس کے معنی ہیں قریب ہونا۔ باب تفعّل میں آکر سلب قرب یعنی دور ہونے کے معنی بنے۔ چونکہ پیٹھ پھیر کر جانے والا دور ہو جاتا ہے۔ اس لئے تولّی کے معنی منہ پھیرنا یا پیٹھ پھیرنا کئے جاتے ہیں۔ پھر نہ ماننے کو بھی تولی اس لئے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ ہماری رائے سے دور ہو گیا یعنی اگر یہ تمہاری ساری باتیں تو مان لیں۔ مگر ایک عقیدے سے بھی منہ موڑ لیں۔ تو وہ ہدایت پر نہیں۔ اور نہ وہ تمہارے دوست۔ بلکہ فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ۔ وہ تمہاری کھلی ہوئی مخالفت میں ہیں۔ شقاق۔ شقّ سے بنا۔ جس کے لفظی معنی ہیں شگاف اور علیحدگی۔ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا۔ ٹکڑے کو بھی شِقّۃٌ اسی لئے کہتے ہیں۔ کہ وہ کٹ کر علیحدہ ہو جاتا ہے مخالفت کو شقاق بھی اسی لئے کہا جاتا ہے۔ کہ اس نے ضد کر کے شق مخالف اختیار کرلی اور شق کے معنی مشقت کے بھی آتے ہیں اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ دشمنی کو اسی لئے بھی شقاق کہتے ہیں۔ کہ ہر دشمن دوسرے کو مشقت میں ڈالنے کی فکر کرتا ہے (تفسیر کبیر) یعنی وہ ضد میں تمہارے جانب مخالف میں ہیں۔ اور تم کو مشقت میں ڈالنے کی فکر میں۔ اور یہاں یہ نہ کہا گیا کہ ان میں ضد ہے۔ بلکہ وہ ضد میں ہیں۔ کہ ضد اور دشمنی ان پر چھا گئی۔ اور غالب آگئی لامحالہ تمہاری ان کی جنگ ہوگی۔ مگر تم یقین رکھو۔ کہ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ۔ اے نبی علیہ السلام اللہ تمہیں ان کی شرارت سے کافی ہوگا۔ اس پر بھروسہ کرو۔ خیال رہے۔ کہ اس سے پہلی عبارت میں خطاب مسلمانوں سے تھا۔ اور اب صرف حضور علیہ السلام سے ہوا۔ تاکہ معلوم ہو جائے۔ کہ رب کی فتح اور نصرت اپنے حبیب کے لئے ہوگی۔ جو ان کے دامن میں آجائے گا۔ وہ بھی اس سے نفع پائے گا۔ اور یہ کیونکر ممکن ہے۔ کہ رب تمہاری امداد نہ کرے۔ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ وہ تو تمہاری اور ان کی باتوں کو سننے والا اور نیتوں کو جاننے والا ہے۔ تمہاری باتوں میں حقانیت اور نیتوں

میں اخلاص ہے۔ ان کی کلام میں شرارت ہے۔ اور دل میں فساد اور مفسد مغلوب اور مخلص غالب ہوتا ہے۔ یہاں تک ایمان کے ارکان اور اعتقادی مسائل بیان فرما کر ترقی کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اے مسلمانوں تم ان سے یہ بھی کہدو۔ کہ صِبْغَةَ اللّٰهِ۔ یہ صِبْغٌ سے بنا جس کے معنی ہیں رنگ بروزن فِعْلَةٌ کے آکر نوعیت اور حالت کے معنی دے رہا ہے۔ اصل عبارت یہ ہے صَبَغْنَا اللّٰهُ صِبْغَةً۔ یعنی ہم کو اللہ نے خاص رنگ میں رنگ دیا ہے۔ جس سے ہمارا ظاہر و باطن ایسا رنگین ہوگیا۔ کہ کسی پانی سے چھوٹ سکتا ہی نہیں یا تو اس رنگ سے مراد فطرت سلیمہ ہے۔ یا دین اسلام یا تقویٰ اور پرہیزگاری یا وہ نور کے چھینٹے جو ارواح کی پیدائش کے وقت مومنوں پر پڑے تھے۔ یا صوفیائے کرام کے کشف کے رنگ۔ کچھ بھی مراد ہو۔ مطلب یہ ہی ہے کہ ہم اللہ کے خاص رنگ میں رنگے ہوئے ہیں وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔ یہ تو بتاؤ کہ اللہ کے رنگ سے بڑھ کر کس کا رنگ ہے۔ کہ دنیوی رنگ پرانے ہو کر پھیکے پڑ جاتے اور دُھل کر یا دوسرے رنگ کے غلبہ سے چھوٹ جاتے ہیں۔ اس کا رنگ ایسا ہے کہ نہ پھیکا پڑے اور نہ چھوٹے۔ دیکھو لوکہ چہرہ اور پتھروں کے قدرتی رنگ کیسے پختہ ہوتے ہیں۔ اور پھر ہم اس رنگ پر ہی نہیں پھولتے۔ بلکہ اس کی جلا کے لئے وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ۔ ہم اس اللہ کے لئے یا اس رنگ کے لئے بغیر دوسری لالچ کے رب کی عبادت کرتے رہتے ہیں تاکہ عبادت کے صیقل سے باطنی زنگ دور ہوتی رہے۔ **خلاصہ تفسیر**۔ اے مسلمانوں تم یہ نہ سمجھنا کہ اہل کتاب کچھ ہدایت پر ہیں اور تم سے قریب۔ کیونکہ بجز بعض پیغمبروں اور بعض کتابوں کے ساری باتیں مانتے ہیں۔ نہیں بلکہ اگر وہ بالکل تمہاری طرح اسلام کو پورے طور پر قبول کر لیں۔ تو تمہارے ساتھ ہدایت میں شریک ہیں۔ اور تمہارے بھائی اور اگر ایک عقیدہ سے بھی الگ رہیں۔ تو یقین کرلو۔ کہ وہ ضدی تمہارے پورے دشمن ہیں۔ اور تم سے ان سے مقابلے مجادلے مقاتلے ضرور ہوں گے۔ مگر اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ مسلمانوں کی کمی اور غریبی پر نظر نہ فرمائیں اللہ آپ کے لئے ان سب کے مقابلہ میں کافی اور وافی ہے۔ آپ اور آپ کی چھوٹی سی مخلص جماعت ان سب پر غالب آئیں گے۔ اور یہ اللہ کی رسّی سے بندھی ہوئی مٹھی بھر جماعت کفر کے سارے بکھرے ہوئے کوڑے کو جھاڑ کر پھینک دے گی۔ رب نے یہ وعدہ پورا فرمایا۔ کہ چند سال کے اندر یہودیوں سے بنی قریظہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اور بنی نضیر جلاوطن۔ اور اہل خیبر مسلمانوں کے رعایا بنے۔ چونکہ عیسائیوں نے اس وقت کوئی خاص شرارت نہ کی۔ بلکہ ان میں سے بادشاہ نجاشی نے اسلام قبول کیا۔ نجران کے عیسائیوں نے صلح کرلی۔ ہرقل قیصر روم نے تکبر و عناد نہ کیا۔ بلکہ عقیدت مندی ظاہر کی۔ اس لئے عیسائی اس قہر میں گرفتار نہ ہوئے۔ حاکم نے مستدرک میں روایت کی۔ کہ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں۔ کہ ایک روز عثمان غنی حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے عثمان تم سورہ بقر پڑھتے ہوئے شہید ہوگے۔ اور تمہارا خون اسی آیت پر پڑے گا۔ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ۔ محدثین و مؤرخین فرماتے ہیں۔ کہ جب مصری لوگ قتل کے ارادہ سے حضرت عثمان کے گھر میں گھسے۔ تو وہ قرآن شریف کھولے ہوئے یہ ہی رکوع پڑھ رہے تھے۔ ایک شقی نے آپ کے ہاتھ پر تلوار ماری۔ جس سے خون نکل کر اسی لفظ پر پڑا۔ آپ قرآن پاک کو صاف کرتے تھے اور فرماتے تھے۔ کہ خدا کی قسم سب سے پہلے اسی ہاتھ نے قرآن لکھا ہے۔ بہت عرصہ کے بعد لوگوں نے اس قرآن پاک کی زیارت کی۔ اور اس پر خون کا اثر دیکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان مصریوں میں سے سب بُرے حال مرے (عزیزی) بلکہ خون عثمانی کا ہی یہ اثر ہوا۔ کہ مسلمانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور قیامت تک کے لئے ان میں کشت و خون جاری ہوگیا+ اب ہم پھر **تفسیر کی طرف آتے ہیں**۔ عیسائی اپنے بچوں کو پیدائش کے ساتویں سال اور دوسروں کو عیسائی بناتے وقت زرد پانی کے حوض میں غوطہ دیتے تھے۔ جس کا نام تھا بپتسمہ۔ اور کہتے تھے کہ یہ اب عیسائی بنا اور عیسائیت کے رنگ میں رنگا گیا۔ اور وہ سمجھتے تھے۔ کہ اس پانی میں عیسیٰ علیہ السلام کے غسل کا پانی ملا ہوا ہے۔ جگہ جگہ حوضوں میں وہ پانی ملا دیا گیا تھا۔ اس پانی کا نام ماءِ معمودیہ تھا۔ اور سنا گیا ہے کہ اب بھی عیسائی بناتے وقت اس پر پانی چھڑکتے ہیں۔ یا پادری کے بدن کا دھوون ڈالتے ہیں۔ رب تعالیٰ ان کی تردید میں فرماتا ہے۔ کہ اس رنگ سے کیا ہوا جس سے فقط دو چار دن کے لئے جسم رنگین ہوگیا۔ اور بعد میں کچھ نہ رہا مسلمانو تم کہدو کہ ہمیں اللہ نے دین کے رنگ میں ایسا رنگا ہے۔ کہ ہمارا ظاہر و باطن ہمیشہ کے واسطے رنگ گیا۔ کہ دل و دماغ رب

کے متوالے بن گئے۔ ہاتھ اس کے آگے بندھ گئے۔ سر سے پاؤں تک وضع قطع۔ شکل و صورت۔ لباس سب مسلمانوں کی طرح ہو گیا۔ اخلاق و آداب چال چلن۔ رنگ ڈھنگ ان سب میں کسی اور ہی محبوب کا جلوہ نظر آنے لگا۔ اور پھر شریعت نے اس رنگ پر عبادت کی پالش کر دی۔ اور ہمیں مسلمان عابد بنا دیا۔ خیال رہے کہ دنیا کے سارے رنگ کچے اور ناکافی ہیں۔ ظاہری رنگ فقط کھال پر۔ فلسفہ کا رنگ فقط عقل پر۔ بدعات اور ناجائز رسموں کا رنگ فقط وہم پر۔ منسوخ دینوں کا رنگ فقط عادت پر۔ دنیوی محبت کا رنگ فقط شہوت پر۔ حکومت کا رنگ مال پر یا غضب پر اور پھر سارے رنگ جلد ٹٹنے والے۔ اللہ کا رنگ وہ رنگ ہے جو ظاہر باطن سب پر چڑھ جائے اور کبھی نہ چھوٹے۔ اللہ ان رنگے ہوئے محبوبوں کی طفیل ہمیں بھی رنگ دے۔ **فائدے۔** اس آیت چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ۔** مومن بننے کیلئے سارے عقائد کا ماننا ضروری ہے۔ ایک عقیدے کا منکر بھی ویسے ہی پورا کافر ہے۔ جیسے سارے عقائد کا منکر لہذا جو لوگ۔ کہ قادیانیوں یا دیوبندیوں یا دیگر مرتدین کو اپنا جانی سمجھیں۔ اور انہیں اسلام سے قریب جانیں سخت غلطی پر ہیں۔ **دوسرا فائدہ۔** ہر کافر مسلمانوں کا پورا دشمن ہے۔ ان سے دوستی کی امید غلطی ہے۔ قرآن مجید کی ساری خبریں سچی ہیں۔ اس نے فرمادیا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ۔ **تیسرا فائدہ۔** فتح و نصرت اور غلبہ رب سے ملے گا نہ کہ سب سے۔ سب کو راضی کرنے کے لئے رب کو ناراض نہ کرو۔ بلکہ خود صحیح مسلمان بنو۔ اور اللہ و رسول کے مخلص فرمانبردار بندے۔ اپنی جماعت بڑھانے کے لئے سب بے دینوں کو اپنے میں نہ ملاؤ۔ عطر بڑھانے کے لئے اس میں پیشاب مت بڑھاؤ۔ کیونکہ اس سے عطر فنا ہو جائے گا۔ **چوتھا فائدہ۔** یقیناً مسلمانوں کو اللہ کافی۔ مگر حضور علیہ السلام کی طفیل۔ اسی لئے فرمایا گیا فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ۔ **پانچواں فائدہ۔** بغیر صفائی باطن ظاہری زینت بے کار ہے۔ اور بغیر ظاہری صفائی کے باطنی صفائی ناقص۔ کامل وہ ہی جس کی سیرت و صورت دونوں اسلامی رنگ میں رنگے ہوں۔ جو کہتے ہیں کہ داڑھی میں کیا رکھا ہے۔ دل پاک چاہیئے وہ اس آیت کو غور سے پڑھیں۔ **چھٹا فائدہ۔** جسے اللہ رنگ دے۔ وہ کبھی بفضلہ تعالےٰ بے رنگ نہیں ہو سکتا۔ جو مسلمان مرتد ہو جائے سمجھو وہ اللہ کا رنگا ہوا نہ تھا۔ **ساتواں فائدہ۔** دین رنگ ہے۔ اور عبادت اس کی پالش یا دافع زنگ۔ فاسق مسلمان کا رنگ گناہوں کے غبار سے پھیکا ہے۔ **پہلا اعتراض۔** بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ سے سمجھا گیا۔ کہ اہل کتاب کو چاہیئے کہ ہمارے دین کی مثل پر ایمان لائیں۔ حالانکہ اسلام بے مثل ہے۔ کیونکہ ہمارا رب بے مثل۔ ہمارے پیغمبر۔ ہمارا قرآن۔ ہمارا کعبہ وغیرہ سب ہی بے مثل ہیں۔ پھر اس آیت کا مطلب کیا۔ **جواب** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مَا مصدریہ ہے اور ب استعانۃ کی۔ تو مطلب یہ ہوا۔ کہ تمہاری طرح خالص اور نفاق سے پاک و صاف ایمان قبول کریں۔ یعنی یہاں ایمان کی ایمان سے تشبیہ ہے نہ کہ دین کی دین سے۔ کہ ان کا ایمان تمہارے ایمان جیسا ہو۔ دوسرے یہ کہ یہاں مثل زائد ہے۔ تو معنی یہ ہوئے۔ کہ اس پر ایمان لائیں جس پر تم لائے ہو۔ یعنی تمہاری طرح قرآن شریف اور نبی آخر الزمان کو مانیں۔ تیسرے یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اپنی کتابوں پر ایسا ایمان لائیں۔ جیسا کہ تم قرآن پر لائے۔ یعنی انہیں بغیر تحریف تبدیل کے مانیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ ضرور مسلمان ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان کی کتابوں میں اسلام لانے کا حکم ہے۔ چوتھے یہ کہ یہ ب استعانۃ کی ہے۔ اور مَا سے مراد دلائل ہیں۔ یعنی اہل کتاب تمہاری طرح دلائل سے ایمان لائیں۔ نہ کہ نفسانی خواہش سے۔ **دوسرا اعتراض۔** فَقَدِ اهْتَدَوْا سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اہل کتاب ہدایت پر تو ہیں۔ مگر اسلام لانے سے اس میں ترقی ہو جائے گی۔ کیونکہ اهْتَدَوْا کے معنی ہیں۔ کہ ہدایت میں کامل ہو جائیں گے۔ حالانکہ وہ تو بالکل کافر ہیں۔ **جواب۔** اس کا جواب تفسیر میں گذر گیا۔ کہ یا تو اس سے مراد ہے ہدایت میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو جانا۔ یا یہ کہ اسلام لاتے ہی کامل ہدایت پر ہوں گے۔ نہ کہ ناقص پر۔ **تیسرا اعتراض۔** یہاں دین کو رنگ کیوں کہا گیا۔ **جواب۔** اس لئے کہ جیسے رنگ کپڑے کے تار تار میں سرایت کر جاتا ہے۔ ایسے ہی ایمان مسلمان کے رگ و ریشہ میں اثر کرتا ہے۔ کہ دل و دماغ کو برے خیالات اور ظاہری اعضاء کو گناہ سے بچاتا ہے۔ **چوتھا اعتراض۔** بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ سے معلوم ہوا۔ کہ ہدایت اسلام میں محدود ہے۔ دوسری آیتوں میں اس کی تصریح بھی ہے اور اہل کتاب بھی اپنے دین میں ہدایت محدود مانتے تھے۔ ان کی تردید نہ کی گئی۔ تو اسلام کے اور اہل کتاب کے عقیدوں میں فرق کیا۔ **جواب**

چند فرق ہیں۔ ایک یہ کہ اہلِ کتاب میں نفسانیت ہے۔ اور اسلام میں للہیت۔ دوسرے یہ کہ اہلِ کتاب بعض انبیاء کا انکار کرتے ہیں مسلمان سب کا اقرار۔ تیسرے یہ کہ اہلِ کتاب کی کتابوں نے قرآن اور نبی آخر الزمان کی آمد کی خبر دی تھی۔ اور بتایا تھا۔ کہ اُن کی آمد پہ ہم سب منسوخ ہو جائیں گے۔ اسلام کی کتاب یعنی قرآن نے اُن کی تصدیق کرتے ہوئے۔ اب دروازہ نبوت کے بند ہونے کی خبر دی۔ لہٰذا اہلِ کتاب کا اپنے میں ہدایت کو محدود ماننا غلط ہے۔ اور اسلام کا یہ دعویٰ کہ صرف قرآن ہی میں ہدایت ہے صحیح۔ اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ نفسانیت میں ہدایت نہیں۔ للٰہیت میں ہے انبیائے کرام کے انکار میں ہدایت نہیں۔ اُن کے ماننے میں ہے۔ رب کی مخالفت میں ہدایت نہیں۔ اُس کی اطاعت میں ہے۔ کوئی اندھا ہی اس کا انکار کرے گا۔ **تفسیر صوفیانہ**۔ رنگ کے لئے چند چیزیں چاہئیں۔ رنگ بنانے والا رنگ جمانے والا رنگ قبول کرنے والا۔ دین اسلام رنگ ہے۔ جو کہ کارخانہ قدرت میں تیار ہوا۔ رب نے تیار کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ رنگ جمایا مسلمانوں کے دل و دماغ اور ظاہر و باطن نے قبول کیا۔ اور عبادت اور ریاضت نے اس میں جلا دی۔ اور پالش کی۔ اللہ کا رنگ اولاً بندوں کے دل پر چڑھتا ہے۔ اور پھر اُس کا اثر ہزارہا پہ ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہ خمخانہ طیبہ سے بٹتا ہے۔ اسی رنگ نے نہ معلوم کسے کیسے کیا کیا کر دیا۔ مولٰنا فرماتے ہیں ؎

رنگہائے نیک از خمّ صفاست — رنگِ زشتاں از سیاہ آب جفاست

صِبْغَةَ اللّٰہ نام آن رنگِ لطیف — لَعْنَتُ اللّٰہ بوئے ایں رنگ کثیف

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضور کی صحبت پاک سے بعض حضرات کے ظاہری رنگ بھی بدل گئے۔ کالے تھے گورے ہو گئے۔ حبشی تھے رومی بن گئے۔ **حکایت**۔ مثنوی شریف میں ہے۔ کہ ایک جنگل میں لشکرِ اسلام پیاسا تھا۔ کسی کافر کا غلام پانی کے مشکیزے اونٹ پر لادے ہوئے اپنے مولیٰ کے پاس لے جا رہا تھا۔ سرکاری حکم سے اُسے روک کر اُس کے مشکیزوں سے سارے لشکر کو پانی پلا دیا گیا۔ اور لشکر کے مشکیزے بھر دیئے گئے۔ لیکن غلام کا پانی اتنا ہی رہا۔ حضور علیہ السلام نے اُس کالے غلام کو سینہ سے لگا کر فرمایا کہ جا اللہ جانے ایک آن میں اُسے کیا دے دیا۔ کہ وہ نہایت حسین جمیل خوبصورت جوان ہو گیا۔ جب وہ اپنے مولیٰ کے پاس پہنچا۔ تو وہ اُسے نہ پہچان سکا۔ اور کہنے لگا۔ کہ تُو کون ہے۔ اور میرا غلام کہاں گیا۔ وہ بولا کہ میں ہی تیرا غلام ہوں۔ مولیٰ نے کہا غلط ہے وہ کالا تو گورا وہ حبشی تو رومی۔ اُس نے جواب دیا ؎

صدر را دیدم بدرے گشتہ ام — صاحبِ فضلے و قدرے گشتہ ام

صِبْغَةَ اللّٰہ ہست رنگِ خمّ او — ہستہا یک رنگ گردد اندر او

یعنی میں تھا تو حبشی ہی۔ مگر کچھ دیر صدر نبوت کے پاس بیٹھ کر۔ بدر بن گیا۔ اور میری عزت و قدر بڑھ گئی۔ اُس کے پاس اللہ کے رنگ کی ایک ماٹ تھی۔ جس میں غوطہ دے کر رنگ برنگوں کو یک رنگ بناتا تھا۔ اور بے رنگوں کو رنگ برنگا۔ اُس ماٹ کے رنگ سے کوئی صدیق بن گیا۔ کوئی فاروق اُس غلام کی طفیل اللہ وہ رنگ ہم پر بھی چڑھائے۔ وَنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ سے معلوم ہوا۔ کہ عارفین تو رضائے الٰہی کے لئے عبادت کرتے ہیں۔ نہ کہ جنت کے شوق اور دوزخ کے خوف سے۔ اگر رب تعالیٰ جنت و دوزخ نہ بناتا۔ تو کیا عبادت کا مستحق نہ ہوتا۔ خیال رہے کہ عبادت اور ہے اور عبودیت کچھ اور۔ اور عبودت کا کچھ اور ہی طور۔ عبادت جسم سے ہوتی ہے۔ عبودیت نفس سے۔ اور عبودت روح سے۔ صوفیاء فرماتے ہیں۔ کہ عابد وہ ہے جو چار چیزوں سے نہ گھبرائے۔ بھوک۔ ننگا ہونا۔ فقیری اور ذلت۔ بعض نے فرمایا۔ کہ بندہ پر چار وقت آتے ہیں۔ ہر وقت کی علیحدہ عبادت۔ نعمت اور بلا معصیت اور اطاعت نعمت میں شکر بلا میں صبر معصیت میں توبہ اور اطاعت میں استقامت عبادت ہے۔ اور یہ وہ ہی کر سکتا ہے جس کا نفس مُردہ ہو۔ نفس کی موت روح کی زندگی ہے۔ مولٰنا فرماتے ہیں ؎

تازہ کن ایمان نہ از گفتِ زباں — اے ہوا را تازہ کردہ در نہاں

تا ہوا تازہ است ایمان تازہ نیست — کیں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست

ایمان ہرا بھرا باغ ہے۔ شیطان چور۔ خواہش نفسانی پالا۔ اس باغ کو ان دونوں سے بچاؤ ؂

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ ۚ

کہ دے کیا جھگڑا کرتے ہو ہم سے بیچ اللہ کے حالانکہ وہ رب ہے ہمارا اور رب ہے تمہارا اور واسطے ہمارے اعمال ہیں ہمارے اور واسطے تمہارے

تم فرماؤ کیا اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی اور ہماری کرنی ہمارے ساتھ اور تمہاری کرنی تمہارے

وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

اعمال ہیں تمہارے اور ہم واسطے اسی کے اخلاص والے ؂

ساتھ اور ہم نرے اوسی کے ہیں ؂

**تعلق**۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**۔ پچھلی آیتوں میں کہا گیا تھا کہ اے مسلمانوں اہل کتاب سے کہدو۔ کہ ہم خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ جس پر وہ کہہ سکتے تھے۔ کہ تم تو آج نئے مومن اور عابد ہوئے اب تک مشرک تھے۔ ہم صدیوں سے اس خدائی رنگ میں رنگین اور اس کی عبادت میں مشغول ہیں۔ لہٰذا ہم اس رنگ میں ہیں نہ کہ تم اس کے جواب میں۔ اب بتایا جا رہا ہے۔ کہ رب کے ہاں نئے پرانے کا لحاظ نہیں اعمال کا لحاظ ہے۔ **دوسرا تعلق**۔ پچھلی آیت کے مضمون پر اہل کتاب اعتراض کر سکتے تھے۔ کہ اسلام اللہ کا رنگ نہیں۔ اور نہ حضور علیہ السلام اس کے نبی۔ نہ تم خدا کے پیارے۔ کیونکہ ہمارا دین پرانا۔ سارے پیغمبر ہمارے ہی نسب میں۔ ہم ہی رب کے محبوب۔ تمہیں اطاعت پر وہ ثواب نہیں مل سکتا جو ہم گناہ کر کے پا لیتے ہیں۔ کیونکہ ہم اس کے پیارے ہیں۔ اور پیارے کی نافرمانی غیروں کی فرمانبرداری سے بڑھ کر ہے۔ اس وہم کو دفع کرنے کے لئے اب فرمایا جا رہا ہے۔ کہ رب کی محبوبیت اعمال سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ نسب سے ؂ **شان نزول**۔ یہود نے مسلمانوں سے کہا۔ کہ ہماری کتاب سب سے پہلی۔ ہمارا قبلہ پرانا۔ ہمارا دین قدیم۔ سارے انبیاء ہم ہی میں۔ لہٰذا ہم ہی سچے۔ اگر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہوتے۔ تو ہم ہی میں سے ہی ہوتے۔ نہ کہ عرب کے بت پرستوں میں سے انکی تردید میں یہ آیت کریمہ اتری۔ **تفسیر**:۔ قُلْ۔ شان نزول اور اگلی ضمیروں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ مسلمانوں سے خطاب ہے کہ اے مسلمانو تم اہل کتاب سے کہدو۔ اور ہو سکتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام سے خطاب ہو۔ یعنی اے محبوب علیہ السلام آپ مسلمانوں سے فرما دیں۔ کہ وہ اہل کتاب سے یہ کہیں۔ کہ اَتُحَآجُّوْنَنَا۔ کیا تم ہم سے حجت بازی کرتے ہو۔ یہ لفظ محاجّۃ سے بنا۔ جس کا مادہ حجت ہے۔ اس کے معنی ہیں۔ ایک دوسرے کے مقابلہ میں اپنے دعوےٰ پر دلیلیں قائم کرنا یعنی آپس میں جھگڑنا فِی اللّٰہِ یا تو یہاں دین وغیرہ پوشیدہ ہے یا نہیں یعنی تم ہم سے اللہ کے دین کے بارے میں جھگڑتے ہو۔ کہ ہم تو کہیں کہ ہمارا دین سچا۔ اور تم کہو کہ ہمارا۔ یا خدا کے بارے میں جھگڑتے ہو۔ کہ تم کہو کہ خدا ہمارا ہی ہے مسلمانوں کا نہیں۔ تمہارا یہ دعوےٰ غلط ہے۔ کیونکہ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّکُمْ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی۔ یعنی اس کی ربوبیت سب کو شامل ہے۔ اور بندہ ہونے میں ہم تم برابر۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے۔ کہ تمہارے تو گناہ بھی بھلے ہوں۔ اور ہماری نیکیاں بھی بری۔ اس کی بارگاہ میں یہ ناممکن ہے۔ اب رہی عبادت اس کے لئے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جو اس کے فرمان کے مطابق ہوگی وہ قبول ورنہ مردود۔ لہٰذا وَلَنَآ اَعْمَالُنَا ہمارے اعمال ہمارے واسطے مفید۔ کیونکہ اس کے قوانین کے مطابق ہیں۔ اور پھر یہ بھی ہم نہیں کہتے۔ کہ تمہاری ساری نیکیاں برباد۔ بلکہ وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ تمہاری بھی وہ نیکیاں کارآمد تھیں۔ جو تم نے پہلے اپنے دین کے مطابق کی تھیں جبکہ تمہارا دین منسوخ نہ ہوا تھا (تفسیر عزیزی) اس صورت میں اعمال سے ان کی گذشتہ نیکیاں مراد ہیں۔ جو ان کے بزرگوں نے ان کے نسخ دین سے پہلے کیں۔ جن کی نسبت ان کی طرف مجازاً ہے۔ یا لَکُمْ کا لام علےٰ کے معنی میں ہے۔ یعنی اب جو تم بدعملیاں اور منسوخ احکام پر عمل کئے جا رہے ہو۔ وہ تمہارے لئے سخت نقصان دہ ہیں۔ کیونکہ رب کے قوانین کے خلاف ہیں (روح البیان) خلاصہ یہ کہ تمہارے اعمال میں نفسانیت اور رسم درواج کی پابندی کو دخل ہے۔ لہٰذا برباد اور ہمارے اعمال کارآمد۔ کیونکہ وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ۔ ہم خالص اس اللہ کے بندے ہیں اور اسی

کی رضا کے لئے سب کچھ کرتے ہیں۔ رسم و رواج کو دخل نہیں دیتے ؛ **خلاصہ تفسیر**۔ اے یہودیو۔ تم اللہ کے بارے میں ہم سے کج بحثی نہ کرو اور اپنے کو رب کا پیارا بلا وجہ نہ جانو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ تم بدعمل کر کے بھی پیارے ہی بنے رہو۔ اور ہم نیکیاں کر کے بھی اُس سے دُور رہیں۔ جب ہم بھی اُس کے بندے اور تم بھی۔ اور وہ ہمارا بھی رب اور تمہارا بھی۔ تو وہ ناحق طرفداری کیوں کرے گا۔ اُس کی بارگاہ میں ذریعہ قبولیت اعمال ہیں۔ آؤ ہم تم اپنے اپنے اعمال کو اخلاص کی کسوٹی پہ کسیں۔ ہمارے اعمال تو رب کے لئے ہیں۔ اور اُس کے قانون کے مطابق۔ اور تمہارے اعمال اپنی قوم کے لئے ہیں۔ اور برادری کے قانون کے مطابق۔ لہٰذا یہ مقبول اور وہ مردود ؛ **دوسری تفسیر**:۔ اے اہل کتاب ہم تمہاری طرح صرف اپنی ذات کو جنت کا ٹھیکیدار نہیں سمجھتے۔ اللہ ہمارا تمہارا دونوں کا رب ہے۔ لہٰذا ہمارے موجودہ عمل جو اس دین کے موافق ہیں۔ وہ قبول اور تمہارے بزرگوں کے گذشتہ اعمال جو اُس دین کے موافق تھے وہ قبول۔ اور ہم یہ انصاف کیوں نہ کریں۔ ہم تو رب کے خالص بندے ہیں۔ اُس کے فرمان پہ سر جھکانا نفسانیت سے دُور رہنا ہمارا پہلا فرض ہے

**فائدے**:۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ**۔ دنیا میں ہر بُرا بھلا بندہ رب کی ربوبیت سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ یہاں کی امیری غریبی سے کسی کی مقبولیت یا مردودیت کا پتہ نہیں چل سکتا۔ ہاں اس کا ظہور تو انشاء اللہ قیامت میں ہوگا۔ **دوسرا فائدہ**۔ آسمانی دین اپنے اپنے وقتوں میں بندوں کے لئے ذریعہ نجات تھے۔ لہٰذا ہم کو گذشتہ یہودی اور عیسائیوں کو کافر فاسق نہیں کہنا چاہیئے۔ اُس زمانہ میں اُن میں بڑے بڑے اولیاء اللہ گذرے۔ **تیسرا فائدہ**۔ منسوخ دین اختیار کرنا گمراہی ہے اور اُن کے اعمال جو پہلے نیکیاں تھیں اب گناہ۔ جوان آدمی ماں کا دودھ پیئے تو گنہگار۔ بچے کے لئے اُس کا پینا ضروری۔ کیونکہ یہ بچپن کی غذا ہے نہ کہ جوانی کی۔ **چوتھا فائدہ**۔ نفسانیت سے کسی کی بُرائی نہ کرو۔ ہاں للّٰہیت سے بُروں کو بُرا کہنا ثواب۔ جیسا کہ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ سے معلوم ہوا۔ سب کو بُرا کہنا بھی بُرا۔ اور سب کو اچھا کہنا بھی بُرا۔ بُروں کو اچھا اور اچھوں کو بُرا کہنا کفر ہے۔ صلح کل اور نیچری اس آیت سے عبرت پکڑیں۔ شریعت کے فرمان کے مطابق نرم و گرم ہونا چاہیئے ؛ **پہلا اعتراض**۔ جب دُنیا میں رب کی ربوبیت کی جلوہ گری ہے اور وہ سب کا ہی رب ہے۔ تو سب کو آرام میں کیوں نہیں رکھتا۔ بعضوں کو تکلیف کیوں دیتا ہے۔ **جواب**۔ یہ بھی ربوبیت کا ہی تقاضا ہے۔ اگر سب ایک حال میں ہو جائیں۔ تو دنیا برباد ہو جائے۔ جو جس کے لائق ہے۔ اُسے وہ ہی دیا گیا۔ چیونٹی کو کن ہاتھی کو من دیتا ہے۔ باپ کے پاس شہد بہت ہے مگر بیٹے کا مزاج بہت گرم ہے۔ کیسے دے (گلستاں) **دوسرا اعتراض**۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان ہر مذہب میں رہ کر مقبول خدا بن سکتا ہے اور ہر دین کی نیکیاں کار آمد ہیں (بعض بے دین) کیونکہ کفار سے فرمایا گیا۔ وَلَکُمْ اَعْمَالُکُمْ۔ تمہاری نیکیاں تمہارے واسطے مفید۔ لام نفع کا ہے **جواب**

اس کے نہایت نفیس جواب تفسیر میں گذر گئے۔ کہ یہاں اعمال سے اُن کے گذشتہ اعمال مراد ہیں جو انہوں نے نسخ دین سے پہلے کئے تھے۔ یا لَکُمْ کا لام علیٰ کے معنی میں ہے۔ جیسے کہ کبھی علیٰ لام کے معنی میں آتا ہے وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَهِیْدًا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ یہاں اُن کے اعمال کا دنیوی نفع مراد ہو۔ جیسا کہ روایت میں آیا ہے۔ کہ مشرکین اور کفار کی نیکیوں کا بدلہ اُنہیں دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے۔ کہ وہ اس کے عوض یہاں آرام پا لیتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ یہاں آخرت کا ہی نفع مراد ہو۔ کہ بعض کفار اپنے صدقہ اور خیرات کی وجہ سے عذاب میں تخفیف پائیں گے۔ جیسے کہ حاتم طائی۔ اور ابولہب اور نوشیرواں وغیرہ یعنی اُن کے اعمال کا نفع تخفیف عذاب ہے۔ جیسا کہ روایات میں ہے۔ اور ممکن ہے اس آیت کے معنی یہ ہوں۔ کہ اگر تم ایمان لا کر ہماری طرح اعمال کرو۔ تو ہمیں تمہیں یکساں ثواب ملے گا۔ نو مسلم اور پُرانے مسلم ہونے کا اعتبار نہ ہوگا۔ جیسا کہ تم کرتے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کلام سے اظہار بیزاری مراد ہے۔ یعنی تمہیں اپنے اور ہم کو اپنے اعمال ہیں۔ جیسے اُردو میں کہتے ہیں۔ "اپنی اپنی کرنی۔ اپنی اپنی بھرنی۔" یہ تحقیق جواب یاد رکھو۔ کیونکہ گذشتہ آیت سے بھی معلوم ہو چکا۔ اور دوسری آیتوں میں بھی صاف فرمایا گیا۔ کہ اسلام کے سوا سارے دین باطل ہیں۔ کہ جن میں رہ کر کوئی نیکی قبول نہیں۔ اور یہ تو کوئی اندھا بھی نہ کہے گا۔ کہ ہر دین سچا ہے۔ اور اُس کے قاعدے صحیح۔ آریہ عیسائی حتیٰ کہ بھنگی چمار بھی لوگوں کو اپنے دین کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر اُن کے نزدیک سب دین صحیح تھے۔ تو وہ اپنے دین کی طرف کیوں بلاتے ہیں۔ اگر سب دین سچے ہیں۔ تو اسلام کی تبلیغ بے کار۔ بلکہ پھر تو یوں کہنا چاہیئے۔ کہ اے ہندو، سکھو اپنے اپنے مذہب پر جمے رہو۔ نجات پا جاؤ گے۔ قرآن فرماتا ہے اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۔ دوسری جگہ

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ ایک جگہ فرماتا ہے وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بغیر اسلام قبول کئے کوئی نیکی قبول نہیں۔ لہٰذا اس آیت کے وہ ہی مطالب ہیں جو ہم نے عرض کئے۔ **تفسیر صوفیانہ**:۔ مخلوق طالب ہے اور خالق کل کا مطلوب۔ ساری خدائی اُسی کی شیدائی ہے۔ اور وہ سب کا محبوب۔ ہر ایک کو اُس کی طلب ہے۔ اور اُسی کی جستجو۔ کافر ہو یا مومن۔ مخلص ہو یا منافق۔ سب اُسی کے جویاں ہیں۔ ہاں یہاں بعض کا جذبہ بھڑکا ہوا ہے۔ اور بعض کا دبا ہوا کل قیامت میں وہ جذبہ عشق بھڑک اُٹھے گا۔ اسی لئے کفار کا سب سے بڑا عذاب محبوب کی مہجوری ہوگی وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْہِمْ وَلَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ اس پر گواہ ہے۔ کافر کی بت پرستی اور مومن کی حق پرستی اپنی اپنی سمجھ میں اُسی کی رضا کے لئے ہے۔ یعنی ہندو مندر میں اُس کو ڈھونڈ رہا ہے۔ اور مسلمان مسجد میں۔ اور پس پردہ ہر عاشق سمجھ رہا ہے۔ کہ رب میرا ہے۔ اُس کی رہنمائی کا جھگڑا ہے جس کا اس آیت میں ذکر ہے قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰہِ۔ مگر یہ سارے جھگڑے پردے کے ہیں ؎

کفر و اسلام کے جھگڑے ترے چھپنے سے بڑھے
تو اگر پردہ اٹھادے [illegible] جائے

پردہ اٹھتے ہی کوئی کافر نہ رہے گا۔ رب فرماتا ہے فَکَشَفْنَا عَنْکَ غِطَآءَکَ فَبَصَرُکَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ۔ اس مقام پر ضرورت تھی۔ کہ کوئی اندرون سراد الامحبوب۔ آئے۔ اور رب کا راز بتائے۔ مجوبوں کے جھگڑے چکائے اور انہیں بتائے کہ رب کس کا ہے۔ اُسی رازدان محبوب یزدان کا نام پاک محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جس نے ان پردے والوں کا فیصلہ فرمایا۔ اور جس کی ذات پاک حق کی کسوٹی ہے۔ کہ جس کی زندگی اُس شہنشاہ کے نقش قدم پر ہے۔ وہ اللہ کا ہے اور اللہ اُس کا۔ اور جو ان کا نہیں رب اُس کا نہیں۔ اس لئے ارشاد ہوا وَنَحْنُ لَہٗ مُخْلِصُوْنَ۔ کہ ہم تو رب اُسی کے ہیں۔ کیونکہ اُس کے حبیب کے ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم ؎

وہ رب کے ہیں رب اُن کا ہے جو اُن کا ہے وہ رب کا ہے
سب اُن کے جو حق سے ملا چاہے دیوانہ ہے سودائی ہے

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ کَانُوْا

یا کہتے ہو تم کہ تحقیق ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد تھے

بلکہ تم تو یوں کہتے ہو ابراہیم و اسمٰعیل و اسحاق و یعقوب اور اون کے بیٹے یہودی یا نصرانی تھے

ھُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰہُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَتَمَ شَھَادَۃً

یہودی یا عیسائی فرمادو کہ کیا تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ اور کون ہے بڑا ظالم اوس سے جو چھپائے گواہی کو

تم فرماؤ کیا تمہیں علم زیادہ ہے یا اللہ کو اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جس کے پاس اللہ کی

عِنْدَہٗ مِنَ اللّٰہِ ؕ وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

جو پاس ہے اوس کے اللہ کی طرف سے اور نہیں ہے اللہ بے خبر اوس سے جو کرتے ہو تم

طرف کی گواہی ہو اور وہ اُسے چھپائے اور خدا تمہارے کوتکوں سے بے خبر نہیں

**تعلق**:۔ اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**۔ اہل کتاب نے دو دعوے کئے تھے۔ ایک یہ کہ ہم کچھ بھی کریں بہر حال اللہ کے پیارے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم بڑے پیغمبر یعنی ابراہیم علیہ السلام کے ہم مذہب ہیں۔ وہ بھی ہمارے ہی دین پر تھے۔ پچھلی آیت میں اُن کے ایک یکو اس کی تردید کردی گئی۔ اب دوسری بات کا رد ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق**۔ پچھلی آیت میں اہل کتاب کے رب تعالیٰ پر اتہام لگانے کی تردید تھی۔ کہ وہ ہمارے عیبوں سے بھی راضی ہے۔ اب اُن کے اُس اتہام کی تردید ہے جو انہوں نے پیغمبروں پر باندھا کہ وہ یہودی تھے **تیسرا تعلق**۔ پچھلی آیت میں کہا گیا تھا۔ کہ مسلمان ہی اللہ کے مخلص بندے ہیں۔ اس پر وہ کہہ سکتے تھے کہ نہیں بلکہ ہم مخلص ہیں۔ کیونکہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے ہم مذہب ہیں۔ اس

وہم کی اب تردید کی جارہی ہے **تفسیر** اَمْ تَقُوْلُوْنَ. یا تو اَم متصلہ ہے یعنی اے اہل کتاب کیا تم خدا کو اتہام لگاتے ہو۔ کہ وہ ہمارا ہے۔ یا اُن پیغمبروں کو کہ وہ ہمارے دین پر تھے۔ یا منفصلہ۔ یعنی تم خدا پر ہی اتہام نہیں باندھتے بلکہ پیغمبروں پر بھی کہ تم اُن کے متعلق کہتے ہو۔ کہ اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ. کہ یہ سارا خاندان نبوت (خیال رہے۔ کہ اسحاق علیہ السلام کے اولاد کو اسباط۔ اور اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد کو قبائل کہا جاتا ہے (قبیلے) (روح البیان) كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى. یہودی تھا یا عیسائی اور ہم اُن کے پیروکار لہٰذا ہم بہر حال محبوب کردگار۔ یہ ایک جماعت کا کلام نہیں۔ بلکہ یہود تو اُن سب حضرات کے یہودی ہونے کا۔ اور عیسائی اُن سب کے عیسائی ہونے کا دعوے کرتے تھے۔ اور اُن دونوں کا یہ دعویٰ نہایت ہی باطل ہے۔ کیونکہ یہودیت تو موسیٰ علیہ السلام سے اور عیسائیت عیسیٰ علیہ السلام سے دنیا میں آئی۔ اور وہ سب حضرات اُن سے پیشتر گذرے۔ کہ اُن کے زمانہ پاک میں نہ توریت تھی نہ توریت والے۔ نہ انجیل نہ انجیل والے۔ شائد اس پر وہ کہیں۔ کہ اُن حضرات کا دین ہمارے دین کے موافق۔ اور اُن کی شریعت۔ شریعت موسوی یا عیسوی کے مطابق تھی۔ اس لئے ہم اُنہیں یہودی یا عیسائی کہتے ہیں۔ تو اس کے جواب میں قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ اے محبوب آپ فرما دو۔ کہ اِس کے متعلق تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ ظاہر ہے۔ کہ اللہ ہی کو زیادہ علم ہے کیونکہ وہ دانائے کل ہے۔ اور وہ تو خبر دے رہا ہے کہ مَا كَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا. کہ ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے نہ عیسائی۔ وہ تو ان سب سے علیحدہ رب کے مطیع تھے۔ رہی شریعت اُس پر بھی غور کر لو۔ کہ اُن کا قبلہ کعبہ تھا تمہارا بیت المقدس۔ اُن کے ہاں ختنہ تھا تمہارے ہاں نہیں۔ اُن کی نمازیں رکوع وسجدہ تھا تمہارے ہاں یہ غائب۔ اُن کی شریعت میں حج کعبہ تھا تمہارے ہاں ندارد۔ تمہارے ہاں ہفتہ کے دن کی تعظیم ہے اُن کے ہاں نہ تھی۔ پھر تمہاری اُن کی شریعت میں شرکت کیسی لہٰذا نہ تمہارا دین اُن کا سا اور نہ تمہاری شریعت۔ اور سب سے بڑا غضب تو یہ ہے کہ توریت وانجیل نے بھی خبر دی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی اولاد دین حنیفی پر تھی۔ اور اُن پر یہودیت کے احکام نہ تھے (عزیزی) اب فیصلہ کرو۔ کہ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ. کہ اُس بدبخت سے بڑھ کر ظالم کون ہے کہ جس کے پاس اللہ کی گواہی موجود ہو۔ اور وہ اُسے چھپائے یعنی تمہاری کتابوں میں رب کی گواہی موجود ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی عیسائی نہ تھے۔ اور پھر تم اُسے چھپاتے ہی نہیں بلکہ بدل کر پیش کرتے ہو۔ کہ رب کہتا ہے کہ وہ یہودی نہ تھے اور تم کہتے ہو کہ تھے۔ جب شہادت الٰہیہ کو چھپانے والا بڑا ظالم تو تم بدلنے والوں کا کیا درجہ۔ خیال رہے کہ مِنَ اللّٰهِ میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہ شَهَادَةً کا صلہ ہے۔ یعنی اللہ کی گواہی کو چھپائے۔ دوسرے یہ کہ كَتَمَ کا متعلق یعنی جو اللہ سے گواہی چھپائے۔ یعنی اے یہودیو تمہاری کتابوں اور پیغمبروں نے ابراہیم علیہ السلام کے حنیفی ہونے کی گواہی دی۔ اور وہ گواہی تم نے رسول اللہ سے چھپائی۔ تو گویا اللہ سے چھپائی۔ اور رب سے چھپانے والا بڑا ظالم۔ تو تم بڑے ظالم۔ خیال رکھو۔ کہ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اللہ تعالیٰ تمہارے ظاہری باطنی اعمال اور کتاب الٰہی میں کاٹ چھانٹ کرنے اور رب کی گواہیوں کے چھپانے سے بے خبر نہیں۔ تم دنیا پر مغرور نہ ہو جاؤ۔ اور اپنے گناہوں سے توبہ کرو۔ اور نبی آخر الزمان کی مخالفت میں اپنے بزرگوں بلکہ رب تعالےٰ پر اتہام نہ لگاؤ۔

**خلاصہ تفسیر** جب یہودیت اور نصرانیت کے عقائد اور خانہ ساز مسائل پر جرح ہوتی جس کا جواب اُن سے نہ بنتا۔ تو وہ عاجز ہو کر بڑے انبیاء کرام کی آڑ لیتے اور کہتے تھے۔ کہ ہمارا ہی مذہب مدار نجات ہے۔ کیونکہ یہ ہی حضرت ابراہیم واسمٰعیل واسحاق علیہم السلام کا دین ہے مسلمانوں کو اس کا جواب بھی سکھایا جا رہا ہے۔ کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا یہ دعویٰ بھی سراسر غلط ہے۔ بھلا یہ تو سمجھو۔ کہ عیسائیت اور یہودیت ہزارہا سال کے بعد دنیا میں آئی۔ تو وہ عیسائی کیسے ہو گئے۔ اور اگر وہ کہدیں کہ اُن کے اور ہمارے اصول دین یکساں ہیں۔ تو بھی غلط ہزاروں برس پہلے کی بات تمہیں معلوم ہے۔ یا خدا کو۔ رب فرماتا ہے کہ وہ نہ یہودیوں کے موافق تھے نہ عیسائیوں کے۔ بھلا اُن حضرات کے زمانہ میں ہفتہ کی تعظیم۔ عزیر علیہ السلام کے خدا کا بیٹا ہونے کا عقیدہ۔ رب تعالےٰ کے جسم شکل ہونے کا خیال کہاں تھا۔ اسی طرح اُن کے زمانہ میں الوہیت مسیح۔ تثلیث کا گندہ عقیدہ۔ اور یہ خیال کہ عیسیٰ علیہ السلام کی صُولی سب کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ اور پوپ صاحب کا سب بدکاریوں کا معاف کرنا۔ اور بپتسمہ وغیرہ جو کہ عیسائی مذہب کے اصول ہیں کب تھے۔ اور اُن میں سے کسی نے ایسے گندے عقیدے کب رکھے تھے۔ لہٰذا ان کے عقیدے اور اُن کے اعمال سب اُن کے خلاف ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ خود ان کی کتابیں بھی گواہ ہیں۔ کہ وہ حضرات عیسائی یہودی نہ تھے۔ یہ اپنی بات پالنے کے لئے

غلط بیانی کر رہے ہیں۔ ان سے بڑھ کر ظالم کون۔ انہیں خدا کا خوف بھی نہیں۔ کہ رب ان کے اعمال سے خبردار ہے۔ اگر سرکاری خفیہ پولیس کسی کے پیچھے لگ جائے۔ تو وہ ڈر کے مارے حکومت کی مخالفت نہیں کرتا۔ یہ کیسے نڈر اور بے خوف ہیں کہ رب ان کی ہر بات پر نگہبان۔ اور انہیں بالکل اطمینان ؛

**لطیفہ** ایک مسلمان نے کسی پادری سے پوچھا۔ کہ ایمان کے جزء کتنے ہیں۔ اس نے کہا تین۔ ایک رب کی ربوبیت جاننا۔ دوسرے روح القدس یعنی عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کو ماننا۔ تیسرے کفارے کا عقیدہ رکھنا۔ کہ مسیح کی سولی سب کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ مسلمان بولا کہ تمہارا ایمان بڑھ کر ہے یا ابراہیم علیہ السلام کا۔ وہ بولا کہ ابراہیم علیہ السلام کا۔ مسلمان نے کہا۔ کہ یہ ناممکن۔ کہ ان کا ایمان تہائی اور تمہارا ان سے تگنا۔ کہ انہیں فقط خدا پر ایمان لانا میسر ہوا۔ کہ وہ مسیح علیہ السلام سے پہلے تھے۔ اور تمہارے ہاتھ تینوں لگے۔ عیسائی شرمندہ تو ہوا۔ مگر جھینپ اتارنے کے لئے کہنے لگا۔ کہ تمہارے ہاں بھی ایمان کے دو جزء ہیں۔ ایک لاالٰہ الا اللہ دوسرے محمد رسول اللہ۔ اور ابراہیم علیہ السلام جب محمد علیہ السلام سے پہلے ہوئے۔ تو انہیں محمد صاحب کی نبوت ماننے کا موقعہ نہ ملا۔ مسلمان نے کہا۔ ذرا پادری صاحب ہوش میں آؤ۔ ایمان کے لئے توحید اور نبوت کا عقیدہ کافی ہے۔ جس نبی کا زمانہ پائے اس پر صراحتہً ایمان لائے۔ اور باقی اگلے پچھلے پیغمبروں پر اجمالاً۔ اور تمہارے ہاں الوہیت مسیح کا جھگڑا ہے۔ آخرکار عیسائی شرمندہ ہو گیا؛

**فائدے**۔ اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ پہلا **فائدہ**۔ انبیاء کرام سے مخالفین کے اتہامات اٹھانا سنت الٰہیہ ہے۔ دیکھو اہل کتاب نے ان پیغمبروں پر یہودیت اور عیسائیت کا الزام لگایا۔ اور رب نے اسے دفع فرمایا۔ اس طرح زمانہ موجودہ میں کفار و مرتدین نے جو حضور علیہ السلام پر الزامات لگائے ان کو دفع کرنا عبادت ہے اور سنت الٰہیہ پر عمل۔ دوسرا **فائدہ**۔ گواہی چھپانا ظلم ہے اور بدلنا بڑا ظلم۔ گواہ پر لازم ہے کہ ضرورت کے وقت گواہی دے۔ تیسرا **فائدہ**۔ گواہی دینے والوں کے مختلف ثواب ہیں اور چھپانے والوں کے مختلف عذاب۔ جیسی گواہی ویسا ہی اس پر ثواب و عذاب۔ سب سے بڑی گواہی عقائد کی ہے کہ اس کا چھپانا کفر اور اس کو ظاہر کرنا ایمان۔ پھر گواہی آپس کے معاملات کی ہے۔ اگر گواہی کے چھپانے سے کسی کا حق مارا جائے۔ تو چھپانے والا گنہگار۔ اسی طرح چاند وغیرہ کی گواہی ضروری ہے۔ کہ اس پر مسلمانوں کے عبادات موقوف ہیں بعض گواہیاں وہ ہیں جن کا چھپانا ثواب۔ اگر تمہیں کسی مسلمان کے خفیہ عیب کی خبر ہے۔ تو اس کا پردہ ڈھک لو۔ اللہ تمہارے عیب چھپائے گا۔ ہاں شریر مفسد کا عیب ضرور ظاہر کرو۔ تاکہ لوگ اس کے فتنہ سے بچیں۔ اسی لئے یہاں شہادت میں مِنَ اللّٰہِ کی قید لگائی۔ یعنی اللہ کی گواہی چھپانے والا بڑا ظالم ہے نہ کہ ہر گواہی کا چھپانے والا۔ تیسرا **فائدہ**۔ بارگاہِ مصطفےٰ علیہ السلام بارگاہ خدا تعالیٰ ہے۔ کہ ان کا مجرم رب کا مجرم ہے۔ جیسا کہ مِنَ اللّٰہِ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا۔ یعنی حضور سے گواہی چھپانا گویا خدا سے چھپانا ہے ؛ **تفسیر صوفیانہ**۔ تمام گناہوں کی اصل اپنی بڑائی اور ریاکاری ہے۔ یہودیوں کی یہ ساری حرکتیں خدا کو الزام لگانا پیغمبروں پر اتہام باندھنا صرف اپنی بات پالنے کے لئے تھا۔ کہ ہماری بات کسی طرح رہ جائے۔ اس کا علاج اخلاص ہے۔ جنید بغدادی فرماتے ہیں۔ کہ اخلاص بندے اور رب کے درمیان ایک راز ہے۔ کہ جسے نہ فرشتہ جانتا ہے تاکہ لکھے نہ شیطان پہچانتا ہے تاکہ اسے بگاڑے اور نہ نفس کو اس کی خبر ہو کہ ڈکیتی کرے۔ قاضی فضیل فرماتے ہیں۔ کہ لوگوں کے لئے نیکی کرنا بھی ریا ہے۔ اور لوگوں کی وجہ سے عمل چھوڑنا بھی ریا۔ (روح البیان) یعنی اس لئے عمل چھوڑ دینا۔ کہ کہیں مجھے لوگ عابد نہ کہیں۔ بے وقوفی ہے۔ ریاکار اس شخص کی طرح ہے جو کھوٹے پیسے تھیلے میں بھر کر بازار پہنچے کہ دیکھنے والے اسے مالدار جانیں۔ مگر دکاندار دُرکار دے۔ ایسے ہی دنیادار تو ریاکار کو عابد شمار کرتے ہیں۔ مگر پروردگار کے ہاں پھٹکار کا انعام پاتا ہے۔ اور یہ سارے فساد مَیں کے ہیں۔ جہاں مَیں ہے وہاں تُو نہیں۔ یار کے لئے اغیار سے خانہ قلب خالی کرو۔ ان یہودیوں میں اگر مَیں نہ ہوتی تو مسلمان ہو جاتے۔ یہ بھی خیال رہے۔ کہ بڑوں پر طعنہ کرنا اپنے کو رسوا کرتا ہے۔ اہل کتاب نے پیغمبروں پر طعنہ کر کے اپنے کو تاقیامت رسوا کرا لیا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد  میلش اندر طعنہ پاکاں دہد

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۴۱﴾

یہ ایسی جماعت ہے کہ بیشک گزر گئی واسطے اوس کے وہ ہے جو کمایا اوس نے اور واسطے تمہارے وہ جو کمایا تم نے اور نہ سوال کئے جاؤ گے تم اوس سے جو کرتے تھے وہ

وہ ایک گروہ ہے کہ گزر گیا اون کیلئے ان کی کمائی اور تمہارے لئے تمہاری کمائی اور ان کے کاموں کی تم سے پرسش نہ ہوگی

**تعلق**:- اس آیت کا پچھلی آیت سے کئی طرح ہے۔ **پہلا تعلق**۔ اہل کتاب نے ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے یہودی یا عیسائی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اُس کی نہایت نفیس عقلی اور نقلی تردید کر دی گئی۔ اس پر وہ کہہ سکتے تھے۔ کہ اچھا اگر ہم اُن کے دین پر نہیں۔ تو اُن کے نسب میں تو ہیں۔ ہمارے واسطے اتنی ہی نسبت کافی ہے۔ اب اس کی بھی تردید کی جا رہی ہے۔ کہ اللہ کے نزدیک بغیر ایمان نسبی رشتہ کار آمد نہیں۔ وہ بزرگ اپنی بزرگی اور نیکیاں اپنے ساتھ ہی لے گئے تمہارے لئے چھوڑ نہ گئے۔ بے دین بیٹا اپنے مسلمان باپ کی مالی میراث بھی نہیں پاتا۔ تم اُن کے علمی میراث کیسے پالو گے اس خیال خام کو دماغ سے نکال دو۔ **دوسرا تعلق**۔ گذشتہ آیتوں میں اہل کتاب کی باتوں کا نہایت محققانہ جواب دیا گیا۔ اب اُن کا دعوےٰ مان کر جواب دیا جا رہا ہے۔ کہ اچھا بفرض محال مان لو۔ کہ وہ حضرات یہودی یا عیسائی مذہب رکھتے تھے۔ مگر تمہیں کیا وہ اور وقت تھا یہ اور۔ اب نیا تخت ہے نیا تاج نیا حاکم نیا راج۔ اب وہ دین ختم ہو چکا۔ اور وہ اعمال بھی گئے۔ اگر آج وہ بھی زندہ ہوتے۔ تو اس سلطانِ کونین کی اطاعت ہی کرتے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔ اب جب تم نے اُن کا زمانہ پایا۔ تم اُن کی غلامی کرو۔ رات میں بہت تارے اپنی اپنی جگہ چمک لئے۔ اور دنیا والوں نے چراغ گیس بجلی وغیرہ سے روشنی لے لی۔ اب آفتاب نبوت چمک چکا۔ دن نکل آیا۔ سورج کو چھوڑ کر چراغ کی طرف بھاگنا نادانی ہے۔ **تفسیر**:- اس آیت کی پوری تفسیر ہم قریب ہی میں کہہ چکے ہیں۔ یہاں اتنا اور سمجھ لو۔ کہ یہ آیت بلا وجہ نہیں دہرائی گئی۔ بلکہ وہاں اور لطف دے رہی تھی۔ اور یہاں کچھ اور رنگ دکھا رہی ہے۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ اے اہل کتاب اپنے باپ دادوں کے دین پر نہ اڑے رہو۔ جیسے کہ اُنہوں نے اپنے سے پہلی شریعتوں کو منسوخ کیا تھا۔ کہ نوح علیہ السلام سے آدم علیہ السلام کی شریعت منسوخ۔ اور ابراہیم علیہ السلام سے پچھلی شریعتیں ختم۔ ایسے ہی اگر نبی آخر الزمان سے شریعت موسوی اور عیسوی منسوخ ہو گئی۔ تو کیوں چیختے ہو یہ تو پہلے سے ہوتا چلا آیا ہے۔ آج اگر کوئی شریعت آدم علیہ السلام کی آڑ لے کر اپنی بہن سے نکاح کرنا چاہے تو دیوانہ ہے۔ ایسے ہی دین مصطفائی کی موجودگی میں جو توریت پر عمل کرے وہ پاگل ہے (از تفسیر کبیر) **فائدے**:- اس آیت سے معلوم ہوا۔ کہ اپنے بزرگوں کے عمل اولاد کو کام نہیں آتے۔ مگر یہ اُس صورت میں ہے کہ اولاد کو عمل کرنے کا وقت ملے اور نہ کرے۔ جو بچپن میں مر جائیں۔ وہ یقیناً اپنے ماں باپ کے تابع ہو کر اُن کے سے درجات پائیں گے۔ متقی مسلمانوں کے فوت شدہ بچے جنت میں اعلیٰ مقام پائیں گے۔ اور فاسق مسلمانوں کے چھوٹے بچے وہ مراتب حاصل نہ کر سکیں گے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں فرزند طیب۔ طاہر۔ قاسم۔ ابراہیم جو کہ بچپن میں وفات پا گئے۔ ہمارے چھوٹے بچوں سے کہیں اعلیٰ اور افضل ہیں۔ یہاں تک کہ بعض روایتوں میں آیا ہے۔ کہ مشرکین کی چھوٹی اولاد اپنے ماں باپ کے تابع ہو کر جہنم میں ہی جائے گی۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں سکوت فرمایا۔ اور یہ تو تم دن رات دیکھتے ہو۔ کہ کفار کے بچوں پر نہ نماز جنازہ پڑھی جائے۔ نہ اُس کا باقاعدہ کفن دفن ہو۔ آخر یہ کیوں؟ اُن بچوں نے کونسا کفر کیا ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ وہ اپنے عاقل بالغ ہونے سے پہلے اپنے ماں باپ کے حکم میں ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھو۔ کہ زبان کسی کو گالی دے۔ تو سر پٹتا ہے۔ اور اگر زبان اچھا وعظ کہے تو ہاتھ پاؤں چومے جاتے ہیں۔ دیکھو نیکی بدی تو زبان نے کی۔ مگر اُس کا نتیجہ دوسرے اعضا نے بھی بھگتنا۔ کیونکہ اُس کے تابع تھے۔ ایسے ہی یہاں سمجھ لو۔ اسی لئے فرمایا گیا وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ۔ جس سے معلوم ہوا۔ کہ یہ خطاب اُس وقت سے ہے کہ اولاد سمجھدار ہو کر کسب

کے قابل ہو جائے۔ اس کے باقی فائدے اور اس کے متعلق اعتراضات و جوابات ہم کچھ پہلے اسی آیت کی تفسیر میں بیان کر چکے ۔

# مولوی و صوفی

چونکہ اس تفسیر میں عالمانہ و صوفیانہ تفسیریں بیان ہوئیں۔ لہٰذا ہم مولوی و صوفی کا فرق بتلاتے ہیں :-
مولوی مولیٰ کی طرف نسبت ہے یعنی مولا والا یائے نسبتی سے مولیٰ کا الف واؤ بن گیا۔ جیسے کہ عیسٰی سے عیسوی اور موسٰی سے موسوی۔ ایسے ہی مولیٰ سے مولوی۔ صوفی صوف سے بنا جس کے معنی ہیں پشمینہ یا اُون۔ چونکہ پچھلے صوفیائے کرام کمبل وغیرہ اُونی اور سادے کپڑے استعمال کرتے تھے اس لئے اُن کا لقب صوفی ہُوا یعنی کمبل پوش یا اُونی لباس والے۔ یہ تو اُن لفظوں کی تحقیق تھی۔ اب اِن حضرات میں کیا فرق ہے۔ ملاحظہ ہو۔ (۱) قرآن کریم کے کچھ ظاہری معنی ہیں اور کچھ باطنی راز۔ دیکھو مشکوٰۃ کتاب فضائل القرآن وغیرہ۔ اس کے ظاہری معنی پر بحث کرنے والا مولوی۔ اور باطنی اسرار سے گفتگو کرنے والا صوفی (۲) دینی علم دو ہیں علم ظاہر یعنی شریعت۔ علم باطن یعنی طریقت۔ شریعت کا عالم مولوی۔ طریقت کا عالم صوفی (۳) انسان کے اعضاء دو قسم کے ہیں ظاہری ہاتھ پاؤں زبان وغیرہ اور باطنی دل و دماغ وغیرہ۔ ظاہر کی اصلاح کرنے والا مولوی۔ اور باطن کو سنبھالنے والا صوفی۔ **مثال** :- ایک بادشاہ نے چینی اور رومی کاریگروں کو بلاکر کہا کہ تم ہمیں اپنا اپنا کمال دکھاؤ۔ اُن دونوں نے عرض کیا۔ کہ ہمیں ایک بند کمرہ دے دیا جائے۔ جس کی دو دیواروں پر علیحدہ علیحدہ ہم دونوں کام کریں مگر بیچ میں پردہ رہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ چینیوں نے تو اپنی دیوار پر نقش نگار کرکے اُسے چمن بنا دیا۔ رومیوں نے اپنی دیوار کی گھٹائی کرکے اُسے آئینہ کر دیا۔ اُن کی فراغت کے بعد بادشاہ اُن کا امتحان لینے پہنچا۔ اور حکم دیا۔ کہ پردہ ہی کا جھگڑا ہے۔ اِسے پھاڑو اور پھر مقابلہ کرکے دکھاؤ۔ پردہ اُٹھتے ہی جب دیواریں مقابل ہوئیں تو چینیوں کے نقش و نگار رومیوں کی دیواریں نظر آنے لگے۔ کیونکہ وہ مثل آئینہ کے تھی حق تعالیٰ بادشاہ ہے۔ انسان بند کمرہ۔ مولوی چینی کاریگر۔ جو کہ شریعت کی اتباع کرا کر انسان کے ظاہری اعضاء پر نقش نگار کرتا ہے۔ صوفی رومی کاریگر جو کہ الا اللہ کے ضربوں اور مراقبوں کے ذریعہ دل ہی جلا دیتا ہے۔ سانس کا ہی پردہ ہے۔ جب یہ زندگی کا پردہ اٹھا۔ اور انسان کی موت آئی۔ تو مولوی کے سارے نقش اس صاف دل کے آئینہ میں جگمگانے لگے۔ اس کا قبر میں امتحان ہے۔ کہ وہاں نماز روزہ کا سوال نہیں۔ یار کے پہچاننے کا امتحان ہے۔ کہ اس ہرے گنبد والے کو پہچانو۔ کہ وہ کون ہے۔ دیکھنا یہ ہے۔ کہ تمہارا آئینۂ دل کاشانۂ یار ہے یا پاخانۂ اغیار (۴) مولوی وہ جو کلام کا منشار سمجھے۔ صوفی وہ جو کلام کا جذبہ پہچانے۔ دیکھو موسٰی علیہ السلام سے رب نے فرمایا۔ کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔ کیا رب کو خبر نہ تھی۔ کہ اُن کے ہاتھ میں لاٹھی ہے۔ منشار کچھ اور ہی تھا۔ مولوی کہتا ہے کہ یہ سوال آئندہ گفتگو کی تمہید تھی۔ کہ وہ جواب میں عرض کریں کہ لاٹھی ہے۔ اور پھر رب فرمائے۔ کہ اچھا اسے پھینکو۔ تو کلیم اللہ پھینکیں۔ وہ سانپ بن جائے۔ تاکہ اسی لاٹھی کی تاثیر موسٰی علیہ السلام یہاں ہی دیکھ لیں۔ ایسا نہ ہو کہ فرعون کے ہاں پہنچ کر یہ تاثیر ظاہر ہو۔ اور خود ڈر جائیں + صوفی کہتا ہے۔ کہ اس کلام کا جذبہ یہ ہے کہ موسٰی علیہ السلام نے اس وادیٔ محبت میں نیا قدم رکھا ہے۔ ابھی اگر اُن سے کوئی اجنبی بات فرمائی گئی۔ تو شائد انہیں اضطراب ہو۔ پہلے اُن کی لاٹھی کا ذکر کیا گیا جو اُن کی عرصے کی ساتھی تھی۔ تاکہ کلام سے وحشت نہ ہو۔ موسٰی علیہ السلام نے اس موقعہ کو غنیمت جانا۔ کہ آج مجھ پر یہ کرم ہے کہ خالق اپنی ہم کلامی سے مجھے نواز رہا ہے۔ تو کلام کو طول دینے کے لئے عرض کیا۔ کہ مولیٰ یہ میری لاٹھی ہے۔ مَیں اس پر ٹیک لگاتا ہوں۔ اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں۔ اور بہت سے کام کرتا ہوں۔ وہ چاہتے یہ تھے۔ کہ رب یہ پوچھے۔ کہ تم اور کیا کام کرتے ہو۔ تاکہ اس بہانہ سے ساری زندگی اس کلام میں ہی گذار دوں۔ جب اس نے مجھ سے ایک بات پوچھی ہے۔ تو جواب سُننا ہی پڑے گا وہ کلام کا منشار تھا اور یہ ہُوا جذبہ (۵) مولوی وہ جو بتا کر سمجھائے۔ اور صوفی وہ جو دکھا کر مسئلہ حل کر دے **حکایت** حج میں میرے ساتھ ایک پنجابی بزرگ تھے۔ جن کا نام تھا صوفی محمد حسین وہ مجھ سے فرمانے لگے۔ کہ ایک بار میں شاہ عبدالحق مہاجر الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کیا۔ کہ حدیث شریف میں تو آتا ہے۔ کہ ہمارا مدینہ بھٹی ہے۔ جیسے کہ بھٹی لوہے کی میل کو نکال دیتی ہے۔ ایسے ہی زمین مدینہ نااہل کو اپنے سے نکال دیتی ہے۔ حالانکہ مرتد اور منافق بھی مدینہ پاک

میں مر کر یہاں دفن ہوجاتے ہیں۔ پھر اِس حدیث کا مطلب کیا۔ شاہ صاحب نے مجھے کان پکڑوا کر نکلوادیا۔ میں حیران تھا کہ مجھے کس قصور میں نکالا گیا۔ رات کو خواب میں دیکھتا ہوں۔ کہ مدینہ منورہ کے قبرستان یعنی جنّت البقیع میں کھدائی ہو رہی ہے۔ اور اونٹوں پہ باہر سے لاشیں آرہی ہیں۔ اور یہاں سے باہر جا رہی ہیں۔ میں اُن لوگوں کے پاس گیا۔ اور پوچھا کہ کیا کر رہے ہو۔ وہ بولے کہ جو نااہل یہاں دفن ہوگئے ہیں۔ اُن کو باہر پہنچا رہے ہیں۔ اور عشاق مدینہ کی اُن لاشوں کو جو اور جگہ دفن ہوگئی ہیں یہاں لا رہے ہیں۔ میں دوسرے دن پھر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا کہ اب سمجھے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے۔ اور کل تم نے مجھ سے اغیار میں اسرار پوچھے تھے۔ جس کی تمہیں سزا دی گئی (۶) مولوی وہ جس کی گفتار سے مسائل حل ہوں۔ صوفی وہ کہ جس کے دیدار سے منازل طے ہوں۔ مگر خیال رہے کہ ولی را ولی مے شناسد۔ مولٰنا فرماتے ہیں ؎

لوحِ محفوظ است پیشانی یار — رازِ پنہاں مے شود زاں آشکار

ایک جگہ فرماتے ہیں:۔ اے لقائے تو جوابِ ہر سوال

(۷) مولوی وہ جو دلائل سُنا کر مسائل کی مسائل میں تسلی کرے۔ صوفی وہ جو مطلوب تک پہنچا کر بذریعہ کشف تشفی کردے۔ کہ جہاں دلائل کی ضرورت ہی نہ رہے۔ مولٰنا فرماتے ہیں ؎

پائے استدلالیاں چوبیں بود — پائے چوبیں سخت و بے تمکیں بود

(۸) مولوی وہ جو صاحبِ قال ہو۔ اور صوفی وہ جو صاحبِ حال۔ مولٰنا فرماتے ہیں ؎

قال را بگذار مردِ حال شو — زیرِ پائے کاملے پامال شو

(۹) مولوی وہ جس پر اطاعت غالب ہو۔ صوفی وہ جس پر عشق غالب ہو ؎

نہ مسجد میں نہ بیت اللہ کی دیوار کے سائے میں — نمازِ عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں

(۱۰) مولوی وہ جو شریعت کا کھلا ہوا سیدھا راستہ طے کرے۔ صوفی وہ جو طریقت کا نہایت تنگ اور دشوار اور پیچیدہ راستہ کو قطع کرے۔ اور وہاں پہنچے جہاں سے نہ لوٹے ؎

یہ حکم ہوا ہے کہ کوئی آنے نہ پائے — اور جو کوئی آجائے تو پھر جانے نہ پائے

(۱۱) مولوی وہ جو اپنے کو سب پر ظاہر کرے۔ اور شور مچاتا سب کو بلاتا منزلِ مقصود کو جائے۔ صوفی وہ جو اپنے کو چھپائے۔ اور سوا رازدار کے کسی کو نہ بتائے گویا مولوی شاہی نشان ہے۔ اور صوفی سرا پردہ۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ کہ مجھے حضور علیہ السلام سے دو علم ملے۔ ایک کو تو سب میں پھیلا دیا۔ دوسرے کو میں ظاہر کردوں تو مارا جاؤں۔ بخاری و مشکوٰۃ کتاب العلم۔ (۱۲) مولوی وہ جو عبادات کا قالب طیار کرے۔ صوفی وہ جو عبادات کا نسب بنائے اور اُن میں روح پھونکے۔ نماز کے شرائطِ ادا مولوی بتلائے گا۔ اور شرائطِ قبول صوفی سے معلوم ہوں گے۔ خیال رہے کہ بعض حضرات شریعت۔ طریقت کے جامع گذرے۔ جیسے مولٰنا جامی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی۔ بعض حضرات وہ ہیں جو علمِ ظاہری میں مشہور ہوئے۔ جیسے کہ مُلّا علی قاری اور امام فخرالدین رازی۔ مولٰنا فرماتے ہیں ؎

گر باستدلال کارِ دیں بودے — فخرِ رازی رازدارِ دیں بودے

بعض وہ حضرات ہیں جو صرف تصوّف میں مشہور ہوئے۔ اور اُن سے فیوض باطنی جاری ہوئے۔ جیسے حضرت امام العارفین محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ۔ یہ بھی خیال رہے۔ کہ ہم کو شریعت طریقت دونوں کی ضرورت ہے۔ یہ دونوں چیزیں زندگانی کی گاڑی کے دو پہیّے ہیں۔ کہ اگر ایک پہیّہ بھی نہ ہو تو گاڑی بیکار۔ ہم عالمِ دین کے محتاج ہیں اور شیخ طریقت کے بھی۔ کسی نے اعلیٰحضرت قبلہ قدس سرہٗ سے پوچھا۔ کہ امام ابوحنیفہ اور حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں سے افضل کون ہے۔ فرمایا کہ وہ شریعت کے امام اعظم ہیں۔ اور یہ طریقت کے امام اعظم۔ تجھے اس فرق کی کیا ضرورت۔ تو دونوں

ہی آنکھوں کا حاجتمند ہے۔ وہ بولا اچھا یہ بتا دیجئے کہ اِن میں داہنی آنکھ کون ہیں۔ اور بائیں کون؟ آپ نے فرمایا۔ اس سلسلہ میں سارے داہنے ہی ہیں۔ بائیں کوئی نہیں۔ سبحان اللہ کیا حکیمانہ جواب ہے۔ افضلیت ایک محکمہ کے حکام میں دیکھی جاتی ہے۔ وائسرائے اور کمانڈر انچیف یا کپتان پولیس۔ اور سول سرجن میں اعلیٰ ادنیٰ کیسا۔ یہ دونوں اپنے اپنے محکمہ میں چوٹی کے حکام ہیں۔ اور ہر ایک کو دوسرے سے تعلق۔ کپتان صاحب سول سرجن سے علاج کراتے ہیں۔ اور سول سرجن صاحب کپتان سے چوری کی تحقیقات۔ اسی طرح علماء صوفیاء سے بیعت ہوتے ہیں اور صوفیاء علماء کے شاگرد۔ ہم غلاموں کو کیا حق ہے۔ کہ اس بحث میں پڑیں ؕ

اللہ کا شکر ہے۔ کہ اس نے تفسیر جلد اوّل بخیر و خوبی انجام پر پہنچائی۔ اور دعا ہے کہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ میں اسے تکمیل تک پہنچائے۔ اور قبول فرمائے۔ اور میرے لئے صدقہ جاریہ اور گناہوں کا کفارہ بنائے۔ اور میرے ولی نعمت مرشد برحق صدر الافاضل مولٰنا الحاج سیّد محمد نعیم الدین صاحب کا سایہ مجھ پر اور تمام اہل سنّت پر قائم رکھے۔ اور مذہب حقہ اہل سنّت پر خاتمہ نصیب فرمائے۔ آمین آمین یا رب العٰلمین

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَنُوْرِ عَرْشِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحٰبِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِهٖ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ۝

ناچیز احمد یار خاں قادری اشرفی نعیمی غَفَرَلَهٗ وَلِوَالِدَيْهِ

مدرس مدرسہ خدام الصوفیہ گجرات۔ پنجاب۔

۲۷ ذیقعدۃ الحرام ۱۳۶۳ھ یوم چہار شنبہ

# فہرست تفسیر نعیمی پارہ الٓمّٓ جلد اوّل (۱)